بارود کے پھول
ایم اے راحت

بارود کے پھول

ایم اے راحت

خزینہ علم و ادب
الکریم مارکیٹ اُردو بازار - لاہور ۷۳۱۴۱۶۹، ۷۲۱۱۴۶۸

دیدہ زیب اور
خوبصورت کتب کا
واحد مرکز

تزئین و اہتمام
نذیر محمد، طاہر نذیر

اشاعت	2004ء
سرورق	حمید اللہ
کمپوزنگ	محمد عمران ساغر
مطبع	[illegible]
قیمت	-/200

انتساب

گل نوشگفتگان
صدف راشد
اور
حمزہ سلمان کے نام
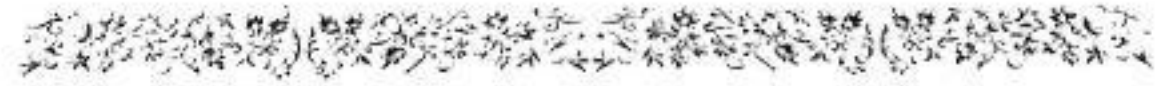
ترے اثر سے نکلنے کے سو وسیلے کیے
مگر وہ نین کہ تو نے تھے جو نشیلے کیے

ابھی بہار کا نشہ لہو میں رقصاں تھا
مگر خزاں نے ہر اک شے کے ہات پیلے کیے

محبتوں کو تم اتنا نہ سرسری لینا
محبتوں نے صف آرا کئی قبیلے کیے

اے سعد نغمہ گری میں ہے فن بھی اپنی جگہ
مگر یہ لوگ کسی درد نے سریلے کیے

سعد اللہ شاد
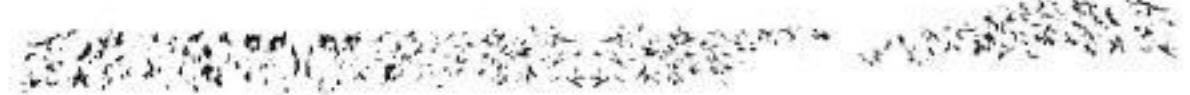
عید ہو بقر عید ہو یا کوئی بھی تہوار ہو۔ لاہور کے پنچھی ان تہواروں سے ایک دن دو دن یا تین دن پہلے لاہور سے چلے جاتے ہیں اور لاہور کی رونقیں تقریباً ختم ہو جاتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے لاہور کی زیادہ تر آبادی باہر سے آنے والوں کی ہے۔ لوگ ملازمتیں کرنے آتے ہیں، چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے علاقے سے پڑھنے آتے ہیں۔ اپنے اپنے معمولات میں مصروف رہتے ہیں اور پھر جب کوئی چھٹی ہوتی ہے تو اپنوں کی یاد میں تڑپتے ہوئے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ ریلیں بسیں ہر ذریعہ سفر خوب مصروف ہو جاتا ہے اور لاہور آدھے سے زیادہ خالی ہو جاتا ہے۔ عید آنے والی تھی اور شاہ زیب بھی کبیر والا جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ کبیر والا میں اس کی پشتی حویلی تھی۔ پتہ نہیں کتنی نسلوں سے یہ حویلی اسی علاقے میں آباد چلی آ رہی تھی۔ اس کے رنگ روپ کئی بار بدلے تھے۔ اب اس وقت بھی وہ اپنی وسعتوں سے پھیلی ہوئی تھی۔ صدیوں پرانے درختوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ جدید وقدیم طرز تعمیر کا بہترین نمونہ تھی۔ کچھ شوقینوں نے اس کی وسعتوں میں اضافہ کیا تھا اور کچھ ایسے بھی تھے جو اسی انداز میں گزار گئے تھے۔ جہاں زیب بھائیوں میں سب سے بڑا اس سے چھوٹا اورنگزیب اور پھر شاہ زیب۔ اس وقت حویلی کبیر والا کے اطراف میں پھیلی ہوئی بے شمار ایکڑ زمینیں، اینٹوں کے بھٹے اور دوسرے بہت سے چھوٹے چھوٹے کاروبار جن کی دیکھ بھال مکمل طور پر جہاں زیب اور اورنگزیب کے سپرد تھی۔ بڑا

زبردست کاروبار چل رہا تھا ان کا کبیروالا میں اور ان کا اطراف کے بڑے لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ جہاں زیب نے صرف میٹرک پاس کیا تھا۔ اورنگ زیب انٹر تک پڑھ کر رہ گیا تھا اور شاہ زیب بی اے کے آخری سال میں تھا۔ لاہور میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور وہیں ہوسٹل میں قیام تھا۔ عید بقر عید گھر چلا جاتا تھا۔ البتہ اس بار اس کے دل میں اداسیاں چھائی ہوئی تھی۔ ماں کا انتقال پچھلے سال ہی ہوا تھا' رمضان میں اور عید نہیں منائی گئی تھی۔ شاہ زیب گھر پہنچا تھا اور گھر کی اداسیوں میں شریک ہو گیا تھا۔ دونوں بھائی نارمل قسم کے لوگ تھے اور بھابیاں بھی روایتی بھابیاں تھیں۔ پہلے بے چاری مرحوم ماں تنازعہ بنی ہوئی تھی۔ اماں نے یہ کہہ دیا' اماں نے وہ کہہ دیا' حالانکہ اماں بہت ہی صابر خاتون تھیں۔ زندگی میں چونکہ بیٹوں نے ایک درجہ دیا ہوا تھا۔ اس لیے خود کو گھر کا بڑا سمجھتی تھیں۔ البتہ اس بات پر بہوؤں نے اعتراض کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اقتدار منتقل ہوتا ہے اور کسی کو بھی اقتدار پر قابض نہیں رہنا چاہیے۔ خاص طور سے بڑی بھابی شاہینہ بیگم تو کچھ خاندانی طور پر بھی گڑبڑ تھیں۔ بات یہ نہیں تھی کہ ان کا خاندانی شجرہ خراب تھا۔ بلکہ وہی بات ہوتی ہے کہ زمینداروں کے اپنے مزاج ہوتے ہیں۔ دو بھائیوں کی بہن تھی اور دونوں بھائی جبار خاں اور الیاس خاں سخت گیر جاگیرداروں میں شمار ہوتے تھے۔ ہنگامہ آرائیاں' دشمنیاں' سازشیں ایسے لوگوں کی فطرت کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں ان میں تھیں اور اپنے علاقے کے قرب و جوار میں انہیں اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ جھٹے بنائے ہوئے تھے اور جھٹوں میں بھی سازشیں چلتی تھیں۔ بہت سے لوگوں سے دشمنی پالی ہوئی تھی اور شاہینہ بھی اس خون کا ایک حصہ تھی۔ شادی ہو کر آئی تھی تو اپنے اقتدار کے لیے مسلسل سرگرداں تھی اور اس سلسلے میں ساس سے اچھی خاصی کسل چلتی رہتی تھی۔ پھر اس کے بعد شکیلہ بیگم تھیں جو اورنگزیب کی بیوی تھیں۔ یہ خاتون بھی اچھے خاندان سے تھیں۔ اچھے سے مراد کھاتے پیتے خاندان کی۔ زمیندار کی بیٹی تھی لیکن کسی حد تک بہتر'

اتنی بری نہیں تھی جتنی شاہینہ۔ شاہینہ بیگم تو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھیں اور اکثر جہاں زیب کو ان کی وجہ سے خاصی پریشانیاں اٹھانی پڑتی تھیں۔ دونوں سالے بھی ذرا ٹیڑھے قسم کے تھے۔ ایک دو بار تلخی ہوئی تو الیاس خاں نے جہاں زیب سے کہا۔

''بھائی جان! ہم تابعدار ہیں تمہارے۔ حکم کرو جو کہو گے وہ کریں گے لیکن ہمارا تمہارا رشتہ بہن کے دم سے ہوا ہے۔ شاہینہ کی پیشانی پر اگر تمہاری طرف سے بل آیا تو پھر تم سوچ لو کہ پھر تمہاری ہماری دوستی کیسی۔'' اور جہاں زیب بھی بزدل نہیں تھا اس نے بھی سخت لہجے میں کہا۔

''تمہارے لیے یہ بہتر ہوگا الیاس خاں کہ اپنے لہجے کو ہمیشہ نیچا رکھو اور کوئی ٹیڑھی بات نہ کرو۔ ورنہ ہم بھی خاندانی زمیندار ہیں۔ ہم نے بھی بہت کچھ پال رکھا ہے۔ اس طرح الیاس خاں اور جبار خاں کوئی الٹی سیدھی حرکت تو نہیں کر سکے تھے لیکن شاہینہ بیگم اپنے بھائیوں کا رعب ہمیشہ ڈالتی رہتی تھیں۔ شکیلہ بیگم کسی سے کم نہیں تھیں لیکن اتفاق کی بات تھی کہ دونوں دیورانی جٹھانی میں بھی بہت زیادہ تلخی نہیں پیدا ہو سکی تھی اور ہر مسئلے میں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انہوں نے ساس کے خلاف مشترکہ محاذ بنا رکھا تھا۔ بیٹے اور تو جو کچھ بھی تھا لیکن ماں کے خلاف کم از کم کبھی کوئی بات نہیں سنتے تھے۔ پھر تقدیر نے خود ہی فیصلہ کر دیا اور اماں درمیان سے اٹھ گئی۔ ساس کے جانے کے بعد کوئی خاص تنازعہ نہیں رہا لیکن شاہینہ کو تو کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا رکھنے میں مزہ آتا تھا۔ اپنے طور پر دونوں دیورانی جٹھانی نجانے کیسے کیسے حساب لگاتی رہتی تھیں۔ بہرحال اس طرح زندگی گزر رہی تھی۔ البتہ ماں کی موت کے بعد شاہ زیب کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ پچھلے سال تو خیر عید ہی نہیں منائی گئی تھی۔ اب کے وہ یہ سوچ رہا تھا کہ چھٹیاں ہو رہی تھیں۔ عید منانے جائے یا نہ جائے۔ اب وہاں گھر میں کون ہے جب ماں زندہ تھیں تو ان کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوا کرتی تھیں۔ اور جب سے شاہ

زیب نے لاہور میں پڑھنا شروع کیا تھا۔ کوئی چھٹی' کوئی تہوار' کوئی عید' بقر عید یا اتفاقیہ پیدا ہو جانے والی چھٹیاں ایسی نہیں ہوتی تھیں کہ شاہ زیب کبیر والا اپنی حویلی پہنچے۔ ماں اسے دروازے پر نہ ملے۔ لیکن اب عید آ رہی تھی۔ ماں کے تصور نے غمزدہ کر دیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ جائے یا نہ جائے اور ایسے ہی موقع پر ممنون نے اس کے پاس پہنچ کر کہا۔

''کتنی بار وعدہ کرو گے مجھ سے میرے گھر چلنے کا۔ ایک بار تو چل کر دیکھ رانی پور کا اپنا بھی ایک مقام ہے۔ دعوئی سے کہتا ہوں کہ تمہیں رانی پور بہت پسند آئے گا۔''

''یار! میں کئی بار گزرتے ہوئے رانی پور دیکھ چکا ہوں۔ مگر اسٹیشن کی حد تک بات ایسی نہیں ہے' بس تم یہ سمجھ لو ادھر بھی بھائی ہیں' بھابیاں ہیں۔''

''ایک بات کہوں' برا تو نہیں مانو گے۔'' ممنون نے کہا۔

''نہیں' نہیں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ کہو۔''

''دیکھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہم بہت اچھے دوست ہیں اور ہم دونوں کی دوستی مثالی ہے۔ دوستیاں اس وقت تک قائم رہتی ہیں۔ جب تک ایک دوسرے کو سمجھا جا سکے۔ اگر میں تمہیں نہ سمجھ پاؤں تو یقین کرو ہماری دوستی ریت کی طرح اتر جائے۔ مگر میں تمہیں سمجھتا ہوں۔''

''مطلب کیا ہے تمہارا؟''

''جب تک ماں زندہ تھی تمہارے چہرے کی خوشیاں اور تمہارے گھر جانے کی لگن ہی مختلف ہوا کرتی تھی اور اب میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ تم ہچکچاہٹ کا شکار ہو۔'' شاہ زیب کے چہرے پر افسردگی پھیل گئی۔ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر آ ۔ ۔ ۔ سے بولا۔

''ہاں' سچی بات یہ ہے کہ ممنون! کہ باپ تو اس وقت اس دنیا سے چلے گئے تھے جب مجھے اس نقصان کا احساس تک نہیں تھا۔ اس کے بعد ماں تھیں' انہوں نے مزید کسی

احساس کو نہ ہونے دیا لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ ان جیسی محبت کرنے والا بھلا کون ہے میرے لیے۔''

''ہاں' ماں کا جو درجہ ہوتا ہے وہ کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ معارف کرنا ذاتی باتیں کرید رہا ہوں لیکن یوں سمجھ لو کہ تمہارے دل کا حال جاننا چاہتا ہوں۔ بھائیوں کا رویہ کیسا ہے تمہارے ساتھ؟''

شاہ زیب تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ ''پتہ نہیں' کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بس یوں سمجھ لو کہ درمیانے ہی رہے ہیں میرے ساتھ۔''

''اور بھابیاں؟''

''نہیں۔ میں نے اپنی بھابیوں کے دل میں کبھی اپنے لیے کوئی لگن نہیں پائی۔ فلموں میں جو روایتی بھابیاں ہوتی ہیں۔ جو دیور پر جان چھڑکتی ہیں۔ وہ صرف کہانی کی حد تک ہوتی ہیں اور ویسے بھی کچھ غیر خواتین ظاہر ہے کسی کے لیے کیوں تڑپیں گی۔''

''نہیں یار! بھابی دیکھنی ہے تو میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں اپنی بھابی سے ملاتا ہوں۔ ایک ہی بھائی ہیں میرے اور ایک ہی بھابی ہیں لیکن تم یقین کرو ماں جیسا درجہ دیتی ہیں۔ بہت کچھ کرتی ہیں۔ میرے لیے فلمی کہانیاں صرف روایتی نہیں ہوتیں لیکن کہانیاں تو تقریباً سچی ہی ہوتی ہیں۔ جو بات انسانی ذہن میں آ جائے اس کا وجود ہوتا ہے۔ اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی ہوتا ہے۔ تم چل کر تو دیکھو۔''

''اس بار نہیں۔ ایسا کرتا ہوں بقر عید پر ضرور چلوں گا تمہارے ساتھ۔ وجہ یہ ہے کہ دیکھوں تو سہی پچھلی عید تو ویسے ہی گزر گئی۔ اس بار بھائیوں اور بھابیوں کا کیا رویہ رہتا ہے۔ پہلے جب عید پر جاتا تھا تو جیسا بھی موسم ہوتا تھا اس لحاظ سے ماں عید کے لیے میرا جوڑا سلوا کر رکھتی تھی اور عید کی نماز میں باقی دونوں بھائیوں کے ساتھ اپنا نیا جوڑا پہن کر جاتا تھا۔ مجال

ہے کبھی اس میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہو۔اب کے دیکھوں گا کیا ہوتا ہے میرے ساتھ؟''

''تمہاری مرضی ہے۔''

''بس ٹھیک ہے یار تمہارا بہت بہت شکریہ۔تم نے میرے بارے میں اس انداز میں سوچا۔'' شاہ زیب نے کہا اور ممنون خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

جبار خاں واپس پہنچ گیا۔الیاس خاں بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔جبار خاں کے چہرے پر وہ کچھ تلاش کر رہا تھا اور جو کچھ وہ تلاش کر رہا تھا وہ اسے مل گیا۔

''کیا ہوا؟ آؤ بیٹھو۔میں یہ نہیں کہوں گا کہ جاؤ پہلے حلیہ درست کرو۔مجھے تفصیل بتا جاؤ اس کے بعد جا کر نہانا دھونا اور آرام کرنا۔''

تفصیل کیا بھائی جان وہ کچھ زیادہ تیس مار خان بن رہے ہیں جو زمین ہم نے خریدنے کی بات کی تھی وہ انہوں نے فوراً خرید لی ہے۔وہ نہیں چاہتے کہ ہم اپنا بھٹہ وہاں بنائیں۔۔اصل میں یہ بات تو آپ کو معلوم ہے کہ اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنے والے مزدور خریدے جا سکتے ہیں۔انہیں زندگی بھر کے لیے غلام بنا لیا جاتا ہے۔معاوضے دے کر ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔اور کوشش کی جاتی ہے کہ آس پاس کوئی اور بھٹے والا ان مزدوروں کا قرض ادا کر کے انہیں خرید نہ لے۔اصل میں یہ کاروبار اس انداز میں چلتا ہے۔وہ لوگ ہمارا بھٹہ وہاں نہیں بننے دیں گے۔دولت والے لوگ ہیں۔انہوں نے وہ زمینیں جس کی ہم نے بات کی تھی خرید لی ہیں اور ہم سے زیادہ معاوضہ دے رہے ہیں۔'' الیاس خاں پر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔پھر اس نے کہا۔

''تمہارے جانے کے بعد میں نے بھی کچھ کام کیا ہے۔چھائی والی زمینوں کے بارے میں کچھ معلوم ہے تمہیں؟''

''ہاں۔''

''ادھر ہی کی بات کر رہا ہوں۔اس گاؤں کا نام آصل ہے۔آصل کے بغلی حصے میں جو زمینیں ہیں وہ جہاں زیب بھائی کی ہیں۔کافی عرصے پرانی بات ہے۔ایک بار ہماری ملاقات ان زمینوں پر ہوئی تھی۔تو جہاں زیب بھائی وہاں نشانی لگوا رہے تھے۔خاصی بڑی زمینیں ہیں ان کی۔اگر ان لوگوں نے وہ زمینیں خریدی ہیں جو ہم خرید رہے ہیں تو جہاں زیب والی زمینیں تو ہمیں مل سکتی ہیں۔''

''دے دیں گے جہاں زیب بھائی؟''

''کیوں نہیں دیں گے؟ قیمت ادا کریں گے ہم ان کی بہنوئی ہیں وہ ہمارے۔''

''تو پھر میرا خیال ہے بھائی جان فوراً کوشش کر لو۔اس وقت تو مونچھ نیچی ہو گئی ہے۔جو ہونی نہیں چاہیے۔''

''چوہدریوں کی مونچھیں کبھی نیچی نہیں ہوتیں۔ہم فخر خاں کو بتا دیں گے کہ ہم کون ہیں۔''

''ٹھیک ہے جہاں تک ہو سکے کام سیدھی انگلیوں سے ہی نکل آئے تو بہتر ہے۔ورنہ پھر ٹیڑھی انگلیاں کرنا بھی جانتے ہیں ہم۔جہاں تک زمینوں کا معاملہ ہے اس کے لیے کوئی خون ریزی نہیں کریں گے۔بلاوجہ کی دشمنیاں بیوقوف لوگ مول لیتے ہیں۔ہم تو پیسہ پھینک کر تماشا دیکھتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے جاؤ آرام کرو۔کل جہاں زیب بھائی کے پاس دونوں چلیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' جبار خاں نے کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔دوسرے دن تیاریاں کی گئیں۔الیاس خاں اور جبار خاں ایک لینڈ کروزر میں بیٹھ کر چل پڑے۔پیچھے دو جیپیں چل رہی تھیں۔جس میں آٹھ آٹھ کلاشنکوف والے بیٹھے تھے۔یہ باڈی گارڈز تھے جوان کے

ساتھ چل رہے تھے۔ ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد وہ لوگ آخر کار کبیر والا پہنچ گئے۔ اور یہاں جب وہ جہاں زیب کی حویلی میں داخل ہوئے تو چاروں طرف سے پراشتیاق آنکھیں ان کا جائزہ لینے لگیں۔ جہاں زیب اور اورنگزیب موجود نہیں تھے۔ عید آنے والی تھی اور عید کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ چنانچہ وہ دونوں اپنی زمینوں پر گئے ہوئے تھے۔ ہاریوں اور مزدوروں میں تھوڑی بہت رقم تقسیم کی جاتی تھی۔ دونوں اسی کام سے نکلے ہوئے تھے۔ شاہینہ کو جب بھائیوں کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ خوش ہو کر باہر نکل آئی اور بھائیوں کی شان کا جائزہ لینے لگی۔ کلاشنکوف بردار جیپوں سے نیچے اتر گئے تھے اور دونوں بھائی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بہن کے قریب آ گئے تھے۔ دونوں نے شاہینہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور شاہینہ ملازموں کو ہدایت دینے لگی کہ ساتھ آنے والوں کی خاطر مدارت کی جائے۔ دونوں بھائی شاہینہ کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہو گئے تھے۔ خیر و عافیت پوچھی گئی۔ شکیلہ بیگم روایتی طور پر سلام کرنے آئیں ان کے سر پر بھی ہاتھ رکھا گیا۔ پھر وہ خاطر مدارت کا کام لے کر اندر چلی گئیں۔ تو جبار خاں نے کہا۔

''شاہینہ بہن! ہم لوگ اس وقت ایک خاص مقصد سے تمہارے پاس آئے ہیں۔ تمہیں ہمارا یہ کام کرنا ہو گا۔''

''بولیں بتائیں۔''

''وہ جو ٹبے والی زمین ہے۔ اس میں تھوڑی سی زمین ہمیں چاہیے۔ وہاں بھٹہ بنانا ہے۔ مونچھ کا سوال ہے۔ اگر بھٹہ نہ بنا تو مونچھ نیچی ہو جائے گی۔''

''ٹبے والی زمین۔ مگر وہ تو شاہ زیب کی ہے۔ ماضی میں بڑی بی نے باقاعدہ زمین تقسیم کر دی تھی۔ ان کی رجسٹری بھی ہو گئی تھی۔ زمین کا وہ حصہ شاہ زیب کے پاس ہے۔ اسی لیے تو آج تک بنجر پڑا ہوا ہے اور اس پر کوئی کام ہی نہیں کیا گیا۔''

''تو شاہ زیب کیا منع کر دے گا۔'' الیاس خاں نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''خیر، وہ ایسا نہیں ہے لیکن پھر بھی ان لوگوں کے اپنے منصوبے ہیں۔'' شاہینہ ہچکچاتی ہوئی بولی تو الیاس خاں نے کہا۔

''مجھے تو یہ تمہارا کوئی منصوبہ معلوم ہوتا ہے شاہینہ۔ میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ جیسے ہی تم چوہدریوں کی مونچھیں نیچے ہونے کا سنو گی بے چین اور بے قرار ہو جاؤ گی اور کہو گی کہ بھائی پہلے اپنا کام شروع کر دو۔ وہ باقی ساری باتیں بعد کی ہیں۔''

''ارے نہیں نہیں۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں بڑے بھیا! میں آپ سے ہٹ کر تو نہیں سوچ سکتی۔ بس چونکہ سارا معاملہ میرے لیے اجنبی اور نیا ہے۔ اس لیے سوچ رہی ہوں کہ اس سلسلے میں ہمیں کیا کیا مشکل پیش آ سکتی ہے۔''

''دیکھو بات فخر خان کی ہے۔ فخر خان خود بھی بڑا زمیندار ہے اور بہت بڑی طاقت ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ابھی فخر خان سے ٹکر لیں۔ لیکن بات پوری ہونے کے بعد میرا مطلب ہے ہمارا وہاں بھٹہ بن جائے۔ اس کے بعد دیکھ لیں گے۔ فخر خان کو بھی فی الحال تو یہ کھلی بات تھی۔ تم جہاں زیب اور شاہ زیب کی بات کر رہی ہو لیکن ایسا نہ ہو کہ زمینوں کے بارے میں منع کیا جائے تو ہم خود وہاں کوئی کارروائی کر ڈالیں۔ شاہینہ نے نگاہیں اٹھا کر بھائیوں کو دیکھا اور بولی۔

''مجھے دھمکی دے رہے ہو بھیا؟''

''نہیں بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ شاہینہ! تمہیں وہ زمین حاصل کر کے فوراً میرے لیے بندوبست کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے عید آ رہی ہے۔ شاہ زیب بھی آنے والا ہو گا اور میں جہاں زیب سے صاف الفاظ میں تمہاری بات کر دوں گی کہ زمین تو چاہیے ہی۔''

''ہاں' میں بھی یہی چاہتا ہوں ورنہ اس کے بعد صورتحال بالکل مختلف ہو جائے گی۔'' شاہینہ ہنسنے لگی پھر بولی۔

''کھاؤ پیو بھیا! بہنوں کے گھر آ کر بھائی دھمکیاں نہیں دیا کرتے۔''

''بہنیں بھی تو دلاسہ دینے کی بات کریں۔ ہم لوگوں کی عزت خطرے میں پڑ گئی ہے۔ ایک دو بھٹے ہمارے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتے لیکن بات مونچھ کی آ جاتی ہے وہاں پھر کھیل دوسرا ہو جاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ اچھا یہ بتاؤ انور اور امیر کیسے ہیں۔ ان کی خیریت تو آپ نے بتائی ہی نہیں۔ ان سے کہیے کہ پھوپھو کبھی یاد نہیں آتی' کبھی تو یاد کر لیا کریں اپنی اس پھوپھی کو بھی۔''

''آئیں گے دونوں آئیں گے۔ کہتے ہیں سالے کہ پھوپھو کے پاس ہو کر آئے ہیں لیکن اگر نہیں آتے تو آئیں گے۔ جب ان کا باپ آ جاتا ہے تو وہ کیا حیثیت رکھتے ہیں۔'' الیاس خاں نے مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ پھر خاطر مدارت کا سلسلہ شروع ہوا۔ آخر میں الیاس خاں یہ کہہ کر چلا گیا کہ فوراً ہی کام شروع کر دیا جائے تاکہ وہ بھٹے کا کام شروع کر سکے۔ گاڑیاں واپس چلی گئیں تھیں۔

☆☆☆

شاہینہ نے اسی رات جہاں زیب کے کان میں بات ڈال دی۔ چالاک عورت تھی۔ ضرورت سے زیادہ شاطر۔ یہ اندازہ لگا چکی تھی کہ الیاس خاں کو ہر قیمت پر ان زمینوں کی ضرورت ہے۔ بہرحال بہنوں کا کردار ادا کر رہی تھی۔ کھانے کی میز پر ہی جہاں زیب سے کہا۔

''پتہ تو چل گیا ہوگا آپ کو الیاس اور [illegible] بھائی آئے تھے۔''

''ہاں بڑی سنسنی پھیلی ہوئی ہے کہ دو جیپوں میں ان کی فوج بھی بھری ہوئی تھی اور پوری طرح مسلح تھی۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ حملہ آور ہوئے تھے یا ایسے ہی دوستی کے مشن پر آئے تھے۔''

''چوہدری حملہ بھی کرتے ہیں تو دیکھ بھال کر کرتے ہیں۔ بہرحال یہ ان کی بہن کا گھر تھا۔ یہاں حملہ کرنے کے خیال سے کیسے آ سکتے تھے۔''

''اچھا' اچھا۔ تو پھر ایسے ہی آئے ہوں گے۔''

''نہیں ایسے ہی نہیں آئے تھے۔ کچھ کام تھا انہیں آپ سے۔''

''ہاں بولو۔''

''وہ پچھائی کی زمین ہے ناں۔'' شاہینہ نے کہا۔

''ہاں ہاں۔ آصل کے پاس۔''

''بالکل انہی کی بات کر رہی ہوں۔''

''ہاں ہے پھر؟''

''وہ تھوڑی سی زمین چاہیے تھی الیاس بھائی کو۔ قیمت ادا کرنا چاہتے ہیں حالانکہ میں نے کہا کہ بھائی کوئی غیر تو نہیں ہیں آپ اور زمین بھی کسی دوسرے کی نہیں ہے ہماری اپنی ہے لیکن پھر بھی میں ذرا جہاں زیب کے کانوں میں ڈال دوں گی۔''

''مگر وہ زمینیں تو شاہ زیب کی ہیں یہ پتہ ہے تمہیں؟''

''تو پھر'' شاہینہ نے نگاہیں اٹھا کر شوہر کو دیکھا۔

''نہیں میرا مطلب ہے اس کا فیصلہ تو شاہ زیب ہی کر سکے گا۔''

''شاہ زیب منع کر دے گا؟''

''وہ تو شاہ زیب ہی بتا سکے گا۔''

''نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے میں نے بڑے اعتماد سے الیاس بھائی سے کہہ دیا ہے کہ ان کی یہ چھوٹی سی خواہش ضرور پوری کر دی جائے گی۔ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔''

''ہاں ہاں۔ بات واقعی مشکل نہیں ہے۔ اگر وہ میری یا اورنگزیب کی ہوتی تو ایک منٹ میں فیصلہ کیا جا سکتا تھا لیکن بات شاہ زیب کی ہے۔''

''اگر بات شاہ زیب کی ہے تو میں بھی منہ کھولے بغیر نہیں رہ سکتی۔ شاہ زیب پر جو کچھ خرچ ہو رہا ہے۔ یا جو کچھ اب تک خرچ ہوا ہے۔ اس کا کوئی حساب کتاب رکھا ہے آپ نے۔''

''ارے بابا! میرے سر کیوں پڑ رہی ہو۔ میں نے تو منع نہیں کیا۔''

''شاہ زیب سے بھی کہہ دیں کہ منع نہ کرے کیونکہ آپ کو الیاس بھائی کی بات معلوم ہے۔ اصل میں کوئی ایسا چکر چل گیا ہے وہاں جس کی وجہ سے الیاس بھائی وہاں بھٹہ ضرور بنانا چاہتے ہیں اور جب تک وہاں بھٹہ نہیں بنے گا۔ الیاس بھائی سکون سے نہیں بیٹھیں گے۔ آپ کو پتہ ہے کہ کتنے ٹیڑھے دماغ کے آدمی ہیں وہ۔ شاہ زیب کو بھی سمجھایئے اگر اس نے کہیں خدانخواستہ منع کر دیا تو بات بہت بگڑ جائے گی۔''

''ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ آنے والا ہے وہ۔ بات کر لیں گے۔''

اورنگزیب نے تنہائی میں جہاں زیب سے ملاقات کی تھی۔

''اور جس طرح وہ لوگ آئے تھے بھائی! آپ کو معلوم ہے کہ جس طرح کے وہ لوگ ہیں۔ پورے علاقے میں ان لوگوں نے اندھیر مچا رکھا ہے۔ قتل و غارت گری خونریزی کسی کو مروا دینا ان کے لیے مشکل کام نہیں ہے۔''

''جانتا ہوں۔''

''شاہ زیب کو سمجھایئے اور کہئے تھوڑی سی زمین کا معاملہ ہے اس کے بدلے میں

ہم اسے اپنی زمینوں کا ایک ٹکڑا دے دیں گے۔''

''ہاں آنے دو اسے۔'' جہاں زیب نے کہا۔ آخر کار شاہ زیب کبیر والا پہنچ گیا۔ بجھا بجھا سا حویلی میں داخل ہوا تھا۔ کوئی بہن ہوتی تو شاید ماں کی کسر پوری کر دیتی لیکن بہن کوئی نہیں تھی۔ دونوں بھائی اپنے اپنے مسائل میں گرفتار تھے۔ ماں کے بغیر یہ دوسری عید تھی لیکن بہرحال بھائیوں نے تھوڑا بہت استقبال بھی کیا۔ شائلہ بیگم شاہینہ سے ذرا مختلف تھیں۔ خوف خدا بھی تھا' دیور کو محبت سے خوش آمدید کہا اور کہنے لگیں۔

''جلدی آنے کے لیے کہا تھا تم سے' جلدی آ جاتے تو کچھ کپڑے وغیرہ سلوا لیے جاتے۔ اب کتنا کم وقت رہ گیا ہے۔''

''ارے بھابی! آپ کی محبت کافی ہے۔ وہی پہن لیں گے وہی اوڑھ لیں گے۔'' شاہ زیب نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ بات کوئی خاص نہیں تھی پہلے تو یہ سوچا جانے لگا کہ عید گزر جانے دی جائے اس کے بعد شاہ زیب سے بات کی جائے۔ ہو سکتا ہے ماحول میں تلخی پیدا ہو جائے لیکن شاہینہ بیگم کو قرار نہیں تھا۔ وہ اپنے بھائیوں کو عید کی خوشخبری دینا چاہتی تھی۔ چنانچہ شاہ زیب کی آمد کے پہلے ہی دن اس وقت جب رات کو ڈنر ٹیبل پر سب ہی جمع ہوئے۔ تو شاہینہ نے تذکرہ چھیڑ دیا۔

''وہ شاہ زیب تمہاری تعلیم کے کتنے دن باقی رہ گئے ہیں ابھی۔''

''ابھی تو وقت ہے بڑی بھابی۔''

''شاہ زیب! ایک بات کرنی تھی تم سے۔''

''جی بڑی بھابی۔''

''وہ پچھائی والی زمینیں ہیں نا جو تمہاری زمینیں ہیں۔''

''ہاں ہاں بھابی! کیا ہوا خیریت؟''

''وہ دراصل الیاس بھائی اینٹوں کا بھٹہ بنانا چاہتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی ضرورت آ گئی ہے اس جگہ کی۔ باقی تو سارا معاملہ اپنی جگہ ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ ان زمینوں سے ملتی ہوئی زمینیں ایک زمیندار فخر خان کی ہیں اور فخر خان نے وہاں بھٹہ بنایا ہوا ہے۔ بس کوئی ایسی بات ہوگئی ہے جو الیاس بھائی کے دل کو لگ گئی ہے اور الیاس بھائی اور جبار بھائی میرے پاس آئے تھے۔ انہوں نے خاص طور سے ان زمینوں کے بارے میں کہا ہے اور کہا ہے جیسے ہی بن پڑے یہ زمینیں انہیں دے دی جائیں۔ اس کی منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہیں وہ۔'' شاہ زیب کا ہاتھ کھانے پر رک گیا تھا۔ اس نے دونوں بھائیوں کی صورت دیکھی پھر بھابی کو دیکھا اور بولا۔

''بھابی! آپ کو ان زمینوں کا پس منظر معلوم ہے۔ اماں نے خود وہاں مجھے ساتھ لے جا کر نشان لگایا تھا۔ ان زمینوں کے بارے میں۔ میری اپنی دونوں بھائیوں سے بھی بات ہوئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ زمینیں کبھی سرسبز نہیں ہو سکیں گی۔ آپ کو اس بات کا بھی علم ہے بھابی کہ میں نے زرعی تعلیم صرف اس لیے حاصل کی تھی کہ وہ زمینیں میرے لیے چیلنج بنا دی گئیں تھیں۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ یہ زمینیں سرسبز نہیں ہو سکیں گی اور میں نے اماں سے کہا تھا کہ اماں کہ اگر تمہارا بیٹا انہی زمینوں کو گلزار بنا کر نہ دکھا دے تو تمہاری اولاد نہیں ہے۔ ماں نے بڑی محبت سے مجھے اپنے سینے سے لگایا تھا اور کہا تھا وہ اس دن کا انتظار کریں گی۔ جانے والے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں لیکن اپنی یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔ کچھ مقاصد چھوڑ جاتے ہیں بھابی۔ آپ الیاس بھائی سے معذرت کر لیں اور کہیں کہ جن زمینوں کو گلزار بنانے کا عہد میں کر چکا ہوں انہیں آتشکدہ نہیں بننے دوں گا۔ بھابی معذرت چاہتا ہوں میں۔ آپ کچھ بھی مانگ لیتیں میں دے دیتا لیکن۔۔۔''

''میاں بات تو وہ چلیں لیکن نام ہو۔ اماں اس دنیا سے۔ اب صرف تمہارے

جذبات اور خیالات رہ گئے ہیں۔ دیکھو جذبات اور خیالات اچھی چیز ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی کا ایک حصہ لیکن بعض اوقات جذباتیت نقصان پہنچا دیتی ہے۔ بات چوہدریوں کی مونچھ کی ہے۔ اگر وہ زمینیں بڑے بھیا کو نہ ملیں تو فخر خان کے سامنے ان کی مونچھ نیچی ہو جائے گی اور بڑے بھیا نے گردنیں جھکا دی ہیں کٹوا دی ہیں۔ اپنی مونچھ نہیں نیچی ہونے دی۔ ضد نہ کرو اور جذباتی نہ بنو۔ زمینوں کا وہ حصہ بڑے بھیا کو دے دو۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا بھابی!''

''ارے کیسے سوال نہیں پیدا ہوتا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم نے تو کبھی حساب کتاب نہیں کیا۔ تم پر جو اخراجات ہو رہے ہیں وہ کیا آسمان سے اتر رہے ہیں۔ حصے تو برابر برابر کر دیئے تھے تمہاری اماں جان نے۔ تمہارے لیے کون سا الگ سرمایہ چھوڑا تھا۔ لاکھوں روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ بھائی تو باپ بنے بیٹھے ہوئے ہیں حساب نہیں لگاتے لیکن حساب تو بھیا حساب ہی ہوتا ہے۔ کبھی سوچا نہیں تم نے کہ تم پر کیا خرچ ہو رہا ہے۔'' دونوں بھائی بے چین ہو رہے تھے اور شاہ زیب پریشانی سے ایک ایک کی صورت دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''آپ کیا کہتے ہیں بھائی صاحب! بھابی کی باتیں سن رہے ہیں آپ۔ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ اماں نے ان زمینوں کے سلسلے میں کیا کہا تھا؟''

''بھئی ایک طرح بات سچ ہی ہے۔ اب یہ مشکل پیش آ گئی ہے تو اس کا حل تو نکلنا ہی ہے۔''

''آپ کچھ اور کہیے۔ میں یہ زمینیں نہیں دوں گا۔''

''تمہاری ہوں گی تو تم نہیں دو گے نا۔ یہ تو اخلاقی معاملہ تھا کہ ہم نے تم سے پوچھ لیا۔ ارے واہ۔ دیکھا آپ نے اسے کہتے ہیں آستین کا سانپ۔ بھیا ڈسے بغیر نہیں چھوڑتا

یہ سانپ۔ سنو! جہاں زیب بیٹھ کر حساب کتاب کروان سے جو ہمارا نکلتا ہے ہمیں دے دو۔ ہم خاموش ہو جائیں گے۔''

''بڑے بھائی صاحب! آپ بول نہیں رہے حساب کریں گے آپ مجھ سے۔''

''بھئی۔ تم مان جاؤ یہ کیا بات ہوئی۔''

''مان جاؤں۔ یعنی یہ زمینیں بھٹہ بنانے کے لیے دے دوں۔''

''ہاں ہاں دے دو۔''

''نہیں بھائی صاحب نہیں۔۔۔ جن زمینوں کو میں نے ماں کے سامنے گلزار بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ انہیں آتشکدہ نہیں بننے دوں گا؟''

''تو پھر یہ بات سمجھ لو تم شاہ زیب کہ اگر چودھری الیاس میرے پاس آیا اور اس نے مجھ سے بات کی تو میں اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔''

''گویا آپ بھی یہی چاہتے ہیں؟''

''میں تمہاری طرح ضدی نہیں ہوں اور نہ ضد کر کے بات بگاڑنا چاہتا ہوں اور جہاں تک بات حساب کتاب کی ہے تو واقعی شاہینہ سچ کہہ رہی ہے۔ جتنی تمہاری ان زمینوں کی قیمت ہے اس سے زیادہ میں تم پر خرچ کر چکا ہوں۔'' شاہ زیب دھک سے رہ گیا تھا۔ بھائی بھی گریزاں ہو گئے تھے۔ اورنگزیب کی طرف دیکھا۔

''بھائی! آپ بھی کچھ نہیں بول رہے۔''

''تمہاری ضد بے جا ہے۔ زمینیں الیاس خاں کو دے دو۔''

''نہیں بھائی جان! میں اپنے ہاتھوں سے تو وہ زمینیں نہیں دوں گا انہیں۔ آپ لوگ سب بیگانے ہو گئے ہیں۔ ایک بار اماں کی کہی یہ بات آپ کو یاد نہیں ہوگی۔ کہی تھی انہوں نے یہ بات۔ بھائی جان مجھے یہ زمینیں آپ سے زیادہ نہیں ہیں۔ بس ماں کے سامنے

ایک بڑا بول بولا ہے لیکن وہ بڑا ہی ثابت ہوا۔ بھابی وہی تھوڑی سی زمین کیا' میرا حصہ تو آپ مجھے دے چکی ہیں نا۔ بہت خرچ ہو چکا ہے مجھ پر۔ اب تو میں اس حویلی میں بھی رہوں تو اصولی طور پر مجھے ایک کرائے دار کی حیثیت سے رہنا ہوگا۔ بھابی اس حویلی سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ میں یہاں کرائے دار بن کر نہیں رہ سکتا۔ شاہ زیب کھانے کی میز سے اٹھ گیا لیکن فوراً ہی اورنگزیب اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

''شاہ زیب! کیا یہ گستاخی نہیں ہے۔ تم کھانے کی میز سے اٹھ کر جا رہے ہو۔ بھائی نہیں سمجھتے ہمیں اپنا؟''

''آپ دیکھ رہے ہیں بھائی جان کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟''

''جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔ بہر حال ہر مسئلے کا حل نکل سکتا ہے۔ پرسوں عید ہے کیا اس طرح سے تمہارے چلے جانا ہم سب کی عید خراب نہ کر دے گا۔''

''آپ کو اپنی عید کا خیال ہے۔ آپ یہ نہیں سوچ رہے کہ میں نے ماں سے کچھ وعدے کیے ہیں۔ وہ وعدے پورے کرنے ہیں مجھے۔ ویسے بھابی صاحبہ! آپ سے مجھے یہ امید نہیں تھی کہ آپ نے جو میرے اوپر تعلیمی اخراجات کیے ہیں اس کا حساب کتاب اس طرح سے لیں گی۔ شاہینہ بیگم نے مصلحتاً سر جھکا لیا تھا۔ صورتحال جس انداز میں خراب ہو رہی تھی وہ ذرا غلط تھا۔ اس طرح تو اس کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی۔ بمشکل تمام شاہ زیب کو سمجھا بجھا کر دوبارہ کھانے کی میز پر بٹھایا گیا۔ کھانا تو خیر کسی نے ڈھنگ سے نہیں کھایا تھا۔ لیکن بہر حال فضا کا وہ تکدر کچھ لمحات کے لیے ختم ہو گیا۔ اورنگزیب شاہ زیب کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ شکیلہ بھی ساتھ ہی تھی۔

''شاہ زیب! میں تم سے کوئی بات نہیں کہوں گا۔ بات بہت زیادہ بڑی نہیں تھی۔ بھابی صاحبہ کی عادت ہے کہ جب بھی ذرا سخت ہوتی ہیں۔ الٹی سیدھی باتوں پر اتر آتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ الیاس خاں اور جبار خاں آئے تھے۔ اور انہوں نے ان زمینوں کی بات کی ہے۔ تھوڑی سی تفصیل مجھے معلوم ہو چکی ہے۔ اصل میں فخر خان نامی ایک زمیندار نے وہاں اپنا بھٹہ بنایا ہوا ہے۔ کچھ ایسی باتیں کہہ دی ہیں اس نے جبار خاں وغیرہ سے کہ یہ لوگ بھی بھڑک گئے ہیں اور وہاں ہر قیمت پر بھٹہ بنانا چاہتے ہیں۔ خیر ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''نہیں بھائی جان! بھابی نے بہت تلخ باتیں کی ہیں۔ میں نے واقعی کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ میرے اوپر جو تعلیمی اخراجات ہو رہے ہیں۔ ان کا ایسا حساب بھی ہے اور آپ یقین کریں۔ زمین آپ سے قیمتی نہیں ہے۔ بس ماں کی یادیں وابستہ ہیں اور میں نے انہیں سرسبز و شاداب بنا کر ماں کی روح کو سرخرو کرنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ کوئی حل نکال لیں گے اس کا۔'' بات کسی قدر پرسکون ہو گئی تھی۔ اس کے بعد عید آئی۔ سب لوگ ایک دوسرے سے گلے ملے۔ بھابی صاحبہ کا رویہ بھی برا نہیں تھا۔ بھابی کو جواب دینا تھا ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی تھی اور صرف چند باتیں شاہینہ صاحبہ نے الیاس خاں سے کہیں تھیں۔

''بھابی جان! صورتحال اتنی آسان نہیں رہی جتنی ہم نے سوچا تھا۔ اصل میں وہ بے وقوف لڑکا شاہ زیب چند ایسی جذباتی باتوں کا شکار ہے۔ جو اس نے اپنی ماں سے کہیں تھیں۔''

''کیا باتیں کہیں تھیں بھئی؟'' الیاس خاں نے پوچھا۔

''بس وہ زمینیں بنجر تصور کی جاتی تھیں اور یہ سوچا جاتا تھا کہ ان زمینوں پر کبھی کھیتی باڑی نہیں ہو سکے گی۔ ایک مرتبہ ان لوگوں نے ان زمینوں کو دیکھ کر ایسی ہی باتیں کی تھیں۔ تب شاہ زیب نے دعویٰ کیا کہ وہ ان زمینوں کو اتنا شاداب بنا دے گا کہ آس پاس کے لوگ

انہیں دیکھا کریں گے۔ یہ وعدہ اس نے اپنی ماں سے کیا تھا۔ چنانچہ اس کے آنے کے بعد جب میں نے بات کی تو وہ جذباتی ہو گیا اور ماحول میں ذرا سی تلخی پیدا ہو گئی۔''

''اوہ۔ تیری تلخی کی ایسی تیسی۔ اس کمینے سے کہہ دے کہ زمین الیاس خاں کو چاہیے۔ سارے جذبات ٹھنڈے کر دیئے جائیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو اسے بھی ماں کے پاس پہنچانا پڑے۔''

''صورتحال خاصی بگڑی ہوئی ہے۔ بہر حال میں تم سے دوبارہ رابطہ کروں گی۔''

''دیکھو بی بی! میری بات سنو میں آدمی ذرا دوسری قسم کا ہوں۔ کام شروع کرا سکتا ہوں۔ پہلے سے اگر تیری بات نہ ہوتی تو کام شروع بھی کرا چکا ہوتا۔''

''تو انتظار کر لو بڑے بھیا! تم بھی اتنے جذباتی نہ ہو۔ میں ٹیلی فون کر کے تمہیں صورتحال بتاؤں گی۔''

''میں انتظار کروں گا۔'' الیاس خاں نے کہا۔ شاہینہ ذرا دوسرے انداز میں سوچ رہی تھی۔ بہر حال شوہر کا معاملہ بھی تھا اور جانتی تھی شاہ زیب چھوٹا بھائی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں زیب پر پورا پورا اختیار تھا اور جس طرف بھی ہو وہ جہاں زیب کو موڑ دیتی۔ جہاں زیب اس طرف مڑ سکتا تھا لیکن پھر بھی دوسرا بھائی تھا۔ سارے معاملات تھے۔ سوچ سمجھ کر کام کرنا تھا۔ بھائیوں کی طرح سنگدل عورت تھی لیکن چالاک اور مصلحت پسند بھی تھی۔ چنانچہ انتظار کرنے لگی ادھر جب عید گزر گئی اور سارے معاملات ہموار ہو گئے۔ شاہ زیب واپس جانے کے بارے میں سوچنے لگا تو جہاں زیب نے ایک بار پھر کہا۔

''شاہ زیب! کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ایک بار پھر تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لو۔ بات اصل میں یہ نہیں کہ میں تمہیں کسی کام کے لیے مجبور کرنا چاہتا ہوں۔'' شاہ زیب نے تلخ نگاہوں سے بھائی کو دیکھا اور کہا۔

''میں بھی آپ سے یہ کہہ چکا ہوں آپ یقین کریں کہ معاملہ اگر میری ماں کا نہیں ہوتا تو شاید میں اگلے لمحے کے لیے ضد نہ کرتا۔ لیکن آپ خود سوچئے بلکہ بھائی جان! میں ذرا زمینوں کے وہ کاغذات دیکھنا چاہتا ہوں آپ ہی کے پاس رکھے ہوئے ہیں۔''

''ہاں بھئی میں کوئی چیز اپنے قبضے میں رکھنا بھی نہیں چاہتا تم دیکھ لو یہ کاغذات۔''

''اور وہ حساب بھی بھائی صاحب جو مجھ پر نکلتا ہے۔''

''وہ تمہاری بھابی تمہیں بتا سکتی ہیں۔'' جہاں زیب نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس کا اپنا کردار کچھ سمجھ میں آ رہا تھا۔ بہر حال اس نے کاغذات کے پرونوٹ نکال کر سامنے رکھ دیئے۔ شاہ زیب انہیں دیکھنے لگا۔ ہر لحاظ سے یہ کاغذات مکمل تھے اور زمین بلا شرکت غیرے اس کے اپنے حصے میں آتی تھی۔ کوئی ایسی شق نہیں تھی جس پر غور کیا جا سکتا۔ جبکہ حساب کتاب کا معاملہ یہ تھا۔ اس میں کہیں باقاعدگی نہیں تھی۔ اور ویسے بھی یہ صرف شاہینہ کی بچ تھی اور بھی بہت سی ایسی چیزیں تھیں جن سے آمدنی ہوا کرتی تھی اور اس آمدنی میں بھی بہر حال تینوں بھائیوں کا برابر کا ہی حصہ تھا۔ شاہ زیب نے وہ کاغذات طے کر کے لفافے میں رکھے اور اٹھتا ہوا بولا۔

''بھائی جان! بات اصل میں یہ ہے کہ صورتحال ذرا سی مشکوک ہوگئی ہے۔ یہ کاغذات میں اپنی تحویل میں لوں گا اور لاہور جا کر انہیں کسی بینک لاکر میں رکھوا دوں گا۔ مجھے آپ پر یا بھابی پر کوئی شک نہیں ہے لیکن الیاس خاں اور جبار خاں جرائم پیشہ لوگ ہیں۔''

''تم کیسی باتیں کر رہے ہو شاہ زیب؟'' اسی وقت شاہینہ اندر داخل ہوگئی۔ اس نے شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے تمہارے الفاظ سن لیے ہیں شاہ زیب! ٹھیک ہے یہ کاغذات تم واقعی اپنے پاس رکھو۔ اصل میں بدنصیبی یہ ہوتی ہے کہ عورت کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھا جاتا

ہے۔ میں نے تو ہمیشہ تمہارے لیے اپنے دل میں ایک ماں کا ہی جذبہ پایا تھا۔ بھائیوں نے مجھ سے کہا کہ ان کی مونچھ نیچی ہونے کا خطرہ ہے۔ میں نے ان سے دعویٰ کرلیا کہ شاہ زیب میرے لیے بیٹوں کی مانند ہے۔ میں کہوں گی تو وہ کبھی انکار نہیں کرے گا۔ لیکن اب میں وہ گھر چھوڑ چکی ہوں اور میں جانتی ہوں کہ اب میرے لیے تم ہی زیادہ اہمیت رکھتے ہو۔ چھوٹے بھائی ہو۔ وہ لوگ اس گھر کے فرد نہیں ہیں۔ میں اس گھر کی ہوں۔ شاہ زیب میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔ میں ان لوگوں کو بتا دوں گی کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔''

''بھابی! آپ یقین کریں میں بھی آپ کو بڑا درجہ دیتا ہوں۔ یہ اگر صرف جذباتی مسئلہ نہ ہوتا اور ابھی ماں کو مرے ہوئے دو سال بھی نہیں ہوئے۔ میں ماں سے کیے ہوئے وعدے کو کیسے بھول جاؤں۔ کیا آپ اس بات کا یقین نہیں کرتیں کہ میں نے زرعی تعلیم محض اس لیے حاصل کی تھی کہ میں ان زمینوں کو آباد کروں گا۔''

''ٹھیک ہے خدا تمہیں یہ آبادی مبارک کرے۔'' شاہینہ بیگم نے کہا اور آنسو پونچھتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ جہاں زیب ملامت آمیز نگاہوں سے بھائی کو دیکھنے لگا اور پھر اس نے کہا۔

''بہنوں کو بڑا مان ہوتا ہے اپنے بھائیوں پر۔ یہ حقیقت ہے کہ شاہینہ نے کبھی ایک لفظ تمہارے خلاف نہیں کہا۔ تمہاری اپنی مرضی ہے خیر۔''

شاہ زیب کو تھوڑا سا دکھ ضرور ہوا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ شاہینہ اگر اس بات پر نہ بھی آمادہ ہوتی تو بھی الیاس خاں وغیرہ اسے مجبور کرتے رہیں گے۔ چنانچہ کاغذات کو بینک میں رکھ دینا زیادہ بہتر ہے۔ چنانچہ رات وہ کاغذات اس نے اپنے سرہانے ہی رکھے تھے۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ باہر سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ شاہ زیب کی آنکھ کھل گئی۔ ویسے بھی وہ پوری طرح سویا نہیں تھا۔ نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور

دروازہ کھول دیا لیکن دوسرے ہی لمحے سر پر ایک زبردست ضرب لگی اور پھر بدن کے کچھ حصوں پر بھی شدید ضربیں لگائی گئیں۔ ان ضربوں نے اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ اور وہ زمین پر پڑا تھا۔ پھر اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کون لوگ تھے۔ جنہوں نے اسے اٹھایا اور خاموشی کے ساتھ باہر اٹھا لائے۔

☆☆☆

گل جلال اس گھر کا بہت پرانا نمک خوار تھا۔ سرحد کا رہنے والا تھا۔ نیک دل آدمی تھا۔ چوکیداری کے فرائض انجام دیتا تھا اور اپنی ذمہ داریاں پوری کرتا تھا۔ اس رات بھی وہ اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔ رات کا ابتدائی پہر تھا کہ اس نے ایک بڑی سی جیپ حویلی سے تھوڑے فاصلے پر آ کر رکتے ہوئے دیکھی۔ ہمیشہ مستعدی کی ڈیوٹی گزارتا تھا۔ چنانچہ جیپ کو دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ آس پاس کوئی اور ایسی جگہ نہیں تھی کہ جس کے بارے میں وہ یہ سوچ سکتا کہ جیپ کہیں اور آ کر رکی ہے۔ پھر جیپ سے دو آدمی نیچے اترے۔ لمبے لمبے قد کے لوگ تھے۔ وہ آہستہ آہستہ حویلی کی جانب بڑھ گئے اور چند ہی لمحوں کے بعد حویلی کے بڑے گیٹ پر جہاں گل جلال ڈیوٹی دے رہا تھا پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نے بڑے احترام سے گل جلال کو سلام کیا تھا۔ تب گل جلال کو یہ اندازہ ہوا کہ اجنبی چہرے والا یہ شخص کوئی غلط انسان نہیں ہے۔ اس نے سلام کا جواب دے کر کہا۔

''جی بھائی صاحب! آپ ادھر کیسے آیا؟''

''خان صاحب! تھوڑی سی معلومات کرنی ہے۔ بڑے ضروری کام سے آئے ہیں ہم۔ آپ کو اس وقت ذرا سی مدد کرنی ہوگی ہماری۔''

''بولو بھائی صاحب بولو۔'' گل خان نے آگے بڑھ کر تھوڑا سا سر جھکایا تھا۔ اسی وقت دونوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ گل جلال کے سر پر ضربیں لگائی گئیں اور گل جلال کے حلق

سے کراہیں نکل گئیں۔ اس کا سر زخمی ہو گیا تھا۔ وہ تھوڑا سا چکرایا۔ اس کے بعد زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ ان میں سے ایک نے جھک کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کام ہو گیا ہے۔''

''ہاں۔ چلو آؤ۔ جلدی کرو۔'' گل جلال بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ طاقتور آدمی تھا۔ بس ان ضربوں سے سر میں تھوڑا سا چکر آ گیا تھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن آنکھوں کے آگے تاریکیاں پھیلتی جا رہی تھیں۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ دو تین بار اٹھنے کی کوشش کی لیکن کم بخت ہاتھ پاؤں اس طرح بے جان ہو گئے تھے کہ اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ پھر وہ بمشکل تمام ہمت کر کے اٹھا اور چکراتے ہوئے زمین کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ جیپ سامنے ہی موجود تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ لوگ کدھر گئے ہیں۔ وہ ان کی تلاش میں جیپ کے قریب پہنچا تھا اور اس نے جیپ کو چاروں طرف سے دیکھا تھا۔ لمبی اور خاص قسم کی جیپ تھی۔ جس کے پچھلے حصے میں خاصی بڑی جگہ بنی ہوئی تھی۔ درمیان کی سیٹ تھی اور پھر ڈرائیونگ سیٹ والی پھر ابھی گل جلال جیپ کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ دفعتاً اسے حویلی کی جانب سے وہ دونوں افراد آتے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے کسی کو اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ گل جلال کی عقل اس وقت کام کر گئی۔ وہ جس کیفیت میں تھا۔ اس میں فوری طور پر تو کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ البتہ وہ پھرتی سے اپنی جگہ سے ہٹا اور جیپ کے اس پچھلے حصے میں داخل ہو گیا۔ جسے اس نے ابھی ابھی دیکھا تھا۔ یہاں وہ سکڑ کر لیٹ گیا۔ رات کی تاریکی میں اگر کسی کو شبہ نہ ہو سکے تو اسے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ قریب آ رہے تھے۔ پھر انہوں نے اپنے کندھوں پر لدے ہوئے بوجھ کو پچھلی سیٹ پر ڈال دیا اور دونوں پھرتی سے اچھل کر جیپ میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے جیپ اسٹارٹ کی اور وہ آہستہ آہستہ آگے

بڑھی پھر اس نے رفتار پکڑ لی۔گل جلال کے بدن کو جھٹکے لگ رہے تھے۔اب اس کا ذہن پوری طرح جاگتا جا رہا تھا۔سر پر لگنے والی ضربوں نے اسے بے شک تھوڑی دیر کے لیے نڈھال کر دیا تھا۔لیکن طاقتور آدمی تھا' پٹھان تھا۔چھوٹی موٹی چوٹوں کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔چنانچہ اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔حس وفاداری جاگ گئی۔اس نے سوچا کہ پتہ نہیں یہ کون لوگ ہیں اور حویلی سے کس کو اغوا کر کے لائے ہیں۔بہت سے واقعے اس کی آنکھوں میں گھومنے لگے۔چھوٹے چھوٹے بچوں کو اور کبھی کبھی بڑے بڑے لوگوں کو بھی اغوا کر لیا جاتا ہے اور ان کے بدلے بڑی بڑی رقمیں طلب کی جاتی ہیں۔یقیناً یہ کوئی ایسا ہی سلسلہ ہے۔یہ جرائم پیشہ لوگ ہیں جو حویلی میں رہنے والے کسی شخص کو اغوا کر کے لائے ہیں اور اب اس کے بدلے وہ کسی بہت بڑی رقم کا مطالبہ کریں گے۔ان کی ایسی تیسی۔گل جلال کے ہوتے ہوئے اگر وہ ایسا کام کرے گا تو گل جلال کی زندگی پر لعنت۔گل جلال نے سوچا اور یہ فیصلہ کرنے لگا کہ اب اسے کرنا کیا ہے۔اس نے سوچا کہ جب یہ جیپ کسی جگہ جا کر رکے گی اور وہ لوگ بے ہوش کیے ہوئے شخص کو اندر لے جائیں گے تو گل جلال ان کا تعاقب کرے گا پھر وہیں چھپے گا۔وہ لوگ جب آرام کرنے لیٹ جائیں گے تو گل جلال صورتحال کا جائزہ لے گا اور اس کے بعد ان لوگوں سے جنگ کرے گا اور اپنے مالکوں میں سے جس شخص کو بھی اغواء کیا گیا ہے' لے کر واپس آجائے گا۔وہ اپنے آپ کو اس کام کے لیے تیار کر رہا تھا کہ تھوڑے فاصلے پر جا کر جیپ کی رفتار سست ہوگئی۔قرب وجوار میں ویرانے پھیلے ہوئے تھے۔جیپ ایسے ہی ایک ویرانے میں جا کر رکی تھی۔یہاں ڈھلان تھی اور شہر کا کوڑا یہاں گاڑیوں کے ذریعے لا کر پھینکا جاتا تھا۔گل جلال ایک لمحے تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔وہ لوگ بھی نیچے اتر آئے تھے۔بے ہوش جسم کو انہوں نے گاڑی میں سے کھینچا اور اسے لے کر چل پڑے۔یہ بات گل جلال کے لیے ذرا تعجب خیز تھی۔وہ تھوڑی دیر تک اپنی جگہ پر لیٹا رہا اور پھر

اس کے بعد پھرتی سے کود کر نیچے آگیا۔وہ ڈھلوان کی جانب جا رہے تھے اور انہوں نے بے ہوش آدمی کا جسم اپنے کندھوں پر لادا ہوا تھا۔دوسرے لمحے گل جلال نے دیکھا کہ انہوں نے اسے ڈھلوان میں کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا ہے۔جسم لڑھکتا ہوا نیچے جا رہا تھا۔ڈھلان بہت زیادہ گہرے نہیں تھے۔لیکن بڑے غلیظ اور بدبودار تھے۔گل جلال کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔کیا انہوں نے کسی کو ہلاک کر دیا ہے۔اس نے سوچا اور پھر وہ اپنی جگہ مستعد ہوگیا۔اس نے دل ہی دل میں کہا کہ خدائی خوارو تمہاری زندگی ہے کہ تم نکل کر جا رہے ہو۔ابھی یہ دیکھنا ہے کہ میرے مالکوں میں سے کون تمہاری کارکردگی کا شکار ہوا ہے۔جیپ آگے بڑھ گئی تھی۔جلال تیزی سے ڈھلانوں کی طرف بڑھا۔ستاروں کی مدھم روشنی میں وہ اس انسانی جسم کو دیکھ سکتا تھا۔ان ڈھلانوں پر اترتے ہوئے اسے بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔اس کا پورا جسم کوڑے کے ڈھیر میں تھا اور اس پر پاؤں جما کر چلنا بڑا مشکل کام تھا۔گل جلال کو بہت سی جگہ بہت انتہائی خوفناک صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔کوڑے کا ڈھیر ایک سنسنی خیز

دلدل جیسی حیثیت رکھتا تھا اور اس پر پاؤں جما کر چلنا بڑا مشکل کام تھا۔گل جلال کو بہت سی جگہ بہت خطرناک صورتحال پیش آئیں۔کوڑے کے ڈھیر میں سینے تک دھنس جاتا تھا اور قدم بڑھانے کے لیے اسے اس طرح آگے بڑھنا پڑ رہا تھا جیسے کوئی پانی میں اترتا ہے۔لیکن اس جسم تک پہنچنا ضروری ہے۔اس نے سوچا اور مزید محنت کے بعد وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوگیا۔انسانی جسم دیکھا پھر اس کے چہرے پر غور کیا تو ایک دم سے اس کے منہ سے نکلا۔

''اوہ خدائی خوار! تمہارا بیڑا غرق اس جوان بچے کو تم نے قتل کر ڈالا۔'' گل جلال نے شاہ زیب کو پہچان لیا تھا۔پھر جلدی سے اس نے شاہ زیب کے بدن کو ٹٹول کر دیکھا۔شاہ زیب زندہ تھا لیکن بے ہوش تھا۔اس کا سانس بھی چل رہا تھا لیکن اس کا چہرے کوڑے

سے اٹ گیا تھا۔ گل جلال نے جلدی سے اس کے بازو اٹھائے' اپنی گردن پر رکھے اور پھر طاقت لگا کر اس کے جسم کو اٹھا لیا۔ پھر وہ تیزی سے کوڑے کے ڈھیر پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن یہ دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔ اترتے ہوئے تو پھر بھی اس کا اپنا ہی وزن تھا اور پھر ڈھلان اسے خود بخود نیچے لے جا رہے تھے۔ لیکن چڑھتے ہوئے ایک ایک قدم آگے بڑھانا مشکل لگ رہا تھا۔ اپنی طاقت کے بل پر بھی وہ اس وقت شاہ زیب کے جسم کو اوپر نہیں لے جا سکتا تھا۔ بہت دیر تک وہ کوشش کرتا رہا۔ لیکن چند قدم سے آگے نہ بڑھ سکا۔ کوڑا نیچے کھسک کر اسے نیچے گرا دیتا تھا بلکہ اب ایک اور خوفناک صورتحال پیش آ گئی تھی۔ اس کے جسم' وزن اور مسلسل جدوجہد کی وجہ سے اوپر کا کوڑا نیچے کھسکنے لگا تھا۔ اور کہیں کہیں اس کے انبار پھسل کر اس کے سر سے گزرنے لگے تھے۔ گل جلدی جلدی سے نیچے اتر گیا۔ اسے خدشہ ہو گیا تھا کہ کہیں وہ کوڑے کے ڈھیر میں دفن نہ ہو جائیں۔ یہ بڑی سنسنی خیز صورتحال تھی۔ وہ کافی پیچھے ہٹ گیا اور بے بسی کی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اسے امید کی ایک کرن نظر آ گئی۔ کوڑے کا ڈھیر صرف سڑک کے ساتھ ساتھ تھا۔ ڈھلانوں کے پچھلے حصے اس سے محفوظ تھے کیونکہ کوڑا گاڑیوں سے لا کر سڑک کے کنارے ہی پھینکا جاتا تھا جبکہ ڈھلان آگے جا کر پھر اوپر بلند ہو جاتے تھے۔ اور ادھر بہت سے درخت لگے ہوئے تھے۔ گل جلدی جلدی سے واپس پلٹا اور تیزی سے ان دوسرے ڈھلانوں کی طرف بڑھنے لگا۔ جو سپاٹ اور کوڑے سے تھوڑی سی جدوجہد کے بعد آخر کار وہ کنارے پر پہنچ گیا۔ پہلے اس نے کندھے پر لدے ہوئے شاہ زیب کے جسم کو کنارے پر رکھا اور اس کے بعد احتیاط سے خود اوپر چڑھ آیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ذرا سا جھک کر شاہ زیب کا جائزہ تو لے لیا جائے۔ وہ شاہ زیب کی نبضیں دیکھنے لگا۔ دل کی دھڑکنیں سنی' سانسوں کی آمدورفت دیکھی' سب ٹھیک تھا۔ پتہ نہیں ان لوگوں نے اسے وہاں سے اٹھا کر

یہاں تک لانے کی ضرورت کیوں محسوس کی تھی۔ بہر حال گل جلال نے اٹھ کر ایک بار پھر شاہ زیب کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر سڑک تک پہنچ گیا۔ سڑک پر جا کر اس نے سمت کا اندازہ کیا۔ بہر حال یہ ساری جگہ اس کے لیے اجنبی تھی۔ چنانچہ وہ وہاں سے واپس چل پڑا۔ جیپ بیروالا سے تھوڑے فاصلے پر پہنچی تھی اور انہوں نے بہت زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک انسانی جسم کو کندھوں پر لاد کر پیدل اتنی دور کا سفر طے کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ البتہ جب وہ حویلی میں داخل ہوا تو حویلی میں روشنیاں جل رہی تھی اور دوسرے ملازم بھی جاگے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ جہاں زیب' اورنگزیب اور دوسرے افراد بندوقیں تانے ہوئے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ حویلی پوری طرح روشن کر دی گئی تھی۔ گل جلال کھلے ہوئے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو روشنیاں اس کا طواف کرنے لگیں۔ حویلی کے اندرونی حصے تو روشن کیے تھے لیکن بڑی بڑی ٹارچوں سے گل جلال کو دیکھا گیا اور اس کے بعد وہ سب کے سب اس کی طرف دوڑ پڑے۔

"کون ہے' کیا ہے؟ کہاں مر گئے تھے تم گل جلال؟" جہاں زیب کی آواز ابھری۔

"مرا نہیں صاحب' زندہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے شاہ زیب صاحب کو بھی زندہ سلامت لے کر آیا ہے۔"

"شاہ زیب!" دونوں بھائی چیخ پڑے اور بھی بہت سی آوازیں نکلیں تھیں۔

"ارے ہاں شاہ زیب' شاہ زیب!" اور پھر وہ تمام گل جلال کے کندھوں پر پڑے شاہ زیب کو دیکھنے لگے۔

"کیا ہوا ہے اسے۔ خیریت سے تو ہے یہ؟"

"ابھی صاحب میرے کو نہیں معلوم خیریت سے ہے یا نہیں۔"

"چلو چلو۔ اسے اندر لے چلو۔" وہ لوگ جانتے تھے کہ اگر گل جلال نے اسے

اپنے کندھوں سے اتار دیا تو اسے اٹھا کر لے جانے والا کون ہے۔ چنانچہ وہ گل جلال ہی کے کندھوں پر شاہ زیب کو لیے ڈرائینگ روم میں پہنچے پھر گل جلال نے شاہ زیب کو ڈرائینگ روم کے قالین پر لٹا دیا۔

''کیا ہوا میرے بھائی کو؟ یہ زندہ تو ہے۔ کیا ہوا ہے اسے؟'' جہاں زیب اور اورنگزیب' شاہ زیب کے کمرے میں پہنچ گئے۔ شاہ زیب ابھی تک بے ہوش تھا۔ سر پر پڑنے والی ضربیں شدید تھیں۔

''ڈاکٹر فاروق کو فون کرو۔ ڈاکٹر فاروق کو فون کرو۔ جلدی جاؤ ان سے کہو کہ جلدی آئیں۔ جہاں زیب نے انہیں طلب کیا ہے۔'' ڈاکٹر فاروق کبیر والا کی سرکاری ڈسپنسری کا انچارج تھا۔ ان لوگوں سے اس کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ چنانچہ خود اورنگزیب نے ڈاکٹر فاروق کو فون کیا۔ بڑی دیر کے بعد فاروق کے ہاں سے کسی نے فون اٹھایا تھا۔

''کون ہے؟''

''ڈاکٹر فاروق سے بات کرائیں۔ ان سے کہیں کہ حویلی سے اورنگزیب بول رہا ہے۔''

''وہ سو رہے ہیں۔''

''بکواس مت کرو جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ فوراً جا کر انہیں اٹھاؤ۔''

''اچھا آپ ذرا انتظار کریں۔'' کچھ لمحوں کے بعد ڈاکٹر فاروق کی نیند میں بھری ہوئی آواز سنائی دی۔

''کہو کیا بات ہے؟''

''ڈاکٹر فاروق میں اورنگزیب بول رہا ہوں۔''

''کون اورنگزیب؟''

''ہوش میں آؤ ڈاکٹر فاروق۔ حویلی سے اورنگزیب بول رہا ہوں اور اگر بات سمجھ میں نہ آئی ہو تو اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے مارو۔ اور سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''اوہو۔۔۔ اوہو۔ اورنگزیب صاحب! کیا بات ہے خیریت؟''

''جلدی سے اپنا میڈیکل بکس لے کر آ جاؤ۔ شاہ زیب بری طرح زخمی ہو گیا ہے۔ حویلی میں ڈاکہ پڑا ہے۔ جلدی آ جاؤ۔ ایک منٹ کی تاخیر بھی نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ ہمارے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔ اورنگزیب کا لہجہ خوفناک ہو گیا۔ ڈاکٹر فاروق کو ہوش آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔

''میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔'' تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر فاروق آ گیا۔ شاہ زیب کو دیکھا۔ اس کے سر کے زخموں کو دیکھا اور بولا۔

''اور تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ضربیں شدید لگائی گئی ہیں۔ بظاہر تو یوں لگ رہا ہے جیسے خدا کے فضل سے ہڈیاں وغیرہ محفوظ ہیں۔ میں بینڈیج کرتا ہوں اور انجکشن لگاتا ہوں۔'' ڈاکٹر فاروق نے ان لوگوں کو تسلیاں دیں اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے کام سے فارغ ہو گیا۔ کہنے لگا۔

''معافی چاہتا ہوں اورنگزیب صاحب! قصور میرا بھی نہیں ہے۔ گہری نیند سو رہا تھا۔ نیند کے عالم میں ایسا ہو جاتا ہے۔''

''مجھے صرف ایک بات بتاؤ۔ اس کی زندگی کو کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟''

''نہیں' جوان آدمی ہے۔ کئی آدمیوں نے مل کر زخمی کیا ہے۔ شاید ممکن ہے سوتے میں کیا ہو۔ اس کو ہوش آ جائے گا تھوڑی دیر کے بعد۔ میں ابھی جان بوجھ کر اسے ہوش میں نہیں لا رہا ہوں۔ خود ہوش میں آئے تو اچھا ہے۔''

''فاروق صاحب! آپ یہ بتایئے کہ چائے پئیں گے یا کافی۔ آپ کو ذرا انتظار

کرنا ہوگا۔ ہوسکتا ہے اسے ضرورت پیش آئے۔''

''ویسے ضرورت تو نہیں ہے اس کی لیکن آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔''

''میں آپ کے لیے کافی بھجواتا ہوں۔ آپ ادھر جا کر آرام سے بیٹھیں۔'' اورنگزیب نے کہا۔

بڑے لوگ تھے۔ بہت بڑے زمیندار، معمولی شخصیت کے مالک نہیں تھے اور یہاں کے باعزت لوگ تھے کہ ان کی مخالفت خطرناک کام ہتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر فاروق بے چارہ باہر جا کر برآمدے میں بیٹھ گیا اور کچھ ہی لمحوں کے بعد اس کے سامنے کافی سرو کر دی گئی۔ اس نے اسے ہی غنیمت جانا اور ادھر شاہ زیب بدستور بے ہوش تھا۔ جہاں زیب، اورنگزیب اس کے پاس موجود تھے۔ شکیلہ بیگم ذرا تھوڑی سی نرم مزاج تھیں۔ اس لیے وہ متاثر تھیں جبکہ شاہینہ کے چہرے پر عجیب سے آثار پھیلے ہوئے تھے۔ وہ طنزیہ نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھ رہی تھی۔ شاہ زیب کے اغوا کے بعد کچھ اور پراسرار لوگ حویلی میں داخل ہوئے تھے اور شاہ زیب کے کمرے کی تلاشی لی گئی تھی اس وقت گھر کے ایک دو ملازموں نے انہیں دیکھ لیا اور شور مچانا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجے میں پورے گھر میں جگار ہوگئی۔ جہاں زیب اور اورنگزیب رائفلیں لے کر نکل آئے۔ ہوائی فائرنگ بھی کی گئی۔ گیٹ پر گل جلال کو غائب پایا گیا۔ شاہ زیب کی طرف کسی کا ذہن ہی نہیں گیا تھا اور اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ عام طور پر سے شہر میں رہتا تھا۔ اور ایک دم سے وہ ان لوگوں کو یاد نہیں آیا تھا کہ وہ یہیں موجود ہے۔ بہر حال اس کے بعد کی بقیہ کارروائی یہ ہوئی تھی۔ رات کو تقریباً تین بجے شاہ زیب کو ہوش آ گیا۔ اس نے پریشان نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا تو جہاں زیب نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''نہیں لیٹے رہو۔''

''مجھے کیا ہو گیا ہے؟'' شاہ زیب نے کہا اور اس کے حلق سے ایک کراہ سی نکل گئی۔ سر کے زخم میں ٹیسیں سی ابھری تھیں۔

''کچھ نہیں ہوا۔ ڈاکو آ گئے تھے۔ تمہیں زخمی کر دیا تھا انہوں نے لیکن تم اب ٹھیک ہو۔''

''ڈاکو آ گئے تھے۔'' شاہ زیب سے بولا۔

''ہاں، ہاں لیکن ڈاکہ نہیں ڈال سکے۔ وہ خدا کا فضل ہے۔'' اورنگزیب نے کہا۔

ڈاکٹر کو اطلاع دی گئی۔ اس نے آ کر جائزہ لیا۔ طاقت کے دو انجکشن دیئے اور پھر رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہ بالکل ٹھیک ہیں جناب۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر اجازت ہو تو میں جاؤں؟''

''شکریہ ڈاکٹر! تمہاری فیس اور رات کو اس طرح آنے کا ہرجانہ تمہیں گھر ابھجوا دیا جائے گا۔'' اورنگزیب نے کہا۔

''شکریہ۔'' ڈاکٹر فاروق کی گلوخلاصی ہوگئی۔ تو وہ ایسا بھاگا کہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔

ادھر شاہ زیب ساری بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دفعتاً ہی وہ چونکا اور اس نے کہا۔

''ایک منٹ مجھے اٹھنے کی اجازت دیں۔''

''لیٹے رہو کیا پریشانی ہے تمہیں؟''

''نہیں ایک منٹ۔ ایک منٹ۔'' اور پھر دوسرے لمحے اسے اندازہ ہو گیا کہ زمینوں کی دستاویزات غائب ہیں۔ اس کے چہرے پر نفرت اور جنون کے آثار ابھر آئے۔

''کیا ہوا، کیا بات ہے؟'' جہاں زیب نے پوچھا اور شاہ زیب نے تیکھی نگاہوں سے جہاں زیب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھائی جان! کیا آپ نہیں جانتے کیا ہو گیا ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''میری زمین کے کاغذات گم ہو گئے ہیں۔ وہ دستاویزات جسے میں بینک کے لاکر میں محفوظ کرنے کے لیے آپ سے لے کر آیا تھا۔ اب میرے پاس موجود نہیں ہیں۔''

''کیا؟''

''جی۔'' شاہ زیب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ اورنگزیب کا منہ بھی حیرت سے کھل گیا تھا۔ اس موقع پر شاہینہ بیگم نے آگے بڑھ کر کہا۔

''اچھا ڈرامہ کھیل رہے ہو شاہ زیب۔ کہنا کیا چاہتے ہو تم؟ کیا جہاں زیب نے تمہیں زخمی کر کے وہ دستاویزات حاصل کر لی ہیں؟'' شاہ زیب نے شاہینہ کا چہرہ دیکھا اور کہا۔

''بھائی صاحبہ! آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ میں نے ہمیشہ آپ کی عزت بڑی بہن کی مانند کی ہے اور آپ اب بھی میری بڑی بہن کی مانند ہی ہیں لیکن آپ جو انداز اختیار کر رہی ہیں اس پر ذرا خود ہی غور کر لیجئے۔ آپ کے خیال میں اپنے جسم اور اپنے سر پر یہ زخم میں نے خود لگائے ہیں۔''

''نہیں۔ میں یہ کب کہہ رہی ہوں۔''

''تو پھر آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''وہی جو تمہارے ذہن میں ہے۔'' شاہینہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''کیا ہے میرے ذہن میں؟''

''تم یہی سمجھ رہے ہو نا کہ دستاویز کا حاصل کرنا تمہارے دونوں بھائیوں کو پسند نہیں آیا اور جہاں زیب یا اورنگزیب نے یہ ساری کارروائی کی ہے۔''

''اورنگزیب یا جہاں زیب یہ کارروائی کرتے تو محترمہ بھابی جان! انہیں باہر سے آدمی بلانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ جیسا کہ میرے علم میں لایا گیا ہے کہ ڈاکو باہر سے آئے تھے۔ سمجھ رہی ہیں آپ کہ یہ ڈاکو کون ہو سکتے ہیں؟''

''کون ہو سکتے ہیں؟'' شاہینہ غرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''یہ پولیس آپ کو جواب دے گی سمجھیں آپ۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''یہ کیا کہہ رہا ہے اور اس کا لہجہ کیسا ہے؟ آپ سن رہے ہیں، دیکھ رہے ہیں اور خاموش ہیں۔'' شاہینہ نے جہاں زیب کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اس کی حالت دیکھ رہی ہیں آپ' کیا اس وقت ان باتوں کی گنجائش ہے۔''

جہاں زیب بہر حال بھائی تھا اور اس وقت بھائی کی کیفیت دیکھ کر بہت زیادہ متاثر تھا۔ شاہینہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔ شکیلہ نے کہا۔

''سنئے۔ اگر میری مانیں تو اسے ذرا سا ہلدی ملا دودھ پلا دیا جائے۔''

''کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔ یہ دور ایسی بے وقوفی کی چیزوں کا نہیں ہے۔ ڈاکٹر انجکشن دے کر گیا ہے۔ شاہ زیب تم سو جاؤ بیٹے! تھوڑی دیر۔ اس کے بعد تمہیں ساری باتوں کی چھان بین کرنے کی اجازت ہو گی۔''

''نہیں۔ میں ٹھیک ہوں بھائی جان! بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ لیکن براہ کرم مجھ سے میرے وہ حقوق نہ چھینیں جو مجھے ادا کرنے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سازش صرف اور صرف ان دونوں نے کی ہے۔ انہوں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ میں ان دونوں کے خلاف یہ کارروائی کیے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔'' جہاں زیب اور اورنگزیب جانتے تھے کہ یہ اشارہ کس کی جانب ہے۔ دونوں ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئے تھے۔

☆☆☆☆

شاہ زیب کو اپنی چوٹوں کا احساس تھا۔ اچانک ہی اسے یہ احساس بھی ہوا تھا کہ اس وقت اس کی کیفیت بڑی مخدوش ہے۔ لاہور سے آتے ہوئے دل و دماغ پر ایک عجیب سا بوجھ طاری تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اب اس کے لیے کبیر والا میں کچھ بھی نہیں ہے۔ حویلی میں جو لوگ رہتے ہیں وہ صرف روایتی رشتوں کے حامل ہیں۔ اس دوران کسی نے بھی اس سے رغبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کہیں سے بھی بے چینی کا مظاہرہ نہیں ہوا تھا۔ کسی نے نہیں کہا تھا کہ تیئس (23) مارچ کی چھٹی میں ایک دن کے لیے ہی آ جاؤ۔ فاصلہ ہی کتنا ہے لاہور اور کبیر والا کا۔ ایک دن رہ کر واپس چلے جانا۔ یہ تو جب تک ماں زندہ تھی اس قسم کی کہانیاں ہوتی رہتی تھیں لیکن بہرحال رسم نبھانے کے لیے آ گیا تھا۔ پھر بھی اپنا خون تھے لیکن یہاں آ کر اسے لگ رہا تھا کہ اس نے غلطی کی۔ ممنون اسے دعوت دے رہا تھا کہ اس بار میرے ساتھ رانی پور چلے۔ اور وہاں عید منائیں لیکن کیسی عید اور کہاں کی عید۔ تنہا لوگوں کی عید کہاں ہوتی ہے۔ یہاں آنے کے بعد جن انوکھے واقعات سے سابقہ پڑا تھا۔ انہوں نے دل و دماغ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری کر دی تھی۔ اور اب یہ حادثہ ہوا تھا۔ زمینوں کی دستاویزات چوری ہو گئیں تھیں۔ وہ خود بھی عقل دوڑا سکتا تھا۔ اب اس قدر بے وقوف بھی نہیں تھا کہ اتنی سی بات نہ سمجھ سکے۔ گھر کے لوگ یہ سب کچھ نہیں کر سکتے تھے لیکن شاہینہ جیسی سخت مزاج خاتون ایسا کر سکتی ہیں۔ بھائیوں کو انہوں نے پوری پوری مدد دی ہو گی اور جہاں تک رہا جہاں زیب کا معاملہ تو جہاں زیب تو صرف ایک ڈمی تھا بے شک وہ شاہ زیب کا بڑا بھائی تھا لیکن درجنوں بار شاہ زیب نے یہ دیکھا اور محسوس کیا تھا کہ ہوا کا رخ اس طرف ہوتا ہے جدھر شاہینہ بھابی اشارہ کر دے۔ بات رہی اورنگزیب کی تو وہ بے چارہ شروع ہی سے دبا اور ڈھکا رہا تھا۔ شکیلہ بیگم کی بھی بڑی بھابی سے خوب چھنتی تھی۔ ہر چند کہ شکیلہ بیگم تھوڑی سی سادہ لوح اور نرم مزاج کی مالک تھیں لیکن یہ دونوں میاں بیوی شاہینہ بیگم کی ٹرانس میں تھے۔

اور ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرتے تھے۔ ایسے حالات میں کسی سے کسی مدد کی توقع شاہ زیب کو حماقت معلوم ہوتی تھی۔ وہ بھی اسی خاندان کا ایک فرد تھا لیکن اس کے بدن میں خون کی روانی تیز تھی اور حدت بھی زیادہ تھی۔ زمینوں کے مسئلے میں اس نے اپنی ماں سے جو وعدہ کیا تھا اب ان حادثات کے بعد اس کے دل و دماغ میں یہ جنون اور بھی شدت اختیار کر گیا تھا اور اس نے ان رکاوٹوں کو اپنے لیے ایک چیلنج تصور کیا تھا۔ لیکن عقل و دانش کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینے کا مطلب یہ تھا کہ کام ادھورا رہ جائے۔ چنانچہ غور کرنا تھا' سوچنا سمجھنا تھا۔ دستاویزات چوری ہو گئی تھیں اور وہ لازمی طور پر اب اس سلسلے میں کوئی ردعمل کریں گے۔ یہ ساری سوچیں شاہ زیب کے ذہن میں تھیں۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ ذرا ٹھنڈے دل سے کام لینا ہو گا۔ رات گزر گئی۔ دوسری صبح شکیلہ بیگم ہی اس سے اس کی خیریت معلوم کرنے آئی تھی۔

''جاگ گئے ہو چھوٹے بھیا! دودھ آ گیا ہے تمہارے لیے رات کو تو مجھے ڈانٹ دیا گیا کہ ہلدی ملا دودھ نہ پلاؤں۔ چوٹوں کی کسک جاتی رہتی۔''

''تو اب پلا دیں بھابی جی!'' شاہ زیب نے کہا۔

''کیوں پٹواؤ گے مجھے۔ تمہیں پتہ ہے کہ یہاں کا کیا حال ہے۔ کسی کو کانوں کان بھی خبر ہو گئی تو شامت آ جائے گی میری۔''

''خیر خبر تو کسی کو نہیں ہو گی لیکن چھوڑیں۔ اب ٹھیک ہوں آپ کی دعاؤں سے۔''

''مگر یہ ہوا کیا ہے؟''

''کچھ نہیں کہا جا سکتا بھابی جی! میرا ذہن تو الیاس خاں اور جبار خاں کی طرف ہی جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے مجھے غلط فہمی ہی ہوئی ہو۔''

''ایسی بات ہو نہیں سکتی۔ وہ بھی چوہدری ہیں۔ عزت والے ہیں۔ ان کی بہن

یہاں اس حویلی میں ہے۔ بہن کے گھر میں ایسا کام کریں گے نہیں۔''

''تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کون لوگ ہو سکتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ لوگ زمین کے کاغذات لے گئے ہیں۔ بس اس سے بھی شبہ ہوتا ہے''

''بھیا! بعض اوقات ہوتا ہے کہ انسانی ذہن کچھ اور سوچ رہا ہو اور اصلیت کچھ اور ہو۔''

''ہاں۔ اس بات کی گنجائش تو ہے۔''

''میری مانو تو اتنا بگاڑ مت کرو۔ جو ہو گا وہ دیکھا جائے گا۔'' شاہ زیب پر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا تھا۔ پھر اس نے دودھ کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

''اب مجھے بیمار نہ بنائیں بھابی جی! تھوڑی بہت چوٹیں ہیں ٹھیک ہو جائیں گی۔ کچھ کھانے پینے کو دیں۔'' شاہ زیب کا رویہ نارمل دیکھ کر شکیلہ بیگم کو بھی خوشی ہوئی تھی۔ کہنے لگیں۔

''میں جاتی ہوں ناشتے کا انتظام کرتی ہوں۔'' باہر جہاں زیب اور شاہینہ بیگم کے ساتھ ساتھ اورنگزیب بھی ان کا منتظر تھا۔ تینوں متجسس انداز میں شکیلہ بیگم کو دیکھنے لگے۔

''ہاں' کیا کیفیت ہے؟''

''اس وقت تو بالکل ٹھیک ہیں۔'' شکیلہ بیگم نے جو باتیں ان دونوں کے درمیان ہوئیں تھیں وہ انہیں بتا دیں۔

''ہوں۔ ٹھیک رہے تو اچھا ہے ورنہ خواہ مخواہ مصیبتیں اپنے سر لے گا۔'' شاہینہ نے کہا۔

''جاؤ۔ تم اسے ناشتہ دو۔'' اورنگزیب نے بیوی کو حکم دیا اور شکیلہ ناشتہ لینے چلی گئی۔ شاہ زیب نے اپنے رویے کو مزید بہتر کیا۔ اپنے منصوبے کو وہ مستحکم کرنا چاہتا تھا۔

شاہینہ نے رات نے کھانے پر اس سے کہا۔

''ہو شاہ زیب تمہارے ذہن سے یہ خیال ٹلا کہ تمہارے ساتھ یہ سختی میرے بھائیوں نے کی ہے۔''

''شاہینہ بھابی! میری ان سے کوئی دشمنی تو نہیں تھی۔ زمینوں کا معاملہ تھا اور بات صرف اتنی سی تھی کہ مرحومہ ماں سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا چاہتا تھا۔ بس اور کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اگر اتنی سی بات پہ میرے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا تھا تو وہ تو غلط ہے غصہ مجھے بھی آنا چاہیے تھا۔''

''ٹھیک کہتے ہو لیکن میں تمہیں پہلی بات یہ بتاؤں کہ اس دور میں لوگ زندوں سے کیے ہوئے وعدے پورے نہیں کرتے۔ مردے سے کیے وعدے کی کیا حیثیت ہے۔ دوسری بات یہ کہ جہاں تک الیاس خاں اور جبار خاں کا معاملہ ہے تو وہ ایسے چھوٹے موٹے کاموں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔ اگر میری مانو تو زمین کا وہ ٹکڑا تم خود انہیں پیش کر دو۔ تم دیکھنا اس کے بدلے تمہیں کیا کچھ مل جاتا ہے۔ اصل میں یہ چوہدری جو ہوتے ہیں نا۔ یہ بھی بس اپنے دوسرے معاملات سے فراغت حاصل کرنے کے بعد دشمنی کی کاشت کرتے ہیں۔ دشمنی کی فصلیں اگاتے ہیں۔ یہ کھیل ان کا پسندیدہ کھیل ہوتا ہے۔ ان سے کون نمٹے بھائی۔'' شاہ زیب خاموش ہو گیا تھا۔ اندر ہی اندر اس کا خون کھول رہا تھا۔ شاہینہ بیگم اپنے بھائیوں کی وکالت کر رہی تھیں۔ شاہ زیب نے دل میں سوچا کہ بھابی جان! ذرا تھوڑا سا وقت گزر جانے دیجئے تو آپ کی ان باتوں کا تو ایسا جواب دوں گا کہ آپ بھی زندگی بھر یاد رکھیں گی۔ بہر حال بھائیوں کی طرف سے کوئی خاص امید نہیں تھی۔ جہاں تک زمینوں کا معاملہ تھا تو اب تو یہ بھی اس کی انا کا مسئلہ بن گیا تھا۔ ان لوگوں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کا اسے کوئی صحیح اندازہ نہیں تھا کہ آخر وہ چاہتے کیا تھے۔ اسے جس طرح پھنکوا دیا گیا

تھا وہ حیران کن بات تھی۔ کوئی بات عقل میں نہیں آتی تھی۔ بہر حال وقت گزاری کرنی تھی اور
ایک دن اس نے بھائیوں کو بھی باتیں کرتے سنا۔ جہاں زیب اور اورنگزیب ایک ایسی جگہ
بیٹھے ہوئے تھے جہاں سے ان کی باتیں سنی جا سکتی تھیں۔ شاہ زیب ٹہلتا ہوا اس جگہ نکل گیا
تھا۔ لیکن بھائیوں کی باتیں کانوں میں پڑیں۔ وہ چپ ہو گیا اس نے سنا اورنگزیب کہہ رہا تھا
۔ وہ تو ٹھیک ہے بھائی لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ جس طرح زمینوں کی دستاویز
چوری کی گئی ہیں۔ اس سے جبار خاں اور الیاس خاں کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ یہ تو بس ایک
طرح سے چیلنج کرنے والی بات ہے“

”اور تم کیا سمجھتے ہو یہ چیلنج ہی تو کیا گیا ہے کیونکہ بہر حال زمینوں پر قبضہ کرنے کے
لیے وہ لوگ سامنے تو آئیں گے ناں۔ بس یہ بتایا گیا ہے کہ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔“

”اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“ اورنگزیب نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔

”تم ضرور کچھ کرو۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے
میں اس دشمنی سے گریز کروں گا۔ کیونکہ میں ان لوگوں کو زیادہ جانتا ہوں۔ اگر تم بہت زیادہ
دلیری کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ شاہ زیب کی مدد کرو۔ بلکہ اسے بھڑکاؤ کہ وہ
بندوق لے کر ان کے گھر چلا جائے اور فائرنگ کر کے سب کو ہلاک کر دے۔“

”آپ میری بات کا برا مان گئے بڑے بھائی!“

”یار! سمجھا رہا ہوں انہیں اور اسے بھی سمجھا رہا ہوں کہ بھائی زمین کا تھوڑا سا
حصہ دے دو۔ وہاں پر بھی ناک کا سوال پیدا ہو گیا ہے۔ فخر خان وہاں بھٹہ نہیں بننے دینا چاہتا
اور وہ زمینیں اس نے خریدی ہیں۔ جہاں یہ لوگ بھٹہ بنانا چاہتے تھے۔ اب یہ اتفاق ہے کہ
وہاں ہماری زمینیں بھی نکل آئیں۔ چھوٹی سی بات ہے جس کو بڑا بنانے کی کوشش کی جا رہی
ہے۔“

”نہیں میرا مطلب یہ تھوڑی ہے۔“

”تمہارا مطلب جو کوئی بھی ہے۔ میں تو تم سے یہی کہتا ہوں کہ اسے سمجھاؤ۔ اس
سے کہو کہ زندگی بہت خوبصورت چیز ہے۔ اسے کسی چھوٹی موٹی سی بات کے لیے ضائع نہیں
کر لینا چاہیے۔“

”تھوڑا سا انسان تو بن گیا ہے۔“

وہ انسان بنا ہے یا نہیں بنا لیکن تم کبھی انسان نہیں بنو گے۔ طوطے کی طرح دن
رات پڑھاتا ہوں تمہیں کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ ارے میرے پیارے بھائی
کبھی خود بھی اپنی عقل سے سوچ لیا کرو۔ اورنگزیب ہنسنے لگا تھا۔ لیکن شاہ زیب خون میں ایک
بار پھر حدت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ بھائی ہیں؟ لعنت ہے ایسے بھائیوں پر۔ ان کے ساتھ رہنا
سانپ کے بل میں رہنے کے مترادف ہے۔ نفرت کی ایک لہر شاہ زیب پورے وجود کو چاٹنے
لگی۔ اس نے سوچا کہ یہاں اس حویلی میں تو مصلحتاً بھی نہیں رہ جا سکتا۔ کچھ جذباتی باتیں
کرنے کو دل چاہتا تھا لیکن اُس نے خود کو باز رکھا۔ اور پھر اس رات وہ وہاں سے باہر نکل
آیا۔ سامان لینا ہی کیا تھا۔ دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ سیدھا رانی پور جاتا ہوں۔ اس بات کے
مکمل امکانات ہیں کہ ممنون وہیں مل جائے۔ ممنون کے گھر کا پتہ معلوم تھا گو کبھی رانی پور گیا
نہیں تھا لیکن ممنون کے گھر سے خطوط آتے جاتے رہتے تھے۔ وہ خود بھی کبھی کبھی خط بھیجتا
تھا۔ بہر حال ایسی جگہوں پر کسی کا گھر معلوم کر لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کبیر والا ریلوے
اسٹیشن پر ایک آدھ ہی ٹرین رکتی تھی۔ وہ قسمت آزمانے کے لیے چل پڑا تھا۔ چنانچہ تقدیر
نے اُس سنہری موقع دیا۔ ٹرین مل گئی اور اس کے بعد وہ رانی پور اتر گیا۔ صبح ہونے میں ابھی
دیر تھی اور قرب و جوار کا پورا ماحول سنسان پڑا ہوا تھا۔ اب رات کی گہری تاریکی میں کسی کا
گھر تلاش کرنا بھی مشکل تھا۔ ریلوے پلیٹ فارم پر ایک گوشے میں جا کر بیٹھ گیا۔ کمر ٹکانے

کے لیے جگہ مل گئی تھی۔ سر کا زخم ابھی خاصا ہرا تھا اور پٹی کسی ہوئی تھی۔ بے چارے ڈاکٹر صاحب اپنا کام بخیر وخوبی سرانجام دے رہے تھے۔ بھائیوں نے کم از کم اتنی ہی مہربانی کر ڈالی تھی کہ اسے ڈاکٹر کو دکھادیا تھا اور ڈاکٹر کو یہ نہیں بتایا تھا کہ انہیں اپنے چھوٹے بھائی سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ ریلوے پلیٹ فارم سنسان پڑا ہوا تھا۔ رات کے اس آخری پہر میں دو مرتبہ اس پر سے گاڑیاں گزری تھیں۔ پھر صبح کے آثار پھوٹنے لگے اور اکا دکا افراد چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔ چنانچہ وہ پلیٹ فارم سے باہر نکل آیا۔ ایک تانگے والے کو روک کر اس نے ممنون کے گھر کا پتہ بتایا تو تانگے والے نے واقف کاری کے انداز میں گردن ہلا کر کہا۔

''بیٹھ جاؤ باؤ جی۔'' تانگہ چل پڑا تھوڑی دیر بعد وہ اس علاقے میں پہنچ گیا۔ ممنون کا گھر خاصی کشادہ جگہ پر تھا۔ وہ نمبر سامنے کی دیوار پر لکھا ہوا تھا اور دروازہ بند تھا۔ تانگے والے کو پیسے دینے کے بعد شاہ زیب نے دروازہ کی کنڈی بجائی۔ چار جوڑے کپڑے اور دوسری ضروری چیزیں وہ اپنے ساتھ لے آیا تھا اور اس کے ہاتھ میں تھیلے کی شکل میں موجود تھیں۔ ایک بزرگ نے دروازہ کھولا تھا اور حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی۔ کیا بات ہے بھائی؟''

''ممنون یہاں رہتے ہیں۔'' شاہ زیب نے سلام کرنے کے بعد کہا۔

''ہاں۔''

''لاہور چلے گئے یا ابھی یہیں ہیں؟''

''نہیں ابھی ہیں مگر آپ کون ہیں؟''

''میں ان کے ساتھ زرعی کالج میں پڑھتا ہوں۔ میرا نام شاہ زیب ہے۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی محترم ذرا ممنون کو بتا دیجئے میرے بارے میں۔''

''آ جاؤ اندر آ جاؤ۔ آ جاؤ۔'' انہوں نے کہا اور اسے ساتھ لیے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ باہر سے عام سا نظر آنے والا یہ مکان اندر سے خاصا کشادہ اور سلیقے سے بنا ہوا تھا۔ رائی پور کی بھی اپنی ایک تاریخ تھی۔ جس کے بارے میں کئی بار اسے ممنون نے بتایا تھا۔ بزرگ اسے لیے ہوئے ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ جو اصل مکان سے الگ تھلگ بنا ہوا تھا اور شاید مہمان خانہ تھا۔ اس کے آگے بہت سے درخت لگے ہوئے تھے وہاں کی فضا بے حد خوشگوار تھی۔ بزرگ نے کہا۔

''وہ سامنے غسل خانہ ہے۔ منہ ہاتھ دھولو میں ابھی ممنون کو بھی بلا کر لاتا ہوں۔ چائے کا وقت بھی ہو گیا ہے ناشتہ ذرا دیر سے ملے گا۔ ویسے میں ممنون کا والد ہوں۔''

''جی۔'' شاہ زیب نے ممنونیت سے کہا اور پھر وہ چلے گئے۔ شاہ زیب کو اپنا یہ فیصلہ بہت مناسب معلوم ہو رہا تھا۔ پھر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ممنون دوڑتا ہوا ہی آیا تھا۔ اور دیکھے بھالے بغیر شاہ زیب سے لپٹ گیا تھا۔

''یار! میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ میں نے تو خود تم سے کہا تھا کہ اب کے میرے ساتھ رائی پور چلو۔ ارے یہ کیا ہوا۔ یہ کیا ہے۔ ارے باپ رے۔ او بھائی کوئی چکر چل گیا ہے کیا؟''

''ہاں۔ اور میرا خیال ہے میرے ساتھ تم بھی مشکل میں پھنس جاؤ گے۔''

''ہیں۔ ارے خیریت تو ہے؟''

''گھبرا گئے۔'' شاہ زیب نے ہنس کر کہا۔

''یہ بتاؤ تم خیریت سے ہو۔ یہ تو زخم ہے اچھا خاصا۔''

''ہاں ہاں اور مصیبت بھی اچھی خاصی ہی ہے۔''

''خیر اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میرے گھبرانے کی وجہ یہ ہے کہ میں خود بھی تمہارے ساتھ

کسی مشکل میں پھنس جاؤں گا تو اس خیال کو اپنے دل سے نکال دو۔ یار! میں اچھے دوستوں میں سے ہوں۔ ساتھ دینے والوں میں سے۔ اگر کسی مشکل میں پھنستا ہوں تو خوشی سے اس مشکل میں پھنسنے کے لیے تیار رہوں۔ اچھا خیر ٹھہرو اباجی آتے ہوں گے۔ ناشتہ تیار کرا کرلا رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں صرف چائے سے کام نہیں چلے گا۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک سفر کر کے آیا ہے بے چارہ۔''

''ارے نہیں۔ ایسی بات نہیں تھی۔''

''نہیں تھی۔ انہیں کیا معلوم کہ ہم لوگوں کا چائے سے کتنا کام چلتا ہے۔ ہوٹل میں چائے کے علاوہ ہوتا ہی کیا ہے؟'' شاہ زیب ہنسنے لگا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد ممنون کے والد صاحب آ گئے۔ ساتھ میں ایک ملازم تھا جو ناشتے کی ٹرے اٹھائے ہوئے تھا۔

''او بیٹا! اس وقت جلدی جلدی میں یہی تیار ہو سکا ہے۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔ اب باقی تم جانو اور ممنون۔ ہم تھوڑی دیر کے بعد باہر نکل جائیں گے۔ پھر رات کو ہی تم سے ملاقات ہوگی ممنون! مہمان کو جانے مت دینا کیا سمجھے۔''

''نہیں اباجی! ابھی کہاں جا رہا ہے یہ۔ میرا بڑا اچھا دوست ہے اباجی! میں آپ سے تذکرہ کرتا رہا ہوں اس کا۔ شاہ زیب ہے اس کا نام۔''

''اوہو۔ وہ کبیر والا'' بزرگ نے کہا۔

''جی وہی۔''

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ اچھا بیٹے تم سے رات کو ملاقات ہوگی۔ میں اس وقت زمینوں پر چلا جاتا ہوں۔'' شاہ زیب نے گردن ہلا دی تھی۔ ممنون نے کہا۔

''یار شاہ زیب! بلاتکلف شروع ہو جاؤ۔ باقی ساری باتیں بعد میں کریں گے۔

شاہ زیب کو یہاں آ کر ایک دلی سکون کا احساس ہوا تھا۔ زندگی سے تھوڑی سی دلچسپی یہاں آ

کر محسوس ہونے لگی تھی۔ ورنہ یہ چند روز تو اس نے بڑی بے کسی اور مشکل کے عالم میں گزارے تھے۔ ناشتے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ممنون نے برتن ایک طرف ہٹائے اور شاہ زیب سے بولا۔

''اب تم یوں کرو کہ آرام سے دراز ہو جاؤ اس بستر پر اور مجھے تفصیل بتاؤ۔''

''یار! کیا تفصیل بتاؤں۔ بس یوں سمجھ لو کہ زندگی کی ڈور ایک دم سے الجھ گئی ہے۔''

''ایسی صورت میں اگر تم اپنے دوست پر بھروسہ کر لو تو میرے نمبر بن جائیں گے۔ کیا سمجھے۔'' ممنون نے ہنس کر کہا۔

''میں تمہیں کیا دے سکوں گا ممنون! میں تو خود اب ایک مشکل میں گرفتار انسان ہوں۔''

''ہوا کیا ہے تفصیل تو بتاؤ۔ لو یہ تکیہ رکھ لو۔ آرام سے اور ہاں سر میں کتنی چوٹ ہے؟''

''نہیں اب ٹھیک ہوں۔ پہلے کافی چوٹیں تھیں۔ بدن پر بھی تھیں لیکن اللہ کا فضل ہے اب کافی ٹھیک ہے سب کچھ۔''

''ہوا کیا؟ اور یہ چوٹیں کیسے آئیں؟ میں تو یہ سب کچھ جاننے کے لیے بے چین ہوں۔ یقین کرو اتفاق ہی ہے کہ عید کی چھٹیاں اتنی لمبی ہو گئیں۔ اباجی کے کچھ ایسے مسائل تھے جن کے لیے انہیں ملتان جانا تھا وہ ملتان چلے گئے اور مجھ سے یہ کہہ گئے کہ جب تک واپس نہ آئیں میں یہاں رکوں۔ کل ہی واپس آئے ہیں اور پرسوں میرا یہاں سے لاہور جانے کا ارادہ تھا۔ چلو اب تم بتاؤ ہوا کیا؟ میں جس قدر بے چین ہوں تمہاری باتیں جاننے کے لیے تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' ممنون بولا اور شاہ زیب کے چہرے پر غم کے تاثرات ابھر

آئے۔ اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

''بس یار ایک دشمنی چل گئی ہے لیکن غم کی بات یہ ہے کہ دشمن بھی وہ ہیں جو اپنا خون ہیں۔ یہی بات ہے کہ اصل دشمن وہی ہیں ورنہ باہر کے دشمن سے تو مل کر نمٹا جاتا ہے اور اگر اصل دشمن گھر میں موجود ہوں تو باہر کے دشمن بھی زیادہ طاقتور ہو جاتے ہیں۔''

''اصل دشمن۔''

''ہاں۔''

''کون؟''

''میرے بھائی۔''

''اوہ بھائی۔'' ممنون کی افسوس بھری آواز ابھری۔

''ہاں۔ میرے دوست بھائیوں سے دلبرداشتہ ہو کر دوست کی آغوش میں پناہ لی ہے۔ گھبرا مت دوستی کا بھرم رکھ لینا ورنہ اندر سے بالکل تنہا ہو جاؤں گا۔'' ممنون کی آنکھوں میں ایک دم آنسوؤں کی نمی آ گئی۔ اس نے کہا۔

''اپنے لیے دعا کر رہا ہوں کہ دوستی کے امتحان میں پورا اتروں۔ تم سے کیا کہوں۔'' شاہ زیب نے ممنون کا شانہ تھپتھپایا اور کہا۔

''کیا ہم لوگ فلمی ڈائیلاگ نہیں بول رہے، ویسے یہ ڈائیلاگ ضرور کسی فلم میں لکھے گئے ہوں گے اور اگر نہیں لکھے گئے تو کسی معروف ادیب کو ہم یہ ضرور بتائیں گے۔''

''اب بھی نہیں بتاؤ گے کہ ہوا کیا ہے؟''

''ہاں۔ وہ جو زر زن زمین کا کھیل ہے نا وہ ایک بار پھر سے تازہ ہو گیا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ ریت کے ایک بگولے کی مانند یہ کھیل میری جانب بڑھا ہے اور میں اس وقت ایک بگولے میں ہوں۔ اصل میں والد کی چھوڑی ہوئی زمین کو ماں نے اپنی زندگی میں ہی

تقسیم کر دیا تھا۔ سب سے بڑے بھائی نے ماں سے جو کچھ مانگا وہ انہیں دے دیا گیا۔ دوسرے بھائی نے جو کچھ مانگا اسے مل گیا۔ جب ماں نے یہ زمین تقسیم کی تھی تو ہم تینوں بھائی ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ بھائیوں کی مانگ پر ماں نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی دیکھو تم تینوں میرے لیے ایک جیسے ہو۔ جو کچھ جہاں زیب اور اورنگزیب نے مانگا ہے۔ شاہ زیب تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''اماں! آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ آپ نے جو کچھ مجھے دیا ہے میں بڑی خوشی سے ان دونوں بھائیوں کے حوالے کرتا ہوں۔ باپ کی موت کے بعد یہی تو میرے سرپرست ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی رکھے۔ مجھے کیا ضرورت ہے زمینوں کی اس تقسیم کی۔ آپ بڑے شوق سے انہیں ان کے حوالے کر دیجیے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بس ان سے اتنا کہہ دیجیے کہ یہ اپنا سایہ ہمیشہ میرے سر پر رکھیں۔'' ماں نے طرف بھائیوں کی طرف نگاہیں بھر کر دیکھا تھا۔ دونوں نے یک زبان ہو کر کہا تھا۔

''ہم تینوں مل کر ایک ہوتے ہیں اماں! آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں جہاں تک زمینوں کا مسئلہ ہے۔ اس کے لیے زمین تینوں بھائیوں میں تقسیم کر دیں کہ بعد میں ہماری اولادوں کے درمیان تنازعہ نہ ہو۔''

''ہاں میں بھی یہی ضروری سمجھتی ہوں۔''

جو زمینیں مجھے دی گئی تھیں وہ بنجر تھیں اور آباد نہیں ہوئی تھیں۔ حالانکہ ہم انہیں بنجر اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ کبھی انہیں ٹھیک کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی تھی۔ بہرحال کچھ اور ٹکڑے بھی تھے جو ان بنجر زمینوں کے ساتھ مجھے دے دیے گئے تھے اور بھائیوں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ مجھے تو ان کی پرواہ ہی نہیں تھی لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہی میں نے

محسوس کیا تھا کہ بھائیوں میں کچھ بددیانتی پائی جاتی ہے جہاں سے بھی میرے کچھ مفادات ہوسکتے تھے۔ میری لاپروائی سے انہوں نے انہیں اپنے حق میں کرلیا تھا۔ کتنی ہی بار میں نے یہ بات محسوس کی تھی لیکن اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ میرے اخراجات پورے ہو رہے تھے۔ ماں کا انتقال ہوا تو مجھ پر جو کیفیت گزری خود تمہیں بھی اس کا اندازہ ہے۔ اس کے بعد جو مزید مجھ پر دکھ کے دن گزرے وہ بھائیوں کی لاپروائی سے تھے۔ بھابیاں تو خیر غیر ہوتی ہیں۔ اگر ساتھ دے جائیں تو تقدیر کی بات ہے۔ ورنہ غیر تو غیر ہی ہوتا ہے۔ خاص طور سے شاہینہ بھابی کو میں نے شروع ہی سے محسوس کیا تھا۔ اماں کی زندگی میں بھی شاہینہ بھابی کے کچھ ایسے روپ سامنے آئے تھے۔ جس سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہم میں سے کسی کو اپنا نہیں سمجھتی بلکہ ان کے دونوں بھائی چوہدری جبار خاں اور چوہدری الیاس خاں اپنے علاقے کے نامی گرامی غنڈے ہیں۔ یہ بات پہلے بھی ہمیں معلوم تھی لیکن اللہ بھلا کرے والد صاحب کا جنہوں نے دوستی نبھائی۔

''دوستی؟'' ممنون نے چونک کر پوچھا۔

جبار خاں اور الیاس خاں کے والد صاحب سے ہمارے والد صاحب کی دوستی تھی اور کسی زمانے میں والد صاحب نے جذباتی لہجے میں کہا تھا کہ جمیل خاں تیری ایک بیٹی کو میں لے جاؤں گا۔ بیٹی ہی ایک تھی اور وہ شاہینہ بھابی تھیں۔ اب ان پرانے لوگوں کے مسئلے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ یہ بات والد صاحب کے علم میں بھی آچکی تھی کہ جبار خاں اور الیاس خاں بہت سے ایسے معاملات میں ملوث رہے ہیں جو انہیں غنڈا ثابت کرتے ہیں۔ مگر ایک بار تو انہوں نے ایک گاؤں میں ڈاکہ ڈال کر وہاں کے چوہدری کو بھی قتل کر دیا تھا اور اس کا سارا ساز و سامان لوٹ لیا تھا۔ بعد میں ڈاکے اور قتل کے سلسلے میں ان پر مقدمہ بھی چلا۔ مگر انہوں نے اپنے تعلقات سے کام لے کر سارے کیس الٹے کر دیئے اور مقدمہ ختم ہوگیا۔ یہ ساری

باتیں والد صاحب کو اپنی زندگی میں ہی معلوم ہو چکی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے قول نبھایا اور شاہینہ بھابی کو بہو بنا کر لے آئے۔ بہر حال یہ سارے چکر ان کی اپنی زندگی کے ساتھ تھے۔ یہ بزرگ لوگ بعض اوقات اپنی انا کے لیے اپنی اولادوں کی زندگی برباد کر جاتے ہیں۔ بھائی جہاں زیب موم کا ڈھیر ہیں جیسی شکل بنانی چاہی بن گئی۔ پتہ نہیں یار یہ مرد عورتوں سے کیوں ڈرنے لگتے ہیں۔ بے شمار افراد کے بارے میں یہ سنا ہے کہ اپنی بیویوں سے ڈرتے ہیں۔ اب کیوں ڈرتے ہیں یہ وہ جانیں اور اللہ جانے۔ کوئی خفیہ ہی مسئلہ ہوسکتا ہے ورنہ بیویوں سے ڈرنے والوں کا ڈر تو آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ٹھیک ہے وہ بیوی ہے۔ تمہاری ہر طرح سے ساتھی ہے۔ تمہارے بچوں کی ماں ہے۔ تمہارے رازوں کی امین ہے لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود وہ ایک اچھی دوست تو ہوسکتی ہے۔ باقی اس سے ڈرنے کی کیا وجہ یہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''ایک بات بتاؤ شاہ زیب! تم اپنی بیوی سے نہیں ڈرو گے۔ حالانکہ اس سلسلے میں ایک بڑا اچھا لطیفہ سنا ہے میں نے۔ معاف کرنا تمہارے ذہن پر بار ہے اور میں لطیفے کی بات کررہا ہوں۔''

''نہیں یار! سناؤ تم لطیفہ۔ میں اپنے ذہن کے اس بار کو ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔''

''کوئی تقریب تھی۔ بے شمار مہمان شریک تھے۔ صاحب خانہ کو تھوڑی سی تفریح سوجھی اس نے کہا کہ خواتین و حضرات ایک دلچسپ کھیل کھیلتے ہیں اور وہ کھیل یہ ہے کہ جتنے حضرات اپنی بیگمات سے ڈرتے ہیں وہ اس گوشے میں جا کر کھڑے ہو جائیں اور جو نہ ڈرتے ہوں وہ اس طرف آجائیں۔ تقریباً سارا مجمع اس طرف جا کر کھڑا ہوگیا جہاں بیوی سے ڈرنے والے کھڑے تھے۔ صرف ایک صاحب دوسرے حصے میں جا کر کھڑے ہوگئے۔ لوگوں کو ان سے بڑی دلچسپی پیدا ہوئی۔ چند افراد نے ان سے انٹرویو کرتے ہوئے

کہا۔

''کمال کی شخصیت ہے آپ کی۔ کیا آپ اپنی بیگم سے نہیں ڈرتے لیکن وہ کیا وجوہات ہیں جن کی بنا پر آپ اپنی بیگم سے نہیں ڈرتے۔'' وہ صاحب جو برا سامنہ بنا کر کھڑے تھے مزید برا منہ بنا کر بولے۔

''بکواس مت کرو۔ میری بیوی نے ہی کہا تھا کہ ادھر جا کر کھڑے ہو جاؤ۔''

''ہاں۔ لطیفہ تو لطیفہ ہی ہوتا ہے اگر مجھے کبھی موقع ملا تو میں بتاؤں گا کہ بیوی سے کیسے ڈرا جاتا ہے اور کیوں ڈرا جاتا ہے؟ تو بات ہو رہی تھی بھائی جہاں زیب کی اور اورنگزیب کی۔ نام تو اتنے بڑے بڑے ہیں لیکن بیگمات کے سامنے بھیگے ہوئے چوہے بنے ہوتے ہیں۔ خیر میں اس بار جب گھر پہنچا تو حالات معمول کے مطابق تھے۔ وہ لوگ عید منا رہے تھے۔ میں بس یوں سمجھ لو کہ زبردستی ان کی خوشیوں میں شریک ہو گیا تھا ورنہ وہ چاہت کہیں بھی موجود نہیں تھی جو ماں کی زندگی میں ہوا کرتی تھی۔ اس کے بعد ایک نیا سلسلہ سامنے آیا۔ چوہدری برادران یعنی جبار خاں اور الیاس خاں ایک اینٹوں کا بھٹہ بنانا چاہتے تھے۔ حالانکہ انہیں اس کی ضرورت نہیں ہے بہت کچھ ہے ان کے پاس۔ لیکن جس زمین پر وہ بھٹہ بنانا چاہتے تھے وہ فخر خان نامی ایک زمیندار کی زمین تھی بلکہ یہ کہیے کہ جب اس زمیندار کو یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ لوگ وہاں بھٹہ بنانا چاہتے ہیں تو اس نے یہ زمین خرید لی اور وہ لوگ بھٹہ بنانے سے محروم ہو گئے۔ فخر خان بھی بہت بڑا زمیندار ہے۔ اس نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ اتفاق کی بات ہے کہ میری وہ بنجر زمینیں فخر خان کی زمین کے پاس ہی ہے۔ چنانچہ وہاں بھٹہ نہ بنانے کے بعد ان لوگوں نے اس طرف بھٹہ بنانے کے بارے میں سوچا۔ بات وہی فخر خان سے چل جانے کی تھی۔ میری ان زمینوں کو انہوں نے مجھ سے مانگا۔ میرا مطلب ہے کہ بھائی جان سے کہا کہ یہ زمینیں ہمیں دے دی جائیں لیکن یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ جب

ماں زمینیں تقسیم کر رہی تھی اور وہ زمین ان دونوں بھائیوں نے میرے لیے چھوڑ دی تھی جو غیر آباد تھی۔ تو ماں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا کہ بیٹا! ان زمینوں میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ان سے شاہ زیب کو کیا فائدہ ہوگا۔ تو میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا کہ اماں! آپ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان زمینوں کو علاقے کی سب سے اچھی زمین نہ بنا دوں تو میرا نام بھی شاہ زیب نہیں ہے۔ یہ بات ایک چیلنج بن گئی تھی اور اسی چیلنج کی وجہ سے میں نے زرعی یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا اور اب جب میں اپنی زمینوں کے بارے میں ایک اچھا منصوبہ ذہن میں رکھ کر گھر واپس پہنچا تھا تو انہوں نے یہ نئی بیخ لگا دی تھی۔ میں نے صاف انکار کر دیا اور میں نے کہا کہ وہ زمین میں نہیں دے سکتا۔ بس اس کے بعد گھر میں ایک ہنگامہ آرائی چل گئی اور اس کے بعد مجھے اغوا کر کے ایک جگہ پھینک دیا گیا۔ اغوا کرنے سے پہلے مجھے اچھی طرح زخمی کر دیا گیا تھا۔ ہمارا ایک ملازم چوکیدار گل جلال مجھے واپس کوٹھی لے آیا۔ بھائیوں نے میرا علاج وغیرہ کرایا۔ وہ دستاویزات جو میری زمین سے متعلق تھیں اور جب میں نے یہ دیکھا کہ وہ لوگ زمین کے چکر میں پڑ گئے ہیں تو میں نے انہیں حاصل کر لیا تھا۔ وہ چوری ہو گئیں اور کچھ عجیب سا کھیلا ہو گیا گھر میں۔ مجھے پوری پوری امید ہے کہ جبار خاں اور الیاس خاں نے میرے لیے یہ سازش کی تھی لیکن بہت سی باتیں میرے لیے الجھنوں کا باعث بن گئیں۔ دستاویزات کی چوری کر لینے سے وہ زمینیں ان کی ملکیت تو نہیں بن جاتیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی انہوں نے مجھے زخمی کر کے باہر پھنکوا دیا۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ مجھے گولی مار دی جاتی یا مجھے قتل کر دیا جاتا۔ کسی طرح سے کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ بہرحال اس کے بعد چند روز میں نے خاموشی سے گزارے اور وہ بھی اس لیے کہ ذرا سے ہاتھ پاؤں درست ہو جائیں اور اس کے بعد میں تمہارے پاس چلا آیا ہوں۔''

''ہوں۔ یہ بات ہے۔ بہت ہی افسوس ہوا مجھے یہ تمہاری کہانی سن کر۔ زرزن''

زمین کا سلسلہ جس نے بھی اس شکل میں پیش کیا ہے۔ اس کا تجربہ بے حد وسیع ہوگا۔ یہ سب کچھ واقعی ہوتا ہے۔''

''چھوڑ ان باتوں کو ممنون! میں تمہارے پاس اس لیے آیا ہوں کہ تم مجھے مشورہ دو۔ دیکھو برا مت ماننا میں بالکل یہ نہیں چاہتا کہ میری دشمنی کسی اور تک منتقل ہو سکے۔ یہ بات اب میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ الیاس خاں اور جبار خاں سے میرا زبردست معرکہ رہے گا۔ ان دستاویزات کے چوری ہونے کے بعد وہ لوگ زمینوں پر قبضہ تو نہیں کر سکتے باقی ساری باتیں اپنی جگہ ہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔''

''خیر چھوڑو ان باتوں کو میں یہاں کچھ وقت گزاروں گا اور اس کے بعد میں یہ سوچ رہا ہوں کہ لاہور جا کر کوئی کارروائی کی جائے۔''

''تم ابراہیم کو تو جانتے ہو نا؟''

''ظفر ابراہیم؟''

''ہاں اسی کی بات کر رہا ہوں۔ جو اپنے باپ کا نام پہلے لگاتا ہے اور اپنا نام بعد میں۔ حالانکہ عام طور سے لوگ اپنے نام کے ساتھ باپ کا نام استعمال کرتے ہیں لیکن وہ الٹا ہے۔''

''اس کی تو خیر ہر بات ہی الٹی ہے لیکن تم اس کا نام کیوں لے رہے ہو؟''

''ظفر صاحب ایڈووکیٹ ہیں اور اچھے نامی گرامی ہیں۔ ہم ابراہیم کے ذریعے ان سے ملاقات کریں گے اور اس سلسلے میں مناسب مشورہ لیں گے۔''

''اسی لیے تو تمہارے پاس آیا ہوں کہ تم سے کوئی اچھا آئیڈیا ملے۔''

''ہاں پھر ایسا کرتے ہیں پرسوں چلتے ہیں لیکن تم اپنے زخم کے بارے میں بتاؤ اور

یہ بھی بتاؤ کہ تمہاری گمشدگی سے تمہارے بھائیوں کی کیفیت کیا ہوگی؟''

''چھوڑو یار! کون بھائی' کیسے بھائی؟ بس اس دنیا سے ایک دم سے نفرت ہوگئی ہے۔ کوئی کسی کا نہیں ہے۔ کیا فائدہ اس طرح سے سوچنے سے۔''

''خیر یہ بعد کی بات ہے۔ پرسوں چل رہے ہیں۔ اب تم ایسا کرو آرام سے سو جاؤ۔ اس بات پر میں تمہارا شکرگزار ہوں کہ تم ادھر چلے آئے اور تم نے مجھے اس قابل سمجھا۔'' ممنون نے کہا۔

''شکریہ تمہارا ہے دوست۔ اچھے وقت میں تو ہر کوئی ایک دوسرے کا ساتھ دے سکتا ہے لیکن میں برے وقت میں تمہارے پاس آیا ہوں۔'' شاہ زیب نے کہا اور ممنون اس کا شانہ تھپتھپانے لگا۔

☆☆☆

حیرانی سب کو تھی اور سب اپنے اپنے طور پر اس سلسلے میں تبصرے کر رہے تھے۔ شکیلہ نے تو یہ بھی کہا تھا کہ ممکن ہے دشمنوں نے شاہ زیب کو دوبارہ اغوا کر لیا ہو لیکن گل جلال نے اس کی تردید کی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

''بیگم صاحب! خدا کی قسم اگر کوئی غلط ارادے سے حویلی میں قدم رکھ دیتا تو پھر دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ گل جلال ایک بار دھوکا کھا سکتا ہے بار بار نہیں۔ میں پوری حویلی کا جائزہ لیتا رہا ہوں کوئی چڑیا کا بچہ بھی باہر سے اندر نہیں آیا۔''

''تو پھر وہ کہاں چلا گیا؟''

''ابھی میں آپ سے بولتا ہوں کہ میں نے انہیں اپنے پیروں سے باہر جاتے دیکھا تھا لیکن میرے کو یہ بات نہیں معلوم تھا کہ وہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہے۔'' گل پر سب کو اعتماد تھا چنانچہ جب وہ کہہ رہا تھا کہ شاہ زیب اپنے پیروں سے چل کر گیا ہے تو سب کو یقین آ گیا

تھا لیکن شاہینہ بیگم نے اس بات پر خاصی بحث کی تھی۔''

''آخر اسے چوروں کی طرح جانے کی ضرورت کیا تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے اپنے دل میں کوئی اور منصوبہ بنا رکھا ہو؟''

''آپ ان منصوبوں پر غور کرتی رہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ میرے بھائی نے گھر چھوڑ دیا یقینی طور پر وہ گھر سے انتہائی بددل ہو گیا ہوگا۔''

''تو ایسا کرو اسے تلاش کرو اور جا کر اس کے ساتھ رہنا شروع کر دو۔ ارے گیا کہاں ہوگا۔ وہیں لاہور چلا گیا ہوگا اپنے ہوسٹل میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟''

شاہینہ کے ان الفاظ پر جہاں زیب خاموش ہو گیا تھا۔ لیکن خود شاہینہ کے دل میں چور تھا چنانچہ موقع ملتے ہی اس نے الیاس خاں کو ٹیلی فون کیا۔ ٹیلی فون پر جبار خاں ملا تھا۔ الیاس خاں کہیں گیا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے۔ آپ لوگوں نے تو بالکل ہی خاموشی اختیار کر لی ہے۔ کبھی خیریت تو لے لیا کریں بھائی، بہن کس حال میں ہے۔'' جواب میں جبار خاں کا قہقہہ سنائی دیا اور اس نے کہا۔

''بہن بہرحال اچھی ہوگی کیونکہ اسے نقصان پہنچانے والے یہ بات جانتے ہیں کہ بہن کو نقصان پہنچانے کا نتیجہ کیا نکل سکتا ہے۔ ابھی تم بتاؤ سب خیریت ہے نا ادھر؟''

''خیریت نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''بھائی جان ایک سوال کرنا چاہتی ہوں میں؟''

''پوچھو، پوچھو۔''

''کیا وہ دستاویز آپ کے پاس پہنچ چکی ہیں۔'' جواب میں جبار خاں کا قہقہہ ابھرا

اور اس نے کہا۔

''جب گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکلتا تو انگلیاں تو تھوڑی ٹیڑھی کرنی ہی پڑتی ہیں شاہینہ بیگم۔''

''دستاویزات آپ کے پاس ہیں؟''

''ہاں ہیں۔ ہم ہی لائے تھے انہیں وہاں سے۔''

''مگر میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی۔''

''کیا؟''

''شاہ زیب کو زخمی کیوں کیا گیا تھا؟'' جواب میں جبار خاں اپنے مخصوص انداز میں پھر ہنس پڑا اور اس نے کہا۔

''ضرورت تھی اسے زخمی کرنے کی۔ تھوڑی مار تو پڑنی چاہیے تھی اسے۔''

''اور پھر اسے وہاں سے اٹھوا کر کوڑے کے ڈھیر پر کیوں پھینکوا دیا گیا تھا؟''

''یہ بات عقل مندوں کے سمجھنے کی ہے شاہینہ بہن اور وہ لڑکا سمجھ گیا ہوگا اچھی طرح سے کیونکہ اس نے ابھی تک کوئی کارروائی نہیں کی۔''

''کیا مطلب؟ میں نہیں سمجھی مجھے سمجھا دیجئے۔ اس لیے کہ میں عقل مند نہیں ہوں۔'' شاہینہ نے کہا۔

''ارے ارے برا مت مانو میری بہن ہو تم عقل مند کیوں نہیں ہوگی۔ یہ اس لیے کہ ایک وارننگ تھی۔ دستاویزات تو ہم نے حاصل کر لی ہیں اور اس سلسلے میں کارروائی بھی کر رہے ہیں لیکن زمینوں کی فروخت پر تو دستخط وہی کرے گا نا اور ایک دفعہ اسے یہ وارننگ مل چکی ہے۔ دوبارہ بھی ہماری اس سے ملاقات ہوگی اور ہم اسے بتائیں گے کہ کوڑے کے ڈھیر پر اس کی لاش بھی پھینکی جا سکتی تھی۔ یا سیدھا اس کے بستر پر قتل بھی کیا جا سکتا تھا لیکن اسے

ایک موقع دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ وہ زمینوں کی فروخت پر دستخط کر دے۔ ابھی تو اس سے ایک اور ملاقات باقی ہے۔''

''وہ قانونی کارروائی کی بات کر رہا تھا اور اس قانونی کارروائی میں وہ آپ کا نام ہی لکھوائے گا۔''

جبار خاں پھر ہنس پڑا۔ پھر اس نے کہا۔ ''اور تم اس کے لیے فکر مند ہو گئی ہو گئی کیوں؟''

''نہیں۔ فکر کی بات تو ہے بہر حال وہ بھی زمیندار کا بیٹا ہے۔''

''غصہ دلا رہی ہو۔ کیا چاہتی ہو سڑک پر اس کے ٹکڑے کر دیں۔ تم جانتی ہو ایسا بھی ہو سکتا ہے۔''

''وہ خاموشی سے گھر سے باہر نکل گیا ہے۔''

''مطلب؟''

''رات کو اچانک ہی گھر سے چلا گیا ہے۔''

''کہاں، کدھر؟''

''اب یہ کیا پتا یقینی طور پر اس کے ذہن میں کھوٹ ہے۔ حالانکہ وہ بات کچھ اور کر رہا تھا۔''

''کیا بات کر رہا تھا؟''

''اپنا رویہ اس نے نرم کیا تھا لیکن اب میری سمجھ میں آیا ہے کہ صرف اس لیے کہ ہم لوگوں کو دھوکہ دے سکے۔''

''تم فکر مت کرو ہم لوگوں کو وہ دھوکہ دے کر بھی ہمارا کیا کرے گا۔ بالکل فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ہاں۔ ایک کام تم کر لو۔'' جبار خاں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''بولو بولو۔ کیا؟''

''یہ بتاؤ جہاں زیب تمہارے قبضے میں ہے؟''

''بالکل اس طرح جیسے مکڑی کے جالے میں مکھی۔''

''گڈ۔۔۔ اور وہ چھوٹا وہ کوئی سرکشی تو نہیں کرے گا۔''

''اورنگزیب؟''

''ہاں۔''

''نہیں وہ بزدل آدمی ہے۔ اس کی تم فکر مت کرو۔ لیکن بات کیا ہے؟''

''ایسا کرو شاہینہ! کہ علاقے کے تھانے میں چوری کی رپورٹ درج کرا دو۔ یہ بتا دو کہ تمہارے چار لاکھ روپے کے زیورات لے کر شاہ زیب فرار ہو گیا ہے۔ یہ کام تم فوراً کر ڈالو۔ تھوڑا سا ہنگامہ کرو گھر میں اور اس کے بعد کسی کی بات مت مانو اور چوری کی رپورٹ درج کرا دو۔ بلکہ چاہو تو ہمیں بھی ٹیلی فون کر دو اور یہ بات جہاں زیب کو بتا دو کہ اگر وہ تمہارے ساتھ رپورٹ درج کرانے میں ساتھ نہیں دے رہا تو تم اپنے بھائیوں کو بلاتی ہو۔ دماغ درست ہو جائے گا اس کا۔'' شاہینہ ہنس پڑی اس نے کہا۔

''خوب سوچی۔ ٹھیک ہے۔ میں ایسا ہی کروں گی۔ اچھا اپنا خیال رکھنا۔''

''تم اپنا خیال رکھو ہمارا سب ٹھیک ہے۔'' شاہینہ نے ٹیلی فون بند کر دیا اور جبار خاں کی باتیں یاد کر کے مسکرانے لگی۔

☆☆☆

شاہ زیب اور ممنون لاہور واپس آ گئے۔ ممنون نے راستے میں کہا۔

''شاہ زیب! تم یونہی خاموشی سے گھر سے نکل آئے ہو اور گھر والوں کو یقیناً اس بات میں تشویش ہوگی۔ تمہارے بھائیوں کا مسئلہ تو الگ ہے۔ خاص طور سے شاہینہ بھابی کو

یہ خیال ہوگا کہ تم اس طرح اچانک کیوں نکل گئے ہو۔ وہ لوگ اگر تمہیں تلاش کرنے کے لیے نکلے تو میرا خیال ہے اب تک وہ ہوسٹل پہنچ چکے ہوں گے۔ کیا تم ان سے ملنا چاہتے ہو؟''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اگر ملنا چاہتا تو اس طرح کیسے نکل آتا۔''

''تو پھر تمام تر کارروائیوں کے بغیر تمہارا ہوسٹل جانا تو مناسب نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟''

''عارضی طور پر کچھ دن کے لیے کسی ہوٹل میں کمرہ حاصل کر لیتے ہیں۔ میں ہوسٹل چلا جاؤں گا اور صورتحال کا جائزہ لے لوں گا۔ پہلے ہم ظفر صاحب سے بات کر لیتے ہیں۔ وہ جو بھی مشورہ دیں گے اس کے تحت کام کیا جائے گا۔ کیا کہتے ہو اس بارے میں؟''

''ٹھیک ہے۔ اچھا مشورہ ہے۔ پیسے میرے پاس اچھے خاصے موجود ہیں۔ یہاں بینک میں بھی کچھ پیسے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ بھی بعد میں ضرورت پڑنے پر نکال لوں گا۔ ویسے وکیل صاحب کو بھی معاوضہ دینا ہوگا۔''

''ہم ابراہیم سے بات کر لیتے ہیں۔ سب سے پہلے ہوٹل کا بندوبست کرنا مناسب ہوگا۔ چنانچہ سب سے پہلے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں ایک کمرہ حاصل کیا گیا اور شاہ زیب اس کمرے میں منتقل ہو گیا۔ اس کے بعد ابراہیم سے رابطے کا فیصلہ کیا گیا۔ عارضی طور پر ممنون نے بھی شاہ زیب کے ساتھ ہی قیام کا فیصلہ کیا تھا۔ ابراہیم سے اسی ہوٹل میں ملاقات کی گئی۔ ابراہیم نے حیرت سے کہا۔

''یار! تم لوگوں نے کافی وقت عیاشی میں صرف کر دیا اور میں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں کہ تم ہوٹل میں ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ یار لوگ یہیں رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ عید منانے گھر نہیں گئے۔''

''نہیں ابراہیم تمہاری ہمیشہ کی عادت ہے کہ رائی کا پہاڑ بنا لیتے ہو۔ اپنے ذہن

میں تم نے ساری کہانی گھڑ لی۔ اس کہانی میں کوئی صداقت نہیں ہے۔''

''اب چھوڑو ساری حقیقتیں پتا ہیں۔ ابھی گھر والوں سے تصدیق کر لوں گا جا کر کہ یہ لوگ عید منانے آئے تھے یا نہیں یا پھر یہیں ہوٹل میں قیام کر کے عید منا رہے تھے۔'' ابراہیم نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''یار! کیا کروں میں اس کا۔ اس وقت تو اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر بھی اس کی زبان بند نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس سے مشورہ لینا ہے۔ او میرے پیارے بھائی! ایسا بالکل نہیں ہوا ہے۔ ہم دونوں اپنے اپنے گھروں میں عید منانے کے لیے گئے تھے لیکن بے چارے شاہ زیب پر ایک مشکل آ گئی ہے۔''

''سنجیدہ ہو۔''

''بالکل میری جان!''

''تب پھر سوری۔ کیا ہو گیا شاہ زیب؟''

''میں بتاتا ہوں اور مختصر الفاظ میں بتاتا ہوں کیونکہ اس کے بعد تمہارے والد صاحب کو تفصیل بتانی ہے۔ تم صرف ایک بات بتاؤ۔ شاہ زیب ایک قانونی مشورہ چاہتا ہے اور اس سلسلے میں ہم دونوں تمہارے والد صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ کیا وہ ہماری مدد کر سکیں گے؟''

''کیوں نہیں بھئی۔ میرے والد ہیں بلکہ تم آج ہی میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں ان کے دفتر لے چلوں۔'' ابراہیم ان لوگوں کے ساتھ ہی رہا۔ تقریباً ڈھائی بجے وہ ان دونوں کو لے کر ظفر صاحب کے آفس پہنچ گیا۔ اچھی شخصیت کے مالک تھے ظفر صاحب۔ ابراہیم متجسس تھا کہ ذرا معلوم تو کرے کہ شاہ زیب کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا۔ اس نے کہا۔

''ڈیڈی! یہ میرے دوست اور میرے کالج کے ساتھی ہیں۔ یہ شاہ زیب ہیں

زمیندار ہیں۔ کسی الجھن کا شکار ہو گئے ہیں۔ میرے ذریعے آپ سے مدد چاہتے ہیں۔''

''ہاں ہاں بیٹے کہو کیا بات ہے؟'' ظفر صاحب نے کہا۔

''میں آپ کو ایک مختصری تفصیل بتائے دیتا ہوں۔'' شاہ زیب نے کہا اور پھر اس نے ساری کہانی ظفر صاحب کو سنا دی۔ ظفر صاحب نے پرخیال انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''خیر وہ دستاویز اور کسی شکل میں تو بے کار ہیں۔ کیونکہ باقاعدہ وصیت کے تحت تمہیں دی گئی ہیں۔ ہاں اگر تمہارے بھائی بھی اس بات سے منحرف ہو جائیں کہ وہ زمینیں تمہاری والدہ نے تمہارے سپرد کی ہیں تو پھر تمہارے پاس کوئی پروف نہیں رہتا اس کا۔ کوئی بھی عمل ہو سکتا ہے لیکن اگر تمہارے بھائی اس بات پر آمادہ نہ ہوں اور بھابی سے تعاون نہ کریں تو پھر جب تک تم خود کوئی تحریر نہ دو تو زمینیں کسی اور کی نہیں ہو سکتیں۔ اب یہ بتاؤ کیا تم باقاعدہ ان دستاویزات کے سلسلے میں اپنی بھابی کے بھائیوں کے خلاف جانا چاہتے ہو۔ یا پھر کوئی درمیانی راستہ اختیار کرنے کے خواہشمند ہو۔''

''درمیانی راستہ کیا ہو سکتا ہے جناب؟'' شاہ زیب نے سوال کیا۔

''یہ کہ دستاویزات تمہارے پاس سے گم ہو گئی ہیں اور تمہارے علم میں نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ اخبار میں تم یہی اشتہار دو گے کہ دستاویزات کہیں گر گئی ہیں جسے ملیں وہ انہیں تمہارے حوالے کر دے۔ اس طرح ان کی چوری غیر موثر ہو جاتی ہے اور اگر کوئی انہیں باقاعدہ استعمال کرتا ہے تو اس کے لیے کارآمد نہیں ہو گی۔''

''عمدہ ترکیب ہے۔'' شاہ زیب کو ایک لمحے کے اندر یہ احساس ہو گیا تھا۔ پھر دوسرے ہی دن تین اخبارات میں ان دستاویزات کی چوری یا گر جانے کی تفصیل شائع ہو چکی تھی اور درخواست کی گئی تھی کہ اگر کسی کو یہ دستاویزات ملیں تو وہ اسے وکیل صاحب کے

پتے پر ارسال کر دے۔ شاہ زیب نے ظفر صاحب کو باقاعدہ وکیل بنا کر ان کے مشورے کا معاوضہ ادا کیا تھا۔

☆☆☆

پتہ نہیں جبار خاں، الیاس خاں یا شاہینہ بیگم کو اس اخباری اشتہار کی خبر ہوئی یا نہیں ہوئی۔ حالات پرسکون تھے اور کوئی ایسی اہم بات نہیں ہوئی تھی۔ بے چارے شاہ زیب کی اب اتنی بڑی حیثیت نہیں رہ گئی تھی کہ اس کے لیے زیادہ جدوجہد کی جاتی۔ اندازہ لگا لیا گیا تھا کہ گھر سے چلا گیا ہے اور یقینی طور پر لاہور گیا ہو گا۔ لیکن شاہینہ بیگم نے تیسرے دن صبح زبردست ہنگامہ آرائی کی اور چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سب لوگ گھبرا گئے تھے۔

''کیا ہو گیا۔ کیا ہو گیا؟''

''وہی جو میں سوچ رہی تھی۔ جہاں زیب بہت برا گھر ہے تمہارا، بڑے ستے، نیچ اور گھٹیا لوگوں کا مرکز۔ کیسے ہو تم لوگ حالانکہ پشتوں سے زمیندار ہو لیکن نیتیں بہت خراب ہیں تمہاری۔''

''اور کچھ۔'' جہاں زیب نے طنزیہ نگاہوں سے بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور بھی کچھ رہ جاتا ہے جو باقی رہ جاتا ہے وہ بھی پورا کر لو۔ کمال ہے بھائی کمال ہے۔ ایسے فتنہ انگیز لوگ میں نے پہلے تو کہیں نہیں دیکھے۔''

''اب بتاؤ گی ہوا کیا ہے؟''

''یہ دیکھو یہ ہوا ہے۔'' شاہینہ نے تجوری کھول کر سامنے کر دی جو خالی پڑی ہوئی تھی۔

''کیا مطلب، کیا کہنا چاہتی ہو تم؟''

''کہنے کو کچھ باقی رہ گیا ہے۔ اے خدا مجھے غارت کر دے۔ ہر ایک پر بھروسہ کر

لیتی ہوں۔ کبھی غور بھی نہیں کرتی تھی۔ اس بات پر کہ گھر میں اس طرح کی چیزوں پر بھی نگاہ رکھنا ہوتی ہے۔ مگر نہیں بابا' جگہ جگہ کی بات ہوتی ہے۔ تبھی تو میں یہ سوچوں کہ یہ حضرت اتنی خاموشی سے نکل کیسے گئے۔"

"شاہینہ! تمہارے خیال میں کیا مجھے غصہ نہیں آ سکتا۔"

"ہاں۔ جوتا اٹھاؤ اور مارو میرے سر پر۔ میں خود ہی کالے منہ والی ہوں۔ صاف صاف کہے دیتی ہوں میرے زیورات اور میری جمع کی ہوئی رقم مجھے واپس ملنی چاہیے۔ ورنہ قیامت برپا کر دوں گی۔ سارے رشتے بھول جاؤں گی۔ جو کر سکتی ہوں وہ کروں گی۔ ابھی فون کرتی ہوں اپنے بھائیوں کو۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو۔ کس پر شبہ ہے تمہیں؟"

"سیدھا سیدھا شاہ زیب پر۔ وہ ایسے ہی تھوڑی نکل کر چلا گیا ہے گھر سے' ساری کسر پوری کر کے لے گیا ہے۔ اب اگر اسے زمینیں چھوڑ بھی دینی پڑیں تو اس پر کیا فرق پڑتا ہے۔ ارے چار پانچ لاکھ کے تو زیورات ہی تھے۔ اور نقدی' میرے خدا ساری زندگی کی کمائی تھی اور تمہاری دی ہوئی نہیں تھی بلکہ میرے بھائیوں نے دی تھی سمجھ رہے ہو نا۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو شاہ زیب کو چور بنا رہی ہو تم؟"

"نہیں تم اسے بادشاہ بنا دو۔ اپنے سر کا تاج بنا لو۔ جس کا نقصان ہوا ہے وہی جانتا ہے۔ تمہارے دل پر کیا بیتی ہو گی۔"

"مگر شاہینہ! بغیر دیکھے تم یہ بات کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"بغیر دیکھے تو بہت سی باتیں ہو جاتی ہیں۔ تمہیں اپنا شوہر بنا لیا میں نے بغیر دیکھے۔ یہ کوئی معمولی غلطی تھی میری۔"

"وہی دماغ خراب پن کی باتیں۔ میں کہتا ہوں کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

"ثبوت۔ پولیس خود ثبوت تلاش کرے گی سمجھے۔ رپورٹ درج کرانی ہے مجھے اس کے خلاف۔"

"دماغ خراب ہوا ہے تمہارا۔ میرے بھائی کے خلاف رپورٹ درج کراؤ گی۔"

"اسے جہنم میں جائے تمہارا بھائی۔ لاؤ میری یہ تمام کسر پوری کر دو۔ خاموش ہو جاؤں گی اور پھر بھی خاموش نہیں ہوں گی۔ آخر اس گھر میں میرا ایک مقام ہے۔ کوئی بات ہی نہیں کی جانے دی جاتی مجھے۔ میں کہتی ہوں رپورٹ درج کراؤ گے یا میں بلاؤں الیاس بھائی اور جبار بھائی کو۔"

"میں--- میں اور رپورٹ درج کراؤں گا؟"

"میں کراؤں گی تم مت کراؤ۔"

"ٹھیک ہے کرا دو لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا۔ بات بہت آگے چلی جائے گی۔"

"جہاں تک بھی جائے مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم رپورٹ درج کراؤ گے یا نہیں؟"

"کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں اپنی خاندانی شرافت پر ایک ایسا دھبہ لگاؤں کہ رہتی دنیا تک مٹائے نہ مٹے۔ ایک بھائی ہو کر میں بھائی کے خلاف چوری کی رپورٹ درج کراؤں؟"

"ٹھیک ہے مت کراؤ۔ بلاتی ہوں میں الیاس بھائی اور جبار بھائی کو۔"

"بلا لو--- بلا لو بہت تیس مار خان ہیں تو بلا لو انہیں۔" اورنگزیب نے بھی کرخت لہجے میں کہا اور شاہینہ ٹیلی فون کی جانب بڑھ گئی۔

جوش میں آ کر اس نے ٹیلی فون پر جبار خاں کے نمبر ڈائل کئے اور تھوڑی دیر کے

بعد اس کا رابطہ الیاس خاں سے ہو گیا۔

''بھائی جان! ایک بات بتائیے کیا چوہدریوں کا خون اتنا سفید ہو گیا ہے کہ انہوں نے اپنی بہن کو ایسے لوگوں کے حوالے کر دیا ہے جو اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں سمجھتے۔ اسے خاطر میں ہی نہیں لاتے۔''

''نام بتا دے بٹیا! کون لوگ ہیں وہ۔ تیری شکایت دور ہو جائے گی۔'' الیاس خاں نے کہا۔

''میرے گھر کے لوگ' میرے اہل خاندان اور میرے شوہر۔''

''ارے ارے کوئی جھگڑا ہو گیا ہے کیا جہاں زیب سے۔'' جہاں زیب ایسے آدمی تو نہیں ہیں کہاں ہیں جہاں زیب بھائی میری بات کراؤ ان سے۔''

''سنو جہاں زیب سے بعد میں بات کر لینا۔ یہاں خاصی گڑبڑ ہو گئی ہے شاہ زیب گھر سے بھاگ گیا ہے۔ میرے زیورات اور رقم لے کر۔''

''ایں--- کیوں بھئی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی اسے اور پھر یہ کام تمہارے ساتھ ہی کیوں کیا گیا۔''

''وہ بھائی جان اصل میں زمینوں کی بات کی تھی میں نے اس سے۔ اور کہا تھا کہ زمین میرے بھائی کو چاہئیں اس پر بگڑ گیا اور بعد میں نجانے کیا کیا ڈرامے کیے ہیں اس نے' زخمی ہو گیا' اغوا کا ڈرامہ رچایا اور پھر واپس بھی آ گیا اور اب زیورات اور رقم لے کر فرار ہو گیا ہے۔''

''کہاں رہ گیا ہے؟''

''اب مجھے کیا معلوم اگر پتہ ہوتا تو میں خود نہ پکڑ لاتی اسے۔''

''وہ تو پڑھ رہا تھا ناں؟''

''ہاں۔''

''لاہور میں تلاش کرایا اسے؟''

''ابھی کہیں نہیں تلاش کرایا میں نے۔ کیونکہ تلاش کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ظاہر ہے گھٹنے پیٹ کی جانب جھکتے ہیں۔ جہاں زیب اور اورنگزیب میرے لیے کام کریں گے یا اس کے لیے۔''

''کیا کہتے ہیں جہاں زیب بھائی ذرا میری ان سے بات کراؤ۔''

''مجھے کسی سے بات نہیں کرانی تم لوگ دیکھ لو اگر رپورٹ درج کرا سکتے ہو تو کراؤ ورنہ میں خود پولیس سٹیشن چلی جاؤں گی۔''

''نہیں دو دو بھائی موجود ہیں تیرے۔ اس کا بھلا کیا سوال ہے کہ تو خود جائے۔ میں آ رہا ہوں میرے ساتھ چلنا بلکہ ایسا کر میں بندے بھیج رہا ہوں۔ ان کے ساتھ یہاں آ جاؤ۔ میں تمہیں ساتھ لے کر چلوں گا۔''

''ٹھیک ہے میں آ رہی ہوں۔'' جہاں زیب دوسرے ٹیلی فون پر بات سن رہا تھا اور پریشان تھا۔ یہ بات شاہینہ بھی جانتی تھی کہ دوسرا ٹیلی فون اٹھا لیا گیا ہے۔ بہرحال شاہینہ تیاری کرنے لگی۔ تو شاہ زیب نے اسے روکنے کی آخری کوشش کی اور کہا۔

''دیکھو شاہینہ! ایسا عمل مت کرو کہ ہمارے درمیان ایک گہری خلیج پیدا ہو جائے۔ تم میرے بھائی کے خلاف رپورٹ درج کراؤ گی تو ظاہر ہے میرا ذہن تمہاری طرف سے صاف نہیں ہو سکے گا۔''

''تو پھر میں جا رہی ہوں اگر میری ضرورت ہو تو مجھے بلا لانا۔''

''تم حد سے زیادہ آگے بڑھ رہی ہو۔''

''تو روک لو مجھے کیا سمجھے۔'' جہاں زیب خاموش ہو گیا۔ الیاس خاں اور جبار

خاں کی غنڈا گردی کے بارے میں وہ جانتا تھا۔ دو ہی صورتیں تھیں یا تو باقاعدہ ان کے مقابلے پر آیا جائے یا پھر کان دبا کر خاموشی اختیار کر لی جائے۔ ویسے شاہ زیب نے اگر یہ حرکت کی ہے تو بہت ہی برا کیا ہے۔ حالات اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ شاہ زیب نے ایسا کیا ہے۔ وہ خاصا بدل ہو گیا تھا۔ زمینوں کے معاملے میں بھی اس جارحیت سے کام لیا تھا۔ اور چالاکی سے دستاویزات اپنے قبضے میں رکھ لی تھیں۔ اب یہ پتہ نہیں کہ باقی جو کچھ ہوا تھا اس کی اصلیت کیا تھی۔ بہرحال شاہینہ تیار تھی اور پھر جب ایک جیپ اسے لینے کے لیے پہنچی اور اس میں سے چار مسلح افراد نکلے تو کسی کی جرات نہیں ہوئی کہ شاہینہ کو روکے۔ شاہینہ جیپ میں جا کر بیٹھ گئی اور جیپ اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔ جہاں زیب' اورنگزیب' شکیلہ بیگم سب کے سب دیکھتے رہ گئے تھے۔

''بات بہت زیادہ بگڑ چکی ہے اورنگزیب!''

''وہ تو ٹھیک ہے بھائی جان لیکن شاہ زیب کو بھی یہ حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہی تعلیم حاصل کر رہا ہے وہ زرعی زمینوں کو شاداب بنانا چاہتا تھا۔ جرائم کی دنیا میں داخل ہو گیا ہے۔ کتنی بری بات ہے۔'' اورنگزیب نے کہا اور جہاں زیب خاموش ہو گیا۔ ادھر شاہینہ اپنے بھائیوں کے پاس پہنچ گئی تھی۔ الیاس خاں نے اس سے کہا۔

''یہ وکیل صاحب ہیں جنہیں میں نے بلایا ہے۔ ابھی آ رہے ہیں۔ کاغذ تیار کر رہے ہیں۔ تمہاری چوری کی رپورٹ کا۔ تم دستخط کر دینا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے اس کمینے کی کیا صورتحال ہے۔''

''بھائی جان! میں نے وہی کیا جو جبار بھائی نے بتایا تھا زیورات کا دستاویزات کچھ چوری نہیں ہوا۔ نہ ہی نقد رقم گئی ہے۔ بس شاہ زیب کو چکر میں لانا تھا۔ جیسا کہ آپ نے کہا۔'' الیاس خاں مسکرانے لگا پھر بولا۔

''زمینیں تو ملنی ہی چاہیں۔ ملائی گئی ہیں۔ اب کیا رہ گیا ہے۔ بس اس چوہے کو پکڑ کر دستخط کرانے باقی رہ گئے ہیں۔ اس نے خود ہی اپنے لیے گہرا گڑھا کھودا تھا ورنہ خاموشی سے زمینیں ہمیں دے دیتا۔ ہم اس کی ادائیگی کر دیتے۔ پتہ نہیں کتنے بیوقوف لوگ اس دنیا میں بستے ہیں۔ چوہدریوں سے ٹکر لینے چلا تھا۔

☆☆☆

دستاویزات کے سلسلے میں ظفر صاحب سے رابطہ قائم ہو چکا تھا اور اخبارات میں تفصیل آ جانے کے بعد ظفر صاحب نے یہ اطمینان دلا دیا تھا کہ زمینوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ظفر صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ بیس دن گزر جائیں تو اس کے بعد ان دستاویزات کی نقل بھی تیار کرائی جا سکتی ہے اور اس طرح کام مستحکم ہو جائے گا۔'' ممنون نے شاہ زیب سے کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب انسان کا ذہن منتشر ہوتا ہے تو دوسرے کام ذرا مشکل ہی ہو جاتے ہیں۔ لیکن میرے دوست تعلیم ایک ایسی چیز ہے جس کے لیے اگر وقت گزر جائے تو پھر افسوس کے علاوہ کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم ان سارے معاملات کو نظر انداز کر کے پڑھائی پر توجہ دو اور پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو۔ جہاں تک ان دستاویزات کا تعلق ہے۔ اب انہیں کوئی غلط طریقے سے استعمال نہیں کر سکے گا۔''

''ایک بات بتاؤ ممنون!'' شاہ زیب نے کہا۔

''ہاں۔''

''تم ہوسٹل گئے تھے؟''

''تین بار جا چکا ہوں۔ اب یہ سوچ رہا ہوں کہ تم بھی واپس چلو۔ ہوٹل تو ہم بہت زیادہ عرصے تک استعمال نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی ایک بے مقصد اخراجات ہو رہے ہیں۔

جبکہ تمہیں یہ بھی خیال رکھنا ہے کہ ہو سکتا ہے اس حویلی سے تمہارا رابطہ نہ ہو۔"

"ہوں۔ٹھیک ہے میں خود بھی اس قدر بے دست و پا نہیں ہوں کہ اپنا بوجھ خود نہ اٹھا سکوں۔حویلی والے اگر یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے مجھ پر بہت زیادہ رقمیں خرچ کر ڈالیں ہیں تو کسی وقت اس کا حساب بھی کرلوں گا۔ایک ایک پائی ادا کردوں گا ان کی۔"

"یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔اس وقت تم جذباتی نہ بنو اور اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھو۔" شاہ زیب نے اس بات سے اتفاق کرلیا تھا۔پھر دوسرے دن وہ اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ ہوسٹل منتقل ہوگیا۔یہاں آئے ہوئے اسے چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں ہوئے تھے کہ اچانک ہی ہوسٹل پر پولیس نے چھاپہ مارا اور شاہ زیب کے کمرے میں داخل ہوگئے۔پولیس آفیسر اور اس کے ساتھ کچھ افراد اندر داخل ہوئے اور انہوں نے شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا نام شاہ زیب ہے؟"

"ہاں کیا بات ہے آفیسر۔"

"تمہیں گرفتار کیا جاتا ہے۔تم پر چوری کا الزام عائد کیا گیا ہے اور باقی ساری باتیں تھانے چل کر ہوں گی۔"

"چوری؟"

"ہاں لاکھوں روپے کے زیورات اور نقد رقم تم اپنی حویلی کبیر والا سے چرا کر بھاگے ہو۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" شاہ زیب نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور پولیس آفیسر چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"اچھا بکواس کر رہا ہوں میں' ٹھیک ہے اسے گھسیٹتے ہوئے لے جاؤ۔اس بات

کا جواب میں اسے تھانے چل کر دوں گا۔انسپکٹر نے خونخوار نگاہوں سے شاہ زیب کو گھورتے ہوئے کہا اور شاہ زیب کو ہتھکڑی ڈال کر اس کے ہوسٹل سے لے جایا گیا۔بہت سے ایسے لوگ جو شاہ زیب کی شخصیت کو اور اس کی حیثیت کو جانتے تھے۔حیران نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔خود ممنون بھی حیران کھڑے کا کھڑا رہ گیا تھا۔اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔شاہ زیب کو وہ لوگ گاڑی میں بٹھا کر لے گئے تو ممنون جلدی سے باہر نکلا اور ابراہیم کی تلاش میں دوڑا۔ابراہیم سے معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ اس وقت ظفر صاحب کورٹ میں ہوں گے۔ممنون نے کہا۔

"ابراہیم! تم نے دیکھا میں نے ساری معلومات تو نہیں حاصل کیں لیکن جتنا میں نے سنا ہے وہ یہی ہے کہ حویلی میں اس پر چوری کا الزام لگایا ہے اور پولیس اسے گرفتار کر کے اس سلسلے میں لے گئی ہے۔ظفر صاحب اس وقت کہاں ہوں گے۔"

"میں نے کہا نا کورٹ میں' پہلی بات تو یہ کہ کورٹ میں ہی ان سے ملاقات ہو جائے گی ورنہ تھوڑی دیر کے بعد وہ آفس تو پہنچ جائیں گے۔لیکن پہلے انہیں کورٹ میں دیکھ لیتے ہیں۔" چنانچہ دونوں ظفر صاحب کی تلاش میں سٹی کورٹ پہنچ گئے۔ظفر صاحب سے بار روم میں ملاقات ہوگئی تھی۔بیٹھے ہوئے دوستوں سے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ممنون اور اپنے بیٹے کو دیکھ کر تھوڑے سے حیران ہوئے پھر انہیں لے کر ایک گوشے میں پہنچ گئے۔

"ڈیڈی! شاہ زیب کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

"گرفتار کرلیا گیا ہے؟"

"ہاں چوری کا الزام لگایا گیا ہے اس پر۔اس نے ساری تفصیل تو آپ کو بتادی تھی۔یہ الزام شاہینہ بیگم نے لگایا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ حویلی سے وہ لاکھوں روپے کے زیورات اور نقد رقم چرا کر بھاگا ہے۔"

''اوہ مائی گاڈ اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ باقاعدہ شاہ زیب کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں یہ تو بڑی خطرناک صورتحال ہو گئی۔ اچھا تم لوگ تھوڑی دیر رکو میں ابھی آتا ہوں۔ کچھ کاغذات لیتے ہیں اس کے بعد ہم تھانے چلتے ہیں بلکہ ایسا کرو کہ تم دونوں جاؤ میں دیکھ کر صورتحال کا جائزہ لیتا ہوں۔ تمہارا سامنے آنا مناسب نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم لوگوں کو بھی کوئی نقصان پہنچے۔ اصل یہ زمینداروں اور چوہدریوں کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ دشمنیاں چلتی ہیں تو پھر بڑی طویل چلتی ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ تم دونوں کسی دشمنی کا شکار ہو جاؤ۔ ابراہیم نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ مگر ڈیڈی ہمیں تفصیل کیسے معلوم ہو گی۔''

''بھئی ہو جائے گی۔ مجھ سے آفس میں مل لینا۔ میں یہاں سے سیدھا تھانے جا رہا ہوں۔'' ظفر صاحب وہاں سے واقعی سیدھے مطلوبہ پولیس اسٹیشن پہنچے تھے۔ اور انہوں نے ایس ایچ او سے ملاقات کی تھی۔

''آپ نے زرعی کالج کے ہوسٹل سے ایک لڑکے کو گرفتار کیا ہے شاہ زیب ہے اس کا نام۔''

''جی ظفر صاحب۔'' انچارج نے ظفر صاحب کو پہچانتے ہوئے کہا۔

''بھئی میں اس کا وکیل ہوں اور بعض معاملات میں اس کے لیے کام کر رہا ہوں۔''

''ظفر صاحب! جانتے ہیں یہ رپورٹ کہاں سے درج ہوئی ہے۔ کبیر والا سے اور کبیر والا کی حویلی کی ایک خاتون نے درج کرائی ہے۔ جو شاہ زیب کی بھابی ہیں اب جب اسی کے گھر سے رپورٹ درج کرائی گئی ہے تو میں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔''

''میں اس کی ضمانت کے کاغذ داخل کرانا چاہتا ہوں۔ ضمانت کا بندوبست کر کے

لاتا ہوں۔''

''دیکھئے۔ میں آپ سے ایک بات کہوں کچھ اور لوگ بھی اس معاملے میں ملوث ہیں۔ ان کا تعلق تو بیل نگر سے ہے اور وہ لوگ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ آپ نے شاید کبھی چوہدری الیاس خاں اور چوہدری جبار خاں کا نام سنا ہو۔''

''اچھی طرح سنا ہے اور میں اس کی تفصیل آپ کو بتانے آ رہا ہوں ایس ایچ او صاحب۔'' ظفر صاحب نے کہا اور مختصر الفاظ میں زمینوں کا مسئلہ ایس ایچ او کے سامنے پیش کر دیا۔ ایس ایچ او نے ہنستے ہوئے کہا۔ آپ تو وکیل ہیں ظفر صاحب ساری صورتحال سمجھتے ہیں۔ ہم عدالتی فیصلے تو نہیں کر سکتے نا۔ اب ساری باتیں تو بعد میں ہی پتہ چلیں گی کہ کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا لیکن صورتحال ذرا مشکل ہے۔ ابھی اس کی ضمانت بھی نہیں ہو سکتی۔ آپ تھوڑا سا انتظار کر لیں اور ضمانتی تیار کر لیں۔ اگر ہو سکا تو میں کوشش کر کے ضمانت دوں گا۔ میرے اور آپ کے ذاتی تعلقات ہیں۔ ورنہ دوسری صورتحال خطرناک ہو سکتی ہے۔''

''دیکھئے آپ براہ کرم مجھ سے تعاون کیجئے۔ وہ بے چارہ تنہا رہ گیا ہے۔ کیا اس سے ملاقات کر سکتا ہوں۔'' ظفر صاحب نے کہا اور ایس ایچ او سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے کہا۔

''نہیں ظفر صاحب، ابھی رک جائیں۔ میں آپ کو ٹیلی فون کر کے بتا دوں گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ بات اصل میں کچھ خطرناک لوگوں کی ہے اور ہمیں بھی اپنی ملازمت خطرے میں ڈالنے کا کوئی شوق نہیں ہوتا۔''

''ٹھیک ہے جیسے ہی صورتحال کسی حد تک نرم ہو آپ مجھے اس کے بارے میں بتا دیجئے اور اس کے علاوہ آپ اس لڑکے کے ساتھ کوئی سختی مت کیجئے گا۔'' ایس ایچ او ہنسنے لگا تھا۔

☆☆☆

شاہ زیب کے دل و دماغ میں سناٹے بھرے ہوئے تھے۔ جب ہوسٹل کے کمرے میں اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالی گئیں تھیں تو ایک دم سے اسے چکر سا آ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پھر اسے ان تمام لوگوں کی نگاہیں یاد آنے لگیں۔ جو اس وقت اسے دیکھ رہی تھیں جب وہ ہوسٹل سے لایا جا رہا تھا۔ بڑی اچھی حیثیت تھی اس کی ہوسٹل میں۔ زمیندار خاندان کا بیٹا سمجھا جاتا تھا اسے۔ ویسے بھی شاہ زیب رکھ رکھاؤ کا آدمی تھا۔ کوئی ایسی حرکت اس نے کبھی بھی نہیں کی تھی جو اس کے وقار کے منافی ہو۔ عزت دار تصور کیا جاتا تھا۔ لڑکے کیا یہاں تک کہ اساتذہ بھی اس کی عزت کرتے تھے اور یہ اس کی ذاتی کاوشیں تھیں۔ شکل و صورت کا بہت خوبصورت تھا۔ بلند و بالا قد و قامت، چوڑا چکلا جسم، ہلکی پھلکی ورزش بھی کیا کرتا تھا۔ جسم اس نے بالکل فٹ رکھا ہوا تھا۔ بڑی بڑی کشادہ آنکھیں، روشن آنکھیں، گھرے گھنگریالے بال، یہ تمام چیزیں اس کی شخصیت کو حسین بناتی تھیں۔ لیکن ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگنا اس کی زندگی کا بدترین سانحہ تھا۔ ساری عزت خاک میں مل گئی تھی۔ اس کے بعد ایس ایچ او اسے تھانے لے آیا۔ اور لاک اپ میں بند کر دیا۔ ابھی تک ایس ایچ او نے اس سے کوئی خاص بات نہیں کی تھی۔ اور اس کی وجہ لازمی طور پر وہ چوہدری ہی تھے جنہوں نے خاص ہدایت کے تحت ایس ایچ او سے کہہ دیا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے۔ بہر حال یہ سارے معاملات چل رہے تھے۔ اور وہ لاک اپ میں بند تھا۔ پھر چار پانچ گھنٹے کے بعد ایس ایچ او نے اسے نکالا۔ اس وقت رات کافی ہو چکی تھی۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ لاک اپ میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ یا اسے لاک اپ کی ایک ایسی کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا جہاں کوئی دوسرا ملزم نہیں تھا۔ ایس ایچ او نے اسے خاص کمرے میں بلایا اور یہاں اس نے جبار خاں کو دیکھا۔ جو بیٹھا ہوا مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ ایس ایچ او جبار خاں سے بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا۔ جبار خاں کو دیکھ کر شاہ زیب

کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اتنا اندازہ تو اسے خود بھی ہو گیا تھا کہ اس سلسلے میں انہی لوگوں نے کارروائی کی ہے۔ شاہینہ بھابی نے انہی کے بل پر سارے اقدامات کئے ہیں۔ بہر طور اس نے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے ایک طرف کھڑا رہا۔ جبار خاں مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوئے اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''بھئی کمال ہے بیٹا! اوئے ایس ایچ او صاحب بیٹھنے کو تو کہو اسے۔''

''بیٹھ جاؤ۔'' ایس ایچ او نے کہا اور شاہ زیب ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔

''او بیٹا کچھ چاہیے تھا تو اپنے بھائیوں سے کہتے اب اتنی غربت بھی نہیں پھیل گئی ہے تم لوگوں پر یا بالکل ہی کنگلے ہو گئے ہو۔ زمینیں وغیرہ تو کافی ہیں۔ یہ میری بہن کے مال پر کیوں ہاتھ صاف کر دیا تم نے۔ تو بولو بھئی ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔ کوئی لونڈیا شونڈیا کا چکر ہے کیا۔ ہوا کیا۔'' شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جبار خاں تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

''چلو چھوڑو، کام کر دیں گے تمہارا پر یہ بتاؤ مال کہاں ہے؟''

''میں نے کبھی آپ کو کچھ نہیں کہا کیونکہ میرا آپ کا کوئی رشتہ ہے ہی نہیں لیکن جبار خاں صاحب مجھے آپ یہ بتائیے کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟''

''لو بھئی بندہ چالاک ہے۔ ذہانت سے کام لے رہا ہے۔ ایس ایچ او صاحب ہم سے پوچھ رہا ہے کہ چکر کیا ہے۔ بیٹا! چکر تو اچھی طرح جانتا ہے سمجھا۔ اگر صحیح معنوں میں کام کرنا ہے تجھے تو بیٹا! ہاں یا نہیں میں جواب دے کیا سمجھے۔ بول کیا کہتے ہو؟''

''کس سلسلے میں؟''

''او میاں سلسلہ تو اچھی طرح جانتا ہے۔ اب اتنا بیوقوف بھی نہیں ہے۔ زیورات کہاں ہیں، مال کہاں چھپا کر رکھا ہے؟''

''میں نے چوری نہیں کی جبار خاں صاحب!''

''دیکھ یہ جو ایس ایچ او صاحب ہیں نا۔ یہ مجھے تفصیل بتارہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ تو نے ان سے بدتمیزی کی تھی۔ کہا تھا کیا بکواس ہے۔ میری اجازت کی وجہ سے خاموش تھے۔ ورنہ تیرے تو گوڈے ابھی تک ٹوٹ چکے ہوتے۔ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ بہت خطرناک آدمی ہیں۔ وہ تو یہ سمجھ کر میں نے خوشامد کرکے رضامند ہوا ہے انہیں کیا سمجھا۔ ایس ایچ او صاحب! کیا کہتے ہیں آپ؟''

''آپ اگر اجازت دیں چوہدری صاحب! تو صرف ایک دن چاہیے۔ ایک گھنٹے کے اندر یہ نہ صرف آپ کے زیورات اور رقم کے بارے میں بتائے گا۔ بلکہ آپ یوں سمجھئے کہ اور بھی جتنی چوریوں کی ذمے داری ہے اس پر ڈال سکتا ہوں۔''

''او جی وہ تو ہم جانتے ہیں ایس ایچ او صاحب! آپ کا تو کام ہی یہی ہے مگر یہ بے چارہ پہلی بار پھنسا ہے اس چکر میں۔ ابھی تو سمجھ جا کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ تیرے بھائیوں سے بات کی تھی میں نے۔ دونوں میں سے کوئی بھی تیرے اوپر ہاتھ رکھنے کو تیار نہیں ہے اور اس کا اندازہ تو اس بات سے لگالے کہ کوئی بھی تجھ سے ملنے نہیں آیا حالانکہ انہیں پتا ہے کہ تو تھانے میں بند ہے۔''

''کیا چاہتے ہیں آپ چوہدری صاحب؟''

''او میاں۔ یہ مار مار کر تجھے الو بنادیں گے۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں گے تیرے۔ جو چیز ایک بار چلی گئی وہ دوبارہ نہیں آتی اور پھر ایس ایچ او صاحب تو تجھ پر ویسے ہی خار کھائے ہوئے ہیں۔ ضمانت دے دیتے ہیں ہم تیری۔ کیس بھی ہم یہیں سے ختم کرادیں گے بات آگے نہیں جائے گی۔ پر انسان بن' ہمیں بتا کہ ہمارے لیے کیا کرسکتا ہے۔'' شاہ زیب کے دماغ کی چرخی چلنے لگی۔ ایک لمحے کے اندر اندر عقل نے اسے سہارا دیا۔ یہ بات تو

طے تھی کہ جہاں زیب اور اورنگزیب اس کے لیے کچھ بھی نہیں کریں گے۔ وہ دونوں اپنی بیویوں کے جال میں پھنسے ہوئے تھے۔ بے چارہ ممنون خواہ مخواہ اس کی وجہ سے مصیبت میں گرفتار ہو جائے گا۔ باقی رہے ظفر صاحب تو وہ صرف وکیل ہیں۔ وہ کوئی بہت بڑا کام نہیں کرسکیں گے۔ چالاکی سے کام لینا چاہیے۔ ان لوگوں نے اسے مشکل میں پھنسادیا ہے تو اب مشکل ہی سے حالات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''جبار خاں صاحب! میری بڑی بے عزتی ہوئی ہے۔ آپ لوگ اگر مجھ سے مل لیتے اور یہ بات کرتے تو پھر یہاں تک آنے کی نوبت نہ آتی۔''

''او میاں مجبوری ہے اصل میں کسی کو جب تک اپنے چہرے سے نقاب ہٹا کر نہ دکھاؤ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے نقش و نگار کیسے ہیں۔ کیوں ایس ایچ او صاحب! ٹھیک کہہ رہے ہیں نا ہم؟''

''جی چوہدری صاحب!''

''تو پھر ایسا کرو اس کی ضمانت لے لو۔ ہم ضمانت دے رہے ہیں۔ ساتھ لے جائیں گے اسے۔''

''چوہدری صاحب! جیسا آپ پسند کریں۔ وہ جو بس ہم لوگوں کی روزی آپ ہی لوگوں سے چلتی ہے۔ ہمارا بھی خیال کر لیجیے۔''

''اوہ۔ تم اس کی تو پرواہ ہی مت کرو۔ تم لوگوں سے تو ہماری دوستی بہت پرانی ہے۔ تم فکر مت کرو تمہارا حصہ تمہیں مل جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ جیسا پسند کریں۔ آپ لیں گے ضمانت؟''

''ہاں۔ چلو باہر چلو۔ کاغذات تیار کر لیتے ہیں اور سن بیٹا! تو جا اسے لاک اپ میں رکھو۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد ہم تجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔'' جبار خاں نے کہا۔

''ٹھیک ہے خاں صاحب!'' شاہ زیب بولا۔ جبار خاں ایس ایچ او کے ساتھ باہر نکل آیا اور کانسٹیبل اسے لیے ہوئے لاک اپ میں پہنچ گئے۔ شاہ زیب اب اپنے آپ کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں نجانے کیسے کیسے خیالات آ رہے تھے۔ آہ۔۔۔ اب اس قابل تو نہیں رہا کہ تعلیم حاصل کرے اور یہ تعلیم حاصل کر کے کرے گا بھی کیا۔ اس قدر بے عزتی ہو چکی ہے۔ وقت مجھے برائی کی جانب لا رہا ہے پھر برائی ہی سہی۔ دیکھوں گا اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ تمام باتیں وہ سوچ رہا تھا اور باہر ضمانت کے کاغذات تیار ہو رہے تھے۔ ضمانت مکمل ہو گئی تو جبار خاں نے کہا۔

''اب اسے نکال لاؤ۔'' تھوڑی دیر بعد جبار خاں اسے اپنی لینڈ کروزر میں لیے ہوئے سفر کر رہا تھا۔ راستے میں اس نے کہا۔

''دیکھ بیٹا! بات صرف اتنی سی ہے کہ ہمیں وہ زمین چاہیے۔ فخر خان بڑا ہی سوردا پتر ہے۔ ہم نے ہر طرح کی کوشش کر لی اس پر نہیں مانا۔ ہم نے تیری زمینوں پر بھٹہ بنانے کا کام شروع کر دیا ہے۔ اصل میں فخر خان سے چل گئی ہے۔ ورنہ ایک بھٹہ ہمارے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ہم درجنوں بھٹوں کے مالک ہیں۔ مگر وہاں بھٹہ بنانا تھا ہمیں اور فخر خان نے انکار کر دیا بس یہ بات تھی۔''

''آپ نے میری زمینوں پر بھٹہ بنانے کا کام شروع کر دیا ہے؟''

''وہ زمینیں اب تیری نہیں ہیں بیٹا! ہماری ہیں۔ سمجھ رہا ہے تجھے بس ایک دستخط کرنے ہوں گے۔ ایک چڑیا بٹھانی ہو گی بات ختم ہو جائے گی۔ رقم جتنی چاہے تو مجھ سے لے لے۔ اگر بھائی تیرا ساتھ نہیں دیتے اور تیری رقم کھا گئے ہیں تو دس لاکھ بیس لاکھ لے لے ہم سے۔ کوئی کاروبار شروع کر دے بلکہ کاروبار بھی ہم ہی تجھے بتا دیں گے۔ ایسا کریں گے ان زمینوں کے عوض تجھے ایک بھٹہ دے دیں گے۔ کیا سمجھا' چلتا ہوا بھٹہ۔ بات صرف فخر

خان کی ہے۔ اس سسرے کو نیچا دکھانا ہے۔'' شاہ زیب نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔ تین کلاشنکوف بردار گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چوتھا خود جبار خاں اور پانچویں شاہ زیب۔ آگے صرف ڈرائیور اور اس کے ساتھ ایک مسلح آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت صورتحال ایسی تھی کہ شاہ زیب کوئی خاص قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ لیکن اس کے اندر جو جوالہ مکھی پھوٹ رہا تھا اور وہ اسے مجبور کر رہا تھا کہ ہر خطرے کو نظر انداز کر کے جبار خاں پر حملہ کر دے۔ ان لوگوں نے اس کا مستقبل تاریک کر دیا تھا۔ آہ کیسی بے عزتی ہوئی تھی۔ بے چارہ ممنون بھی کچھ نہیں کر سکا تھا۔ کوئی کچھ نہیں کر سکا تھا۔ مجھے ہی کچھ کرنا ہو گا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا خون اتنا ٹھنڈا نہیں ہے کہ ان لوگوں کی ساری حرکتیں برداشت کر کے صبر کر لو ایسا نہیں کروں گا۔ بالکل نہیں کروں گا۔ شاہ زیب مسلسل باہر دیکھ رہا تھا۔ پھر اچانک نے اس نے کہا۔

''مجھے پیشاب لگ رہا ہے۔ بہت دیر سے سوچ رہا تھا کہ کہیں چل کر ہی پیشاب کروں گا لیکن اب ذرا جلدی ہو گئی ہے۔ گاڑی رکوایئے۔'' شاہ زیب کا لہجہ نرم اور آواز مدہم تھی۔ جبار خاں نے گردن ہلا کر کہا۔

''گاڑی روک دے بھئی۔ او حمیدے! چل نیچے اتر لڑکے کو جھلے لے جا۔ جھلے لاے جا کر اسے فارغ کرا دے۔'' جبار خاں نے اپنے ایک آدمی کو حکم دیا اور اس کے پاس رائفل تھی۔ گاڑی رک گئی اور شاہ زیب نیچے اتر گیا۔ جس آدمی کو اس کی نگرانی کے لیے ساتھ کیا گیا تھا۔ وہ بھی نیچے کود گیا تھا۔ آٹومیٹک رائفل اس کے ہاتھ میں تھی اور گلے میں کارتوس کی پیٹی پڑی ہوئی تھی۔ شاہ زیب نے ایک نگاہ اس پر نہ ڈالی تھی جبکہ اس نے گاڑی میں ہی دیکھ لیا تھا کہ صورتحال کیا ہے۔ جھلہ کوئی بیس گز فاصلے پر تھا۔ یعنی ایک ایسی جگہ جہاں ایک آڑ سی تھی۔ اور اس آڑ میں بیٹھا جا سکتا تھا۔ شاہ زیب نے اسی کی جانب رخ کیا تھا اور اس

طرح لاپرواتھا کہ دیکھنے والے کو یہ احساس بھی نہ ہو سکے کہ اس کے دل میں کوئی برائی ہے۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ تھلے کے پاس پہنچ گیا تھا اور پھر اس نے کہا۔

''تو ادھر رک بھئی میں پیشاب کرلوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں کھڑا ہو رہا ہوں۔'' رائفل بردار بولا اور شاہ زیب دوسری طرف چلا گیا۔ پھر اچانک ہی اس کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی اور رائفل بردار چونک کر اس کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ تھلے کے دوسری جانب پہنچ گیا تھا۔ شاہ زیب نے زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اوئے کمال ہے یار! یہ دیکھ یہ کیا ہے۔'' رائفل بردار بے اختیار زمین پر جھک گیا تھا۔ اسی لمحے شاہ زیب کا گھونسہ پوری قوت سے اس کی گردن پر پڑا۔ ساتھ ہی شاہ زیب نے اس کے دونوں پیروں پر اپنا داہنا پیر مارا تھا۔ رائفل بردار حالانکہ ایک طاقتور آدمی تھا لیکن دونوں وار اچانک ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ اوندھے منہ گر گیا۔ شاہ زیب اچھل کر اس کی پشت پر چڑھ گیا اور پھر اس نے رائفل بردار کا چہرہ زمین سے رگڑ دیا۔ پاس ہی کوئی پتھر پڑا ہوا تھا۔ شاہ زیب نے ایک پتھر اٹھایا اور پے در پے رائفل بردار پر وار کئے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اس کا منہ بھی دبا رکھا تھا۔ کام بن گیا رائفل بردار نے دو چار ہاتھ پاؤں مارے اور اس کے بعد وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ دوسری طرف جیپ میں بیٹھے ہوئے لوگ خاموشی سے قرب و جوار کا جائزہ لے رہے تھے۔ شاہ زیب نے پھرتی سے رائفل بردار کی گردن سے کارتوس کی پیٹی نکالی۔ اس کی شاندار رائفل اپنے ہاتھ میں لی اور اس کے بعد تیار ہو گیا۔ وہ خاموشی سے اپنی جگہ انتظار کرنے لگا کہ دوسری جانب سے کوئی تحریک ہو تو وہ عمل کرے اب اس وقت صورتحال ایسی ہی ہو گئی تھی۔ کوئی تین منٹ یا چار منٹ گزرے تو اچانک ہی جبار خاں چونکا۔

''اوئے یہ تو پیشاب کر رہا ہے یا۔'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور پھر اپنے

آدمیوں سے کہا۔

''ذرا دیکھو۔۔۔'' دونوں آدمی پھرتی سے نیچے کود آئے اور تھلے کی جانب بڑھنے لگے۔ یہی موقع تھا کہ شاہ زیب اپنا کام شروع کر دیتا۔ رائفل سے دو شعلے نکلے اور دونوں آنے والے اوندھے منہ زمین پر گر پڑے۔ ان کی پنڈلیاں چور چور ہو گئیں تھیں۔ دوسری سے ڈرائیور دروازہ کھول کر نیچے کودا اور اس طرف سے دوسرا آدمی جو ڈرائیور کے علاوہ تھا۔ جبار خاں البتہ باہر نکلنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ لیکن صورتحال اس کی سمجھ میں فوراً ہی آ گئی تھی۔ شاہ زیب نے پھر فائر کیے اور جیپ کے دونوں ٹائر جو اس کی جانب کے تھے پھاڑ دیے۔ پھر اس نے اندھادھند کئی گولیاں جیپ پر چلائیں اور جبار خاں بھی جیپ سے کود کر دوسری جانب بھاگا۔ شاہ زیب نے اس پر بھی گولی چلائی تھی لیکن جبار خاں بچ گیا اور جیپ کی آڑ لے کر تیز رفتاری سے دوسری طرف دوڑتا چلا گیا۔ ادھر وہ دونوں آدمی جن کی پنڈلیوں کی ہڈیاں چور چور ہو گئیں تھیں اپنے آپ کو سنبھال رہے تھے۔ انہوں نے الٹے سیدھے دو فائر کیے لیکن ظاہر ہے شاہ زیب کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ شاہ زیب نے دو چار فائر اور کئے اور اس کے بعد وہ سیدھا ہی سیدھا دوڑتا چلا گیا۔ اس نے مخالف سمت اختیار کی تھی اور تیزی سے لمبی لمبی چھلانگیں لگاتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ جانے کتنی دور نکل آیا تھا۔ قرب و جوار میں دور دور تک کوئی آبادی نہیں تھی اور اس علاقے کے بارے میں وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون سا علاقہ ہے لیکن بہر حال ویرانے تھے اور وہ ان ویرانوں میں برق رفتاری سے دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ ذہن پر کوئی سوچ نہیں تھی ساری سوچیں اس وقت تک کے لیے تھیں جب یہ یقین ہو جائے کہ چوہدری جبار کے آدمی اس کا پیچھا نہیں کر رہے۔ حالانکہ دو آدمیوں کو اس نے بیکار کر دیا تھا لیکن اسے علم تھا کہ چوہدری کے ساتھ اور بھی لوگ ہیں۔ تیسرا آدمی تو شاید ٹھنڈا ہی ہو گیا تھا۔ بہر حال اب ان تمام باتوں پر غور کرنا بے معنی تھا۔ نجانے کتنا فاصلہ طے

کیا تھا اس نے کہ اسے ایک ٹوٹی ہوئی عمارت نظر آئی۔ پتہ نہیں کیسی عمارت تھی اور اس علاقے میں کیوں بنی ہوئی تھی۔ طرز تعمیر قدیم تھا۔ چھوٹی چھوٹی لال اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔ نقش و نگار بھی تھے اپنے ڈیزائن سے مسجد نہیں معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اب جو کچھ بھی تھا کم از کم اس پر چھت موجود تھی اور جس طرح سے وہ اتنا طویل سفر طے کر کے یہاں تک پہنچا تھا اس سے اس کی کیفیت کافی خراب ہو گئی تھی۔ زبان باہر نکل پڑ رہی تھی اور شدید پیاس اور تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس عمارت تک پہنچا اور پھر اس عمارت کے صحن سے گزر کر اس کی چھت کے نیچے آ گیا۔ رائفل اس نے برابر رکھی' کارتوس کی پیٹی رائفل کے پاس رکھی اور زمین پر چت لیٹ کر ہانپنے لگا۔ اب بہت سی سوچیں اس کے ذہن پر اثر انداز ہو چکی تھی۔ اسے اپنا فیصلہ غلط نہیں لگا تھا۔ جو کچھ کیا تھا اس نے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ اگر جبار کی حویلی تک پہنچ جاتا اور جبار کے قبضے میں رہتا تو یقینی طور پر جبار اس سے اپنی مرضی کے دستاویز پر دستخط لے لیتا اور اس طرح وہ زمینیں اس کے قبضے سے نکل جاتیں۔ زمین پر لیٹے لیٹے اس نے اس عمارت کی چھت کو دیکھا اور کہا۔

''میری مدد کرنا ماں! تم نے دیکھ لیا ہے کہ وقت شدت سے میرا مخالف ہو گیا ہے۔ تمہارے دونوں بیٹے جنہوں نے مجھے اپنی گود میں لے کر پروان چڑھایا ہے۔ اس طرح بیگانے ہو گئے ہیں کہ انہوں نے میری جانب سے آنکھیں ہی بند کر لی ہیں۔ ایسے حالات میں اماں! اگر میں غلط راستوں پر اتر آؤں تو اسے میری مجبوری سمجھنا۔ میں مجرم نہیں لیکن مجھے جرم کرنے پڑیں گے جن کا آغاز وقت نے مجھ سے کرا دیا ہے۔ مجھے معاف کر دینا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے دونوں طرف لڑھک گئے۔

☆☆☆

اس وقت جان بچانے کا مسئلہ تھا۔ چوہدری جبار خاں کی ساری اکڑ فوں نکل گئی

تھی۔ بے تحاشا دوڑ رہا تھا۔ تین آدمی تو اس طرف کام آ گئے تھے لیکن دو بچ گئے تھے ان میں ایک ڈرائیور تھا اور ایک ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا آدمی۔ دونوں جبار خاں سے چند قدم پیچھے ہی تھے اور جبار خاں آگے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ دفعتاً ڈرائیور نے ایک قہقہہ لگایا اور دوسرا چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''ابے کیا پاگل ہو گیا ہے ہنسنے کی کیا تک ہے؟''

''اوہ یار! انسان بھی کیا چیز ہے۔ ذرا دیکھ ایسا لگ رہا ہے جیسے موت پیچھا کر رہی ہے۔ یہ وہ بندہ ہے جو سینہ تان کر کہتا ہے کہ اگر موت بھی اس کے سامنے آ جائے تو وہ اس کی پروا نہیں کرے گا۔''

''کہنا اور کرنا الگ الگ بات ہوتی ہے۔ پر تو اپنی زبان بند رکھ ایک لفظ بھی اس کے کانوں تک اتر گیا تو سارا غصہ ہم پر ہی اتر جائے گا۔''

''لے وہ گر پڑا۔'' اچانک ہی دوسرے آدمی نے کہا۔ جبار خاں کو ٹھوکر لگی تھی اور وہ اوندھے منہ نیچے گرا تھا۔ سر پر چوٹ بھی لگی تھی اور خون نکلنے لگا تھا۔ دونوں دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئے۔ جبار خاں کا سانس دھونکنی بنا ہوا تھا۔ ایک لفظ منہ سے نہیں نکل رہا تھا۔ ڈرائیور نے جلدی سے اپنی قمیض کا دامن پھاڑا اور اس کے ایک حصے کو تہہ کر کے جبار خاں کے ماتھے کے زخم پر رکھا اور دوسرے سے پٹی باندھ دی۔ جبار خاں کراہ رہا تھا۔

''اوئے تمہارا بیڑا غرق کتے کے پترو۔ سارے کے سارے کھسرے ہی نکلے۔ اوئے ایک بندہ نہیں سنبھال سکے تم۔ اوئے تم پر اللہ کی مار زخمی کرا دیا مجھے۔ اوئے اسے کہتے ہیں نیکی برباد گناہ لازم۔''

''اصل میں چوہدری صاحب! ہمیں تو صورتحال کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔''

''اوئے تمہیں دنیا کی کوئی بات معلوم بھی ہے۔ اوئے اب کیا کریں یہ بتاؤ؟ یہ تو راستہ ہی بڑا لمبا ہے۔''

''ہم حکم کریں چوہدری صاحب! تو ہم جیپ جا کر دیکھیں؟'' ڈرائیور نے کہا۔

''اوئے بہادر دے پتر! اوئے اگر وہ موجود ہوا تو کیا کرو گے؟''

''بس جی--- آپ پر جان نثار کر دیں گے اور کیا کریں گے۔''

''تو جاؤ۔ میرا منہ کیوں دیکھ رہے ہو؟ احسان جتا رہے ہو مجھ پر۔''

''نہیں چوہدری صاحب! آ بھئی تو بھی آ جا۔'' ڈرائیور نے دوسرے آدمی سے کہا۔ تو وہ ایک دم کہنے لگا۔

''اوئے پاگل ہوا ہے کیا؟ چوہدری صاحب کو اکیلا چھوڑ دوں۔ دیکھتے نہیں ہو زخمی ہوئے ہیں۔'' ڈرائیور نے معنی خیز مسکراہٹ سے اسے دیکھا اور بولا۔

''وہ چوہدری صاحب! کو کچھ بتانا بھی تو تھا مجھے۔'' دوسرے آدمی کے چہرے پر شدید خوف کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس نے چوہدری کے بارے میں کچھ الفاظ کہے تھے۔ اس نے ملتجی نگاہوں سے ڈرائیور کو دیکھا تو ڈرائیور بولا۔

''ٹھیک ہے تو رک چوہدری صاحب کے پاس میں چلتا ہوں۔'' اور ڈرائیور واپس مڑ گیا۔ اب پتہ نہیں کیا سوجھی تھی اسے وفاداری کا خناس ذہن میں سمایا تھا یا پھر سچ مچ سنجیدگی سے جیپ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ خاصا لمبا فاصلہ طے کر چکا تھا اور واپس جیپ تک جانا بڑا ہی خطرناک تھا لیکن حالات کا اندازہ کر رہا تھا۔ ایسے ہی مواقع ہوا کرتے ہیں جب مالکوں کے دل میں جگہ بن جاتی ہے۔ خطرہ تو مول لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ وہ چلتا رہا اور پھر تھوڑا سا چوکنا ہو کر آخر جیپ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ لوگ جو زخمی ہوئے تھے اس کے اپنے ہی تھے۔ سارے کے سارے ساتھی تھے۔ اس نے پہلے ان دونوں کا جائزہ لیا۔ جو خاصے زخمی ہو گئے

تھے اور بے ہوش تھے۔ پھرتی سے اس نے دونوں کے کپڑے پھاڑ پھاڑ کر ان کے زخموں کو کسا اور اس کے بعد اس کے پاس پہنچا جو شدید زخمی ہوا تھا۔ اس کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ ڈرائیور چند لمحے سوچتا رہا اور اس کے بعد اس نے اس لاش کو کندھے پر اٹھایا اور انہیں جیپ کی سیٹ کے پیچھے ڈال دیا۔ اس کے بعد جیپ اسٹارٹ کی۔ لیکن جیپ کے دو ٹائر پھٹے ہوئے تھے۔ یہ صورتحال بڑی سنگین تھی۔ ایک کی تو اسٹپنی موجود تھی۔ جسے کھول کر لگایا جا سکتا تھا لیکن دوسرا ٹائر اس کا کیا کیا جائے اور اس وقت اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ پھٹے ہوئے ٹائر پر ہی جیپ چلائی جائے۔ کم از کم کارکردگی کا کوئی نتیجہ تو برآمد ہو۔ بمشکل تمام اس نے ایک اسٹپنی تبدیل کی اور پچھلے ٹائر میں لگا دی۔ تیسرے ٹائر کو اس نے اسی طرح رہنے دیا تھا اور اس کی وجہ سے جیپ کی رفتار انتہائی سست رہی تھی۔ اچھلتی کودتی اس راستے کو طے کر رہی تھی۔ جہاں سے گزر کر چوہدری تک پہنچا جا سکتا تھا۔ کافی دیر میں یہ راستہ طے ہوا۔ جیپ کا انجر پنجر ہل گیا تھا لیکن بہرحال ڈرائیور اسے لیے ہوئے چوہدری تک پہنچ گیا۔ دوسرا آدمی چوہدری کے پاس مستعد کھڑا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے کہا۔

''چوہدری صاحب! رفیقہ مر چکا ہے۔ یہ دونوں زخمی ہیں لیکن سب سے بڑی افسوس کی بات جو ہے وہ یہ ہے کہ اس نے جیپ کے دو ٹائر پھاڑ دیئے تھے۔ اب اسی پر ہمیں آگے چلنا ہوگا۔ ٹائر تو کٹ پھٹ گیا ہے۔ بس رم پر چلنا ہوگا۔''

''اوئے کیسے--- چل--- چل تو سکتی ہے نا یہ؟''

''جی چوہدری صاحب! بہت سست رفتاری سے چل سکتی ہے۔''

''اوئے چل یار۔ جیسے بھی چل سکتی ہے رخ ادھر کا ہی رکھے۔ میرا خیال ہے یہ مونگاہ کا علاقہ ہے۔ ہم چک مونگا سے آگے بڑھ کر گھوڑا شاہی پہنچ سکتے ہیں۔ گھوڑا شاہی میں ہمیں کوئی سارا راستہ مل ہی جائے گا۔''

"جی چوہدری صاحب!" جیپ وہاں سے آگے بڑھ گئی اور سست رفتاری سے یہ راستہ طے ہونے لگا۔ چوہدری کے سر کے زخم میں تکلیف ہو رہی تھی اور وہ تشویش بھری نگاہوں سے اپنے دونوں ساتھیوں کو بھی دیکھ رہا تھا۔ جو اتنے شدید جھٹکے لگنے کے باوجود ہوش میں نہیں آئے تھے۔

☆☆☆

کافی دور تک شاہ زیب دوڑتا رہا۔ اسے یہ احساس تھا کہ کسی بھی وقت کوئی بھی سنگین بات ہو سکتی ہے۔ جبار خاں پتہ نہیں زخمی ہوا ہے یا نہیں لیکن کم از کم وہ دو تین افراد ضرور زخمی ہوئے ہیں یا مارے گئے ہیں۔ جن سے اس کا براہ راست مسئلہ ہو گیا تھا۔

بہرحال کافی دور تک دوڑنے کے بعد وہ رکا۔ اس وقت کوئی سستی مصیبت کا باعث بن سکتی تھی لیکن وہ ذہنی طور پر غیر مطمئن نہیں تھا۔ وہی کیا تھا اس نے جو دنیا اپنے دفاع کے لیے کرتی ہے۔ جبار خاں اگر اسے اپنی حویلی لے جاتا تو یقینی طور پر وہ ان دستاویزات پر دستخط لے لیتا جو اس کو زمینوں سے دست بردار کر دیتی اور بہرحال اب یہ اس کا مشن بن چکا تھا کہ ماں کی زمینوں کو آزاد کرائے اور اپنا وعدہ پورا کرے۔ بس ایک جنون چڑھ گیا تھا اسے اور اس کے علاوہ اور کوئی چیز اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ رکے بغیر آگے بڑھتا رہا اور کافی فاصلہ طے کر کے وہ ایک ایسی جگہ پہنچا۔ جہاں گھاس اور سرکنڈوں کے اونچے اونچے پودے اگے ہوئے تھے۔ زمین دلدلی تھی اور تھوڑے فاصلے پر ایک اونچا ٹیلہ نظر آ رہا تھا۔

ہر طرف ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ زیب کے قدم اس ٹیلے کی جانب بڑھ گئے لیکن ٹیلے کی بلندی سے اس نے جو کچھ دیکھا وہ اس کے لیے کارآمد تھا۔ ایک بہت بڑا جوہڑ نظر آ رہا تھا۔ جو جھلملاتا ہوا چمک رہا تھا۔ آگے جا کر ایک پل نظر آتا تھا جس پر سے سڑک

گزرتی تھی۔ یہ علاقہ شاہ زیب کا دیکھا ہوا تھا چنانچہ وہ تھکے ہونے کے باوجود اس جانب چل پڑا۔

جوہڑ پر پہنچ کر کم از کم وہ اپنی پیاس بجھا سکتا تھا۔ ویسے اس علاقے کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ یہاں دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہیں تھا۔ نہ کوئی پگڈنڈی تھی نہ کوئی راستہ تھا۔ ہر طرف ٹیلے اور ٹبے تھے۔ جنگلی پودوں کی جھاڑیاں تھیں۔ کہیں کہیں اکا دکا درخت بھی نظر آ رہے تھے۔ بہرحال اس کی نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لینے لگیں اور آخر کار اسے ایک ایسا ٹھکانہ مل گیا جہاں وہ آرام کر سکتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ جوہڑ کے کنارے پر تھا۔ اس نے رائفل ایک طرف رکھی۔ کارتوس کی پیٹی اتاری اور اس کے بعد اوپری لباس اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر نچلا لباس بھی اتار دیا۔ یہ شدید تھکن اتارنے کا ایک ہی ذریعہ تھا وہ یہ کہ جوہڑ کے پانی میں دل کھول کر نہائے۔ اسے جوہڑ کہنا غلط تھا بلکہ ایسی جگہوں کو ٹوبہ کہا جاتا تھا کیونکہ اس کا پانی صاف شفاف تھا۔ ہاں گہرائی میں گندگی ضرور بیٹھی ہوئی تھی اور اگر نیچے جا کر پاؤں تہہ سے لگائے جاتے تو پھر یہ گندگی اوپر اٹھ سکتی تھی اور صحیح معنوں میں یہ ٹوبہ جوہڑ بن سکتا تھا۔

خوب اچھی طرح نہایا اور پھر باہر نکل کر خوب اچھی طرح پانی پیا اور پھر اپنی طے شدہ جگہ آ کر اس نے آرام کرنے کی ٹھانی اور زمین پر سیدھا سیدھا لیٹ گیا۔ نیند اس طرح دوڑی ہوئی آئی کہ اسے احساس بھی نہ ہو سکا کہ سو گیا۔

"آنکھ کھلی تو شام آہستہ آہستہ زمین پر اتر رہی تھی۔ دور کچھ فاصلے پر اونچی اونچی گھاس اور سرکنڈوں کے پودے دھند میں لپٹ گئے تھے۔ سورج ٹیلوں کے دور تک پھیلے ہوئے لاتعداد ناہموار سلسلوں کے پیچھے ڈوب چکا تھا اور مغرب میں گہری سرخ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بہرحال وہ سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ زیادہ تاریکی ہو گئی تو پھر آگے چلنا خطرے سے خالی نہیں ہو گا۔ ہو سکتا ہے کوئی اسے دیکھ لے اور پھر تھوڑے فاصلے پر سڑک

بھی گزر رہی تھی اور سڑک پر سے اکادکا گاڑی گزرتی نظر آجاتی تھی۔

کافی غور وخوض کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ بھوک برداشت کرنی پڑے گی۔ کل صبح کی روشنی میں ہی کچھ کیا جاسکتا ہے۔ رات کی تاریکی میں اپنی جگہ چت لیٹے ہوئے وہ حالات پر غور کرنے لگا۔ دونوں بھائی' دونوں بھاوجیں کائنات میں یہی رشتے تھے۔ اس کے اور بھی کچھ رشتے دار تھے لیکن ان سے بس سرسری سی ملاقاتیں تھیں۔ ان میں کئی نام آتے تھے۔ ایک ماماجی تھے جو کافی فاصلے پر حسن ابدال میں رہتے تھے اور کچھ رشتے دار ایسے تھے جن سے کبھی دو چار سال میں ملاقات ہوجاتی تھی اور نہ انہوں نے کبھی کسی رغبت کا اظہار کیا تھا اور نہ کبھی ادھر سے کوئی بات ہوئی تھی۔ بس ماں تھی اور زندگی تھی۔

بہرحال وقت کافی گزر گیا تھا اور اس کے بعد چاند نکل آیا لیکن چودھویں رات کا چاند تھا اور روشنی اس طرح پھیل گئی تھی کہ ماحول دن کے مطابق ہوگیا تھا۔ ایسی جگہ تو رسک لیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ وہ دیر تک سوچتا رہا اور اس کے بعد اپنی جگہ سے آگے بڑھ گیا۔ سامنے چاندنی میں چھلکتا ہوا ایک تالاب نظر آرہا تھا۔ اس کے ایک کنارے پر اونچی اونچی گھاس تھی۔ پیچھے دلدل تھی اور کوئی دو سو گز کے فاصلے پر پل نظر آرہا تھا۔ اس وقت چونکہ رات ہو رہی تھی۔ اس لیے سڑک پر آمدورفت تقریباً ختم ہوگئی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ کبھی کبھی کہیں ایک آدھ جھاڑی بھی نظر آجاتی تھی اور اس کے بعد مکمل خاموشی۔ اس کے قدم پل کی جانب بڑھتے رہے اور پھر وہ پل کے نیچے سے بھی گزر گیا۔ ابھی کچھ ہی قدم آگے چلا تھا کہ دفعتاً اس کے قدم ایک جگہ جم کر رہ گئے۔

''کافی فاصلے پر بائیں سمت آگ روشن نظر آرہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہلکا ہلکا سفید دھواں جو گوشت جلنے کی چراند اپنے وجود میں سمیٹے ہوئے فضا میں بلند ہو رہا تھا۔ شاہ زیب کے قدم رک گئے' ہوسکتا ہے یہ کوئی شمشان گھاٹ ہو جہاں کسی مردے کو جلایا جارہا ہو

ورنہ گوشت بھننے کی چراند کیسے اٹھ رہی ہوتی۔ کیا اس طرف کا رخ کیا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ آس پاس کوئی بستی ہو۔ اگر بستی مل جائے تو کھانے پینے کا بندوبست بھی ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے وہاں کچھ لوگ ایسے ہوں جو ابھی تک چتا کے آس پاس موجود ہوں۔ شاہ زیب کو یہ بات معلوم تھی کہ اس علاقے میں ہندو بھی اچھے خاصے رہتے ہیں اور ان کے تمام تر معمولات اپنے دین دھرم کے مطابق ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نے اسی جانب قدم اٹھادیے۔ تھوڑا فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک ایک کڑک دار آواز اس کے کانوں میں اتری۔

اڑی خود تکبر نہ کر بندیا' دس تو تیرا مکان کتھے
اوہ دارا سکندر نمرود مٹ گئے دس اوہناں نام نشان کتھے
جس کے تخت تو پریاں اڈاندیاں سن وڈ شان والا سلیمان کتھے
سائیاں موت نے مار فنا کتا مالک حکمت دا شان لقمان کتھے

شاہ زیب کے قدم ٹھٹھک گئے تھے۔ وہ اس آواز کو سنتا رہا۔ بڑا سوز تھا اس کی آواز میں اور جو الفاظ نکلے وہ بھی بڑے سبق آموز تھے۔ شاہ زیب ایک لمحے کے لیے ان الفاظ میں گم ہوگیا تھا پھر چند ہی لمحوں کے بعد اس نے آگے قدم بڑھادیے۔

چاند کی روشنی میں اب اسے ایک شخص نظر آرہا تھا۔ جو آگ سے کچھ فاصلے پر کسی پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ شاہ زیب کو یہ اندازہ بھی چند لمحوں کے بعد ہوگیا کہ یہ کوئی شمشان گھاٹ نہیں ہے۔ ایک عام سی جگہ ہے یہ شخص کون ہے اور کیا کر رہا ہے۔

بہرحال وہ آگے بڑھتا رہا اور کچھ لمحوں کے بعد اس شخص نے بھی اسے دیکھ لیا لیکن اس کے انداز میں بڑی لاپروائی سی تھی۔ شاہ زیب کے ہاتھ میں رائفل بھی تھی اور سینے پر کارتوس کی پٹی بھی بجی ہوئی تھی۔ جب وہ قریب پہنچا تو اس نے انتہائی قد آور بوڑھے کو دیکھا۔ جس کی داڑھی سفید تھی' مونچھیں بھی سفید تھیں لیکن بدن کا چوڑا چکلا پن یہ احساس دلا رہا

تھا کہ اگر کسی کو اپنے بازوؤں میں دبوچ لے تو اس کی پسلیاں آپس میں ملا سکتا ہے۔ کلائیاں چوڑی چوڑی اور بالوں سے بھری ہوئی تھیں۔ البتہ ایک ٹانگ گھٹنے کے پاس سے کٹی ہوئی تھی۔ قریب ہی پتھر سے ایک مضبوط بیساکھی ٹکی ہوئی تھی۔ سامنے جو آگ جل رہی تھی وہ کسی انسانی بدن کی چتا نہیں تھی بلکہ اس پر ایک ہرن بھونا جا رہا تھا۔ سالم ہرن شاہ زیب کی بھوک آخری حد تک پہنچ گئی۔ یہ تو ایک قدرتی امداد ہوئی اس نے دل میں سوچا پھر وہ اس بوڑھے کی جانب متوجہ ہوا۔ جو خاموشی سے شاہ زیب کا جائزہ لے رہا تھا۔ شاہ زیب آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ گیا پھر اس نے کہا۔

''ابھی آپ گا رہے تھے۔'' بوڑھے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی اس خاموشی سے شاہ زیب ایک لمحے کے لیے کچھ خجل سا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ دوبارہ بولتا۔ بوڑھے نے خود کہا۔

''بھوکے ہو بیٹھ جاؤ۔'' بڑی گرج دار اور پر رعب آواز تھی۔ شاہ زیب کو وہ کوئی مافوق الفطرت ہستی محسوس ہوئی۔ ویسے بھی اس ویرانے میں کسی انسان کا وجود بڑا حیرت ناک تھا اور شاہ زیب کو بڑا تعجب سا ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے دل پر خوف کا ایک احساس طاری ہوا اور پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور خاموشی سے آگے جا کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

''اسلحہ ہے تمہارے پاس۔ پھر بھی کوئی شکار نہیں کیا۔'' بوڑھے شخص نے کہا۔

''ہاں۔'' شاہ زیب آہستہ سے بولا۔ بوڑھے نے وجہ نہیں پوچھی تھی پھر وہ کہنے لگا۔

''دیکھو اب جب تم آ گئے ہو تو خود سارے کام کرو۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میں معذور ہوں۔ یہ لو۔'' اس نے اپنے بائیں سمت سے ہاتھ ڈال کر ایک بڑا چوڑا چھرا نکالا اور شاہ

زیب کو دیتا ہوا بولا۔

''اگر گوشت بھن گیا ہو تو آگ بجھا دو اور اپنے لیے اور میرے لیے گوشت کاٹ کر لاؤ۔ کسر ہو تو رک جانا۔ شاہ زیب اس پراسرار وجود کی ہر بات ماننے پر مجبور ہو گیا۔ اور کچھ لمحے بعد اس نے اپنے ہاتھ میں چھرا لے کر ہرن کے نزدیک پہنچ کر چھرے کی نوک گوشت میں چبھو کر دیکھی۔ گوشت ابھی صحیح انداز میں گلا نہیں تھا۔ وہ پیچھے ہٹ آیا لیکن نجانے کیوں بوڑھے کی سحر انگیز شخصیت نے اسے مشکوک کر دیا تھا۔ بوڑھے نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ بات خود سمجھنے والی تھی۔ گوشت یقینی طور پر تیار نہیں ہوا تھا۔ بوڑھے نے کہا۔

''کیا نام ہے تیرا؟''

''شاہ زیب۔''

''میرا نام مکرم شاہ ہے۔ یہ رائفل کیوں لیے پھر رہا ہے۔ اسلحے پر تو پابندی ہے۔ لائسنس ہو گا اس کا تیرے پاس؟''

''ہاں ہے۔''

''مطلب میرا یہ ہے کہ شکار کی تلاش میں نکلا ہے یا خود شکار ہے؟'' بوڑھے کے الفاظ بڑے دلچسپ تھے لیکن احتیاط ضروری تھی۔ کچھ لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا۔

''نہیں نہ شکاری ہوں' نہ خود شکار ہوا ہوں۔ ایک بڑے آدمی کا باڈی گارڈ ہوں اور وہ بڑا آدمی مجھے اس علاقے میں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ کچھ کام تھا اس لیے مجھے پیدل سفر کرنا تھا لیکن شام ہو گئی۔'' بوڑھا خاموش رہا۔ اس نے کوئی اور سوال نہیں کیا تھا۔ پھر وہ بولا۔

''لیکن یہ علاقہ تو.....''

''راستہ بھول گیا ہوں' یہی تو پریشانی ہے۔''

’’اچھا اچھا۔ یہ بات ہے تبھی تو۔۔۔ویسے شکل سے ہی بھوکا لگ رہا ہے۔ غالباً سارا دن مارا مارا پھرتا رہا ہے۔‘‘

’’اوپر سے یہ مصیبت ہوگی کہ جب وہاں پہنچوں گا تو وہ لوگ یہیں کہیں گے کہ کسی کام سے نکل گیا ہوگا۔‘‘

’’دیکھو۔ میرا خیال ہے گوشت ہوگیا۔ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر بستی موجود ہے۔ وہاں سے تجھے تیرا راستہ بھی مل جائے گا۔ کیا تو کریم والا سے اپنے گھر پہنچ سکتا ہے؟‘‘

’’ارے ہاں۔ کیا کریم والا کہیں آس پاس موجود ہے؟‘‘

’’تھوڑا فاصلہ ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ کوئی آدھے گھنٹے کی مسافت ہے۔ پر میرے لیے نہیں تیرے لیے۔ میری رفتار سست ہوگی۔ جا گوشت دیکھ۔‘‘ بوڑھے نے پھر کہا اور اس بار گوشت واقعی تیار ہو چکا تھا۔ شاہ زیب نے لکڑیاں کھینچیں اور ایک دوسرے پر لکڑی مار کر آگ بجھائی اور جب ہرن کے نیچے کا ماحول صاف ستھرا ہو گیا تو اس نے ٹکٹکی پر لٹکے ہوئے ہرن کا ایک بازو کاٹ لیا اور اسے لیے ہوئے بوڑھے کے پاس پہنچا۔

’’گرم ہے؟‘‘ بوڑھے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہاتھ بڑھا کر بازو لے لیا۔ پھر بولا۔

’’تو بھی کھا میری طرف سے اجازت ہے۔ شاہ زیب نے گوشت کا ایک ٹکڑا لے لیا اور اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ بھوک سے برا حال ہو رہا تھا لیکن شاہ زیب اپنے دانتوں سے گوشت ادھیڑنے لگا۔ بوڑھا بھی خاموشی سے گوشت کھا رہا تھا۔ شاہ زیب نے اسے غیر معمولی شخصیت پہلے ہی تسلیم کر لیا تھا۔ اب بھی اس نے اسے اسی انداز میں دیکھا۔ بوڑھا کہنے لگا۔

’’پانی تجھے لانا ہوگا۔ برتن میرے پاس موجود ہے۔‘‘ اس نے ایک طرف اشارہ

کیا۔ سلور کا ایک بڑا پیالہ رکھا ہوا تھا۔

’’یہ ہرن آپ نے شکار کیا ہے؟‘‘

’’ہاں کچھ شکار ہوتے ہیں کچھ شکاری۔ میں بھوکا تھا۔ یہ ٹہلتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ میں نے سوچا کہ چلو جب یہ خود ہی میرا میزبان بن رہا ہے تو تکلف کیسا۔ میں نے اسے چھرا مار کر ہلاک کر دیا۔‘‘

’’چھرا مار کر؟‘‘ شاہ زیب نے تعجب سے پوچھا۔

’’ہاں۔ یہی چھرا جو تیرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے اسے صاف کر لیا تھا۔‘‘ شاہ زیب کو یہ اندازہ ہو گیا کہ بوڑھا غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ باقی انتظامات کرنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ بہر حال اس کے بعد اس نے پانی کا برتن لیا اور جوہڑ سے پانی لے آیا۔ وہ خود بھی اچھی طرح شکم سیر ہو چکا تھا۔ سب سے بڑا عذاب خمار گندم کا عذاب ہے۔ کیا سمجھے ہے یا نہیں۔‘‘

’’کس طرح سے؟‘‘

’’بس یہ جب پیٹ بھرتا ہے تو باقی سب کچھ ختم ہو جاتا ہے اور اسی سے پتا بنیادی بات ہے۔‘‘

’’ہاں یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔‘‘

’’تو پھر چلو۔ چلتے ہیں۔‘‘

’’کک۔۔۔ کہاں؟‘‘ شاہ زیب نے تعجب سے پوچھا۔

’’بس کریم والا چلتے ہیں۔ یہاں سے تم اپنا راستہ تلاش کرنا اور وہاں دوست رہتا ہے میرا۔ اس سے بھی ذرا ملنا ہے کیا سمجھا۔‘‘ شاہ زیب خاموش ہو گیا۔ اس جگہ رات گزارنا ضروری بھی نہیں تھا۔ چنانچہ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''یہ گوشت اس کا ہم کیا کریں گے؟''

''بس۔ ہمیں کیا معلوم کہ اس کا کیا ہوگا' کیا سمجھا۔ جانے دے۔ جس کی تقدیر کا ہوگا اسے مل جائے گا۔ ہمارا کام تو بس اتنا ہی تھا جتنا ہوگیا۔'' شاہ زیب ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگیا۔ اس شخص کے بارے میں اسے اندازہ تھا کہ ذرا مختلف قسم کا آدمی تھا۔ سفر جاری ہوگیا۔ شاہ زیب بہر حال کسی جگہ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ بوڑھے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا لیکن یہاں بھی ایک دلچسپ تماشا ہی سامنے آیا۔ بوڑھے کا قد تو لمبا تھا ہی لیکن اس کی جسمانی طاقتیں بے مثال تھیں۔ بیساکھی کے ذریعے وہ اتنے لمبے قدم اٹھا رہا تھا کہ خود شاہ زیب کو اس کے ساتھ بڑی تیز رفتاری سے چلنا پڑ رہا تھا۔ بہر حال کسی بھی طرح بوڑھے میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی تھی جو ظاہر کرے کہ یہ اس کی معذوری اور عمر کا راستہ روکتی ہے۔ وہ سو جوانوں کا ایک جوان تھا۔ شاہ زیب کے دل میں ایک کرید پیدا ہوئی تھی کہ وہ اس کے بارے میں اس سے زیادہ معلوم کرے لیکن اسے کوئی صحیح اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

☆☆☆

چوہدری جبار خاں آخر کار اپنے گھر پہنچ گیا۔ راستے میں زخمی ہونے والوں میں سے ایک اور مر گیا تھا۔ تیسرے کی حالت بھی خراب تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ شاید وہ بھی زندہ نہ رہنے پائے۔ بہر حال وہ حویلی پہنچ گیا تھا اور پھر اندر جا کر اس نے اپنے آدمیوں کو ہدایت دینا شروع کر دیں۔ دونوں لاشیں ایک جگہ رکھوا آیا تو اسے صورتحال معلوم ہوئی۔ دوسرے لمحے وہ بھائی کے پاس پہنچ گیا۔

''اوئے کیا ہوا۔ کیا ہوا یہ؟'' جبار خاں کے چہرے پر خون اترا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

''اس حرامی نے میرے دو بندے مار دیئے۔''

''کس نے؟''

''اسی شاہ زیب کی بات کر رہا ہوں۔''

''کیا؟''

''ہاں۔''

''مگر ہوا کیا تھا پوری بات تو بتاؤ بھئی؟'' الیاس خاں نے کہا اور جبار خاں اسے تفصیل بتانے لگا۔

''یار! میں نے تجھے منع کیا تھا کہ اس کی ضمانت مت کرا ڈس لیا نا اس نے تجھے۔''

''مجھے نہیں ڈسا اس نے خان جی! مگر اس نے اپنی حویلی میں رہنے والے لوگوں کو ڈس لیا۔''

''اوئے نہیں بھئی نہیں۔ بات سن تیرے فیصلے ہمیشہ غلط ہوتے ہیں۔ جو میں کہہ رہا ہوں اب اس سے الگ نہیں ہونا چاہیے۔ حویلی والوں کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟''

''آگ لگا دوں گا میں پوری حویلی کو۔''

''اوئے شرم کر شرم چوہدری! اہن کے گھر کو آگ لگائے گا اور پھر وہاں کے لوگوں نے کیا کیا ہے۔ انہوں نے تو تیرا پورا پورا ساتھ دیا ہے۔ جو ہم نے کہا ہے وہی کیا ہے انہوں نے۔''

''مگر میرا خون کھول رہا ہے۔''

''اوئے اس خون کو ٹھنڈا کر عقل سے سوچ۔ میں نے پہلے بھی یہ بات کہی تھی کہ تھوڑے دن پڑا رہنے دے تھانے میں۔ تھانیدار سے کہہ کر اس کی ہڈی پسلی ایک کراتا اور اس کو قابل نہ چھوڑتا کہ وہ کچھ کرے۔ میں نے تو کچھ اور ہی سوچا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ بس ٹانگیں ختم کرا دی جائیں اس کی۔ تھانیدار یہ کام آسانی سے کر لیتا۔ گولی مار دیتا اس کی

دونوں ٹانگوں میں اور پھر علاج کرالیتا اس کا۔ ہمدرد بھی بن جاتے۔ ہم تھانے سے بھی نکال لاتے۔ مگر اس وقت جب اس میں بھاگنے کی ہمت نہ ہوتی۔ مگر جلد بازی بھئی تیری جلد بازی۔''

''خاں جی بھٹے پر کام تو شروع ہونا تھانا۔''

''کمال کا آدمی ہے یار تو۔ میں نے تجھ سے کہہ دیا کہ میں کام شروع کرانے جا رہا ہوں اور کام شروع ہو جائے گا۔ بھلا کام شروع ہونے میں رکاوٹ کون بنتا۔ انور اور امیر وہاں کام کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ کام شروع ہو چکا ہے۔''

''مگر خاں جی! اس دوران اگر وہ کوئی حرکت کر ڈالتا تو؟''

''کیا حرکت کر ڈالتا۔ زیادہ سے زیادہ خیر چھوڑ دو بندے مارے گئے۔ بڑا دکھ ہوا ہے بڑے کام کے آدمی تھے۔''

''تیسرا ابھی مر جائے گا خاں جی!''

''تو پھر۔''

''اور وہ نکل گیا ہے۔''

''ہاں سب سے بری اور بڑی بات یہ ہے کہ وہ نکل گیا ہے۔ اس پر ہاتھ ڈالنے کے لیے بڑی محنت کرنا ہوگی۔ چل تو بول کیا کر سکتا ہے اس سلسلے میں اور تیرا کیا ارادہ ہے؟''

''خاں جی! آپ بتاؤ اور جیسا آپ کہو۔''

''پہلی بات تو یہ کہ اپنے بندے کو تلاش پر لگا دے سمجھے۔ ابھی ہم اگر پولیس کو اس کے پیچھے لگاتے ہیں تو ہو سکتا ہے وہ پولیس کے ہاتھ آ جائے اور اس کے بعد ہمارے لیے کچھ مشکلات کھڑی ہو جائیں۔ بھئی سارے بندے تو اپنے نہیں ہیں۔ بھاگ دوڑ کرنی پڑے گی کہ یہ کرو وہ کرو۔ بندے تم خاموشی سے دفن کرا دو۔ تیسرا مر جائے تو اسے بھی دفن کرا دو اور

ان کے گھر پیسہ بھجوا دو۔ اس سے کہو بندے کام سے گئے ہوئے ہیں۔ اصل بات بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کام کرا دو اور اس کے بعد اپنے بندوں کو اس کی تلاش میں لگوا دو۔ تیسرا کام مجھے یہ کرنا ہے کہ شاہینہ کو فون کیے دیتا ہوں۔''

''شاہینہ کو؟''

''ہاں اس سے کہتا ہوں کہ اگر شاہ زیب ادھر کا رخ کرے تو ایک لمحے کے اندر اندر ہمیں اطلاع دے اور کوئی بات ابھی شاہینہ کو نہیں بتانی۔ عورتوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا ہے کہیں وہ کسی اور سے نہ کہہ دے۔ شاہ زیب کو ہمارے ہاتھ آنا چاہیے۔ ہماری باتیں اپنی جگہ بھٹہ بنانے کا کام شروع کرا دیا گیا ہے۔ لیکن اس سے دستخط لینا بڑا ضروری ہے۔ اس سے دستخط لے کر اسے زمین کے نیچے پہنچا دیں گے کیا سمجھے۔''

''کیا اس کی تلاش اتنی آسان ہوگی خاں جی؟''

''اوہ تو نے جو کرنا تھا وہ تو نے کر ڈالا۔ اب باقی میں دیکھوں گا۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔'' چوہدری الیاس نے کہا اور جبار خاں پرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔ پھر بولا۔

''پھر بھی میرے لیے کیا حکم ہے چوہدری جی؟''

''فی الحال تو آرام کر میں دیکھتا ہوں۔'' چوہدری الیاس نے کہا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

بستی کا سفر بڑا دلچسپ رہا تھا اور مکرم شاہ کی کاوشیں بڑی سنسنی خیز تھیں۔ یہاں تک کہ وہ بستی کریم والا میں داخل ہو گئے۔ چھوٹی سی آبادی تھی۔ چند گلیوں اور سڑکوں سے گزرنے کے بعد مکرم شاہ ایک بڑے سے مکان کے سامنے رکا۔ لال اینٹوں کا بنا ہوا مکان

تھا اور خاموشی اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ سامنے ہی پیپل کا ایک درخت نظر آ رہا تھا۔ جو خاصا پھیلاؤ رکھتا تھا اور اس کا تنا بھی کافی چوڑا تھا۔ مکرم شاہ نے کہا۔

''وہ میرا یار سامنے رہتا ہے۔ معاف کرنا میں تجھے اس کے گھر نہیں لے جا سکتا۔ آدھے پونے گھنٹے کی بات ہے۔ میں اپنا کام ختم کر کے نکل آؤں گا۔ ویسے بھی اب تیرا میرا کوئی خاص ساتھ نہیں ہے۔ یہ کریم والا ہے' کوئی جگہ تلاش کر کے اپنے لیے منتخب کر لے۔ صبح کی روشنی ہوگی تو یہاں سے معلومات حاصل کر کے نکل جانا۔''

''آپ اپنے دوست کے پاس ہی رہیں گے۔''

''دیکھوں گا کیا ہوگا اور کیا کرنا ہوگا مجھے۔'' مکرم شاہ نے کہا اور پھر وہ بیساکھی ٹیکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ شاہ زیب گہری سانس لے کر اسے دیکھنے لگا۔ اس وقت بھی اس کی چال اور رفتار وہی تھی۔ جو تمام راستے رہی تھی اور شاہ زیب کو لطف ہی آ گیا تھا اس کا ساتھ دیتے۔ کتنی ہی جگہ اسے مکرم شاہ کے ساتھ دوڑنا پڑا تھا۔ جب اس شخص کی دونوں ٹانگیں ہوں گی تب تو یہ گھوڑے کی طرح دوڑتا ہوگا۔ بہرحال وہ اس لال مکان کے پاس پہنچ گیا۔ مکان کا دروازہ سامنے ہی تھا لیکن مکرم شاہ اس کے برابر چلتا ہوا پیچھے جا کر غائب ہو گیا تھا۔ شاہ زیب درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اب صورتحال بہت مختلف ہو گئی تھی۔ کبیر والا جانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ حویلی میں پہلے ہی اس کے لیے کوئی موجود نہیں تھا۔ کیا کرنا چاہیے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اتنی دور کی مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچا تھا۔ ایک بار پھر بدن میں تھکن ہو گئی تھی۔ اور اب اس کے اندر اتنی سکت نہیں تھی کہ آگے کا سفر اختیار کروں۔ اس نے سوچا کہ درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا رہے گا اور اس کے بعد یہاں سے چل پڑے گا۔ کسی خاص جگہ کا تعین تو کرنا نہیں تھا اسے۔ اصل میں یہی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ جائے تو جائے کہاں۔ ابھی تک ایسی کوئی

خاص بات نہیں ہوئی تھی چوہدری جبار نے باقاعدہ ضمانت کرائی تھی چنانچہ اب جب تک وہ کوئی اور رپورٹ درج نہ کرائیں' پولیس سے بچت تھی لیکن وہی سوال پیدا ہوتا تھا کہ کہاں جائے۔ ایسی حالت میں ممنون کی طرف رخ کرنا بھی خطرناک تھا۔ جبار خاں اور الیاس خاں کے بارے میں اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ جبار خاں کے ساتھ جو کچھ بیتی ہے وہ اس کا بدلہ لینے کی کوشش ضرور کریں گے۔ بہرحال یہ سب کچھ چل رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے کچھ اونگھ سی آ گئی تھی کہ اچانک ہی کچھ زوردار چیخیں ابھریں اور شاہ زیب کی آنکھ کھل گئی وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ سامنے والے لال اینٹوں کے مکان میں ایک دم تیز روشنی جل اٹھی تھی اور لوگ دوڑتے ہوئے باہر نکل آئے تھے۔ ان کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

''پکڑو' کدھر گیا ہے۔''

''نہیں ادھر گیا ہے۔''

''ادھر کہاں۔''

''وہ سامنے کی سمت دوڑا ہے۔''

''دماغ خراب ہے تمہارا پیچھے کی دیوار کود کر بھاگا ہے۔''

''تو آؤ پیچھے چلو۔'' اور پھر لوگ پیچھے کی جانب دوڑ گئے۔ شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا قصہ ہوا ہے۔ بہرحال وہ ان لوگوں کی بھاگ دوڑ دیکھتا رہا۔ اندر سے ایک دم رونے پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں تھیں۔ شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے۔ اس کے ذہن میں شدید تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ پھر اچانک اسے اپنی رائفل اور کارتوس کا خیال آیا اور اس نے سوچا کہ کہیں یہ اس وقت اس کے لیے مصیبت نہ بن جائے۔ پیپل کے درخت کے پیچھے ایک ایسی جگہ موجود تھی۔ جہاں وہ چاہتا تو رائفل ٹکا کر کھڑی کر سکتا تھا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ لوگوں کے درمیان شامل ہونے کے لیے ان کے ساتھ ہونا ضروری تھا۔ تبھی

صورتحال معلوم ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک لمبا چکر کاٹا۔ اندر سے رونے پیٹنے کی آوازیں اور ادھر بھاگ دوڑ ہو رہی تھی۔ لوگ لالٹینیں لے کر دوڑ رہے تھے۔ چودھویں رات کا چاند آخری سفر طے کر رہا تھا اور اس پر بادلوں کے سائے آ گئے تھے۔ اس لیے تھوڑا سا ماحول تاریک ہو گیا تھا۔ لالٹین بردار لوگ ادھر سے ادھر دوڑتے رہے۔ کچھ لوگ قریب کھڑے ہوئے تھے۔ اندر سے بدستور رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاہ زیب نے ایک آدمی سے کہا۔

''ہوا کیا ہے بھائی' کیا ہو گیا؟''

''اوہ بھائی چوہدری غلام علی اور اس کے دونوں بھائیوں کو قتل کر دیا گیا۔ گردنیں کاٹ دی گئیں ان کی۔ اللہ رحم کرے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں۔ تینوں کی گردنیں اتار کر دور پھینک دی گئیں ہیں اور جانتے ہو جس بندے نے گردنیں کاٹیں ہیں وہ لنگڑا تھا۔ بیساکھی سے چلتا تھا۔ شاہ زیب کے پورے بدن میں ایک گڑگڑاہٹ سی پیدا ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ بمشکل تمام اس نے خود کو سنبھالا۔

''لنگڑا۔''

''ہاں لنگڑا۔ بیساکھی سے چل رہا تھا۔ پر کمال آدمی تھا۔ بیساکھی کے بل پر اس نے اتنی اونچی چھلانگ ماری اور نکل بھاگا اور اتنے بندے اس کا پیچھا کر رہے ہیں لیکن کسی کے ہاتھ نہیں آیا۔ سنا ہے لگڑے والی سڑک پر دوڑ گیا ہے۔'' شاہ زیب حیران نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جو کہانی سنی تھی وہ واقعی ناقابل یقین تھی۔ مکرم شاہ اس کا مطلب ہے مکرم شاہ یہاں کسی کو قتل کرنے آیا تھا اور وہ جتنا خونخوار بوڑھا تھا اسے دیکھ کر یہ بات سوچی جا سکتی تھی کہ وہ یہاں کسی سے اپنا انتقام لینے آیا ہے۔ شاہ زیب کو اپنے بدن میں خاصی تھرتھری سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ راتوں رات ہی یہاں سے نکل جانا زیادہ مناسب ہے۔

نہیں ایسا نہ ہو آفتیں گلے پڑ جائیں۔ چنانچہ وہاں سے آگے بڑھا اور درخت کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں سے اس نے اپنی رائفل سنبھالی۔ کارتوسوں کی پیٹی کندھے سے لٹکائی اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بستی کو پیچھے چھوڑ آیا۔ کوئی منزل' کوئی راستہ نہیں تھا بس چلا جا رہا تھا۔ ویسے بھی ایک طویل عرصے لاہور میں رہ چکا تھا اس لیے اب آس پاس کے علاقوں سے ناواقفیت ہو گئی تھی۔ شکلیں بدلتی رہتی ہیں اس لیے کریم والا کے بارے میں بھی اسے کوئی خاص معلومات نہیں رہی تھی۔ کریم والا ایک بار پہلے آیا تھا کسی چکر میں لیکن اب نقشے ہی بدل گئے تھے۔ وہ چلتا رہا اور کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد جب صبح کی روشنی بیدار ہوئی تو اس نے اس علاقے کو پہچان لیا اور اس علاقے کو پہچان کر اس کی جو حالت ہوئی وہ ناقابل بیان تھی۔ یہ اس کی اپنی زمینوں کا علاقہ تھا۔ وہی بنجر زمینیں جنہیں آباد کرنا اس نے اپنا ایمان بنا لیا تھا اور کچھ زیادہ ہی محبت محسوس ہونے لگی تھی اسے۔ اس قدر ضد نہ کی جاتی اور کسی مناسب طریقے سے اسے ان زمینوں کے بارے میں بات کی جاتی تو شاید اس کے ذہن میں کوئی نرم گوشہ نکل آتا لیکن ایک شدید ضد چڑھا دی گئی تھی یہ بتا دیا گیا تھا اسے کہ اب یہ زمینیں اس کی ملکیت نہیں رہیں ہیں۔ خاص طور سے بڑی بھابی نے تو یہ کہہ دیا تھا کہ اس کی تعلیم پر جو اخراجات ہوئے ہیں وہ ان زمینوں کی قیمت کے متبادل ہیں اور اب اس کا کوئی حصہ اس ساری دولت اور جائیداد میں نہیں رہا۔ بات بڑی مضحکہ خیز تھی۔ اتنی معمولی جائیداد بھی نہیں تھی کہ تعلیم پر خرچ ہو جانے والے تھوڑے سے پیسوں کے عوض ختم ہو جاتی۔ وہ لوگ بددیانتی پر آمادہ تھے۔ لیکن وہ انہیں یہ بددیانتی نہیں کرنے دے سکتا تھا۔ بے شمار خیالات اس کے ذہن سے گزرنے لگے اور پھر اچانک ہی اس کی نگاہیں ایک طرف اٹھیں اور دوسرے لمحے اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ آٹھ دس مزدور تھے جو وہاں کام کر رہے تھے۔ بے شمار اینٹوں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ سیمنٹ اور ریت کے انبار بھی لگے ہوئے تھے۔ ایک

جگہ بھٹے کا مینار بنانے کے لیے چنائی ہو رہی تھی۔ مزدوروں نے ابھی اپنا کام شروع نہیں کیا تھا لیکن ایک ایک کر کے مزدور جمع ہوتے جا رہے تھے۔ اور ان کی تعداد کوئی دس بارہ کے قریب تھی۔ ایک لمحے کے اندر اندر شاہ زیب کے ذہن میں ساری تفصیل آ گئی۔ چوہدری الیاس اور چوہدری جبار نے بھٹہ بنانے کا کام شروع کر دیا تھا اس کی زمینوں پر۔ ان زمینوں پر آگ نہیں جلے گی اس زمین پر تو سبزہ زار اگنے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں جو اس زمین پر آگ جلائے۔ یہاں بھٹہ نہیں بنے گا۔ شاہ زیب کے اندر سے آواز ابھری اور یہ آواز آہستہ آہستہ اس کے ہونٹوں سے خارج ہونے لگی۔ پھر اس کے قدم اس جانب اٹھ گئے۔ ایک جگہ رک کر اس نے رائفل لوڈ کی اور اسے ہاتھ میں لے کر آگے بڑھ گیا۔ یہاں تک کہ وہ ان مدوروں کے پاس پہنچ گیا۔ مزدور اسے حیرت سے دیکھنے لگے تھے۔ اس نے ان میں سے ایک مزدور کو انگلی سے اشارہ کیا اور وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ سب ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔

''اینٹوں کا بھٹہ بن رہا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں جی، چوہدری الیاس خاں کا بھٹہ ہے۔''

''تمہارا نگراں کون ہے۔ ٹھیکیدار کون ہے اسے بلاؤ۔''

''میں ہی ہوں جناب ابات کیا ہے؟''

''دیکھو ٹھیکیدار یہ زمین میری ہے اور چوہدری الیاس خاں اس پر ناجائز کام کر رہا ہے۔ یہ غلط ہے تم لوگ اب پہلا کام یہ کرو کہ یہ جو تم نے جتنی چنائی کی ہے اسے گرا دو۔ سب لوگوں سے کہو کہ اس کام میں مصروف ہو جائیں۔''

ٹھیکیدار کا منہ حیرت سے کھل گیا وہ شاہ زیب کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''اوہ کیا بات کر رہے ہو باؤ جی! ہفتے کی محنت لگی ہے ہماری۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ زمینیں تمہاری ہیں تو چوہدری انور سے بات کرو۔''

''اس سے میں بعد میں بات کروں گا۔ پہلے تم سے جو کہہ رہا ہوں کرو۔'' شاہ زیب نے کہا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں تھیں۔ پھر اس نے رائفل سیدھی کر لی۔

☆☆☆

ٹھیکیدار کا منہ پھر کھلا رہ گیا۔ کہیں اچانک رائفل سے گولیاں چلیں تو وہ اچھل کر بھاگا۔ 'او کیا کرتے ہو باؤ جی! کیا کرتے ہو؟''

''چلو بھٹہ گراؤ۔ ورنہ تم سب کو بھون دوں گا۔'' شاہ زیب نے غراتی ہوئی آواز میں کہا اور پھر ایک دو گولیاں چلائیں۔ وہ لوگ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے اور اس کے بعد ہتھوڑے اور کدالیں لے کر وہ تمام تعمیر گرانے لگے۔ جو انہوں نے کی تھی۔ دفعتاً ان میں سے ایک چیخا۔

''لو جی۔ مالک آ گئے۔'' شاہ زیب دور سے اس جیپ کو دیکھنے لگا جو اس طرف آ رہی تھی۔ کافی فاصلے پر ایک اور جیپ بھی تھی۔ جو سست روی سے چلی آ رہی تھی۔ آنے والی پہلی جیپ میں چوہدری الیاس کے دونوں بیٹے انور اور امیر موجود تھے۔ ان کے ساتھ دو آدمی اور بھی موجود تھے۔ جو ان کے باڈی گارڈ تھے۔ انور اور امیر مزدوروں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ابھی ان کی نگاہ شاید شاہ زیب پر نہیں پڑی تھی۔ ویسے بھی شاہ زیب ایک ایسی آڑ میں تھا جو چنی ہوئی اینٹوں کی آڑ تھی۔ اس لیے انہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ امیر زور سے چیخا۔

''اوئے کتے دے پترو! یہ کیا کر رہے ہو۔ کیا کر رہے ہو یہ؟'' وہ جیپ سے کود کر نیچے اتر آیا اور ٹھیکیدار نے گردن گھما کر شاہ زیب کی طرف دیکھا۔ پھر سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

''وہ صاحب بھی ادھر --- سر جی ادھر۔'' تب امیر اور انور نے اس طرف دیکھا۔ ایک لمحے تک تو انہیں شاہ زیب کو پہچاننے میں دقت ہوئی لیکن پہلے بہت سی ملاقاتیں ہو چکی

تھیں۔ رشتے داری تھی شاہ زیب سے۔ چنانچہ انہوں نے اسے پہچان لیا۔ البتہ حویلی میں یہ
بات ان کے کانوں تک پہنچ چکی تھی کہ شاہ زیب نے چوہدری جبار کے دو آدمی مار دیئے ہیں۔
چنانچہ امیر نیچے اتر آیا۔

''شاہ زیب تم؟''

''ہاں پہچان گئے تم مجھے' بھٹہ بنا رہے ہو یہاں پر۔''

''تم نے ہمارے دو آدمی مار دیئے ہیں شاہ زیب! اور اب تم بچ نہیں سکو گے۔''

''دیکھو۔۔۔ بے شک تمہاری اور میری عمر میں زیادہ فرق نہیں ہے لیکن رشتے میں تم
سے تھوڑا سا بڑا بھی ہوں۔ میں نے یہ بھٹہ تڑوا دیا ہے۔ یہ زمینیں میری ہیں اور میں نے اپنی
ماں سے ان کے لیے کچھ وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ تم لوگ یہاں یہ کام نہ کراؤ۔ تم بچے ہو' میں تمہیں
کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے شاہ زیب! بھٹہ تو خیر بنے گا یا نہیں بنے گا لیکن تم یہاں سے نہیں
نکل کر جا سکو گے۔ ہمیں تمہاری تلاش تھی یہ پیچھے جو جیپ آ رہی ہے۔ اس میں آٹھ آدمی سوار
ہیں۔ اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی تو یہ تمہیں بھون ڈالیں گے۔ ہمیں تمہارا گولیوں سے چھلنی جسم بھی
قبول ہوگا۔''

''سنو۔۔۔ کسی چکر میں مت رہو۔ ایسا کرو یہاں سے چلے جاؤ۔ ان مزدوروں
کو بھی لے جاؤ۔ اس کے بعد اس طرف کا رخ مت کرنا۔ چوہدری الیاس سے کہہ دینا کہ یہ
زمین میری ہے۔ تم ہزار آدمی بھی یہاں لے کر آؤ گے تو اس زمین پر بھٹہ نہیں بنا سکو گے۔''

''تیری تو ایسی تیسی۔'' امیر نے یہ کہہ کر ریوالور نکالا لیکن شاہ زیب تیار تھا۔ رائفل
سے فائر ہوا۔ اب یہ اتفاق تھا کہ اسی وقت انور نیچے کودا تھا اور گولی اس کے دل کے مقام پر
پڑی تھی۔ وہ امیر کے سامنے آ گیا تھا۔ ایک دم شور مچ گیا۔ مزدوروں اور ٹھیکیدار نے دوڑ لگا

دی۔ ادھر امیر نے انور کو پکڑ لیا تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ دوسرے لمحے امیر کی
آواز ابھری۔

''انور۔۔۔ میرے بھائی انور۔۔۔'' وہ اپنے بھائی کو سنبھالنے لگا جو خون میں لت
پت اس کے بازوؤں میں جھول گیا تھا۔ شاہ زیب نے کہا۔

''انور کو ہلاک کرنے میں میرے ارادے کا دخل نہیں تھا کوشش تم نے کی تھی میں
نے صرف تمہارا ہاتھ زخمی کرنے کے لیے رائفل سے فائر کیا تھا۔ میں دعا کرتا ہوں کہ انور
ٹھیک ہو جائے۔ جاؤ اسے لے کر ہسپتال جاؤ۔ میں چلتا ہوں مگر یہ بات چوہدری کو بتا دینا
کہ ان زمینوں پر بھٹہ نہیں بنے گا۔ یہاں آگ نہیں روشن ہونی چاہیے۔ ورنہ تمہاری پوری
حویلی جلا کر خاکستر کر دوں گا۔ اس بات کو اپنے دماغ میں رکھنا۔ دوسری جیپ اب قریب
پہنچتی جا رہی تھی۔ اس لیے زیادہ دیر [illegible] خطرناک تھا۔ ایک ساتھ ہی کچھ فائر ہوئے یہ فائر
ان باڈی گارڈز نے کیے جو انور اور امیر کے ساتھ جیپ میں موجود تھے۔

''لیکن اینٹوں کی آڑ لے کر شاہ زیب نے پھر دو فائر کیے اور ان دونوں کے بھیجے
اڑ گئے۔ پھر اس کے بعد شاہ زیب نے پیچھے کی سمت چھلانگ لگا دی اور اس کے بعد وہ برق
رفتاری سے دوڑتا چلا گیا۔ ایک بار پھر اسے شدید مشقت کرنی پڑ رہی تھی۔ واقعات اس
طرح پے در پے پیش آ رہے تھے کہ اس کے ہاتھوں قتل بھی ہو رہے تھے۔ اور صورتحال سنگین
سے سنگین تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ برق رفتاری سے دوڑتا رہا۔ سامنے ہی کسی باغ کے آثار نظر آ
رہے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ دوسری جیپ اس کے پیچھے چل پڑی ہے۔ جس میں
چوہدری الیاس کے آدمی موجود تھے۔ اگر وہ جیپ اتنی پیچھے نہ ہوتی تو شاید شاہ زیب کے لیے
یہ کام کرنا مشکل ہو جاتا۔ جو وہ کر کے آیا تھا لیکن اب وہ جیپ اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

چند لمحوں کے بعد اس سے فائر بھی ہونے لگے اور شاہ زیب نے اپنی رفتار تیز کر

دی۔ باغ اس کے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوسکتا تھا۔ چنانچہ چند ہی لمحوں کے بعد وہ درختوں کے درمیان پہنچ گیا۔ آم کے باغ تھے اور خاصے پرانے تھے۔ کیونکہ آم کے درخت بہت وسیع ہو چکے تھے۔ اور ان کے درمیان شاہ زیب کو پناہ مل گئی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا بہت دور نکل آیا۔ یہ بات تو اس کے علم میں تھی کہ جیپ درختوں کے درمیان داخل نہیں ہو سکے گی۔ وہ لوگ اسے درختوں میں داخل ہو کر ہی تلاش کریں گے۔ کافی دور تک دوڑنے کے بعد جب وہ ایک جگہ رکا اس کے کان پوری احتیاط سے کام کر رہے تھے اور اسے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جارہا۔ وہ آہٹیں لیتا رہا۔ لیکن کوئی آواز اسے سنائی نہ دی۔ پھر وہ ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ بدن تھکن سے چکنا چور ہو رہا تھا اور اس پر نیم غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اتنی بھاگ دوڑ آسان نہیں ہوتی۔ دفعتاً اسے ایک آہٹ سنائی دی اور اس سے پہلے کہ وہ چونکے کسی کی رائفل کی نال اس کی گدھی سے آ لگی۔ شاہ زیب ایک لمحے کے لیے ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ صورتحال گڑبڑ ہوگئی۔ اس نے سوچا۔

پھر ایک دم سناٹا زخمی ہو گیا۔ چاروں طرف سے آوازیں ابل پڑی۔ شاہ زیب کا تعاقب کرنے والے دم سادھے اس جنگل میں شاہ زیب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ شاہ زیب چونکہ نڈھال ہو چکا تھا۔ اس لیے پوری طرح ہوش وحواس میں نہیں تھا اور شاید اس کے بدن کی سرسراہٹیں سن لی گئی تھیں۔

چنانچہ خاموشی سے اسے تلاش کرنے والوں میں سے کسی نے اسے دیکھ لیا تھا اور بڑی ہوشیاری اور چالاکی کے ساتھ پیچھے سے آ کر رائفل کی نال شاہ زیب پر رکھ دی تھی اور جیسے ہی اسے احساس ہوا کہ اب اس نے شاہ زیب جیسے خطرناک قاتل پر قابو پالیا ہے تو اس نے شور مچا دیا۔

''دوڑو ادھر ادھر میں نے اسے قبضے میں کر لیا ہے۔'' بھاگتے قدموں کی بہت سی

آوازیں سنائی دیں اور تھوڑی ہی دیر کے بعد شاہ زیب پر بہت سے لوگوں نے حملہ کر دیا۔ گھونسے تھپڑ لاتیں۔ شاہ زیب تھوڑی دیر تک یہ چوٹیں برداشت کرتا رہا اور پھر اس کے حواس جواب دے گئے۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسے پکڑنے والے اب بھی اسی طرح چیخ رہے تھے جیسے انہوں نے کسی طاقتور ہاتھی کو پتلی رسیوں میں جکڑ لیا ہو اور اس خوف کا شکار ہوں کہ کہیں ہاتھی بھاگ نہ جائے۔ ہر شخص اپنی اپنی باتیں کر رہا تھا۔

''نکلنے نہ پائے' دیکھو بے ہوش ہو گیا ہے یا نہیں۔ پولیس اسٹیشن لے چلو سیدھے پولیس اسٹیشن۔''

''یہ قاتل ہے۔ یہ خونی ہے لے چلو۔'' اسی طرح کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ بے ہوش شاہ زیب کو مختلف طریقوں سے کس کر باندھ لیا گیا۔ پھر وہ لوگ اسے ہاتھوں اور پیروں سے پکڑ کر چل پڑے۔ کسی نے کہا۔

''ذرا اس کے مسئلے میں بھی ہوشیار رہنا یہ بھی کوئی للو پنجو نہیں ہے۔ بہت بڑے گھرانے کا بندہ ہے۔ زخمی ہو گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ پولیس جانے اور اس کا کام۔''

شاہ زیب کو تھوڑی دیر کے بعد پولیس اسٹیشن پہنچا دیا گیا تھا اور انسپکٹر کو اس بارے میں تفصیل بتائی جا رہی تھی۔

''ارے کیا اس نے الیاس خاں کے بیٹے انور خاں کو مار دیا۔'' ایک آفیسر جو شاید الیاس خاں کو جانتا تھا کہا۔

''ہاں انسپکٹر صاحب! اسی کو مار دیا ہے۔''

''او بھائی لمبا چکر چل گیا۔ اب دشمنیاں نکلیں گی' خون خرابے ہوں گے' یار میں کہتا ہوں یہ اس قسم کے بندے پال کیوں لیے جاتے ہیں۔ جن کے نزدیک جرم کرنا کوئی

بات ہی نہیں ہوتی۔ چلو بھئی پرچہ کاٹو۔ رپورٹ لکھاؤ۔'' انسپکٹر بے چینی سے کہہ رہا تھا۔ اصل میں یہ انسپکٹر اس علاقے میں نیا آیا تھا لیکن ایس آئی پرانا تھا۔ کہنے لگا۔

''سر جی! کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ پہلے الیاس خاں سے بات کر لی جائے۔ اس کے بعد پرچہ کاٹا جائے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' انسپکٹر نے حیرت سے کہا۔

''نہیں جی' اصل میں اس علاقے کے لوگوں کا یہ ہی اصول ہے۔ اگر ان کا کوئی معاملہ ہوتا ہے تو پہلے ان سے مشورہ لے لیا جاتا ہے۔ جیسا یہ کہیں۔ ورنہ سر جی صورتحال خراب ہو جاتی ہے۔''

''میں ذرا دوسرے قسم کا آفیسر ہوں' کام کرتا ہوں تو اپنی مرضی سے۔ یہ کیا بات ہوئی یہ لوگ کیا آئی جی لگے ہوئے ہیں یا بادشاہ ہیں اس علاقے کے کہ ان سے پوچھے بغیر کوئی کام نہ کیا جائے۔''

''سر جی! آپ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ آئی جی تو بے شک نہیں ہیں وہ اس علاقے کے لیکن یہ لوگ اپنی اپنی زمینوں کے بادشاہ ہی ہوتے ہیں۔ دوسروں کو پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔''

''مگر الیاس خاں اور جبار خاں پر تو اٹیک کیا گیا ہے ہم تو اس کے دشمن کے خلاف پرچہ کاٹ رہے ہیں۔''

''سر جی! جیسے آپ کی مرضی۔''

''اوئے' تم کام کرو۔ پیں پیں پیں مت لگایا کرو۔ چلو پرچہ کاٹو۔ جائے واردات پر چلتے ہیں۔ تیاریاں کرو۔''

''اس کا کیا کریں سر جی؟ بہت مارا ہے اسے ان لوگوں نے۔''

''بند کر دو ان سب کو۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''سر جی! ایک بار پھر آپ سے کہوں گا۔ یہ الیاس خاں اور جبار خاں کے آدمی ہیں اور پھر مار پیٹ کا یہ سلسلہ کسی ایک آدمی کا تو نہیں ہے۔ آپ جی اس چکر میں نہ پڑو تو بہتر ہے۔''

''بہت زیادہ مشورے مت دیا کرو مجھے' چلو جو کچھ میں کر رہا ہوں تیاریاں کرو۔ پہلے پرچہ کٹواؤ' نام لکھواؤ ان لوگوں کے اور پھر اس کے بعد جائے واردات پر چلو۔''

''ٹھیک ہے سر!'' ایس آئی نے ایڑیاں جماتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

انور کی لاش گھر پہنچ گئی۔ اس سے پہلے دو افراد برق رفتاری سے گھر دوڑا دیئے گئے تھے اور انہوں نے جبار خاں کو بتا دیا کہ انور مارا گیا۔ جبار خاں جو اپنی پسندیدہ کیاری کے پھولوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچھل پڑا۔ اس نے آنے والے لوگوں کی طرف دیکھا اور بولا۔

''کیا بک رہا ہے؟''

''سچ کہہ رہا ہوں بڑے شاہ' سچ کہہ رہا ہوں۔ مار دیا --- مار دیا اس نے انور کو مار دیا۔''

''شاہ زیب نے؟''

''ہاں شاہ جی' بھٹے پر پہنچ گیا تھا حرام کا پلا۔ بھٹہ تڑوا دیا۔ کہنے لگا یہاں آگ نہیں جلے گی یہ میری ماں کی وصیت کی زمینیں ہیں۔ بھٹہ توڑ دو۔ جب ہمارے بندوں نے انکار کیا تو اس نے دو بندے مار دیئے اور اس کے بعد بھٹہ تڑوا دیا۔ شاہ جی اتنی دیر میں انور شاہ اور امیر شاہ پہنچ گئے۔ ان سے تو تو میں میں ہوئی اور اس نے رائفل سے گولی مار۔ انور شاہ کو

ہلاک کر دیا۔ امیر شاہ ابھی اس کی لاش لے کر ادھر ہی آ رہے ہیں۔''

''اور وہ کہاں گیا؟'' جبار خاں کی خوفناک دھاڑ ابھری۔

''پکڑ لیا ہے شاہ جی! پکڑ لیا گیا ہے اسے' پولیس اسٹیشن لے گئے ہیں اسے' پکڑنے والے ہمارے اپنے بندے تھے۔''

''الیاس خاں' الیاس خاں۔ جبار خاں چیختا چلاتا ہوا اندر بھاگا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد ساری حویلی میں کہرام مچ گیا۔ عورتیں بین کرنے لگیں۔ گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ سارے ملازم دیکھاوے کے لیے ہی سہی رونے پیٹنے لگے۔ الیاس خاں وحشت کے عالم میں تھا۔ اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اس نے میرا بیٹا مار دیا۔ ارے یہ کیا ہو گیا۔ ایک ذرا سی زمین کے لیے انہوں نے میرا بیٹا مار دیا۔''

''حویلی کی اینٹوں کا ڈھیر بنا دو' ختم کر دو اس حویلی میں رہنے والے ایک ایک مرد کو۔ ورنہ الیاس خاں میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ انور کی ماں کربناک آوازیں نکالتی ہوئی بولی۔

''الیاس خاں خود بھی رو رہا تھا۔ پھر وہ تیاریاں کرنے لگے لیکن تھوڑی دیر کے بعد جیپیں حویلی پہنچ گئیں۔ انور کی لاش جیپ میں رکھی ہوئی تھی۔ الیاس خاں اور جبار خاں اور دوسرے لوگ اس طرف دوڑ پڑے اور اس کے بعد وہ رونا پیٹا مچا کہ سچ مچ ہر آنکھ غم کا شکار ہو گئی۔ جوان بیٹے کی لاش اٹھا کر الیاس خاں اندر لے آیا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے تھے۔ جبار خاں نے بھتیجے کی موت پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور اس نے بھتیجے کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میرے بیٹے تیری قسم کھاتا ہوں ایسا انتقام لوں گا اس کتے کے بچے سے کہ دنیا

تماشا دیکھے گی۔ میں کہتا ہوں کہ اسے پولیس کے حوالے کیوں کیا گیا۔ کس نے کیا اسے پولیس کے حوالے' بولو کس نے اسے پولیس اسٹیشن پہنچایا؟ کیا پولیس وہ کر سکتی ہے جو ہمیں کرنا ہے' کیا پولیس اسے وہ سزا دے سکے گی جو ہم اسے دینا چاہتے ہیں؟ پہلے اس کی ایک آنکھ نکالی جائے گی تاکہ وہ آنکھ کی محرومی کو محسوس کرے لیکن دنیا دیکھنے سے محروم نہ رہے۔ اس کے بعد وہیں وہ بھٹہ بنے گا وہ' اور جب میں پہلی بار اس بھٹے میں آگ لگاؤں گا تو یہ آگ شاہ زیب کے بدن پر لگے گی۔ پہلے اسے بھٹے پر جلا کر زمین کی قربانی دوں گا مجھے۔ قربانی دوں گا زمین کو اس حرام زادے کی۔ اسے پولیس کے حوالے کیوں کیا گیا۔ ہمارا مجرم تھا وہ۔ اسے ہمارے سامنے کیوں نہیں لایا گیا۔ داؤد خان تم بتاؤ کون لے گیا اسے پولیس اسٹیشن؟''

''شاہ جی! رحیم شاہ تھا جس نے یہ مشورہ دیا۔''

''کہاں ہے رحیم شاہ؟''

''سرکار! مجھ سے غلطی ہو گئی۔''

''نہیں' غلطیاں معاف نہیں کی جا سکتیں۔ رحیم شاہ کے دونوں پاؤں جلا دو۔ دونوں پاؤں جلا دوں اس کے' یہ اسے لے کر پولیس اسٹیشن کیوں گیا۔ کیوں یہ اس نے فیصلہ کیا؟''

''شاہ جی! غلطی ہو گئی ہے آپ کا نمک خوار ہوں جان آپ کی ہے۔ آپ لے لو گے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا لیکن ایک وعدہ کرتا ہوں۔ ایک وعدہ کرتا ہوں' پولیس اسٹیشن پہنچایا ہے نا اسے اپنے ہاتھوں سے' آپ بے فکر رہیں واپس بھی اسے میں ہی لے آؤں گا۔ لاک اپ میں ہو' جیل میں ہو' میں اسے نکال کر لے آؤں گا۔ آپ کے پاس چاہو تو اتنی اجازت دے دو۔ ورنہ جو حکم دے چکے ہیں اس کی تعمیل کراؤ۔''

''رحیم شاہ! اگر تو اسے نکال کر نہیں لایا تو زندہ جلا دوں گا تجھے' بالکل زندہ جلا دوں

گا۔ چھوڑوں گا نہیں تجھے' سمجھ رہے ہو نا۔''

''جی شاہ جی' سمجھ رہا ہوں۔ آپ اس کی تو بالکل پروا نہ کریں۔ میں نے تو غصے کے عالم میں اسے پولیس کے حوالے کیا تھا۔ لیکن آپ ٹھیک کہہ رہے ہو پولیس اسے وہ سزا نہ دے گی جو ہم دے سکیں گے۔ شاہ جی وہ آ جائے گا' آپ بالکل فکر نہ کریں۔''

''جاؤ دفع ہو جاؤ اور مجھے اس وقت تک اپنی شکل مت دکھانا۔ جب تک وہ تمہارے ساتھ نہ ہو اور خبردار کہیں میرا نام لے کر اسے تھانے سے نہ نکال لانا' سمجھے۔''

''شاہ جی! جو آپ کا حکم ہو کام وہی ہو گا لیکن اب چونکہ وہ پولیس اسٹیشن پہنچ چکا ہے اس لیے پولیس کو تھوڑی سی کارروائی تو کر لینے دو۔'' رحیم شاہ نے کہا۔

''دفع ہو جاؤ۔ دل میں سوراخ ہو گیا ہے میرے۔ میں کیا کروں گا' کیا کروں گا۔''

''صبر کرنا ہو گا الیاس خاں صبر کرنا ہو گا۔'' ایک بزرگ نے کہا۔

''ادھر آؤ۔'' الیاس خاں نے آنکھیں نکالتے ہوئے اس بزرگ سے کہا۔ یہ الیاس خاں کا رشتے میں ماموں تھا۔ وہ قریب آیا تو الیاس خاں کا بھرپور ہاتھ اس کے منہ پر پڑا اور اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے۔ منہ سے خون ابل پڑا اور وہ کئی فٹ دور جا پڑا۔

''صبر کرو۔ صبر کرنے کا مشورہ دے رہے ہو مجھے۔ صبر وہ کرتے ہیں جو بے بس اور کمزور ہوتے ہیں' سمجھے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ بزرگ خود اٹھ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے دانت اور خون کے چھینٹے وہاں زمین پر پڑے رہ گئے تھے۔ الیاس خاں کی آنکھوں میں آگ جل رہی تھی۔ وہ سامنے کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھتا رہا اور پھر اس نے کہا۔

''کتے کے بچو' اتنے سارے تھے تم اور وہ اکیلا۔ میرے بچے کو مار دیا اس نے۔ تم

دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ میں تمہیں اس کی سزا دوں گا۔ ہنٹر لاؤ۔'' چمڑے کا ہنٹر لایا گیا اور الیاس خاں ان لوگوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے ان کی کھال اُدھیڑ دی تھی۔ وہ دانت بھینچ بھینچ کر پٹ رہے تھے۔ کرب سے ان کے چہرے سرخ ہو گئے تھے اور الیاس خاں انہیں مارے جا رہا تھا۔

''تم نے ہمارے گھر کا چراغ بجھا دیا۔'' بمشکل جبار خاں نے الیاس خاں کو روکا۔

''بس انہیں سزا مل گئی ہے لیکن ابھی تو سزا کے حقدار بہت سے ہیں۔ سزا کے حقدار۔ آؤ شاہ زیب کے ہاں چلتے ہیں۔ جہاں زیب سے بات کریں گے' اس سے کہیں گے سارے رشتے ناطے اپنی جگہ۔ ہمیں شاہ زیب کی اس حرکت کا انتقام لینا ہے۔ فیصلہ کرو اس کے لیے کیا کیا جائے۔ یہ فیصلہ انہیں سے کر لیا جائے گا۔''

''چلو۔'' تھوڑی دیر کے بعد یہ دونوں تیار ہو گئے اور ان کی لینڈ کروزر چل پڑی۔ پیچھے دو جیپیں اور آ رہی تھیں اور ان میں الیاس خاں کے آدمی تھے جو رائفلوں سے مسلح تھے۔ لینڈ کروزر برق رفتاری سے لمبا سفر طے کرتی ہوئی آخر کار جہاں زیب کی حویلی پہنچ گئی۔ حویلی میں سکون اور سناٹا تھا۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ جہاں زیب اور اورنگزیب اس وقت سامنے والی بارہ دری میں بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے تھے۔ انہوں نے لینڈ کروزر کو آتے ہوئے دیکھا اور اس کے پیچھے مسلح افراد کی جیپیں تھیں۔ چوکیدار نے بڑا گیٹ کھول دیا تھا۔ جہاں زیب نے حیرانی سے کہا۔

''گاڑی تو جبار خاں کی ہے۔''

''وہی لوگ ہیں کیا ہوا خیریت۔ ان کی آمد بڑی عجیب سی ہے۔ خدا خیر کرے کہیں کوئی بات نہ ہو گئی ہو۔'' گاڑیاں رک گئیں۔ یہ دونوں شطرنج کی بازی سمیٹ کر بارہ دری سے باہر نکل آئے۔ جہاں زیب نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''آہا بڑے اور چھوٹے شاہ جی! اچانک ہی آپ لوگوں کی آمد میرے لیے حیرانی کا باعث ہے۔ پہلے سے کوئی اطلاع نہیں تھی مجھے۔ کیا بات ہے خیریت؟'' جہاں زیب نے ان کے خونی چہرے دیکھے اور اسے یقین ہو گیا کہ کوئی بات ہے۔

''شاہ زیب نے انور خاں کو مار دیا۔ شاہ زیب نے میرے بھتیجے کو مار دیا' گولی مار دی گئی ہے اسے۔ مر گیا ہے وہ اور اس کی لاش حویلی میں رکھی ہوئی ہے۔ میں اس وقت تک اس کی لاش نہیں دفنانا چاہتا جہاں زیب جب تک کہ شاہ زیب کی لاش بھی اس کے ساتھ دفن ہونے کے لیے نہ تیار ہو جائے۔ بولو کیا کرنا چاہیے مجھے؟''

''آپ کیا کہہ رہے ہیں شاہ جی! شاہ زیب نے انور کو مار ڈالا۔''

''ہاں بھٹے پر گیا تھا انور۔ بھٹے پر کام شروع ہو گیا ہے وہ جرائم پیشہ وہاں آ گیا اور اس نے انور کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔''

''اوہ' میرے خدا' میرے خدا یہ بات کہاں سے کہاں تک جائے گی۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا۔''

''یہ تو بہت دور تک جائے گی شاہ زیب کی وجہ سے تمہاری یہ حویلی کھنڈر بن جائے گی جہاں زیب! ہم اس حویلی کو اپنے ستونوں پر کھڑے نہیں دیکھ سکتے جس میں شاہ زیب پیدا ہوا اور اس کی پرورش ہوئی۔'' جہاں زیب نے جبار خاں کے یہ الفاظ سنے۔ اورنگزیب کو غصہ آ گیا۔ اس نے کہا۔

''شاہ جی! بڑی عزت کرتے ہیں۔ ہم آپ کا بڑا احترام کرتے ہیں لیکن عجیب باتیں کر رہے ہیں آپ۔ آپ کی بیٹی اس گھر میں ہے جسے آپ خاکستر کرنا اور مٹی کا ڈھیر بنانا چاہتے ہیں۔ کیا آپ اس کا بھی برا چاہتے ہیں۔''

''تو پھر بتاؤ جہاں زیب ہمارا انتقام کیسے پورا ہو؟ بتاؤ۔ اس نے ہمارے گھر کا چراغ

بجھایا ہے۔ ہم اس کا گھر ہمیشہ کے لیے تاریک کر دینا چاہتے ہیں۔''

''اب یہ گھر اس کا نہیں ہے سمجھے۔ اب یہ گھر اس کا نہیں ہے۔ اس کے باوجود اگر تم یہاں کچھ کرنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے کرو۔ ہم لوگ بھی اندر چلے جاتے ہیں۔ باہر سے مٹی کا تیل چھڑکو اور آگ لگا دو اس گھر میں تا کہ تمہارا سینہ ٹھنڈا ہو جائے۔'' جہاں زیب نے کہا۔

''ہمارا سینہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ کہاں ہے شاہینہ' شاہینہ کہاں ہے تو دیکھ تیرا بھتیجا مار دیا ان لوگوں نے۔ ان لوگوں نے تیرا بھتیجا مار دیا تو بتا ہم کسے قتل کریں۔ ہم کس سے بدلہ لیں اپنے انور کا۔'' اندر اطلاع پہنچی۔ شاہینہ کو صحیح حال معلوم ہوا تو وہ بھی سینہ پیٹتی ہوئی باہر نکل آئی۔

''ارے اس موذی' اس موذی نے میرے گھر پر حملہ کیا ہے۔ وہ کہاں ہے مار دو اسے ختم کر دو اسے۔''

''غرض یہ کہ خوب ہنگامہ آرائی ہو گئی تھی اور جہاں زیب اور اورنگزیب خود بھی پریشان ہو گئے تھے۔ پھر جبار خاں نے کہا۔

''آؤ الیاس خاں چلتے ہیں۔ فیصلے بعد میں کرنے ہوں گے۔ انور کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچانے کی تیاریاں کریں۔ اس کے بعد دیکھیں گے۔ وہ سب اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ شاہینہ الیاس خاں کی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔

''مجھے بھی ساتھ لے چلو بھائی! مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ دم گھٹ رہا ہے میرے یہاں۔ ہائے میرا اکڑیل جوان' دم گھٹ رہا ہے میرا اس گھر میں جس کے گوشوں سے شاہ زیب کی بدبو آتی ہے۔ میں شاید اب یہاں کبھی نہیں رہ سکوں گی۔ جہاں زیب اگر میرے لیے دوسرا گھر بنوا سکتے ہو تو مجھے بلا لینا ورنہ میں اپنے بھائی کے گھر رہوں گی۔ لعنت بھیج رہی ہوں تمہاری اس حویلی پر میں' سمجھے۔'' جہاں زیب نے سخت نگاہوں سے بیوی کو دیکھا پھر

بھائی کو اور اس کے بعد خاموش ہو گیا۔ البتہ اس نے شاہینہ کے جانے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ البتہ شکیلہ خاموش کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ جب یہ ہنگامہ ختم ہو گیا تو جہاں زیب اور اورنگزیب اندر آ کر ایک کمرے میں خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

''کیا ہوا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے' کس کی غلطی ہے' کیسی غلطی ہے۔ اس بار ہمیں سوچنا پڑے گا۔ صورتحال تو ایک دم سنگین ہو گئی ہے۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

شکیلہ تھوڑے فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ ان دونوں کو ان کی موجودگی کا پتہ نہیں تھا۔ اس وقت وہ جرات مندانہ انداز سے آگے بڑھی اور کہنے لگی۔

''آپ بڑے لوگ عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔ کوئی عزت' کوئی احترام نہیں ہے اس گھر میں عورت کا۔ سوچ لیجئے مصیبتوں کا شکار ہی رہیں ہم لوگ۔ اپنے اپنے گھر چھوڑ کر آپ لوگوں کے گھر آئے ہیں یہ سمجھ کر کہ ہم اس گھر کے مکین ہیں' آپس کے ہیں لیکن اس کے بعد ہمیں دو کوڑی کا کر دیا جاتا ہے۔ شاہینہ ایک طاقتور گھرانے کی فرد ہے کیا اپنے گھروں میں بھی طاقت ہی کی حکمرانی ہوتی ہے۔ وہ طاقت ور ہے آپ لوگوں کو برا بھلا کہہ کر چلی گئی۔ ہماری کوئی عزت نہیں ہے۔ یہ فرق اس لیے ہے نا کہ اس کا تعلق ایک طاقتور گھرانے سے ہے۔''

''نہیں۔ شکیلہ! آؤ بیٹھو۔ کیوں تم نے اپنے دل میں یہ خیال پروان چڑھایا کہ تمہاری کوئی عزت' کوئی حیثیت نہیں ہے۔ تم مکمل طور پر اس گھر کی ذمے دار فرد ہو۔ یہ تمام سنگین صورتحال جو پیش آئی ہے اس کے بارے میں تم اپنی رائے بتاؤ۔''

''کیا فائدہ بڑے بھائی۔ جب پانی سر سے اونچا ہو گیا کیا فائدہ ان باتوں کا۔ آپ مجھے صرف ایک بات بتائیے۔ کتنی دولت چاہیے آپ کو۔ کیا کچھ چاہیے۔ کتنی زمینیں وسیع کریں گے۔ کتنے نوٹوں کے انبار لگائیں گے۔ کتنا سونا چاندی جمع کریں گے اور یہ سب

کچھ کر لیں گے تو اس کا کیا کریں گے۔ کیا دنیا سے انہیں لے جائیں گے۔ آپ اس لڑکے سے اس کا سب کچھ چھین لیا گیا اور میں خود بھی اپنے آپ کو اس کا مجرم سمجھتی ہوں۔ یہ نہیں کہ میں اپنے آپ کو ایک پارسا عورت ثابت کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے بھی لالچ کیا تھا۔ میں نے بھی اس معاملے میں اتنے سخت اقدامات نہیں کئے تھے۔ جتنے مجھے کرنے چاہیے تھے۔ یعنی کم از کم آپ لوگوں کے درمیان مداخلت کرتی لیکن یہ سچ ہے کہ میں دل سے آپ لوگوں کے اقدامات کی تائید نہیں کرتی تھی۔ آپ مجھے بتائیے کتنی دولت خرچ ہو گئی تھی اس کی تعلیم پر' کیوں آپ اس سے سب کچھ چھیننے پر آمادہ ہو گئے تھے بتائیے؟''

''اس میں قصور میرا تھا اورنگزیب کا نہیں۔ اصل میں شاہینہ کے بھائیوں کو بھٹے والی زمینیں چاہئیں تھیں۔ انہوں نے شاہینہ کو مجبور کیا اور شاہینہ نے مجھے۔ اتفاق سے شاہ زیب بھی آ گیا۔ سارے حالات ہمیں بدنصیبی کی جانب دھکیل کر لے گئے اور وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آہ' بہت برا ہوا ہے اور سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس مشکل کا حل کیا نکلے گا۔''

''مجھے معاف کیجئے گا بڑے بھائی! آپ لوگ مجھے بڑے سنگدل محسوس ہو رہے ہیں۔ آپ نے انور کی موت کا ماتم تو کر لیا۔ یہ نہیں معلوم کیا آپ نے کہ شاہ زیب کہاں ہے' اس پر کیا گزری' کیا بیتی؟'' اس پر دونوں بھائیوں نے شرمسار نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اورنگزیب نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ شاہ زیب ان کے ہاتھ نہیں لگا۔ وہ یہ کہہ رہے تھے کہ اسے بھٹے والی زمین پر زندہ جلائیں گے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا ہے انہیں۔''

''اورنگزیب ابھی آپ لوگوں نے کہا ہے۔ میرا اس گھر میں کوئی مقام ہے تو میں آپ لوگوں سے سب سے پہلا مطالبہ کرتی ہوں کہ سب سے پہلے شاہ زیب کو تلاش کریں

اور اسے اپنا تحفظ دیں۔ چاہے وہ سرعام ہو یا خفیہ کیسے لوگ ہیں آپ، کیسے لوگ ہیں۔ دونوں بھائیوں کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ پھر جہاں زیب نے کہا۔

''ایسا کرتے ہیں فوراً تیاریاں کرکے انور کی آخری رسومات کے لیے چلتے ہیں۔ تعزیت اور افسوس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس بات کا علم ہو جائے گا کہ شاہ زیب ان کے قبضے میں تو نہیں آیا یا اگر ہے تو کہاں ہے۔ یہ بات طے ہوئی۔ شکیلہ کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ تیار ہو جائے اور دونوں بھائی بھی تیار ہونے لگے۔

''غمناک مناظر چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انور ایک کڑیل جوان تھا اور اس کی موت سب کے لیے باعث غم تھی لیکن بہرحال برے ماں باپ کی تربیت پائی تھی اس لیے کہیں نہ کہیں تو یہ ہونا ہی تھا جو ہو گیا تھا۔ امیر چھوٹا تھا، دونوں بھائیوں میں بڑی دوستی تھی۔ وہ تنہا رہ گیا تھا۔ ادھر الیاس خاں اور جبار خاں حویلی واپس پہنچنے کے بعد انور کی تدفین کے انتظامات کرنے لگے پھر انہوں نے جہاں زیب وغیرہ کو آتے ہوئے دیکھا۔ الیاس خاں نے جبار خاں سے کہا۔

''جبار! ہم نے وہاں یہ تو نہیں بتایا کہ شاہ زیب تھانے پہنچ چکا ہے۔''

''نہیں بڑے شاہ یہ نہیں بتایا تھا۔''

''تو پھر یہ بتانا بھی نہیں ہے۔ ان کی یہ مجال تو نہیں ہے کہ وہ میرے بیٹے کے قاتل کو بچانے کی کوشش کریں لیکن ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں کہیں نہ کہیں تو رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔''

بہرحال حویلی کے ہنگامے جاری تھے اور بے شمار افراد جمع ہو گئے تھے۔ جہاں زیب اور اورنگزیب کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جا رہا تھا۔ شاہینہ زبردست ماتم کر رہی تھی اور ایک ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی۔

پھر انور کی تدفین کر دی گئی۔ بہت ہی خوفناک رویہ تھا ان لوگوں کا جہاں زیب اور اورنگزیب کو تو بالکل منہ نہیں لگایا گیا تھا۔ شاہینہ بھائیوں کے گھر رہ گئی تھی۔ شکیلہ اور دونوں بھائی واپس آ گئے۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر وقت گزرا۔ تیسرے دن دونوں بھائی اپنے ساتھیوں کے ساتھ تھانے چلے گئے۔ اس سے پہلے ایک آدمی کو تھانے دوڑا دیا گیا تھا اور انسپکٹر کو پیغام دیا گیا تھا کہ قاتل کی بھرپور حفاظت کی جائے کہیں وہ فرار نہ ہو جائے یا اسے فرار کرانے کی کوشش نہ کی جائے۔ غرض یہ کہ الیاس خاں اور جبار خاں تھانے پہنچ گئے۔ انسپکٹر دلاور خان نے انہیں دیکھا لیکن اپنی کرسی سے نہیں اٹھا۔ ایس آئی نے جلدی سے کہا۔

''یہ الیاس خاں اور جبار خاں ہیں۔''

''سلام چوہدری صاحب! میں آپ کے گھر پہنچا تھا۔ جائے وقوع پر بھی پہنچا تھا۔ سارے کام کر لایا ہوں۔ آپ سے کچھ کاغذات پر دستخط کرانے تھے۔ پر ظاہر ہے اس وقت یہ ممکن نہیں تھا۔ آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔''

''ہوں۔'' دونوں بھائیوں نے خود ہی کرسی گھسیٹی اور بیٹھ گئے۔ جبار خاں کہنے لگا۔

''اصل میں حکومت کے آدھے کام تو غلط ہوتے ہیں۔ کسی کو علاقے کا [illegible] لگانے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کی عمر دیکھی جائے۔ تجربہ دیکھا جائے تم جیسے [illegible] کے لڑکوں کو اتنی ذمے داریاں نہیں دینی چاہیے۔ تم ان کے اہل نہیں ہوتے۔ [illegible] جا [illegible] کہ کس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔ خیر۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم [illegible] سلسلے میں تفتیش کی ہے یا نہیں۔''

''ہاں ملزم سے پوچھ گچھ کی گئی ہے۔''

''کھال ادھیڑی ہے اس کی یا نہیں۔ یہ بتاؤ۔ الٹا لٹکایا ہے۔ برف کی سل پر رکھا

ہے۔ دانت توڑے ہیں' ناخن نکال لیے ہیں یا نہیں؟'' جواب میں انسپکٹر دلاور خان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے کہا۔

''آپ روایت کی باتیں کر رہے ہیں چوہدری صاحب! تھانوں میں یہ سب کچھ تو ہوتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں بہت زیادہ ضروری نہیں ہے اور وہ تو ویسے بھی آپ کے آدمیوں نے پہلے ہی کر دیا ہے۔ ٹھیک ٹھاک مارا پیٹا ہے اسے۔ حالانکہ یہ کام دوسرے لوگوں کا نہیں ہے آپ کی ذات آڑے آ گئی ورنہ میں ان سب کو پکڑ کر بند کر دیتا۔ جو انہیں جھنجھوڑتے یہاں لائے تھے اور جنہوں نے خود قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی تھی۔''

''جبار خاں! یہ انسپکٹر کچھ ضرورت سے زیادہ نہیں بول رہا۔ میں تم سے یہ سوال کر رہا ہوں کہ تم نے اسے مارا پیٹا ہے یا نہیں؟''

''میں نے عرض کیا نا چوہدری صاحب! اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اس نے مجھے ایک رپورٹ لکھائی جس میں اس نے صاف صاف کہا ہے کہ اس کی زمینوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہاں ناجائز طریقے سے بھٹہ بنایا جانے لگا۔ اس نے منع کیا تو اس پر تشدد کیا گیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کے بھائی اس کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور اپنے سالوں کے حق میں انہوں نے اسے نظر انداز کر کے بے دخل کر دیا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا تھا کہ وہ تشدد کا جواب تشدد سے دے۔''

''خوب تم اس کی طرفداری کر رہے ہو انسپکٹر!''

''نہیں مسٹر! آپ نے مجھ سے یہ سوال کیا ہے نا کہ ہم نے اسے مارا پیٹا ہے یا نہیں۔ اس کا جواب دے رہا ہوں۔ ذرا مختلف آدمی ہوں۔ ظاہر ہے ہر شخص اپنے مسائل خود سمجھتا ہے اور خود انہیں سرانجام دینے کی کوشش کرتا ہے۔''

''انسپکٹر۔۔۔ انسپکٹر کیا نام ہے تمہارے؟''

''دلاور خان سر!''

''دلاور خان! دیکھو شہری تھانوں میں لگنے والی ڈیوٹیاں الگ ہوتی ہیں۔ وہاں کے مسائل بھی الگ ہوتے ہیں لیکن جب ایسے علاقوں میں تھانے بنائے جاتے ہیں تو وہاں کے معزز لوگوں سے تعاون کی درخواست کی جاتی ہے اور یہ تعاون اسی شکل میں ممکن ہوتا ہے جب تم اس سے تعاون کرتے ہو۔ بھئی دیکھو نا علاقوں کے مسائل جتنا ہم لوگ سمجھتے ہیں تم باہر سے آنے والے تو نہیں سمجھ سکتے نا۔ تم نے اسے مارا نہیں حالانکہ تمہارے لیے یہ بہترین موقع تھا ہماری خوشنودی حاصل کرنے کا۔ تم کھال کھینچ کر ہمارے ہاتھ میں دے دیتے تو ہم سمجھتے کہ تم کام کے آدمی ہو۔ لگتا ہے جیسے تم ہمارے لیے کچھ نہیں کر پاؤ گے۔ چلو نکال لاؤ اسے۔ غلطی ہمارے آدمیوں سے ہوئی تھی کہ انہوں نے اسے یہاں پہنچا دیا۔ انہیں بھی سزا مل گئی ہے۔ بہر حال ٹھیک ہے۔ لاؤ اسے باہر لے کر آؤ۔''

''نہیں جناب! آپ اس سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ آپ اس پر سختی کرانا چاہتے ہوں گے تھانے کی عمارت میں۔ میں آپ سے پھر یہی درخواست کر رہا ہوں کہ اس عمارت پر حکومت کا ہی کنٹرول رہنے دیجیے۔''

''اوئے کیا بکواس کر رہا ہے۔ حاکم ہیں ہم سمجھا'' الیاس خاں کے لہجے میں غراہٹ پیدا ہو گئی۔

''دیکھیے چوہدری صاحب! حاکم بے شک آپ ہیں لیکن آپ نے یہ وردی ہم تک پہنچائی ہے اگر آپ نے خود اس وردی کا تقدس پامال کیا تو پھر اس کی عزت کرنے والا کون ہوگا۔''

''اوئے تو نے سنا نہیں۔ ہم اتنی بکواس کسی کی نہیں سنتے۔ اگر ہوش و حواس قائم نہیں ہیں تیرے تو تیرے حواس قائم کر دیے جائیں گے۔ اوئے اندر آ ؤ اوئے۔ بیٹا قتل ہوا

ہے ہمارا اور انسپکٹر ہمیں قانون سکھا رہا ہے۔ اوئے سنا نہیں تم نے اندر آؤ۔'' اور تھوڑی ہی دیر بعد تھانے کی عمارت ان مسلح افراد سے بھر گئی جو الیاس خاں اور جبار خاں کے آدمی تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ انہوں نے بندوقیں وہاں پر موجود تمام افراد پر تان دیں۔''

''انسپکٹر جاؤ۔ آخری بار سن لو اسے نکال کر لے آؤ۔ ورنہ دوسری صورت یہ ہوگی کہ یہ سب بے قابو ہو جائیں گے اور بے قابو افراد جو کچھ بھی کر دیں وہ کم ہے۔''

دلاور خاں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ صورتحال سنگین تھی اور اس سنگین صورتحال کا اسے پورا پورا احساس تھا۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''چوہدری صاحب! میں نے آپ کا حکم ماننے سے انکار نہیں کیا ہے لیکن قانون کا ایک انداز ہوتا ہے۔ آپ دیکھئے نا ایف آئی آر لکھی گئی ہے روزنامچے میں درج ہو گیا ہے۔''

''تو یہ روزنامچے ہم لیے جاتے ہیں تم دوسرے تیار کر لینا کون سی مشکل بات ہے اس میں اٹھا لو بھئی یہ روزنامچے بھی اٹھا لو چلو تم۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تمہاری۔ جاؤ اسے نکال کر لاؤ۔ یا یہ کام بھی ہم ہی کریں۔''

''نہیں میں کرتا ہوں۔'' انسپکٹر نے کہا اور تیز رفتاری سے اس لاک اپ کی طرف بڑھ گیا جہاں شاہ زیب قید تھا۔ لاک اپ میں داخل ہو کر اس نے شاہ زیب کو بازوؤں سے پکڑا اور انتہائی سرگوشی کے انداز میں بولا۔

''شاہ زیب! چوہدری الیاس خاں اور جبار خاں تمہیں لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ وہ اسلحے کے زور پر تمہیں لے جا رہے ہیں۔ یہاں تو میں تمہارے تحفظ کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ میرا سروس ریوالور ہے یہ میں تمہارے لباس میں چھپا رہا ہوں۔ موقع ملے تو بھاگ جانا۔ ان کے قبضے سے دور کسی انتہائی ضرورت پر چھپتے چھپاتے میرے پاس تھانے میں آ جانا۔ اس کے پچھلے حصے میں میری رہائش گاہ ہے۔ بے فکر رہو۔ میں تمہیں تحفظ دوں

گا۔''

جب یہ لوگ غیر قانونی عمل کر رہے ہیں اور قانون یہاں بے بسی محسوس کر رہا ہے تو میں بھی کیوں نہ یہاں انسانیت کا حق ادا کروں۔ میں تمہیں لے جا رہا ہوں اور ان کے حوالے کر دوں گا۔ بلکہ ایک کام اور بھی کرتا ہوں۔ تمہارے ہاتھ پیچھے کر کے باندھ دیتا ہوں۔ اس طرح کی بندش باندھوں گا تمہیں کہ تمہارے ہاتھ آسانی سے کھل جائیں۔ ریوالور میں تمہارے لباس کے نیفے میں چھپائے دے رہا ہوں۔ بس اب مجھ سے کوئی سوال مت کرنا میرا نام دلاور خان ہے یاد رکھنا۔ انسپکٹر دلاور خان نے ایک سپاہی سے رسی طلب کر کے شاہ زیب کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر کر کے باندھ دیئے اور اس کے بعد شاہ زیب کو دھکے مارتا ہوا باہر لے آیا۔

باہر الیاس خاں اور جبار خاں انتظار کر رہے تھے۔ الیاس خاں نے خونی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا اور دانت پیس کر بولا۔

''خدا کی قسم۔ میں تجھے اسی جگہ ڈھیر کر دیتا لیکن ایسے نہیں جہاں میرے انور کا خون گرا ہے۔ اسی جگہ تیرے جسم کو شعلوں کی نظر کروں گا عہد ہے یہ میرا۔'' شاہ زیب نے ایک نگاہ الیاس خاں کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مذاق اڑانے والا انداز تھا۔ لیکن زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔

چوہدری جبار حسن نے جیب سے نوٹوں کی دو گڈیاں نکالیں اور آگے بڑھ کر انسپکٹر کے سامنے ڈالتے ہوئے بولا۔

''یہ ایک خود رکھ لو اور ایک ان تمام لوگوں میں بانٹ دو اور یوں نہ سوچو انسپکٹر ان علاقوں میں ہم لوگوں سے تعاون ہی تمہیں زندگی دے سکتا ہے۔ انسپکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا اور پھر وہ لوگ شاہ زیب کو لے کر چل پڑے۔

شاہ زیب کو لینڈ کروزر کے بجائے جیپ میں بٹھایا گیا تھا اور پھر لینڈ کروزر اسٹارٹ ہوئی اور دونوں جیپیں چل پڑیں۔ انسپکٹر نے شاہ زیب کے ساتھ جو سلوک کیا تھا شاہ زیب خود بھی اس پر حیران تھا۔ اس طرح کے لوگ کم ہی ہوا کرتے ہیں لیکن بہرحال ہوتے ہیں جس کا جیتا جاگتا ثبوت یہ انسپکٹر تھا۔ بہرحال شاہ زیب کی اب یہ ذمے داری تھی کہ وہ اپنا کام سرانجام دے۔ اگر یہ لوگ اسے لے کر حویلی تک پہنچ گئے تو شاہ زیب کے لیے زندگی بڑی مشکل چیز ہو جائے گی۔ جو کچھ کرنا تھا اسی دوران کر لینا تھا۔ چنانچہ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر ایک ایسی مناسب جگہ اسے نظر آ گئی۔ یہ کچے کا علاقہ تھا۔ چاروں طرف چکنی مٹی کے اونچے نیچے ڈھیلے بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان سڑک گزر رہی تھی۔ کافی آگے جانے کے بعد کھیتوں اور جنگلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ادھر نکل جائے تو بڑا کام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ شاہ زیب تیار ہو گیا۔ ہاتھوں کی بندشوں کو اس نے خود ہاتھ چوڑا کر کے سخت کر رکھا تھا لیکن اس طرح کہ کسی کو اس پر شبہ نہ ہو سکا تھا۔ کلائیاں ذرا سی برابر کر کے اس نے آہستہ سے کلائیوں کو دو تین جھٹکے دیئے تو رسی اس کے ہاتھوں سے نیچے نکل گئی۔ شاہ زیب نے دونوں ہاتھ اس طرح پیچھے کیے ہوئے تھے۔ پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا۔

''کتے کے پلے کیا کر رہا ہے؟ کیوں جھٹکے دے رہا ہے؟''

''کہیں گاڑی رکواؤ' مجھے نیچے اترنا ہے ایک منٹ کے لیے۔''

''وہ منٹ یہیں گزار لے۔'' اس نے کہا اور ہنس پڑا۔

شاہ زیب نے بے بسی کا اظہار کیا تھا لیکن پھر جیسے ہی جیپ نے موڑ کاٹا۔ شاہ زیب نے اچانک ہی اپنے بدن کو جنبش دی اور دونوں ہاتھ سیدھے کیے ہوئے برابر بیٹھے ہوئے دو آدمی جو بے خبر تھے اس کے ہاتھوں کی ضرب سے جیپ سے اچھل کر نیچے جا گرے۔

شاہ زیب نے ریوالور سنبھال لیا اور سب سے پہلے اس نے جیپ ڈرائیو کرنے والے ڈرائیور کو نشانہ بنایا گولی ڈرائیور کی گدی میں لگی اور جیپ بے قابو ہو گئی۔ پھر ایک لمحے میں وہ ایک ڈھیلے سے ٹکرا گئی۔

شاہ زیب اس کے لیے تیار تھا۔ پچھلی جیپ ایک دم قریب آ گئی۔ ڈرائیور قابو نہیں پا سکا تھا۔ وہ اس دوسری جیپ سے ٹکرائی اور اسی لمحے شاہ زیب نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ ٹانگوں میں زبردست جھٹکے لگے تھے لیکن اس کے لیے وہ پہلے سے تیار تھا۔ اس نے برق رفتاری سے آگے جانے والی لینڈ کروزر پر دو فائر کیے اور ایک فائر میں لینڈ کروزر کا کام بھی تمام کر دیا اس کا ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ اب اس کے بعد یہاں زیادہ دلیری دکھانا بیوقوفی کی بات تھی۔

چنانچہ شاہ زیب ان ڈھیلوں کے درمیان دوڑنے لگا۔ یہ بھاگ دوڑ اس کے مقدر کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ چنانچہ وہ جان بچانے کے لیے بڑی تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ ادھر بچے کھچے لوگ سنبھل گئے تھے چنانچہ عقب سے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

لیکن یہ ٹیلے بہترین محافظ ثابت ہوئے کسی دوڑنے والے پر ان کی موجودگی میں صحیح نشانہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ چنانچہ شاہ زیب کو دوڑنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ پھر تھوڑے فاصلے پر جا کر یہ جگہ ڈھلان میں اتر گئی تھی۔ چکنی مٹی کے ڈھلان بے حد خطرناک ہوتے ہیں۔ اگر ہلکی سی بارش ہو جائے تو یہ ڈھلان موت کے ڈھلان کہلاتے ہیں۔ اب بھی یہاں خاصی گڑبڑ نظر آ رہی تھی۔ شاہ زیب کو ان ڈھلانوں میں اترنے کے لیے بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ پیچھے آنے والوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ تعاقب کرتے ہوئے کیسے پہنچ جائیں گے۔

ہوسکتا ہے اب بھی ان کا زیادہ فاصلہ نہ ہو۔ البتہ گولیاں چلنا بند ہو گئیں تھیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کو خود بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس طرح ٹیلوں پر نشانے نہیں لگائے جاسکتے۔

بہرحال شاہ زیب کو چھپنے کے لیے کسی ٹھکانے کی ضرورت تھی۔ اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ نشیب میں ایک بڑا سا گڑھا نظر آیا۔ شاید یہ برساتی نالہ تھا جو برسات نہ ہونے کی وجہ سے اجاڑ اور خشک پڑا تھا۔ البتہ اس کے کنارے درختوں کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ جو بلندی پر دور تک پھیلے چلے جارہے تھے۔ ڈھلان ختم ہونے کے بعد بلندی شروع ہوتی تھی۔ شاہ زیب نے درختوں کو غور سے دیکھا۔ اس کو یہ جگہ چھپنے کے لیے مناسب معلوم ہوئی۔

چنانچہ وہ تیز رفتاری سے نشیب عبور کرنے کے بعد بلندیوں پر چل پڑا لیکن بلندی پر پہنچنے کے بعد تھوڑے فاصلے پر پہنچ کر اسے ایک جگہ نظر آئی جو اس علاقے میں ناقابل یقین کہی جاسکتی تھی۔ یہ نہ تالاب تھا نہ جوہڑ۔

غالباً ایک ایسا صاف شفاف گڑھا تھا جو چکنی مٹی میں خود بخود بن گیا تھا۔ نیچے کی تہہ بھی بڑی نرم اور شفاف تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس میں پانی موجود تھا۔ یہ پانی بالکل شفاف اور موتی کی طرح چمکتا ہوا پانی تھا۔ شاہ زیب نے ایک بار نیچے بیٹھ کر دور تک نگاہیں دوڑائیں۔ ڈھلانوں کے سرے پر بھی ابھی تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔

چنانچہ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور پہلے پانی پیا اور منہ ہاتھ دھویا۔ حالانکہ دل چاہ رہا تھا کہ پانی میں اتر جائے۔ لیکن یہ بات اس کے دل نے گوارہ نہ کی۔ کم از کم وہ اپنے طور پر اس پانی کو گندا نہیں کرسکتا تھا۔ ہوسکتا ہے اس کی طرح کوئی اور مصیبت کا مارا وہاں پہنچ جائے اور اسے پانی کی ضرورت پیش آجائے۔

لیکن یہ جگہ عارضی طور پر نہایت مناسب جگہ تھی۔ پانی کی موجودگی کم از کم زندگی کا پتہ دے سکتی تھی۔ پھر اس کی نگاہ اس درخت کی جانب پڑی۔ وسیع و عریض تھا۔ نہایت پرانا معلوم ہوتا تھا اور اس کا تنا اس قدر بڑا تھا کہ اس کی عمر کا صحیح طور اندازہ بھی نہ ہوسکے۔ اس کی شاخیں اتنی موٹی موٹی اور اتنے دائرے میں پھیلی ہوئی تھی کہ اگر بلندی پر کوئی مناسب ٹھکانہ تلاش کرلیا جائے تو خاصا وقت گزر سکتا ہے۔ شاہ زیب کو اس وقت یہ جگہ بہت ہی غنیمت محسوس ہوئی۔ چنانچہ اس نے جوت اتار کر ہاتھ میں لیے اور اس کے بعد اس درخت پر چڑھنے لگا۔ یہ کام اس کے لیے بالکل مشکل نہیں تھا۔

"چنانچہ وہ اوپر چڑھتا چلا گیا۔ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ شاخیں اس طرح آپس میں گوندھی ہوئی تھی کہ ان پر بڑے اطمینان سے بیٹھا لیٹا جاسکتا تھا اور اس کے علاوہ وہ بالکل صاف ستھری جگہ تھی۔ شاہ زیب نے جوتے ایک شاخ میں اس طرح پھنسائے اور پھر بہت سی شاخوں کے درمیان بنی ہوئی چارپائی پر لمبا لمبا لیٹ گیا۔ دماغ سائیں سائیں کررہا تھا۔ کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ کوئی وقت جاتا ہے کہ چوہدریوں کے آدمی اسے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک پہنچیں گے۔ اب یہ تو وہ نہیں سوچ سکتے کہ وہ اس درخت پر چڑھا ہوا ہے اور اگر سوچیں گے بھی تو جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ابھی رائفل اس کے پاس تھی اور عارضی طور پر ہی سہی لیکن یہ اس کا بہترین سہارا تھا۔

بہت دیر تک وہ اسی طرح درخت پر لیٹا رہا۔ جگہ کے بارے میں بھی کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کس طرف نکل آیا ہے۔ بس تقدیر کے بنائے ہوئے راستوں پر چل رہا تھا اور تقدیر کے فیصلوں پر اسے مکمل طور پر اعتبار تھا۔ پھر اس کی نگاہ اپنے آپ سے تھوڑے فاصلے پر پڑی۔ یہاں پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ یہ پرندوں کی آبادی تھی۔

بہرحال وہ ان گھونسلوں کو دیکھتا رہا اور نجانے کب اس کی آنکھوں میں تھکن نیند

بن گئی۔ صحیح معنوں میں وقت ہی گڑ بڑ ہو گیا۔ چونکہ جب آنکھ کھلی تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ایک رات گزر چکی ہے۔ البتہ درخت پر ایک ہی انداز میں لیٹے رہنے کی وجہ سے اس کا بدن دکھنے لگا تھا۔ درختوں کے پتوں سے دھوپ چھن چھن کر نیچے آ رہی تھی۔ پرندوں کی آوازیں بھی گونج رہی تھیں اور بھوک کی شدت جان لے رہی تھی۔ اتنا وقت گزر جانے کے بعد تو یہ امکانات نہیں تھے کہ چوہدری کے آدمی بھی ان راستوں پر اسے تلاش کرتے پھر رہے ہوں۔

چنانچہ وہ آہستہ آہستہ درخت سے نیچے اتر آیا۔ ایک بار پھر اس پانی نے اس کی راہنمائی کی لیکن اس وقت بھی وہ پانی میں اترا نہیں تھا۔ البتہ اس نے خوب چہرہ دھویا' گردن' ہاتھ' پانی کے چند گھونٹ پیے تو طبیعت خراب ہونے لگی۔ اس لیے اس نے زیادہ پانی نہیں پیا۔ البتہ اپنا ایک کپڑا پانی میں بھگو کر کندھے پر ڈال لیا اور اس کے بعد وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

رات بھر آرام کرنے کے بعد بدن میں درختوں کی شاخوں کی چبھن نے تکلیف تو بے شک پیدا کر دی تھی لیکن اس کے باوجود اچھا خاصا بدن توانا تھا۔ چنانچہ وہ برق رفتاری سے چلتا رہا۔ خاصا فاصلہ طے کر کے اسے دور سے لکڑی کے درختوں کی بنی ہوئی ایک بوسیدہ جھونپڑی نظر آئی۔ تھوڑے فاصلے پر کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ہو سکتا ہے ان کھیتوں کے محافظ اس جھونپڑی میں موجود ہوں لیکن اگر وہ ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انسان انسان کے کام آتا ہے اور پھر سارے لوگ تو چوہدری جبار کے آدمی نہیں ہو سکتے۔ وہ دروازے کے پاس پہنچا اور پھر اس نے آہستہ سے جھونپڑی کے دروازے کو اندر دھکیلا۔ دروازہ کھل گیا اور بدبو کا ایک بھبکا شہ زیب کی ناک سے ٹکرایا۔ عجیب سی بدبو تھی۔

اس نے اندر جھانک کر دیکھا تو اندر خشک گھاس کے گٹھر چنے ہوئے تھے۔ بدبو

وہیں کہیں سے آ رہی تھی۔ شاہ زیب مایوس ہو کر واپس پلٹا اس نے یہ سوچا تھا کہ جھونپڑی میں شاید اسے کھانے پینے کی کوئی چیز مل جائے۔ ہر طرف گہرا سناٹا طاری تھا۔ جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ شاہ زیب تھوڑی دیر وہاں رکا۔ جھونپڑی صرف اس کام آ سکتی تھی کہ اس میں تھوڑی دیر بیٹھا جائے۔

پھر اس نے سوچا کہ ممکن ہے کھیتوں پر کام کرنے والے اسے نظر آ جائیں۔ وہ ان میں سے کسی سے کھانے پینے کی چیز مانگ لے۔ یہ سوچ کر وہ کھیتوں میں داخل ہو گیا لیکن کچھ نہیں۔ بدن کچھ عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ آخر کار وہ ایک درخت تلاش کر کے اس کے نیچے بیٹھ گیا۔

دوپہر ہوئی پھر دن ڈھلنے لگا۔ ابھی وہ ویران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ یکایک سناٹے میں کچھ آہٹیں ابھریں اور وہ ایک دم سمٹ گیا۔ اس نے رائفل سنبھالی اور درخت کے تنے سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ذہن میں ہر لمحے چوہدری جبار کے آدمیوں کا خیال تھا۔ ممکن ہے ان لوگوں نے نئے سرے سے اس کی تلاش شروع کی ہو۔ حالانکہ واقعات کو اس نے اب اپنے ذہن میں جگہ دینا چھوڑ دیا تھا۔ یہ احساسات صرف خوف پیدا کرتے تھے اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جو بے گانے ہو گئے تھے انہیں بیگانہ ہی سمجھنا مناسب تھا۔ آہٹیں قریب ہوتی گئیں اور پھر اس نے ایک شخص کو دیکھا۔

دیہاتی تھا۔ بدن پر دیہاتی لباس تھا۔ کندھے پر ایک گٹھری تھی۔ وہ شاہ زیب کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھ گیا۔ شاہ زیب نے وہ جگہ بھی چھوڑ دی۔ اب سورج ڈھل گیا تھا اور شام کے دھندلکے بھی چاروں طرف پھیل گئے تھے۔ اندھیرا گہرا ہوا تو ہوا تیز ہو گئی اور درختوں سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ خشک پتے شور مچا رہے تھے۔ وہ خاموشی سے اس پگڈنڈی پر چلتا رہا۔ کوئی دو ڈھائی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک ڈھلان نظر آیا اور وہ ڈھلان

سے نیچے اترنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آبادیاں کہاں ڈوب گئیں۔ غالباً رخ بدل گیا تھا کہ ایک کھیتوں کے پاس سے صحیح سمت اختیار کر لی جاتی تو ہو سکتا ہے کوئی آبادی مل جاتی۔

بہر حال وہ رات کے اندھیروں میں چلتا رہا اور پھر جب بدن نے بالکل ساتھ دینا چھوڑ دیا تو ایک جگہ زمین پر بیٹھ گیا اور کافی دیر وہاں بیٹھے بیٹھے گزار دی پھر آہستہ آہستہ اجالا پھیلنے لگا۔ چاند درختوں کے پیچھے سے دھیرے دھیرے طلوع ہو رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چاندنی ہر طرف پھیل گئی۔ تھوڑے فاصلے پر چاندنی نے مرکز بنایا ہوا تھا اور یہ مرکز چمک رہا تھا۔ جیسے جیسے چاندنی ابھرتی رہی وہ جگہ چمکنے لگی اور تھوڑی دیر کے بعد شاہ زیب کو اندازہ ہو گیا کہ وہاں بھی پانی ہے۔

قرب و جوار میں بے شک جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں لیکن زیادہ گھنی جھاڑیاں نہیں تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس پانی کے نزدیک پہنچا۔ اس جگہ بھی قدرت نے اپنا ایک نشان بنایا ہوا تھا۔ حالانکہ علاقہ ریتیلا تھا لیکن پانی کا ایک گڑھا یہاں بھی موجود تھا اور کیفیت وہی یعنی صاف شفاف ریت کے ذرات گہرائیوں میں چمک رہے تھے۔ اب اس سے نہ رہا گیا۔ پیٹ کی ضرورت تو پوری نہیں ہو پا رہی تھی۔ رائفل ایک طرف رکھی اور پانی میں اتر گیا۔ کپڑے بھی اتار دیئے تھے بس ایک کچھا تھا جو بدن پر پہنا ہوا تھا۔ پانی نے اسے کچھ ایسا سکون بخشا کہ اس کا دل چاہا کہ یہیں پانی میں سو جائے۔ وہ اس طرح دم سادھ کر پڑ گیا جیسے کوئی مردہ ہو۔ ذہن پر ایک غنودگی سی طاری ہو گئی تھی اور یہ ایک بہت خطرناک مسئلہ تھا۔ یہ غنودگی اسے موت کی نیند بھی سلا سکتی تھی۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کہیں سے قدموں کی چاپ ابھری ہے اور پھر دو انسانی سائے اس کے قریب پہنچے۔ مدھم مدھم آوازیں ابھر رہی تھیں۔

پھر جب پانی میں شرشر کی آواز ابھری تو وہ ایک دم خوفزدہ ہو گیا۔ اپنی جگہ دم بخود رہ

گیا تھا اس نے دیکھا کہ ان میں ایک مرد ہے اور دوسری عورت۔ مرد کے سر پر گٹھری رکھی ہوئی ہے۔ عورت کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ موجود ہے۔ مرد نے گٹھری سر سے اتاری اور پھر اس میں سے کوئی چیز تلاش کرنے لگا۔

شاہ زیب کے لیے زندگی کا بڑا انوکھا تجربہ تھا۔ وہ پانی میں کس حیثیت سے تھا۔ یہ وہ جانتا تھا لیکن وہ دونوں اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور پھر انہوں نے اس بارے میں جو کچھ بھی سوچا۔ شاہ زیب کو فوراً اس کا اندازہ ہو گیا۔ مرد نے جیسے پانی کا پیالہ بھرا اس کی نگاہ شاہ زیب پر پڑ گئی اور پھر اس کی چیخ اتنی زوردار تھی کہ خود شاہ زیب کے کان جھنجھنا گئے۔

''ارے بیارے پیا---ارئی بھاگ۔'' اس نے کہا۔ عورت اس سے زیادہ زور سے چیخی تھی لیکن مرد بہر حال عورت کا وفادار تھا۔ وہ اکیلا نہیں بھاگا بلکہ اس نے عورت کا ہاتھ بھی مضبوطی سے پکڑ لیا تھا اور اس کے بعد وہ برق رفتاری سے دوڑتے چلے گئے۔

شاہ زیب ایک لمحے تک تو صورتحال کا جائزہ لیتا رہا اور اس کے بعد اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ بات افسوسناک تھی، پتہ نہیں بے چارے کہاں جا رہے تھے۔ پانی کی ضرورت محسوس ہوئی تھی انہیں کہ یہ افتاد پیش آ گئی۔ بہت افسوس ہوا تھا شاہ زیب کو۔ ایک لمحے کے اندر اندر اس کا دل چاہا تھا کہ دوڑ کر جائے اور کہے بھائی پانی لے لو۔ میں زندہ انسان ہوں پتہ نہیں تم لوگ مجھے کیا سمجھے۔ ہو لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں اندھیرے میں گم ہو گئے تھے۔ شاہ زیب نے گردن جھٹکی اور اس عجیب واقعہ پر افسوس کرتا ہوا باہر نکل آیا۔

لیکن دوسرے لمحے اس کی نگاہ گٹھری پر پڑی اور اسے مزید افسوس ہونے لگا۔ پتہ نہیں اس گٹھری میں کیا ہے۔ پھر ایک انوکھا خیال اس کے ذہن میں آیا اور وہ پھرتی سے اس گٹھری کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے گٹھری کھول کر دیکھی اس کا خیال بالکل درست تھا۔ گٹھری میں موٹی موٹی چھ روٹیاں اس کے درمیان رکھی ہوئی دال اور گڑ کا کوئی آدھا کلو کا ڈھیلا اس

کے علاوہ کپڑے جو بچے کے تھے۔ چیتھڑے ایک آدھ جوڑا عورت اور مرد کا بھی تھا۔ یہ اس بیچارے کی کل کائنات تھی۔ جو پتہ نہیں بیوی اور بچے کو لے کر کہاں جا رہا تھا لیکن شاہ زیب نے ایک لمحے کے لیے تمام انسانی اقدار ذہن سے الگ کر دیئے۔ یہ روٹیاں چیخ چیخ کر اسے آواز دے رہی تھیں۔ شاہ زیب نے ان میں سے دو موٹی روٹیاں کھائیں۔ سوکھی سوکھی سی دال جو بہرحال تازہ پکی ہوئی تھی اور پھر اس کے بعد سویٹ ڈش۔ کیا زندگی ملی تھی اس وقت۔ شاہ زیب نے وہ گٹھری جوں کی توں باندھ کر رکھ دی۔ البتہ اس میں سے دو روٹیاں اور نکال لی تھیں۔ آہ--- کاش وہ واپس آئیں اور اپنا یہ سامان اٹھا کر لے جائیں۔ یہ جگہ چھوڑ دینا زیادہ بہتر تھا اور اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ خود یہاں سے آگے بڑھ جائے۔

چنانچہ وہ وہاں سے آگے چل پڑا۔ حالانکہ نجانے کتنے گھنٹوں کے بعد پیٹ میں غذا پہنچی تھی لیکن کچھ فرائض ایسے تھے جنہیں سرانجام دینا تھا۔ آہستہ آہستہ چاند ڈوب گیا تھا اور راستہ دشوار ہو گیا تھا۔ زمین ریتلی اور ناہموار تھی۔ دونوں طرف ویسے ہی اونچے نیچے ٹیلے اور ٹبے تھے۔ کہیں کہیں ببول اور بیری کے درخت بھی نظر آ رہے تھے۔ جنگلی جھاڑیوں کے جھنڈ بھی اب کچھ زیادہ نظر آنے لگے تھے۔ وہ آگے بڑھتا چلا گیا اور جب صبح کا ہلکا ہلکا اجالا پھیلا اور تاریکی ختم ہوئی تو اس نے اپنے سامنے ایک ایسی جگہ پھیلی ہوئی پائی جہاں گھاس اور سرکنڈوں کے اونچے نیچے پودے تھے۔ یہاں زمین بھی کسی قدر دلدلی تھی اور جگہ جگہ پاؤں زمین میں دھنس رہے تھے۔

سورج طلوع ہونے میں ابھی تھوڑی دیر باقی تھی۔ اس نے ایک لمحے تک کچھ سوچا۔ اس کی نگاہیں آبادی کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ پھر ایک اونچی سی جگہ پہنچ کر اس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور اسے ایک بہت بڑا ٹوبہ نظر آیا۔ جو صبح کی روشنی میں شفاف جھیل کی طرح جھلملاتا دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ کچھ دور آگے ایک پل بھی نظر آ رہا تھا۔

جس پر سے سڑک گزرتی تھی۔ یہ سڑک چوڑی اور پکی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ مین روڈ ہے۔

اب اسے یقین ہو گیا کہ آس پاس اسے کوئی نہ کوئی آبادی ضرور مل جائے گی۔ چنانچہ وہ آگے بڑھتا رہا۔ اس علاقے میں جہاں وہ سفر کر رہا تھا نہ کوئی پگڈنڈی تھی نہ کوئی راستہ تھا۔ ہر طرف ٹیلے اور ٹبے تھے۔ جنگلی جھاڑیوں کے پودے تھے۔ کہیں کہیں درخت بھی نظر آ جاتے تھے۔ کافی دیر تک وہ یہ سوچتا رہا کہ سڑک پر پہنچ جانا چاہیے لیکن اس کے لیے اچھی طرح جائزہ لے لینا ضروری تھا کیونکہ بہرحال یہ ایک سنگین عمل تھا۔

پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور اسے ایک ٹھکانہ مل گیا۔ یہ کافی کشادہ غار جیسی جگہ تھی۔ اگر یہاں کچھ وقت آرام کر لیا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔ دو روٹیاں موجود تھیں پانی بھی۔ تھوڑی سی کوشش سے مل سکتا تھا۔

چنانچہ وہ غار میں داخل ہو گیا۔ اندازہ یہ ہوتا تھا کہ یہ ایک بیکار سی جگہ ہے اور عام لوگوں کی نگاہوں کا مرکز نہیں ہے۔ چنانچہ یہاں سو جانا کوئی بری بات نہیں ہے۔ وہ گہری نیند سو گیا اور شاید خمارِ گندم نے اب اس پر اثر کیا۔ اتنی گہری نیند سویا کہ شاید پورا دن گزر گیا۔

آنکھ کھلی تو شام آہستہ آہستہ ٹیلے پر اتر گئی۔ دلدلی زمین پر اگی ہوئی اونچی نیچی گھاس اور سرکنڈوں کے پودے دھند میں لپٹ گئے تھے۔ وہ غار سے باہر نکل آیا۔ سورج ٹیلے کے پیچھے ناہموار سلسلوں میں ڈوب چکا تھا۔ مغرب میں گہری روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں قرب و جوار کا ماحول بے حد عجیب سا نظر آ رہا تھا۔ سامنے والی سڑک پر سے کبھی کبھی اکا دکا کوئی گاڑی گزر جاتی تھی۔

وہ سوچنے لگا کہ اس وقت آگے بڑھے یا تھوڑا سا انتظار کرے۔ وہیں بیٹھا کاہلوں کی طرح گردن کھجاتا رہا۔ زمین میں سناٹے آ رہے تھے۔ پیٹ کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ ہلکی

ہلکی بھوک کا آغاز ہوگیا ہے۔ ایک روٹی اور آدھا گڑ اس وقت کائنات کی سب سے لذیذ شے محسوس ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ اب اس کے بعد کیا کیا جائے۔ یہ دلدلی جگہ عبور کرنا خطرناک تھا اور ان ٹیلوں کے درمیان جگہ بنانا بھی آسان کام نہیں تھا لیکن یہاں سے آگے بڑھنا تو ہے۔ خاصی دیر تک وہ وہاں بیٹھا رہا۔ رات کا پہلا پہر گزرا تو چاند طلوع ہوگیا۔ چٹکی ہوئی چاندنی میں وہاں سے آگے بڑھنے لگا۔ اس کا ایک ایک قدم سنبھل سنبھل کر اٹھ رہا تھا۔

آخر وہ اونچے نیچے ٹیلے عبور کرنے کے بعد نشیب میں اتر گیا۔ سامنے چاندنی میں جھلکتا ہوا ٹوبہ تھا۔ اس کے ایک کنارے پر اونچی نیچی گھاس نظر آ رہی تھی۔ عقب میں دلدل تھی۔ ٹوبے سے کوئی فرلانگ بھر کے فاصلے پر پل نظر آ رہا تھا۔ سڑک بالکل سنسان پڑی تھی اور ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ابھی وہ چند قدم آگے بڑھا تھا کہ سناٹے میں دور سے ہارن کی آواز ابھری۔ سڑک کے موڑ پر تیز روشنی جھلملائی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک کار زنگ سے سامنے سے گزر گئی۔ وہ اپنی جگہ ساکت ہوگیا تھا اور دور تک جاتی ہوئی لال روشنی کو دیکھتا رہا تھا۔

بہر حال اس کے بعد وہ پھر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ زندگی کا سفر تو ہر حال میں جاری رہتا ہے۔ اپنی مرضی ہو یا نہ ہو۔ سڑک کے کنارے کنارے پیدل چلتے ہوئے ایک بار پھر اس کے ذہن میں ماضی گردش کرنے لگا۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ ویسے تو زندگی کے بہت سے روشن اور تاریک پہلو تھے لیکن جب ماں زندہ تھی تو کوئی فکر نہیں تھی۔ ہر طرح کے معاملات وہ سنبھالے رہتی تھی۔ مجال ہے کسی کی کہ کوئی اس کی طرف ٹیڑھی نگاہ سے دیکھ جائے۔ حالانکہ شاہینہ بھابی بہت ہی سرکش اور سخت گیر تھی لیکن ماں کے سامنے کسی کی نہیں چلتی تھی۔ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ زندگی اس طرح خوفناک مشکلات سے دوچار ہو جائے گی۔ کبھی بھول کر بھی نہیں سوچا تھا کہ جن ہاتھوں سے وہ انسانیت کے مضامین لکھتا

تھا ان ہاتھوں سے انسانیت کا خون بھی کر سکتا ہے۔ لیکن انسان خود برا نہیں ہوتا۔ اسے بڑی محنت سے برا بنایا جاتا ہے۔ کیا فرق پڑتا تھا بھائی اگر زندگی بھی مانگتے اور ان کی ضرورت واقعی حقیقی ہوتی تو شاید جذبات میں آ کر زندگی بھی قربان کی جا سکتی تھی۔

لیکن اندازہ یہی ہوا تھا کہ قربانی دینے والے بیوقوف اور قربانی لینے والے ذہین ہوتے ہیں۔ آپ ہزار قربانیاں دیجیے کبھی آپ کو اپنے لیے ضرورت پیش آئے گی تو اپنے آپ کو تنہا ہی پائیں گے۔ بھابیاں بری تھیں، بھائی تو اپنا خون تھے۔ کیا نہیں ہوا میرے ساتھ۔ بھائیوں نے تو چشم پوشی اختیار کی ورنہ الیاس خاں اور جبار خاں کے سامنے ایک نہیں تین رائفلیں اٹھتیں اور پھر وہ بھی زمیندار تھے۔ زمینداروں کی اولاد تھے ان کے ساتھ بھی ان کے اپنے ہاری اور ان کے ہمدرد تھے۔ جبار خاں اور الیاس خاں کے سامنے بڑی مشکل کہانی آ جاتی اگر وہ چاہتے۔ لیکن تھوڑی سی جائیداد تھوڑی سی دولت' تھوڑی سی زمین ان کی آنکھوں میں دھندلاہٹ بن گئی تھی اور انہوں نے ان دھندلکوں میں نہ تو ماں کا چہرہ دیکھا نہ بھائی کا۔ یہ ایک غم ناک پہلو تھا۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور سوچنے لگا کہ دنیا کے بارے میں جو معلومات مختلف جگہوں سے حاصل ہوئی ہیں وہ غلط تو نہیں ہو سکتی ہیں۔ بہر حال وقت گزرتا رہا۔ اس نے اس طرح نجانے کتنا طویل فاصلہ طے کر لیا اور پھر اس وقت جب وہ گہرے سناٹے میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے درختوں کے عقب سے روشنیوں کی مسکراہٹ دیکھی اور ایک دم جھٹک کر اس کے پاؤں رک گئے۔

کئی دنوں تک جنگلوں اور ریتیلے صحراؤں میں بھٹکتا رہا تھا۔ چاند کی روشنی بے شک دیکھی تھی اس نے لیکن کسی بستی کے چراغ اسے اب تک نظر نہیں آئے تھے اور اتنے دنوں کے بعد یہ پہلی آبادی تھی جس نے مسکرا کر سلام کیا تھا۔ وہ دیر تک ادھر نگاہیں جمائے دیکھتا رہا

تھا اور پھر احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ اس نے یہ راستہ طے کیا۔ جب ان روشیوں کے قریب پہنچا تو اسے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی گاؤں ہے لیکن کافی بڑا۔ دور تک مکانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ زیادہ تر مکانات مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ اکا دکا پختہ اور نیم پختہ تھے۔ وہ ایک جگہ رک کر ان مکانوں کا جائزہ لیتا رہا۔

اور پھر اس نے اس کونے والے مکان کا انتخاب کیا۔ جو دوسرے مکانوں سے الگ تھلگ اور کچا تھا اور چھوٹا سا۔ یہاں داخل ہو کر وہ سب سے پہلے کھانے پینے کی چیزیں تلاش کرے گا اور اس کے بعد دیکھے گا کہ اسے آگے کیا کرنا چاہیے۔ آہستہ آہستہ چل کر وہ اس مکان کے قریب پہنچ گیا اور دیوار سے لگ کر اندھیرے میں چپ چاپ کھڑا ہو کر اندر کا اندازہ لگاتا رہا۔ پھر اس نے دیوار کی بلندی کا اندازہ لگایا۔ دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے دونوں ہاتھ بلند کئے اچھلا اور ہاتھ سے دیوار کا اوپری حصہ تھام لیا۔ پھر وہ پیروں سے سہارا لیتا ہوا دھیرے دھیرے اوپر پہنچ گیا۔ دیوار پر پہنچ کر اس نے اندر کا جائزہ لیا۔ ذرا دیر دیوار سے جھیلتا ہوا جھانکتا رہا۔ پھر خاموشی سے صحن میں اتر گیا اور دیوار کے ساتھ چپک کر بیٹھ گیا۔

وہ یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ گھر کے مکین جاگ رہے ہیں یا سو چکے ہیں۔ ایک کمرے سے مدھم سی روشنی جھلک رہی تھی۔ غالباً دو کمرے تھے۔ یہاں دونوں کمروں کے سامنے ایک چھوٹا سا دالان تھا۔ دالان کے سامنے صحن، گھر چھوٹا سا تھا لیکن صاف ستھرا تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھا رہا۔ اچانک ہی اسے اندر سے رونے کی آواز سنائی دی۔

کوئی عورت تھی جو بڑے دردناک انداز میں رو رہی تھی۔ شاہ زیب کے کان کھڑے ہو گئے۔ شاید کوئی بیمار ہے یا کسی تکلیف کا شکار ہے۔ ایک ہلکی سی بے چینی کا احساس اس کے دل میں نمودار ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اپنی بھوک

پیاس وہ تھوڑی دیر کے لیے بھول گیا تھا۔ اس رونے کی آواز نے نجانے کیوں اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا اور پھر ان کمروں کے پاس پہنچ گیا۔ دالان میں چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ کھڑکیاں بھی کچی دیواروں میں بس ایسے ہی بنائی گئی تھیں۔ ان کھڑکیوں میں نہ کوئی شیشے تھے نہ دروازے۔ بس چوکور سوراخ کر لیے تھے۔ غالباً اس خیال سے کہ جب کبھی پیسے ہوں گے۔ تو ان دیواروں میں کھڑکیاں لگالی جائیں گی۔

البتہ ان دیواروں پر ہلکے ہلکے پردے پڑے ہوئے تھے۔ سادہ سے کپڑے کے میلے کچیلے پردے۔ ایک پردہ تھوڑا سا اٹھا ہوا تھا۔ شاہ زیب نے پردے سے اندر جھانکا اور ایک دم سحر زدہ سا ہو گیا' ایک مست شباب نقش نمایاں تھا۔ لمبے لمبے بال اس طرح چاروں طرف اڈے ہوئے تھے جیسے سچ مچ آسمان پر گھٹائیں چھائی ہوئی ہوں اور ان کے درمیان ایک حسین چہرہ جس پر چاندنی نثار ہو رہی تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ قدرت کے بعض مناظر انسان کو اس طرح مسرور کر دیتے ہیں کہ دین دنیا سے بھٹکا ہوا بھی ان مناظر میں کھو جائے۔ اس وقت جو روشنی روشن دان سے آ رہی تھی۔ اس نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا ہوا تھا اور وہی روشنی اس کے بدن کے نقوش نمایاں کئے ہوئے تھی۔ انیس سے بیس سال کی عمر ہوگی۔ اس سے زیادہ نہیں تھی اور روشن دان سے پڑنے والی روشنی نے اس کے چہرے کو اس طرح چمکایا ہوا تھا جسے ایک اور چاند زمین پر کھلا ہو۔

شاہ زیب خدا کی قدرت کا یہ نظارہ دیکھتا رہا پھر ایک دم اسے یہ احساس ہوا کہ وہ ایک گناہ کر رہا ہے وہ عالم نیند میں ہے اور اس وقت اس کے بدن کا ہر نقش کائنات پر قرض ہے۔ اگر کائنات کی یہ امانت اس طرح چرائی جائے تو مناسب تو نہیں ہوگا۔ اس نے

آنکھیں وہاں سے ہٹالیں اور کھڑکی کے ساتھ ساکت کھڑا عالم تصور میں اندر موجود حسین وجود کو دیکھتا رہا۔ وہ نگاہوں کے سامنے نہیں تھا لیکن اس طلسم پیکر کا ایک ایک نقش اس کے ذہن پر منجمد ہوگیا تھا اور اس وقت دل چاہ رہا تھا کہ اس کے علاوہ ساری کائنات کو بھول جائے۔ کیا عجیب کیفیت ہوتی ہے انسان کی بھی۔

بہت دیر تک وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ رونے کی آواز دوبارہ ابھری اور وہ پھر چونک پڑا۔ اس نے کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہ اسی طرح رو رہی تھی۔ اس کے قدم یہاں جم گئے لیکن اپنی کیفیت کا اسے بخوبی اندازہ تھا۔ ابھی اسے کوئی دیکھ لے تو کیا سوچے اور کیا کہے۔

تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح کھڑا رہا اور اس کے بعد بوجھل قدموں سے آگے بڑھا اور دوسرے کمرے کی کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ آوازیں اندر سے آ رہی تھیں۔ کوئی مرد کہہ رہا تھا۔

''سکینہ! سنبھال لے اپنے آپ کو۔ کیا ملے گا رونے دھونے سے۔ لجیا جاگ گئی تو اس کا بھی دل دکھے گا۔ دل ٹوٹے گا۔ رو نہیں اللہ سے دعا مانگ تو تو پانچوں وقت کی نماز پڑھتی ہے۔ دعا مانگ اللہ سے کہ اللہ ہماری مشکل حل کرے۔ ہمارے پاس تو کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ پر--- پر کیا کہیں اور کیا نہ کہیں۔''

''ہوگا کیا' وہ ریچھ میری لجیا کو لے جائے گا اور لجیا کے دل پر کیا گزرے گی۔ اللہ یہ چاند کے ٹکڑے تو غریبوں کے گھر میں کیوں اتار دیتا ہے۔ ہم تو اس کا صحیح بندوبست بھی نہیں کر سکتے۔ ہم تو ان کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔''

''مٹی لگا دے اس کے منہ پر' شکل بگاڑ دے اس کی اور اس کے بعد میں چوہدری کو کہوں کہ لے جا اس بھوتنی کو بڑا حسن پرست بنا پھرتا ہے' کتا کمینہ کہیں کا' نہ اپنی عمر دیکھتا ہے

نہ شکل وصورت۔ بتاؤ میری پھول سی بچی پر کیا مصیبت نازل کر دی ہے اس نے۔ اللہ ہماری مدد کر۔ ہماری مدد کر۔''

اور اس بار عورت کے رونے کی آواز پھر ابھرنے لگی۔ شاہ زیب بڑی تعجب بھری نگاہوں سے ان دونوں کا جائزہ لیتا رہا۔

پچاس پچپن سال کی عمر کے بڑے میاں تھے۔ پینتالیس سے لے کر پچاس کے درمیان کی عورت تھی۔ دونوں ہی کی شکل وصورت بہت اچھی تھی اور ان کے چہروں سے نیکی اور شرافت برستی تھی لیکن ان کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ لجیا کے بارے میں تو اسے اندازہ ہوگیا کہ وہی لڑکی ہے جسے وہ لوگ چاند کا ٹکڑا کہہ رہے تھے اور اس میں کوئی شک کی بات نہیں تھی لیکن باقی بات شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ اس امید پر نگاہیں جمائے اور کان لگائے انہیں دیکھتا اور سنتا رہا کہ شاید وہ اس بارے میں کچھ اور کہیں لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

شاہ زیب خاموشی سے کھڑا سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے کہ دفعتاً ہی ایک مدھم سی چیخ فضا میں ابھری اور شاہ زیب اس طرح اچھل پڑا جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے پلٹ کر دیکھا تو اس حسین مجسم کو اپنے سامنے پایا۔ وہ دہشت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ شاہ زیب کو دیکھ کر اس کا منہ کھلا لیکن آواز بلند نہ ہو سکی تھی۔ اتنی دیر میں اندر سے جو آواز سن لی گئی تھی وہ رنگ لائی اور دونوں میاں بیوی باہر نکل آئے۔ اب صورت یہ تھی کہ ایک طرف وہ کھڑی ہوئی تھی دوسری طرف وہ دونوں میاں بیوی اور بیچ میں شاہ زیب جو پتھرائی ہوئی نگاہوں سے اس سارے ماحول کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی مرد کی آواز ابھری۔

''کون ہو بھائی؟ کس نیت سے یہاں داخل ہوئے ہو' کون ہو بیٹا؟ کیسے آنا

ہوا۔ چوری کرنے آئے ہو ہمارے گھر میں۔ اگر یہ بات ہے تو کھل کر کہو۔ ہم تمہیں کچھ دے تو نہیں سکیں گے تم سے کچھ مانگیں گے ضرور۔ ہم تم سے موت مانگیں گے میرے بچے۔ ایسا کرو اس گھر میں بڑا مال و دولت' بڑا اسباب چھپا ہوا ہے۔ ہم سب کو قتل کیے بغیر تم وہ سب کچھ نہیں حاصل کر سکو گے۔ سب سے پہلے ہماری زندگی لے لو۔ رائفل تو ہے تمہارے ہاتھ میں۔ تین گولیاں چلاؤ' صرف تین گولیوں کا سوال ہے اور یقین کرو تمہیں یہاں ان کے بدلے میں بہت کچھ مل جائے گا۔ ماردو ہمیں تمہیں خدا کا واسطہ' ماردو' ماردو بیٹا ہمیں' ماردو۔''

مرد کی آواز میں ایسی لرزشیں تھیں جنہیں بس محسوس کیا جا سکتا تھا وہ مرد تھا اور رونا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کا دل رو رہا تھا۔ سارا وجود چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ شاہ زیب اس طرح ساکت کھڑا رہا۔ لڑکی بھی اسی طرح کھڑی ہوئی تھی۔ پھر اس نے ہلکی سی چیخ ماری اور اچھل کر ماں باپ کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''بابا! اس کے ہاتھ میں تو بندوق ہے۔''

''بیٹا! کنجوس معلوم ہوتا ہے تین گولیوں کا خرچ بھی نہیں برداشت کر سکتا۔ ارے بھائی دیکھ تو سہی اندر آ کر یہ دونوں کمرے ہیں۔ بہت کچھ ہے ان میں' میں تجھے اندر نہیں جانے دوں گا۔ جب تک تو ہم پر گولی نہیں چلائے گا۔'' شاہ زیب نے آنکھیں میچ کر زور سے گردن جھٹکی اور اپنے آپ کو اس ماحول کے سحر سے آزاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ کیا عجیب احمقانہ سچویشن بن گئی ہے۔ اسی کو کہتے ہیں کہ انسانی زندگی تو صرف واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے اور واقعات اس طرح زندگی میں داخل ہوتے ہیں کہ پہلے سے ان کی ترتیب کسی شکل میں کی ہی نہیں جا سکتی۔ بہرحال یہ ساری باتیں تھیں۔ شاہ زیب خاموش کھڑا ہوا تھا اور پھر اس نے کہا۔

''بابا صاحب! اگر میں آپ سے کہوں کہ میں چور نہیں ہوں۔ تو کیا آپ میری

بات پر یقین کر لیں گے؟''

''ڈاکو ہے بابا' ڈاکو چوروں کے پاس بندوقیں کہاں ہوتی ہیں۔'' ایک معصومانہ آواز ابھری۔ ایسی دلکشی ایسا حسن تھا اس آواز میں کہ کوئی سوچ بھی نہ سکے۔ شاہ زیب ان معصوم الفاظ پر مسکرا دیا اور اس نے کہا۔

''نہیں ڈاکو بھی نہیں ہوں تم چاہو تو یہ بندوق میں تمہیں دے سکتا ہوں۔ لو بابا اسے پکڑ لو۔ کیا تم ایک بہت منافع کا سودا کرنا پسند کرو گے؟''

بوڑھا شخص بھی سمجھ گیا اور اس نے کہا۔

''سودا؟''

''ہاں۔''

''تو تم سوداگر ہو۔''

''بن گیا ہوں۔''

''کیا سودا کرنا چاہتے ہو؟''

''دو روٹیاں' تھوڑا سا ان کے ساتھ کوئی بھی سالن۔ ایک گلاس ٹھنڈا پانی اور اگر مجھے بہت سا منافع دینا چاہتے ہو تو پھر ایک پیالی چائے جو میں نے نجانے کتنے دنوں سے نہیں پی۔ اس کے عوض میں یہ بندوق تمہیں دے سکتا ہوں۔ بلکہ پہلے سے اپنے قبضے میں کر لو اور اس کے بعد مجھے یہ چیزیں مہیا کرو۔ بابا بڑی مہنگی بندوق ہے اور اس کے ساتھ یہ کارتوس بھی ہیں۔ بولو ایمانداری سے سودا کرو گے۔ روٹی کھاؤں گا اور یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''ارے بیٹا! کیسی باتیں کرتے ہو تم نے جو کچھ مانگا ہے وہ تو ہمارے لیے ایک اعزاز ہے۔ سکینہ جلدی بتا ہے کچھ کھانے کے لیے؟''

"آثار کھا ہوا ہے۔ گوندھا ہوا، روٹیاں دو منٹ میں پکتی ہیں سالن بھی پکا ہوا ہے۔
جا لجیا جلدی سے چائے کا پانی چڑھا دے۔ دوسرے چولہے پر میں روٹیاں پکاتی ہوں آ کر۔
چھوڑو بیٹا چور ہو ڈاکو ہو جو کچھ بھی ہو روٹی مانگی ہے نا یہ تو اللہ کا قرض ہوتا ہے انسان پر خدا کا
شکر ہے کہ ہم اس قابل ہیں کہ تمہیں دو روٹیاں کھلا سکیں۔ آؤ--- اب جو کوئی بھی ہو جاتے
ہوئے یہاں سے جو کچھ حاصل کرنا چاہو لے جانا لیکن تم سے جو فرمائش کی گئی ہے اگر اسے پورا
کر دو تو زندگی بھر تمہارا احسان مانیں گے۔ جواب میں وہ ہنس پڑا۔ پھر بولا۔

"زندگی بھر۔"

"نہیں مرنے کے بعد بھی۔" عورت نے جلدی سے اپنے الفاظ درست کے
لیے۔ پھر لڑکی سے بولی۔

"گئی نہیں تو۔ جا منہ پر پانی کے چھینٹے مار لے نیند دور ہو جائے گی۔ مہمان آیا ہے
بیٹا چاہے چور ڈاکو کی شکل میں ہی کیوں نہ ہو۔ سب سے پہلے مہمان ہے بعد میں سب کچھ
جا--- کھڑی کھڑی میری شکل کیا دیکھ رہی ہے۔ دو دفعہ کہہ چکی ہوں سنا نہیں تو نے۔" عورت
کے لہجے میں کرختگی پیدا ہو گئی اور وہ جلدی سے ایک طرف چل پڑی۔ مرد نے دالان میں
سیدھی کھڑی ہوئی چارپائی بچھائی اور کہنے لگا۔

"آیئے ڈاکو صاحب! بیٹھ جایئے۔ آپ نے چوریاں بھی کیں ہوں گی ڈاکے بھی
ڈالے ہوں گے لیکن ایسا گھر بھی آپ کو کبھی نہیں ملا ہوگا۔ جو آپ کو اتنی عزت اور احترام کے
ساتھ بیٹھنے کی پیشکش کرے۔" شاہ زیب کو اب اس ماحول سے لطف آنے لگا تھا۔ وہ آگے
بڑھا اور اس نے رائفل دیوار سے ٹکا دی اور پھر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ عورت نے کہا۔

"لوٹے میں پانی لا دیتی ہوں منہ ہاتھ دھو لو۔ نہانا چاہو تو اس کا بھی انتظام ہے۔
ہم وعدہ کرتے ہیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ ارے ہم نقصان پہنچانے کے قابل

ہی نہیں۔ نہیں سمجھے۔"

"نہیں سب کچھ ٹھیک ہے کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ آپ لوگ فکر نہ کریں۔"

"پانی لا دوں لوٹے میں؟"

"لا دیجئے۔" شاہ زیب نے کہا اور عورت ایک طرف چلی گئی۔ شاہ زیب کی
نگاہیں بند دروازے کی جانب اٹھیں۔ تو مرد نے کہا۔

"دروازہ بند ہے تم اس وقت ہماری پناہ میں ہو۔ بے فکر رہو اللہ کے فضل و کرم
سے کریم بخش ایک مسلمان کا بیٹا ہے اور پوری طرح اسلامی آداب سے واقف ہے۔ تمہیں
کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ یہاں اس وقت جب تک تم اس گھر کے دروازے سے باہر نہیں نکل
جاؤ گے۔"

"خوب۔ اچھے لوگ ہیں آپ۔" شاہ زیب نے اتنا ہی کہا تھا کہ عورت لوٹے
میں پانی لے آئی اور شاہ زیب اپنی جگہ سے اٹھ کر دالان کے سرے پر بیٹھ کر منہ ہاتھ دھونے
لگا۔ باورچی خانے سے دھڑ دھڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ عورت نے کہا۔

"تم مہمان کو تولیا دے دینا۔ میں باورچی خانے میں جا رہی ہوں۔" پھر وہ وہاں
سے آگے بڑھ گئی۔ شاہ زیب نے اطمینان سے منہ دھویا اور پلنگ پر آ بیٹھا۔ کریم بخش کھڑا
ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

"بابا جی! آپ بیٹھیں نا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" بوڑھے نے ایک پیڑھی اٹھائی اور شاہ زیب سے کچھ فاصلے پر
بیٹھ گیا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ شاہ زیب کا ذہن تجسس میں ڈوبا ہوا تھا۔ پتہ نہیں ان لوگوں کی
رام کہانی کیا ہے۔ خاص طور سے وہ رونے کی آواز شاہ زیب کے لیے معمہ بنی ہوئی تھی۔ پتہ
نہیں کیا قصہ ہے ان لوگوں کے ساتھ۔ بظاہر کوئی ایسی پریشانی نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن پھر

بھی کچھ نہ کچھ مسئلہ ضرور تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد عورت کھانا لے آئی' کوئی ساگ پکا ہوا تھا۔ تلے ہوئے آلو تھے۔ چٹنی تھی اور گرم گرم روٹیاں۔ شاہ زیب ان چیزوں پر ٹوٹ پڑا اور پھر اس نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ بوڑھی عورت واپس باورچی خانے میں چلی گئی تھی اور گرم گرم روٹیاں لے کر آئی تو شاہ زیب نے کہا۔

''نہیں ماں جی بہت کافی ہیں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' پھر کھانے سے فارغ ہوا کہ لجیا ایک ٹرے لے کر آ گئی۔ جس میں چائے کے چار پیالے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے بڑے اطمینان سے ایک پیالہ اٹھا کر شاہ زیب کی جانب بڑھا دیا۔ دو سفید سفید ہاتھ زندگی کے حسن سے مالا مال شاہ زیب کی نگاہوں کے سامنے آئے۔ ان میں چائے کا پیالہ دبا ہوا تھا۔ شاہ زیب نے پیالہ دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ لیکن احتراماً اس نے اپنے ہاتھوں کو ان ہاتھوں سے مس نہیں کیا تھا۔ وہ پیچھے ہٹی تو کریم بخش نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ تو نے اچھا کیا لجیا کہ سب کے لیے چائے بنا لی اب نیند بھلا آنکھوں میں کہاں آئے گی۔'' شاہ زیب نے چائے کے کچھ گھونٹ لیے۔ لجیا اپنا پیالہ لے کر تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گئی تھی۔ شاہ زیب نے چائے کے دو تین چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے کے بعد کہا۔

''زندگی میں کبھی کبھی ایسے عجیب لمحات آتے ہیں۔ جو زندگی بھر کے لیے یادگار بن جاتے ہیں۔ آپ لوگوں کو بھی یہ لمحے یاد آتے رہیں گے۔ ویسے میں آپ کو بتاؤں کہ چائے پینے کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا لیکن آپ یقین کیجئے میں چور یا ڈاکو نہیں ہوں۔''

''اب یقین آ گیا ہے۔ اس بات پر تھوڑی سی زندگی میں نے بھی گزاری ہے اور اس زندگی میں انسانی چہروں کے کچھ تجربات بھی ہوتے ہیں مجھے۔ بیٹے! میں تم سے تمہاری کہانی اس لیے نہیں پوچھوں گا کہ تھوڑی دیر بعد تم یہاں سے چلے جاؤ گے۔ بعض اوقات

کہانیاں ذہن پر نقش ہو کر رہ جاتی ہیں اور انسان ان کہانیوں میں بھٹک جاتا ہے۔''

''لیکن میں ایک کہانی ضرور سننا چاہتا ہوں۔'' شاہ زیب نے کہا۔ بوڑھے نے چونک کر شاہ زیب کا چہرہ دیکھا۔ پھر اپنی بیوی کا اور اس کے بعد بولا۔

''نہیں بیٹا! میں نے کہا نا کوئی کہانی نہیں۔ اتنے مختصر سے لمحات کے لیے ملنے والوں کو ایک دوسرے کے بارے میں اتنا نہیں جاننا چاہیے کہ پھر یہ جانکاری ایسی سسکتی ہوئی یادیں بن جائے جو انسان کو زندگی بھر رلاتی رہیں۔'' شاہ زیب نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا اور بولا۔

''بابا صاحب! آپ اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔'' جواب میں بوڑھا پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو گیا۔ لجیا نے اپنی چائے ختم کی اور بولی۔

''اب میں کیا کروں؟''

''جاؤ' اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔''

''نیند تو مجھے بھی نہیں آئے گی۔ اس لیے کہ میں نے چائے پی ہے۔''

''پھر بھی لجیا جاؤ اپنے کمرے میں جاؤ۔ بری بات ہے بڑوں کے درمیان اس طرح نہیں بیٹھا کرتے۔'' اس بار عورت نے کہا۔

''عجیب بات ہے۔ بڑے بڑے بڑے بڑے بلاوجہ کے بڑے۔ اماں ہو تم ہماری یہ ابا ہیں اور یہ انہیں تو میں جانتی نہیں ہوں۔ اگر میں بھی یہاں بیٹھی رہوں آپ کی باتیں سنتی رہوں تو اس میں کیا برائی ہے۔''

''لجیا بیٹے! ایک دفعہ کا کہنا سنتے ہیں۔''

''ہاں۔ بس سنتے ہی ہیں۔'' اس نے کہا اور اٹھ کر منہ بناتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پھر اس نے شاید اندر کی روشنی بھی بجھا دی تھی۔ یا روشنی کمرے میں تھی ہی نہیں اور

چاندروشن دان سے ہٹ گیا تھا کیونکہ اب کمرے سے تاریکی کے سوااور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بوڑھے کریم بخش نے کہا۔

''بیٹا! نام بھی نہیں بتاؤ گے اپنا؟''

''آپ مجھے زیب کہہ سکتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''چہرے سے تو تم بھی پڑھ لکھے لڑکے معلوم ہوتے ہو لیکن حلیہ بڑا خراب کر رکھا ہے اپنا' کیا قصہ ہے بیٹا! دیکھو مجھے معاف کرنا دیکھنے میں کوئی تمہیں چور یا ڈاکو ہی کہہ سکتا ہے۔ اور یہ صرف تمہارے حلیے کی وجہ سے ہے۔ اگر چہرہ ٹھیک کر لو تو کوئی بھول کر بھی نہیں سوچے گا۔''

''بس بابا صاحب! جانے دیجئے ان باتوں کو۔''

''ہاں جانے دو تم نے مجھ سے ایک کہانی سنانے کی فرمائش کی تھی نا؟''

''میں یہاں داخل ہوا اور چھپا ہوا بیٹھا تھا کہ مجھے کسی کے رونے کی آواز سنائی دی تھی اور اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ رونے کی یہ آواز ان ماں جی کی تھی۔ دونوں کے چہروں پر غمناک تاثر پھیل گیا۔ کریم بخش نے کہا۔

''ہاں بیٹا ایسی ہی بات ہے۔''

''کیوں ویسے میں آپ کو پھر ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ میں بہت لمبا سفر طے کر کے آیا ہوں۔ بھوک سے بلبلا رہا تھا اور بستی کے بارے میں میں نے سوچا تھا کہ جو بھی پہلا مکان نظر آئے گا۔ اس میں داخل ہو کر اس کے باورچی خانے سے کھانا تیار کروں گا اور اگر مل گیا تو کھانا کھا کر خاموشی سے باہر نکل جاؤں گا۔ یہاں میں نے کھانے کو تلاش کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ ماں جی کے رونے کی آواز سنائی دی اور میں متجسس ہوگیا۔ کریم بخش نے نگاہیں اٹھا کر شاہ زیب کو دیکھا اور بولا۔

''بیٹا! ہم ایک مصیبت میں گرفتار ہیں۔ بہت بڑی مصیبت ہے یہ۔''

''کیا بابا جی! مجھے بتائیے؟'' کریم بخش نے نگاہیں اٹھا کر بوڑھی کو دیکھا تو وہ کہنے لگی۔

''بتا دو کیا نقصان ہوگا ہمارا۔''

''ویسے تو بیٹا انسان صرف اللہ کے سامنے ہی رو سکتا ہے کون کسی کی مدد کر سکتا ہے۔ میرا نام کریم بخش ہے شہر میں رہتا تھا۔ اسکول میں پڑھاتا تھا۔ اللہ نے مجھے بیٹی دے دی۔ اس وقت تو جوانی تھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرا بڑھاپا بیٹی کا بوجھ کیسے سنبھال سکے گا لیکن جیسے جیسے عمر گزرتی گئی اور لجیا بڑی ہوتی گئی۔ میرے دل میں خوف اور وسوسوں کا بسیرا ہوگیا۔ لجیا کو اللہ تعالیٰ نے جو جوانی اور خوبصورتی دی ہے۔ وہ تم نے دیکھی بھی ہوگی۔ میں اللہ سے شکوہ تو نہیں کرتا لیکن اتنا ضرور کہتا ہوں کہ انسان کو اس کی بساط بھر دے۔ اگر لجیا کو اللہ تعالیٰ نے یہ حسن و جمال دیا تھا تو اس کے تحفظ کا بندوبست بھی کر دیتا۔ کوئی بھائی ہی ہوتا اس کا لیکن اللہ نے یہ ذمے داری بھی مجھے ہی دے دی۔ بھلا یہ بوڑھی ہڈیاں اس کی حفاظت کیسے کر سکتی ہیں۔ جس طرح میں نے زندگی گزاری ہے بیٹے! تم سوچ نہیں سکتے۔ میں نے بڑی رو رو کر یہ زندگی کاٹی ہے۔ راتوں کا جاگتا رہتا ہوں۔ کچھ عرصہ قبل میں شہری آبادی میں جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ رہتا تھا۔ وہاں ایک چھوٹا سا گھر تھا میرا جو اپنا نہیں تھا۔ محلے میں ایک غنڈے نے لجیا کو دیکھا اور کم بخت ہمارے پیچھے لگ گیا۔ مجھ سے بڑی محبت سے پیش آنے لگا۔ ہمارے گھر کے کام کاج کرنے لگا اور آخر میں اس نے محلے کے ایک دوکاندار کی معرفت مجھ سے کہلوایا کہ لجیا کی شادی اس سے کر دی جائے۔ چھٹا ہوا غنڈہ تھا اور کوئی کام دھندا نہیں کرتا تھا۔ لڑائی جھگڑا مار پیٹ اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ میں دہشت زدہ ہوگیا۔ اور آخر کار میں نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ آبادی چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ بڑی مشکل سے میں نے

ایک گھر کرائے پر حاصل کیا اور آہستہ آہستہ تھوڑا تھوڑا سا سامان اس گھر میں منتقل کرتا رہا۔ اتنا سامان میں نے وہاں پہنچا دیا کہ ہم گزارہ کر سکیں اور اس کے بعد ایک رات میں لجیا اور اس کی ماں کو لے کر وہاں سے نکل آیا اور اس گھر میں منتقل ہو گیا۔ نوکری کا بھی معاملہ تھا۔ اسکول میں پڑھاتا تھا اور اس طرح زندگی گزار رہا تھا۔ شہر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ بہر حال کوئی سال سوا سال تک کچھ بھی نہ ہوا۔ لیکن ایک دن میں نے رفیقے کو دیکھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا اور خاموشی سے میرا پیچھا کر رہا تھا۔ میں گھر آنے کی بجائے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں جا کر بیٹھ گیا۔ رفیقا میرے پاس آ گیا اور مجھ سے سلام دعا کر کے مجھ سے میرے بارے میں پوچھنے لگا۔ پھر کہنے لگا۔

''چاچا جی! کہاں غائب ہو گئے آپ وہاں سے ایک دم' گھر کا سامان بھی آپ نے وہیں چھوڑ دیا۔ مجھے بتائیے کہاں یہ سامان پہنچا دوں۔ مکان مالک آپ کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''کرایہ میں دوں گا تجھے۔ خبردار چاچا جی کے سامان کو ہاتھ لگایا۔ چاچا جی مجھے اپنا گھر دکھاؤ۔''

''بس بیٹے میں بیوی بچوں کو کہیں اور چھوڑ آیا ہوں اور یہاں پارک میں سو جاتا ہوں۔''

''کیا بات کرتے ہو چاچا جی! میرے ہوتے ہوئے تم پارک میں سوؤ گے۔ مگر تم نے ایسا کیا ہی کیوں؟''

''بس ایسے ہی۔ حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے۔''

''چاچا جی! رفیقے کو اپنا بیٹا بنا لو تمام حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ چلو اٹھو میرے ساتھ میرے گھر چلو۔''

''نہیں بیٹا!''

''چلو آؤ چاچا جی۔۔۔''

''میں نے منع کیا نا۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ تو وہ مجھے دیکھتا رہا اور پھر وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''ٹھیک ہے چاچا جی! ہم سے اڑو گے تو کہاں جاؤ گے۔ دیکھ لیں گے تمہیں۔''

''بس اس کے بعد وہ چلا گیا۔ لیکن یہ سمجھ لو بیٹا! زندگی مجھ پر حرام ہو گئی۔ اسی رات وہاں سے بھاگا۔ ریل میں جا بیٹھا۔ ہر لمحے ذہن کو یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ کہیں رفیقا میری تلاش نہ کر رہا ہو۔ اس نے میرا پیچھا نہ کیا ہو۔ یہاں آ گیا۔ بس یوں سمجھ لو ایسے ہی منہ اٹھائے ریل میں جا بیٹھا تھا۔ جو نقد پیسے اور تھوڑا بہت بیوی کا سامان تھا وہ ساتھ لے لیا تھا۔ باقی ایک بار پھر چھوڑ دیا تھا اپنا گھر۔

ریل یہاں رکی اور میں بھی اسی اسٹیشن پر اتر گیا اور اس کے بعد بستی آ گیا۔ تین دن ایک سرائے میں گزارے۔ اس بستی کا جائزہ لیا اور پھر یہ چھوٹی سی جگہ حاصل کر کے یہاں پر کچا گھر بنوا لیا۔ تھوڑے فاصلے پر پرچون کی ایک دکان بھی کھول لی ہے۔ میں نے اور یہاں رہ کر میں نے ایک اور بھی چکر چلایا ہے بیٹا! میری مجبوری تھی یہ میری زندگی کا بدترین غم ہے۔ جو مجھے کھائے جا رہا ہے بیٹا۔ یہاں کے لوگ بہت اچھے ہیں برے نہیں ہیں۔ انہوں نے میرا بڑا خیال رکھا ہے۔ دوکان بھی اللہ کے فضل سے اتنی چل جاتی ہے کہ میری روزی روٹی پوری ہو جاتی ہے لیکن وہی خوف میرے دل میں سمایا ہوا تھا کہ میں اپنی بیٹی کا تحفظ کیسے کروں۔ میں انتظار کرتا ہوں اس کا جو خاموشی سے کہیں سے آئے اور میری بیٹی کا ہاتھ تھام لے۔

''بیٹا! میں بڑا پریشان تھا اور پھر میں نے ایک چال چلی۔ میں خود اپنے ہاتھوں

سے خط لکھتا تھا اور پاس کی بستی میں جا کر ڈاک خانے میں ڈال دیا کرتا تھا۔ یہ خط میرے بیٹے کی طرف سے ہوا کرتا تھا۔ جو جیل سے مجھے خط لکھتا تھا۔ میں نے لوگوں کو یہ بتایا تھا کہ میرا ایک بیٹا ہے۔ جو بچپن سے ہی بری صحبتوں میں پڑ گیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایک گروہ میں شامل ہو گیا اور اس نے ڈاکہ زنی شروع کر دی۔ بینکوں میں ڈاکے ڈالے، مار پیٹ کی، لوگوں کو قتل کیا۔ چھ قتل کر چکا ہے وہ، قتل کرنا اب اس کی عادت بن چکی ہے۔ بات بات پر لوگوں کو زندگی سے محروم کر دیتا ہے۔ میں نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ اس کی کمائی کا ایک پیسہ بھی میں نے قبول نہیں کیا اور میں نے کہا کہ میں اپنی کمائی کھاؤں گا اور حرام کا ایک پیسہ نہیں لوں گا۔ جیل گیا ہوا ہے۔ بس تھوڑے ہی دنوں کے بعد چھوٹنے والا ہے۔ مجھے خط لکھتا ہے بابا! میں آ رہا ہوں۔ یہ کہانیاں میں لوگوں کو سناتا ہوں۔ اس لیے کہ لوگ خوفزدہ ہو جائیں اور میری طرف بری نگاہ سے نہ دیکھیں۔ مجھے لجیا کا تحفظ حاصل ہو جائے اور اللہ کہیں سے بندوبست کر دے تو کوئی نیک لڑکا دیکھ کر میں اس کی شادی کر دوں۔ انہی حالات میں جی رہا تھا۔ لوگ مجھ سے بے حد متاثر ہو گئے تھے۔ میرا احترام کرنے لگے تھے۔ خاص طور سے میرے اس جرائم پیشہ بیٹے کے خوف سے۔

وہ سوچتے تھے کہ اگر وہ آئے گا اور میں کسی کی شکایت کر دوں تو اس کی شامت آ جائے گی لیکن تقدیر ایسے راستے بعض اوقات بالکل بند کر دیتی ہے۔ لجیا کی شناسائی وہاں کچھ گھروں میں ہو گئی تھی۔ بچی تو بچی ہی ہوتی ہے۔ لڑکیوں بالیوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی ہے۔ زمیندار کی حویلی میں زمیندار کی بھتیجی کی شادی تھی۔ لڑکیاں وہاں جا رہی تھیں۔ مجھے بھی دعوت نامہ آیا تھا۔ یہاں سب ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ لجیا کو کہاں تک دبا کر رکھتا۔ یہ خیال بھی دل میں تھا کہ کوئی نیک بخت اسے دیکھ لے اور کوئی رشتہ آ جائے۔ چنانچہ میں نے اسے لڑکیوں کے ساتھ بھیج دیا۔ وہاں اسے اس منحوس چوہدری نے دیکھ لیا۔ چوہدری کا نام

راجہ شہاب الدین ہے۔ اس کم بخت کی رال ٹپک پڑی میری بیٹی پر۔ خدا ان منحوسوں کو غارت کرے۔ بیوی بچوں والا ہے۔ لجیا کی برابر اس کی بیٹیاں ہیں لیکن شیطان کی آنکھوں پر چربی چڑھی ہوئی ہے۔ دوسری کی اولاد کو اپنی اولاد کب سمجھتا ہے وہ۔ جب اس کے پاس دولت کے انبار ہوں۔

بہر حال لجیا چلی آئی۔ اس نے معلومات حاصل کیں اور پھر اپنے آدمیوں کو میرے پاس بھیج دیا لجیا کا رشتہ دے کر۔ خوش ہے لنگور ہے پورا اور پھر عمر میں بھی جیسے میں نے تمہیں بتایا کہ لجیا کے باپ کے برابر۔ مجھ سے ایک دو سال ہی چھوٹا ہو گا۔ بد بخت کھایا پیا ہے۔ اس کی صحت بہت اچھی ہے۔ اس کے آدمیوں نے آ کر مجھ سے کہا تو میں نے ان سے یہی بات کی کہ غیرت کرو بھائی۔ کہاں میری کومل سی بیٹی اور کہاں وہ بوڑھا بھوت! تو اس کے آدمی سخت ناراض ہوئے۔ کہنے لگے۔

''بڑے میاں! ہماری بستی میں نئے آئے ہو۔ چوہدری صاحب کو نہیں جانتے ہو۔ یہ بات کہی تو ہے تم نے۔ اب اس کے نتیجے میں ہونا تو یہ چاہیے کہ تمہیں چوہدری صاحب کے پاس پہنچا دیا جائے اور چوہدری صاحب کو تمہاری بات بتا دی جائے۔ جب وہ تمہیں بڑے پیار سے تہہ خانے میں لے جائیں گے اور وہاں کھڑے ہوئے ان لوگوں کی تصویریں دکھائیں گے جو اپنی کھال میں بھس بھروائے وہاں موجود ہیں۔ تیرہ ایسے آدمی ہیں جن کی کھالیں اتار کر چوہدری صاحب نے اس میں بھس بھروا دیا ہے اور اپنے ان سرکش ساتھیوں کو ان کا نظارہ کراتے رہتے ہیں جو چوہدری صاحب سے کسی طرح کا اختلاف کرتے ہیں۔ بات سمجھ میں آ رہی ہے نا۔ ہوش میں آؤ تیاریاں کرو ورنہ کیا فائدہ چوہدری صاحب کے لیے مشکل نہیں ہے کہ چار بندے بھیجیں اور تمہاری بیٹی کو اٹھوا لیں۔ قاضی بلائیں اس سے نکاح کریں اور تمہارے ساتھ باقی سارے کام ہوں۔ کیا سمجھے ہوش میں آؤ۔ ہم

ابھی احتیاط کریں گے کیونکہ ہماری ابھی تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ چوہدری صاحب سے یہی کہیں گے کہ چوہدری صاحب کریم بخش نے کہا ہے کہ سوچ کر جواب دوں گا۔ اب یہ اس کا حق ہے سمجھ رہے ہو نا تو بات بچی ہونی چاہیے۔ سوچ لو تمہیں ہفتہ دس دن دیئے جا سکتے ہیں۔ ہم اس بات کو سنبھال لیں گے۔ بھائی عقل کے ناخن لو۔ بھلا اس بستی میں رہ کر کوئی چوہدری شہاب الدین سے بیر مول لے سکتا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا تم؟''

چنانچہ بیٹا! ایسا ہی ہوا ہے۔ زندگی عذاب ہو گئی ہے ہم پر۔ میری بوڑھی ہڈیاں اب میرا ساتھ چھوڑتی جا رہی ہیں۔ بس یہ دوکان کر لیتا ہوں آس پاس کی بستیوں سے خریداری کرتا ہوں اور یہاں لا کر بیچ دیا کرتا ہوں۔ اتنے پیسے بچ جاتے ہیں کہ ہم میاں بیوی اپنا پیٹ پال لیتے ہیں۔ بیٹا! کیا کروں کیا نہ کروں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ شاہ زیب خاموشی سے یہ ساری داستان سن رہا تھا۔ بوڑھے نے کہا۔

''اب رونے کے سوا ہماری زندگی میں ہے کیا۔ یہ بیچاری یہ تصور کر کے روتی رہتی ہے کہ اگر لجیا کو چوہدری نے اٹھوا لیا تو کیا ہوگا۔ کیا ہماری لجیا کی تقدیر میں وہ کالا بھوت لکھا ہوا ہے۔ ہونا تو نہیں چاہیے بیٹا! ایسا۔ بس یہ ہے ہماری رام کہانی۔'' شاہ زیب چشم تصور سے اس حسن خوابیدہ کو دیکھ رہا تھا جسے چاند نے اپنی آغوش میں لیا ہوا تھا۔ اور چاندنی جسے ہنکارے دے دے کر سلا رہی تھی۔ واقعی جیسا کہ شہاب الدین کا حلیہ بیان کیا گیا ہے اگر لجیا اس کے چکر میں پھنس جاتی ہے تو یہ انتہائی دکھ اور افسوس کی بات ہوگی۔ ایسا ہونا تو نہیں چاہیے۔

بہر حال اس سلسلے میں شاہ زیب کے ذہن میں اور بھی بہت سے خیالات آ رہے تھے۔ یہ چوہدری ٹائپ کے لوگ ہر جگہ ایسی ہی گندگی پھیلائے ہوئے ہیں۔ بہت کم ایسے ہوں جو نیک نفسی سے زندگی گزار رہے ہوں گے۔ کیا ان کا طلسم نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ کیا کیا

جائے ایسا کون سا عمل ہو جو یہ بھی اپنے غریب ساتھیوں کے ساتھ ہمدردی اور انصاف کا برتاؤ کرنا شروع کر دیں۔ ایسی کون سی ترکیب ہو سکتی ہے۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر دونوں میاں بیوی کی طرف دیکھا۔ دونوں کے چہرے زرد ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''نہیں بابا صاحب! نہیں ماں جی' آپ لوگ بالکل بے فکر رہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ابھی تک وقت ہے۔ آپ کے پاس۔ ہم چوہدری کو جواب دے لیں گے۔ آپ یہ نہ سوچیں کہ میں اس خیال سے آپ کے سر پر پڑے رہنا چاہتا ہوں۔ میری منزل کچھ اور ہے سمجھ رہے ہیں نا آپ لوگ لیکن آپ کو میں تحفظ دے جاؤں گا۔ آپ اس بات کا اطمینان رکھیے گا۔'' شاہ زیب نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا اور بوڑھا نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔

''بیٹا! نیند آ رہی ہوگی سو جاؤ۔ سمجھے سو جاؤ۔ میں لجیا کو کمرے سے نکال دیتا ہوں اور تم اس کے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ وہ ہمارے پاس سو جائے گی۔''

''بابا صاحب! یہ درخت جو ہے نا آپ کے آنگن میں اگر آپ چاہیں تو اس کے نیچے مجھے جگہ دے دیں۔ ورنہ میں ابھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''ارے نہیں بیٹا! انسانوں پر کچھ ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ مہمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے۔ تم ہمیں اس سے کیوں محروم کر رہے ہو۔''

''بابا صاحب! آخری بات کہہ رہا ہوں آپ سے۔ میں ابھی دروازے سے باہر نکلوں گا اور آپ کی بستی کی وسعتوں میں گم ہو جاؤں گا۔ یہ دھمکی نہیں دے رہا ہوں میں آپ کو کہ میں آپ کو تنہا چھوڑ دوں گا۔ کہیں بھی کسی گوشے میں پناہ لے لوں گا میں۔ ایک تنہا انسان کے لیے زندگی گزارنا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا لیکن آپ یہ سمجھ لیجئے کہ اگر آپ نے

مجھ سے ضد کی اور اپنی نیند اور آرام میں خلل اندازی کی تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا ورنہ مجھے اس درخت کے نیچے سونے دیجیے۔"

"بیٹا! یہ---"

"نہیں بابا جی! ہاتھ جوڑتا ہوں آپ کے۔" شاہ زیب نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں وہاں چارپائی بچھائے دیتا ہوں تمہارے لیے۔" درخت سے تھوڑے سے فاصلے پر شاہ زیب کے لیے چارپائی بچھا دی گئی۔

کریم بخش صاحب! اسکول ماسٹر تھے۔ پڑھے لکھے تھے یہ جانتے تھے کہ رات کے وقت درخت کے نیچے چارپائی بچھا کر نہیں سونا چاہیے۔ اس لیے انہوں نے تھوڑے فاصلے پر چارپائی بچھائی۔ تکیہ اوڑھنے کے لیے چادر، چارپائی پر بچھانے کے لیے دری مہیا کر دی گئی تھی۔ شاہ زیب نے اپنی رائفل اپنے برابر رکھی اور تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ آسمان پر چاند کھلا ہوا تھا۔ اس کے آس پاس ستارے بکھرے ہوئے تھے۔ شاہ زیب اس کھلے آسمان کی وسعت میں اپنی منزل تلاش کرنے لگا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ ذہن سوچوں کا انبار لگائے ہوئے تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ نہ کوئی گھر ہے نہ در۔ وقت اس بستی میں لے آیا ہے۔

چوہدری الیاس اور جبار خاں بدترین دشمن ہیں۔ وہ اس کی تلاش میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے اور ادھر میں ماں سے کیے وعدہ کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہا دوں گا۔

ٹھیک ہے دوستو! میں تو زرعی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے علاقے کی بنجر زمینوں کو آباد کرنے کا عزم رکھتا ہوں لیکن تم نے میری منزل بدل دی ہے۔ تم نے مجھے جرم کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ اب انتظار کرو۔ ایک ایسے مجرم کا جو قتل و غارت گری

میں اپنی مثال قائم کر دے۔ ہاں چوہدری الیاس اور چوہدری جبار تم اس زمین پر بھٹہ کبھی نہیں بنا سکو گے۔ جس زمین کو میری ماں نے محبت بھری نگاہ سے دیکھا ہے۔ میرے لیے مخصوص کیا ہے اور مجھ سے کہا ہے کہ میں اسے آباد کروں۔ اس پر میں آگ کبھی روشن نہیں ہونے دوں گا۔ یہ میرا عہد ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ زندگی میرا ساتھ نہ دے۔ اس وقت میرے لیے مجبوری ہوگی۔

پھر اس نے کریم بخش بابا کی باتوں پر غور کیا اور ایک انوکھا اور میٹھا احساس اس کے دل میں جاگا۔ ایک پہلو تو یہ ہے کہ زندگی کو انتقام کے راستے پر ڈال دے۔ دوسرا یہ بھی ہے کہ کریم بخش کی مشکل دور کرنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دے اور ان سے کہے کہ بابا میں حاضر ہوں۔ میں نہ کوئی شہزادہ ہوں نہ آسمان سے اترا ہوا کوئی وجود۔ نہ برسر روزگار ہوں لیکن میرے پاس بہت کچھ ہے۔ اگر زندگی نے وفا کی تو میں تمہاری بیٹی کو راج کرا دوں گا۔ اسے میری زندگی میں شامل کر دو۔ وہ اس قابل ہے کہ اسے زندگی بھر چاہا جائے پوجا جائے۔ لیکن پھر اپنے اس خیال پر وہ خود ہی ہنس پڑا تھا۔ اگر کچھ عرصہ قبل کی بات ہوتی تو اس کی دل میں ایسی چور چور آہٹیں جاگتیں کہ دل کی دھڑکنوں کا انداز بدل جاتا۔ اپنے دوستوں سے وہ اس کا تذکرہ کرتا۔ انہیں بتاتا کہ یار تصور کر سکتے ہو کہ گدڑی میں لعل کیسے ہوتے ہیں اور پھر وہ اپنے بھائیوں سے کہتا۔ بھابیوں سے کہتا۔ کہ اس نے اپنے لیے اپنا مستقل چن لیا ہے۔ اب اسے اس تک پہنچانا ان کی ذمے داری ہے۔ آہ--- کیسے خوش نصیب لوگ ہوا کرتے ہیں، جنہیں چاہنے والے ان کی منزل تلاش کرتے ہیں۔ میرے لیے تو موت کے راستے منتخب کیے گئے ہیں۔ ان تمام خیالات نے اسے دکھی مسکراہٹ کے خاموش کر دیا۔

آسمان پر پھیلے ہوئے ستارے مستقبل کا حساب پیش کر رہے تھے۔ کئی قتل ہو چکے

تھے اس کے ہاتھوں۔ پولیس اسے بھلا کہاں چھوڑنے والی تھی۔ ادھر چوہدری الیاس اور جبار پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اس نے دکھ بھرے انداز میں سوچا کہ یہ سب کچھ اس کی زندگی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس کا تو محور ہی کچھ اور ہے۔ یہ سوچ کر اس نے ٹھنڈی سانس لی اور پھر خاموش ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

رفتہ رفتہ صبح کا اجالا پھوٹنے لگا تھا اور اس نے کچھ فیصلے کر لیے تھے۔ کریم بخش بابا نماز کے لیے اٹھ گیا تھا۔ اس نے ایک نگاہ اس پر ڈال لی تھی اور اسے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ رات کا چور درحقیقت چور نہیں تھا۔

پھر سکینہ اٹھ گئی اور لجیا بھی۔ باورچی خانے میں کھٹر پٹر کی آوازیں ابھرتی رہیں اور جب روشنی پوری طرح پھوٹ آئی تو کریم بخش اس کے پاس آ گیا۔

''بیٹا! جاگ گئے نہیں۔'' اس کی محبت بھری آواز ابھری۔

''جاگ رہا ہوں بابا' آپ کی طرح جنتی نہیں ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کس طرح عبادت کرتے ہیں۔''

''بیٹے! مہمان ہو کب آئے ہو کب چلے جاؤ گے یہ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں ایک درخواست ضرور کرتا ہوں۔ اگر ہو سکے تو اللہ کی عبادت کر لیا کرو۔ بڑے فائدے ہیں اس کے' اٹھو--- لجیا! پانی لا کر دو بیٹا۔ منہ ہاتھ دھو لیں۔ ناشتہ تیار ہے بیٹے! یہ چھوٹی چھوٹی آبادیاں ہیں نا۔ یہاں زندگی جلدی جاگ جاتی ہے اور جلدی سو جاتی ہے۔ شہروں کی بات اور ہے جیسا دیس' ویسا بھیس اپنانا پڑتا ہے۔ بس میں تھوڑی دیر کے بعد دوکان پر چلا جاؤں گا۔ میرے لگے بندھے گاہک ہیں جو صبح ہی صبح آ جاتے ہیں۔ اپنے کاموں کا آغاز کرنے سے پہلے ان کی ضرورتوں کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے بیٹا!'' وہ جلدی سے اٹھ گیا۔

موٹی چھوٹی روٹی' چائے کی جگہ دودھ بس تھوڑی سی چائے کی پتی اس دودھ میں

ڈال دی گئی۔ خوب مٹھاس' یہ صبح کا ناشتہ تھا۔ اپنا سب کچھ بھول چکا تھا۔ روٹی مل جائے یہی کون سی کم بات تھی۔ بھائیوں نے اس درجے تک پہنچا دیا تھا لیکن بہتر تھا اپنی شخصیت کو بھول ہی جایا جائے۔ ابھی تو دشمنوں سے نگاہیں چھپائے پھرنا پڑ رہا تھا۔ اُس نے ناشتہ کیا۔ بابا کریم بخش کہنے لگے۔

''دیکھو بیٹا! بستی میں گھومنا چاہو بے شک گھوم سکتے ہو لیکن کہیں جانا نہیں اگر رگوں میں اچھا خون دوڑ رہا ہے تو کم از کم اتنی وفاداری ضرور کرنا کہ جب جاؤ تو بتا کر جانا۔''

شاہ زیب نے خاموش نگاہوں سے کریم بخش کو دیکھا۔ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ کریم بخش نے خدا حافظ کہا اور چلا گیا۔ لجیا اور سکینہ رہ گئی تھیں۔ سکینہ نے کہا۔

''بیٹا! نہانے کا بندوبست ہے۔ ہمارے ہاں باقاعدہ غسل خانہ تو نہیں ہے۔ پیچھے جگہ ہے کنواں بھی ہے۔ چاہو تو ادھر نہا لو۔ ورنہ جیسے تمہاری مرضی۔''

شاہ زیب نے گھر کے بجائے پیچھے ہی نہانا مناسب سمجھا تھا۔ نہا دھو کر اس نے وہی کپڑے بدل لیے۔ ادھر کوئی آبادی نہیں تھی۔ بس تھوڑے فاصلے پر درخت پھیلے ہوئے تھے۔ شاہ زیب سوچتا رہا کہ کیا چوہدری جبار اور الیاس کے آدمی یہاں تک آ جائیں گے۔ اس علاقے کے بارے میں اسے کوئی خاص معلومات حاصل نہیں تھیں۔ وہ ان لوگوں سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن جلد بازی بھی مناسب نہیں تھی۔ ویسے یہ بڑی عظمت کی بات تھی کہ شاہ زیب نے ان سے کہا تھا کہ وہ چور یا ڈاکو نہیں ہے تو پھر یہ سوال تو کیا جا سکتا تھا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیا کر رہا ہے؟ چلو یہ بات مان لی جائے کہ اس نے اپنی بھوک مٹانے کے لیے اس گھر میں قدم رکھے تھے لیکن اس کے بعد یہ پوچھا جا سکتا تھا کہ وہ کہاں جائے گا۔ کیا کرے گا؟ یہ باتیں شاہ زیب کے ذہن میں آ رہی تھیں۔ بہر حال وہ ابھی اس آبادی میں عام نہیں ہونا چاہتا تھا۔ نہانے دھونے کے بعد وہ گھر واپس آ گیا اور

اس نے کہا۔

''ماں جی! یقینی طور پر کسی کے گھر میں ضرورت سے زیادہ مداخلت مناسب نہیں ہوتی۔ آپ کا حکم ہے کہ میں آپ کو بتائے بغیر یہاں سے نہ جاؤں ایک سوال میں آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔ ساری جذباتی باتوں سے ہٹ کر مجھے بتائیے کہ کچھ دن میں آپ کے گھر میں گزار سکتا ہوں۔ آپ میرے بوجھ کی متحمل ہو سکیں گی۔''

''بیٹا! جیسا کہ ماسٹر صاحب نے تم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم نہ جاہل ہیں اور نہ ہی دین کی باتوں سے ہٹے ہوئے۔ مہمان اللہ کی نعمت ہوتے ہیں۔ تم جتنے دن یہاں رہنا چاہوں آرام سے رہو' کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ رزق تو اللہ کا اپنا معاملہ ہے۔ تمہارا رزق تو تم سے پہلے ہی یہاں آ گیا ہے۔ اب میں بھی تم سے یہ بات کہہ رہی ہوں کہ یہاں سے جانے کی کوشش مت کرنا۔''

''تو پھر یہ درخت میری ملکیت' اپنی چارپائی اس کے نیچے بچھا لیتا ہوں۔ میرا گھر میں رہنا آپ کو ناگوار تو نہیں گزرے گا۔''

''ہم نے اللہ کے نام کے حوالے سے تم پر اعتماد کیا ہے۔ اب اللہ جانے اور اس کا کام۔ میں ذرا جا رہی ہوں۔ کچھ کام ہے مجھے۔ لجیا تمہارا خیال رکھے گی۔''

شاہ زیب دنگ رہ گیا۔ یہ لوگ تو واقعی فرشتہ صفت ہیں۔ کتنی سادگی سے انہوں نے ایک اجنبی پر بھروسہ کر لیا تھا۔ ایک ایسے اجنبی پر جس کے پاس رائفل بھی موجود تھی۔ بہر حال دنیا ابھی اتنی بری نہیں ہوئی کہ اعتماد کا نام ختم کر دیا جائے۔ شاہ زیب پلنگ پر بیٹھا رہا۔ لجیا گھر کی صفائی کر رہی تھی۔ دو تین بار شاہ زیب کی نگاہیں اس پر اٹھیں تو اس نے دل میں سوچا کہ واقعی قدرت کی فیاضی بے مثال ہے اور وہ کسے کیا دیتی ہے یہ وہ جانتی ہے۔ بڑے بڑے اعلیٰ گھرانوں میں پرورش پانے والیوں کے مدقوق چہرے سوکھے ہوئے اور پچکے

ہوئے گال' دھنسی ہوئی آنکھیں اس بات کا اظہار کرتی تھیں کہ اللہ کی دین ہر چیز سے عاری ہے۔ وہ جسے جو چاہے بخش دے۔ یہ لڑکی اگر محل میں پیدا ہوتی تو صحیح معنوں میں شہزادی ہی کہلاتی۔ بہر حال لجیا اپنے کاموں سے فارغ ہوئی۔ ہاتھ دھوئے اور پھر بڑی بے تکلفی سے چلتی ہوئی اس کے پاس آ کر زمین پر بیٹھ گئی۔

''ارے ارے لجیا! اس طرح زمین پر۔''

''کیوں زمین پر بیٹھنے سے کیا ہو جاتا ہے؟ شہر کے بابو صاحب ہم لوگ تو اس زمین کے عادی ہوتے ہیں۔''

''مگر لجیا! تم بھی تو شہری ہی ہو۔''

''ارے وہ جو کہتے ہیں نا جیسا دیس ویسا بھیس' ہوں گے کبھی شہری۔ اب تو ہم دیہاتی ہیں۔ یہاں کے رہنے والے اور سچی بات یہ ہے کہ زندگی تو بڑی ہی اچھی ہے۔ اب اس کچی زمین پر بیٹھنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔''

''ہاں' یہ تو ہے۔''

''ویسے ایک بات کہوں تم ہو بڑے چالاک۔'' لجیا معصومیت سے بولی اور شاہ زیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''وہ کیوں؟''

''اچھا پہلے بتاؤ چالاک ہو یا نہیں؟''

''اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ تم کہہ رہی ہو لجیا! تو یقیناً چالاک ہوں گا۔ مگر تم یہ کیوں کہہ رہی ہو؟''

''چوری کرنے آئے تھے ہمارے گھر میں اور یہاں مہمان بن بیٹھے۔ پر بھاگے کیوں نہیں؟ بچ تو گئے تھے نا۔''

"لجیا! تمہیں یقین نہیں آیا کہ میں چور نہیں ہوں؟" شاہ زیب نے سوال کیا تو وہ اسے دیکھنے لگی۔ پھر مسکرا کر بولی۔

"آ گیا یقین تم واقعی چور نہیں ہو۔ پر ایک بات بتاؤ' کہاں سے آئے ہو اور یہ بندوق کیوں لیے پھر رہے ہو۔ کسی دشمن کا پیچھا کر رہے ہو۔ دونوں میں سے ایک بات تو ضرور ہوگی؟"

"ہاں لجیا! دونوں میں سے ایک بات ضرور ہے۔"

"بتاؤ گے نہیں کون سی بات ہے؟"

"بس سمجھ لو کہ دشمن میرا پیچھا کر رہے ہیں۔"

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ تم لوگ دشمنیاں کیوں مول لے لیتے ہو۔ ارے بابا! زندگی ہے ہی کتنی تھوڑی سی سانسیں اور بس' پھر ہوا نکل جاتی ہے اور غبارہ پچک جاتا ہے۔ ہڈیاں گھل جاتی ہیں' گوشت سڑ جاتا ہے۔ اتنی سی زندگی کے لیے دشمنی مول لینے کا کیا فائدہ۔"

"لجیا! کبھی کبھی وقت انسان کا دشمن بن جاتا ہے۔"

"اپنی سمجھ میں کوئی ایسی بات نہیں آتی۔ چلو ٹھیک ہے کون ہیں وہ تمہارے دشمن؟ کیا وہ تمہیں مار دینا چاہتے ہیں؟"

"ہاں۔"

"اللہ نہ کرے اتنے پیارے سے تو ہو۔ مر گئے تو کتنا افسوس ہوگا۔"

"کسے؟" شاہ زیب نے سوال کیا تو لجیا چونک پڑی اور بولی۔

"کیا کہہ رہی تھی میں؟"

"تم کہہ رہی تھیں کہ میں مر گیا تو کتنا افسوس ہوگا۔ میں نے کہا کسے تو تم خاموش

ہو گئیں۔" شاہ زیب نے کہا۔

"مجھے اور کسے؟"

"اچھا--" شاہ زیب عجیب سے لہجے میں بولا پھر کہا۔

"لجیا! یہاں آ کر تم خوش ہو؟"

"اب مجھے کیا معلوم خوشی کیا ہوتی ہے؟ میری کئی سہیلیاں ہیں۔ ان میں سے دو کی شادی بھی ہو چکی ہے۔ وہ کہتی ہیں لجیا! تیری شادی ہو جائے گی تو تجھے بھی اطمینان ہو جائے گا۔ اب دیکھو نا شادی ہو جاتی ہے پھر بچے ہو جاتے ہیں۔ انسان ان میں پھنس کر ساری ہنسی خوشی بھول جاتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے اپنی سہیلیوں کو بھی۔" وہ بہت معصوم تھی۔ شاہ زیب نے اس سے بہت زیادہ باتیں نہیں کیں۔ اس کی ماں شاہ زیب پر اعتبار کر کے اسے یہاں چھوڑ گئی تھی۔ تو شاہ زیب پر یہ لازم نہیں تھا کہ وہ اس سے ضرورت سے زیادہ باتیں کرے۔ اس نے کہا۔

"اچھا لجیا! میں چلتا ہوں بابا جی کس وقت آ جاتے ہیں؟"

"دوپہر کو کھانا کھانے آئیں گے۔ اس کے بعد چلے جائیں گے تو پھر رات کو آئیں گے۔" لجیا نے اسے تفصیل بتا دی۔

"اچھا تو میں چلتا ہوں۔"

"کہاں جاؤ گے؟"

"بس ایسے ہی گاؤں کے چکر لگاؤں گا۔ تمہاری شادی کے لیے کہیں سے رشتہ نہیں آیا ابھی تک۔"

"پتہ نہیں یہ اماں ابا کو معلوم ہوگا۔ میں تو ان چکروں میں پڑتی ہی نہیں ہوں۔ وہ تو میری سہیلیاں مجھ سے کہتی ہیں کہ زندگی میں شادی بہت ضروری ہوتی ہے۔ تو میں سوچتی

ہوں اس بارے میں۔ ورنہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیا چکر بازیاں ہیں۔''

''میں اپنی یہ رائفل یہاں چھوڑے جا رہا ہوں۔ لاک کر دیا ہے میں نے اسے۔ چھیڑنا نہیں ورنہ گولی چل جائے گی۔''

''میرا دماغ خراب ہے کیا۔ میں نہیں چھیڑتی ایسی چیزوں کو مگر ایسا کرو اسے چارپائی کے نیچے چھپا دو۔ پتہ ہے کوئی آیا اور اس نے اسے دیکھا تو پوچھے گا یہ بندوق کس کی ہے؟''

''ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔'' شاہ زیب نے کہا اور رائفل کو اندرونی کمرے کی چارپائی کے نیچے رکھ دیا۔ پھر وہ اس کے بعد گھر سے باہر نکل آیا۔ یہ رسک تو لینا ہی تھا۔ اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا اسے چلتا رہا۔ بازار کھل گئے تھے۔

چھوٹی سی آبادی کی ضرورتیں ان کے ساتھ تھیں۔ خاصا لمبا چکر لگایا اس نے۔ اس کے بعد بڑی حویلی کو دیکھا جو یقینی طور پر اس آبادی یا گاؤں میں ایک ہی تھی۔ ظاہر ہے یہ چوہدری راجہ شہاب الدین کے علاوہ اور کس کی حویلی ہو سکتی تھی۔

شاہ زیب کے ذہن میں عجیب سے خیالات آنے لگے۔ سارے چوہدری ٹائپ کے لوگ ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ اب یہ بے چارے ماسٹر کریم بخش کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ نہیں ماسٹر کریم بخش کو اس مشکل سے نجات تو دلانا ہی ہوگی۔ باقی رہا میری اپنی پسند کا سوال تو ابھی زندگی مجھے ان راستوں پر سفر کرنے کی اجازت نہیں دے رہی۔ خاموشی سے کریم بخش کا کام کروں گا اور یہاں سے نکل جاؤں گا۔ اب یہ کام کس انداز میں کرنا ہے اس کے بارے میں جائزہ لینا ہوگا۔

چنانچہ اس نے اس تصور کے تحت حویلی کے چاروں طرف ایک چکر لگا کر اس کا جائزہ لیا تھا اور ایک ایسی جگہ منتخب کر لی تھی جہاں سے وہ ضرورت کے وقت خفیہ طور پر حویلی

میں داخل ہو سکے۔

بہر حال یہ بات اس نے دل میں طے کر لی تھی کہ حسین لڑکی میں خود تو تیری زندگی میں شامل نہیں ہو سکتا۔ کاش! تقدیر مجھے اس کا موقع دیتی لیکن میں تجھے کسی ایسے ہاتھوں میں بھی نہیں پڑنے دوں گا۔ جس سے تو اپنے دل کو غم سے آزاد نہ کر سکے۔ تیرے ساتھ میں یہ سب کچھ نہیں ہونے دوں گا۔

پھر ایک لمبا چکر لگانے کے بعد وہ واپس ماسٹر کریم بخش کے گھر میں پہنچ گیا۔ اس دوران بے شمار نگاہوں نے اس کا تعاقب کیا تھا اور کچھ لوگوں نے اس کے بارے میں کانا پھوسی بھی کی تھی۔ دو آدمیوں نے اس کا پیچھا بھی کیا تھا۔ جس کا شاہ زیب کو احساس نہیں ہو سکا۔ وہ صرف یہ دیکھنے آئے تھے کہ یہ نوجوان کہاں جاتا ہے۔ کافی وقت تک باہر گھوما تھا۔ گھر واپس آیا تو پتہ چلا کہ ماسٹر کریم بخش دوپہر کا کھانا کھا کر واپس دوکان پر جا چکے ہیں۔ سکینہ نے کہا۔

''کہاں چلے گئے تھے بیٹا! ماسٹر صاحب تو کھانے پر تمہارا انتظار ہی کرتے رہے۔ میں نے لجیا سے بھی پوچھا تھا کہ اس نے تمہیں یہ بات بتائی تھی یا نہیں کہ ماسٹر کریم بخش کب کھانے پر آتے ہیں تو وہ کہنے لگی بتا دی تھی اماں! میں نے کہا یاد نہیں رہا ہوگا۔ چلو خیر ٹھیک ہے۔ منہ ہاتھ دھو لو کھانا کھا لو۔ بستی دیکھنے گئے تھے؟''

''ہاں اور حیرت کی بات یہ ہے ماں جی! کہ ابھی تک مجھے اس گاؤں کا نام ہی نہیں معلوم ہو سکا' نہ تو یہاں ریلوے اسٹیشن ہے اور نہ یہاں دوکان والوں نے دوکانوں پر اپنے بورڈ لگائے ہوئے ہیں۔ البتہ پوچھا میں نے کسی سے نہیں کہ اس گاؤں کا نام کیا ہے؟''

''بیٹا! اسے کوٹ آدم کہتے ہیں۔'' یہاں سے قریب جو سب سے بڑی بستی ہے وہ شاہ کوٹ ہے۔'' سکینہ نے بتایا اور شاہ زیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

بڑا دلچسپ معاملہ تھا۔ وقت نے اسے اپنے گھر سے کافی دور دھکیل دیا تھا۔ بہر حال سکینہ لجیا کی مدد سے کھانے لگانے لگی جو بس معمولی سی خوراک پر مشتمل تھا اور شاہ زیب کا ذہن ایک لمبا فاصلہ طے کر کے کبیر والا میں اپنی حویلی تک پہنچ گیا۔

☆☆☆

حویلی کے معاملات البتہ بڑے سنگین چل رہے تھے۔ بڑی سنسنی خیز صورتحال تھی۔ ادھر جذبات کی شدت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ الیاس خاں کو اپنا بیٹا یاد آ رہا تھا اور اس کا جنون انتہا کو پہنچتا جا رہا تھا۔ اس دن بھی اس وقت جب جہاں زیب اور اورنگزیب بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو کا موضوع شاہ زیب ہی تھا۔ دونوں کے چہرے پر دکھ کے آثار تھے۔ اور اورنگزیب کہہ رہا تھا۔

''حقیقت یہ ہے کہ اپنی غلطیوں کو انسان نظر انداز کر دیتا ہے بھائی جہاں زیب! ہم اگر اسے پیار سے سمجھاتے تو یہ مسئلہ بہت چھوٹا سا تھا۔ کسی نہ کسی طرح حل ہو ہی جاتا۔ وہ اپنی زمینیں یقینی طور پر الیاس خاں کے حوالے کر دیتا۔ اگر اسے سمجھایا جاتا طریقے سے اور کہا جاتا کہ ماں کی آرزوؤں کو دوسرے طریقے سے بھی پورا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بدبختی یہ تھی کہ ابتداء ہی غلط ہوئی۔ پہلے تو اسے یہ احساس دلایا گیا کہ اب اس کا کوئی حصہ ہمارے پاس نہیں رہا ہے۔ اگر آپ غور کریں جہاں زیب بھائی! تو اس نے کبھی زندگی میں سرکشی نہیں کی۔ آپ کو یاد ہوگا خود آپ نے اس سے کتنی ہی بار پوچھا کہ وہ کس طرح لاہور میں زندگی گزار رہا ہے۔ وہ ایک زمیندار گھرانے کا فرد ہے۔ معمولی درجے کے لڑکوں کی طرح ہوسٹل میں نہ رہے۔ بلکہ اعلیٰ درجے کی زندگی گزارے تو اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنی محنت سے اعلیٰ درجے کی جو زندگی گزرے گی وہی صحیح معنوں میں زندگی ہوگی۔

جہاں زیب بھائی! کسی طور وہ برا تو نہیں تھا۔ ہزاروں واقعات ایسے ہیں جواب

مجھے یاد آتے ہیں۔ آہ۔۔۔ اس گھر سے اس پر چوری کا الزام لگایا گیا۔ شاہینہ بھابی نے یہ سارا الزام غلط لگایا ہے۔ آپ بتائیے کیا میرا بھائی چور ہو سکتا ہے؟'' اورنگزیب کا لہجہ جذباتی ہو گیا تھا۔ اتنی دیر میں حویلی کے بڑے دروازے پر الیاس خاں کی پیجیرو نظر آئی۔ دونوں بھائی ساتھ ہی تھے جہاں زیب نے پریشان لہجے میں کہا۔

''خدا خیر کرے ان کم بختوں کی آمد سے تو میں بھی پریشان ہو گیا ہوں۔'' بہر حال اندرونی جذبات کے برعکس مصلحت کو ذہن میں رکھتے ہوئے انہوں نے دونوں بھائیوں کا استقبال کیا۔ رائفل برداروں کی بھری ہوئی جیپ پچھلے حصے میں تھی۔ ہر بار جب یہ لوگ اس طرح سے آتے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے حملہ کرنے آئے ہوں۔ بہر حال شاہینہ بھی ابھی وہیں تھیں۔ یہ لوگ گاڑی سے نیچے اترے تو جہاں زیب اور اورنگزیب آگے بڑھے اور انہوں نے بڑے پرتپاک انداز میں ان کا استقبال کیا۔

''آیئے الیاس بھائی! آیئے جبار بھائی خوش آمدید۔''

''رنگ رلیاں منا رہے ہو۔ ہم اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں وہ سور ادھر آیا تو نہیں؟'' بھائی کے لیے یہ لوگ جذباتی ہو رہے تھے لیکن اس کے لیے یہ گالی سننا پڑی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر اس سلسلے میں احتجاج کیا گیا تو خوفناک نتائج نکل سکتے ہیں۔ جہاں زیب نے کہا۔

''نہیں الیاس بھائی! اب اتنا بیوقوف بھی نہیں ہے وہ کہ ادھر کا رخ کرے۔ وہ بے حد چالاک ہے۔''

''تمہارے پاس کام سے آئے ہیں اورنگزیب اور جہاں زیب بھائی! دیکھو یہ بات تو طے ہے کہ ہم لوگ اسے چھوڑیں گے نہیں۔ پاکستان کے کسی بھی شہر میں اس کا نام و نشان ملے گا اور ضرور ملے گا لیکن اس سلسلے میں اگر تم لوگوں نے ہماری مدد نہ کی تو ہمارے

رشتے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔''

''آپ بار بار آتے ہیں اور صرف دھمکیاں دینے آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے انسانیت آپ کے دل سے بہت دور چلی گئی ہے۔ ارے آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ وہ بچہ ہمارا بھی کچھ تھا۔ میری مراد انور سے ہے۔ کیا آپ کے خیال میں اس کی موت کا افسوس ہمیں نہیں ہوگا۔ شاہ زیب نے یہ کیا اس کے کچھ عوامل تھے۔ لیکن اسے یہاں تک جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ ہم نے کیا نہیں کیا اس کے خلاف۔ موقع ہی نہیں ملا ہمیں بیچ کی مصالحت کرانے کی کوشش کی جانے دی جاتی۔ یہ سب کچھ سب آپ یوں سمجھ لیجئے کہ ہوتا چلا گیا۔ خیر وہ ادھر نہیں آیا۔ شاہینہ سے کہیے کہ یہاں آ جائے تاکہ آپ لوگوں کی غلط فہمی آپ کے دلوں سے دور ہو جائے۔ وہ یہاں آئے گا تو ہم اس کی اطلاع آپ کو ضرور دیں گے۔''

''صرف اطلاع نہیں دو گے سمجھے۔ صرف اطلاع نہیں دو گے۔''

''تو پھر؟'' اورنگزیب نے پوچھا۔

''اس کے پاؤں توڑ دو گے' اسے معذور کر کے ہمارے حوالے کرو گے۔''

''آپ جانتے ہیں الیاس بھائی ہم ایسا نہیں کر سکتے وہ ہمارا خون ہے' ہمارا بھائی ہے۔ ٹھیک ہے اس نے جو کچھ کیا ہے اگر وہ قانون کے شکنجے میں آ جائے گا تو قانون اسے سزا دے گا اور ہم اسے نہیں بچا سکیں گے لیکن اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اسے یہ اذیت پہنچائیں گے تو آپ خود سوچ لیجئے کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ آپ اگر اس کی وجہ سے ہمارے دشمن بننا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے الیاس خاں صاحب کیجئے آپ سے جو کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اتاریئے اپنے مسلح افراد کو اور ان سے کہیے ہمیں گولیوں سے بھون ڈالیں۔ ہمارے آدمی اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں جو آپ کو اس کا جواب دیں گے۔ کمال کی باتیں کرتے ہیں آپ۔ ہم اسے معذور کر کے آپ کے حوالے کریں گے۔'' جہانزیب کو غصہ آ گیا تھا۔

''قانون اسے سزا نہیں دے گا' قانون اسے وہ سزا دے ہی نہیں سکتا۔ جو ہمارے دلوں میں ہے۔ قانون کیا سزا دے گا اسے۔ خون پر خون کیے جا رہا ہے وہ۔ شکنجے میں آ گیا تو قانون اسے زیادہ سے زیادہ موت کی سزا دے گا۔ پھانسی پر لٹکا دے گا اسے۔ پھانسی پر نہیں لٹکے گا وہ۔ میں نے قسم کھائی ہے زندہ جلاؤں گا میں اسے بھٹے میں۔ بھٹہ تعمیر ہوگا اگر وہ اس کی تعمیر سے پہلے میرے قبضے میں آ گیا تو قید رکھوں گا اسے اور جب بھٹے میں آگ لگے گی اور اس کا افتتاح ہوگا تو اس سے گوشت کی چراند اٹھے گی اور جلتے ہوئے گوشت کی چراند شاہ زیب کی ہوگی سمجھے شاہ زیب کی ہوگی۔ تم لوگ بے شک مجھ سے تعاون نہ کرو۔ تم جانتے ہو جہانزیب کہ شاہینہ کی وجہ سے میں تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ورنہ اس حویلی کی جگہ اب تک راکھ کا ڈھیر پڑا ہوتا۔

''بہت زیادہ سخت الفاظ بیان کر رہے ہو تم الیاس خاں! بہت عزت کرتا تھا میں تمہاری مگر اب مجبوراً جواب دے رہا ہوں۔ یہ حویلی تم راکھ کا ڈھیر نہیں بنا سکتے تھے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی جنگ مول لی جائے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے اور تمہارے درمیان خونریزی ہو لیکن براہ کرم ہمیں دھمکیاں نہ دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری قوت برداشت ہی ختم ہو جائے۔''

الیاس خاں غصے سے تلملانے لگا اور اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے بے شک یہ ہماری بہن کا گھر ہے لیکن یہ فیصلہ شاہینہ کرے گی کہ وہ اپنے سہاگ کی زندگی چاہتی ہے یا اپنے بھائیوں کی محبت اور جب وہ فیصلہ کرے گی تو تمہیں تمہاری ان تمام باتوں کا جواب دے دیا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے تم ایسا کر لو گے الیاس خاں' جبکہ قصور ہمارا نہیں ہے۔ تم ایسا کر لو گے۔'' جہانزیب نے کہا اور اس کے بعد الیاس خاں اپنی جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ جہانزیب اور اورنگزیب اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے

تو جہانزیب نے کہا۔

''پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ کیا ہم لوگ اتنے بودے ہیں کہ ان کی دھمکیاں برداشت کرتے رہیں۔ بھائی بھی ہاتھ سے گیا' قصور اس کا نہیں تھا۔ بتاؤ اب کرنا کیا چاہیے اورنگزیب؟''

''میں معافی چاہتا ہوں بھائی! اگر شاہینہ بھابی اب اس گھر میں آئیں تو کم از کم میں ان کی عزت نہ کر سکوں گا' جو کرتا رہا ہوں۔ ان کی وجہ سے سارا شیرازہ منتشر ہوا ہے۔ آپ غور کر لیجیے شکیلہ شاہ زیب کے لیے دل میں ماں کا سا پیار رکھتی ہے۔ وہ اتنی مخالف نہیں تھی۔ شاہ زیب کی لیکن بھابی نے---''

''بھائی! اب جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا ہے۔ تم مجھے بتاؤ' اگر شاہینہ کے سلسلے میں کوئی سخت قدم اٹھاتا ہوں تو حالات بہت زیادہ بگڑ جائیں گے۔ شاہ زیب کو منہ چڑھ گئی ہے بندے پر بندہ مارتا جا رہا ہے وہ۔ ہم کیسے اسے قانون کے شکنجے سے بچا سکیں گے۔ ہم تو اس کے لیے بالکل ہی ناامید ہو گئے ہیں۔ ادھر یہ الیاس خاں اور جبار فضول باتیں دوہراتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر شاہ زیب ان کے ہاتھ لگ گیا تو یہ فیصلہ کرو کہ ہمارا کیا ہوگا؟''

''نہیں جہانزیب بھائی معافی چاہتا ہوں میں۔ میری ماں کی اولاد ہے۔ وہ میرے لیے اپنے بیٹوں کی مانند ہے۔ کچھ کروں گا میں اس کے لیے۔''

''مجھے اپنے آپ سے الگ مت سمجھو' جو غلطی ہو چکی ہے وہ تو ہو ہی چکی ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ اس کے تحفظ کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''ہمیں بھی اسے تلاش کرنا ہوگا۔ حالانکہ ابھی ہم یہ کوشش اس لیے نہیں کر رہے کہ کہیں الیاس خاں ہمارا پیچھا نہ کرے۔ ہمارے ذریعے وہ اس تک نہ پہنچ جائے لیکن خفیہ طور پر ہمیں ان تمام جگہوں پر کام کرنا چاہیے جہاں اس کی موجودگی کے امکانات ہو سکتے ہیں۔''

''ہمیں تو کچھ بھی پتہ نہیں ہے۔''

''میں ایسا کرتا ہوں لاہور چلا جاتا ہوں۔ وہاں وہ ہوسٹل میں رہتا تھا اور وہاں اس کے شناسا بھی موجود ہوں گے۔ اگر الیاس خاں کو یہ پتہ چل جائے کہ میں لاہور گیا ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ہم یہ ظاہر کریں گے کہ میں الیاس خاں کے لیے شاہ زیب کو تلاش کر رہا ہوں۔ ہم الیاس خاں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش بھی کریں گے اور شاہ زیب کو سزا دلانے کے سلسلے میں اس کا مقدمہ بھی لڑیں گے۔ اس طرح کا اظہار کرنا چاہیے ہمیں اور جیسے ہی ہمیں شاہ زیب کا پتہ چل جائے۔ ہم اسے کوشش کر کے ملک سے باہر بھجوا دیں گے۔ امریکہ' انگلینڈ اور جرمنی یا کسی بھی دوسرے ملک۔ ہم انتہائی کوشش کر کے اور لمبا سرمایہ خرچ کر کے اسے باہر نکال دیں گے۔ اس کا تذکرہ عورتوں سے کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ اس مہم کا ہمیں آغاز کرنا ہے۔''

''افسوس واقعی بڑی درندگی کرنے لگے تھے ہم۔ بھول گئے تھے اپنے خون کو تھوڑی سی زمینوں' تھوڑی سی جائیداد اور تھوڑی سی دولت کے عوض' بہت افسوس ہے ہمیں اپنی حرکتوں پر ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

ادھر تو یہ کارروائی ہو رہی تھی۔ ادھر الیاس خاں اور جبار خاں خونخوار انداز میں سوچتے ہوئے اپنی رہائش گاہ کا سفر کر رہے تھے۔ جبار خاں نے کہا۔

''ان لوگوں کا رویہ واقعی اچھا نہیں تھا۔ اپنے بھائی کی بات کرتے ہیں میرے بھتیجے کی بات نہیں کرتے۔ اس کتے نے خون میں نہلا دیا تھا۔''

''انتقام لیا جائے گا' اس کا انتقام لیا جائے گا۔''

''لیکن ایک بات آپ سوچ لیجیے بڑے بھیا! ابھی تک ہم نے صرف جذباتی اقدامات کیے ہیں۔ کوئی عقل کی بات نہیں سوچی ابھی تم' ہم جوش میں دیوانے ہو کر بھاگ

دوڑ کرتے پھرے ہیں اس کا کوئی بہت موثر نتیجہ تو نہیں نکلا۔''

''مطلب؟''

''ہمیں سوچنا چاہیے آخر وہ بھی تو انسان ہے۔ کہیں تو چوک کرے گا' کہیں تو غلطی کرے گا۔ ہم سے تو غلطیوں پر غلطیاں ہوتی رہی ہیں۔ اسے تھانے سے نکال کر لائے اور وہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔

''ہاں وہ آئی جی صاحب سے کیا بات ہوئی تمہاری؟''

''سب ٹھیک ہے۔ آئی جی صاحب بذات خود مجھ سے ملے تھے۔ کہنے لگے ہم لوگوں نے تھانے کے عملے کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ اسلحے کے زور پر ایک مجرم کو چھڑا کر لے گئے تھے۔ یہ مناسب اقدامات نہیں ہیں۔ انسپکٹر بڑا سرپھرا آدمی ہے آگے بھی بات پہنچا سکتا ہے۔ بہرحال قانون کا اپنا ایک مقام تو ہوتا ہے۔ میں نے کہا آئی جی صاحب! صورتحال تو سمجھ لیجیے اس کے بعد آپ بتائیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ جب میں نے انور کے قتل کی ساری تفصیل بتائی تو وہ کچھ نرم ہوئے اور کہنے لگے کہ آئندہ خیال رکھا جائے۔ انسپکٹر کو سمجھا بجھا کر کام چلا لیں گے اور اسے آگے نہیں جانے دیں گے۔ سنا ہے انہوں نے انسپکٹر کو وہاں سے ہٹا دیا ہے۔ وہ سرپھرا مان نہیں رہا تھا۔''

''پتہ لگاؤ کہاں ہے وہ۔ بندہ بھیج دو اور مروا دو اسے' ہم جب تک انور کے مسئلے کو حل نہیں کر لیں گے۔ کسی اور جھگڑے میں پڑنا پسند نہیں کریں گے سمجھے۔''

''ٹھیک ہے' انسپکٹر کو تلاش کرنے کے لیے میں قادر شاہ کو مخصوص کیے دیتا ہوں۔ وہ ایسے کاموں کا ماہر ہے۔''

''ہاں عقلمندی کی بات کی ہے تم نے۔ آئی جی سے اس کا پتہ نہ پوچھنا ورنہ جب وہ مارا جائے گا تو آئی جی کو شبہ ہم پر ہی ہوگا لیکن اب اس سلسلے میں فیصلہ کر دو کہ اس کے لیے کیا

کرنا ہے؟ کچھ دیر تک مکمل خاموشی رہی اور اس کے بعد الیاس خاں نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

''بات اس کتے کے بچے فخر خان کی ہے اگر وہ بیچ میں گڑبڑ نہ کرتا تو اتنا بڑا مسئلہ نہ بنتا۔ ایک بھٹہ بنانے سے ہم کروڑ پتی نہیں ہو جائیں گے۔ اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ ہمیں اپنی ناک اونچی رکھنی ہے اور تم یہ بات جانتے ہو کہ چوہدری کی اگر ناک اونچی نہ رہے تو ان کی کوئی عزت' کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ آہ --- کاش یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ انور کی موت کا غم میرے دل میں ناسور بنتا جا رہا ہے۔ صرف انتقام لینے سے کام نہیں چلے گا۔ میرا تو دل یہ چاہتا ہے کہ قتل عام شروع کر دوں۔ اتنے لوگ ماروں کہ خون کا دریا بہنے لگے۔ تب شاید میرے دل کی یہ پیاس ٹھنڈی ہو جائے۔'' جبار خاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک باپ کے سینے میں جو جوار بھاٹے اٹھ رہے ہیں وہ آسانی سے ختم نہیں ہو سکتے۔ بہت دیر تک خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد الیاس خاں نے کہا۔

''نہیں.....ایسے کام نہیں چلے گا۔ ویسے جبار خاں مجھے معاف کرنا وہ تمہارے ہاتھوں سے بھی نکل گیا۔ آخر ہماری پلاننگ اتنی خراب کیوں ہے؟''

''بس ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے لیکن کہاں جائے گا۔''

''شاہینہ سے اس سلسلے میں بات کر لی جائے۔''

''ہاں' کیوں نہیں۔'' شاہینہ ابھی تک بھائیوں کے گھر میں ہی موجود تھی اور اپنے بھتیجے کے لیے غمزدہ نظر آتی تھی۔ الیاس خاں اور جبار خاں اس کے پاس پہنچے تو اس نے سرخ آنکھیں اٹھا کر انہیں دیکھا اور بولی۔

''ایسا لگ رہا ہے جیسے چوہدریوں کی مونچھیں نیچی ہوتی جا رہی ہیں۔ میں کہتی ہوں کہ اب تک شاہ زیب کو موت کی سزا کیوں نہیں ملی۔ ہمارے انور کو مار دیا ہے اس نے

اور زندہ پھر رہا ہے وہ۔ ایسا تو نہیں ہوتا تھا بڑے بھائی۔''

''ہاں' ایسا نہیں ہوتا تھا' مگر بہنوں کے گھروں میں آگ بھی تو نہیں لگائی جا سکتی۔''

''اگر حویلی میں آگ لگانے سے شاہ زیب جل کر راکھ ہو جاتا ہے تو آگ لگا دو اس حویلی کو۔ مجھے نہیں چاہیے ایسی حویلی۔''

''سوچ لو شاہینہ' شاہ زیب کے ساتھ ساتھ جہانزیب اور اورنگزیب بھی راکھ بن جائیں گے۔ کیا تم ہمیں اس کی اجازت دو گی۔'' شاہینہ نے پہلی بار چونک کر بھائی کو دیکھا۔ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔

''اگر وہ اپنے بھائی کی مدد پر کھڑے ہو جاتے ہیں تو میں بھلا تمہیں کیسے روکوں گی۔ لیکن اگر وہ تمہارا ساتھ دیتے ہیں تو ان کی زندگی باقی بچ جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ زندگی ختم بھی ہو تو ایسے کہ شاہ زیب موت کے گھاٹ اتر جائے۔'' شاہینہ نے بے رحمی سے کہا اور الیاس خاں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے کہا۔

''پھر بعد میں یہ مت کہنا کہ میں نے تمہارا سہاگ اجاڑ دیا۔''

''میرا سہاگ اجاڑنے کی بار بار بات کیوں کرتے ہو بھائی! اصل مجرم کو تلاش کرو۔ وہی بات میں کہہ رہی تھی کہ کیا چوہدری اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ ایک قاتل کو گھیر کر نہ مار سکیں۔''

''ہم کمزور نہیں ہوئے ہیں۔ بس کچھ مصلحتیں ہیں۔'' الیاس خاں نے کہا اور جبار خاں کو اشارہ کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔

''بہت کچھ کرنا پڑے گا جبار! بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ میں دوسرے جھگڑوں سے بچنا چاہتا ہوں۔ ایک کام کرو۔ اس انسپکٹر کا معاملہ دیکھ لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہمارے لیے

مصیبت بن جائے۔''

''میری کچھ اور رائے ہے بڑے!''

''ہاں بولو کیا؟''

''کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ انسپکٹر کا معاملہ آئی جی پر چھوڑ دیا جائے۔ آئی جی صاحب نے یہ بات تو کہی ہے نا کہ وہ انسپکٹر کو سنبھال لیں گے۔ تبادلہ بھی کر دیا انہوں نے اس کا۔ اگر آئی جی صاحب اس سلسلے میں کچے پڑتے ہیں تو پھر ہم خود دیکھ لیں گے۔''

''ہوں۔'' الیاس خاں اپنا داہنا گال کھجانے لگا۔

☆☆☆

راجہ شہاب الدین کی حویلی میں اس کا ایک خاص ملازم شاہ دین داخل ہوا اور شہاب الدین کو تلاش کرتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں شہاب الدین نظر آتا تھا۔ تھوڑی دیر تک اس کی رسائی شہاب الدین تک ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے تجسس کو دیکھ کر شہاب الدین نے بھاری آواز میں پوچھا۔

''کیا بات ہے شاہ دین! جب تیری یہ داہنی مونچھ پھڑ پھڑاتی ہے تو مجھے لگتا ہے جیسے یہ کچھ بول رہی ہو اور اس وقت سچ مچ تجھ سے اچھا تیری یہ مونچھ بولتی ہے۔ ضرور کوئی خاص بات ہے۔ کوئی خاص خبر؟''

''ہاں راجہ صاحب! شاہ دین آپ کے پاس ہمیشہ خاص خبر ہی لے کر آتا ہے۔''

''بول' بول جلدی بول۔ مجھ سے انتظار نہیں ہوتا۔'' شہاب الدین نے کہا۔

''راجہ صاحب! شہاب الدین آپ کے دل کی تمام باتیں جانتا ہے۔ آپ بڑے نیک اور خدا ترس آدمی ہو ورنہ چوہدریوں کے لیے کیا مشکل ہے کہ کسی ایک لڑکی کو اٹھا کر حرم میں ڈال لیں اور پھر ویسے بھی کریم بخش ہمارے پنڈ کا نہیں ہے۔ زیادہ ہمدرد بھی نہیں

اس کے۔ایسی صورت میں کیا مشکل ہے کہ ہم اس کی لڑکی کو اٹھا لائیں۔''

''آگے بول آگے۔اٹھائی ہوئی لڑکیاں گھروں کی عزت نہیں بنتیں۔وہ صرف دروازے پر پڑے رہنے والیاں ہوتی ہیں اور وہ۔جس نے ہمارا دل چھین لیا ہے۔وہ ہمارے دروازے کی نہیں ہمارے گھر کی زینت ہے۔چھوڑ رکھا ہے اس بوڑھے کھوسٹ کو ورنہ ہڈیاں تڑوا کر جنگل میں ڈلوا دیتا اور گدھ اس کی لاش کو نوچ نوچ کر اس کا قصہ ختم کر دیتے لیکن اس کے بعد لجیا خوش نہ رہتی۔میں تو چاہتا ہوں وہ ہنسی خوشی اس گھر میں آئے۔جتنا مسکراتا ہوا اس کا چہرہ ہے وہ اسی طرح مسکراتی رہے۔تو نہیں سمجھتا شاہ دین کبھی کبھی مسکراتے ہوئے چہرے بھی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت بن جاتے ہیں۔بدن تو ہزاروں مل جاتے ہیں۔چہروں کی مسکراہٹ ایک احساس دلاتی رہتی ہے۔زندگی کو ان خوشگوار کیفیتوں کا جن کی طلب ہر انسان کو ہوتی ہے۔''

''ٹھیک کہتے ہو راجہ جی! لیکن ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔''

''ہاں تیری مونچھ وہی بتا رہی ہے۔مجھے کیا گڑبڑ ہے اور دوسری بات یہ کہ یہ گڑبڑ کوٹ آدم میں ہی ہوئی ہے نا۔کوٹ آدمی میں اگر کوئی گڑبڑ ہوئی ہے تو تو سمجھ لے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔باقی اگر کوئی باہر کی بات ہے تو بتا۔''

''نہیں راجہ صاحب! بات اندر کی ہی ہے۔''

''تو بولتا کیوں نہیں ہے یار! کہانیاں سنائے جا رہا ہے۔''

''پہلے بھی میں نے آپ کو ایک بات بتائی تھی کہ کریم بخش کا ایک بیٹا ہے جو جرائم پیشہ ہے۔قتل و غارت گری' ڈاکہ زنی کرتا رہا ہے۔بہت سے قتل کر دیئے ہیں اس نے۔جیل میں تھا۔کریم بخش بتاتا تھا کہ رہا ہو کر آنے والا ہے۔''

''تو پھر۔'' راجہ شہاب الدین نے پہلی بار پیشانی پر شکنیں ڈال کر پوچھا۔

''وہ آگیا ہے۔''

''کب؟''

''یہ تو پتہ نہیں کہ کب آیا لیکن اب اسے کوٹ آدم کے گلیوں' بازاروں اور کوچوں میں دیکھا جا رہا ہے۔بڑا کریل جوان ہے' چہرے سے پتہ چلتا ہے کہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔''

''ہوں---پھر---؟''

''سوچ لیجئے راجہ جی کیا کرنا ہے۔''

''یہ تو پتہ چلے کہ آخر وہ آیا کتنے عرصے کے لیے ہے۔مکمل چھوڑ کر آیا ہے یا کہیں جیل ویل جانا ہے اسے؟''

''ظاہر ہے اگر چھوٹ کر نہ آیا ہوتا تو اس طرح بازاروں میں نہ گھومتا پھرتا۔''

''یہ تو واقعی تشویش کی بات ہے کریں کیا۔ویسے کریم بخش نے ابھی کوئی جواب تو نہیں دیا ہے نا۔''

''اس کا جواب تو پہلے ہی دن پتہ چل گیا تھا۔وہ بیکار باتیں کیا کرتا تھا۔''

''ہوں ایک بات بتا۔جرائم پیشہ ہے تو دولت سے بھی محبت کرتا ہوگا۔دو' چار' پانچ لاکھ اگر اسے دے دیئے جائیں تو ہوسکتا ہے باپ کا بھی دماغ ٹھیک کر دے۔''

''اب یہ کیسے کہا جا سکتا ہے راجہ صاحب! آپ بتایئے اس سلسلے میں مجھے کیا کرنا ہے۔میں نے اطلاع تو دے دی ہے آپ کو۔'' راجہ شہاب الدین کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

''ایسا کرو کھانا کھلاؤ اسے ہمارے ساتھ۔۔آج رات خبر دے دو اسے کہ وہ کھانا ہمارے ساتھ کھائے۔''

''گھر چلا جاؤں اس کے؟''

''ہاں ظاہر ہے۔''

''اکیلا یا کریم بخش کو بھی بلانا ہے۔''

''کریم بخش اس قابل نہیں ہے کہ اسے دوبارہ بلایا جائے۔ ہم نہیں چاہتے کہ بوڑھے کو ہمارے ہاتھوں کوئی نقصان پہنچ جائے۔ ویسے تو وہ بڑا غلط آدمی ہے۔''

''ٹھیک ہے میں اسے اطلاع دیئے دیتا ہوں۔''

''جواب دینا ہمیں آ کر اور پھر شاہ دین وہاں سے نکل آیا۔ یہی اُس کا ذریعہ معاش تھا۔ چوہدری کی جائز اور ناجائز خواہشیں پوری کرنا اور اس کے بعد چوہدری سے رقم بٹورنا اس کے علاوہ اُس کا اور کوئی مصرف یا کام نہیں تھا۔

چنانچہ شاہ دین کریم بخش کے گھر پہنچ گیا۔ کریم بخش اس وقت گھر پر موجود نہیں تھا۔ اتفاق سے شاہ زیب بھی باہر نکلنے کے لیے تیاریاں کر رہا تھا' باہر آواز سنائی دی تو شاہ زیب خود باہر نکل آیا۔ شاہ دین نے اسے دیکھا تو کہنے لگا۔

''سلام دینے آیا ہیں تمہیں راجہ صاحب کا۔''

''کون راجہ صاحب؟''

''تم کریم بخش کے بیٹے ہو نا؟'' شاہ زیب نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا پھر مدھم لہجے میں بولا۔

''کون راجہ صاحب! میں نے تم سے یہ سوال کیا ہے؟''

''راجہ شہاب الدین کوٹ آدم کے سب سے بڑے زمیندار' کوٹ آدم کے مالک۔''

''اچھا اچھا وعلیکم السلام!''

''انہوں نے کہا ہے کہ رات کا کھانا ان کے ساتھ کھاؤ۔ شام کو سات بجے ان کے پاس پہنچ جاؤ۔ راجہ صاحب بہت کم لوگوں کو تی عزت دیتے ہیں۔ تمہیں انہوں نے خاص طور سے یہ عزت دی ہے۔''

''ہوں' اکیلا آنا ہے مجھے؟''

''ہاں' بالکل اکیلے۔''

''ٹھیک ہے میں پہنچ جاؤں گا۔'' شاہ زیب نے معنی خیز لہجے میں کہا اور شاہ دین واپس پلٹ پڑا۔ اندر سکینہ اور لچیا باہر سے آنے والی آوازیں سن رہی تھیں۔ شاہ زیب جب اندر پہنچا تو سکینہ نے کہا۔

''چوہدری کا آدمی تھا؟''

''ہاں۔''

''تمہیں کھانے پر بلایا ہے اس نے؟''

''ہاں۔''

''پتہ ہے کیا بات ہے کریم بخش بھی یہی بات کہہ رہے تھے۔''

''کیا؟''

''بستی والوں کا خیال ہے کہ تم ہمارے وہ بیٹے ہو جو جیل سے رہا ہو کر آئے ہو۔ کریم بخش نے جو یہ خبر اڑا رکھی تھی کہ اس کا بیٹا جیل میں بند ہے اور سزا کاٹ رہا ہے۔ بہت ہی خطرناک ہے وہ۔ جھوٹی افواہ اب سچی ہو گئی ہے۔ کریم بخش یہ بتا رہے تھے کہ لوگ اب تمہارے بارے میں باتیں کرنے لگے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ کوٹ آدم میں ایک خطرناک آدمی آ گیا ہے۔ اب بستی کے ہر گھر کو ہوشیار رہنا ہوگا۔''

''اس سلسلے میں میرا قصور ہے چچی! آپ بتاؤ میں نے تو بستی میں کوئی ایسا کام

نہیں کیا اور اپنے بارے میں آپ کو ساری تفصیل بتا چکا ہوں۔''

''ہاں بیٹا! مگر تم نے کریم بخش سے مشورہ کیے بغیر چوہدری کی دعوت قبول کر کے اچھا نہیں کیا۔''

''نہیں چاچی! میرا خیال ہے بابا صاحب بھی مجھے اس کے لیے منع نہیں کرتے۔ دیکھیں چاچی! کوئی غلط بات نہیں کہہ رہا لیکن لجیا کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے۔ چاہے اس کے لیے خطرناک اقدامات کیوں نہ کرنے پڑیں۔'' سکینہ کے چہرے پر خوف کے آثار پھیل گئے۔ کہنے لگی۔

''بیٹا! تم تو جو کچھ کر سکتے ہو کر کے چلے جاؤ گے۔ بعد میں ہم لوگوں کا کیا ہوگا؟''

''آپ لوگ سوچ لیجیے کہ آپ لوگ اپنی بیٹی کو بقول آپ کے اس کالے بھوت کے حوالے کرنے کو تیار ہیں۔''

''اللہ نہ کرے ایسا ہو۔''

''تو پھر کیا اسے زہر دے دیں گے؟''

''نہیں بیٹا نہیں۔'' سکینہ کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

''تو پھر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا اس کے لیے۔'' سکینہ نے گردن جھکا لی۔ تھوڑی دیر تک وہ سوچتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔

''تو اس کا ہاتھ کیوں نہیں تھام لیتا بیٹے! تو یہ قصہ ختم کیوں نہیں کر دیتا۔ اب تم نے جب زبان کھلوا ہی دی ہے تو میں بتا دوں کہ کریم بخش بھی اس کے لیے تیار ہے۔ خاموشی سے ہم مسجد کے مولوی کو بلواتے ہیں۔ دو بول پڑھوا دیں گے تیرے اور اس کے بعد آس پاس والوں کو مٹھائی کھلا دیں گے۔ سارے دلدر دور ہو جائیں گے ہمارے۔ سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔'' شاہ زیب کے دل پر ایک گھونسہ سا پڑا تھا۔ بھلا لجیا جیسی لڑکی کون قبول نہ کرتا

لیکن بدنصیبی نے اس کی پیشانی پر ایک ایسی گہری مہر لگا دی تھی کہ وہ یہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جو یہ لوگ چاہتے تھے۔ شریف لوگ اپنی زبان سے ایسے الفاظ ادا نہیں کرتے لیکن مجبوری نے سکینہ کی زبان کھلوا دی تھی اور سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ سکینہ کی زبان کی پذیرائی نہیں کر سکتا تھا۔ سکینہ آس بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سکینہ کی آنکھوں میں جھانکا اور ایک بار پھر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ کیسی بے کسی تھی ان آنکھوں میں۔

کیا چیز ہے انسان۔ اولاد پیدا کر کے اس کے لیے کتنا مضطرب رہنا پڑتا ہے اسے۔ اس وقت شاہ زیب کو احساس ہو رہا تھا۔ کچھ لمحے تک وہ سوچتا رہا' کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا اس سے پھر وہ گردن جھکا کر وہاں سے ہٹا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اس کا ذہن شدید الجھنوں اور اندیشوں میں پھنسا ہوا تھا۔ سکینہ کے الفاظ اس کے دل میں ہوک بن رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ کاش ایسا ممکن ہو جاتا۔ ایسا کر بھی سکتا تھا وہ۔ لیکن وہی پرانی روایتیں سامنے تھیں۔ وہ کئی افراد کا قاتل تھا۔ ایک طرف پولیس اس کی تلاش میں تھی اور دوسری طرف چوہدریوں کا پورا خاندان اور پھر زیادہ عرصہ یہاں رک نہیں سکتا تھا۔ یہاں تو زندگی بسانے نہیں آیا تھا۔ اس کے علاوہ اگر لجیا سے شادی کر لی جائے تو چوہدری شہاب الدین دشمن بن جائے گا۔ دشمنی کا یہ سلسلہ نجانے کہاں سے کہاں تک چلے گا اور کتنے دشمن بناؤں کہ یہ سلسلہ ختم ہو۔

ان تمام سوچوں نے شاہ زیب کو الجھا رکھا تھا۔ بے خیالی میں کافی دور نکل آیا اور پھر جب شام کا آغاز ہوا تو وہ واپس چل پڑا۔ گھر پہنچا' دروازہ بجایا تو لجیا نے دروازہ کھولا۔ شکایتی نگاہوں سے اسے دیکھا اور منہ بنائے واپس پلٹ گئی۔ شاہ زیب سمجھ نہیں پایا تھا کہ کیا ہوا۔ اندر داخل ہوا۔ درخت کے نیچے اس نے اپنے آپ کو محدود کر لیا تھا۔ وہیں جا بیٹھا۔ درخت کی ٹھنڈی ہوا صحیح معنوں میں اس کی سب سے اچھی دوست بن گئی تھی۔ اس

نے چند لمحات انتظار کیا پھر اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ کریم بخش تو خیر دوکان پر گیا ہوا ہے لیکن سکینہ بھی اس وقت گھر پر موجود نہیں ہے صرف لجیا ہے۔ ایسے موقع پر وہ اچھا خاصا الجھ جاتا تھا۔

ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اٹھ کر باہر نکل جائے۔ کسی جوان لڑکی کے ساتھ اس طرح تنہا رکنا مناسب نہیں تھا۔ لیکن پھر لجیا سامنے آتی نظر آئی۔ بڑا غصیلہ سا انداز تھا اس کا۔ اس کے سامنے آ کر کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ شاہ زیب نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور دل ہی دل میں بڑے افسوس کے ساتھ سوچا کہ اس حسین لڑکی کو اپنے حسن کا احساس نہیں ہے۔ جس انداز میں یہ کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے صاحب دل اسے دیکھیں تو دل تلاش کرتے پھریں۔ اتنی حسین لگ رہی تھی وہ۔ چہرے پر غصے کے آثار ایک لمحے کے لیے شاہ زیب کا دل ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ کیوں نہ سب کچھ بھول کر ماضی کی ہر کہانی کو گزری ہوئی داستان سمجھ کر لجیا میں کھو جائے۔ کریم بخش کی مشکل حل کر دے۔ چاہے اس بستی کو ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے۔ لجیا کی آواز ابھری۔

''جی مادھو مہاراج! کیا سوچ رہے ہیں بیٹھے ہوئے؟''

''ایں۔'' شاہ زیب چونک پڑا۔

''ایک تو تم ایں---ایں--- زیادہ کرتے ہو۔ میں کہتی ہوں اماں نے جو کچھ کہا ہے کوئی بری بات ہے۔ شادی تو نہیں ہوئی ہے تمہاری۔ کہیں نہ کہیں تو شادی کرو گے۔ پتہ ہے کتنا خرچہ ہوتا ہے شادی میں۔ یہاں تمہارا کوئی خرچہ نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں چاہیے ہمیں۔ یہ چار جوڑے گھر میں ہیں نا انہی سے کام چلا لیں گے۔ تم بھی کوئی کام دھندہ کرو گے۔ اس طرح کام چل جائے گا۔ کیوں زیادہ نخرے کر رہے ہو۔''

شاہ زیب نے اس کا چہرہ دیکھا اور اسے ہنسی آ گئی۔ کیا باتیں کر رہی ہے یہ لڑکی۔

آ وہی صورتحال ہے اپنی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہے اسے۔ بے باک ہے اور نادان بھی ورنہ اتنی بے تکلفی سے یہ ساری باتیں نہ کرتی۔ اس نے دکھ بھرے انداز میں لجیا کو دیکھا اور کہنے لگا۔

''لجیا! تم یقین کرو کہ اگر زندگی میں مجھے تم جیسی لڑکی بیوی کی حیثیت سے مل جاتی تو ساری زندگی اپنے آپ کو خوش نصیب ترین انسان سمجھتا۔ پھر میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ دشمن میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ کبھی بھی وہ لوگ مجھ تک پہنچ سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ مجھے ہلاک کر دیں یا ہوسکتا ہے میں انہیں قتل کر دوں۔ اور اگر انہوں نے مجھے ہلاک کر دیا تو تم بیوہ ہو جاؤ گی اور اگر میں نے انہیں ہلاک کر دیا تو مجھے جیل جانا پڑے گا۔ مجھے بتاؤ لجیا! دونوں صورتوں میں میں تم سے شادی کیسے کر سکتا ہوں۔ تمہیں نقصان کیسے پہنچا سکتا ہوں۔ جبکہ تم اتنی اچھی لڑکی ہو۔ حالانکہ میں اگر چاہوں تو آسانی سے بابا کریم بخش سے اپنے دل کی بات کہہ سکتا ہوں۔ جتنا بھی وقت تمہارے ساتھ گزر جائے۔''

''وہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔'' لجیا کا لہجہ اچانک ایک دم بدل گیا۔ پھر وہ کہنے لگی۔

''لیکن میری تو مشکل پھر مشکل ہی رہی نا۔ اللہ نہ کرے اگر بابا مجبور کر دیئے گئے تو پھر میرا کیا ہوگا۔ مرنا تو مجھے وہاں بھی ہوگا نا۔ اب اس کالے بھوت کے پاس تو جاؤں گی نہیں۔ چاہے مجھے کنوئیں میں کود کر جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ فرض کرو اگر تمہارے ساتھ شادی ہوگئی اور تم مارے بھی گئے تو بیوہ بن کر زندگی گزار لوں گی۔ ہوسکتا ہے میں بھی مر جاؤں کیونکہ جب تمہیں کوئی مارنے آئے گا تو میں ہاتھ باندھے تو نہیں بیٹھی رہوں گی۔ بہت بہادر ہوں میں۔ سب سے نمٹنا جانتی ہوں سمجھے۔ ایک دفعہ میرے ساتھ شادی کر کے تو دیکھو مان لو میری بات۔''

''لجیا!''

''ہوں۔''

''ایک بات میں کہوں تم سے؟''

''کہو۔''

''مان لوگی میری بات۔''

''ہاں۔''

''بقول تمہارے وہ کالا بھوت تمہیں کبھی اپنے قبضے میں نہیں کر سکے گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ لیکن اگر اس کالے بھوت سے تمہاری جان بچ جائے تو بتاؤ۔ کیا تم میرا انتظار کرلوگی۔''

''انتظار؟''

''ہاں۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''میں چلا جاؤں گا۔ اپنی جان بچانے کی کوشش کروں گا۔ دیکھوں گا کہ حالات کیا ہوتے ہیں تمہارے لیے ایک جگہ بنالوں گا۔ ایک ایسا گھر جو یہاں سے کسی دور دراز علاقے میں ہو۔ یہاں سے میں تمہیں، بابا کریم بخش اور چاچی سکینہ کو لے جاؤں گا۔ وہاں تمہیں رکھوں گا تم سے شادی کرلوں گا۔ پھر زندگی آرام سے گزرے گی۔ تمہیں زندگی کے سارے آرام ساری خوشیاں دوں گا۔ میں بولو انتظار کرلوگی میرا؟''

''حرج تو کوئی نہیں ہے۔ اگر کوئی پریشان نہ کرے۔ پر ایک بات اور سنو تم بابا سے بات کرلینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بابا پھر کسی اور مسئلے میں پھنس جائے لیکن ایک بات بتاؤ؟''

''ہاں پوچھو۔''

''اس کالے بھوت سے میری جان کیسے بچاؤ گے؟''

''بس اسے میرے اوپر چھوڑ دو۔''

''ہوں۔ چلو ٹھیک ہے ملاؤ ہاتھ۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا اور شاہ زیب نے اس کا حسین ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ آہ! کاش! یہ ہاتھ اسی طرح اس کے ہاتھ میں رہے۔ ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا۔ لجیا کی آنکھوں میں بھی محبت کے آثار ابھر آئے تھے۔ اپنی نادانی کی وجہ سے وہ ہر بات پوری بے تکلفی سے کہہ دینے کی عادی تھی۔ کہنے لگی۔

''اتنا اچھا لگتا ہے تمہارا ہاتھ پکڑ کر۔ اب تم سمجھ لو میں تمہارا انتظار کروں گی تم نہ ملے تو مر جاؤں گی۔''

''نہیں تم نہیں مروگی لجیا! زندہ رہوگی اور میں تمہیں ایک دن ضرور لے جاؤں گا۔''

''ہاتھ ملایا ہے خیال رکھنا۔''

''ہاں۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

لجیا تھوڑی دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی۔ دل کو بڑا اطمینان ہوا تھا۔ بڑی اچھی باتیں کرتی تھی وہ۔ ہر قسم کے فریب سے پاک محبت میں ڈوبی ہوئی۔

بہر حال اس کے بعد سکینہ آگئی تھی۔ مقررہ وقت پر شاہ زیب نے تیاریاں کیں اور چوہدری کی حویلی کی جانب چل پڑا۔ راستے میں وہ کریم بخش کی دوکان پر پہنچا تھا۔ کریم بخش اپنے کام میں مصروف تھا۔ شاہ زیب کو دیکھ کر اس نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور بولا۔

''آؤ بیٹا! نکل آیا کرو کبھی کبھی دوکان پر جب طبیعت گھبرائے۔ ویسے تو یہ بڑی بیکار سی جگہ ہے لیکن بہر حال گاہکوں میں دل بہل ہی جاتا ہے۔''

حمیدی

"میں آپ کے پاس ایک کام سے آیا تھا بابا صاحب!"

"ہاں بولو۔"

"چوہدری شہاب الدین کا آدمی میرے پاس آیا تھا۔ شہاب الدین نے مجھے رات کے کھانے پر اپنی حویلی میں بلایا ہے۔ آپ سے اس سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"تمہیں بلایا ہے۔"

"ہاں۔"

"اوہ، میں سمجھ گیا گڑبڑ ہوگئی ہے بیٹا!" کریم بخش نے پریشان لہجے میں کہا۔ شاہ زیب اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا جب کریم بخش دیر تک کچھ نہ بولا تو شاہ زیب نے کہا۔

"کیا گڑبڑ ہوگئی ہے؟"

"خدا کا شکر ہے کہ میں تمہیں اصلیت بتا چکا ہوں بیٹے! صرف لجیا کی عزت کی خاطر یہاں بستی والوں سے میں نے ایک جھوٹ بولا تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میرا ایک بیٹا ہے جو جیل میں بند ہے۔ بڑا ہی جرائم پیشہ قسم کا آدمی ہے، بے حد خطرناک۔ وہ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ شاید تم میرے وہی بیٹے ہو۔ راجہ شہاب الدین نے یقیناً تمہیں اسی چکر میں بلایا ہے۔"

"تو اس میں گڑبڑ کیا ہوگئی؟"

"نہیں میرا مطلب ہے وہ تم سے یقیناً لجیا کے بارے میں بات کرے گا۔"

"ہوسکتا ہے کہ ایسا ہو۔"

"تو پھر تم کیا کہو گے؟"

"باباجی! میں کوشش کروں گا کہ اسے سمجھا سکوں کہ وہ لجیا کا خیال دل سے نکال

دے۔ میرا خیال ہے وہ مان جائے گا۔"

"کیا بات کرتے ہو کتنا بڑا انسان ہے وہ تمہیں کیا بتائیں۔ بیٹا! ہم تو سچی بات ہے کہ زندگی کا بڑا غم اٹھائے ہوئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ خیر اللہ مالک ہے تم جاؤ اور تم بہتر سمجھتے ہو کہ تم اس سے کیا بات چیت کرو گے۔ ویسے میرا دعویٰ ہے کہ وہ تمہیں میرا بیٹا ہی سمجھ رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے بابا کریم بخش بیٹا تو ہوں میں آپ کا۔ بیٹے کے برابر تو ہوں کم از کم۔"

"ہاں ہو اللہ تمہیں خوش رکھے۔ کب جانا ہے؟"

"سات بجے تک جانا ہے۔ تھوڑی دیر باقی ہے بس وہیں جانے کے لیے نکلا تھا۔"

"اپنا خیال رکھنا بیٹا! اپنے جذبات کو بھی قابو میں رکھنا۔ کوئی ایسی بات مت کر بیٹھنا کہ وہ مشکل بن جائے۔"

"جی بابا صاحب! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ اطمینان رکھیے۔" شاہ زیب نے کہا۔ تھوڑی دیر تک کریم بخش کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ وقت بھی گزارنا تھا۔ پھر وقت مقررہ پر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور حویلی کی جانب چل پڑا۔

حویلی کو وہ کئی بار دیکھ چکا تھا۔ وہاں پہنچنے میں اسے کوئی خاص دقت نہیں ہوئی۔ حویلی کے بڑے دروازے پر چوکیدار موجود تھا۔ انہیں شاید یہ بتا دیا گیا تھا کہ کریم بخش کا بیٹا آرہا ہے۔ اچھی خاصی شہرت ہوگئی تھی یہاں شاہ زیب کی اور شاہ زیب نے یہ بھی سوچا تھا کہ کہیں یہ شہرت عذاب نہ بن جائے اور اس کی اصلیت کسی کو نہ پتا چل جائے۔

بہرحال چوکیدار نے اسے بھیج دیا۔ ایک ملازم نے اس کی راہنمائی حویلی کے

لان کے ایک حصے کی جانب کی جہاں راجہ شہاب الدین بیٹھا ہوا تھا۔ شاہ زیب نے اسے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ درحقیقت اسے کالا بھوت غلط نہیں کہا گیا تھا۔ انتہائی مکروہ چہرہ تھا۔ پورے چہرے پر چیچک کے بڑے بڑے داغ' بے ترتیب مونچھیں' موٹے موٹے ہونٹ' چہرے سے شیطنت ٹپکتی تھی۔ منہ سے بدبو کے بھبکے اٹھتے تھے۔ اس نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی اور بولا۔

''لگتا ہے--- لگتا ہے--- بیٹھ جا۔'' اس نے سامنے موڑھے کی طرف اشارہ کیا اور شاہ زیب موڑھے پر بیٹھ گیا۔

''بہت کم لوگوں کو یہ عزت ملتی ہے۔ تیری یہ عزت کریم بخش کی وجہ سے نہیں کر رہے ہم بلکہ ان خبروں پر کر رہے ہیں کہ تو بہادر لڑکا ہے' بندے مارے ہیں تو نے بہت سے۔ غلط تو نہیں کہہ رہے ہم۔ ہا--- ہا---'' شہاب الدین خود ہی مکروہ انداز میں ہنس پڑا۔ شاہ زیب خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر شہاب الدین نے کہا۔

''ہاں کچھ کھائے گا پیئے گا۔'' رات کا کھانا تو تجھے کھانا ہی ہے۔ ابھی کچھ کھانا پینا ہے تو بتا؟''

''نہیں چوہدری صاحب! بڑی مہربانی ہے آپ کی۔ آپ نے مجھے اتنی عزت دی۔ یہ آپ کا بڑاپن ہے۔ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں چوہدری صاحب۔ کسی نہ کسی کام کے لیے تو آپ نے مجھے بلایا ہوگا؟''

''اوہ ہاں بھئی بات اصل میں یہ ہے کہ بوڑھے دماغ' بوڑھے انداز میں سوچتے ہیں جوان دماغوں کی بات کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ سنا تو تھا تیرے بارے میں کہ کریم بخش کا بیٹا شہر میں رہتا بلکہ شاید جیل میں ہے۔ ہم نے سوچا کہ جب تو آ ہی گیا ہے تو تجھ سے کیوں نہ بات کر لی جائے۔ اصل میں تھوڑے دن پہلے کی بات ہے ہم نے اپنا بندہ تیرے باپ کے

پاس بھیجا تھا۔ تم لوگ شریف لوگ معلوم ہوتے ہو۔ یہ چھوٹے موٹے کام تو مردوں کے ہوتے ہی ہیں۔ ایک دوبار جیل چلے جانا کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ہم نے تیری بہن لجیا کو بھی دیکھا بڑی اچھی لڑکی ہے۔ بے اختیار ہمارا جی چاہا کہ وہ سڑکوں پر گھسیٹ رہی ہے کیوں نہ اسے اپنی حویلی میں جگہ دی جائے۔ عزت کا مقام دیا جائے اور وہ کریم بخش بے چارہ ایک چھوٹی سی دوکان چلاتا ہے۔ چار پیسے کی آمدنی ہوگی اس سے کیا ملتا ہوگا۔ اس کے بھی دلدر دور کردیں گے ہم۔ اس نیک جذبے کے تحت ہم نے اپنا بندہ تیرے گھر بھیجا۔ مگر وہی بات کر رہے تھے ہم کہ بوڑھے دماغ نے دوسرے انداز میں سوچا۔ ارے بھائی جس کے پاس دولت ہو وہ بوڑھا نہیں ہوتا۔ اور پھر ہماری تو اتنی عمر بھی نہیں ہے۔ بالکل جوانوں جیسے ہیں۔ لجیا یہاں عیش کرتی۔ کیا نقصان پہنچا اس کو۔ مگر باباجی نہیں مانے۔ باتیں بنا کر خاموش ہوگئے۔ دیکھ بات تو اصل میں یہ ہے کہ چوہدری' چوہدری اس وقت بنتا ہے جب اپنی بات منوالے۔ ہم بھی اپنی ہر بات منوالیتے ہیں۔ ہمیں کوئی دقت نہیں ہوتی لیکن ہر چیز زبردستی حاصل کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ مزہ چلا جاتا ہے۔ لجیا اپنی خوشی سے ہماری حویلی میں آجائے تو سمجھ لے اس کی بھی زندگی بن جائے گی اور تیرے گھر والوں کی بھی اور جہاں تک تیرا معاملہ ہے تو تو فکر ہی مت کر۔ چھوٹ گیا ہے نا اب دوبارہ جیل جانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور پھر ہمارے بندے جیل نہیں جاتے ہم خود سنبھال لیا کرتے ہیں انہیں۔ ساری بات تیری سمجھ میں آگئی ہوگی۔ جا اپنے بابا سے جا کر بات کر تیاریاں کر۔ لجیا کے ساتھ ہمارا نکاح کرادے۔ تجھے جو مانگے گا وہ مل جائے گا۔ کیا سمجھا اسی لیے تجھے بلایا تھا۔''

''چوہدری صاحب! اور بھی تو بیوی ہے نا آپ کی؟''

''ارے بھئی' چوہدری کا گزارہ کب ہوتا ہے ایک دو پر۔ ارے یہی تو زندگی ہے تھوڑا دن زندگی کے عیش کرنے دے۔ اس کے بعد تو جو کچھ ہونا ہے وہ ہوگا ہی۔ تو اس کی فکر

بھی گزر رہی تھی اور سڑک پر سے اکا دکا گاڑی گزرتی نظر آ جاتی تھی۔

کافی غور و خوض کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ بھوک برداشت کرنی پڑے گی۔ کل صبح کی روشنی میں ہی کچھ کیا جا سکتا ہے۔ رات کی تاریکی میں اپنی جگہ چت لیٹے ہوئے وہ حالات پر غور کرنے لگا۔ دونوں بھائی' دونوں بھاوجیں کائنات میں یہی رشتے تھے۔ اس کے اور بھی کچھ رشتے دار تھے لیکن ان سے بس سرسری سی ملاقاتیں تھیں۔ ان میں کئی نام آتے تھے۔ ایک ماماجی تھے جو کافی فاصلے پر حسن ابدال میں رہتے تھے اور کچھ رشتے دار ایسے تھے جن سے کبھی دو چار سال میں ملاقات ہو جاتی تھی اور نہ انہوں نے کبھی کسی رغبت کا اظہار کیا تھا اور نہ کبھی ادھر سے کوئی بات ہوئی تھی۔ بس ماں تھی اور زندگی تھی۔

بہرحال وقت کافی گزر گیا تھا اور اس کے بعد چاند نکل آیا لیکن چودھویں رات کا چاند تھا اور روشنی اس طرح پھیل گئی تھی کہ ماحول دن کے مطابق ہو گیا تھا۔ ایسی جگہ تو رسک لیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ دیر تک سوچتا رہا اور اس کے بعد اپنی جگہ سے آگے بڑھ گیا۔ سامنے چاندنی میں چھلکتا ہوا ایک تالاب نظر آ رہا تھا۔ اس کے ایک کنارے پر اونچی اونچی گھاس تھی۔ پیچھے دلدل تھی اور کوئی دو سو گز کے فاصلے پر پل نظر آ رہا تھا۔ اس وقت چونکہ رات ہو رہی تھی۔ اس لیے سڑک پر آمد و رفت تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ کبھی کبھی کہیں ایک آدھ جھاڑی بھی نظر آ جاتی تھی اور اس کے بعد مکمل خاموشی۔ اس کے قدم پل کی جانب بڑھتے رہے اور پھر وہ پل کے نیچے سے بھی گزر گیا۔ ابھی کچھ ہی قدم آگے چلا تھا کہ دفعتاً اس کے قدم ایک جگہ جم کر رہ گئے۔

''کافی فاصلے پر بائیں سمت آگ روشن نظر آ رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہلکا ہلکا سفید دھواں جو گوشت جلنے کی چراند اپنے وجود میں سمیٹے ہوئے فضا میں بلند ہو رہا تھا۔ شاہ زیب کے قدم رک گئے' ہو سکتا ہے یہ کوئی شمشان گھاٹ ہو جہاں کسی مردے کو جلایا جا رہا ہو

ورنہ گوشت بھننے کی چراند کیسے اٹھ رہی ہوتی۔ یا اس طرف کا رخ کیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ آس پاس کوئی بستی ہو۔ اگر بستی مل جائے تو کھانے پینے کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے وہاں کچھ لوگ ایسے ہوں جو ابھی تک چتا کے آس پاس موجود ہوں۔ شاہ زیب کو یہ بات معلوم تھی کہ اس علاقے میں ہندو بھی اچھے خاصے رہتے ہیں اور ان کے تمام تر معمولات اپنے دین دھرم کے مطابق ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نے اسی جانب قدم اٹھا دیئے۔ تھوڑا فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک ایک کڑک دار آواز اس کے کانوں میں اتری۔

اڑی خود تکبر نہ کر بندیا' دس تو تیرا مکان کتھے
اوہ دارا سکندر نمرود مٹ گئے دس اوہناں نام نشان کتھے
جس کے تخت تو پریاں اڈاندیاں سن وڈ شان والا سلیمان کتھے
سائیاں موت نے مار فنا کتا مالک حکمت دا شان لقمان کتھے

شاہ زیب کے قدم ٹھٹھک گئے تھے۔ وہ اس آواز کو سنتا رہا۔ بڑا سوز تھا اس کی آواز میں اور جو الفاظ نکلے وہ بھی بڑے سبق آموز تھے۔ شاہ زیب ایک لمحے کے لیے ان الفاظ میں گم ہو گیا تھا پھر چند ہی لمحوں کے بعد اس نے آگے قدم بڑھا دیئے۔

چاند کی روشنی میں اب اسے ایک شخص نظر آ رہا تھا۔ جو آگ سے کچھ فاصلے پر کسی پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ شاہ زیب کو یہ اندازہ بھی چند لمحوں کے بعد ہو گیا کہ یہ کوئی شمشان گھاٹ نہیں ہے۔ ایک عام سی جگہ ہے یہ شخص کون ہے اور کیا کر رہا ہے۔

بہرحال وہ آگے بڑھتا رہا اور کچھ لمحوں کے بعد اس شخص نے بھی اسے دیکھ لیا لیکن اس کے انداز میں بڑی لاپروائی سی تھی۔ شاہ زیب کے ہاتھ میں رائفل بھی تھی اور سینے پر کارتوس کی پٹی بھی بجی ہوئی تھی۔ جب وہ قریب پہنچا تو اس نے انتہائی قد آور بوڑھے کو دیکھا۔ جس کی داڑھی سفید تھی' مونچھیں بھی سفید تھی لیکن بدن کا چوڑا چکلا پن یہ احساس دلا رہا

تو خود ہی توبہ تلا کر لیں۔"

"کیا مطلب ہے تیرا؟"

"بتا دوں آپ کو؟" شاہ زیب نے کہا۔

"کیا بتائے گا بھئی؟" چوہدری صاحب کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

لیکن اس وقت وہ سمجھ گیا جب شاہ زیب نے اس پر چھلانگ لگا دی تھی۔ اس نے چوہدری کی گردن پکڑ لی۔ اپنے دونوں انگوٹھے اس کے حلق پر رکھے اور پوری قوت سے انہیں دبانے لگا۔ چوہدری کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں تھیں۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن شاہ زیب کے ہاتھوں کے آہنی شکنجوں نے اس کی گردن کو اس طرح دبایا ہوا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ پھیل کر رہ گئے اور وہ حلق سے بطخ جیسی آوازیں نکالنے لگا۔ قیں قیں کی چند آوازیں نکلی اور اس کی زبان باہر نکل آئی۔ شاہ زیب نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب چوہدری کی زندگی کسی طور ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اس وقت تک چوہدری کی گردن دباتا رہا جب تک کہ اس کی روح پرواز نہ کر گئی۔

چند لمحات کے بعد اس کی گردن ایک جانب لٹک گئی تھی۔ کم از کم شاہ زیب کا یہی خیال تھا کہ چوہدری مر چکا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ شیطان کی موت اتنی آسانی سے نہیں ہوتی۔ شاہ زیب نے اس کی نکلی ہوئی زبان اور ابل آنے والی آنکھیں دیکھیں۔ پھر اس کے تنفس کا اندازہ لگایا۔ دور سے شاید کچھ لوگ ادھر دیکھ رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر انہوں نے وہیں سے شور مچانا شروع کر دیا اور یہ بھی شاہ زیب کی تقدیر کا ایک اچھا حصہ تھا کہ ایسا ہوا۔ دوسرے لمحے اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور پھر حویلی کے اس گوشے کی جانب چل پڑا جہاں سے وہ باہر نکل سکتا تھا۔ یہ اندازہ اس نے بہت پہلے ہی لگایا تھا۔ بس یونہی دل میں آیا تھا کہ ایسا اگر کبھی کرنا پڑ جائے اور بعض اوقات انسان اپنے ذہن میں جو کچھ سوچتا ہے تقدیر

اسے سامنے لا کھڑا کر دیتی ہے۔

چنانچہ وہ حویلی سے باہر نکل آیا۔ حویلی میں خوب ہلچل مچل گئی تھی اور لوگ چاروں طرف سے دوڑ پڑے تھے۔ لیکن شاہ زیب ان کے ہاتھ نہیں لگا۔ وہ تو ان دنوں ایسے ہنگاموں کا عادی ہو گیا تھا۔ البتہ وہاں سے سیدھا کریم بخش کی دوکان پر پہنچا۔ کریم بخش کو اطلاع دینا ضروری تھا۔ کریم بخش نے اسے دیکھا تو حیرت سے چونک کر بولا۔

"ارے شاہ زیب --- ارے بیٹا! تم چوہدری کے ہاں دعوت پر نہیں گئے۔ یہاں سے تو تم یہ کہہ کر گئے تھے۔"

"ہاں بابا صاحب --- گیا تھا میں چوہدری کے پاس باتیں ہوئیں اس سے لجیا کے پیچھے پڑا ہوا تھا حرام زادہ۔ میں نے قصہ ہی ختم کر دیا۔ لجیا اب محفوظ ہو گئی ہے بابا صاحب! اب وہ کسی چکر میں نہیں پڑے گی سمجھے آپ۔"

"کک --- کیا مطلب؟"

"میں نے چوہدری کو مار ڈالا ہے' ختم کر دیا ہے میں نے اسے اور یہ جگہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ کوٹ آدم میں اب میرے لیے ایک لمحہ رکنا خطرناک ہے۔" کریم بخش کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ وہ سکتے میں گرفتار ہو گیا تھا لیکن شاہ زیب جانتا تھا کہ اس کے آدمی کیا کریں گے۔ ان لوگوں کے کچھ کرنے سے پہلے ہی کوٹ آدم چھوڑ دینا مناسب تھا۔

چنانچہ اس نے آبادی سے باہر کی طرف قدم اٹھا دیئے۔

☆☆☆

رفتہ رفتہ حالات اعتدال پر آتے جا رہے تھے۔ انور کی موت کا زخم بھر تو نہیں سکتا تھا لیکن غصے کی شدت کم ہو گئی تھی اور غم کی شدت بھی۔ شاہینہ اپنے گھر واپس چلی گئی تھی۔ البتہ اسے کافی ہدایات دے دی گئیں تھیں اور اسے کہا گیا تھا کہ کہیں سے بھی شاہ زیب کا

سراغ ملے تو انہیں فوراً اطلاع دی جائے۔ یہی نہیں بلکہ وہ چالاکی سے کوشش کرے کہ شاہ زیب کے بارے میں معلومات حاصل ہو جائیں۔

بہر حال دونوں بھائی غمزدہ تھے۔ جبار خاں کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ بھتیجوں سے وہ اپنی اولاد ہی کی مانند محبت کرتا تھا اور کافی حد تک وہ غمزدہ تھا۔ پھر اس دن امیر نے ایک بار پھر دل میں آگ لگا دی۔ کہیں سے اس کے ہاتھ پرانا اخبار لگ گیا تھا۔ جس میں دستاویزات کی چوری کے بارے میں تفصیلات درج تھیں اور چوری کی رپورٹ لکھوائی گئی تھی چنانچہ وہ اخبار لے کر سیدھا الیاس خاں کے پاس پہنچا۔ الیاس اور جبار دونوں اداس بیٹھے ہوئے تھے۔ امیر شاہ نے پرانا اخبار ان کے سامنے رکھ دیا۔ تو جبار خاں نے نگاہیں اٹھا کر امیر خاں کو دیکھا۔

''کیا بات ہے پتر! کیا بات ہے اس اخبار میں جو تو خاص طور سے ہمارے لیے لایا ہے؟''

''چاچا جی! دشمن ہمارے منہ پر مسلسل تھوک رہا ہے اور ہم بس منہ صاف کر کے رہ جاتے ہیں۔ یہ دیکھو کیا خبر چھپی ہے اس میں۔ امیر شاہ نے سرخ پنسل سے نشان لگی ہوئی وہ خبر دونوں کے سامنے کر دی اور وہ اخبار پر جھک گئے۔ دستاویزات کی چوری کی خبر تھی۔ یہ خبر پڑھکر دونوں اچھل پڑے۔

''اوئے اس کا مقصد ہے کہ وہ لاہور میں گھومتا پھر رہا ہے۔ اس نے اپنی کارروائی جاری رکھی ہے۔''

''نہیں چاچا جی! یہ خبر پہلے کی ہے۔ اخبار کی تاریخ دیکھو وہ دستاویزات کے گم ہو جانے کے بعد اپنی کارروائی کرتا رہا ہے۔''

''ہوں۔ خبر تو واقعی پرانی ہے مگر یہ تو کام پکا ہو گیا اس کا۔ اس کے دستخطوں کے بغیر

تو ویسے بھی زمین ہمارے قبضے میں نہیں آنی تھی۔ مگر اب تو بات بالکل پکی ہو گئی ہے۔ اب تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔''

''اوہو۔۔۔۔ اس کا خانہ خراب تو کر سکتے ہیں۔ بھٹہ بنانے سے ہمیں کون روکے گا۔ بندے وہاں لگا دیئے جائیں اور بھٹے کی تعمیر شروع کر دی جائے۔ پھر کس کی مجال ہے کہ ہمارا کام روکے۔''

''لیکن بات اس کی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارا ایک ایسا دشمن زندہ پھر رہا ہے جس نے ہمارے گھر کا چراغ بجھا دیا ہے۔''

''اوہ اس رحیم شاہ کو بلاؤ۔ حرام کے جنے مفت کی روٹی توڑتے ہیں۔ عیش کر رہے ہیں عیاشی کر رہے ہیں ہمارے پیسے پر۔ جھوٹے دلاسے دے کر رہ جاتے ہیں۔ کیا کیا ہے اس نے ابھی تک۔''

''بلاؤ اسے جاؤ امیر شاہ! ذرا دیکھو کدھر ہے اور تھوڑی دیر بعد رحیم شاہ ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

''اوئے رحیم شاہ! کدھر ہے شاہ زیب؟ کہاں ہے اس کی لاش؟ کہا تھا نا تو نے کہ خاں جی میرے ہاتھوں سے وہ گم ہوا ہے۔ میں ہی اسے لے کر آؤں گا۔ اوہ۔۔۔ میں کہتا ہوں کہ کدھر ہے وہ۔ یہی ہے تیری نمک خواری' ہمیشہ کہتا رہا ہے کہ خاں جی! کوئی حکم دے کر دیکھو گھر بے نور ہو گیا۔ تم لوگوں کو کتوں کی طرح پال رہا ہوں میں لیکن کتے وفادار ہوتے ہیں تم کسی قابل بھی نہیں۔''

''نہیں خاں جی! ایسی بات نہیں ہے۔ بس آپ یوں سمجھ لو کہ آپ لوگوں کی وجہ سے اس کی تلاش میں نہیں نکلا ہوں۔ اس لیے کہ کہیں میری آپ کو ضرورت نہ پیش آ جائے۔ بس آپ حکم کرو اس کی لاش لا کر آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔''

''تو ایسا کر پتر! کہ وقت لے لے ہم نے حکم کر دیا اور یہ بھی سن لے کہ اگر اسے زندہ یا مردہ لے کر نہ آ سکے تو خود اپنی موت کی خبر ہی بھجوا دینا۔ ظاہر ہے وہ جھوٹی ہو گی لیکن اس کے بعد تیری صورت دیکھنے کو نہیں ملے گی۔''

'ٹھیک ہے خاں جی! اجازت چاہتا ہوں۔'' رحیم شاہ نے کہا اور اس کے بعد وہ وہاں سے باہر نکل آیا۔ تیاریاں کیں ایسے موقع بار بار کہاں ملتے ہیں۔ انہی موقعوں پر تو نمبر بنائے جاتے ہیں۔ چنانچہ دو جیپوں میں پندرہ آدمی چل پڑے۔

ان کے کھانے پینے کے معاملات' دوسرے اخراجات بھاری رقم کی شکل میں حاصل کر لیے تھے اور اس کے بعد وہ جنگلوں میں بھٹکنے لگے۔ البتہ ایک کام کیا تھا۔ اس نے چک جھمرہ میں اس کے جاننے والے کھوجی رہتے تھے۔ اس نے ان کھوجیوں کو ساتھ لے لیا تھا اور ساری تفصیلات بتا دی تھیں کہ کس طرح سے یہ بندہ بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔ کھوجی اپنے فن میں ماہر تھے۔

حالانکہ وقت خوب گزر چکا تھا۔ لیکن کھوجی کچھ اندازے سے اور کچھ اپنی فنکاری سے صورتحال کے بارے میں پتہ لگاتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ لمبا فاصلہ طے کر کے وہ شاہ کوٹ کے اطراف میں پہنچ گئے۔ اب یہ خدا کی قدرت کہی جا سکتی ہے یا پھر قدرت کی ستم ظریفی کہ یہ وہ لمحات تھے جب شاہ زیب نے کوٹ آدم چھوڑ دیا تھا اور چوہدری کو ہلاک کر کے وہاں سے نکل آیا تھا۔ سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔ بس سفر جاری رہا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے کرنا کیا چاہیے۔ یہ اطراف بے حد خطرناک تھے کیونکہ ان علاقوں میں الیاس خاں اور جبار خاں کی اجارہ داری تھی۔ چوہدریوں کے آپس میں تعلقات بھی تھے اور شاہ زیب یہ بات جانتا تھا کہ ایک دوسرے کو اطلاع بھجوا دی گئی ہو گی اور شاید تصویریں بھی جن کا حصول چوہدریوں کے لیے ناممکن نہیں تھا۔ یہ تصویریں وہ اس کے گھر سے بھی حاصل کر سکتے

تھے کیونکہ شاہینہ وہاں موجود تھی۔

بہر حال جنگل' دریا' صحرا' پہاڑ یہی اب اس کے ساتھی رہ گئے تھے۔ اگر اس میں کچھ اضافہ ہوا تھا تو لجیا کی یادوں کا۔ آنکھیں بند کر کے لجیا کا مسکراتا چہرہ نگاہوں کے سامنے لے آتا۔ تو سارے وجود میں ایک روشنی سی ہو جاتی۔ لجیا کی چمکدار آنکھیں' گلابی ہونٹ' چمکتے ہوئے سندر دانت نجانے کیسی کیسی کہانیاں سناتے تھے اور وہ ٹھنڈی سی آہ لے کر سوچتا تھا کہ محبوب کا حصول کبھی اتنا آسان تو نہیں ہوا۔ یہ لوگ تو اس کی محبت اپنے ہاتھ میں رکھ کر پیش کر رہے تھے اور وہ اسے لجیا کی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا تھا اور اس طرح اپنے سارے دلدر دور کر لینا چاہتا تھا۔ لیکن شاہ زیب اتنا بدنصیب تھا کہ وہ اپنی محبت کو دل و جان سے چاہنے کے باوجود اپنا قرب نہیں دے سکتا تھا۔

آہ --- کاش! لجیا ایک ایسی شکل میں اس کے سامنے آتی اور وہ اپنے گھر کا چہیتا ہوتا۔ ماں زندہ ہوتی تو وہ شرما شرما کر اسے بتاتا کہ ماں میں نے تیرے لیے بہو پسند کر لی ہے اور پھر لجیا ماں کی آغوش میں آ جاتی۔ ماں جتنی محبت کرنے والی نیک اور نفیس خاتون تھی۔ وہ یہ بھول جاتی کہ لجیا کس گھر کی فرد ہے اپنے بیٹے کی پسند کو وہ اوّل حیثیت دیتی اور اس کے بعد زندگی میں کوئی مشکل نہ رہتی۔ یہ خواب اس کی آنکھوں میں آتے تو اس کو بڑا سکون نصیب ہوتا۔ اس نے اب ان خوابوں کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا تھا اور اس دن بھی وہ ایسے ہی کسی خواب میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک اسے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ یہ ایک ویران سی جگہ تھی اور اس بات کے امکانات تھے کہ یہاں کوئی عام گزرگاہ بھی نہ ہو لیکن اس نے کافی دیر پہلے ڈیزل کی بو محسوس کی تھی اور ادھر ادھر نگاہیں دوڑا کر رہ گیا تھا۔

ہو سکتا ہے ہوا کا کوئی آوارہ جھونکا بہت دور سے اپنے آپ میں یہ بدبو بسائے دوسرے جھونکوں سے ہٹ کر سفر کر رہا ہو اور ادھر سے گزر رہا ہو۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچا

جا سکتا تھا لیکن اب یہ آہٹیں سننے کے بعد اسے احساس ہوا کہ ڈیزل کی بو کہیں دور سے نہیں آئی تھی۔ بلکہ آس پاس ہی تھی۔ وہ دم سادھ کر ان آہٹوں کو سننے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی چھٹی حس نے بتایا کہ اسے چاروں طرف سے گھیرا جا رہا ہے۔

شاہ زیب ایک دم سنبھل گیا۔ قرب و جوار میں اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اور جہاں اس وقت وہ موجود تھا وہاں درخت کافی تعداد میں تھے۔ دفعتاً ایک سیٹی کی آواز آئی اور اس کے بعد اچانک ہی گولیاں چلنے لگیں۔ شاہ زیب دم بخود رہ گیا تھا۔ اسے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ دیکھ لیا گیا ہے لیکن ان لوگوں نے اسے غفلت میں چھاپنے کی بجائے اس پر گولیاں چلانا شروع کر دی تھیں اور اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ شاہ زیب کے ہاتھوں پہلے ہی بہت سے افراد مارے جا چکے تھے۔ گولیاں پوری رفتار کے ساتھ چل رہی تھیں۔ شاہ زیب نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر اسے وہ گہرا نالہ یاد آ گیا جو سوکھا تھا اور یقینی طور پر برسات میں بھر جاتا ہو گا۔

چنانچہ وہ پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور نالے کی جانب دوڑنے لگا۔ نالہ تھوڑے فاصلے پر تھا۔ وہ دوڑا تو اس کے پیروں کے نیچے آنے والے پتے آہٹ پیدا کرنے لگے۔ پھر جیسے ہی وہ درختوں سے نکل کر کھلی جگہ میں پہنچا۔ اچانک ہی گولیاں چلیں اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ گولیاں اس کے سینے ٹانگوں اور سر پر سے سنسناتی ہوئی گزرنے لگیں۔ وہ دم سادھے کھڑا رہا۔ موت اس کے چاروں طرف منڈلا رہی تھی اور وہ رک رک کے گہرے سانس لیتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا واپس درختوں کی جانب بڑھنے لگا۔ آخر وہ درختوں کے تلے اندھیرے میں آ گیا اور اس طرح فائرنگ کی زد سے باہر ہو گیا لیکن وہ جانتا تھا جیسے جیسے وہ لوگ گھیرا تنگ کریں گے۔ اس کی موت اس کے قریب آتی چلی جائے گی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے' کدھر جائے۔

ہر سمت گولیاں چاروں طرف چیخ رہی تھیں۔ مگر کسی جگہ ٹھہرنا ہی خطرناک تھا۔

زندگی بچانے کے لیے جلد سے جلد نکلنا ضروری ہو گا چنانچہ اس نے چوکنی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر کچھ دور تک بڑھتا چلا گیا۔ دفعتاً ہی وہ اندھیرے میں کسی چیز سے ٹکرا کر گرتا گرتا بچا۔ وہ ایک درخت کی جڑ تھی جو ابھر آئی تھی۔ اس کے ٹکرانے سے آہٹ ہوئی اور گولیاں سنسناتی ہوئی اس کے آس پاس سے گزرنے لگیں۔ پھر اس نے وہ جگہ بھی چھوڑ دی اور آگے بڑھ گیا۔

چاند نکل آیا تھا مگر آسمان پر غبار اس قدر گہرا تھا کہ چاندنی بہت پھیکی اور دھندلی پڑ گئی تھی۔ البتہ درختوں کے نیچے گہرا اندھیرا تھا جیسے ہی موقع ملتا وہ درخت کی آڑ لے کر دوسرے درختوں کے پاس پہنچ جاتا اسے اب دوسرے رخ کا خیال آیا تھا۔ چنانچہ درختوں کے نیچے سے نکل کر وہ باہر آ گیا۔ تھوڑی ہی دور پہنچنے کے بعد اس نے راستہ بدل لیا اور تیزی سے دوڑنے لگا۔ خاصی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا تھا اس نے اور خوب دور نکل آیا تھا۔ لیکن اس کو قرب و جوار میں آہٹیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں اور جب تک ان آہٹوں سے پیچھا نہ چھڑایا جا سکے کوئی بھی کام ہونا مشکل تھا۔ وہ کئی منٹ تک اس طرح جھاڑیوں کی اوٹ میں چلتا رہا۔ بار بار راستے بدلتا کہیں تیز کہیں سست۔ کہیں جھاڑی کی آڑ لے کر چھپ جاتا۔ جھاڑی میں کانٹے بے پناہ تھے اور بہت سی دفعہ اس کے جسم پر کانٹے چبھے تھے۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسی جگہ آ گیا جہاں جنگل ختم ہو گیا تھا۔ سامنے چٹیل میدان تھا اور اس سے آگے کسی قدر بلندی پر درختوں کے جھنڈ' درختوں کی آڑ سے زرد زرد روشنی کا ایک دھبہ نظر آ رہا تھا۔ وہ میدان سے گزرتا ہوا بلندی کی جانب چل پڑا۔ دور سے کوئی چیخا۔

''وہ ہے---وہ ہے---وہ ہے ادھر---ادھر'' اور پھر قدموں کی آوازیں اس کے ساتھ ہی تڑ تڑ گولیاں جو صحیح انداز سے نہیں چلائی جا رہی تھیں لیکن صورتحال خاصی خوفناک تھی۔ ان لوگوں نے اسے دیکھ لیا تھا اور اب اس بات کے کیا امکانات تھے کہ وہ

انتظار کرتے وہ اسی طرح دوڑ پڑے تھے۔

کچھ دیر تک تو وہ دوڑتا رہا۔ اس کے بعد اچانک اسے ایک خیال آیا اور وہ ایک گھنے درخت پر بندر کی طرح پھرتی سے چڑھتا چلا گیا۔ اوپر پہنچنے کے بعد اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں لیکن آس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ وہ کس جگہ تک پہنچ سکا ہے۔ لیکن جب بھی ذرا سکون ہوا تو اس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ تھوڑے فاصلے پر آبادی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ابھی خاصا اندھیرا تھا۔ اب اس بات کا تو اندازہ ہی نہیں ہو پا رہا تھا کہ جگہ کون سی ہے۔ بس یونہی اطراف میں گھومتا پھر رہا تھا۔ شاہ کوٹ سے نکلا تھا۔ کوٹ آدم سے باہر چل پڑا تھا۔ راستوں کا کوئی صحیح تعین نہیں تھا۔ مگر سارے راستے بے مقصد ہوتے ہیں۔ اگر ان میں زندگی کا وجود نہ ہو۔ بہت دیر تک وہ درخت کی ایک شاخ پر چمٹا رہا اور پھر اس نے یہ دیکھنے کے بعد کہ اس طرف کوئی نہیں آیا ہے اور اس کا پیچھا کرنے والے شاید راستہ بھٹک کر کسی اور سمت نکل گئے ہیں وہ آہستہ آہستہ سے نیچے اترنے لگا۔ آبادی کے بہت سے مکانات میں مدھم مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ ویسے مکانات خاصے خوبصورت بنے ہوئے تھے۔ گو ان میں آپس میں فاصلہ تھا لیکن بالکل جدید انداز میں یہ مکانات بنائے گئے تھے اور یقیناً بڑے لوگوں کے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک خوبصورت عمارت نظر آئی۔ احاطے میں لاتعداد درخت بکھرے ہوئے تھے اور ان درختوں کی شاخیں دیوار سے باہر بھی نکلی ہوئی تھیں۔ بعض جگہیں اتنی نیچی اور اس قدر مضبوط تھیں کہ ان کو پکڑ کر بڑے آرام سے اندر پہنچا جا سکتا تھا۔ پتہ نہیں مکان میں رہنے والوں نے اس سلسلے میں غور کیوں نہیں کیا تھا کہ بیرونی لوگوں کو خاص طور سے ایسے لوگوں کو جن کی نگاہوں میں آئے بغیر اندر جانا چاہتے ہیں بڑی آسانیاں حاصل تھیں۔ کم از کم یہ شاخیں تو کٹوا دینی چاہئیں تھیں۔ لیکن اگر شاخیں کٹی ہوتیں تو شاہ زیب کو اتنی آسانی کیوں مل جاتی۔

چنانچہ ایک شاخ کو پکڑ کر وہ اوپر چڑھا اور پھر نہایت ہوشیاری کے ساتھ دوسری جانب نیچے اتر گیا۔ خوبصورت عمارت کی ایک کھڑکی سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ شاہ زیب دبے دبے قدموں سے آگے بڑھتا ہوا اس کھڑکی پر پہنچا جس سے روشنی جھلک رہی تھی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ کھڑکی پر شیشے نہیں لگے ہوئے تھے۔ بلکہ باریک جالی تھی جو مچھروں سے بچاؤ کے لیے لگائی جاتی ہے اور دوسری طرف پڑے ہوئے پردے کھلے ہوئے تھے۔ شاہ زیب نے اندر جھانکا۔ کمرے میں روشنی تھی لیکن اندر کوئی موجود نہیں تھا۔ سامنے میز پر لیمپ رکھا ہوا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی میں ہر چیز نظر آ رہی تھی۔

بہر حال وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا ادھر ادھر کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک ہی باہر سے سیٹیاں بجنے کی آوازیں سنائی دیں اور وہ ایک دم اچھل پڑا پھر اس نے بنگلے کے بیرونی دروازے کے کھلنے کی آواز سنی اور وہ بدحواس ہو کر برق رفتاری سے دوڑتا ہوا عمارت کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ صدر دروازے کے قریب ہی راہداری تھی۔ جو بائیں سمت چلی جاتی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھے بغیر اس راہداری میں قدم رکھ دیے اور تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگا۔ پھر راہداری کا اختتام ایک وسیع و عریض ہال کمرے پر ہوا۔ کچھ عجیب سا ڈیزائن تھا عمارت کا۔ عام عمارتوں سے ذراہٹ کے وہ اس ہال نما کمرے میں داخل ہوا۔ تو اچانک ہی اس نے ایک شخص کو دیکھا جو ایک بڑے سے اعلیٰ درجے کے صوفے پر بیٹھا ہوا کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ اس نے سن لی تھی۔

چنانچہ جیسے ہی شاہ زیب اندر داخل ہوا۔ اس نے اسے حیران نگاہوں سے دیکھا۔ کتاب ایک طرف رکھی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بہت ہی اعلیٰ درجے کے گاؤن میں ملبوس وہ ایک دراز قامت آدمی تھا لیکن شاہ زیب کو اس کا چہرہ دیکھ کر ایک لمحے کے لیے شدید ذہنی جھٹکا برداشت کرنا پڑا تھا۔ شاہ زیب کی آنکھیں بالکل دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔ بعض چہرے

کوئی واقعہ نہ ہونے کے باوجود ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں لیکن مکرم شاہ تو ایک ایسا کردار تھا جس نے شاہ زیب کو دنگ کر کے رکھ دیا تھا۔لنگڑا مکرم شاہ تین قتل کر کے بھاگ گیا تھا۔کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اس وقت مکرم شاہ اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔شاہ زیب کو ایک بار پھر ذہنی جھٹکا لگا۔باہر سے خاصی بھاگ دوڑ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔چنانچہ شاہ زیب کو سنبھلنا پڑا۔دوسرے ذہنی جھٹکے نے اسے بالکل ہی معطل کر دیا تھا۔دوسرا ذہنی جھٹکا اس بات کا تھا کہ مکرم شاہ اس وقت اپنے دونوں پیروں پر کھڑا ہوا تھا۔

اس علاقے میں جب مکرم شاہ اسے ملا تھا تو میلہ کچیلا گودڑ نما لباس تھا لیکن اس وقت وہ جو گاؤن پہنے ہوئے تھا اس کی قیمت ہزاروں روپے ہوگی اور پھر وہ اپنے دونوں پیروں پر کھڑا ہوا تھا۔ایک لمحے کے اندر شاہ زیب کے ذہن سے بہت سے خیالات گزر گئے۔یہ شخص مکرم شاہ سے اتنا ملتا ہے کہ اگر دونوں کو پاس پاس کھڑا کر دیا جائے تو پہچاننا مشکل ہوگا لیکن یہ مکرم شاہ نہیں ہے کیونکہ مکرم شاہ کی لنگڑی ٹانگ تو باقاعدہ ران کے پاس سے کٹی ہوئی تھی۔اور شاہ زیب نے اسے بہت اچھی طرح دیکھا تھا۔شاہ زیب اپنی سوچوں میں گم تھا اور سامنے کھڑا ہوا شخص اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔پھر اس نے چونک کر کہا۔

''تیرے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔'' شاہ زیب اچھل پڑا۔اس نے جلدی سے کہا۔

''نہیں۔میرے دشمن ہیں۔''

''ادھر آ۔۔۔'' مکرم شاہ بولا اور شاہ زیب کو ایک الماری کے پاس لے گیا۔

''یہاں کھڑا ہو جا۔۔۔ کوئی نہیں آئے گا یہاں۔'' شاہ زیب وہاں کھڑا ہو گیا لیکن یہ جگہ ایسی تھی کہ جہاں سے وہ مکرم شاہ کو دیکھ سکتا تھا۔مکرم شاہ پر اطمینان قدموں سے چلتا ہوا دوبارہ اسی صوفے پر جا بیٹھا اور اس نے کتاب دوبارہ کھول لی۔شاہ زیب کی نگاہیں چاروں

طرف بھٹک رہی تھیں۔کمرے میں ہر طرف اونچی اونچی الماریاں نظر آ رہی تھیں اور ان الماریوں کے شیشوں کے پیچھے بہت ہی اعلیٰ درجے کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ایک طرف بڑی سی میز لگی ہوئی تھی اور اس میز پر بھی کچھ کاغذات اور موٹی موٹی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ باہر کی آوازیں بند ہو گئیں تھیں اور کچھ عجیب سی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔اس دوران صدر دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں بھی فضا میں ابھری تھیں۔تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک چوڑے شانوں اور گٹھے ہوئے جسم کا آدمی اندر داخل ہوا۔اس نے مدھم مدھم لہجے میں مکرم شاہ کے ہم شکل سے کچھ کہا اور مکرم شاہ نے گردن ہلا دی۔وہ شخص باہر نکل گیا۔تب مکرم شاہ کی آواز ابھری۔

''باہر آ جا تیرے دشمن جا چکے ہیں۔'' شاہ زیب نگاہیں نیچے کیے اس الماری کے عقب سے نکل آیا اور پھر اس نے گردن خم کر کے کہا۔

''آپ کا شکریہ جناب! آپ نے میری زندگی بچالی۔بہت احسان کیا ہے مجھ پر'' وہ شخص اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور پھر آہستہ سے بولا۔

''چل میرے ساتھ آ۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔شاہ زیب اس کے پیچھے چل پڑا تھا۔اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور پھر راہداری میں آ گیا۔کچھ دور جا کر ایک اور دروازے کے سامنے رکا۔دروازہ کھلا تھا۔اس نے اندر جانے کا اشارہ کر کے کہا۔

''جا اندر جا کر سو جا۔دروازہ بند کر لینا۔یہاں تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔اس وقت تو میرے پاس ہے۔'' شاہ زیب اندر داخل ہو گیا اور پھر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔یہ مختصر سی کوٹھی تھی ایک دیوار کی بلندی پر روشن دان تھا۔اس پر لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں جڑی ہوئی تھیں۔روشن دان سے مدھم روشنی اندر جھانک رہی تھی۔تھوڑی دیر تک وہ کھڑا اپنی آنکھوں کو اس جگہ کا عادی بنانے کی کوشش کرتا رہا۔اور پھر اس کی نگاہیں

چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ ایک طرف غالباً تخت بچھا ہوا تھا۔ لکڑی کے تخت پر موٹا سا بستر بچھا ہوا تھا۔ تکیہ بھی تھا اور چادر بھی۔

شاہ زیب اس قدر تھکا ہوا تھا اور اس قدر وحشت زدہ تھا کہ اس کا پورا بدن چٹخنے لگا اور وہ خاموشی سے جا کر تخت پر لیٹ گیا۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ کہیں کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی لیکن جو لمحات گزر رہے تھے وہ شاہ زیب کے لیے شدید ذہنی جھٹکوں کا باعث تھے۔ پہلے بات تو یہی خوفناک تھی کہ اتنے عرصے کے بعد اسے ایک بار پھر تلاش کر لیا گیا تھا۔ نہ ہی صرف تلاش کر لیا گیا تھا بلکہ ان لوگوں نے بہت ہی زبردست طریقے سے اس کا تعاقب کیا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ یہاں آئے ہی کیسے اور پھر دوسرا شدید ذہنی جھٹکا اس وقت مکرم شاہ کے سلسلے میں تھا۔ آواز بھی وہی تھی بولنے کا انداز بھی وہی تھا اور چہرے کے نقوش ان میں تو ذرا بھی فرق نہیں تھا۔ لیکن بس دونوں ٹانگیں پریشان کر رہی تھیں۔ لمبے گاؤن میں یہ تو اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ ٹانگوں کا انداز کیا ہے لیکن جس انداز میں مکرم شاہ چلتا ہوا اس کے آگے آگے آیا تھا اس میں ذرہ برابر بھی کوئی ایسی چیز نہیں تھی۔ جس پر شبہ کیا جا سکے۔ سو فیصدی دونوں پیروں والے انسان کا انداز تھا۔ بس اس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ وہ مکرم شاہ کا ہمشکل بے شک ہے۔ لیکن مکرم شاہ نہیں ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان دونوں میں آپس میں کوئی ایسا ربط ہو جس سے ان کی شکلیں ایک جیسی ہوں۔

پھر دو گھنٹے گزر گئے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دفعتاً اسے کچھ خیال آیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے پر پہنچ گیا۔ پھر اس نے دروازہ اندر سے کھولا اور اسے گھسیٹنا چاہا لیکن دروازہ باہر سے بند تھا۔ یہ تو عجیب سی صورتحال ہوئی۔ کیا احتیاطاً دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا ہے یا پھر کوئی اور لمبا چکر اس کا انتظار کر رہا ہے۔

بہر حال یہ عارضی پناہ گاہ عجیب و غریب کیفیت کی حامل تھی۔ ذہن اس کے لیے

کوئی مناسب فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا اور وحشت کچھ اس طرح سوار تھی کہ اس سے چھٹکارہ پانا بھی ضروری تھا۔ اب تو بہت سے واقعات شاہ زیب کی زندگی سے منسلک ہو گئے تھے۔ جن میں لجیا بھی تھی۔

بہر حال اس کے بعد نیند آئی تھی اور سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ نیند کیسے آئی ہے۔ پھر صبح کو کوٹھی کا دروازہ کھلا تھا اور شاہ زیب کی آنکھ کھل گئی تھی۔ حالانکہ اس نے رات کو دروازہ اندر سے بند کیا تھا لیکن دوبارہ اس نے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی تھی تو پھر اس کے بعد پھر اسے اندر سے بند نہیں کیا تھا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا تو دروازے سے اندر داخل ہونے والا وہی آدمی تھا جو رات کو مکرم شاہ کے پاس آیا تھا اور مکرم شاہ سے کوئی بات چیت کی تھی۔ اس وقت اس آدمی کی کمر میں پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس پٹی میں ریوالور اڑسا ہوا تھا۔ یہ بھی خطرناک شکل کا آدمی تھا۔ اپنے ڈیل ڈول اور وضع قطع سے وہ خاص خطرناک آدمی لگتا تھا۔ شانے ضرورت سے زیادہ چوڑے سینہ ایسی مناسبت سے چوڑا۔ قد چھوٹا گردن اس طرح کندھوں پر رکھی ہوئی تھی جیسے کسی تھالی میں کدو رکھ دیا گیا ہو۔ اس نے کوئی بات نہیں کی بس اشارہ کیا۔ اور شاہ زیب کو باہر چلنے کا حکم دے کر واپس مڑ گیا۔ شاہ زیب خاموشی سے باہر نکل آیا۔ وہ شخص راہداری میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ اچانک ہی شاہ زیب نے کہا۔

''کہاں جا رہے ہیں ہم؟'' لیکن ایسا لگا جیسے اس کے کانوں نے کچھ سنا ہی نہیں ہو۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھتا رہا اور تین سیڑھیاں اتر کر ایک خوبصورت لان پر آ گیا۔ لان خاصا وسیع و عریض تھا۔ جگہ جگہ رنگا رنگ پھولوں کے تختے لگے ہوئے تھے۔ عمارت کا بیرونی حصہ اتنا زیادہ خوبصورت نہیں تھا۔ لیکن یہ عقبی حصہ بڑی وسعت میں پھیلا ہوا تھا اور اس کا حسن دیکھنے کے قابل تھا۔ بہت سے درخت ادھر بھی لگے ہوئے تھے اور نرم گھاس دور

تک پھیلی ہوئی تھی۔ مالی کام کر رہا تھا اور سامنے ایک اور عمارت نظر آ رہی تھی۔ غالباً یہ اس عمارت کا دوسرا حصہ تھا۔ اور درمیان میں لان بنا ہوا تھا۔

بہرحال خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ دوسری عمارت تک پہنچ گئے۔ سامنے کے دروازے پر اونچے اونچے ستونوں پر چھت بنی ہوئی تھی۔ اور اس کے نیچے ایک بہت ہی خوبصورت کار کھڑی ہوئی تھی۔ ایک ڈرائیور وردی میں ملبوس اس کار کی صفائی کر رہا تھا۔ شاہ زیب سحر زدہ سے انداز میں آگے بڑھا اور اوپر پہنچ گیا۔ یہ کافی بڑی جگہ تھی اور یہ بھوت نما انسان شاہ زیب کو لیے ہوئے بڑی سست رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے چلنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اسے سیر کرا رہا ہو۔ اور یہ عمارت دکھا رہا ہو۔ پھر اس وقت شاہ زیب کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ عمارت کے دوسرے سرے سے باہر نکل آیا۔ ادھر بھی ایک بڑا سا پھاٹک نظر آ رہا تھا اور شاہ زیب کی راہنمائی کرنے والا اس پھاٹک سے بھی گزر گیا تھا۔ پھاٹک کے آگے ایک سڑک بنی ہوئی تھی۔ جس کے دونوں طرف درخت لگے ہوئے تھے۔ سڑک کے داہنی سمت تا حد نگاہ کھیتوں کا ایک بڑا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور ان میں پودے لہرا رہے تھے۔ شاہ زیب پر اب دیوانگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے اور وہ اسے کہاں لے جا رہا ہے۔

بہرحال وہ سامنے دور تک پھیلے ہوئے سبزہ زار میں آگے بڑھتا رہا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اسے سامنے سے کچھ افراد نظر آئے۔ درختوں کے ایک بڑے جھنڈ کے نیچے چارپائی بچھی ہوئی تھی اور اس چارپائی پر بہت ہی خوبصورت دری اور چادر بچھی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے پائیوں والی اس چارپائی پر اس نے مکرم شاہ یا اس کے ہمشکل کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ سامنے ہی بہت خوبصورت حقہ رکھا ہوا تھا اور مکرم شاہ حقے کے کش لے رہا تھا۔ حقے کی خوشبودار تمباکو کی بو دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ زیب آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس چارپائی

کے پاس پہنچ گیا۔ اسے یہاں لانے والا مودب انداز میں پیچھے پلٹ گیا تھا۔ حقے کے کش لیتے ہوئے مکرم شاہ کے ہمشکل نے سر سے پاؤں تک شاہ زیب کا جائزہ لیا۔ پھر بھاری آواز میں بولا۔

''مجبوری تھی تو نے سوچا ہوگا کہ آسمان سے گرا ببول میں اٹکا۔ دشمنوں سے بچا دوستوں کا قیدی بن گیا۔ پر ایسی بات نہیں ہے اصل میں کتوں سے جان بچا کر بھاگنے والا گیدڑ ڈرا ہوا ہوتا ہے۔'' وہ رک کر ہنسا۔ شاہ زیب خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

''مگر ہم تمہیں گیدڑ نہیں کہہ رہے ہو سکتا ہے تم شیر ہو۔ جب بہت سے کتے شیر پر پڑ جاتے ہیں تو شیر کو بھی بھاگنا پڑتا ہے۔ ہم نے سوچا کہ کہیں تو ڈر کر یہاں سے بھی نہ بھاگ جائے۔ ہمیں تجھ جیسے ایک بندے کی ضرورت تھی۔ بڑا ضروری کام تھا تجھ سے۔'' شاہ زیب نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے ذہن میں عجیب و غریب خیالات آ رہے تھے۔ کم بخت کی اگر دونوں ٹانگیں نہ ہوتیں تو سو فیصدی مکرم شاہ ہی تھا۔ وہ اس کے آگے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

مکرم شاہ دیر تک کچھ نہیں بولا تھا۔ شاہ زیب انتظار کرتا رہا کہ وہ کچھ بولے۔ اپنی فطرت کے مطابق وہ کسی بھی شخص سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوتا تھا۔ مکرم شاہ کی شخصیت ذرا مختلف تھی۔ خاص طور سے یہ احساس کہ وہاں وہ ایک ٹانگ کا تھا اور کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی لیکن یہاں وہ اپنے دونوں پیروں پر چلتا پھرتا تھا۔ شاہ زیب نے اس پر بہت غور کیا تھا۔ اس نے دونوں پیروں میں جوتے پہنے ہوئے تھے اور اس کی چال میں بھی ذرہ برابر کوئی احساس نہیں ملتا تھا جس سے یہ پتہ چلے کہ اس کی ایک ٹانگ مصنوعی ہے۔ پھر یہ اس قدر

ہمشکل لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی بعض اوقات بہت ہی گہرے ہمشکل بھی نظر آ جاتے ہیں۔

البتہ یہ احساس اس کے دل میں ضرور تھا کہ اس شخص سے معلوم کرے کہ یہ کون ہے۔ کیا نام ہے اس کا لیکن یہ بھی ایک الگ ہی مسئلہ تھا اور شاہ زیب نے سوچا تھا کہ جتنا وقت یہاں گزر رہا ہے یہی کافی ہے۔ یہ شخص اس پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ عارضی طور پر اس کی کوئی برتری قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تاکہ یہ مطمئن ہو جائے۔ ہر شخص کے اندر بڑائی کا ایک جذبہ پل رہا ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی ذات کو پوشیدہ اور پراسرار سمجھتا ہے اور دوسروں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ وہ عام انسانوں سے ایک منفرد انسان ہے۔ یہ انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس کے سامنے والا شخص بالکل بیوقوف نہیں ہوتا۔ بلکہ بیوقوف خود اپنے آپ کو ایسا سمجھنے والا ہوتا ہے اور اس کی حماقت کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کو نہیں سمجھ پاتا۔ اس وقت بھی یہی کیفیت تھی۔ مکرم شاہ کا ہم شکل شاہ زیب کو ایک رات کی پناہ دے کر یہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے اس پر احسان عظیم کیا ہے اور یہ بھی سوچ رہا تھا وہ کہ اسے شاہ زیب جیسا کوئی بندہ چاہیے جو اس کا کوئی کام کر سکے۔ جبکہ کافی دیر اسی طرح گزر گئی تو شاہ زیب نے کہا۔

''آپ نے بتایا نہیں شاہ جی! کہ میں نے آپ کی کیا خدمت انجام دینی ہے؟''

جواب میں اس شخص نے نگاہیں اٹھائیں اور گردن ہلاتا ہوا بولا۔

''بتائیں گے' بتائیں گے۔ ابھی وقت گزرنے دے۔ البتہ تجھے ایک مشورہ دے سکتے ہیں۔ کیسی کارکردگی ہے تیری۔ سینے میں موجود دل کتنا بڑا ہے۔ دشمنوں سے بھاگتا ہی پھرتا ہے یا کبھی ان کی آنکھوں میں آنکھیں بھی ڈال لیتا ہے؟''

''شاہ جی! میں ایک شریف آدمی ہوں۔''

''دھت تیرے کی۔ پھر بیکار ہے تو۔ جا ہم نے تیرے بارے میں غلط اندازہ لگایا۔ جا بیٹا جا۔ شریف آدمی کی اس دنیا میں ہی نہیں کسی بھی جگہ کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ تیرا پیچھا کرتے پھر رہے ہیں اور تو کہتا ہے کہ تو شریف آدمی ہے۔ دیکھ دشمن کے بارے میں صرف اتنا ہی کہتا ہوں کہ دشمن کو مار دو ورنہ وہ تمہیں مار دے گا۔ سمجھ رہے ہو نا تم۔ میں نے تمہیں پناہ دی ہے۔ یہ احسان تمہارے اوپر قرض رہا میرا۔ اگر شریف آدمی ہو تو میرا یہ احسان اتار دینا کبھی۔ بس تمہارے لیے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ جاؤ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں ابھی نئی دشمنیاں خریدنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ البتہ ایک بات میں تمہیں بتا دوں۔ وہ یہ ہے کہ مجھے بھی دشمن پالنے کا شوق ہے۔ میں اپنے دشمن بناتا ہوں ان سے کھیلتا ہوں کھلونوں کی طرح اور جب ان سے میرا دل بھر جاتا ہے تو انہیں ختم کر دیتا ہوں۔ دشمنی کا اپنا ایک الگ مزہ ہے۔ دوستی تو لوگ کرتے ہی ہیں۔ آج کل کئی دشمن میرے پاس اسٹاک میں ہیں۔ میں ذرا ان کا کھیل کھیل لوں۔ پھر ذرا نئے دشمن بناؤں گا۔ اس لیے تم سے معذرت چاہتا ہوں۔ یہ بتاؤ کب جا رہے ہو یہاں سے؟''

''شاہ جی! آپ کی محبت' آپ کی مہربانی نے میرے قدم روکے ہوئے ہیں۔ ورنہ اصولی طور پر جتنا وقت میں گزار چکا ہوں۔ اس کے بعد مجھے یہاں مزید وقت نہیں گزارنا چاہیے اور آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں میرے لیے آپ بالکل نئی دشمنی نہ خریدیں میں خود بھی اسے پسند نہیں کروں گا۔''

''اور وہ میرے احسان کی بات؟''

''شاہ جی! اس کے لیے تو ابھی اور اسی وقت تیار ہوں۔'' جواب میں وہ پھر ہنسنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

''اس وقت تو تو خود مشکل میں ہے بچھڑے۔ میرا کام کیا کرے گا؟''

''شاہ جی! اگر آپ پسند کرتے ہو تو مجھے بتاؤ؟'' شاہ زیب نے کہا۔

''نہیں۔ جب تو اپنے دشمنوں سے نمٹ کر ایک مضبوط آدمی کی حیثیت سے میرے پاس آئے گا اور تو آئے گا ضرور اس بات کو یاد رکھنا اور جب تو میرے پاس آئے گا تو میں تجھے اپنا کام بھی بتا دوں گا۔ تجھے جو چاہیے مانگ لے میرا آدمی تیرے لیے بندوبست کر دے گا۔ اور اس کے بعد یہاں سے نکل جا۔ معصوم شاہ! یہ بچہ جو مانگے اسے دے دینا کیا مانگتا ہے یہ مت سوچنا۔''

''ٹھیک ہے شاہ جی!'' معصوم شاہ نے کہا۔ اس وقت بھی شاہ زیب کی یہ حسرت دل میں رہ گئی کہ کوئی اسے اس شخص کے نام سے مخاطب کرے لیکن اس وقت بھی اس کا نام شاہ زیب کے علم میں نہیں آیا تھا۔ مکرم شاہ کے ہم شکل نے انگلی اٹھا کر کہا۔

''ہے۔ ٹھیک ہے ٹھیک اللہ بیلی' اللہ بیلی۔'' اس کا مطلب تھا کہ اب شاہ زیب کو وہاں نہیں رکنا چاہیے۔ چنانچہ وہ گردن جھکا کر وہاں سے واپس چل پڑا۔ جس شخص کو معصوم شاہ کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ وہ شاہ زیب کے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا تھا۔ یہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو اسے یہاں تک لائے تھے۔ جس جگہ شاہ زیب کا قیام تھا وہاں پہنچنے کے بعد معصوم شاہ نے کہا۔

''بھائی جان! جب شاہ جی نے آپ سے کہہ دیا کہ اب یہاں سے جاؤ تو آپ کے لیے یہاں سے نکل جانا ضروری ہوتا ہے۔ ہاں! آپ یہ بتا دو کہ کیا چاہیے؟'' شاہ زیب نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر بولا۔

''مجھے جو کچھ چاہیے مل جائے گا؟''

''ہاں! ہوائی جہاز مت مانگ لینا۔ ہمارے پاس نہ ہیلی کاپٹر ہے نہ ہوائی جہاز۔'' معصوم شاہ نے اپنی دانست میں مذاق کرتے ہوئے کہا۔

''گھوڑا؟''

''مل جائے گا۔''

''رائفل؟''

''وہ بھی مل جائے گی۔''

''بس رائفل میگزین کے ساتھ' ایک تندرست گھوڑا اور تھوڑی سی رقم۔ یہ تمام چیزیں شاہ جی سے کہہ دینا کہ قرض کے طور پر لے رہا ہوں۔ واپس کر دوں گا انہیں اس وقت جب میری ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی اور میں یہ چیزیں واپس کرنے کی پوزیشن میں ہوا۔'' معصوم شاہ ہنس پڑا پھر بولا۔

''ایسا قرض واپس کرنے کی بات بھی نہیں کرنی چاہیے۔ شاہ جی کے کئی قرض ہو گئے ہیں تم پر۔ خیر یہ تمہاری معصومیت ہے کہ تم نے کچھ نہیں مانگا۔ ایسا کرو کچھ اور چاہیے تو کچھ اور لے لو۔ رقم بڑھا لو کیونکہ ایسے موقع بار بار نہیں ملتے۔ شاہ زیب نے حقارت بھری نگاہوں سے معصوم شاہ کو دیکھا اور بولا۔

''جو کچھ میں لے رہا ہوں وہ قرض ہے اور وہ بھی اس لیے کہ شاہ جی نے مجھے اس کا موقع دیا ہے اور یہ سب کچھ میری مجبوری ہے۔'' شاہ زیب کے لیے ایک شاندار گھوڑا' جدید طرز کی رائفل اور شاہ زیب کے طلب کرنے کے مطابق پانچ ہزار روپے فوراً مہیا کر دیئے گئے۔ شاہ زیب نے ان چیزوں کو سنبھالا اور پھر گھوڑے کو ایڑ ھ لگا دی۔

وہ تھوڑی دیر کے بعد اس علاقے سے نکل آیا اور سنسان راستوں پر سفر کرنے لگا۔ یہ علاقے اس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ بچپن سے اب تک یہیں زندگی گزاری تھی۔ لیکن چھوٹے چھوٹے گاؤں اور قصبے اُس کے لیے بے نام ضرور تھے۔ وہ ان سے بچتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور پھر کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک ڈھابے پر پہنچ گیا۔ آگے تھوڑے

فاصلے پر ایک ٹیوب ویل چل رہا تھا۔ ترکاریوں کے کھیت لگائے گئے تھے۔ ایک لمحے تک وہ سوچتا رہا۔ یہ معصوم لوگ کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ ترکاریوں کے کھیتوں پر دو افراد کام کر رہے تھے۔ صورت سے ہی مقامی معلوم ہوتے تھے۔ گھوڑے کو دیکھ کر وہ سیدھے ہو گئے اور کچھ دیر کے بعد شاہ زیب ان کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں نے اسے جھک کر سلام کیا۔

''سلام چوہدری جی! حکم کریں جی۔ ہمارے لائق کوئی خدمت۔'' شاہ زیب گھوڑے سے نیچے اتر گیا اور پھر اس نے کہا۔

''کچھ پانی وانی پلاؤ بھائی! پیاسا ہوں۔''

''ابھی چوہدری جی! جا رحیم جا لسی لے آ۔''

''لسی نہیں اگر پانی مل جائے تو۔''

''پانی بھی ہے چوہدری صاحب! آیئے ادھر آ جایئے۔ لایئے آپ کا گھوڑا میں پکڑ لیتا ہوں۔'' اس نے کہا اور بڑے احترام سے اسے کھیتوں کے اس طرف بنے ہوئے درختوں کے پاس لے گیا جس کے نیچے چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ حقہ رکھا ہوا تھا۔ تھوڑا سا سامان بھی تھا جس میں مٹی کے ایک برتن میں یقینی طور پر لسی تھی۔ پانی کا بھی انتظام تھا۔ رحیم نے بڑے احترام سے گلاس کو خوب اچھی طرح دھویا اور اس کے بعد شاہ زیب کو پانی پیش کیا۔ پانی پینے کے بعد شاہ زیب نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''کون سی جگہ ہے؟''

''ماواں چک ہے صاحب' چک نمبر چھ۔''

''اچھا اچھا۔ تو یہاں سے تھوڑے فاصلے پر تو گمی ہے اور گمی کے سیدھے ہاتھ پر کبیر والا۔''

''ہاں جی۔ ہاں جی۔ آپ کہیں دور سے آئے ہو چوہدری صاحب!''

''ہاں میں خاصے فاصلے سے آیا ہوں۔''

''صاحب جی! ہمارے لیے حکم کرو کچھ کھانے کے لیے لائیں آپ کے لیے۔ ہمارا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔''

''نہیں بھائی! تمہارا بہت بہت شکریہ۔ یہ کیا تم نے گاجریں لگائی ہیں؟''

''ہاں جی تیار ہیں توڑ کر لائیں۔''

''ہاں اپنے کھیت کی ایک دو گاجریں کھلاؤ۔'' شاہ زیب نے کہا اور رحیم بھاگا بھاگا ترکاریوں کے کھیت میں جا گھسا۔ پھر چار پانچ لال لال گاجریں توڑ لایا۔ انہیں دھویا چھیلا اور [illegible] شاہ زیب کو پیش [illegible]۔ یہ ساری چیزیں بچپن کی پسند تھیں۔ شاہ زیب کو بہت کچھ یاد آنے لگا۔ سرخ گاجریں تو ماں کی بھی پسند تھیں۔ ماں۔۔۔ ایک آہ سی دل سے اٹھی اور اسے ماں یاد آ گئی۔ بہت محبت کرتی تھی وہ۔

اچانک ہی شاہ زیب کے ذہن پر ایک اور جھٹکا سا لگا۔ آج سترہ تاریخ تھی نومبر کی سترہ تاریخ۔ اور یہی دن ماں کی موت کا دن تھا۔ پورا سال گزر گیا تھا۔ اسے ایک سال میں کیا کیا تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ یہ سوچ کر شاہ زیب کے سینے میں ایک گولہ سا اٹھنے لگا۔ آنکھوں میں آنسو تیر آئے۔ وہ گاجریں کھاتے ہوئے ماں کے بارے میں غور کرتا رہا۔ آج ماں کی برسی ہے۔ اگر تھوڑی سی ہمت کر لی جائے تو قبرستان جا کر فاتحہ پڑھی جا سکتی ہے۔ کبیر والا اتنا دور نہیں تھا کہ وہ اب یہ سفر پورا نہ کر سکے۔ بس اس بات نے دل میں بے چینی پیدا کر دی۔ گاجریں کھانے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''بھائیو! میرے لائق کوئی خدمت ہو تو مجھے بتاؤ۔ تمہاری بہت بہت مہربانی۔''

''چوہدری صاحب جی! ہم تو یہ کہتے تھے کہ آپ کھانا کھا کر جاتے۔ غریب لوگ ہیں جی! کبھی کبھی غریبوں کو بھی عزت دے دی جائے تو اچھی بات ہوتی ہے۔ ہمارا بھی دل

بڑھ جاتا ہے۔"

"ایک وعدہ کرسکتا ہوں تم سے بھائی! وہ یہ کہ جیسے ہی موقع ملا اور ادھر سے گزرا۔ تمہارے پاس آ کر تم سے کہوں گا کہ چلو میرے لیے کھانا تیار کراؤ۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔" شاہ زیب نے دونوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور انہوں نے بڑی عقیدت سے شاہ زیب کا ہاتھ چوما پھر کچھ دیر کے بعد شاہ زیب گھوڑے پر سوار ہو کر چل پڑا تھا۔

دل میں بہت سے خیالات آ رہے تھے۔ ان میں ایک خیال لجیا کا بھی تھا۔ کیسی حسین، کیسی معصوم بالکل صاف شفاف طبیعت پر کوئی میل نہیں ہوتا تھا۔ جو منہ میں آتا تھا کہہ دیتی تھی۔ کہنے لگی۔

"مجھ سے شادی کرلونا۔ ماں باپ کی پریشانی دور ہو جائے گی۔" شاہ زیب جانتا تھا کہ اس وقت اس کے ذہن میں ایک مرد یا شادی کا تصور نہیں تھا بلکہ صرف ماں باپ کی پریشانی کی وجہ سے اس نے یہ پیشکش کردی تھی لیکن کاش ایسا ہو جائے وہ تو اس کے دل میں آ بسی تھی۔ بہرحال اس نے اس کے لیے جو کچھ کیا تھا وہ بھی بہتر ہی تھا۔ رلیہ شہاب الدین جیسا کمینہ انسان اس دنیا میں رہنا ہی نہیں چاہیے۔ لجیا کے لیے نہ سہی دوسروں کے لیے وہ پریشان کن ثابت ہوسکتا تھا۔ اب جب زندگیاں لینے کا سلسلہ شروع ہو ہی چکا تھا تو پھر کیوں نہ ہر ایسی مشکل کو راستے سے دور کر دیا جائے جو کسی کے لیے یا خود اپنے لیے عذاب بنتی ہو۔

گھوڑا برق رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ کئی بستیاں اور چھوٹے چھوٹے چک راستے میں آئے لیکن انہیں مہارت سے نظر انداز کرتا ہوا وہ آگے بڑھتا رہا اور پھر اس علاقے میں پہنچ گیا جو کبیر والا کی مشرقی سمت میں تھا اور شہری آبادی سے کافی دور تھا۔ یہیں بڑا قبرستان تھا۔ بڑے قبرستان میں ماں کی قبر کو ان لوگوں نے بڑے تپاک سے بنوایا تھا اور راستے تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن وہاں کچھ افراد کو دیکھ کر وہ ایک دم ٹھٹھک گیا۔ اس نے گھوڑے کی

لگامیں کھینچیں اور رک کر ادھر دیکھنے لگا لیکن پھر یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ وہاں جہاں زیب، اورنگزیب اور چار ایسے آدمی تھے جو جہاں زیب کے خاص آدمیوں میں سے تھے بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ ان لوگوں کے گن مین تھے۔ باڈی گارڈ تھے۔ دوست بھی تھے لیکن انہیں حویلی سے تنخواہیں ملتی تھیں۔ کل چھ افراد تھے یقینی طور پر جہاں زیب وغیرہ بھی ماں کی برسی پر فاتحہ پڑھنے آئے ہوں گے۔ بھائیوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

چنانچہ وہ گھوڑا دوڑتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سن لی گئیں اور سب کے سب اس جانب متوجہ ہو گئے۔ ماں کی قبر پر پانی ڈال کر پھول چڑھا دیئے گئے تھے اور شاید وہ لوگ فاتحہ خوانی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ شاہ زیب کو دیکھ کر جہاں زیب اور اورنگزیب کے چہروں پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔

شاہ زیب گھوڑے سے نیچے اترا تو ایک باڈی گارڈ نے اس کے گھوڑے کی لگامیں سنبھال لیں۔ دونوں بھائی شاہ زیب سے لپٹ گئے تھے اور ان کے رونے کی آوازیں بلند ہونے لگیں تھیں۔ شاہ زیب کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ ماں یاد آ گئی تھی۔ ایک ایک بات جو ہوش کے پہلے دن سے اس دن تک کی تھی۔ جب تک ماں زندہ تھی یاد آئی۔ گن مین ہوشیاری سے کھڑے ہو گئے۔ ان لوگوں کو بھی صورتحال کا اندازہ تھا۔ جہانزیب نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

میں نے اورنگزیب سے کہا تھا کہ تم آؤ گے ماں کی قبر پر ضرور آؤ گے۔ میرے بھائی زیادتی ہم سے ہوئی تھی اور ہماری ہی زیادتی نے آج ہمیں یہ دن دکھا دیا ہے کہ ہم اپنے بھائی سے محروم ہو گئے ہیں۔ تم بھی جذباتی ہو گئے ہمیں تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم اس طرح جذباتی ہو جاؤ گے۔" شاہ زیب نے نگاہیں اٹھا کر بھائی کو دیکھا اور بولا۔

"ماں کی قبر پر یہ باتیں مناسب نہیں ہیں بھائی! ماں کی روح کو دکھ ہوگا۔ ہم تو

یہاں صرف اس کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ کیا فائدہ ان باتوں سے؟''

''ہاں! میں نے تو بس یونہی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ الفاظ کہے تھے۔ شاہ زیب کیا کر ڈالا تم نے۔ کیا کرتے پھر رہے ہو میرے بھائی! ایک طرف پولیس تمہارے پیچھے ہے تو دوسری طرف وہ شیطانی گروہ۔''

''کیا کیا جا سکتا ہے آپ لوگوں نے تو مجھے ہر چیز سے بے دخل کر دیا تھا۔ مجھ سے میرا گھر ہی چھین لیا تھا۔ شکر ہے کہ آپ نے مجھ سے ماں کی یادیں نہیں چھینی۔ بس یہی تو میرا سرمایہ رہ گیا ہے۔'' شاہ زیب نے کہا۔

نہیں۔ ہم نے کچھ نہیں چھینا۔ بس تقدیر نے ہم سے ہمارا بھائی چھین لیا ہے۔ کہاں رہتے ہو تم؟ مگر نہ بتاؤ۔۔۔ بالکل نہ بتاؤ۔ خدانخواستہ اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچ گیا تو یہی سوچو گے کہ اب بھی ہم نے ہی تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک کیا ہے۔ شاہ زیب! گھر چلو گے؟''

''گھر۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔''

''میرا کوئی گھر ہے؟'' شاہ زیب نے سوال کیا اور جہاں زیب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اورنگزیب کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے۔ شاہ زیب ایک لمحے تک غم کا شکار رہا۔ پھر اس نے کہا۔

''ہاں چلوں گا۔۔۔ گھر دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ میرا وہاں کوئی نہیں ہے۔''

''آؤ۔۔۔'' تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس کبیر والا چل پڑے۔ گن مین ایک الگ جیپ پر تھے۔ اورنگزیب اور جہاں زیب دوسری جیپ پر' شاہ زیب نے اپنا گھوڑا نہیں چھوڑا

تھا۔ اس طرح یہ لوگ کبیر والا میں داخل ہوئے۔ دیکھنے والے سب ان کے ہمدرد تھے۔ ان کے شناسا جو پشتوں سے اس حویلی کی آن بان شان دیکھا کرتے تھے۔ شاہ زیب گھوڑے پر سوار ان کے ساتھ حویلی میں داخل ہو گیا۔ پہلی ملنے والی شکیلہ تھی جس نے ان لوگوں کے ساتھ شاہ زیب کو دیکھا تو حیرت سے منہ کھول کر رہ گئی لیکن پھر دوسرے لمحے وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھی اور اس نے شاہ زیب کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

'میرا بیٹا۔۔۔ میرا بھائی' میرا بیٹا۔۔۔'' شکیلہ کے دل میں ایک دم شاہ زیب کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا احساس پیدا ہوا تھا اور اس دن کے بعد سے وہ مسلسل شاہ زیب کے حق میں لڑنے لگی تھی۔ یہاں تک کہ شاہینہ سے بھی اس کی اَن بن ہو گئی تھی اور اب شاہینہ اس سے بات نہیں کرتی تھی۔

بہرحال شاہ زیب کے آنے سے جو ہلچل پیدا ہوئی وہ شاہینہ سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔ اور وہ صورتحال معلوم کرنے کے لیے باہر نکل آئی۔ تب اس نے شاہ زیب کو دیکھا اور ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گئی۔ بہرحال وہ اسے لے کر اندر چلے گئے اور بڑے کمرے میں جا بیٹھے۔ کچھ لمحوں کے بعد شاہینہ بھی آ گئی۔ آتے ہی اس نے شاہ زیب کو دیکھا۔ بہت چالاک عورت تھی۔ جانتی تھی کہ اسے اس وقت کیا کھیل کھیلنا ہے۔ شاہ زیب کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئی۔ اس کے چہرے کے نقوش پتھریلے ہو گئے تھے۔ شاہ زیب خود اپنی جگہ سے اٹھا چند قدم آگے بڑھا اور سر جھکا کر بولا۔

''سلام عرض کرتا ہوں بڑی بھابی!'' شاہینہ نے اسے دیکھا اور پھر بے اختیار ہو کر آگے بڑھی اور شاہ زیب کی پیشانی چومنے لگی۔

''دشمن ہوں میں تیری؟ ڈائن ہوں؟ ماں کی جگہ ہوں تیری' ماں اگر ڈائن بھی ہو تو اپنے بچوں کو نہیں کھاتی۔ میرا بھتیجا مار ڈالا ہے تو نے' میرا بھتیجا مار ڈالا ہے۔ مگر تو مجھے

اپنے بیٹوں کی طرح عزیز ہے۔ شاہ زیب! کہاں چلا گیا تھا۔ کہاں مارا مارا پھر رہا ہے؟ پاگل! بڑے اگر غصے بھی ہوتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے اس کے بعد ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ تو نے ہم سب کو چھوڑ دیا۔''

''بھابی! بیٹھیے۔ ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے آیا تھا۔ واپس آپ کی حویلی میں نہیں آیا ہوں۔ جس سے آپ نے مجھے بے دخل کر دیا تھا۔ آپ خود سوچیے آپ لوگوں نے خود ہی تو مجھ سے حویلی چھوڑ دینے کے لیے کہا تھا۔ کہا تھا نا آپ نے کہ میرا یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔''

''میں کیا کہوں؟ اگر تجھ سے اس موضوع پر بات کروں گی تو تیرے بھائی کہیں گے کہ میں پھر شروع ہو گئی اور غلط باتیں کر رہی ہوں۔ مجھے بتا شاہ زیب کیا ایک چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا تو اپنی بھابی کو نہیں دے سکتا تھا۔ مجھے اپنے بھائیوں کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ اصل بات تیرے علم میں ہے۔ فخر خان نامی زمیندار وہاں بھٹہ نہیں بننے دینا چاہتا تھا۔ شاہ زیب یہ بات تو بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ ہمارے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے اور ایک بھٹہ ہماری بہت بڑی ضرورت نہیں ہے لیکن چوہدریوں کی آن' بان' شان ہی تو ان کی جان ہوتی ہے۔ بات صرف اس علاقے میں بھٹہ بنانے کی تھی اور اسی لیے میرے بھائیوں نے مجبور ہو کر وہ زمین کا ٹکڑا مانگا تھا شاہ زیب! اگر تو دے دیتا اسے تو کیا ہوتا؟ مگر تو نے دشمنی کی بنیاد ڈال دی۔ بس وہیں سے ہی سارا کھیل بگڑ گیا۔''

''دیکھو بھابی! برامت ماننا ماں ایک بڑی چیز ہوتی ہے۔ میں نے اپنی ماں سے وعدہ کیا تھا۔ اگر یہ وعدہ کسی اور سے ہوتا۔ میری آمدنی کا مسئلہ ہوتا تو تم یقین کرو بھیک مانگ لیتا۔ محنت مزدوری کر لیتا لیکن سب کچھ تمہیں دے دیتا۔ تم سے زیادہ کچھ نہیں تھا بھابی! لیکن جب لاہور تعلیم کے لیے جانے کا سلسلہ ہوا تھا اور زرعی یونیورسٹی میں داخلے کی بات ہوئی تھی تو

اس کی بنیاد یہی زمینیں تھیں۔ ایک بار باتیں کرتے ہوئے ماں نے کہا تھا کہ وہ بنجر زمینیں ہمارے کس کام آئیں گی۔ جہاں زیب بھائی نے کہا تھا کہ اماں ان زمینوں کو بیچ دیں۔ بیکار ہماری جان کا عذاب ہیں۔ تو میں نے ماں سے کہا تھا کہ ماں! وہ زمینیں میرے حصے میں آئی ہیں۔ ایک دن میں انہیں اس علاقے کی سب سے زرخیز زمینیں نہ بنا دوں تو میرا نام شاہ زیب نہیں ہے۔ ماں نے بڑی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! میں اگر زندہ بھی نہ رہوں گی تو تو یہ سمجھ لے کہ یہ زمینیں بقول تیرے سونا اگلیں گی تو میں سب سے پہلے انہیں دیکھنے جاؤں گی۔ اگر زندہ نہ رہی تو میری روح ان زمینوں پر بھٹکے گی۔ اس وقت تو سنہری رنگ کی ایک تتلی تلاش کر لینا' جو تیرے تیار کیے ہوئے کھیتوں پر اڑ رہی ہوگی سمجھ رہا ہے وہ تتلی کون ہوگی؟ میں--- جو میں کہہ رہی ہوں اسے یاد رکھنا شاہ زیب! یہ بات کہی ہے میری ماں نے۔'' میں نے عہد کر لیا تھا کہ ان زمینوں کو ایسا ہی زرخیز بناؤں گا بھابی! یہ اب آپ خود سوچو--- جہاں ایک انسان کا یہ مان ہو وہاں کسی کی مداخلت کیسے پسند کی جا سکتی ہے؟ بھابی! وہاں کبھی آگ نہیں جلے گی۔ یہ بات اپنے ذہن میں رکھیے۔ کیونکہ وہاں میری ماں ایک سنہری تتلی کی شکل میں چھوٹے سے درخت پہ بیٹھی اس وقت کا انتظار کر رہی ہوگی۔ جب ان زمینوں سے کونپلیں اگیں اور تناور ہو جائیں۔'' شاہ زیب جذباتی آواز میں کہہ رہا تھا اور اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ دونوں بھائی شدید متاثر تھے۔ شاہینہ نے گردن جھکائی ہوئی تھی اور دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔

''کہ دیکھتا رہ لڑکے میرے بھائی بڑے جنونی ہیں۔ وہ اس پوری زمین کو اگر آتشکدہ نہ بنا دیں تو میرا بھی نام شاہینہ نہیں ہے۔'' لیکن وہ دل کی بات چھپانا جانتی تھی اور چہرے تک سے اپنے دل کی بات عیاں ہونے نہیں دیتی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

''جہانزیب! اب بتاؤ کیا کیا جا سکتا ہے؟ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب شاہ زیب کو

مشکلات سے کیسے بچا سکتے ہیں۔ چلو میں جبار خاں اور الیاس خاں کی خوشامد کر کے ان سے یہ درخواست کروں گی کہ وہ شاہ زیب کو معاف کر دیں حالانکہ تمہیں معلوم ہے جہانزیب کہ الیاس بھائی کی کیا کیفیت ہوگئی ہے۔ ایک گوشے میں بیٹھے دیوار کو تکتے رہتے ہیں۔ اندر کا غم انہیں کھائے جا رہا ہے لیکن پھر بھی میں بھرپور کوشش کروں گی کہ کوئی بات بن جائے لیکن پولیس کا کیا کرو گے؟ بتاؤ --- پولیس سے اس کی جان کیسے بچاؤ گے؟ اس نے تو بہت سے آدمیوں کا خون کر دیا ہے۔ شاہ زیب! اس دوران تو کہاں رہتا رہا ہے۔ کوئی جگہ بنائی ہے کیا تو نے؟''

''ہاں بھابی! میں یہاں سے چلا گیا ہوں اور میں نے لاہور بھی چھوڑ دیا ہے۔ سندھ کے ایک شہر نواب شاہ میں میں نے اپنے لیے ایک گھر خریدا ہے اور وہیں تیاریاں کر رہا ہوں۔''

''تو کیا تو برسی میں شرکت کے لیے نواب شاہ سے آیا ہے؟''

''ہاں بھابی! آپ کو یہ معلوم ہے کہ بھائی الیاس خاں اور جبار خاں چپے چپے میں مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اصل میں نواب شاہ میں میرا ایک دوست ہے سندھ کا رہنے والا ہے۔ اس نے مجھے پناہ دی ہے۔ میں نے ساری صورتحال اسے بتا دی ہے اور اسی نے وہ گھر میرے لیے حاصل کیا ہے ورنہ میرے پاس کوئی رقم وغیرہ نہیں ہے بس دوستی ہے۔ وہ لاہور ہی میں میرے ساتھ پڑھتا تھا۔'' شاہ زیب نے بتایا۔

''کیا نام ہے اس کا؟''

''فقیر محمد ---'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''نہیں --- ہم تجھے اتنے گرم شہر میں نہیں رہنے دیں گے۔ وہاں تو سنا ہے بڑی گرمی پڑتی ہے۔ دودھ کی طرح سفید رنگ ہے تیرا۔ کالا پڑ جائے گا۔''

''میرا تو سارا وجود کالا ہوتا جا رہا ہے بھابی! آپ صرف میرے رنگ کی بات کر رہی ہیں۔ کیا رکھا ہے یہاں میرے لیے۔'' شاہینہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگئی پھر اس نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ ٹھنڈا کر کے کھانا چاہیے۔ میں بھائی الیاس خاں سے بھی بات کروں گی۔ بڑے لمبے ہاتھ ہیں ان کے بڑے اعلیٰ تعلقات ہیں۔ پولیس سے بھی وہی تجھے بچا لیں گے۔ بس ذرا غصہ ٹھنڈا ہو جانے دے۔ یہاں چھپا کر رکھوں گی میں تجھے اور فکر مت کر میں ہوں۔'' شاہینہ کافی دیر تک باتیں کرتی رہی۔ اورنگزیب اور جہانزیب شاہینہ کے رویے پر حیران تھے لیکن شکیلہ کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر تھا۔

بہر حال کچھ بولنا نہیں چاہتی تھی لیکن اپنے سر مصیبت نہیں مول لینا چاہتی تھی لیکن نجانے کیوں اس کے اپنے ذہن میں ایک کریدی تھی۔ شاہینہ کا رویہ اچانک ہی کیسے تبدیل ہو گیا ہے۔ بہر حال وہ خاموش ہی رہی تھی۔ ادھر جہانزیب اور اورنگزیب بھائی سے باتیں کر رہے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ جب تک کوئی بہتر صورتحال پیدا نہ ہو جائے یہاں حویلی میں رہنا مناسب نہیں ہے۔ کوئی ایسا ٹھکانہ تلاش کر لیا جائے جہاں قیام کیا جا سکے۔'' جہانزیب نے کہا۔

''اورنگزیب! ٹوٹی چکی کا علاقہ کیسا رہے گا؟ بڑی اچھی جگہ ہے وہاں یہ چھپ کر رہ سکتا ہے۔ دیکھیں گے شاہینہ اس سلسلے میں الیاس خاں سے بات کر کے کیا کرتی ہے۔ ہم لوگ خود بھی اپنے تعلقات استعمال کریں گے۔ ویسے بڑے سنگین معاملات ہوئے ہیں۔ دستاویزات کے چوری کی رپورٹ بھی اخبارات میں آ چکی ہے اور باقی پولیس کو بھی اس نے بڑا مشتعل کر دیا ہے۔ خیر کوئی نہ کوئی بندوبست کر لیا جائے گا۔''

شاہینہ نے سب کے لیے چائے کا بندوبست کیا تھا چنانچہ ایک بڑے کمرے میں

بیٹھ کر چائے پی گئی۔ شکیلہ چائے نہیں پیتی تھی۔ شاہینہ خود دودھ پیتی تھی لیکن جہانزیب اور اورنگزیب نے شاہ زیب کے ساتھ چائے پی تھی۔ چائے پی لینے کے بعد اورنگزیب نے کہا تھا۔

''آج دن بھر بڑا تھکا رہا ہوں ذہنی طور پر بھی اور ویسے بھی ماں یاد آتی رہی ہے اگر اجازت دو تو سونے جانا چاہتا ہوں۔''

''ہاں جاؤ--- شاہ زیب تم بتاؤ تم کیا کرو گے؟''

''جیسا آپ کا حکم ہو بھائی!''

''آج تو تم یہیں سو جاؤ۔ انشاء اللہ تعالیٰ کچھ نہیں ہوگا سب ٹھیک ہے۔ گن مین ہوشیار ہیں' کوئی گڑبڑ ہوئی تو اطلاع دے دیں گے۔ میں انہیں اور ہدایت دیئے دیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔''

''پھر کل دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے؟ شاہینہ سے مشورہ کریں گے کہ وہ کیا بات کرتی ہے اپنے بھائیوں سے۔ بلکہ ایسا کرو ابھی یہاں آرام سے رکو۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تو دیکھا جائے گا۔ ویسے پولیس یہاں آ چکی ہے اور ان لوگوں کو یہ اندازہ ہو چکا ہے کہ اب تم یہاں واپس نہیں آؤ گے۔ اس لیے وہ ادھر دیکھنے کی کوشش نہیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ابھی یہیں رک جاتا ہوں۔'' جہانزیب اپنی جگہ سے اٹھا۔ خیال یہ تھا کہ وہ گن مینوں کو ہدایت کرے گا لیکن اس کا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ چنانچہ وہ اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لمبا دراز ہو گیا۔ شاہینہ وہاں موجود تھی۔ اس نے شوہر کو دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اورنگزیب کی رہائشگاہ پر پہنچی۔ اورنگزیب کے کمرے میں مدھم روشنی ہو رہی تھی اور وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ شاہینہ وہاں سے آگے بڑھی اور اس کمرے میں پہنچ گئی

جہاں تھوڑی دیر پہلے چائے کا دور چل رہا تھا اور پھر وہ اندر جھانکنے لگی اس نے دیکھا کہ شاہ زیب میز پر سر ٹکائے اوندھا پڑا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور پھر ٹیلی فون پر نمبر ڈائل کئے اور انتظار کرنے لگی۔ تین چار منٹ تک انتظار کرنے کے بعد اس نے کہا۔

''ہاں کون ہے؟''

''میں شاہی بول رہی ہوں۔''

''ہاں شاہی! بہرے ہو کیا سنائی کم دے رہا ہے۔ میری آواز نہیں پہچانتے۔ کبیر والا سے بول رہی ہوں شاہی۔ الیاس خاں یا جبار خاں کو بلاؤ۔ جلدی کرو دیر مت کرو۔'' وہ بولی اور تھوڑی دیر تک انتظار کرتی رہی۔ پھر کہا۔

''ہاں الیاس بھائی! میں ہی ہوں شاہی بول رہی ہوں۔ ہاں خیریت ہے--- میں بالکل ٹھیک ہوں--- نہیں کوئی خطرناک بات نہیں ہے--- اچھا سنو--- تم لوگ ویسے تو آسمانوں کی بات کرتے ہو لیکن عقل سے کوئی نہیں سوچتا--- تمہیں معلوم ہے آج جہانزیب کی ماں کی برسی تھی۔ تم لوگ نجانے کہاں کہاں اس کتے کو تلاش کرتے پھر رہے ہو۔ اصولی طور پر آج تمہیں قبرستان کی ناکہ بندی کرنی چاہیے تھی۔ دونوں بھائی تو وہاں پہنچے ہی تھے اسے بھی وہاں قبرستان آنا تھا۔ آہ--- شاہ زیب--- شاہ زیب--- شاہ زیب' الیاس بھائی انور تمہارا بیٹا تھا اور میں پھوپھی تھی اس کی۔ اور کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی پھوپھی ماں سے زیادہ بھتیجے کو چاہتی ہے۔ میں انہی پھوپھیوں میں سے ایک ہوں۔ انور کے قاتل کو میں مرتے وقت تک معاف نہیں کر سکتی۔ شاہ زیب کا پتہ ہی نہیں بلکہ اس وقت وہ حویلی میں ہے--- سمجھ رہے ہو نا تم--- ہاں ہاں حویلی میں موجود ہے وہ--- قبرستان آیا تھا وہاں سے دونوں بھائی اسے لے کر یہاں آئے ہیں۔ میں نے چالاکی سے اس پر یہ ظاہر کیا ہے کہ

میرے دل میں اب اس کے لیے کوئی غصہ نہیں ہے بلکہ ماں جیسی محبت ہے۔ لیکن اس وقت میں نے کام دکھا دیا ہے۔ تینوں بھائیوں کو میں نے چائے میں بے ہوشی کی دوا دے دی ہے اور تینوں اس وقت بے ہوش پڑے ہوئے ہیں۔ ہوشیاری کے ساتھ آ جاؤ--- نہیں یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے بھائی! کہ تمہیں اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے--- یہ فیصلہ صرف تم کرو گے--- ویسے ایک بات بتا دوں' گن مین ہوشیار ہیں--- آؤ تو پوری تیاریوں کے ساتھ آنا--- ٹھیک ہے--- ''شاہینہ نے ٹیلی فون بند کر دیا اور اس کے بعد وہاں سے واپس پلٹی تو ایک دم پتھرا کر رہ گئی۔ شاہ زیب اس کے سامنے ہی کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔

''میری ماں! میری پیاری ماں جیسی بھابی! کاش تم واقعی مجھ سے محبت کرتی بھابی! اسی طرح جیسے تم نے انور سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔ بڑی حسرت پیدا ہو رہی ہے میرے دل میں کیونکہ اب اس کائنات میں مجھ سے محبت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اطلاع دے دی بھائیوں کو کہ میں یہاں موجود ہوں۔ کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے یہاں تک--- ویسے بھابی تمہیں ایک بات بتاؤں۔ بالکل مانتا ہوں اس بات کو کہ انور سے تم کو محبت تھی لیکن پہلے بھی تمہیں یہ بات بتا چکا ہوں کہ صرف ماں کے پیار نے مجبور کیا تھا ورنہ زمینوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر انصاف سے کام لیں تو آپ خود ہی اس بات کی گواہی دیں گی کہ میں نے باقی جائیداد کے بارے میں کبھی پوچھا تک نہیں کہ اس میں سے کیا مجھے ملا ہے اور کیا نہیں ملا۔ بلکہ آپ لوگوں نے اور خود میرے بھائیوں نے یہ کہہ کر میری ساری جڑیں کاٹ دیں کہ میرے حصے کی رقم میری تعلیم پر خرچ ہو چکی ہے۔ میں نے اس بات پر بھی کوئی احتجاج نہیں کیا بھابی! آپ لوگ میرے لیے اتنے ہی قیمتی تھے کہ میں کہیں کوئی معمولی سی نوکری کر کے بھی اگر آپ کی محبت پا سکتا تو ضرور پانے کی کوشش کرتا۔ لیکن بھابی! آپ نے مجھے اس کا موقع نہیں دیا اور یہ میرے بھائی جو آج مجھے مجرم بنانے کے بعد مجھ سے محبت کا اظہار کر رہے

ہیں۔ انہیں ماں بھی یاد آ رہی ہے پر ساری باتیں اپنی جگہ۔ مجھے مجرم بنانے کے جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ بھابی! آپ جو کچھ کر رہی ہیں اس میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گی۔ اپنے بھائیوں کو اس بات کا یقین دلا دیں کہ وہ کبھی شاہ زیب پر ہاتھ نہیں ڈال سکیں گے۔ بھابی! میں کوشش کر رہا ہوں کہ جرم کی دنیا میں زیادہ دور تک نہ جاؤں۔ لیکن اگر آپ لوگوں کا یہی رویہ رہا تو آپ کو ایک بہت مشکل وقت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بہت ہی مشکل وقت کا سمجھ رہی ہیں نا۔ چلتا ہوں۔ چونکہ وہاں سے فوج چل پڑی ہوگی۔ آپ ذرا میرے ساتھ آئیے۔ ''شاہینہ ایک دم سنبھل گئی اور غراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''کہاں؟''

''آئیے بھابی آپ' کبھی بدتمیزی نہیں کی ہے میں نے آپ سے لیکن مجھے مجبور نہ کریں۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو کہاں لے جانا چاہتے ہو تم مجھے؟''

''بس ذرا ایک دس منٹ کے لیے آئیے۔'' شاہ زیب نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور شاہینہ ایک دم خوفزدہ ہو گئی۔ اس آواز میں جو کچھ تھا اس نے شاہینہ کو احساس دلا دیا تھا کہ کوئی بڑی ہی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے شاہ زیب کے ساتھ ساتھ چل پڑی۔ شاہ زیب کو یوں لگا تھا جیسے ڈرائینگ روم کے دروازے سے کوئی سایہ سا ہٹ گیا ہو۔ اس وقت وہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ شاہینہ کو اس کے ایک خالی کمرے کے باتھ روم میں بند کر دیا اور باتھ روم کا دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔ پھر کمرے کا دروازہ بھی لاک کیا اور اس کے بعد وہاں سے آگے بڑھا۔ اس کے ذہن میں وہ سایہ گردش کر رہا تھا جو دروازے کے پاس سے ہٹ گیا تھا۔ جب وہ وہاں سے آگے بڑھا تو چند قدم کے فاصلے پر اس نے شکیلہ کو کھڑے ہوئے دیکھا اور اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ شکیلہ کے چہرے پر عجیب سے

تاثرات تھے۔

''تم سے اتفاق کرتی ہوں شاہ زیب! قصور واقعی تمہارے بھائیوں کا ہی ہے اور آج یہاں تک پہنچانے والے وہی ہیں۔ وہی اگر عقل سے کام لیتے اور لالچی نہ ہو جاتے تو آج صورتحال یہ نہ ہوتی۔ باقی بات رہی جہاں تک شاہینہ بھابی کی۔ تو میں ان کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گی کیونکہ مجھے اسی دوزخ میں زندگی بسر کرنی ہے۔ بہرحال میں ہمیشہ تمہارے لیے دعائیں کرتی رہوں گی کہ اللہ تمہاری حفاظت کرے۔ بہت برے وقت اور برے حالات کا شکار ہو گئے ہو۔ میں نے سب سن لیا ہے مجھے یہی شبہ بھی تھا کہ شاہینہ بھابی نے کوئی شیطانی چال چلی ہے اور اورنگزیب کو بے ہوش دیکھ کر مجھے اس بات کا یقین ہو گیا۔ لیکن تم مجھے بتاؤ کہ تم بے ہوش کیوں نہیں ہوئے۔'' شاہ زیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

''بھابی! ہر انسان کے ذہن میں ایک اور انسان چھپا ہوتا ہے۔ اصل تربیت اسی چھپے ہوئے انسان کی ہوتی ہے۔ اگر ماحول ان کے لیے برائیاں منتخب کرتا ہے تو وہ برا بن جاتی ہے۔ اچھائیاں منتخب کرتا ہے تو وہ نیک بن جاتا ہے۔ اوپر کا انسان تو صرف ایک خول ہوتا ہے بھابی! ان لوگوں نے اپنے اندر چھپے ہوئے مجرم انسان کو جگایا ہے اور جب کوئی جرم کی دنیا میں آ جاتا ہے تو اسے ذہانت سے کام لینا ہوتا ہے۔ اگر وہ ذہانت سے کام نہ لے تو پھر اس کے لیے مشکل ہو جائے۔ شاہینہ بھابی نے مجھ سے جس محبت اور دل سوزی کا اظہار کیا۔ بس اسی نے مجھے محتاط کر دیا اور میں ایک ایک لمحہ یہی انتظار کرتا رہا کہ دیکھو وہ کب اور کیا وار کرتی ہیں۔ چائے انہوں نے جس چاہت سے بنا کر ہم تینوں بھائیوں کے سامنے رکھی تھی۔ اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ شاہینہ بھابی کی یہ توجہ بلاوجہ نہیں ہے۔ پھر آپ کو لوگوں کا یہ اندازہ نہیں ہو سکا وہ چائے آرام سے میز کے نیچے قالین میں جذب ہو چکی ہوگی۔ باقی یہ میں

جانتا تھا کہ چائے میں زہر نہیں ہوگا کیونکہ وہی چائے جہانزیب بھائی اور اورنگزیب بھائی نے بھی پی ہے۔ شاہینہ بھابی کم از کم انہیں ہلاک کرنے کی کوشش نہیں کریں گی۔ بس یہ تھی ساری صورتحال بھابی! زیادہ دیر نہیں رک سکوں گا۔ آپ میرے بھائیوں کو بتا دیجئے کہ صرف اپنا سامان لے کر جا رہا ہوں۔ یہاں سے کوئی چیز نہیں لے جا رہا اور انہیں اطمینان دلا دیجئے کہ اگر ماں کے حوالے سے ہی سہی ان کے دل میں چاہے چند لمحوں کے لیے میری محبت جاگی ہے میں ان کی محبت کی قدر کرتا ہوں لیکن میرے لیے ماحول مختلف ہو چکا ہے۔ آپ جائیے اور آرام سے سو جائیے اور اس بات کا اظہار بالکل مت کیجئے گا کہ میں اور آپ ان معاملات سے کسی مشکل میں واقف ہو گئے تھے۔ ٹھیک ہے نا بھابی!''

''اللہ تمہاری حفاظت کرے۔'' شکیلہ نے کہا اور آگے بڑھ کر شاہ زیب کی پیشانی چوم لی۔ شاہ زیب وہاں سے بالکل نکل آیا۔ اس نے اپنا گھوڑا کھولا۔ رائفل تو اس نے اپنے ساتھ لے ہی لی تھی اور اس کے بعد حویلی کے دروازے سے باہر نکل کر رات کی تاریکیوں میں گھوڑا دوڑانے لگا۔ ویسے جو کچھ ہوا تھا برا ہوا تھا۔ لیکن اب یہ تمام باتیں اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئیں تھیں۔ دنیا آہستہ آہستہ سمجھ میں آ رہی تھی اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ دنیا ایسی ہی ہے۔ بھائی اس وقت نرم پڑے تھے جب صورتحال اس قدر بگڑ گئی تھی۔

کبیر والا سے بہت دور نکل آیا۔ جنگلوں کے سوا اور کہاں بسیرا کر سکتا تھا۔ آس پاس بہت سے چک اور کوٹ پھیلے ہوئے تھے لیکن شاہ زیب سمجھتا تھا کہ اس کی تقدیر میں بس جنگل ہی رہ گئے ہیں۔ کوئی خاص نظریہ ابھی تک پیدا نہیں ہو سکا تھا۔ سوائے ایک نظریے کہ جب تک سانس ہے زمینوں کی حفاظت کی جائے۔ موت کے بعد تو کچھ بھی نہیں ہوتا لیکن زندگی میں الیاس خاں اور جبار خاں ان زمینوں پر بھٹہ نہیں بنا سکتے۔ جن کے بارے میں ماں سے وعدہ کیا تھا۔ بس یہ ایک جنون تھا جو شاہ زیب کے سر پر سوار تھا۔ رات کو ایک جگہ

منتخب کر کے قیام کے لیے اتر گیا۔ گھوڑے کی خوراک کا بھی بندوبست کرنا تھا۔ اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ دن کی روشنی میں کسی آبادی کے پاس پہنچ کر گھوڑے کے لیے خوراک حاصل کرے گا۔ دوسرے دن صبح اس نے اپنے اس منصوبے پر عمل کیا۔ بستی تو کوئی نظر نہیں آئی تھی لیکن ایک جگہ گھاس کافی موجود تھی اور پانی بھی تھا۔ قدرت بہر طور ہر جاندار کے لیے خود ہی بندوبست کر دیتی ہے۔

یہاں کافی دیر تک ایک درخت کے سائے میں بیٹھا رہا۔ گھوڑا شکم سیر ہو گیا تو اس نے تھوڑی سی گھاس توڑ کر ایک گٹھر سا بنا لیا۔ تا کہ کم از کم گھوڑے کو بھوکا نہ رہنا پڑے۔ وہ خود بھوکا تھا کوئی ناشتہ وغیرہ نہیں کیا تھا اس نے لیکن پچھلے دن کھا پی لیا تھا۔ یہاں سے اسے راستے کا تعین کرنے کا خیال آیا اور پھر وہ زمینوں کی جانب چل پڑا۔ اصل کے پاس پہنچ کر اس نے ایک جھونپڑا ہوٹل سے تلی ہوئی مچھلی خریدی اور وہاں سے ہٹ آیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ اسے غور سے دیکھیں اور اس کے بارے میں کسی کو اطلاع دیں۔ وہ اپنی زمینوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس واردات کے بعد چوہدری الیاس وغیرہ نے وہاں کسی کارروائی کا آغاز کیا یا نہیں۔

پھر اس وقت دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ جب وہ آصل کے پاس پہنچا۔ اسے یوں لگا جیسے زمینیں ماں کی محبت بھری نگاہیں ہوں کیونکہ وہ بھٹہ اسی طرح پڑا ہوا تھا اس کی تعمیر شروع نہیں کی گئی تھی۔ ان لوگوں کا احساس تھا کہ وہاں انور کے ساتھ اور بھی کئی لوگوں کی قربانی دی گئی ہے۔ ابھی خون کا رنگ کالا نہیں پڑا ہے۔ تھوڑا سا انتظار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔
وہ دیر تک گھوڑے پر سوار اپنی جگہ ساکت کھڑا اپنی زمینوں کو دیکھتا رہا۔ چشمہ تصور سے وہ ان زمینوں پر لہلہاتے باغ اور کھیت دیکھ رہا تھا۔ باغ میں پھیلے ہوئے درختوں میں ہر ایک درخت ایک آنکھ تھا اور اس آنکھ سے ماں کی ممتا ٹپک رہی تھی۔ ماں کی روح خوشیوں سے مسکرا رہی تھی اور اس کے کانوں میں آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ اس آواز کو سننے کی کوشش میں مصروف

ہو گیا اور اس وقت چونکا اور اس نے وحشی ہرن کی طرح چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔
کافی فاصلے پر زمین کی تھوڑی سی گہرائیوں میں پولیس کی جیپیں نظر آ رہی تھیں دو جیپیں تھیں جو اس طرح تیزی سے دوڑ رہی تھیں اور انہی سے گولی چلائی گئی تھی۔ شاہ زیب نے ایک لمحے کے لیے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ایک سمت اختیار کر کے اس نے گھوڑے کو ایڑھ لگا دی۔ اس وقت کئی گولیاں اس کے پاس سے گزر گئیں۔ جیپیں چونکہ چل رہی تھی اس لیے وہ لوگ صحیح نشانہ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ یہاں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ قرب وجوار میں کوئی جنگل نہیں تھا۔ ایسے موقعوں پر جنگل بہترین پناہ گاہ ثابت ہوتے ہیں۔ پولیس کی جیپیں الگ الگ ہو گئیں تھیں اور دو سمتوں سے اسے گھیر رہی تھیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ انہوں نے اس پر فائر کھول رکھا تھا اور چونکہ ان کی تعداد کافی تھی اس لیے وہ تابڑ توڑ گولیاں چلا رہے تھے اور بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ فائرنگ کر رہے تھے۔ یہ منصوبہ بندی یوں بھی ہو سکتی تھی کہ یہ جیپیں آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ جاتی اور تب اس پر گولیاں برسائی جاتیں لیکن اس طرح وہ لوگ نقصان اٹھا سکتے تھے کیونکہ جیپوں کی آواز بہر حال سن لی جاتی۔ یہ سب کچھ تھا لیکن گھوڑا چھلانگیں لگا رہا تھا۔ جگہ جگہ چٹانیں راستے میں رکاوٹ تھیں اور آخر نقصان ہو ہی گیا۔ گھوڑے کو ایک زوردار ٹھوکر لگی تھی اور وہ قلابازی کھا گیا تھا۔ اس وقت شاہ زیب کو اپنے آپ کو سنبھالنا بڑا ہی مشکل ہو گیا۔ وہ دس بارہ فٹ اونچا اچھل کر نیچے زمین پر گرا تھا اور جو سب سے بڑا نقصان ہوا تھا وہ یہ تھا کہ رائفل کچھ اس طرح زمین پر گری تھی کہ وہ ٹوٹ گئی۔ شاہ زیب نہتا ہو گیا تھا۔ گھوڑا تو قلابازیاں کھا کر شدید زخمی ہو گیا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو کئی گولیاں اس کے بدن کو لگیں اور گھوڑا وہیں ہلاک ہو گیا۔ شاہ زیب نے ٹوٹی ہوئی رائفل کو غم آلود نگاہوں سے دیکھا۔ ایک اچھا ساتھی ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ چاہے وہ گھوڑا تھا یا رائفل۔

بہر حال یہ ایک غم ناک پہلو تھا۔ ادھر پولیس بدستور اس طرف چلی آ رہی تھی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ شاہ زیب دوڑنا شروع کر دے۔ کافی چوٹیں لگیں تھیں لیکن شکر تھا کہ جسم کا کوئی حصہ ٹوٹا نہیں تھا۔ اس نے ایک چٹان پر سے چھلانگ لگائی اور جیسے ہی چٹان پر سے بلند ہوا۔ گولیاں کی باڑ اس پر پڑی اور اس بار شاہ زیب کو اپنی بغل کے نیچے پسلیوں کے پاس ایک انگارہ سا دہکتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ ایک کراہ کے ساتھ چٹان کے دوسری جانب گرا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ پشت میں گولی لگی ہے۔ جو سینے کے پاس سے نکل گئی ہے۔ ٹھنڈا ٹھنڈا سا لگا تھا اسے ایک لمحے کے لیے اور پھر شدت کی تکلیف یہ انتہائی کرب کا عالم تھا لیکن وہ دوڑتا رہا۔ خون کس رفتار سے بہہ رہا تھا۔ اسے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ چھلانگیں لگاتا رہا اور پھر دفعتاً ہی ایک بڑی چٹان راستے میں آئی تو وہ اس کے عقب میں پہنچ گیا۔ چٹان کے پاس ایک ایسی جگہ موجود تھی جس سے اسے پناہ مل سکتی تھی۔ اور گولیوں سے بچا جا سکتا تھا۔ لیکن ممکن نہیں تھا چونکہ خون کے دھبے اس چٹان تک آئے تھے اور یقینی طور پر اب اسے کچھ دیر بعد پولیس اس چٹان تک پہنچ جائے گی اور خون کے دھبوں کے نشانات پر اسے اندازہ ہو جائے گا۔

دفعتاً ہی اس کے کانوں میں کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ پولیس شاید اپنے ساتھ کتے بھی لائی تھی۔ دو جیپیں تھیں کتوں کے بارے میں اندازہ تو نہیں ہو سکا تھا۔ یہ آواز تو پہلی بار ہی سنائی دی تھی۔ چٹان پر جیسے وہ گرا تھا اس سے اس کے سر میں بھی چوٹ لگی تھی۔ اگر بہت زیادہ ہوش و حواس کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ اتنی دور تک نہ دوڑ لیتا تو اصولی طور پر اسے وہیں گر کر بے ہوش ہو جانا چاہیے تھا۔ اب خون بھی کافی بہہ چکا تھا۔ چنانچہ اسے چکر آنے لگے تھے۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی چھاتی جا رہی تھی اور اس تاریکی میں اسے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں تیز سنائی دے رہی تھیں۔ پھر اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا تھا۔ بے

ہوشی کے یہ لمحات نجانے کتنے طویل تھے۔ اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا۔ ہوش آیا تو سب سے پہلا احساس بھوک کا تھا ایسی شدید بھوک لگ رہی تھی کہ متلی سی آ رہی تھی۔ پھر اس نے ایک کراہ کے ساتھ کروٹ بدلی اور آنکھیں کھول کر ماحول کو دیکھا لیکن اسی وقت ایک نرم ہاتھ اس کے سینے پر آ ٹکا۔

''نہیں ہلو نہیں، زخموں کے منہ کھل جائیں گے ہلو نہیں پلیز۔'' وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ ہاتھ کا دباؤ جس قدر نرم اور لطیف تھا آواز بھی اسی لطافت کی حامل تھی۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر اس آواز کی سمت دیکھا تو ایک خوبصورت سی لڑکی اسے نظر آئی۔ سادہ سے لباس میں ملبوس وہ ہمدردی سے اس کے سینے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی۔ شاہ زیب اسے دیکھتا رہا۔ لڑکی کی آنکھوں میں شاہ زیب کے لیے ہمدردی کے آثار تھے۔ کچھ لمحے تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد شاہ زیب نے کہا۔

''پانی۔ پانی مل سکے گا مجھے؟''

''ہاں، ہوں کیوں نہیں۔'' وہ بولی اور اس نے جلدی سے شاہ زیب کے بدن پر سے ہاتھ ہٹایا پھر اس نے تھوڑے فاصلے پر رکھا ہوا پانی کا جگ اٹھا کر گلاس میں پانی انڈیلا اور شاہ زیب کے قریب آ گئی۔ پھر اس نے انتہائی نرم اور ہمدردی کے ساتھ شاہ زیب کو سہارا دیا اور اس کا گداز بدن شاہ زیب کے بدن سے مس ہو گیا لیکن لڑکی کو اس کی پروا نہیں تھی۔ اس نے شاہ زیب کو پانی پلایا۔ دو گھونٹ ہی پینے کے بعد شاہ زیب کی طبیعت اور خراب ہونے لگی۔ تو وہ بولا۔

''بس۔۔۔'' لڑکی نے اسے واپس لٹایا اور گلاس ایک طرف رکھ دیا۔ شاہ زیب اسے دیکھ کر مسکراتا ہوا بولا۔

''میں نہیں جانتا تم کون ہو۔ یہ بھی نہیں جانتا کہ میری ہمدرد ہو یا دشمن لیکن پھر بھی

اگر انسان اپنی کمزوریوں کو محسوس کرتا ہو تو کسی کی ذرا سی ہمدردی پا کر سب کچھ کہہ دینے پر تل جاتا ہے۔ میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے شدید بھوک لگ رہی ہے۔ میں پانی کا پورا گلاس پی جاتا لیکن پانی جیسے ہی میں نے اپنے ہونٹوں سے لگایا مجھے متلی ہونے لگی۔ کچھ کھانے کو مل سکتا ہے۔''

''ہاں ہاں۔ بالکل ڈاکٹر صاحب نے کہہ دیا ہے کہ جیسے ہی آپ ہوش میں آئیں۔ آپ کو کھانے کو دیا جائے۔ سینڈوچ رکھے ہوئے ہیں۔ آپ تو شاید ہاتھ نہ ہلا سکیں میں کھلاتی ہوں۔''

''ارے نہیں، نہیں، بالکل نہیں۔ آپ مجھے اس قدر مریض نہ بنایئے میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' شاہ زیب نے کہا اور بازوؤں پر زور دے کر تھوڑا سا کھسکا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لڑکی کے حلق سے ایک ہلکی سی آواز نکلی تھی۔ وہ جھک کر شاہ زیب کے زخموں کو دیکھنے لگی۔ تب شاہ زیب کو احساس ہوا کہ اس کے اوپر جسم پر قمیض نہیں ہے۔ ایک ہلکی سی جھجک محسوس ہوئی تھی۔ لیکن مجبوری تھی قمیض کسی نہ کسی نے تو اتاری ہوگی۔ لڑکی نے اس دوران سینڈوچز کی پلیٹ اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دی تھی۔

''کافی لاتی ہوں۔''

''نہیں آپ کہاں کافی بنانے کے لیے جاتی پھریں گی۔ تھوڑا سا پانی لے لوں گا۔''

''نہیں کافی تیار ہے جگ میں رکھی ہوئی ہے۔''

''تب پھر ٹھیک ہے۔'' شاہ زیب نے کہا اور پھر لڑکی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ شاہ زیب شدید بھوک سے متاثر ہو کر یہ سینڈوچ کھانے لگا۔ جو انتہائی لذیذ تھے۔ اس کے نتھنوں میں کافی کی خوشبو بھی آئی تھی۔ سینڈوچز کے ساتھ کافی مزہ دے گئی۔ اب یہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ لڑکی کیا ہے؟ اس کے بارے میں تو پیٹ بھرنے کے بعد ہی معلومات حاصل کی جا سکتی

تھی۔ بنیادی چیز بھوک کا مسئلہ تھا جو سینڈوچز کی پوری پلیٹ کھانے کے بعد کافی حد تک حل ہو گیا تھا۔ پھر کافی نے باقی کسر پوری کر دی اور شاہ زیب کو یوں لگا جیسے دنیا اتنی بری جگہ نہیں ہے جتنی وہ سمجھ رہا ہے۔ نجانے کتنے وقت کا بھوکا تھا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر اس نے آنکھیں بھینچ کر زور سے گردن جھٹکی اور تب پہلی بار اسے اپنے زخموں میں تکلیف کا احساس ہوا۔ خاص طور سے پسلیوں کے نیچے جو زخم تھا وہ خاصا تکلیف دے رہا تھا۔ شاہ زیب لڑکی کی طرف دیکھنے لگا پھر بولا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''نائلہ۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''اب میں یہ پوچھوں گا نائلہ کہ میں کہاں ہوں؟ اصل میں یہ بتاتے ہوئے مجھے جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ پولیس مجھ پر فائرنگ کر رہی تھی اور میں بھاگ رہا تھا۔ پھر میں زخمی ہو گیا تھا اور اس کے بعد مجھے کتوں کی آواز سنائی دی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے کتے بھونکتے ہوئے میرے قریب آ رہے ہوں بس اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔ وہ کون تھا جو مجھے وہاں سے اٹھا کر لایا؟''

''وہ ہم تھے۔'' ایک بھاری مردانہ آواز بائیں طرف سے سنائی دی اور شاہ زیب کی نگاہیں اس طرف گھوم گئیں۔ لمبے قد کا ایک نوکیلی مونچھوں والا آدمی اندر آ رہا تھا۔ بال گھنگھریالے تھے۔ کانوں میں کوکے پہنے ہوئے تھے۔ چہرے سے عجیب سا لگتا تھا۔ لباس بھی ذرا گھٹیا قسم کا ہی تھا لیکن ہاتھوں میں قیمتی انگوٹھیاں پہنے ہوئے تھا۔ بہر حال وہ اندر آ گیا اور ایک کرسی گھسیٹ کر شاہ زیب کے پاس بیٹھ گیا۔

''وہ ہم تھے --- اور وہ کتے ہمارے شکاری کرتے تھے۔ پولیس تمہارے پیچھے لگی ہوئی وہاں تک پہنچی جہاں چٹان کے پاس سے اسے تمہارا خون ملا تھا لیکن اس دوران ہم

تمہیں وہاں سے اٹھالائے اور اپنی اس حویلی میں لے آئے۔ یہاں پولیس نہیں آتی۔ سنا تھا دس بارہ سال پہلے جب ہم یہاں پاکستان میں نہیں تھے بلکہ ملک سے باہر تھے۔ پولیس ایک بار یہاں داخل ہوئی تھی لیکن واپس نہیں گئی تھی اور پھر اس کا روزنامچہ دو گھنٹے کے اندر اندر غائب ہوگیا تھا تاکہ یہ نہ پتہ چلے کہ پولیس نے کہاں ریٹ کیا ہے۔

البتہ پولیس جن گاڑیوں میں آئی تھی وہ یہاں سے کئی سو میل کے فاصلے پر ایک جوہڑ میں ڈوب گئیں تھیں۔ اس طرح یہ کھیل ختم۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ ہم اس وقت یہاں نہیں تھے۔ ہمارے بڑے تھے لیکن بڑے ہوں یا چھوٹے جو کرنے کے کام کرتے ہیں سبھی کرلیا کرتے ہیں۔ سمجھ گئے ہوں گے نا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں پولیس نہیں آتی۔'' شاہ زیب متاثر نگاہوں سے اس شخصیت کو دیکھ رہا تھا۔ جو دوسری بڑی شخصیت تھی جو اس کی نگاہوں میں آئی تھی۔ اس نے گردن خم کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کا بے حد شکر گزار ہوں سر جی! میں پولیس واقعی مجھے ہلاک کردیتی۔ بس میرا اور اس کا ایسا ہی چکر چل رہا ہے۔ ویسے سر جی آپ میرے محسن ہیں۔ واقعی آپ نے میری جان بچا کر ایک عظیم کام سر انجام دیا ہے۔ نام معلوم کرسکتا ہوں اپنے محسن کا' میرا نام شاہ زیب ہے۔''

''اور میرا نام فخر خان ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

شاہ زیب کے کانوں میں ایک جھنجھناہٹ سی پیدا ہوگئی تھی۔ فخر خان--- فخر خان---- فخر خان--- یہ نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ فخر خان وہی آدمی تھا جس نے الیاس خاں اور جبار خاں کو اپنی زمینوں کے پاس بھٹہ بنانے کی اجازت نہیں دی تھی اور وہ زمینیں اسے خریدنے نہیں دی تھیں۔ جہاں وہ بھٹہ بنانا چاہتے تھے۔ تب اس کے بعد الیاس خاں اور جبار خاں نے شاہ زیب کی زمینیں حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیونکہ وہ فخر خان کو

نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ یہ شخص جس حلیے اور جس شکل وصورت کا مالک تھا۔ اسی سے صاف اندازہ ہوجاتا تھا کہ کافی خطرناک شخصیت ہے اور اس وقت شاہ زیب اسی کے پاس ہے۔ فخر خان مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

''جو کچھ تم سوچ رہے ہو ہمارے ذہن میں ہے بچے! اگر طبیعت ٹھیک ہے اور ہمت ہے تو ہم سے کھل کر بات چیت کرو یا اگر ابھی آرام کرنا چاہتے ہو تو ہم تمہیں تکلیف نہیں دیں گے۔ بلکہ یہی زیادہ بہتر ہے۔ جس وقت ڈاکٹر یہ بتادے گا کہ تمہارے زخم سوکھ گئے ہیں۔ بس اس کے بعد تم سے ملاقات ہوگی۔'' وہ خود ہی فیصلہ کرکے باہر نکل گیا اور شاہ زیب کے جسم میں ٹھنڈی ٹھنڈی لہریں دوڑنے لگیں۔ تو یہ ہے فخر خان۔ واقعی چیز تو معلوم ہوتا ہے۔ چہرے سے یہی لگتا ہے جیسے کوئی کمینہ فطرت انسان ہے۔ حالانکہ بڑی حیثیت کا مالک ہے لیکن ہوتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔

بہر حال اس کا علاج ہونے لگا۔ اسی دن دوپہر کو ڈاکٹر اسے ملا تھا۔ نوجوان اور خوبصورت سی شکل کا مالک تھا۔ اس کے ساتھ ایک نرس بھی تھی۔ نائلہ سے اس نے شاہ زیب کی کیفیت پوچھی تو نائلہ شاہ زیب کی پوری تفصیل اسے بتانے لگی۔

''زخم کافی ہیں خون بھی بہت بہہ چکا ہے' اگر مکمل نگہداشت نہیں کی گئی تو زخم خراب ہونے کا خطرہ ہے۔ کیونکہ اس وقت قوت مدافعت بہت کم ہے۔ سخت احتیاط کرنا ہوگی۔''

''جی ڈاکٹر صاحب!'' نائلہ نے اس طرح کہا جیسے وہ شاہ زیب کی بہت ہی قریبی رشتے دار ہو۔ اس کے کہنے کے انداز سے شاہ زیب کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی ہے۔ ڈاکٹر اسے ہدایات دیتا رہا۔ شاہ زیب کو بھی اس نے کچھ ہدایات دیں۔

''آپ بدن کو بالکل جنبش نہیں دیں گے۔ خود اٹھنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ بلکہ سہارا لے کر اٹھیں گے۔ ابھی ان زخموں کو ذرا مکمل طور پر جڑنے دیجئے۔ اس کے بعد آپ

ہنگاموں کے لیے تیار ہوں گے۔'' شاہ زیب پھیکی سی ہنسی کے بعد خاموش ہو گیا۔

بہرحال وہ لوگ بڑی ہمدردی کے ساتھ پیش آ رہے تھے۔ نائلہ کے سلسلے میں تو واقعی ایسا لگتا تھا جیسے وہ شاہ زیب کی کوئی قریبی ہی رشتے دار ہو۔ شاہ زیب نے اس سے یہ سوال کر بھی ڈالا۔

''نائلہ! آپ کو مس کہوں میں؟''

''میری شادی نہیں ہوئی۔'' نائلہ نے جواب دیا۔

''آپ کے عزیز و اقارب تو ہوں گے؟''

''ہاں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''ماں باپ؟''

''نہیں۔''

''بہن بھائی؟''

''ہاں۔''

''اس ہاں اور نہیں کے علاوہ کچھ بھی نہیں بولیں گی آپ اس بارے میں؟''

''نہیں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا اور شاہ زیب چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

''ہاں۔'' نائلہ نے کہا اور خود بخود مسکرا دی۔

''یہ وجہ میں پوچھ سکتا ہوں؟''

''نہیں۔''

''کمال ہے یا تو میرے سوالات اتنے مکمل ہیں کہ آپ اس کا صرف ہاں یا نہیں میں جواب دے سکتی ہیں یا پھر ہم اسے اتفاق کہہ سکتے ہیں۔''

''دیکھئے کسی کے بارے میں ضرورت سے زیادہ جاننے کی کوشش بھی تو اچھی نہیں ہوتی۔ آپ میرے بارے میں مجھ سے کچھ نہ پوچھے۔ باقی جو آپ پوچھیں گے وہ بتا دوں گی۔''

''وعدہ کرتی ہیں؟'' شاہ زیب نے کہا۔

''ہاں۔'' اس نے کہا اور اس بار وہ کھل کر ہنسی۔

''تو پھر مجھے فخر خان صاحب کے بارے میں بتایئے۔'' شاہ زیب نے کہا اور نائلہ کا چہرہ ایک دم اتر گیا۔ وہ پریشان نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھنے لگی پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور اس کے کان کے پاس منہ کر کے بولی۔

''دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔''

''گویا آپ مجھے یہ بتانا چاہتی ہیں کہ میں دیوار ہوں۔''

''نہیں، پلیز میری بات کو سمجھیں۔''

''ٹھیک ہے بابا ٹھیک ہے۔'' شاہ زیب نے کہا اور اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔

نائلہ اس کی مسلسل تیمارداری کر رہی تھی۔ کھانا پینا' اس کا چہرہ دھلانا' یہاں تک کہ وہ اس کا لباس تک تبدیل کرا دیتی تھی۔ لیکن بس اخلاقی حدوں کے ساتھ۔ دوسرے دن دوپہر کا وقت تھا شاہ زیب اب تک ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کرتا رہا تھا لیکن اپنی کیفیت کا خود جائزہ لے کر وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ ڈاکٹر کچھ زیادہ ہی احتیاط کرا رہا ہے اسے۔ ورنہ اس احتیاط کی اسے ضرورت نہیں تھی۔ نوجوان جسم تھا۔ جوان خون تھا بہت تیزی سے اس نے اپنی تمام قوتیں واپس حاصل کر لی تھیں ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر کی تھیوری میں ایسا نہ ہو۔

''لیکن بہرحال شاہ زیب خود بھی سمجھ دار آدمی تھا۔ صورتحال کا اس نے اندازہ لگا لیا تھا۔ پھر اس وقت زخموں سے چور تھا۔ جب فخر خان اسے اٹھا لایا تھا۔ پولیس نے تو واقعی

اسے چاروں طرف سے گھیر ہی لیا تھا۔ اب یہ پتا نہیں کہ فخر خان نے کیا چال چلی۔ ویسے پولیس کے بارے میں یہ جو کچھ کہا گیا تھا اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ پولیس جان بوجھ کر اسے نظر انداز کر گئی ہو یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فخر خان کی زمینوں میں داخل ہونے کی پولیس نے جرات نہ کی ہو۔ زمانہ ہی ان لوگوں کا ہے۔ کوئی کیا کر سکتا ہے۔

بہت دیر تک وہ ان تمام باتوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے بعد اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ باہر سے بند تھا۔ البتہ تین کھڑکیاں اس کمرے میں تھیں۔ دو تو ایسی جگہ کھلتی تھیں جہاں دیواریں تھیں لیکن ایک کھڑکی سامنے والے لان پر کھلتی تھی۔ یہ شاید حویلی کا پچھلا لان تھا۔ یہاں عجیب سی جگہیں بنی ہوئی تھیں۔ جن کے بارے میں شاہ زیب صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔

لیکن دوسرے دن صبح اس نے باہر کچھ شور شرابے کی آواز سنی۔ نائلہ بھی اس وقت یہاں موجود نہیں تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا۔ جو عقبی لان کی جانب کھلتی تھی۔ تب اس نے سامنے کی سمت دیکھا۔ ایک آدمی کو جو ایک جوان اور اچھی شکل و صورت کا آدمی تھا۔ اسے لکڑی کی ٹکٹکی سے باندھا جا رہا تھا۔ شاہ زیب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے غور سے اس آدمی کو دیکھنے کی کوشش کی اس جوان اور خوبصورت آدمی نے نجانے کیا کیا تھا۔ جو اسے سزا دی جا رہی تھی۔ آٹھ دس آدمی وہاں موجود تھے۔ پھر اس آدمی کا اوپری لباس اتار دیا گیا۔ صرف نچلے بدن کا لباس باقی تھا اور پھر اس نے فخر خان کو دیکھا۔ جو شیطان جیسی شکل کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں چمڑے کی ایک بیلٹ پکڑی ہوئی تھی۔ یہ بیلٹ لے کر وہ ٹکٹکی پر بندھے ہوئے آدمی کے سامنے پہنچ گیا اور اس کے بعد اس نے اس آدمی کو بیلٹ سے مارنا شروع کر دیا۔ بندھے ہوئے آدمی نے

ہونٹ بھینچ لیے تھے اور شاہ زیب اس کے چہرے پر ایک عزم کے آثار دیکھ رہا تھا۔ فخر خان کی آواز ابھر رہی تھی۔

''چیخ کتے چیخ، گڑگڑا، گڑگڑا کر ہم سے معافی مانگ۔ اپنی غلطیوں کی معافی مانگ ہم سے۔'' فخر خان اسے پوری قوت سے مار رہا تھا اور جگہ جگہ سے اس کے بدن کی کھال اڑ گئی تھی۔ خون رسنے لگا تھا اور شاہ زیب کے پورے بدن میں تھرتھری پیدا ہو گئی تھی۔ فخر خان ان زخموں پر اسے مار رہا تھا لیکن نوجوان ایک بار بھی نہیں چیخا تھا۔ فخر خان مسلسل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

''چیخ کتے چیخ۔ میں کہتا ہوں چیخ۔'' لیکن وہ ایک بار بھی نہیں چیخا تھا۔ پھر اس کی گردن سینے پر لٹک گئی۔ فخر خان البتہ ہانپنے لگا تھا۔ ایک لمبے تڑنگے جسم والا آدمی جو صورت سے ہی بھیانک معلوم ہوتا تھا۔ اس کا قد کسی بھی طرح سات فٹ سے کم نہیں تھا۔ ہاتھ پاؤں اس مناسبت سے لمبے چوڑے تھے۔ آگے بڑھا اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پانی کا جگ بے ہوش نوجوان کے چہرے پر انڈیل دیا لیکن اس کے بدن میں جنبش نہیں ہوئی تھی۔ تب اس کی بھاری آواز ابھری۔

''بے ہوش ہو گیا ہے سرجی!''

''ہوں کوئی بات نہیں یہ تو صبح دوپہر شام کا کھیل ہے کیا سمجھے۔'' اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور پھر وہاں سے واپسی کے لیے پلٹ گیا۔

شاہ زیب کو احساس ہو رہا تھا کہ یہ جگہ اتنی آرام دہ نہیں ہے جتنی یہ محسوس کر رہا ہے۔ یہ فخر خان اسے اٹھا کر لایا ہے اور جو الفاظ وہ کہہ کر گیا ہے یقیناً اس کا کوئی نہ کوئی پس منظر بھی ہوگا۔ شاہ زیب آسانی سے یہاں سے نکل نہیں سکتا۔ اب اسے اپنی پالیسی مرتب کرنی تھی۔ الیاس خاں اور جبار خاں کو ایک بار پھر چکما دیا گیا تھا۔ وہ پھر تلملا کر چڑ گئے ہوں گے۔

جہاں تک بھائیوں کا سوال ہے انہیں کوئی نقصان پہنچنے کا خطرہ نہیں تھا کیونکہ بہرحال الیاس خاں کی بہن جہانزیب کے گھر میں تھی اور جہانزیب ان دونوں کا بہنوئی تھا اور پھر رہا شاہینہ وغیرہ کا معاملہ وہ بھی پاؤں پیٹ کر خاموش ہو جائے گی لیکن فخر خان کا مسئلہ بڑا مختلف تھا۔ بات اصل میں ان زمینوں کی تھی اور شاہ زیب کو کم از کم یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ ان دونوں نے دوبارہ اس بھٹے کی تعمیر نہیں شروع کرائی ہے۔ اب جب ایسا ہوگا تو دیکھا جائے گا۔ جب تک اس کے زخم بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ پھر دوپہر کو فخر خان شاہ زیب کے پاس آیا۔ اس وقت نائلہ اس کے پاس موجود تھی۔ نائلہ ادب سے کھڑی ہو گئی۔ فخر خان کسی پر توجہ دیئے بغیر شاہ زیب کے پاس آ بیٹھا۔

''ہاں جوان! تو جانتا ہے مجھے تیرے صحت مند ہونے کی فکر کیوں ہے؟ اس لیے کہ تجھے میرا ایک کام کرنا ہے۔ میں تجھے تیرے بارے میں بتاؤں۔ ساری تفصیلات معلوم ہیں مجھے تیرے بارے میں۔ اچھے شریف لوگوں سے تعلق ہے تیرا۔ تیرے دونوں بھائی جہانزیب اور اورنگزیب میرے علم میں ہیں۔ کسی کا راستہ نہیں روکتے۔ سیدھی سادی زندگی گزارتے ہیں لیکن جس نے بھی غلطی کی ہے اس نے الیاس خاں اور جبار خاں کے گھر تیرے بھائی کا رشتہ کر کے کی ہے۔ ارے وہ تو انٹرنیشنل کمینے ہیں، چھچھورے دو کوڑی کے۔ زمانہ بھر میں رسوا اور بدنام۔ ایسے لوگوں کے گھر رشتہ کیوں لے کر گئے تھے تیرے بابا جان۔ خیر ہمیں اس سے کیا لینا تو نے واقعی کھیل دکھایا ہے۔ ایسے جیالے مجھے پسند ہیں۔ ناک میں نکیل ڈال دی ہے تو نے الیاس خاں اور جبار خاں کے۔ بھٹہ بنا رہے تھے وہ لوگ ہمارے بھٹوں کے پار۔ ارے جوتے کی نوک پر مارتے ہیں لیکن بات وہی آن بان شان کی ہے۔ انہوں نے اس انداز میں کام شروع کیا تھا کہ ہمیں اپنی بے عزتی محسوس ہوئی اور ہم نے ان کے راستے کاٹ دیئے لیکن ابھی گنجائش ہے۔ گنجائش ہے۔ تم نے صبح کا کھیل نہیں دیکھا ہمارا۔

ہم اپنے دوستوں کے ساتھ دوستی دشمنوں کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں اور جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ اس طرح کرتے ہیں کہ خود ان کی روح خوش ہو جائے۔ صبح کو یہاں پچھلے میدان میں ایک بندے کی مرمت کی جا رہی تھی۔ اس کی کہانی سنائیں تجھے، سنے گا۔''

''جی سرجی۔۔۔ چیخ پکار کی آوازیں تو ادھر بھی آ رہی تھیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے مجھے ہدایت کی ہے کہ اس وقت تک بستر سے جنبش نہ کروں جب تک کہ وہ مجھے اجازت نہ دے دیں۔''

''ہاں ہاں۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ ڈاکٹروں کی باتیں ماننی ہی پڑتی ہیں۔ وہ جس کی صبح پٹائی ہو رہی تھی۔ اس کا نام تاجہ ہے۔۔۔ تاجہ۔'' شاہ زیب پوری توجہ اور دلچسپی کے ساتھ ادھر دیکھنے لگا۔ نجانے کیوں فخر خان تاجہ کے بارے میں بتانے پر تل گیا تھا۔ پرخیال انداز میں بولا۔

''نوکر تھا سالا۔ ہمارے ٹکڑوں پر پلتا تھا۔ کام دے رکھا تھا ہم نے اسے ایک چکر میں پھنس گیا۔ ہم نے اس سے کہا کہ حرامی تو ہمارا پلا ہے۔ اگر کوئی مشکل تھی تو ہم سے کہتا۔ اوپر ہی اوپر کیوں اپنا چکر چلاتا رہا۔ بعد میں پتہ چلا کہ کسی نے اسے پیسے دے کر ہمارے خلاف کام پر آمادہ کیا تھا۔ نمک حرامی کر رہا تھا ہم سے اور سارا کھیل یہی تھا۔ لمبی چال چل رہا تھا اور وہ بھی ہمارے ساتھ، ہم جو شطرنج کے کھلاڑی ہیں اور شطرنج کے سارے مہرے صرف ہمارے اشاروں پر گردش کرتے ہیں۔ یہ کتیا کا پلا ہمارے خلاف ہمارے دشمن کی سازش کا شکار ہو رہا تھا۔ اور جانتے ہو دشمن کون تھا۔ وہی دونوں کتیا کے جنے الیاس خاں اور جبار خاں وہ خیر ذرا دور کی چیز تھے اور ہم ان کے بارے میں کچھ اور سوچ رہے تھے لیکن دکھ ہمیں اس بات کا ہوا کہ اس نے ہمارے لیے یہ سب کچھ کیا۔ تھانے بھجوا دیا ہم نے اسے مقدمہ چلا اور سزا ہو گئی۔ ارے کمینے! ہماری حویلی میں پیدا ہوا۔ ماں باپ پلے کو چھوڑ کر مر گئے۔

یہیں پرورش پائی اور مل گیا دوسروں کے ساتھ۔ اب اس کے بعد بتاؤ کیسے چھوڑ دیتے اسے۔ مقدمہ چلا عدالت میں کہنے لگا کہ ہمیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ ہمارا دشمن نہیں تھا' نہ ہمارے دشمنوں کا آلہ کار بنا۔ لیکن ہمیں معلوم تھا کہ ایسا ہے۔ عدالت نے اسے سزا سنائی تو جوتا اتار کر ہمارے منہ پر دے مارا۔ ہمارے منہ پر جوتا مارا اس حرامی نے۔ کہاں تک برداشت کرتے ہم نے بھی سوچا کہ بیٹے! تھوڑا سا وقت گزر جانے دو اور پھر چودہ دن گزر گئے۔ اس نے جو جوتا پھینک کر ہمارے منہ پر مارا تھا۔ وہ بڑی اذیت دے رہا تھا ہمیں۔ انتظار کرتے تو سینہ سلگ کر راکھ ہو جاتا۔ دو بندے جیل بھجوائے۔ جیل توڑنے کے ماہر تھے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔ دونوں نے اس سے دوستی کی۔ اسے بہلایا پھسلایا اور پھر جیل توڑ دی گئی۔ سمجھے جیل توڑ دی گئی۔ تو بھاگ نکلے اور اطمینان سے اس حرامی کو لے کر ہمارے پاس آ گئے۔ اب اس وقت تک اس پر مار پڑتی رہے گی جب تک کہ مر نہیں جائے گا۔ ابھی تو زخموں کا آغاز ہوا ہے۔ آگے آنے والے وقت میں دیکھنا کہ ہم اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ شاہ زیب خاموشی سے فخر خان کی صورت دیکھتا رہا اور پھر اس نے مدہم لہجے میں کہا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں خان صاحب! ایک وفادار کتے کو مالک کے ساتھ غداری نہیں کرنی چاہیے۔'' فخر خان کسی اور ہی سوچ میں تھا۔ بہت ہی عجیب قسم کا آدمی تھا۔ وہاں سے چلا گیا لیکن شاہ زیب کے ذہن پر تاجے' تاجے' تاجو کا خیال مسلط ہو کر رہ گیا تھا۔ نائلہ اب اس کی اچھی خاصی دوست بن گئی تھی۔ اس نے نائلہ سے کہا۔

''نائلہ! میں نے کھڑکی سے ایک منظر دیکھا تھا ایک آدمی کو مارا جا رہا تھا۔''

''تاجو ہے اس کا نام بہت اچھا لڑکا ہے۔ بہت ہی اچھا لڑکا ہے۔ خان جی کو اس سے بلاوجہ کی دشمنی ہو گئی۔ خان جی کے اندر یہی بہت بڑی خرابی ہے کہ اگر کوئی بات ان کے ذہن میں جڑ پکڑ جائے تو اس کی نفی اصلی شکل میں بھی پیش کر دو وہ نہیں مانتے۔''

''ویسے نائلہ برا مت ماننا۔ یہ تمہارا خان جی ہے کیا چیز؟ شکل و صورت سے تو یہ ایک گھٹیا درجے کا انسان معلوم ہوتا ہے۔'' نائلہ نے جلدی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سہمی ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

''خدا کے لیے' خدا کے لیے کتنے زخم ہوں گی اپنے سینے پر' کتنے زخموں سہوں گی۔ میرے سینے پر اور زخم مت لگاؤ تمہیں خدا کا واسطہ۔'' شاہ زیب حیرت سے نائلہ کو دیکھنے لگا پھر بولا۔

''مگر میں نے ایسی کیا بات کہہ دی نائلہ؟''

''نہیں تم خان جی کو برا کہہ رہے ہو۔ وہ عجیب و غریب قوتوں کا مالک ہے۔ بات اس کے کانوں تک پہنچ جائے گی اور پھر تم دیکھ رہے ہو کہ تمہیں بھی اس طرح ٹکٹکی سے باندھا دیکھا جائے گا اور مجھے یہ دیکھنا پڑے گا' کیسے برداشت کروں گی میں؟''

''مگر زخموں والی بات۔''

''تاجو مجھے بہن کہتا تھا۔ بہت اچھا لڑکا تھا وہ۔ خان جی کو بالکل غلط فہمی ہوئی ہے خان جی نے اس پر جو الزام لگایا ہے۔ تاجو ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ سب غلط فہمی ہے' غلط فہمی دور ہو جائے گی مگر اس وقت تک' اس وقت تک تاجو مر چکا ہو گا۔ تم بتاؤ کیا یہ قابل برداشت بات ہے۔ بہن' بہن کہہ کر مجھے پکارتا ہے۔ میں تو خیر اسے بھائی کیا ہی سمجھتی۔ میں تھی کس قابل' حویلی کی غلام لیکن پھر بھی انسان کا دل تو دل ہی ہوتا ہے نا اور اب تم ہو میرے ساتھ' مجھے اچھے لگتے ہو اچھے انسان ہو۔ سب سے بڑی بات یہ کہ تم نے مجھے عورت سمجھ کر مجھ پر لپکنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے اس سے پہلے بھی کئی بندوں کی خدمت پر لگایا گیا۔ خان جی کی طرف سے انہیں اجازت تھی کہ وہ جس طرح چاہیں مجھ سے کھیلیں۔ بہت سوں نے کوشش کی کیا ہوا کیا نہ ہوا اسے جانے دو لیکن تم' تم ایسے آدمی نہیں ہو۔ میرے دل میں تمہارے لیے یہ

جگہ پیدا ہوگئی ہے۔ میں تمہیں ایسے نہیں کھونا چاہتی۔ اس لیے کوئی ایسی ویسی بات مت کہو۔ تمہیں خدا کا واسطہ۔'' نائلہ رونے لگی اور شاہ زیب حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''عجیب ہے یہ دنیا' بہت عجیب ہے لیکن نائلہ! بات صرف زخم کھانے کی نہیں ہوتی۔ زخم لگانے بھی تو چاہیے۔ تم اس بات کو کیوں نہیں جانتیں کہ دنیا سے پستی رہو گی' پستی رہو گی لیکن اگر اس کے مقابلے پر سینہ تان کر کھڑی ہو جاؤ گی تو پھر دنیا تمہیں اپنے درمیان جگہ دے گی۔ میں یہی تجربہ تو کر رہا ہوں اپنی زندگی میں۔''

''آہ۔۔۔ ایسے تجربے موت سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔''

''موت۔'' شاہ زیب زہریلی ہنسی کے ساتھ بولا۔ پھر کہنے لگا۔

''شاید تم یقین نہ کرو۔ موت کو میں نے اتنی بار اپنے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے دیکھا ہے کہ شاید ہی کسی نے دیکھا ہو اور اب میں موت کا مذاق اڑاتا ہوں۔ کسی سے نہیں ڈرتا میں۔ اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ زخمی ہو کر میں یہاں آ کر چھپ گیا ہوں تو جانتی ہو کس لیے چھپا ہوں میں۔ مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے۔ صرف اپنے کام کی تکمیل کے لیے اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہوں۔ یہ کوئی مذاق نہیں ہے نائلہ۔ میرے کہنے کا مطلب صرف اتنا سا ہے کہ تاجو تاجہ یا تاجے جو کوئی بھی وہ ہے اگر اس نے تمہیں بہن کہہ کر پکارا ہے اور تم نے اپنے دل میں اس کے لیے بھائی کی محبت محسوس کی ہے اور اس کی گرفتاری اور اذیتوں کو تم زخم قرار دیتی ہو تو اس زخم پر مرہم لگانے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ یہ تو بزدلی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش ہے۔ تم اسے بھائی کا نام دے کر اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہو حالانکہ تم اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔ نائلہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''اسے فرار کرا دو یہاں سے' نکال دو تا کہ اس کی زندگی بچ جائے۔ تم نے فخر خان کی بات سن لی۔ وہ اسے اس وقت تک مارے گا جب تک کہ وہ نہ مر جائے۔ اس نے عدالت میں اپنے اوپر جھوٹے الزام سے مشتعل ہو کر فخر خان پر جوتا پھینک مارا تھا۔ کتنا جرات مند تھا وہ کہ اس نے بھری عدالت میں یہ کام کر دکھایا۔ نائلہ! اگر تم واقعی ایک اچھی انسان ہو اور زندگی کو صحیح معنوں میں اس قابل سمجھتی ہو کہ اس کے نام پر جیا جائے تو پھر تمہیں کوشش کرنی چاہیے کہ اسے یہاں سے نکال دو۔'' شاہ زیب کی اس جذباتی گفتگو نے نائلہ پر کافی اثر کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

''جن کا کوئی نہیں ہوتا وہی تنہائی کا دکھ جانتے ہیں۔ اگر کوئی اس طرح سے بہن کہہ دے تو سچ بات ہے دل پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر میں کیا کروں کیسے نکالوں اسے؟''

''دیکھو نائلہ! تم یہ جانتی ہو کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن پھر بھی میں انسانیت کے نام پر اور جو واقعات میرے علم میں آئے ہیں انہیں ذہن میں لا کر یہ کام کرنے کو دل چاہتا ہے۔ میں خود بھی تمہاری مدد کروں گا۔ میرا کیا ہے مجھے بھی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ بچ جائے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔''

''ہاں جی۔ یہ تو بالکل ٹھیک ہے پر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟''

''نائلہ! جہاں وہ قیدی ہے وہاں کی پوری تفصیل تم مجھے بتاؤ۔ ایک نقشہ بنا کر لے آؤ اس جگہ کا پھر ہم لوگ بیٹھ کر یہ طے کریں گے کہ تاجو کو یہاں سے کیسے نکالا جا سکتا ہے۔'' شاہ زیب نے کہا۔ نائلہ پر خیال انداز میں گردن ہلاتی ہوئی بولی۔

''ٹھیک ہے جی۔ انسان کی زندگی میں ایک لمحہ ہی تو ہوتا ہے جب وہ فیصلہ کر لیتا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تاجو کو یہاں سے نکالوں گی ورنہ سچی بات یہ ہے کہ

چوہدری فخر خان اسے چھوڑے گا نہیں۔ یہ اتنا ہی کتی دا پتر اے۔ جو کہتا ہے وہ کر ڈالتا ہے اور پھر اس حرام دے پتر نوں روکنے والا بھی تو کوئی نہیں ہے۔'' نائلہ جذباتی ہو کر گالیاں بکنے پر اتر آئی۔ اس وقت اس کا اصل روپ سامنے تھا۔ شاہ زیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

''تو پھر نائلہ! تم یہ کام کر رہی ہو؟''

''اب تو جی کرنا ہی ہوگا۔ اب میں اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکتی۔'' شاہ زیب گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

صبح کے پونے چار بج رہے تھے۔ جب الیاس خاں اور جبار خاں اپنی آدمی کے ساتھ کبیر والا پہنچے تھے اور دندناتے ہوئے کوٹھی میں داخل ہو گئے تھے۔ اس وقت کوٹھی میں تقریباً تمام ہی لوگ سو رہے تھے۔ اندر جو واردات ہوئی تھی اس کا پتہ اگر شکیلہ کو ہو تو ہو۔ باقی کسی کو نہیں تھا۔ جہانزیب اور اورنگزیب اپنے کمروں میں سو رہے تھے۔ چوکیدار کی مجال نہیں تھی کہ ان لوگوں کو روکنے کی کوشش کر سکتا۔ مسلح افراد نے اپنے مورچے سنبھال لیے تھے اور دونوں سورما ریوالور ہاتھ میں لیے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ اتفاق سے آہٹوں سے اورنگزیب کی آنکھ کھل گئی۔ شکیلہ شاید بنی ہوئی پڑی تھی۔ اورنگزیب بستر سے اتر کر باہر کی طرف چلا تو شکیلہ سونے کا مظاہرہ کرتی رہی یا پھر درحقیقت وہ سوئی ہوئی تھی۔ کم از کم جو کچھ ہو گیا تھا اس کی تمام تفصیل اسے معلوم نہیں تھی۔ اورنگزیب نے ایک لمحے کے لیے غور کیا اور پھر خود بھی اپنا ریوالور نکال کر باہر نکل آیا۔

اس وقت جبار خاں اور الیاس خاں اس کے کمرے کے سامنے سے ہی گزر رہے تھے۔ جونہی اورنگزیب کا دروازہ کھلا وہ دونوں چونک کر سیدھے ہو گئے اور ان کے ریوالور کی

نال اورنگزیب کی جانب اٹھ گئی۔ اورنگزیب نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھا تھا اور پھر اس نے ان دونوں کو پہچان لیا۔ اس کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا تھا۔ الیاس خاں اور جبار خاں بھی ایک لمحے کے لیے سکتے میں رہ گئے تھے اور حیران کن نگاہوں سے اورنگزیب کو دیکھنے لگے تھے۔ اورنگزیب نے کہا۔

''بھول کر بھی نہیں کہہ سکتا کہ چوہدریوں کا یہ ٹولہ ڈاکہ زنی کے لیے اپنی بہن کے گھر میں داخل ہوا ہے لیکن یہ انداز میری سمجھ میں نہیں آیا۔'' دونوں کے چہرے غصے سے سرخ ہو گئے۔ الیاس خاں غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''زیادہ بڑھ کر بات مت کرو یہ بتاؤ شاہ زیب کہاں ہے؟'' اورنگزیب کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ سو کر جاگا تھا اس لیے بہت سی باتیں یاد میں نہیں آئی تھیں۔ لیکن اب اسے ایک دم سے احساس ہوا کہ بھائی کو قبرستان سے گھر لے کر آیا تھا اور اب وہ یہیں ہے۔ ذہن نے جھٹکا کھایا لیکن اس کے بعد وہ فوراً سنبھل گیا۔ اس نے کہا۔

''الیاس بھائی اور جبار بھائی آپ بات کو اس قدر بگاڑتے جا رہے ہیں کہ کل بحالت مجبوری ہمیں بھی اپنے آدمیوں کو لے کر تمہاری حویلی پر چڑھائی کرنی پڑے گی۔ اب یہ فیصلہ تو بعد کی بات ہے کہ کتنے ادھر کے مرتے ہیں اور کتنے ادھر کے۔ جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو کیا ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ مجھے معاف کرنا بدنام ترین غنڈے بھی بہنوں کی سسرال پر اس طرح چڑھ کر نہیں دوڑتے۔''

''اورنگزیب۔'' جبار خاں حلق پھاڑ کر چیخا۔ ان آوازوں سے جہانزیب بھی جاگ گیا تھا اور اٹھ کر باہر نکل آیا تو یہ منظر دیکھ کر وہ بھی ششدر رہ گیا۔ جبار خاں غرائے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''جو الفاظ تم نے میرے لیے کہے ہیں کیا ان سے برے الفاظ بھی ہو سکتے ہیں؟

ہم ڈاکو ہیں۔ ارے ہے کیا تمہارے پاس جب دل چاہے تمہاری حویلی خرید کر پھینک سکتے ہیں۔ تم ہمیں ڈاکو کہہ رہے ہو۔''

''یا تم بہرے ہو جبار خاں! یا تم پر دیوانگی سوار ہے۔ بات سنو یہاں اس حویلی میں اگر میں ایک اشارہ کر دوں تو تمہیں گھیر کر مار دیا جائے گا۔ سمجھ رہے ہو تم اتنی گولیاں لگیں گی تمہارے جسموں میں کہ سوراخ نہیں گنے جا سکیں گے تمہارے۔ آخر کیا سمجھ رکھا ہے تم نے ہمیں۔ ایک تو چوروں کی طرح ہماری حویلی میں داخل ہوئے ہو اور پھر ہم ہی سے بدتمیزی کر رہے ہو۔''

''ایک منٹ اورنگزیب' ایک منٹ۔'' جہانزیب نے بھائی کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

''کیا ہوا ہے مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم۔ آپ لوگ یہاں کیسے؟'' لیکن الیاس خاں غور سے اورنگزیب کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''معاف کرنا جہاں زیب بھائی! یہ بھائی ہے تمہارا لیکن ان الفاظ کے بعد اس کی زندگی ممکن نہیں ہے۔''

''میں نے ایک سوال کیا ہے آپ دونوں سے۔ آپ کا یہاں کیسے آنا ہوا؟ اور اس وقت آپ ہاتھوں میں ریوالور لیے ہوئے آپ ہماری اطلاع کے بغیر حویلی میں کیسے تشریف لائے ہیں؟ اورنگزیب نے اگر اس بارے میں سوال کیا ہے تو آپ سے کیا درست سوال نہیں کیا۔ بالکل ٹھیک ہے یہ گھر آپ کے لیے ہمیشہ کھلا ہوا ہے۔ آپ یہاں معزز مہمانوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر معزز مہمانوں ہی کی طرح اس گھر میں داخل ہوں۔ باقی جہاں تک دوسرا معاملہ رہا تو الیاس بھائی! جبار بھائی! کیا ہماری حویلی کوئی گزرگاہ ہے کہ آپ بندوقیں لیے جب دل چاہا دندناتے ہوئے اندر آ گئے۔''

''شاہ زیب یہاں ہے۔''

''تو پھر آپ شاہ زیب کو جانتے ہیں کون ہے؟ بھائی ہے وہ ہمارا۔ اگر یہاں ہے تو ٹھیک ہے۔ اگر آپ اسے مجرم کی حیثیت دیتے ہیں تو جائیے پولیس کی نفری لے آئیے۔ حملہ کرائیے ہمارے اوپر۔ فوج لے آئیے۔ ہم اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے جہاں تک ممکن ہو سکا ہم سے۔ کیا ہماری زندگی میں آپ اسے یہاں سے لے جا سکتے ہیں۔''

''تم جانتے ہو جہانزیب بھائی! کہ وہ میرے بیٹے کا قاتل ہے۔''

''ہاں میں جانتا ہوں کہ یہ قتل ہوا ہے اور شاہ زیب کے ہاتھوں ہی ہوا ہے۔ لیکن جس لیے ہوا ہے وہ آپ بھی جانتے ہیں۔ وہ زمینیں اس کی ہیں۔ آپ اس پر قبضہ کر رہے ہیں وہ قبضہ نہیں کرنے دے رہا۔ ٹھیک کر رہا ہے۔ اس نے آپ کی وجہ سے آپ کے بندوں کو قتل کیا ہے۔ یہ مجبوری تھی اس کی۔ پولیس اسے پکڑے گی تو مقدمہ چلے گا پھانسی دے دی گی۔ ہم اسے نہیں بچا سکیں گے۔ یہ ہماری مجبوری ہوگی مگر یہ کیا کہ آپ ہماری کوٹھی میں جب دل چاہا گھس کر چلے آئے اور آ کر یہاں ہنگامہ شروع کر دیا۔ بتائیے کیا کیا جائے اس سلسلے میں؟''

''شاہینہ کہاں ہے؟'' الیاس خاں نے سوال کیا اور اب جہانزیب بھی چونکا۔

''بلاتا ہوں میں شاہینہ کو۔''

''شاہینہ سے ملاؤ ہمیں۔'' اور تھوڑی دیر کے بعد شاہینہ کی تلاش شروع ہوگئی لیکن وہ باتھ روم میں جس حال میں ملی۔ اس نے سب کو چونکا دیا۔ پسینے سے تربتر ہو رہی تھی۔ حالت خراب تھی۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔

''یہ---یہ کیا ہوا---یہ کیا ہوا؟''

''شاہ زیب---شاہ زیب۔'' شاہینہ ہانپتی ہوئی بولی۔

"کیا مطلب؟"

"اس نے مجھے واش روم میں بند کر دیا اور---اور فرار ہو گیا یہاں سے۔"

"واش روم میں بند کر دیا۔ کب--- کیوں؟" جہانزیب نے سوال کیا لیکن شاہینہ چکرانے لگی تھی۔ پھر وہ گرنے لگی تو دونوں بھائیوں نے اسے سنبھال لیا۔

"شاہینہ! شاہ زیب یہاں سے چلا گیا؟"

"بھاگ گیا وہ--- بھاگ گیا وہ' وہ ایک خونی ہے۔ ایک قاتل ہے۔ وہ---وہ ---وہ شیطان ہے' شیطان ہے وہ۔"

"کیوں جہانزیب بھائی! یہ ہماری بہن ہے آپ کی بیوی ہے کیا اس حویلی میں اس کی یہی عزت ہو رہی ہے۔ آپ کے بھائی نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا ہے۔ وہ ٹھیک ہے۔" جہانزیب اور اورنگزیب بھی سنبھل گئے تھے۔ جہانزیب نے کہا۔

"اس کی وجہ کیا تھی؟ یہ بتانا پسند کریں گی شاہینہ کیا ہوا تھا؟"

"مم---میں---میں بس' میں نے---میں نے۔"

"ہاں ہاں بولو۔ یقیناً تم نے اپنے بھائیوں کو شاہ زیب کی یہاں ہونے کی اطلاع دی ہوگی۔ ہم تو کچھ پہلے ہی سمجھ گئے تھے۔ اوہو یہ تو بہت بڑا کھیل ہوا ہے۔ جہانزیب بھائی! یہ تو بہت بڑا کھیل ہوا ہے۔ آپ کو اندازہ ہے کہ چائے پینے کے بعد آپ کی کیا کیفیت ہوئی تھی؟"

"اس---ہاں سر چکرانے لگا تھا اور---اور---"

"شاہینہ بھابی نے پورا پورا کام دکھایا تھا۔ میرا خیال ہے یا تو شاہ زیب ان کے چکر میں نہیں آیا یا پھر اسے نشہ نہیں ہوا اور وہ بھاگ گیا۔ کیوں الیاس خاں! کیا شاہینہ بھابی نے آپ کو شاہ زیب کے یہاں ہونے کی اطلاع نہیں دی تھی۔"

"دی تھی اور اسے یہی کرنا چاہیے تھا۔ اس کا بھتیجا قتل ہوا ہے۔ اس کا بھتیجا ہوا ہے۔ نہیں شاہینہ نہیں۔ یہ حویلی اب تمہارے لیے غیر محفوظ ہو گئی ہے۔ ہم اس کی چھت کے نیچے تمہیں نہیں رہنے دیں گے۔" الیاس خاں نے کہا۔

"میں خود بھی یہاں نہیں رہوں گی---میں دیکھوں گی۔"

"ٹھیک ہے چلو۔"

"سنو الیاس خاں! جبار خاں! تم نے جس دشمنی کی بنیاد ڈالی ہے آج وہ بنیاد پوری ہو گئی ہے۔ ٹھیک ہے شاہینہ جاؤ اور تم دونوں کو میں یہ اطلاع دیئے دیتا ہوں کہ اس کے بعد حویلی سے پچاس پچاس گز کے فاصلے پر تم لوگ نظر آئے تو تمہیں بھون کر رکھ دیا جائے گا۔ اس وقت بات دوسری ہے۔ جاؤ---شاہ زیب یہاں نہیں ہے اور اگر ہوتا بھی تو تم سے تمہارے یہ ہتھیار چھین کر تمہیں باہر نکال دیا جاتا۔ جاؤ الیاس خاں! بہت بڑے غنڈے ہو تم۔ بہت بڑے بدمعاش ہو لیکن تمہارا واسطہ اب شریفوں سے ہے۔ اور شریف جب بدمعاشی کے مقابلے پر آتا ہے تو بدمعاش کی ایک نہیں چلتی اس بات کو ذہن میں رکھنا۔"

"جہانزیب!"

"ہاں بولو۔" جتنی زور سے الیاس خاں غرایا تھا۔ اس سے کہیں زور سے جہانزیب کی آواز ابھری تھی۔ الیاس خاں اسے گھورتا رہا اور اس کے بعد وہ سب مڑ کر وہاں سے واپس چلے گئے۔ شاہینہ نے کہا۔

"ٹھہرو۔ میں اپنے کپڑے لے لوں۔"

"نہیں۔ تم جبار خاں اور الیاس خاں کی بہن ہو۔ ان ساری چیزوں کو اس حویلی کے لیے خیرات کر دو۔ یہیں رہنے دو انہیں۔ اس کے بعد تو اس حویلی سے ہمارا ایک نیا رشتہ قائم ہو گیا ہے۔ سمجھے نیا رشتہ۔ آؤ---" الیاس خاں نے بہن کا ہاتھ پکڑا اور اسے گھسیٹتا ہوا باہر

نکل گیا۔ مورچہ سمٹ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ لوگ واپس چل پڑے۔

☆☆☆

نائلہ شاہ زیب کی باتوں سے پوری طرح متاثر ہوگئی تھی۔ اس کے دل میں تاجو کے لیے بہت اچھے جذبات تھے۔ پر جو کچھ تاجو کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اس نے اسے سخت پریشان کر دیا تھا۔ یہاں اسے تمام لوگوں کا اعتماد حاصل تھا۔ جو شخص تاجو کے قید خانے پر پہرہ دیتا تھا۔ اس کا نام منیر شاہ تھا۔ منیر شاہ ایک دیو قامت لیکن کم عقل آدمی تھا۔ شاید اس کی ساری عقل بھی اس کی جسمانی نشوونما میں استعمال ہوگئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کام کرنا جانتا تھا۔ اسے ہدایات کر دی گئی تھی کہ جو قیدی اس کمرے میں بند ہے بس اسے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ منیر شاہ اسی ہدایت پر عمل کرتا تھا۔

بہر حال اس کے بعد نائلہ نے اس قید خانے کا نقشہ اپنے ذہن میں ترتیب دیا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی کسی ایسے کام میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن اس وقت تاجو کی زندگی کا سوال تھا۔ فخر خان یہ طے کر چکا تھا کہ اذیتیں دے کر آخر کار تاجو کو قتل کر دے گا۔ لیکن نائلہ اس کی زندگی بچانا چاہتی تھی اس نے منیر شاہ سے ملاقات کی اور منیر شاہ نے اسے دیکھ کر ادب سے کہا۔

''جی بی بی صاحب! کیا حکم ہے؟''

''نہیں منیر شاہ' کوئی حکم نہیں ہے۔ بس ذرا تاجو سے ملاقات کرنی ہے۔''

''کیوں بی بی جی؟''

''کچھ معلوم کرنا ہے اس سے' ویسے وہ بڑا ہی کمینہ انسان ہے۔ منیر شاہ! ہم جس مالک کا نمک کھاتے ہیں۔ اس سے پوری طرح وفاداری کرتے ہیں۔ تاجو کو خان جی کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' نائلہ نے کہا۔

''کتا ہے' کتا پورا۔ ہمارے خان جی کے منہ پر جوتا پھینک کر مارا تھا اس نے۔ پر دیکھا تو نے اس کا نتیجہ۔ خان جی نے کیا سلوک کیا اس کے ساتھ۔ خان جی کے لیے کوئی کام مشکل نہیں ہے۔ جیلیں توڑنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ نائلہ نے کچھ اس طرح منیر شاہ کو اپنے جال میں پھانسا کہ منیر شاہ اسے ساتھ لے کر اس بنگلے کے پاس پہنچ گیا۔ جہاں تاجو قید تھا۔ نائلہ کو وہاں تک لانے میں اسے کوئی تعارض نہیں ہوا تھا کیونکہ نائلہ نے بہر حال قیدی کو آزاد کرنے کے بارے میں نہیں کہا تھا۔ وہ خاموشی سے تاجو کو دیکھتی رہی۔ تاجو کے چہرے پر بھی عجیب سے تاثرات تھے۔

''تاجو! تمہیں شرم آنی چاہیے۔ تمہاری غیرت کو کیا ہوا تھا۔ جس مالک کا نمک کھایا تم نے اسی پر جوتا پھینک مارا۔ نوکر تو مالکوں پر جان قربان کر دیتے ہیں۔ تم نے مالک کے ساتھ جو سلوک کیا۔ میں سمجھتی ہوں کوئی تمہیں معاف نہیں کرے گا۔ تاجو کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ منیر شاہ نے جلدی سے کہا۔

''میں باہر پہرے پر کھڑا ہوں۔ کوئی ادھر سے گزرے گا اور مجھے غائب دیکھے گا تو سوچے گا کہ شاید میں اپنی ڈیوٹی صحیح طریقے سے نہیں کر رہا۔''

''ہاں منیر شاہ تم اپنی جگہ پر جاؤ--- میں آتی ہوں' ابھی کچھ منٹ میں۔'' نائلہ نے خوشی سے کہا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پیش آئی اور کام خود بخود ہوگیا۔ بہر حال وہ باہر نکل گیا تو نائلہ نے جلدی سے تاجو سے کہا۔

''جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے تاجو! اس کے لیے میں تم سے سخت شرمندہ ہوں۔ اصل میں مجھے کوئی ترکیب نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ یہ کیے بغیر چارہ کار نہیں تھا۔ اب مجھ سے کوئی سوال نہ کرو۔ تاجو تمہیں یہاں سے نکلنا ہے۔ میں اسی کے انتظامات کر رہی ہوں۔''

''دماغ خراب ہوا ہے تمہارا۔ اگر تم نے ایسی کوئی کوشش کی تو تمہارا کیا ہوگا۔ اس

کا تمہیں اندازہ ہے۔''

''دیکھو۔ نہ میں جذباتی ہو رہی ہوں نہ تم۔ اگر مجھے کوئی صحیح راستہ نہ ملتا تو میں کبھی ایسا قدم نہ اٹھاتی۔ اس لیے تم فضول باتوں سے گریز کرو۔ جو کچھ میں بتا رہی ہوں تمہیں؛ تمہیں اس پر عمل کرنا ہے۔ میں یہ دروازہ کھلوا دوں گی۔ اس کے لیے مجھے جو کچھ کرنا ہوگا اس کی ذمے دار میں خود ہوں۔ اصل میں یہاں ایک شخص کو لایا گیا ہے اس کا نام شاہ زیب ہے۔''

''شاہ زیب۔'' تاجو نے جیسے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔

''یہ جہانزیب کا بھائی تو نہیں ہے؟''

''جانتے ہو تم اسے؟''

''ہاں ایک دفعہ جہانزیب کی حویلی میں کسی کام سے گیا تھا۔ مجھے اس لیے ان کے بارے میں معلوم ہے اور یہ تفصیل بھی مجھے معلوم ہو چکی ہے کچھ لوگوں سے کہ شاہ زیب وہ بندہ ہے جس نے آصل کی زمینوں پر بھٹہ نہیں بننے دیا۔ وہی ہے نا یہ۔۔۔؟''

''سو فیصدی وہی ہے۔''

''تو پھر؟''

''وہ یہاں ایک طرح سے قیدی ہے۔ زخمی ہو گیا اور فخر خان اپنے کسی مقصد کی تکمیل کے لیے اسے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ بندہ بہت چالاک ہے اور تم سے ہمدردی رکھتا ہے۔ میں نے اسے تمہاری مدد کے لیے آمادہ کر لیا ہے۔ وہ تمہیں یہاں سے نکالنے میں مدد دے گا۔ جب تم یہاں سے نکلو گے۔ تو راستے تو تمہیں معلوم ہیں۔ حویلی کی پچھلی سمت پہنچنے میں تمہیں کوئی خاص دقت نہیں ہوگی۔ اس کے لیے تم اپنا صحیح طور استعمال کرو گے۔ البتہ حویلی سے نکلنے کے بعد تمہارے لیے یہ مشکل ہوگی کہ تم کہاں جاؤ۔ میں جو

کچھ تمہیں بتا رہی ہوں تاجو تم اس پر غور کرو۔ تمہیں یہاں سے سیدھا گردہ دے ڈیرے جانا ہے۔ گردہ دے ڈیرے میں میرے ماموں رہتے ہیں۔ ماما! کے لیے میں تمہیں ایک چٹھی دے دوں گی وہ ماما جی کو دے دینا۔ ماما جی تمہاری حفاظت کا بندوبست کر دیں گے۔ وہاں پرانی پن چکی ہے جس کے نیچے تہہ خانہ ہے۔ پن چکی کے اس تہہ خانے کے بارے میں ماما جی کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم کیونکہ وہ جگہ ہماری پرانی جگہ ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ماما جی تمہیں وہاں چھپا دیں گے اور اس کی پروا مت کرنا کہ وہاں تم کتنے دن چھپے رہتے ہو۔ میں چٹھی میں ماما جی کو سب کچھ لکھ دوں گی۔ سمجھ رہے ہو نا۔ تو مطلب میرا کہنے کا یہ ہے کہ تم اس وقت تک چھپے رہنا جب تک کہ خان جی کے آدمی تمہیں تلاش کرتے کرتے مایوس نہ ہو جائیں۔ سارے معاملات ماما جی خود سنبھال لیں گے۔ ٹھیک ہے نا!''

''مگر شاہ زیب کو میرے ساتھ یہ ہمدردی کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی ہے۔ وہ تو خود بھی بہت بڑے زمیندار کا بیٹا ہے۔''

''سب انسانیت کے حوالے سے اور پھر میں نے اس سے کہا ہے وہ میرے کہنے سے بھی ایسا کرے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر تم میری یہ مدد کر رہی ہو نائلہ تو میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم اسی جہنم میں رہو گی۔'' نائلہ کچھ دیر کھڑی سوچتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے لیکن کچھ دیر کے بعد نائلہ نے اپنی آنکھوں کی نمی پی لی۔ کسی کو ذہنی طور پر پریشان کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ نہ ہی جھوٹے دلاسے دینے کی گنجائش تھی۔ تاجو نے کہا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا نائلہ! کہ تم بھی میرے ساتھ نکل چلو؟''

''ہو سکتا تھا تاجو! لیکن میں تمہیں ایک بات بتاؤں میں یہاں رہ کر تمہارے لیے

بہت کچھ کرسکتی ہوں۔ مجھے کم از کم یہ علم رہے گا کہ یہاں تمہارے خلاف کیا ہو رہا ہے۔ یا تمہارے یہاں سے نکل جانے کے بعد یہاں کے حالات کیا ہے۔ دیکھو تاجو خدانخواستہ اگر تم نہ نکل پائے اور دوبارہ گرفتار ہوگئے تو یہاں رہ کر تو میں پھر کوشش کرسکتی ہوں کہ تمہاری زندگی بچاسکوں۔ ایک بار پھر میں تمہیں یہاں سے نکالنے میں تمہاری مدد کروں لیکن اگر میں بھی تمہارے ساتھ چل پڑی اور دونوں پکڑے گئے تو خان جی تمہیں موقع پر گولی ماردیں گے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ بعد میں میں خود بھی نکلنے کی کوشش کروں اور تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔ یہ بات تو مجھے معلوم ہوگی کہ تم کس طرف نکلے ہو۔ ابھی تم مجھ سے اس کے لیے ضد نہ کرو۔ جب تک کہ میں خود ہی تم سے رابطہ قائم نہ کروں۔ تاجو نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور گردن ہلا کر بولا۔

''ٹھیک ہے میں رات کو ادھر سے ہونے والی کارروائی کا انتظار کروں گا۔''

☆☆☆

شاہ زیب اپنی تیاری مکمل کرچکا تھا۔ اس نے ایک بار اپنے کمرے سے نکل کر بڑی احتیاط کے ساتھ اس جگہ کا جائزہ لے لیا تھا۔ جہاں منیر شاہ کی ڈیوٹی ہوا کرتی تھی اور یہاں سے کچھ فاصلے پر تاجو کا قید خانہ تھا۔ منیر شاہ درحقیقت دیوہیکل آدمی تھا اور فخر خان نے اسے قید خانے کا محافظ مقرر کرکے یہ یقین کرلیا تھا کہ منیر شاہ کی موجودگی میں کسی قیدی کا فرار ہو جانا ناممکنات میں سے ہے۔ بہرحال شاہ زیب نے ایک لائحہ عمل تیار کرلیا تھا۔ مقررہ وقت پر جس کا تعین اس نے کرلیا تھا وہ اپنی آرام گاہ سے باہر نکلا۔ تاحد نظر گہرا سناٹا طاری تھا۔ سوائے اس ایک زندہ وجود کے جو نکلا کا تھا اور وہ ایک خاص ستون کی آڑ میں نجانے کب سے بیٹھی یہ انتظار کررہی تھی کہ شاہ زیب باہر نکل کر اپنا کام سرانجام دے۔ مقررہ وقت پر شاہ زیب تیار ہو کر اپنی جگہ سے باہر نکل آیا۔ اب وہ اپنے کام کے لیے تیار تھا حالانکہ زندگی میں

کبھی کسی مجرمانہ عمل کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ لاہور زرعی یونیورسٹی میں وہ ایک انتہائی شریف نوجوان تصور کیا جاتا تھا جس کا لڑائی بھڑائی سے کوئی تعلق نہیں تھا اور اگر کبھی اس پر کوئی مقدمہ قائم ہوتا اور کبھی یونیورسٹی سے اس کے کردار کی تصدیق کی جاتی تو سارا مقدمہ ہی آپ سیٹ ہو کر رہ جاتا لیکن وقت نے اسے آخر کار وہ بنا دیا تھا جو وہ نہیں بننا چاہتا تھا۔ سب کچھ تو ہو چکا تھا۔ دشمنیاں' قتل و غارت گری۔ پولیس کا تعاقب' سازشیں' محبت۔ ایک انسان کی زندگی میں اتنے سارے واقعات ایک دم مشکل ہی سے آتے ہیں لیکن شاہ زیب کے ساتھ یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ بہرحال یہ تمام سلسلے جاری رہے اور شاہ زیب اپنی جگہ سے باہر نکل آیا۔ دبے قدموں چلتا ہوا ستونوں کی آڑ لیتا ہوا وہ آگے بڑھتا رہا۔ رات ایک سنجیدہ عمل کا نظارہ کررہی تھی۔ پھر شاہ زیب اس ستون کی آڑ میں کھڑا ہو گیا جہاں سے وہ منیر شاہ کو دیکھ سکتا تھا۔ منیر شاہ ایک مستعد آدمی تھا۔ اس وقت بھی وہ جاگ رہا تھا اور ایک کرسی پر بیٹھا اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھے اس تمباکو کو مسل رہا تھا جس کی چند لمحات کے بعد وہ پھنکی لگانے والا تھا۔ بس یہی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد اس نے اپنے کام سے فارغ ہو کر تمباکو کی پھنکی منہ میں ڈالی لیکن اسی وقت اسے احساس ہوا کہ اس کے علاوہ بھی یہاں کوئی متحرک وجود موجود ہے۔ وہ ایک دم چونک کر کھڑا ہو گیا لیکن صحیح سمت کا اندازہ نہیں لگا پایا تھا اور نہ ہی اسے یہ احساس ہوا تھا کہ وہ پراسرار وجود جو چند لمحوں کے بعد اس پر حملہ آور ہونے والا ہے اس کے بالکل قریب پہنچ چکا ہے۔ شاہ زیب کی لات پیچھے سے اس کی کمر پر پڑی تھی اور یہ لات اتنی کمزور نہیں تھی کہ طاقتور منیر شاہ کو کوئی احساس ہی نہ ہوتا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اپنے آپ کو سامنے والی دیوار سے ٹکرانے سے بچانے کے لیے دوڑا لیکن عقب سے باہر نکلنے والے نے ایک اور لات اس کی کمر پر رسید کردی اور منیر شاہ دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس پر حملہ کرنے والا معمولی آدمی نہیں تھا۔ شاہ زیب نے جیسے ہی وہ دیوار سے چپکا اس کی دونوں

کلائیوں پر ہاتھ ڈال دیا اور اپنا گھٹنہ زور سے اس کی کمر پر مارا۔ منیر شاہ کے حلق سے آواز نکل گئی تھی۔ شاہ زیب نے اس کی دونوں کلائیاں پکڑ کر اس کے دونوں ہاتھ پیچھے موڑ لیے اور پھر ایک اور جھٹکا دے کر اسے سامنے والے ستون سے ٹکرا دیا۔ منیر شاہ کے سر پر چوٹ لگی تھی اور اس کا سر چکرا گیا تھا۔ دشمن کو ایک لمحے کا موقع نہ دو۔ اگر اس پر وار کر چکے ہو ورنہ لڑائی مقابلے کی ہو جاتی ہے۔ اس بار شاہ زیب نے اس کے بال مٹھی میں جکڑے تھے اور پھرتی سے اچھل کر زمین پر کودا تھا اور منیر شاہ راہداری کی زمین سے ٹکرایا تھا۔ شاہ زیب نے فوراً ہی اپنا گھٹنہ اس کی گردن پر رکھ دیا اور اس کے بعد بڑے مضبوط ہاتھ اس کی کنپٹی پر مارے۔ منیر شاہ کو ایک لمحے کا موقع نہیں مل سکا تھا کہ وہ اپنے مدمقابل کو ایک گھونسہ بھی مار سکے۔ پے در پے گھونسوں نے اسے حواس باختہ کر دیا اور اب جو یہ ہاتھ اس کی کنپٹی اور گردن کے داہنے حصے پر پڑے۔ انہوں نے اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ گردن پر گھٹنے کا دباؤ بھی دم گھٹنے کا سبب بن رہا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے مقابل کو دیکھا اور اس کا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس جدوجہد میں شاہ زیب کے منہ سے وہ رومال کھل گیا تھا جو اس نے یہاں آتے ہوئے لپیٹ لیا تھا۔ حالانکہ اس کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی لیکن پھر بھی شاہ زیب نے احتیاط برتی تھی۔ منیر شاہ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے حیرت کے نقوش نمودار ہوئے اور اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا۔ نائلہ کچھ فاصلے پر کھڑی کانپ رہی تھی اور شاہ زیب کی لڑائی کا اندازہ دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے اندر اسے احساس ہو گیا تھا کہ شاہ زیب منیر شاہ پر بھاری پڑ گیا ہے۔ اس کی نگاہیں ادھر ادھر بھی بھٹک رہی تھیں حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس وقت اس علاقے میں کوئی نہیں ہوتا ہے لیکن پھر کسی کے کہیں نہ کہیں سے نکل آنے کا خدشہ موجود تھا۔ ظاہر ہے اس تمام جدوجہد میں آوازیں بھی ابھری تھیں۔ ویسے شاہ زیب نے لازمی طور پر اس بات کا خیال رکھا تھا کہ منیر شاہ کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلنے پائے اور ایسی کوئی چیخ کی

آواز نہیں نکلی تھی یا اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ منیر شاہ اپنے آپ کو اتنا طاقتور سمجھتا تھا کہ ایک آدمی کے مقابلے پر اس نے چیخنے کی کوشش نہیں کی تھی اور یہ سوچا تھا کہ خود ہی اس سے نمٹ لے گا لیکن بہرحال اب نائلہ محسوس کر رہی تھی کہ منیر شاہ زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا ہے یا پھر شاید' شاید مر چکا ہے۔ اس احساس سے نائلہ کے پورے وجود میں خوف کی لہریں دوڑ رہی تھیں اور اس نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنا منہ بند کر رکھا تھا۔ پھر وہ دیکھتی رہی شاہ زیب منیر شاہ کے لباس کی تلاشی لے رہا ہے۔ اور اس کے بعد وہاں سے آگے بڑھ گیا ہے۔ شاہ زیب درحقیقت چابی کی تلاش میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ قید خانے کے دروازے پر پہنچا۔ یہ نجی قید خانہ اس طرح کے وڈیرے اور زمیندار اپنی عیش گاہوں میں بناتے ہیں کیونکہ انہیں قانون نہیں پوچھتا۔ یہ قانون کے حصے دار ہوتے ہیں اور قانون ان کے لیے انتہائی لچک رکھتا ہے۔ ورنہ سینکڑوں عقوبت خانے پکڑے گئے ہیں۔ بہت سے وڈیروں کے بارے میں یہ علم ہو چکا ہے کہ زیرزمین دنیا میں انہوں نے اپنے ذاتی قیدی رکھے ہوئے ہیں اور ان پر زندگی تنگ کر رکھی ہے بلکہ انصار برنی نے ایسے بہت سے قید خانے برآمد کیے ہیں اور ان سے ایسے ایسے لوگوں کو نکالا ہے جو تیس تیس' پچیس پچیس' چالیس چالیس سال سے ان قید خانوں میں جانوروں کی طرح زندگی گذار رہے ہیں اور وہیں پر ان کی زندگی کے ماہ و سال بیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو قانون کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن کسی ایک وڈیرے' زمیندار' کسی ایک چوہدری کو کبھی پھانسی ہونے کی خبر نہیں سنی۔ انہیں اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے جیسے انسانوں پر زندگی تنگ کر دیں۔ انہیں ہلاک کر دیں' بھوک سے مار دیں' انہیں جو دل چاہے سلوک کریں ان کے ساتھ۔ یہ قانون کے حصے دار ہوتے ہیں اور ان کا اپنا قانون ہوتا ہے۔ شاہ زیب نے اس قید خانے کا دروازہ کھولا۔ تاجو اس کا انتظار کر رہا تھا تالا کھلا تو تاجو باہر نکل آیا۔ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی اور وہ صرف شکر گذار نگاہوں سے شاہ

زیب کو دیکھ رہا تھا۔ شاہ زیب نے کہا۔

"جو تدبیر تمہیں نائلہ نے بتادی ہے اس پر عمل کرو اور جہاں نائلہ نے کہا ہے وہاں پہنچ جاؤ۔ میں تمہیں صرف ایک ہدایت کرتا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ اس وقت تک اسی جگہ انتظار کرنا جب تک کہ تمہیں کوئی دوسرا ذریعہ نہ مل جائے۔ ہوسکتا ہے نائلہ تم سے اس جگہ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرے۔ بہر حال یہ کام خود کر ڈالو۔ چلو نائلہ کا انتظار مت کرو۔ وہ تمہیں رخصت کرنے کی ہمت نہیں رکھتی۔ تاجو نے اشک بار آنکھوں سے شاہ زیب کو دیکھا۔ جھک کر اس کا ہاتھ اٹھایا۔ چوما آنکھوں سے لگایا۔ اس کے بعد تیزی سے واپس پلٹ پڑا۔ شاہ زیب اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہوا تو اس نے قید خانے کا کھلا ہوا تالا ایک طرف ڈال دیا اور خود واپسی کے لیے پلٹ پڑا۔

منیر شاہ اسی طرح بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ تاجو ایک لمحہ کے لیے اس کے پاس رکا گرد و پیش کا جائزہ لیا کہ کہیں کوئی ایسی چیز تو آس پاس نہیں رہ گئی ہے جو اس کی وہاں نشاندہی کر دے اور پھر وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔

نائلہ اب بھی کھڑی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی لیکن اس کا سارا وجود اس طرح پتھرا گیا تھا کہ اسے ہلنے جلنے میں بھی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ شاہ زیب اپنے کمرے میں آ گیا اور نائلہ اپنے آپ کو سنبھال کر واپس چل پڑی۔ دل چاہ رہا تھا کہ یہ دیکھے کہ تاجو باہر نکل گیا ہے یا نہیں لیکن بدن ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ چنانچہ اس نے اللہ پر بھروسہ کیا اور واپس اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ اس کا ذہن نجانے کیسی کیسی سنسناہٹوں کا شکار ہو رہا تھا۔

☆☆☆

شاہینہ کو بھائیوں کے ساتھ آئے ہوئے ساتواں دن تھا۔ ان سات دنوں میں کسی نے اس سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ جہانزیب کا انداز اسے یاد تھا حالانکہ جہانزیب ہمیشہ

ایک اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔ اپنی حویلی میں وہ راج کر رہی تھی۔ شکیلہ بے شک چھوٹے بھائی کی بیوی تھی لیکن اس سے بھرپور تعاون کرتی تھی۔ بڑی بھاوج سمجھ کر ہمیشہ اس کا احترام کرتی تھی اور کبھی اس نے اس سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا۔ اورنگزیب بھی اچھا دیور ثابت ہوا تھا۔ فطرتاً شاہینہ ان لوگوں سے مطابقت رکھتی تھی حالانکہ اس کی ماں بہت نیک اور نفیس خاتون تھیں۔ البتہ بات وہی چوہدریوں کا سا مزاج رکھتا تھا اور باپ ہی نے بیٹوں کو غلط راستوں پر ڈالا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ بہت سخت مزاج اور مجرمانہ ذہنیت کے مالک بن گئے تھے۔ البتہ ماں ہمیشہ اپنے بیٹوں کو برائیوں سے روکتی رہتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں شاہینہ ماں کی فطرت سے مختلف ثابت ہوئی تھی۔ وہ بھائیوں کے شانہ بشانہ رہتی تھی اور انہی کے مزاج کے مطابق عمل کرتی تھی۔

بہر حال یہ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن اپنی ماں سے شاہینہ کو بہت زیادہ محبت تھی۔ ماں اسے جو ہدایت کرتی تھی وہ کوشش کرتی تھی کہ ان ہدایات پر عمل کرے مگر وہی بس فطرت غالب آ جاتی تھی۔ پھر ماں باپ کی موت کے بعد اس کا اپنا مزاج کسی خاص نقطے پر نہیں ٹھہر پایا تھا۔ شوہر سے بہت محبت کرتی تھی لیکن جب بھائی سامنے آتے تو اس کے مزاج میں وہی سرکشی، وہی وحشت خیزی آ جاتی تھی اور وہ ان کی فطرت کے مطابق ہو جایا کرتی تھی۔

پچھلے کچھ عرصے سے تو وہ بہت ہی بھائیوں سے منسلک ہو گئی تھی۔ فطرتاً خراب نہیں تھی اور نہیں جانتی تھی کہ یہ مزاج اسے کیا نفع اور کیا نقصان دے گا۔ شادی کے وقت ماں زندہ تھی اور ماں نے بہت سی ہدایتیں کر کے بھیجا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ بیٹی چاہے راجہ کی ہو یا کسی غریب آدمی کی، اس کا سسرال ہی اس کا گھر ہوتا ہے اور اگر اس نے سسرال جیت لیا تو سمجھو کہ ساری کائنات جیت لی۔ شاہینہ نے کچھ عرصہ اس پر عمل بھی کیا تھا اور اسے اس کا

بھرپور جواب بھی ملا تھا۔ گھر میں ایک عزت‘ ایک مقام حاصل تھا اسے۔ شاہ زیب چھوٹے بھائیوں کی طرح سے تھا اور بھابی کی بڑی عزت کرتا تھا۔ ساس بھی بری نہیں تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ شاہینہ جب بھائیوں کے درمیان آتی اور کچھ عرصہ ان کے ساتھ رہتی اور پھر سسرال پہنچتی تو اس کا مزاج کافی بدلہ ہوا ہوتا تھا اور وہ ہر ایک سے نفرت کا برتاؤ کرتی تھی۔ پھر جب ماں کی موت کے بعد زمینوں کی بات کا قصہ چلا تو دستاویزات کے مطابق شاہ زیب کو بھی بڑا حصہ ملا تھا۔ یہاں شاہینہ نے پہلی بار ایک بری عورت ہونے کا ثبوت دیا لیکن وہی بھائیوں کی شہ پر۔

’’سن بھئی۔ یہ چھوٹا مونڈا بیچ میں سے نکل جائے تو یہ تینوں باغ تمہیں مل جائیں۔ باقی تو بنجر زمین پڑی ہوئی ہے کسی طرح اس چھوٹے کو بیچ سے نکالو۔‘‘

’’مگر کیسے بڑے بھائی جی۔ حصہ تو اس کا ہے اور وصیت بھی ہے۔ کاغذات بھی تیار ہیں۔‘‘

’’اوہ حصہ --- حصہ --- حصہ وہ پڑھ رہا ہے نا شہر میں۔‘‘ الیاس خاں نے کہا۔

’’ہاں۔‘‘

’’ہاں تو بس اخراجات نہیں ہوتے اس پر۔ معمولی بات تو نہیں ہے۔ ہوٹل میں رہتا ہے۔ کب سے پڑھ رہا ہے۔ تم اس سے کہو کہ اس کا خرچہ پانی پورا ہو گیا۔ اب کوئی جائیداد نہیں رہی اس کے لیے۔ کرنے سے کام ہوتا ہے وہ باغ سونا اگل سکتے ہیں اگر ان پر صحیح ہاتھ لگ جائے۔ یہ جو بادشاہ اورنگزیب اور جہانزیب ہیں نا۔ گدھے ہیں میری نگاہوں میں۔ اوہ --- انہیں آتا جاتا ہی کچھ نہیں ہے۔ یہ کیا جانیں زمینداری کیا چیز ہوتی ہے۔ تو چکر چلا شاہینہ وہ باغ تجھے حاصل ہو جائے نا تو میں بندے دے دوں گا تجھے گلزار بنا دیں گے ان باغوں کو۔ تو سمجھ رہی ہے نا؟‘‘

’’جی بھائی جی! میں کوشش کرتی ہوں۔‘‘ اور اس کے بعد شاہینہ نے کوشش شروع کر دی۔ جہانزیب تو اس کی مٹھی میں تھا۔ اورنگزیب کو بھی اس نے اپنی باتوں سے تاڑ لیا اور نتیجے میں شاہ زیب کو ایک مجرم بنا دیا گیا۔ اسے بے دخل کرنے کی اطلاع دی گئی اور اس کے بعد اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی گئی اور شاہ زیب مجرم بن گیا۔ یہ بھی ان کی کوشش کا ایک حصہ تھا اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا گیا تھا لیکن بس انور کی موت ان لوگوں کے لیے ناقابل یقین واقعہ تھی اور اس نقصان کو وہ زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ شاہینہ کو لے آئے تھے لیکن اس کے بعد خاص طور سے کوئی اس کی دیکھ بھال نہیں کی جا رہی تھی۔ بس جس طرح وہ کبھی کبھی ملنے جلنے آ جاتی تھی اور حویلی میں رہتی تھی اس طرح اب بھی رہ رہی تھی۔ چار پانچ دن تو شدید غصے کے عالم میں گزارے لیکن چھٹے دن شاہینہ کو احساس ہوا کہ یہ کیا زندگی ہوئی۔ کیا شوہر اور اس کا گھر چھوٹ گیا۔

اپنے رویے پر غور کیا تو اسے احساس ہوا کہ واقعی کچھ خرابی ہو گئی ہے۔ ماں اب اس دنیا میں نہیں تھی لیکن اس کی ہدایتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ یہی کہتی تھیں کہ شوہر کا گھر ہی بیٹی کا گھر ہوتا ہے۔ چاہے وہ کسی راج محل میں کیوں نہ پیدا ہوئی ہو۔ بھائیوں کا رویہ بالکل اچھا نہیں تھا۔ بگڑے ہوئے گھرانوں کی بگڑی ہوئی عورتیں تھیں۔ بے شک دونوں بھائی شاہینہ سے محبت کرتے تھے۔ اس کا احترام بھی کیا جاتا تھا لیکن بھائیوں کے ساتھ تو گزارہ نہیں ہوتا۔ آخر اپنے گھر سے یہاں تک چلے آنے کی وجہ کیا تھی۔ صرف بھائیوں کی سازشیں۔ شاہینہ کو اب غور کرنے کا موقع ملا تو وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے کیا کیا۔ کیا جہانزیب اور اس کے گھر والے اس کی بھرپور عزت کرتے تھے۔ وہ وہاں اپنی من مانی کرتی تھی۔ کوئی روک ٹوک نہیں تھی جبکہ یہاں آ کر وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کی شخصیت بالکل محدود ہے۔ ایک مہمان کی طرح لیکن ایک ایسی مہمان جس کی کوئی پذیرائی نہیں ہو رہی تھی۔

اپنے حالات پر غور کیا تو اسے احساس ہوا کہ ماں کی ہدایتوں کے بالکل خلاف چل رہی ہے۔ شوہر کے گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھتی بلکہ اب بھائیوں کے گھر کو اپنا گھر سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے اور اس کوشش سے مسلسل اس کی توہین ہو رہی ہے۔ وہ لوگ اسے یہاں لے آئے تھے لیکن اس کے بعد انہوں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ بس ایک خوبصورت ڈیکوریشن پیس کی طرح ایک کمرے میں پڑی ہوئی تھی۔ کھانے کو مل جاتا تھا۔ دوسری ضرورتیں پوری ہو جاتی تھیں۔ دونوں بھاوجیں آپس میں مست رہتی تھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے شاہینہ اپنے گھر میں شکیلہ سے گھلی ملی رہتی تھی۔ باہر کے تمام لوگ الگ حیثیت رکھتے تھے۔ شاہینہ کو ایک دم احساس ہوا تھا کہ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سونے کی چھڑی پھینک دی ہے اور اب لوگ اس پر پاؤں رکھتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ یہ تو غلط ہوا۔ شکیلہ کے رویے پر غور کیا تو احساس ہوا کہ شوہر کے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کرتی۔ جہانزیب نے شاہینہ کے اشارے پر جو کچھ کیا اس میں اس نے کوئی بھرپور ساتھ نہیں دیا' کوئی حصہ نہیں لیا۔ بس گزارہ ہوتا رہا۔ اس طرح وقت گزر گیا۔

شاہ زیب کو مجرم بنا دیا گیا۔ واقعی ماں سے وعدہ کیا تھا اس نے کہ اپنی زمینوں کو گلزار بنا دے گا۔ اس کی اپنی ملکیت تھی۔ بھائی اگر اسے چھیننا چاہتے تھے تو یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ کم از کم وہ اس گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے بھائیوں کو روک سکتی تھی اور کہہ سکتی تھی کہ وہ یہ خیال دل سے نکال دیں۔ بلکہ ایک بار الیاس خاں نے کہا بھی تھا کہ شاہینہ تیرے گھر کی وجہ سے ہم خاموش ہیں ورنہ اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔ جہانزیب بہرحال ایک اچھا شوہر تھا۔ کیا یہ اچھی بات ہوتی کہ جہانزیب کو اس کے بھائیوں کے ہاتھوں نقصان پہنچے۔ شاہینہ کی سوچیں گہری ہوتی چلی گئیں۔ اسے احساس ہوا کہ اس نے گناہ پر گناہ کیا ہے۔ بھتیجے کی محبت اپنی جگہ تھی لیکن شاہ زیب بھی کیا کرتا۔ سب کچھ تو چھین لیا گیا تھا اس سے۔

پہلے تو جہانزیب اور اورنگزیب بھی اس مسئلے میں شریک تھے اور شاہ زیب کو زمینوں سے بے دخل کرنے میں انہوں نے شاہینہ کی ہر بات کی پذیرائی کی تھی اور وہ کر ڈالا تھا جو نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اب شاہینہ محسوس کر رہی تھی کہ بھائیوں کی محبت ابھر آئی تھی۔

شاہ زیب ایک خوبصورت سا نوجوان لڑکا جواب صرف موت کا مسافر بن گیا تھا۔ ایک طرف پولیس اسے ہلاک کر دینا چاہتی تھی تو دوسری طرف اس کے دونوں بھائی اس کی جان کے گاہک بنے ہوئے تھے۔ یہ ساری باتیں اب شاہینہ کو محسوس ہو رہی تھیں۔ اس وقت دل کچھ ایسا گھبرایا کہ اپنی جگہ سے اٹھی اور یہ فیصلہ کر کے کمرے سے باہر نکلی کہ بھائیوں سے اس موضوع پر بات کرے گی اور اگر ہو سکا تو خود جہانزیب کے گھر واپس چلی جائے گی۔ وہ گھر تو اس کا اپنا ہے۔ بھائیوں کے ہاتھوں اسے یا اس کے شوہر کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو پھر ساری زندگی بھاوجوں کے ٹکڑوں پر پڑے رہنا پڑے گا۔ اپنی مرضی کے خلاف جینا پڑے گا۔ یہ تو کسی طور مناسب نہیں ہے۔ ادھر جبار خاں اور الیاس خاں مسلسل غم و غصہ کا شکار تھے۔ اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔

''ادھر سے کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ جہانزیب یا اورنگزیب نے شاہینہ سے بھی رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ برائی پر برائی ہو رہی ہے۔ بہت زیادہ چالاک بن رہے ہیں وہ لوگ اور وہ کتے کا بچہ ابھی تک آزاد پھر رہا ہے۔ لعنت ہے ہم پر کہ ایک بندے کو ہم قابو نہیں کر سکے۔ وہ ہر بار ہمارے منہ پر جوتا مار کر نکل جاتا ہے۔ کتنے جوتے کھائیں ہم بھائی جان!'' الیاس خاں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

''میں زندگی کے اس سب سے بڑے حادثے کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ جوڑی تھی میری' میری جوڑی بچھڑ گئی۔ آج جب ایک بیٹے کو اکیلا دیکھتا ہوں تو دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ دونوں ساتھ ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ نظر لگ گئی یار! نظر لگ گئی۔

مگر نہیں یہ کہنا بہت آسان ہے کہ نظر لگ گئی۔ برائی تو میں نے خود کی ہے۔۔۔ برائی تو میں نے خود کی ہے۔ مجھے میری برائی کا نتیجہ مل گیا۔ اس حرام زادے فخر خان نے یہ سارا چکر چلایا تھا۔ یہ تو اچھا نہیں ہوا بھائی! یہ تو اچھا نہیں ہوا۔ مجھے میرا انور بہت یاد آتا ہے۔ کیا کروں کیسے اس کتے کو دانتوں سے چباڈالوں۔ ارے میں کیا کروں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ میں کیا کروں؟'' الیاس خاں کے سینے میں بیٹے کا درد اٹھا تھا۔ جبار خاں نے کہا تھا۔

''دیکھو بھائی! ساری باتیں اپنی جگہ۔ ہم جہانزیب کو زندہ انہی زمینوں پہ جلادیں گے میرا مطلب شاہ زیب سے ہے۔ جہانزیب کے چھوٹے بھائی کو۔ ہم کو قرار آجائے گا اور اس کے بعد ہم ساری دشمنی ختم کردیں گے۔ ویسے میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔ بے شک وہ لڑکا بہت چالاک ہے۔ ایک طرف پولیس کو جل دے رہا ہے۔ دوسری طرف ہمارے آدمی آج تک اس کی تلاش میں ناکام رہے ہیں۔ پتہ ہی نہیں چل پاتا کہ کہاں ہے۔ باقی کام بھی اس نے کرڈالے۔ خیر دستاویزات کی چوری کے بارے میں رپورٹ درج کرائی ہے وہ ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ادھر ہماری رپورٹ پر بھی پولیس کچھ نہیں کرسکی ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ہی آدمی ناکام رہے ہیں، اور وہ نکمے ہیں پولیس بھی تو اس کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہے۔ کوئی کچھ نہیں کرپارہا اور وہ کامیاب زندگی گزار رہا ہے۔''

''ترکیب کیا بتارہے تھے تم؟'' الیاس خاں نے سوال کیا۔

''میں یہ کہہ رہا تھا کہ بھٹے کی تعمیر دوبارہ شروع کردی جائے۔ مزدور لگادیئے جائیں ادھر۔ اسے ضرور علم ہوجائے گا اس بات کا اور وہ بھٹے پر آئے گا۔ جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہے وہ کرنے آئے گا۔ ہم اپنے آدمی چھپا کر چاروں طرف پھیلا لیتے ہیں کہ اس بار اگر وہ ادھر پہنچ جائے تو اس کی روح بھی نکل کر نہ جاسکے۔ ہم اپنے آدمیوں کو ہدایت دے دیں گے کہ وہ اسے گولیوں سے چھلنی کردے۔ زندہ رہنے کا موقع ہی نہ دیں۔ اس کی لاش پر بھی ہم

دس بیس لاکھ کا انعام رکھ دیتے ہیں۔ میرا مطلب ہے خفیہ طور پر اپنے آدمیوں کو بتادیئے ہیں کہ اگر اس کی لاش انہوں نے ہمارے سامنے پیش کردی تو انہیں کتنا بڑا انعام دیا جائے گا۔

الیاس خاں غور کرنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

''ترکیب تو اچھی ہے بھٹے پر تعمیر شروع کردی جائے۔ وہ ضرور ادھر آئے گا۔ ایسا ہی کرتے ہیں۔ اسی وقت شاہینہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی اور وہ دونوں اسے دیکھ کر چونک پڑے تھے۔ شاہینہ خود بھی ایک چالاک عورت تھی۔ بھائیوں کے مزاج کو اچھی طرح جانتی تھی اور اب جبکہ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنے رویے کو بدلے گی اور اپنی عزت بنانے کی کوشش کرے گی۔ چاہے اس کے لیے اسے کتنی ہی محنت کیوں نہ کرنی پڑے۔ پھر اس نے بھی تھوڑی سی چالاکی سے کام کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ شاہینہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دونوں بھائیوں کے پاس پہنچ گئی۔ جبار خاں نے فوراً کہا۔

''آؤ شاہینہ! بیٹھو۔۔۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔ تم سے بھی مشورہ کرلینا اچھا ہوگا۔'' شاہینہ خاموشی سے بھائیوں کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ الیاس خاں تھوڑی دیر تک شاہینہ کا چہرہ دیکھتا رہا پھر مدھم لہجے میں بولا۔

''شاہینہ! ہم لوگ مسلسل ناکامیوں کا سامنا کررہے ہیں۔ وہ ٹانگ برابر لڑکا ہمیں نچاتا پھر رہا ہے۔ کیا یہ مناسب ہے؟''

''کون کہتا ہے بڑے بھائی جی!''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں اور اب ہم نے اسے پھانسنے کے لیے یہ ضروری سمجھا ہے کہ بھٹے کی تعمیر ایک بار پھر شروع کرادی جائے۔ اپنے آدمیوں کو چاروں طرف خفیہ طریقے سے پھیلا دیا جائے۔ جب بھٹے کی تعمیر شروع ہوئی تو وہ دیوانہ وہاں پھر آئے گا اور مداخلت کرنے کی کوشش کرے گا۔ بس اسی وقت اسے مارلیا جائے گا۔'' شاہینہ نے پرخیال

انداز میں گردن ہلائی اور بولی۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں بھائی جی! پر ایک بات بتاؤ اگر شاہ زیب آپ کے ہاتھوں مارا گیا تو جہانزیب کا رویہ میرے ساتھ کیسا ہوگا؟''

''ایسی تیسی اس سالے کی۔ ہاتھ پاؤں توڑ کر تیرے سامنے ڈال دیں گے شاہینہ! وہ تو بس بیوقوفی کا شکار ہو گئے۔ ورنہ جہانزیب اور اورنگزیب جیسے چھوٹے لوگوں کی یہ مجال کہاں کہ ہمارے سامنے آسکیں۔ ارے تیری وجہ سے تو ان کی جان بچی ہوئی ہے۔ ورنہ وہ حال کرتے ان کہ دنیا دیکھتی۔''

''مجھے یہاں آئے ہوئے سات آٹھ دن ہو گئے بھائی جی! ادھر کا کچھ حال معلوم ہے آپ کو؟''

''جہانزیب کے گھر کا؟''

''ہاں۔''

''نہیں ہمیں کیا معلوم۔''

''یہی میں کہنے آئی تھی آپ کے پاس۔ کیا آپ کے بندے اس حویلی کا گھیراؤ کیے ہوئے ہیں؟''

''نہیں ایسا تو نہیں کیا ہم نے کیونکہ یہ خطرناک بات ہوتی۔''

''بھائی جی! کون کہہ سکتا ہے کہ ہم لوگوں کے وہاں سے واپس آتے ہی شاہ زیب ایک بار پھر حویلی پہنچ گیا ہو۔ ظاہر ہے میری غیر موجودگی میں تو وہاں آسانیاں ہی آسانیاں ہیں۔''

''ارے ہاں۔ یہ بات تو ہم نے سوچی ہی نہیں تھی۔'' الیاس خاں نے جبار خاں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جبار خاں بھی چونک پڑا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''تب تو پھر ذرا سی غلطی ہو گئی بھائی جان! شاہینہ کو وہاں سے نہیں لانا چاہیے تھا کم از کم ہمیں۔ حویلی کے حالات تو معلوم ہوتے رہتے۔'' دونوں بھائی سوچ میں ڈوب گئے اور پھر جبار خاں نے کہا۔

''تو پھر اب کیا کیا جائے؟''

''میرے خیال میں کسی طرح کوشش کر کے شاہینہ کو حویلی پہنچا دیا جائے۔ ہمیں صورتحال کا پتہ چلتا رہنا چاہیے وہاں کی۔ ظاہر ہے وہ لوگ بھی چوہے نہیں ہیں ایک بری فضا پیدا ہو گئی ہے وہ بھی کوئی کارروائی کر سکتے ہیں کیوں شاہینہ؟''

''جیسا آپ پسند کریں بھائی! میں تو آپ سے ہر طرح تعاون کرنے پر آمادہ ہوں بلکہ میں اب یہ کوشش کروں گی کہ کوئی ایسی ترکیب نکالیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

''یہ دور لاٹھی کا نہیں بیٹا! سانپ کو مارنے کے لیے کچھ اور ہی بڑے اقدامات کرنے ہوں گے۔'' جبار خاں نے پر خیال انداز میں کہا۔

''تو پھر میرے لیے کیا حکم ہے بھائی جان؟''

''شاہینہ! تو اگر برا نہ مان تو واپس حویلی چلی جا۔ تجھے وہاں داخل ہونے سے کون روک سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ انتظار کریں میں چلی جاؤں گی۔'' جبار خاں اور الیاس خاں نے واقعی اس بات پر غور کیا تھا کہ شاہینہ اگر وہاں نہیں ہے تو حویلی کے حالات کا انہیں کبھی پتہ نہیں چلے گا۔ شاہینہ وہاں ان کی بہترین جاسوس تھی۔

چنانچہ انہوں نے شاہینہ کی واپسی کا انتظام کر دیا اور پھر دو دن کے بعد شاہینہ ساز و سامان سے لدی پھندی حویلی کی طرف چل پڑی اور حویلی میں داخل ہو گئی۔ جہانزیب اور

اورنگزیب نے اسے حیران نگاہوں سے دیکھا تھا۔ اورنگزیب تو خیر بھائی کی عزت کرتا تھا لیکن جہانزیب نے اس سے طنزیہ انداز میں کہا۔

''آیئے ملکہ عالیہ! آپ کی واپسی کیسے ہوگئی؟ ہم نے تو سنا تھا کہ آپ فوج تیار کرنے کے لیے گئی ہیں تا کہ ہماری مملکت پر حملہ کر کے یہاں قتل و غارت گری کریں اور اس کے بعد اس حویلی پر قبضہ کرلیں۔'' شاہینہ نے شکست خوردہ نگاہوں سے شوہر کو دیکھا اور بولی۔

''غلطی کر رہی تھی میں اب تک۔ غلطی انسان سے ہوتی ہے۔ یہ گھر امیرا ہے۔ میں نے اس گھر سے بے وفائی کی تھی لیکن جہانزیب میں برا وقت آنے سے پہلے واپس آ گئی ہوں۔ میری مدد کرو، مجھے سہارا دو۔ میں صحیح راستوں پر چلنا چاہتی ہوں۔ تم میری راہنمائی کرو۔ یہ نظرانداز کر کے کہ میں نے اب تک بھائیوں کے لیے اس گھر سے غداری کی ہے۔ مگر اب میں غدار نہیں رہ سکتی۔ ہم لوگ شاہ زیب کے موضوع پر بات کریں گے۔''

''شاہینہ! میں معافی چاہتا ہوں۔ اصل میں تمہارا تعلق ایسے لوگوں سے ہے جو نہایت چال باز ہیں۔ میں ان پر بھروسہ نہیں کرتا اور شاہینہ! یہ بات تم بھی جانتی ہو کہ تم نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا ہے بلکہ اگر برا نہ مانو تو میں تم سے یہ کہوں کہ جب الیاس خاں اور جبار خاں کو ان زمینوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے تمہیں شاہ زیب کا حصہ ہضم کرنے کی پٹی پڑھائی اور تم نے پورے گھر کو اس جنون کا شکار کر دیا۔ ہم لوگ بھی تمہارے انداز میں سوچنے پر مجبور ہو گئے اور آخر کار ہم نے اپنے بھائی کے ساتھ وہ ظلم کیا کہ اب وہ دربدر مارا مارا پھر رہا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ تمہارا بھتیجا اس کے ہاتھوں موت کا شکار ہوا لیکن مجھے بتاؤ تم کسی سے اس کے بدن کی کھال نوچ لو۔ تم اس کے سینے میں سوراخ کر دو تو وہ کیا کچھ نہیں کرے گا۔ اپنا بچاؤ تو ضرور کرے گا وہ شاہینہ! شاہ زیب کے ساتھ تو ایسا ہی ہوا ہے نا۔''

''ہاں شاہ زیب کے ساتھ بہت برا ہوا ہے مگر وقت ابھی ہمارے ہاتھ سے نہیں

نکلا۔ ہم اپنی برائی سے خود ہی نمٹیں گے۔ شاہ زیب کو زندہ رہنا چاہیے۔ ہم اس کے بارے میں سوچیں گے۔''

''شاہینہ! مجھے تم پر یقین نہیں آتا۔''

''جس طرح بھی تم یقین کرنا چاہو یقین کر لینا جہانزیب! میں وہاں سے بہت بدل کر آئی ہوں۔''

''وجہ سچ سچ بتانا۔''

''بس یہ سات آٹھ دن رہ کر میں نے محسوس کیا کہ اب اس گھر سے میرا وہ تعلق نہیں ہے جو کبھی تھا۔ جب تک میری شادی نہیں ہوئی تھی میں اس گھر پر حق رکھتی تھی اور اب میں اپنا حق چھوڑ کر وہاں چلی گئی تھی۔ اس کا مجھے بھرپور احساس اپنی بھابیوں کے رویے اور سلوک سے ہوا۔ بے شک بھائی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میرے لیے سب کچھ کرنے پر آمادہ رہتے ہیں اور آج بھی ان کے ذہنوں میں شاہ زیب کے خلاف برائی اور نفرت ہے لیکن اب میں ان کی ساتھی نہیں ہوں۔ انور اور امیر میرے اپنے بچوں کی طرح سے تھے لیکن شاہ زیب بھی تو میرا اپنا ہی ہے۔ مجھے اس کے لیے اسی انداز میں سوچنا ہوگا۔ باقی ابھی دیکھ لو کہ سب کچھ کیا ہے اور ہمیں کیا کرنا ہے۔ میری طرف سے ہو سکے تو اپنا ذہن صاف کرلو۔''

''وقت لگے گا شاہینہ اس میں۔'' چھ سات دن مزید گزر گئے۔ رفتہ رفتہ جہانزیب اور اورنگزیب کا رویہ بدلتا جا رہا تھا۔ کچھ شاہینہ نے بھی اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اپنے بدلے ہوئے رویے اور اپنے دل کی سچائی کا انہیں یقین دلا سکے۔

بہر حال یہ ساری باتیں ہو رہی تھیں۔ شاہ زیب کا اس کے بعد سے کوئی پتہ نہیں تھا ان لوگوں کو۔ وہ وہاں سے جانے کے بعد پھر واپس نہیں آیا تھا۔ شاہینہ نے کہا۔

''اگر شاہ زیب سے ہمارا رابطہ ہو جائے تو ایک کام کیا جا سکتا ہے۔''

''کیا---؟''

''دیکھو---میرا ماضی بہت خراب رہا ہے لیکن اب میں تم لوگوں کو یقین دلا رہی ہوں کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل بدل لیا ہے۔ میرے سوچنے کا اندازہ تبدیل ہو گیا ہے۔ پتہ ہے ان لوگوں نے کیا اسکیم بنائی ہے۔ انہوں نے یہ اسکیم بنائی ہے کہ بھٹے کی تعمیر دوبارہ شروع کرادی جائے اور اپنے آدمی جو شاہ زیب کی تلاش میں چاروں طرف بھٹک رہے ہیں۔ خفیہ طور پر ایسی جگہوں پر تعینات کر دیئے جائیں جہاں سے وہ شاہ زیب پر نگاہ رکھ سکیں۔ جب شاہ زیب کو بھٹے کی تعمیر کا علم ہوگا تو وہ اپنے شدید جذبات کا شکار ہو کر زمینوں پر پہنچے گا اور وہاں وہ لوگ اسے ختم کر دیں گے۔ یہ ان کا منصوبہ ہے۔ شاہ زیب کو اس منصوبے کی اطلاع ملنا بہت ضروری ہے۔ بہر حال شاہ زیب کے لیے میرے دل میں تو بس یہ خیال ہے کہ اسے کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر نکال دیا جائے کسی اور ملک بھیج دیا جائے۔ انتہائی خاموشی کے ساتھ۔ وہاں کچھ وقت وہ گزرے اور یہاں ہم اس کی زمینوں کی حفاظت کریں۔ میں خود بھی کوشش کروں گی کہ شاہ زیب کی دل شکنی نہ ہو اور جبار خاں اور الیاس خاں ان زمینوں پر بھٹہ بنانے کی کوشش نہ کریں۔ اصل میں مسئلہ کسی کاروباری منافع کا نہیں ہے۔ میرے دونوں بھائی فخر خان سے پرخاش رکھتے ہیں اور اسے نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ بہر حال یہ میری تجویز ہے۔ آپ لوگ غور کرلیں۔ میرے سلسلے میں اگر اعتماد کرنا چاہیں تو کرلیں۔ ورنہ خفیہ طریقے سے ہی شاہ زیب سے رابطہ قائم کر کے یہ کام کرڈالیں۔ دو چار سال باہر رہے گا۔ اس کا ذہن بھی اعتدال پر آجائے گا۔ یہاں اس کے خلاف جو کام ہو چکے ہیں وہ بھی رفتہ رفتہ ماند پڑ جائیں گے۔ جہانزیب اور اورنگزیب پرخیال انداز میں گردن ہلانے لگے۔

☆☆☆

''کیا؟'' فخر خان اچھل پڑا۔ اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو پھر سے بتاؤ؟''

''جی چوہدری جی! وہ بھاگ گیا' لاک اپ کا تالہ کھلا پڑا ہے جی اور منیر شاہ بڑا زخمی ہو گیا ہے۔ بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ ہم نے اٹھا کر ایک طرف لٹایا ہے۔ ابھی تک ہوش میں نہیں آیا جی۔ خون ہی خون پڑا ہوا ہے جی وہاں۔''

''تاجہ!'' فخر خان کی غرائی ہوئی آواز ابھری اور وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ تیزی سے دروازے سے باہر نکلا۔ اطلاع دینے والے دونوں آدمی اس کے پیچھے پیچھے چلے تھے اور لاک اپ کے دروازے پر پہنچ گئے تھے۔ کھلے ہوئے تالے کو دیکھا گیا' کمرے کی تلاشی لی گئی اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی جانے لگی کہ تاجو کے وہاں سے نکل جانے کا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے۔

فخر خان نے منیر شاہ کو دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یہ تو سب مٹی کے ڈھیر تھے۔ اس سے بھلا کسی کو کیا لینا ہے۔ ان کا تو کام ہی یہ ہوتا ہے کہ مالک پر نثار ہو جائیں۔ مر جائیں' قتل ہو جائیں اور اس سے زیادہ ان کا مصرف کیا ہو سکتا ہے لیکن یہ ذرا شرمناک بات تھی کہ فخر خان کی قید سے ایک معمولی سا آدمی بھاگ جائے اور اس کے ایک خاص آدمی کو زخمی کر دے۔ فخر خان دیر تک اپنے لاک اپ کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''تاجو کا باپ بھی اس طرح سے یہاں سے نہیں نکل سکتا تھا۔ یہ باہر کے بندے کا کام ہے اور باہر کا بندہ کون ہو سکتا ہے۔ یہ پتہ لگانا پڑے گا۔ کہاں ہے وہ نکما' جو مار کھا گیا' سو گیا ہوگا حرامی اور سوتے ہونے میں مار کھا گیا ہوگا۔ ورنہ ویسے تو دو چار آدمیوں کے بس کا نہیں ہے۔ کدھر مر رہا ہے وہ؟ مر جائے گا یا زندہ بچ جائے گا؟''

''سائیں جی! ادھر لٹا دیا ہے ہم نے زمین پر۔''

''آؤ'' فخر خان نے کہا اور اپنے آدمیوں کے پاس پہنچ گیا۔ جہاں منیر شاہ لمبا لمبا پڑا ہوا تھا۔ اس کے بے شمار چوٹیں تھیں۔ جس پر اب خون کی موٹی موٹی تہیں جمتی جا رہی تھیں وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور اسے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر ایک زوردار ٹھوکر اس کے پیٹ پر ماری اور بولا۔

''کتے کے بچے! جانوروں کی طرح کھاتا ہے اور اب کتوں کی طرح مرا پڑا ہے۔ ڈاکٹر کو بلاؤ اس سے کہو اس کی مرہم پٹی کرے۔ اسے کسی کمرے میں لٹا دو۔ میں ڈاکٹر کو فون کر کے خود بھیجتا ہوں اس کے پاس۔'' یہ کہہ کر فخر خان واپس چل پڑا۔

پھر اس نے ایک ڈاکٹر کو فون کیا جو اس کا اپنا آدمی تھا اور تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر اس کے پاس پہنچ گیا۔

''منیر شاہ زخمی ہو گیا ہے اس کی مرہم پٹی کرو۔ اور اس کے بارے میں رپورٹ مجھے آ کر دو۔ اسے لے جاؤ'' ڈاکٹر کو تھوڑی سی تفصیل بتا دی گئی تھی۔ وہ تمام سامان لے کر آیا تھا۔ منیر شاہ کے زخموں کی دیکھ بھال کی گئی۔ اسے تین انجکشن دیئے گئے اور بتا دیا گیا کہ اس کی کیا احتیاطی تدابیر کرنی ہیں۔ پھر ڈاکٹر فخر خان کے پاس پہنچ گیا۔

''خان جی! وہ تو بہت شدید زخمی ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اسے بری طرح مارا گیا ہے۔ دیواروں سے ٹکرایا گیا ہے۔ چوٹیں شدید ہیں لیکن زندگی کو خطرہ نہیں ہے۔ کیونکہ جاندار بندہ ہے زخموں کو جھیل جائے گا۔''

''تمہارے خیال میں ڈاکٹر اسے کتنے بندوں نے مارا ہے؟''

''خان جی! اس کے ذخموں سے یہ تو نہیں پتہ چل سکتا لیکن جتنا لمبا چوڑا وہ ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم چار چھ بندے ہوں گے جنہوں نے مل کر اسے قابو کیا ہوگا۔''

''چار چھ بندے ہماری اس حویلی میں کہاں سے آ گئے۔ حویلی میں تو ہمارا مخالف

ایک بھی بندہ نہیں ہے اور جو ہمارے مخالف ہوتے ہیں وہ تو اپنے ہاتھ پاؤں تڑوا چکے ہوتے ہیں یا پھر حویلی سے باہر ہوتے ہیں۔ یہ اندر کون آ گیا یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔''

''خان جی! حویلی میں آپ کا کوئی جاسوس نہیں ہے۔''

''دفعہ ہو جاؤ۔ نہ میں تم سے مشورہ مانگ رہا ہوں اور نہ مجھے مشورہ دینے کی کوشش کرو۔ تمہیں یہ سوال کرنے کی ہمت کیسے ہوئی؟''

''معافی چاہتا ہوں خان جی! آپ کا ہمدرد ہوں' آپ کا نمک خوار ہوں اس لیے یہ سوال کر ڈالا تھا۔''

''نہیں۔ بہت سے ہمدرد ہیں میرے' بہت سے میرا نمک کھاتے ہیں لیکن سب کو اپنی اپنی اوقات میں رہنا چاہیے۔ تم جاؤ یہاں سے اور مجھے یہ بتا کر جاؤ کہ اس کی حالت کب تک درست ہو جائے گی یا مجھے ابھی تمہاری ضرورت اور پڑے گی؟''

''خان جی! شام کو ایک چکر میں تو ضرور لگاؤں گا۔ اس کی کیفیت دیکھنے کے لیے ابھی میں نے اسے ایک انجکشن دیا ہوا ہے۔ جس سے وہ گہری نیند سوتا رہے گا۔ دو تین گھنٹے کے بعد جاگے گا۔''

''جاگے تو ٹھیک ہوگا۔ میں اس سے پوچھ تو سکتا ہوں نا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا؟''

''ضرور خان جی ضرور۔''

''جاؤ۔''

ڈاکٹر اپنا سامان سمیٹ کر تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد فخر خان کافی دیر تک سوچتا رہا۔ شدید ذہنی الجھن کا شکار تھا۔ زندگی میں لاتعداد واقعات پیش آئے تھے۔ کبھی نفع کبھی نقصان ہوا تھا لیکن کوئی اس کی حویلی سے نکل کر اس طرح نہیں بھاگ سکا تھا۔ یہ بالکل اجنبی بات تھی۔ حویلی میں لازمی طور پر اس کے مخالف بھی موجود

ہوں گے لیکن اس کے مخالف یہ بات جانتے تھے کہ اگر فخر خان کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھایا تو پتہ تو چل ہی جائے گا لیکن اس کے نتیجے میں جو کچھ ہوگا وہ بہت برا ہوگا۔ اس کا انہیں بھرپور اندازہ تھا۔

فخر خان بہت دیر تک سوچتا رہا۔ ذہن مسلسل دوڑ رہا تھا کہ آخر ایسا کون ہوسکتا ہے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال انتظار کرنا پڑا۔ پھر اسے اطلاع ملی کہ منیر شاہ کو ہوش آ گیا ہے۔ فخر خان نے اپنے آدمیوں سے کہہ دیا تھا کہ کوئی بھی منیر شاہ کے پاس نہ پھٹکے۔ بس اسے یہ اطلاع دے دی جائے کہ وہ ہوش میں آ گیا ہے۔ فخر خان نہیں چاہتا تھا کہ منیر شاہ کسی اور کو کچھ بتائے پھر جب منیر شاہ کے ہوش میں آنے کی اطلاع ملی تو فخر خان اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ منیر شاہ کے بدن پر پٹیاں کسی ہوئی تھیں۔ اس نے فخر خان کو اٹھ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ فخر خان نے انگلی اٹھا کر غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''صرف زندہ رہنا ہے تجھے پڑا رہ اسی طرح جو پوچھوں وہ بتا۔ زبان موجود ہے تیری یا کاٹ دی گئی ہے۔'' منیر شاہ نے سہمی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر اٹھنے کی کوشش ترک کر دی۔

''کتے! جانوروں کی طرح کھاتا ہے یہ تیری مردانگی ہے' کس نے مارا ہے تجھے۔ مجھے بتا کس نے مارا ہے' تاج نے' دو کوڑی کے اس آدمی نے' کیا کیا تھا' گردن پکڑی تھی تیری۔ چابی چھین لی تھی تجھ سے کیا کیا تھا اس نے آخر کیسے وہ نکل کر بھاگا؟''

''خان جی! خان جی! میں--- میں تو اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا خان جی! مگر وہ---وہ---وہ---وہی تھا آپ کو قسم کھا کر بتاتا ہوں میں۔''

''کون---؟ تیرا مردہ باپ یا دادا کس کی بات کر رہا ہے' کس کا نام لے رہا ہے؟''

''خان جی! شاہ زیب کی بات کر رہا ہوں۔''

''کس کی؟''

''قسم لے لیجئے خان جی! وہ شاہ زیب ہی تھا۔''

''کون---؟ کیا--- کیا بکواس کر رہا ہے تو؟''

''شاہ زیب کی مجھ سے دو بدو لڑائی ہوئی تھی جی۔ آمنے سامنے تھے ہم۔ مگر وہ چالاکی سے مجھ پر قابو پانے میں کامیاب ہوگیا۔ اصل میں خان جی! مجھے یہ بھی تو نہیں پتہ تھا کہ اگر وہ میرے ہاتھوں مارا گیا تو آپ کو کیا احساس ہوگا۔ خان جی! آپ کے ڈر کی وجہ سے میں اس سے مار کھا گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اگر میں اس پر ہاتھ اٹھا دوں گا تو آپ کو کیسا لگے گا اور آپ میرے ساتھ کیسا سلوک کریں گے۔ اس نے مجھ سے بھرپور جنگ کی۔''

''اور پھر؟''

''بس خان جی! میں بے ہوش ہوگیا اس کے بعد مجھے کچھ نہیں معلوم۔''

''شاہ زیب نے تجھ سے جنگ کی۔ کیا بکواس کر رہا ہے' تو نے خود اس کی حالت دیکھی ہے ابھی تو اس کے زخموں پر صحیح طرح سے کھرنڈ بھی نہیں آیا اور پھر کہاں تو اور کہاں وہ؟ اس جیسے چار بندے مل کر تجھے نہیں گرا سکتے۔ اس کا مطلب ہے کہ تو بکواس کر رہا ہے اور جھوٹ بھی بول رہا ہے۔ تو ان لوگوں کو جانتا ہے جنہوں نے تجھے زخمی کیا؟''

''خان جی! آپ کے سامنے بھلا میں کیوں جھوٹ بولوں گا جبکہ بات بھی میرے دشمنوں کی ہو رہی ہے۔''

''ہوسکتا ہے اس کی وجہ کچھ اور ہوسکتی ہے۔ میری عقل بالکل کام نہیں کرتی۔ ایک بندے کی بات کرتا ہے۔ ایک بندہ تجھ پر قابو پا سکتا ہے کیا؟''

''خان جی! اس نے مجھ پر قابو پالیا تھا۔''

''جھوٹ بولتا ہے۔ بکواس کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں بکواس کرتا ہے تو۔''

''خان جی! آپ اس سے پوچھ لیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اسے مجھ سے کیا دشمنی ہوگئی لیکن وہ وہی تھا۔ خان جی! میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں؟''

''یقین کرلوں گا۔ میں یقین کرلوں گا۔ مگر ایک بندہ تجھ سے نہیں سنبھالا گیا۔ کھوتے دے پتر! اس لیے تو اتنا کھاتا پیتا ہے۔ اس لیے تو نے اتنی جان بنائی ہے۔ تیرے مقابلے میں تو وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک بندہ صرف ایک بندہ۔''

''خان جی! ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے بیٹے! ابھی بستر پر پڑا رہ۔ یہ زخم تو تیرے کچھ بھی نہیں ہیں۔ تیرے زخم تو میں لگاؤں گا۔ منہ پر دوسرا جوتا پڑا ہے میرے۔ ایک جوتا تاجو نے عدالت میں مارا تھا اور دوسرا جوتا آج اس نے میرے منہ پر یہ مارا ہے کہ باہر نکل گیا ہے وہ میری حویلی سے باہر نکل گیا ہے۔ کیوں یہی ہوا ہے نا؟''

''خان جی! آپ جو کچھ بھی سمجھیں۔ بس میں آپ کو یہی بتاؤں کہ دھوکے سے مارا گیا ورنہ اتنا آسان نہیں تھا یہ۔'' فخر خان اسے گھورتا ہوا وہاں سے باہر نکل آیا اور اس کے بعد اس نے شاہ زیب سے ملاقات کی۔

شاہ زیب اپنے کمرے میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور نائلہ اس کے لیے اس وقت چائے بنا رہی تھی۔ فخر خان کو دیکھ کر نائلہ سنبھل گئی۔ اس نے چائے کی پیالی شاہ زیب کے سامنے رکھی اور گردن جھکائے وہاں سے باہر نکل گئی۔ شاہ زیب نے سنبھل کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ فخر خان گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ شاہ زیب کے چہرے پر سادگی ہی سادگی نظر آرہی تھی۔

''کیسے ہو تم؟'' فخر خان نے بھاری لہجے میں کہا۔

''خان جی! آپ کی دعاؤں میں زندہ ہوں۔''

''ہوں' زخم کیسے ہیں تمہارے؟''

''ٹھیک ہیں خان جی۔''

''تم یہاں سے اٹھ کر باہر جاتے ہو؟''

''جی خان جی! ڈاکٹر کی ہدایت ہے کہ تھوڑا بہت چلا کروں۔ چلتا ہوں خان جی' ٹھیک ہوں اب۔ آپ کی محبت ہے' زخموں میں بھی تکلیف نہیں ہے۔''

''میں نے ڈاکٹر کو بلایا ہے کہ تمہارے بارے میں مجھے رپورٹ دے اور یہ بتائے کہ اب تم کب تک بھاگ دوڑ کے قابل ہو جاؤ گے۔ میں پہلے بھی تم سے کہہ چکا ہوں کہ میری تمہاری کوئی رشتے داری نہیں ہے۔ نہ مجھے اس بات سے دلچسپی ہے کہ تمہاری زمینوں پر الیاس خاں اور جبار خاں بھٹہ بنا رہے ہیں۔ میں اگر نہیں چاہوں گا تو کسی قیمت پر بھٹہ نہیں بنے گا۔ تم جس طرح سے اسے روکنا چاہتے ہو مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تمہارا سو فیصدی ذاتی معاملہ ہے۔ میں نے جو تم پر محنت کی ہے وہ بالکل ایک الگ کام کے لیے کی ہے۔ تمہیں میرا ایک کام کرنا ہے اور یہ تمہارے لیے بھی ضروری ہے۔''

''خان جی! آپ نے جس طرح میرا علاج کرایا ہے اور مجھے محفوظ رکھا ہے۔ اس کے لیے میں آپ کا احسان مند ہوں اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے تو سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میرے معاملات آپ کے علم میں ہیں۔ بلاوجہ کچھ لوگوں نے مجھ سے دشمنی پال لی ہے اور میں اس دشمنی کو نبھا رہا ہوں۔ زمینوں پر بھٹہ تو خیر نہیں بننے دوں گا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی مجھے اب کسی کے تحفظ کی ضرورت بھی ہے۔ ہر شخص کے سر پر کسی نہ کسی ہاتھ کا سایہ ہوتا ہے۔ میرے بھی دو بھائی ہیں لیکن وہاں میری ایک دشمن بھی ہے۔''

''کون؟''

''میری بھاوج' جو الیاس خاں اور جبار خاں کی بہن ہے۔''

''شاہینہ؟''

''جی ہاں جی انہی کی بات کر رہا ہوں۔ وہ میری بھاوج ہے لیکن میری بھاوج کم اور الیاس خاں اور جبار خاں کی بہن زیادہ ہے۔ ان لوگوں نے میری ساری دولت اور جائیداد ہڑپ کر لی ہے۔ آپ یقین کرو خان جی مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اس کی طلب لیکن بھٹہ نہیں بننے دوں گا جب تک زندہ ہوں۔ تو خان جی مجھے ویسے بھی آپ کی مدد اور سہارے کی ضرورت ہے۔''

''کوئی بھی چیز بلاوجہ کوئی کسی کو نہیں دیتا۔ میرے دوست تمہیں میرا ایک کام کرنا ہے اور ہر قیمت پر کرنا ہے۔''

''خان جی! اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مجھ جیسا آدمی کوئی کام کرسکتا ہے تو آپ سمجھ لیجئے کہ میں دل و جان سے آپ کا وہ کام کروں گا۔'' کچھ ہی لمحوں کے بعد ڈاکٹر آ گیا تھا۔ فخر خان نے کہا۔

''ڈاکٹر! ذرا اس کے زخموں کو دیکھو کوئی زخم ہرا تو نہیں ہوا ہے۔ کسی زخم کا کھرنڈ تو نہیں ٹوٹا ہے۔ نجانے کیوں مجھے یوں لگ رہا ہے کہ جیسے اس بندے نے کوئی جدوجہد کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب! ایسا کوئی بندہ جو زخمی ہو اور اس کے زخموں پر کھرنڈ آ رہے ہوں کسی قسم کی زبردست مشقت کرتا ہے تو کھرنڈ کے ٹوٹ جانے کا خطرہ ہوتا ہے ناں۔ یا ایسی علامات اس کے جسم پر ہوتی ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحت مند ہونے سے پہلے اس نے یہ عمل کیا ہے۔''

''سو فیصدی ہوتے ہیں خان جی! سو فیصدی ہوتے ہیں۔''

''میں یہی چیک اپ کرانا چاہتا ہوں اس کا۔'' فخر خان نے کہا اور ایک لمحے کے لیے شاہ زیب کے دل میں خوف کا گزر ہوا۔ اگر کسی طرح ڈاکٹر نے فخر خان کے سامنے یہ

بیان کر دیا کہ شاہ زیب کے زخموں کے کھرنڈ ٹوٹ گئے ہیں اور اس نے کوئی جسمانی جدوجہد کی ہے تو سو فیصدی فخر خان کا شبہ شاہ زیب پر ہی جائے گا۔ جبکہ شاہ زیب محسوس کر رہا تھا کہ فخر خان اپنے ہاں ہونے والی واردات کی تفتیش کر رہا ہے اور یہ جاننا چاہتا ہے کہ تاجو اس کے قبضے سے کیسے نکل گیا۔

بہر حال یہ ایک سنسنی خیز لمحہ تھا۔ ڈاکٹر نے خود اپنے ہاتھوں سے ایک مناسب حد تک شاہ زیب کے کپڑے اتارے اور پھر بڑی احتیاط سے اس کا چیک اپ کرنے لگا۔ شاہ زیب بالکل ساکت تھا۔ ڈاکٹر نے کوئی پندرہ منٹ تک یہ معائنہ جاری رکھا اور اس کے بعد اس نے کہا۔

''نہیں خان جی! کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ ابھی اس کے زخم کمزور ہیں۔ اگر اس نے ذرا بھی کسی قسم کی مشقت کی۔ کہیں کسی سے زور آزمائی کی تو اس کے کھرنڈ ٹوٹ جائیں گے اور زخم ہرے ہو جائیں گے۔ میں نے اسے احتیاط بتا دی تھیں۔ پر پتہ نہیں یہ احتیاط کر رہا ہے یا نہیں۔ پھر بھی خان جی ابھی تک کوئی علامت اس کے بدن پر نہیں ملتی۔'' فخر خان نے گردن ہلا دی تھی پھر فخر خان ڈاکٹر کے ساتھ وہاں سے نکل گیا اور شاہ زیب ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلانے لگا۔

وہ بچ گیا تھا۔ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں تھا کہ فخر خان تاجے کے فرار کے سلسلے میں تفتیش کر رہا تھا۔ نائلہ اس دن اسے ملی ہی نہیں تھی لیکن دوسرے دن معمول کے مطابق اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''اللہ تعالیٰ نیک کام کرنے والوں کی مدد کرتا ہے۔ اسے تم پر شبہ نہیں ہو سکا۔ اللہ کا شکر ہے۔'' شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر چند روز گزر گئے اور پھر ایک دن وہی ڈاکٹر شاہ زیب کے پاس پہنچا۔ ایک اور

آدمی بھی ساتھ تھا۔ ڈاکٹر نے پوری طرح ٹھوک بجا کر شاہ زیب کا معائنہ کیا اور اس کے بعد وہ مسکراتا ہوا بولا تھا۔

''اب تو تم بالکل ٹھیک ہو شاہ زیب! کوئی کمزوری پاتے ہو اپنے اندر؟''

''نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں بالکل۔''

''خان جی! نے مجھے یہی کہا تھا کہ تمہیں اچھی طرح چیک کر کے انہیں رپورٹ دوں۔ شاید وہ تم سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں۔'' شاہ زیب مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو گیا تھا۔

پھر رات کو نہانے کے بعد ایک آدمی اس کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ خان جی اسے طلب کر رہے ہیں۔ شاہ زیب اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔

فخر خان کی اعلیٰ درجے کی حویلی میں شاہ زیب کئی راہداریاں طے کرتا ہوا ایک بڑے سے کمرے میں پہنچ گیا اور اس کمرے میں اس نے فخر خان کو دیکھا جو ایک آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس کے برابر شراب کے برتن رکھے ہوئے تھے اور گلاس میں شراب نظر آ رہی تھی۔ برابر میں ایک ایش ٹرے رکھا ہوا تھا۔ ایش ٹرے پر آدھی جلی ہوئی سگریٹ' فخر خان کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاہ زیب سلام کر کے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ فخر خان اس طرح اسے دیکھ رہا تھا جیسے اسے اپنی آنکھوں سے کچھ نظر نہ آ رہا ہو۔ آدھ کھلی آنکھوں سے وہ دیر تک شاہ زیب کو دیکھتا رہا اور شاہ زیب اسی طرح پتھر کے بت کی مانند کھڑا رہا۔

بہرحال اب ساری دنیاداری اسے آ گئی تھی اور وہ جانتا تھا کہ اس طرح کے لوگوں کے درمیان کیسے وقت گزارا جاتا ہے۔ دفعتاً ہی فخر خان اس طرح چونکا جیسے سوتے سوتے جاگ گیا ہو۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پہلے سگریٹ کی طرف پھر گلاس کیطرف اس کے بعد اس نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ گلاس کی شراب حلق میں انڈیلنے کے بعد اس نے

گلاس رکھا اور ایک نگاہ سر سے پاؤں تک شاہ زیب پر ڈالی۔ پھر بولا۔

''تمہارے دونوں بھائی بھی تمہاری طرح جاندار ہیں؟''

''مہربانی ہے خان جی کی۔ ہم تینوں بھائی اچھے قد و قامت کے مالک ہیں۔''

''ہوں۔ کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہو خان جی! بالکل ٹھیک ہوں۔''

''ہمارے تمہارے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا۔ اور وہ معاہدہ یہ تھا کہ تم میرے لیے ایک کام کرو گے۔''

''جی خان جی! مجھے یاد ہے۔''

''ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تم اب بالکل فٹ ہو۔''

''یہ بھی آپ ہی کی مہربانی ہے۔''

''مانتے ہو اس بات کو۔''

''کیوں نہیں خان جی!''

''حالانکہ تمہیں پتہ نہیں ہوگا کہ پولیس والے ہمارے آس پاس چکراتے رہے ہیں۔ انہیں شبہ تھا کہ تم اس طرف آئے ہو۔ یہاں تک آنے کی ہمت تو نہیں کی انہوں نے۔ مگر ہمارے علاقے کی سرحدوں پر گھومتے رہے ہیں۔ ہم نے تم سے تمہاری حفاظت کا وعدہ کیا تھا اور یہ بھی معلوم تھا ہمیں کہ اس کے بعد تمہیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ اس لیے میدان صاف کرنا ضروری تھا۔ بیس بندے بھیجے ہم نے اور ان دس آدمیوں کو پکڑوا کر بلوایا۔ جو پولیس کی وردی میں ایک ایس آئی کی نگرانی میں یہاں گشت کرتے تھے۔ پھر ہم نے ان کے دماغ درست کر دیے۔ پہلے تو ان کی وردی اتروائی اس کے بعد انہیں کمرے میں بند کر دیا اور پھر پوچھا کہ وہ یہاں کیوں بھٹک رہے ہیں۔ بعد میں بڑی معافی تلافی ہوئی۔ دوسرے

پولیس کے آفیسر انہیں بچانے کے لیے آئے۔ ہم نے خود انہیں اطلاع کرائی تھی اور اس کے بعد ہم نے انہیں برا بھلا کہہ کر جانے کی اجازت دے دی۔ یہ سب ہم نے تمہاری وجہ سے کیا۔ اب بولو کیا کہتے ہو؟''

''خان جی! ہم نے تو پہلے ہی دن آپ سے عرض کر دیا تھا کہ آپ کے ہر حکم کی تعمیل دل و جان سے کروں گا۔'' شاہ زیب نے جواب دیا اور فخر خان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ شاہ زیب کو اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا کہ فخر خان بہت زیادہ شیخی بگھارنے کا عادی ہے۔ پولیس کے ساتھ اُس نے یہ کیا یا نہیں کیا یہ ایک الگ بات ہے لیکن بہر حال شاہ زیب کو یہ معلوم تھا کہ الیاس خاں اور جبار خاں اس کے مقابل آ کر بھٹہ بنانا چاہتے تھے اور شاہ زیب فخر خان کو اس طرح اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے بڑی سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔ فخر خان نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر پتر تو بھی یہ خیال رکھنا کہ فخر خان کا ہاتھ جس کے کندھے پر پہنچ جاتا ہے وہ اپنی زندگی پر فخر کرتا ہے سمجھا۔ بڑا کام نہیں مجھ کو تجھ سے، پر فخر کی اپنی پالیسی ہے۔ جس سے وہ کیا کام لینا چاہتا ہے یہ وہی جانتا ہے اور اس کی وجہ بھی وہی جانتا ہے تجھے اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ میرے لیے کسی بندے کو مار دینا کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن کون سے بندے کو کس کے ہاتھوں مارنا ہے یا مروانا ہے یہ بالکل الگ بات ہے۔''

''جی خان جی!'' شاہ زیب نے کہا۔

''ایک بندہ مارنا ہوگا تجھے میرے لیے، فی الحال یہی کام ہے میرا تجھ سے۔ اب یہاں تک میں بہت سی باتیں کر چکا ہوں تجھ سے ان کی ذمے داری میں قبول کرتا ہوں۔''

''بندہ کون ہے خان جی! بات اصل میں یہ ہے کہ زرعی یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ ہوں میرا کام زمینوں سے کونپلیں اگانا اور ان کی آبیاری کرنا ہے۔ بندے کو نقصان پہنچانے کا

کبھی تصور بھی نہیں کیا لیکن وقت مجھ سے یہی چاہتا ہے تو یہی سہی۔ الیاس خاں اور جبار خاں نے مجھے قتل و غارت گری کے چکر میں لگایا ہے تو ٹھیک ہے۔ ایک قتل کر دیا چھ کر دو سزا موت کی ہی ہوتی ہے۔ آپ حکم دیں خان جی کون ہے یہ بندہ؟''

فخر خان نے لباس سے ایک تصویر نکالی جو براؤن رنگ کے ایک لفافے میں رکھی ہوئی تھی۔ اس نے یہ تصویر شاہ زیب کے سامنے کر دی اور شاہ زیب نے ادب سے اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا پھر اس نے اس کا چہرہ دیکھا اور ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں تاریکی چھا گئی۔ دماغ پر بڑے زور کا دھچکا لگا تھا۔ پورے وجود پر سنسناہٹ دوڑ گئی تھی۔

تصویر مکرم شاہ کی تھی۔ لیکن یہ مکرم شاہ کی نہیں بلکہ مکرم شاہ کے اس ہمشکل کی جو دونوں پیروں والا تھا اور جس نے اس پر زندگی بچا کر احسان کیا تھا اور اسے چھوڑ دیا تھا۔ یہ سارے احساسات اور خیالات شاہ زیب کے ذہن میں آ رہے تھے لیکن اس وقت فخر خان جیسے چالاک آدمی کے سامنے اپنے آپ کو چھپانا تھا اور چہرے کے تاثرات کا سنبھالنا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے بدن کی لرزشوں پر قابو پایا اور گردن خم کر کے بولا۔

''خان جی! اس بندے کے بارے میں تفصیلات؟''

''ہاں۔ یہ ایک بڑا آدمی ہے یوں سمجھ لو خاصا بڑا زمیندار ہے اور اس نے ایک شاندار حویلی بنائی ہوئی ہے اس کی زمینیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔''

فخر خان مکرم شاہ کے ہمشکل کے بارے میں اسے تفصیلات بتاتا رہا اور شاہ زیب نے یہ اندازہ ضرور لگا لیا کہ فخر خان کو تصویر دیکھنے کے بعد شاہ زیب کی حالت کا اندازہ نہیں ہو سکا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ شاہ زیب کو تصویر دینے کے بعد شاید فخر خان کسی خیال میں ڈوب کر دیوار پر لگی ہوئی تصویر کو دیکھنے لگا تھا۔ بہر حال شاہ زیب کو فوراً ہی ری ایکشن دینا تھا ورنہ فخر خان جیسے شیطان کے چنگل سے نکلنا آسان کام نہیں تھا۔ اس نے کہا۔

"خان جی! اس کی پوری تفصیلات مجھے دے دی جائے۔ آپ بے فکر رہیں یہ بندہ بہت جلد موت کے گھاٹ اتر جائے گا۔"

"ہاں یہی میں چاہتا ہوں اس کی زندگی کے دن بہت زیادہ نہیں بڑھنے چاہئیں۔" فخر خان شاہ زیب کی کیفیت سے بے نیاز مکرم شاہ کے ہم شکل کے بارے میں تفصیلات بتاتا رہا۔ ساری تفصیل تو پہلے ہی شاہ زیب کو معلوم تھی وہ صرف گردن ہلا کر ہاں ہاں کرتا رہا اور پھر فخر خان نے کہا۔

"تم مجھے اس بندے کے قتل کی اطلاع دو گے اور سنو کبھی اگر پولیس تمہارے پاس پہنچ جائے تو خاموشی سے ان کے ساتھ چلے جانا۔ ان سے مقابلہ مت کرنا جب وہ لوگ تمہیں تھانے لے جائیں یا کہیں بھی لے جائیں تم ان سے صرف اتنا کہنا کہ بس ایک بار خان جی کے موبائل پر فون کر لیں۔ باقی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہاں! اگر ایاس خان کے آدمی کہیں تمہیں ٹکرا جائیں تو پھر تم انہیں بھون کر رکھ دینا۔ اس کی میں تمہیں اجازت دیتا ہوں اور تم خود بھی جانتے ہو کہ بندہ ایک مارو یا دس سزا ایک ہی ہوتی ہے۔" فخر خان یہ کہہ کر ہنسنے لگا اور پھر بولا۔

"اور سزا بالکل نہیں ہوتی اگر فخر خان تم سے یہ کہہ دے کہ بندے مار دو۔"

"جی خان جی!" شاہ زیب نے مودبانہ انداز میں گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے تیاریاں کرو۔" یہ کہہ کر فخر خان نے واپسی کے لیے قدم اٹھا دیئے۔

شاہ زیب خاموشی سے اسے دیکھتا رہا تھا پھر وہ خاموشی سے اپنی آرام گاہ میں واپس آ گیا۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد اسے ایک شخص سے بات کرنی پڑی اس کا نام وزیر خاں تھا۔ وزیر خاں خود ہی اس کے کمرے میں پہنچا تھا اور اس نے کہا تھا۔

"تم رات کو یہاں سے نکلو گے۔ یہ تمہارے لیے رائفل ہے یہ اس کا میگزین اور

یہ پستول اسے سنبھال کر اپنے اندرونی لباس میں پوشیدہ کر لو۔ یہ اس کا میگزین ہے۔" اس نے ایک مخصوص طرز کی پیٹی شاہ زیب کو دکھاتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔

"اس کے علاوہ یہ چار پتے نوٹ کر لو۔ یہ تمہارے پوائنٹس ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر کوئی وقت پیش آ جائے، کوئی ضرورت پیش آ جائے۔ کہیں پناہ لینا چاہو تو ان چاروں جگہوں پر جا سکتے ہو۔ نام وغیرہ لکھے ہوئے ہیں یہ دیکھو یہ نواز خاں ہے چک نمبر ستائیس نواز خاں کا گھر کا نمبر اٹھائیس ہے۔ اس کے بارے میں کسی سے بھی پوچھ سکتے ہو۔ کپڑے کی دوکان کرتا ہے لیکن صرف دکھانے کے لیے لیکن خان جی کا خاص بندہ ہے اور یہ رفاقت ہے۔ رفاقت علی شاہ آفت کی پڑیا ہے یہ جس کی جان کے پیچھے لگ جائے سمجھ لو وہ مشکل میں گھر گیا۔" وزیر خاں ان سب کے بارے میں تفصیل بتانے کے بعد بولا۔

"یہ کرنسی ہے۔ چھوٹی کرنسی خان صاحب نے صرف اس لیے دی ہے کہ تمہیں راستے میں انہیں خرچ کرنے میں دقت نہ ہو۔ ویسے ان پوائنٹس سے تم جب بھی چاہو اور جہاں بھی چاہو جو ضرورت تمہیں ہو وہ لے سکتے ہو اور کوئی بات ہو تو مجھے بتاؤ۔"

"نہیں اور کیا رہ جاتا ہے۔ خان جی نے ساری ضرورتیں تو پوری کر دی ہیں۔ یہ تصویر میں اپنے پاس رکھوں یا تم اسے واپس لے جانا چاہو تو واپس لے جاؤ۔"

"اپنے پاس ہی رکھو۔ اس سلسلے میں خان جی نے مجھے کوئی ہدایت نہیں دی اور خان جی اگر کسی بات کی ہدایت نہ کریں تو اپنے کو اپنی طرف سے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے۔ بس رات کو تم مناسب موقع دیکھ کر نکل جانا۔ چوکیداروں سے تمہارے بارے میں کہہ دیا گیا ہے۔ وہ تمہیں باہر جانے سے نہیں روکیں گے۔" یہ کہہ کر وزیر خاں چلا گیا اور شاہ زیب ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ ایک آرام کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ آخر یہ قصہ کیا ہے' بات خاصی پراسرار ہو گئی تھی۔ مکرم شاہ کے ہم شکل سے فخر خان کا کیا تعلق ہے؟

فخر خان نے جبار خاں یا الیاس خاں کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔
حالانکہ اصولی طور پر شاہ زیب کے حوالے سے تو وہ اس وقت ان دونوں کے دشمن تھے۔ پتہ نہیں اس پراسرار آدمی کے کھیل کیا ہیں۔ بات پھر وہی آ جاتی تھی۔ یعنی یہ کہ مکرم شاہ کی ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور اس کے ہم شکل کا ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ شاہ زیب اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔ وہ بے لچک اپنے پیروں پر چلتا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ یہ سوچ کر اطمینان کر لیا جائے کہ یا تو وہ ایک دوسرے کے جڑواں تھے یا پھر یہ قدرت کا ایک کارنامہ تھا کہ دونوں اس قدر ہم شکل تھے۔ رات کو یہاں سے نکلنا تھا۔ اب یہ فیصلہ تو کرنا بعد کی بات تھی کہ آگے چل کر کیا کرنا ہے۔ ویسے دل قبول نہیں کر رہا تھا کہ ایک ایسے شخص کو مار دیا جائے جس نے شاہ زیب کے ساتھ ہمدردی کی تھی۔ مکرم شاہ کے ہم شکل نے تو ایک بے مقصد ہی عمل کیا تھا جبکہ فخر خان نے یہ بات تسلیم کر لی تھی کہ میری مدد کرنے کے لیے اس نے اپنی ایک لالچ کو سامنے رکھا تھا۔ شاہ زیب یہی تمام باتیں سوچتا رہا اور وقت گزرتا رہا۔

پھر رات پوری طرح ہوئی بھی نہیں تھی کہ اسے اپنی آرام گاہ میں آہٹ محسوس ہوئی۔ آنے والی نائلہ تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں کسی قدر سوجی ہوئی تھیں۔

''ارے نائلہ! خیریت تمہیں کیا ہوا؟'' شاہ زیب نے سوال کیا اور نائلہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

''کچھ نہیں---''

''کچھ تو بتاؤ۔''

''جا رہے ہو؟''

''اوہ---ہاں خان جی کا یہی حکم ہے۔''

''کبھی دوبارہ ملنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' نائلہ سسکی سی لے کر بولی۔

''کیا کہا جا سکتا ہے نائلہ! ویسے تم نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔''

''کیسا فیصلہ؟''

''زندگی یہیں گزاروں گی؟''

''تو پھر کیا کروں گی؟'' نائلہ نے سوال کیا۔

''یہاں سے نکلنے کی کوشش نہیں کرو گی؟''

''کہاں جاؤ گی؟ کوئی ہو بھی تو سہی۔'' اس نے عجیب سی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے کہا اور شاہ زیب ایک لمحے کے لیے مشکل میں گرفتار ہو گیا۔ اگر اس سے یہ کہتا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے وہ بے فکر رہے تو بات نہیں بنتی تھی۔ کیونکہ شاہ زیب بھلا اس کے لیے کیا کر سکتا تھا۔ اپنی ہی زندگی زبردست مشکلات کا شکار تھی۔ کسی دوسرے کو سہارا دینے کی بات کیسے کرتا؟ اور پھر دل کے آخری گوشوں میں تو لجیا بیٹھی ہوئی تھی۔ لجیا--- جس کا احساس جس کے خواب زندگی کو شگفتہ کر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں اس انداز میں سوچنا اب شاہ زیب کے لیے ممکن نہیں تھا۔ زندگی کے کٹھن لمحات میں لجیا کا تصور بس اس کے لیے ایک دلکش احساس کے طور پر رہتا تھا۔ بہر حال وہ خاموشی سے یہ تمام باتیں سوچتا رہا اور پھر اس نے کہا۔

''دیکھو نائلہ! اگر یہاں خوش ہو تو دوسری بات ہے ورنہ انسان زندگی کے راستے بدلنے کی کوشش کرتا ہے تم کو بھی یہ کوشش خود ہی کرنا ہوگی۔''

''ہاں۔ بے سہارا درخت آندھیوں میں بھی قائم رہتے ہیں اپنے بل پر اپنے طور پر۔ یہ الگ بات ہے کہ آندھیاں انہیں بنجر کر دیتی ہیں۔ ایک بات کہنے آئی ہو تم سے۔''

''ہاں بولو؟''

''اگر ممکن ہو سکے تو گرو دے ڈیرے جا کر تاجو سے ملاقات کر لینا۔ اس کا حال

پوچھتے جانا اور اگر ہو سکے تو اس کی ضروری مدد کرنا۔ میں مامے کے لیے ایک پیغام دیتی ہوں تمہیں۔ اصل میں مامے کی ایک بیٹی ہے اگر ماما تاجو کی شادی اس سے کر کے انہیں کہیں نکال دے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فخر خان سے جان بچ جائے اس کی۔ ایسا نہ کر سکے تو تاجو سے کہنا کہ کہیں باہر چلا جائے۔ نوکری مل ہی جائے گی کہیں نہ کہیں۔'' شاہ زیب اچھی طرح محسوس کر رہا تھا کہ نائلہ اس سے کیا سننا چاہتی ہے۔ ایک جھوٹ بولا جا سکتا تھا۔ یہ کہا جا سکتا تھا کہ نائلہ! اگر زندگی، ماحول، وقت ساتھ دے تو ہم ایک دوسرے کا انتظار کر سکتے ہیں لیکن بات وہی آ جاتی تھی کہ ایک ایسا جھوٹ بولنا بھی گناہ ہوتا ہے۔ جو محبوب کی شخصیت کی نفی کر دے اور یہ لجپال کی شخصیت کی نفی ہی تھی کہ نائلہ کو جھوٹا دلاسا تک دیا جا سکتا۔ نائلہ کچھ لمحات تو خاموش رہی پھر بولی۔

''مے کو ساری تفصیل بتا دینا لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ وہاں جاؤ گے یا نہیں؟''

''تم کہو گی تو نائلہ ضرور جاؤں گا۔ نہ جانے کی کیا بات ہے؟''

''ہاں۔ ہاں ضرور چلے جانا۔ میں نے بتایا نا کہ مامے کی ایک بیٹی ہے۔ نارو ہے اس کا نام۔ بڑی اچھی شکل وصورت کی ہے۔ نارو اگر تاجو کے ساتھ منسوب ہو سکے تو بڑا ہی اچھا ہو گا۔ دونوں کا کام بن جائے گا۔ ماما بڑا کنجوس آدمی ہے۔ پائی پائی جوڑ کر اس نے اچھی خاصی رقم جمع کر لی ہے اپنے پاس۔ وہ بھی تاجو کے کام آ سکتی ہے۔'' نائلہ نہ جانے کیا کیا کہتی رہی اور شاہ زیب سنتا رہا۔ پھر کسی کے آنے پر ہی شاہ زیب کا پیچھا چھوٹا تھا۔

رات کو تقریباً ساڑھے گیارہ بجے وہ اپنی جگہ سے باہر نکل آیا۔ یہ اس پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ کسی بھی وقت حویلی چھوڑ دے اور رات کی تاریکی میں وہ حویلی کے بڑے گیٹ سے باہر نکل آیا۔ فخر خان کا طریقہ کار بڑا عجیب سا تھا۔ اپنے مقصد کی تفصیلات بتانے کے بعد فخر خان نے اس طرف رخ نہیں کیا تھا اور وہاں سے چلا گیا تھا۔

بہر حال شاہ زیب تیزی سے آگے بڑھتا رہا اور رات کی تاریکی میں وہ زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کرنے کے لیے خاصی تیز رفتاری سے چلنے لگا۔ اس وقت صبح کے پونے چار بجے تھے۔ جب وہ گروے ل ڈیرے نامی جگہ پہنچا۔ چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن تھا جہاں چند گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ اس ریلوے کی دوسری جانب آبادی سوئی ہوئی تھی۔ ریلوے اسٹیشن جانے کے بجائے وہ دوسرے راستے سے آبادی کی جانب چل پڑا۔ نائلہ نے اسے جو تفصیلات بتائی تھیں اس کے مطابق راستہ طے کرتا ہوا آخر کار وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں نائلہ کا وہ ماموں رہتا تھا۔

ابھی پوری طرح صبح نہیں ہوئی تھی اور کچھ وقت باقی تھا۔ مکان کے سامنے ایک درخت کے نیچے شاہ زیب جا کر بیٹھ گیا۔ بستی اچھی خاصی تھی۔ اپنے نام کی مطابقت کے بالکل خلاف صاف ستھری بستی اچھے بنے ہوئے مکانات پر مشتمل تھی۔ یہ جگہ بھی خاصی وسعت میں تھی۔ جہاں نائلہ کا ماموں رہتا تھا۔ اونچے اونچے درخت احاطہ سا بنائے ہوئے تھے اور کچی مٹی سے بنی ہوئی وسیع وعریض عمارت ان درختوں کے سائے میں پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد بھینسوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگی۔ اتنے فاصلے پر درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے بھی بھینسوں کی موجودگی کا احساس اسے مخصوص بو سے ہو رہا تھا جو بھینسوں کے باڑے سے اٹھتی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نائلہ کا ماموں اچھی خاصی حیثیت کا مالک ہے۔ پھر نہ جانے کیوں نائلہ فخر خان کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔ اگر یہ ماموں اس کی اتنی بات مانتا تھا کہ اس کے کہنے پر اس نے ایک اجنبی آدمی کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا تو کیا وہ نائلہ کو نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہ سوالات شاہ زیب کے ذہن میں آ رہے تھے۔ پھر صبح کا اجالا پھوٹنے لگا۔ بھینسیں بولنے لگیں۔ پھر خاموش ہو گئیں۔ غالباً ان کا دودھ نکالنے والے ان کے پاس پہنچ گئے تھے۔ کچھ اور وقت گزرا تو شاہ زیب اپنی جگہ سے اٹھا اور مکان کے دروازے کی

جانب چل پڑا۔ ابھی وہ دروازے سے کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک خوبصورت سی لڑکی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ شاہ زیب کو دیکھ کر وہ ایک دم ٹھٹھک گئی تھی۔ شاہ زیب بھی رک گیا تھا۔ لڑکی کا رنگ دودھ کی طرح سفید تھا۔ سب سے زیادہ حسین اس کے چہرے کے نقوش میں اس کی آنکھیں تھیں۔ خوابوں میں ڈوبی ہوئی آنکھیں، ہونٹوں پر ایک قدرتی مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی۔ بدن بھی متناسب تھا۔ عمر سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ وہ اس طرح شاہ زیب کو دیکھ رہی تھی جس طرح جاگتی آنکھوں کے خواب دیکھ رہی ہو۔ اس کے ہونٹوں کی ملکیتی مسکراہٹ بڑی دلکش تھی۔ ہنستے ہوئے اس کے دانتوں کی قطار جھانکتی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے آبدار موتی چمک رہے ہوں۔ شاہ زیب کچھ لمحوں کے لیے ساکت رہ گیا تھا۔ لڑکی اسے خواب آلود نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر اس نے اپنی گردن جھٹک کر آنکھیں کھولیں اور بولی۔

''توبہ---توبہ---یہ خواب مجھے پاگل کر دیں گے۔'' پھر وہ ایک دم سنبھل گئی اور آگے بڑھ کر بولی۔

''کون ہیں جی آپ؟''

''کہیں سے آیا ہوں۔ یہاں میرا ایک ساتھی رہتا ہے تاجو ہے اس کا نام۔ اس سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔''

''اچھا' اچھا تاجو بھیا کے رشتے دار ہیں آپ۔ آجائیں اندر آجائیں۔'' اس نے بڑے خلوص سے تاجو بھیا کہا تھا۔ پھر وہ مجھے اندر لے گئی۔

عمارت اندر سے اور زیادہ وسیع نظر آ رہی تھی۔ ایک طرف بھینسوں کا باڑا تھا اور دوسری طرف درخت لگے ہوئے تھے۔ درختوں کے نیچے تین چار پلنگ پڑے ہوئے تھے۔ وہ مجھے اس طرف لے گئی اور بولی۔

''بیٹھیں۔ میں جا کر تاجو بھیا کو بتاتی ہوں۔''

''جی سنئے۔'' میں نے اس سے کہا اور وہ بولی۔

''سنائیے۔''

''وہ آپ--- آپ کا نام کیا ہے؟'' شاہ زیب نے سوال کیا۔

''حنا! آپ جانتے ہیں حنا کسے کہتے ہیں؟''

''نہیں۔'' شاہ زیب نے مسکرا کر گردن ہلائی۔

''لو--- پھر آپ کیا جانتے ہیں؟ حنا مہندی کو کہتے ہیں جو ہاتھوں پر لگائی جاتی ہے۔ اب بتائیے کسے کہتے ہیں حنا؟''

''آپ کو۔'' شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ حیرت سے شاہ زیب کو دیکھنے لگی پھر بولی۔

''کہتے تو مجھے ہیں لیکن ابھی میں نے کیا بتایا تھا آپ کو؟''

''پتہ نہیں۔ شاید مہندی کہا تھا آپ نے۔''

''جی' جی' جی۔ آپ باتیں بہت زیادہ بناتے ہیں نا۔ میں حنا ہوں بس اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوں۔ چلتی ہوں تاجو بھیا کو بھیجتی ہوں اور پھر وہ مڑ کر واپس چلی اور دوبارہ پلٹ کر آ گئی اور پھر بولی۔

''اور جانتے ہیں آپ میں نے کیا کہا تھا اصل میں میرا معدہ خراب رہتا ہے۔ اماں یہی کہتی ہے کہ جب انسان کا معدہ خراب ہوتا ہے تو وہ الٹے سیدھے خواب دیکھتا ہے۔ بس میں خواب ہی دیکھتی رہتی ہوں۔ کیسے خواب آپ کو بتاؤں؟''

''بتائیے۔''

''بیٹھ کر بتاؤں گی تاجو سے ذرا دیر بعد مل لیجئے گا آپ۔ میں آپ کو اپنے

خواب سناؤں اور بتاؤں کہ میں کیسے خواب دیکھتی ہوں۔"

"بتایئے بتایئے۔" وہ سامنے والے پلنگ پر بیٹھ گئی شاہ زیب کو رات بھر کی کوفت دور ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسی حسین، معصوم اور الہڑ لڑکیاں اگر مل جائیں تو پھر بات ہی کیا ہوتی ہے۔ اس نے ایک لمحے سوچا پھر کہنے لگی۔

"ویسے تو حکیم صاحب کو دکھایا تھا اماں نے، حکیم صاحب نے پتہ ہے کیا کہا؟"

"نہیں مجھے نہیں معلوم۔" شاہ زیب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"آپ کو تو دنیا کی کوئی بات ہی نہیں معلوم۔ حکیم صاحب نے کہا ہے کہ اس کا معدہ خراب نہیں ہے۔ تم غلط کہتی ہو۔ جب معدے خراب ہوتے ہیں تو رنگ میلے پڑ جاتے ہیں، صحیح خون نہیں بنتا اور صحیح خون نہیں بنتا تو رنگ خراب ہو جاتا ہے، جل جاتا ہے۔ اب آپ خود دیکھیں میرا رنگ خراب ہے کوئی؟"

"بالکل نہیں۔ آپ کا رنگ تو بس رنگ ہی رنگ ہے۔"

"ہوں--- بالکل ٹھیک--- اچھا تو میں بتا رہی تھی کہ آپ کو کہ میں خواب دیکھتی ہوں۔ آپ دیکھیں وہ جو ہماری بھینس نمبر چار ہے نا۔ وہ سامنے جو کھڑی ہے۔ نظر آ رہی ہے نا موٹی سی؟"

"ہاں۔"

"اس کے ہاں بچہ نہیں ہوتا۔ سب لوگ کہتے ہیں کہ اسے قصائی کے ہاتھ بیچ دیں گے لیکن پتہ ہے کیا بات ہے؟ میں اسے نہیں بیچنے دیتی۔ جب بھی میں اس کے پاس جاتی ہوں وہ زبان نکال کر مجھے اس طرح چاٹتی ہے۔ بس جناب مجھے بھی اس سے محبت ہو گئی ہے۔ اب دیکھیں نا کوئی کسی کو چاٹے تو اس سے محبت ہونی چاہیے یا نہیں۔ ہونی چاہیے۔"

"بالکل ہونی چاہیے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ کو تھوڑا سا چاٹ کر اپنی محبت

حاصل کی جا سکتی ہے؟" شاہ زیب نے کہا۔

"نہیں۔ نہیں، نہیں ایسی بات بھی نہیں ہے۔ تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ میں نے منع کر دیا کہ اس بھینس کو نہیں بیچا جائے گا۔ ورنہ میں جان دے دوں گی اور جب میں یہ بات کہہ دوں تو بھلا کس کی مجال ہے کہ یہ بھینس بیچ دے لیکن میں یہاں بیٹھ کر خواب دیکھتی ہوں کہ اس کے ہاں بچہ ہوا ہے اور میں خوش ہو جاتی ہوں۔ میں جب کوئی کام نہیں کر پاتی نا تو بس اسے خواب میں دیکھ لیتی ہوں اور بیٹھے بیٹھے دیکھ لیتی ہوں۔ آنکھیں بند کرتی ہوں اور مجھے خواب نظر آنے لگتے ہیں کہ جی میرا کام ہو گیا لیکن رات کو تو میں نے واقعی خواب دیکھا تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ جی میری شادی ہو رہی ہے۔ میری بارات آ رہی ہے۔ دولہا گھوڑے پر سے اترتا ہے اور پھر اچانک آندھی چلنے لگتی ہے۔ دولہا کا سہرا اڑ جاتا ہے میں اسے دیکھتی ہوں اور خوب ہنستی ہوں۔ پتہ ہے اس کی شکل کیسی تھی؟"

"نہیں مجھے نہیں معلوم۔"

"بالکل تمہاری جیسی تھی۔ جب ہی تو میں تمہیں دیکھ کر حیران رہ گئی تھی اور پھر ادھر دیکھنے لگی تھی کہ تمہارا سہرا کہاں گیا۔ اس وقت تو آندھی بھی نہیں چل رہی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں تو خواب دیکھ رہی تھی۔ یہ تھا سارا قصہ۔ اچھا میں جاتی ہوں۔ تاجو کو بلا کر لاتی ہوں۔ تم بھی سوچ رہے ہو گے کہ تمہارا کام نہیں کیا اور اپنی بک بک کیے جا رہی ہوں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اندر چلی گئی۔

شاہ زیب اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ زندگی میں کیسے کیسے نازک موڑ آتے ہیں۔ ایسے ایسے کرداروں سے واسطہ پڑتا ہے کہ ہر کردار دل کو چھونے کی کوشش کرتا ہے لیکن آخر کس کس کے سامنے گردن جھکائی جائے۔ کس کس کو اپنا محبوب بنایا جائے۔ تاجو دوڑتا ہوا آیا تھا اور اس طرح آ کر مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ جیسے اس سے برسوں کی شناسائی ہو۔ اس کی حالت

بھی کافی بہتر نظر آ رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک اُس سے لپٹا رہا۔ پھر جب علیحدہ ہوا تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

''نائلہ کیسی ہے؟'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ٹھیک ہے۔''

''کمال ہے یار! میں اس کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ زندگی بچادی ہے اس نے میری۔ ورنہ میں جانتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ تم کیسے آئے یہ بتاؤ؟ بس میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کسی کا احسان اتارنے کے قابل کیسے ہو سکتا ہوں۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔ سوائے دعا ہی دے سکتا ہوں تمہیں اور نائلہ کو جس نے مجھے زندگی دی ہے۔ تمہارے زخم کیسے ہیں؟ ٹھیک ہونا؟ اس کم بخت کا کیا ہوا۔ میری مراد منیر شاہ سے ہے؟'' وہ اتنے سوالات ایک ساتھ کیے جا رہا تھا اور شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کے سوالات کا کیا جواب دے۔ پھر اس نے کہا۔

''تمہارا آگے کیا ارادہ ہے تاجو! نائلہ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تم سے ملتا ہوا آگے جاؤں۔''

''یار! یہ نائلہ کا ماموں جو ہے فرشتہ صفت ہے۔ خوب کھاتا پیتا آدمی ہے لیکن اتنا انکسار پسند ہے کہ اس نے مجھے شرمندہ کر دیا ہے۔ سارا گھر ہی اچھا ہے۔ ابھی جو لڑکی مجھے بلانے گئی تھی۔ وہ ماموں کی بیٹی ہے۔ حنا ہے اس کا نام۔ بس کیا بتاؤں اس لڑکی کے بارے میں تم اس سے ملے ہوں گے تو اس نے تم سے لگاوٹ کی باتیں کی ہوں گی۔ اتنی بے تکلفی کی باتیں کرتی ہے کہ انسان ایک لمحے کے لیے غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ کوئی بری لڑکی ہے لیکن ایسی بات نہیں ہے وہ بالکل معصوم ہے جو کچھ بھی دل میں آتا ہے کہہ دیتی ہے۔''

''ہاں میں نے محسوس کیا۔''

''میں زیادہ عرصہ یہاں نہیں رکتا لیکن ماموں مجھے جانے نہیں دیتا کہ مہمان آتے اپنی مرضی سے ہیں اور جاتے میز بانوں کی مرضی سے ہیں۔''

''تو اور کیا میں نے تو غلط تو نہیں کہا۔'' درخت کے پیچھے سے ایک آواز ابھری اور شاہ زیب چونک کر ادھر دیکھنے لگا۔ ایک لمبا چوڑا آدمی تھا عمر پچپن ساٹھ سے کم نہیں ہوگی لیکن صحت بہت شاندار تھی۔ تاجو جلدی سے بولا۔

''ماما جی!''

''ماموں کی بڑائیاں ہو رہی تھیں نا۔ سن رہا تھا میں سب کچھ --- ارے انسان اور فرشتوں میں تو فرق ہوتا ہے نا اور میں بتاؤں تمہیں بچو! انسان کو کبھی فرشتہ مت کہنا۔ اتنا بڑا درجہ نہیں ہوتا اس کا۔ فرشتے تو بہت عظیم ہوتے ہیں اور انسان بڑی معمولی چیز۔ سمجھ رہے ہو نا تم ہاں بھئی تم تو تاجو سے ملنے آئے تھے اور تمہیں میری بھانجی نے بھیجا ہے کہ تاجو کی خبر لو اور تم یہاں سے بھاگنے کے چکر میں ہو۔ یار! اپنی یہ بندوق ذرا مجھے دینا اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا اور شاہ زیب نے بے اختیاری سے رائفل اس کے حوالے کر دی۔

''ہاں۔ اب دیکھو اگر تمہیں اس رائفل کی ضرورت ہے اور اس سے محبت ہے تو یہ تمہیں اس وقت ملے گی جب میں تمہیں یہاں سے جانے کی اجازت دوں گا کیا سمجھے؟ ویسے ایک بات بتاؤں تم چھین نہیں سکتے اسے مجھ سے۔ بوڑھا ہوں تو کیا ہے لیکن تم سے تگڑا ہوں۔'' شاہ زیب ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔

''آپ کو تکلیف ہوگی صاحب! تاجو کو ہی آپ رکھے ہوئے ہیں۔''

''ایک بات بتاؤ بیٹا!''

''جی پوچھیے۔''

''اگر تم ان بھینسوں کی پیٹھ پر جا کر سو جاؤ گے تو کیا انہیں تکلیف ہوگی۔ مجھے کیا ہوگی اگر تم اگر تم اس چھوٹے سے کچے مکان میں رہو گے تو گھر کو تکلیف ہوگی مجھے کیا ہوگی۔ اور گھر کو تکلیف کیسے ہوگی یہ نہ تم بتا سکتے ہو نہ میں بتا سکتا ہوں۔ ارے بیٹا! یہ جو تاجو ہے یہ بھی یہیں ان درختوں کے نیچے چارپائی پر سوتا ہے تم بھی سو جاؤ گے۔ کھانا پکتا ہے گھر میں تم بھی کھا لو گے۔ چار' چھ' آٹھ دن' دس دن چلے جانا یار! کون منع کرتا ہے تمہیں جانے کے لیے۔ پر ایک بات سن لو بندوق لے جا رہا ہوں تمہاری۔ اتنا بیوقوف نہیں ہوں کہ جذباتی ہو کر اسے تمہارے حوالے کر دوں۔ ویسے بھی ذرا اس طرح کے ہتھیار ساتھ رکھنا اچھی بات نہیں ہے۔ پتہ نہیں کب بندے کو غصہ آ جائے اور وہ کسی پر گولی داغ دے۔ ویسے تمہاری امانت ہے۔ میں اسے تمہارے حوالے کر دوں گا لیکن ابھی جانے نہیں دوں گا۔ چاہے کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ ہو تمہیں۔ آخر ہمارے مہمان ہو ہماری بھانجی نے بھیجا ہے تمہیں۔ دو چار دن تو ہمارے ساتھ رہو۔'' شاہ زیب اس شخص کو انکار نہیں کر سکتا تھا۔

''اچھا اب تم بیٹھو۔ تمہاری بندوق تمہارے بدلے رکھ لی گئی ہے۔ میں ناشتہ بھجواتا ہوں تمہارے لیے۔ تاجو بیٹھ بھائی سے باتیں کر' معاف کرنا یار! اس تاجو کو تو پتہ ہے کہ صبح سیر کے لیے نکلتا ہوں اور دوسرے راستے سے اندر واپس آتا ہوں۔ تم دونوں کو دیکھا تو سننے کے لیے آ گیا کہ کیا باتیں کر رہے ہو تم۔ بس پتہ چل گئی ساری بات اچھا--- چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ بندوق سمیٹ کر اندر کی جانب چل پڑا۔

شاہ زیب اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ واقعی کچھ لوگ بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ یہ نائلہ کا ماموں بھی اتنا ہی اچھا آدمی تھا۔ رہن سہن کا انداز' بھینسوں کی تعداد اور یہاں گزرنے والا ہر لمحہ اس بات کا احساس دلاتا تھا کہ وہ صاحب حیثیت بھی ہے۔ کھلی طبیعت کا مالک تھا۔ اس چھوٹی سی جگہ رہنے کے باوجود اس نے اپنی معصوم بیٹی کو اتنی آزادی دے دی تھی۔ بہرحال

کچھ دیر کے بعد صبح کا ناشتہ آ گیا۔ حنا اس بار بھی ساتھ ہی آئی تھی۔ کہنے لگی۔

''یہ مت سمجھنا ہمارے ہاں اندر کسی مہمان کے لیے جگہ نہیں ہے۔ بڑی جگہ ہے یہاں پہ' مگر مہمان کو دیکھا جاتا ہے' پرکھا جاتا ہے۔ ویسے ایک بات بتایئے تاجو بھیا! یہ ہیں کون؟ ان کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں معلوم مجھے۔ نہ ان کا نام پتہ چل سکا ہے اور نہ ہی کوئی اور بات معلوم ہوئی ہے۔ کہاں سے آئے ہیں یہ؟''

''بتا دیں گے حنا جلدی کیا ہے؟''

''چائے تو میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہی پیوں گی۔ اندر کہہ کر آئی تھی۔ دیکھ لیجئے چائے کے تین پیالے رکھے ہیں۔''

''ہاں' ہاں کیوں نہیں؟ تم ہمارے ساتھ ناشتہ بھی کرو۔'' شاہ زیب دلچسپی کی نگاہوں سے حنا کو دیکھ رہا تھا۔ بہرحال اس نے ناشتہ انہی لوگوں کے ساتھ کیا اور یہ بہت بڑی بات تھی۔ پھر وہ بولی۔

''کوئی بات نہیں کرو گے تم لوگ' اتنی خاموشی ہے کیا میری وجہ سے؟''

''نہیں حنا! ایسی بات نہیں ہے۔ آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کے بھائی کتنے ہیں؟''

''لیجئے آپ پوچھتے تو بتاتے نا۔ ہمارا کوئی بھائی ہے نہ بہن۔ بس اکیلے ہیں ہم جیسے کوئی اکیلا درخت پڑا ہوتا ہے نا جنگل میں ایسے ہم ہیں۔''

''اوہو اچھا۔''

''ویسے تاجو اب ہمارے بھائی بن گئے ہیں۔ کتنا اچھا لگتا ہے انہیں بھائی کہتے ہوئے اور آپ کو تو ہم اس وقت تک بھائی نہیں کہیں گے جب تک آپ یہ نہیں کہیں گے کہ آپ یہاں ہمارا رشتہ مانگنے نہیں آئے ہیں۔ تاجو بھیا! اصل میں ہم کیا کریں۔ ہم نے ایک

خواب دیکھا تھا۔ جس میں ہم نے یہ دیکھا تھا کہ ان سے ہماری شادی ہو رہی ہے۔ آپ پوچھ لیں ہم نے انہیں پہلے ہی بتا دیا ہے۔''

''خواب مت دیکھا کرو حنا! ان سے تمہاری شادی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو بس تھوڑی دیر کے لیے یہاں آئے ہیں چلے جائیں گے۔''

''ہوں اگر ایسی بات ہے تو ٹھیک ہے۔ نہیں دیکھیں گے ان کے خواب۔ اچھا اب چلتے ہیں دل ٹوٹ گیا ہمارا۔''

''حنا! بات تو سنو۔''

''کہا نا دل ٹوٹ گیا اب نہیں رکتے یہاں۔'' یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے اندر چلی گئی۔

''اچھا اب مجھے بتاؤ کون سنگدل ہوگا جو اس معصوم سی بچی کے بارے میں برے انداز میں سوچے گا؟'' شاہ زیب نے کہا۔

''ہاں بالکل ٹھیک کہتے ہو تاجو! واقعی وہ بہت ہی معصوم ہے۔ خیر چھوڑو اب یہ بتاؤ تمہارا ارادہ کیا ہے یہاں کب تک رکو گے؟''

''یار! قسم لے لو ایک منٹ بھی نہیں رکنا چاہتا یہاں۔ اب یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں کہ کوئی سنگین صورتحال پیش آنے میں دیر نہیں لگے گی۔ ہو سکتا ہے نائلہ پر ہی تشدد کر کے ہمارے بارے میں معلوم کیا جائے؟'' شاہ زیب گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا تھا۔

پھر کافی وقت گزر گیا' دن چڑھ آیا۔ ناشتہ کر لیا تھا' کام کوئی نہیں تھا۔ بڑا عجیب سا محسوس ہوا۔ وہ خود یہ سوچ رہا تھا کہ اب اُسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ تو یہاں تاجو سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ ماسے نے اُس کی بندوق لے لی تھی۔ اسے بتانا پڑے گا کہ اسے کسی ضروری کام

سے آگے جانا ہے۔ بہرحال ایک آدھ دن کہیں رُک بھی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ان مخلص لوگوں کے درمیان جتنا بھی وقت گزرے گا اچھا گزرے گا۔ اُس کے ذہن پر پھر وہی احساس سوار ہو گیا تھا اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ پھر دل میں وہی خیال آیا کہ بہتر یہ ہے کہ ایک بار پھر اس شخص سے مل لے اور اسے فخر خان کے بارے میں بتائے اور یہ بھی بتائے کہ اس نے اُس کے سپرد کیا ذمے داری کی ہے۔ یہ تصویر گواہی کے طور پر پیش کر دے گا۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ انکشافات ہوں۔ ویسے بھی کوئی خاص کام تو نہیں تھا اُسے۔ اس بات پر دل آمادہ ہو گیا اور اُس نے سوچا کہ ایک آدھ دن یہاں گزارنے کے بعد یہاں سے نکل جائے گا کہ اس شام ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ایک دم اسے اپنا ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ ایک گھوڑا احاطے سے اندر داخل ہوا تھا۔ وہ دونوں درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ گھوڑے پر ایک شخص سوار تھا جو سیدھا اس طرف چلا آ رہا تھا۔ غالباً کسی کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کے لیے۔ پھر وہ گھوڑے سے نیچے اترا اور وہ اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

''میں۔'' یہ کہہ کر وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ اس کی نگاہیں مجھ پر جم گئیں تھیں اور میری اس پر۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا اور میں نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔ وہ امیر خاں تھا الیاس خاں کا دوسرا بیٹا۔ انور کا بھائی۔

☆☆☆

شاہ زیب اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر وہ سیدھا ادھر نہ آیا ہوتا اور کہیں سے شاہ زیب کو دیکھ لیتا تو یا تو اسے ہلاک کرنے کی کوشش کرتا یا پھر کوئی نہ کوئی ایسا عمل ضرور کرتا جس سے شاہ زیب اس کے قبضے میں آ جائے۔ ادھر شاہ زیب بھی اگر اسے پہلے سے دیکھ لیتا اور پہچان لیتا تو یقیناً اس کے سامنے آنے کی کوشش نہ کرتا لیکن دونوں ہی غیر متوقع طور پر ایک

دوسرے کے سامنے آ گئے تھے۔ ظاہر ہے انہیں آپس میں ایک دوسرے کی اداکاری کسی طور راس نہیں آتی۔ کچھ لمحے امیر خاں شاہ زیب کو گھورتا رہا اور اس کے بعد کچھ پوچھے بغیر آگے بڑھا۔ ایک ملازم نے گھوڑا سنبھال لیا تھا اور امیر خاں نے اسی سے جو کچھ پوچھنا تھا پوچھ لیا تھا۔ ملازم نے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ دیا اور امیر خاں کو ساتھ لیے ہوئے اندر چلا گیا۔ تاجو نے کہا۔

''کیا یہ تمہیں جانتا ہے؟'' شاہ زیب نے چونک کر تاجو کو دیکھا اور کہا۔

''کیا تم اسے جانتے ہو؟''

''ہاں یہ فخر خان کے دشمن کا بیٹا ہے۔ اس کے باپ کا نام الیاس خان ہے۔''

''اور وہ تمہیں جانتا ہے؟''

''شاید نہیں۔ اس لیے کہ میرا اس سے کبھی کوئی ایسا سامنا نہیں پڑا۔ بابا بڑے لوگ ہیں کسی کو جان کر بھی اگر وہ غریب ہے تو اجنبیت کا اظہار کرتے ہیں مگر ایک بات بتاؤ۔ یہ تمہیں عجیب طرح سے گھور رہا تھا اور تم بھی اسے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے اسے جانتے ہو؟''

''ہاں ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور اس وقت یہ چوہے بلی کا کھیل عجیب شکل اختیار کر گیا ہے۔''

''ہر طرف ایک ہی کھیل جاری ہے بھاجی! چوہے بلی کا کھیل۔ کہیں چوہا ہوتا ہے کہیں کوئی۔ ویسے اس وقت تو ہم دونوں ہی چوہے بنے ہوئے ہیں۔'' تاجو نے کہا اور ہنس پڑا لیکن شاہ زیب نے اس کی ہنسی کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ امیر خاں کو اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ میں یہاں ہوں اور اس کا کیا ردعمل ہوگا۔ یہ پتہ چلنا چاہیے۔

بہر حال امیر خاں یہاں تنہا ہی تھا۔ بات دشمنی کی ہوتی تو شاہ زیب اسے یہاں روک کر ٹھکانے لگا سکتا تھا اور یہی عمل امیر خاں بھی کر سکتا تھا۔ شاہ زیب جانتا تھا کہ امیر خاں

کے ہوش و حواس اڑے ہوئے ہیں لیکن بہر حال اس نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔ البتہ اس کے لباس میں جو ریوالور چھپا ہوا تھا وہ ابھی تک محفوظ تھا اور اس نے اسے سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہر لمحہ اس بات کا منتظر تھا کہ امیر خاں کی طرف سے کوئی کارروائی ہو۔ مامے کے بارے میں بھی وہ نہیں جانتا تھا کہ مامے کے الیاس خاں سے کیا تعلقات ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ امیر خاں اس کی گرفتاری کے لیے مامے سے مدد مانگے۔ اس خیال کے تحت اس نے فوراً تاجو کو ہوشیار کیا اور کہا۔

''تاجو! یہ تو میں تجھے بعد میں بتاؤں گا کہ امیر خاں مجھے کیوں گھور رہا تھا یا میری اس سے کیا دشمنی ہے۔ امیر خاں کے اگر مامے سے اچھے تعلقات ہیں تو مامے کی مدد سے وہ مجھے گرفتار کرنے یا ہلاک کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''خیر بندوں کے بارے میں کوئی بات پورے اعتماد سے نہیں کہی جا سکتی۔ بندے کو شیطان بننے میں دیر نہیں لگتی اور ماما بھی خراب ہو سکتا ہے۔ اپنے مفادات کے لیے سب ایک دوسرے کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ میں تو یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے فخر خان کی بڑی خدمت کی لیکن اس نے جو الزام مجھ پر لگائے بس میں نہیں برداشت کر سکا اور اب فخر خان سے بڑا میرا اور کوئی دشمن نہیں ہے۔ ماما بظاہر تو اچھا آدمی نظر آتا ہے لیکن تمہارا کہنا بھی درست ہے۔ اگر امیر خاں کسی طرح سے تمہارا دشمن ہے اور جس طرح وہ تمہیں گھور رہا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ امیر خاں کے دل میں تمہارے لیے کوئی بہت بڑی برائی ہے۔ میں کوئی بہت زیادہ ہوشیار آدمی نہیں ہوں لیکن بہر حال تھوڑی بہت بات تو میری عقل میں بھی آ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں تمہیں اپنے بچاؤ کا بندوبست کر لینا چاہیے۔ شاہ زیب تھوڑی دیر تک سوچتا رہا اور پھر اس نے پرخیال انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں ٹھیک کہتے ہو لیکن ابھی یہاں سے جانا بھی مناسب نہیں۔'' اچانک ہی امیر خاں اور ماما اندر سے برآمد ہوئے اور یہ دونوں سنبھل گئے۔ شاہ زیب نے اس طرح تاجو کی طرف رخ کر لیا جیسے وہ امیر خاں کی یہاں موجودگی کو کوئی اہمیت نہ دینا چاہتا ہو۔ وہ امیر خاں کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا لیکن پوری طرح ہوشیار تھا اور لباس میں چھپا ہوا ریوالور ایک لمحے کے اندر نکلنے کے لیے تیار تھا۔ امیر خاں اپنے گھوڑے کی طرف گیا اور اس کے بعد گھوڑے پر سوار ہو کر باہر کی طرف چل پڑا۔ جبکہ ماما ان کی جانب آنے لگا۔ دونوں ہوشیار ہو گئے اور پھر شاہ زیب اور تاجو نے مسکرا کر ماما کا استقبال کیا۔

''بیٹھو بیٹا' بیٹھو۔ بیٹھ جاؤ۔'' ماما نے کہا اور خود بھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پھر بولا:

''یہ لڑکا جو ابھی آیا تھا۔ کیا تم میں سے کوئی اسے جانتا ہے؟''

''میں جانتا ہوں۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ تمہارے بارے میں اس طرح کرید کرید کر پوچھ رہا تھا کہ مجھے شبہ ہوا۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ بس یہی پوچھا کہ ماما یہ بندہ کب سے تمہارے پاس ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میں بھی بوڑھا آدمی ہوں۔ مجھے لہجے کی شناخت ہے۔ کوئی بات ضرور تھی اس کے لہجے میں۔''

''ماما! آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟''

''بس اس کے باپ سے کچھ کام ہے۔ اکثر میں بھی الیاس خاں کے پاس جاتا رہتا ہوں۔ تھوڑے دن پہلے اس کا ایک بیٹا قتل ہو گیا تھا۔ کوئی دشمنی تھی کسی سے۔ یہ دو بھائی تھے۔ اس کا نام امیر ہے اور دوسرا جو تھا وہ انور تھا۔ جوان بچہ تھا مگر دشمنی کا شکار ہو گیا۔ ویسے الیاس خاں بھی اچھا آدمی نہیں ہے۔ بس ایک ایسی ڈیل ہو گئی تھی ہماری کہ میں اسے جانتا نہیں تھا لیکن میرے ساتھ ابھی تک اس نے کوئی برا سلوک نہیں کیا۔ میں نے بھی سر سے بلا

ٹالی ہے مگر یہ تمہیں کیسے جانتا ہے؟''

''ماما! یہ بات بتاتے ہوئے میں بڑے افسوس سے کہتا ہوں کہ آپ نے جس جوان کے قتل کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ قتل میں نے ہی کیا تھا۔'' شاہ زیب نے کہا اور ماما کے ساتھ ساتھ تاجو بھی اچھل پڑا۔ ایک لمحے تک دونوں کے منہ سے آوازیں نہ نکل سکیں۔ پھر ماما نے کہا۔

''اوئے خیر ہو تیری تو نے قتل کیا تھا اسے؟''

''ہاں ماما!''

''مگر بیٹا کیوں؟'' ماما نے سوال کیا۔

بہرحال ماما کو کچھ نہ کچھ تو بتانا تھا۔ شاہ زیب کچھ لمحے سوچتا رہا۔ ماما جو کوئی بھی تھا ایک اچھا آدمی ثابت ہوا تھا اور اس نے ان دونوں کی خوب خاطر مدارت کی تھی۔ اس سے کچھ نہ کچھ کہنا ضروری تھی۔ چنانچہ چند لمحات سوچنے کے بعد شاہ زیب نے کہا۔

''ماما! بالکل گھریلو معاملات تھے۔ آپ یہ سمجھ لو کہ الیاس خاں اور جبار خاں کے گھر سے رشتہ داری بھی ہے۔ الیاس خاں کی بہن ہمارے گھر میں ہے۔''

''تمہارا تعلق کہیں جہانزیب سے تو نہیں ہے؟''

''ہاں وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔''

''اوہو۔ بڑے لوگوں کے معاملات ہیں بابا! بڑے خطرناک ہیں۔''

''ہاں بابا! یہ بندہ جو واپس چلا گیا ہے۔ بہت سے بندوں کو لے کر واپس پلٹے گا۔ ہمارا یہاں سے چلے جانا بڑا ضروری ہے۔ تاجو! تم سے اس کا کوئی جھگڑا نہیں معلوم ہوتا۔ تم بڑی خاموشی سے یہاں ماما کے پاس رہو۔''

''تم کب جا رہے ہو شاہ زیب یہاں سے؟''

"میرا خیال ہے دیر کرنا بے وقوفی ہے۔"

"تو چلو ماے سے اجازت لیتے ہیں۔" ماے نے چونک کر شاہ زیب اور تاجو کو دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔

"جاؤ گے تم دونوں؟"

"ماے! یہ ضروری ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری وجہ سے تم پر کوئی مشکل آئے۔"

"مشکل تو آئے گی بیٹا!"

"نہیں ماے۔ ہم آپ کو کسی مشکل میں نہیں پڑنے دیں گے۔"

"وہ واپس آئے گا اور مجھے تم لوگوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہنا پڑے گا۔ اب وہ یقین کرے یا نہ کرے الگ بات ہے۔"

"ماے! بڑی آسان سی بات ہے۔ آپ انہیں کہہ دیں کہ دونوں نوکری کی تلاش میں آئے تھے۔ آپ نے ہمیں چھوٹے موٹے کاموں پر رکھ لیا اور پھر نہ جانے ہم دونوں کیوں یہاں سے غائب ہو گئے۔ بڑی آسانی سے یہ بات کہہ سکتے ہیں آپ ان سے۔"

"ہاں کہہ تو سکتے ہیں۔ دیکھ لیں گے۔ جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا پر تم دونوں اب کہاں جاؤ گے۔"

"ماے کوئی منزل نہیں ہے ہماری۔ بس کچھ گھریلو جھگڑوں کی بناء پر یہ قتل ہو گیا تھا۔ جان بوجھ کر نہیں کیا تھا میں نے۔ نہ میں اس طرح کا آدمی ہوں لیکن اب وقت نے مجھے مجرم بنا دیا ہے۔ کہیں نہ کہیں نکل ہی جاؤں گا۔ تاجو ایک بار میں پھر تم سے کہتا ہوں تم کیوں اپنے آپ کو پریشان کر رہے ہو؟"

"ارے تو تم کیا سمجھتے ہو کیا میں ماے کے پاس زندگی گزارنے کو آیا ہوں۔ نہیں بابا نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ماے اجازت چاہتے ہیں ہم دونوں۔"

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو۔"

"نہیں ماے۔ سب ٹھیک ہے۔ گھوڑا ملا تھا لیکن اب وہ آپ کے پاس ہی چھوڑے جا رہے ہیں۔ ہاں بس تھوڑا سا سامان ضروری ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں تھوڑی سی دے دی جائیں تو ہماری ابتدائی مشکل دور ہو جائے گی۔ ورنہ جو کچھ باقی تقدیر میں لکھا ہے۔" ماے نے شاہ زیب کی رائفل شاہ زیب کے حوالے کر دی۔ تاجو شاہ زیب کے ساتھ ہی چل پڑا تھا۔ دونوں باہر نکل کر برق رفتاری سے ایک سمت چل پڑے اور تھوڑی دیر بعد بستی سے نکل آئے۔ شاہ زیب نے کہا۔

"دیکھو تاجو! تم نے بلاوجہ میرا ساتھ دے کر ان لوگوں سے دشمنی مول لے لی ہے۔ خطرہ پیش آ سکتا ہے۔"

"یار! ایک بات سنو میں خطرات کی پروا نہیں کرتا۔ بندہ جب اکیلا ہوتا ہے نا تو اسے کسی کا ساتھ حاصل کرنے کے لیے قربانی تو دینی پڑتی ہے۔ میں تمہارے لیے قربانی دینے کو تیار ہوں۔ مگر ہوا کیا تھا۔ قصہ تو پورا بتاؤ۔"

"بس یوں سمجھ لو کہ الیاس خاں اور جبار خاں میری زمینوں پر قبضہ کر رہے تھے۔ وہ وہاں بھٹہ بنانا چاہتے تھے اور میں نے اپنی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ ان زمینوں پر فصل اگاؤں گا۔ وہ زمینیں جنہیں دنیا بنجر اور ناکارہ کہتی ہے۔ میں ان پر سبزہ لہلہا دوں گا۔ وہ لوگ وہاں بھٹہ بنانا چاہتے تھے۔ ماں مر گئی لیکن اس سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کے لیے میں نے بڑی محنت کی تاجو! تو میں اس زمین پر آگ کیسے جلنے دیتا۔ انہوں نے بھٹہ میری اجازت کے بغیر بنانا شروع کیا۔ میں نے بھٹہ توڑ دیا۔ مجھے روکا گیا۔ گولیاں چلیں۔ ہاں الیاس خاں کا بیٹا میرے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ دوسرے کچھ بندے بھی مارے گئے۔ اس کے بعد ظاہر ہے پولیس کو مداخلت کرنا ہی تھی۔ پولیس کے اور میرے درمیان بھی خاصی ہنگامہ آرائی چلی

ہے اور شاید کچھ پولیس والے بھی میرے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ اس طرح میں جرم کی دلدل میں پھنستا چلا گیا ہوں؟''

''ہوں۔ واقعی یہ تو سنگین بات ہے۔ اب کیا کرو گے؟''

''کچھ نہیں یار! زندگی در بدر ہوگئی ہے۔ فی الحال تو ایک ہی کام کرنا ہے مجھے؟''

''کیا؟''

''اپنی زمینوں پر بھٹہ نہیں بننے دوں گا۔''

''فخر خان کے قبضے میں کیسے چلے گئے تھے؟''

''فخر خان' الیاس خاں اور جبار خاں کا دشمن ہے۔ بلکہ اسی سے لگی ہوئی ہے ان کی اور وہ اسی کے خلاف بھٹہ بنانا چاہتے ہیں۔ بس ہنگامہ آرائی کے دوران فخر خان کے حصے میں جا نکلا تھا۔ اس نے مجھ تک رسائی حاصل کرلی۔ اتنی سی بات ہے۔''

''ہوں۔ ٹھیک تو اب کیا ارادہ ہے؟''

''کچھ نہیں۔ آوارہ گردی کروں گا۔ اس لیے کہہ رہا ہوں تم سے کہ چلے جاؤ یہاں سے۔ دو باتیں ہیں۔ ہوسکتا ہے ہم پر نگاہ رکھی جارہی ہو۔ امیر خاں' الیاس خاں کا بیٹا ہے اور اس کا بھائی مرگیا ہے۔ ظاہر ہے اس نے اپنے بھائی کے قاتل کو تلاش کرلیا ہے۔ جبکہ الیاس خاں کے آدمی اور پولیس مجھے چپے چپے پر ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ اب امیر خاں مجھے اتنی آسانی سے تو نہیں چھوڑ دے گا۔ کچھ نہ کچھ کرکے دم لے گا وہ۔ ہوسکتا ہے ابھی تھوڑی دیر کے بعد گولیاں ہمارا استقبال کریں۔ بس بستی سے باہر نکل جانا شرط ہے۔ وہ بھی بے وقوف نہیں ہیں۔ یہ ضرور سوچا ہوگا اس نے کہ جیسے ہم اسے جاتے ہوئے دیکھیں گے۔ فوراً یہاں سے نکلنے کی تیاریاں کریں گے۔ کیا سمجھے۔''

''دیکھو--- میں ڈرتا بالکل نہیں ہوں لیکن دشمن سے ہوشیار رہنا بہت ضروری

ہے۔ اب کیا کریں؟''

''بستی پیچھے رہ گئی ہے۔ اوہو دیکھو--- دیکھو'' اچانک ہی شاہ زیب نے کہا۔ گھوڑے کی ہنہناہٹ سنائی دی تھی اور اس کے ساتھ ہی گولیاں چلنے لگیں تھیں۔ گولیاں کی سنسناہٹ ان کے سروں سے گزر رہی تھی۔ شکر ہے کہ امیر خاں نے خود ہی اپنا کھیل کھیلنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اکیلا ہی گولیاں چلا رہا تھا۔ شاہ زیب نے اس پر جوابی فائرنگ نہیں کی۔ حالانکہ اس کی رائفل بھی لوڈ تھی۔ پستول بھی اس کے پاس موجود تھا۔ وہ بس پتھروں کی آڑ لیتا ہوا جگہ تبدیل کرتا رہا تھا جبکہ تاجو ایک بڑی چٹان کے نیچے لمبا لیٹ گیا تھا۔ وہ بے چارہ نہتا تھا اور کسی طرح کا مقابلہ بھی نہیں کرسکتا تھا۔

بہرحال یہ سارا معاملہ اسی طرح ہوتا رہا۔ گولیاں برق رفتاری سے چلائی جارہی تھیں۔ امیر خاں ہر قیمت پر شاہ زیب کو مار دینا چاہتا تھا اور ایک ایسا کارنامہ سرانجام دینا چاہتا تھا جس پر اس کا باپ فخر کرے لیکن شاہ زیب بھی وہ نہیں تھا۔ دفعتاً شاہ زیب نے ایک زبردست چیخ ماری اور اس طرح کا اظہار کیا جیسے اسے گولی لگ گئی ہو۔ تاجو بھی ہولی آواز میں چیخا۔

''کیا ہوا--- کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں تاجو! بالکل خاموش کھڑے رہنا۔ کسی قسم کی کیفیت کا اظہار مت کرنا۔''

''اوہو--- اچھا ٹھیک ہے۔'' تاجو نے کہا اور تھوڑی دیر تک بالکل خاموشی طاری رہی۔ غالباً امیر خاں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ اسے سچ مچ گولی لگ گئی ہے یا اس کے ساتھ کوئی دھوکا دہی کی جارہی ہے۔ اس طرح خاصی دیر گزر گئی تو امیر خاں اپنے گھوڑے کی لگام پکڑے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا اور کچھ لمحوں کے بعد وہ شاہ زیب کے پاس پہنچ

گیا۔

شاہ زیب اس طرح مڑا تڑا پڑا تھا جیسے اس نے شدید کرب کے عالم میں جان دی ہو۔

امیر خاں اس کے قریب پہنچ کر جھکا اور اس نے شاہ زیب کو سیدھا کرنے کی کوشش کی تو شاہ زیب کے دونوں پاؤں فضا میں اٹھے اور امیر خاں کی گردن ان پیروں کی گرفت میں آ گئی۔ ایک لمحے کے اندر اندر شاہ زیب نے اسے پلٹ دیا اور امیر خاں بری طرح نیچے گر پڑا۔

شاہ زیب نے فوراً ہی اس پر قابو پا لیا تھا۔ امیر خاں کی رائفل بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گری تھی اور وہ پوری طرح شاہ زیب کے قبضے میں آ گیا تھا۔ شاہ زیب نے اس کے دونوں بازوؤں پر اپنے گھٹنے رکھے اور اسے بالکل بے بس کر دیا۔ امیر خاں سہمی ہوئی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھ رہا تھا۔ شاہ زیب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں امیر خاں! میں تمہیں ذرہ برابر کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ تمہارا بھائی بس جذباتی ہو کر میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ میں اسے کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ بالکل نہیں دینا چاہتا تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔ تمہیں بھی میں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ اپنے باپ سے صرف اتنا کہہ دینا کہ ان زمینوں پر آگ نہیں جلے گی۔ میرا اپنی ماں سے وعدہ ہے اور ماں کا وعدہ میں نہیں توڑ سکتا۔ چاہے اس کے لیے مجھے جرم کی دنیا میں کتنی ہی دور نکل جانا پڑے۔ یہ میری مجبوری ہے میرے بھائی! سمجھے میری مجبوری ہے یہ۔'' یہ کہہ کر شاہ زیب نے امیر خاں کی گردن پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ امیر خاں نے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی لیکن شاہ زیب اس پر پوری طرح حاوی تھا اور تھوڑی دیر کے بعد امیر خان بے ہوش ہو گیا۔

تاجو شاہ زیب کی یہ کیفیت دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے تعریفی انداز میں شاہ زیب کو دیکھا اور بولا۔

''مجھے یقین تھا کہ اگر یہ بندہ تمہارے ہاتھوں کی گرفت میں آ گیا تو پھر بچ نہیں سکے گا۔ کیوں کہ یہ منیر شاہ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ منیر شاہ کو میں بہت عرصے سے جانتا تھا۔ وہ بڑی آفت چیز تھا لیکن تم نے اسے --- تم نے اسے''

''امیر خاں کو میں نے بے ہوش کر دیا ہے لیکن میں تمہیں بتاؤں یہ لوگ بڑے کینہ پرور ہیں۔ اس احسان کا کوئی بدلہ نہیں دیں گے۔ سوائے اس کے کہ میرے خلاف کوشش کرتے رہیں۔ بے چارے ماسٹر کو بھی پریشان کیا جائے گا اور اس کے بعد نہ جانے وہ کیا کیا کریں۔ سمجھ رہے ہو۔''

''یار! کیا بتاؤں تم تو واقعی بہت خطرناک چیز ہو۔''

''میں خطرناک چیز نہیں تھا لیکن میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔ بات بہت خراب ہو جائے گی تم پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔ میرے چکر میں نہ پڑو۔ کیا سمجھے۔''

''چلو چھوڑو۔ اب یہ بتاؤ یہاں سے کہاں چلیں؟''

''زمین بہت بڑی ہے۔ میں تو کہیں اور ہی جاؤں گا۔ کہاں جاؤں گا اس کے بارے میں مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہی ہوں۔'' تاجو نے کہا۔

''تو پھر آؤ۔ ہم یہ جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔'' شاہ زیب نے کہا اور اس کے بعد وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر چل پڑے۔

شاہ زیب بڑے عجیب سے انداز میں سوچ رہا تھا۔ امیر خاں نہ جانے جا کر کیا کرے گا۔ ویسے اس نے ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا تھا جس سے احسان مندی کا اظہار ہو۔

پھر انہوں نے پہلی رات ایک جگہ قیام کیا۔ مامے کے گھر سے جو کھانے پینے کی چیزیں ملیں تھیں۔ انہیں بانٹ کر کھایا۔ شاہ زیب سوچ رہا تھا کہ تاجو کو اب اس سے علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ ایک آدمی زندگی کا بہت بڑا سہارا ہوتا ہے۔ لیکن بے چارہ تاجو! بلاوجہ کہیں اس کی وجہ سے مارا نہ جائے۔ بات صرف امیر خاں کی نہیں تھی۔ اب تو پولیس پنجاب کے چپے چپے میں اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ کسی بھی جگہ پولیس کا سامنا ہو سکتا تھا۔ پتہ نہیں اس کے سلسلے میں پولیس نے اپنے طور پر کیا کیا کارروائیاں کی ہوں۔ ہو سکتا ہے اسے اشتہاری قرار دے دیا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی تلاش میں جنگلوں اور کھیتوں‘ کھلیانوں میں سادہ لباس والے دوڑ رہے ہوں۔ ایسی صورت میں تاجو کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ کسی بھی طرح اس سے چھٹکارہ حاصل کر لیا جائے تو اچھی بات ہوگی۔

پھر اسے لجیا یاد آئی۔ بے چاری نے بڑی سادگی سے اپنے لیے بر مانگ لیا تھا۔ نہ اس میں عشق و محبت کا دخل تھا نہ کوئی اور رومانی داستان تھی جو کچھ بھی تھا یکطرفہ ہی تھا۔ شاہ زیب کے دل میں بے شک لجیا آ بیٹھی تھی۔ لیکن وہ لجیا کو حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ایک بے کار زندگی کے لیے کسی کی زندگی برباد کرنا اچھی بات تو نہیں تھی۔ لجیا بے چاری نے تو ویسے بھی زندگی کا خوشنما روپ نہیں دیکھا تھا۔ ایک بار پھر اسے ایک عذاب میں گرفتار کر لیا جائے۔ یہ تو کسی طور جائز نہیں تھا۔ نہ جانے کب تک وہ لجیا کے خیالوں میں ڈوبا رہا۔

پھر ذہن اس تصویر کی جانب مڑ گیا جو اس کے لباس میں اب بھی پوشیدہ تھی۔ یہ شخص جس کا کوئی نام معلوم نہیں تھا۔ جو صرف چوہدری صاحب کے نام سے اس کا شناسا تھا۔ اس کی دوسری شکل مکرم شاہ کی شکل تھی لیکن یہ بات مسلسل شاہ زیب کے ذہن میں سوئی کی طرح چبھتی رہتی تھی کہ مکرم شاہ اور وہ چوہدری ایک ہیں یا الگ الگ۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی اسے نہیں معلوم تھی کہ فخر خان سے اس کی کیا دشمنی تھی اور فخر خان اسے کیوں قتل کرانا چاہتا

تھا۔

یہ ایک عجیب مثلث بن گیا تھا جو بڑی الجھنوں کا باعث تھا اور شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ اس شخص کا بھی احسان مند تھا جس نے بے غرض اس کی مدد کی تھی اور جسے قتل کرنے کے لیے فخر خان نے اسے تیار کیا تھا۔ ویسے فخر خان کا جہاں تک معاملہ تھا وہ بے شک الیاس خاں اور جبار خاں کا دشمن تھا لیکن ویسے بھی اچھا آدمی نہیں تھا اور بہت سے الٹے سیدھے چکر چلا رکھے تھے اس نے۔ یہ سارے چوہدری ایک جیسے ہی ہوتے ہیں یا ان میں ایسے نیک دل اور رحم دل لوگ بھی مل جاتے ہیں جو دل کے بل پر انسانیت کے قتل پر آمادہ نہ ہوں۔ کیا کرنا چاہیے؟ کوئی ترکیب تو ایسی ہو جس سے آگے کچھ صورتحال بہتر ہونے کی امید ہو۔

بہت دیر تک وہ سوچتا رہا اور اس کے بعد ایک ہی خیال ذہن میں آیا کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے اس چوہدری کے پاس پہنچے۔ اس کے گوٹھ جائے اور جانے کے بعد اسے ساری صورتحال سے واقف کرے۔ یہ سوچ کر شاہ زیب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے ایک گہری نگاہ تاجو پر ڈالی۔ تاجو ایک جذباتی سا آدمی تھا۔ شاہ زیب نے اس کی تھوڑی سی مدد کی تھی تو وہ شاہ زیب کا اس قدر احسان مند ہو گیا تھا کہ اب اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اگر جاگتے وقت میں شاہ زیب اس سے یہ کہے کہ وہ اس سے علیحدہ ہونا چاہتا ہے تو وہ اس سے بہت سی جذباتی باتیں کرے گا اور اسے جانے نہیں دے گا۔ اس لیے کیوں نہ اس وقت سے فائدہ اٹھایا جائے۔ تاجو کروٹ لیے گہری نیند سو رہا تھا اور اتنی گہری نیند تھی اس کی کہ اگر اس وقت اس کے کان پر ڈھول بھی بجایا جاتا تو وہ نہ جاگتا۔ شاہ زیب نے آخری فیصلہ کیا جو کھانے پینے کا سامان تھا اس کے دو حصے کیے۔ ایک حصہ اپنے ساتھ لے لیا اور دوسرا تاجو کے لیے چھوڑ کر خاموشی سے وہاں سے اٹھا اور رات کی تاریکیوں میں برق رفتاری

سے ایک طرف دوڑنے لگا۔ اتنا فاصلہ پیدا کر لینا چاہتا تھا تاجو سے کہ اگر تاجو اسے تلاش کرنے کی کوشش کرے تو نہ تلاش کر سکے۔ وہ راستہ طے کرتا رہا۔

رات آہستہ آہستہ اس کے سر پر سے گزرتی رہی۔ پھر جب صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو وہ اس جگہ سے کافی دور نکل آیا تھا جہاں اس نے تاجو کو چھوڑا تھا۔ اپنے آپ کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ واقعی تاجو اس کے لیے دردِ سر ہی تھا۔ بس اتنا کافی تھا کہ کسی کے کہنے پر اس نے تاجو کی مدد کر ڈالی تھی لیکن اب اس کا یہ مقصد نہیں تھا کہ تاجو اس پر مسلط رہے۔ اپنی حفاظت کے ساتھ ساتھ تاجو کے تحفظ کا بھی خیال کرنا پڑتا اور ایسی شکل میں اسے کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا تھا۔ اس نے ایک اونچی جگہ چڑھ کر چاروں طرف دیکھا اور اس کے بعد دور دور تک آبادی نہ پا کر اس نے فیصلہ کیا کہ یہاں کچھ وقت آرام کر لیا جائے۔ بنجر سا علاقہ تھا اور کسی کی تحویل میں نہیں معلوم ہوتا تھا۔

بہرطور اس نے سامان کا تکیہ بنایا اور ایک جگہ منتخب کر کے لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر کے وہ اپنے آپ پر غور کرنے لگا۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا وہ یقیناً وقت کی دین تھا۔ خود اس کا اس تمام کارروائی میں ایسا ارادہ شامل نہیں تھا۔ یہ سوچتے سوچتے وہ گہری نیند سو گیا۔ اس کے بعد جب وہ جاگا تو صورتحال بالکل بدلی ہوئی تھی۔ وہ ایک کمرے میں قید تھا۔ قید کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا کہ اس سادہ سے کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جنگل میں لیٹا تھا اگر اسے وہاں سے اٹھا کر بھی لایا گیا ہے تو کیا لانے والوں نے اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ ورنہ نیند اتنی گہری تو نہیں ہو سکتی کہ کوئی بڑا فاصلہ نیند کے عالم میں طے کر لیا جائے۔ پڑھا لکھا نوجوان تھا اپنے آپ غور کیا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کے سسٹم میں کوئی خرابی موجود ہے یقینی طور پر اسے کلوروفام یا بے ہوش کر دینے والی کسی اور چیز سے بے ہوش کیا گیا ہے اور اس کے اثرات ابھی تک اس پر موجود تھے۔ شاہ زیب نے آنکھیں بند

کر کے ذہن کھنگالا۔ اسے لانے والے کون ہو سکتے ہیں اور قصہ کیا ہے۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے چاروں طرف نگاہیں گھما کر اس کوٹھڑی سے کمرے کو دیکھا۔ جس چارپائی پر وہ لیٹا ہوا تھا اس پر معمولی سا بستر پڑا ہوا تھا۔ کمرے میں ایک کھڑکی تھی جس میں مضبوط سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کھڑکی کے سامنے ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ برآمدے کی ایک سمت کوڑے کا ڈھیر، گھنی جھاڑیاں اور درخت تھے۔

بہرحال سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا قصہ ہے۔ وہ کھڑکی کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا کہ اس نے ایک لمبے چوڑے آدمی کو دیکھا جو چہرے ہی سے خطرناک لگتا تھا اور غالباً راستہ کاٹ کر اسی کمرے کے دروازے کی جانب آ رہا تھا۔ اس نے بھی شاہ زیب کو کھڑکی میں کھڑے دیکھ لیا تھا۔ شاہ زیب نے ہاتھ اٹھا کر اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن وہ برآمدے میں دوسری جانب مڑ گیا اور شاہ زیب صرف منہ کھول کر رہ گیا۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد اسے کمرے کے دروازے پر باہر سے آہٹیں سنائی دیں اور تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھل گیا۔ اس نے گردن ہلا کر شاہ زیب کو آنے کا اشارہ کیا اور شاہ زیب اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ وہ شاہ زیب کو لیے ہوئے سیدھا آگے بڑھتا رہا۔ شاہ زیب نے کہا۔

''سنو تو بھائی--- سنو تو--- میری بات تو سنو۔''

''چلتے رہو اور یہ نہ سوچنا کہ تمہارے ہاتھ پاؤں اس لیے کھلے چھوڑ دیے گئے ہیں کہ تم بھاگنے کی کوشش کرو۔ کیا سمجھے؟''

''نہیں میں بھاگ کر کہاں جاؤں گا لیکن میری بات تو سن لو۔''

''سن لی جائے گی تیری بات۔ آ جاؤ میرے ساتھ۔'' وہ لاپروائی سے بولا۔ جس طرح وہ شاہ زیب کو ساتھ لیے جا رہا تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یا تو وہ بے انتہا

خوداعتماد ہے یا پھر یہ جگہ ہی ایسی ہے کہ یہاں سے کسی کا نکل جانا ناممکنات میں سے ہے۔ لیکن شاہ زیب کے ذہن میں یہاں سے بھاگنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ پہلے تو سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ وہ یہاں تک پہنچا کیسے اور اس کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اسے ان لوگوں سے تعاون کرنا ہوگا۔ وہ شاہ زیب کو لیے ہوئے ایک بڑے سے وسیع کمرے میں آیا۔ یہ کمرہ دوسرے کمروں سے زیادہ کشادہ تھا اور اس میں اٹیچ باتھ بھی تھا۔ اس نے کہا۔

''اندر جاؤ۔ خوب اچھے طریقے سے نہا دھو لو۔ شیو بنانے کا سامان بھی اندر موجود ہے لیکن ظاہر ہے تم بیوقوف نہیں ہو۔ کسی بھی چیز سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرنا۔ یہاں تمہارے لیے بہتر ماحول ہے اور تم کسی کی دشمنی کا شکار نہیں ہو۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے لیکن کپڑوں کا کیا ہوگا۔ میرے کپڑے تو بالکل چیکٹ ہو رہے ہیں۔''

''اندر جاؤ کپڑے موجود ہیں۔'' اس نے کہا۔ شاہ زیب غسل خانے کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ پھر دروازے پر رک کر بولا

''سنو۔ تمہیں کس نام سے مخاطب کر سکتا ہوں میں؟''

''شہباز--- میرا نام شہباز ہے۔''

''شکل سے بھی لگتے ہو۔'' شاہ زیب نے کہا اور غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ غسل خانہ کمرے سے زیادہ خوبصورت تھا۔ ٹائل لگے ہوئے تھے۔ فٹنگ بھی جدید ترین تھی۔ شاہ زیب کا شیو بہت بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے اس نے اپنا شیو کیا اور اس کا چہرہ صاف شفاف ہو گیا۔ اندر کپڑے بھی لٹکے ہوئے تھے جو شاہ زیب کے جسم پر بالکل فٹ تھے۔ سفید شلوار اور قمیض اسفنج کی چپل۔ شاہ زیب کو اپنا سارا وجود ہلکا محسوس ہوا۔ غسل کر کے وہ باہر نکلا۔ شہباز اس کا منتظر تھا۔ پہلی بار شہباز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی پھر اس نے کہا۔

''آ جاؤ۔'' اور پھر وہ شاہ زیب کو لے کر واپس اسی کمرے میں پہنچ گیا جس میں شاہ زیب کے لیے انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں پہنچ کر وہ چارپائی پر بیٹھا۔ شہباز واپس پلٹ گیا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس نے دروازہ باہر سے بند نہیں کیا تھا۔ شاہ زیب ابھی حیران ہی تھا کہ دروازے سے ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک بڑی سی ٹرے تھی۔ شاہ زیب نے ٹرے کی جانب دیکھا۔ عورت نے ٹرے شاہ زیب کے سامنے رکھ دی تو شاہ زیب کہنے لگا۔

''اماں جی--- پانی نہیں پلاؤ گی؟''

''لاتی ہوں۔'' عورت نے کہا اور واپس دروازے کی جانب مڑ گئی۔

شاہ زیب کو نہ جانے کیا سوجھی وہ پھرتی سے دروازے کی جانب لپکا۔ ابھی آدھا دروازے سے باہر نکلا تھا کہ ایک چوڑا ہاتھ اس کے سینے پر آ کر رک گیا۔

''امتحان بھی تھا تمہارا کہ بھاگنے کی کوشش کرتے ہو یا نہیں۔ اندر جاؤ--- یہ جگہ بہت خطرناک ہے اگر چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو دونوں پیروں میں گولی مار دی جائے گی اور اس کے بعد ظاہر ہے یہ خطرہ غلط ہو جائے گا۔ ہم بہت زیادہ رسک نہیں لیا کرتے۔''

''نہیں میں تو بس۔'' شاہ زیب نے شرمندہ سے لہجے میں کہا اور واپس اپنی جگہ آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

وہ عورت جو پانی لینے گئی تھی چند لمحوں کے بعد واپس آ گئی۔ وہ ایک جگ اور ایک گلاس اٹھائے ہوئے تھی۔ ٹھنڈا پانی اس نے سامنے رکھ دیا۔ شاہ زیب باہر کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن کوئی صحیح اندازہ نہیں ہو سکا۔

چنانچہ وہ کھانے میں مصروف ہو گیا۔ اچھا کھانا تھا۔ چکن قورمہ، خمیری روٹیاں، کٹی ہوئی پیاز اور کھیرا۔ شاہ زیب نے خوب اچھی طرح پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ جو چیزیں ساتھ لائی

گئی تھیں ان کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ رائفل اور پستول بھی کسی کے قبضے میں جا چکا تھا۔ عورت برتن اٹھا کر لے گئی اور شاہ زیب چارپائی پر لیٹ گیا۔

وہ دیر تک اس پراسرار ماحول کے بارے میں غور کرتا رہا تھا اور اسے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ ماحول واقعی پراسرار تھا۔ نہ جانے کون ہے اور اسے کیوں یہاں لایا ہے۔ بہت دیر تک لیٹے لیٹے سوچتا رہا اور پھر سو گیا۔

نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ وہ نیند سے بیدار ہو گیا۔ لیٹے لیٹے طبیعت اکتا گئی تھی۔ چنانچہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ دروازے کے بارے میں صحیح اندازہ نہیں تھا کہ وہ بند ہے یا کھلا ہوا لیکن شہباز کے الفاظ یاد تھے۔ پھر بھی وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کمرے کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ دروازے کو آزمایا تو وہ حیرت انگیز طور پر کھل گیا اور شاہ زیب کچھ لمحے سوچنے کے بعد کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گیا۔ ابھی وہ برآمدے میں ہی تھا کہ کسی طرف سے شہباز نکل کر سامنے آ گیا۔ شاہ زیب اسے دیکھ کر مسکرایا پھر بولا۔

''شہباز بھائی! بدن ٹوٹ رہا ہے چائے کی پیالی مل جائے گی؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔''

''سگریٹ پیتے ہو؟''

''نہیں' اللہ کا شکر ہے سگریٹ نہیں پیتا۔''

''چائے منگا دیتا ہوں تمہارے لیے۔ چاہو تو یہاں برآمدے میں بیٹھ جاؤ۔ بار بار یاد نہیں دلانا چاہیے۔ جس بندے کو ایک دفعہ کی بات کا اعتبار نہ ہو۔ اسے دو دفعہ بات کر دو وہ نہیں مانتا۔ تمہاری ٹانگیں ٹوٹ جائیں گی تو مجھے بھی افسوس ہوگا۔''

''نہیں بے فکر رہو میں اپنی ٹانگوں کی حفاظت کروں گا۔'' شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے کہا اور شہباز وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ پھر کچھ ہی لمحوں بعد وہ واپس آ کر شاہ زیب کے

ساتھ برآمدے میں بیٹھ گیا تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد وہی عورت چائے کے برتن لے آئی۔ شاہ زیب کی نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اونچی اونچی دیواریں تھیں اور برآمدے کی جھکی ہوئی چھت نیچی تھی۔ بہرحال چائے گرم تھی اور بڑی اچھی بنائی گئی تھی۔

''شہباز! میرے بارے میں تمہیں کچھ معلوم ہے؟''

''نہیں۔ اور نہ مجھے کچھ معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''یار! میری بات سنو میں تمہیں ذرا بھی پریشان نہیں کروں گا۔ اصل میں میں ایک ویران جگہ آرام کرنے لیٹ گیا تھا اور نہ جانے کس طرح مجھے وہاں سے اٹھا کر لایا گیا۔ بس اس کے بارے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں نے کہا نا دوست بننے کی کوشش مت کرو۔ اگر دوستی کی ضرورت ہوئی تو دوستی بھی کر لی جائے گی لیکن ابھی مجھے تمہارے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن انسان کے بچے تو ہو۔ انسانوں کی طرح بات تو کر سکتے ہو۔ جانور بننے کی کوشش کیوں کر رہے ہو۔''

''بتاؤں تجھے جانور بننے کی کوشش کیوں کر رہا ہوں۔''

''ارے نہیں بھائی! میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔ کوئی جھگڑے والی بات نہیں ہے۔''

''جب میں نے تمہیں بتا دیا کہ اس وقت میں تمہارا نہ دوست بن سکتا ہوں نہ دشمن جب تک کہ پتہ نہ چل جائے۔ جب تک کہ پتہ نہ چل جائے مجھے کہ تمہارے ساتھ کرنا کیا ہے۔'' شاہ زیب نے گہری سانس لے کر گردن ہلا دی تھی۔

کافی دیر تک وہ بیٹھا چائے پیتا رہا۔ شہباز کو بھی اس نے چائے کی پیشکش کی تھی لیکن اس نے منع کر دیا۔ پھر شام کا جھٹپٹا ہوا تو اندھیرا کے ساتھ ساتھ ہی ہر طرف موت کی خاموشی

چھا گئی۔ شاہ زیب چارپائی پر واپس آ بیٹھا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہی عورت اندر آئی اور اس نے سوئچ دبا کر روشنی کر دی اور پھر باہر چلی گئی لیکن شاہ زیب کو اب یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔ البتہ کچھ دیر کے بعد سناٹے میں آواز سنائی دی اور بوڑھی عورت کھانا لے کر اندر داخل ہو گئی۔ شاہ زیب نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دن بھر عجیب سی کیفیت رہی تھی۔ اس لیے اس وقت کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ خود کو بہت مضمحل اور تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ نہ جانے کب تک وہ بستر پر لیٹ کر سو گیا اور پھر اس وقت جاگا جب کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑا۔ شہباز کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ شاہ زیب اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' شاہ زیب اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے ایک کمرے میں پہنچا دیا اور اس کمرے میں اس نے جسے دیکھا اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے قدم رک گئے تھے۔ یہ مکرم شاہ کا ہم شکل تھا اور فخر خان نے اس کا نام حیدر شاہ بتایا تھا۔ شاہ زیب پر بہت دیر تک سنسنی طاری رہی اور مکرم شاہ کا ہم شکل اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ زہریلے لہجے میں بولا۔

''ہاں--- آؤ--- میرا خیال ہے کہ تم مجھے میرے احسانات کا صلہ دینے کے لیے آئے ہو؟''

''شاہ جی! میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ جو بتاؤں گا شاید آپ اس پر یقین نہ کرو۔''

''اگر سچ بولو تو یقین نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟''

''شاہ جی! میں بالکل سچ بولوں گا۔ آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے اور بات بھی کچھ ایسی ہی ہوئی ہے کہ مجھے آپ کے احسانات کا صلا اتارنا ہے۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ آگے بولو۔''

''شاہ جی! فخر خان کو جانتے ہیں آپ؟''

''جانتا ہوں۔''

''شاہ جی! میرا مسئلہ تو تھوڑا بہت آپ کے علم میں ہے اور اگر نہیں ہے تو میں مختصر انداز میں آپ کو اپنے بارے میں بتا دوں۔''

''ہاں۔ پہلے میں نے تم سے تمہارے بارے میں کچھ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن اب تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔''

''شاہ جی! بس تقدیر کا مارا ہوا ہوں۔ لاہور میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ بھائیوں نے اپنی بیویوں کے کہنے پر میرے لیے مشکلات پیدا کر دیں۔ الیاس خاں اور جبار خاں سے دشمنی چل گئی۔ کچھ بندے میرے ہاتھوں مارے گئے اور بڑی مشکلات سے وقت گزرا۔''

شاہ زیب نے یہاں بھی اپنی کہانی سنائی اور محسوس کیا کہ حیدر شاہ کے چہرے پر نرمی کے آثار پھیل گئے۔ شاہ زیب کی اب تک کی کہانی ختم ہوئی۔ تو حیدر شاہ کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے گردن ہلائی اور بھاری لہجے میں بولا۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ تم جہاں پڑے ہوئے تھے وہاں ایک خوفناک زہریلا سانپ پہنچ چکا تھا اور اگر ہمارے آدمی اسے نہ دیکھ لیتے تو تمہارا کھیل ختم ہو چکا تھا۔ سانپ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا لیکن تم اس بات پر یقین نہیں کرو گے کہ اس کا زہریلا سانس تمہارے سانس میں شریک ہو گیا تھا۔ وہ ان علاقوں میں پنکور کہلاتا ہے اور پنکور اتنا زہریلا اور خطرناک ہوتا ہے کہ اس کی سانسیں کوئی سو گز کے فاصلے پر سوئے بندے کو گہری بے ہوشی کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ تم اسی بے ہوشی کا شکار ہو گئے تھے۔ ہمارے بندے تمہیں اٹھا لائے۔ تمہاری تلاشی لی تو تمہارے لباس سے میری تصویر برآمد ہوئی۔ یہ ان کے لیے حیرانی کی بات تھی۔ میں نے تمہیں دیکھا اور پہچان لیا کہ تم کون ہو۔ لیکن تصویر کا مسئلہ میرے لیے بھی تعجب

خیز تھا۔ میں نے شہباز کو ہدایت کر دی کہ جیسے ہی تم ہوش میں آؤ۔ تمہیں میرے پاس لے آیا جائے۔ اٹھو آؤ میرے ساتھ۔'' حیدر شاہ نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ پھر وہ دوسرے دروازے سے نکل کر ایک راہداری میں داخل ہو گیا اور خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے اپنے لباس سے ایک چابی نکالی اور کمرے کا دروازہ کھولنے لگا۔ پھر اسے اندر داخل ہونے کا اشارہ کر کے اندر داخل ہو گیا۔

اندر پہنچ کر اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اندر گھپ اندھیرا ہو گیا تھا۔ حیدر شاہ نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ دبایا اور ایک مدھم سا بلب روشن ہو گیا سامنے زینہ تھا جو نیچے جاتا تھا۔ حیدر شاہ اسے آنے کا اشارہ کر کے زینے کی طرف بڑھ گیا اور شاہ زیب کچھ سمجھے بوجھے بغیر زینے پر حیدر شاہ کے ساتھ نیچے اترنے لگا اور کچھ دیر کے بعد سیڑھیاں طے ہو گئیں اور وہ کشادہ تہہ خانے میں پہنچ گئے۔

تہہ خانے کا فرش کچا تھا اور یہاں سلین اور گھٹن کے ساتھ ساتھ عجیب قسم کی بساند پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں بھی ایک مدھم سا بلب روشن تھا۔ چھت پر ایک چمنی بنی ہوئی تھی۔ جس کے نیچے آتش دان تھا اور تہہ خانہ گرم رکھنے کے لیے لکڑی کے ٹکڑے اور کوئلے پڑے ہوئے تھے لیکن اس وقت سرد تھے کیونکہ موسم سرد نہیں تھا۔ تہہ خانے میں جلنے والے بلب کی مدھم مدھم روشنی میں شاہ زیب نے ایک شخص کو دیکھا جو زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کی داڑھی اور سر کے بال بڑھے ہوئے تھے اور اس کا لباس بھی انتہائی بوسیدہ تھا لیکن جو چیز قابل غور تھی وہ اس کے پیر میں بندھی ہوئی لوہے کی ایک بہت ہی موٹی زنجیر تھی جسے دیوار میں نصب ایک کنڈے سے باندھا گیا تھا۔ ضرورت کی چند چیزیں یہاں موجود تھیں۔ ان دونوں کے قدموں کی آواز سن کر وہ شخص اٹھ کر بیٹھ گیا اور ان دونوں کو گھورنے لگا۔

شاہ زیب نے ایک لمحے کے اندر اندر اس کی آنکھوں میں نفرت اور غصے کے آثار

دیکھے تھے۔ اس کے چہرے پر وحشت طاری تھی اور اس کے سینے کی کیفیت بدلنے لگی تھی۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا اور اس کے منہ سے ہلکی ہلکی خرخراہٹ بلند ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے غصے کی شدت سے وہ اپنے الفاظ بھی ترتیب نہ دے پا رہا ہو۔ پھر اس کے منہ سے آواز نکلی۔

''کتے کے بچے--- کتے کے بچے' شیطان کی سی عمر پائی ہے تو نے۔ میں کہتا ہوں تجھ جیسے لوگوں کے لیے موت بھی نہیں ہے۔ لعنت ہو تجھ پر۔ تیری زندگی پر لعنت ہو۔ اس ماں پر لعنت ہو جس نے تجھے جنم دیا۔ کمینے' بے غیرت۔ بار بار کیوں میرے سامنے آ جاتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تیری دونوں آنکھیں انگلیاں ڈال کر نکال لوں۔ میں تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ دفع ہو جا یہاں سے۔'' وہ چیخ چیخ کر گالیاں دیتا رہا اور شاہ زیب حیرت سے کبھی اسے اور کبھی حیدر شاہ کو دیکھ رہا تھا۔

حیدر شاہ کے چہرے پر گہرا سکوت طاری تھا۔ بوڑھے سے جب تک گالیاں دی جاتی رہیں وہ گالیاں دیتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ بوڑھے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ بوڑھا شدید دیوانگی کا شکار نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں وحشت سے ابل پڑ رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے برق رفتاری سے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس پر حملہ کر دیا لیکن حیدر شاہ بیوقوف نہیں تھا۔ وہ صرف اتنا آگے بڑھا تھا کہ بوڑھے کے ہاتھوں کی لمبائی سے دور رہے۔ بوڑھا چونکہ تیزی سے حیدر شاہ پر لپکا تھا۔ اس لیے اپنی زنجیر کی حد کا اندازہ نہیں لگا سکا اور برق رفتار ہونے کی وجہ سے وہ لڑکھڑایا اور پھر اس بری طرح زمین پر گرا کہ شاہ زیب نے تو یہ سمجھا کہ بوڑھا گیا۔ اس کے پیر میں بندھی ہوئی زنجیر جھنجھنا اٹھی تھی۔ حیدر شاہ نفرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بوڑھے کے کافی زور سے چوٹ لگی تھی۔ لیکن اس کی ہڈیاں جاندار تھیں کہ ٹوٹی نہیں۔ وہ وہیں اپنی جگہ بیٹھا رہا اور پھر اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''کیوں آ کر مرا ہے یہاں۔ خدا تجھے غارت کرے۔''

''بتاتا ہوں۔'' حیدر شاہ نے کہا اور ایک طرف مڑ گیا۔

پھر اس نے دیوار سے چمڑے کا ایک ہنٹر اٹھایا اور اسے کھول کر بوڑھے کی جانب بڑھا۔ شاہ زیب کو اندازہ نہیں تھا کہ ایسی کسی سچویشن کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ اس سارے ڈرامے کو حیران کن نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ شاہ زیب نے بوڑھے کے چہرے پر کسی قدر خوف کے آثار دیکھے تھے۔ اب وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر حیدر شاہ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی سہمی ہوئی آواز نکلی۔

''ہاں ہاں اور کیا کر سکتا ہے تو۔ مار مجھے مار۔'' دوسرے لمحے شڑاک کی آواز کے ساتھ چمڑے کا ہنٹر بوڑھے کے جسم پر پڑا اور بوڑھے کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی۔ شاہ زیب کو ایک لمحے کے اندر اندر بوڑھے کے لیے اپنے دل میں ہمدردی کا احساس ہوا تھا لیکن وہ کچھ بولا نہ تھا۔ دوسرا ہنٹر اس کے بدن پر پڑا اور بوڑھا پھر کراہا۔

''مار دے مجھے مار دے کتے اور کیا کر سکتا ہے تو' مار دے مجھے مار دے جان سے۔'' وہ زمین پر سیدھا سیدھا لیٹ گیا تھا لیکن حیدر شاہ نے اسے تیسرا ہنٹر مارا اور خونی نگاہوں سے اسے گھورتا رہا۔

شاہ زیب محسوس کر رہا تھا کہ حیدر شاہ کی آنکھوں میں اس شخص کے لیے عجیب سی نفرت رچی ہوئی ہے۔ نہ جانے کیا قصہ تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد حیدر شاہ نے کہا۔

''آؤ۔'' جب وہ واپسی کے لیے مڑا تو بوڑھے نے کہا۔

''میرے لیے دو چار امرود کے درخت لیتے آنا۔ اب کے جب بھی واپس آؤ۔'' حیدر شاہ نے مڑ کر اسے دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تو اپنا کام جاری رکھ۔ میں دیکھوں گا تیرے اندر کتنی قوت برداشت ہے۔'' اس نے

ایک بار پھر شاہ زیب کو اشارہ کیا اور شاہ زیب اس کے پیچھے چل پڑا۔ حیدر شاہ اسے لیے ہوئے باہر آیا تھا۔ اور پھر ایک کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ شاہ زیب نے کہا۔

''شاہ جی! ایک سوال کروں آپ سے؟''

''بیٹھ جاؤ ادھر --- یہ معلوم ہونے کے بعد کہ تم بھی ایک زمیندار کے بیٹے ہو اور ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ میں تمہارے ساتھ اپنا رویہ تبدیل کر رہا ہوں۔ سامنے بیٹھ جاؤ۔''

''ہاں کیا سوال کرنا چاہتے ہو؟''

''شاہ جی! کیا یہ وہی عمارت ہے جہاں میں پہلی بار آپ کے پاس آیا تھا؟''

''نہیں۔ یہ وہ عمارت نہیں ہے۔ میرے بہت سے گھر مختلف علاقوں میں ہیں۔ بس اس سے زیادہ کوئی سوال نہ کرو۔ تم نے فخر خان کے بارے میں بتایا تھا۔ میں تمہارے خاندان کو بھی جانتا ہوں۔ ہم زمیندار ایک دوسرے سے واقفیت رکھتے ہیں۔ کہیں ملاقات کی حد تک اور کہیں صرف شناسائی اور ناموں کی حد تک۔ جہانزیب اور اورنگزیب کا نام میں نے سنا ہے۔ بہر حال جہاں تک فخر خان کا تعلق ہے وہ ایک کمینہ انسان ہے۔ الیاس خاں اور جبار خاں کے بارے میں بھی میں جانتا ہوں۔ چھچھورے اور گھٹیا قسم کے غنڈے ہیں۔ کچھ سرکاری اہل کاروں سے شناسائی حاصل کر لی ہے اور وہ بھی جانتے ہو کس طرح۔ الیکشن میں ان کو کامیاب کرا دیا ہے اور اب وہ اس وقت برسر اقتدار ہیں۔ الیاس خاں اور جبار خاں ہر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جب نئے الیکشن ہوتے ہیں تو انہیں امید ہوتی ہے کہ اس بار کون سی پارٹی ان کے کام آ سکتی ہے۔ چنانچہ وہ ان سے ہی ڈیل کرتے ہیں اور ان کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ ہمیشہ اپنے لیے ایک جگہ رکھتے ہیں۔ خیر فخر خان ان سے لڑ رہا ہے۔ لیکن بذات خود فخر خان بھی ایک کمینہ آدمی ہے۔ وہ شخص جسے تم نے

تہہ خانے میں دیکھا۔فخر خان کا ماموں زاد بھائی اور اس کی تمام جائیداد کا مینجر ہے۔ ہماری ایک زمین تھی۔ یہ زمین میں نے فخر خان سے خریدی تھی۔کافی مہنگے داموں اور بڑی محنت کی تھی میں نے اس پر۔ باغ لگوائے تھے میں نے بڑے شاندار اور جب فخر خان نے ایک بار پھر زمینوں کو دیکھا۔تو اس کی نیت خراب ہوگئی۔اس نے چالاکی سے وہ دستاویزات غائب کرادیں میرے پاس سے۔ایک بار پھر ان زمینوں پر اپنا قبضہ قائم کرلیا۔وہ صاف مکر گیا کہ اس نے یہ زمینیں بیچیں ہیں اور اس نے سارے انتظامات مکمل کر دیئے لیکن یہ مینجر یہ بات جانتا تھا کہ وہ دستاویزات جہاں موجود ہیں۔ وہاں سے انہیں کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی تو میں نے مینجر کو اغوا کرالیا۔اس کا نام فاضل باجوہ ہے۔ میں نے اس سے یہ دستاویزات کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو اس نے پاگل پن کا ڈھونگ رچالیا اور اب یہ بنا ہوا پاگل ہے۔ یہ تمام صورتحال ہے سمجھے تم۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ حالات کے تحت تم فخر خان تک جا پہنچے اور اس وقت تم فخر خان کے لیے دوہری حیثیت رکھتے ہو۔ایک تو تمہارے ذریعے وہ وہاں کارروائی کرتا رہے گا۔مطلب یہ کہ الیاس خاں اور جبار خاں کا بھٹہ نہیں بننے دے گا۔ میں جانتا ہوں کہ بات ایک چھوٹے سے بھٹے کی نہیں ہے۔ بلکہ یہ زمیندار اپنی بادشاہت قائم رکھنا چاہتے ہیں اور انہیں اپنی برتری کا اظہار کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ فخر خان تمہارے ذریعے یہ سب کچھ کرنا چاہتا ہے۔

سنو لڑکے! میں یہ نہیں جانتا کہ میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں۔اگر تمہارا مقصد صرف یہ ہے کہ تم ان زمینوں پر بھٹہ نہ بننے دو اور اپنی ماں سے کیے قول کو نبھاؤ تو میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔خفیہ طریقے سے تم وہاں جو بھی کارروائی کرنا چاہو کرو اور اس کے بعد میرے پاس پناہ لے لو۔آدمیوں کی ضرورت ہے تو میں تمہیں بندے مہیا کرسکتا ہوں۔ہم تم دونوں مل جل کر کام کریں۔کوئی ایسا منصوبہ بنائیں جو کارآمد ہو اور تم بھی اس سے فائدہ اٹھا سکو۔'' شاہ زیب

نے فوراً ہی اس بات کو پکڑ لیا اور بولا۔

''شاہ جی! آپ کا غلام ہوں میں۔آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ کوئی سرپرستی نہیں ہے میری۔اپنے طور پر ہی لڑ رہا ہوں لیکن اچھی طرح جانتا ہوں میرے ہاتھ بہت کمزور ہیں۔''

''میں ان ہاتھوں کو طاقت دوں گا شاہ زیب! تمہیں حیدر شاہ کی طاقت حاصل ہوگی۔ دیکھو بات زمینوں کی یا باغوں کی نہیں ہوتی۔ بات اپنی انا کی ہوتی ہے اور یہ انا صدیوں تک قائم رہتی ہے۔ ہم چوہدری دولت کے پیچھے نہیں بھاگتے بلکہ دولت ہمارے پیچھے بھاگتی ہے۔ یہ فخر خان بھی ان زمینوں کا لالچی نہیں ہے۔لیکن اس نے جو کچھ کیا یہ اس پر بغلیں بجاتا رہے گا اور اپنے آپ کو مجھ سے برتر سمجھتا رہے گا۔بس یہ برتری ہی ہمیں قبول نہیں ہوتی۔ زمینوں کی دستاویزات جو اس کی خرید کے سلسلے میں تھیں اس نے غائب کردی ہیں۔اور یہ بندہ فاضل باجوہ ان دستاویزات کے بارے میں جانتا ہے۔جس طرح فخر خان نے یہ دستاویزات چوری کرائی ہیں۔اسی طرح میں بھی انہیں چوری کرانا چاہتا ہوں۔بشرطیکہ مجھے ان کی موجودگی کی جگہ کا پتہ مل جائے۔فخر خان نے تمہیں پیشکش کی ہے کہ وہ تمہاری زمینوں کی حفاظت کرے گا۔ارے وہ تو کرے گا ہی کیونکہ یہ اس کا بھی مسئلہ ہے لیکن میں تم سے جو بات کہہ رہا ہوں وہ بالکل الگ ہے۔ میں ہر جگہ تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تعلقات میرے بھی کم نہیں ہیں۔ بندے میرے پاس بھی بہت ہیں۔بات صرف اتنی سی ہے کہ صحیح کام ہونا چاہیے۔کیا تم میرے لیے کام کرنے کو تیار ہوگے۔ میں سمجھتا ہوں تمہارے پاس بھی براہ راست کوئی راستہ نہیں ہے۔میرے ساتھ شامل ہو جاؤ۔''

''آپ نے پہلے ہی مجھ پر احسان کیا ہے شاہ جی! میں نے اس وقت بھی آپ سے کہا تھا کہ میں آپ کے احسانوں کا صلہ دینے کی کوشش کروں گا۔''

''ہاں لیکن اس وقت مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ تم ایک

معمولی سے آدمی ہو اور کوئی معمولی سا آدمی بھلا میرے احسان کا مجھے کیا صلہ دے سکتا ہے۔ لیکن بات جب بڑے آدمیوں کی ہوتی ہے تو اس میں ایک وزن ہوتا ہے اور پھر تمہیں تو فوراً ہی موقع مل گیا ہے۔ بولو میرے لیے کچھ کام کرو گے؟''

''بالکل تیار ہوں شاہ جی!''

''تو سنو۔ اس بوڑھے فاضل باجوہ کی دیکھ بھال تم سنبھال لو۔ یہ بنا ہوا پاگل ہے۔ پاگل نہیں ہے۔ یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم اس کے دل میں اتر جاؤ۔ اگر چاہو تو اسے یہاں سے فرار کرانے کی کوشش بھی کرو لیکن اس طرح کہ ان دستاویزات کا پتہ چل جائے۔ میں نے ساری زندگی رسک لیا ہے۔ فخر خان مجھے قتل کرانا چاہتا ہے۔ تم یہ کوشش بھی کر سکتے ہو۔ میں تمہیں پورا پورا موقع دوں گا۔ شاہ زیب سوچ میں ڈوب گیا پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔

''مجھے اس سلسلے میں آپ پوری تفصیل بتائیے حیدر شاہ صاحب!''

''دیکھو بوڑھے کی دیکھ بھال کی ذمے داری تم لے لو۔ اس سے اظہار ہمدردی کرو اور اس سے معلومات کرو کہ میں نے تمہیں یہاں کیوں بند کر رکھا ہے اور پھر ہو سکے تو مجھے ان دستاویزات کے بارے میں تفصیلات فراہم کر دو۔ بعد میں اگر تم چاہو تو میں تمہارے لیے ایک بڑا ڈرامہ کر سکتا ہوں۔''

''کیا ڈرامہ؟''

''فخر خان کی ہدایت کے مطابق تم مجھ پر قاتلانہ حملہ کرو اور مجھے شدید زخمی کر دو۔ اس طرح سے کر دو کہ میری موت کی خبر اڑ جائے۔ بعد میں یہ وضاحت کر دی جائے گی کہ مجھ میں تھوڑی سی زندگی رہ گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے مجھے بچا لیا۔ اس طرح تمہارا مقصد بھی پورا ہو جائے گا اور فخر خان تم پر اعتماد کرے گا لیکن درپردہ تم میرے اپنے آدمی ہو گے اور مجھے وہ

دستاویزات لا کر دو گے۔ نتیجے میں تم صرف یہ کہہ دینا کہ تمہیں کیا چاہیے۔ بات فخر خان کو ذلیل کرنے کی ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ جو کچھ تم مانگو گے وہ تمہیں دے دوں گا۔''

شاہ زیب سرد نگاہوں سے حیدر شاہ کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''ٹھیک ہے شاہ جی! مجھے منظور ہے۔'' حیدر شاہ نے کسی قسم کی جذباتی کیفیت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بس اپنی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھتا رہا۔ شاہ زیب کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس کی آنکھوں کے راستے اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر رہا ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک شاہ زیب کے دل میں اس کے لیے کوئی خاص برائی نہیں تھی کیونکہ اس نے شاہ زیب کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی تھی۔ بلکہ جیسا وہ کہہ رہا تھا کہ سانپ اس کی زندگی لینے کے درپے تھا اور اس کے آدمیوں نے شاہ زیب کی زندگی بچائی تھی۔ چنانچہ ایک بار پھر اس پر ایک احسان ہو گیا تھا۔ بہت دیر تک حیدر شاہ سوچتا رہا۔ اسی دوران شاہ زیب نے کہا۔

''شاہ جی! ایک بات میرے ذہن میں اٹکی ہوئی ہے۔ آپ سے اگر نہ پوچھوں تو یہ بزدلی ہی ہو گی اور میں چاہتا ہوں کہ دل کی صفائی ہو جائے۔''

''ہاں ہاں پوچھو کیا بات ہے؟''

''شاہ جی! کچھ عرصہ پہلے میری ملاقات ایک شخص سے ہوئی تھی۔ اس نے اپنا نام مکرم شاہ بتایا تھا۔ شاہ جی ایک عجیب و غریب اور مستانہ سا آدمی تھا جو غائب ہو گیا اور مجھے دوبارہ نہیں ملا۔ شاہ جی وہ آپ کا اتنا ہمشکل تھا کہ میں آپ سے بیان نہیں کر سکتا۔ بس ایک فرق تھا اس میں اور آپ میں۔ شاہ جی! اس کا ایک پاؤں نہیں تھا۔'' شاہ زیب یہ الفاظ حیدر شاہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ تھوڑا سا تجربہ اس کا اپنا بھی تھا۔ یونیورسٹی میں پڑھ چکا تھا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس دور کا جدید لڑکا تھا۔ اس نے حیدر شاہ کے چہرے کا ہلکا سا رنگ بدلتے ہوئے دیکھا۔ لیکن حیدر شاہ نے ایک لمحے کے اندر خود کو سنبھال لیا اور بولا۔

''تو پھر بھائی! اگر میرا کوئی ہمشکل تمہیں ملتا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

''نہیں شاہ جی! یہ بات نہیں ہے۔ بس ایسے ہی میں نے آپ سے سوال کر لیا۔ کوئی جڑواں بھائی تو نہیں تھا آپ کا؟''

''نہیں بھائی! میں اپنی ماں کی اکیلی اولاد ہوں سمجھے۔''

''جی شاہ جی! یہ سوال تھا جو میں نے آپ سے کر لیا۔''

''اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔ اب تمہیں کل سے اپنا کام سنبھال لینا ہے اور یہ بات تو تم جانتے ہو کہ جو کام جتنی جلدی ہو جائے۔ وہ بہتر رہتا ہے۔''

''جی شاہ جی۔'' شاہ زیب نے جواب دیا اور پھر اس کے بعد شاہ زیب کو یہ ذمے داری دی گئی۔ اس سلسلے میں اس کا نگران صرف شہباز تھا۔ جو بڑی خطرناک شخصیت کا مالک لگتا تھا۔ شاہ زیب کو خود بھی یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے اپنے ذہن میں بہت سے فیصلے کیے اور دوسری رات وہ تہہ خانے میں جا پہنچا۔ کھانا لے کر گیا تھا۔ ایک مخصوص طریقہ کار منتخب کر لیا گیا تھا۔ اس وقت بوڑھا فاضل باجوہ گردن جھکائے خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر اس وقت وحشت بھی نہیں تھی۔

لیکن جیسے ہی اس نے قدموں کی آواز سنی۔ گردن اٹھائی اور اس وقت شاہ زیب نے ایک لمحے کے اندر اندر محسوس کر لیا کہ فاضل باجوہ نے اپنے چہرے پر ایک مصنوعی وحشت پیدا کی ہے۔ اسے ایک اچھا اداکار کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ وحشت کی یہ اداکاری بہت خوبصورت تھی۔ اب یہ الگ بات ہے کہ کوئی ذہین ترین آدمی اس بات کو محسوس کرے۔

''کتے کی اولاد۔ کتا ہی ہوتا ہے۔ مگر تو مجھے اس کی ناجائز اولاد معلوم ہوتا ہے۔'' شاہ زیب کا خون کھول گیا۔ اس نے خاموشی سے برتن اس کے آگے رکھے۔ اتنے کہ اس کی پہنچ میں رہیں اور پھر وہ آگے بڑھ کر ایسی جگہ پہنچ گیا۔ جہاں سے وہ فاضل باجوہ کی رینج میں

آ جائے۔ فاضل باجوہ نے کسی خونخوار بندر کی طرح اس پر چھلانگ لگائی اور شاہ زیب نے پلٹ کر اپنی لات اس کی کمر پر رسید کی۔ فاضل باجوہ نے تین قلابازیاں کھائیں تھیں اور زمین پر گر پڑا تھا۔ شاہ زیب اس کے قریب پہنچا اور اس نے باجوہ کا گریبان پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں دیوانے کتے' مجھ پر حملہ کر۔ آج میں تجھے بتاؤں کہ دور دور سے کوڑے مارنا کیا چیز ہوتی ہے اور ہاتھوں سے مرمت کیا چیز ہوتی ہے۔'' باجوہ نے پھر اپنے ہاتھ شاہ زیب کی گردن میں پھنسانے کی کوشش کی لیکن شاہ زیب کا گھونسہ اس کے پیٹ پر پڑا۔ وہ جھکا تو شاہ زیب نے اس کی گردن دونوں ہاتھوں سے پکڑی۔ اسے زمین سے اٹھایا اور ایک بار پھر زمین پر دے مارا۔ باجوہ کی دل دوز راہ ابھری تھی اور اس بار وہ زمین سے نہیں اٹھ سکا تھا۔

''میں اگر چاہوں تو تیری دونوں ٹانگیں توڑ دوں۔ حیدر شاہ سے میں کہہ دوں گا کہ تو نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ مجبوراً مجھے اپنے بچاؤ کے لیے ایسا کرنا پڑا۔ بے غیرت انسان میں نے تو تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا میں نے اور نہ میں ایسا کرنا چاہتا تھا کیونکہ بہر حال تو ایک بوڑھا آدمی ہے لیکن تو نے اپنی زبان سے جو گالیاں مجھے بکی ہیں۔ تیرے خیال میں تو نے ایک جائز قدم اٹھایا ہے۔ میرے ہاتھوں کوئی نقصان اٹھانے سے پہلے ایک لمحے میں پھر شاہ زیب نے محسوس کیا کہ باجوہ کے چہرے پر ایک تبدیلی رونما ہوئی ہے وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لیکن اب بھی اس کے منہ سے کراہ نکل رہی تھی۔ اس نے کھانے کی طرف دیکھا اور ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

''اور سن تو جو اداکاری کر رہا ہے۔ اسے ترک کر دے۔ میں تجھے نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ میں تو بڑی عزت بڑے احترام سے تجھ سے مخاطب ہوتا۔ لیکن تو نے جو الفاظ کہے ہیں انہوں نے ہمیشہ تیرے اور میرے درمیان ایک خلیج پیدا کر دی۔ ہمیشہ کے لیے۔'' شاہ

زیب واپس پلٹ پڑا اور تھوڑی دیر بعد تہہ خانے سے باہر نکل آیا۔ اسے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ اس نے اس بوڑھے آدمی کو جو بوڑھا تو بے شک تھا لیکن بے پناہ طاقتور تھا۔ اپنے ہاتھوں سے یہ نقصان پہنچایا جبکہ واقعی اس کے لیے اس کے دل میں ایک ہمدردی کا جذبہ تھا۔ بوڑھے کے سخت اور مکروہ الفاظ کو بھولنے میں شاہ زیب کو کافی محنت کرنا پڑی۔ بوڑھے نے جو گالیاں اسے دی تھیں وہ اس کی ماں تک جاتی تھیں۔ اور یہیں سے اسے بوڑھے سے شدید نفرت کا احساس ہوا تھا۔

بہرحال اس کی ذمے داری اسے دوبارہ بوڑھے کے پاس لے گئی۔ اس وقت بھی وہ اس کے لیے کھانا لے کر گیا تھا۔ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے بوڑھے کو دیکھا۔ وہ رخ بدلے بیٹھا ہوا تھا۔ شاہ زیب کے قدموں کی آواز پر بھی اس نے گردن نہیں گھمائی تھی۔ شاہ زیب نے کھانا اس کے سامنے رکھا اور بولا۔

''کھانا کھالو۔'' یہ کہہ کر وہ واپس پلٹا تو اسے بوڑھے کی آواز سنائی دی۔

''رکو گے نہیں کچھ لمحوں کے لیے میرے پاس۔'' بالکل بدلا ہوا لہجہ تھا' بدلا ہوا انداز' شاہ زیب نے پلٹ کر اسے دیکھا تو بوڑھے نے بھی رخ بدل لیا اس کے چہرے پر ایک شرمندگی کی مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگا۔

''پہلی ایک غلطی تو خدا بھی معاف کر دیتا ہے۔ کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گے؟'' بڑا نرم اور شرمسار لہجہ تھا۔ شاہ زیب اسے گھورتا رہا۔ تو اس نے کہا۔

''بس یوں سمجھ لو کہ اپنی زندگی کے لیے جو کچھ کرتا رہا ہوں۔ میرے منہ سے نکلنے والی گالیاں بھی اس کا حصہ تھیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں یہ گالیاں کسی غیرت مند کو دے رہا ہوں۔ میں بھی انسان ہوں غیرت کی قدر کرتا ہوں لیکن یہاں حیدر شاہ کی تحویل میں اس شخص نے مجھ پر اتنے مظالم کیے ہیں کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے اور اب میرے پاس گالیوں کے سوا

کچھ نہیں ہے لیکن تم سے میں معافی چاہتا ہوں۔ تمہارے الفاظ نے مجھے بہت زیادہ شرمندہ کیا ہے۔'' شاہ زیب کا رویہ کسی حد تک نرم ہو گیا۔ ویسے بھی اسے اس شخص سے دوسرا کام لینا تھا۔ اس نے کہا۔

''کھانا کھاؤ اور اگر مناسب سمجھو تو مجھ سے باتیں کرو۔ یہ تو میں پہلے بھی جانتا تھا کہ تم دیوانے نہیں ہو اور یہ بات خود حیدر شاہ بھی جانتا ہے۔''

''تم کھانا چھوڑ جانا۔ میں بعد میں کھا لوں گا۔ میں ویسے بھی صرف زندہ رہنے کے لیے کھاتا ہوں۔ یقین کرو نہ مجھے بھوک لگتی ہے اور نہ خوراک سے کوئی رغبت ہے۔ اس ماحول میں تم خود اندازہ لگا لو۔ غلاظتوں کے انبار ہیں یہاں۔ وہ جو جگہ ہے صرف وہ ساتھ دیتی ہے ورنہ شاید میں یہاں پھیلی ہوئی بدبو سے مر جاؤں۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔ جہاں ایک گڑھا اور نالی بنی ہوئی تھی۔ شاہ زیب نے اعتراف کر لیا اور اس جگہ جینا نہایت مشکل کام ہے۔ بہرحال بوڑھا اسے رحم آلود نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ شاہ زیب کا دل بھی پگھل گیا اور اس نے کہا۔

''تمہارے بارے میں مجھے شاہ جی نے بہت کچھ بتایا ہے۔ میں ان کی ہدایت پر نہیں اپنے طور پر تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ فاضل باجوہ کیا تم آنکھیں بند کر کے مجھ پر اعتبار کرو گے۔؟''

''جو شخص غیرت مند ہو اگر وہ کسی کو یہ یقین دلائے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ سچ ہے تو یقین نہ کرنے والا بدکار انسان ہوتا ہے اور میں تم پر یقین کا اظہار کرتا ہوں۔'' شاہ زیب کچھ لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

''تو مجھے یہ بتاؤ کہ وہ دستاویزات جو حیدر شاہ کی ملکیت ہیں کیا غاصبانہ طور پر فخر خان نے نہیں رکھی ہوئی ہیں۔ وہ باغات حیدر شاہ کی ملکیت ہیں پھر فخر خان کو انہیں رکھنے کا کیا حق

ہے۔تم مجھے جواب دو۔"

"بالکل نہیں ہے لیکن کیا تم اپنے مالک سے منحرف ہو سکتے ہو۔تم تو حکم کے غلام ہو۔ جس کا نمک کھاتے ہو اس کی باتیں تمہیں ماننی ہی پڑتی ہیں۔"

"ابھی تم نے غیرت مندی کی بات کی تھی۔ کیا تمہارا مالک تمہیں یہاں سے نکال کر لے گیا۔تم جن اذیتوں میں زندگی بسر کر رہے ہو۔کیا ان کے پاس اس کا کوئی صلہ ہے۔ کسی بھی لمحے حیدر شاہ تمہیں موت کے گھاٹ اتار دے۔ کیا کہو گے اس بارے میں؟"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں کر بھی کیا سکتا ہوں؟"

"دیکھو مجھے یہاں اس لیے تعینات کیا گیا ہے کہ میں تم سے ان دستاویزات کی جگہ معلوم کروں اور انہیں حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ حیدر شاہ تمہیں پاگل سمجھتا ہے تو اصل پاگل پن یہ ہو گا تمہارا۔ وہ جانتا ہے کہ تم بنے ہوئے پاگل ہو۔ مجھے صرف ایک بات بتا دو اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ حیدر شاہ اس سلسلے میں حق پر ہے تو میرا خیال ہے کہ تمہیں اب ان حالات میں ان دستاویزات کے بارے میں بتا دینا چاہیے۔"

"اور اس کے بعد فخر خان جو سلوک میرے بچوں کے ساتھ کرے گا اس کا علم ہے تمہیں؟" فاضل باجوہ نے جواب دیا۔

"کہاں ہیں تمہارے بچے؟"

"وہیں اس حویلی میں۔ اگر میری نشاندہی پر وہ دستاویزات چوری ہو گئیں تو فخر خان صرف اور صرف یہی سمجھے گا کہ میں نے زبان کھول دی اور اس کے بعد وہ مجھ سے انتقام لینے کے لیے میرے بچوں کو نشانہ بنائے گا۔ کیا سمجھے۔" شاہ زیب سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ لمحوں کے بعد اس نے کہا۔

"اس کا حل ہے میرے پاس۔"

"کیا حل ہے؟"

"نہیں پہلے تم یہ بتاؤ کہ کیا تم یہ دستاویزات حیدر شاہ کے حوالے کر سکتے ہو؟"

"تمہارے خیال میں کیا تمہیں اس کا حق حاصل ہے؟"

"مطلب؟"

"میرا مطلب ہے کہ وہ دستاویزات میری ملکیت تو نہیں ہیں۔"

"دیکھو تمہارا انداز فکر غلط ہے۔ میں تمہیں ایمانداری سے بتا رہا ہوں کہ میرا ابھی حیدر شاہ سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ میں اس برے حالات کا شکار ہوں اور حیدر شاہ نے میری تھوڑی سی مدد کی ہے۔ بس یہ بات ہے کہ میں اس کا احسان مند ہوں۔ باقی جہاں تک رہا اس کی دستاویزات کا مسئلہ تو ان کا حصول میری ذمہ داری نہیں ہے لیکن کبھی کبھی ہم ایک بے مقصد کام میں بھی الجھ جاتے ہیں اور ہمیں وہ کام کرنے پڑتے ہیں کیونکہ حالات ہمیں اسی کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات۔"

"ہاں سمجھ رہا ہوں۔"

"تو اس سلسلے میں ایک تجویز میرے ذہن میں ہے۔" شاہ زیب نے کہا اور باجوہ گردن اٹھا کر اسے دیکھنے لگا اور پھر بولا۔

"کیا تجویز ہے؟"

"فخر خان نے مجھے حیدر شاہ کے قتل کی ذمے داری سونپی ہے اور میں اسی لیے یہاں آیا تھا لیکن حیدر شاہ مجھ پر اس سے پہلے ایک احسان کر چکا ہے اور میں اسے ہلاک نہیں کر سکتا۔ جبکہ فخر خان نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا تم؟"

"ابھی نہیں سمجھ رہا۔"

"حیدر شاہ! اس بات کے لیے تیار ہے کہ میں اس پر قاتلانہ حملہ کروں اور اس کی موت

سی خبر پھیل جائے۔ پورا ڈرامہ ہوگا اور ہم دونوں واپس فخر خان کی حویلی پہنچ جائیں گے۔ وہاں تمہیں منصوبے کے مطابق یہ دستاویزات حیدر شاہ کے حوالے کرنا ہوں گی اور اس کے بعد اگر تم چاہو تو میں حیدر شاہ سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ تمہارے تحفظ کا بندوبست کر دے۔ تم اپنے بچوں کے ساتھ وہاں سے نکل آؤ۔ کیا سمجھے؟'' فاضل باجوہ اُس کی اس تجویز پر غور کرنے لگا۔ پھر بولا۔

''حالانکہ اس کے بعد میرے اور میرے بچوں کے لیے خطرات پیدا ہوں گے۔''

''دیکھو۔۔۔ ایک بات میں تمہیں بتا دوں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ دستاویزات کے حصول کے ذریعے تم حیدر شاہ کے چنگل سے نکل سکتے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔ تم چاہو تو یہ کوشش کر سکتے ہو۔ پڑے رہو اس کی قید میں۔ تمہارے بیوی بچوں کا جہاں تک معاملہ ہے۔ ظاہر ہے تمہاری موت کے بعد انہیں صبر تو کرنا ہی ہوگا۔ فیصلہ کر لو اگر تم چاہو تو میں یہ کھیل کھیل سکتا ہوں۔'' وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔''

''ایسے نہیں۔ غور کر لو ایک آدھ دن۔''

''بھلا جب ایک بات کا فیصلہ کر ہی لینا ہے تو بے مقصد غور کرنے سے کیا فائدہ۔ تم کوشش کرو میں تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر میں حیدر شاہ کو تمہارے سامنے لے آؤں گا۔ بات سامنے ہی ہو جائے گی۔'' فاضل باجوہ نے گردن جھکا دی تھی لیکن جب شاہ زیب نے حیدر شاہ کو اس سلسلے میں تفصیلات بتائیں تو حیدر شاہ نے کہا۔

''نہیں مجھے اس قدر سستا نہ کرو کہ میں اس جیسے لوگوں سے اس طرح کے معاہدے کروں۔ یہ ذمے داری تم خود سنبھال لو شاہ زیب! مجھے تم پر مکمل اعتماد ہے۔''

''ٹھیک ہے سر جی! اگر آپ یہ اعتماد کرتے ہیں تو میں بھی تیار ہوں۔'' شاہ زیب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر طریقہ کار کیا رہے گا؟''

''میں وہی بات کہتا ہوں۔ میں نے اس پر بہت غور کیا ہے اور مجھے یہ تدبیر بڑی کارآمد محسوس ہوئی ہے۔ مجھ پر قاتلانہ حملہ ہونا چاہیے اور اس کے بعد یہ افواہ اڑ جانی چاہیے کہ یہ حملہ کامیاب ہو گیا ہے۔ بعد میں میری زندگی کا اعلان بھی ہوگا لیکن خاصے عرصے کے بعد۔ تم فاضل باجوہ کو یہاں سے لے جاؤ گے اور باقی سارے کام کرو گے۔'' شاہ زیب نے مکمل منصوبے پر آمادگی کا اظہار کر دیا تھا۔ پھر فاضل باجوہ کو اس قید خانے سے نکالا گیا اور ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت حیدر شاہ پر حملے کا اعلان کر دیا گیا۔ پھر شاہ زیب اور فاضل باجوہ دونوں اس دوران وہاں سے نکل آئے تھے۔ اُن کے لیے دو گھوڑے مہیا کر دیئے گئے تھے۔

چنانچہ وہ برق رفتاری سے ان گھوڑوں پر چڑھ کر چل پڑے تھے اور رخ تبدیل کر دیا تھا۔ اب یہ صرف اتفاق تھا کہ جس راستے سے گھوم کر انہیں آنا تھا۔ وہ کوٹ آدم سے گزرتا تھا۔ اس تھوڑے سے فاصلے کو طے کر کے لجیا کی خیر خبر نہ لینا شاہ زیب کے بس کی بات نہیں تھی۔ انہوں نے ایک ویران سی جگہ قیام کیا تھا لیکن شاہ زیب پر ایک ایسا سحر طاری ہو گیا تھا۔ لجیا اس طرح یاد آئی تھی کہ بھلائے نہ بھلائی جا رہی تھی۔

چنانچہ نے اس رات لجیا سے ملنے کا فیصلہ کیا لیکن فاضل باجوہ کو اپنے اس فیصلے میں شریک نہیں کیا تھا۔ وہ رات کو اس وقت جب فاضل باجوہ گہری نیند سو گیا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور منزلِ مقصود کی جانب چل پڑا۔ لجیا اُس کے سارے وجود میں ہلچل پیدا کر رہی تھی اور وہ ایک سحر زدہ کی طرح اس کی جانب دوڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس جگہ تک پہنچ گیا جہاں

لجیا کا مکان تھا۔

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ وہ خفیہ طریقے سے اس مکان میں داخل ہوا۔ اس کے بارے میں اسے سب کچھ معلوم تھا۔ بالکل پہلے ہی کی مانند میں مکان میں پہنچا تھا لیکن مکان میں قدم رکھتے اُسے مجھے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ اس آواز کو پہچان گیا۔ لجیا کی ماں سکینہ کی آواز تھی اور سکینہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھا اور اس جگہ پہنچ گیا جہاں وہ دونوں میاں بیوی اُسے پہلی بار ملے تھے۔ کریم بخش سکینہ کو سمجھا رہا تھا۔

''کچھ نہیں ملے گا سکینہ! رونے دھونے سے کچھ نہیں ملے گا۔ دیکھ اب زندگی کے تھوڑے ہی دن باقی رہ گئے ہیں۔ مجھے ان آخری دنوں میں دکھ نہ دے سکینہ! یہ دکھ میری تقدیر بن چکا ہے۔ وہی ہوا مت رو سکینہ تجھے خدا کا واسطہ مت رو۔ میں وقت سے پہلے بہت مرجاؤں گا۔''

''ہم جی کر کریں گے بھی کیا۔ کیا رکھا ہے ہمارے لیے اس دنیا میں۔'' شاہ زیب کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یہ تو کچھ عجیب سی بات ہو رہی تھی۔ اس سے زیادہ وہ برداشت نہیں کر سکا اور ان دونوں کے سامنے آ گیا۔ دونوں اسے دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے تھے۔

''میں شاہ زیب ہوں بابا کریم بخش! میں شاہ زیب ہوں۔''

''شاہ زیب بیٹا! ہائے شاہ زیب بیٹا! ہماری لجیا گئی، ہماری لجیا گئی۔'' شاہ زیب کے سارے وجود میں گڑگڑاہٹیں ہو رہی تھیں۔ اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہوا جا رہا تھا اس کے لیے۔ وہ پتھرائی ہوئی نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ سکینہ روتی ہوئی بولی۔

''وہ کتا، مردود اللہ اسے غارت کرے۔ وہ زندہ بچ گیا بیٹا! شیطان کی زندگی بڑی لمبی ہوتی ہے۔ تو نے اپنی دانست میں اسے ہلاک کر دیا تھا۔ پر وہ بچ گیا اور بچنے کے بعد اس نے

سب سے پہلے تیری تلاش کی۔ تو نہیں ملا تو اس نے لجیا کو اٹھوا لیا۔ ہائے ہماری لجیا نجانے کس حال میں ہوگی۔'' شاہ زیب بدستور لرزتا رہا تھا۔ یہ سارے الفاظ اس کے لیے دھماکوں سے کم نہیں تھے۔ لجیا جسے وہ دل میں بسا چکا تھا۔ اس طرح اغواء کر لی گئی ہے اور وہ اس کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ کریم بخش نے کہا۔

''بیٹا! ہاتھ رکھ لیتا ہم لوگوں کی پیٹھ پر تو کیا بگڑ جاتا تیرا۔ نکل چلتے یہاں سے۔ نہ کسی سے دشمنی نہ دوستی۔ اپنا ایک کنبہ الگ بسا لیتے۔ جس میں میری لجیا ہوتی، تو ہوتا۔ ہم دونوں ہوتے بیٹا! کسی کے لیے ایثار کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ تو بھی وہ نہ کر سکا جو تو کر سکتا تھا۔ آج صورتحال بدل ہوئی ہوتی۔ میں تو تیرے ساتھ جہنم میں بھی جا سکتا تھا بیٹا! ہماری لجیا چلی گئی پتہ نہیں کس حال میں ہوگی۔''

''ایک بات بتاؤ بابا کریم بخش! کتنے دن ہو گئے اسے اغوا ہوئے؟''

''ارے کیا بتائیں بیٹا! پتہ نہیں کتنے دن ہو گئے۔ بس تیرے جانے کے کوئی مہینہ پندرہ دن کے بعد یہ کام ہو گیا تھا۔''

''تمہیں یقین ہے کہ چوہدری شہاب الدین نے اسے اغوا کرایا ہے؟''

''ہاں بیٹا! چوہدری اسپتال سے آیا اور اس کے بعد یہ سارا کام ہو گیا۔ اب صاف ظاہر کون کرتا ہے۔ مجھے بلوایا تیرے بارے میں پوچھا۔ تو میں نے انہیں بتایا کہ مہمان تھا آیا اور چلا گیا۔ بڑا مارا انہوں نے مجھے، تو چاہے تو میرے جسم پر اب بھی چوٹوں کے نشانات دیکھ سکتا ہے مگر یہ نشان اس گہرے گھاؤ کے سامنے کچھ بھی نہیں ہیں۔ جو میرے سینے پر لگا ہوا ہے۔ بس اب ہم دونوں میاں بیوی کے لیے موت کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی نہیں ہے۔''

دوسری بار شاہ زیب نے ان کی بات سنی ان سنی کر کے کہا۔

''تم لوگوں کو بعد میں تو کوئی نقصان نہیں پہنچایا؟''

''نہیں بیٹا! اب ہم سے کیا لیں گے وہ مرے ہوؤں کو کون مارے گا۔ ہم تو مر چکے ہیں۔''

''ٹھیک ہے تم لوگ یہاں جس انداز میں رہ رہے ہو بابا کریم بخش! اس میں رہو۔ اس وقت تک جب تک مجھے لجیا نہ مل جائے۔ میں اسے لے کر تمہارے پاس آ جاؤں گا۔ وہ ہر حالت میں' بے قصور' بے گناہ اور پاکیزہ ہے۔ ہر حالت میں کیونکہ اگر اس کے ساتھ کوئی برائی ہو بھی گئی تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں بابا! میں اس کی ساری برائیوں کو اپنے وجود میں سمو لوں گا۔ میں اسے اپنا لوں گا۔ جو غلطی میں کر چکا ہوں وہ اب نہیں کروں گا۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ وہ زندہ ہوگی اور آخر کار اسے لے کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔'' شاہ زیب نے کہا اور سکینہ کی سسکیاں رک گئیں۔

''بیٹا! برا ہو گیا بچی کے ساتھ۔ برا ہو گیا بہت اچھی بچی تھی۔ بہت اچھی۔ نجانے چوہدری نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا؟''

''اللہ مالک ہے۔ اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔'' شاہ زیب نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ وہاں سے باہر نکل آیا۔

اس کے دل و دماغ میں طوفانی جھکڑ چل رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو کوسنے لگتا تھا۔ بہت زیادہ تیس مار خاں بننے کی کوشش کی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ چوہدری شہاب الدین کی گردن کو شانوں سے الگ کر کے رکھ دیتا۔ تاکہ اس کی زندگی کا کوئی امکان باقی نہ رہتا۔ یہ سب کچھ غلط ہو گیا تھا۔ ذرا سی غلطی نے چوہدری کو زندگی دے دی تھی اور بے چاری لجیا اس کا شکار ہو گئی تھی۔ دل و دماغ میں طوفان اٹھ رہے تھے۔ دل چاہ رہا تھا کہ جس طرح بھی بن پڑے ابھی چوہدری کی حویلی میں داخل ہو جائے۔ اسے قابو میں کر کے اس سے پوچھے کہ بتا لجیا کہاں ہے؟ اور لجیا کو حاصل کرے جو کچھ اس نے لجیا کی ماں اور باپ سے کہا

تھا وہ اس کے دل کی سچائیاں تھیں۔

بہرحال وہ سیدھا چوہدری شہاب الدین کی حویلی پہنچ گیا اور اس کے چاروں طرف چکر لگانے لگا۔ وہ کسی بھی طرح اندر داخل ہو جانا چاہتا تھا لیکن اسے اندر جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ موت اس وقت اس کے لیے ایک بے مقصد چیز تھی لیکن حویلی کے انتظامات کچھ اس طرح سے کیے گئے تھے کہ اس کے اندر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ حویلی کی دیوار کے اوپر چاروں طرف خاردار باڑ لگی ہوئی تھی اور اس باڑ میں بھی کرنٹ چھوڑا ہوا تھا۔ اندر پانی کی ایک اونچی ٹینکی تھی۔ یہ ٹینکی بھی خالی تھی اور اس پر ایک بڑی سرچ لائٹ لگی ہوئی تھی کچھ لوگ نظر آ رہے تھے۔

بہرحال یہ ساری چیزیں تھیں۔ وہ آدھی رات تک کوشش کرتا رہا لیکن حویلی میں داخلہ ممکن نہیں ہوا پھر شاید اوپر سے اسے دیکھ لیا گیا اور دفعتاً ہی پانی کی ٹینکی پر سے فائرنگ ہونے لگی۔ شاہ زیب کو برق رفتاری سے پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ آیا اور آخر کار اپنے گھوڑے تک پہنچ گیا۔

یہ صورتحال سنگین ہے۔ اس طرح شہاب الدین کی حویلی تک پہنچنا خطرناک ہے۔ کوئی اور ہی ترکیب کرنی پڑے گی۔ حالانکہ وہ بے چارے فاضل باجوہ کو راستے میں چھوڑ آیا تھا۔ اصرلی طور پر اسے باجوہ کے ساتھ فخر خان کی حویلی جا کر فاضل باجوہ کی تجویز کو عملی جامہ پہنانا تھا لیکن اب جب یہ صورتحال پیدا ہو گئی تھی۔ جو یہ سب ممکن نہیں تھا اور اسے ہر قیمت پر لجیا کی تلاش کرنی تھی۔ لجیا کی تلاش کے سلسلے میں وہ دیوانہ ہو رہا تھا اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے لجیا کو تلاش کرے۔ بس ایک جنون کی سی کیفیت تھی اور یہ جنون نجانے اسے کیسے کیسے جہانوں کی سیر کرا رہا تھا۔

پھر اس نے آخری فیصلہ کیا۔ گھوڑے کی لگامیں کھولیں اور اس کی پشت پر ہاتھ مار کر

اسے دور بھگا دیا۔ پہلا مشن اب مشن نہیں رہا۔

حیدر شاہ، فخر خان سب جہنم میں جائیں۔ اگر لجیا مل جائے تو وہ ان تینوں کو لے کر یہاں سے نکل جائے۔ سب سے پہلے ان کے لیے کوئی مناسب بندوبست کرے۔ ایسا کہ ان کے دشمن انہیں نہ پا سکیں۔ پھر اس کے بعد دیکھے کہ اسے آگے کیا کرنا ہے۔ بڑا مشکل وقت آ پڑا تھا اس پر۔ اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا پڑی ہے کہ فخر خان کے کام کروں یا حیدر شاہ کے کام آؤں۔ میری زندگی کے بہت سارے مقصد ہونے چاہئیں۔ ان لوگوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے اللہ پر بھروسہ کروں۔ موقع ملے تو لجیا کو اپنی زندگی میں شامل کر لوں اور اس کے بعد اپنی زمینوں کی حفاظت کروں۔ ایک دوہری شخصیت اختیار کر لوں۔ ایک طرف تو میں ایک ایسا انسان بن جاؤں جو معمولی سا اور امن پسند ہو۔ دوسری طرف میں باقاعدہ اس زمین پر بننے والی ہر چیز کو ملیامیٹ کرتا رہوں۔ یہ طریقہ پہلے طریقوں سے زیادہ مناسب ہوگا۔

آہ---واقعی وقت کی ٹھوکروں نے اس کی منزل ہی بدل دی تھی۔ پتہ نہیں لجیا کہاں ہے۔ شاہ زیب پر مسلسل جنون سوار ہوتا جا رہا تھا اور پھر صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی۔ گھوڑے کو دوڑا چکا تھا۔ تھوڑا سا سامان جو حیدر شاہ نے راستے کے لیے دیا تھا۔ کینوس کے ایک تھیلے میں موجود تھا۔ اس کو ساتھ رکھنا ضروری تھا کیونکہ اس میں کرنسی وغیرہ بھی تھی جس کی ضرورت بہرحال پیش آ سکتی تھی۔ اب یہاں اس جگہ ایک چھوٹے سے چک میں اسے اپنے لیے کوئی ایسا مقام تلاش کرنا تھا جو بہتر ثابت ہو سکے۔ ان لوگوں کے گھر میں داخل ہونا ممکن نہیں تھا یعنی سکینہ اور کریم بخش کے ہاں۔ وہ دونوں بے چارے کسی مصیبت کا شکار نہ ہو جائیں۔ وہ یہ تمام باتیں سوچ رہا تھا لیکن اس چھوٹی سی جگہ، کسی مقام کو حاصل کر لینا ممکن بھی تو نہیں تھا۔ اس لیے کہیں ایسا نہ ہو کہ چوہدری شہاب الدین تک اس کی یہاں موجودگی کی خبر پہنچ جائے۔

ویسے تو اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی لیکن بس یہ خطرہ تھا کہ کہیں لجیا کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

چوہدری شہاب الدین کو اس نے اتنا مارا تھا کہ اب شہاب الدین اس کا نام بھی پائے گا تو اس پر حملہ کرنے سے دریغ نہیں کرے گا لیکن اس چھوٹے سے چک میں اسے کہیں جگہ نہ ملی۔ دن کی روشنی میں اپنے آپ کو محفوظ رکھنا بہت ضروری تھا۔

چنانچہ ایک بار پھر اسے کریم بخش کے ہاں جانا پڑا تھا۔ لیکن دروازے سے نہیں بلکہ وہ پچھلی دیوار کود کر اندر داخل ہوا تھا۔ وہاں بھی بدقسمتی نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ کسی نے اسے دیوار کودتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ اندر پہنچا ہی تھا کہ کریم بخش کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ کریم بخش کا گھر بھی اتنا بڑا نہیں تھا کہ شاہ زیب کہیں چھپ جاتا۔ وہ غسل خانے میں جا گھسا تھا۔ کریم بخش بے چارہ پریشان سا دروازے تک پہنچا تھا۔

''ارے کون ہے بھائی! صبح ہی صبح دروازے توڑے دے رہے ہو۔ کون ہے؟''

''دروازہ کھولو کریم بخش! تمہارے گھر چور گھس آیا ہے۔'' کریم بخش نے دروازہ کھول دیا۔ آنے والا جو کوئی بھی تھا۔ شاہ زیب تو اسے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن آنے والے نے کہا۔

''چور گھسا ہے تمہارے گھر میں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے دیوار کودتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''تم تو پاگل ہو زمانے بھر کے، میرے گھر میں چور کی گنجائش ہے۔ بستی کا کوئی بندہ اس گھر میں چوری کرنے کے لیے گھس سکتا ہے۔ تم خود سوچو اور خود بتاؤ۔ صبح ہی صبح کسی کے گھر کا دروازہ پیٹنا کوئی اچھی بات ہے۔''

''یار! کمال کرتے ہو۔ میں تمہاری ہمدردی میں تمہارے پاس آیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

''تمہاری آنکھوں کی کمزوری کبھی دور نہیں ہوگی ارشاد بھائی! جاؤ بابا اپنا کام کرو۔ چور اگر میرے گھر میں گھسا بھی ہے تو میں ہی ہوں گا۔ میرے کپڑے ہی لے جاسکتا ہے وہ اور کیا لے جائے گا جاؤ۔ تمہیں خدا کا واسطہ اپنا کام کرو۔''

''آج کل تو نیکی کا زمانہ ہی نہیں۔ چلو بھگتو میرا کیا ہے۔ اطلاع دینے والا ناراض ہو کر واپس چلا گیا۔'' کریم بخش نے دروازہ بند کر دیا اور بڑبڑاتا ہوا واپس آنے لگا۔ تو سکینہ نے کہا۔

''کون ہے؟ کون تھا؟''

''ارے باولے ہیں لوگ۔ بس بلاوجہ کی ہمدردیاں جتاتے رہتے ہیں۔ کام کا ایک بھی بندہ نہیں۔ چور گھسا تھا ہمارے گھر میں۔''

''وہ سچ کہہ رہا تھا کریم بابا! میں دیوار کود کر اندر آیا تھا۔'' شاہ زیب نے غسل خانے سے اندر آتے ہوئے کہا۔ سکینہ تو ایک لمحے کے لیے ڈر گئی تھی لیکن کریم بخش شاہ زیب کو دیکھنے لگا پھر بولا۔

''بیٹا! دروازے سے آجاتے تو اب ایسا بھی کیا چھپنا۔ اللہ سب کا نگہبان ہوتا ہے۔ دیکھ لو ہم ساری مصیبتوں کے باوجود پڑے ہوئے ہیں یہاں۔ چلو آؤ اندر آؤ۔ دیکھنا سکینہ میں نے دروازہ بند کر دیا ہے یا کھلا چھوڑ آیا ہوں۔ اب تو دماغ قابو میں رہتا ہی نہیں ہے۔ سکینہ دروازہ دیکھنے چلی گئی تھی۔ کریم بخش اُسے لے کر اندر آ گیا اور بولا۔

''بیٹھو بیٹا! کیا حال ہے کہاں مارے مارے پھر رہے ہو؟''

''بابا! لجیا کو تلاش کر رہا ہوں۔'' اُس نے کہا۔ کریم بخش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سکینہ واپس آئی تو کریم بخش نے کہا۔

''سکینہ چائے بناؤ۔ شاہ زیب بھی پی لے گا۔ ساتھ میں کیا کھلا رہی ہو؟'' سکینہ جلدی

سے بولی۔

''پراٹھا بنا کر لاتی ہوں۔ رات کا ساگ رکھا ہوا ہے۔ ساگ پراٹھا مزہ دے گا۔''

''نہیں رہنے دیں خالہ جی! کھانے کو دل نہیں چاہتا۔''

''بیٹا! دل تو بہت سی باتوں کو نہیں چاہتا۔ دل کے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ضرورتیں تو پوری کرنی ہی پڑتی ہیں۔'' سکینہ چلی گئی تو شاہ زیب نے کہا۔

''لگتا ہے چوہدری شہاب الدین نے اپنی حویلی کے لیے خاص انتظامات کئے ہیں۔ تاروں کی باڑ لگی ہوئی ہے اوپر جس میں کرنٹ رہتا ہے اور شاید اس نے کتے بھی رکھ چھوڑے تھے۔''

''تم نے اسے اپنی دانست میں مار ڈالا تھا بیٹا! ایک بات کہوں بندہ بڑا خطرناک ہے۔ لجیا کو تو وہ لے گیا لیکن تمہیں اب وہ زندہ نہیں چھوڑے گا۔ دیکھو بیٹا زندگی ایک بار ملتی ہے بار بار نہیں۔ بڑی قیمتی چیز ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی زندگی کی بازی ہار بیٹھو۔'' شاہ زیب نے ایک گہری سانس لی اور کہنے لگا۔

''بابا کریم بخش! زندگی ایک بار ملتی ہے اور ایک ہی بار جاتی بھی ہے۔ کب ملتی ہے اور کب جاتی ہے اس کا انسان کو کوئی پتہ نہیں۔ مجھے بھی اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن لجیا اگر زندہ ہے تو تم یقین کرو۔ میں اسے تلاش کر لوں گا۔ اس کی تم فکر مت کرو۔ یہ میرا کام ہے۔''

''اللہ تمہاری مدد کرے۔ ہم بھی بس اسی آس پر پڑے ہیں کہ شاید تقدیر ہم پر مہربان ہو جائے۔ میں نے تو کئی بار سوچا کہ یہاں سے کہیں دفعان ہو جاؤں لیکن سکینہ کہتی ہے کہ اگر لجیا کبھی واپس آئی اور ہمیں نہ پایا تو ہمیں کہاں تلاش کرے گی۔ اس آس پر بیٹا ہم اس گھر میں مریں گے۔ یہ ہمارا آخری فیصلہ ہے۔'' شاہ زیب گردن جھکا کر خاموش ہو گیا تھا۔

سکینہ چائے پراٹھا اور ساگ لے آئی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ماحول بے حد غمناک تھا لیکن پیٹ پوجا بھی ضروری تھی۔ کھانا کھایا اور پھر کریم بخش نے کہا۔

''اگر رات بھر جاگتے رہے ہو بیٹا! تو سو جاؤ۔ آرام کرو میں گھر میں ہی موجود ہوں کہیں جاؤں گا نہیں۔''

''نہیں۔ کیا آپ دکان پر نہیں جائیں گے؟''

''اب تو ویسے بھی بہت کم جاتا ہوں۔ دکان داری بھی بہت کم ہوگئی ہے کیونکہ سودا سلف بھی نہیں ڈالا ہے۔ دکان میں جو مال پڑا ہوا ہے وہی کھا رہے ہیں۔ بیٹا! دل نہیں چاہتا کچھ کرنے کو۔ پہلے ایک لجیا کا سہارا تھا اور اس کے لیے کچھ کرنے کو دل چاہتا تھا اور اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کے لیے کیا کیا جائے۔''

''نہیں بابا! اس طرح ہمت نہ توڑیں کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔''

''ہاں کچھ نہ کچھ تو ضرور ہو جائے گا۔''

بہر حال شاہ زیب سونے کے لیے لیٹ گیا اور سکینہ اور کریم بخش باہر صحن میں جا بیٹھے۔ ساری رات کا جاگا ہوا تھا لیکن نیند بھی خاص طور سے ہی آئی تھی اور اس وقت شاید شدید بھوک نے ہی جگایا تھا۔ مغرب کا وقت گزر چکا تھا۔ پورا دن سوتا رہا تھا۔ طبیعت پر ایک عجیب سی غنودگی سوار تھی۔ بہر حال جاگا تو کریم بخش اور سکینہ دونوں ہی موجود تھے۔

''ہم نے جان بوجھ کر تمہیں نہیں جگایا۔ ایک دو بار تمہارے کمرے میں گئے تو ایسی گہری نیند سو رہے تھے کہ اگر ڈھول بھی بجاتے تو تمہاری آنکھ نہ کھلتی۔''

''ہاں مجھے خود تعجب ہے۔''

''چلو خیر چھوڑو۔ کھانا تیار ہے سکینہ کھانا لگا دو۔ جاؤ تم ہاتھ منہ دھو لو'' شاہ زیب نے منہ ہاتھ دھویا اور اس کے بعد کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ بڑی خاطر مدارت کر رہے تھے یہ لوگ۔

۔ شاہ زیب نے سوچا تھا کہ آج یہاں مزید وقت گزارے گا اور اس کے بعد یہاں سے نکل جائے گا۔ ان بے چارے لوگوں کو زیر بار کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔ البتہ اس نے ایک اچھی خاصی رقم کریم بخش کو دیتے ہوئے کہا۔

''بابا صاحب! یہ پیسے رکھ لیں۔ منع کریں گے تو مجھے احساس ہوگا کہ میں بے مقصد ہی آپ کو اپنا سمجھتا رہا ہوں۔ دوکان داری ویسے ہی نہیں ہو رہی۔ آپ کے اخراجات ان سے پورے ہو سکیں گے۔''

''اور اس کے بعد کیا ہوگا بیٹا؟'' کریم بخش نے عجیب سے انداز میں کہا۔

''جہاں تک مجھ سے ہو سکا آپ کی خدمت کروں گا۔ پھر ہمیں لجیا مل جائے گی تو ہم اسے لے کر یہاں سے نکل جائیں گے۔'' کریم بخش نے گردن جھکا لی تھی۔

رات کو تقریباً بارہ ساڑھے بارہ کا وقت ہوگا۔ نو بجے کے بعد یہاں پر بالکل خاموشی طاری ہو جاتی تھی چنانچہ نو بجے شاہ زیب باہر نکل گیا تھا لیکن پھر حویلی کے اطراف میں چکر لگانے کے بعد واپس آ گیا تھا۔ کریم بخش کی رہائش گاہ ہی ایک پناہ گاہ تھی اس کے لیے باقی تمام جگہیں تو خطرناک ثابت ہو سکتی تھیں۔ واپس آنے کے بعد درخت کے نیچے سو گیا تھا اور اس وقت رات کے بارہ بجے تھے۔ جب صحن کی جانب سے دھم کی ایک آواز سنائی دی تھی اور صاف محسوس ہو گیا تھا جیسے کوئی دیوار سے اندر کودا ہے۔

شاہ زیب پوری طرح سویا نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں صرف غنودگی کا شکار ہوئی تھیں لیکن اس آواز سے وہ چونک پڑا تھا اور اس نے پلٹ کر دیکھا اس کا خیال بالکل درست تھا۔ بیرونی دروازے کے قریب سے ایک سایہ سا چپکا ہوا تھا اور صاف نظر آ رہا تھا کہ کوئی آدمی ہے۔ اس سے پہلے کہ شاہ زیب کوئی عمل کرے۔ سائے میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ آہستہ آہستہ دیوار کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتا ہوا دروازے کی جانب بڑھا۔ اس نے بے آواز

دروازے کی کنڈی گرائی اور دونوں پٹ کھول دیئے۔ ایک کے بعد دیگرے کئی افراد اندر گھس آئے تھے اور سب نے اپنے چہرے چھپائے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور دو کے کندھوں پر رائفلیں نظر آ رہی تھیں۔ شاہ زیب کا دم رک گیا۔ صورتحال کا اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ آنے والے کچھ دیر تک صحن میں کھڑے جائزہ لیتے رہے۔ پھر دو آدمی اس طرف بڑھے جہاں سکینہ اور کریم بخش سو رہے تھے۔ پہلے انہوں نے کھڑکی پر دباؤ ڈال کر کھولنے کی کوشش کی۔ پھر دروازے کو ہلانے لگے۔

شاہ زیب کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے درخت کے نیچے بچھی چارپائی پر غور نہیں کیا ہے اور اب کسی قسم کی حماقت سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ چنانچہ شاہ زیب بے آواز چارپائی سے نیچے اترا اور چھپکلی کی طرح رینگتا ہوا دروازے کی آڑ میں پہنچ گیا۔ یہاں سے وہ سناٹے میں ان لوگوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اندر سے کریم بخش کی آواز سنائی دی۔

''کیا بات ہے۔ کون ہے؟'' جواب میں آنے والے نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ماں کے خصم دروازہ کھول بتاتا ہوں کون ہے؟'' دوسری طرف خاموشی طاری رہی پھر دروازے کی کنڈی کھلی اور وہ بھرا مار کر اندر گھس گئے۔ اندر سے سکینہ کی چیخیں سنائی دی تھیں۔ بقیہ افراد جو باہر موجود تھے دوڑتے ہوئے اندر چلے گئے۔

شاہ زیب اب وہاں خاموش کھڑا ہوا تھا۔ صورتحال کا صحیح طور پر جائزہ لیے بغیر کوئی عمل کرنا حماقت تھی۔ آنے والے کم از کم پانچ یا چھ تھے۔ ان سب سے ایک دم نہیں نمٹا جا سکتا تھا۔ ایک گرجدار آواز سنائی دی۔

''او کتیا کے بچی! چپ ہو جا نہیں تو گردن کاٹ کر پھینک دوں گا۔ بڈھے! کدھر گیا تیرا باپ جو وہ تیرا بہت ہمدرد ہے کدھر گیا؟''

''کس کی بات کر رہے ہو بھائی۔ کس کی بات کر رہے ہو؟''

''بہت زیادہ چالاک بن رہا ہے۔'' اچانک ہی ان میں سے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کریم بخش کو گریبان سے پکڑا اور اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ پھر اس نے کریم بخش کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ کدھر گیا وہ' کہاں چھپا رکھا ہے اسے۔ کہاں چلا گیا۔''

''کس کی بات کر رہے ہو بھائی مجھے تو کچھ نہیں پتہ۔''

''اس کی جو صبح تیرے صحن میں کودا تھا۔ اور اس وقت سے کہیں باہر نہیں نکلا۔ تو کیا سمجھتا ہے کہ ہم لوگوں کی اس کی آمد کا پتہ نہیں چلے گا۔''

''تم--- مگر کسی نے تم سے جھوٹ بولا پاگلوں کی بات کا یقین کر لیتے ہو کوئی بھی نہیں کودا تھا میرے صحن میں۔''

''دیکھو میں تمہاری گردن کاٹ کر الگ پھینک دوں گا۔ ورنہ بتا دو وہ کہاں ہے۔ چلو بھئی چلو--- تم لوگ ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے ہو۔ جاؤ اسے تلاش کرو۔ گھر ہے ہی کتنا بڑا۔''

اب شاہ زیب کے لیے سنبھلنے کا موقع تھا اور انہیں دھوکا دینے کے لیے اسے اپنی جگہ تبدیل کرتے رہنا تھا۔

بہر حال اس کے پاس ریوالور موجود تھا۔ جس کا میگزین دبا کر اس نے تیار کر لیا تھا۔ دو آدمی تو وہیں کھڑے رہے اور باقی ادھر ادھر بکھر گئے۔ ان میں سے ایک دوڑتا ہوا چارپائی کے پاس بھی آیا اور اس پر چادر اور دری بچھی دیکھ کر بولا۔

''استاد میری بات سنو--- ادھر تھا وہ حرامی۔ میرا خیال ہے پھر سے نکل بھاگا ہے۔''

دوسری طرف سے گالیوں کی آوازیں سنائی دیں تھیں۔ اس کے ساتھ ہی شاید سکینہ کے منہ پر تھپڑ بھی پڑا تھا اور سکینہ کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

''مر گئی--- مر گئی۔ میں مر گئی۔''

''بول بڈھے کدھر گیا وہ--- جواب دے۔ ورنہ ختم کردوں گا تجھے۔'' شاہ زیب ابھی تک کسی معقول چوئیشن کا انتظار کر رہا تھا۔ بہرحال اب صورتحال ذرا مختلف تھی۔ اسے کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔ چنانچہ وہ ایک دم سے آگے بڑھا اور اس نے ریوالور کا رخ ان کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

''بس--- کھیل ختم کرو۔ ورنہ تم سب کو بھون کر رکھ دوں گا۔'' وہ چونک کر شاہ زیب کی جانب پلٹے تھے۔ شاہ زیب نے انہیں قریب سے دیکھا تھا۔ سب سے آگے جو آدمی نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک ہولناک شکل کا مالک تھا اور چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا۔ بہرحال تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر اس کے بعد اس نے کہا۔

''وہی ہے نا۔ وہی ہے حرامی۔ پکڑ لو اسے۔'' ایک آدمی آگے بڑھا تو شاہ زیب کے لیے مشکل ہو گیا کہ وہ خاموش رہے۔ اس نے گولی چلائی اور اس آدمی کی ران میں سوراخ ہو گیا۔ شاید ہڈی بھی ٹوٹ گئی ہوگی۔ وہ ایک چیخ مار کر نیچے گرا تو باقی لوگوں کے جسموں میں جنبش ہوئی۔ شاہ زیب نے دوسرے آدمی کو نشانہ بناتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو اس کی ران میں گولی ماری ہے۔ مگر تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا میں۔ سمجھے۔ اس لیے ہوش میں آ جاؤ اور اپنے اپنے ہتھیار پھینک دو۔ ان لوگوں کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ شاہ زیب کا نشانہ بھی اچھا ہے اور آدمی بھی سنکی ہے۔ چھوڑے گا نہیں۔ چنانچہ وہ کچھ کچے نظر آنے لگے تھے۔

''دیکھ میری بات سن--- خاموشی سے اپنے آپ کو میرے حوالے کر دے۔ ورنہ تو کیا سمجھتا ہے کہ چوہدری شہاب الدین تجھے چھوڑ دے گا۔''

''چوہدری شہاب الدین مجھے چھوڑے یا نہ چھوڑے لیکن مین تجھے نہیں چھوڑوں گا سمجھے۔'' اُس نے کہا اور اس کی طرف ریوالور تان لیا۔

''نہیں نہیں۔ مجھے مارنے کی ضرورت نہیں ہے میں تو--- میں تو---''

''چل پیچھے ہٹ--- پیچھے ہٹ جا اور دیوار کے ساتھ لگ جا۔'' شاہ زیب نے خوفناک لہجے میں کہا اور وہ جوان کا سربراہ تھا وہ ان کی جانب دیکھنے لگا۔ تبھی اس پوزیشن میں تھے کہ شاہ زیب کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اور وہ تو زمین پر بیٹھا بری طرح کراہ رہا تھا۔ جو شاہ زیب کی گولی کا شکار ہوا تھا۔ انہیں ایک دم سے یہ احساس ہو گیا کہ صورتحال خراب ہو گئی ہے۔

''چل--- رائفل ادھر پھینک دے۔'' شاہ زیب نے پھر حکم دیا اور اس نے جسے حکم دیا گیا تھا۔ رائفل نیچے پھینک دی۔

شاہ زیب نے آگے بڑھ کر اپنے پیروں سے اسے پیچھے کیا اور ہاتھ میں اٹھا کر بہت دور درختوں کی طرف اچھال دیا۔ وہ سب یہیں موجود تھے جو یہاں آئے تھے۔ بہرحال اس کے بعد شاہ زیب نے کہا۔

''تم آگے آؤ--- ارے چل آگے آ فوراً۔'' مخاطب اس کو کیا گیا تھا جوان کا استاد نظر آ رہا تھا اور وہ لوگ اسے کہہ بھی استاد رہے تھے۔ وہ آگے آیا تو شاہ زیب نے اس کا گریبان پکڑ کر اس کا رخ موڑ دیا اور ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے لگاتے ہوئے کہا۔

''ہاں ایسا کرو بابا کریم! کہ دوسری بندوق بھی نکال لو اور اسے اس بندوق کے پاس ڈال دو۔'' بابا کریم بخش بڑی ہمت والا آدمی تھا۔ سکینہ کی تو جان نکلی ہوئی تھی اور وہ نیم مردہ کیفیت میں پڑی ہوئی تھی لیکن کریم بخش نے رائفل نکالی اور اسے خالی کر کے اس کے کارتوس اپنے قبضے میں کر لیے۔''

''ہاں ان کی تلاش لو۔'' تلاشی لینے سے ان کے پاس اور کچھ نہیں ملا تھا۔ ظاہر ہے چوہدری شہاب الدین کے آدمی تھے صرف دو رائفلیں بھیجی گئیں تھیں۔ باقی سب کے ہاتھ میں لاٹھیاں اور کچھ کے پاس خنجر وغیرہ تھے۔ کریم بخش نے ان سب کو نہتا کر دیا اور شاہ زیب

نے کہا۔

''ہاں۔اب ایسا کرو تم، تمہارا جو کوئی بھی نام ہے اپنے ان ساتھیوں کے ہاتھ پیچھے پیٹھ کی طرف کر کے باندھ دو۔ان کی قمیصیں اتار لو اور ایک بات سن لو کہ میرا نشانہ کبھی خالی نہیں جاتا۔'' شاہ زیب کی غراہٹ ان لوگوں کی جان لینے کے لیے کافی تھی۔ چنانچہ استاد نے ان کے ہاتھ پیچھے کر کے باندھ دیئے اور اس کام سے فارغ ہو کر اس نے شاہ زیب کو دیکھا۔

''ہاں یہ کام ہوا ٹھیک۔اگر کسی نے چیخنے کی کوشش کی تو میں بلاشبہ یہ خنجر اس کی گردن میں پھیر دوں گا۔تمہارا ہی خنجر ہے۔زیادہ سے زیادہ یہ کہ ہمیں رات بھر لاشیں ڈھونی پڑیں گی ویسے تم نے دیکھا کہ ریوالور کی آواز پر تو کوئی ادھر آیا نہیں۔''

''سنو۔تم شاہ زیب ہو نا؟''

''ہاں میں شاہ زیب ہوں۔تم اپنے لیے جتنا بڑا گڑھا کھود رہے ہو تم سوچ بھی نہیں سکتے۔اول تو تم نے چوہدری پر ہاتھ اٹھایا۔کم از کم تمہارے ہاتھ تو تمہارے کندھوں سے لگے رہیں گے نہیں یہ الگ بات ہے کہ چوہدری تمہاری زندگی بخش دے۔لیکن یہ بات سمجھ لو۔''

''بک بک بند کر کتے! تیرا نام کیا ہے؟''

''جاگیر ہے میرا نام اور میں کیا کہوں۔یہ پوچھ لو اپنے اس کریم بخش سے۔'' کریم بخش ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

''بابا! آپ اسے جانتے ہیں؟'' شاہ زیب نے سوال کیا۔

''ہاں یہ چوہدری شہاب الدین کا کتا ہے۔اس کے نام پر بے دریغ قتل و غارت گری شروع کر دیتا ہے۔لوگ اس کے نام سے کانپتے ہیں۔''

''ہوں--- ٹھیک آج یہ میرے نام سے کانپے گا تم دیکھنا۔'' شاہ زیب نے کہا اور ریوالور کریم بخش کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''لو اسے اسی طرح رکھو۔میں ذرا آج اسے یہ بتا دوں کہ یہ بہت زیادہ طاقتور نہیں ہے۔ہتھیاروں اور بہت سے ساتھیوں کے بل پر تو کتے بھی اکڑ سکتے ہیں۔میں ذرا اس کی تھوڑی سی مرمت کر دوں۔''

یہ الفاظ کہہ کر شاہ زیب آگے بڑھا اس نے ایک لمحے کے اندر محسوس کیا تھا کہ اس کے ان الفاظ پر جاگیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھنچی تھی۔غالباً وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ شاہ زیب خود اپنے جال میں پھنس گیا۔لیکن اس نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔شاہ زیب دو قدم آگے بڑھا تو اچانک ہی جاگیر نے اسے اپنے بازو میں بھرنے کی کوشش کی۔جیسے ہی وہ شاہ زیب کے قریب پہنچا۔شاہ زیب نے غیر متوقع طور پر سر کی ٹکر اس کی ناک پر ماری اور اس کی نکسیر پھوٹ گئی۔وہ بندر جیسی خوناہٹ کے ساتھ پیچھے ہٹا۔شاہ زیب کی لات اس کے پیٹ پڑی اور وہ آگے جھکا تو شاہ زیب نے اس کی گردن میں بازو ڈال کر اپنے آپ کو ایک دم نیچے گرا لیا۔اس کا سر پھٹے ہوئے تربوز کی طرح دیوار سے ٹکرایا اور وہ ایک تیز کراہ کے ساتھ سیدھا ہو گیا۔اس کے بندھے ہوئے ساتھی اپنے استاد کی مرمت دیکھ رہے تھے۔شاہ زیب ان پر بھرپور طریقے سے اپنا اثر ڈال دینا چاہتا تھا۔

دنیا شاہ زیب کے دل میں نفرت کے بیج بو رہی تھی تو وہ نفرتوں کی آغوش میں سوتا چلا جا رہا تھا اور ایسے ہی لمحات ہوتے ہیں جب انسانیت کا احساس دل سے نکل جاتا ہے۔حالانکہ یہ شخص صرف شہاب الدین کا ملازم تھا اور براہ راست اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن شاہ زیب اب کسی پر بھی کوئی احسان نہیں کرنا چاہتا تھا۔چنانچہ وہ راجہ شہاب الدین کے اس آدمی کو بھی اپنا بدترین دشمن سمجھ رہا تھا۔وہ دشمن جس نے لجیا جیسی معصوم لڑکی کو نجانے کس عذاب میں گرفتار کر دیا تھا۔

بہرحال اس نے مدمقابل کو موقع نہیں دیا۔اس سے پہلے کہ وہ اٹھنے کی کوشش کرتا۔

شاہ زیب نے اسے الٹا کر کے اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ دوسری ٹانگ پر اس نے پاؤں رکھا اور پہلی ٹانگ کو اوپر اٹھاتا چلا گیا۔ اب جاگیر کے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے اونٹ بلبلا رہا ہو۔ یہ ایسا ہی خوفناک داؤ تھا۔ ران کی ہڈی اپنی جگہ چھوڑ دیتی تھی اور اس کے بعد ایک طرح سے بندہ اپاہج ہو جاتا تھا۔ وہ گڑگڑانے لگا اور شاہ زیب نے ایک زور کا جھٹکا دے کر اسے چھوڑ دیا۔ ورنہ کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

''ایک منٹ کے لیے چھوڑا ہے تجھے۔ بہت جاندار سمجھتا ہے اپنے آپ کو ایک تھوڑی سی کوشش کرتا تو تیرا ایک پاؤں ہمیشہ کے لیے جھول جاتا اور اس کے بعد سوکھ کر ختم ہو جاتا۔ سمجھ رہا ہے نا تو۔''

''چھوڑ دے مجھے' جانے دے مجھے' میں جانا چاہتا ہوں۔''

''ایسے ہی--- پہلے کہہ ہار مان لی میں نے تجھ سے۔''

''مان لی--- مان لی--- آہ--- میرا پاؤں۔ میں مرا جا رہا ہوں۔''

''ابھی میں تجھے مرنے نہیں دوں گا دوست' کیا سمجھا' بڑا تمیں مار خان بن کر آیا ہے نا۔ بہت تمیں مار خان بن کر آیا ہے تو ٹھیک کروں گا تجھے فکر مت کر۔''

''جانے دے مجھے جانے دے۔''

جاگیر پر تکلیف کی وجہ سے دیوانگی سی سوار ہو رہی تھی اس نے دیوار کا سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن لڑھک کر ایک طرف جا گرا۔ اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ مسلسل چیخ رہا تھا' کراہ رہا تھا اور اس کے ساتھی دم بخود یہ دیکھ رہے تھے۔ غالباً انہیں اپنے استاد پر بڑا مان تھا لیکن استاد اس وقت جس کیفیت کا شکار تھا۔ وہ دیکھنے کے قابل تھی اور اس سے کچھ ہو نہیں رہا تھا۔

بہرحال شاہ زیب نے کہا۔

''ہاں کس نے بھیجا ہے' تجھے کون ہے تو؟''

''چوہدری شہاب الدین کا آدمی ہوں۔ یہ بابا کریم بخش جانتا ہے مجھے۔'' اس نے کریم بخش کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''چوہدری شہاب الدین نے بھیجا ہے تجھے؟''

''ہاں۔''

''لیکن کیوں؟''

''ہمیں اطلاع ملی تھی کہ تو کریم بخش کے گھر آیا ہے۔''

''کس نے اطلاع دی تھی؟''

''صبح ایک بندے نے تجھے دیوار کودتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسی نے جا کر بتایا تھا۔''

''ہوں--- تو چل ٹھیک ہے یہ بتا کہ چوہدری شہاب الدین نے تجھے میرے بارے میں کیا بتایا تھا؟''

''اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تجھے زندہ پکڑ کرلاؤں۔''

''ہوں--- شہاب الدین کا حال کیا ہے یہ بتا؟''

''ٹھیک ہو گیا ہے اب سانپ کی طرح بل کھا رہا ہے۔ سولہ بندے اس نے تیری تلاش کے لیے ادھر ادھر بھیجے ہوئے ہیں اور وہ سولہ بندے تجھے تلاش کر رہے ہیں۔''

''خوب--- اچھی بات ہے یہ تو--- اچھا یہ بتا لجیا کہاں ہے؟'' وہ خاموش رہا تو شاہ زیب نیچے جھکا اور اس نے اس کی ٹانگ پکڑ لی۔

''نہیں' نہیں' نہیں--- نہیں چھوڑ دے--- چھوڑ دے--- تجھے خدا کا واسطہ چھوڑ دے۔ ہم کتے ہیں' کتوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں--- مالک اشارہ کرتا ہے تو بھونکنے لگتے ہیں۔ وہ اشارہ کرتا ہے تو دم ہلانے لگتے ہیں۔ اس کی ذاتی باتیں ہمیں نہیں معلوم' بالکل

نہیں معلوم۔‘‘

’’ہوں--- کہاں رکھا ہے اس نے لجیا کو؟‘‘

’’تو یقین کر ہمیں نہیں معلوم۔‘‘

’’حویلی میں؟‘‘

’’پتہ نہیں۔‘‘

’’یہاں سے جا کر کیا کرے گا تو؟‘‘

’’دو ہی باتیں ہیں یا تو بھاگ جائیں‘ چھپ جائیں کہیں جا کر‘ یا پھر اس کے رحم و کرم پر جا پڑیں۔ اب یہ اس کی مرضی ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی بھی سلوک کرے۔ تو چھوڑ دے مجھے---اور یہ بتا دے کہ یہ ٹانگ کو کیا ہوا ہے میری۔‘‘ جاگیر جنون کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

’’باہر کس سواری سے آئے ہو تم؟‘‘

’’جیپ ہے۔‘‘

’’ہوں---بابا کریم بخش‘ میں ذرا انہیں کسی مناسب جگہ پہنچا کر آتا ہوں۔‘‘ شاہ زیب نے کہا اور پھر اس نے ان میں سے ایک کے ہاتھ کھولے اور بولا۔

’’چل اپنے استاد کو اٹھا کر جیپ پر لے چل۔ ورنہ یہ ریوالور دیکھ رہا ہے نا ساری گولیاں تیرے بدن پر خالی کر دوں گا۔‘‘ جس بندے سے یہ بات کہی تھی وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر منتیں کرنے لگا۔ پھر اس نے ان باقی افراد کو بھی جیپ تک پہنچایا۔

کریم بخش سے اجازت لے کر شاہ زیب باہر نکل آیا اور جیپ اسٹارٹ کر کے چل پڑا۔ وہ سب پوری طرح سیدھے ہو گئے تھے۔ بات وہی تھی۔ جاگیر کی پٹائی نے انہیں خوفزدہ کر دیا تھا لیکن شاہ زیب پر اب اس وقت ایک عجیب سی وحشت سوار تھی۔ لجیا کی یاد دل میں چٹکیاں لے رہی تھی اور اس کی سوچیں بالکل مختلف ہو گئیں تھیں۔

دشمن ہے ساری دنیا دشمن ہے۔ بھائیوں نے یہ ماحول پیدا کیا ورنہ زرعی یونیورسٹی کا طالب علم زمینوں کی خدمت کر رہا ہوتا۔ انہوں نے ایک جرم تخلیق کیا اپنی بیویوں کی باتوں میں آ کر۔ الیاس خاں اور جبار خاں نے وحشتوں کے دروازے کھول دیئے۔ پھر مکرم شاہ‘ فخر خان‘ حیدر شاہ‘ شہاب الدین یہ سارے کے سارے سرمایہ دار ایک ہی طرح کے لوگ اسے مجرم بنانے میں مصروف ہو گئے اور آخر کار اس کا ذہن تبدیل ہو گیا۔

انسانی زندگی بڑی کمینی ہوتی ہے لیکن ہر شخص اپنا مفاد حاصل کرنے کے لیے اپنے جیسے دوسرے کو ختم کرنے پر تلا ہوا ہے تو پھر میں کیوں ان کے ساتھ رحم کروں۔ چوہدری شہاب الدین نے انہیں بھیجا ہے۔ کریم بخش اور سکینہ کو یہ کس طرح مار رہے تھے۔ اب اس کے بعد ان کے ساتھ کیا انصاف کیا جا سکتا ہے۔ یہاں سے واپس جائیں گے ساری صورتحال شہاب الدین کو بتائیں گے۔ سکینہ اور کریم بخش بابا کو قتل کر دیا جائے گا۔ اذیتیں دے دے کر مار دیا جائے گا۔ لجیا کے ساتھ تو جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہو رہا ہے اگر یہ لوگ چھوٹ گئے تو ساری صورتحال چوہدری کو بتائیں گے اور اس کے بعد---اس کے بعد--- نہیں ایسے لوگوں کی زندگی ممکن نہیں ہے۔

یہی سوچ کر وہ انہیں جیپ میں لے کر چل پڑا تھا۔ جیپ میں موجود لوگوں کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں لیکن جب ایک ویران سے علاقے میں جہاں ٹیلوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ جیپ رکی تو ان میں سے ایک نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔

’’یہاں--- یہاں کیوں لائے ہو تم ہمیں؟‘‘

’’اس لیے کہ تم زندگی کا آخری سفر یہیں طے کرو۔‘‘ شاہ زیب کی غراہٹ ابھری اور ان لوگوں کے چہرے زرد پڑ گئے۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھنے لگے۔ تو شاہ زیب نے کہا۔

''زندگی بچنے کی صرف ایک ہی صورت ہوسکتی ہے۔ وہ یہ کہ تم مجھے لجیا کے بارے میں بتادو۔'' وہ سب رونے اور گڑگڑانے لگے۔ اب ان میں کوئی بدمعاش نہیں تھا بلکہ سارے کے سارے زندگی بچانے کے خواہش مند تھے۔ موت واقعی ہی انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے ناچتی محسوس ہورہی تھی۔

شاہ زیب کی خونی آنکھوں میں وہ اپنی تقدیر کا فیصلہ پڑھ چکے تھے۔ شاہ زیب واقعی اس وقت ایک بالکل غیر انسانی شخصیت بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے دل میں ان لوگوں کے لیے ذرہ برابر ہمدردی نہیں تھی۔ وہ لوگ یہی کہہ رہے تھے کہ انہیں لجیا کے بارے میں نہیں معلوم۔ بس وہ تو چوہدری شہاب الدین کے حکم پر اسے پکڑنے کے لیے آئے تھے۔

''اور اس کے بعد تم لوگ چوہدری شہاب الدین کو جاکر یہ بتاؤ گے کہ کریم بخش کے گھر میں تم پر کیا گزری؟''

''وہ تو بتانا پڑے گا' وہ تو بتانا ہی پڑے گا۔''

''نہیں میں کریم بخش کے لیے عذاب نہیں خریدنا چاہتا کیونکہ یہ عذاب میری وجہ سے اس پر آئے گا۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ اور پھر شاہ زیب نے ریوالور سیدھا کرلیا۔ وہ سب روتے گڑگڑاتے رہے لیکن شاہ زیب نے ان کے دل کے نشانے لے کر ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کردی اور وہ وہیں گر کر تڑپنے لگے۔ شاہ زیب خونی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

وقت کے بے رحم ہاتھ نے اسے انسانیت سے دور کردیا تھا اور اس کے دل میں کالے کالے دھبے بڑھتے جارہے تھے۔ پانچ انسانوں کو زندگی سے محروم کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی لیکن شاہ زیب کا اپنا یہ نظریہ تھا کہ دنیا نے جو کچھ اسے دیا ہے وہ دنیا کو واپس لوٹانا ہی پڑے گا۔ کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ آہستہ آہستہ یہ پانچوں لاشیں تڑپ تڑپ کر سرد ہوگئیں اور شاہ زیب سوچنے لگا کہ اس سے زیادہ وہ کریم بخش اور سکینہ کے لیے اور کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

وہ ان لوگوں کو مشورہ دے سکتا تھا کہ وہ اپنا گھر چھوڑ کر وہاں سے نکل جائیں بلکہ یہ مشورہ دیا تھا اس نے انہیں لیکن وہ دونوں محبت کے مارے غمزدہ افراد اس بات کی توقع رکھتے تھے کہ ممکن ہے کہ بیٹی واپس آجائے۔ ایسے وقت میں وہ اپنے گھر میں کسی کو نہیں پائے گی تو کیا ہوگا۔ یہ حسرت کا ایک انداز تھا اس سے زیادہ وہ بے چارے اور کیا کرسکتے تھے۔

بہرحال اب اس کے بعد یہاں رکنا ممکن نہیں تھا۔ لجیا اس کے دل میں تڑپ رہی تھی لیکن بات وہی آجاتی ہے۔ جب دل پر کالے دھبے پڑنے لگتے ہیں۔ چاہے اس کا ماضی کچھ بھی ہو تو پھر بہت سی یادیں مدھم پڑجاتی ہیں۔ شہاب الدین لجیا کے بارے میں جانتا تھا لیکن اس سے کچھ معلوم کرلینا ناممکنات میں سے تھا اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ شاہ زیب کے پاس ذرائع کی کمی تھی کوئی ایسا ٹھکانا نہیں تھا اس کا جہاں وہ اپنا مسکن بناسکے۔ بہت سی باتیں سوچ رہا تھا وہ ایسے ہی موقع ہوتے ہیں جب معاشرے میں خوفناک مجرم پیدا ہوجاتے ہیں۔ ان مجرموں کی تخلیق اسی انداز میں ہوتی ہے۔ اب شاہ زیب کے لیے اس آبادی میں ٹھہرنا ممکن نہیں تھا وہ سوچتا رہا اور پھر اس نے وہاں سے آگے قدم بڑھادیئے۔ ان لوگوں کی جیپ وہیں چھوڑ دی تھی۔ اپنے گھوڑے کا بھی اسے کوئی پتہ نہیں تھا کہ کہاں ہے۔ پیدل ہی جاسکتا تھا۔ جیپ کو ساتھ لے جانے کا مقصد یہ تھا کہ چوہدری شہاب الدین کے مخبروں کو اپنے پیچھے لگا کرلے جائے۔ ان علاقوں میں کھوجی بھی بہت سے ہوا کرتے ہیں اور ایسے ایسے ماہر فن ہوتے ہیں کہ ان کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ شاہ زیب نے سوچا کہ اگر کھوجی اس کی تلاش میں نکلے تو وہ اس کے ذہن کا پیچھا کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ کہاں تک جاسکیں گے۔ اس نے اس کی بالکل مخالف سمت اختیار کی تھی۔

ساری رات سفر کرنے کے بعد اس نے ایک جگہ قیام کیا۔ ویران جگہ تھی دور دور تک کچھ بھی نہیں تھا۔ دو تین گھنٹے آرام کرنے کے بعد وہ پھر وہاں سے چل پڑا۔ اب شاید کسی

آبادی کے آثار نظر آرہے تھے۔ کیونکہ کچی پگڈنڈیوں پر کاروں کے ٹائروں کے نشانات تھے گویا سڑک کچی تھی لیکن جیپیں ان علاقوں سے گزرتی رہتی تھیں۔ ظاہر ہے کوئی آبادی زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ پھر اسے ایک عمارت نظر آئی لیکن اس عمارت کو دیکھ کر اس کے ذہن میں کچھ یادیں تازہ ہوگئیں تھیں۔ یہ کھڈیاں کا علاقہ تھا۔

کھڈیاں میں بہت عرصے پہلے ان کا ایک رشتے دار رہتا تھا اور شاہ زیب کا دو تین بار یہاں آنا ہوا تھا۔ ان راستوں سے گزرتے ہوئے اس نے کھڈیاں سے کچھ فاصلے پر یہ ڈاک بنگلہ دیکھا تھا اور ایک بار بارش میں یہاں پناہ بھی لی تھی۔ اس وقت یہ ڈاک بنگلہ اس کے لیے بڑی کام کی جگہ تھی۔ اس نے ڈاک بنگلے کی جانب سفر شروع کر دیا اور تھوڑی دیر کے بعد ڈاک بنگلے میں داخل ہوگیا۔

☆☆☆

انسان چاہے کتنا ہی برا کیوں نہ ہو۔ اس کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں۔ جب وہ خوف محسوس کرتا ہے۔ اصل میں خوف انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔ وہ یا تو خود اپنے آپ سے واقف نہیں ہے یا پھر جھوٹ بولتا ہے۔

چوہدری شہاب الدین بہت ہی کالے دل والا ظالم آدمی تھا۔ اس کی ساری زندگی چوہدریوں کی طرح رنگینیوں میں گزری تھی اور وہ ایک مکمل طور پر غلط کار قسم کا آدمی تھا۔ بات ابھی کی نہیں تھی بلکہ اس سے پہلے چوہدری شہاب الدین اپنے گناہوں کا آغاز کر چکا تھا۔ بڑی مکروہ زندگی تھی اس کی۔ اس کے ماں باپ بھی اس سے بہت پریشان رہا کرتے تھے۔ ایک بھائی تھا جو اس سے دو سال بڑا تھا اور انتہائی نیک نفس انسان تھا۔ چوہدری شہاب الدین نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا۔ اور کچھ اس قسم کی سازش کے جال بنے

تھے کہ چوہدری شہاب الدین کے دشمن دو گھرانے اس کی لپیٹ میں آگئے تھے۔ سخت دشمنی چلی تھی، قتل و غارت گری ہوئی تھی اور اس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوا تھا۔ روح رواں چوہدری شہاب الدین تھا لیکن بہت سے لوگ اس کی شیطنت کی زد میں آگئے تھے۔

بہر حال اس کی شیطنت ابھی جاری تھی زندگی میں۔ پہلی بار اسے شاہ زیب کے ہاتھوں مار کھانی پڑی تھی اور وہ زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہا تھا لیکن شیطان کی زندگی ہمیشہ طویل ہوتی ہے۔ وہ بچ گیا تھا اور اتنا غیر متوقع طور پر بچ گیا تھا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

بہر حال پوری طرح صحت یاب ہونے کے بعد اس نے تحقیقات کی تھی اور لجیا سامنے آئی تھی۔ لجیا کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چوہدری شہاب الدین نے لجیا کو اغوا کرایا۔ ایسی دشمن لڑکیاں بڑی حفاظت سے رکھی جاتی ہیں۔ چنانچہ اس نے لجیا کو اغوا کرا کے لاہور بھجوا دیا۔ شاہدرہ میں اس کی ایک کوٹھی تھی۔ اس نے اس کوٹھی میں کچھ پہرے داروں کی نگرانی میں لجیا کو منتقل کر دیا اور مکمل طور پر صحت یاب ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے علاوہ اسے اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ شاہ زیب زندہ ہے اور غائب ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے بے شمار افراد شاہ زیب کی تلاش میں لگا دیئے اور انہیں ہدایت کر دی جہاں بھی اسے دیکھیں زندہ یا مردہ پکڑ کر لے آئیں۔

چوہدری شہاب الدین اندر ہی اندر سے اس طرح کھولتا رہتا تھا شاہ زیب کا تصور کر کے کہ بیان سے باہر ہے لیکن ظاہر ہے اس کی جو پٹائی ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں کسی کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر اسے اطلاع ملی کہ شاہ زیب، کریم بخش کے گھر آیا ہے۔ کریم بخش تو خیر ایک معمولی سا آدمی تھا۔ اسے زیادہ سے زیادہ کیا نقصان پہنچایا جا سکتا تھا۔ پڑا ہوا تھا اپنے گھر میں لیکن کسی نہ کسی ذریعے سے یہ اطلاع چوہدری شہاب الدین تک پہنچ گئی تھی

کہ کریم بخش کے گھر میں ایک شخص دیوار کود کر اندر داخل ہوا ہے اور اس کے بعد سے وہیں موجود ہے اور کریم بخش کا کہنا ہے کہ کوئی اندر نہیں آیا۔ ایسی صورت اسی وقت ہو سکتی ہے جب کریم بخش کا کوئی پسندیدہ شخص اندر آیا ہو اور اس نے اپنے سب سے خطرناک آدمی کو وہاں بھیجا تھا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ پچاس آدمیوں پر بھاری ہے۔ ایسا آدمی جاگیر کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن پھر جاگیر واپس نہیں آیا تھا اور شہاب الدین بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا تھا اور جب اس نے دیکھا کہ جاگیر واپس آیا ہی نہیں ہے تو اس نے جاگیر کی تلاش شروع کرا دی اس کے پاس ایسے خاص آدمی موجود تھے جو ایسے سلسلوں میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔

چنانچہ اس کا بہت ہی قریبی مشیر اسلم خاں جاگیر کے بارے میں معلوم کرنے نکل گیا تھا۔ اسلم خان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کریم بخش کے گھر کے آس پاس چکر لگا رہا تھا اور اس نے لوگوں سے معلومات حاصل کی تھیں لیکن جاگیر کا کہیں پتہ نہیں چل سکا تھا اور نہ یہ معلوم ہوا تھا کہ کریم بخش کے مہمان کا کیا ہوا تھا۔ اسلم خان اگر چاہتا تو بے چارے کریم بخش کو با آسانی مار پیٹ کر اس سے معلومات حاصل کر لیتا لیکن اسلم خان بہت چالاک تھا۔ چودھری شہاب الدین کی پٹائی کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ صرف اس لیے ہوئی ہے کہ کریم بخش کو نقصان پہنچایا گیا تھا۔ وہ اپنے لیے کوئی مشکل مول نہیں لینا چاہتا تھا لیکن جو ذمے داری اسے سونپی گئی تھی اسے پوری کرنا بہرحال اس کا کام تھا۔ اس نے بھی کھوجیوں ہی کا سہارا لیا تھا۔

اس کے اپنے جاننے والوں میں ایک زبردست کھوجی رحیم خان موجود تھا۔ رحیم خان کو ساتھ لے کر وہ جاگیر کی تلاش میں نکلا اور اس کے بعد جب رحیم خان اسے لے کر اس جگہ پہنچا جہاں وہ پانچ لاشیں بے گور و کفن پڑی ہوئی تھیں تو اسلم خان کانپ کر رہ گیا۔ اسے اپنی

عقلمندی پر خوشی ہوئی کہ اس نے کریم بخش کے ساتھ وہ سلوک کرنے کی کوشش نہ کی تھی جو بعد میں جاگیر جیسے لوگوں کے لیے موت کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس نے اپنے آپ کو بچا لیا تھا۔ ظاہر ہے کریم بخش بذاتِ خود ایسی کوئی کارروائی نہیں کر سکتا تھا جس کے نتیجے میں یہ پانچوں لاشیں یہاں موجود ہوتیں۔

بہرحال وہ جن لوگوں کے ساتھ یہاں تک آیا تھا۔ وہ بھی کانپ کر رہ گئے تھے۔ بمشکل تمام ان لاشوں کو جیپ میں ڈالا گیا اور اسلم خان انہیں لے کر شہاب الدین کی حویلی میں داخل ہو گیا۔ لاشوں کو چھپا کر یہاں لایا گیا تھا اور چونکہ وہ زیادہ پرانی نہیں تھیں اس لیے اس میں بدبو وغیرہ بھی نہیں اٹھ رہی تھی۔ وہ ان لاشوں کو لے کر ایک خفیہ جگہ پہنچ گیا۔ اس کا چہرہ شدت جوش سے سرخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں ناچ رہی تھیں۔ آخر کار شہاب الدین نے ایک ایسا دشمن پیدا کر لیا جو چالاک بھی تھا' طاقتور بھی تھا' بے رحم بھی اور کبھی بھی کسی بھی جگہ جا کر بڑے سے بڑے خطرناک آدمی کو موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔ اسلم خان جیسے لوگ ایسے دشمنوں سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ دولت کمانا ایک اچھا عمل ہے لیکن اس کے بدلے میں زندگی کو داؤ پر لگا دینا کوئی عقلمندی کی نشانی نہیں ہے۔ شہاب الدین اس کا منتظر تھا۔ کہنے لگا۔

''یہ تم لوگ جاتے ہو تو سو کر رہ جاتے ہو۔ میں پوچھتا ہوں کہاں رہ گئے تھے اب تک؟ کچھ پتہ چلا اس گدھے کا جو کھاتا گھوڑے کی طرح ہے اور رینگتا کچھوے کی طرح ہے۔''

اسلم خان نے ایک لمحے خاموشی اختیار کی اور پھر مدھم لہجے میں بولا۔

''چوہدری جی! جاگیر اور اس کے چاروں ساتھی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔'' شہاب الدین پر جیسے بجلی سی گری ہو۔ ایک لمحے تک وہ منہ کھول کر رہ گیا۔ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی لیکن پھر اس نے بمشکل تمام خود کو سنبھال کر کہا۔

"کک--- کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں شاہ جی! ان پانچوں کی لاشیں ایک ویران علاقے میں پڑی ہوئی ملی ہیں۔ ان کے سینوں میں گولیاں مار کر انہیں ہلاک کر دیا گیا ہے۔ میں ان لاشوں کو اٹھا کر لے آیا ہوں۔"

"گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے مگر کس نے مارا ہے انہیں؟"

"شاہ جی! اب اس سلسلے میں بھلا سوال کرنے کی کیا گنجائش ہے۔ صرف اور صرف شاہ زیب نے۔"

چوہدری شہاب الدین شاہ زیب کے ہاتھوں موت کا مزہ چکھ چکا تھا اسے وہ خونخوار شخص یاد تھا جو چھوٹی سی عمر میں اس قدر وحشی ہو چکا تھا۔ شہاب الدین کو اپنے بدن میں ایک جھرجھری کا سا احساس ہوا۔ کچھ لمحے وہ سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

"جاگیر جیسے بندے کو مارنا کسی معمولی آدمی کے بس کی بات تو نہیں ہے۔"

"شاہ جی! اس کے ساتھ چار بندے اور مر گئے ہیں۔ ان سب کے سینوں میں گولیوں کے سوراخ ہیں اور ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ شاہ جی! یہ کام پندرہ آدمیوں نے مل کر نہیں بلکہ ایک آدمی نے کیا ہے کیونکہ کریم بخش ایک بوڑھا آدمی ہے اور اس کے اندر اتنی ہمت نہیں ہے کہ شاہ جی کسی بندے کو وہ رسی سے باندھ سکے۔"

"اسلم خان! مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت ہے۔ یہ صورتحال تو کافی سنگین ہو گئی ہے۔ وہ حد سے آگے بڑھا ہوا بندہ ہے۔ میں اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے کیا مشورہ ہے تمہارا ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"شاہ جی! آپ کا وفادار ہوں۔ نمک خوار ہوں آپ کا۔ آپ کی زندگی چاہتا ہوں۔ وہ آس پاس منڈلاتا رہے گا۔ لجیا سے وہ محبت کرتا ہے۔ شاہ جی! میرا خیال ہے آپ لجیا کو آزاد

کر دیں۔ طریقہ ذرا مختلف ہو۔ پہلے اسے لے کر آئیں۔ میں خود یہ کام کروں گا۔ یہاں لانے کے بعد اسے موقع دیں کہ وہ ہماری گرفت سے نکل جائے۔ شاہ جی! جب وہ فرار ہو کر اپنے گھر پہنچ جائے گی تو کسی نہ کسی طرح شاہ زیب کو بھی معلوم ہو جائے گا اور شاہ جی! اس کے بعد آپ پر اس کا دباؤ کم ہو جائے گا۔ دیکھیں شاہ جی!--- بات کسی ذاتی انا کی نہیں ہے۔ بہت سی لڑکیاں آپ کے پاس آتی ہیں۔ بہت سی جاتی ہیں۔ صرف ایک لڑکی کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول لینا اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اندھیرے کا تیر ہے۔ کدھر سے آئے اور زخمی کر جائے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یا تو اس کا کوئی ٹھور ٹھکانا ہوتا تو پھر اس کا ہمارے ہاتھوں سے بچنا ممکن نہیں تھا۔ کریم بخش کو بھی نقصان پہنچانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس کی آتش انتقام اور تیز ہو جائے گی۔ شاہ جی! ویسے آپ کا جو بھی حکم ہو لیکن اگر میری رائے پوچھتے ہیں تو میں تو آپ سے یہی کہوں گا کہ زیادہ الجھن میں نہ پڑیں اور بھاڑ میں ڈالیں اس لڑکی کو۔ مجھ سے کہیں میں ایک سے ایک حسین لڑکی شہر سے اٹھا کر لا سکتا ہوں۔ شہاب الدین سوچ میں ڈوب گیا پھر اس نے کہا۔

"تم ایسا کرو پہلے ان پانچ بندوں کو ٹھکانے لگاؤ۔ ہم نہیں چاہتے کہ ان کی موت کی خبر عام ہو۔ کسی ویرانے میں ہی گڑھا کھود کر انہیں دفن کرا دو۔ کیا سمجھے۔"

"جی شاہ جی! ٹھیک ہے۔"

"یہ کام کرنے کے بعد مجھ سے ملاقات کرو۔" شہاب الدین نے کہا اور اسلم خان گردن جھکا کر وہاں سے چلا گیا۔

شہاب الدین واقعی اسلم خان کی بات پر غور کر رہا تھا۔ تمام باتیں اسے بالکل صحیح محسوس ہو رہی تھیں۔ بات خاموشی سے ٹل جائے تو اچھا ہے۔ ایک چوٹ کھا چکا تھا اس کے ہاتھوں۔ دوسری چوٹ نہیں کھانا چاہتا تھا۔ جو بندہ جاگیر جیسے آدمی کو اس طرح مار دے۔ اس

کے لیے موقع ملنے پر کچھ کرنا ناممکن نہیں تھا۔ اب اس سے ملاقات کر کے یہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس سے معافی مانگی جائے۔ بس لجیا کو آزادی دے دی جائے یہی کافی ہے۔ بلکہ شہاب الدین دل میں خوش ہو رہا تھا کہ لجیا ابھی تک اس کے ہاتھوں سے بچی ہوئی تھی۔ یہ شدید زخمی ہونے کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ ابھی تک ٹھیک سے سنبھل نہیں پایا تھا۔ اس نے حالات کے تحت لجیا کو اغوا کرا کر لاہور بھیج دیا تھا اور وہ لاہور میں اس کی ایک کوٹھی میں رہ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کچھ عرصے کے بعد لاہور چلا جائے گا۔ موسم کے نرم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر لجیا کے ساتھ رنگ رلیاں منانا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ لیکن اب اسلم خان کے مشورے پر عمل کرنا زیادہ مناسب سمجھ رہا تھا اور اسلم خان نے دوسرے دن اس وقت اس سے ملاقات کی جب وہ ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ سلام کرنے کے بعد وہ بولا۔

''چوہدری جی! کام آپ کے حکم کے مطابق ہو گیا ہے۔''

''اسلم خان! تم جانتے ہو ہم لوگوں کے راز دار کم ہی ہوتے ہیں اور ہم بڑا ٹھوک بجا کر کسی کو اپنا راز دار بناتے ہیں۔ تم ہمارے خاص آدمی ہو۔ تمہارے مشورے پر عمل کرنا چاہتے ہیں ہم۔ لاہور چلے جاؤ اپنے ساتھ اپنے اعتماد کے بندے لے جاؤ۔ اس لڑکی کو یہاں تک لے آؤ۔ بستی کے قریب کسی ایسی جگہ رک جانا جہاں سے وہ اپنے گھر آسانی سے آ سکے۔ اسے موقع دینا کہ وہ فرار ہو جائے اور اس کے بعد اس کے گھر کی طرف رخ نہ کرنا۔''

''شاہ جی! میں ابھی تھوڑی دیر کے بعد چلا جاتا ہوں۔ خطرے کو جتنی جلدی ٹال دیا جائے اتنا اچھا ہے۔''

''لیکن بات سنو۔ یہ سمجھ لو کہ وہ آس پاس ہی کسی بھوکے بھیڑیے کی طرح چکرا رہا ہو گا۔ اس کی طرف سے ہمارے ہر آدمی کو ہوشیار رہنا چاہیے۔''

''آپ فکر نہ کیجیے شاہ جی! اللہ کے بھروسے پر میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔'' اسلم خان نے کہا۔

شہاب الدین درحقیقت ان دنوں بہت خوفزدہ رہنے لگا تھا۔ اسے اپنے سائے سے بھی وحشت ہوتی تھی۔ بہرحال اس کام سے اسے اس بات کی امید تھی کہ شاہ زیب کا غصہ کسی حد تک کم ہو جائے گا اور اس کے بعد وہ اس کی جانب رخ نہیں کرے گا۔ ایسے مصیبت کے لمحات کم ہی آتے ہیں اور آ جاتے ہیں تو ٹلتے نہیں ہیں۔

بہرحال اس وقت شہاب الدین بڑی پریشانیوں کا شکار تھا پھر اس کی پریشانی میں اضافہ اس وقت ہوا جب دوسرے ہی دن اسلم خان واپس آ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ شہاب الدین نے ایک لمحے کے اندر اندازہ لگا لیا کہ کوئی انہونی بات ہوئی ہے۔ اس نے پریشان لہجے میں کہا۔

''کیا بات ہے اسلم خان! کام ہو گیا؟''

''شاہ جی! کام نہیں ہو گیا بلکہ لٹیا ڈوب گئی۔''

''کام کی بات کرو۔'' شہاب الدین غرایا۔

''شاہ جی! لڑکی میرے وہاں پہنچنے سے پہلے نکل گئی۔''

''کیا مطلب؟''

''پہرہ دینے والوں سے ذرا سی چوک ہو گئی جس کمرے میں اسے قید کیا گیا تھا۔ وہاں ایک روشن دان تھا۔ کمرے میں پورا فرنیچر موجود تھا۔ لڑکی وہاں سے نکل گئی شاہ جی! اور اب اس کا کہیں پتہ نہیں ہے۔'' شہاب الدین کچھ دیر کے لیے تو سکتے میں رہ گیا تھا۔ پھر اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ان لوگوں سے معلومات کیا تم نے جو پہرہ دے رہے تھے؟''

''شاہ جی! معلومات کیا کرتے سب عیاشیاں کر رہے ہیں۔ کھا رہے ہیں' پی رہے ہیں' جو ذمے داریاں انہیں دی جاتی ہیں اسے مذاق سمجھتے ہیں۔''

''سب کو یہاں بلوا لو۔''

''جی اچھا۔۔۔''

''لیکن اسلم خان! یہ تو بہت برا ہو گیا۔ کون ہماری بات پر یقین کرے گا۔ یار! ایک کام کرو۔ تلاش کرواسے چاروں طرف تلاش کرو۔''

''شاہ جی! آٹھ بندے لگائے ہیں اور پورے لاہور میں پھیلا دیا ہے کہ جگہ جگہ دیکھیں ڈھونڈیں اور تلاش کریں۔ شاہ جی! کیا کہا جا سکتا ہے یا تو ہماری تقدیر خراب ہے یا پھر ہمارے ساتھ کام کرنے والے بندے خراب ہیں۔ جا گیرا لگ مارا گیا۔ چار بندے اس کے ساتھ مارے گئے اور اس سے پہلے وہ آپ پر حملہ کر چکا ہے۔ شاہ جی! حالات بہت سنگین ہو گئے ہیں۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔''

''مگر کچھ کرنا پڑے گا۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ سنو اس شاہ زیب کے بارے میں پوری تفصیل معلوم کر کے آؤ۔ بڑے اچھے انداز میں کریم بخش کو بھی ٹٹولو۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لڑکی وہاں سے بھاگنے کے بعد اپنے ماں باپ کے پاس آ جائے۔ ویسے تو وہ سیدھی سادی معصوم سی لگتی ہے لیکن اور کہاں جائے گی ارے ہاں یہی کرو۔ کریم بخش کے گھر پر نظر رکھو۔ بلکہ اس کے ساتھ کچھ تھوڑا سا اپنائیت کا سلوک کر لو۔ ہو سکتا ہے تمہیں اس کے بارے میں تفصیلات معلوم ہو جائیں اور یہ بھی پتہ چل جائے کہ لڑکی باپ کے پاس پہنچی ہے یا نہیں۔ کچھ کرو یار میری تو عقل خراب ہو کر رہ گئی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں تم خود آگے بڑھ کر کچھ کرو۔''

''جی شاہ جی! میں بھرپور کوشش کروں گا کہ شاہ زیب کی کھوج نکال لاؤں۔'' اسلم خان

نے کہا اور پھر اسلم خان اپنے طور پر مصروف ہو گیا۔ وہ کریم بخش سے ملا' کریم بخش جانتا تھا کہ وہ چوہدری کا آدمی ہے۔ کریم بخش کی حالت قابل رحم ہو گئی تھی۔ بیمار پڑا ہوا تھا بستر پر۔ اسلم خان اس کے قریب پہنچا اور اس نے کریم بخش سے کہا۔

''بابا کریم بخش! آپ کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے۔ چوہدری شہاب الدین خود اس پر انتہائی شرمندہ وافسردہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کریم بخش تو بلاوجہ پھیر میں آ گیا۔ ہم نے بے شک لجیا کو پسند کیا تھا۔ لیکن عیاشی کے لیے نہیں ہم اسے اپنی حویلی میں اپنی بیوی کی حیثیت سے رکھنا چاہتے تھے۔ بات بگڑتی چلی گئی۔ کریم بخش نے منع کر دیا تھا ٹھیک ہے لیکن یہ مقصد نہیں تھا۔ بات تو اس وقت بگڑی جب شاہ زیب نے چوہدری صاحب پر حملہ کیا۔ بابا صاحب لجیا واپس آنے والی ہے۔ اسے عزت آبرو کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ شاہ زیب کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ اس نے چوہدری صاحب کے بندوں کو بڑا نقصان پہنچایا ہے لیکن چوہدری صاحب کہتے ہیں اس میں کریم بخش کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہم اسے کسی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ لجیا آپ کے پاس پہنچنے والی ہے۔'' کریم بخش کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک ہی چوہدری شہاب الدین پر شرافت کا دورہ کیسے پڑا ہے۔ بہر حال وہ ہاں ہو کر کے رہ گیا تھا۔ اسلم خان کافی دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا اور اس کے بعد وہاں سے اٹھ آیا۔ آٹھویں دن اس نے چوہدری شہاب الدین کو رپورٹ دی تھی۔

''سر جی! بات بڑی بگڑی ہوئی ہے۔ آپ کبیر والا کے زمینداروں جہانزیب اور اورنگزیب کو تو جانتے ہو؟''

'ہاں نام سنا ہے ان کا۔''

''شاہ زیب ان کا تیسرا بھائی ہے اور اس کی گھر سے کچھ ناراضگی ہو گئی ہے۔''

''اوہو۔ یہ تو بڑے کام کی بات معلوم ہوئی ہے۔ ایسا کرتے ہیں ان لوگوں سے

ملاقات کرتے ہیں اور ان سے بات کر کے کہیں گے کہ شاہ زیب کو سمجھائیں۔ برے راستوں پر نکل گیا ہے۔ میں اس سے کہوں گا کہ وہ میرے چھوٹے بھائیوں کی طرح ہے۔ دوسروں کے بہکانے میں آ کر غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے۔ یہی کہا جا سکتا ہے اور کیا کریں۔''

''شاہ جی! میرا خیال ہے یہ مناسب ہے۔ آپ تیاریاں کریں۔ اور اس کے بھائیوں سے مل لیں۔''

شہاب الدین پر واقعی بہت برا وقت آ پڑا تھا۔ یہ جتنے لوگ اپنے جیسے دوسرے انسانوں پر ظلم و ستم کرتے ہیں۔ اندر سے اتنے بزدل ہوتے ہیں کہ اگر موت کی پرچھائیاں بھی ان کے قریب سے گزر جائیں تو موت سے پہلے آدھے مر جاتے ہیں۔ پتہ نہیں گناہوں کا احساس انہیں اس قدر خوفزدہ کیے رکھتا ہے یا پھر یہ بھی فطرت کا ایک حصہ ہے۔ چوہدری شہاب الدین ایک بار شاہ زیب کے ہاتھوں زندگی اور موت کا مزہ چکھ چکا تھا اور اب پھر اسے اپنے چاروں طرف موت منڈلاتی نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

ڈاک بنگلہ اندر سے کافی صاف ستھرا تھا۔ دروازے پر ہی شاہ زیب کو چوکیدار ملا جو اٹھائیس تیس سال کی عمر کا جوان آدمی تھا۔ اس نے شاہ زیب کو سلام کیا تھا اور شاہ زیب نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''یہاں تھوڑا وقت قیام کے لیے جگہ مل سکتی ہے؟''

''صاحب جی! جگہ ہی جگہ ہے آ جائیے۔'' چوکیدار نے مہذب لہجے میں کہا۔ ڈاک بنگلہ خوب صاف ستھرا کر کے رکھا گیا تھا۔ جس کمرے میں چوکیدار نے شاہ زیب کو پہنچایا تھا۔ وہاں ایک بستر پڑا ہوا تھا اور ضرورت کی کئی چیزیں۔ یہ چوکیدار کی اپنی کوشش کا نتیجہ تھا۔ ورنہ اس جیسے لاقے میں کون آتا ہو گا۔ پھر بھی شاہ زیب نے چوکیدار سے پوچھ لیا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''ماجھا! صاحب جی۔''

''ماجھے! کیا یہاں لوگ آتے رہتے ہیں؟''

''ہاں صاحب جی! کبھی کبھی آ جاتے ہیں۔ کبھی بہت دن تک نہیں آتے۔''

''تم نے اس جگہ کو کافی صاف ستھرا کر کے رکھا ہوا ہے۔''

''صاحب جی! کرنے کو کوئی اور کام تو ہوتا نہیں ہے۔ ویسے ہم نے اپنے لیے دوسرا کام بھی نکال لیا ہے۔''

''کیا۔۔۔؟'' شاہ زیب نے پوچھا۔

''پیچھے ہم نے ترکاریوں کا کھیت اگا لیا ہے۔ بیکار زمین پڑی ہوئی تھی۔ ویسے بھی ہم کسان ہیں۔ کسان کے بیٹے ہیں۔ اب یہ سرکاری نوکری ملی ہے اور یہاں ڈیوٹی لگی ہے تو ہم نے سوچا یہیں پر کچھ کام کیا جائے۔ پیچھے کنواں لگا ہوا ہے۔ اس سے پانی نکال کر ہم نے یہ زمینیں بنائیں۔ بہت بڑا علاقہ نہیں ہے صاحب جی! پر آپ دیکھو۔ آپ کا جی خوش ہو جائے گا۔ گوبھی، شلجم، مولیاں لگائی ہیں ہم نے اور بڑی محنت کی ہے ان پر۔''

''بالکل ٹھیک اس کا مطلب ہے کہ تم ڈاک بنگلے میں رہنے والوں کو ترکاری تو بالکل تر و تازہ کھلاتے ہو گے۔''

''مزہ آ جائے گا صاحب جی! آپ کو آپ دیکھیں تو سہی ہم بڑی بڑھیا سبزی پکاتے ہیں اور تو اور اگر آپ گوشت کھانا چاہو تو باہر سے کوئی گوشت نہ ملے تو ہمیں بتائیں۔ غلیل سے پرندے مارتے ہیں اور ان کا گوشت کھلاتے ہیں۔ آپ حکم کرو۔''

''بھئی تم تو بہت کمال کے آدمی ہو ماجھے۔'' شاہ زیب نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''مہربانی ہے صاحب جی! آپ کی۔'' ماجھے نے واقعی انتہائی اعلیٰ درجے کی ترکاری اور روٹیاں پکا کر شاہ زیب کو دی تھیں۔ شاہ زیب نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا اور پھر ماجھے سے کہا تھا۔

''ہاں ماجھے! آؤ بیٹھو' شادی شدہ ہو؟''

''نہیں جی' ہم جیسے غریب لوگ شادی شدہ ذرا کم ہی ہوتے ہیں۔''

''نہیں خیر یہ بات تو نہیں ہے ماجھے! بندہ کتنا ہی غریب ہو اگر شادی کرنا چاہے تو اپنی جیسی کسی غریب لڑکی سے شادی کر ہی سکتا ہے۔''

''ہاں۔ پھر کچھ اور باتیں بھی ہوتی ہیں۔ اب آپ دیکھو دنیا میں ہمارا تو کوئی بھی نہیں ہے۔ نہ ماں' نہ باپ' نہ بہن' نہ بھائی۔ کبھی کبھی شادی ان لوگوں کا شوق بھی ہوتا ہے صاحب جی اور آپ کو سچ بتائیں ہماری اپنی تو کبھی اتنی ہمت پڑتی ہی نہیں کہ کسی سے اپنے بارے میں کچھ کہیں اور کہیں بھی کس سے۔ ہے کون' بس یہی ساری باتیں سوچ کر اس ڈاک بنگلے میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اچھی جگہ ہے۔ صبح کو جب سورج نہیں نکلتا اور ہم جاگ جاتے ہیں تو صاحب جی اس علاقے کا منظر دیکھنے کے قابل ہوتا ہے اور پھر ہماری ترکاریوں کے کھیت آپ دیکھو تو سہی دل خوش ہو جائے گا۔''

''ہاں۔ میں ضرور دیکھوں گا۔''

''بس پیچھے ہی ہیں۔ زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔''

''کسی نے منع تو نہیں کیا یہاں کھیت لگانے سے؟''

''نہیں صاحب جی! ہم اس بات کی پوری پوری امید رکھتے ہیں کہ جب کوئی سمجھدار چوہدری ادھر سے گزرے گا تو ہماری ترکاریوں کے کھیت سے جل کر انہیں اجاڑ دے گا۔ صاحب جی! یہ چوہدری لوگ جو ہوتے ہیں نا بڑے تھوڑے دل کے ہوتے ہیں۔ کسی

دوسرے کی بڑائی تو قبول ہی نہیں کرتے۔''

''اچھا تجربہ ہے تمہیں چوہدریوں کا؟'' شاہ زیب نے پوچھا۔

''کیسے تجربہ نہیں ہے شاہ جی! سارا کیا دھرا انہی کا تو ہوتا ہے۔''

''ایک بات بتاؤ ماجھے! ان چوہدریوں کے لیے کیا کیا جائے؟'' ماجھا ہنسنے لگا پھر اس نے کہا۔

''صاحب جی! آپ کو دل کی بات بتاؤں برا تو نہیں مانیں گے۔ اچھا ایک بات بتاؤ۔ آپ خود چوہدری تو نہیں ہیں؟''

''نہیں میں چوہدری نہیں ہوں۔''

''صاحب جی! ہم کبھی کبھی اپنے آپ کو خواب میں دیکھتے ہیں اور ہمارے قبضے میں ایک جن ہوتا ہے۔ ہم وہ بن چکے ہیں کیا کہتے ہیں جن کے مالک کو؟''

''عامل۔''

''ہاں جی وہی۔ وہی تو ہم عامل ہیں اور ہمارا جن ہم سے کہتا ہے کہ بتاؤ میرے آقا! کیا چاہیے تمہیں۔ بس صاحب جی' خواب میں ہم جن کے کندھوں پر بیٹھ کر نکل جاتے ہیں اور کسی چوہدری کا گھر تاک لیتے ہیں جو غریبوں پر ظلم کرتا ہے۔ بس صاحب جی پھر ہم اور ہمارا جن ایسی پٹائی لگاتے ہیں اس چوہدری کی کہ اسے بھی چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا ہوگا صاحب جی! یہ خواب دیکھ کر ہم دل ہی دل میں خوش ہو لیتے ہیں۔ اس سے زیادہ تو بندہ اور کچھ کر نہیں سکتا نا۔ پر آپ کو ایک بات بتائیں۔ قسم سے اگر کوئی جن قبضے میں آ جائے تو ان سارے چوہدریوں کو ٹھیک کر دیا جائے جنہوں نے انسانوں کو کتا بنا کر رکھا ہوا ہے۔ صاحب جی! ہماری بستی کھنڈیاں ہی میں لے لیجیے۔ بہت سے ایسے کام ہوتے رہتے ہیں۔ عورتوں کو ننگا نچایا جاتا ہے۔ گھروں کو خالی کر دیا جاتا ہے۔ کھیتوں کو آگ لگا دی جاتی ہے۔ اپنے دشمن

کو بیچ سڑک پر گولی ماردی جاتی ہے۔ کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا ان کا۔ اس وقت میرا دل چاہتا ہے صاحب جی! کہ سچ مچ میرے قبضے میں کوئی جن آجائے اور میں وہ کام کرسکوں جو میرے دل میں آتے ہیں۔''

شاہ زیب کے چہرے پر گہری فکر کی لکیر پھیل گئی تھی۔ واقعی اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دولت مند لوگوں نے ان زمینداروں نے اپنے اپنے علاقوں کے انسانوں کو اس طرح تنگ کررکھا ہے کہ وہ خواب دیکھنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرسکتے۔ کیا ان کے خلاف کوئی ایسا محاذ بنایا جائے جس سے ان لوگوں کی ناک میں نکیل ڈالی جاسکے۔ ہونا تو ایسا ہی چاہیے۔ چاروں طرف ایک ہی مسئلہ ہے۔ خیر جہانزیب اور اورنگزیب بہت بڑے زمیندار ہیں بھی نہیں۔ جو چھوٹی موٹی زمینیں ان کے پاس ہیں۔ ان پر ہی کھا کمارہے ہیں۔ لیکن ان کی بھی ایک ٹور ہے۔

اس کے بعد الیاس خاں اور جبار خاں آتے ہیں جو بہر حال روایتی قسم کے چوہدری ہیں اور اپنے مخالفوں کے خلاف سازشیں اور حرکتیں کرتے رہتے ہیں جو دب سکتا ہے اسے دبا لیتے ہیں۔

پھر اس کے بعد فخر خان جو ایک شخص کو قتل کرانا چاہتا ہے اور جس نے اپنی حویلی میں نجانے کیسے کیسے راز پال رکھے ہیں۔ پھر حیدر شاہ جس کا اپنا کھیل مختلف ہے پھر شہاب الدین۔

راجہ شہاب الدین جو عیاش طبع ہے اور اپنے علاقے میں ایسے ایسے المیے پیدا کرتا رہتا ہے۔ ان سب کا ایک ہی رنگ ایک ہی انداز ہے۔ کسی کے لیے کچھ کرنے کی بجائے یا کسی کے ہاتھوں میں کھیلنے کے بجائے کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ان کی سرکوبی کی جائے۔ اس کے لیے ایک منصوبہ بنایا جائے۔ جو شخص بھی جہاں ملے اسے اس کام پر لگا دیا جائے کہ وہ چوہدریوں کے

خلاف جنگ کرے۔ یہ ہونا تو چاہیے ایک معمولی سا ڈاک بنگلے کا چوکیدار بھی دل میں یہی جذبہ رکھتا ہے۔ ایسے جذبے اسی وقت بیدار ہوتے ہیں جب انسان انسانوں پر ظلم کرنے میں آخری حد تک بازی لے جائے۔

اس معمولی سے چوکیدار نے شاہ زیب کے ذہن میں وہ بیج ڈال دیا تھا جو بعد میں نجانے کیسی کیسی شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ رات ہوگئی۔ شاہ زیب اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے دل میں بہت سے خیالات آرہے تھے۔ ان میں لجیا سرفہرست تھی۔ بھائیوں کا خیال بھی دل میں تھا۔ بہت سے ایسے کردار تھے جو بکھرے بکھرے سے تھے۔ فاضل باجوہ بھی ذہن میں آیا بے چارے کی ذمے داری لگائی گئی تھی اور حیدر شاہ اس بات کا منتظر تھا کہ یہ لوگ کچھ کرکے دکھائیں لیکن درمیان میں یہ سلسلہ آگیا تھا۔ پتہ نہیں فاضل باجوہ کہاں گیا ہوگا۔ یہی باتیں سوچتے سوچتے شاہ زیب پر نیم غنودگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی لیکن ابھی اس کا ذہن پوری طرح سویا نہیں تھا کہ دفعتاً اس کے کانوں میں ایک تیز آواز ابھری۔ ایک عجیب کیف بھری آواز تھی اور تھوڑے فاصلے سے آرہی تھی۔ پہلے تو بول سمجھ میں نہیں آئے لیکن پھر ایک حسین آواز نمایاں ہوتی چلی گئی۔

کہہ دساں میں کیڑی گلوں جتی بازی ہار گیا
جینوں' جینوں منصف پایا اوہو مینو چار گیا
لہو رنگا او اتھرو جیڑا پلکیں زور دیں ڈگیا سی
ڈگدا ڈگدا کئی سجناں دے پیار دا بھار اتار گیا
کوئی موت بیانہ یارو میری موت نوں ملیا نئیں
مینوں اپنے اندروں اتھ دا ہویا ہوکا مار گیا

گہری رات' پر ہول سناٹا اور پھر یہ آفاقی آواز --- اور پھر اس پر یہ سوز شاہ زیب کو یوں

لگا جیسے یہ اس کی اندر کی آواز ہو۔ کوئی اس کے دل کی آواز کو الفاظ کا رنگ دے رہا ہو۔ نیند آنکھوں سے دور ہوگئی۔ ذہن اس پر اثر آواز میں کھو گیا لیکن پھر اچانک دماغ ہی میں ایک دھماکہ ہوا۔۔۔ یہ آواز۔۔۔ یہ آواز اس نے پہلے بھی سنی تھی۔۔۔ بالکل یہی آواز مکرم شاہ۔ سو فیصدی مکرم شاہ۔

پہلے بھی اس مستانہ آواز نے اسے مکرم شاہ کی طرف متوجہ کیا تھا۔ مکرم شاہ کے اندر نجانے کیسی کشش تھی کہ وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھا اور ڈاک بنگلے سے باہر نکل آیا۔ اس کے قدم جیسے اس کی آواز کے سحر میں بندھ گئے تھے۔ اور وہ کھنچا چلا جا رہا تھا۔ اس کی آواز نے اسے سحر زدہ کر دیا تھا۔

پھر کچھ دیر کے بعد وہ اس آواز کی شاہراہ پر چلتا ہوا مکرم شاہ تک پہنچ گیا۔ تھوڑے فاصلے پر گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ آگ روشن تھی اور مکرم شاہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے آواز کا جادو بکھیر رہا تھا۔ اس کے بول دل و دماغ پر چھائے جا رہے تھے۔ مکرم شاہ کو بالکل پتہ نہیں تھا کہ کوئی اس کے پاس آ گیا ہے۔ وہ بدمست تھا اور نجانے کس خیال میں کھویا ہوا تھا۔ شاہ زیب گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بدن میں شدید اینٹھن پیدا ہوگئی تھی۔ ایک عجیب سا احساس دل و دماغ پر طاری تھا۔ پھر مکرم شاہ خاموش ہوگیا اور فضا میں جیسے ایک دم سے سکوت طاری ہوگیا۔ ایک پر اسرار اور ہولناک سکوت' آسمان پر ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ چاند نے چہرے پر نقاب ڈال لیا تھا۔ صرف آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جن سے وہ ماحول کو جھانک رہا تھا۔ البتہ ستارے مکرم شاہ کی پرسوز اور حسین آواز سننے کے لیے آنکھیں پھاڑے اس کی جانب دیکھ رہے تھے اور ان کی وجہ سے ماحول میں مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت اس قدر خاموشی طاری ہوگئی تھی کہ شاہ زیب کے سانسوں کی آواز خود شاہ زیب کو زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ مکرم شاہ نے بھی یہ آواز سنی' پلٹ کر دیکھا اور

دیکھتا رہا۔ پھر اس کے منہ سے حیرت بھری آواز نکلی۔

''شاہ زیب! یہ تم ہو؟'' شاہ زیب جیسے چونک پڑا جلدی سے سیدھا ہوا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر مکرم شاہ کے پاس پہنچ گیا۔ پھر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور پھر اس نے کہا۔

''ہاں شاہ جی! میں ہوں۔''

''یہاں کب؟ کیسے؟ اور کہاں سے آ گئے؟''

''شاہ جی! تھوڑے فاصلے پر ڈاک بنگلہ ہے وہاں رکا ہوا تھا۔ آپ کی آواز سنی تو آ گیا۔''

''پہلے بھی تم میری آواز سن کر ہی آئے تھے۔''

''شاہ جی! آپ کو خوش کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا۔ یہ آواز سن کر تو چرند پرند بھی آپ کے گرد آ کر اکٹھا ہو جائیں گے۔ شاہ جی۔۔۔ آپ کی آواز کا یہ سوز دل و دماغ میں ٹھنڈک بن کر بیٹھ جاتا ہے۔'' مکرم شاہ تھکے تھکے انداز میں ہنسنے لگا اور تھوڑے توقف کے بعد بولا۔

''ہاں۔ جانتے ہو کیوں؟''

''نہیں جانتا شاہ جی!''

''اس لیے کہ یہ آواز میری نہیں ہے۔'' مکرم شاہ کے الفاظ کو شاہ زیب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ مکرم شاہ نے بھی اس بات کی وضاحت نہ کی تو مجبوراً شاہ زیب نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں شاہ جی!''

''کچھ باتیں بیٹا! سمجھانے کی نہیں ہوتیں۔ وقت جب سمجھ لیتا ہے تو خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہیں اور اس وقت تک میں تمہیں یہ باتیں نہیں سمجھا سکتا۔ جب تک کہ وہ وقت تمہیں ان کے سمجھنے کی سمجھ نہ دے دے۔ الجھی ہوئی بات تھی۔ شاہ زیب کا ذہن تو خود الجھنوں کا

شکار تھا۔ نئی الجھنوں کی گنجائش تھی بھی نہیں۔ وہ خاموشی سے مکرم شاہ کو دیکھتا رہا اور دل و دماغ میں طوفان امنڈتے رہے۔

یہ چہرہ--- حیدر شاہ کے علاوہ کسی اور کا نہیں ہے۔ حیدر شاہ--- کے چہرے پر نفاست تھی۔ بال قرینے سے بنے ہوئے ہوتے تھے۔ داڑھی کا بھی ایک خاص انداز تھا۔ جبکہ یہاں جھاڑ جھنکاڑ اگے ہوئے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے چہرے پر توجہ ہی نہ دی جاتی ہو۔ آواز سو فیصدی حیدر شاہ کی تھی لیکن جو سب سے بڑی چیز سامنے تھی وہ کٹا ہوا پاؤں تھا۔ وہ بھی ران کے پاس سے کٹا ہوا اور صاف نمایاں تھا۔ یہ نہیں لگتا تھا کہ یہ کسی تیکنیک سے موڑ لیا گیا ہو۔

جبکہ حیدر شاہ کا پاؤں بالکل صحیح سالم تھا۔ بے شک شاہ زیب نے اسے مکمل نہیں دیکھا تھا۔ ظاہر ہے وہ لباس میں ہوتا تھا اور پیر بھی تقریباً ڈھکے ہوئے ہوتے تھے۔ ان میں موزے کے ہوئے ہوا کرتے تھے لیکن چال میں ذرہ برابر لغزش نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی کسی جگہ ایسی لچک پائی جاتی تھی کہ یہ اندازہ ہو کہ دوسرا پاؤں مصنوعی ہے۔

بہر حال حیدر شاہ یہ بھی کہتا تھا کہ اس کا کوئی جڑواں بھائی نہیں ہے پھر یہ یکساں صورت یقینی طور پر کوئی نہ کوئی راز رکھتی ہوگی۔ بہر حال مکرم شاہ کے ملنے سے۔ شاہ زیب کو ایک خوشی کا احساس ہوا تھا۔ مکرم شاہ نے کہا۔

''اور سناؤ تمہاری مشکل حل ہوئی یا نہیں؟''

''نہیں شاہ جی! مشکلوں میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔''

''تم نے مجھے اپنی مختصری کہانی سنائی تھی۔ بعد میں اس کہانی کی کچھ اور تفصیل مجھے معلوم ہوگئی تھی۔ تمہارے ذریعے نہیں بلکہ کچھ ایسے لوگوں کے ذریعے جو تمہاری کہانی سے منسلک تھے۔ تمہاری زمینوں کا مسئلہ کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں شاہ جی! بس جنگل گردی ہے دشمنوں سے چھپا چھپا پھر رہا ہوں۔ پرانے

دشمن میری تاک میں ہیں۔ نئے دشمن بنتے جا رہے ہیں۔''

''واہ--- واہ--- واہ--- بس تمہاری یہی صفت مجھے تمہارے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تم جیسے لوگوں سے مجھے بڑا پیار ہے۔ مجھے دوستیاں تو سب ہی کرتے پھرتے ہیں لیکن دشمنی دل والے ہی کیا کرتے ہیں۔ بزدل لوگ دوست بناتے ہیں اور بہادر دشمن۔'' مکرم شاہ نے کہا اور شاہ زیب اس کے فلسفے پر غور کرنے لگا۔ تھوڑی دیر تک مکمل خاموشی طاری رہی پھر شاہ زیب نے کہا۔

''شاہ جی! آپ کے بارے میں مکمل سوچتا رہا ہوں اور بہت سے خیالات میرے ذہن میں ابھرے ہیں۔ کیا آپ صرف دوسروں کے بارے میں رائے دیتے ہیں اور ان کے بارے میں پوچھتے ہیں یا اپنے اندر بھی کچھ لچک رکھتے ہیں۔'' مکرم شاہ نے حیرانی سے شاہ زیب کو دیکھا اور پھر بولا۔

''سمجھا نہیں میں۔''

''شاہ جی! آپ اس دن مجھے ملے تھے۔ مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ پھر آپ نے مجھے ایک جگہ بٹھایا تھا اور سامنے والے گھر میں چلے گئے تھے۔ اس کے بعد وہاں چیخ پکار مچی تھی اور مجھے پتہ چلا تھا کہ تین افراد قتل ہوگئے ہیں۔ قاتل کی حیثیت سے وہ لوگ آپ کا نام لے رہے تھے۔ یہ بات میرے ذہن میں آج تک اٹکی ہوئی ہے۔ آپ مجھے بتائیں گے وہ کیا قصہ تھا اور آپ مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے باوجود مجھے وہاں چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے۔''

''اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو میں ضرور تجھ سے مدد مانگتا۔ مجھے جو کام کرنا تھا اس کو کرنے کے بعد تیری طرف آنے کا مقصد یہ تھا کہ تو بھی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا۔ اس گھر سے میری دشمنی تھی۔ مجھے وہاں تین بندے مارنے تھے اور اس رات میں اسی مقصد سے نکلا

تھا۔ تو تو وہاں مل گیا۔ میں نے کچھ وقت تیرے ساتھ گزارا اور پھر اپنا کام کر کے وہاں سے نکل گیا۔ دشمنی تھی میری وہاں ان تین بندوں سے۔ میں نے وہی دشمنی نکال لی۔ جھوٹ کیوں بولوں۔''

''شاہ جی! آپ اس سے پہلے بھی کچھ بندوں کو قتل کر چکے ہیں۔''

''بہت --- بس اس سے زیادہ کچھ مت پوچھ۔ ہر ایک کا اپنا ایک کام ہوتا ہے۔ کیا سمجھا؟''

''سمجھ رہا ہوں شاہ جی --- آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اچھا شاہ جی! آپ ایک بات اور بتایئے؟''

''وہ بھی پوچھ لے بھائی۔''

''حیدر شاہ سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟'' شاہ زیب نے مکرم شاہ کے چہرے پر بھرپور نگاہیں جما رکھی تھیں اور اپنے تمام تر تجربے سے کام لے کر اس کے دل کی گہرائیوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ مکرم شاہ کے چہرے پر کوئی تغیر نہیں ہوا۔ اس نے کہا۔

''حیدر شاہ --- مجھ یاد نہیں آ رہا کہ اس کی حیدر شاہ نامی شخص سے میری شناسائی ہے۔ کون ہے یہ --- کہاں رہتا ہے؟''

''شاہ جی! آپ کی بات کو میں بالکل سچ تسلیم کروں گا کیونکہ آپ سے مجھے عقیدت ہو گئی ہے۔ میری عقیدت کو دھوکہ نہ دیجئے گا۔ حیدر شاہ آپ کا اتنا ہمشکل ہے کہ یقین نہیں آتا کہ وہ آپ نہیں ہیں۔ مگر اس کے دونوں پاؤں ٹھیک ہیں۔ شاہ جی! اس بات نے مجھے شدید حیران کر دیا ہے۔'' مکرم شاہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کچھ دیر تک وہ مکمل خاموش رہا اور اس کے بعد بھاری لہجے میں بولا۔

''دیکھو شاہو! بعض باتیں ایسی باتیں ہیں کہ جنہیں انسان اپنے سائے سے بھی چھپاتا

ہے۔ بس اس سوال کو تو دوبارہ نہ کر اور آگے بھی مجھے ملے تو اس سوال کو کبھی مت کرنا۔ تو نے ایک ایسی بات کہہ دی جو میرے دل کو جا کر کھٹ سے لگی ہے۔ میں بڑی آسانی سے یہ کہہ سکتا تھا کہ حیدر شاہ نامی کسی شخص کو نہیں جانتا لیکن تو نے عقیدت کی جو بات کی ہے۔ میں تیری عقیدت کو دھوکا نہیں دینا چاہتا لیکن بس اس بارے میں اپنی زبان کو ہمیشہ کے لیے بند کر لے۔''

''ٹھیک ہے شاہ جی! دوسرے کا احترام کرنا ہر اس بندے کی ذمہ داری ہوتی ہے جس کے دل میں عقیدت کے پودے ہوں۔''

''ہاں --- بہت تیرا شکریہ اور تیری مہربانی۔ اب مجھے اپنے بارے میں بتا تیری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''شاہ جی! اب آپ کو میرے بارے میں کچھ تفصیل معلوم ہے۔ جس کا آپ نے ابھی اظہار کیا۔ چار لفظوں میں بتائے دیتا ہوں۔ لاہور میں تعلیم پوری کر رہا تھا۔ زرعی یونیورسٹی سے زمین کے سینے سے سونا نکالنے کی تعلیم لے رہا تھا۔ ایک یا ڈیڑھ سال پہلے ماں کا انتقال ہوا تو اپنے آپ کو اکیلا محسوس کیا۔ جب وصیت میں جائیداد کے بارے میں لکھا گیا تھا۔ تو مجھے بھی حصہ ملا اور ایک خاص جگہ کچھ ایسی زمینیں جو بنجر پڑی ہوئی تھیں۔ ماں سے بات ہوئی تو میں نے فخر اور اعتماد سے کہا کہ ماں جی! ایک دن آپ کی آنکھیں اس زمین کو سونا اگلتے ہوئے دیکھیں گی۔ یہ ایک وعدہ ہے ایک اعتماد ہے ایک یقین ہے جو میں آپ کو دلا رہا ہوں۔ ماں تو اس دنیا سے چلی گئی۔ میرے پیچھے وہی زر زن زمین کا معاملہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بھابیوں نے بھائیوں کو اکسایا کہ میرا حصہ ہڑپ کر جائیں۔ چنانچہ جب میں گھر واپس لوٹا تو مجھے بتایا گیا کہ اب میرے حصے کا کچھ باقی نہیں بچا ہے۔ سب کچھ میری تعلیم پر خرچ ہو چکا ہے۔ بڑی احمقانہ بات تھی یہ۔ میں نے تو کبھی اس بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا شاہ جی! کہ

بھائیوں سے اپنے حصے کی بات کروں گا لیکن درپردہ ایک اور سازش چل رہی تھی۔''

شاہ زیب نے مختصر ترین الفاظ میں الیاس خاں اور جبار خاں' انور کی موت اور اس کے بعد کی تمام باتیں' اپنے عشق کی داستان' ساری کی ساری تفصیل مکرم شاہ کو سنا دی اور مکرم شاہ آنکھیں بند کیے سنتا رہا۔ شاہ زیب خاموش ہوا تب بھی مکرم شاہ دیر تک کچھ نہیں بولا۔ بہت دیر کی خاموشی کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور کہا۔

''تو اب دل میں یہ فیصلہ کر کہ تجھے کرنا کیا ہے۔''

''فیصلہ میں کر چکا ہوں شاہ جی! اب زندگی کے دو مقصد بنا لیے ہیں میں نے۔ پہلے میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا۔''

''وہ دو مقصد کیا ہیں؟''

''اس زمین پر کبھی آتش کدہ نہیں بننے دوں گا۔ میں اپنی ماں کی روح کو جلانا نہیں چاہتا اور لجیا میری زندگی میں شامل ہوگئی ہے۔ بڑی معصومیت سے اس نے کہا تھا کہ شاہو! مجھ سے شادی کرلے۔ میرے ماں باپ کے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔ تیری بیوی بن جاؤں گی تو تجھے بھی سکھ ہوگا مجھے بھی اور میرے ماں باپ کو بھی۔ شاہ جی! اس وقت دل میں یہی خیال تھا کہ ایک طرف پولیس پیچھے پڑی ہوئی ہے اور دوسری طرف الیاس خاں اور جبار خاں کے آدمی۔ اس کے علاوہ پتہ نہیں اور کتنے دشمن ساتھ ہوں گے۔ کیا کروں گا اس جوان لڑکی کو اپنے جال میں پھانس کر۔ پر شاہ جی یہ امید نہیں تھی کہ شہاب الدین زندہ بچ جائے گا اور لجیا کو اس کی وحشت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اب تو شاہ جی صرف یہی خیال ہے کہ لجیا کو تلاش کروں۔ مکرم شاہ نے ایک عجیب سے انداز میں شاہ زیب کو دیکھا اور بولا۔

''طریقہ سوچا کوئی؟''

''شاہ جی! کوئی طریقہ نہیں ہے میرے پاس' بس شہاب الدین کی تاک میں ہوں۔

اس کے آدمیوں سے تو لجیا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔''

''ٹھیک ہے۔ دیکھ بیٹا! میں نے تجھ سے پہلے بھی کہا تھا کہ بزدل دوستیاں کرتے ہیں اور دلیر دشمنیاں۔ اپنے ارد گرد دشمنوں کا کھیت دیکھ کر دل کو جو خوشی حاصل ہوتی ہے اس کا کوئی جواب ہی نہیں۔ یہ میں اپنی بات کر رہا ہوں۔ تیرے دل میں عشق کی آگ ہے۔ اس لیے تیرا دل اتنا سنگلاخ نہیں ہو سکتا۔ تو مجھ پر یقین کرلے کہ میرا جو کردار بن گیا ہے وہی ہے۔ میں اپنے ان دشمنوں سے کھیلتا ہوں کہ اب وہ پست ہو گئے ہیں اور صرف مجھ سے فرار حاصل کر رہے ہیں۔ میں انہیں ہلاک کر دیتا ہوں۔ معاف کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دشمنی تو دشمنی ہوتی ہے سمجھ رہا ہے نا۔ میں دشمنوں کی فصلیں کاٹتا رہتا ہوں اور نئے دشمن بوتا رہتا ہوں۔ کیونکہ اس دنیا نے مجھے دشمنی ہی دی ہے دوستی نہیں۔ شاہ زیب عجیب سی نگاہوں سے مکرم شاہ کو دیکھتا رہا۔ مکرم شاہ کچھ لمحے تو خاموش رہا اور پھر بولا۔

''تیرے دشمن ابھی طاقتور ہیں اور تجھ سے جنگ کر رہے ہیں۔ دیکھ جہاں بھی ضرورت پیش آئے دشمنی کی فصل کاٹتا رہ۔ تعداد اتنی ہونی چاہیے جتنی تو برداشت کر سکے۔ اب اگر بہت سے تیرے پیچھے لگ گئے تو تیرے لیے تو مشکل ہو جائے گی نا اور جہاں تک اس لڑکی کا تعلق ہے ایسا کر اسے تلاش کر۔ اسے حاصل کر اور جب وہ تجھے مل جائے تو اسے کوئی ایسی جگہ رہنے کے لیے دے دے جہاں تیرے دشمنوں کی نگاہ نہ پہنچے۔ اپنا کھیل کھیلتا رہ۔ موت سے ایک گھنٹے پہلے بھی جب تجھے یہ احساس ہو جائے کہ تو موت کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اس کے پاس پہنچ جانا۔ اس سے نکاح کر کے اسے سینے سے لگا لینا۔ بس زندگی کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ اسے تو اتنا دے ہی چکا ہوگا کہ وہ عیش کر سکے۔ جہاں تک باقی باتوں کا تعلق ہے تو سن بیٹا! ڈاکو بن جانا معمولی سی بات ہے۔ ہر بندہ یہی کام کر لیتا ہے۔ ایک بندوق اٹھائی' ایک گھوڑا لیا۔ کچھ بندے ساتھ لیے بستیوں میں ڈاکے ڈالے --- نہ نہ

نہ۔۔۔دوسرے بندوں کو تنگ کرنا غلط بات ہے۔ مرد وہی ہے جو صرف دشمن کے منہ میں ہاتھ ڈالے۔ سمجھ رہا ہے نا تو۔ تو جو تیرے دشمن ہیں ان سے رقمیں وصول کر، کچھ بندوں کو ساتھ ملانا ضروری ہے۔ اکیلے دنیا کا ہر کام نہیں ہوتا۔ ایسے بندے ہونے چاہئیں جو تیرے لیے دوسرے کام کر سکیں۔ سمجھ رہا ہے نا میری بات۔"

"ہاں شاہ جی! سمجھ رہا ہوں۔"

"اچھا۔ ویسے تجھے ایک بات بتاؤں۔ یہ ڈاک بنگلہ تجھے کیسا لگا؟"

"شاہ جی! اچھی جگہ ہے۔ ایسی جگہ ہے کہ بندہ یہاں چھوٹا موٹا کام کر سکتا ہے۔"

"ماجھے! کو جانتا ہے نا۔"

"چوکیدار۔"

"ہاں۔ میرا آدمی ہے۔" مکرم شاہ نے کہا اور شاہ زیب چونک پڑا۔

"آپ کا آدمی۔"

"ہاں۔ میرا بندہ ہے۔ میں نے اسے یہاں رکھوایا ہے۔ اپنے تعلقات سے کام لے کر۔ وہ اتنا وفادار ہے کہ ایک اشارہ کرو۔ اپنے ہاتھ سے گردن کاٹ کر پیروں میں ڈال دے گا۔ یہاں کبھی کبھار ہی کوئی آ جاتا ہے۔ ورنہ تو یہ سمجھ لے کہ یہ ڈاک بنگلہ میں نے قائم کر رکھا ہے۔ ماجھے کو سرکار سے نہیں مجھ سے تنخواہ ملتی ہے۔ ضرورت کی ساری چیزیں مجھ سے حاصل ہوتی ہیں۔ تھوڑے فاصلے پر بستی کھڈیاں ہیں۔ کھڈیاں جا کر وہ ضروریات کی ساری چیزیں خرید لاتا ہے۔ پیسہ بھی وہیں سے اسے مل جاتا ہے۔ میں نے اس کے لیے ایک ٹھکانا بنا دیا ہے۔ میں جب بھی ادھر آتا ہوں۔ خود ڈاک بنگلے میں نہیں ٹھہرتا بلکہ کچھ فاصلے پر ڈیرہ جماتا ہوں جیسے اس وقت۔ اس کی بھی کچھ وجوہات ہیں۔ سمجھ رہا ہے نا تو۔ بات وہی دشمنوں کی ہے۔ دشمن اگر اس ڈاک بنگلے کا پتہ لگا بھی لیتے ہیں تو ڈاک بنگلے میں انہیں کچھ بھی نہیں

ملے گا۔ ماجھے سے جا کر پوچھ میرا نام و نشان کیا میری ہوا کا بھی پتہ نہیں دے گا تجھے۔ بس پالیسی ہوتی ہے، یہی پالیسیاں دشمنوں کے درمیان کھیلنے کا موقع دیتی ہیں۔ ابھی میں تیرے ساتھ جا کر ماجھے سے تیرا تعارف کرا دیتا ہوں اور کہہ دیتا ہوں کہ یہ میرا بچہ ہے۔ میرا بندہ ہے۔ جب بھی کبھی اسے کوئی مشکل پیش آئے اس کی بھرپور مدد کی جائے۔ سمجھ رہا ہے نا۔

"جی شاہ جی۔"

"تو بول اب کیا ارادہ ہے؟"

"شاہ جی! بس کوشش کرتا رہوں گا کہ آپ نے جو نصیحتیں کی ہیں وہ واقعی میرے لیے مشعل راہ ہوں گی۔ میں وہی کروں گا شاہ جی! جو آپ نے بتایا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اس وقت تیرا مسئلہ زمینوں کا ہے۔ فخر خان نے تجھ سے زمینوں کے لیے تحفظ کی بات کی ہے۔ کسی پر بھروسہ نہ کر۔ یہ سارے کے سارے اپنے مقصد کے غلام ہوتے ہیں۔ بڑے جال پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں انہوں نے۔ لیکن جب اپنے ہی جالوں میں پھنستے ہیں تو پھر کونے کھدروں میں منہ چھپائے اپنے مددگاروں کو تلاش کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے ان سے رابطے ضرور رکھ۔ کبھی کبھی ان سے کام بھی نکل آتے ہیں۔ لیکن اپنے طور پر جو کچھ کرتا ہے کرتا رہ۔ زمین پر جب بھی بھٹہ قائم ہو تجھے وہاں خونریزی کرنی ہوگی۔ میں کچھ بندوں کو تیرے لیے مخصوص کر دوں گا۔ میری تیری محبت ہوگئی ہے نا۔ حالانکہ میں تجھے بتا چکا ہوں کہ مجھے دوستوں سے زیادہ دشمن پسند ہیں لیکن تو نے عقیدت کے جس رشتے کی بات کی ہے بس اس نے مجھے الو بنا دیا ہے۔ میرے بندے تجھے مختلف اطلاعات دیتے رہیں گے۔ نشان ان کا یہ ہوگا کہ وہ تجھے ایک لفظ کہیں گے اور وہ لفظ یہ ہوگا "صبح قریب ہے" تو سمجھ لینا وہ میرا بندہ ہے۔ جو بھی اطلاع وہ تجھے دیں، تو اسے صحیح سمجھنا۔ اس کے علاوہ میں تجھے بتاؤں میرا ایک بہت ہی گہرا یار ہے۔ ہنسی آئے گی تجھے میرے منہ سے یہ الفاظ سن کر مگر

تو سن لے چیز ہی ایسی ہے۔ میں نے اسے جیل میں بند کر رکھا ہے۔ کیونکہ اس نے کچھ ایسے لوگوں سے دشمنی مول لے لی تھی جو کسی بھی وقت اس پر حاوی آ سکتے تھے۔ بہت بڑا نام ہے ان لوگوں کا۔ میں نے ان میں سے پانچ مار دیئے ہیں دو باقی رہ گئے ہیں۔ آج کل انہی پر کام کر رہا ہوں۔ جب ان دونوں کا بھی صفایا کر دوں گا تو اسے جیل سے نکال لوں گا بڑا جذباتی ہے اور بڑی دلچسپ چیز ہے۔ ملے گا تو پتہ چلے گا تجھے۔ بس یوں سمجھ لے کر اس کائنات میں وہی ہے جس پر واقعی میری جان جاتی ہے۔ ورنہ ساری دنیا سے میری دشمنی چلتی ہے۔ ایسا کرنا اس سے مل لینا۔ پتہ چل جائے گا تجھے کہ کب وہ جیل سے باہر آتا ہے۔''

''تو پھر ایک کام کریں آپ شاہ جی!''

''ان دو بندوں کی موت تیرے ہاتھوں میں دے دوں یہی کہنا چاہتا ہے نا تو دوسرا جملہ---''

''ہاں شاہ جی! میری طرف سے آپ کو بھی تو کوئی تحفہ ملنا چاہیے۔''

''پاگل ہے۔ بالکل ہی باؤلا ہے رے تو--- کہہ چکا ہوں تجھ سے کہ مجھے دشمنی میں جو مزہ آتا ہے دوستی میں نہیں---ارے پانچ مارے ہیں ان کے بندے دو باقی رہ گئے ہیں سسرے---منہ چھپائے چھپائے پھر رہے ہیں۔ میں ذرا ان کا کھیل ختم کر لوں۔ اس کے بعد جہانگیر کو تو نکال لوں گا۔ اس کا اپنا کھیل ہے۔ بندے ہیں اس کے ساتھ۔ اپنا اڈا چلاتا ہے پورے کا پورا۔ پر میں نے کہا نا جذباتی ہے۔ ان لوگوں کو جو اس کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ غیر ملکیوں کا سہارا حاصل ہے۔ ایک بہت بڑے ملک کا محکمہ جاسوسی ان کا ساتھ دیتا ہے۔ جبکہ ہمارا جہانگیر ذرا دوسری قسم کا بندہ ہے۔ سمجھ رہے ہو نا تم۔ تو ایسی صورت میں ہم ان کو ان کے ہاتھوں میں نہیں چھوڑ سکتے۔ جہانگیر سسرے کو تو پتہ بھی نہیں ہے کہ میں نے اسے قید کرایا ہے۔ بس ایسا ہی ایک چکر تھا۔ چل چھوڑ ان باتوں کو تو ایسا کرنا موقع ملنے پر جہانگیر

سے مل لینا۔ بڑے کام آئے گا تیرے۔ تجھے ایک ایسا ساتھی مل جائے گا۔ بس تو اس کے ساتھ کھیلنا جیسے تیرا دل چاہے۔ سمجھ رہا ہے نا!''

شاہ زیب نے پرخیال انداز میں گردن ہلا دی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔

''جہانگیر کونسی جیل میں ہے؟''

''کوٹ لکھپت والی جیل میں۔ مگر زیادہ عرصے نہیں رہے گا۔ مہینے دو مہینے کی بات ہے اور ہو سکتا ہے اگر میرا کام جلدی ہو جائے تو میں اسے جلدی نکال لاؤں۔ تجھ تک اس کی اطلاع پہنچ جائے گی۔ جہاں بھی تو ہو گا اس کی پرواہ مت کر---اچھا اب تو ایک کام کر--- کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ کدھر جا رہا ہے؟''

''ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے شاہ جی!''

''سن میری بات سن۔ چار چھ دن کے لیے اپنے آپ کو بالکل گم کر دے۔ اگر مناسب سمجھ تو یہیں اس ڈاک بنگلے میں رہ۔ ماجھے کو تیرے پاس کر دیتا ہوں۔ ہر طرح سے مدد کرے گا تیری۔ کیا سمجھا---ارے پیسے کی تو بالکل پرواہ مت کریو---یہاں رہ--- کوئی چھ سات دن کے بعد خاموشی سے ادھر نکل جا---میرا مطلب ہے چوہدری شہاب الدین کی طرف‘ نگرانی کر اس کی‘ اس کی حویلی میں گھسنے کی کوشش مت کرنا۔ وہ بیوقوفی ہو گی۔ کوئی ایسا بندہ ملے تجھے اس کا جسے تو اٹھا کر اپنے ساتھ لا سکے تو اسے اٹھا لانا۔ ادھر ہی لے آنا اور پھر تو چوہدری سے مذاکرات کر سکتا ہے۔ کیا سمجھا؟''

شاہ زیب کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے روشنی آ گئی تھی واقعی یہ ترکیب تو بڑی اچھی بتائی تھی اس شخص نے۔

''تیرے لیے سارے انتظامات میں کر دوں گا۔ ابھی ذرا چار چھ دن یہیں آرام کر۔

آ جا میرے ساتھ ---ماجھے سے تیری بات کرا دیتا ہوں۔'' ماجھا اندر سے اتنا گہرا نکلے گا اس کا شاہ زیب کو ذرا بھی احساس نہیں تھا لیکن مکرم شاہ نے ماجھے سے کہا۔

''ماجھے! یہ میرا خاص آدمی ہے--- سمجھ رہا ہے تو--- جو کچھ یہ تجھ سے کہے آنکھیں بند کر کے اس پر عمل کرنا ہے۔ جس طرح تو میری بات پر کرتا ہے۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ کہوں تجھ سے۔''

''نہیں شاہ جی کافی ہے۔''

''ہفتہ بھر رہے گا تیرے پاس۔ جس چیز کی کمی ہو بستی جا کر خرید لانا۔ خوب خاطر مدارت خدمت کرنا اس کی۔ اچھا شاہ زیب میں چلتا ہوں۔''

''شاہ جی! آپ---''

''ہاں ہاں--- بس میں ایسا ہی سیلانی آدمی ہوں۔ چل پڑا تو چل پڑا۔ رک گیا تو رک گیا۔ کیا سمجھا۔'' مکرم شاہ نے ہنس کر کہا۔

''ٹھیک ہے شاہ جی!''

''بس بس--- باہر نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہاں سے اپنا سامان اٹھاؤں گا اور چلا جاؤں گا۔'' مکرم شاہ نے اس وقت شاہ زیب کو روک دیا جب شاہ زیب اس کے ساتھ قدم آگے بڑھا رہا تھا۔

شاہ زیب اسے دیکھتا رہ گیا- ماجھا بھی اس کے پاس کھڑا تھا۔ چند لمحوں کے بعد مکرم شاہ ڈاک بنگلے کے سامنے والے حصے میں تاریکی میں گم ہو گیا۔ بالکل کھلی آوارہ روح کی مانند ایسا گیا جیسے وہ فضاؤں میں تحلیل ہو گیا ہو۔

قاتل پرچھائیاں
ایم اے راحت
حصہ سوم
پتھر کا مسیحا
ایم اے راحت
خزینہ علم و ادب
الکریم مارکیٹ اردو بازار - لاہور
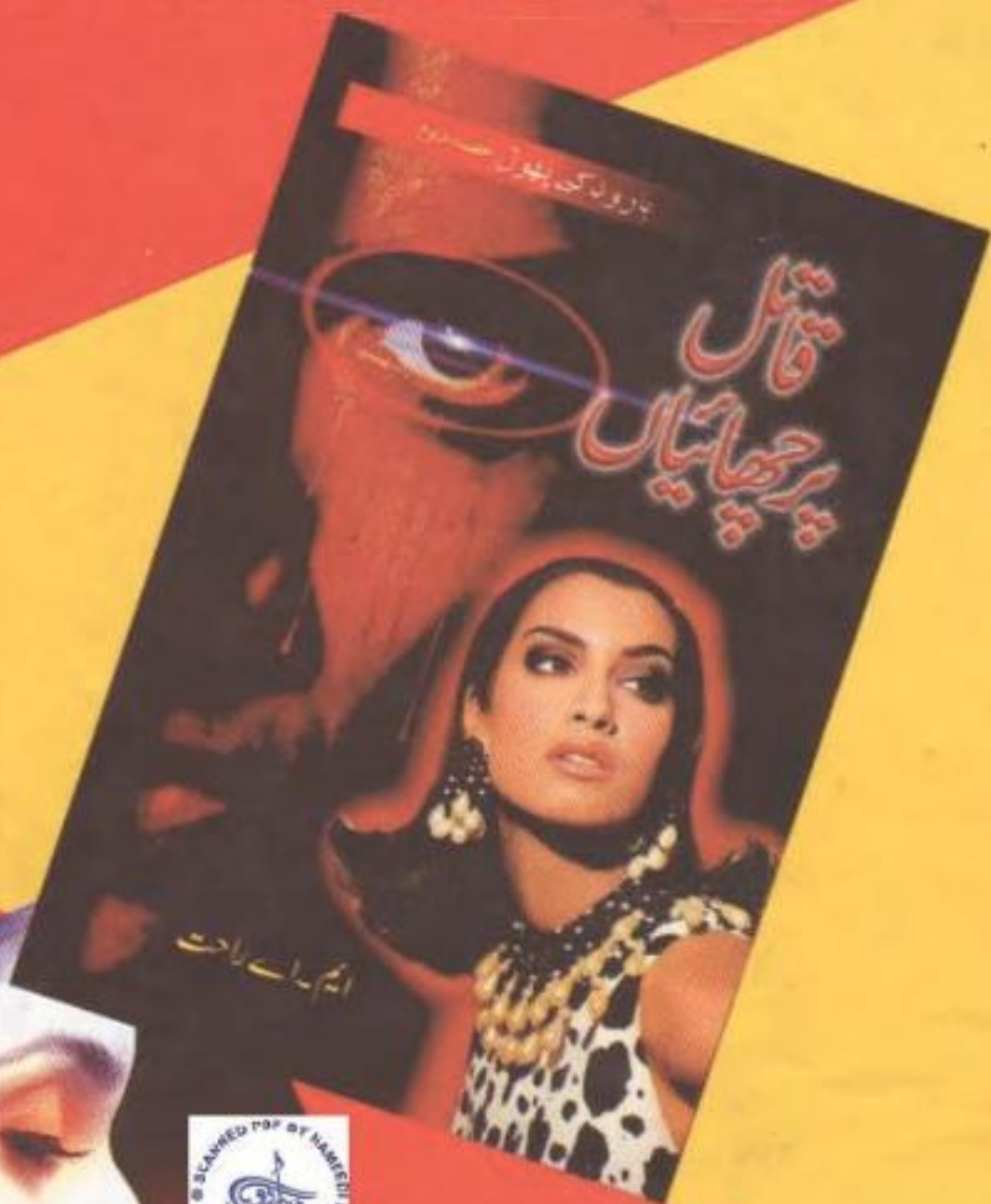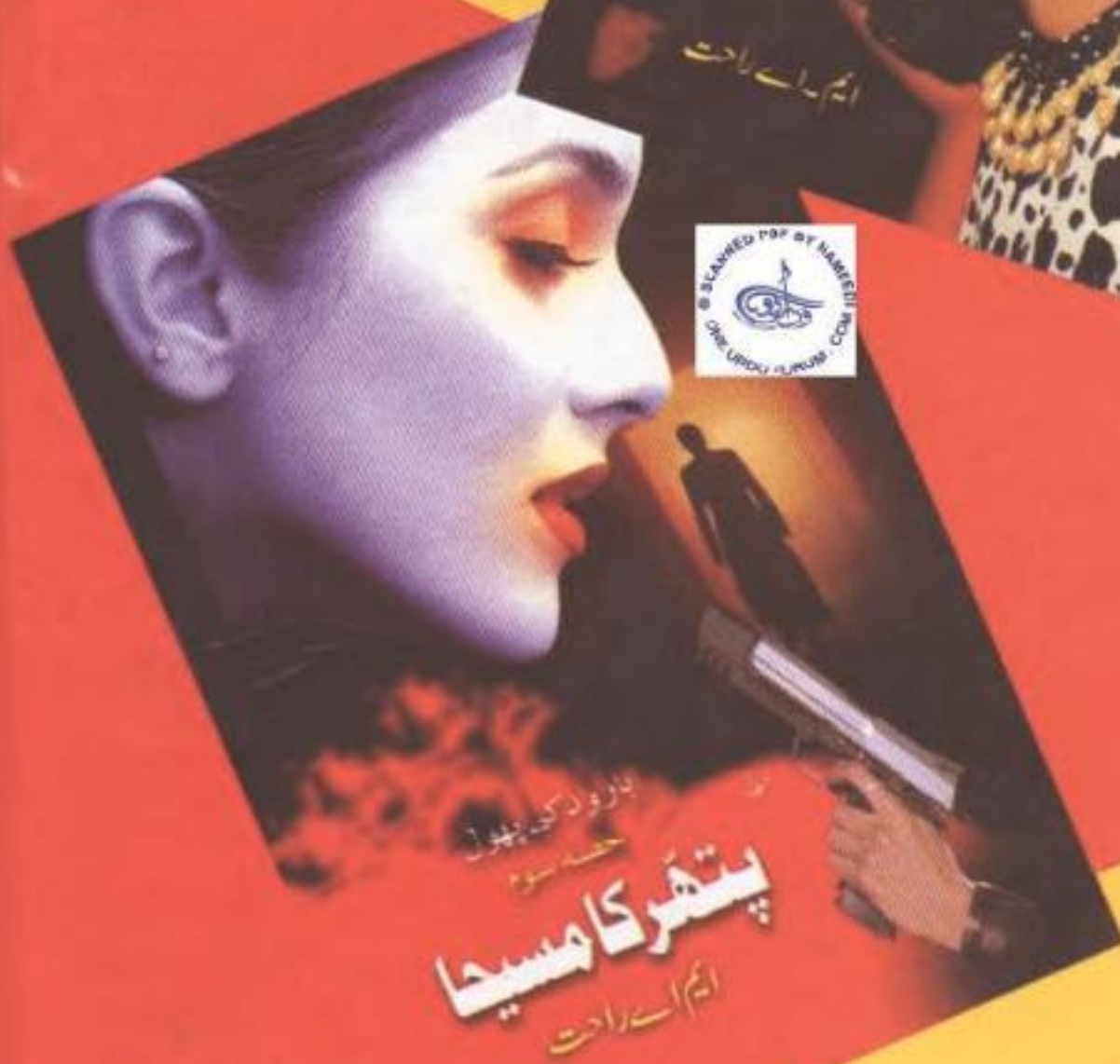
بارود کے پھول حصہ دوم
قاتل
پرچھائیاں
ایم۔ اے راحت

ہم کہ چہرے پہ نہ لائے کبھی ویرانی کو
کیا یہ کافی نہیں ظالم تری حیرانی کو

کارِ فرہاد سے یہ کم تو نہیں جو ہم نے
آنکھ سے دل کی طرف موڑ دیا پانی کو

دامنِ چشم میں تارا ہے نہ جگنو کوئی
دیکھ اے دوست مری بے سروسامانی کو

تو رُکے یا نہ رُکے فیصلہ تجھ پر چھوڑا
دل نے در کھول دیے ہیں تری آسانی کو

سعداللہ شاہ
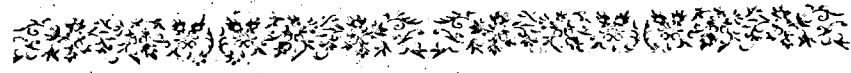
فاضل باجوہ کے ذہن پر ایک عجیب سا تاثر قائم تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شاہ زیب اچانک کہاں غائب ہو گیا۔ حالانکہ دونوں ایک لمبے منصوبے کے تحت باہر نکلے تھے اور سیدھا انہیں فخر خان کے پاس جانا تھا لیکن شاہ زیب کی درمیان میں گمشدگی اس کے لیے بڑی تعجب خیز تھی۔

بہرحال وہ اسے تلاش کرتا رہا جتنا ممکن ہو سکا لیکن شاہ زیب کا کہیں نشان نہیں مل سکا تھا۔ اب فاضل باجوہ کے لیے یہ فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہو رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ بہت غور کرتا رہا۔ آخر میں یہ فیصلہ کیا کہ خود ہی فخر خان کے پاس پہنچ جائے۔ اپنے لیے اس نے ایک کہانی تیار کر لی تھی۔ جہاں تک ان دستاویزات کا تعلق تھا تو اس سلسلے میں فاضل باجوہ کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ دستاویزات درحقیقت اس کے علم میں تھیں لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر حیدر شاہ کے چکر سے نکلا تو فخر خان کے عذاب کا شکار ہو جائے گا۔ کوئی صحیح فیصلہ کرنا اس وقت دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔

بہرحال وہ فخر خان کی جانب ہی چل پڑا۔ زخموں سے چور تھا۔ حیدر شاہ اس کی کافی مرمت کر چکا تھا۔ حالت کافی خراب ہو گئی تھی۔ فخر خان کی حویلی میں داخل ہوا تو سارے شناساؤں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ حویلی ہی میں اپنی رہائش گاہ تک جا پہنچا۔

اس کی بیوی بچے وہیں ایک گوشے میں رہا کرتے تھے اور یہ ایک بڑا سنگین مسئلہ

تھا۔ جس کا کوئی حل ابھی فاضل کے پاس نہیں تھا۔ فخر خان اس وقت حویلی میں موجود نہیں تھا چنانچہ وہ اس کا انتظار کرنے لگا۔ گھر میں داخل ہوا تو بیوی اور بچے اسے دیکھ کر زار و قطار رونے لگے۔ انہیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ فاضل کسی مشکل میں گرفتار ہو چکا ہے۔ دو تین بار فاضل باجوہ کی بیوی نے فخر خان تک رسائی حاصل کی تھی اور بڑی عاجزی سے کہا تھا۔

''خان جی! کچھ پتہ چل سکتا ہے کہ وہ گئے کہاں ہیں؟''

''جہاں بھی گیا ہے واپس آ جائے گا تم لوگ فکر مت کرو۔''

''مگر خان جی! اس سے پہلے کبھی وہ بغیر بتائے گھر سے اتنے دن تک غائب نہیں رہے۔''

''تو میں کیا کروں؟'' فخر خان نے کہا۔

''نہیں خان جی! آپ بس ہمیں یہ اطمینان دلا دیں کہ انہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچا ہے۔''

''ارے بابا! وہ اپنی مرضی سے کہیں چلا گیا ہے۔ مجھے کیا معلوم؟ نقصان پہنچ گیا ہے تو میں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔ واپس آ جائے گا تو تمہارے پاس ہی پہنچے گا۔ تم لوگوں کو روٹی مل رہی ہے' رہنے کے لیے جگہ موجود ہے اور جو کچھ چاہئے بتاؤ---اس کے علاوہ اگر فضول باتیں کرو گی تو بلاوجہ میرا دماغ ہی خراب کرو گی۔ میں کیا کر سکتا ہوں اس سلسلے میں۔ اگر کوئی بندہ ادھر سے چلا جائے مجھے بتائے بغیر اور اس کی واپسی نہ ہو۔''

فخر خان کو خود بھی اس بات کی امید نہیں تھی کہ حیدر شاہ کے چنگل میں پھنسنے کے بعد فاضل باجوہ وہاں سے نکل سکتا ہے۔ کچھ ایسے ہی معاملات تھے ان دونوں کے۔ حیدر شاہ کے بارے میں بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کس طرح کا انسان ہے۔

بہرحال فاضل باجوہ گھر پہنچ گیا تھا۔ بیوی بچے خوش ہو گئے تھے۔ اب ظاہر ہے انہیں ساری تفصیل تو نہیں بتائی جا سکتی تھی۔ وہ فخر خان کا انتظار کرنے لگا۔ بڑی شدید کشمکش کا شکار تھا۔ جو کچھ کرنا تھا اسے بڑے غور و خوض کے ساتھ کرنا تھا۔ فخر خان تین دن کے بعد واپس آیا اور فاضل باجوہ اس کے سامنے پہنچ گیا۔ فاضل کو دیکھ کر فخر خان حیرت سے اچھل پڑا تھا۔

''ارے فاضل تم آ گئے۔''

''خان جی! مجھے تو آئے ہوئے کئی دن ہو گئے۔''

''اوہو...... اوہو کیا اس کی موت کے بعد تم وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو سکے؟'' فخر خان نے کسی قدر مسرور لہجے میں کہا۔

''نہیں خان جی! بس آپ یہ سمجھ لو کہ ایک فرشتہ مل گیا تھا مجھے اور اسی نے شاید حیدر شاہ کو مارا ہے۔ مجھے یہی اطلاع دی تھی اس نے۔''

''میرا اپنا بندہ تھا۔ ارے تم کیا سمجھتے ہو باجوہ! مجھ سے بڑا جوہری پورے پنجاب میں ایک بھی نہیں ہوگا۔ ہیروں کی جو پہچان مجھے ہے کسی اور کو نہیں ہو سکتی۔ چلو چلو...... چھوڑو...... تم بتاؤ...... تمہیں رہائی کیسے ملی؟''

''شاہ جی! آپ کو معلوم تھا کہ میں اس کے قبضے میں ہوں۔''

''بہت بعد میں معلوم ہوا تم کیا سمجھتے ہو باجوہ! ہم چوہدریوں کے ڈیروں پر ایک دوسرے کے مخبر ضرور ہوا کرتے ہیں۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ حیدر شاہ کا کوئی مخبر میری حویلی میں ضرور موجود ہوگا۔ کوئی ملازم' کوئی بھی بندہ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے اسے تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے لیکن تلاش نہیں کر سکا۔ اس سلسلے میں دو بندے میرے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔''

''مارے گئے ہیں؟''

''ہاں' ہاں ... تفصیل مت پوچھو...... بس یہ سمجھ لو کہ مجھے شبہ ہوا تھا کہ وہ کسی چوہدری کے مخبر ہیں۔ کچھ ایسی حرکتیں دیکھی تھیں ان کی۔ میں نے ان سے پوچھا۔ پوچھ گچھ کے دوران وہ مر گئے۔ اب اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ میری حویلی میں حیدر شاہ کا کوئی بندہ ہے یا نہیں لیکن میرا بندہ حیدر شاہ کی حویلی میں ضرور موجود ہے۔'' فاضل باجوہ کے بدن میں ایک لمحے کے لیے کپکپی دوڑ گئی تھی لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا پھر بولا۔

''شاہ جی! وہ بندہ کون تھا جس نے حیدر شاہ کو مارا ہے؟''

''وہ بندہ ..... تم نے کبیروالا کے جہانزیب اور اورنگزیب کا نام سنا ہے؟''

''ہاں خان جی! یہ بھی زمیندار ہیں نا!''

''ہاں۔ انہیں کا تیسرا بھائی ہے۔ اصل میں الیاس خاں اور جبار خاں سے اس کی دشمنی چل گئی ہے۔ وہی بھٹے والے سلسلے میں عجیب الجھاؤ کا کیس تھا۔ وہ کسی طرح مجھ تک پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ بندہ کام کا ہے اور میرے بھی کام آ سکتا ہے۔ بس میں نے اس سے سودا کر لیا۔ اسے حیدر شاہ کے راستے پر لگا دیا اور وہاں بھیج دیا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تم سے اس کی ملاقات کیسے ہوئی؟''

''خان جی! پہلی بار تو وہ حیدر شاہ کے ساتھ اس تہہ خانے میں آیا تھا جہاں حیدر شاہ نے مجھے باندھ رکھا تھا۔ خان جی پاگل پن کی ایکٹنگ کر کے میں نے اتنے عرصے اپنی زندگی بچائی ہے۔ وہ مجھ سے دستاویزات کے بارے میں ہی پوچھتا رہا تھا۔''

''پھر...''

''اس کے بعد اس بندے نے کسی طرح چالاکی سے یہ بات بھانپ لی کہ میں

آپ کا کارندہ ہوں۔ میری ذمے داری سنبھال لی اس نے مجھ سے باتیں کیں تو میں نے اسے ساری تفصیل بتائی۔ تب اس نے کہا کہ موقع ملتے ہی وہ حیدر شاہ کی چھٹی کرنے والا ہے۔ میں نکلنے کے لیے تیار رہوں اور خان جی آخر کار اس مرد کے بچے نے ایسا ہی کر ڈالا۔ اس نے حیدر شاہ پر وار کر کے اسے ہلاک کر دیا اور مجھے کھول کر حویلی سے باہر نکل آیا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ آ رہے تھے کہ راستے میں اچانک وہ غائب ہو گیا۔ بس یہاں سے خان جی مجھے پتہ نہیں چلا اس بارے میں۔ اب آپ یہ بتا رہے ہیں تو آپ جلدی سے مجھے بتایئے کہ کیا وہ واپس آ گیا ہے۔ اصل میں بندہ اتنا اچھا تھا ایک تو لڑکا جیسا پھر اس کے اپنے حالات۔ خان جی! مجھے اس سے ہمدردی ہے۔''

''واپس نہیں آیا وہ مجھے نہیں معلوم اس کے بارے میں لیکن ایک بات میں تمہیں بتائے دیتا ہوں ایسا نہیں ہے کہ آسانی سے کسی کے قابو میں آ جائے گا۔ اگر کسی چکر میں پھنس بھی گیا ہے تو نکل جائے گا وہاں سے۔''

''ہو سکتا ہے خان جی! ایسا ہی ہو۔'' فاضل باجوہ نے کہا لیکن وہ خود تھوڑا سا فکرمند ہو گیا تھا کیونکہ بہرحال حیدر شاہ سے جو معاہدہ ان لوگوں کا ہوا تھا۔ اس کے تحت صرف فاضل باجوہ ہی کو نہیں بلکہ شاہ زیب کو بھی یہاں رہ کر کارروائی کرنا تھی۔ دستاویزات کا حصول جس کے بارے میں اصولی طور پر طے کیا گیا تھا کہ وہ حیدر شاہ ہی کی ملکیت ہیں اور اس کے بعد یہاں سے بیوی بچوں کے ساتھ فرار اس سلسلے میں اس کا بہترین معاون کار شاہ زیب ہی ہو سکتا ہے اور اب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہاں معمول کے مطابق رہ کر شاہ زیب کی واپسی کا انتظار کیا جائے۔

☆☆☆

ماجھے کے بارے میں بڑے انکشافات ہو رہے تھے۔ بظاہر وہ سیدھا سادھا نظر

آنے والا نوجوان رفتہ رفتہ کھل رہا تھا۔ بڑی باتیں بتائی تھیں اس نے اس کی اپنی بھی ایک کہانی تھی اور شاہ زیب کو احساس ہو رہا تھا کہ ہر وجود کی اپنی داستان ہے۔ بہت سے چہرے لمحوں میں نظرانداز کر دیئے جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ نظرانداز کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ ان کی اپنی لاتعداد داستانیں ہوتی ہیں۔ سات آٹھ دن گزر گئے اور آٹھویں دن شام کو ایک گھوڑے سوار ان کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ کچھ سامان تھا۔ ماجھے شاید اس شخص کو جانتا تھا۔ اس سے تو باتیں ہوتی رہیں لیکن جب وہ شاہ زیب کے پاس پہنچا تو اس نے وہی کوڈ دہرایا کہنے لگا۔

"صبح قریب ہے صاحب جی!"

"کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں بڑے شاہ جی نے یہ گھوڑا اور سامان آپ کے لیے بھجوایا ہے۔ یہ نئی رائفل ہے اور یہ اس کا میگزین' شاہ جی نے پوچھا ہے کہ ریوالور تو آپ کے پاس وجود ہے نا۔ میگزین کتنا ہے ان کا' آپ کو اب اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ شاہ جی کو میرا سلام کہہ دینا اور کہہ دینا کہ شاہ زیب ان کا ہمیشہ تابعدار رہے گا۔ وہ شخص گھوڑا وغیرہ چھوڑ کر چلا گیا اور شاہ زیب کے دل و دماغ پر ایک عجیب سا تاثر چھوڑ گیا۔ مکرم شاہ اور حیدر شاہ کے بارے میں وہ مسلسل سوچتا رہا تھا۔

بہرحال یہ بات طے ہوگئی تھی کہ دونوں کے درمیان کوئی رابطہ ضرور تھا۔ فطرت میں بھی تھوڑی سی تبدیلی تھی۔ مکرم شاہ ایک عجیب و غریب شخصیت تھی۔ ویسے حیدر شاہ کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا تھا لیکن بہرحال دونوں ہی اس کے لیے بہتر رہے تھے۔ تمام تیاریاں مکمل کرنے کے بعد آخر کار وہ گھوڑے پر سوار ہو کر چل پڑا۔ ایک سنگین مسئلہ درپیش تھا۔ کوٹ آدم کے علاقے میں داخل ہونے کے بعد شہاب الدین کی حویلی میں

یہی معلومات حاصل کرنا۔ جس سے مکرم شاہ کے کہنے کے مطابق کوئی کام بن سکے ایک مشکل امر تھا لیکن بہرحال یہ کام سرانجام دینا ہی تھا۔

جب وہ اس علاقے میں پہنچا تو ایک بار پھر لجیا کی یاد اس کے دل میں کسکنے لگی۔ لیکن اس کے بعد اس نے اپنی اس کسک کو دور کر لیا۔ لجیا کے حصول کے لیے وہ کرنا ہے جو بہرحال انتہائی مجرمانہ عمل ہوگا اور یہ سب کچھ آسان بھی نہیں تھا۔ دو دن تک اسے انتظار کرنا پڑا۔ تیسرے دن اس نے حویلی سے ایک جیپ باہر نکلتے ہوئے دیکھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس جیپ سے اسے عورتوں کی جھلکیاں نظر آئیں تھیں۔ حویلی سے نکلنے والی کوئی عورت اگر ہاتھ لگ جائے تو شہاب الدین کو اس کے ذریعے مجبور کیا جا سکتا ہے اور اس کے بعد شاہ زیب نے اپنے آپ کو تیار کر لیا۔ زندگی کا ایک مشکل مرحلہ درپیش تھا اور اسے پوری مہارت کے ساتھ وہ کام کرنا تھا جس نے اس کا بیڑا اٹھایا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے کو دور لے گیا اور کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد جب جیپ آبادی سے باہر نکل گئی تو اس نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ دل کی دھڑکنیں عروج پر تھیں اور وہ ایسی کسی جگہ کا تعین کر رہا تھا جہاں سے اس جیپ تک پہنچا جا سکے۔ بات آسان نہیں تھی۔ جان جوکھوں کا کام تھا لیکن جان جوکھوں کے بغیر لجیا کا حصول کس طرح ممکن تھا۔

☆☆☆

شاہ زیب کا گھوڑا جیپ کا تعاقب کر رہا تھا۔ طریقہ اس نے ایسا رکھا تھا کہ جیپ والوں کو شبہ نہ ہونے پائے اور وہ یہی سمجھیں کہ کوئی گھوڑا سوار ان سے ہٹ کر اپنی منزل کی طرف جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ شاہ زیب اس جگہ سے فاصلہ بھی زیادہ کر لینا چاہتا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ ذرا یہ اندازہ ہو جائے کہ جیپ میں کتنے لوگ موجود ہیں اور ان سے نمٹنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔ یہ تمام باتیں شاہ زیب کے ذہن میں تھیں اور وہ بڑی

ذہانت سے صورتحال کا جائزہ لے رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اندازہ بھی لگاتا جا رہا تھا کہ جیپ پر کیسے قابو پایا جاسکتا ہے۔

بہرحال کوئی ایسا عمل تو کرنا نہیں تھا جو بعد میں اس کے لیے مشکلات پیدا کرے۔ شہاب الدین کی حویلی سے برآمد ہونے والی یہ خواتین یقینی طور پر اس کے لیے ایک اچھا ذریعہ ثابت ہوسکتی ہیں۔ غرض یہ کہ شاہ زیب اس جیپ کا پیچھا کرتا رہا تھا۔ اس وقت وہ ایک ایسے علاقے سے گزر رہا تھا جہاں کسی زمیندار نے کینوں کے باغات لگائے تھے۔ ہرا بھرا کھیت بہت دور تک پھیلا چلا گیا تھا اور سرسبز و شاداب زمین پر اگے ہوئے درختوں میں نارنجی رنگ کے کینوں عجیب بہار دکھا رہے تھے۔ آسمان پر بھی بادلوں کے ٹکڑے آ گئے تھے اور روشنی کم ہوگئی تھی۔

جیپ اس وقت سڑک پر ان باغات کے ساتھ ساتھ گزر رہی تھی اور علاقہ ایسا تھا کہ اس جیپ پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکتا تھا۔ کیونکہ اتنے بڑے اور وسیع باغ کے محافظ بھی مسلح ہی ہوں گے اور کوئی بھی یہ نہیں سوچے گا کہ جو کارروائی کی جا رہی ہے اس کا پس منظر کیا ہے لیکن باغوں کے علاقے سے نکلنے کے بعد زیادہ وقت نہیں ضائع کیا جاسکتا تھا۔ کیونکہ پھر صورتحال مختلف ہو جاتی اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

چنانچہ اب یہاں سے تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد کام کا آغاز کر دینا ضروری تھا۔ ویسے بھی اس علاقے سے تھوڑا سا آگے چل کر بائیں سمت کا رخ کرتا تو وہ ڈاک بنگلہ آجاتا تھا جو ان دنوں شاہ زیب کا مسکن بنا ہوا تھا اور جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ نہایت محفوظ جگہ ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ جیپ ڈرائیو کرنے والے' جس کے بارے میں یہ اندازہ یقینی طور پر لگایا جاسکتا تھا کہ شہاب دین کے آدمی ہیں ان کے ساتھ کیا سلوک کیا

جائے۔ غرض یہ کہ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب کینوں کے ان باغات کا آخری سرا ختم ہوا اور اس کے تھوڑے فاصلے پر ایک ویران سا علاقہ نظر آیا تو شاہ زیب نے گھوڑے کی رفتار تیز کر دی اور سیدھا سڑک پر آ گیا۔

وہ جیپ کے پیچھے پیچھے سفر کر رہا تھا اور بار بار ہاتھ ہلاتا جا رہا تھا جیسے جیپ والوں کو کوئی پیغام دینا چاہتا ہو۔ وہ تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑا رہا تھا اور جیپ والوں نے غالباً عقب نما آئینے میں اس سوار کو تعاقب کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ فوری طور پر کوئی بات ذہن میں نہیں آ سکتی تھی۔ اس لیے جیپ کی رفتار آہستہ آہستہ سست ہونے لگی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد جیپ رک گئی۔

شاہ زیب کے گھوڑے کا فاصلہ بھی بہت زیادہ نہیں تھا وہ بھی گھوڑا دوڑتا ہوا آخر کار جیپ کے پاس پہنچ گیا۔ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ دوسرا اس کے برابر اسٹین گن سنبھالے بیٹھا تھا۔ شاہ زیب کو صرف اس بات کا احساس تھا کہ وہ لوگ کہیں اسے پہچانتے نہ ہوں۔ جیپ کے نچلے حصے میں ایک عمر رسیدہ عورت اور دو نوجوان لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ یقینی طور پر ان کا تعلق شہاب الدین کے اہل خاندان سے ہوگا۔

چنانچہ فوراً ہی جیپ کا ڈرائیور جیپ کا انجن بند کرتا ہوا اپنے ساتھی سے بولا۔

''دیکھو بھئی کون ہے؟ میں اتنی دیر میں ریڈی ایٹر میں پانی ڈالتا ہوں۔'' اس نے پانی کا برتن گاڑی سے نکالا۔ جیپ کا انجن اسٹارٹ چھوڑ دیا گیا تھا۔ جبکہ دوسرا آدمی جس کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی اتر کر نیچے آیا اور شاہ زیب کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''کیا بات ہے بھائی! کیوں روک رہا تھا گاڑی کو؟''

''وہ بھاجی! چوہدری صاحب نے مجھے آپ کے پیچھے بھیجا ہے۔''

''کون سے چوہدری نے؟''

''وہ جی شہاب الدین چوہدری کی بات کر رہا ہوں۔''

''اچھا نیا بندہ ہے تو' کبھی دیکھا نہیں تجھے۔''

''تو اب دیکھ لو یار! جو بات میں کہہ رہا ہوں وہ بات تو تم سنتے نہیں ہو اور اپنی لگائے ہوئے ہو۔'' شاہ زیب نے کسی قدر جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اوہ کیا بات ہے بھئی...... بتا تو سہی؟'' اسٹین گن بردار آہستہ آہستہ گھوڑے کے سامنے آ گیا۔ شاہ زیب گھوڑے سے نیچے اترا پھر بولا۔

''یہ خط رکھ لو۔ یہ خط بھی تو ساتھ ہی دینا ہے نا۔'' شاہ زیب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اسٹین گن بردار کی پوری توجہ اس کی جیب کی طرف مبذول ہوگئی۔ وہ غالباً جیب سے نکلنے والے خط کا انتظار کر رہا تھا۔ ویسے اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ یہ کوئی غلط آدمی ہوسکتا ہے۔ اول تو نوجوان لڑکا' صورت شکل کا بھی اچھا اور پھر اس طرف سے آیا تھا جدھر سے یہ لوگ آئے تھے۔

چنانچہ کچھ ہی لمحوں کے بعد اس شخص کی نگاہیں شاہ زیب کی جانب اٹھی تھیں لیکن شاہ زیب نے کچھ اس طرح اپنی کمر کو جھٹکا دیا جیسے کوئی چیز نکلنے میں مشکل پیش آتی ہے اور پھر دوسرے لمحے اس کی بائیں لات اس شخص کے پیٹ پر پڑی۔ یہ غیر متوقع حملہ تھا۔ ادھر وہ دوسرا آدمی جیپ کا بونٹ کھولے ریڈی ایٹر کا ڈھکن اٹھا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا برتن دبا ہوا تھا۔ ریڈی ایٹر چونکہ گرم ہو چکا تھا اس لیے پانی تھوڑا سا ابل رہا تھا۔ وہ پوری طرح اس جانب متوجہ تھا۔ اس لیے ایک لمحے تک تو کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکا کہ برابر میں کوئی غلط کھیل شروع ہو چکا ہے۔ ہاں جب اسٹین گن بردار کی آواز ابھری تو اس نے چونک کر ادھر دیکھا لیکن اتنی دیر میں شاہ زیب اپنا کام کر چکا تھا۔ سب سے پہلے اس نے اس کی اسٹین گن پر ہاتھ ڈالا تھا اور جیسے ہی اسٹین گن اس کے ہاتھ میں آئی۔ اس نے

اسے لاٹھی کی طرح استعمال کیا اور اس شخص کی گردن پر دے مارا۔ بڑا زبردست حملہ تھا پہلے تو پیٹ پر پڑنے والی لات نے ہی اس کے ہوش وحواس گم کر دیئے تھے اور پھر اسٹین گن کا فولادی بٹ اس کی گردن پر پڑا تو وہ اچھل کر دور جا گرا۔ ادھر جب ڈرائیونگ کرنے والے نے یہ منظر دیکھا۔ تو وہ پوری قوت سے شاہ زیب پر حملہ آور ہوا۔ اس نے پانی کا برتن شاہ زیب پر اچھال دیا تھا۔ وہاں اگر ایک لمحے کی تاخیر ہوگئی ہوتی تو اور کچھ ہوتا یا نہ ہوتا پانی کا برتن اس کے سر پر پڑتا اور پانی اسے ڈبو دیتا۔

اس طرح ایک لمحے کے لیے اس کی کارکردگی معطل ہو جاتی لیکن شاہ زیب پھرتی سے اچھل کر ایک طرف ہٹا نہ صرف پیچھے ہٹا بلکہ اس کے ساتھ ہی اس نے جیپ کے ڈرائیور پر حملہ کر دیا۔ جیپ کا ڈرائیور بھی اچھا خاصا پھرتیلا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ شاہ زیب کی زد سے نکل گیا لیکن شاہ زیب نے اسے نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ایک بار پھر پھرتی سے اس پر حملہ آور ہوا۔ ادھر عورتوں نے جب یہ منظر دیکھا تو عمر رسیدہ عورت کی چیخ بلند ہوئی۔

''ارے ارے...... یہ کیا ہو رہا ہے؟...... یہ کیا کر رہا ہے تو؟...... یہ کیا کر رہا ہے؟......ارے بھائی...... کیوں مار رہا نہیں؟''

یہ جملے عورت کہہ رہی تھی۔ دونوں لڑکیاں خاموش بیٹھی ہوئی خوفزدہ نگاہوں سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ شاہ زیب نے آخر کار ڈرائیور کو بھی چھاپ لیا اور ڈرائیور نیچے پڑا۔ شاہ زیب کی ایک لات اس کے پیٹ پر پڑی اور دوسری منہ پر۔ اسٹین گن کو وہ استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان دونوں کو ہلاک کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جب تک کسی انسان کی زندگی بچائی جاسکے' بچائی جانی چاہیے لیکن اس کے ساتھیوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اگر یہ بچ جائیں تو اچھا ہے۔ شاہ زیب نے اس شخص پر آخری ضرب لگائی جو زمین پر

گر پڑا تھا اور دوسرے لمحے اس کے حلق سے ہائے کی آواز نکلی۔ اس نے دو چار بار پاؤں ٹیڑھے کیے اور اس کے بعد ساکت ہو گیا۔

شاہ زیب اس شخص کی جانب متوجہ ہوا جس نے اسے اسٹین گن کا بٹ مارا تھا۔ اس کی گردن پر چوٹ لگی تھی اور اس نے اس کے ہوش و حواس چھین لیے لیکن اس کے باوجود شاہ زیب نے یہ اندازہ لگانے کے لیے اس کے جسم کو اچھی طرح جھنجھوڑا' اسے برا بھلا بھی کہا کہ کہیں وہ مکر و فریب تو نہیں کر رہا۔ اس کے بعد وہ ان عورتوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ عمر رسیدہ عورت برابر چیخ رہی تھی۔ لڑکیاں ساکت بیٹھی ہوئی تھیں۔ شاہ زیب جیپ کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اور کوئی مرد ہے اس جیپ میں' لیکن ہوتا تو باہر آتا۔'' دونوں لڑکیاں خوفزدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ موٹی عورت کا منہ بھی بند ہو گیا تھا۔ شاہ زیب نے چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا اور پھر اس نے ایک ہی فیصلہ کیا۔ ان لوگوں کو ظاہر ہے ایک گھوڑے پر بٹھا کر تو لے جا نہیں سکتا تھا۔

چنانچہ اس نے گھوڑے کی لگام جیپ کے پچھلے حصے سے باندھی اور جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ ہر چند یہ ایک خطرناک کام تھا لیکن اس کے باوجود اس کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ اسے اس بات کا خوف ضرور تھا کہ کھوجی اگر اس کے پیچھے لگ گئے تو اس کا پتہ ضرور لگا لیں گے لیکن ابھی تک کوئی ایسا نشان نہیں ملا تھا جیپ کو جس راستے پر لے جانا تھا۔ اس نے اس کے بجائے ایک مخالف راستہ اختیار کیا۔ اس کا وفادار گھوڑا اس کی جیپ کے پیچھے آ رہا تھا اور گھوڑے کی وجہ سے اس کی جیپ کی رفتار زیادہ تیز نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

تاہم ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد ایسے بھلاوے دینے کے بعد جس سے اگر

کوئی تعاقب کر کے پتہ چلانے کی کوشش کرے کہ جیپ کہاں لے جائی گئی ہے تو اسے کوئی پتہ نہ چل سکے۔ یوں اپنے طور پر شاہ زیب نے تمام حفاظتی اقدامات کر لیے تھے اور پھر وہ ڈاک بنگلے میں داخل ہو گیا۔ ماجھا غالباً دور سے ہی یہ منظر دیکھ چکا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی جیپ اندر داخل ہوئی ماجھا دوڑتا ہوا جیپ کے پاس پہنچ گیا۔ شاہ زیب نے ماجھا کو اشارہ کیا اور پھر بولا۔

''چلو...... ان تینوں کو عزت کے ساتھ اندر لے جاؤ لیکن اگر عزت انہیں راس نہ آئے تو تمہیں اختیارات حاصل ہیں کہ جو سلوک چاہو ان کے ساتھ کرو۔'' ماجھا صورتحال کو سمجھ گیا تھا۔ چنانچہ وہ کرخت لہجے میں بولا۔

''چلو...... نیچے اترو۔'' بوڑھی عورت کے منہ سے پھر ایک دہشت زدہ آواز نکلی۔ اور وہ اٹھتے ہوئے کئی بار گری۔ اس کا وزن بھی زیادہ تھا اور وہ اچھے خاصے موٹے جسامت کی مالک تھی۔ چہرے سے بہت عجیب لگ رہی تھی۔ شاہ زیب کو کوئی تجربہ تو نہیں تھا کہ کون سی عورتیں کس طرح کی ہوتی ہیں۔ لیکن اسے یہ اندازہ ضرور تھا کہ شہاب الدین کی حویلی سے نکلنے والی عورتیں یقینی طور پر کسی نہ کسی طرح شہاب الدین سے ہی تعلق رکھتی ہوں گی۔

غرضیکہ وہ تینوں نیچے اتر گئیں اور اس کے بعد شاہ زیب کے لیے یہ مسئلہ ہوا کہ اب اس جیپ سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ ماجھا ان تینوں کو ہانکتا ہوا اندر لے گیا تھا۔ شاہ زیب نے تھوڑی دیر توقف کیا پھر گھوڑے کی لگام جیپ کے پچھلے حصے سے کھول کر ایک درخت سے باندھی۔ اس کا سامان اس پر ہی رکھا رہنے دیا گیا تھا۔ اب سیل اتارنے کی نوعیت نہیں آ سکتی تھی۔ پہلے اس جیپ سے چھٹکارا حاصل کر لینا بڑا ضروری تھا اور اس کے لیے شاہ زیب نے اپنے طور پر سوچ رکھا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ ان

علاقوں میں رہتے ہوئے اسے قرب و جوار کے تمام راستوں اور چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوگئیں تھیں۔ جیپ کو اس وقت اگر کھلا چھوڑ دیا جائے یا زمین پر کہیں کھڑا کر دیا جائے تو بہت سی غلط چیزیں ہوسکتی ہیں۔ ایسا کوئی رسک ابھی شاہ زیب نہیں لے سکتا تھا۔

چنانچہ اس نے سوچا کہ جس طرح بھی ممکن ہو جیپ کو گم کر دیا جائے اور اس کا ایک ہی راستہ تھا۔ وہ یہ کہ اسے اس جھیل میں غرق کر دیا جائے۔ ایک کھائی یہاں سے تھوڑے فاصلے پر تھی اور کافی گہری تھی اور اس کا تعارف شاہ زیب سے بخوبی ہو چکا تھا لیکن اس سے پہلے اس نے جیپ کی تلاشی لے لینا ضروری سمجھا۔ جیپ کا اچھی طرح جائزہ لے کر اسے جو کام کی چیزیں ملیں شاہ زیب نے انہیں اپنے قبضے میں لے لیا اور وہیں ڈاک بنگلے کے ایک کمرے میں انہیں پوشیدہ کرنے کے بعد جیپ اسٹارٹ کر کے باہر نکل آیا اور اس کے بعد تیز رفتاری سے وہاں سے چل پڑا۔

ایک بار پھر اس نے اپنے گھوڑے کی لگام کھول کر اسے جیپ کے پچھلے حصے سے باندھ لیا تھا اور اس بار گھوڑا ابھی تیز رفتاری سے اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ یہاں تک کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد شاہ زیب اس کھائی کے کنارے پہنچ گیا۔ اب اسے جو عمل کرنا تھا وہ بڑا دردناک تھا۔ خاص طور سے اس طرح کی ایک جیپ ضائع ہو رہی تھی لیکن انسانی زندگیاں ضائع نہیں ہو رہی تھیں جس طرح وقت نے اس کے دشمن تخلیق دیئے تھے اس کے بعد شاہ زیب کے لیے کسی چیز کے بارے میں سوچنا ایک مشکل کام تھا۔ اس نے جیپ اسٹارٹ کی۔ ایکسیلیٹر پر پتھر رکھا اور جیپ کا رخ کھائی کی جانب کر کے اس پر سے کود گیا۔ نتیجہ اس کی توقع کے مطابق نکلا تھا۔ جیپ برق رفتاری سے فراٹے بھرتی ہوئی کھائی کی جانب دوڑی اور اپنی طاقت میں آگے بڑھتی چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ کھائی کے بیچ و بیچ پہنچ گئی اور اس کے پہیے نیچے بیٹھنے لگے۔ شاہ زیب جیپ کے ڈوبنے کا منظر دیکھتا رہا تھا اور جب تھوڑی دیر کے بعد وہ نگاہوں سے غروب ہوگئی تو شاہ زیب پلٹا اور اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر اس نے اپنے وفادار گھوڑے کو ڈاک بنگلے کی طرف چلنے کا حکم دے دیا۔ ڈاک بنگلے میں داخل ہونے کے بعد اس نے گھوڑے کو اپنی جگہ باندھا اور اندر کی جانب چل پڑا۔

تینوں عورتوں کو ماجھے نے ایک کمرے میں بند کیا ہوا تھا اور وہ خود باقاعدہ پہرہ دے رہا تھا۔ کہنے لگا۔

''صاحب جی! میں نے آپ کو دور سے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اب بتاؤ کیا کیا جائے؟ ویسے وہ بڑھیا بہت شور مچا رہی ہے۔ رو رہی ہے' پیٹ رہی ہے۔ کہہ رہی ہے لوٹ لیا ہمیں لوٹ لیا۔''

''ارے ہاں ماجھے۔ وہ بڑے درخت کے نیچے جو جگہ بنی ہوئی ہے وہاں ان لوگوں کا سامان رکھا ہوا ہے۔ غالباً زیورات وغیرہ ہیں جو کسی پوٹلی میں باندھ لئے گئے تھے۔ تم ذرا انہیں اٹھا کر لے آؤ۔''

''جی صاحب جی!'' ماجھے نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد ان کا سامان جو کچھ بھی تھا اندر لے آیا۔ زیورات کی پوٹلی تھی۔ جس میں تھوڑے بہت زیورات' کچھ کرنسی نوٹ لیکن جو ایک اہم چیز اسے برآمد ہوئی تھی وہ گھنگھروں کے توڑے تھے۔

شاہ زیب کا ذہن ایک لمحے کے لیے جھنجھنا کر رہ گیا۔ وہ ان گھنگھروں کو دیکھ کر حیران ہوگیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ صورتحال اس کی سمجھ میں آنے لگی اور ایک لمحے کے اندر اندر اسے اپنی شدید غلطی کا احساس ہوا۔ یہ کیا یہ تو بڑی غلط بات ہوگئی اور ان گھنگھروں کی موجودگی بتاتی ہے کہ ان عورتوں کا تعلق شہاب الدین سے نہیں تھا۔ بلکہ عیاش طبع رئیس

نے انہیں ناچنے گانے کے لیے بلایا تھا اور اب واپس بھجوا رہا تھا۔ یہ تو بہت ہی برا ہوا بہت ہی برا۔ بہر حال اب جو ہوا وہ تو ہو ہی چکا تھا۔ شاہ زیب نے کچھ لمحوں کے لیے سوچا اور اس کے بعد اس نے ماجھے سے کہا۔

"ماجھے! ان لوگوں کو کھانے پینے کے لیے دو۔ میں ذرا یہ ردعمل معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میرے اس عمل سے شہاب الدین پر کیا گزری؟"

"سر جی! آپ حکم کرو۔ کھانا پکا کر دوں انہیں۔"

"فی الحال تم ان سے پوچھو کہ انہیں کس چیز کی ضرورت ہے۔" شاہ زیب نے کہا اور ماجھا چل پڑا۔ شاہ زیب خود بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا تھا لیکن وہ دروازے سے اندر داخل نہیں ہوا۔ بلکہ ایک ایسی جگہ رک کر اندر کی گفتگو سننے لگا۔ جہاں سے کمرے کے اندر ہونے والی باتیں سنی جا سکتی تھیں۔ ماجھا اندر داخل ہوا۔ اس نے سنا۔

"ہاں اماں! تجھے کچھ چاہیے۔ کھانے پینے کی کوئی چیز چاہیے تمہیں۔" ماجھے کے سوال پر وہ پھر شروع ہو گئی۔

"تیرا ستیاناس مسٹنڈے۔ کون ہے تو؟ کھانے پینے کی چیزیں تو کیوں ہمیں دے رہا ہے۔ ارے ہم پوچھتے ہیں آخر تو ہمارا کرے گا کیا؟ اور وہ کہاں چلا گیا جو ہمیں یہاں تک لایا ہے۔ کیا وہ ڈاکو ہے کچھ بتا تو دے۔ ہمارا سامان جیپ میں ہے۔ ہائے میری میا۔ میرے زیورات سارے کے سارے اس میں ہیں۔ ارے بھیا! لاکھوں روپے کے زیورات ہیں۔ میں کہتی ہوں کہ تم چاہتے کیا ہو؟ کچھ بتاؤ تو سہی؟"

"اماں! میں نے تجھ سے کہا ہے کہ کچھ کھائے گی یا نہیں؟"

"زہر ہے۔ زہر کھلا دو ہم تینوں کو زہر کھلا دو۔ نہیں تو ہمارا سامان واپس کر دو۔"

"تیرا سامان تجھے واپس مل جائے گا اور ہم تمہیں زہر نہیں کھلائیں گے۔ کھانے

پینے کی جو چیز تمہیں چاہیے وہ ہمیں بتا دے۔ ہم تجھے ساری چیزیں پہنچا دیں گے۔"

"کچھ نہیں کھانا ہمیں، کچھ نہیں کھانا۔"

"اماں! مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" لڑکیوں میں سے ایک لڑکی بولی۔

"چپ نہیں بیٹھے گی تو ابھی جوتا لے کر منہ پر لگاؤں گی کہ ساری بھوک ختم ہو جائے گی۔"

"نہیں بڑی بی! تمہیں کچھ نہیں کھانا تو کم از کم انہیں تو کھانے دو۔ ٹھہرو میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں اور سنو! اگر یہ بڑھیا تمہیں کھانے پینے سے روکے تو مجھے بتانا۔ میں اسے بھی اچھی طرح کھلا دوں گا۔" ماجھے نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ارے تیری اپنی ماں بہنیں نہیں ہیں کیا؟ مجھ بوڑھی عورت کے ساتھ یہ سلوک کر رہا ہے تو۔ اللہ تجھے غارت کرے۔" بوڑھی عورت گالیاں دیتی رہی۔ ماجھا باہر نکل آیا تھا۔ شاہ زیب وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ اس نے اندر کی آوازیں سن لی تھیں۔

بہر حال اب اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ صورتحال گڑبڑ ہو گئی ہے اور یہ عورتیں صحیح عورتیں نہیں ہیں۔ لیکن بہر حال اب جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ اب بے چاریوں کو نقصان پہنچانا شاہ زیب کو کسی بھی طور گوارہ نہ تھا۔ اگر پہلے ہی پوٹلی دیکھ لیتا تو ان لوگوں کو پہلے ہی پہچاننے کی کوشش کرتا لیکن بہر حال اب یہ بھی ذرا دیکھنا تھا کہ شہاب الدین پر اس بات کا کیا ردعمل ہو سکتا ہے۔ اس لیے اگر ایک دو دن یہ لوگ یہاں رہ جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ چنانچہ شاہ زیب نے ماجھے کو اس کا کام کرنے دیا۔ کھانا وغیرہ پہنچانے کے بعد ماجھا اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔

"ماجھے! یہ اسٹین گن ہے اسے استعمال کرنا آتا ہے تمہیں؟"

"آتا ہے صاحب جی!"

''یار! تو آخر ہے کیا۔ سچی بات یہ ہے ماجھے کہ میں تجھے سمجھ نہیں پایا۔ ایک نگاہ دیکھنے سے تو ایک غریب سیدھا سادھا آدمی نظر آتا ہے لیکن تیرے اندر کے گُن تو بڑے پکے ہیں بھئی۔'' ماجھے ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔

''صاحب جی! اس دور میں سب ہی مکار ہیں اور جو بہت زیادہ شرافت کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے تو آپ یہ سمجھ لو کہ اس کے لیے تو زندہ رہنا ایک بہت بڑی مشکل ہے۔''

''یہ تو بالکل ٹھیک کہتا ہے ماجھے۔ وہ عورتیں کھانا کھا رہی ہیں یا نہیں؟''

''صاحب جی! دونوں لڑکیاں تو بہت بے تکلف ہیں۔ بڑی بی ہی کچھ زیادہ نخرے دکھا رہی ہیں۔ کیا میں انہیں کھانا کھلا کر آؤں؟''

''نہیں۔ کوئی سختی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری ان سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔''

''جی صاحب جی! جیسا آپ کا حکم۔'' ماجھے نے جواب دیا۔ کافی دیر تک ماجھے شاہ زیب کے پاس بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا اور پھر شاہ زیب نے کہا۔

''ذرا ایسا کرو بوڑھی عورت کو بلاؤ۔''

''صرف بوڑھی عورت کو صاحب؟''

''ہاں۔'' شاہ زیب نے کہا۔ ماجھے کچھ دیر بعد بوڑھی کے ساتھ اندر آیا تھا۔ بوڑھی نے آتے ہی پھر چلانا شروع کر دیا۔

''ارے بھیا! بتا تو دو ہمیں ہمارا قصور کیا ہے۔ کیوں لوٹ لیا ہے تم نے ہمیں۔ ارے ساری زندگی کی کمائی ہماری تمہارے پاس پہنچ گئی ہے۔'' شاہ زیب ہنسنے لگا پھر بولا۔

''بڑی اماں! ساری زندگی میں تم نے بس اتنا ہی کمایا ہے؟''

''ارے تیرے ہاتھ جوڑتی ہوں بھیا! ہماری چیزیں واپس کر دے۔ ارے تجھے کیا معلوم عمر کے اس حصے میں انسان پر کیا بیتتی ہے۔ ہمارے پاس یہی کچھ ہے۔ ایسی نکمی لڑکیاں ہیں دونوں کی دونوں۔ نہ کماتی ہیں نہ دھاتی ہیں۔ بس بھیا! واپس کر دے ہمیں چھوڑ دے ہمیں۔ ہم سے تجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہم تجھے بددعائیں نہیں دینا چاہتے۔ کسی ماں کا لعل ہوگا۔ مگر تو ایسے ہی کام کر رہا ہے آخر ہمارے منہ سے تیرے لیے بددعائیں نکل جائیں گی۔ دیکھ ایک بات تجھے بتاؤں کہ میری زبان کالی ہے اور میں نے جب بھی کسی کو بددعا دی ہے تو اس کا بیڑا غرق ہوگیا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تجھ جیسے نوجوان اور خوبصورت لڑکے کو بددعا دوں۔''

''ٹھیک کہتی ہیں اماں! مجھے بددعا دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا سارا سامان میرے پاس امانت کے طور پر ہے۔ ایک آدھ دن اور یہاں رک جاؤ۔ کھاؤ پیؤ عیش کرو اس کے بعد تمہیں تمہارے سامان سمیت واپس کر دوں گا۔''

''جھوٹ بول رہا ہے۔ جھوٹ بول رہا ہے تو۔ پتہ نہیں کیا چاہتا ہے تو۔ کیوں دلاسے دے رہا ہے۔''

''اچھا اماں یہ بتاؤ۔ تم گئیں کہاں تھیں تم سے ذرا سی معلومات حاصل کرنی ہے۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''بھاڑ میں جو پہنچ میں گئی تھی۔ ارے میں کہتی ہوں میرا سامان مجھے واپس کر دے۔ اس کے بعد جو مجھ سے پوچھے گا اس کا جواب دوں گی۔''

''یہ بات ہے؟''

''کہہ تو رہی ہوں نا کہ جو کچھ تو پوچھے گا اس کا جواب دے دوں گی۔''

''اگر یہ بات ہے تو اماں ٹھیک ہے میں تمہارا سامان واپس کیے دیتا ہوں۔ ٹھہرو

ایک منٹ۔'' شاہ زیب نے کہا اور اس کے بعد اس نے ماجھے کو اشارہ کیا۔

''جاؤ---اماں کے سامان کی پوٹلی لے آؤ۔'' ماجھے نے فوراً ہی حکم کی تعمیل کی جو کچھ بھی سامان تھا وہ لاکر بوڑھی عورت کے سامنے رکھ دیا گیا اور شاہ زیب نے کہا۔

''بڑی اماں! اسے کھول کر دیکھ لو۔ اس میں سے کوئی چیز کم تو نہیں ہے۔'' بوڑھی نے جلدی سے پوٹلی کھول لی۔ ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگی وہ اور اس کے بعد حیرانگی سے بولی۔

''ٹھیک تو ہیں ساری چیزیں۔''

''اب تو تم میرے سوال کا جواب دوگی؟''

''ہاں۔اب دوں گی۔''

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''حمیدہ بائی۔''

''بائی؟''

''ہاں۔''

''مطلب؟''

''بھیا! ناچنے گانے والیاں ہیں ہم لوگ۔''

''یہ دونوں تمہاری بیٹیاں ہیں؟''

''ایک میری بیٹی ہے اور ایک میری بھتیجی ہے۔''

''سگی بھتیجی؟''

''نہیں سگی تو نہیں ہے ہمارے ہاں سگا سوتیلا نہیں ہوتا۔''

''بیٹی بھی سگی نہیں ہوتی؟''

''کبھی کبھی بیٹی بھی سگی نہیں ہوتی۔''

''گویا تم جس بیٹی کو سگی بیٹی کہہ رہی ہو۔ کیا وہ تمہاری سگی بیٹی ہی ہے؟''

''ہاں وہ تو سگی بیٹی ہے۔''

''ٹھیک۔اور دوسری سگی بھتیجی۔''

''میں نے کہا نا سگی نہیں ہوتی۔''

''مطلب؟''

''اب ساری باتیں بتانے کی تو نہیں ہوتیں۔ سب کے اپنے اپنے کاروبار ہوا کرتے ہیں۔ مگر ہم ناچنے گانے والے ہیں۔ بڑے زمیندار جی نے ہمیں بلایا تھا اور تین دن تک ہم ان کے لیے مجرہ کرتے رہے ہیں اور اب واپس لاہور جارہے ہیں جانے دو ہمیں۔''

''وہ لوگ جو تمہیں لاہور لے جارہے تھے وہ تمہارے اپنے ساتھی ہیں یا اس شہاب الدین کے؟''

''ارے نہیں بھیا! ہمارے سازندے تو پہلے چلے گئے تھے۔ چوہدری شہاب الدین نے انہیں لاہور بھجوا دیا تھا۔ یہ چوہدری شہاب الدین ہی کے آدمی تھے جنہیں تم نے مار پیٹ کر وہاں پھینک دیا۔''

''ہوں۔اچھا کیا کیا نام ہیں تمہاری ان دونوں بیٹیوں کے۔''

''ایک کا نام شمع ہے اور دوسری کا ریحانہ۔''

''ٹھیک۔بھتیجی کون سی ہے تمہاری؟''

''ریحانہ۔''

''ٹھیک چلو یہ سامان اپنے قبضے میں لو شور شرابہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' مجھے

اس میں سے ایک پیسے کی کوئی چیز نہیں چاہیے۔ اپنے کمرے میں جاؤ اور ذرا ریحانہ کو میرے پاس بھیج دو۔'' یہ کہہ کر شاہ زیب نے ماجھے کو اشارہ کیا اور ماجھا جو حکم کے غلام کی طرح تھوڑے فاصلے پر کھڑا تھا۔ بوڑھی عورت کے پاس پہنچ کر بولا۔

''چلو اماں جی۔'' بوڑھی زیورات کی پوٹلی سنبھالے ہوئے ماجھے کے ساتھ چل پڑی تھی۔ شاہ زیب تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا اور اس کے بعد جب ریحانہ کمرے میں داخل ہوئی تو شاہ زیب نے پہلی بار گہری نگاہوں سے ان لڑکیوں میں سے ایک کا جائزہ لیا۔ شمع کے بارے میں تو شاہ زیب نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ اس بوڑھی عورت کی بیٹی ہے۔ نہایت چالاک ہوگی اور کچھ بھی نہیں بتائے گی لیکن دوسری لڑکی سے وہ بوڑھی عورت کے بیان کی تصدیق کرنا چاہتا تھا اور اس کے علاوہ شہاب الدین کے بارے میں سوالات بھی کرنا چاہتا تھا۔ ریحانہ سہمی سہمی سی وہاں آ کر بیٹھ گئی تھی۔

''تم تو چوہدری شہاب الدین کی بھتیجی ہو۔''

''کس کی؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''چوہدری سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟''

''دولت اور حماقت کا۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ میرا دولت لگتا ہے اور میں اس کی حماقت۔'' لڑکی نے کہا۔ چونکہ شاہ زیب کو ان کی حقیقت معلوم ہو چکی تھی اس لیے اسے اس جواب میں بہت لطف آیا اور اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے گہری نظروں سے لڑکی کو دیکھا۔ اس کے چہرے کی کچھ لکیریں کرب کا اظہار کرتی تھیں لیکن اس کے باوجود اس کے اندر سنس آف ہومر تھا۔ اس طرح وہ شاہ زیب کے لیے تھوڑی سی دلچسپی کا باعث بن گئی تھی۔ شاہ زیب

نے اسے دلچسپی کی نگاہوں سے دیکھا۔ پھر بولا۔

''باتیں بہت اچھی کر لیتی ہو۔ کیا نام بتایا تم نے اپنا؟''

''ابھی تک نہ تو تم نے میرا نام پوچھا اور نہ میں نے اپنا نام بتایا۔ اب پوچھ رہے ہو تو بتائے دیتی ہوں ریحانہ نام ہے میرا۔''

''ہاں تو ریحانہ! میں نے تم سے پوچھا تھا کہ چوہدری سے تمہارا کیا رشتہ ہے اور تم نے مجھے بتایا کہ تمہارا اس سے دولت اور حماقت کا رشتہ ہے۔ میں ذرا سی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔''

''بھولے بابو! ہم لوگ ناچنے گانے والیاں ہیں اور چوہدری ایک عیاش آدمی، عیاش آدمی ہمارے جسم کو متحرک کر کے اسے رقص کا نام دیتا ہے۔ ہمارے نسوانی اعضاء کی تھرکن اسے لطف دیتی ہے اور وہ اس کے بدلے ہمیں دولت دیتا ہے۔ ہم اسے مکمل طور پر احمق سمجھتے ہیں۔ چونکہ بدن تو یکساں ہی ہوتے ہیں۔ یہ تو اپنی اپنی سوچ، اپنی اپنی حس ہے کہ بدن کی تھرکن کو وہ اپنے لیے پر لطف بنا لیتے ہیں۔ ہمارا نہ کچھ بگڑتا ہے نہ بنتا ہے۔ دیکھ مجھے معاف کرنا تمہاری عمر بہت زیادہ نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے تم اس طرح کے تجربے سے آشنا نہ ہو اور میں تمہیں بلاوجہ بدن کی ترغیب دے رہی ہوں لیکن تم نے ایک سوال کیا ہے تو جواب دے رہی ہوں کہ میرا اور شہاب الدین کا صرف اس تھرکن کا رشتہ ہے جسے میں تو حماقت سمجھتی ہوں لیکن وہ باعث لطف اور اس کے بدلے وہ ہمیں ادائیگیاں کرتا ہے۔'' شاہ زیب ریحانہ کو بغور دیکھ رہا تھا۔ عجیب سی باتیں تھی اس کی۔ حالانکہ وہ خود اتنے مسائل میں گھرا ہوا تھا کہ کسی دوسرے کے کسی مسئلے پر توجہ دینا اس کے لیے ممکن نہیں تھا لیکن بہر حال ریحانہ کی باتوں نے اسے کچھ لمحوں کے لیے اپنے آپ میں سمو لیا تھا۔ اس نے کہا۔

''تو تم صرف ناچنے گانے گئیں تھیں؟''

''ہاں اور اس کے بدلے وہ لے کر آئے جو تم نے دیکھ لیا۔ اب اس کے بعد پتہ نہیں زندگی میں کبھی چوہدری شہاب الدین ہمیں اپنے پاس بلاتا ہے یا نہیں۔ ہم بھی یہاں سے جب اپنے گھر کی سیڑھیاں عبور کریں گے تو اسے بھول جائیں گے۔''

''کہاں رہتی ہو؟''

''لاہور۔ مشہور جگہ ہے ہمارا گھر۔ ہم نہیں جانتے کہ اسے ہیرا منڈی کب سے کہا جاتا ہے۔ اب وہاں جتنے ہیرے موجود ہیں ان کے بارے میں تمہیں کیا بتائیں۔ کس میں کتنی چمک ہے اور یہ چمک اس نے کہاں سے حاصل کی ہے۔''

''ریحانہ! پڑھی لکھی ہو؟'' شاہ زیب نے سوال کیا۔ تو اس کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

''ہاں تھوڑی بہت۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہ پوچھو۔''

''میرا شہاب الدین سے ایک جھگڑا چل رہا ہے اور اسی جھگڑے کے تحت میں نے تمہیں اغوا کیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ تم اس کی رشتے دار عزیز ہو لیکن یہاں معاملہ دوسرا نکلا۔ شہاب الدین کے علاوہ مجھے کسی اور سے کوئی دشمنی یا پرخاش نہیں ہے۔ تم مطمئن رہو میں تمہیں یہاں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا اور تمہاری واپسی کا بندوبست کر دوں گا۔''

''تمہاری مہربانی ہوگی۔ میں تو خیر بالکل پریشان نہیں ہوں لیکن اماں اور شمع بہت پریشان ہیں۔ دیکھ لو یہ بات طے ہے کہ تمہیں ہم سے نہ کوئی فائدہ پہنچے گا اور نہ نقصان ہاں--- ایک بات میں تم سے ضرور کہوں گی۔ تمہیں بھی اگر موقع ملے تو ہمارے پاس آنا۔ بلکہ میرے پاس آنا۔ مجھے تم سے مل کر خوشی ہوگی۔'' ریحانہ نے یہ الفاظ عجیب سے لہجے میں کہے تھے لیکن شہاب الدین نے ان پر توجہ نہیں دی تھی۔

''میرا پتہ تو سن لو۔ ہیرا منڈی ایک مشہور جگہ ہے بس جب اس میں داخل ہو جاؤ گے۔'' ریحانہ اپنا پتہ دوہرانے لگی۔

شاہ زیب نے اسے غور سے سنا یا نہیں سنا لیکن بہرحال اس نے سرسری طور پر یہ وعدہ کر لیا کہ اگر وہ کبھی ادھر آیا تو ریحانہ کے پاس آئے گا۔ یہ ایک ٹالنے والی بات تھی۔ اس کے بعد ان سے چھٹکارا پا کر اس سوچ میں ڈوب گیا کہ ان لوگوں کو واپس کیسے پہنچایا جائے۔ جیپ تو جھیل میں غرق ہو چکی ہے۔ ایک گھوڑا اور پھر ان تین افراد کو کیسے اور کب تک سنبھالا جا سکتا ہے۔ کوئی گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے۔ البتہ انہیں یہاں سے نکالتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا پڑے گا کہ یہ راستے کی نشاندہی نہ کر سکیں۔ اس سلسلے میں ماجھے سے مشورہ کرنا ضروری تھا۔

☆☆☆

اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ظالم آدمی ہمیشہ بزدل ہوتا ہے اور اس کی بزدلی مثالی ہوتی ہے۔ شہاب الدین مکار اور ظالم انسان تھا اور اس کی بزدلی بھی بے مثال تھی۔ جب سے شاہ زیب کی کارروائیوں نے شدت اختیار کی تھی اور اسے اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ شاہ زیب انتقام کی آگ میں سلگ رہا ہے۔ اس کی صورتحال کافی خراب ہو گئی تھی۔ اسلم خان نے جو اسے اطلاع دی تھی وہ اس کے لیے انتہائی خوفناک تھی اور اطلاع یہ تھی کہ لجیا جس جگہ لاہور میں اسے رکھا گیا تھا وہاں سے فرار ہو گئی ہے اور اب لاپتہ ہے۔ ادھر شاہ زیب لجیا کی تلاش کے لیے ہر طرح کی کارروائی کر رہا تھا اور ادھر شہاب الدین کا دم نکل رہا تھا اور پھر اس پر مزید تازیانہ اس وقت پڑا جب اس کے ایک آدمی نے اس سے ملاقات کی۔

شہاب الدین اپنی حویلی میں رنگ رلیاں مناتا رہتا تھا اور رقص و سرور اور دوسری

چیزوں کے لیے انتظامات ہوتے رہتے تھے۔ ناچ گانے کے لیے طوائفیں بھی آیا کرتی تھیں اور شہاب الدین ان پر اچھی خاصی دولت لٹاتا تھا۔ ریحانہ اور شمع بھی اس کی پسندیدہ رقاصائیں تھیں۔ اس نے انہیں بلا کر کئی دن اپنے پاس رکھا تھا اور خوب مال و دولت دے کر رخصت کیا تھا۔ اپنے ڈرائیور اور گن مین کے ساتھ انہیں لاہور بھجوانے کے انتظامات کر دیئے تھے۔ گن مین تو صحیح حالت میں واپس نہیں آیا تھا لیکن ڈرائیور بہت برے حالات میں حویلی پہنچا تھا اور اس نے درخواست کی تھی کہ اسے فوراً شہاب الدین کے پاس پہنچا دیا جائے۔ اتفاق سے اسلم خان ہی اسے مل گیا تھا۔ اسلم خان نے کہا۔

''یہ ہوا کیا تجھے آخر۔ کس نے تیری یہ درگت بنائی؟''

''صاحب جی --- آپ مجھے راجہ صاحب کے پاس پہنچا دو آپ کی مہربانی ہوگی۔''
راجہ شہاب الدین نے ڈرائیور کو دیکھا تو چونک پڑا اور بولا۔

''تجھے کیا ہوا رے؟''

''صاحب جی! آپ کا وفادار مارا گیا۔ وہاں جنگل میں اس کی لاش پڑی ہوئی ہے۔''

''کون' نوازا؟''

''او جی --- اسی کی بات کر رہا ہوں جی۔''

''مگر ہوا کیا بیوقوف! ارے ہوا کیا میں پوچھتا ہوں؟''

''صاحب جی! ایک بندہ مل گیا تھا راستے میں شاہ زیب تھا اس کا نام صاحب جی! اس نے ہم دونوں کی یہ حالت بنا دی۔ نوازے کو تو اس نے ختم ہی کر دیا۔ میری اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کی لاش کندھے پر اٹھا کر لاتا۔ میں صاحب جی اس حال کو پہنچ گیا۔''

شہاب الدین کا خون خشک ہو گیا۔ اسلم خان نے پوچھا۔

''مگر تیری جیپ کہاں گئی؟''

''لے گیا صاحب جی وہ اور ان عورتوں کو بھی لے گیا۔ جنہیں میں لاہور چھوڑنے جا رہا تھا آپ کے حکم سے۔''

''اوہ میرے خدا انہیں کیوں لے گیا وہ؟''

''یہ تو مالک ہی جانتا ہے صاحب جی! ہمیں کیا معلوم۔'' ڈرائیور نے کہا۔
شہاب الدین کا دم نکل گیا تھا۔ یہ اطلاع اس کے لیے بے حد بھیانک تھی۔ بہت دیر تک وہ سر پکڑے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

''اسلم خان! اس کو۔ اس کو یہاں سے روانہ کرو۔ اس سے کہو آرام کرے اپنے کمرے میں جا کر اور --- اور --- کچھ لوگوں کو روانہ کر دو۔ جلدی جائیں بڑی احتیاط سے نوازے کو دیکھ کر لائیں اسے کیا ہو گیا۔''

''صاحب جی! نوازے کی نشاندہی کے لیے اسے بھی ساتھ جانا پڑے گا۔''

''تو بھیج دو۔ بھیج دو یار! مجھے کیوں پریشان کر رہے ہو۔'' شہاب الدین نے کہا اور پھر جلدی سے بولا۔

''جاؤ۔ انتظامات کر کے آؤ۔ قاعدے کے لوگوں کو بھیجنا اور اگر نوازا واقعی مر چکا ہے تو ذرا احتیاط سے لے کر آنا' دوسروں کو پتہ نہ چلے سمجھے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں سر جی! آپ فکر نہ کریں۔'' اسلم خان ڈرائیور کو لے کر باہر نکل گیا تو شہاب الدین دہشت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسے ہر طرف شاہ زیب کے بھوت نظر آ رہے تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی مسہری کے نیچے سے شاہ زیب باہر نکلے گا اور اسے زندگی سے محروم کر دے گا۔

''یہ کیا ہوا؟'' اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ''یہ تو بہت برا ہوا۔ اب میں کیا کروں؟ ارے باپ رے یہ تو تفریحی معاملات تھے۔ اگر یہ معاملات زندگی موت تک پہنچ جائیں تو یہ تو کوئی عقل کی بات نہیں ہے۔ ایسا تو نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا تو نہیں ہونا چاہیے۔ اتنی سی بات کے لیے زندگی تو نہیں کھوئی جاسکتی۔'' وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے۔ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ''اب کیا کروں۔ اب کیا کروں۔'' تھوڑی دیر میں اسلم خان واپس آ گیا۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔

''بیٹھو اسلم خان! بیٹھ جاؤ۔ کسی طرح بھی ہو سکے روپے پیسے کی پرواہ مت کرنا۔ تم اس لڑکی لجیا کو تلاش کرلو۔ جس طرح بھی ممکن ہو سکے اسے تلاش کر کے اس کے ماں باپ تک پہنچا دو۔ اسلم خان اسی میں ہماری زندگی ہے۔''

''سرکار! ہمارے بندے اسے تلاش کر رہے ہیں۔''

''نہیں۔ نہیں کوئی بات نہیں۔ اعلیٰ پیمانے پر اسے تلاش کیا جائے۔ یہ اندازہ لگایا جائے کہ آخر وہ کہاں جاسکتی ہے۔ دیکھو یہ بات تو معلوم ہے کہ لاہور میں اس کا کوئی رشتے دار نہیں ہے یار! اگر کہیں کسی غلط ہاتھ میں پھنس گئی تو پھر تو شاہ زیب ہمیں کسی قیمت پر نہیں چھوڑے گا۔ کیا کیا جائے کچھ سمجھ میں نہیں آتا' کیا کیا جائے۔ اسلم خان بھی کوئی جواب نہیں دے پا رہا تھا۔ کوئی بات ہی ایسی نہیں تھی۔ جو سمجھ میں آ رہی ہو۔ یا جس کے بارے میں کچھ سوچا اور کہا جا سکے۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر دیر تک وہ خاموش بیٹھے رہے۔ پھر شہاب الدین نے کہا۔

''وہ اسلم خان! تم نے تفصیل بتائی تھی نا شاہ زیب کے بارے میں تم نے کہا تھا کہ وہ کبیر والا کے علاقے میں رہنے والے جہانزیب اور اورنگزیب کا بھائی ہے۔''

''ہاں سرکار! یہی تفصیل معلوم ہوئی ہے۔ اس دوران آپ کا یہ غلام شاہ زیب کے

بارے میں اور بھی تفصیل معلوم کرتا رہا ہے۔''

''اچھا کیا بتاؤ۔ جلدی بتاؤ۔''

''سر جی! وہ گھر سے بھاگا ہوا ہے اور اپنے دو رشتے داروں سے ان کا جھگڑا ہے الیاس خاں اور جبار خاں۔ اس نے بہت بندے مار دیئے ہیں جی۔ پولیس والوں کو بھی مارا ہے اور چوہدریوں کے بیٹے کو بھی۔ الیاس خاں اور جبار خاں اس کے رشتے دار ہیں۔ کوئی صحیح تفصیل میرے علم میں نہیں آئی صاحب جی! لیکن یہ سنا ہے میں نے۔''

''پولیس والوں کو بھی مار دیا ہے؟''

''صاحب جی! ایک طرف تو الیاس خاں اور جبار خاں کے آدمی اس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں اور دوسری طرف پولیس والے۔ وہ قاتل ہے اور باقاعدہ اس کی تلاش کی جا رہی ہے شاید اسے اشتہاری بھی قرار دے دیا گیا ہے۔ اب یہ پتہ نہیں ہے اس پر انعام رکھا گیا ہے یا نہیں۔''

''ارے باپ رے یہ صورتحال تو اور سنگین ہوگئی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ آسانی سے کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

''جی صاحب جی!''

''جی صاحب جی کا بچہ کوئی ترکیب بتا یار! یہ تو زندگی ہی مشکل میں پھنس گئی۔''

''صاحب جی! اگر اس کے بھائی اس سے صلح کرا دیں آپ کی تو کیا زیادہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''ہاں یہ بات تو میں نے پہلے بھی سوچی تھی۔ پہلے بھی سوچی تھی میں نے یہ بات اگر ایسا ہو جائے تو بڑا اچھا ہو جائے۔ صلح ہو جانی چاہیے۔''

''جی صاحب جی!'' تھوڑی دیر کے بعد شہاب الدین نے پھر کہا۔

''بس یہی ایک بہتر طریقہ ہے تم تیاریاں کرو۔ ہم جہانزیب وغیرہ کے پاس چلیں گے۔'' شہاب الدین نے کہا۔

''میں تیاریاں کیے دیتا ہوں سر جی!''

''جاؤ۔'' اسلم خان باہر نکل گیا اور شہاب الدین پرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔

☆☆☆

حالات کچھ تھوڑے سے بہتری کی طرف آتے نظر آ رہے تھے۔ الیاس خاں اور جبار خاں بھی اپنی دھن کے پکے تھے۔ اور باز نہ آنے والوں میں سے تھے۔ الیاس خاں کا بیٹا مارا گیا تھا لیکن اس کے باوجود اس کے دماغ پر بھٹہ بنانے کی ضد سوار تھی اور وہ تیاریاں کر رہا تھا کہ بھٹہ بنانے کا کام شروع کر دے۔ ادھر کبیر والا میں جہانزیب اور اورنگزیب بھی اپنا وقت کسی نہ کسی طرح گزار رہے تھے۔ جہانزیب اور اورنگزیب کے سوچنے کے انداز میں کافی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ بھائی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ اس کا انہیں شدید دلی طور پر رنج تھا اور وہ اکثر اس کے بارے میں دکھ کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ بڑے لوگ تھے۔ اس لیے پولیس انہیں پریشان نہیں کرتی تھی۔ البتہ ایک دو بار وہ صرف معلومات کے لیے آ چکی تھی۔ اعلیٰ پولیس افسران ان سے صرف یہی درخواست کرتے تھے کہ اگر شاہ زیب کے بارے میں کوئی تفصیلات فراہم ہو جائیں تو پولیس کو ضرور اطلاع کی جائے کیونکہ بہرحال وہ ایک قاتل ہے اور بچ نہیں سکتا۔ اگر ان کی معاونت کی گئی تو انہیں بھی جرم میں برابر کا شریک قرار دیا جائے گا۔ اس لیے ایسا کوئی عمل کرنے سے گریز کریں۔

شکیلہ ایک نارمل عورت تھی۔ بہت زیادہ اس طرح کا مظاہرہ بھی نہیں کرتی تھی۔

جیسے وہ شاہ زیب کے لیے پریشان ہو لیکن بھائیوں کی پریشانی میں شریک بھی تھی۔ البتہ شاہینہ کے ردعمل سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس کی اپنی کیا کیفیت ہے ویسے برے گھر کی بری لڑکی تھی اور اس پر کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حالانکہ پچھلے کچھ دنوں اس پر یہ احساس سوار تھا کہ بہرحال شاہ زیب کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ جس کے نتیجے میں بھتیجا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا لیکن بری فطرت کہاں جاتی ہے۔ بہت سے فیصلے بدلے تھے اس نے۔ شاہ زیب اس کے بعد نظر نہیں آیا تھا۔ اگر نظر آتا تو پتہ نہیں وہ اس سلسلے میں کیا کرتی؟ ابھی شاید خود اپنے بارے میں یہ فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔

پھر اس دن دس گیارہ بجے کا وقت ہوگا۔ جب راجہ شہاب الدین دو جیپوں میں اپنے آدمیوں کو سوار کیے ہوئے کبیر والا کی حویلی میں پہنچا تھا اور چوکیدار نے یہاں آ کر اطلاع دی تھی۔ اس وقت جہانزیب اور اورنگزیب بیٹھے ہوئے کسی کاروباری موضوع پر بات کر رہے تھے۔ شہاب الدین کا نام سن کر جہانزیب نے کہا۔

''یہ نام سنا ہوا تو لگتا ہے۔ آؤ۔۔۔ دیکھتے ہیں۔'' پھر راجہ شہاب الدین جو اپنے ساتھ چند تحفے تحائف پھلوں کی شکل میں لایا تھا۔ خوش اخلاقی سے ان سے ملا۔ اس نے یہ پھل جہانزیب اور اورنگزیب کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

''انسان غرض کا بندہ ہے جی۔ بغیر غرض کے کبھی کسی کے پاس نہیں جاتا۔ میں بھی آپ کے پاس ایک غرض سے آیا ہوں۔''

''آپ حکم کریں راجہ صاحب! پہلے تو ہم آپ کا نام نہیں پہچان سکے تھے لیکن آپ تو بہت مشہور آدمی ہیں۔''

''اوہ بھائی جان! کیا مشہور آدمی ہیں۔ مصیبت میں گرفتار کر دیا ہے ہمیں آپ کے بھائی نے۔''

''بھائی نے۔ کس نے؟''

''شاہ زیب آپ کا بھائی ہی ہے نا؟'' راجہ شہاب الدین نے کہا اور جہانزیب اور اورنگزیب کی تیوریاں بدل گئیں۔ راجہ شہاب الدین کا انداز کچھ اچھا نہیں تھا۔ بہر حال وہ سوالیہ نگاہوں سے راجہ شہاب الدین کو دیکھنے لگے۔

''کچھ دن پہلے کی بات ہے بھائی جان! کہ وہ ہمارے علاقے میں آ گیا بس جی ویسے تو سنا ہے کہ اچھا بندہ تھا۔ کالج میں پڑھتا تھا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ چوہدریوں کی اولادیں اگر بگڑی ہوئی ہوتی ہیں تو چوہدری پن کا ثبوت ہی دیتی ہیں۔ لیکن اگر کالجوں میں پڑھ لیں تو پھر بات بہت خطرناک ہو جاتی ہیں۔ ہمیں معاف کرنا جی۔ آپ کو تو اس بات کا علم ہے کہ اس کا مزاج بہت بگڑا ہوا ہے۔ کوئی لڑکی تھی ہمارے ہی علاقے کی لجیا نام تھا اس کا۔ دیکھو جی! بڑے آدمی کے بیٹے کو تو لوگ یونہی پھانس لیا کرتے ہیں۔ وہاں جی چوہدری کریم بخش کے ہاں رہ رہا تھا۔ یہ کریم بخش چوہدری وہدری تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک دوکاندار ہے چھوٹا سا۔ بس جی اس کی لڑکی سے اس کا آنکھ مٹکا ہو گیا۔ لڑکی بہت تیز طرار تھی وہ کچھ اور چاہتی تھی۔ کئی بار ہمیں ملی جی بہت چھوٹی عمر کی تھی۔ ہم نے تو اس سے کہا کہ بٹیا تو ہماری بیٹیوں کی عمر کی ہے۔ ہم سے کیا ملے گا تجھے لیکن پتہ نہیں کیسی لڑکی تھی۔ ایک طرف اسے بیوقوف بنا رہی تھی اور دوسری طرف ہمیں۔ اور پھر یہ ہوا جی ایک بار وہ گھر سے کہہ کر نکلی کہ وہ ہمارے پاس جا رہی ہے اور نجانے کہاں چلی گئی۔ اب وہ لڑکا ہے کہ ہمارے پیچھے لگا ہوا ہے۔ کئی بار ہم پر قاتلانہ حملہ کر چکا ہے۔ دیکھو جی! ہم شریف آدمی ہیں' آپ کہیں سے معلوم کر لو۔ ہم کبھی کسی سے کوئی جھگڑا نہیں چاہتے۔ لڑکی جہاں بھی چلی گئی' ہمیں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ اگر اسے پتہ چل جائے کہ مجھے لڑکی کے بارے میں معلوم ہے تو جو سلوک چاہے میرے

ساتھ کر سکتا ہے۔ مگر جب ہمیں کسی کے بارے میں معلوم ہی نہیں ہے تو ہم اسے کیا بتائیں۔ آپ ایسا کرو بھائی جان! اسے بلاؤ۔ ہمارے سامنے اس سے ہماری صلح کرا دو۔ ہمارا اس کا کوئی بڑا جھگڑا نہیں ہے۔ بس اس نے ہم پر قاتلانہ حملہ کیا اور ہم نے بھی اس پر کوئی جوابی کارروائی کی۔ لیکن اب اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ساری زندگی دشمنی میں ہی گزار دیں۔ بھائی جان! اس لیے ہم نے سوچا کہ آپ کے پاس پہنچ جائیں۔ آپ اس کام کو با آسانی کر سکتے ہو۔''

یہ ساری کہانی سنی گئی۔ راجہ شہاب الدین کے انداز سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ سخت خوفزدہ ہے اور اس بات کو ان دونوں بھائیوں نے بھی اچھی طرح محسوس کیا تھا لیکن شاہ زیب کے بارے میں تو انہیں خود بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ البتہ یہ بات جان کر انہیں سخت حیرت ہوئی کہ شاہ زیب اس طرح ایک گھرانے میں زندگی بسر کرتا رہا ہے اور اس گھرانے کے سربراہ کا نام کریم بخش ہے۔ بہر حال یہ بات ذرا سوچنے کے قابل تھی۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد جہانزیب نے کہا۔

''آپ کو معلوم ہے راجہ صاحب کہ اس کا اصل جھگڑا کیا ہوا ہے؟''

''او جی۔ اڑتی اڑتی خبر سنی تھی کہ یہاں الیاس خاں اور جبار خاں نامی دو چوہدری ہیں ان سے ان کا جھگڑا چل گیا۔ میرا مطلب ہے شاہ زیب کا اور شاہ زیب نے اس مسئلے میں گھر بھی چھوڑ دیا ہے۔''

''ہاں۔ یہ بڑا عجیب وغریب سلسلہ ہے۔ آپ یہ سمجھ لیجئے کہ وہ ہمارے رشتے دار بھی ہیں لیکن اس وقت ہمارے اور ان کے درمیان بدترین دشمنی چل رہی ہے۔''

''خیر جی' یہ کام تو چوہدریوں کا ہوتا ہے دشمنی تو چلتی رہتی ہے۔ لیکن کسی بے غرض سی بات پر ایسی جس کا سر ہو نا پاؤں۔ یہ کوئی دشمنی کی بات ہے۔ اب ہماری عمر دیکھئے۔ اب

ایسی عمر تو نہیں ہماری کہ ہم لڑکیوں کے لیے اپنے دشمن بنائیں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن ایک بات آپ بھی سن لیں شہاب الدین صاحب! کہ اب وہ یہاں نہیں آتا۔ وہ ہمارا بھائی ہے ہم اس کی تاک میں ہیں لیکن یہاں ہمیں اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔''

''یہ کیا بات ہوئی جی--- آپ سے بھی نہیں ملتا وہ۔ یہ تو سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔''

''بس آپ یہ سمجھ لیجئے کہ وہ گھر سے بھی اتنا ہی بگڑا ہوا ہے جتنا دوسروں سے۔ تبھی تو کہیں اور جا کر رہ رہا ہے۔ ورنہ آپ خود سوچ لیجئے راجہ شہاب الدین صاحب! کہ وہ گھر چھوڑ کر کہیں اور کیوں رہتا۔''

''ہوں--- پھر تو ہماری بات نہیں بنے گی۔ کیوں اسلم خان--- پھر ادھر سے کیا فائدہ؟''

''کوئی ترکیب سوچی جا سکتی ہے۔''

''اوہ میاں--- کیا ترکیب سوچی جا سکتی ہے۔ وہ دیوانہ ہو رہا ہے۔ ابھی چند روز قبل اس نے ہمارے ہاں ناچنے گانے آنے والیوں کو اغوا کر لیا۔ ایک بندہ ہمارا جان سے مار دیا۔ دوسرے کو زخمی کر دیا۔ کل پرسوں کی ہی بات ہے یہ۔''

''کل پرسوں کی۔''

''ہاں۔''

''مگر کس علاقے میں؟''

''اوہ بھئی۔ اس بارے میں ہمیں کیا معلوم۔ بس یہ پتہ چل گیا تھا کہ ہمارا ایک بندہ مارا ہے اور ناچنے گانے والی عورتیں اغوا کر لی گئیں ہیں۔''

''ہوں۔ یہ تو ذرا تشویش کی بات ہے۔ سوچنا پڑے گا' دیکھنا پڑے گا۔'' جہانزیب نے کہا۔

''بھائی جان! ایک پیشکش ہم آپ کو کر رہے ہیں۔ اگر وہ سر پھرا آپ کے ہاتھ لگ جائے تو اسے صرف ایک بات بتا دیں کہ راجہ شہاب الدین سے مل لے دوستوں کی طرح مل لے۔ جہاں اس کا دل چاہے مل لے۔ ہم اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے۔''

''ٹھیک ہے ایسا ہی کریں گے ہم۔''

''تو پھر چلتے ہیں۔''

''کوئی پانی وغیرہ۔''

''نہیں جی۔ بالکل نہیں۔ اس وقت تو بالکل نہیں۔ ہمارا کام ہوا نہیں ہے لیکن ہم انتظار کریں گے کہ آپ ہماری مشکل حل کر دیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ آپ اطمینان رکھیں۔'' اورنگزیب اور جہانزیب راجہ شہاب الدین کو چھوڑنے کے لیے آئے۔ لیکن شاہینہ نے یہ باتیں سن لیں تھیں۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ بچھو ڈنگ مارنے سے کبھی باز نہیں آتا۔

شاہ زیب کے بارے میں تھوڑی بہت اطلاع ملی تھی۔ شاہینہ یہ اطلاع اپنے بھائیوں کو پہنچانا چاہتی تھی لیکن اس وقت حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اب تو وہ شکیلہ سے بھی محتاط رہنے لگی تھی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ شکیلہ شاہ زیب کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ پیدا کر چکی ہے' دونوں بھائیوں کی طرح۔ اس لیے اب ذرا احتیاط برتنی پڑے گی۔ بہر حال اسی رات اس نے الیاس خاں سے رابطہ قائم کیا اور تھوڑی دیر کے بعد اس سے رابطہ قائم ہو گیا۔

"اوہ۔ کیوں فون کیا ہے تو نے ہمیں۔ تو اپنے گھر کی گھر والی اور ہم اپنے گھر کے رہنے والے اور ہم سے تو زیادہ رابطہ نہ کیا کر۔" الیاس خاں نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے بھا جی! آئندہ خیال رکھوں گی۔ اس بات کا کہ آپ مجھے اس طرح ٹھکراتے ہیں۔ بات اصل میں اب آپ کی نہیں رہی ہے۔ بھتیجے کی آگ پھوپھی کے دل میں جس قدر ہو سکتی ہے۔ وہ میرے دل میں بھی ہے۔ اس کی وجہ سے میں آپ کو تھوڑی سی اطلاع دے رہی ہوں۔"

"کیا اطلاع ہے' کیا شاہ زیب کا پتہ چل گیا؟"

"۔آپ لوگ تو پتہ نہیں کہاں کے چوہدری ہو۔ چھوٹا موٹا کام بھی نہیں کر سکتے آپ لوگ۔ لیکن بہرحال میں اس کی پھوپھی ہوں۔ میرے دل میں بدلے کی آگ اسی طرح سلگ رہی ہے جیسے روز اول سے سلگ رہی تھی۔ دو بندے آئے تھے ایک کا نام اسلم خان تھا اور دوسرے کا نام راجہ شہاب الدین وہ ایک کہانی سنا کر گئے ہیں۔"

"کیسی کہانی؟" الیاس خاں نے کہا اور شاہینہ نے جلدی جلدی ساری تفصیل الیاس خاں کو بتا دی۔ الیاس خاں کے منہ سے آواز نکل گئی تھی۔

"اوئے ہوئے' ہوئے ہوئے۔ نیا کھیل شروع ہو گیا ہے یہ تو۔"

"ہاں شاہ جی! آپ اسے نیا کھیل کہہ لیں۔ لیکن میرا دماغ ہر طرح سے سوچتا ہے۔"

"کوئی نئی سوچ ہے تمہارے ذہن میں۔"

"ہاں۔ شاہ جی! آپ ایسا کرو۔ جس طرح بھی ہو سکے آپ کریم بخش اور اس کی بیوی کو حاصل کر لو۔ اپنے پاس لے آؤ اسے اور اپنے پاس رکھو۔ اس سے پتہ ہے دو

فائدے ہوں گے۔ پہلی بات تو یہ کہ اگر لجیا کہیں سے مل جائے۔ تو آپ اسے لا کر شاہ زیب کو اپنے قبضے میں لے سکتے ہو کیونکہ اندازہ ہو رہا ہے کہ شاہ زیب کے دل میں لجیا کے لیے کوئی گنجائش پیدا ہو گئی ہے۔ آپ جب لجیا کو اپنے قبضے میں کر لو گے تو شاہ زیب خود بخود آپ کی مٹھی میں آ جائے گا۔ دوسری طرف کریم بخش اور اس کی بیوی کو اغوا کرنے سے شاہ زیب کے دل میں یہی خیال جائے گا کہ یہ کام بھی راجہ شہاب الدین نے ہی کیا ہے۔ شاہ زیب' راجہ شہاب الدین پر بھی حملے کرے گا اور آپ موقع کی تاک میں لگے رہو گے۔ کیا سمجھے۔ وہاں آپ کو شاہ زیب دستیاب ہو سکتا ہے۔ الیاس خاں سوچ میں ڈوب گیا تھا اور پھر وہ حیرت سے اچھل پڑا۔

"اوہ۔ آخر بہن تو کس کی ہے شاہینہ! پر تیری کچھ باتوں نے بڑا دل توڑ دیا ہے۔"

"شاہ جی! جو کچھ بھی کہتے رہو وہ آپ کی مرضی ہے لیکن بہرحال میں اپنے بھتیجے کی موت کو نہیں بھول سکوں گی۔ اچھا فون بند کر لیں۔ زیادہ خطرہ لینا مناسب نہیں ہے۔ آپ جو میں نے کہا ہے وہی کرو۔ آپ دیکھو گے اس سے آپ کو فائدہ ہو گا۔ الیاس خاں پرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا اور پھر اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں موقع ملنے پر تجھے اطلاع دوں گا۔"

"فون مت کرنا شاہ جی! فون میں ہی کروں گی آپ کو۔"

"اوہ میں جانتا ہوں۔ کوئی پاگل سمجھا ہے تو نے مجھے۔" الیاس خاں نے کہا اور اس کے بعد دونوں جانب سے سلسلے منقطع ہو گئے۔

☆☆☆

زندگی کبھی کبھی اس طرح بھی مشکلات سے دوچار ہوتی ہے۔ فاضل باجوہ جس طرح بھی بن پڑا تھا۔ بچ بچا کر آخر کار اپنے اہل خاندان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ حیدر شاہ

ایک خطرناک آدمی تھا لیکن بہرحال شاہ زیب کی مدد سے ان کے درمیان جو ڈیل ہوئی تھی۔ وہ فاضل باجوہ کو اس بات کا احساس دلاتی تھی کہ صورتحال کچھ بہتر ہو جانے کی امید ہے۔ بشرطیکہ وہ دستاویزات حیدر شاہ کے حوالے کر دی جائیں لیکن یہ کام اس قدر آسان نہیں تھا۔ حیدر شاہ ابھی تک روپوش تھا اور فخر خان کو یہی اطلاع ملی تھی کہ حیدر شاہ مر چکا ہے۔ ساری کارروائی بھی ہوئی تھی۔ فخر خان کو ابھی تک اس پر کوئی شبہ نہیں ہو سکا تھا اور وہ مطمئن تھا اور اب اس کی توجہ الیاس خاں اور جبار خاں کی جانب تھی۔ وہ باقاعدہ اس زمین کا جائزہ لیتا رہتا تھا۔ جہاں الیاس خاں اور جبار خاں بھٹہ بنانا چاہتے تھے۔ ابھی تک وہ بھٹہ اسی طرح ٹوٹا پڑا ہوا تھا اور اس میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ فاضل باجوہ اپنی بیوی کو بھی اعتماد میں لے چکا تھا اور اسے کافی صورتحال بتائی جا چکی تھی۔ دستاویزات فاضل باجوہ کی دسترس میں تھیں اور وہ یہ کام کر سکتا تھا۔

بہرحال یہ ساری باتیں اپنی جگہ تھی لیکن فاضل باجوہ پر جو کچھ بیت رہی تھی۔ وہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اس دن بھی فخر خان اسے ساتھ لے کر سیر کے لیے نکلا تھا اور جان بوجھ کر بوئے آسل کی جانب چل پڑا تھا۔ جہاں وہ متنازعہ زمین موجود تھی۔ اپنے علاقے میں گن مینوں کے ساتھ محتاط انداز میں آگے بڑھتے ہوئے اس نے ایک بلند جگہ سے اس زمین کا جائزہ لیا۔ جہاں ٹوٹی ہوئی اینٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور بھٹے کی تباہ شدہ عمارت موجود تھی۔ فخر خان دیر تک آنکھوں پر دوربین لگائے اس علاقے کا جائزہ لیتا رہا پھر اس کی آواز ابھری۔

''باجوہ! دیکھ رہے ہو اس ٹوٹی ہوئی اینٹوں کے ڈھیر کو۔''

''جی شاہ جی! یہ الیاس خاں اور جبار خاں کے ارمانوں کی راکھ ہے۔''

''لیکن وہ لوگ یہاں تعمیر کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ بات اس بچے کی ہے

جس نے میرا دل جیت لیا ہے۔''

''شاہ زیب کی بات کر رہے ہیں آپ؟''

''ہاں۔ بڑا جی دار بچہ ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس نے اس علاقے میں بڑا نام پیدا کر لیا اور ایک بات میں تمہیں بتاؤں فاضل باجوہ۔''

''جی شاہ جی۔''

''دیکھو بڑی گر کی بات ہے۔ ویسے تو چوہدری زمینوں کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ زمینیں ان کے باپ دادا کی چھوڑی ہوئی بھی ہوتی ہیں اور ان کی اپنی کاٹی ہوئی بھی لیکن جن لوگوں نے بڑے بڑے نام پیدا کیے ہیں اور علاقوں میں بہت مشہور ہوئے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی قوت بازو کس صحیح طرح سے استعمال کیا ہے۔ اور اس کے بعد اپنا نام کمایا ہے۔ پولیس کو ناکوں چنے چبوا دیتے ہیں۔ چوہدریوں کو یہ بتا دیا ہے کہ اگر وہ کوئی مقابلے میں آئے تو نقصان کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ ایسے لوگ بڑی قدر والے ہوتے ہیں۔ فاضل باجوہ اور یہ لڑکا شاہ زیب یہ بھی ایسا ہی نظر آ رہا ہے مجھے۔ میں بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ ایک طرف پولیس اسے تلاش کر رہی ہے۔ دوسری طرف الیاس خاں اور جبار خاں کے آدمی اس کی جان کو لگے ہوئے ہیں لیکن میرا کام کچھ اور ہے۔ میں اس سے اپنے چار چھ کام اس طرح کے لوں گا کہ میری مشکلات دور ہو جائیں اور میں اس سے فائدہ اٹھاؤں۔ سمجھ رہے ہو نا تم اور اس کے بعد---اس کے بعد میں خود اسے اپنے ہاتھ سے مار دوں گا۔ ایسے بندوں کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ جو تیزی سے ابھر رہے ہوں۔ میں اسے اپنے ہاتھوں سے ختم کر دوں گا اور نام لگوا دوں گا۔ بہت سے الیاس خاں جبار خاں ہیں۔ پولیس ہے اور دوسرے بھی کچھ دشمن بن جائیں گے اس دوران اس کے جیسے حیدر شاہ کے رشتے ناطے دار۔''

''جی شاہ جی مگر---''

''نہیں مگر کی گنجائش نہیں ہے فاضل باجوہ۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ایسے ابھرتے ہوئے لوگوں کو اگر ختم نہ کر دیا جائے تو آگے چل کر انہیں کے ہاتھوں ختم ہونا پڑتا ہے کیا سمجھے۔''

''شاہ جی! آپ چوہدری ہو بڑے آدمی ہو۔ بڑی سیاست ہے جی آپ کی۔ میں کیا اور میری اوقات کیا۔''

''مگر بات تو سمجھ میں آ رہی ہے نا تمہاری؟''

''اچھی طرح آ رہی ہے شاہ جی۔ اچھی طرح آ رہی ہے۔''

''میں نے یہاں پوری نگرانی کر رکھی ہے۔ اگر بھٹے پر الیاس خاں اور جبار خاں کی طرف سے ایک بھی اینٹ لگائی گئی تو ان پر گولیوں کی بارش ہو گی۔ کچھ بندے مر جائیں گے نام کس کا لگے گا شاہ زیب کا۔ میرا کام بھی ہو جائے گا شاہ زیب کا کام بھی ہو جائے گا۔ وہ تو ہے ہی خیر پولیس کے لیے۔ وانٹڈ کیا سمجھے۔ میری طرف کون سوچے گا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ شاہ زیب پر بات آئے گی مگر شاہ زیب یہ سوچے گا کہ میں اس کے لیے پورا پورا کام کر رہا ہوں۔ اسے کہتے ہیں کہ ایک تیر اور کئی شکار۔''

فخر خان ہنسنے لگا۔

فاضل باجوہ بھی بے بسی کی ہنسی ہنس رہا تھا۔ لیکن اس کا دل اندر ہی اندر خون ہو رہا تھا۔ ایسے سازشی لوگوں سے نمٹنا بھی تو آسان نہیں ہوتا۔

بہرحال تھوڑی دیر بعد فخر خان نے واپسی کے لیے قدم اٹھا دیئے۔ یہ پورا علاقہ اس کا تھا اور یہاں اس کے آدمی جگہ جگہ بکھرے ہوئے کام کرتے تھے۔ فاضل باجوہ آخر کار حویلی پہنچ گیا۔ فخر خان تو اپنے کام سے چلا گیا تھا لیکن فاضل باجوہ اپنے گھر پہنچا اس

کی بیوی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے تھوڑی سی ضروری باتوں کے بعد ایک لفافہ لا کر باجوہ کو دیتے ہوئے کہا۔

''یہ جمال الدین خان کون ہیں۔ لاہور کے رہنے والے انہوں نے شادی کا کارڈ بھیجا ہے۔ ذرا دیکھیں آپ اسے۔''

''جمال الدین خان لاہور سے۔'' فاضل باجوہ نے حیرت سے کہا۔ اس نے بیوی کے سامنے کارڈ کھول کر دیکھا۔ ایک خوبصورت سا شادی کارڈ اور اس میں ایک شادی کا دعوت نامہ موجود تھا لیکن کارڈ کے ایک اندرونی حصے میں سفید رنگ کا پرچہ رکھا ہوا تھا۔ جو بالکل الگ سے اور ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔ فاضل باجوہ نے پرچہ نکال لیا اور دوسرے لمحے اس کے چہرے پر پیلاہٹ دوڑ گئی۔ پرچے پر لکھا تھا۔

''باجوہ! میں ابھی تک شدت کے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔ میری مطلوبہ چیز ابھی تک مجھ تک نہیں پہنچی یہ کیا بات ہے؟ کیا تم لوگ بدعہدی کرنا چاہتے ہو۔ تو تم یہ سمجھ لو کہ تمہاری گردن اب بھی میری مٹھی میں ہے اور کچھ ہو یا نہ ہو لیکن تم تو وہیں فخر خان کی حویلی میں زندہ دفن کر دیئے جاؤ گے۔ جب فخر خان کو علم ہو گا کہ میں زندہ ہوں۔ اور تم نے فخر خان کو صرف دھوکا دیا۔ یہ اطلاع فخر خان کو میں خود ہی دوں گا۔ اور اس کے بعد مجھے وہ کام خود نہیں کرنا پڑے گا اور فخر خان تمہارے ساتھ کیا کر ڈالے گا اس لیے اب کے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر وہ دستاویز نکال کر میرے حوالے کر دو اور یہ سمجھ لو کہ اس میں مزید کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دستاویز کو حوالے کرنے کے لیے جو جگہ منتخب کی جائے گی۔ اس کے بارے میں

میں تمہیں آج کی رات ٹیلی فون پر بتادوں گا۔ ٹیلی فون ایک گمنام انداز میں کیا جائے گا۔ بس سمجھ لینا وہ میرا ہی ہے۔ رات کو ٹھیک نو بجے جانتے ہو۔ میں کون ہوں؟ صرف تمہارے تحفظ کے لیے نام نہیں لکھ رہا۔۔۔''

یہ پراسرار پرچہ اور یہ انوکھا شادی کا دعوت نامہ جس کے بارے میں فاضل باجوہ کی بیوی کو اس کی ایک ملازمہ نے بتایا تھا اور کہا تھا کہ ڈاک میں آیا ہے۔

بہر حال فاضل باجوہ کو اس بات کا تو پتہ لگ گیا تھا کہ یہ حیدر شاہ ہی کی کارروائی ہے۔ خط اور دعوت نامہ لاہور ہی سے پوسٹ کیا گیا تھا۔ باجوہ نے اسے سنبھال کر رکھ لیا اور کاغذ کے اس پرزے کو اس نے نذر آتش کر دیا کہ یہ تو ایٹم بم کی مانند چیز تھی جو پھٹی تو نجانے کس کس کی زندگی لے جائے گی۔ اس کے بعد وہ کمرا بند کر کے بیٹھ گیا اور کافی دیر تک اس بات پر غور کرتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔

بیوی اس کی پریشانی کا بھرپور جائزہ لے رہی تھی اور سمجھ گئی تھی کہ صورتحال کیا ہے۔ قریب آئی اور کہنے لگی۔

''اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو حیدر شاہ کی طرف سے کوئی سندیس ملا ہے۔''

''ہاں اور یوں سمجھ لو کہ زندگی موت کی آغوش میں جا سوئی ہے۔''

''اگر تم مجھ پر بھروسہ کرو باجوہ! تو میں خود تمہیں بتاؤں کہ میں زندگی سے عاجز ہوں۔ جو خطرہ مجھے اپنے سر پر منڈلاتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ اس سے مجھے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہم لوگ کسی بڑے حادثے سے دوچار ہونے والے ہیں۔ یقیناً کوئی بڑی ہی بات ہو جائے گی۔''

''تو پھر بھاگوان! یہ بتا میں کروں کیا؟''

''میں بتاؤں۔ اپنا ضمیر یہ سوچ کر مجرم تو نہیں ہوتا کہ ہم مالکان کی کوئی چیز کسی غیر آدمی کو دے رہے ہیں۔ جو دستاویز اور جو کاغذات حیدر شاہ نے تم سے طلب کئے ہیں وہ ہیں تو حیدر شاہ کی ملکیت' ان پر غلط طریقے سے قبضہ تو فخر خان نے جمایا ہے۔ اگر تم اپنی جان بچانے کے لیے ایسا کر سکتے ہو تو ایسا کر دو اور خود یہاں سے نکل چلو۔''

''نکل چلوں۔''

''ہاں۔''

''مگر کیسے۔۔۔؟ کیا ہم آسانی سے یہاں سے نکل سکتے ہیں؟''

''جان ہے تو جہان ہے۔ کیا اس وقت آنکھوں کھولو گے جب بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ فخر خان کو نہیں جانتے تم۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر بھگوان! کیا کیا جائے؟''

''میں بتاؤں کیا کیا جائے۔''

''ہاں بتاؤ۔''

''وہ دستاویزات حیدر شاہ کے حوالے کر دو اور اس کے بعد یہاں سے نکل چلو۔ پہلے یہاں سے لاہور چلتے ہیں۔ وہاں رکیں گے نہیں کسی ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد کراچی چل پڑتے ہیں۔ انسانوں کے اس سمندر میں کسی گمنام جگہ اپنے لیے کوئی گوشہ تلاش کر لینا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ کم از کم اس جنجال سے تو نجات ملے گی۔''

''لیکن فخر خان پوچھے گا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں تو کیا جواب دیں گے؟''

''یہ شادی کارڈ جو ہمارے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے بس اسی کا سہارا لے کر نکل چلتے ہیں۔'' فاضل باجوہ نے چونک کر بیوی کو دیکھا پھر کارڈ کو۔ پھر مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''بات تو بہت اچھی سوچی ہے تم نے۔''

''میں کہتی ہوں اب اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ رات کو نو بجے حیدر شاہ سے پوچھو کہ وہ دستاویزات اسے کہاں وصول کرنی ہیں اور اس کے بعد فخر خان صاحب سے بات کرلو اور نکل چلو خاموشی کے ساتھ۔''

''تو پھر تم یوں کرو کہ سارا قیمتی سامان جمع کرلو۔ باقی تو سب کچھ چھوڑنا ہی پڑے گا۔ لیکن زیورات' نقدی وغیرہ لے لو۔ جس سے ہم کسی بھی جگہ اپنے قدم جما سکتے ہیں اور اس کے بعد یہاں سے نکل لو۔''

''ٹھیک ہے۔ ایسا ہی کرتے ہیں۔'' فاضل باجوہ کی بیوی نے جواب دیا اور اس کے بعد دونوں اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

☆☆☆

جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا۔ شاہ زیب کی سوچ میں پختگی آتی جارہی تھی۔ ابتدا تو طوفانی انداز میں ہوئی تھی۔ ایک رسی کھلا ہوا بچھڑا جو فطرتاً برا نہیں تھا لیکن تھا بچھڑا۔ کودنے اور چھلانگیں لگانے والا۔ بھابیوں نے بھائیوں کو ورغلا کر حق چھین لیا تھا۔ اسے کوئی پرواہ نہیں تھی اس کی۔ وہ جانتا تھا کہ اپنی قوت بازو سے بہت کچھ کرسکتا ہے۔ والدین کے مقام اور تعلقات بھی کام آسکتے ہیں۔ پھر بھائی بھی بہرحال اتنا ساتھ ضرور دیں گے کہ اسے اس کے پیروں پر کھڑا کرنے میں مدد دیں۔

بہت کچھ ہوسکتا تھا لیکن الیاس خاں اور جبار خاں نے جس طرح ماں سے کیے ہوئے وعدے کے راستے میں رکاوٹیں ڈالیں تھیں۔ وہ اسے گوارہ نہیں تھیں اور اس کے نتیجے میں جو جذباتی اقدامات ہوتے رہے۔ انہوں نے آخر کار اس حال کو پہنچا دیا کہ اسے دربدر بھٹکنا پڑا اور اسی دوران دل کو بھی لگ گئی۔

بار ہا اس نے لجیا کے بارے میں سوچا لجیا بلاشبہ ایک الہڑ سی خوبصورت لڑکی تھی لیکن اس کی کائنات میں اکیلی بھی نہیں۔ زندگی تو نجانے کیسے کیسے لمحات سے دوچار ہوسکتی ہے۔ یہ سب کچھ ابھی تک سخت انداز میں ہی ہو رہا تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وقت کس طرح اس کے راستوں کو لپیٹ رہا ہے۔

اور پھر اسی زندگی میں کئی پراسرار کردار جن میں سرفہرست مکرم شاہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مکرم شاہ نے بڑی مدد کی تھی اس کی۔ بے لوث اور بے غرض۔ لیکن مکرم شاہ کی پراسرار شخصیت نے اس کے ذہن کو ایک طرح سے باندھ کر رکھا ہوا تھا اور وہ مکرم شاہ کے بارے میں کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر پارہا تھا۔

ادھر مکرم شاہ نے اس ڈاک بنگلے میں ماجھے جیسی شخصیت کے ساتھ اس کے لیے جو بندوبست کیا تھا وہ بھی ناقابل فراموش تھا۔ ماجھا تو صحیح معنوں میں چراغ کا جن ثابت ہوا تھا۔ ہر مسئلے میں اس کا بہترین مددگار۔ اس کے لیے ہر طرح کی آسانیاں فراہم کرنے والا اور بلاشبہ یہ ماجھے ہی کا کام تھا کہ اس نے ان تینوں عورتوں کو لاہور پہنچا دیا تھا۔ ماجھا انہیں لے کر نکلا تھا اور کسی قریبی اسٹیشن سے اس نے انہیں لاہور کے لیے سوار کرادیا تھا۔

بہرحال یہ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن زندگی کے ان الجھاوؤں نے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اب کیا کیا جائے۔

بہرحال وقت گزرتا رہا اور وہ سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ ان دنوں ذرا خاموشی اختیار کرلی تھی۔ خاص طور پر سے راجہ شہاب الدین کے مسئلے میں صورتحال جوں کی توں تھی۔ وہ کوئی اہم کارنامہ سرانجام دینے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اب دل چاہ رہا تھا کہ ایک بار پھر واپس جائے اور کریم بخش سے ملکر پوچھے کہ لجیا کا کہیں پتہ چلا یا نہیں یا

پھر راجہ شہاب الدین کی کوئی ایسی کمزوری اس کے ہاتھ آئے جس سے یہ پتہ چلے کہ کوئی صورت نکل سکتی ہے یا نہیں۔

بہر حال یہ سب کچھ اس کے بس سے باہر کی بات تھی اور کبھی کبھی وہ سوچتا تھا کہ اپنا مشن صرف ایک کردے۔ یعنی الیاس خاں اور جبار خاں جب بھی کبھی بھٹے کی جانب رخ کریں وہ انہیں تڑی پار دے۔ باقی اپنی ڈیڑھ انچ کی مسجد کہیں اور بنا کر رہے لیکن اس ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں لجیا کے بغیر وقت گزارنا بھی مشکل نظر آتا تھا۔ بعض کردار کس قدر بے بس کر دیتے ہیں کہ انسان ان سے چھٹکارا بھی پانا چاہتا ہے لیکن چھٹکارا نہیں پاسکتا۔ وہ اس کی ذات پر مسلط ہو جاتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے۔

بہر حال پھر اس رات کچھ لوگ ڈاک بنگلے کے قریب آنکلے۔ ماجھے نے فوراً ہی اسے ہوشیار کیا اور ایک رات کے لیے اسے بنگلے سے دور رہنے کے لیے کہا۔ اجنبیوں کے سامنے اسے نہیں آنا چاہیے تھا چنانچہ وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا اور اس نے تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد برساتی نالے کے قریب قیام کیا۔ جو ڈاک بنگلے سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ نالے کے آس پاس جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ گھنی بھی تھیں اور اونچی بھی وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں اپنا ٹھکانہ بنا کر رات کا قیام کرنے کے لیے ٹھہر گیا۔ یہاں سانپوں وغیرہ کا خطرہ ہوسکتا تھا لیکن ان سے بچاؤ کے لیے کوئی معقول انتظام بھی نہیں تھا۔

کافی دیر تک وہ جھاڑیوں میں بیٹھا رہا۔ پھر رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ ایک گھنی جھاڑی کے قریب اندھیرے میں اسے سرسراہٹیں محسوس ہوئیں لیکن اس وقت اس پر ایک افسردگی طاری تھی وہ سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اسے دبوچ لیا۔

بہت ہی مضبوط ہاتھوں نے اس کے بازوؤں پر گرفت کی تھی اور ایک لمحے کے لیے شاہ زیب کو احساس ہوا کہ کوئی بھی داؤ اس پر کارگر نہیں ہوسکتا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو دبوچنے والے کا پورا حلیہ اسے نظر آگیا۔ بڑا لمبا چوڑا آدمی تھا۔ منہ کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا اور اس کی خوفناک آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ اس نے ایک طرح شاہ زیب کو اپنے قبضے میں کرلیا تھا اور یہ کچھ ایسا انداز تھا جس سے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ شخص نہ صرف طاقتور ہے بلکہ اپنے کام کا بھی ماہر ہے۔ پھر اس نے ہونٹوں سے ایک سیٹی کی آواز نکالی اور اس کے ساتھ ہی لمحوں کے اندر اندر بالکل اس جیسی شکل وصورت اور جسامت کے دو اور جوان نکل کر جھاڑیوں سے سامنے آگئے۔ ان کے لباس ڈھیلے ڈھالے تھے اور چہروں پر بدستور کپڑا بندھا ہوا تھا۔ پھر ان میں سے ایک کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔

''ہاں۔ کون ہے تو اور یہاں کیا کر رہا ہے؟''

''باؤ جی بندہ ہوں۔ بس آگے نکل کر اسٹیشن جانا چاہ رہا تھا کہ رات آگئی۔ اندھیرے میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں پڑی۔ سو ادھر رک گیا۔''

''جھوٹ بول رہا ہے۔ مجھے تو تو کچھ اور ہی لگتا ہے۔''

''اور کیا ہوسکتا ہوں جی؟'' شاہ زیب نے گڑگڑائی ہوئی آواز میں کہا۔

''پولیس کا مخبر۔''

''نہ جی نہ۔ اللہ نہ کرے۔ اللہ ہر شریف بندے کو پولیس سے بچائے۔''

''اوئے زیادہ چرب زبانی سے کام نہ لے اور ٹھیک ٹھیک بتا کون ہے تو؟'' سامنے کھڑے ہوئے آدمی نے شاہ زیب کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ بڑا طاقتور ہاتھ تھا۔ ایک لمحے کے اندر اندر شاہ زیب کے اندر جنون ابھرا تھا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ساری دنیا سے دشمنی مناسب نہیں تھی۔ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

''باؤ جی--- مارو تو نہیں--- میں تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔ باؤ جی! سامنے جو ڈاک بنگلا ہے وہاں کچھ بندے آ کر دے ہیں۔ ان کا پیچھا کرتا ہوا آیا ہوں اور ان میں سے ایک کے پاس مال ہے اور گھوڑا بھی ہے اور بھی سامان ہے جی۔ بس جناب جی! رات ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔''

''ہوں اور یہ سچی بات ہے۔''

''صاحب جی! آپ دیکھ لو آپ--- اگر میری بات غلط نکلے تو جو سلوک آپ چاہو میرے ساتھ کر سکتے ہو۔''

''ہوں۔'' اس شخص نے اس پر تھوڑی سی گرفت ہلکی کی اور پھر مسکرا کر بولا۔

''بندہ تگڑا ہے۔ مگر ایک بات سمجھ لے بھاگنے کی کوشش کی تو بدن میں اتنے سوراخ ہو جائیں گے کہ تو گن بھی نہیں سکے گا۔ ہر سوراخ سے خون کی دھار نکلے گی اور منٹوں میں تیری مکتی ہو جائے گی۔''

''پاگل ہوں جی کوئی۔ آپ اللہ کے واسطے مجھے ڈراؤ نہیں۔ چھوٹا موٹا چور اچکا ہوں زیادہ دل والا نہیں ہوں۔''

''ڈاک بنگلے میں کوئی ہے؟''

''ہاں جی۔ یہ لوگ شہر سے آئے ہیں۔ میرا خیال ہے انہوں نے اپنے مویشی بیچے ہیں' پیسہ ہے ان کے پاس۔''

''ہوں۔ ذرا چل تو سہی۔'' وہ لوگ وہاں سے آگے بڑھے اور ایک طرف چل پڑے۔ کچھ لمحوں کے بعد انہوں نے خشک برساتی نالہ عبور کیا اور دوسری طرف پہنچ کر گھنے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھنے لگے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو وہاں کچھ آدمی اور بھی نظر آئے۔ ان میں سے ایک مٹی کے تودے پر ذرا سا ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ اس کے پاس

بارہ بور کی دو نالی بندوق رکھی تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ ان لوگوں میں نمایاں حیثیت کا مالک ہو کیونکہ اس کے سامنے پہنچ کر ان سب کے بدن ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اس شخص نے دور ہی سے دیکھ کر کہا۔

''اوئے کینوں پھڑ لائے اوئے کون اے؟''

''سر جی! ٹھیک سے پتہ نہیں۔ کہتا ہے اچکا ہے اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے کچھ بندوں کے مال کے چکر میں ان کے پیچھے لگا ہوا ہے۔''

''اوئے ہوئے ہوئے ہوئے۔ ادھر آ بھئی' ادھر آ۔'' اس شخص نے شاہ زیب کو اشارہ کیا اور شاہ زیب نے چند قدم آگے بڑھاتے ہوئے یہ فیصلہ کر لیا کہ اس وقت ہر طرح کی بے عزتی برداشت کر لینی چاہیے۔ ان لوگوں کی فطرت کو وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ سارے کے سارے مسلح تھے اور اس وقت کسی بھی طرح ان سے مقابلہ کرنا مناسب نہیں تھا بلکہ ان کے سامنے جس قدر بے وقوفی کا مظاہرہ کیا جائے۔ اسی میں بچت ہے۔ وہ آگے بڑھ کر اس قوی ہیکل شخص کے سامنے پہنچ گیا۔ جو ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اوپر سے نیچے تک شاہ زیب کو دیکھا اور بولا۔

''ہاں' تو اچکا ہے تو--- اوئے یار کیا چراتا ہے؟''

''سر جی! تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہے میٹرک پاس کیا ہے۔ آگے پڑھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ماں باپ نہیں پڑھوا سکے۔ بس آپ یہ سمجھ لو کہ پھر نوکری کی تلاش کی۔ نوکری نہیں ملی تو بس غصہ آ گیا اور بس چھوٹے موٹے کام کرنے لگا۔''

''اوئے چھوٹے موٹے کام کیسے ہوتے ہیں وہ؟''

''بس صاحب جی! راہ گیروں کو روک لیا مال چھینا ان سے' کسی نے گڑبڑ کی تو مرمت کی۔''

''ریوالور ہے تیرے پاس؟''

''نہیں صاحب جی! اس پائے کا اچکا نہیں ہوں۔ ابھی ریوالور چلانا بھی نہیں آتا۔''

''ہوں--- بیٹھ جا--- بیٹھ جا--- بیٹھ جا۔ ابھی تک کالو نہیں آیا۔ اوئے تمہیں کالو کی کوئی خبر ہے؟''

''سر جی! کوئی خبر نہیں ہے۔''

''تو تم سب ادھر کیوں مر رہے ہو۔ تمہیں پتہ ہے کہ پولیس بھی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے جا کر ہوشیاری سے پولیس پر نگاہ رکھو۔ خطرہ ہو تو اشارہ دو--- چلو--- آس پاس بندے درختوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ تم ذرا دور دور تک نظر ڈال لینا۔''

''ٹھیک ہے سر جی!''

''اوئے تم دو بندے ادھر بیٹھو میرے پاس۔'' سردار نے انہیں حکم دیا اور پھر شاہ زیب سے بولا۔

''مجھے جانتے ہو اوئے؟''

''نہیں صاحب جی! پہلی دفعہ دیکھ رہا ہوں۔''

''نام تو سنا ہوگا تو نے میرا؟''

''آپ نام بتاؤ گے تو پتا چلے گا۔''

''اوئے---اوئے تم لوگوں نے اسے میرا نام نہیں بتایا۔'' سردار نے تھوڑے فاصلے پر بیٹھے ہوئے افراد سے کہا۔ جنہیں اس نے روک لیا تھا اور باقی دو چلے گئے تھے۔

''نہیں سر جی! ہم تو ساتھ تھے ہی نہیں نا۔''

''مستان گھوڑا ہے میرا نام۔ کیا سمجھے مستان گھوڑا۔ گھوڑے سے تیز دوڑتا ہوں

بدمست ہو کر نشانہ لگاتا ہوں۔ کیا سمجھا سترہ خون کیے ہیں میں نے اور اگر مہینے بھر خون نہ کروں تو ہاتھوں میں کھجلی ہونے لگتی ہے۔ کیا سمجھا۔''

''جی سر جی!'' شاہ زیب نے خوفزدہ ہونے کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

مستان گھوڑا اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے شاہ زیب کو خوفزدہ دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ہنسی پھیل گئی۔ پھر اس نے کہا۔

''ہاں اوئے۔ اب تو بتا کیا کیا کام کر چکا ہے تو؟''

''میں نے بتایا نا سر جی! کوئی خاص کام نہیں کیا ہے میں نے۔''

''اوئے تیرا نام کیا ہے؟ تو نے تو اپنا نام بھی نہیں بتایا۔''

''شاہو جی' شاہو۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''دھت تیرے کی لڑکیوں جیسا نام ہے۔ اوئے کوئی خطرناک سا نام رکھ۔ ویسے ڈاک بنگلے میں جو لوگ آئے ہیں وہ کون ہیں؟''

''سر جی! مویشیوں کے سوداگر ہیں۔ کوئی سودا کر کے آئے ہیں۔ میں نے رقم دیکھی تھی ان کے پاس مویشیوں کی منڈی میں۔ بس جی ادھر سے ہی پیچھے لگا ہوا ہوں۔''

''اوئے مویشی منڈی سے یہاں تک پیچھے لگا ہوا ہے تو اور راستے میں اتنی جگہ ملی کہیں تو ان سے وہ رقم نہیں حاصل کر سکا؟''

''کیا کروں صاحب جی! ہتھیار نہیں ہے نا میرے پاس۔''

''ہوں' ہوں' ہوں۔ چل ان کی تقدیر اچھی ہے جانے دے انہیں۔''

''سر جی! رقم اچھی خاصی ہے۔''

''اوئے کتنی ہوگی۔ دس ہزار ہوگی' بیس ہزار ہوگی' پچاس ہزار ہوگی۔ اوئے پاگل دے پتر پولیس چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اگر شور مچا دیا انہوں نے اور نشاندہی کر دی تو

تیرے ساتھ ہم بھی مارے جائیں گے۔ یہ خیال دل سے نکال دے۔ ان کا خیال دل سے نکال دے کیا سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اجالا پھیلنے والا ہے اب تو یہ بتا کہ تو یہاں سے نکل کر کدھر جائے گا۔ کیا سمجھا۔ ایسا کر دن یہیں کاٹ دے۔ رات کو ہمارے ساتھ نکل چلنا۔ ہمارا ایک بندہ آنے والا ہے۔ وہ آجاتا تو آج ہی نکل جاتے۔ اسی کا انتظار کر رہے ہم۔'' شاہ زیب نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر مدھم لہجے میں بولا۔

''جو حکم سرجی! آپ سے منہ تو نہیں موڑ سکتا۔''

''ہوں۔'' وہ چند لمحے آنکھیں بند کیے چپ چاپ بیٹھا رہا پھر بولا۔

''جی دار بندہ ہے۔ جوانی ہے' جان بھی ہے۔ کہاں پڑ گیا چوری چکاری کے چکر میں۔ کیا دھرا ہے اس میں۔ پوچھو کیا چرایا' پتہ چلا پانچ سو روپے' ہزار روپے' دو ہزار روپے اوئے یہ کوئی زندگی ہے۔ تو ایسا کر اپنے ساتھ لگ جا ڈکیتی کا مزا بھی چکھ لے۔ لومڑی سے شیر بن جائے گا۔ ایک دم شیر' کیا سمجھا۔''

''ہاں جی۔ بات تو صحیح ہے مگر میرا معاملہ کچھ اور ہے۔''

''کیا ہے تیرا معاملہ؟''

''صاحب جی! ایک لڑکی سے چکر چلا ہوا ہے اس سے وعدہ کیا ہے کہ تھوڑی سی رقم جمع کر کے صاف سیدھا ہو کر اس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اس سے نکاح کروں گا اور پھر اسے لے کر کسی گاؤں میں جا کر کھیتی باڑی کروں گا۔''

''دھت تیرے کی۔ اوئے رہا ہیجڑے کا ہیجڑا' چل تیری مرضی پر ابھی تجھے ادھر ہی ٹائم گزارنا پڑے گا۔ دن تو تجھے یہیں کاٹنا پڑے گا' رات کو تیرے بارے میں سوچوں گا۔'' شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا اور گردن جھکا کر خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے سامنے بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں سے کہا۔

''اوئے خیال رکھنا اس کا۔ خیال رکھنا میں سو رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ تھوڑا سا آگے سرکا اور سر کے نیچے گٹھڑی لے کر لیٹ گیا۔ تھوڑے فاصلے پر اور بھی درخت نظر آ رہے تھے۔ شاہ زیب اپنی جگہ سے اٹھا تو سامنے رائفلیں لیے بیٹھے چوکس لوگوں میں سے ایک نے کہا۔

''کدھر اوئے؟''

''لیٹوں گا شاہ جی! نیند آ رہی ہے مجھے بھی۔''

''دیکھ گھوڑا ابھی تجھے بتا چکا ہے اور ہم بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش نہ کرنا ہمارا تجھ سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ تجھے نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ پر زیادہ مرد بننے کی کوشش کی تو تو جانتا ہے تیرے ساتھ کیا ہوگا۔''

''اوئے نہیں جی نہیں' کچھ نہیں کرنا ہے مجھے۔ آپ آرام سے اپنا کام کرو۔'' شاہ زیب نے بدستور دیہاتی لہجے میں کہا اور تھوڑے فاصلے پر ایک درخت کی جڑ پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ مست ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ تھکن بھی بے پناہ تھی۔ آنکھیں جڑی جا رہی تھیں اور دل چاہ رہا تھا کہ گہری نیند سو جائے لیکن سوچوں کی پرچھائیاں اس کے ذہن پر سواری کر رہی تھیں اور وہ کافی الجھن میں مبتلا تھا۔

بہرحال سوچتے رہنے کے باوجود آنکھیں نرم نرم ہوا کے جھونکوں سے خود بخود بند ہو گئیں اور پھر گہری نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ جوانی کی مست نیند تو مشہور ہوتی ہے۔ سویا تو ایسا کہ جب تک سورج کی تیز شعاعوں نے بدن میں چبھنا نہ شروع کیا' پرندوں کے شور نے سارے ماحول میں ہلچل نہ مچا دی۔ آنکھ ہی نہ کھلی وہ بڑی مشکل کے ساتھ جاگا تھا۔ بس آنکھ کھول کر سامنے دیکھا تھا تو مستان گھوڑے کا ایک ساتھی بندوق سنبھالے چوکس بیٹھا نظر آیا تھا۔ ایک لمحے کے اندر اندر ماحول کا اندازہ ہو گیا اور وہ خود

بھی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بندوق بردار نے اسے دیکھا اور پھر دانت نکال دیئے۔

''مزے کی نیند پوری ہوگئی تیری؟''

''ہاں' سرجی!'' شاہ زیب نے کہا۔

''اوئے سارے سرجی نہیں ہوتے میرا نام موجی ہے۔ چل ناشتہ کر لے وہ ادھر دیکھ کپڑے میں روٹیاں لپٹی رکھی ہیں۔ اس کے ساتھ گڑ بھی ہے بس صبح کا ناشتہ پانی البتہ سنبھال کر پینا منہ دھونے کے لیے بھی پانی نہیں ہے۔ کوئی صحیح جگہ ملی تو منہ ہاتھ دھو لینا۔ ورنہ ضروری نہیں ہے۔''

شاہ زیب اپنی جگہ سے اٹھا' گڑ کر ساتھ باسی روٹی کھاتے ہوئے اسے اپنا گھر یاد آیا اور ایک لمحے کے لیے دل میں غم کا احساس جاگ اٹھا۔ یہ تو لازمی بات ہے کہ اس کے بھائیوں نے کبھی زندگی میں ایسا ناشتہ نہیں کیا ہوگا۔ صرف تھوڑی جائیداد کا لالچ سارے جذبوں کو فنا کرنے کا باعث بن گیا تھا۔ کسی نے اس سے کچھ نہ کہا۔ یہ تھوڑا بہت کھانے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ تھوڑی دیر تک وہ چہل قدمی کرتا رہا۔ پھر اس نے موجی سے کہا۔

''موجی استاد! ذرا---'' یہ کہہ کر اس نے اپنی چھوٹی انگلی اٹھا دی۔

''چل اس ٹیلے کے پیچھے چل۔'' موجی نے بندوق سنبھال لی۔

بہرحال شاہ زیب نے اس مسئلے سے نجات حاصل کی اور اس کے بعد وہیں جا کر بیٹھ گیا۔ یہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ ویسے مستان گھوڑا اس وقت نظر نہیں آ رہا تھا۔ نجانے کہاں چلا گیا تھا۔ ساری بات بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ موجی سے بھی بہت زیادہ بے تکلفی مناسب نہیں سمجھی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی اور پھر میں نے دو افراد کو دیکھا جو کہیں

سے گھوم پھر آئے تھے اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ ان کی آواز صحیح انداز میں یہاں تک نہیں پہنچی تھی۔ بہرحال یہ اندازہ ضرور ہوگیا کہ جس بندے کا یہ انتظار کر رہے تھے وہ ابھی تک نہیں آیا ہے اور اب یہ اس کے لیے پریشان ہو رہے ہیں۔ اس بندے کا نام کالو تھا۔ رفتہ رفتہ فضا میں اندھیرے ابھر آئے اور ہر چیز دھندلا گئی۔ وہ لوگ بدستور آ جا رہے تھے۔ پتہ نہیں مستان گھوڑا کہاں چلا گیا تھا۔ صبح سے اب تک تو نظر نہیں آیا تھا لیکن ان کی کسی بات کی ابھی تک سمجھ نہیں آئی تھی۔ موجی نے جیب سے سگریٹ نکالی۔ چرسی بھری سگریٹ تھی۔ اس کی بدبو فضا میں پھیلنے لگی۔ وہ تھوڑے فاصلے پر بیٹھا تھا۔ رات کی خاموشی اور سناٹا حد نظر پھیلا ہوا تھا۔ موجی بھی خاموشی سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا اور کچھ سوچ رہا تھا پھر اچانک ہی تھوڑے فاصلے پر ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی باتیں کر رہا ہو۔ موجی نے جلدی سے سگریٹ رگڑ دی اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ بندوق اس نے ہاتھ میں سنبھال لی تھی۔ ذرا دیر گزری تھی کہ اندھیرے میں کوئی چلتا ہوا قریب پہنچ گیا۔

''کون گا مو؟''

''مروا دیا یار! کالو نے۔''

''کیوں کیا ہوگا؟''

''پولیس نے چاروں طرف گھیرا ڈال رکھا ہے اور اسے یہ بات پتا ہے کہ ہم یہاں موجود ہیں۔ کوئی وہم نہیں ہے اسے۔ وہ چاروں طرف سے گھیرا تنگ کر رہی ہے اور اس نے وارننگ دینا شروع کر دی ہے کہ ہتھیار ڈال دیئے جائیں۔ ورنہ بھون کر رکھ دیا جائے گا۔''

''مگر یار! پولیس کو اتنا صحیح پتا کیسے چلا؟'' موجی نے کہا اور اس بار دونوں نے شاہ

زیب کی طرف دیکھا۔شاہ زیب رات کی تاریکی میں ان کی کیفیت کے صحیح اندازے لگا رہا تھا۔آنے والے نے جس کا نام شاہ زیب کو معلوم نہیں تھا۔

''اوئے میرا تو خیال ہے یہ کتے کا پلہ پولیس کا مخبر ہے اور یہی خبریں دے رہا ہے۔'' موجی نے چونک کر شاہ زیب کو دیکھا۔شاہ زیب کے اندر ایک لہر سی اٹھی تھی۔ اس کا دل چاہا تھا کہ اسے جواب دے لیکن بے عقلی رخصت ہو چکی تھی۔جذباتی اقدامات ہمیشہ ہی نقصان دیا کرتے ہیں۔اس بات کا پورا پورا خیال رکھنا تھا۔

چنانچہ اس نے اس کی بات کو سنی ان سنی کر دیا۔موجی نے کہا۔

''اس کی تلاشی تو لے لو۔کوئی وائرلیس وغیرہ تو نہیں ہے اس کے پاس۔''

''دیکھو حرامی کو۔'' دوسرے آدمی نے کہا اور شاہ زیب نے آنکھیں بند کر لیں۔کیا بدنصیبی ہے کیا کیا سننے کو مل رہا ہے لیکن اس نے ایک بات دل میں طے کر لی تھی کہ جس شخص نے اسے حرامی کہا ہے۔اسے اس کا بھرپور جواب دے گا۔یہ فیصلہ اس نے دل میں کر لیا تھا۔ان دونوں نے ان کی بھرپور تلاشی لی۔اس کے آس پاس دیکھا لیکن ظاہر ہے کچھ بھی نہیں ملا تھا۔وہ کہنے لگا۔

''چاہے تو کچھ بھی کہے موجی! میرا دل کہتا ہے کہ اس نے ہماری مخبری کی ہے۔''

''یار! تو ایک بات سن جب استاد گھوڑا نے اس کے لیے کوئی فیصلہ تجویز نہیں کیا ہے تو کیا تو اپنے طور پر اس کا کام تمام کرے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ٹھیک ہے اب تو یہ بتا کہ کرنا کیا ہے؟''

''استاد نے کوئی خبر دی ہے؟''

''ابھی تک کوئی اشارہ نہیں ملا ہے۔پتہ نہیں کالو کس چکر میں پھنس گیا کہ اپنے پاس راشن بھی ختم ہو گیا ہے۔اب جو کچھ کرنا ہے آج ہی کرنا ہو گا۔کل پولیس کا گھیرا توڑ کر نکا

مشکل ہو جائے گا۔''

''سن۔۔۔سن۔۔۔ایک بات سن۔کچھ آوازیں سن رہا ہے تو۔'' موجی نے کہا اور دونوں خاموش ہو گئے۔تھوڑی دیر تک یہ خاموشی طاری رہی۔پھر موجی بولا۔

''ہاں۔کام تو شروع ہو گیا ہے۔ایک بار پھر انہیں کچھ اور آوازیں سنائی دیں اور تھوڑی ہی دیر کے بعد تین افراد آتے ہوئے نظر آئے۔

''کون' کون ہے ادھر؟'' یہ آواز مستان گھوڑے کی تھی وہ سب الرٹ ہو گئے۔

''ہاں۔چلو مورچے لگ رہے ہیں۔سمٹ کر رہنا اور دور دور تک مت بکھر جانا۔ جب سیٹی کی آواز سنو تو فائر کھول دینا اور ہوشیار رہنا بالکل یہی معلوم ہو کہ چاروں طرف سے فائرنگ ہو رہی ہے میں چلتا ہوں اور سنو۔۔۔جیسے ہی موقع ملے گا بڑی سیٹی سنائی دے گی۔اس وقت سمت کا تعین کر لینا اور پھر اس کا گھیرا توڑنے کی کوشش کرنا۔جب فائرنگ ہلکی پڑ جائے تو تم تیز فائرنگ کرتے ہوئے پیچھے ہٹنا شروع کر دینا اور نکلنے کی کوشش کرنا میں ہربن پورے کے پاس تمہارا انتظار کروں گا۔بات سمجھ میں آ گئی یا کچھ اور سمجھانا ہے۔''

''نہیں استاد! سب سمجھ گئے ہم آپ فکر مت کرو۔''

''فکر کے بچے۔'' استاد گھوڑے نے جلی کٹی آواز میں کہا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا جب وہ یہاں سے دور نکل گیا تو اچانک ہی موجی نے کہا۔

''اوئے ہوئے' ہوئے' ہوئے یار! غلطی ہوئی۔''

''کیا ہوا؟''

''اس کے بارے میں تو ہم نے پوچھا ہی نہیں۔''

''اوئے یار! میں تو سیدھی سیدھی بات کہتا ہوں۔جب گولیاں چلانا شروع کرو تو

دو گولیاں اس پر بھی خرچ کر دینا۔ ایسی مصیبتوں کا ساتھ رکھنا اچھا نہیں ہوتا۔ کہیں بھی کوئی مشکل پیش آ سکتی ہے۔''

''تو تو بالکل ہی کھسکا ہوا ہے یار! تیری بات ہی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اوئے--- تجھے یہ تو پتہ ہے کہ استاد کو اس کی موجودگی کا پتہ ہے کیا سمجھا--- استاد خود تو کوئی حوالہ دے کر جاتا۔''

''تو پھر اسے یہیں پڑا رہنے دیں۔''

''ساتھ لگائے رکھیں گے۔ اٹھ اوئے تیار ہو جا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ذرا آگے بڑھتا ہوں اس ٹیلے پر چڑھ کر حالات کا جائزہ لے لیتا ہوں۔'' اس نے کہا اور ٹیلے کی جانب بڑھ گیا۔ شاہ زیب کے پورے بدن میں عجیب سی سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ موجی اس کے پاس پہنچا اس نے کہا۔

''تو فکر مت کرنا میں ہوں نا دیکھ لوں گا سب کو' کوئی فکر کرنے کی بات نہیں ہے۔ مرنے نہیں دوں گا تجھے۔''

''او جی! تمہارے اس بندے کا خیال بالکل غلط ہے۔ میں نہ پولیس کا مخبر ہوں اور نہ تم لوگوں کا کوئی دشمن' صبح سے میں تمہارے سامنے ہوں بھلا مجھ پر شبہ کیوں کیا جا رہا ہے۔''

''بس بس ٹھیک ہے۔ اب کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ تو چپ ہو کر بیٹھ جا۔'' شاہ زیب خاموشی سے اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ ذرا سی دیر میں وہ واپس آیا اور کہنے لگا۔

''آؤ--- اب یہاں سے آگے بڑھنا ہے۔ چل اوئے چل۔'' اس نے خود ہی شاہ زیب کو بھی مخاطب کیا تھا۔ شاہ زیب خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑا۔ صورتحال وہی تھی۔ پولیس ان ڈاکوؤں کو یا تو گرفتار کر لیتی یا مار دیتی۔ مگر شاہ زیب اگر ان کے ہاتھ

لگ جاتا تو صحیح معنوں میں پولیس کی لاٹری نکل آتی۔ اس وقت شاہ زیب ان ڈاکوؤں سے زیادہ حیثیت رکھتا تھا۔

بہر حال وہ آگے بڑھتا رہا اور خاصا فاصلہ طے کر کے وہ لوگ ایک جگہ رکے۔ پھر اچانک ہی فضا میں سیٹی کی آواز سنائی دی اور سیٹی بلند ہوتے ہی رات کے سناٹے میں ایک دم گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ موجی اور شاہو خاموش کھڑے رہے۔ شاہ زیب بھی ساکت ہو گیا تھا۔ گولیاں تابڑ توڑ چل رہی تھیں۔ شاہ زیب نے موجی سے کہا۔

''موجی استاد! اگر تم یہ بندوق مجھے دے دو تو میں بھی تمہارا بھرپور ساتھ دوں۔ کیا سمجھے۔'' موجی نے گھور کر اسے دیکھا اور پھر سرگوشی سے بولا۔

''اوئے چپ کر' چپ کر۔'' شاہ زیب خاموش ہو گیا۔

بہر حال وہ دونوں کھڑے رہے تھے۔ موجی نے چند لمحے تک کچھ سوچا اور پھر انہوں نے ایک دوسرے کو اشارہ کر کے آگے بڑھنے کو کہا۔ وہ اندازہ لگا رہے تھے کہ انہیں کون سی جگہ مورچہ قائم کرنا ہے اور کہاں سے گولیاں چلنی ہیں۔ شاہ زیب کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ کیوں نہ ان دونوں کے درمیان سے نکلنے کی کوشش کرے۔ اگر وہ چاہتا تو آسانی سے ان کی بندوق اپنے قبضے میں کر سکتا تھا لیکن اس وقت صورتحال اس نوعیت کی سنگین تھی کہ یہ لوگ آس پاس بکھرے ہوئے تھے اور یقیناً ان میں سے کچھ کے دل میں یہ خیال ضرور ہوگا کہ وہ پولیس کا مخبر ہے جبکہ ایسی بات نہیں تھی۔ اگر وہ ان لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرے تو پولیس کا گھیرا توڑنا آسان نہیں ہوگا۔ وہ یہ سوچ کر خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر تک وہ لوگ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے۔ خشک پتے ان کے پیروں کے نیچے آ کر آہٹ پیدا کر رہے تھے لیکن اچانک ہی جب وہ درختوں سے نکل کر کھلی جگہ

پہنچے تو سامنے سے گولیوں کی ایک باڑ چلی اور گولیاں چیختی ہوئی اس طرف آئیں۔ رات کی تاریکی میں برق رفتاری سے سفر کرتے ہوئے انگارے ان کے اوپر سے گزر گئے۔ تینوں زمین پر بیٹھ گئے۔ فائرنگ بڑی تیز رفتاری سے ہو رہی تھی۔ غالباً پولیس والوں نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ گولیاں رکے بغیر ان کے سر، سینے اور ٹانگوں پر سے سنسناتی ہوئی گزر رہی تھیں اور وہ دم سادھے پڑے ہوئے تھے۔ شاہ زیب اس وقت اس تیرتی ہوئی موت کو دیکھ رہا تھا۔ ان لوگوں نے ابھی جوابی فائرنگ نہیں شروع کی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد پولیس کی گولیاں بند ہو گئیں لیکن نالے کے آس پاس فائرنگ پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ شاہ زیب کو اندازہ نہیں تھا کہ کوئی گولی اس کے جسم کے کس حصے میں کس وقت لگ سکتی ہے۔

بہرحال وہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور غور کر رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے محسوس کیا کہ موجی اور شاہو آہستہ آہستہ درختوں کی جانب کھسک رہے ہیں۔ یہ ایک بہترین موقع تھا وہ لوگ غالباً کسی منصوبے کے تحت اس طرح آگے بڑھ رہے تھے یہاں تک کہ پولیس نے ایک بار پھر فائرنگ شروع کر دی لیکن اب موجی اور شاہو بھی سیدھے ہو کر فائرنگ کر رہے تھے اور انہوں نے پہلی بار وہاں پولیس کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ یہ بہترین موقع تھا وہ تیزی سے پیچھے کھسکا اور مزید تیزی سے پیچھے کھسکنے لگا اور اس کے بعد اس نے رخ تبدیل کر دیا اور جھکا جھکا تیزی سے دوڑتا ہوا ایک تنے کے قریب آ گیا۔ وہ درخت کے تنے سے چپک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ پولیس بھی رک رک کر فائرنگ کر رہی تھی اور ڈاکوؤں کی جگہ بدلنے کا اندازہ ہوتا جا رہا تھا۔

بہرحال وہ لوگ فائرنگ کرتے رہے اور شاہ زیب کو زندگی کا ایک انوکھا تجربہ

حاصل ہوا اس نے اس سے پہلے پولیس مقابلے کی باتیں ہی سنی تھیں لیکن آج اس نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا تھا۔ وہ اس کے لیے زندگی میں ایک پراسرار ترین واقعہ تھا۔ البتہ یہ لمحات ایسے نہیں تھے کہ وہ اس واقعہ کی پراسراریت میں کھو جائے یا اس کے انوکھے پن پر غور کرے۔

ہر سمت گولیاں تڑاتڑ چل رہی تھیں۔ اس نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا اور پھر وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ چند لمحے چوکنی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور کچھ دور سے ٹارچ کی روشنی ابھری اور اس نے جھک کر دیکھا۔ ڈاکوؤں کا ایک ساتھی خون میں لت پت پڑا ہوا تھا۔ شاہ زیب نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا لیکن اچانک ہی اس طرف بوچھاڑ پھر شروع ہو گئی اور شاہ زیب برق رفتاری سے زمین پر گر پڑا۔ گولیاں سنسناتی ہوئی اس کے برابر سے گزرتی رہیں۔ اس کے قریب ہی لاش پڑی ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد چاند نے سر ابھارا مگر آسمان پر غبار اس قدر گہرا تھا کہ چاندنی پھیکی اور دھندلی پڑ گئی تھی۔ درختوں کے نیچے گہرا اندھیرا تھا۔ شاہ زیب نے وہاں زیادہ دیر رکنا مناسب نہیں سمجھا۔ یقینی طور پر پولیس کا نشانہ وہ بن سکتا تھا کیونکہ صورتحال اس کے سامنے تھی۔ فائرنگ ایک لمحے تک رکی تو وہ درختوں کی آڑ لیتا ہوا تیزی سے بھاگا اور دور تک بھاگتا چلا گیا۔ درختوں کے نیچے پھیلے ہوئے اندھیرے نے اس کی مدد کی تھی۔ کچھ دیر تک وہ درختوں کے نیچے بھاگتا رہا اور پھر جیسے ہی باہر نکلا اچانک ہی وہ کسی شخص سے ٹکرا گیا۔ جس سے وہ ٹکرایا تھا وہ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی ٹکر سے وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ گرتے گرتے اس کے منہ سے موٹی سی گالی نکلی تھی۔ نیچے گر کر وہ سیدھا ہوا اور اچانک ہی اپنے سامنے شاہ زیب کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ خود شاہ زیب کی کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ ایک پولیس کانسٹیبل تھا۔

وردی میں ملبوس پولیس کانسٹیبل اور وہ دونوں ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے پھر اچانک ہی پولیس کانسٹیبل نے لوٹ لگائی اور اپنی رائفل کو سیدھا کرنا چاہا لیکن شاہ زیب اس سے زیادہ پھرتیلا اور چالاک تھا۔ اس نے ایک زوردار لات اس کی رائفل پر ماری اور رائفل اچھل کر دور جا گری۔ اس کے ساتھ ہی شاہ زیب پولیس والے کے سینے پر سوار ہو گیا تھا اور پھر اس کا انگوٹھا پولیس والے کے حلق پر جم گیا اور اس نے ناخن کا دباؤ بڑھا دیا۔ پولیس والا اس کے نیچے دبا ہوا اچھل رہا تھا۔ بولنے کی کوشش اس لیے ناکام ہو گئی تھی کیونکہ شاہ زیب کا انگوٹھا تقریباً اس کے حلق سے جا لگا تھا اور وہ بری طرح تڑپ رہا تھا کیونکہ اس کا سانس رک گیا تھا۔ شاہ زیب کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ اسے زندگی سے محروم کر دے۔ چند ہی لمحوں کے بعد پولیس والا مر گیا تھا۔ شاہ زیب نے یہ اندازہ لگایا کہ کہیں وہ زندہ تو نہیں ہے اور پھر دوسرے لمحے اس نے برق رفتاری سے اس کا لباس اتارنا شروع کر دیا اور پھر یہ لباس شاہ زیب کے بدن پر پہنچ گیا۔

ایک پولیس والے کا روپ دھار کر بھی بچت تو نہیں تھی کیونکہ بہرحال ڈاکو بھی اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ان سے بھی ہوشیار رہ کر ہی کوئی بہتر قدم اٹھا سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے پولیس والے کی رائفل، میگزین وغیرہ بھی اپنے قبضے میں کر لیا اور اس کے بعد بالکل پولیس والوں کی طرح آڑ لیتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اچانک ہی اسے عقب سے آواز سنائی دی۔

''رحیم خان! بندہ نکل گیا؟''

''ہاں۔ میں اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔'' شاہ زیب نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کہا اور تیزی سے رائفل سنبھالے آگے بھاگا۔ اگر سوال کرنے والا اس کے قریب پہنچ جاتا تو شاہ زیب کو مشکل ہو جاتی۔ تیزی سے آگے بڑھتا رہا اور اس نے ایک جھاڑی کے عقب

میں پناہ لی۔ اسے ہر لمحہ یہ خطرہ رہا تھا کہ کہیں عقب سے گولی نہ چل جائے اور اس کے جسم میں لاتعداد سوراخ کر دے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جھاڑی کی آڑ میں وہ گہری سانسیں لیتا رہا۔ قدموں کی آہٹیں آس پاس گونج رہی تھیں۔

اس علاقے پر پولیس نے اپنا کنٹرول جما لیا تھا۔ چنانچہ اسے پولیس والوں کی چاپ برابر سنائی دے رہی تھی۔ کبھی یہ چاپ قریب آ جاتی اور کبھی دور چلی جاتی۔ کئی منٹ تک وہ اسی طرح جھاڑیوں کی اوٹ میں چلتا رہا اور بار بار راستے بدلتا رہا کہیں رفتار تیز کر دیتا، کہیں جھاڑی کی آڑ لے کر ساکت ہو جاتا۔ ان جھاڑیوں میں کانٹے بھی بہت تھے اور جگہ جگہ یہ کانٹے چبھ رہے تھے۔ آخر کار جھاڑیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ سامنے چٹیل میدان تھا اور اس سے آگے بلندی پر درختوں کے جھنڈ پھیلے ہوئے تھے۔ درختوں کی آڑ سے روشنی کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ آہ، اگر اس جگہ تک بچ بچا کر پہنچنا ممکن ہو جائے تو زندگی بچ جانے کے امکانات ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ اس نے برق رفتاری سے دوڑ لگا دی۔ وہ میدان سے گزرتا ہوا بلندی کی جانب جا رہا تھا اور اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ اب درختوں کے اس جھنڈ کے پاس جا کر ہی دم لے گا چنانچہ وہ لہرا لہرا کر دوڑ رہا تھا۔ پولیس کی وردی میں تھا اس لیے شاید کسی نے اس پر خاص طور سے توجہ نہیں دی تھی۔ وہ برق رفتاری سے یہ میدان عبور کر گیا اور درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچ گیا پھر سب سے پہلے اس نے درخت کے ایک تنے کے پیچھے پناہ لی تھی۔ اس کا سانس بری طرح چڑھا ہوا تھا اور وہ چوکنی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ قرب و جوار میں کوئی نظر نہیں آیا اور اس نے سکون کی ایک گہری سانس لی۔ وزنی رائفل کو سنبھالے رکھنا ایک مشکل کام تھا لیکن اس وقت یہ رائفل اور یہ سرکاری وردی اس کے لیے بڑی کارآمد ثابت ہو سکتی تھی اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔

پھر اس کی نگاہیں اس روشنی کی جانب اٹھ گئیں۔ جو اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھیں اور یقینی طور پر کسی گھر سے آ رہی تھی۔ شاہ زیب نے گہری سانس لی اور اس کے قدم آہستہ آہستہ اس گھر کی جانب اٹھ گئے۔

☆☆☆

ہر شریف آدمی اپنے لیے بچت کا انتظام کرتا ہے۔ فاضل باجوہ درحقیقت ایک شریف آدمی ہی تھا۔ فخر خان کے ہاں ملازمت ایک الگ حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی برائیوں میں ساتھ دینا بالکل ہی الگ چیز ہوتی ہے۔ فاضل باجوہ اس چکر میں کبھی نہ پھنستا وہ اپنا کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیتا تھا لیکن دستاویزات کے مسئلے میں وہ بلاوجہ ہی پھنس گیا تھا اور اب صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے ایک مشکل فیصلہ کیا تھا۔ پہلے ہی حیدر شاہ کی قید میں بڑی مشکلات سے گزر چکا تھا۔ اب مزید چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ بال بچوں والا آدمی تھا۔ آخری بات یہی سوچی تھی اس نے کہ دو چار سال بالکل گمنامی کے عالم میں بسر کرے گا۔ ویسے بھی رشتے ناطے دار بہت زیادہ نہیں تھے۔ مختلف شہروں میں اس کے اور اس کی بیوی کے کچھ عزیز و اقارب تھے لیکن اپنی زندگی کی حفاظت ضروری ہوتی ہے بعد میں عزیز و اقارب کی فکر۔

چنانچہ اپنے طور پر وہ بالکل طے کر چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ بیوی کی ہدایت کے مطابق قیمتی سامان اور نقدی وغیرہ محفوظ کر لی تھی اور فاضل باجوہ نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے چنانچہ سب سے پہلے اس نے وہ دستاویزات اس جگہ سے نکال کر اپنے قبضے میں کیں اور انہیں ایک ایسی جگہ محفوظ کر دیا جہاں سے وہ کسی کے ہاتھ نہ لگ سکیں اور اس کے بعد وہ شادی کا کارڈ لے کر فخر خان کے پاس پہنچ گیا۔ فخر خان نے اس سے کہا۔

''ہاں باجوہ جی! کیسی چل رہی ہے گاڑی؟''

''سر جی! آپ کی دعاؤں کے سہارے سب ٹھیک ہے۔''

''کیسے آئے؟''

''سر جی! ایک چار دن کی چھٹی چاہتا ہوں۔''

''تو کر لو۔ کیا بات ہے۔ کیا کام ہے؟''

''وہ جی۔ ایک شادی میں شریک ہونا ہے اور یہ کارڈ آیا ہے شادی کا۔'' باجوہ نے شادی کا کارڈ فخر خان کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں۔ ٹھیک ہے چلے جاؤ۔ ویسے بھی آج کل سستی چل رہی ہے۔ دو چار دن میں واپس آ جانا۔''

''جی سر جی! بہت مہربانی۔''

''کچھ پیسے ویسے چاہیں تو لے جانا۔''

''سر جی! آپ کی محبت اور دعائیں بڑی کافی ہیں۔'' فخر خان نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی۔ فاضل باجوہ پر اسے کوئی شک نہیں ہوا تھا۔ خاص طور سے ان دنوں وہ فاضل باجوہ سے خاصا متاثر تھا کیونکہ باجوہ ہی کی وجہ سے اس کا ایک بدترین دشمن موت کے گھاٹ اتر گیا تھا۔ وہ زمین جس کا ہیر پھیر چل رہا تھا فخر خان کے لیے بڑی قیمتی تھی اور اب راستے کا ہر کانٹا نکل گیا تھا۔ تو وہ سوچ رہا تھا کہ ان زمینوں کو صحیح طور پر استعمال کرے گا۔ کیا ہی دلچسپ اور عجیب چکر ہے ایک لمحے کی زندگی کا کوئی پتہ نہیں اور دنیا بھر پر قبضہ کر لینے کے خواب آنکھوں میں آ کر سج جاتے ہیں اور باقی اور کچھ نظر نہیں آتا۔

بہر حال فاضل باجوہ کا کام بن گیا تھا۔ حویلی سے وہ بڑی شان وشوکت کے ساتھ

نکلا تھا اور اپنے ایک منصوبے کے تحت ایک گاڑی کرائے پر حاصل کر لی تھی۔ طے یہی کیا گیا تھا کہ اسی گاڑی سے وہ لاہور جائے گا سامان بھی مختصر تھا۔ حالانکہ فخر خان نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی لیکن پھر بھی فاضل باجوہ نے احتیاط رکھی تھی۔ گاڑی وہ خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔

چنانچہ اتنے فاصلے پر اس نے اس طرح سفر طے کیا جیسے اس کا رخ لاہور کی سمت ہو لیکن ایک مخصوص جگہ جا کر وہ واپس پلٹ پڑا اور الگ کے راستے سے ایک لمبا چکر کاٹ کر ساہیوال پہنچا۔ ساہیوال میں کافی دیر تک رک کر یہ جائزہ لیتا رہا کہ کوئی اس کے تعاقب میں تو نہیں ہے۔ جو اہم کام وہ سرانجام دے رہا تھا اس کے تحت لمحے لمحے کی یہ احتیاط بڑی ضروری تھی۔ ایک طرح سے وہ صحیح معنوں میں اپنے بیوی بچوں کا تحفظ کر رہا تھا پھر جب اسے اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ ہر طرف سکون' خاموشی اور سناٹا ہے تو وہ وہاں سے واپس چل پڑا اور پھر لمبا چکر کاٹتا ہوا کئی علاقوں سے گزر کر آخر کار اس علاقے میں پہنچ گیا۔ جہاں حیدر شاہ کی رہائش گاہ تھی۔ حیدر شاہ کی شاندار رہائش گاہ کے دروازے پر اسے روکا گیا تو اس نے چوکیدار سے کہا۔

''مجھے حیدر شاہ صاحب سے ملنا ہے۔ ایک انتہائی ضروری کام ہے ان سے۔''

''کیا نام بتایا جائے تمہارا؟'' چوکیدار نے کہا۔

''بس ان سے یہ کہہ دو کہ ان کا ایک خاص مہمان آیا ہے۔''

''خاص مہمان کا کوئی نام نہیں ہے؟'' چوکیدار نے کرخت نگاہوں سے فاضل باجوہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

''ہاں میں اپنا نام نہیں بتانا چاہتا۔ اب تم بولو کیا کہتے ہو۔ اس سلسلے میں رکنا ہے کہ جاؤں لیکن جواب تم خود دو گے۔''

''اوہ بھائی! ہر جگہ جانے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ آخر شاہ جی کو کچھ بتانا پڑے گا۔''

''جو میں نے بتایا ہے وہ کافی ہے۔ تم جا کے یہ الفاظ کہہ دو ذمے دار میں ہوں۔''

''او جا بھائی جا کے اطلاع دے۔ کیسے کیسے سر پھرے آ جاتے ہیں۔''

''یہ بات میں حیدر شاہ صاحب کو بتاؤں گا کہ تم نے مجھے سر پھرا کہا تھا۔ سمجھ رہے ہو؟''

''اوہ معاف کر دو۔ بھائی جی معاف کر دو اور کیا کہہ سکتے ہیں ہم۔ ہماری بھی ایک ڈیوٹی ہوتی ہے۔'' چوکیدار نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

دوسرا چوکیدار اندر چلا گیا تھا وہ کئی منٹ کے بعد واپس آیا اور بولا۔

''شاہ جی! ان مہمانوں کو بلا رہے ہیں لیکن ان کی تلاشی لینا ضروری ہے۔''

''ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ تلاشی لو۔''

فاضل باجوہ کی بیوی اور بچے بھی نیچے اتر آئے تھے۔ چوکیداروں سے چونکہ تلخی ہو گئی تھی۔ اس لیے انہوں نے ان کی اچھی طرح تلاشی لی لیکن فاضل باجوہ اس وقت جن حالات سے گزر رہا تھا۔ وہاں کسی سے اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی پھر ایک ڈرائینگ روم میں وہ بٹھا دیا گیا۔ اپنے ساتھ وہ جو فائل لایا تھا وہ اس نے بڑی احتیاط سے رکھی ہوئی تھی۔ غالباً حیدر شاہ نے کسی خفیہ جگہ سے اسے دیکھا۔ اصل میں حیدر شاہ نے جو ابھی تک اپنی موت کا اعلان کیا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے وہ اس قدر احتیاط برت رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ چوکیداروں نے اس سلسلے میں کوئی تعرض نہیں کیا تھا پھر جہاں سے حیدر شاہ نے فاضل باجوہ کو دیکھا۔ وہاں سے وہ فاضل باجوہ کو پہچان کر تیز رفتاری سے باہر نکل آیا تھا۔

''اوہو باجوہ جی! سلام بھابی جی!'' فاضل باجوہ کی بیوی نے جواب دے کر گردن

جھکا دی تھی۔

''باجوہ! یہ تمہاری آمد اور اس طرح خیریت تو ہے؟''

''جی جناب! اگر اجازت ہو تو کسی تنہا جگہ بیٹھ کر آپ سے بات کروں۔''

''ہاں ہاں۔ ان لوگوں کو اندر بھجوا دیا جائے۔ میری فیملی بھی اندر موجود ہے۔''

''صاحب! ہم واپس جائیں گے۔ ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہیے۔''

''باجوہ! تمہاری کسی مشکل کی وجہ سے میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ ورنہ تم میرے اب معزز مہمان ہو۔ آؤ میرے ساتھ۔'' حیدر شاہ اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ فاضل باجوہ نے وہ فائل اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''شاہ جی! آپ کی یہ امانت آپ کے سپرد کر رہا ہوں۔ اچھی طرح دیکھ لیجئے۔

حیدر شاہ نے بڑی دلچسپی اور لگن کے ساتھ فائل لی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر مسرت کے نقوش نمایاں تھے۔ پھر اس نے پوری فائل دیکھنے کے بعد فاضل باجوہ سے کہا۔

''اس کے بدلے تمہیں جو کچھ درکار ہو مجھ سے مانگ لو باجوہ! اب یہ بتاؤ یہ بیوی بچے کیوں ساتھ ہیں تمہارے؟''

''صاحب جی! میں دھوکا دے کر نکل آیا ہوں۔ آپ کے بھیجے ہوئے شادی کارڈ کا سہارا لے کر میں چھٹی لے آیا ہوں۔ فخر خان صاحب نے اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی ابھی تک انہیں یہی اطلاع ملی ہے کہ خدانخواستہ آپ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ بہت خوش ہیں خان صاحب۔''

''میں انہیں اور خوش کر دوں گا۔ اب تو ان کی خوشیوں کا صحیح وقت آیا ہے۔'' حیدر شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔

''تو کیا اب تم نے فخر خان کی حویلی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دی ہے؟''

''شاہ جی! اب اس کے بعد کوئی گنجائش تھی وہاں رہنے کی؟ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ زندگی بچ جائے بہت بڑی بات ہے۔''

''تو کیا ارادہ رکھتے ہو میرے ہاں کام کرو۔ یہاں رہو۔''

''یہ دشمنی جس کا آغاز ہو گیا ہے میری پیدا کی ہوئی نہیں ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ میں چوہدریوں کے غضب کو برداشت نہیں کر سکوں گا۔ مجھے گمنامی کی زندگی ہی گزارنی چاہیے۔''

''ہوں لاہور جانا چاہتے ہو؟''

''جی--- شاہ جی! لاہور ہی جا رہا ہوں۔ یہ گاڑی میں نے لاہور ہی سے کرائے پر منگوائی ہے۔ گاڑی واپس کروں گا اور پھر وہاں کسی گمنام گوشے میں زندگی بسر کرنا شروع کر دوں گا۔''

''تم ایسا کرو یہ میں ایک پتہ لکھ دیتا ہوں۔ تمہیں دھرم پورہ جانا ہے۔ دھرم پورہ کے اس مکان پر پہنچ کر تم میرے بندے سے ملاقات کرو گے۔ وہ تمہارے لیے بہترین رہائش کا بندوبست کر دے گا۔ زندگی گزارنے کے لیے رقم تمہیں یہاں سے ملتی رہے گی اور منی آرڈر سے ملا کرے گی۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ تمہارا مجھ سے کوئی رابطہ ہے۔ فی الحال تم یہ پچیس ہزار روپے رکھ لو۔ یہ تمہارے کام آئیں گے۔''

حیدر شاہ نے ہزار ہزار کے پچیس نوٹ نکال کر فاضل باجوہ کو دیئے جس کو اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کر کے اپنی جیب کے اندرونی حصے میں رکھ لیا اور اس کے بعد وہ حیدر شاہ سے بولا۔

''شاہ جی! ہمیں صرف آپ کی محبت اور سہارے کی ضرورت ہے۔''

''ہاں میں تمہیں لکھ کر دیتا ہوں۔ کرم دین تمہاری ہر مشکل حل کر دے گا۔ تم بالکل
فکر مت کرو۔''

حیدر شاہ نے ایک چھوٹا سا رقعہ لکھ کر فاضل باجوہ کو دے دیا جسے فاضل باجوہ
احترام سے لے کر اپنے لباس میں رکھ لیا اور بولا۔

''اب اجازت چاہتا ہوں۔''

''ارے نہیں، اب ایسا بھی کیا کوئی پانی وانی پیو۔''

''شاہ جی! میں لاہور پہنچ کر ہی پانی پینا چاہتا ہوں۔ آپ میری مشکل کو سمجھیے۔ ہ
دشمن بہت خطرناک ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی اگر اسے یہ احساس ہو گیا کہ اس
ساتھ کوئی دھوکا کیا گیا ہے تو بس آپ سمجھ لیجئے۔ اس کے بعد ہماری جو درگت بنے گی۔
اللہ ہی جانتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ تم بہت زیادہ ڈر بھی رہے ہو۔ خیر میں تمہیں نہیں روک
گا۔ آؤ میرے ساتھ۔'' پھر حیدر شاہ فاضل باجوہ کے ساتھ باہر نکل آیا۔ باجوہ کی ب
اور بچے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ حیدر شاہ نے کہا۔

''بھابی جی! آپ یہاں آئیں یہ باجوہ صاحب بہت جلدی میں ہیں۔ پانی
نہیں پیا آپ نے ہمارا لیکن فکر نہ کریں آپ کی آگے کی زندگی بڑی پرسکون گزرے
تمام جھگڑوں سے الگ جو مہربانی آپ لوگوں نے ہم پر کی ہے وہ اتنی معمولی نہیں ہے
ہم آپ کو نظر انداز کر دیں۔''

فاضل باجوہ کی بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اتنے بڑے لوگوں کے سامنے ز
کھولنا بھی عجیب سا لگتا ہے۔ بہر حال وہ لوگ وہاں سے اٹھ گئے اور ایک بار پھر فا
باجوہ کرائے کی اس گاڑی میں آ بیٹھا۔ جو لاہور کی ایک کمپنی سے منگوائی گئی تھی۔ اس

چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ چوکنے انداز میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ آنکھوں میں
ایک حسرت بھری کیفیت تھی۔ بیوی نے اس کے بارے میں سوال کیا تو بولا۔

''دیکھو نئی زندگی کے لیے جدوجہد کر رہا ہوں۔ خدا کرے یہ جدوجہد کامیاب ہو
جائے۔ قصور میرا بالکل نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہے سلطانہ اب آگے تقدیر ہے۔''

''اللہ مالک ہے۔ آپ اس قدر فکر مند نہ ہوں۔''

فاضل باجوہ ڈرائیونگ کرتا رہا۔ انتہائی طویل اور لمبا سفر جاری تھا اور کئی گھنٹے تک
جاری رہا تھا۔ راستے میں جہاں بھی موقع ملا۔ باجوہ نے بیوی بچوں کے لیے کھانے کا
بندوبست کیا اور اس کے بعد آخر کار وہ لاہور میں داخل ہو گئے۔ لاہور میں پہنچنے کے بعد
سب سے پہلے اس نے اس کمپنی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ جہاں سے یہ کار
حاصل کی گئی تھی اور بیوی بچوں سمیت وہاں پہنچ گیا۔ یہاں پہنچنے کے بعد اس نے کار
معاوضے کے ساتھ واپس کی اور وہاں سے باہر نکل آیا۔ پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ سیدھا
ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ جب وہ ٹیکسی کا بل ادا کر کے اپنا مختصر سامان اٹھائے ریلوے
اسٹیشن میں داخل ہوا تو بیوی بچوں نے پھر سوال کر ڈالا۔

''کہیں اور جانے کا ارادہ ہے کیا؟''

''ہاں۔ سیدھا کراچی۔''

''لاہور میں نہیں رکیں گے۔ پہلے تو آپ کا پروگرام یہی تھا کہ لاہور میں قیام کریں
گے۔''

''تم نہیں سمجھتیں۔ اس وقت ہم زندگی کی تلاش میں دوڑ رہے ہیں۔ اپنے دوستوں
اور دشمنوں کو جتنا دھوکا دے سکتے ہیں۔ زندگی اتنی ہی محفوظ ہو سکتی ہے۔ جانتی ہو حیدر شاہ
صاحب نے مجھے ایک رقعہ دیا تھا اور کہا ہے کہ دھرم پورہ میں کسی شخص سے ملنا ہے۔ وہ

ہمارے لیے زندگی کی ساری آسائشوں کا بندوبست کر دے گا اس کے علاوہ حیدر شاہ صاحب نے یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ ہمیں ماہانہ معاوضہ دیتے رہیں گے۔ بقول ان کے جو دستاویزات ہم نے ان کے حوالے کیں ہیں وہ اس قدر قیمتی ہیں کہ زندگی بھر وہ ہمارا خرچ اٹھاتے رہیں تو انہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔''

''تو پھر---''

''لیکن میں زندگی کی حفاظت چاہتا ہوں۔ یہاں سے فوراً کراچی نکل جانا ضروری ہے۔ اصل میں کراچی کا انتخاب میں نے اس لیے کیا ہے کہ وہاں کی زندگی بالکل مختلف ہے۔ وہ ہر طرح کے لوگوں کو اپنے میں ضم کر لیتا ہے۔ وہاں کسی بھی محلے میں جا کر رہو برابر والا آدمی بھی تم سے یہ نہیں پوچھے گا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔ کرائے کا ایک مکان لیں گے اور خاموشی سے زندگی بسر کرنا شروع کر دیں گے۔ مجھے تھوڑا سا حلیہ تبدیل کرنا پڑے گا۔ بس سمجھ لو کہ زندگی کے لیے ضروری ہے۔ حیدر شاہ بے شک ہمارے بہت بڑے دوست ہیں۔ لیکن یہ کون جانے کہ یہ چوہدری کب کس کے دشمن ہو جائیں اور کب اپنے کسی مفاد کے لیے کس کو مہرہ یا بکرا بنا لیں۔ باپ رے باپ میں ذرا معلوم کر کے آتا ہوں کہ کراچی جانے کے لیے کون سی ٹرین کس وقت ملے گی اور ہمیں اس کے ٹکٹ کے حصول کے لیے کیا کرنا ہوگا۔''

فاضل باجوہ وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا اور بولا۔

''خدا کا شکر ہے یہاں سے نائٹ کوچ چلتی ہے۔ شام کو چھ بجے کراچی کے لیے ٹکٹ تو مل نہیں رہے تھے لیکن ہر مشکل حل ہو جاتی ہے۔ میں نے ٹکٹ حاصل کر لیے ہیں۔''

''ابھی تو سوا گھنٹہ باقی ہے۔''

''ہاں۔ دعا کرو اللہ یہ مشکل بھی ٹال دے۔ یہ سوا گھنٹہ نکل جائے اور ہم ٹرین میں بیٹھ کر چل پڑیں۔ فاضل باجوہ نے کہا اور اس کی بیوی آنکھیں بند کر کے گردن ہلانے لگی تھی۔

☆☆☆

الیاس خاں اور جبار خاں اپنے کام میں مصروف تھے۔ بس ایک مشغلہ ہوتا ہے چوہدریوں کا اگر نیکو کار ہوں آس پاس بکھرے ہوئے لوگوں کی زندگی سدھر جاتی ہے اور اگر غلط ہوں تو زندگی بے حد تلخ ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ خیر اپنے علاقے کے لوگوں کے لیے تو اتنے زیادہ تکلیف دہ نہیں تھے۔ بس جہاں کسی سے بگاڑ ہوا تو وہ مصیبت میں پڑ جاتا تھا لیکن آس پاس کے زمینداروں سے ان کے بہت زیادہ اچھے تعلقات نہیں تھے۔ اور اکھاڑ پچھاڑ چلتی ہی رہتی تھی فطرتاً سارے بہن بھائی ایک جیسے تھے۔ انور کی موت کے بعد دوسرا بھائی امیر علی اپنی رنگ رلیوں میں مصروف ہو گیا تھا۔ ان لوگوں میں ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے۔ یہ محبتوں کے پھیر میں پڑ کر تنہائیوں میں آنسو نہیں بہاتے بلکہ جو کھو بیٹھتے ہیں چاہے اس میں ان کی اپنی ہی غلطی کیوں نہ ہو اسے بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ اگر یاد رہا ہے تو صرف اتنا کہ کس سے کس سلسلے میں کیا دشمنی ہے۔ باقی سب خیریت ہوتی ہے۔

چنانچہ امیر علی تو تقریباً بھائی کو بھول ہی گیا تھا۔ بہت کم اس کی یاد آتی تھی لیکن جہاں تک الیاس خاں کا تعلق تھا وہ باپ تھا اور جب بھی اس کو بیٹا یاد آتا تھا اس کے سینے میں آگ دہکنے لگتی تھی لیکن ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ بہن کا سسرال تھا۔ جو مجرم تھا وہ ہاتھ نہیں لگتا تھا باقی لوگوں سے دشمنی کر کے کچھ حاصل نہیں تھا کیونکہ بات وہی شاہینہ کے سہاگ پر آ جاتی تھی۔ جبار خاں نے تو البتہ ایک بار کہا تھا۔

''بھائی جی! ہم چوہدریوں کی فطرت میں دشمنی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ شا
زیب اگر ہاتھ نہیں لگتا تو ہم اس کے بھائیوں سے تو بدلہ لے سکتے ہیں۔'' الیاس خا
نے نگاہیں اٹھا کر بھائی کو دیکھا اور بولا۔

''جبار خاں! سب سے بڑا مسئلہ تو شاہینہ کا ہے۔ بہن کے گھر کا بھی تو خیال کر
ہوتا ہے۔ اسی بات نے تو مار ڈالا ہے۔ ورنہ انور کی موت جب بھی یاد آتی ہے دل چاہ
ہے کہ جہانزیب کی حویلی کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا جائے۔ پر اس گھر کو کیسے راکھ کا ڈھیر بنا سک
ہیں جہاں بہن رہتی ہے۔''

''ٹھیک ہے جہانزیب ہمارا بہنوئی ہے' اورنگزیب تو بہنوئی نہیں ہے۔ ہمارے دل
میں انور کی آگ سلگ رہی ہے۔ ہم اس کا بدلا اورنگزیب سے تو لے سکتے ہیں۔
اورنگزیب کو اٹھا لو اور اعلان کرا دو کہ اگر شاہ زیب بھائی کی بچت چاہتا ہے تو ہمار
سامنے آ جائے۔''

''جذبات میں آ کر سوچ رہے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے کیا جہانزیب اس بات
قبول کر لے گا اور اس کے اثرات شاہینہ پر نہیں پڑیں گے۔''

''ہاتھ پاؤں توڑ کر ڈال دیں گے جہانزیب کے اگر اس نے شاہینہ کی طرف ٹیڑھ
نظر سے دیکھا تو۔''

''اور اس کے بعد ٹوٹے ہوئے ہاتھ پاؤں والے کو اپنا بہنوئی کہو گے۔'' الیا
خاں نے کہا۔

''مگر اورنگزیب کی تو بات کر سکتے ہیں آپ۔''

''وہی تو میں تم سے کہہ رہا ہوں ان لوگوں نے شاہ زیب کے سلسلے میں خامو
اختیار کر لی ہے اور کل کو اگر ہم شاہ زیب کو رسی سے باندھ کر علاقے کی سڑکوں پر گھمائ

اور جہانزیب نگاہ اٹھا کر دیکھ لے تو بات بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ وہ ایسا کبھی نہیں
کرے گا۔ یہ بات میں جانتا ہوں لیکن اورنگزیب اس معاملے میں بالکل بے گناہ ہے۔
اس سے کچھ گڑبڑ کرنا مناسب نہیں ہے اور پھر بیوی بچوں والا آدمی ہے۔ یہ دیکھو سب
سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ لوگ نرم طبیعت کے مالک ہیں اگر ذرا بھی اکڑ دکھاتے تو ہمیں
بھی اس کا حق پہنچتا تھا۔''

''مگر میرا دل نہیں بھولتا۔ میرا دل نہیں بھولتا اپنے بھتیجے کو۔ میں انور کو یاد کر کے روتا
ہوں۔''

''اوہ تو تیرا کیا خیال ہے جبار! کیا میرے دل میں اپنے بیٹے کا غم نہیں ہے۔ خدا
کی قسم دل تو چاہتا ہے کہ قتل عام شروع کر دوں۔ اتنے بندے ماروں اس کے بدلے میں
کہ لوگ یاد رکھیں مگر دیوانگی سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہ بے غیرت' بدمعاش بچا بچا پھر
رہا ہے۔ غضب کا بندہ ہے۔ پولیس کے قابو میں بھی نہیں آیا ابھی تک۔ اوہ میں کہتا ہوں
کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔''

''لمبا ہی نکل گیا ہے خاں جی! ایسا لگتا ہے جیسے ملک ہی چھوڑ گیا ہو۔''

''نہیں ملک نہیں چھوڑے گا وہ۔ تھوڑا سا مجھے بھی اندازہ ہے اور ابھی تم نے سنا
نہیں وہ چوہدری شہاب الدین کیا کہہ کر گیا ہے۔''

''ہاں۔ اب اس بارے میں کیا کہتے ہو تم؟''

''میں سمجھتا ہوں بات بڑے پائے کی ہے۔ سمجھ رہے ہو نا۔ شاہینہ نے جو کچھ بتایا
ہے شہاب الدین کے بارے میں اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ زیب اس لڑکی
پر مرمٹا ہے۔ ہوتا ہے ایسا ہوتا ہے اور اب شہاب الدین نے جو کہانی سنائی ہے۔ میرا
مطلب ہے جو شاہینہ کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔ اس سے وہ دو کردار ہمارے سامنے

آتے ہیں۔یعنی کریم بخش اوراس کی بیوی۔میں سمجھتا ہوں ہمیں یہ کر لینا چاہیے۔''

''کرو گے کیا' اسے یہاں لاکر رکھو گے؟''

''کسے؟''

''کریم بخش کی بات کر رہا ہوں۔''

''اوہ۔نہیں یار! کہیں بھی رکھا جا سکتا ہے انہیں۔کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں ہے۔ وہاں رکھا جا سکتا ہے جہاں لاکھو رہتا ہے۔لاکھو سے کہہ دیا جائے گا کہ ان دونوں کا خیال رکھے اور پھر ذرا سوچ سمجھ کر کام کر لیتے ہیں۔ان لوگوں سے یہ کہہ کر کہ انہیں تھوڑی لائیں گے کہ ہم انہیں اغوا کر رہے ہیں۔کوئی ایسی دھوکے والی بات۔''

''ہاں۔ہو تو سکتا ہے یہ بتاؤ اس سے فائدہ کیا ہوگا؟''

''فائدہ یہ ہوگا کہ اس کے بدلے ہم بھی اس لڑکی لجیا کو تلاش کریں گے اور پھر اگر وہ ہاتھ لگ گئی تو اسے اٹھا کر وہیں لے آئیں گے۔اس طرح شاہ زیب ہماری مٹھی میں ہوگا۔جہاں بھی اس کا نام ونشان ملا اس سے کہہ دیا جائے گا کہ اگر لجیا کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو ہم سے آکر ملے۔'' دونوں سوچ میں ڈوب گئے پھر جبار خاں نے کہا۔

''مگر اس سلسلے میں کام کون کرے گا؟''

''کوئی بھی' اپنے کسی بندے کو لگا دیتے ہیں اس کام پر۔''

''نہیں۔میں خود انہیں لے کر آؤں گا۔''

''تم؟''

''ہاں۔'' جبار خاں نے کہا اور الیاس خاں تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں ڈوب گیا پھر بولا۔

''خیر کوئی مشکل کام نہیں ہے۔مگر شہاب الدین سے ملاقات نہیں کرو گے تم ایک

عام آدمی کی حیثیت سے جاؤ گے۔''

''ہاں۔بالکل ٹھیک ہے ایسا ہی کریں گے۔''

''تو بس ٹھیک ہے تم یہ کام کر لو اور کوشش کرنا کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔میں خاص طور سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ جب تم وہاں جاؤ گے تو شہاب الدین کو اس کے بارے میں پتہ نہیں چلنا چاہیے۔''

''نہیں چلے گا بھائی جی! اب اتنا بے وقوف تو نہیں ہوں میں۔حلیہ بدل کر جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔بندے ساتھ رکھنا کسی بھی جگہ دھوکا کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اس کی تو آپ فکر نہ کریں۔شاہ زیب کی بہرحال اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ راستے میں مجھ پر حملہ کرے۔''

''ایک بات اور بھی ہے۔اس نے کبھی اپنی طرف سے حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔بس اس کا ٹارگٹ بوئے آسل ہی رہا ہے۔جذباتی لونڈا ہے۔بے وقوفی کی حرکتیں کر رہا ہے۔اپنا سارا مستقبل تو وہ تباہ کر بیٹھا۔اب پولیس اسے بھلا کہاں چھوڑے گی۔ پولیس کے بندے تک مار دیئے ہیں اس نے' اس کی بچت تو ناممکن ہی ہے۔''

دونوں بھائی بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔پھر جبار خاں نے کہا۔

''ٹھیک ہے تو پھر ایسا ہی کر لیا جائے۔اسے ہم اسی طرح گھیریں گے۔کام آہستہ ہوگا کوششیں کرتے رہیں گے ہم اور اس کے بعد اندازہ لگائیں گے کہ اب وہ کیا کر رہا ہے۔لیکن کریم بخش کو حاصل کر لینا بہت مناسب رہے گا۔اس لڑکی لجیا کی تلاش کے لیے بھی ہم بھرپور کوششیں کریں گے۔بلکہ اگر ہو سکا تو شہاب الدین سے بھی رابطہ قائم کریں گے۔''

"یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے تم کریم بخش کو اپنے قابو میں کرلو۔" الیاس خاں نے کہا اور جبار خاں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

پھر اس نے تیاریاں کیں تھیں۔ دو گن مین ساتھ لیے۔ تھوڑا سا حلیہ تبدیل کیا اور مطلوبہ علاقے کی جانب پجیرو میں بیٹھ کر چل پڑا۔ اپنے ساتھ اس نے ایک اور آدمی کو بھی لیا تھا جو اس کا خاص آدمی تھا اور اس کا نام حفیظ خان تھا۔ حفیظ خان سے باتیں کرتا ہوا وہ اپنی منزل کی جانب چلا جا رہا تھا پھر مطلوبہ جگہ سے تھوڑے فاصلے پر اس نے گاڑی رکوادی اور پھر حفیظ خان سے بولا۔

"حفیظ خان! ہم تیرا یہاں انتظار کریں گے۔ پتہ اپنے دماغ میں رکھ، جا کر معلوم کر کہ کریم بخش نامی آدمی وہاں رہتا ہے یا نہیں۔ ملے گا یا نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" حفیظ خان نے کہا اور پتہ لگاتا ہوا کریم بخش کے گھر پہنچ گیا۔

دروازے پر کنڈی بجائی تو سکینہ نے دروازہ کھولا تھا۔ کریم بخش بھی گھر پر ہی موجود تھا۔ دکان تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ میاں بیوی بیٹی کے غم میں ڈوبے رہتے تھے۔ گھر میں جو کچھ تھا۔ وہی کھا پی کر زندگی گزار رہے تھے۔ بڑا مسئلہ بن گیا تھا ان کی زندگی کے لیے۔ گھر چھوڑ کر کہیں جاتے تو اس بات کا خوف تھا کہ کہیں لجیا واپس نہ آ جائے اور انہیں گھر میں نہ پائے تو کہاں بھٹکتی پھرے گی۔ بے چارے غم کے مارے آنسوؤں میں زندگی گزار رہے تھے۔ حفیظ خان نے سکینہ کی شکل دیکھی تو کہنے لگا۔

"کریم بخش صاحب کا گھر یہی ہے؟"

"ہاں بھائی!"

"میں کریم بخش صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"میں انہیں بھیجتی ہوں۔" سکینہ نے کہا اور اندر پہنچ گئی۔ کریم بخش ایک چار پائی پر

لیٹا ہوا چھت کو گھور رہا تھا۔ سکینہ نے کہا۔

"کوئی بندہ ملنے آیا ہے آپ سے۔"

"کون ہے؟"

"پتہ نہیں۔ نئی شکل ہے، پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" کریم بخش اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازہ پر آ گیا۔ حفیظ خان نے اسے دیکھ کر سلام کیا اور بولا۔

"بابا کریم بخش آپ ہی ہیں؟"

"ہاں بھائی ہم ہیں۔"

"بابا صاحب! آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے آپ کی بیٹی گم ہو گئی ہے نا اور راجہ شہاب الدین صاحب نے اسے اغوا کیا ہے؟" کریم بخش چونک کر آنے والے کو دیکھنے لگا تو حفیظ خان نے جلدی سے کہا۔

"دیکھیں۔ مجھے بھی اللہ کا ایک بندہ سمجھیں۔ میری نیت پر کوئی شبہ نہ کریں۔ میں بہت دور سے چل کر آیا ہوں اور ایک ایسے آدمی کا بندہ ہوں جو آپ کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ اس کا نام آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ اصل میں آپ یوں سمجھ لیں کہ شہاب الدین کی اور اس کی چلتی ہے۔ وہ بھی ایک چوہدری ہے۔ جب اسے یہ پتہ چلا کہ شہاب الدین نے آپ کی بیٹی کو غائب کرایا ہے تو اس نے شہاب الدین کے خلاف آپ کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ ایسا کریں اپنے کچھ کپڑے ساتھ باندھ لیں اور ہمارے ساتھ چلیں۔ ہم آپ کی بیٹی کو تلاش کر کے آپ تک پہنچائیں گے۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے۔"

"مگر بھائی دیکھیں۔۔۔"

"کچھ نہیں۔ ہمارے مالک نے ہم سے کہا ہے کہ اگر آپ خوشی سے ہمارے ساتھ آنا پسند کریں تو آ جائیے۔ ورنہ آپ کو مجبور نہیں کیا جائے۔ ہم آپ کی مدد کرنا چاہتے

ہیں۔''

''مگر میری بات تو سنو۔''

''جی فرمائیے۔''

''تمہارے مالک کا نام کیا ہے؟''

''میں نے کہا نے ابھی نام نہ سنئے تو بہتر ہے۔ آپ مل لیں مالک سے تھوڑے فاصلے پر وہ جیپ میں موجود ہیں۔''

''عجیب بات ہے ایسا کرتا ہوں۔ میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔ سکینہ کو ابھی رہنے دو--- ٹھیک ہے نا؟''

''میں نے کہا نا سب کچھ آپ کی مرضی پر منحصر ہے لیکن اگر بہن جی کو آپ ساتھ لے لیتے تو کوئی مشکل نہ رہتی۔ گھر میں تالا لگا دیجیے۔ اگر آپ کو ہمارے ساتھ جانا پسند نہ آئے تو واپس آ جائیے گا۔ یہ کوئی مشکل کام تو نہیں ہے۔''

''نہیں ایسا کرو پہلے میں چلتا ہوں۔ پھر بعد میں سکینہ آ جائے گی۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ بہن جی کو یہ خبر کر دیجیے۔'' کریم بخش اندر آیا۔ سکینہ دروازے کے قریب ہی ٹیک لگائے کھڑی تھی، کہنے لگی۔

''کہیں کوئی دھوکا نہ ہو؟''

''ارے میرے ساتھ کون دھوکا کرے گا۔ کیا رکھا ہے ہم میں۔ راجہ شہاب الدین تو لجیا کی وجہ سے ہمارے پیچھے پڑ گیا تھا اور بھلا ہماری کسی سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے اللہ نے ہمارے لیے کوئی سبیل نکالی ہو۔ دن رات تو دعائیں مانگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوبست کر دے ہمارا۔''

''تو پھر میں بھی چلوں۔''

''نہیں میں بات کر کے آتا ہوں ذرا دیکھوں تو سہی کون اللہ کا بندہ ہے۔ جو ہماری مدد کرنا چاہتا ہے۔'' کریم بخش نے کہا اور سکینہ نے گردن ہلا دی۔ کریم بخش اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔

حفیظ صاحب نے چالاکی سے کام لیا تھا۔ بھرا پرا محلہ تھا۔ اگر وہ سختی کی کوشش کرتا تو محلے والے پیچھے لگ جاتے اور پھر یہ کام مشکل ہو جاتا اور اگر یہ کام مشکل ہو جاتا تو الیاس خاں مار مار کر اس کی کھال اتار دیتا۔

بہرحال کریم بخش تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے اس پجیرو تک پہنچ گیا۔ اس کو دیکھ کر ہی یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ کسی بڑے زمیندار کی ہے۔ ادھر جبار خاں نے جب حفیظ خان کو ایک آدمی کے ساتھ آتے دیکھا تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''یہ حفیظ خان کسے بلا لایا اس کی تو بیوی بھی تھی۔'' حفیظ خان آخر کار کریم بخش کو ساتھ لے کر پجیرو کے قریب پہنچا۔ اس نے فوراً کہا۔

''شاہ جی! یہ بابا کریم بخش ہیں۔ میں نے تو ان سے کہا تھا کہ چاچی کو بھی ساتھ لے لیں لیکن انہوں نے کہا پہلے یہ آپ سے مل لیں۔ میں نے بتا دیا ہے انہیں کہ ہم ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔'' جبار خاں فوراً صورتحال کو سمجھ گیا اور اس نے کہا۔

''آئیے بابا صاحب! آئیے اندر بیٹھ جائیے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے ہمیں آپ کے بارے میں تفصیلات معلوم ہوئی ہیں۔ ہم آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر جبار خاں نے حفیظ خان کو اشارہ کیا اور حفیظ خان وہاں سے فوراً واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ کریم بخش کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے دوبارہ زنجیر بجائی تو سکینہ نے دروازہ کھولا۔

''آئیے چاچی جی! بابا صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ اپنے کپڑے وغیرہ لے لیجیے

اور بابا صاحب کے بھی کپڑے لے لیجیے۔ بابا صاحب کہتے ہیں کہ سب ٹھیک ہے۔ آپ کی بیٹی کا پتہ بھی جلد مل جائے گا۔ آپ آ جائیے۔ سیدھی سادھی عورت نے اس کی ہدایت کے مطابق اپنا سامان سمیٹا۔ ایک چھوٹا سا تالا گھر کی کنڈی میں لٹکایا اور اس کے بعد پوٹلی بغل میں دبا کر حفیظ خان کے ساتھ چل پڑی۔

ادھر کریم بخش کو پجیرو میں بیٹھا کر جبار خاں اس سے باتیں کر رہا تھا کہ اتنی دیر میں سکینہ بھی وہاں پہنچ گئی اور اسے بھی پجیرو میں بٹھا دیا گیا۔ کریم بخش نے اسے دیکھا تو چونک کر بولا۔

''ارے تو--- تم کیسے آ گئیں؟''

''کیا--- کیا مجھے تم نے نہیں بلایا تھا؟'' سکینہ وحشت زدہ لہجے میں بولی۔

ادھر جبار خاں کے اشارے پر پجیرو اسٹارٹ کر کے واپس موڑ دی تھی۔

''ارے بھائی! کہاں لے جا رہے ہو ہیں۔ کس عذاب میں گرفتار کر دیا تو نے میرے مالک ہمیں۔ بھائی--- سنو تو سہی کہاں لے جا رہے ہو ہمیں؟ ہم گھر نہیں چھوڑنا چاہتے۔ ہماری لجیا اگر واپس آئی تو گھر میں تالا دیکھ کر کیا سوچے گی۔ بھائی رحم کر دو ہمارے اوپر۔''

''دیکھو بابا! ہم جو کچھ کر رہے ہیں تمہاری بیٹی کے لیے ہی کر رہے ہیں۔ تم اس بات کی بالکل پرواہ مت کرو اور ویسے بھی تم یہ بتاؤ کہ پڑوس میں تمہارا جاننے والا کوئی نہیں ہے۔''

''سارے جاننے والے ہیں۔''

''تو لجیا وہاں پہنچ بھی گئی تو کسی کے بھی گھر میں پہنچ جائے گی۔ ہم تو ہیں ہی اس کی تلاش میں۔''

''کیا تم شہاب الدین کے آدمی ہو؟''

''لعنت بھیجتے ہیں شہاب الدین پر۔ تم بالکل فکر مت کرو۔ ہم شہاب الدین کے دشمن ہیں اور اس کی دشمنی کی وجہ سے ہی لجیا کو تلاش کر رہے ہیں۔ ہم تمہاری بیٹی تمہارے پاس پہنچائیں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔'' کریم بخش ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ کوٹ رادھا کشن کے اس گھر میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں کے بارے میں فیصلہ کیا گیا تھا۔ یہاں پہنچنے کے بعد جبار خاں نے ساری تفصیلات کریم بخش سے معلوم کیں اس کے ساتھ بہت ہی ہمدردی کا رویہ اختیار کیا اور وہاں موجود نوکر کو ہدایت کی کہ ان دونوں کے کھانے پینے اور آرام و آسائش کا بھرپور خیال رکھا جائے۔ کوٹ رادھا کشن میں یہ بڑا سا مکان جبار خاں کی ملکیت ہی تھا اور یہاں کی دیکھ بھال ایک ملازم کیا کرتا تھا۔ کیونکہ قرب و جوار میں جبار خاں اور الیاس خاں کی زمینیں موجود تھیں۔ یہاں بھی فصل اگائی جاتی تھی اور یہ لوگ کبھی کبھی یہاں آ کر اس مکان میں قیام کیا کرتے تھے۔ بہرحال کریم بخش اور اس کی بیوی کو یہاں منتقل کر دیا گیا تھا اور پھر جبار خاں واپس چل پڑا تھا۔ واپس آ کر اس نے الیاس خاں کو رپورٹ دی۔

''بھائی جی! کام ہو گیا ہے۔ ان دونوں کو کوٹ رادھا کشن منتقل کر دیا گیا ہے۔''

''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس لڑکی کو کیسے تلاش کیا جائے۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تمہارے جانے کے بعد بھی میں کافی دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا ہوں اور مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ یہ کام زیادہ آسان ہوگا۔ کاش وہ لڑکی بھی ہمیں مل جائے۔''

''اس کے لیے ایک کام کیا جا سکتا ہے۔''

"کیا، بولو؟"

"یا تو شاہینہ سے یہ مسئلہ طے کیا جائے یا پھر ہم خود جہانزیب وغیرہ سے ملاقات کرتے ہیں اور اس بارے میں زیادہ تفصیلات معلوم کرتے ہیں بلکہ اگر ایسا کیا جائے تو کیسا رہے گا کہ ہم جہانزیب سے شہاب الدین کے بارے میں براہ راست تفصیل معلوم کریں اور پھر شہاب الدین سے رابطہ قائم کریں اور اس سے کہیں کہ وہ لڑکی کچھ دن کے لیے ہمارے حوالے کر دے۔ ہم اس کے بدلے شاہ زیب سے مشترکہ طور پر بدلہ لیں گے۔ شہاب الدین کو دوستی کی پیشکش کی جائے۔ جہانزیب اور اورنگزیب تو اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کرسکیں گے۔ ہم کوشش کریں۔"

"یار! تو پھر سیدھی سیدھی ناک کیوں نہیں پکڑتے۔"

"کیا مطلب؟"

"خود شہاب الدین سے ملو اور اس سے کہو کہ تم شاہ زیب کے سلسلے میں اس کی مدد کرنا چاہتے ہو۔ خود بھی اس کا ساتھ دو اور اس سے کہو کہ وہ بھی ہمارا ساتھ دے۔ ہم لوگ مشترکہ طور پر کام کیوں نہ کریں؟"

"بات سمجھ میں آنے والی ہے۔ یہ کیا جاسکتا ہے---واقعی یہ کیا جاسکتا ہے۔" جبار خاں نے پرخیال انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

شاہ زیب ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھتا ہوا اس گھر کے احاطے میں داخل ہوا اور پودوں اور جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا دبے قدموں سے چل پڑا۔ پھر وہ کھڑکی پر پہنچا جس سے مدھم سی روشنی جھلک رہی تھی۔ اس نے شیشے کے قریب ہو کر اندر جھانکا۔ وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ کھڑکی کا ایک شیشہ چٹخا ہوا تھا۔ اس نے انگلی گھسا کر شیشہ آدھے

سے زیادہ توڑ دیا۔ مگر ٹوٹے ہوئے شیشے کی تیز دھار سے انگلی کٹ گئی اور خون بہنے لگا۔ اس نے انگلی ہونٹوں سے دبا کر خون چوسا اور گردن جھکا کر زمین پر تھوکا پھر ٹوٹے ہوئے شیشے کے اندر جلدی سے ہاتھ ڈالا اور چٹخنی کھول دی۔ اس نے کھڑکی کا ایک پٹ ہٹا کر راستہ بنایا۔ اوپر چڑھا اور اندر کود گیا۔

سامنے میز پر لیمپ رکھا تھا۔ لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں کمرے کا ماحول ابھر رہا تھا۔ کمرے میں کوئی خاص چیز نہیں تھی البتہ اندر جانے کے لیے ایک دروازہ اور نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد شاہ زیب اس دروازے کی طرف چل پڑا اور اس سے دوسری طرف چلا گیا۔

یہ مختصر سی کوٹھڑی تھی۔ ایک دیوار کی بلندی پر روشندان تھا اور اس پر لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں جڑی ہوئی تھیں۔ روشندان سے ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ شاہ زیب دروازے کے پاس کھڑے ہو کر سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس کی نگاہیں اب اس ماحول سے پوری طرح واقف ہوگئی تھیں۔ مکان کے بارے میں اسے یہ اندازہ تھا کہ غیر آباد تو نہیں ہے لیکن وہاں کون رہتا ہے اور کہاں ہے؟ اس کا اسے کوئی علم نہیں تھا۔

بہرحال تھوڑی دیر تک وہ وہیں کھڑا رہا جس مصیبت سے بچ کر یہاں تک پہنچا تھا اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہ جگہ کیسی ہی ہو۔ بہرحال اس کے لیے ایک مناسب پناہ گاہ تھی۔ اس کے بدن پر پولیس کی وردی تھی اور ہاتھ میں پولیس کی رائفل۔ ایسی صورتحال میں اگر اسے مکان کا مالک دیکھ بھی لے تو فوری طور پر کوئی خطرہ پیش نہیں آ سکتا تھا۔ شاہ زیب کوئی بھی بات کہہ کر اسے مطمئن کرسکتا تھا کہ وہ کسی کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آیا ہے اور اسے شبہ ہے کہ جس بندے کا تعاقب کرتا ہوا وہ یہاں تک پہنچا

ہے۔ وہ اس گھر میں داخل ہوا ہے۔ بہر حال پہلے اس گھر کا اچھی طرح جائزہ لے لیا جائے۔

چنانچہ شاہ زیب وہاں سے باہر نکل آیا۔ بڑا سا صحن تھا جس میں درخت جھول رہے تھے۔ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ ایک بغلی برآمدہ تھا جس میں کوئی چارپائی بچھائے گہری نیند سو رہا تھا۔ شاہ زیب نے تھوڑی دیر تک کچھ سوچا اور اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ سونے والا گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے خراٹے گونج رہے تھے۔ بھاری جسامت کا ایک چوکیدار قسم کا آدمی تھا۔ شاہ زیب ادھر ادھر دیکھتا ہوا وہاں سے بھی آگے بڑھا۔ ایک لمحے کے لیے تو اس نے یہ سوچا تھا کہ اس شخص کے ہاتھ پاؤں باندھ دے لیکن پھر اس نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ ذرا گھر کا جائزہ تو لے لیا جائے۔ کھانے پینے کی کوئی چیز ہو سکتا ہے وہاں موجود ہو۔''

چنانچہ اس کی تلاش میں وہ آگے بڑھا تو ایک کمرے میں اسے کچھ آوازیں سنائی دیں کمرے میں مٹی کے تیل کی لالٹین جل رہی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اسے دو افراد نظر آئے۔ ایک نے چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ دوسری بغیر چادر کے تھی۔ اچانک ہی اسے ایک آواز سنائی دی۔

''اللہ میری توبہ ان مچھروں نے تو زندگی عذاب کر دی۔ سو گئے---''

نجانے کیوں شاہ زیب کو یہ آواز جانی پہچانی محسوس ہوئی اور وہ ایک دم چونک کر ادھر دیکھنے لگا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اسے سونے والوں کے چہرے تو نظر نہیں آئے لیکن نسوانی آواز بدستور اس کے ذہن میں دھماکے کر رہی تھی۔ یہ آواز--- یہ آواز کس کی ہے؟ اس نے دروازے پر دباؤ ڈالا تو دروازہ کھل گیا۔

وہ تھوڑی دیر تک تو کچھ سوچتا رہا۔ لالٹین کی روشنی مدھم کر دی گئی تھی۔ اگر اسے تیز

کر کے ان لوگوں کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی جاتی تو ممکن ہو سکتا تھا کہ ان کے نقوش اسے نظر آ جاتے۔ شاہ زیب اپنے تجسس کو دبا نہیں سکا تھا۔ اب جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ چنانچہ وہ آگے بڑھا۔ پہلے اس نے لالٹین اٹھائی پھر اس کے بعد جیسے ہی آگے بڑھا عورت اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے خوف سے اس کی آواز بند ہو گئی ہو لیکن شاہ زیب نے لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا اور ایک دم اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یہ سکینہ تھی لجیا کی ماں سکینہ۔ ناقابل یقین نہ سمجھ میں آنے والی بات۔ دوسری شخصیت ظاہر ہے کریم بخش کے علاوہ اور کس کی ہو سکتی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سکینہ کو دیکھتا رہا اور سکینہ اس طرح جھومنے لگی جیسے اسے چکر آ رہے ہوں۔ اس وقت دوسری آواز ابھری۔

''ایسا کرتے ہیں چارپائی باہر لے چلتے ہیں۔ وہاں کم از کم ٹھنڈی ہوا تو ہو گی۔ چادر اوڑھ لیں گے پھر مچھر نہیں کاٹیں گے۔ سکینہ--- سکینہ---''

آواز کریم بخش کی تھی لیکن سکینہ کے منہ سے اب بھی کوئی آواز نہیں نکلی تو کریم بخش اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے بھی سامنے بیٹھے ہوئے ایک ایسے وجود کو دیکھ لیا تھا جس کے ہاتھ میں لالٹین تھی اور بدن پر پولیس کی وردی لیکن لالٹین چونکہ نیچی تھی اس لیے چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کریم بخش ایک لمحے کے لیے تو خاموش رہا۔ پھر اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

''کون ہو بھائی؟ کیا بات ہے؟ کیا کر رہے ہو؟ رات تو بہت ہو چکی ہے۔ کون ہو بھائی؟ بتاؤ تو سہی؟''

شاہ زیب نے لالٹین ایک اونچی جگہ رکھی اور آگے بڑھتے ہوئے قریب پہنچ گیا۔

''بابا کریم بخش! میں ہوں آپ کا شاہ زیب۔''

''کون؟'' کریم بخش بری طرح اچھل پڑا۔ ادھر سکینہ کی آواز ابھری۔

''شاہ زیب!---ہاں یہ تو اپنا شاہ زیب ہے---شاہ زیب بیٹا---تم' تم---''

''ہاں چچی---میں ہی ہوں۔'' شاہ زیب نے بھاری لہجے میں کہا اور سکینہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔

''ارے بیٹا شاہ زیب! برباد ہو گئے۔ ہم تو مارے گئے---ہم تو پتر---ہمارا سب کچھ ہی لٹ گیا۔ ہائے ہماری لجیا! ہم سے دور ہو گئی۔ ارے بیٹا! تم نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔''

''کیا بک بک کر رہی ہو سکینہ! اس بے چارے نے کیا کیا ہے۔ یہ تو ہماری تقدیر تھی۔ وہ بہت بعد میں ہوا جو بہت پہلے ہونے والا تھا۔ کیا کر سکتا ہے کوئی سکینہ' کوئی کیا کر سکتا ہے۔ اس وقت بھی تو چوہدری شہاب الدین نے ہماری بیٹی کے لیے چکر چلانے شروع کر دیئے تھے وہ تو بس عارضی طور پر شاہ زیب نے صورتحال سنبھال لی تھی۔ وہ بے چارہ بھی کیا کرتا۔''

''ہائے اگر وہ ہماری بیٹی کو اپنا بنا لیتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ لجیا اس طرح دربدر نہ ہوتی۔ ارے پتہ نہیں زندہ ہے یا مر گئی وہ---ہائے میری بیٹی۔'' وہ زاروقطار روتی رہی۔

شاہ زیب پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ ان دونوں کی یہاں موجودگی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ یہ بھی تقدیر کا انوکھا کھیل تھا کہ وہ اپنی مشکل میں گرفتار ہو کر یہاں پہنچا تھا یہ پہلا گھر اگر اسے نظر نہ آتا اور کوئی اور جگہ ہوتی تو وہ اسی طرح اس گھر میں جانے کی بھی کوشش کرتا لیکن یہ انوکھا اتفاق۔ البتہ اسے شدید حیرت تھی اس بات پر اور کوئی ایسی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ جو ان دونوں کی یہاں موجودگی کا جواز پیش کر سکے۔

بہر حال پہلے انہیں سنبھالنا ضروری تھا۔ باہر سوتے ہوئے آدمی کو وہ دیکھ آیا تھا اور وہی ہوا جس کا اسے خطرہ تھا۔ سکینہ کے رونے کی آواز غالباً رات کے سناٹے میں باہر چلی گئی تھی۔ شاہ زیب بھی کچھ وقت کے لیے باہر کی طرف توجہ نہیں دے سکا تھا اور اس لمحے وہ آن موجود ہوا تھا لمبے چوڑے بدن والا اس نے واسکٹ پہنی ہوئی تھی اور سر پر پگڑ باندھا ہوا تھا۔ شاہ زیب نے ایک لمحے کے اندر اپنے پیچھے کسی کو محسوس کیا اور دوسرے لمحے وہ سنبھل گیا۔ پیچھے موجود آدمی کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔

''کون ہے اوئے تو یہاں کیسے گھس آیا؟''

شاہ زیب فوراً ہی پلٹ پڑا اور سخت لہجے میں بولا۔

''پولیس۔ اندھے ہو کیا دیکھتے نہیں ہو کہ میں پولیس والا ہوں۔'' آنے والے نے واقعی اب تک شاہ زیب کی وردی پر غور نہیں کیا تھا۔ اب جو اس نے شاہ زیب کی وردی دیکھی اور اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی بندوق تو وہ ایک دم سیدھا ہو گیا۔

''مگر افسر صاحب جی! آپ اس طرح کیسے گھس آئے ہو؟ یہ تو پرائیویٹ جگہ ہے جی۔ پولیس کا یہاں کیا کام؟''

''پولیس کا یہاں کیا کام ہے؟ یہ میں تمہیں ابھی بتائے دیتا ہوں۔ چلو باہر لیٹ کر میرا انتظار کرو۔''

''ٹھیک ہے جی! پر ہماری بات تو سن لو۔''

''میں تمہاری بات سن لوں گا اور ایک بات میں تمہیں پہلے سے بتائے دیتا ہوں۔ میں تمہیں یہاں کوئی نقصان پہنچانے نہیں آیا۔ یہ ایک اتنا ہی ضروری کام تھا۔''

''مگر صاحب جی!''

''مگر کے بچے پیچھے ہٹتا ہے یا۔'' شاہ زیب نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور اس

کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے دھکیل دیا۔ گوشت کا یہ پہاڑ چند قدم پیچھے ہٹ کر سید
کھڑا ہو گیا تھا۔ شاہ زیب نے پہلے تو یہ سوچا تھا کہ ان لوگوں سے یہاں ان کی موجود
کے بارے مین معلوم کیا جائے لیکن اب اس شخص کے آجانے کے بعد صورتحال ایک د
بدل گئی تھی۔ اس نے ایک نگاہ کریم بخش اور اس کی بیوی کو دیکھا اور اس کے بعد باہر نک
آیا۔

''ہاں اب تو بول کیا پوچھ رہا تھا؟''

''صاحب جی!''

''یہاں جو کوئی اور ہے اسے بھی بلا لو۔ میں تم لوگوں کو ایک بہت ہی خاص با
بتانا چاہتا ہوں۔'' شاہ زیب نے چالاکی سے کہا۔

''صاحب جی! یہاں ہمارے علاوہ کوئی نہیں ہوتا۔ ہم ہی اس گھر کی نگرانی کر
ہیں۔ آپ کو پتہ نہیں ہے یہ گھر بہت بڑے زمیندار کا ہے۔''

''یہی تو معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ۔۔۔''

''خاں جی کو جب یہ پتا چلے گا کہ پولیس یہاں اندر داخل ہوگئی ہے تو آپ کے ح
میں اچھا نہیں ہوگا۔''

''دیکھو باہر سے پولیس نے اس گھر کو پوری طرح گھیر رکھا ہے۔ ہمیں یہاں تلاش
لینی تھی۔ یہ بتاؤ کہ یہ لوگ کب یہاں پہنچے؟''

''دوسرا دن ہے جی۔''

''ہوں۔ اب تم اپنے مالک کے بارے میں بتاؤ؟''

''وہ جی ہمارے مالک کا نام الیاس خاں' جبار خاں ہے۔ یہ انہی کا گھر ہے اور د
ہی ان دونوں کو لے کر یہاں آئے ہیں۔''

''تمہیں پتہ ہے کہ انہوں نے انہیں حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے۔''

''او جی ہم تو نہیں جانتے بے جا کیا چیز ہوتی ہے۔ پر ہم تو یہاں چوکیدار ہیں اور
ہمیں ہدایت ہے۔ آپ ہمیں اجازت دو تو ہم خاں جی کو اطلاع کر دیں۔''

''کیسے اطلاع کرو گے کیا یہاں ٹیلی فون ہے؟''

''نہیں ٹیلی فون تو نہیں ہے۔ یہاں سے جائیں گے گھوڑ سوار کو دوڑائیں گے اور
اس سے کہیں گے کہ خاں جی کو جا کر اطلاع دے دیں کہ پولیس آئی ہے۔''

''باہر قدم رکھا تو پولیس والے مار مار کر تمہارا حلیہ بگاڑ دیں گے۔''

''مگر کیوں صاحب جی؟''

''اچھا ایک کام کرو۔ ادھر آؤ۔'' شاہ زیب نے کہا اور بھاری بھرکم چوکیدار آگے
بڑھ آیا۔

شاہ زیب کا زوردار گھونسہ اس کی کنپٹی پر پڑا۔ وہ چکرا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اسی
وقت شاہ زیب نے بڑھ کر اس کے پیٹ پر لات ماری اور وہ آواز نکال کر اوندھا ہو گیا
پھر شاہ زیب نے اس کا سر پکڑ کر اس کو زمین پر دے پٹخا۔ اس کا پورا چہرہ زمین پر لگا۔ پختہ
زمین تھی اور چہرہ بڑی زور سے لگا تھا۔ اس کی پیشانی پھٹ گئی۔ ناک کی ہڈی بھی غالباً
ٹوٹ گئی تھی۔ اس کے منہ اور ناک سے خون بہہ نکلا۔ پھٹی ہوئی پیشانی سے بھی خون بہا
تھا۔ کریم بخش اور اس کی بیوی سکینہ نے منہ پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

شاہ زیب نے اور کئی لاتیں اس طرح کی اس چوکیدار کو رسید کیں کہ وہ بے ہوش
ہو گیا۔ شاہ زیب جھک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے اس کی ٹانگ پکڑی اور اسے گھسیٹتا
ہوا اس جگہ لے گیا جہاں وہ چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ اب اسے اٹھا کر چارپائی پر ڈالنا تو
یک مشکل کام تھا لیکن بہرحال شاہ زیب نے چارپائی کی رسی کھول کر اسے چارپائی سے

ہی کس کر باندھ دیا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد وہ واپس ان کے پاس پہنچا اور انہیں کہا۔

''ہاں' اب یہ بتائیے پورا واقعہ کیا ہوا تھا؟''

شاہ زیب کا ذہن بری طرح چکرا رہا تھا۔ کریم بخش بتانے لگا کہ کس طرح انہیں دھوکا دے کر یہاں تک لایا گیا ہے اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ انہیں یہاں لانے والے کون ہیں؟ کریم بخش نے روتے ہوئے کہا۔

''ہم تو یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ایسا کون سا ہم نے بڑا گناہ کیا ہے جس کی سزا ہمیں اس انداز میں مل رہی ہے۔ ہم نے تو ہمیشہ یہ کوشش کی کہ کسی کو ہم سے نقصان نہ پہنچے. پتہ نہیں کیا ہوا ہے؟''

''بابا صاحب! آپ ہی بزرگوں سے میں نے سنا ہے کہ انسان پر امتحان کا کڑا وقت بھی آتا ہے اور یہی وہ لمحے ہوتے ہیں جب انسان اپنا ایمان قائم رکھتے ہیں۔ اس کڑے وقت کو گزار جائیں آپ۔ اپنے آپ کو اکیلا نہ سمجھیں اس کڑے وقت میں' میں بھی آپ کے ساتھ شریک ہوں اور جہاں تک رہا بابا صاحب! لجیا کی بازیابی کا معاملہ میرا ایمان ہے کہ وہ مجھے اور آپ کو ضرور مل جائے گی۔ وہ بھی مشکل حالات سے گزر رہی ہوگی۔ میں مسلسل کوشش کر رہا ہوں کہ اس کے بارے میں پتہ چل جائے۔ شہاب الدین نے اپنی حویلی کے گرد سینکڑوں پہرے دار بٹھا رکھے ہیں۔ بس ایک بار وہ میرے ہاتھ لگ جائے اس کے بعد آپ تماشا دیکھئے کہ میں اس کا کیا حال کرتا ہوں۔ اس وقت تک ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔''

''بیٹا! یہ لوگ کون تھے جو اس طرح ہمیں وہاں سے نکال لے آئے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہماری اس قدر اہمیت کیسے ہوگئی ہے۔ جہاں تک مظلوم لجیا کا تعلق ہے بس یہی ایک معاملہ ہے جو سمجھ میں آتا ہے باقی تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''سب کچھ سمجھ میں آتا ہے اور آجائے گا آپ اطمینان رکھئے۔'' شاہ زیب نے کہا اور اس کے بعد اس پورے گھر کی تلاشی لے ڈالی۔

یہاں بھی اسے تھوڑی سی رقم ہاتھ لگی تھی۔ اس وقت یہ رقم انتہائی ضروری تھی تاکہ کسی موقع پر اسے اس طرح کی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے اور اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو لے کر یہاں سے کہاں جائے۔ اس کے پاس تو اپنا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ ذہن دوڑاتا رہا اور اس کے بعد ایک ہی ترکیب اس کے ذہن میں آئی۔ ایک ہی نام اس کے ذہن میں آیا۔ ابھی تک وہ حیدر شاہ کی گڈ بک میں تھا اور حیدر شاہ اس کے ساتھ بہتر سلوک کر سکتا تھا۔ اس تک پہنچنے کا معاملہ اصل معاملہ تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ باہر نکلے۔ یہاں جس طرح پہنچا تھا۔ اس سے اسے بالکل اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کون سے علاقے میں ہے اور لاہور سے اس کا کتنا فاصلہ ہے۔ قرب و جوار کی آبادیوں میں ہی گھومتا پھر رہا تھا۔

غرض یہ کہ اس نے کریم بخش اور سکینہ کو تیار کیا اور اس کے بعد باہر نکل آیا۔ صبح ہونے میں ابھی وقت تھا لیکن صبح کا اجالا پھوٹنے لگا تھا۔ جب وہ وہاں سے نکل کر بازار میں پہنچا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ گوٹ رادھا کشن کا علاقہ ہے۔ اس نے اس مکان سے ایک کھیس لے لیا تھا۔ یہ کھیس اس نے مقامی دیہاتیوں کی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا۔ ایک کھیس سکینہ کو بھی دیا تھا جبکہ کریم بخش کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔

بہر حال تلاش کرتا ہوا وہ بس کے اڈے تک پہنچ گیا اور پھر ایک بس میں بیٹھ کر وہ تینوں وہاں سے چل پڑے۔ راستے میں وہ علاقہ پڑتا تھا جہاں سے حیدر شاہ تک رسائی ممکن تھی۔ دن کی روشنی بس ہی میں پھوٹی تھی اور پھر تقریباً سات بجے تک وہ اس علاقے میں پہنچ گیا۔ جہاں حیدر شاہ کی حویلی تھی۔ تینوں نیچے اتر آئے اور شاہ زیب ان کی

راہنمائی کرتا ہوا حیدر شاہ کی حویلی میں پہنچ گیا۔ حویلی کا پراسرار ماحول جوں کا توں تھا۔ حیدر شاہ کی عجیب وغریب زندگی بھی بڑی عجیب تھی۔

بہر حال حیدر شاہ تک رسائی ہوگئی۔ حیدر شاہ جلدی اٹھنے کا عادی تھا اور اس وقت وہ اپنے باغ میں ٹہل رہا تھا۔ جب اس نے ان تینوں کو دیکھا۔ شاہ زیب کو پہچان کر وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب پہنچ گیا۔

''اوئے شاہے آ بھئی آ--- بڑا یاد کر رہا تھا تجھے میں۔ کہاں غائب ہو گیا تھا؟ ہیں آ جا یہ کون ہیں تیرے؟''

''شاہ جی! بڑی مشکل کا شکار ہیں بے چارے آپ کے پاس لے کر آیا ہوں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ اس وقت ان کے لیے آپ کے گھر سے اچھی پناہ گاہ اور کوئی نہیں ہوگی۔ شاہ جی! انہیں اس اعتماد کے ساتھ لایا ہوں کہ انہیں کچھ عرصے آپ اپنی پناہ میں رکھیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ جب تو اعتماد کے ساتھ لایا ہے تو ہم تیرے اس اعتماد کو دھوکا تو نہیں دیں گے۔ آجا' آجا انہیں ساتھ رکھنا ہے یا الگ بیٹھ کر بات کرے گا۔''

''شاہ جی! آپ ان کے لیے۔''

''ٹھیک ہے۔'' حیدر شاہ نے کہا اور پھر ایک ملازم کو آواز دے کر کہا۔

''ان دونوں کو عزت کے ساتھ مہمان خانے میں ٹھہراؤ۔ نہانے دھونے کا بندوبست کرو۔ کپڑے بھی نہیں ہیں ان کے پاس ان کے لیے کپڑے مہیا کرو۔ کھلاؤ پلاؤ اور آرام سے سلا دو۔ اور سنو--- جسے بھی ان کے ساتھ ڈیوٹی پر لگاؤ اسے ہدایت کر دو کہ انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ میرا حکم ہے۔''

''جو حکم شاہ جی!'' ملازم نے کہا اور ادب سے کریم بخش اور سکینہ کو لے کر چل پڑا۔

شاہ زیب کو اس وقت اپنے فیصلے پر انتہائی خوشی ہو رہی تھی۔ حیدر شاہ کا انتخاب کر کے اس نے واقعی عقلمندی کا ثبوت دیا تھا لیکن اسے اس بات پر حیرت تھی کہ حیدر شاہ کھلے عام منظر عام پر آ گیا ہے۔ جبکہ اس نے اپنی موت کا اعلان کر دیا تھا۔ حیدر شاہ اسے اپنے ساتھ لے کر کمرے میں پہنچ گیا اور بولا۔

''تو بھی بیٹھ جا۔ تھکا ہارا آیا ہوگا۔ مگر تجھ سے تھوڑی دیر باتیں کروں گا اس کے بعد تو بھی آرام کرنا سمجھا۔ یہاں بالکل بے فکر ہو جا کتنے ہی غم اپنے پیچھے پیچھے لے کر آیا ہو مگر وہ اس حویلی کے دروازے سے باہر رہیں گے۔ حیدر شاہ اپنے دوستوں کو ہمیشہ بھرپور تحفظ دیتا ہے۔''

شاہ زیب نے دل ہی دل میں سوچا کہ حیدر شاہ تم مکرم شاہ کے ہم شکل ہو اور مکرم شاہ نے میری جس طرح مدد کی ہے میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ حیدر شاہ' شاہ زیب کو لے کر بیٹھ گیا پھر اس نے کہا۔

''یہ بتاؤ کہ باجوہ سے ملاقات ہوئی کہ نہیں۔ باجوہ بتا رہا تھا کہ تو راستے میں ہی گم ہو گیا تھا۔''

''ہاں شاہ جی! میں جن مشکلات کا شکار ہوں وہ آپ کے علم میں ہیں۔''

''یہ کون ہیں تیرے جنہیں تو اپنے ساتھ لایا ہے؟''

''شاہ جی! یہ اس لڑکی کے ماں باپ ہیں جس سے میں بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ اگر زندگی نے میرا ساتھ دیا تو میں اس سے شادی کروں گا۔ اس لڑکی کو اغوا کر لیا گیا ہے اور یہ بے چارے اغوا کرنے والوں کے لیے فٹ بال بنے ہوئے ہیں۔''

''اوئے یار ایک بات کہوں تجھ سے تو بھی ہنگامی بندہ ہے۔ نچلا بیٹھنا ہی نہیں جانتا۔ اب اس کا روگ بھی لگا لیا تو نے اپنے سر۔''

''شاہ جی! میں زندگی کے انہی لمحات سے گزر رہا ہوں جو انسانی زندگی کا حصہ
ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں غلط کر رہا ہوں یا صحیح کر رہا ہوں۔''

''اوہ صحیح ہے بھئی صحیح ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ باجوہ نے وہ دستاویز میرے پاس
پہنچا دیں ہیں اور اب میں بہت جلد منظر عام پر آنے والا ہوں۔ ظاہر ہے فخر خان کو صحیح
طور پر اب پتہ چلے گا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں۔'' حیدر شاہ یہ کہہ کر ہنسا اور بولا۔

''اور اس میں مجھے تیری مدد حاصل رہی۔ یہ بات میں بھول نہیں سکتا۔ اوہ دیکھ
زمینداروں کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے اللہ نے بہت کچھ دیا ہے ہمیں۔ پر ہماری آن
سب سے بڑی چیز ہوتی ہے اب اس فخر خان کو دیکھو چاروں طرف سے جھگڑے مول
لیے بیٹھا ہے۔ ادھر الیاس خاں اور جبار خاں کی زمینوں کا معاملہ ہے ادھر ہم سے پنگا
ہوا ہے۔ ایسی منہ کی کھائے گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ زمینیں تو اب اسے ہمارے
حوالے کرنی ہی پڑیں گی۔ ان دستاویزات کی مدد سے ہم اس پر جو بم بلاسٹ کریں گے
وہ بھی کیا یاد کرے گا۔''

''جی شاہ جی! اللہ آپ کو مبارک کرے اور یہ دعائیں میں آپ کو اس لیے دے رہا
ہوں کہ آپ حق پر ہیں۔''

''اوہ۔ وہ لڑکی کا کیا قصہ ہے بھئی۔ ذرا مجھے تفصیل سے بتا۔'' حیدر شاہ نے کہا
اور شاہ زیب، حیدر شاہ کو لجیا کے بارے میں بتانے لگا۔

حیدر شاہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک ملازم
چائے لیے ہوئے آ گیا۔ حیدر شاہ نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور بولا۔

''ٹھیک ہے جا۔'' ملازم چلا گیا تو حیدر شاہ نے کہا۔

''چائے پی جائے۔'' شاہ زیب نے چائے کی پیالی اٹھالی تھی کچھ دیر تک سوچتا رہا

پھر اس نے کہا۔

''یہ تو بڑی بری ہوئی ہے شہاب الدین بہت برا بندہ ہے۔ ہماری تو خیر اس سے
کوئی ملاقات نہیں ہوئی لیکن یہ واقعی افسوسناک بات ہے۔ کم از کم اپنی مملکت میں بچیوں
کو تو تحفظ ملنا چاہیے۔ یہ تو بڑے کمینے پن کی بات ہے۔ ٹھیک ہے میں بھی سوچوں گا کہ
اس کے خلاف کیا کیا جا سکتا ہے۔ تو بے فکر رہ تو نے میری مدد کی ہے میں ہر طرح تیری
مدد کے لیے تیار ہوں۔''

''شاہ جی! جس طرح بھی بن پڑے میں لجیا کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ باقی رہا
دوسرا معاملہ تو یہ بات تو طے ہے کہ الیاس خاں اور جبار خاں جب تک میں زندہ ہوں ان
زمینوں پر بھٹہ نہیں بنا سکتے۔ اب میری زندگی کے صرف دو مقصد رہ گئے ہیں۔''

''ہاں سمجھتا ہوں۔ سمجھتا ہوں۔ اب ایسا کر چائے پی تو نے۔ اب تھوڑی دیر کے
بعد نہا دھو کے آرام کر لے۔ یہاں تم کسی بھی قسم کی فکر نہ کرنا۔ جب تیری ساری تھکن اتر
جائے تو اس کے بعد باہر نکلنا ابھی کوئی ایسا مشن تو ہے نہیں تیرے سامنے جس کے نتیجے
میں لجیا فوراً ہی تیرے ہاتھ آ جائے۔ تھوڑا سا انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔''

''جانتا ہوں شاہ جی!'' شاہ زیب نے جواب دیا اور پھر وہ حیدر شاہ کی ہدایت کے
مطابق آرام کرنے چل پڑا۔

لیکن آرام کرنے سے پہلے وہ کریم بخش اور سکینہ کے پاس گیا تھا۔ دونوں ایک
کشادہ اور وسیع کمرے میں اعلیٰ درجے کی مسہری پر بیٹھے ہوئے تھے لیکن ان کے دلوں پر
جو زخم تھا وہ انہیں بھلا کہاں چین لینے دے سکتا تھا۔ سکینہ اس وقت بھی رو رہی تھی۔ شاہ
زیب اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

''چاچی! رونے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ تو بزرگ لوگ ہو جی آپ نے اپنی

زندگیاں برائیوں سے دور گزاری ہیں۔ آپ دعا کرو اللہ سے اللہ آپ کی دعا ضرور سن
لے گا۔''

''بیٹا! باتیں کر رہے تھے ہم کہ دیکھ کیسی کیسی جگہ زندگی گزارنی پڑ رہی ہے۔ پتہ نہیں
تقدیر ایسے کھیل کیوں کھیلتی ہے۔ ارے ہم تو بے ضرر لوگ ہیں نہ دنیا میں کسی کو نقصان
پہنچانے کی کوشش کی۔ نہ کسی کے خلاف کوئی کارروائی کی۔ بس سر جھکا کر جیتے رہے ہیں۔
کوئی چار باتیں بھی کہہ گیا تو یہ سوچ کر برداشت کر لیں کہ چل بھائی تو ہی بڑا۔ ہمارے
ساتھ پتہ نہیں کیوں ایسا ہوا ہے۔''

''زندگی امتحان لیتی ہے چاچا جی! آپ خدا پر بھروسہ رکھئے۔ انشاءاللہ سب ٹھیک
ہو جائے گا۔ ویسے ایک بات کہنا چاہتا ہوں آپ سے۔''

''ہاں کہو بیٹا!''

''جن لوگوں نے آپ کو وہاں سے اٹھا کر اس گھر میں قید کیا تھا ظاہر ہے ان کے
ارادے اچھے نہیں تھے اور وہ آپ سے کوئی فائدہ ہی اٹھانا چاہتے تھے لیکن اللہ کا کرم ہے
کہ آپ مشکل سے بچ گئے۔ اب میں آپ کی حفاظت کا بھی ذمے دار ہوں کیونکہ آپ
کی ان پریشانیوں میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ چاچا جی! اس حویلی کے مالک حیدر شاہ
صاحب ہیں۔ مجھ سے محبت کرنے والے ہیں۔ میں ان سے درخواست کروں گا کہ اس
وقت تک آپ کو اپنے پاس رکھیں جب تک کہ لجیا نہ مل جائے۔ یہاں آپ کو کوئی تکلیف
نہیں ہوگی۔ آپ اطمینان سے یہاں رہیں اور سکون کی زندگی گزاریں۔ چاچا جی! یہ جگہ
آپ کے لیے انتہائی بہتر رہے گی۔ یہاں آپ کو ہر طرح کا تحفظ ملے گا اور آپ یہ سمجھ
لیجئے کہ مجھے اطمینان رہے گا کہ آپ محفوظ جگہ موجود ہیں اگر مجھے اس طرف سے اطمینان
رہے گا تو پھر میں لجیا کو آسانی سے تلاش کر لوں گا۔''

''بیٹا! لجیا کے سلسلے میں تمہیں کتنی پریشانی ہو رہی ہے۔''

''چاچا جی! آپ میرے بڑے ہو کوئی اور بات تو نہیں کہنا چاہتا آپ سے لیکن اتنا
ضرور کہوں گا کہ لجیا اب میری زندگی کا مقصد بھی ہے۔ وہ صرف آپ کی ہی ضرورت یا
مشکل نہیں ہے۔ اس کے لیے عزت بھرے الفاظ یہی ہو سکتے ہیں اللہ اسے زندگی دے۔
جن مشکلوں سے وہ گزرے گی وہ اس کی نہیں ہماری مشکلیں ہوں گی۔ جب وہ مشکلوں کا
پل عبور کر کے ہم تک پہنچے تو ہمارے لیے ایک خوشنما تازہ تازہ کھلے پھول کی مانند ہو گی
جس پر کوئی دھبہ نہیں دیکھا جائے گا۔''

شاہ زیب نے اپنے طور پر اپنے اندر کی وضاحت کر دی تھی۔ اب یہ الگ بات
ہے کہ یہ معصوم دیہاتی سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں۔

بہر حال وہ ان لوگوں کو دلاسے دے کر اور ان کو یہاں رہنے پر آمادہ کر کے اپنی
آرام گاہ کی طرف چل پڑا اور پھر وہ خوب ہی سویا تھا۔ رات کا کھانا ان لوگوں کو ساتھ ہی
دیا گیا۔ حیدر شاہ نے اسے پھر طلب کر لیا تھا۔ تب حیدر شاہ نے کہا۔

''مجھے ایک بات بتاؤ شاہو! وہ یہ کہ اب تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔ دیکھو ہم
چوہدریوں کا نیٹ ورک اتنا کمزور نہیں ہوتا۔ شہاب الدین کے بارے میں بھی معلومات
حاصل کر رہا ہوں میں۔ اصل میں پوری طرح تمہاری طرف متوجہ ہو جاتا اور لجیا کو تلاش
کرنے کی کوشش کرتا لیکن صورتحال یہ ہے کہ مجھے اس دستاویزی پروگرام پر فوری طور پر
عمل کرنا ہے اور میں اپنی ساری توجہ اپنے دشمن کی طرف مبذول رکھنا چاہتا ہوں۔ ایسی
صورت میں تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔''

''شاہ جی! آپ نے جس محبت کا اظہار کیا ہے میرے ساتھ.....''

''اوئے میری بات سن۔ میری بات سن۔ اس دنیا میں کوئی غرض سے خالی نہیں

ہوتا۔ ہر بندہ پہلے اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے کے بارے میں۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے تو اگر میرے ساتھ یہ سلوک نہ کرتا جو تو نے کیا۔ تیری وجہ سے تجھے اندازہ ہے میری گردن بھی اونچی ہوئی ہے اور بہت بڑی بچت بھی ہوئی ہے میری۔ ورنہ کروڑوں روپے کا نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا۔ کوئی معمولی بات نہیں ہوتی ہے کہنے کو تو آسانی سے کہہ دیا جائے۔ کروڑ' دس کروڑ' پچاس کروڑ لیکن ایک جان ہوتی ہے اس کی سمجھ رہا ہے نا۔''

''جی شاہ جی! مجھے خوشی ہے کہ میری حقیری سی کوششیں آپ کے کچھ کام آسکیں۔''

''اچھا اب یہ بتاؤ کہ میں اس سلسلے میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ اصل میں جیسا کہ میں نے تجھے بتایا کہ ذرا اس معاملے سے نمٹ لوں اس کے بعد تیرا بھرپور طریقے سے ساتھ دے سکتا ہوں۔''

''آپ آرام سے اپنا کام کرو شاہ جی! میری تو زندگی کا معاملہ ہی ذرا مشکل ہے۔ مجھے دیکھنا ہے کہ میں اپنی زندگی کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

''تو ایک کام کر کچھ دن کے لیے لاہور چلا جا۔ وہاں رک اور دیکھ کہ صورتحال کیا ہوتی ہے۔ میں نے باجوہ کو لاہور بھجوا دیا ہے۔ تم بھی وہیں چلے جاؤ۔ تھوڑے سے دن ادھر گزارو اور صورتحال کا جائزہ لیتے رہے اور ان لوگوں کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ تم نے انہیں سمجھا دیا ہے نا۔''

''جی شاہ جی!''

''بس تو ٹھیک ہے لاہور چلے جاؤ۔ میں تمہیں باجوہ کا پتہ بتائے دیتا ہوں۔''

شاہ زیب نے گردن ہلا دی تھی۔ اب اس سلسلے میں حیدر شاہ کے کندھے کا سہارا لے کر تو کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنے طور پر کارروائی کرنی تھی۔ حیدر شاہ اپنی محبت میں

کچھ بھی کہہ رہا ہے وہ اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے۔ کم از کم اس وقت یہ ضرور ہوا تھا کہ کریم بخش اور سکینہ کی رہائش کا بندوبست ہو گیا تھا اور وہ بھی محفوظ جگہ یہ بات ابھی تک صیغہ راز میں تھی کہ الیاس خاں اور جبار خاں نے ان دونوں کو وہاں سے کیوں اٹھایا تھا اور اپنی تحویل میں کیوں رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اتنی سی بات تو سمجھ میں آتی تھی کہ معاملہ شاہ زیب کا ہی تھا لیکن ایسا کیوں کیا گیا تھا اور اس کا پس منظر کیا تھا۔ یہ معلوم کرنے کا تجسس شاہ زیب کے دل میں تھا اور وہ اس سلسلے میں کوئی مناسب منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

بہر حال اسے یہاں سے تو نکلنا ہی تھا۔ وہ کافی دیر تک سوچتا رہا تھا اور آخر کار اس نے یہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ بعد کی بات ہے کہ لاہور جائے گا یا نہیں۔ آخری بار وہ کریم بخش اور سکینہ سے ملا اور اس نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگوں کے لیے یہ جگہ بہت مناسب ہے۔ ویسے بھی وہاں آپ کے دل کو لگی رہتی۔ جہاں تک لجیا کا معاملہ ہے کہ کہیں وہ حالات سے لڑتی جھگڑتی واپس وہاں نہ پہنچے اور آپ کو وہاں نہ پا کر کسی اور احساس کا شکار ہو جائے تو آپ اطمینان رکھیں پتہ نہیں آپ نے یہ بندوبست کیا ہے یا نہیں۔ مگر میں یہ ضرور جا کر کر دوں گا کہ آپ کے آس پڑوس کے لوگوں کو اس بات کی خبر ضرور دوں گا کہ اگر لجیا اپنا گھر تلاش کرتی ہوئی آئے تو وہ اسے اپنے پاس روک لیں اور یہ میرا وعدہ ہے آپ سے کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہاں جا کر لجیا کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہوں گا۔ اول تو امکانات اس بات کے ہی ہیں کہ لجیا کے وہاں جانے سے پہلے ہی میں اس کا سراغ لگا لوں گا۔ بس ایک بار صرف ایک بار راجہ شہاب الدین میرے چنگل میں آ جائے۔ آپ یقین کریں کہ اپنے منہ سے بتائے گا کہ لجیا کہاں ہے۔''

''تم کہاں جا رہے ہو؟''

''ہاں ظاہر ہے میں یہاں رک کر تو انتظار نہیں کر سکتا۔ بس آپ لوگوں کی طرف سے میرا دل مطمئن رہے گا کہ آپ پرسکون ہیں۔'' کریم بخش نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''آہ۔ کاش! تم ہمارے بیٹے ہوتے؟''

''میں آپ ہی کا بیٹا ہوں۔''

''نہیں بیٹا! تم نے اس وقت ہماری بات نہیں مانی تھی۔''

''چاچی! ہر شخص کے اپنے حالات ہوتے ہیں۔ آپ کو میرے بارے میں کیا معلوم۔ کیا بتاؤں میں آپ کو اپنے بارے میں کہ میں کن الجھنوں کا شکار ہوں۔ چاچی میں بھی زندگی کے بہت بڑے دریا سے لڑ رہا ہوں۔ اس کی مخالف سمت تیر رہا ہوں۔ میں دریا کے بہاؤ میں بہہ جانے والوں میں سے نہیں ہوں۔ جس وقت میں اپنا کنارا پا لوں گا آپ اطمینان رکھو۔ میرا کنارہ آپ ہی کا گھر ہوگا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔''

شاہ زیب نے کہا اور وہاں سے واپسی کے لیے قدم اٹھا لیے۔

☆☆☆

فاضل باجوہ کو گئے ہوئے دس دن گزر چکے تھے۔ حالانکہ وہ دو تین دن کے لیے یہ کہہ کر گیا تھا اور فخر خان کے ہاں کام کرنے والے کسی آدمی کی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ فخر خان سے کچھ کہے اور اس کی تعمیل نہ کرے یا فخر خان سے کوئی وعدہ کیا جائے اور اس وعدے کی پابندی نہ ہو۔ فخر خان اتنا ہی سخت گیر انسان تھا۔ پھر یہ فاضل باجوہ کو کیا سوجھی کہ اس نے پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔ فخر خان نے ایک اور کارندے کو بلایا اور اس سے فاضل باجوہ کے بارے میں پوچھا۔

''اوہ۔ کچھ کہہ کر گیا ہے یہ کہ کب تک آ کر مرے گا۔ اس کی اتنی ہمت کیسے ہوگئی

کہ ہم سے پوچھے بغیر ضرورت سے زیادہ رک گیا۔''

''خان جی! ہو سکتا ہے بیمار ہو گیا ہو۔''

''اوئے تو بیمار ہو کر بھی ادھر ہی آ کر مرنا تھا۔ یہاں آ کر بیمار ہو لیتا۔ جاؤ کسی سے معلوم کرو اس کے بارے میں۔''

''ٹھیک ہے شاہ جی! پتہ چلاتے ہیں ہم۔'' ملازم نے کہا ابھی وہ واپسی کے لیے مڑا ہی تھا کہ ایک اور ملازم اندر آ گیا۔

''وہ شاہ جی! لاہور سے یوسف خان صاحب آئے ہیں۔''

''اوہ کون یوسف خان؟''

''وہ جی یوسف خان ایڈووکیٹ۔''

''بغیر کسی خبر کے آ گیا۔ بلاؤ---اسے بٹھاؤ آتا ہوں میں۔'' فخر خان نے کہا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ ڈرائینگ روم میں داخل ہو گیا اور ڈرائینگ روم میں بیٹھا ہوا عمر رسیدہ شخص جو چہرے سے کافی پروقار نظر آتا تھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''سلام عرض کرتا ہوں خان جی!''

''وعلیکم السلام--- بیٹھو خان صاحب! کہو کیسے ہو؟ طبیعت شبیعت ٹھیک ہے۔ ایک دم کیسے آنا ہو گیا؟''

''خان جی! حیران ہو کر آیا ہوں۔''

''حیران ہو کر؟''

''ہاں خان جی! کچھ عجیب سی بات ہوئی ہے۔ جو میری سمجھ میں تو بالکل نہیں آئی۔''

''کیا عجیب بات ہوئی خان صاحب! کھل کر بات کرو۔ آپ عمر والے آدمی ہیں۔ ہم بزرگی کی عزت کرتے ہیں لیکن ہمارے اندر ایک بڑی خرابی ہے۔ گول مول

بات ہم سے برداشت نہیں ہوتی۔ ہوا کیا ہے؟''

''وہ جناب عالی! حیدر شاہ صاحب کی طرف سے ان زمینوں کی سپردگی کی بات کی گئی ہے اور یہ با قاعدہ سرکاری نوٹس ہے کہ پندرہ دن کے اندر اندر زمینیں حیدر شاہ کی تحویل میں دے دی جائیں۔''

''اوہ خان ---اوہ خان صاحب---اوہ خان صاحب! تاریخیں دیکھی ہیں تم نے؟''

''مطلب نہیں سمجھا خان جی؟''

''اوہ۔کب کی بات کر رہے ہو۔ یہ سرکاری آرڈر کتنے عرصے پہلے ایشو ہوئے اور تمہیں پتا ہے کہ حیدر شاہ تو مر چکا ہے۔''

''جی۔''

''مر چکا ہے حیدر شاہ! دین دنیا کی خبر رکھا کرو۔''

''سر! آپ تاریخیں دیکھ لیجئے۔ یہ تو بالکل تازہ ترین تاریخیں ہیں۔ تین دن پہلے یہ نوٹس ایشو ہوا ہے۔''

''اوہ دکھاؤ یار! سب لوگ میرا دماغ خراب کرنے کو تلے رہتے ہیں۔ وہ نوٹس کیا عالم بالا سے ملا ہے۔حیدر شاہ تو مر چکا ہے یہ تو پرانی بات ہے۔کبھی اخبار وغیرہ بھی دیکھ لیا کرو۔ ایڈووکیٹ صاحب فخر خان نے اپنی مخصوص جہالت سے کہا اور وہ کاغذات دیکھنے لگا۔ جو یوسف خان نے اس کے حوالے کئے تھے۔کاغذات پر اس نے تاریخیں دیکھیں۔حیدر شاہ کے دستخط دیکھے۔ وہ چکرا کر رہ گیا۔

''اوہ بھئی حیدر شاہ تو مر گیا ہے۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔''

''آپ دیکھ لیجئے اس نوٹس کا جواب بھی دینا ہے۔''

''ہوں دیکھ تو لیں گے ہم لیکن آپ کو معلوم ہے کہ زمینوں کی سپردگی کے جو معاہدے ہوئے تھے وہ دستاویز جو کسی وقت حیدر شاہ کو دی گئیں تھیں۔کینسل کر کے ہم نے اپنی تحویل میں لے لی ہیں۔اب حیدر شاہ کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ وہ زمینیں اس نے ہم سے خرید لی تھیں۔کوئی سودے کا پروف ہی نہیں ہے۔نہ کوئی گواہ ہے۔جو گواہ ہے وہ حیرت سے کہیں گے کہ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ زمینوں کا سودا ہی نہیں ہوا تھا۔''

''خان جی! اگر آپ اس بات پر اطمینان رکھتے ہیں تو ظاہر ہے۔ میں تو ضد نہیں کروں گا لیکن یہ نوٹس کسی بنیاد پر ہی دیا گیا ہے اور یقینی طور پر عدالت میں وہ دستاویزات پیش کی جائیں گی جو زمین کی فروخت کے لیے تیار کی گئیں ہیں۔''

''اوئے کدھر سے پیش کی جائیں گی بھئی' میں دکھاتا ہوں تمہیں وہ دستاویزات جو لکھی گئیں تھیں اور پھر اسے ملتوی کر دیا گیا تھا۔بیٹھو ادھر ہی۔'' فخر خان نے غصیلے لہجے میں کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

''اوئے یہ کتے دا پتر کدھر مر کر رہ گیا ہے۔ سارے کام اسی کی تحویل میں تو تھے۔'' فخر خان بولا اور خود اس جگہ پہنچ گیا جہاں دستاویزات محفوظ کی گئیں تھیں۔

''یہ دستاویزات بے شک فاضل باجوہ ہی نے یہاں رکھیں تھیں لیکن فخر خان کے علم میں تھیں۔فاضل باجوہ پر وہ بھرپور اعتماد رکھتا تھا اور اسے یقین تھا کہ فاضل باجوہ کی گردن بے شک کٹ جائے لیکن وہ دستاویزات کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔

اس نے وہ تجوری کھولی جس میں دستاویزات رکھی ہوئی تھیں اور جیسے ہی تجوری کا ڈھکن کھلا اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ دستاویزات کا فائل وہاں موجود نہیں تھا۔فخر خان پھٹی پھٹی آنکھوں سے خالی تجوری کو دیکھتا رہ گیا تھا اور اس کے منہ سے

غراہٹ نکلی۔

''اوئے فاضل باجوہ! کیا تیری گمشدگی معنی خیز ہے۔ یہ دستاویزات کہاں گئیں یہاں سے۔ اب کس سے پوچھوں۔ اوئے فخر بہت زیادہ اپنے اوپر بھروسہ بھی موت کا باعث ہوتا ہے۔ اوئے یہ دستاویزات آخر گئیں کہاں۔ اوئے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچا جاسکتا کہ فاضل باجوہ چوٹ کر گیا۔ اوئے ہوئے ہوئے ہوئے۔ یہ تو ایک لمبی پلاننگ معلوم ہوتی ہے۔ یہ قصہ کیا ہے۔ کیا ہے یہ قصہ---اوئے نہیں بھئی ایسا نہیں ہوسکتا۔''

وہ دیر تک کھڑا بڑبڑاتا رہا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی دماغی کیفیت خراب ہوگئی تھی۔ یہ تصور اس کے لیے بے حد ہولناک تھا کہ دستاویزات غائب ہوگئیں ہیں اور اب اس کی چہیتی زمینیں حیدر شاہ کے قبضے میں چلی جائیں گی لیکن حیدر شاہ! اوئے سارے کے سارے حرام زادے نکلے ہیں۔ میرے کسی بندے نے بھی مجھے خبر نہیں دی۔ ادھر تو اپنے لوگ موجود ہیں۔

بہر حال اس وقت یوسف خان کے سلسلے میں کام کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے تجوری بند کی اور واپسی کے لیے قدم اٹھا دیئے۔ یوسف خان ایڈووکیٹ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ فخر خان اندر داخل ہوا تو اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ ایک نگاہ میں یوسف خان نے اندازہ لگا لیا کہ فخر خان جس کروفر سے گیا تھا۔ اس کروفر سے واپس نہیں آیا۔ تاہم اس نے اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا اور فخر خان سے بولا۔

''لگتا ہے یوسف خان صاحب! کوئی لمبی پلاننگ ہوئی ہے۔ آپ یوں سمجھ لو کہ ایک طرح سے میرے سر پر کلہاڑی مار دی گئی ہے۔ بہت لمبی پلاننگ ہوئی ہے۔ وہ دستاویز غائب ہیں جو میں نے واپس حاصل کر لی تھیں اور میرا ایک خاص بندہ بھی غائب

ہے جس کا نام فاضل باجوہ ہے۔''

''مجھے فرمائیے میں کیا کروں؟''

''اوہ بھئی۔ ایڈووکیٹ میں ہوں یا تم؟ دیکھو میں تمہیں ساری تفصیل بتائے دیتا ہوں۔ حیدر شاہ سے میری ڈیل ہوئی تھی۔ دستاویزات تیار ہوئیں تھیں اور بعد میں جب یہ ڈیل کینسل ہوئی تو میں نے وہ دستاویزات حیدر شاہ سے واپس لے لیں۔ کچھ دن پہلے مجھے اطلاع ملی کہ حیدر شاہ اچانک ہی موت کا شکار ہوگیا ہے۔ اوہ یار! کی تدفین بھی ہوئی تھی اور اس میں میرے جاننے والوں نے بھی شرکت کی تھی۔ مجھے کنفرم کیا تھا انہوں نے کہ حیدر شاہ مر چکا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا تم۔ دستاویزات میرے قبضے میں تھیں لیکن اب وہ موجود نہیں ہیں۔'' یوسف خان گہری نگاہوں سے فخر خان کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے خان جی! کہ کوئی بہت بڑی سازش ہوئی ہے۔ ایک طرف دستاویزات غائب کر دی گئیں ہیں دوسری طرف حیدر شاہ کی جعلی موت کا ڈرامہ رچایا گیا ہے۔ آپ دیکھ لیجئے اندر کے معاملات دوسرے ہوتے ہیں اور سرکاری معاملات دوسرے۔ اگر دستاویزات حیدر شاہ کے قبضے میں ہیں اور اس نے یہ دعویٰ کیا ہے تو آپ کو زمینوں سے بے دخل ہونا پڑے گا۔''

''اوئے نہیں ہونا پڑے گا اوئے۔ تباہی مچا دوں گا میں۔ اتنے بندے ماروں گا کہ دیکھنے والے دیکھیں گے۔ دیکھتا ہوں۔ تم ایسا کرو---اس نوٹس کا جواب کب تک دینا ہے؟''

''ظاہر ہے مجھے اس سلسلے میں عدالت سے رجوع کرنا ہوگا اور پھر پیشی ہوگی یہ الگ بات ہے کہ اس مسئلے کو میں مہینہ پندرہ دن آگے بڑھا سکتا ہوں۔''

"تو پھر ٹھیک ہے تم جاؤ۔ اپنا کام کرو اور میں اپنا کام کرتا ہوں۔"

"بہت بہتر جناب! اجازت چاہتا ہوں۔" یوسف خان نے کہا اور اپنی جگہ
اٹھ گیا۔

لیکن فخر خان سکتے کے عالم میں بیٹھا رہ گیا تھا۔ اس کے ذہن میں کھچڑی پک ر
تھی۔ آخر یہ ہوا کیا؟ فاضل باجوہ حکم کا بندہ تھا یہ مجال تو نہیں تھی اس کی کہ فخر خان ک
خلاف کسی سازش میں حصہ لے۔ بے شک وہ حیدر شاہ کے قبضے میں چلا گیا تھا اور ا
نے وہاں بے حد اذیتیں اٹھائیں تھیں جس کے نشانات اس کے جسم پر نظر آتے تھے لیک
وہ کوئی غداری کرے گا ایسی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس کے علاوہ سب سے بڑ
بات یہ تھی کہ شاہ زیب کو حیدر شاہ کے قتل کے لیے بھیجا گیا تھا اور بعد میں یہ اطلاع ملی
کہ اس نے حیدر شاہ کو ہلاک کر دیا۔ فخر خان کے مخبروں نے جو حیدر شاہ کی حویلی میں م
تھے حیدر شاہ کی موت کی اطلاع دی تھی اور انہوں نے کہا تھا کہ حیدر شاہ کی باقاع
تدفین ہوئی ہے۔ پھر یہ حیدر شاہ کہاں سے زندہ ہو گیا۔ فاضل باجوہ گھر چھوڑ کر بھاگ
گیا اور بیوی بچوں سمیت اس کا مطلب ہے کہ اس کے پس منظر میں کچھ تھا۔ شادی کا
جو دکھایا تھا اس نے آہ کاش! یہ پتہ چلا لیتا کہ لاہور میں وہ کس جگہ گیا ہے۔ کئی کام کر
تھے اس نے اپنے ایک آدمی کو بلایا اور کہا۔

"سن بھگے! فوراً حیدر شاہ کی حویلی میں موجود اپنے مخبروں سے رابطہ قائم کرو اور
معلوم کر کہ حیدر شاہ سچ مچ مر گیا ہے اس کی موت کی افواہ پھیلائی گئی تھی۔"

"ٹھیک ہے خان جی!" بھگے نے کہا اور وہاں سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد
خان خود بھی باہر نکل آیا تھا اور اس بار وہ سیدھا وہاں پہنچا تھا جہاں فاضل باجوہ رہتا تھا۔
حویلی ہی کے ایک گوشے میں اسے رہائشگاہ دی گئی تھی۔ رہائشگاہ کے بیرونی د

میں تالا لگا ہوا تھا۔ فخر خان نے ایک اینٹ اٹھا کر زور سے تالے پر ماری اور تالا توڑ لیا
اور اس کے بعد وہ حویلی کے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا۔ پرانی حویلی کا یہ حصہ اس نے
خاص خاص ملازموں کو رہنے کے لیے دے دیا تھا۔ اندر پہنچ کر اس نے سب سے پہلے
فاضل باجوہ کی الماری وغیرہ کا جائزہ لیا۔ بڑی محنت لیکن دیوانگی کے عالم میں وہ ایک
ایک چیز کو دیکھ رہا تھا۔ کپڑے لتے دوسرے استعمال کی اشیاء موجود تھیں لیکن اور کوئی چیز
نہیں جسے قیمتی کہا جائے۔ اگر کوئی شخص خفیہ طور پر گھر چھوڑ کر بھاگنا چاہے تو یقیناً اس سے
زیادہ انتظامات نہیں کرے گا وہ۔ اس کا مطلب ہے کہ فاضل باجوہ صاف نکل گیا۔
دستاویز کی فائل بھی اس نے ذہن میں رکھی تھی۔ ہوسکتا ہے فاضل باجوہ نے وہ اپنی اس
رہائشگاہ میں ہی چھپائی ہو۔

لیکن ایک گھنٹہ تک مسلسل ہر چیز کا جائزہ لینے کے باوجود اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ
فاضل باجوہ باقاعدہ پلاننگ کے تحت گیا ہے۔ سر میں دکھن ہو رہی تھی۔ زندگی میں شاید
کبھی اسے نقصان سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔ اپنی آرام گاہ
میں آ کر لیٹ گیا۔ ذہن میں جوار بھاٹے اٹھ رہے تھے اور گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا
کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔

بہرحال پھر اس نے یہ طے کر لیا کہ جن لوگوں نے اسے یہ نقصان پہنچایا ہے انہیں
زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ساری کوششیں بے مقصد اور بے کار ہو گئیں تھیں۔ دل و دماغ
آگ میں جھلس رہے تھے بعد میں اسے بھگے سے اطلاع ملی کہ حیدر شاہ زندہ ہے۔ بھگے
نے بتایا۔

"سر جی! وہاں حیدر شاہ کی حویلی سے ہمارے مخبروں نے اطلاع دی ہے کہ حیدر
شاہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ وہ تو زخمی بھی نہیں ہوا کچھ دن کے لیے وہ کچی حویلی چلا گیا

تھا۔اس کی دوسری رہائشگاہیں بھی ہیں۔ وہ لوگ یہی سمجھے تھے کہ حیدر شاہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ بڑی حویلی میں یہی خبر اڑتی رہی تھی۔ بلکہ کچھ کفن دفن کا بھی سلسلہ ہوا تھا لیکن اب حیدر شاہ پکی حویلی میں ہی ہے اور بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔''

اس اطلاع نے فخر خان کے حوصلے اور بھی پست کر دیئے تھے۔ اچانک ہی اس نے جنون کے عالم میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ان دونوں بندوں نے مجھے دھوکا دیا۔ شاہ زیب اور فاضل باجوہ' سب سے پہلے میں تیری خبر لیتا ہوں شاہ زیب۔'' اس نے کہا اور پھر اپنے آدمیوں کو طلب کرنے لگا۔ جب دس بارہ افراد اس کے گرد جمع ہو گئے تو اس نے کہا۔

''ایک ٹانگ برابر لونڈا ہے' ٹانگ برابر جس نے ایک طرف پولیس کو نچا رکھا ہے اور دوسری طرف الیاس خاں اور جبار خاں کو اور اب اس نے فخر خان کے منہ پر بھی تھپڑ مارا ہے اس کی کھال چاہیے مجھے' کھال میں بھس بھروا کر اپنی حویلی کے میوزیم میں رکھوں گا میں سمجھے۔ چلو میں خود اس سلسلے میں تم لوگوں کے ساتھ مل کر شاہ زیب کو تلاش کروں گا۔''

''جو حکم خان جی!'' اس کے خونخوار ساتھیوں نے کہا۔

☆☆☆

شاہ زیب ایک بار پھر محبت کے سفر پر چل پڑا تھا۔ کوئی منزل نہیں تھی' کوئی راستہ نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے آپ پر ہنسنے لگتا تھا۔ تقدیر نے کیا عجیب جدوجہد لکھ دی ہے۔ کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ زرعی یونیورسٹی لاہور میں کیا حسین زندگی گزر رہی تھیں۔ سارے قصے کہانی بن کر رہ گئے تھے۔ ایک زمانے میں ماں باپ بھی تھے' بھائی بھی تھے' کیسے برے بھائی ہیں یہ صرف زمینوں اور جائیداد کے لیے انہوں نے اپنے خون کو در بدر بھٹکنے

کے لیے چھوڑ دیا۔ اب وہ خود تو عیش کر رہے ہیں اور میں زندگی کی ان مشکلات سے گزر رہا ہوں۔ پولیس والوں کے قتل کی ذمے داری' انور کے قتل کی ذمے داری اور اس کے بعد نئے نئے کھیل شروع ہوتے جا رہے ہیں۔ آہ' کاش! ایک دفعہ لجیا کا پتہ چل جائے۔ چوہدری شہاب الدین! آہ' کاش! ایک بار تو میرے ہاتھ لگ جائے۔

بس چل پڑا تھا ایک اجنبی راستے پر حالانکہ وہ ریسٹ ہاؤس ذہن میں تھا جہاں ماجھے جیسا آدمی موجود تھا۔ ایک اچھا ساتھی' اچھا ساتھی تو مکرم شاہ بھی تھا۔ ان دو ہم شکلوں نے جس طرح شاہ زیب کا ساتھ دیا تھا۔ کسی اور نے نہیں دیا تھا۔ وہ ان کا دل سے ممنون کرم تھا۔ اس وقت بھی جس طرف وہ جا رہا تھا۔ وہاں ہو کا عالم تھا یہ سڑک نیم پختہ تھی اور زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ سڑک کے دونوں طرف گھنے درخت تھے۔ کوئی منزل تو تھی نہیں۔ بس ایک سفر تھا ایک بے مقصد اور ایک بے نام سا سفر وہ سست رفتاری سے یہ سفر طے کر رہا تھا۔ فاصلے طے ہو رہے تھے۔

کافی دور نکلنے کے بعد اسے شام کے جھٹپٹوں میں درختوں کی ایک سمت سے روشنی کی نظر آئی اور اس کے قدم اس جانب بڑھ گئے۔ قریب پہنچا تو پتھروں کی بنی ہوئی یہ دو منزلہ عمارت نظر آئی۔ یہ بھی غالباً انگریزوں کے زمانے کا کوئی ڈاک بنگلہ ہی تھا اور اچھی خاصی مضبوط حالت میں نظر آتا تھا۔ شاہ زیب اپنی جگہ رک گیا اور چونکی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ہر طرف ہو کا عالم اور خاموشی طاری تھی۔

بہر حال رات ہونے والی تھی۔ بلکہ ہو چکی تھی اور عمارت میں روشنی بھی تھی۔ اس لیے اس عمارت میں داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسی عمارتیں ڈاک بنگلہ ہی ہو سکتی ہیں کیونکہ رہائشی عمارتیں تو ایسے ویرانوں میں ہو نہیں سکتیں۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور عمارت کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے پیروں کے نیچے خشک اور

ریتیلی زمین آ گئی تھی۔ کچھ لمحے کے بعد اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر درواز
آزمایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ یہ لازمی بات تھی کہ ڈاک بنگلے میں چوکیدار موجو
گا۔ لیکن کئی بار آوازیں دینے کے باوجود کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ ڈاک بنگلہ کیا' بھو
بنگلہ معلوم ہو رہا تھا۔ ہو سکتا ہے یہاں بھوتوں کا راج ہو۔

بہت سے واقعات بہت سے قصے جو بچپن میں اور نوجوانی کے عالم میں شاہ زی
کے علم میں آئے تھے اس وقت اس کے ذہن سے گزرنے لگے اور وہ پھیکی سی ہنسی
ساتھ گیٹ پر چڑھ کر اندر داخل ہو گیا۔

گیٹ سے اندر کودنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ڈاک بنگلے میں ہر طرف ویرانی چھا
ہوئی تھی۔ اچھا خاصا وسیع و عریض احاطہ تھا۔ جس کے درمیان یہ دو منزلہ عمارت نظر آ ر
تھی اور یہ روشنی اوپر کی منزل کے ایک دریچے سے پھوٹ رہی تھی۔ اس احاطے می
اونچے اونچے درخت لگے ہوئے تھے۔ جو غالباً کافی پرانے تھے۔ ان درختوں کے
گر چکے تھے اور برہنہ شاخیں تاریکی میں مکڑی کے جالوں کی مانند الجھی الجھی نظر آ ر
تھیں۔ خزاں چھائی ہوئی تھی۔ ہوا چلتی تو خشک پتے کڑکڑاتے اور دور تک نکل جا
اور یوں لگتا جیسے کوئی دبے قدموں آگے بڑھ رہا ہو۔ شاہ زیب احاطے میں پہنچنے کے بع
اندھیرے میں ایک دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جائزہ لے رہا تھا کہ ڈاک بنگ
میں اگر کوئی موجود ہے تو سامنے کیوں نہیں آتا لیکن پھر اس کی یہ مشکل بھی حل ہو گئی۔

عمارت کے پچھلے حصے سے ایک متحرک روشنی نظر آئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے روش
چل رہی ہو یہ روشنی ایک لالٹین کی تھی جو ایک چوکیدار کے ہاتھ میں تھی۔ چوکیدار اچھ
خاصے لمبے چوڑے قد و قامت کا مالک تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں لاٹھی سنبھالی ہوئی تھ
اور دوسرے میں یہ لالٹین تھی وہ آگے بڑھا اور شاہ زیب کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس نے

لالٹین زمین پر رکھی اور لاٹھی مضبوطی سے پکڑ کر بولا۔

’’کون ہے بھائی؟ کون ہے رے تو؟‘‘ شاہ زیب نے نرم لہجے میں کہا۔

’’میں نے آپ کو بہت آوازیں دی تھیں بابا جی! لیکن جب کوئی آواز نہیں سنائی
دی تو میں گیٹ سے کود کر اندر آ گیا۔‘‘

’’پر تو ہے کون؟‘‘ چوکیدار نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

’’بابا جی! یہ کون سی عمارت ہے۔ آپ کی ملکیت ہے؟‘‘

’’نہیں جی' سرکاری ملکیت ہے۔ ڈاک بنگلہ ہے یہ۔‘‘

’’تو ڈاک بنگلے میں کوئی مسافر نہیں آ سکتا۔ آپ کس طرح سے مجھ سے بات کر
رہے ہیں۔‘‘ شاہ زیب نے ذرا سی کرخت زبان استعمال کی تو چوکیدار ایک دم سنبھل
گیا۔ پھر اس نے لالٹین اٹھالی اور اونچا کر کے شاہ زیب کا جائزہ لینے لگا۔ پھر بولا۔

’’اوہ بھئی۔ معزز مہمان اندر آتے ہیں تو بنگلے کا پھاٹک بجاتے ہیں اور جب میں
دروازہ کھولتا ہوں تو وہ اندر آ کر مجھ سے ڈاک بنگلے میں رہنے کی اجازت مانگتے ہیں۔ مگر
تم تو اس طرح اتر کر اندر آ گئے۔ تم آئے کیسے۔ یہاں تک میں نے تو اندر سے تالا لگایا
ہوا ہے۔‘‘

’’میں نے کہا نا پھاٹک پھلانگ کر اندر آ گیا۔‘‘

’’ہوں۔ کب تک رہو گے یہاں؟‘‘

’’جب تک آپ اجازت دو گے اور اجازت نہیں دو گے تو واپس چلا جاؤں گا۔‘‘

’’تمہیں پتہ ہے کہ یہ سرکاری ڈاک بنگلہ ہے اور یہاں صرف سرکاری آفیسر آ کر
ٹھہرتے ہیں۔‘‘

’’کیا اس وقت بھی یہاں سرکاری افسر ٹھہرے ہوئے ہیں؟‘‘ شاہ زیب نے

مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

’’نہیں۔اس وقت تو کوئی نہیں ہے۔مگر آتے جاتے رہتے ہیں۔آؤ میرے سا
آؤ---میں تمہیں اندر نہیں لے جاؤں گا جب تک کہ تمہارے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرلوں۔‘‘چوکیدار نے کہا۔

’’اوہ بابا جی! رات ہو چکی ہے جنگل بیابان ہے اگر تم چاہتے ہو کہ میں جانوروں شکار بن جاؤں تو ٹھیک ہے۔نکال دو مجھے یہاں سے باہر اور اگر نہیں چاہتے تو ذرا سی جگہ کہیں بھی دے دو۔میں کب کہتا ہو کہ تم مجھے اندر لے جاؤ۔‘‘

’’آجاؤ ادھر آجاؤ۔‘‘چوکیدار کا لہجہ نرم ہو گیا۔وہ شاہ زیب کو لیے ہوئے درختو کے نیچے پہنچ گیا اور پھر اس نے ایک درخت کے نیچے جہاں چارپائی پڑی ہوئی تھی۔اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔اس درخت کے پیچھے ایک چھوٹا سا کوارٹر بنا ہوا تھا جو یقینی طور پر اس چوکیدار کا ہی تھا۔ظاہر ہے وہ اندرونی عمارت میں تو رہتا نہیں ہوگا۔شاہ زیب نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

’’مگر بابا جی! مجھے ایک بات بتاؤ۔میں نے تو آپ کو بہت سی آوزیں دی تھیں۔آپ نے خود آواز ہی نہیں سنی۔‘‘

’’اوہ بابا! میری عمر دیکھتا ہے یہ تو بس مالک کا کرم ہے کہ ہاتھ پاؤں کام کر رہے ہیں۔ستر سے اوپر ہے میری عمر کیا سمجھا۔‘‘

’’یقیناً ہوگی بابا جی! بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کے ہاتھ پاؤں چل رہے ہیں۔‘‘چوکیدار کو اب اس کی جانب سے اطمینان ہو گیا تھا۔اس نے لاٹھی ایک طرف رکھ دی۔لالٹین کی لو مدھم کر دی اور اسے بھی چارپائی کے ایک طرف رکھ دیا اور پھر وہ تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گیا۔شاہ زیب گہری نگاہوں سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہا

تھا۔پھر اس نے کہا۔

’’جب یہاں کوئی ٹھہرا نہیں بابا جی! تو اوپر یہ بتی کیوں جل رہی ہے؟‘‘شاہ زیب کی نگاہیں اوپر کی منزل کی اس کھڑکی کو دیکھ رہی تھیں۔جس کے شیشوں سے زرد زرد روشنی چھن کر یہاں آ رہی تھی اور دیکھنے میں انتہائی پراسرار لگ رہی تھی۔ویسے بھی اس ڈاک بنگلے کا ماحول اس ڈاک بنگلے سے بہت مختلف تھا۔جہاں زیب شاہ نے کافی وقت گزارہ تھا اور جہاں ماجھے اس کا دوست بن گیا تھا۔چوکیدار نے چند لمحات کے لیے خاموشی اختیار کی پھر بولا۔

’’بس جی رات میں یہ روشنی نشانی کے طور پر جلا دی جاتی ہے تا کہ اگر کوئی بھولا بھٹکا ادھر آئے اور پریشانی کا شکار ہو اور جنگل میں بھٹک جائے تو اسے یہ ڈاک بنگلہ نظر آجائے۔‘‘

’’یہاں آس پاس میں جانور تو ہوں گے؟‘‘

’’ان کی آوازیں سن رہے ہو۔یہ جو ہاؤں ہاؤں لگائے ہوئے ہیں۔رات کے سناٹے میں یہی میرے دوست اور ساتھی ہوتے ہیں ورنہ اور یہاں کوئی نہیں ہوتا۔‘‘

’’ہوں۔یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔‘‘

’’کیوں‘ عجیب کیوں ہے؟‘‘

’’بس جی مطلب یہ ہے کہ ان گیڈروں کی موجودگی میں آپ کو ڈر نہیں لگتا؟‘‘ چوکیدار ہنسنے لگا پھر بولا۔

’’ڈر کسے کہتے ہیں یہ بات ہم نہیں جانتے۔‘‘

’’ہاں۔ظاہر بات ہے اگر ایسا ہو تو تم یہاں کیسے رہ سکو گے۔‘‘

’’بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔اچھا یہ بتاؤ کچھ کھاؤ گے‘ پیو گے؟‘‘

"بابا جی! کیا کہوں اگر کچھ مل جائے تو بڑی مہربانی ہوگی آپ کی؟"

"مل جائے گا۔ مل جائے گا۔ چائے بنا کر لاتا ہوں لیکن تم نے اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ تم جا کہاں رہے تھے؟"

"بس بابا جی! میں عجیب وغریب حالات کا شکار ہوگیا ہوں۔ اخبار میں کام کرتا ہوں ان دیہاتوں کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے کے لیے نکلا تھا کہ راستے میں ڈاکو پڑ گئے۔ ناکا لگا ہوا تھا کیمرہ بھی چھین لیا میرا۔ جس میں میں نے یہاں آس پاس کی تصویریں بنائیں تھیں اور اس کے ساتھ ہی مجھ پر اچھا خاصا تشدد بھی کیا وہ تو خوش قسمتی ہے کہ پیسے بچ گئے تھوڑے سے --- لو ان میں سے تھوڑے سے تم بھی رکھ لو۔"

شاہ زیب نے اس خیال سے ایک نوٹ نکال کر چوکیدار کو دیا کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ کھانا پینا مفت میں ہی ہوگا۔ چوکیدار نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے نوٹ فوراً شاہ زیب کے ہاتھ سے لے لیا اور بولا۔

"بس کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ ویسے کپڑے لتے وغیرہ بھی نہیں ہیں تیرے ساتھ۔ یہ بندوق کسی کام نہیں آتی۔"

"ہاں۔ آپ یہی سمجھ لو یہ بندوق میں نے کسی جگہ چھپا دی تھی کیونکہ اب ڈاکوؤں کی زندگی تو نہیں لے سکتا تھا۔"

"ان کی نگاہ نہیں پڑی؟"

"یہی تو میری چالاکی تھی۔ اب یہ بتاؤ کہ اب میں یہاں سے آگے نکلوں تو کہاں جاؤں گا؟"

"تھوڑے فاصلے پر آگے چل کر پکی سڑک آجائے گی۔ اسی سڑک پر آگے بڑھتے چلے جانا۔ نیا آباد کی بستی آجائے گی۔"

"راستہ خطرناک تو نہیں ہے؟"

"نہیں باقاعدہ راستہ تو نہیں ہے۔ آگے رحیم پور ہے۔ یہاں سے چار پانچ میل کا فاصلہ ضرور ہوگا۔ وہاں سے نہر ملے گی۔ سیدھی نیا آباد جاتی ہے اور دوسری نہر بائیں سمت حسن واڑی نکل جاتی ہے۔ پر ابھی تیرا جانا بالکل ٹھیک نہیں ہے کیونکہ نہر کے کنارے کی سڑک کچی ہے اور اس میں گندے پانی کے بھرے ہوئے گڑھے ہیں۔ برسات میں ان گڑھوں میں پانی جمع ہو جاتا ہے تو انہی میں سڑتا رہتا ہے۔ نکالنے والا تو کوئی ہے نہیں۔"

"ٹھیک ہے بابا جی! بڑی مہربانی آپ کی۔"

"لے۔ میں ابھی آتا ہوں تو آرام سے لیٹ جا اور ان آوازوں سے ڈرنا مت کوئی جانور اندر نہیں آتا۔ ہمارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہے۔" بوڑھے نے آخری الفاظ بطور مذاق کہے تھے۔

بہرحال شاہ زیب واقعی لیٹ گیا اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہونے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب اس کے بعد نیا آباد وغیرہ چلا جائے اور وہاں سے لاہور کا سفر اختیار کرے۔ حلیہ تو اب خاصا بدل ہی گیا تھا۔ کبھی کبھی دل میں گھر کا خیال آتا تھا لیکن پھر وہ سوچتا تھا کون سا گھر، وہ گھر جہاں جہانزیب اور اورنگزیب رہتے ہیں۔ شاہینہ رہتی ہے، شکیلہ بعد میں نرم ہوئی تھی یعنی وہ بات ہوتی ہے نا کہ

"کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ"

تو اب وہ پشیمان ہوئی تو کیا فائدہ میری زندگی تو بگڑ گئی۔

چوکیدار تھوڑی دیر کے بعد چائے اور ہاتھ سے بنی ہوئی میٹھی ٹکیاں لے آیا۔ جو باجرے کے آٹے سے بنائی گئیں تھیں اور غالباً کئی دن پہلے بنائی گئیں تھیں۔ ایک تھوڑا سا

ٹکڑا توڑ کر شاہ زیب نے منہ میں رکھا تو اسے لطف ہی آ گیا۔ اس نے حیرت سے
پوچھا۔

''بابا جی! یہ میٹھی ٹکیاں کہاں سے آ گئیں؟''

''بیٹا! بندہ جب دنیا سے کٹ کر کوئی گوشہ اپنا لیتا ہے تو مر نہیں جاتا۔ دل تو زند
رہتا ہے نا اور دل جب زندہ ہوتا ہے تو اس میں آرزوئیں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ میں
بھی انسان ہوں بس یہ سمجھ لے کہ شوق پورا کرنے کے لیے کبھی کبھی کچھ بنا لیا کرتا ہوں
میں نے خود ہی بنائیں ہیں کوئی چار روز پہلے کی بات ہے۔''

''تو یہ چار دن پہلے کی پرانی ہیں؟''

''اوئے یہ باجرے کے آٹے کی ٹکیاں پرانی کبھی نہیں ہوتیں۔ مہینہ مہینہ بھر رکھی
رہتی ہیں نہ مزے میں خرابی آتی ہے اور نہ ان کے کرارے پن میں کھا کر تو دیکھ۔''

''بہت اچھی بنی ہوئی ہیں۔'' شاہ زیب نے کہا۔ چائے کے ساتھ اس وقت واق
باجرے کی یہ ٹکیاں اتنا لطف دے گئیں تھیں کہ وہ بتا نہیں سکتا تھا۔ بہرحال بوڑھے کے
انداز میں اب نرمی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے کہا۔

''جوان بچہ ہے ایسے خطروں کے سفر پر نہ نکلا کر۔ تم شہری بابو یا تو ہوتے ہو ا
بزدل کہ گھر کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے ڈرتے ہو یا پھر بہادری دکھاؤ گے تو ا
کہ جنگلوں میں بھٹکتے پھرو گے۔ بندوق بھی ساتھ ہے اگر ڈاکو مار دیتے تو کیا ہوتا؟''

''بابا جی! ہوتا کیا دنیا میں بہت سے لوگ مر جاتے ہیں۔ ویسے بابا جی! تمہارا ا
دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے گھر والے کہیں نہ کہیں تو ہوں گے۔ سرکا
تنخواہ مل جاتی ہے۔ اس میں گزارہ ہو جاتا ہوگا۔''

''ہاں سرکاری تنخواہ ملتی ہے۔ پہلی تاریخ کو نیا آباد چلا جاتا ہوں۔ ڈاک خا

سے پیسے مل جاتے ہیں میرے دو بیٹے ہیں۔ دونوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ بیٹے تو خیر
کبھی نہیں پوچھتے۔ مہینے یا برسوں ہو جاتے ہیں۔ عید بقر عید بھی نہیں کہتے کہ ابا آ جا
ہمارے ساتھ عید منا لے۔ اصل میں بات یہ ہوتی ہے بیٹا کہ انسان کا ایک وقت ہوتا
ہے۔ بچپن میں ماں باپ کی نگرانی ہوتی ہے۔ جوانی میں اپنی نگرانی خود کرتا ہے بڑھاپے
میں اگر تقدیر ساتھ دیتی ہے تو کوئی نگران بن جاتا ہے ورنہ کہیں کسی کونے کھدرے میں
جان دیتا ہے۔ مگر یہ سسری محبت کچھ بھی کر لو بیٹا! تم محبت کو کہیں سے چھین نہیں سکتے۔ دو
دو بیٹے ہیں دونوں کی بیویاں ہیں۔ پر ہماری زندگی یہیں گزر رہی ہے۔ کیا تھا اپنے پاس
بلا لیتے۔ کہتے بابا جی! دو وقت کی روٹی کھا لو۔ دو وقت کی نہ دیتے ایک وقت کی دے
دیتے۔ پر بال بچوں کے ساتھ اپنا بھی ہنسی خوشی وقت گزر جاتا۔ پر کسی نے نہیں پوچھا۔ وہ
تو اللہ کا فضل تھا کہ نوکری ہمیشہ سرکاری تھی۔ ہم نے یہی کہا کہ ڈاک بنگلے میں لگا دو ہمیں۔
ہم یہاں آرام سے رہیں گے بس سمجھ لو اللہ کی مدد حاصل ہے۔''

''ہوں' تو یہ بات ہے۔''

''ہاں جی! بس ایسے ہی وقت گزر جاتا ہے۔ نیند آ رہی ہے تو میں تمہارے لیے
کھیس اور چادر لے آؤں۔''

''نہیں بس ایسے ہی ٹھیک ہے۔''

''نہیں بیٹا! ہے میرے پاس تو کیا حرج ہے۔'' بوڑھے نے کہا اور اپنی جگہ سے
اٹھ کر کوارٹر کے دروازے کی طرف چل پڑا۔ پھر اس نے اندر جا کر ایک کھیس اور تکیہ نکالا
اور لے کر آ گیا۔ شاہ زیب کے قریب رکھ کر کہا۔

''یہاں مچھر نہیں ہیں۔ پر ہو سکتا ہے سر سے آ ہی جائیں۔ دری نہیں لایا ہوں میں
دھونے کے لیے ڈالی ہوئی ہے۔ تم آرام سے لیٹ جاؤ۔''

"ٹھیک ہے چاچا جی!" شاہ زیب نے اس بار بوڑھے کو باباجی کی بجائے چاچا ج
کہا تھا لیکن بوڑھے نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ شاہ زیب تکیہ رکھ کر لیٹ گیا تو بوڑھا
کہنے لگا۔

"ویسے تو میں جاگتا رہتا ہوں۔ نیند بہت کم آتی ہے لیکن ضرورت پڑے تو مجھے اٹھا
لینا۔ وہ دیکھ وہ برآمدے میں پانی کا مٹکا رکھا ہوا ہے۔ وہیں کٹورہ بھی ہے۔ پیاس لگے
پانی کی تو پی لینا اور ہاں سو جانا آرام سے۔ رات کو گیدڑ چیخیں تو ڈرنا نہیں۔ سمجھے۔"

شاہ زیب نے رائفل اپنے برابر رکھی اور تکیہ رکھ کر لیٹ گیا۔ چوکیدار اندر چلا گ
تھا۔ شاہ زیب کے ذہن میں بہت سی باتیں آنے لگیں۔ حیدر شاہ، کریم بخش اور پھر لجیا
نجانے لجیا کب تک اس کے دل میں مسکراتی رہی۔ پھر لجیا نے تھپک تھپک کر اسے سلاد
تھا اور اس وقت جب دھوپ دیوار سے اتر کر درختوں کے نیچے پھسل گئی تو اس نے
آنکھیں کھول کر دیکھا۔ چوکیدار اس سے تھوڑے فاصلے پر ایک لکڑی کے اسٹول پر بیٹھ
ہوا تھا۔ اس کے برابر ہی ایک چنگیر رکھی ہوئی تھی جو دوسری چنگیر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ شا
زیب جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا تو چوکیدار نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ چارپائی کی دوسری طرف لوٹے میں پانی ہے۔ منہ ہاتھ دھو لے۔ ضرورت
کے لیے جانا ہے تو اندر چلا جا اور پھر جلدی سے آ جا۔ دیکھ تو سہی میں نے تیرے لیے
بنایا ہے۔ شاہ زیب نے گردن جھٹکی اور اس کے بعد اتر کر اندر کوارٹر میں چلا گیا۔ کوارٹر
کے دوسری طرف بیت الخلاء بنا ہوا تھا۔ وہ ضروریات سے فارغ ہو کر آیا۔ پانی وغیرہ کی
کوئی کمی نہیں تھی اور چوکیدار کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ دل ہی دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ
پیسوں کا لالچ نہیں ہو سکتا بس وہی دل میں پھوٹنے والی محبت جو انسان کو لمحوں میں دیوانہ
کر دیتی ہے۔ غیر اور اجنبی اس کے لیے نہ غیر رہتے ہیں اور نہ اجنبی ایسا ہی مصیبت کا ما

ہے یہ انسان جہاں سے محبتیں ملنی چاہیں وہاں سے نفرتیں ملتی ہیں اور جہاں کچھ بھی نہیں
ہوتا وہاں بلاوجہ دل میں محبتیں پھوٹ جاتی ہیں۔

کچھ دیر کے لیے اس کا دل چاہا کہ بوڑھے کے پاس کچھ وقت قیام کرے۔ محبت کا
ترسا ہوا تھا۔ اس دوران بوڑھا جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور چنگیر لا کر اس کے
سامنے رکھ دی تھی۔ تیل میں تلے ہوئے پراٹھے تھے۔ آٹے کا حلوہ تھا جو گڑ ڈال کر بنایا
گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی چائے کا بڑا سا پیالہ۔ شاہ زیب نے زور سے گردن جھٹکی۔ کیا
زندگی ہے؟ کیا زندگی ہے؟ اس کے بعد اس نے بڑے مزے سے دونوں پراٹھے حلوے
کے ساتھ کھائے اور اس کے بعد چائے کا پیالہ اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

"باباجی! آپ نے ناشتہ نہیں کیا؟"

"باباجی! پہلے تو نے مجھے چاچا جی کہا تھا؟"

"معافی چاہتا ہوں دل تو یہی چاہتا ہے کہ آپ کو چاچا جی کہوں پر میں نے سوچا
کہیں آپ برا نہ مان جائیں۔"

شاہ زیب نے جلدی سے کہا۔ ایک لمحے کے اندر اس پر عجیب سے احساسات کا
حملہ ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے ایک لفظ نے بوڑھے کے دل میں کس طرح محبتیں
بیدار کر دی ہیں۔ اب اس وقت یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ چاچا جی اس نے رواداری میں
کہہ دیا تھا اگر ایسا کہتا تو بوڑھے کی تمام امنگیں خاک میں مل جاتیں۔ چنانچہ اس نے یہ
بات کہہ کر بات بنائی تھی۔ بوڑھے کے چہرے پر خوشی کے احساسات صاف نمایاں
تھے۔

"لو چاچا! کہہ رہا ہے اور برا مانوں گا۔ ارے بابا لفظوں کی تو بڑی قیمت ہوتی
ہے۔ کسی بندے کو پیار سے اپنا کہہ دو اگر اس کے دل میں محبت کے پھول نہ کھل اٹھیں تو

سمجھ لو بندہ ہی نہیں جانور ہے جانور۔“

”ہاں یہ بات تو آپ ٹھیک کہتے ہیں چاچا جی!“

”کیسا لگا ناشتہ؟“

”اتنا اچھا کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔“

”ہاں بس۔ اچھا اب یہ بتا کب تک رہے گا ہمارے پاس؟“

”جب تک چاچا جی کا حکم ہوگا۔“

”سچ کہہ رہا ہے بھاگ تو نہیں جائے گا بیچ میں چھوڑ کر؟“

”نہیں آپ حکم کرو گے تو دو تین دن تک تو رکوں گا۔“

”اس لیے پوچھ رہے ہیں ہم کہ تیرے لیے بستی جا کر کچھ چیزیں لے آئیں۔“

”ارے نہیں اب یہ تکلیف بھی نہیں دوں گا میں آپ کو۔“

”تکلیف نہیں ہمیں تو جانا ہی ہوتا ہے۔ ویسے بھی کچھ سامان ختم ہوگیا ہے۔“

”تو میں چلا جاتا ہوں۔“

”نہیں۔ نہیں۔ تو کیسے جائے گا۔ تو ادھر رہے گا ہمارا انتظار کرے گا۔ پر ایک وعد کرنا دوسروں کی طرح وعدہ خلافی مت کرلینا۔ بھاگ مت جانا یہاں سے۔ بول بھاگے گا تو نہیں ہمارے پیچھے۔“

”نہیں چاچا جی! وعدہ۔ پر تمہیں بھی ایک شرط ماننی ہوگی ہماری۔“

”ارے تو نے یہاں دو تین دن ہمارے پاس رکنے کا وعدہ کرلیا۔ ہماری تو عید ہوگئی۔ بول تیری کیا شرط ہے؟“ شاہ زیب نے جیب سے چند نوٹ نکالے اور انہیں چوکیدار کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”سودا تم میرے پیسوں سے لاؤ گے۔“

”ارے نہیں بیٹا! ہمارے پاس پیسے---“

”نہیں چاچا جی! ورنہ میں جھوٹ بولوں گا آپ سے۔ چلا جاؤں گا یہاں سے۔“

بوڑھے نے ایک لمحہ تک کچھ سوچا اور پھر یہ نوٹ لے کر کہا۔

”مگر یہ تو بہت سے ہیں بیٹا!“

”چاچا جی! آپ سب خرچ کردو اور میں اور بھی نوٹ آپ کو دے کر جاؤں گا۔ کیا سمجھے؟ میرے پاس ہیں۔ جب چاچا جی بنے ہو میرے تو پھر یہ تکلف کیسا؟“

”ٹھیک ہے تو آرام کرنا ہم چلے جائیں گے۔ فکر مت کرنا۔ دیر سے واپس آئیں گے۔ اب اتنی تیزی نہیں ہے ہاتھ پیروں میں۔“

”اس لیے تو میں کہہ رہا تھا کہ میں چلا جاؤں۔“

”نہ بیٹا نہ۔ تجھے اللہ کا واسطہ ایسا نہ کرنا ٹھیک ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“

”بس تو چاہے تو ادھر آرام کر چاہے تو اندر چلا جا۔ تیری مرضی ہے۔ سارا ڈاک بنگلہ کھلا ہوا ہے۔ یہ جگہ بڑی اچھی ہے۔ ہوا چل رہی ہے۔ بادل بھی گھرے ہوئے ہیں۔ ادھر زیادہ مزے کرے گا کیا سمجھا۔“

”ٹھیک ہے۔“ شاہ زیب نے جواب دیا۔ چوکیدار چلا گیا اور شاہ زیب ڈاک بنگلے میں تنہا رہ گیا۔ بہت دیر تک وہ جاتے ہوئے چوکیدار کو دیکھتا رہا۔ پھر جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تو شاہ زیب اندر آ کر پھر اس درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

کافی دیر تک وہ اسی جگہ بیٹھا رہا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈاک بنگلے کی اندرونی عمارت میں داخل ہوگیا۔ جیسے کہ ڈاک بنگلے ہوا کرتے ہیں ویسے ہی یہ عمارت بھی تھی۔ نچلی منزل بالکل سنسان اور خاموش پڑی ہوئی تھی۔ اب یہ انسان کا اپنا احساس ہوتا ہے

اپنا خیال ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی وہ سوچ لے۔ شاہ زیب کو یوں لگ رہا تھا جیسے عمارت کے در و دیوار بول رہے ہوں۔ کچھ کہہ رہے ہوں' کچھ سنا رہے ہوں۔ شاہ زیب بڑے ہال میں پہنچا جہاں سے اوپر جانے کا راستہ تھا۔ وہ اوپر کی منزل کی جانب چل پڑا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی' کوئی احساس نہیں تھا۔

نجانے کیوں شاہ زیب کا ذہن ہلکا ہلکا گھوم رہا تھا' چکرا رہا تھا' کچھ سرسراہٹیں کچھ آہٹیں اسے در و دیوار سے گزرتی محسوس ہو رہی تھیں وہ بہت دیر تک بیٹھا رہا' سوچتا رہا اور نجانے کیوں اس کے اپنے احساسات اسے عجیب سی کہانی سناتے رہے لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ صرف کہانی ہے۔ دوپہر کو کوئی ڈیڑھ بجے کے قریب چوکیدار بابا واپس آیا تھا بری طرح لدا پھندا تھا۔ کھانے پینے کی کافی چیزیں لایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ پکا پکا بھی لایا تھا۔ کہنے لگا۔

''اس وقت تو تیری دعوت کر رہا ہوں بیٹا! میں جانتا تھا کہ تو نے کچھ کھایا پکایا تو ہو نہیں۔ دیکھ پکا پکایا کھانا لے آیا ہوں اور شام کے لیے گوشت اور یہ آلو مزہ آ جائے تجھے۔''

شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بہرحال چوکیدار نے اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ پھر بولا۔

''برا مت ماننا بیٹے! چاچا جی کہہ دیا نا تم نے تو ہمیں بھی سارے رشتے یاد آ گئے ہیں۔''

''بار بار یہ بات کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کرو چاچا جی!''

''ٹھیک ہے۔''

بہرحال دن بھر بادل چھائے رہے تھے۔ شام چار بجے کے قریب بوندا باندی

شروع ہو گئی اور بہت ہی اچھا موسم ہو گیا۔ وہ شاہ زیب کو لے کر کوارٹر میں چلا گیا تھا۔ کوارٹر کے دو کمرے اور اس کے بعد چھوٹا سا برآمدہ اور پھر صحن۔ بارش میں مزہ دے رہے تھے۔ کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے تک ہلکی ہلکی بارش ہوتی رہی۔ اب سورج ڈوب گیا تھا اور شام کا دھندلکا ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ بارش چونکہ رک گئی تھی اس لیے چوکیدار اور شاہ زیب آہستہ آہستہ باہر نکلے اور پھر اس چارپائی کے پاس پہنچ گئے۔ جو کوارٹر کے سامنے درختوں کے نیچے بچھی ہوئی تھی۔

شاہ زیب چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گیا مگر چوکیدار کوارٹر کے اندر گیا اور ذرا دیر کے بعد واپس آ گیا تو جلتی ہوئی لالٹین اس کے ہاتھ میں لٹک رہی تھی۔ لیکن شاہ زیب کے پاس آنے کے بجائے وہ عمارت کے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا۔ شاہ زیب خاموش بیٹھا رہا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے دیکھا کہ ڈاک بنگلے کی بالائی منزل سے ایک دریچے کے پیچھے روشنی جھلملا رہی ہے۔ چوکیدار نے شاید اپنا فرض پورا کرتے ہوئے وہاں لیمپ روشن کر دیا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد وہ لالٹین سمیت باہر نکل آیا۔ اس نے لالٹین ایک طرف رکھی اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''بارش ہو گئی بادل یہی بتاتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اندھیرا اب بڑھ گیا تھا اور ہر طرف ماحول پر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دن کے تجربے نے شاہ زیب کو ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار کیا تھا اور اس وقت بھی وہ سناٹے کی شدت محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔

''ویسے چاچا جی! آپ کی ہی ہمت ہے کہ آپ یہاں زندگی گزار لیتے ہو۔ ابھی سے اتنا سناٹا ہے کہ لگتا ہے آدھی رات ہو گئی۔ یہاں آپ کا جی تو نہیں گھبراتا۔'' جواب

میں بوڑھا افسردگی سے مسکرادیا۔

''گھبرائے گا بھی تو کیا ہوگا۔ نوکری تو کرنی ہی ہوتی ہے۔ پر بندہ اکیلا شوق
نہیں رہتا۔ میں نے تجھے جو روکا ہے تو اس کی کوئی وجہ ہی ہے۔''

''یہاں تو اندھیرے میں بڑی ویرانی محسوس ہوتی ہے۔ لگتا ہے جیسے کوئی رہتا
نہیں ہے۔''

چوکیدار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پت جھڑ کے مارے ہوئے درخت سے زرد
پتے جھڑ کر گر رہے تھے۔ ہوا کے جھونکے انہیں سمیٹ کر اس طرح سفر کرتے جیسے ا
ساتھ کسی خاص جگہ لے جا رہے ہوں۔ گہری خاموشی میں ان کی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوتی
یوں لگتا جیسے کوئی دبے قدموں آگے بڑھ رہا ہو۔ چوکیدار کہنے لگا۔

''پہلے یہ بہت آباد ہوا کرتا تھا۔ خوب چہل پہل ہوتی تھی۔ ایک جاتا د
آجاتا۔ کبھی کبھی تو اتنے سارے لوگ ایک ساتھ آجاتے کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہو جا
اور زیادہ آنے والوں کو واپس چلے جانا پڑتا اور یہاں اسٹاف بھی کافی تھا لیکن
اب---اب یہاں لوگ بھی نہیں آتے۔''

''کیوں---اب کیوں نہیں آتے؟ کوئی خاص بات ہوگئی ہے کیا؟'' چوکیدار
گردن جھکالی۔ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

''خاص ہی بات کہہ لو مگر سر پھروں والی بات ہے۔''

''کیا؟''

''لوگوں کا کہنا ہے کہ رات کو یہاں کوئی سایہ گھومتا ہے۔ کسی عورت کا سایہ۔''
زیب نے چونک کر اسے دیکھا اور بولا۔

''تم نے نہیں دیکھا وہ سایہ؟''

''پتہ نہیں۔ ہم تو ایسی باتوں پر غور ہی نہیں کرتے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کیا لوگوں کا کہنا سچ ہے؟'' شاہ زیب نے پوچھا۔

''اللہ جانے کہتے تو یہی ہیں لوگ کہ آدھی رات کے بعد وہ نظر آجاتی ہے۔ کبھی
زور زور سے چیختی ہے، کبھی روتی ہے، کبھی ہنستی ہے۔''

''نہ تم نے اس کی آواز سنی اور نہ دیکھا؟''

''نہیں میں نے کہا نا کہ شبہ تو مجھے بھی کئی بار ہوا مگر ایمان کی بات ہے دیکھا کبھی
نہیں۔ اصل میں ویسے بھی مجھے رات کو کم دکھائی دیتا ہے اور سنائی بھی کم دیتا ہے۔
دوسرے لوگوں نے اسے دیکھا ہے، کئی تو اسے دیکھ کر ڈر کے مارے چیخنے چلانے لگے
تھے۔ ایک دو بار دو تین بندے بے ہوش بھی ہوگئے تھے۔ ایک افسر جو بیوی بچوں کے
ساتھ یہاں آیا تھا ایسا ڈرا کہ کئی دن ہسپتال میں پڑا رہا۔ پھر یہ باتیں مشہور ہوگئیں اور
لوگ یہاں ٹھہرنے سے گھبرانے لگے۔''

''نہیں چاچا جی! میں نہیں مانتا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو سب سے پہلے تم خود دیکھتے
نا؟''

''بس کہانی بہت پہلے شروع ہوگئی تھی۔ سنا ہے کہ یہاں کبھی کسی عورت کا خون
ہوگیا تھا۔ جاڑوں کی رات تھی بڑی سخت سردی پڑ رہی تھی۔ اس دن بھی شام ہی سے ایسی
ہی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ہوا بھی خوب تیز چل رہی تھی۔ پھر خوب زور زور کی بارش
ہونے لگی۔ اس دن یہاں کوئی نہیں تھا۔ بس ایک سرکاری آفیسر ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ بھی شام
ہونے سے پہلے جا چکا تھا۔ کوئی دس بجے رات کو ایک آفیسر آیا بڑی سی موٹر میں آیا تھا۔
اس کے ساتھ اس کے گھر والی بھی تھی۔ میں اس وقت اکیلا ہی تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج
کوئی نہیں آئے گا۔ لیکن افیسر آگیا اس کے آنے کے بعد میں نے نیچے کے کمرے میں

اس کے رہنے کا بندوبست کر دیا۔ سردی زیادہ تھی اس لیے آتش دان میں کوئلے سلگا
کمرہ خوب گرم کر دیا۔ گیارہ بجے تک میں صاحب کے کمرے کے آس پاس ہی ر
دونوں خوش خوش اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ پھر جب رات زیادہ گہری ہوگئ
کمرے میں خاموشی چھا گئی اور میں بھی اپنے کوارٹر میں آ گیا۔ صاحب کا ڈرائیور
میرے ساتھ ہی تھا۔ لمبا چوڑا طبیعت کا بھی بھلا تھا۔ بیس پچیس سال سے زیادہ کا نہ
ہوگا۔ میرے ساتھ کوارٹر میں بیٹھا آگ تاپتا رہا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ کوئی
بجا ہوگا کہ ڈرائیور میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔ یہ جو سامنے زینہ اوپر جا رہا ہے نا
اوپر کی منزل تک جاتا ہے۔ میں نے اسے زینے سے اوپر جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ سو
کے لیے اپنے کمرے میں گیا اور میں نے باہر نکل کر بنگلے کا ایک چکر لگایا۔ ابھی تک ہلکی
ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ کوارٹر میں آ کر میں نے دراوزہ اندر سے بند کیا اور آگ ک
سامنے بیٹھ گیا۔ پھر ذرا سی جھپکی آئی تھی کہ اوپر کی منزل پر گولیاں چلنے لگیں۔ بارش
ہو چکی تھی لیکن ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ گولی کی آواز سن کر میں اپنے کوارٹر سے نکل آ
اور لالٹین لے کر اوپر پہنچا تو دھیمی دھیمی روشنی میں، میں نے اس ڈرائیور اور صاحب کی گ
والی دونوں کو خون میں لت پت پڑے ہوئے دیکھا۔

''کیا مطلب۔ دونوں کو گولی لگی تھی؟''

''ہاں۔ عورت بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا سر پلنگ سے نیچے جھول رہا تھا۔
مر چکی تھی لیکن ڈرائیور زندہ تھا اور تھوڑی دیر کے بعد اسے ہوش آ گیا تھا۔ جبکہ صاحب
کمرے میں موجود نہیں تھا۔ جب میں نے ڈرائیور کو پانی پلایا تو اس نے صرف اتنا بتا
کہ صاحب نے ان دونوں پر گولی چلائی ہے۔ میں صاحب کو تلاش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر
کے بعد میں نیچے آیا تو صاحب مجھے نظر آ گیا۔ وہ اس سامنے والی گیلری میں ٹہل رہا تھا۔

میں اس کے پاس پہنچا تو میں نے کہا۔ صاحب! اوپر کمرے میں---''
''بکواس مت کرو۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' اس نے مجھے غصے میں کہا۔ میں اس
کی کوئی بات نہیں سمجھا تھا۔

بہر حال میں نے صاحب کے پاس پستول بھی دیکھ لیا تھا اور مجھے اندازہ ہو گیا تھا
کہ یہ دونوں خون صاحب نے ہی کیے ہیں۔ بس جی اب میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا
کروں۔ میں باہر نکل آیا۔ صاحب نے مجھے نہیں روکا تھا۔ مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں صاحب
مجھے بھی گولی نہ مار دے۔ پر میں دوڑا دوڑا پولیس چوکی پہنچا اور پھر پولیس والوں کے
ساتھ آ گیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ صاحب بھاگا نہیں تھا بلکہ وہیں موجود تھا۔ پھر
پولیس والے لاش بھی لے گئے۔ زخمی ڈرائیور کو بھی اور بس اس کے بعد نجانے کیا ہوا کچھ
بھی نہیں ہوا مجھے اور ہوا بھی ہو تو مجھے نہیں پتا چل سکا۔ بس جی بڑے لوگوں کے کھیل بھی
بڑے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ پتہ نہیں نوجوان بیویوں کے ساتھ نوجوان ڈرائیور کیوں رکھ
لیتے ہیں۔ بس اس دن سے تو آپ سمجھ لو یہاں چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ میں تو خیر لوگوں کو
نہیں بتاتا۔ لیکن کچھ لوگوں کو جو معلومات ہیں وہ یہی کہتے ہیں کہ یہ اس صاحب کی بیوی
کی روح ہے جو ڈاک بنگلے میں بھٹکتی پھرتی ہے۔''

شاہ زیب ہنس کر خاموش ہو گیا لیکن رات کو سوتے ہوئے اس کے ذہن میں کئی بار
یہ کہانی آئی اور اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹکتی رہیں لیکن اسے نہ کسی کے رونے اور
چیخنے کی آوازیں سنائی دی تھیں اور نہ ہی کسی کے چلنے پھرنے کی آہٹیں۔ پھر رات کے
کسی حصے میں وہ گہری نیند سو گیا تھا۔ دوسرا دن بھی اس نے وہیں گزارہ اور کوئی خاص
بات نہ ہوئی لیکن اب اس سے زیادہ وقت گزارنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ پھر جب وہ
چوکیدار سے رخصت ہوا تو اس نے چوکیدار کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ کہنے لگا۔

''چاچا کہہ کر مار دیا تو نے ہمیں ایک بار پھر۔ پر کوئی بات نہیں ہم لوگوں کی تقد میں تو بار بار کی موت ہی لکھی ہوتی ہے۔''

''دوبارہ کبھی ادھر سے گزرا تو تمہارے پاس ضرور آؤں گا چاچا جی!''

''ضرور آنا بیٹا!'' چوکیدار سے رخصت ہو کر شاہ زیب چل پڑا۔

اب وہ نیا آباد کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں سے اسے لاہور کے لیے بس پکڑنا تھی تھوڑا عرصہ لاہور میں گزارنا ضروری تھا۔ باجوہ کا پتہ بھی اس کے پاس موجود تھا لیکن یہ وقت کی بات ہے کہ وقت کب اور کہاں لے جائے۔ پھر اس وقت وہ ایسے ہی ایک راستے سے گزر رہا تھا جس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے خودرو درخت بکھر ہوئے تھے کہ اچانک ہی اس نے دو جیپوں اور چار گھوڑے سواروں کو دیکھا جو دور دو تک بکھر کر چلے آ رہے تھے۔ ان کا انداز کچھ اتنا عجیب تھا کہ شاہ زیب کو چونک کر رک جانا پڑا تھا۔ سیاہ لباس تھے اور جیپیں بھی پولیس کی نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ اس لیے شا زیب کو اس بات کا تو اطمینان ہو گیا تھا کہ یہ پولیس والے نہیں ہیں۔

لیکن ان لوگوں نے بھی اسے دیکھ لیا تھا کوئی بھی ہو سکتا تھا اور کسی ایک بندے کو دیکھ کر ضروری نہیں تھا کہ اس پر گولیاں برسانا شروع کر دیتا لیکن دوسری جانب سے ایسا ہی ہوا۔ اچانک ہی گولیاں سنسناتی ہوئی شاہ زیب کے آس پاس سے گئیں اور شاہ زیب نے اپنے آپ کو ایک دم سے زمین پر گرا دیا۔ اس نے فوراً ہی اپنی رائفل بھی سنبھال لی تھی۔

لیکن ابھی تک ایک لمحے کے لیے بھی اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ اچانک ی ان لوگوں نے اس پر فائرنگ کیوں شروع کر دی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ کچھ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اسے پہچان لیا ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ الیاس خاں اور جبار

خاں کے آدمی ہی ہوں۔

لیکن بہر حال شاہ زیب ابھی تک ان میں سے کسی کو پہچان نہیں سکا تھا۔ البتہ اب اس نے صورتحال کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ یہاں جس جگہ وہ موجود تھا یہاں سے اس کا مارا جانا بے حد آسان ہو گیا تھا۔ تھوڑی سی گردن اٹھا کر اس نے ان لوگوں کی کارروائی دیکھی تو اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ لوگ اسے چاروں طرف سے گھیر رہے ہیں۔ پتہ نہیں کیا قصہ ہے۔ گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ وہ لوگ اسے ایک لمحے کے لیے بھی موقع نہیں دینا چاہتے تھے اور اسے چاروں طرف سے گھیر رہے تھے۔ ان کا مقصد یہی تھا کہ اسے چاروں طرف سے گھیر کر اس پر قابو پا لیں۔

شاہ زیب اس وقت جوابی کارروائی کے بجائے اپنے تحفظ کے لیے نگاہیں دوڑانے لگا۔ اور پھر اچانک ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جس جگہ وہ موجود تھا وہاں سے کوئی پانچ گز کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا خشک نالا نظر آ رہا تھا۔ یہ تقریباً پانچ فٹ گہرا تھا۔ ذرا سی کوشش کر کے اگر شاہ زیب نالے میں اتر جاتا تو کم از کم ان کی گولیوں سے محفوظ رہ سکتا تھا اور اس کے بعد نالے کے ذریعے وہ تھوڑا سا سفر بھی طے کر سکتا تھا جبکہ اسے اس بات کا پوری طرح علم تھا کہ دوسری جانب سے اس نالے کو نہیں دکھا جا سکا ہو گا۔ وہ لوگ اسے چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ شاہ زیب نے ایک لمحے کے لیے گردن اٹھالی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر دو افراد اس کے نشانے پر تھے۔ کم از کم ان لوگوں کی یلغار روکنے کے لیے ضروری تھا کہ فائر کیا جائے۔

چنانچہ اس نے نشانہ لے کر فائر کر دیئے اور اس نے ان دونوں کو اچھل کر چیخ مارتے ہوئے زمین پر گرتے دیکھا۔ اس کا اندازہ بالکل درست نکلا جیسے ہی وہ دونوں زمین پر گرے اور انہوں نے چیخیں ماریں باقی افراد ایک دم زمین پر لیٹ گئے تھے اور

انہوں نے گولیاں چلانا بھی بند کر دیں تھیں۔ یعنی شاہ زیب کی اس کوشش کا خاطر خو
نتیجہ نکلا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور کسی تیز رفتا
مگرمچھ کی مانند زمین پر ہاتھ پاؤں مارتا ہوا اس نالے میں اتر گیا۔ نالے میں اترتے ہ
اس نے نالے کے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کر دیا۔ کم از کم اس جگہ سے دور نکل جانا چا
تھا۔ نالہ ظاہر ہے دور تک گیا تھا اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آگے جا کر وہ ک
چکروں میں گھوماتا تھا اور پھر دائیں سمت سیدھا مڑتا چلا گیا تھا۔

شاہ زیب نے کافی دور تک اس نالے میں فاصلہ طے کیا اور اس کے بعد اس
سوچا کہ وہ مڑ کر تو دیکھے کہ ان لوگوں کی کیا صورتحال ہے۔ ویسے گولیاں پھر چلنے لگی
تھیں۔ ان لوگوں نے سنبھل کر گولیاں چلانا شروع کر دیں تھیں۔ شاہ زیب نالے م
اوپر ابھرا تو اسے ایک درخت نظر آیا اور وہ پھرتی سے اپنی جگہ سے نکل کر اس درخت
جانب چل پڑا۔ بڑا گھنا اور چوڑا درخت تھا۔ شاہ زیب نے ایک لمحے کے اندر اندر فیصل
کیا اور کسی پھرتیلے بندر کی طرح درخت پر چڑھتا چلا گیا۔ وہ ان لوگوں کو احساس نہ
ہونے دینا چاہتا تھا کہ وہ آس پاس موجود ہے۔ بلکہ یہی تاثر دینا چاہتا تھا کہ نالے
ذریعے وہ نکل گیا ہے۔ ظاہر ہے تھوڑی دیر کے بعد وہ نالے کی طرف رخ کریں گے او
اسے تلاش کرتے ہوئے وہاں تک پہنچ جائیں گے۔

شاہ زیب غور کرتا رہا۔ اس کی نگاہیں دور دور تک بھٹک رہی تھیں۔ وہ ان دھبو
آگے بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا جو ٹھیکری کی جانب جا رہے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد
وہاں پہنچ گئے۔ غالباً انہیں اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ شاہ زیب اب وہاں نہیں ہے
پھر شاہ زیب نے ہر عمل اپنی مرضی کے مطابق ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ لوگ نالے میں ا
گئے تھے اور برق رفتاری سے فاصلہ طے کرتے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ شاہ زیب

ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ نالے سے باہر نکلیں تو شاہ زیب کے نشانے پر
آ سکتے ہیں لیکن اب بھی یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ کم بخت ہیں کون۔ ابھی وہ یہی سوچ رہا
تھا کہ اس نے چند افراد کو اس درخت کی جانب آتے ہوئے دیکھا اور ایک لمحے کے اندر
اندر وہ سنبھل گیا۔ یہ فیصلہ پتہ نہیں غلط تھا یا صحیح کہ وہ درخت پر آ چڑھا تھا۔

لیکن بہرحال اب جو کچھ بھی تھا اس نے اپنا عمل تو کر ہی ڈالا تھا۔ رائفل سنبھالے
وہ ان لوگوں کو دیکھتا رہا اور پھر دفعتاً ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے
ان میں فخر خان کو دیکھ لیا تھا۔ ہوں تو یہ فخر خان کے آدمی ہیں۔ اس کے ذہن کی چرخی چلنے
لگی۔ اس کا مطلب ہے کہ اسے حیدر شاہ کی زندگی کا علم ہو گیا ہے اور فخر خان اس کی تلاش
میں نکل پڑا ہے۔ باقی سارے معاملات کا اسے کوئی علم نہیں تھا۔ وہ غور سے دیکھتا رہا۔
اب اسے حالات کی ستم ظریفی کہیں یا پھر ایک ایسی صورتحال جو قدرتی طور پر نمایاں ہوتی
ہے اور اسی کو قدرت کا عمل کہا جاتا ہے کہ فخر خان اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ اسی
درخت کے نیچے آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ غراتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

''اوئے تو پاگل ہے دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا۔ اوئے میری آنکھیں اتنی کمزور
نہیں ہیں کہ میں اسے نہیں پہچان سکتا۔ وہ سو فیصدی شاہ زیب ہی تھا۔''

''ٹھیک ہے خان جی! ظاہر ہے آپ نے اسے دیکھا تھا لیکن اب ہمارے لیے کیا
حکم ہے؟''

''اوئے دیکھو تقدیر اسے موقع کبھی کبھی ہی دیتی ہے۔ اسے ہر قیمت پر گھیر کر مارنا
ہے۔''

''خان جی! ایک بات بتاؤں آپ کو۔ بلی کو دیکھا ہے آپ نے اکیلی کمرے میں
گھر جاتی ہے تو کتنی خونخوار ہو جاتی ہے۔ شاہ جی! اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا۔''

"اوئے کتے دے پلے! میں نے تجھے اس لیے رکھا ہے کہ تو مجھے کہاوتیں سنائے؟ ہاتھ نہیں ڈال سکتا تو ریوالور لے اور اپنی کنپٹی پر رکھ کر گولی مار لے اپنے آپ کو۔ کوئی مصرف ہوگا تیرا۔"

"شاہ جی! آپ ٹھیک کہتے ہیں چلو بھئی۔ چلو جاؤ۔" اس نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا اور تینوں تیزی سے ایک جانب دوڑنے لگے۔ شاہ زیب کچھ لمحے سوچتا رہا تھا اور پھر اس نے ایک فیصلہ کرلیا اپنے آپ کو پوری طرح سنبھال کر وہ درخت کی شاخ سے فخر خان پر کود پڑا۔ فخر خان اس کی لپیٹ میں آ کر بری طرح زمین پر گرا تھا اور اس کو کافی چوٹ لگی تھی۔ جبکہ شاہ زیب اس کے جسم پر ہونے کی وجہ سے زخمی نہیں ہوا تھا۔ اس نے فخر خان کو رائفل کی زد پر لے لیا۔ فخر خان کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے دائیں گال سے خون بہنے لگا۔ کافی زور کی رگڑ لگی تھی۔ کہنیاں اور گھٹنے بھی چھل گئے تھے۔ شاہ زیب نے فخر خان کو خونی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اتنے سارے بندوں کے ساتھ ایک بندے کو گھیرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آئی فخر خان!"

فخر خان کے منہ سے شدت حیرت کی وجہ سے آواز نہیں نکلی تھی۔ وہ شاہ زیب کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی ان لوگوں نے پلٹ کر فخر خان کی طرف دیکھا جو ابھی یہاں سے گئے تھے اور ان دیوانوں کو پتہ نہیں کیا سوجھی کہ انہوں نے فوراً ہی موقع کی نزاکت دیکھے بغیر فائرنگ شروع کر دی۔ ان گولیوں سے فخر خان کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا لیکن شاہ زیب کے لیے اس وقت ضروری تھا کہ ان سے نجات پائے۔

چنانچہ اس کی رائفل سے فائر ہوئے اور تینوں وہیں ڈھیر ہوگئے۔ شاہ زیب کو یقین تھا کہ وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ ادھر فخر خان پر اس عمل کا شدید اثر ہوا تھا اور

اس کے بدن میں تھرتھری پیدا ہوگئی تھی۔ شاہ زیب نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اگر ایک انچ ادھر سے ادھر ہلے تو تمہارا حشر ان سے مختلف نہیں ہوگا۔ قرب و جوار میں جو لوگ بکھر کر شاہ زیب کو تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے اس طرف گولیوں کی آوازیں سنی تو رک گئے اور سمٹ کر ایک جگہ کھڑے ہوگئے۔ پھر اس کے بعد وہ تیزی سے اس طرف دوڑے۔ یہاں اب فخر خان اور شاہ زیب کے سوا کوئی نہیں تھا۔ شاہ زیب نے فخر خان کی پیٹی میں لگے ہوئے ریوالور کو ہاتھ ڈال کر نکال لیا۔ دوسری جانب بھی پیٹی میں ریوالور اڑسا ہوا تھا۔ دونوں ریوالور لوڈ تھے۔ شاہ زیب نے جلدی سے رائفل ایک طرف پھینکی۔ فخر خان کو بغلوں میں ہاتھ ڈال کر پیچھے گھسیٹا۔ درخت کے تنے سے پشت لگائی اور اس کے بعد سامنے کی سمت دیکھنے لگا۔

جس طرح پہلے تین پاگلوں نے اچانک ہی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ ہوسکتا ہے فخر خان کے دوسرے آدمی بھی یہی حرکت دہرائیں۔ بارہ میں سے پانچ ڈھیر ہو چکے تھے۔ سات باقی تھے اور ساتوں ہی ایک جگہ جمع ہوگئے تھے۔ وہ فخر خان کی کیفیت کو دیکھ رہے تھے اور انہوں نے شاہ زیب کو بھی دیکھ لیا تھا۔ اس نے کہا۔

"ان سے کہو کہ اپنا ایک ایک ہتھیار نکال کر جتنی دور پھینک سکتے ہیں پھینک دیں ورنہ پہلی گولی میں تمہاری گدھی میں اتاروں گا اور باقی ساری رائفل ان پر خالی کر دوں گا۔ ان کی تعداد صرف سات ہے جبکہ یہ ریوالور پوری طرح بھرے ہوئے ہیں۔"

"اوئے حرام دے پترو! ہتھیار پھینک دو۔ اوئے کتے دے پلو! ہتھیار پھینک دو۔" فخر خان خوفزدہ آواز میں چیخا۔ ان لوگوں نے فخر خان کے الفاظ سنے تو ساکت رہ گئے۔

"فخر خان! ان سے کہو کہ اپنے ہتھیار دور تک پھینک دیں بلکہ وہ ادھر دیکھو وہ نیچے

جو کھائی نظر آ رہی ہے ان سے کہو ایک ایک بندہ کھائی کے کنارے جائے اور اپنے ہتھیار پھینک دیں۔ کسی نے بھی گڑبڑ کی تو اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''کہتا ہوں یار! کہتا ہوں۔ یہ گردن چھوڑ میری آواز بھنچی جا رہی ہے۔'' فخر خان نے ہاتھ اٹھا کر شاہ زیب کے بازو کو نیچے کرتے ہوئے کہا اور پھر اس نے زور سے چیخ کر وہی الفاظ کہنا شروع کر دیئے۔ کہنے لگا۔

''اوئے کوئی گڑبڑ مت کرنا۔ میں تم سے کہہ رہا ہوں کوئی گڑبڑ مت کرنا سمجھے۔ چلو ایک ایک کر کے جاؤ سارے ہتھیار پھینک دو اور واپس اپنی جگہ آ کر کھڑے ہو جاؤ۔ اوئے جلدی کرو اوئے جلدی کرو۔'' ان لوگوں نے صورتحال کی نزاکت کو سمجھ لیا۔

چنانچہ پہلے آدمی نے جا کر اپنے ہتھیار وغیرہ سب کھائی میں پھینک دیئے اور واپس آ گیا پھر دوسرا گیا۔ ایک ایک کر کے وہ لوگ جانے لگے۔ شاہ زیب کی عقابی نگاہیں ان کا جائزہ لے رہی تھیں۔ چوتھے آدمی نے شاید اس دوران کوئی ذہانت کا عمل کرنے کے بارے میں سوچ لیا تھا چنانچہ کھائی کے کنارے سے کوئی چار گز پہلے وہ اچانک دوڑنے لگا۔ اس نے ہتھیاروں سمیت دوڑ کر کھائی میں اترنے کی کوشش کی لیکن شاہ زیب تیار تھا۔ ریوالور سے شعلہ لپکا اور اس شخص کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ گئے۔ ایک دہشت ناک چیخ کے ساتھ وہ کھائی میں جا گرا تھا۔ یہاں بھی اس نے بیوقوفی کا مظاہرہ کیا تھا۔ کنارے پر پہنچ کر ہتھیار پھینکنے کی کوشش کرتے ہوئے اگر وہ پھرتی سے کھائی میں اتر جاتا تو شاید شاہ زیب کو صحیح طور پر اندازہ نہ ہو پاتا لیکن اب وہ کھائی کے کنارے پر ہی گرا پڑا تھا۔

''اوئے تیرا بیڑا غرق' اوئے کتے دے پتر! اوئے کوئی چالاکی مت کرو۔ جیسا کہا جا رہا ہے ویسا کرو۔'' چنانچہ باقی افراد نے کوئی گڑبڑ نہیں کی۔ شاہ زیب نے یہ صورتحال دیکھنے کے بعد کہا۔

''ہاں خان جی! اب بولو کیا کہتے ہو؟''

''اوئے یار! میں کیا کہوں گا؟''

''میری تلاش میں نکلے تھے؟''

''تو نے غداری کی تھی نا!'' فخر خان بولا۔

''کیسی غداری؟''

''حیدر شاہ زندہ ہے۔''

''ہاں حیدر شاہ زندہ ہے۔''

''اور میری دستاویزات چوری ہو گئی ہیں۔ کروڑوں روپے کی زمین میرے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔''

''فخر خان! نہ تیری زمین سے مجھے کوئی دلچسپی تھی نہ دستاویزات سے۔ یہ تو میرا کام ہی نہیں تھا۔ جن حالات میں تم مجھے پکڑ کر اپنی حویلی میں لے گئے تھے۔ ان میں میرے لیے بے بسی تھی۔ تم نے مجھے قیدی کی حیثیت سے رکھا تھا اور اس کے بعد تم نے اپنی شرائط عائد کر دی تھیں مجھ پر۔ فخر خان تمہیں معلوم تھا کہ میں بھی کوئی سڑک پر گرا ہوا پتھر نہیں تھا۔ میں وہاں سے باہر نکل آیا' تمہاری شرائط پر۔ وہ میری مجبوری تھی لیکن میں کسی کے کہنے پر نہ کسی کو قتل کرنا چاہتا تھا نہ کچھ اور کرنا چاہتا تھا۔ تم لوگوں نے مجھے سڑک کا پتھر سمجھ رکھا ہے کیا۔ ایک شریف خاندان کا فرد ہوں لیکن مجبور کر دیا ہے تم نے مجھے کہ شرافت چھوڑ دوں اور اس کے بعد تم دیکھ لو یہ جتنے لوگ تم میرے ہاتھوں سے مروارہے ہو۔ ان کا خون میری گردن پر نہیں تمہاری گردن پر ہے۔ سمجھے فخر خان! اور اس کے بعد بھی اگر تم لوگوں نے اپنے آپ کو نہ سنبھالا تو مجبوری ہو گئی میری کہ میں خونریزی کرتا رہوں۔ سمجھ رہے ہو نا تم۔'' فخر خان نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ شاہ زیب نے غرائی

ہوئی آواز میں کہا۔

''اب ان میں سے اپنے ایک بندے سے کہو کہ ایک جیپ لے کر یہاں آجا
فوراً۔''

''ٹھیک ہے۔اوئے رفیق جا--- جا گڈی لے کر ایتھے آجا'' فخر خان نے ا
ایک ساتھی سے کہا اور وہ جیپ کی جانب بڑھ گیا۔

''اوئے کوئی چالاکی مت کریو۔ بہت مر گئے اب اس سے زیادہ کی گنجائش نہی
ہے۔سیدھا جیپ لے کر ادھر آجا۔''

فخر خان چیخا۔شاہ زیب اسے کور کیے ہوئے کھڑا تھا۔بہرحال تھوڑی دیر کے بع
جیپ ادھر آگئی اور جیپ کو لے کر آنے والا اسے کھڑی کر کے نیچے اتر آیا۔

''چابی کہاں ہے؟''

''سر جی! گڈی میں ہی لگی ہوئی ہے۔'' گاڑی لانے والے نے جواب دیا۔تب
شاہ زیب نے فخر خان کی تلاشی لی۔اس کی جیب سے ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں نکل
تھیں گویا دو لاکھ روپے۔شاہ زیب نے انہیں اپنی جیب میں ٹھونسا۔

''بہت کچھ بنا دیا ہے تم نے مجھے اور اب مجھے یہی سب کچھ کرنا پڑے گا۔''

''اوہ میری گل سن اوئے۔ میں نے تیرے ساتھ کونسا برا سلوک کیا تھا۔تو بول جس
حالت میں تو مجھے ملا تھا۔اسی حالت میں لے گیا تھا نا۔اب یہ الگ بات ہے کہ میں نے
تجھ سے ایک فائدہ اٹھانے کے بارے میں سوچا۔یہ بھی تو کہا تھا میں نے تجھ سے کہ میں
تیری زمینوں کی حفاظت کروں گا۔بھٹہ نہیں بننے دوں گا ادھر۔جس کے بدلے میں نے
تجھ سے ایک کام کرنے کو کہا تھا۔اوئے تو نے تو مجھ سے ہی دشمنی باندھ لی۔''

''میں نے تجھ سے کہہ دیا فخر خان! میں نے کوئی دشمنی نہیں باندھی۔بس اتنا کہا کہ
تمہارے کہنے سے میں نے حیدر شاہ کو قتل نہیں کیا لیکن اس کے ساتھ ہی نہ میں نے
دستاویزات کے بارے میں کوئی کام کیا ہے اور نہ انہیں اڑایا ہے۔کیا سمجھے؟''

''اوئے تو اس حرامی فاضل باجوہ نے یہ کام دکھایا ہے۔وہ بک گیا۔اوئے یار بس
یوائگی میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ پر ٹھیک ہے تو نے مجھے اچھی سزا دے دی۔ چھ بندے مار
دیئے میرے۔اوئے میں کیا جواب دوں گا نقصان پر نقصان ہوئے جا رہا ہے۔تقدیر ہی
ساری کھوٹی ہوگئی ہے۔''

شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔رائفل اٹھا کر جیپ کے پچھلے حصے میں ڈالی۔
دونوں ریوالور اپنے قبضے میں پہلے ہی کیے ہوئے تھے۔اس کا ایمونیشن بھی اس نے فخر
خان کے لباس سے نکال لیا اور اس کے بعد جیپ میں جا بیٹھا۔فیول چیک کیا' کافی تھا۔
اس نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی اور پھر دوسری جیپ کے پاس پہنچ گیا۔پھر

دوسری جیپ کے ٹائروں پر اس نے ریوالور سے فائر کیے اور دو ٹائر ناکارہ کر
گھوڑوں کو البتہ کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا تھا۔ انسان دشمن تھے جانوروں کو نقصا
پہنچایا جاسکتا تھا۔ ویسے بھی اس افراتفری میں گھوڑے بھاگ چکے تھے لیکن پھر بھی
فاصلے پر تھے کہ تھوڑی سی کوشش کے بعد انہیں حاصل کیا جاسکتا تھا لیکن اتنی دیر میں
دور نکل سکتی تھی۔ چنانچہ شاہ زیب نے اپنی جیپ برق رفتاری سے ایک جانب دوڑا

☆☆☆

شاہدرہ کے ایک سینما کے پاس اس نے جیپ چھوڑ دی۔ رائفل جیپ میں
رہنے دی تھی۔ ایک ریوالور بھی ہاتھ کے نشانات وغیرہ صاف کر کے جیپ میں ہی
دیا تھا لیکن دوسرا ریوالور اس نے لباس میں پوشیدہ کر لیا۔ جن حالات میں قدم رکھ
ان میں ہتھیار کا پاس ہونا بڑا ضروری تھا۔ ایک طرف پولیس تو دوسری طرف خطر
لوگ اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ایسے حالات میں اپنے آپ کو حالات کے دھار
پر چھوڑ دینا ایک خطرناک عمل کے سوا کچھ نہیں تھا۔

البتہ جو کچھ بھی کرنا تھا سوچ سمجھ کر کرنا تھا۔ چہرے میں ان شدید مشقتوں کی
سے بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی تھی۔ سرخ وسفید رنگت اب دھوپ کی تمازت اور گرد کی
جمنے کی وجہ سے تانبے کی رنگت جیسی ہوگئی تھی لیکن اس رنگت میں بھی ایک حسن تھا۔
میں جوانی کی شوخیاں اور سرخیاں جھلکتی تھیں۔ بدن شدید مشقتوں کی وجہ سے فولاد
تھا۔ چنانچہ حلیے کی تبدیلی خود بخود پیدا ہوگئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ پہچاننے والوں
تیز نگاہیں غور سے دیکھ کر صحیح اندازہ لگا سکیں۔

بہر حال شاہدرہ سے ایک آٹو رکشہ میں بیٹھا اور شہر کی جانب چل پڑا۔ کچھ
کر لیے تھے۔ لبرٹی مارکیٹ پر پہنچ کر اس نے ایک شاپ سے ریڈی میڈ لباس خرید

شلوار قمیص، پینٹ شرٹ، موزے، جوتے یہ تمام چیزیں خرید کر اس نے ایک سوٹ کیس
میں بند کیں اور ایک بار پھر وہاں سے چل پڑا۔

درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں اسے کمرہ حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش
نہیں آئی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے غسل خانے کا رخ کیا۔ ایک شلوار قمیص نکالی
تھی۔ غسل خانے میں داخل ہو کر دیر تک نہاتا رہا۔ ٹھنڈے پانی کی ہلکی پھواریں وجود
سے جیسے تھکن نچوڑ رہی تھیں۔ آنکھیں بند کر کے وہ بہت دیر تک پانی کو اپنے اوپر سے
گراتا رہا اور پھر جب یہ احساس ہوا کہ بہت دیر ہوگئی ہے۔ تو شاور بند کر کے تولیے سے
بدن خشک کیا۔ کنگھے سے بال سنوارے اور اس کے بعد باہر نکل آیا۔ غسل خانے کے
دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے کمرے کے ماحول پر ایک نگاہ ڈالی۔

وسیع وعریض کمرہ تھا۔ بہت اچھے طریقے سے آراستہ لیکن تنہا بے جان دیواریں،
بے جان چیزیں اسے سرد نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ زندگی کی کوئی رمق کہیں سے بھی نظر
نہیں آتی تھی۔ کسی ایک وجود کو وہ اپنا نہیں کہہ سکتا تھا۔ دشمنوں کی تو بے پناہ تعداد تھی،
دوستی کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ یہ لاہور تھا، لاہور میں اسے بے شمار شناساؤں کی فہرست
یاد تھی۔ کچھ اس کے یونیورسٹی کے ساتھی تھے۔ کچھ ایسے جو اتفاقیہ طور پر شناسا بن گئے
تھے۔ ایک آدھ ایسا گھرانہ بھی تھا جس سے اس کے آنے جانے کے تعلقات بھی تھے
لیکن اب کوئی اس کی صورت بھی دیکھتا تو اس سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا۔ وقت و
حالات اس طرح بدلتے ہیں اور انسان ان پر قابو نہیں پاسکتا۔ ایسی ہی بات تھی بالکل
ایسی ہی بات تھی لیکن اس طرح کے حالات جنون کو جنم دیتے ہیں جب اپنی بے بسی انتہا کو
پہنچ جاتی ہے تو پھر شرافت کے دروازے بند ہونے لگتے ہیں اور یہی وہ موقع ہوتا ہے
جب شیطان انسان پر غلبہ پاتا ہے۔ ایسے ہی موقع پر اگر کوئی بچ جانے میں کامیاب

ہو جائے تو ہم اسے ایک نیک اور کامیاب انسان کہتے ہیں لیکن بھٹکنے والوں کی تعد
زیادہ ہوتی ہے۔

شاہ زیب بڑا اچھا بڑا ہونہار نوجوان تھا جو اپنے عہد کے تحت زرعی تعلیم حاصل کر
تھا اور اکثر اس نے تنہائیوں میں یہی سوچا تھا کہ نہ صرف وہ زمین جسے بنجر قرار دیا گیا
اور کسی قابل نہیں سمجھا گیا' گل وگلزار بنا دے گا۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ اپنے وط
اور ملک کی ترقی کے لیے اپنی وہ ہر صلاحیت استعمال کرے گا جو اس کے اندر ہوگی۔ وط
عزیز کو اگر بہتر اجناس ملیں تو ملک خوش حالی کی جانب تیز رفتاری سے سفر کر سکتا ہے اور
ملک میں رہنے والے ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے عمل سے جس طرح بھی وہ اپنے ملک ک
ایک انچ مٹی کو بھی فائدہ پہنچا سکتا ہے تو اس سے گریز نہ کرے۔ کیونکہ قطرہ قطرہ ہی در
بنتا ہے۔

لیکن اسے تو خود بنجر زمین کی طرح خشک کر دیا گیا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ اس کا
آغاز اس کے اپنے گھر سے ہی ہوا تھا۔ وہ زمینیں اور جائیداد تو سبھی کی ملکیت تھیں جس
طرح دونوں بھائی اپنی بیویوں کے ساتھ مل کر اس خاندانی حویلی میں رہ رہے تھے۔ جو
خود انہوں نے نہیں تعمیر کی تھی بلکہ انہیں اور ان سے بھی پہلے والوں کو ورثے میں ملی تھی۔
اس کا ایک گوشہ اگر انہی کی طرح اس کے لیے بھی ہوتا تو بھلا کسے پڑی تھی جو وہ زمینوں
اور جائیدادوں پر قبضے کی بات کرتا۔ بلکہ اس دولت و جائیداد میں آنے والی نسلوں کے
لیے اضافہ ہی ہوتا رہتا اور اسی طرح صدیوں تک نسلیں قائم رہتیں لیکن جہاں اسی نسل
کے لوگ ان نسلوں کا بگاڑ کرنے پر تل جاتے ہیں وہیں سے بس ان کی تباہی کا آغاز ہوتا
ہے۔

اورنگزیب اور جہانزیب سے پہلے کے لوگ اپنی بیویوں کی باتوں میں آ کر اپنوں

ہی کی گردن کاٹنے پر نہیں تلے تھے۔ جس کی وجہ سے حویلی کا وقار اور خاندانوں کا حال
بہتر تھا لیکن شاہینہ نے یہاں یہ بیج بھی بو دیا تھا اور اب اس کے نتائج فی الحال ایک انسان
کو بھگتنے پڑ رہے تھے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ آنے والے وقت میں اورنگزیب اور
جہانزیب کے ساتھ کیا سلوک ہو۔ ظاہر ہے اثرات تو ان تک بھی پہنچنے ہی تھے۔

یہ تمام باتیں ہوٹل کے اس تنہا کمرے میں شاہ زیب کے ذہن سے گزر رہی تھیں
اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اسے اچھائیوں سے دور کر دیا گیا ہے اور برائیاں اب اس سے
سانپوں کی طرح لپٹ گئی ہیں اور ان لوگوں سے چھٹکارہ اب ممکن نہیں ہے۔ نیکیوں کے
راستے جیل اور پھر پھانسی کے تختے تک جاتے ہیں جبکہ اگر وہ اپنی یہی سرشت قائم رکھے
تو شاید اسے زندگی کے اور بھی لمحات مل سکیں۔ یہ بات دل کا خون کر دینے والی تھی لیکن
کبھی کبھی دوست اتنے ہی بڑے دشمن بن جاتے ہیں۔ بھائیوں کے لیے اس کے دل
میں اب بھی نفرت نہیں تھی۔ بھابی نے جو بھی کچھ کیا تھا وہ بہتر نہیں تھا لیکن یہ سب کچھ
ہونے کے بعد اب وہ ان کے ساتھ ہمدردی کا کوئی سلوک بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آخری بات اس نے دل میں یہ سوچی کہ وہ کیوں مرے۔ دنیا اس بے گناہ کو قتل کر
دینا چاہتی ہے۔ ہاں اتنا کچھ کرنے کے باوجود میں بے گناہ ہوں۔ میں نے کسی سے کچھ
چھین کر تو نہیں جینا چاہا تھا۔ لوگ مجھ سے چھین کر جینے کے کیوں خواہشمند ہیں۔ پھر تو
میرے اور ان کے درمیان جنگ چلنی ہی چاہیے۔ جہاں تک مسئلہ میری اپنی محبت کا ہے تو
اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ لجیا کو میں دل سے چاہتا ہوں اور اب شاید یہ بات کہنے میں
مجھے کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی کہ اگر زندگی میں کسی چیز کے حصول کی خواہش ہے تو وہ لجیا
ہے۔ میں اسے تلاش کرلوں گا اگر وہ زندہ ہے تو جس عالم میں بھی وہ مجھے ملے گی میں
اسے تلاش کرلوں گا۔ اب زندگی کو اقدار کے راستوں پر چلانا ممکن نہیں ہے۔ وقت جو بھی

چاہے مجھ سے طلب کرے۔ کچھ ایسا ذہنی بحران پیدا ہوا کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ لباس تبدیل کیا۔ کچھ نوٹ جیب میں رکھے۔ باقی اسی طرح محفوظ کر دیئے اگر ہوٹل کے عملے کے افراد پورے کمرے کی چھان بین کر لیں تب بھی انہیں نوٹ دستیاب نہ ہوں۔ ساری رقم کو ساتھ ساتھ لیے پھرنے کا مطلب یہ ہے کہ کہیں بھی کسی جگہ کوئی حادثہ ہو جائے اور اگر جیب میں رقم نہ ہو تو زندگی کا ہر مقصد ادھورا رہ جاتا ہے۔

بہر حال ان تمام تیاریوں کے بعد وہ باہر نکل آیا۔ ہلکے رنگ کا چشمہ آنکھوں پر لگا کر اس کا حلیہ واقعی بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔ نیچے اترا اتفاق کی بات یہ کہ سامنے ہی ٹیکسی نظر آ گئی۔ ٹیکسی میں بیٹھا اور ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ پھر وہ اس کی طرف گھوم کر بولا۔

''کہاں چلنا ہے صاحب؟''

''چلو۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی آگے بڑھا دی تھی۔ وہ لاہور کی سڑکوں اور گلیوں کو دیکھتا رہا۔ چھوٹا سا لاہور فاصلے ہی کتنے لیکن ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی قلعے کے پاس لے جا کر روک دی تو وہ چونک کر ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھنے لگا۔

''یہاں کیوں لے آئے؟''

''صاحب جی! آپ نے ہی تو کہا تھا۔''

''کیا کہا تھا میں نے؟''

''آپ نے کہا تھا قلعہ۔''

''ہوں۔ میں نے قلعہ نہیں چلو کہا تھا۔'' شاہ زیب نے جواب دیا اور دفعتاً اس کی نگاہیں ایک طرف اٹھ گئیں۔

یہ راستہ اس بازار کو جاتا تھا جہاں زندگی کا سمندر مصنوعی رنگ میں لہریں لیتا تھا۔

نا ہے وہاں زندگی بختی ہے خاص طور سے مجھ جیسے تنہا اور زمانے سے مایوس لوگوں کے لیے وہ جگہ ایک کلینک یا مطب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔

''میں نے قلعہ نہیں کہا تھا بلکہ ---'' انگلی سے اشارہ کر کے اس نے اس طرف چلنے کے لیے کہا اور ڈرائیور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''سمجھا تو میں نے بھی تھا صاحب! لیکن ڈر کے مارے ادھر نہیں لایا۔ کیونکہ آپ کے چہرے پر داڑھی ہے۔ وہ مسکرا دیا۔ ڈرائیور نے ٹیکسی تھوڑی دیر کے بعد بازار کے سامنے روک دی۔ اس نے اتر کر ڈرائیور کو دو سو کے نوٹ دیئے۔ ڈرائیور نے بڑے ادب سے گردن خم کی تھی۔

''میرا نام منیر ہے صاحب! مشہور آدمی ہوں واپسی میں اگر آپ کسی ٹیکسی ڈرائیور سے میرا پوچھیں گے تو وہ بتا دے گا۔ کوشش کر لیجئے آپ کا خادم ہوں۔''

شاہ زیب اس خادم کو چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ جب وہ لاہور میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو اوباش قسم کے نوجوان لڑکوں کی زبانی اس نے اس بازار کی کہانیاں سنی تھیں۔ یہ کہانیاں کبھی اسے متاثر نہیں کر سکی تھیں بلکہ وہ یہی سوچتا تھا کہ ماں باپ نے ان لوگوں کو تعلیم کے حصول کے لیے بھیجا ہے۔ جوانی کی عمر ایسی ہے کہ تعلیم کے سمندر سے جتنا بھی فیض اٹھا سکیں اٹھائیں اور اس کے بعد زندگی کو ایسے ہی راستے پر لے جائیں جو صحیح معنوں میں نیکیوں کے اور اچھے شہری کی زندگی کے راستے ہوتے ہیں لیکن یہ لوگ کہاں کہاں کی باتیں کرتے ہیں۔

آج وہ خود اس بازار میں سکون کی تلاش میں آیا تھا۔ تقدیر بھی بڑے دلچسپ اور انوکھے فیصلے کرتی ہے وہ ایک بالاخانے کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اس وقت اس پر بے خودی

سی طاری تھی۔ بس دل کی آگ سکون کی تلاش میں بھٹک رہی تھی۔ ابھی رقص و
شروع نہیں ہوئی تھی۔ بالا خانے خالی تھے اور اوپر پہنچا تو ایک سازندے نے اس سے کہا

"صاحب جی! ابھی تو آدھا گھنٹہ باقی ہے۔"

"کون ہے شیر خاں؟"

"صاحب ہیں بائی جی۔"

"بلالو۔ بیٹھیں گے اب گھر آئے مہمان کو ایسے تو نہیں کہا جاتا۔"

"آیئے۔" اور شیر خان نے شاہ زیب کو ایک بڑے کشادہ روشن کمرے میں
دیا۔ اس کی نفاست قابل دید تھی۔ وہ وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ ایک طرف کچھ سازندے
ہوئے تھے اور سامنے ہی ایک عمر رسیدہ خاتون۔

شاہ زیب بیٹھ گیا لیکن اسے ایک دم احساس ہوا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔
نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اچانک ہی اس کی نظر ان خاتو
پڑی اور ایک لمحے کے اندر اس کے دل و دماغ میں شدید دھماکے ہونے لگے۔ یہ
اجنبی نہیں تھا یہ جانی پہچانی شکل تھی۔ یہ وہی بائی جی تھیں جو راجہ شہاب الدین کی جیپ
آ رہی تھیں اور شاہ زیب نے انہیں راستے سے اغوا کر لیا تھا۔ یہ سمجھ کر کہ شہاب الد
کے اہل خاندان اس گاڑی میں سفر کر رہے ہیں۔ بعد میں ناچنے گانے والیاں نکلی تھیں
انہی میں ریحانہ بھی تھی۔ شمع بھی تھی اسے سب کچھ یاد آ گیا اور اس نے عجیب سی نگا
سے بائی جی کو دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھیں لیکن یہ مسکراہٹ خالص کاروبا
تھی۔ ان کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔

شاہ زیب کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ اس کے دماغ کی چرخی گھوم رہی تھی
بائی جی کا چہرہ دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ بائی جی اسے پہچان نہیں سکیں ہیں۔ بنیادی وجہ

تھی کہ اس وقت جب شاہ زیب نے اسے اغوا کیا تھا اور ڈاک بنگلے میں وہ ماجھے کے
ساتھ رہیں تھیں تو پہلی بات تو یہ کہ شاہ زیب ان کے سامنے آیا ہی بہت کم تھا۔ دوسری
بات یہ کہ اس وقت وہ ایک خالص دیہاتی کے روپ میں تھا اور اسے آسانی سے پہچان لیا
جانا ممکن نہیں تھا۔

بائی جی نے پانوں کی گلوریاں بنائیں اور ایک سازندے کے ہاتھ اس تک
پہنچائیں۔ اس کے بعد وہ خود بھی اٹھ کر شاہ زیب کے پاس آ بیٹھیں۔

"شرمائے شرمائے ہو۔ پہلی بار کسی بالا خانے پر آئے ہو؟"

"جی جی۔" شاہ زیب نے کہا۔

"پتہ نہیں کیوں، شکل جانی پہچانی سی لگتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کہیں دیکھا ہے لیکن
کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بعض چہروں کی بناوٹ ہی ایسی ہوتی ہے۔ وہ ایک نگاہ دیکھنے
سے اپنے اپنے لگتے ہیں۔"

"جی درست کہتی ہیں آپ۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"نواز خان۔" شاہ زیب کے منہ میں اس وقت یہی الفاظ آئے تھے۔

"آرام سے بیٹھو۔ کچھ جلدی آ گئے ہو۔ مگر کوئی بات نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کیا پیو
گے؟"

"نہیں کچھ نہیں۔"

"واہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کچھ تو پینا ہی پڑے گا۔"

"نہیں ابھی کچھ نہیں۔"

"اچھا اچھا۔ پان کھاؤ گے؟"

''میں پان نہیں کھاتا۔''

''نئے ہونا۔ یہاں سب کچھ کھایا پیا جاتا ہے۔ اوہو دیکھو چوہدری شہباز آ گئے۔ بڑے رنگیلے آدمی ہیں۔ ذرا ان سے ملتی ہوں۔'' بائی جی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

آنے والا ایک لمبا تڑنگا بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی تھا۔ وہ اندر آیا اور بڑی بے تکلفی سے اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ بائی جی اس کے بازوؤں میں چلی گئیں تھیں۔ چوہدری شہباز ہنس کر کہنے لگا۔

''اوہ۔ بی بی پرانے چاول پرانے ہی ہوتے ہیں۔ بچپن کی یاری بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ تمہیں کلیجے سے لگا کر جو مزہ ملتا ہے وہ کسی اور میں کہاں۔ یہ لڑکیاں بالیاں تو بس نمک پارہ ہوتی ہیں۔'' وہ بے تکے انداز میں ہنسنے لگا۔

اس نے کسی اور طرف نگاہ نہیں ڈالی تھی۔ بائی جی اسے لیے ہوئے ایک گوشے میں جا بیٹھیں۔ شاہ زیب نے ایک نگاہ بس انہیں دیکھا تھا۔ نجانے کیوں اسے اب یہ احساس ہو رہا تھا کہ جلدی آ کر یا یہاں آ کر غلطی کی ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ یہاں ریحانہ وغیرہ مل گئیں تھیں۔ جو اسے ایک عجیب سے انداز میں پہچانتی تھیں اور یہ بائی جی جنہیں یاد نہیں آیا کہ انہوں نے اسے کہاں دیکھا ہے۔ لیکن جنہیں اس بات کا شبہ ہو گیا تھا کہ اس کی شکل جانی پہچانی ہے ابھی اپنی سوچوں میں گم تھا کہ ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا اندر آیا اور سیدھا اس کے پاس پہنچ گیا۔

''باجی بلا رہی ہیں۔'' اس نے کہا اور شاہ زیب بری طرح چونک پڑا۔

''کک کون باجی؟'' بائی جی نے نگاہیں اٹھا کر لڑکے کی طرف دیکھا تھا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر لڑکے کے پاس آ گئیں تھیں۔

''کیا بات ہے تو یہاں کیوں آ گیا؟''

''وہ دادی جی! انہیں باجی بلا رہی ہیں۔''

''انہیں؟''

''ہاں جی۔''

''کون باجی؟''

''بڑی باجی۔''

''کہاں؟''

''اپنے کمرے میں۔'' بائی جی نے ایک لمحے تک سوچا پھر بولیں۔

''ٹھہر میں ابھی آتی ہوں۔ چل تو باہر نکل۔'' انہوں نے لڑکے سے کہا اور پھر لڑکے کے پیچھے ہی پیچھے باہر نکل گئیں۔ کوئی دو یا تین منٹ کے بعد وہ واپس آئیں اور شاہ زیب کے پاس پہنچ کر بولیں۔

''جاؤ اندر چلے جاؤ۔'' لہجہ کسی قدر خشک سا تھا۔ شاہ زیب بوکھلا کر ان کی شکل دیکھنے لگا۔

''جاؤ' جاؤ' چلے جاؤ۔ کوئی بات نہیں ہے جاؤ۔ چلو۔'' انہوں نے کہا اور شاہ زیب اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ یہ سب کیا چکر چل رہا ہے۔ باہر پہنچا تو شمع کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ شاہ زیب نے اسے فوراً پہچان لیا تھا۔ کہنے لگی۔

''آیئے ڈاکو صاحب! ساتھ آ جایئے۔'' اس کے لہجے میں شوخی اور شرارت تھی۔ شاہ زیب کو یہ الفاظ بڑے عجیب سے محسوس ہوئے۔

بہرحال وہ شمع کے ساتھ دوسرے کمرے میں پہنچ گیا۔ ایک بڑا سا کمرا تھا جہاں ریحانہ دروازے کے پاس ہی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے شاہ زیب کو دیکھا تو مسکرا کر سلام کیا اور شاہ زیب آنکھیں بند کر کے گردن ہلانے لگا۔

"آیئے--- شمع پلیز تو جا اور ذرا صورتحال کو سنبھال لینا۔ اماں کا موڈ خراب ہو ہوگا مگر تو اسے سنبھال سکتی ہے۔"

"جی، جی جی۔" شمع نے شوخی سے کہا اور اس کے بعد وہ باہر نکل گئی۔

"آیئے شاہ جی۔"

"کیسی ہیں آپ ریحانہ؟"

"ٹھیک ہوں۔ لیکن میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ آپ اس طرح یہاں آ جائیں گے۔"

"ہاں۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میں اس طرح کبھی یہاں تک پہنچ جاؤں گا۔"

"کچھ جذبوں کے بارے میں جانتے ہیں نا آپ۔ آیئے بیٹھئے نا۔" اس نے بے تکلفی سے شاہ زیب کا ہاتھ پکڑا اور اسے ساتھ لئے ہوئے مسہری کی طرف چل پڑی۔ بہت ہی خوبصورت مسہری بچھی ہوئی تھی۔ حالانکہ وہاں بڑی اعلیٰ درجے کی کرسیاں بھی موجود تھیں لیکن اس نے شاہ زیب کو مسہری کے ایک گوشے پر بٹھایا اور دوسرے پر خود بیٹھی۔

"جی۔ تو بات خوابوں کی ہو رہی تھی۔"

"نہیں۔ جذبوں کی۔ آپ یقین کریں کتنی ہی بار بڑے سچے دل سے آپ کو یاد کیا اور پھر اپنے آپ پر ہنس پڑی۔ میں نے سوچا کہ ویرانوں کا شکاری بھلا شہروں کا رخ کیوں کرے گا۔"

"ویرانوں کا شکاری۔"

"ہاں۔ آپ نے ہمیں ویرانی میں ہی شکار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن بڑے عجیب

شکاری تھے آپ۔ بہت عرصے تک میں آپ کے بارے میں سوچتی رہی۔ نجانے کیوں یہ احساس ہوا کہ کوئی بہت ہی عجیب بات ہے اور جتنی عجیب باتیں ہوتی ہیں نا وہ انسان کے ذہن سے چپکی رہتی ہیں اور اس کا دل چاہتا ہے کہ ان کے بارے میں جان لے بس آپ سمجھ لیں۔ یہی کیفیت میری بھی رہی ہے۔ مگر میرے پاس آپ کو جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔"

"ریحانہ! کیا آپ اس بات کا یقین کریں گی کہ زندگی میں پہلی بار میں ایسی کسی جگہ آیا ہوں اور اسے صرف اتفاق کہیں گے کہ جو پہلی سیڑھیاں میں نے طے کیں وہ یہی تھیں۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں آپ موجود ہیں۔"

"مجھے آپ کی بات پر یقین ہے۔ میرا خود بھی ایک اندازہ ہے۔ ہم لوگ یہی تو کام کرتے ہیں۔ انسانوں کو پڑھنا، انہیں دیکھنا اور محسوس کرنا۔ ہمارا یہی کاروبار ہے۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں شاہ جی۔ شاہ زیب ہے نا آپ کا نام؟"

"بتایا تھا میں نے تمہیں۔"

"ہاں جی۔ بتایا تھا آپ نے۔ بہت سی باتیں آپ بھول گئے ہیں۔"

"ہاں۔"

"اور شاید ہمیں بھی۔"

"نہیں۔ آپ کو بھول جاتا ریحانہ تو اس طرح آپ کے بلاوے پر یہاں کیوں آ جاتا۔ ویسے براہ کرم آپ مجھے یہ بتایئے کہ یہاں کے اصول یہاں کے آداب کیا ہیں میں اس جگہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ آپ مجھے گائیڈ کریں گی؟"

"نہیں۔" ریحانہ نے کہا اور شاہ زیب چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"کیوں؟"

''اس لیے کہ اگر آپ یہاں کے بارے میں تمام چیزوں سے واقف ہو جائیں گے تو یہاں کے علاوہ کہیں اور بھی جائیں گے۔''

''نہیں اصل میں میرا قیام یہاں ایک ہوٹل میں ہے بالکل تنہا ہوں۔ اس قدر اور ویران ہوں کہ بتا نہیں سکتا۔ اپنی اس ویرانی کو دور کرنے کے لیے میرے قدم ا جانب اٹھ گئے تھے۔ آپ یقین کریں صرف اتفاقات کے سہارے میں یہاں تک پہ ہوں۔ وقت مجھے یہاں لے آیا ہے تو دیکھئے ناتماشا تو نہیں بننا چاہیے اور خاص طور ایسی مشکل میں جبکہ میرا کوئی شناسا بلکہ ہمدرد بھی یہاں موجود ہو۔''

''ایک بات بتائیں ملکہ بائی نے آپ کو پہچان لیا؟''

''کون ملکہ بائی؟''

''وہ اماں' اماں۔''

''نہیں پہچانیں۔ جبکہ میں نے انہیں پہچان لیا تھا۔''

''تھوڑا سا حلیہ اور تبدیل ہو گیا ہے آپ کا۔ مثلاً یہ کہ داڑھی تھوڑی سی بڑھ گئی۔ اس وقت آپ کا حلیہ ایک سچی بات یہ ہے کہ شکاری جیسا ہی تھا۔ جسے دیکھ کر انسا خوفزدہ ہو جائے لیکن اس وقت آپ ایک انتہائی مہذب شہری نظر آ رہے ہیں۔''

''ٹھیک۔ ان الفاظ کا شکریہ۔ انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ بس اتنا کہا تھا کہ شا جانی پہچانی لگ رہی ہے۔''

''بتا دیا میں نے انہیں۔'' اس نے کہا اور شاہ زیب چونک پڑا۔

''کیا؟''

''یاد دلا دیا انہیں کہ آپ کہاں ملے تھے۔''

''کیا یہ اچھا ہوا؟''

''برا بھی نہیں ہوا۔''

''اگر وہ۔''

''نہیں کچھ بھی نہیں۔ وہ صرف ہمارے اشاروں پر چلتی ہیں۔ ان کی مجال نہیں کہ وہ ہمارے اشاروں سے الگ ہٹ کر بات کریں کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔'' ریحانہ کے لہجے میں ایک ایسا اعتماد تھا کہ شاہ زیب تعجب بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ ریحانہ بولی۔

''شاہ زیب! کیا پئیں گے یہ بتائیں؟ چائے یا کوئی ٹھنڈی چیز؟''

''میں تو یہ سوچ کر بھی نہیں آیا تھا کہ اس طرح۔''

''نہیں آپ یہ بتائیے کہ آپ کیا پئیں گے چائے یا کچھ اور؟''

''اگر ممکن ہو تو چائے ہی پلوا دیجئے۔''

''بالکل ممکن ہے۔ ہر چیز ممکن ہے۔'' اس نے کہا اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔ شاہ زیب عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ جو کچھ اس نے ان علاقوں کی کہانیوں کے بارے میں سنا تھا۔ وہ ایسا نہیں تھا جیسی اس پر گزر رہی تھی۔ غالباً ریحانہ چائے کے لیے کہہ کر آ گئی تھی اس نے کہا۔

''ایسے مت بیٹھیں۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا ہے ان لوگوں سے کہ آج کی محفل میں میری شرکت ممکن نہیں ہے۔ شمع سنبھال لے گی اور بھی لڑکیاں ہیں۔''

''مم--- مگر کیوں؟''

''اس لیے کہ میں آپ سے باتیں کروں گی آپ میرے مہمان ہیں۔''

''اور اگر اس بات پر آپ کی چچی ناراض ہو گئیں تو؟''

''تمہیں یاد ہے کہ انہوں نے مجھے یہی کہہ کر متعارف کرایا تھا کہ میں ان کی بھتیجی

ہوں۔تم نے اس حساب سے انہیں چچی کہا ہے نا؟''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔''

''تو پھر۔''

''بس یونہی۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''شاہ زیب اس وقت مجھے یہ احساس ہوا تھا جیسے میری اور تمہاری گفتگو ادھوری رہ گئی ہے۔کیا اس وقت ہم ان باتوں کو دوہرا سکتے ہیں۔دیکھو نا۔انسان کی بنیادی ضرورت یہی ہوتی ہے کہ ایک دوسرے سے تعارف ہو جائے۔کیا تم مجھے اپنے بارے میں بتانا پسند کرو گے؟''

شاہ زیب کچھ دیر سوچتا رہا۔پھر اس نے کہا۔''مگر اس سے کیا فائدہ ہوگا آپ کو ریحانہ۔''

''شاہ زیب! یہاں پر آنے والے یا تو عادی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔وہ بہت برے ہوتے ہیں' شراب پیتے ہیں اور دوسرے معاملات میں ملوث رہتے ہیں یا پھر لمحوں کے لیے بھٹکے ہوئے لوگ ہوتے ہیں جو راستہ بھول کر ادھر آ نکلتے ہیں اور پھر ایسا راستہ بھولتے ہیں کہ پھر کبھی انہیں صحیح راستہ یاد نہیں آتا۔ہم لوگ ان سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے۔ہمارا بھی ایک تصور ہے وہ یہ کہ جب یہ ہمیں بھٹکا کر یہاں تک لے آتے ہیں اور اپنے لیے ایک کھلونا سمجھ لیتے ہیں۔تو پھر ہمیں بھی اس کا حق حاصل ہے کہ ہم بھی انہیں کھلونا ہی سمجھیں۔اپنے مطلب کے کھیل ان سے کھیلیں۔ان کی جیبیں خالی کرائیں' انہیں لوٹ لیں اور اس کے بعد جب ان کے پاس کچھ نہ ہو تو انہیں دھتکار دیں۔ہم لوگ یہی کرتے ہیں لیکن انسان کے دل میں کبھی کبھی انسانیت بھی جاگ اٹھتی ہے۔ہم بھی گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں۔ہم بھی اسی طرح کے لوگ ہوتے ہیں اور کبھی کبھی

ہمارا بھی دل چاہتا ہے کہ کسی کے ساتھ محبت سے بات کریں۔شاہ زیب وہاں تم ہمیں اغوا کر کے لے گئے تھے۔مختصراً جو تم نے بتایا تھا وہ اس وقت چونکہ ہماری بری حالت تھی اس لیے ہماری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔اب کیا تم اپنے بارے میں ہمیں بتانا پسند کرو گے۔تم نے ہمیں جس طرح وہاں سے صاف ستھرا کر کے بھجوا دیا اور ہم سے کچھ بھی نہیں لوٹا یہ بات خود اماں کے لیے باعث حیرت تھی۔کہتی تھی کوئی اناڑی چور تھا۔یہ شکر ہے کہ تمہیں پہچانی نہیں۔بلکہ انہوں نے مجھ سے یہ بھی پوچھا کہ کیا میں نے تنہائی میں تم پر جادو کر دیا۔اب تو انہیں اس بات کا بھی یقین ہو جائے گا۔اگر انہوں نے اس بارے میں ذرا غور سے سوچا تو۔''

''جی ریحانہ! مگر آپ کو ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

''کن باتوں سے؟''

''وہی جو میں آپ کو بتاؤں گا۔''

''دیکھو ہر جگہ فائدہ اور نقصان کے بارے میں تو نہیں سوچا جاتا۔زندگی کی بہت سی ضرورتیں ہوتی ہیں۔جو انسان ایک دوسرے سے پوری کرتا ہے۔''

''میں تمہیں کیا بتاؤں؟''

''یہی کہ کون ہو تم؟ کیا ہو؟ اپنا دل کھول دو یقین کرو نقصان نہیں ہوگا۔'' اس نے کچھ ایسی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا کہ شاہ زیب کا دل اندر سے بھر آیا۔کسی نے اس طرح نہیں پوچھا تھا۔اس سے ملے تو بہت سے تھے۔ہمدرد بھی تھے' دشمن بھی تھے' ساتھی بھی تھے۔خود لجیا تک سے یہ بات نہیں ہوئی تھی۔لجیا تو ایک معصوم اور الہڑ سی لڑکی تھی۔کیسے پیار سے کہا تھا اس نے شادی کر لو مجھ سے سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔کوئی لڑکی اپنی زبان سے اس طرح کے الفاظ نہیں کہہ سکتی۔لیکن اس کے ان الفاظ میں کوئی فریب نہیں

تھا۔ بس ماں باپ کی ایک الجھن تھی اس کے ان الفاظ میں محبت کا کوئی عنصر بھی نہیں تھ
جبکہ شاہ زیب اپنے دل کو ٹٹولتا تھا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے لجیا بغیر کسی راستے کو تلا
کیے سیدھی اس کے دل میں آ کر بیٹھ گئی ہو۔

ادھر ریحانہ کی حسین اور دلکش آنکھیں اس کے وجود میں اتر رہی تھیں اور پھر ا
یوں ہوا جیسے شاہ زیب پانی کی طرح بہنے لگا۔ اس کی زبان اس کی اپنی کہانی سنا رہی تھی
اس کی کہانی میں جذبات بھی تھے' دکھ تھا' آنسو تھے' ہچکیاں تھیں' سسکیاں تھیں۔ وہ سب
کچھ بتا رہا تھا اپنے بارے میں' اپنے بھائیوں کی بے اعتنائی' بھابیوں کی وحشت خیزی
سارا ماحول جو اس کے خلاف تھا۔ وہ ساری باتیں اس نے ریحانہ کو بتا دیں۔ حالانکہ
ایک طوائف تھی کوٹھے پر بیٹھی ہوئی ایک ایسی لڑکی جو نجانے کتنے رازوں کو اپنے سینے م
چھپائے ہوگی۔ ایک اور راز اس کی زندگی پر بوجھ بن گیا ہوگا۔ ریحانہ خاموشی سے اسے
دیکھ رہی تھی۔

شاہ زیب اس وقت چونکا۔ جب اس کی ساری داستان ختم ہوگئی۔ اسے یوں لگا
جیسے اس داستان کو سنانے کے لیے وہ زندہ تھا اور جب اسے اپنی زندگی کا احساس ہ
وہ چونک کر ریحانہ کو دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس نے یہ ساری ک
ریحانہ کو کیوں سنا دی۔ یہ تو بڑی عجیب بات تھی۔ وہ جلتی نگاہوں سے ریحانہ کو دیکھنے لگ
ریحانہ بت بنی ہوئی تھی اور اس وقت یہ جمود ٹوٹا جب ایک عورت ایک ٹرالی دھ
ہوئے اندر آ گئی۔ ٹرالی پر بہت ہی نفیس قسم کے پھل اور بسکٹ وغیرہ سجے ہوئے تھے
ساتھ ہی نچلی سطح میں چائے کے برتن بھی رکھے ہوئے تھے۔ جن سے مدھم مدھم بھا
اٹھ رہی تھی اور چائے کی نفیس خوشبو فضا میں تیر رہی تھی۔ اس نے برتن اٹھا کر چا
بنائی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اس نے کہا۔

"کیا ہی عجیب کہانی ہے لیکن اس طرح تو شاہ زیب! تم کسی بھی وقت کسی مشکل کا
کار ہو سکتے ہو۔"
"ہاں۔ میں جانتا ہوں۔"
"اپنی زندگی کا کوئی اختتام نہیں سوچا ہے تم نے۔"
"سوچا ہے۔" شاہ زیب نے چائے کا گھونٹ لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔
"کیا؟"
"موت۔" شاہ زیب نے کہا اور نجانے کیوں ریحانہ بے اختیار ہوگئی۔ اس نے
نا خوبصورت ہاتھ شاہ زیب کے ہونٹوں پر رکھ دیا اور پھر بولی۔
"جذبات زندگی کا ایک حصہ ہوتے ہیں لیکن عقل بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ حرام
وت مرنا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ برائی کسی نے کی۔ نتیجہ تم بھگت رہے ہو۔ تم نے
س جانب قدم اٹھائے ہیں شاہ زیب میں سمجھتی ہوں وہی ایک صحیح راستہ تھا تمہارے
لیے۔ بالکل ٹھیک کیا ہے تم نے کہ بندوق اٹھالی ہے اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ان
وں سے نمٹ رہے ہو۔ مگر ان کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ شاہ زیب! یہ بات
ہارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔"
"مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے میں تم سے سچے دل سے یہ بات کہہ رہا ہوں
ریحانہ! کہ موت اب میرے لیے بے حقیقت چیز بن کر رہ گئی ہے اور جس کی زندگی سے
سی کو کوئی فائدہ ہی نہ ہو۔ خود مجھے اپنی زندگی سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تو کیا جینا بہت
روری ہوتا ہے۔ بتاؤ؟"
"ہاں جینا بہت ضروری ہوتا ہے شاہ زیب! کاش میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔"
"تم نے میری مدد کر ڈالی ہے ریحانہ! میں نہیں جانتا کہ تقدیر کیا سوچ کر تمہیں

میرے پاس لے آئی ہے۔ وہاں ڈاک بنگلے میں بھی میرے دل میں تمہارے ۔
گداز پیدا ہوا تھا۔ مجھے افسوس ہوا تھا اس وقت کہ میں نے تم لوگوں کو تکلیف ا
جب میرے اندر کا انسان مجھے ذہنی طور پر دیوانہ کئے دے رہا تھا۔ ایک بار تم پھر
دل پر مرہم بنی ہو۔ سچ جانو میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ میں تمہیں مرہم کہوں صرف مر؟

''شاہ زیب! اب کہاں جاؤ گے؟'' ریحانہ نے محبت بھری آواز میں کہا۔

''گھر اور کہاں؟''

''گھر؟''

''میرا مطلب ہے ہوٹل۔''

''صبح کو چلے جانا۔'' وہ بولی اور شاہ زیب جلتی آنکھوں سے اسے دیکھنے
ریحانہ نے ایک بار پھر کہا۔

''ہاں صبح کو چلے جانا۔ میں کہہ رہی ہوں نا تم سے۔''

''ریحانہ! بہت تھکا ہوا ہوں میں۔''

''ہاں۔ میں جانتی ہوں بہت تھک گئے ہو تم بس ابھی نہ جاؤ۔ سمجھے ابھی نہ جاؤ.

''لیکن کیا میرا یہاں رہنا مناسب ہوگا۔''

''ہاں۔ مناسب ہوگا۔ یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں ہے۔ مجھے سوچنے د
ریحانہ نے کہاں اور مسہری کے پائنتی میں بیٹھے ہوئے شاہ زیب کے قدموں میں
گئی۔ پھر اس نے شاہ زیب کے جوتوں کو ہاتھ لگایا تو شاہ زیب جلدی سے اپنا پاؤں ؟
کر کے بولا۔

''ریحانہ --- یہ --- یہ ---''

''دیکھو کبھی کبھی کسی کو کچھ دے دیا کرتے ہیں۔ پتہ ہے اس دینے کا ثواب ہوتا

ی کے منہ سے بلکہ دل سے ایک سچی دعا نکل جائے تو بہت سی مشکلیں ٹل جاتی ہیں۔
تمہیں سچے دل سے دعا دوں گی تم اس وقت اپنے آپ کو میرے لیے چھوڑ دو۔ میرا
ا جو چاہے میں وہ کروں اس پر اعتراض نہ کرو۔ بولو مجھے یہ خیرات دے دو گے۔''

''ریحانہ! کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔ میں تو تمہارے ان الفاظ پر ہی حیران ہوں۔
ا کائنات میں کوئی ایسا ہے جو میرے لیے اتنے گداز سے سوچے ریحانہ! میں تمہیں
ا کے صلے میں کیا دے سکوں گا؟''

''اس وقت مزید کچھ دینے کی بات مت کرو۔ جو میں مانگ رہی ہوں وہ تو دے
۔'' ریحانہ نے پھر اس کے جوتے کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا اور شاہ زیب
رانی سے اسے دیکھتا رہا۔ ریحانہ نے اس کے جوتوں کے فیتے کھولے' جوتے اتارے
رموزے اتارے اور اس کے پیروں کو ہاتھ سے ملنے لگی۔ پھر اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی
رکھنے لگی۔

''سیدھے ہو کر لیٹ جاؤ۔''

''ریحانہ؟''

''اب بھی اعتراض کرو گے۔''

''نہیں۔'' شاہ زیب نے کہا اور پھر سیدھا ہو کر مسہری پر لیٹ گیا۔

نجانے کیوں اس وقت وہ اپنے آپ کو ایک ہلکا پھلکا کھلونے جیسا محسوس کر رہا تھا
رحیرانی سے سوچ رہا تھا کیا ایسا بھی ہوتا ہے کسی کے دل میں کسی کے لیے بے لوث' بے
رض ایسا پیار بھی جاگ سکتا ہے۔ یہ ساری باتیں اسے بڑی اجنبی سی لگ رہی تھیں
لیونکہ اس کی زندگی میں پہلی بار کچھ ایسے لمحات آئے تھے۔

بہر حال وہ بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔ ریحانہ اس سے باتیں کرتی رہی اس کی باتیں

کرنے کا انداز ہی بڑا دلکش تھا۔ شاہ زیب نے کتنی ہی بار یہ بھی سوچا تھا کہ کسی نے
یہاں موجودگی پر اعتراض نہیں کیا۔ ریحانہ اپنی محفل چھوڑ کر یہاں موجود ہے۔
بہر حال ہوتے ہوں گے کچھ اصول۔ آدھی رات تک وہ جاگتا رہا۔ ریحا
سے باتیں کرتی رہی۔ وہ مسہری پر آ کر اس کے برابر ہی لیٹ گئی تھی۔ اس کے ل
ہاتھ کی خوبصورت انگلیاں شاہ زیب کے خوبصورت بالوں میں گردش کرتی رہی تھی
شاہ زیب کو نجانے کیا کیا یاد آتا رہا تھا۔ اس کے دل میں کوئی حیوانی جذبہ نہیں جا
اس لمس میں تو ماں جیسا پیار تھا۔ ماں اور نجانے کب ماں ہی کو یاد کرتے کرتے وہ
نیند سو گیا۔

صبح کو جاگا تو غسل خانے سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے
نگاہوں سے اس شاندار کمرے کا جائزہ لیا ہر چیز قیمتی' ہر شے سے نفاست ٹپکتی ہوئی۔
طرف ریحانہ کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نجانے کیوں اسے
گہرے جرم کا سا احساس ہو رہا تھا۔ حالانکہ خود جرم اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کچھ
لمحوں کے بعد ریحانہ ایک گھریلو لباس میں باہر نکلی اس کے بالوں سے پانی کے قط
ٹپک رہے تھے۔ چہرہ اس طرح دھلا دھلا لگ رہا تھا جیسے رات بھر پھولوں پر شبنم گر
اور پھول نکھر جائیں۔ وہ مسکرائی تو اس کے سفید دانتوں کی قطار جھانکنے لگی۔

''اٹھو---ملازمہ دو تین بار چائے کے لیے پوچھ چکی ہے۔ پتہ نہیں تم صبح کو جا
پیتے ہو یا نہیں۔ میں نے صرف تمہاری وجہ سے انتظار کیا ہے۔ ورنہ نہانے سے پہلے
چائے پیتی ہوں۔''

شاہ زیب کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا وہ خاموشی کے ساتھ غسل خانے میں چلا
تھا۔ منہ ہاتھ وغیرہ دھویا۔ نہانے کی تو گنجائش نہیں تھی جو لباس پہنے ہوئے تھا اسے تبد

کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا چنانچہ نہانے کا کیا فائدہ۔ البتہ بال وغیرہ سنوار کر وہ تازہ دم
ہو گیا' باہر نکلا تو چائے کی مدھم مدھم خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

''آؤ۔'' ریحانہ نے کہا اور اس کے لیے بنائی ہوئی چائے کی پیالی اس کی طرف
بڑھا دی۔ اس چائے کا کپ اٹھا لیا۔ وہ کیا بتاتا کہ زندگی اب جن لمحات سے آشنا ہوئی
ہے اس میں تو کبھی کبھی فاقہ کشی کی نوعیت آ جاتی ہے۔ اس نے کہا۔

''ریحانہ! اگر میں تم سے صرف یہ کہوں کہ تمہارا شکریہ۔ بہت عرصے کے بعد تم نے
مجھے وہ یادیں واپس لوٹا دی ہیں۔ جو اب خواب کی شکل میں بھی باقی نہیں رہی تھیں تو یہ ان
تمام کاوشوں کی نفی ہو گئی جو تم نے میرے لیے کی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ یہاں کے
آداب کیا ہوتے ہیں لیکن اتنا میں نے سن رکھا ہے کہ یہ جگہیں صرف دولت مندوں کے
لیے ہوتی ہیں۔ پتہ نہیں میری تقدیر کا کون سا حصہ اتنا روشن تھا کہ مجھے تم جیسی ہمدرد ملی۔''

''بہت اچھی باتیں کر لیتے ہو۔ میدان جنگ کا کھلاڑی اگر زندگی سے اتنا آشنا ہو تو
بڑی بات ہوتی ہے۔''

''نہیں ریحانہ! میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میدان جنگ میری منزل نہیں تھا۔ میں تو
زمینوں کو سبزہ دینے کے لیے پیدا ہوا تھا۔ نجانے یہ زمینیں میرے ہاتھوں سے سرخ کیوں
ہونے لگیں۔ قصور میرا نہیں ہے ریحانہ! کل کو اگر پھر مجھے ان زمینوں کی محبت سونپ دی
جائے تو تم دیکھنا جہاں ہاتھ رکھوں گا وہاں کونپلیں پھوٹ اٹھیں گی۔''

''ایسا تو ہوا ہے شاہ زیب! جہاں تم نے ہاتھ رکھا ہے وہیں کونپلیں پھوٹ اٹھی
ہیں۔''

باہر سے آواز آئی۔

''ریحانہ---ریحانہ---'' یہ ملکہ بائی تھی وہی عورت جو ریحانہ کو اپنی بھتیجی اور شمع کو

اپنی بیٹی کہا کرتی تھی۔ وہ اندر آ گئی تو شاہ زیب کچھ الجھ سا گیا۔ اس نے گہری نگا
سے شاہ زیب کو دیکھا تھا اور پھر بول اٹھی۔

''یقین کرو جب بھی تمہارے چہرے پر نظر پڑتی ہے یوں لگتا ہے کہ کہیں د
ہے۔ اب یہ نگوڑی یادداشت ساتھ نہیں دیتی۔ ریحانہ کہیں چلنا ہے ہمیں۔ تمہیں پتہ
کسی نے ہمیں کہیں بلایا تھا۔'' ریحانہ نے کسی قدر ناپسندیدہ نگاہوں سے ملکہ بائی کو د
اور کہا۔

''اماں! چلے جائیں گے ابھی صبح ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔''

''دیکھو بی بی! بات اصل میں یہ ہے کہ مہمانوں کو بلاؤ انہیں کلیجے سے لگاؤ۔ سب
کچھ کرو لیکن کوٹھوں کے آداب مت بھولو۔ ہماری تو زندگی ہی اتنی سی ہوتی ہے۔ جوا
کے چند دن ہی تو ایسے ہوتے ہیں کہ ہمارا بڑھاپا کٹ جائے۔ گھوڑا گھاس سے یار
کرے گا تو کھائے گا کیا۔ میں صرف یہ کہہ رہی تھی۔''

''معافی چاہتا ہوں واقعی میری وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی۔ میں آپ کا مطلب
سمجھ گیا ہوں یہ ایک تھوڑی سی نذر۔'' یہ کہہ کر شاہ زیب نے اپنی جیب سے لائے ہوئے
وہ سارے نوٹ ملکہ بائی کی جانب بڑھا دیئے جو اچھی خاصی مالیت رکھتے تھے۔

''ارے' ارے شاہ زیب! یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔ یہ غلط ہے۔'' ریحانہ نے کہا
لیکن ملکہ بائی نے جلدی سے آگے بڑھ کر نوٹ پکڑ لئے تھے۔

''یہی تو فرق ہوتا ہے جوانی اور بڑھاپے میں۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے کوئی ایک
کام بھی سوچ سمجھ کر کیا جاتا ہو اس جوانی کے عالم میں۔ اچھا ناشتہ کر کے جانا بیٹا!'' یہ کہہ
کر ملکہ بائی نے نوٹ اپنے لباس میں رکھے اور دروازے سے باہر نکل گئی۔

ریحانہ غم وغصہ کے عالم میں اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ پھر اس نے شاہ زیب کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ نے کیا کیا شاہ زیب! میری رات بھر کی محنت پر پانی پھیر دیا۔''

''رات بھر کی محنت پر۔'' شاہ زیب نے کسی قدر حیرانی سے کہا۔ ریحانہ کے چہرے
پر جذبات کے سائے لرز رہے تھے۔ کہنے لگی۔

''ہاں۔ ساری رات تمہارا سر اپنے سینے سے لگا کر سوئی ہوں اور کسی قسم کا کوئی اور
جذبہ میرے سینے میں پیدا نہیں ہوا۔ میں نے تو اپنی ذات میں تمہارے قرب کے چراغ
جلائے تھے۔ سارے چراغ تم نے بجھا دیئے ان کاغذ کے ٹکڑوں سے۔ وہ تو ہے ہی مکار
عورت جو اس نے کیا بہت برا کیا۔''

''ریحانہ! تمہارے پاس کبھی کبھی آنا چاہتا ہوں میں۔''

''تو آ جایا کرو کس نے منع کیا ہے۔''

''اس کاغذی پل کے بغیر تم تک رسائی مشکل نہیں ہوگی؟''

''میں اپنی ذات کے لیے بھی تو جیتی ہوں۔ ملکہ بائی کے لیے تو میں نے اپنی پوری
زندگی وقف کر دی ہے۔ خود بھی تو سانس لیتے رہنا چاہتی ہوں میں اور اگر میں یہ سانس
لینا بند کر دوں تو ملکہ بائی پھر میرے نام سے کیا کمائے گی۔ آئندہ پلیز ایسا مت کرنا۔''

''ٹھیک ہے اب چلوں۔''

''ناشتہ کر کے جانا۔''

''نہیں ناشتہ رہنے دو۔''

''کر لو نا۔ تھوڑی دیر اور سہی۔''

''وہ کہہ رہی تھی اسے کہیں جانا ہے؟'' شاہ زیب بولا۔

''کہیں نہیں جانا۔ بس یہ حربے ہوتے ہیں' گر ہوتے ہیں۔'' ریحانہ نے افسردگی

سے کہا۔

پھر شاہ زیب نے موزے پہنے، جوتے پہنے اور اس کے بعد وہ ریحانہ کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔

ریحانہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سینے سے دل نکل گیا ہو۔ یہ رات اس پر بھی سحر کی رات گزری تھی۔ ماضی کی کہانی جو کچھ بھی تھی حال میں اسے بھول چکی تھی لیکن کبھی کبھی ایسی نئی کہانیاں جنم لیتی ہیں جو ماضی کی کہانی سے الگ ہٹ کر ایک اور کہانی بن جاتی ہے۔ گزری رات ایک انوکھا پراسرار وجود اس کے سینے سے لپٹا سوتا رہا تھا۔ وہ ان تمام حیوانی جذبوں سے بے نیاز تھا جو ریحانہ جیسی لڑکیوں کے لیے مخصوص ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہ خونی جذبے انسان سے اس کی اپنی شخصیت چھین لیتے ہیں اور وہ کچھ لوگوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ جاتے ہیں۔

لیکن گزری رات ایک معصوم سا بچہ اس کی آغوش میں تھا۔ اس کے دل چاہ رہا تھا کہ اسے اپنے سینے کی گہرائیوں میں اتارے اور ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کی بے خبری میں اس نے اس کا سر اپنی چھاتی میں بھینچ لیا تھا اور رات ایسے گزر گئی تھی جیسے ہوئی ہی نہ ہو بس کچھ لمحے اس قدر جاوید ہوتے ہیں کہ ان کی آہ سی سینے میں رہ جاتی ہے۔

بہت دیر تک وہ دروازے پر نگاہیں جمائے بیٹھی رہی پھر اسے دروازے سے ملکہ بائی کا مکروہ چہرہ نظر آیا اور ایک دم اس کے وجود میں ایک گرم سی لہر دوڑ گئی۔ ملکہ بائی نے وہی کیا تھا جو ایک طوائف کر سکتی تھی۔ وہ ان جذبوں کے خواب تک نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جو اس وقت ریحانہ کے دل میں پیدا ہو گئے تھے۔ بے غرض، بے مقصد، ریحانہ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ملکہ بائی مسکراتی ہوئی اس کے پاس آ بیٹھی۔

''انتخاب تو اچھا کیا تو نے، اچھی خاصی رقم دے کر گیا ہے۔ تھا کون؟''

''اماں! آپ کو بھی شرم و حیا سے کوئی واسطہ نہیں رہا ہے۔ میں نے ہر اس شخص کی پذیرائی کی ہے جس کی جانب آپ نے انگلی اٹھا دی ہے۔ آپ سے میرے ایک بھی مہمان کی پذیرائی نہ ہو سکی۔''

''اے لو بوا! میں نے کیا کر دیا۔'' ملکہ بائی نے حیرانی سے کہا۔

''اگر کچھ کرنا ہوتا اس سے۔ کچھ لینا دینا ہوتا تو میں ہی لے دے سکتی تھی۔ آپ نے مجھے اس کی نگاہوں سے کتنا گرا دیا۔''

''ارے، ارے کیا ہو گیا تجھے ریحانہ! پہلی بات تو یہ کہ میں بڑی حیران ہوں۔ وہ کون تھا مجھے تو یاد ہی نہیں آ رہا۔ نجانے کیوں دماغ میں ٹھک ٹھک ہو رہی ہے کہ کہیں دیکھا تھا اسے۔ خیر بہت سے چہرے ایسے ہوتے ہیں جو جانے پہچانے لگتے ہیں۔ مگر تو نے بھی اسے ضرور پہچان لیا تھا۔ ورنہ اس طرح بلا کر اپنے کمرے میں کیوں لے جاتی۔ پھر ساری رات خیر۔ اس پر تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن یہ پیسے نہ لینے کی کیا بات ہے۔ ارے اگر کوئی اچھی آسامی ہے تو میں کب منع کرتی ہوں۔ پھر آئے گا میرا تجربہ کہتا ہے پھر آئے گا۔ اس میں الجھن کی کیا بات ہے؟''

''تم نے اسے نہیں پہچانا تھا اماں!''

''نہیں۔ تو نے ضرور پہچان لیا ہو گا۔ کون تھا آخر وہ؟''

''یاد نہیں جب ہم راجہ شہاب الدین کے گھر سے واپس آ رہے تھے اور راستے میں کسی نے ہمیں اغوا کر لیا تھا۔''

''ایں۔''

''ہاں، ارے میری میاہ ارے، ارے رے رے۔ یہ تو وہی ڈاکو تھا۔ ارے باپ رے پر ریحانہ، ریحانہ وہ تو تمہیں لے کر باہر چلا گیا تھا تو کیا اوہو اوہو۔''

''اب بلاوجہ کا شور' اوہو' آہا لگا رہی ہیں۔ پہلی بات آپ مجھے یہ بتایئے وہ ڈاکو تھا؟''

''لو پھر کون تھا؟''

''اور اس نے آپ کا سارا مال آپ کو واپس کر دیا۔ کیوں؟''

''ایں۔''

''ہاں۔''

''مگر وہ تو تیرا کارنامہ تھا۔ عورت اچھے اچھوں کو بیوقوف بنا دیتی ہے۔''

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اصل میں وہ سرے سے ڈاکو تھا ہی نہیں۔ وہ بے چارا تو ایک مصیبت کا مارا ہے۔''

''ہاں' ہاں مصیبت کا مارا ہے اور ہم جو وہاں مصیبت کے مارے بن گئے تھے۔ کم بخت نے گاڑی کی گاڑی غائب کر دی۔ دو بندے جان سے مار دیئے۔ ارے بابا! یہ یہاں تک کیسے پہنچ گیا۔ کیا تو نے اسے اپنا پتا بتایا تھا؟''

''ارے فضول باتوں سے گریز کرو۔ وہ یہ سمجھا تھا کہ جیپ میں راجہ شہاب الدین کی سواریاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ مطلب یہ کہ اس کے گھر کی عورتیں' انہی کے دھوکے میں وہ ہمیں لے کر آیا تھا۔''

''راجہ شہاب الدین کے گھر کی عورتوں کے دھوکے میں؟''

''تو اور کیا۔''

''مگر یہ کیا بات ہوئی۔ اس کے گھر کی عورتوں سے اسے کیا دشمنی ہے؟''

''لمبی کہانی ہے راجہ شہاب الدین کے بارے میں۔ خیر یہ کہنا ہی بالکل بیکار ہے کہ وہ ایک کمینہ صفت اور اوباش آدمی ہے۔''

''چوہدری ایسے ہی ہوتے ہیں بیٹا!''

''نہیں' بالکل نہیں۔ سارے چوہدری ایسے نہیں ہوتے۔ اماں بعض لوگ راجہ شہاب الدین جیسے ہوتے ہیں اور بعض کو خدا اس زمین پر فرشتے بنا کر اتارتا ہے۔''

''تلاش کرنا پڑے گا بیٹا--- فرشتے کہاں ہوتے ہیں مگر راجہ شہاب الدین سے اس کا جھگڑا کیا ہے؟''

''راجہ شہاب الدین نے ایک لڑکی کو اغوا کر لیا ہے۔ جس کا نام لجیا ہے اور یہ لجیا سے محبت کرتا ہے۔ بس اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ کسی ایسی ہستی کو پکڑنا چاہتا ہے جو راجہ شہاب الدین کی اپنی ہو اور اس کے بعد وہ راجہ شہاب الدین سے لجیا کی رہائی کی بات کرے گا۔ ہمیں وہ راجہ شہاب الدین کے گھر کی سواریاں سمجھ کر ہی اٹھا لایا تھا اور جب اسے علم ہوا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے تو آپ نے خود دیکھ لیا کہ اس نے کس طرح اپنے آدمی کے ہاتھوں ہمیں واپس لاہور پہنچا دیا۔''

ملکہ بائی سکتے کے عالم میں یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔ بے حد چالاک عورت تھی۔ راجہ شہاب الدین کے بارے میں بھی اس طرح جانتی تھی کہ کس پائے کا زمیندار ہے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ خود بھی زمیندار ہے مگر تم کہتی ہو کہ اس سے اس کا سب کچھ چھن چکا ہے۔''

''ہاں اماں! رشتے ناطے تو اب انسانوں کی دنیا میں مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔ حالانکہ مجھے اس بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں لیکن دنیا تو دیکھی ہے میں نے رشتے اس طرح بھی اتنے برے اور دشمن بن جاتے ہیں۔ میں یہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔''

''وہ تو شکر کرو کہ ڈاکو نہیں بنا ورنہ اتنی آسانی سے ڈاکے مار سکتا ہے؟'' ملکہ بائی

نے معنی خیز نگاہوں سے ریحانہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''لو اماں! اس کے لئے کیا مشکل ہے۔ جوان ہے' طاقتور ہے۔ بس یوں کہو اچھا خون ہے جواب تک اسے بالکل ہی برا بننے سے روکے ہوئے ہے۔ تم دیکھو تو سہی غضب خدا کا چاروں طرف دشمن ہی دشمن بکھرے ہوئے ہیں۔ کوئی دوستی کا نام ونشان نہیں ہے۔''

''مگر شہاب الدین تو معمولی آدمی نہیں ہے وہ تو اسے قبر کی گہرائیوں میں پہنچا دے گا۔ اتنے سارے زمینداروں سے لڑنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔''

''اماں! ایسی بات نہیں ہے۔ جب انسان کچھ کرنے پر اتر آتا ہے تو بہت کچھ کر لیتا ہے۔''

''تمہیں جو یہ پیسے دے کر گیا ہے اس کے پاس کہاں سے آئے تھے؟''

''یہ کوئی کرنے کا سوال ہے۔ بس غیرت مند تھا۔ تمہارے سامنے اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکا اور جو کچھ جیب میں تھا دے کر چلا گیا۔''

''ہاں پر بیٹا ہے خطرناک آدمی۔ اب آگے کیا کرو گی؟''

''اماں! وہ تو اتنا معصوم ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتی۔ بہت ہی معصوم بس یوں سمجھو ایک بچے کو آگ میں ڈال دیا گیا ہے اور وہ اس آگ سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔'' ملکہ بائی گہری نگاہوں سے بیٹی کو دیکھتی رہی۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

''کل رات کو سب لوگ بڑی شکایت کر رہے تھے مگر میں نے اس لیے کچھ نہیں کہا کہ تم ایسی حرکتیں کرتی رہی ہو پر بیٹا یہ کوٹھا ہے۔ یہاں سب کو برابر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آئندہ اس بات کا خیال رکھنا۔''

''اماں! اگر یہ بات نہ کہتی تو زیادہ اچھا ہوتا۔ میں خود بھی انسان ہوں' جینا چاہتی ہوں۔ تمہاری مرضی کے مطابق سب کچھ کرتی رہی ہوں۔ شکر ہے پچھلی رات کو تم نے اپنی ٹانگ نہیں اڑائی ورنہ بری طرح منہ کی کھاتی۔ آئندہ بھی اس کا خیال رکھنا۔''

''میں تو بس ایسے ہی کہہ رہی تھی۔ اچھا چلو اب تیار ہو جاؤ ذرا چلنا ہے۔''

''تم جاؤ میں آتی ہوں۔'' ریحانہ نے کہا۔

جو کچھ کرنا تھا وہ کرتی رہی اور اس کے ذہن میں شاہ زیب کی ایک ایک بات گونجتی رہی۔ نجانے کیوں اسے اپنے دل میں ایک کسک سی محسوس ہو رہی تھی۔ شاہ زیب مصیبتوں کا مارا پڑھا لکھا نوجوان جاگیردار جس سے اس کا سب کچھ چھن گیا تھا اور وہ اب ایک خطرناک آدمی بن کر رہ گیا تھا لیکن میرے لیے بھلا کون سا راستہ ہے۔ سوائے اس کے کہ خود اپنی آگ میں جل جاؤں' کر بھی کیا سکتی تھی اس کے سوا۔ کاش تمہارے لیے کچھ کر سکتی شاہ زیب۔

ادھر تو ریحانہ کے ذہن میں یہ سوچیں گردش کر رہی تھیں اور ادھر ملکہ بائی اپنے طور پر یہ سوچ رہی تھی۔ اس کے سوچنے کے انداز میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہی ایک انداز جو طوائفوں کا ہوتا ہے۔ رحیمی اس کا ایک سازندہ تھا۔ نوجوانی کے زمانے میں ملکہ بائی کا عاشق تھا گھر بار چھوڑ کر اس کے کوٹھے پر آ پڑا تھا۔ ملکہ بائی کے لیے وہ بے کار سی چیز تھا۔ یہ اپنا گھر بار بھول گیا تھا اور جب ملکہ بائی کے ٹکڑوں پر اس کی زندگی کا دارومدار ہو گیا تو ملکہ بائی نے اسے کوئی ساز بجانا سیکھنے کے لیے کہا اور رحیمی نے بانسری بجانا سیکھ لی۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بڑی اچھی بانسری بجاتا تھا۔ اب تو وہ اپنے خاندان کو بھی بھول گیا تھا۔ ملکہ کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ بہر حال ملکہ بائی نے اسے طلب کیا اور رحیمی اس کے پاس پہنچ گیا۔

"رحیمی! تم سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں۔ ذرا اپنے پیٹ کے ہلکے پن کا دھیان رکھنا۔کوئی بات منہ سے نکالی تو زبان نکال کر ہتھیلی پر رکھ دوں گی۔"

"جو کرنا ہے کر ڈالو دھمکیاں کیوں دیتی ہو۔کبھی رحیمی نے تم سے غداری کی ہے۔ جو زبان دے دی اس زبان سے کبھی ہٹا ہے۔ زبان باہر نکال کر رکھنا چاہتی ہو تو حاضر ہے۔" رحیمی نے لمبی زبان باہر نکال دی۔

"کسی سرکس میں مسخرے ہوتے تو کما کھاتے یہ پھیپھڑا اندر کرو۔ توبہ توبہ کیسی بدنما زبان ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ٹھیک ہے۔کبھی تم ہی اپنے رحیمی کی تعریفیں کیا کرتی تھیں۔"

"دماغ خراب تھا' میرا پاگل ہوگئی تھی۔اب چپ بھی کرو گے یا بک بک ہی کیے جاؤ گے۔مشکل میں پڑ گئی ہوں۔"

"اللہ نہ کرے---رحیمی کے ہوتے ہوئے بھلا تم مشکل میں پڑو۔ یہ کیسے ممکن ہے۔" رحیمی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"سچ مچ مشکل میں پڑ گئی ہوں۔ ارے تم یہ دیکھو رحیمی یہ لڑکیاں ہی ہمارا سرمایہ ہیں۔انہی کے بل پر بڑھاپا کاٹ رہے ہیں۔ اگر وہ کھیل یہاں بھی شروع ہو گیا جو کھیل طوائفوں کے کوٹھوں کو اجاڑ دیتا ہے تو تم سمجھو کہ یہ کوٹھا بھی اجڑ جائے گا۔"

"اللہ نہ کرے۔" رحیمی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"اللہ تو نہیں کر رہا لیکن دنیا یہی کر رہی ہے۔ پچھلی رات ایک لڑکا آیا تھا اور ریحانہ بیگم کمرے سے باہر ہی نہیں نکلیں تھیں۔"

"ہاں وہ چچا نیاز تو بڑے ناراض ہو رہے تھے۔ کہہ رہے تھے یہ کوئی طریقہ ہے؟ پہلے سے گتے پر لکھوا کر باہر لٹکوا دیا کرو کہ آج ریحانہ بیگم نہیں گائیں گی۔ کیونکہ لوگ

آتے ہی ان کا گانا سننے کے لیے ہیں۔"

"یہی میں تم سے کہہ رہی ہوں گتے پر یہ نہیں لکھوانا پڑے گا کہ ریحانہ بیگم آج نہیں گائیں گی۔ بلکہ یہ لکھوانا پڑے گا کہ کرائے کے لیے خالی ہے۔"

"اللہ نہ کرے۔" رحیمی نے کہا۔

"اچھا سنو۔لڑکے کو پہچانا تم نے کون تھا؟"

"لو میں کیسے پہچانوں گا۔ میں نے کب دیکھا ہے؟"

"ہاں میں تو بھول ہی گئی۔تم لوگ تو پہلے آ گئے تھے۔"

"پہلے آ گئے تھے۔کہاں سے؟" رحیمی نے کہا۔

"ایں بتا رہی ہوں' مرے کیوں جا رہے ہو۔یاد ہے نا راجہ شہاب الدین کے ہاں مجرے پر گئے تھے' ہے نا یاد تمہیں؟"

"لو کیوں نہ یاد ہوگا۔کوئی معمولی زمیندار تھوڑی ہے۔ بڑا مال ملا تھا تمہیں پر ہمیں وہی۔"

"پھر پھر---وہی بک بک پر اتر آئے۔ ارے کبھی تو اپنی چونچ بند رکھا کرو۔ قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھے ہوئے ہو۔کیا کرو گے اتنے پیسوں کا۔ ہر نشہ پورا ہو جاتا ہے۔ ڈھنگ کے کپڑے لتے پہنتے ہو۔ دن میں پانچ مرتبہ کھاتے ہو۔ رہنے کے لیے جگہ موجود ہے جو رونا جاتا اللہ میاں سے جاتا۔کرو گے کیا زیادہ پیسوں کا؟"

"اتر آئیں نا اپنی باتوں پر کرو گے کیا جو کچھ کرتے ہیں تمہارے لیے ہی کرتے ہیں۔ابھی پچھلے سال ہی تو ہم نے سونے کا وہ کنگن بنوا کر دیا تھا تمہیں۔"

"پھٹکار پڑے تمہارے کنگن پر پڑا ہوا ہے ایک کونے میں۔ جب دل چاہے لے لینا۔وہ کوئی کنگن تھا۔ چھلکے جیسا سونے کا کنگن بنوایا تھا" ملکہ بائی نے ناز بھرے انداز

میں کہا۔ یہ بات کم نہیں تھی کہ اب اس عمر میں بھی اس سے عشق جتانے والے موجود تھے بہر حال وہ بھی مطلب کی بات پر آ گئی۔

''تو میں بات کر رہی تھی راجہ شہاب الدین صاحب کی اس لڑکے سے راجہ شہاب الدین صاحب کی دشمنی چلتی ہے۔''

''کک--- کس لڑکے سے؟'' رحیمی نے اچھل کر پوچھا۔

''ارے اسی سے جیسے لے کر وہ بیگم صاحبہ! رات بھر کمرے میں کھدر بدر کرتی رہی ہیں۔ اب کیا کہتی۔ پہلے کبھی ایسا نہیں کیا ورنہ چوٹی پکڑ کر باہر نکال لاتی اور کہتی کہ بی بی یہ سب کچھ اپنی پسند سے نہیں ہوتا۔ یہاں تو رقم چلتی ہے رقم۔ تو خیر میں تمہیں بتا رہی تھی کہ اس لڑکے سے راجہ شہاب الدین کی زبردست لگتی ہے۔ بلکہ راجہ شہاب الدین سے ہی نہیں بلکہ اور بھی کئی چوہدریوں سے اس کی چلتی ہے اور یہ وہی تھا جس کے بارے میں میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ جیپ سمیت ہمیں اڑا لایا تھا اور دو بندے مار دیئے تھے اس نے۔'' رحیمی ایک بار پھر اچھل پڑا۔

''مار دیئے تھے؟''

''ایسے ویسے دیکھتے تو کلیجہ پکڑ کر رہ جاتے۔ بڑا ظالم' بڑا جنونی ہے۔''

''مم--- مگر--- پپ--- پھر ریحانہ سے اس کے تعلقات کیسے ہو گئے؟''

''ارے رحیمی! یہی تو بتا رہی ہوں آنا جانا شروع کر دیا ہے اور لگتا ہے ریحانہ بی بی! اس سے متاثر ہو گئیں ہیں۔ ارے ہے تو انسان ہی کی بچی نا۔ ہم لوگوں کو بڑے پھونک پھونک کر چلنا ہوتا ہے۔ بڑے عرصے کے بعد طبیعت میں پختگی آتی ہے اور رحیمی طوائفوں کے کوٹھوں پر جب عشق و محبت کا کھیل شروع ہو جاتا ہے تو پھر وہاں حادثے جنم لیتے ہیں' خون ہوتے ہیں۔ قتل و غارت گری ہوتی ہے۔ کیا سمجھے؟ سانپ سر اٹھانے سے

پہلے ہی ختم ہو جائے تو زیادہ اچھا ہے۔ وہ لڑکا خوبصورت ہے' جوان ہے۔ صحیح معنوں اس سے متاثر ہوا جا سکتا ہے اور لگتا ہے ایسا ہو گیا ہے۔ بات صرف چند ٹکوں کی نہیں ہے۔ پیسہ تو آنی جانی چیز ہے۔ کہیں نہ کہیں سے آ ہی جاتا ہے لیکن اس فتنے کو ختم کرنا بھی ضروری ہے اور ہم بذات خود اس پر ہاتھ کیوں ڈالیں۔ جبکہ ہمارے پاس اس کے لیے بندے موجود ہیں۔''

''سمجھ رہا ہوں۔ سمجھ رہا ہوں۔ پر یہ بتاؤ کروں کیا؟'' رحیمی نے کہا۔

''جا تو چکے ہو راجہ شہاب الدین کی حویلی میں۔ ایک بار پھر سے چلے جاؤ۔ میرا سندیس لے جاؤ اور ساری کہانی وہاں جا کر سنا دو جو میں تمہیں سنا رہی ہوں۔ راجہ صاحب سے کہنا کہ جب ہم ان کے ہاں سے مجرے سے لوٹے تو راستے میں ہمیں اغوا کر لیا گیا۔ ان کے دو بندے مار دیئے گئے اور وہ ہمیں لے کر ایک عمارت میں آ گیا۔ جس کے بارے میں ہمیں پتہ نہیں کہ کون سی عمارت ہے۔ اس نے یہ سمجھ کر ہمیں اغوا کیا تھا کہ ہم آپ کے گھر کے لوگ ہیں اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ہم لاہور کی طوائفیں ہیں تو اس نے ہمیں لاہور بھجوا دیا اور اب وہ یہاں آتا جاتا ہے۔ اگر وہ انہیں درکار ہے تو یہاں آئیں اور اسے حاصل کریں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں چلا جاتا ہوں۔ پر ایک بات بتاؤ ملکہ بائی؟''

''ہاں پوچھو۔''

''تم ٹھہریں حرفوں کی بنی ہوئی۔ جادو کی چھڑی ہو تم' جادو کی چھڑی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سازش میرے ہی خلاف ہو۔''

''ارے رحیمی' ارے رحیمی! قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھے ہو تمہیں تو بس ایک دھکے کی ضرورت ہے۔ سیدھے قبر میں جا کر گرو گے۔ تمہارے خلاف بھلا کوئی

سازش کیسے کرنے کی ضرورت ہے۔ زندگی بھر میرے ٹکڑوں پر پلتے رہے ہو۔ کچھ د
کی بجائے لیتے ہی رہے ہو اور اب کہتے ہو کہ سازش کر رہی ہوں میں تمہارے خلاف
وہ سازش ہو کیا سکتی ہے بھلا؟''

''بھئی ایسا جھگڑا چل گیا ہے تمہارے کوٹھے پر' تم ٹھہریں دو دھاری تلوار۔ تم
سوچا کہ ایک طرف اس لڑکے کی چھٹی کرادو اور دوسری طرف اس لڑکے کی۔''

''ہائے' ہائے رے لڑکے۔ ارے بڈھے نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت ا
ہے۔''

''ارے دیکھنے والی نظر چاہیے ملکہ بائی!''

''دیکھو تمہارا انتخاب صرف میں نے اس لیے کیا ہے کہ ظاہر ہے راجہ شہاب الد
سے انعام بھی ملے گا۔ تمہارا بھی کچھ بھلا ہو جائے گا۔ کپڑے لتے بنا لو گے۔ ورنہ کو
بھی اس کام سے بھیج سکتی ہوں۔''

''واری صدقے --- مذاق بھی نہیں سمجھتیں۔ ارے رحیمی کو تو بس تم آنکھ سے اشا
کردو۔ آگ کے دریا میں کود جائے گا۔ بھلا باقی باتیں کیا حیثیت رکھتی ہیں۔''

''اچھا اب جاؤ تیاریاں کرو۔ دیر نہیں ہونی چاہیے اور ذرا سنبھل کر ہوشیاری
ساتھ اور میں تمہیں بتاؤں ایک بات۔''

''ہاں بولو' بولو۔''

''راجہ شہاب الدین کو ساری تفصیلات بتانے کے بعد ناک کی سیدھ میں ادھر م
دوڑے چلے آنا۔''

''کک --- کیا مطلب؟''

''ارے کہیں جا کر مر رہنا ہفتہ پندرہ دن کے لیے۔ صورتحال کا جائزہ لیتے رہنا'

بھی صورتحال ہو اس کا اندازہ لگا لینا۔ تمہاری ہی جان کے لیے کہہ رہی ہوں۔''

''دیکھوں اماں! ہوئی نہ وہی بات۔'' رحیمی نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''کیا---؟'' ملکہ بائی نے پوچھا۔

''میرا مطلب ہے میری جان کو خطرہ ہے۔''

''تمہاری جان کو بھلا کیا خطرہ ہو سکتا ہے اور جان ہے ہی کہاں تمہارے اندر۔ چلو
جاؤ دفع ہو جاؤ۔ ورنہ اگر مجھے غصہ آ گیا تو یہیں جان دینی پڑ جائے گی۔''

''جان تو بہت عرصہ پہلے دے چکے ہیں ملکہ جان! کیا کہیں تم سے۔''

''اوئے جاتے ہو یا اتاروں پاؤں کی جوتی۔'' ملکہ بائی نے کہا اور رحیمی ہنستا ہوا
اٹھ گیا۔ ملکہ بائی پر خیال انداز میں گردن ہلانے لگی۔

☆☆☆

الیاس خاں اور جبار خاں کو اطلاع مل گئی تھی کہ کریم بخش اور سکینہ کو وہاں سے
حاصل کر لیا گیا ہے اور حاصل کرنے والا شاہ زیب ہی تھا۔ جب اس کے ملازم نے جو
اچھا خاصا زخمی ہو گیا تھا۔ الیاس خاں کے پاس جا کر اسے بتایا تو الیاس خاں اور جبار
خاں سکتے میں رہ گئے۔

''اوئے وہ حرامی کا پلہ ادھر پہنچ کیسے گیا؟'' اس نے پر خیال انداز میں جبار خاں
کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جبار خاں بھی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد اس
نے گردن اٹھا کر کہا۔

''یوں لگتا ہے بھائی جی! کہ ٹھیک ٹھاک مخبری ہو رہی ہے۔''

''مخبری؟ مگر مخبری کون کر رہا ہے؟''

''سیدھی سی بات ہے جہانزیب کی حویلی میں ہی کوئی --- میرا دماغ تو بار بار ایک

ہی طرف جاتا ہے۔''

''کون؟''

''وہ اورنگزیب کی بیوی شکیلہ۔ تم نہیں جانتے بھائی جی یہ عورتیں کیا چیز ہوتی ہوسکتا ہے شکیلہ کو شاہینہ سے جلن ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دیور بھابی کے درمیان کو چلا ہوا ہو۔ یار گھر سے نکل گیا تو ظاہر ہے دل تو دکھے گا ہی۔ شاہینہ معصوم ہے جو کچھ کہتی ہے ہوسکتا ہے شکیلہ سے بھی کہہ دیتی ہو یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شکیلہ اس۔ سوئے لیتی ہو اور کوئی ایسا ذریعہ پال رکھا ہو اس نے جس سے تمام خبریں شاہ زیر پہنچ جاتی ہوں۔ تم ذرا ماضی کی باتوں پر غور کرو۔ کئی جگہ اس طرح کے شبہے ملتے ہیں سمجھے؟''

''ہوں۔ پھر تو واقعی غور کرنے والی بات ہے۔ ایسا ہوسکتا ہے یا پھر یہ بھی ہے کہ دونوں بھائی ہی چھوٹے بھائی کو سپورٹ کر رہے ہوں۔''

''یار! میری سمجھ میں تو ایک اور بات بھی آتی ہے۔'' الیاس خاں نے غور سے خاں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا؟''

''اوہ بھئی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شاہ زیب خفیہ طور پر حویلی ہی میں رہتا ہو اور بھائیوں نے اسے ایک ایسے تہہ خانے میں چھپا دیا ہو جس کا علم باقی کسی اور کو نہ شاہینہ بے چاری کو بھلا یہ تمام باتیں کیسے معلوم ہوسکتی ہیں۔ اوئے ہولے ہولے! سمجھ میں آتیں ہیں۔ ذرا غور کرو۔ اس سے بڑی حفاظت اور کیا ہوسکتی ہے بھائی؟'' الیاس خاں نے کہا اور دونوں سر پھرے گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ کافی دیر تک خا طاری رہی پھر جبار خاں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''مگر خاں جی! ایک بات بتاؤ وہ یہ کہ اگر انہوں نے شاہ زیب کو حویلی ہی میں چھپا رکھا ہے تو ہم اسے نکالیں گے کیسے؟''

''دیکھو۔۔۔ میرا جہاں تک خیال ہے ہمیں ایک کام کرنا چاہئے۔ ہوسکتا ہے شاہ زیب کو انہوں نے حویلی میں نہ رکھا ہو لیکن کہیں آس پاس کسی چھوٹے موٹے گھر میں رکھ چھوڑا ہو اور اس کی دیکھ بھال کرتے ہوں۔ اصل میں اب تک دماغ اس طرف نہیں گیا ورنہ پہلے سے کوشش کر لی جاتی۔ اب ہم دو تین کام کرتے ہیں۔''

''کیا خاں جی؟''

''دیکھو دو بندے حویلی کے آس پاس نگرانی پر لگا دیتے ہیں اور انہیں یہ ہدایت کر دیتے ہیں کہ ذرا دیکھیں اور غور کریں جہانزیب اور اورنگزیب کا کہاں آنا جانا ہے یا گھر کا کوئی ملازم کھانے پینے کی چیزیں لے کر کہاں پہنچتا ہے۔ یہ تو ہوا کام نمبر ایک۔ دوسرا کام یہ کرتے ہیں کہ شاہینہ کو اس سلسلے میں ہوشیار کر دیتے ہیں اور اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ ذرا گہری نگاہ رکھ کر یہ جائزہ لے کہ حویلی میں کوئی تہہ خانہ شہہ خانہ تو نہیں ہے۔ بھائیوں کے چہرے سے یہ اندازہ لگائے کہ انہیں چھوٹے بھائی کی طرف سے اطمینان ہے یا پھر وہ بھی اس سلسلے میں باتیں کرتے رہتے ہیں اور پریشان ہیں۔ اگر وہ پریشان نہیں ہیں تو اس سے یہ پتہ چل جائے گا کہ بھائی کی طرف سے انہیں اطمینان ہے اور نمبر تین ایک یہ کام کرتے ہیں کہ بھٹے پر کام شروع کرا دیتے ہیں۔ بندوں کو بتائیں گے نہیں کہ ایسی کوئی بات ہے اور جیسے کہ ہم نے پہلے طے کیا تھا کہ آس پاس مسلح بندے لگا دیتے ہیں اور انہیں یہ ہدایت کر دیتے ہیں کہ اگر انہیں شاہ زیب نظر آ جائے تو تکلف سے کام نہ لیں۔ اڑا دیں حرامی کے جنے کو۔ بعد میں جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔''

دونوں بھائی بہت دیر تک اس سلسلے میں باتیں کرتے رہے تھے۔ بہر حال بہت

سے موضوع زیر بحث آئے۔ یہ بھی سوچا گیا کہ کریم بخش اور اس کی بیوی کو وہاں
نکال کر کہاں لے جایا گیا۔ جبار خاں کہنے لگا۔

''اب یہ تو ممکن نہیں ہو سکتا بھائی جی کہ وہ واپس انہیں ان کے گھر چھوڑ آیا ہو۔
مطلب ہے شاہ زیب انہیں ان کے گھر چھوڑ آیا ہو۔ وہاں تو ان کے لیے خطرہ ہی خ
ہے۔ بلکہ اس سے تو خود شاہ زیب کا بھی مسئلہ بن جاتا ہے۔''

''ہاں یہ بات بھی ہے لیکن پھر بھی ایک بندہ ادھر دوڑائے دیتے ہیں بلکہ ا
کرتے ہیں کہ شہاب الدین کو بتائے دیتے ہیں کہ شاہ زیب اپنی سرگرمیوں میں مصرو
ہے۔''

''تو پھر بندہ دوڑا دو ادھر بھی تا کہ شہاب الدین بھی ذرا ہوشیار رہے۔ اس لڑ
نے تو ناک میں دم کر کے رکھ دیا۔ ٹانگ برابر چھوکرا اور ذرا دیکھو کیا قیامت جو
ہوئے ہے۔ ناکوں چنے چبوا دیئے ہیں اس نے ہمیں تو۔''

''ارے واہ، وہ کیا ناکوں چنے چبوائے گا ہم دیکھتے ہیں۔ ذرا شاہینہ کا نمبر ملاؤ۔''

تھوڑی دیر بعد الیاس خاں کا رابطہ شاہینہ سے ہو گیا۔

''ہاں خاں جی! خیریت سے ہو؟'' شاہینہ کی آواز ابھری۔

''تو جانتی ہے شاہینہ! اس وقت تک خیریت نہیں ہو سکتی جب تک کہ دل کی آگ
نہ بجھ جائے۔ ایک بیٹا کھویا ہے میں نے بیٹا!''

''وہ تو ٹھیک ہے خاں جی! بلاوجہ ساری صورت حال بگڑ گئی۔ آپ کیا سمجھتے ہ
میرے دل میں انور کا درد نہیں ہے۔''

''جانتا ہوں۔ مگر دیکھو--- ہماری بدقسمتی کہ انور کا قاتل بڑے آرام سے دندنا
پھر رہا ہے۔''

''خیر آرام سے تو نہیں دندناتا پھر رہا خاں جی! وہ بھی دربدر ہے۔ بھلا اس کی کوئی
زندگی ہے۔ بہت سے دشمن بنا رکھے ہیں اس نے۔ بہت سے لوگ اس کے پیچھے لگے
ہوئے ہیں۔''

''شاہینہ! ایک بات بتا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم سب کے سب بیوقوف بن رہے
ہوں؟''

''میں سمجھی نہیں خاں جی!''

''ایسا تو نہیں ہے دونوں بھائی مل کر چھوٹے بھائی کی مدد کر رہے ہوں؟''

''جہانزیب اور اورنگزیب؟''

''ہاں۔''

''نہیں خاں جی!''

''شاہینہ! دیکھو کچھ باتیں تیرے ذہن میں ڈالنا بہت ضروری ہیں۔ ان لوگوں
کے رویے کے بارے میں بتا۔''

''اوہ۔ یہ تو بدلا ہوا ہے خاں جی۔ پہلے جب یہ سارے چکر نہیں چلے تھے تو میں
نے انہیں اچھا خاصا بھائی سے بگاڑ دیا تھا۔ میرے ہی کہنے پر تو یہ سارا کھیل ہوا تھا اور
زمینوں کا معاملہ آیا تھا۔ پھر آپ کو بوئے آسل کی زمین کی ضرورت پڑی۔ تو میں نے
اپنا یہ کام اور تیز کر دیا۔ جبھی تو سارے چکر چلے، مگر بعد میں ان لوگوں کا رویہ بدل گیا۔''

''تیرا خیال ہے وہ بھائی کے لیے پریشان رہتے ہیں؟''

''پریشان رہتے ہیں۔''

''ہاں۔''

''تم یہ بات کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''میں نے کتنی ہی بار چھپ چھپ کر ان کی باتیں سنی ہیں۔ وہ اب اس بات پر ک افسوس ملتے ہیں کہ تھوڑی سی زمینوں کی خاطر انہوں نے ایک بھائی کو کھو دیا۔ اپنا ا ستون گرا دیا۔ اسے زندگی کی ان مشکلات سے دوچار کر دیا۔ یہ باتیں وہ اکیلے کرتے ہیں؟''

''کوئی مصنوعی باتیں تو نہیں کرتے۔ کسی کو سنانے کے لیے۔ میرا مطلب ہے سنانے کے لیے۔''

''نہیں بھائی جی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اندازہ لگا چکی ہوں۔ مگر آپ سوال کیوں کر رہے ہیں؟''

''شاہینہ! ہم جو بھی کام کرتے ہیں اس کی خبر شاہ زیب کو مل جاتی ہے۔ آ کیسے؟''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''ہمارا خیال ہے کہ گھر ہی سے مخبری ہوتی ہے اور یہ بھی خیال تھا کہ کوئی جو وغیرہ میں کوئی ایسا تہہ خانہ شہہ خانہ تو نہیں ہے جہاں اورنگزیب اور جہانزیب نے ا چھپا رکھا ہو۔ ہم ساری دنیا میں اسے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ پولیس اسے ڈھونڈ پھرتی ہے اور وہ گھر میں ہی محفوظ ہے یا پھر آس پاس کسی ایسے گھر میں اسے رکھا گیا ہو یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہو۔''

''نہیں خاں جی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں پورے دعوے سے کہہ سکتی ہوں بات۔''

''ہوں۔ اچھا' اچھا ایک بات بتا۔''

''پوچھو خاں جی!''

''یہ تیری دیورانی کیسی ہے؟''

''شکیلہ؟''

''ہاں۔''

''کیوں؟''

''میرا مطلب ہے اس کا کوئی لاگا تو نہیں شاہ زیب سے؟''

'''کیسا لاگا؟''

''اوہ سمجھا کر بات کو کیسا لاگا' کیسا لاگا۔ میرا مطلب ہے کہ یہ تو مخبری نہیں کرتی؟''

''نہیں خاں جی! یہ کیسے کرے گی۔ گھر کی رہنے والی ہے۔''

''دیکھو شاہینہ! اپنے آپ کو بہت زیادہ چالاک سمجھنے کی کوشش مت کیا کر۔ تجھے پتہ نہیں دنیا کیا چیز ہے اور تو تو فرشتوں کی طرح معصوم ہے۔ تو کیا جانے عورتوں کے جھل فریب کو۔ اچھا سن میری ایک بات سن۔ اب تجھے ہمارے لیے جاسوسی کرنی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ جہانزیب اور اورنگزیب پر پوری پوری نظر رکھ۔ دیکھ وہ کیا کرتے ہیں' کہاں کہاں جاتے ہیں۔ خفیہ طور پر ان کی دیکھ بھال کر کہ وہ اندر سے پریشان ہیں یا نہیں۔ ان ساری باتوں پر غور کر ذرا معلومات کر کے پتا لگا۔ دیورانی پر بھی نظر رکھنا۔ اوہ تو بالکل معصوم ہے بچی۔''

''ٹھیک ہے خاں جی! آپ کہتے ہیں تو میں ایسا کروں گی۔''

''ہاں' ہاں ایسا ہی کرنا ہے تجھے۔ اچھا خدا حافظ۔'' الیاس خاں نے فون بند کر دیا۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے تھے۔ پھر جبار خاں نے کہا۔

''تو پھر کیا خیال ہے بھائی جی! بھٹے پر کام شروع کرا دیا جائے؟''

''ہاں۔'' الیاس خاں نے جواب دیا۔

☆☆☆

راجہ شہاب الدین جیسے لوگ وہ ہوتے ہیں جو اپنی عیاشیوں میں ڈوب کر زندگی
کے بہت سے اہم مسائل کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ راجہ شہاب الدین عیش و عشرت میں
کھیل رہا تھا۔ زندگی کے لیے کوئی مشکل نہیں تھی۔ اپنا گھر' اپنے مصاحب اور اپنی رنگ
رلیاں ہی زندگی کا محور تھیں۔ لجیا جیسی لڑکی اس کے لیے کوئی بنیادی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔
بے شمار ایسی لڑکیاں اس کے پاس آتی جاتی رہتی تھیں۔ کچھ وہ جو برائیوں میں ڈوب چکی
ہوتی تھیں اور کچھ ایسی جو اس کی شیطنت کا شکار ہو جاتی تھیں لیکن ان کی زندگی برباد
کرنے کے بعد کچھ ہی دنوں کے اندر اندر وہ انہیں بھول جاتا تھا۔ حالانکہ اس کی شیطنت
سے ایسے ایسے دردناک المیے جنم لیتے تھے۔ جن سے انسانیت تھرا اٹھے۔

پچھلے دنوں لجیا کے معاملے میں اسے کافی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا اور آج بھی وہ
دشمن اس کے ذہن میں کھٹکتا رہتا تھا۔ جس کا نام شاہ زیب تھا۔ اکثر کبھی کبھی اسے رات
کی تنہائیوں میں شاہ زیب کا خیال آ جاتا تو اس کی نیندیں حرام ہو جاتیں۔ اتفاق کی بات
تھی کہ اس وقت بھی وہ اپنے مصاحب خاص اسلم خان کے پاس بیٹھا ہوا اسی موضوع پر
بات کر رہا تھا۔

''اوہ یار! اس حرامی کا کچھ پتہ چلا یا نہیں۔ وہ لڑکا تو جان کا عذاب بن گیا۔ وہ جو
کہتے ہیں کہ گناہ اور بے لذت۔ وہ کتیا بھی ہاتھ نہیں لگی اور دشمنی الگ پال لی۔ بات یہ
ہے کہ کوئی باقاعدہ دشمن سامنے ہو تو چلو بندہ اپنے آپ کو بھی آزما لے اور دیکھ لے کہ
دشمن کتنے پانی میں ہے لیکن اگر کوئی ایسا اکیلا بندہ دشمنی پر آمادہ ہو جائے جس کا کوئی ٹھور
ٹھکانہ نہ ہو تو وہ زیادہ خطرناک ہوتا ہے کون جانے کب کہاں سے نمودار ہو اور وار کر
دے۔ اندھیرے کے تیر سے بچنا تو ذرا مشکل کام ہوتا ہے۔''

''جی شاہ جی! پتہ نہیں ہوا کیا ہے؟''

''یار! میں نے بندشیں تو ساری کر دی ہیں۔ الیاس خاں اور جبار خاں سے بھی ملا
تھا۔ ان لوگوں سے بڑی تفصیلی بات چیت ہوئی تھی اور میں نے اپنے تعاون کی پیشکش کر
دی تھی۔ پر بعد میں کوئی رابطہ نہیں ہو سکا۔''

''جی صاحب جی!''

''اوہ۔ دیکھو کیا جی دار بندہ ہے۔ ایک طرف پولیس کے بہت سے بندے مار
دیئے اور دوسری طرف اور بھی نجانے کیا کیا' کیا ہے۔ ہمارے بھی بندے مار دیئے اس
نے۔ پر کسی کے ہاتھ نہیں لگا۔ اصل میں پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ لاہور میں تعلیم حاصل کر رہا
تھا۔ بات یہی ہوتی ہے نا کہ اگر بندہ چالاک بھی ہو اور دلیر بھی ہو۔ تو پھر صورتحال
خطرناک ہو جاتی ہے۔ ویسے میں تجھے سچ بتاؤں اسلم خان! اگر وہ لڑکی مجھے دوبارہ مل
جائے تو میں فوراً اسے پیشکش کر دوں کہ لے جا بھائی اس مصیبت کو لے جا۔ میرے لیے
کوئی کمی نہیں ہے۔ ویسے اسلم خان! وہ بابا کریم بخش اور اس کی بیوی کا کیا حال ہے؟
کچھ معلوم ہے؟''

''بس سر جی! جی رہے ہوں گے اپنے گھر میں۔ گھر تو لٹ گیا ہے ان کا۔''

''اوہ۔ بھاڑ میں جائیں سسروں نے ہمارے لیے تو مصیبت کھڑی کر دی ہے۔''

اسی وقت ایک ملازم نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''شاہ جی! ایک بندہ لاہور سے آیا ہے۔ رحیمی نام بتاتا ہے۔ شاہ جی کے لیے ایک
ضروری پیغام لایا ہے۔ اور کہتا ہے مجھے ان سے ملا دو۔''

''لاہور سے آیا ہے رحیمی ہے اس کا نام؟ تو اسلم خان اس نام کے کسی بندے کو ہم
جانتے ہیں؟''

''نہیں صاحب جی! کبھی سنا تو نہیں ہے۔''

''لاہور سے آیا ہے۔ کیوں آیا ہے؟ کچھ بتاتا نہیں ہے؟''

''نہیں صاحب جی! بس آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

''دیکھو۔ پہلے اس کی تلاشی لو۔ ایک تنکا بھی اس کے پاس ہو تو اسے لے کر ا
قبضے میں کرلو۔ پھر اسے ہمارے پاس بھیج دو۔''

''جی صاحب جی!''

''اوہ بھئی کوئی بھی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ شاہ زیب کا بندہ بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا
آتے ہی مجھ پر حملہ کردے۔ اپنی عقل سے تو کام لینا ہوگا نا۔''

''جی شاہ جی!'' اسلم خان نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد رحیمی اندر داخل ہوگیا اس نے کئی فرشی سلام کئے اور راجہ شہا
الدین اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اسلم خان کی کرخت نگاہیں بھی اس کا جائزہ لے ر
تھیں۔

''بیٹھ جا بھئی بیٹھ جا۔ لاہور سے آیا ہے تو؟'' راجہ شہاب الدین نے کہا۔

''جی مائی باپ۔ غلام ہوں میں آپ کا۔ پہلے بھی آچکا ہوں میں آپ کے پار
پر ظاہر ہے مالک غلام کو کیا پہچانے۔ رحیمی ہے میرا نام۔ ملکہ بائی کا سازندہ ہوں۔''

''ملکہ بائی---ہاں، ملکہ بائی یاد آ گئی۔ پچھلے دنوں آئی تھی نا ہمارے پاس اور ا
کے ساتھ تو وہ واقعہ پیش آیا تھا۔''

''جی شاہ جی---جی مالک، جی مائی باپ۔''

''کہو کیا بات ہے۔ کیا کہا ہے اس نے۔ ہم نے اسے کوئی پیغام تو نہیں بھجوایا۔ ؟
اس پر کیا مصیبت نازل ہوئی ہے؟''

''شاہ جی! آپ کی وفاداری میں اس نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔''

''ہاں ہاں۔ سارے ہی وفادار ہوتے ہیں۔ آگے بولو۔''

''وہ جی ایک بندہ ہے جس کی آپ سے دشمنی چل رہی ہے۔ شاہ زیب ہے اس کا
م۔'' رحیمی نے کہا اور شہاب الدین اور اسلم خان چونک پڑے۔

''ہاں تو پھر؟''

''صاحب جی! جب ملکہ بائی اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ لاہور واپس جا رہی تھیں
راستے میں شاہ زیب نے انہیں روکا تھا۔ آپ جانتے ہیں اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟''

''اوہ ہاں بھئی ہاں۔ سوال مت کر۔ آگے بولتا رہ۔''

''صاحب جی! وہ انہیں آپ کی فیملی کے بندے سمجھا تھا۔ مطلب یہ کہ وہ یہ سمجھا تھا
لہ یہ آپ کی گھر کی عورتیں ہیں۔ انہیں اغوا کر کے وہ آپ سے کوئی کام لینا چاہتا تھا۔''

''بولتا رہ، بولتا رہ۔ رکا تو یہ جوتا اتار کر دس ماروں گا تیرے سر پر۔'' راجہ شہاب
دین نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ایک دم اس کے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا تھا۔ تو یہ تھی صورتحال مگر یہ باتیں اسے
لیے معلوم ہوئیں۔ اسے رحیمی کا رکنا پسند نہیں آ رہا تھا۔ رحیمی نے کہا۔

''مائی باپ! میں تو خادم ہوں۔ جس طرح مجھے بتا کر بھیجا گیا ہے اسی طرح میں
پ کو بتا رہا ہوں۔ وہ لڑکا شاہ زیب ہمارے ہاں کی ایک لڑکی ریحانہ سے متاثر ہو گیا
ار کوٹھے پر اس کا گانا سننے کے لیے آیا۔ ریحانہ کو وہاں دیکھ کر اس نے اس سے ساری
تیں کیں اور اب صاحب جی صورتحال یہ ہے کہ وہ ہمارے ہاں آتا ہے۔ ملکہ بائی کو
ب اس بات کا پتہ چلا کہ وہ آپ کا دشمن ہے اس نے خود ہی اپنی زبان سے یہ ساری
تیں بتائی تھیں صاحب جی! تو ملکہ بائی نے سوچا کہ فوراً آپ کو اطلاع دینی چاہیے اور

حضور اس نے ہمیں یہاں بھیج دیا۔

''وہاں کوٹھے پر آتا جاتا ہے وہ؟''

''جی صاحب جی!''

''آخری بار کب آیا تھا؟'' شہاب الدین نے سوال کیا۔

''جی یہی کوئی کل یا پرسوں۔'' رحیمی نے تکا لگایا۔ اس کے فرشتوں کو بھی نہیں پتا کہ کون شاہ زیب اور کب یہاں آیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ اس وقت لاہور میں ہے۔''

''ہاں جی بالکل۔ ملکہ بائی نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ رحیمی اگر زندگی میں کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے، کوئی اچھا اور بڑا انعام چاہتا ہے تو جا یہ خبر لے کر جلدی سے راجہ صاحب کے پاس جا اور انعام پا۔ کیونکہ وہ راجہ صاحب کو درکار ہے۔''

''اچھا--- اسلم خان اسے انعام دو اور سن واپس جا اور ملکہ بائی سے کہنا کہ اس کا بہت بہت شکریہ۔ ہم اسے اس کی وفاداری کا انعام دیں گے اور رحیمی تو خود بھی ہمارے لیے مخبری کر۔ یہاں تک آنے جانے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ ذرا ایک دو بار ہمیں آ کر بتا کہ وہ مسلسل آتا ہے یا آنا جانا بند کر دیا اور ایک کام اور کر رحیمی! ارے ہاں اسلم خان اسے ذرا ایک اچھی خاصی رقم دے دو۔ تاکہ یہ بھی یاد کرے کہ کسی راجہ کے پاس آیا تھا۔''

''سر جی! اپنی نگرانی ہی میں دلوا دیجئے۔ پتہ نہیں یہ بھائی آپ کی بات سمجھے ہیں یا نہیں۔'' رحیمی نے کہا اور شہاب الدین ہنس پڑا۔ پھر اس نے کہا۔

''جاؤ اسلم! دس ہزار روپے لے کر آ جاؤ۔''

''جی جناب۔'' اسلم خان نے رحیمی کے گھورتے ہوئے کہا۔ دس ہزار کی رقم سن کر رحیمی کے پورے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے لیے یہ بہت بڑی رقم تھی۔

''ہاں تو میں تم سے یہ کہہ رہا تھا۔'' اسلم خان کے جانے کے بعد شہاب الدین نے کہا۔

''جی حضور! جی مائی باپ۔''

''جیسے ہی وہ آئے تم چھٹی لے کر باہر نکل جانا اور جب وہ جانے لگے تو اس کا پیچھا کرنا۔ اگر تم نے اس کی رہائش گاہ کا پتہ لگا لیا تو دس ہزار روپے تمہیں اور دوں گا۔ جیسے ہی اس کی رہائش گاہ کا پتہ چلے فوراً ہی آ کر مجھے اطلاع دینا۔''

''شاہ جی! شاہ جی! آپ کا یہ غلام، آپ کا یہ کتا۔ ایسا ہی کرے گا۔ آپ اس کے لیے بالکل فکر مند نہ ہوں۔ میں آپ کو اس کا پتہ لا کر دوں گا۔ ورنہ میری زندگی پر تھو۔'' رحیمی نے کہا اور شہاب الدین پھر ہنس پڑا۔

خالص سازندہ تھا۔ طوائفوں کے ہاں پلا ہوا۔ بہر حال اسلم خان دس ہزار روپے لے کر آیا اور وہ رحیمی کے حوالے کر دیئے گئے۔ پھر شہاب الدین نے کہا۔

''اب تم جاؤ اور جو کچھ میں نے کہا ہے وہ بڑی ہوشیاری سے کرو۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔'' رحیمی نے اٹھ کر بہت سے فرشی سلام کیے اور اس کے بعد الٹے قدموں چلتا ہوا باہر چلا گیا۔

راجہ شہاب الدین کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ وہ گہری نگاہوں سے دروازے کو دیکھتا رہا۔ اسلم خان اس کی ذہنی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد راجہ شہاب الدین نے کہا۔

''دیکھو شیطان کی بات کرو تو شیطان زیادہ فاصلے پر نہیں ہوتا۔ ابھی ہم اسی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔''

''جی شاہ جی!''

’’یار! میں تمہیں سچ بات بتاؤں۔ اس بندے کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے میں چ
کوؤں کو کھلا دیتا۔ میرے لیے کسی ایک بندے کو مار دینا کون سا مشکل کام ہے لیکن یہ
ایسے گلے پڑ گیا ہے کہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔‘‘

’’شاہ جی! اب تو بات سمجھ میں آ گئی۔ اس کا پتہ تو چلا کہ کہاں ہے۔ اگر کسی طوائ
کے چکر میں پھنس گیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کے برے دن خود بخود قریب
گئے۔‘‘

’’اوہ نہیں اسلم خان! اس لڑکے کو تو نے غور سے نہیں دیکھا۔ وہ کسی طوائف کے
جال میں پھنسنے والا نہیں ہے۔ اب یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ وہاں کیوں آنے جانے
ہے۔ ہو سکتا ہے ریحانہ نے اسے اپنا ساتھی بنا لیا ہو۔‘‘ اسلم خان پر خیال انداز میں گرد
ہلانے لگا۔ شہاب الدین گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد اسلم خان۔
کہا۔

’’صاحب جی! میرا خیال ہے ہمیں پوری توجہ اس طرف لگا دینی چاہیے۔ رحیم
سے آپ نے اچھا کام لیا۔ وہ پتہ لگا لے گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ دس پندرہ افراد آپ اد
چھوڑ دو۔ اور ان سے پوری طرح یہ بات کر لو کہ وہ جب بھی نظر آئے اسے بھون کر رکھ
دیں۔‘‘ شہاب الدین نے اس کی بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ وہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔
کچھ لمحوں کے بعد اس نے کہا۔

’’اگر ہماری گولیوں سے وہ بچ گیا تو پھر یوں سمجھ لو اسلم خان کہ پاگل ہو جائے گا
اور جان کی بازی لگا دے گا ہم لوگوں سے بدلہ لینے میں۔ میرے ذہن میں تو ایک اور
خیال بھی ہے۔‘‘

’’کیا شاہ جی؟‘‘ اسلم خان نے سوال کیا۔

’’میں سمجھتا ہوں اس کے بارے میں مکمل طور پر اندازہ لگانے کے بعد پولیس کو اس
کے بارے میں اطلاع دے دو۔ بلکہ لاہور میں ایک ایس پی سے میرے بہت گہرے
تعلقات ہیں۔ میں ایس پی کو ساری صورتحال بتا کر اسے اس بات پر آمادہ کر لوں گا کہ
جیسے ہی وہ نظر آئے اسے گرفتار کر لیا جائے۔ وہ پولیس کو بھی تو اتنا ہی مطلوب ہے نا جتنا
ہمیں۔ اس طرح فائدہ ہو جائے گا۔ کیا سمجھے۔‘‘

’’ہاں شاہ جی! بہت اچھی بات ہے۔ واقعی مسئلہ تو دشمن کو مارنے کا ہے۔ وہ کیسے
ہی مرے۔‘‘

’’بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ خود رسک نہیں لینا چاہیے۔ اپنے آپ کو تو منظر عام پر لانا
ہی نہیں چاہیے۔ ٹھیک ہے۔ بس اب یہ کرتے ہیں بلکہ تم ایسا کرو۔ لاہور چلنے کا بندوبست
کرو۔ میں وہیں کسی اچھے ہوٹل میں قیام کروں گا اور ایس پی صاحب سے بھی ملاقات
کر کے ساری صورت حال انہیں بتا دوں گا تاکہ اسے پہلی ہی کوشش میں گرفتار کر لیا
جائے اور اسے فرار ہونے کا موقع نہ ملے۔‘‘

’’ٹھیک ہے تو پھر میں چلوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے جاؤ۔ لاہور چلنے کی تیاریاں کرو۔‘‘ شہاب الدین نے کہا اور اسلم
خان اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

لاہور کے ایک شاندار ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد شہاب الدین نے ایس پی
وہاب محمد شیخ سے رابطہ قائم کیا۔ لاہور آتے ہوئے اسے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔
اس سے پہلے اس نے اپنے کسی دشمن کے بارے میں خواب میں بھی نہیں سوچا تھا لیکن
اب نجانے کیوں اسے شدت کے ساتھ اپنے عدم تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔

چنانچہ راستے بھر وہ شدید محتاط رہا تھا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ شاہ زیب کے قبضے میں کوئی جن نہیں تھا جس سے وہ اس بات کا اندازہ لگا لیتا کہ اس وقت شہاب الدین کہاں ہے۔ بہر حال ایس پی وہاب احمد شیخ سے رابطہ قائم ہو گیا تو شہاب الدین نے کہا۔

''ایس پی صاحب! آپ کا ایک پرانا دوست بول رہا ہوں۔ پہچانو تو جانیں۔''

''بھئی دوست ہو تو خود بتا دو کہ کون ہو اور میرے دماغ کو الجھاؤ میں مت ڈالو۔ ہاں اگر دشمن ہو تو پھر تمہارے لیے یہ بہترین موقع ہے کہ مجھے سوچ میں ڈال دو۔'' شہاب الدین ہنسنے لگا پھر بولا۔

''تمہارا دوست شہاب الدین۔ راجہ شہاب الدین۔''

''ارے میری جان! تم؟ بڑے عرصے کے بعد تمہیں اپنے اس دوست کی یاد آئی۔''

''تم سرکاری لوگ اگر مصروف ہوتے ہو تو اس قدر مصروف ہو جاتے ہو کہ سب کو بھول جاتے ہو اور ویسے تمہارے بارے میں جو تفصیلات سنی ہیں وہ تو یہی ہیں کہ کام تو بہت کم کرتے ہو۔''

''یار! پولیس والوں کے لیے تو ایسا مت کہو۔ دن رات ہماری زندگی سولی پر چڑھی رہتی ہے، تم جیسے لوگوں کے تحفظ کے لیے۔''

''خاک تحفظ کرتے ہو تم ہمارا۔ جان پر بنی ہوئی ہے اور تمہیں پتہ بھی نہیں ہے۔''

''میری جان کی جان پر بنی ہو اور میں اس سے انجان رہوں کیا بات ہے؟''

''یہ بھی فون پر ہی بتانا پڑے گا۔''

''بالکل نہیں ایک عمدہ سا کھانا کھلا دو۔ جہاں کہو آ جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں جانتا ہوں یہ تو کبھی نہیں کہو گے کہ میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ چلو

ٹھیک ہے۔ ہوٹل کا پتہ دیتا ہوں۔ جتنی جلدی ہو سکے پہنچ جاؤ۔ کام ہے تم سے اور بہت ہی ضروری کام۔''

''رات کو آ رہا ہوں۔ پتہ بتاؤ'' شہاب الدین نے اسے اپنے ہوٹل کا پتہ بتا دیا اور کہا۔

''یہ رات کو ہی کیوں؟''

''اس لیے کہ شام کی چائے پی چکا ہوں اور رات ہونے میں کون سی دیر ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ پکے پولیس والے ہو۔ میں انتظار کروں گا۔'' شہاب الدین نے کہا اور اس کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

اسلم خان اس وقت اس کے پاس ہی موجود تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے زندگی میں کبھی شہاب الدین نے کہیں باہر نکل کر اسلم خان کو اپنے کمرے میں نہیں رکھا تھا لیکن اس وقت صورتحال ایسی تھی کہ اسے ڈبل روم لینا پڑا تھا اور اسلم خان اس کے ساتھ ہی تھا۔ وہ انتظار کرتا رہا پھر کوئی آٹھ بجے ایس پی وہاب احمد اس کے پاس پہنچ گیا۔ بھاری بھر کم جسامت والا یہ شاندار شخصیت کا مالک تھا۔ دونوں گلے ملے تھے کیونکہ زمانہ طالب علمی سے ایک دوسرے کے ساتھی تھے اور پھر خود وہاب احمد شیخ بھی ایک زمیندار کا بیٹا ہی تھا۔ کوئی للو پنجو نہیں تھا۔ اس لیے شہاب الدین اس سے گلے ملنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا تھا۔

''کافی ہلکے ہو گئے ہو۔''

''ہاں پچھلے دنوں خاصا پریشان رہا ہوں۔''

''یقیناً وہ پریشانی کوئی لڑکی ہو گی؟'' وہاب احمد نے کہا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

''ہاں۔ لڑکی ہی کہہ سکتے ہو۔ کیونکہ یہ پریشانی مجھ پر ایک لڑکی ہی کی وجہ سے آئی

ہے۔''

''کسی سر پھرے کی محبوبہ ہو گی؟''

''تم تو درویش ہوتے جا رہے ہو یار!'' شہاب الدین نے کہا اور وہاب احمد قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

''پولیس والا ہوں کوئی اور نہیں ہوں۔ قصہ کیا ہے؟''

''کھانا منگوا لیا جائے یا دیر سے کھاؤ گے؟''

''یار! ذرا دیر سے کھائیں گے جلدی کیا ہے۔ بھگانا چاہتے ہو۔''

''نہیں تمہاری ہی مصروفیت کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں تم بات بتاؤ پوری۔''

''وہ صورتحال یہ ہے کہ اپنی ہی بستی میں ایک لڑکی پسند آ گئی تھی۔ لجیا نام تھا اس کا۔ اٹھوا لیا لیکن اس کے پیچھے پیچھے اس کا حرامی عاشق دوڑا چلا آیا اور اس نے کافی گڑبڑ کی خیر کوئی چھوٹا موٹا بندہ ہوتا تو میں خود ہی سنبھال لیتا لیکن وہ تو کیس ہے ایک پورا کیس۔''

''کیسا کیس؟''

''ہو سکتا ہے تمہارے علم میں ہو اور ہو سکتا ہے ایسا نہ بھی ہو۔ کبیر والا کے رہنے والے زمیندار اورنگزیب اور جہانزیب کا چھوٹا بھائی شاہ زیب جو یہیں لاہور میں تعلیم حاصل کرتا تھا۔ انہی کے رشتے دار دو افراد اور بھی ہیں الیاس خاں اور جبار خاں۔''

''ہاں وہ دونوں تو دس نمبری ہیں۔''

''بیس نمبری ان کے گلے پڑ گیا ہے۔''

''ارے ارے تم اس شاہ زیب کی بات تو نہیں کر رہے جس نے الیاس خاں کے بیٹے انور کو مار ڈالا تھا۔''

''سمجھ گئے۔ تم بالکل سمجھ گئے۔ کیا یہ کیس تمہارے پاس آیا تھا۔''

''نہیں آیا تو نہیں ہے لیکن سنا ضرور ہے۔ اس کے بارے میں۔ بلکہ کئی مرتبہ لاہور سے بھی پولیس کی نفری گئی ہے اور اس نے شاہ زیب کے گرد گھیرا ڈالا ہے لیکن یہ بھی سنا کہ وہ کچھ پولیس والوں کو مار کر نکل گیا۔ بلکہ یہ خبر تو اخبار میں پڑھی تھی۔ وہ کئی خون کر چکا ہے اور ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں لگا۔''

''ظاہر ہے بندہ معمولی نہیں ہے۔ سانپ کی طرح چالاک اور پھرتیلا ہے۔ ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہی کسی بل میں جا گھستا ہے۔''

''یار! یہ تم کہہ رہے ہو۔''

''ارے بھائی! پولیس والے ہیں جادوگر نہیں ہیں۔ ہم بھی بس تکے پر ہی کام کرتے ہیں۔ سراغ رسانی بے شک ہوتی ہے لیکن جادوگری نہیں ہوتی کہ وظیفہ پڑھا اور مجرم حاضر اور پھر دیکھ لو ہمارے بندے بھی ایسے حرامیوں کے ہاتھوں ہلاک ہوتے ہیں۔ ہم کیوں ان کے ساتھ رعایت کریں۔''

''پر اس بندے کے ساتھ تو کچھ زیادہ ہی رعایت ہو رہی ہے۔ میرا بھی ایک بندہ مار دیا اس نے اور میری جان کے پیچھے لگا ہوا ہے۔''

''میری جان کے پیچھے کوئی لگے اور میں اسے چھوڑ دوں۔'' وہاب احمد شیخ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بہر حال تم تو کچھ نہیں کر سکے لیکن میں تو اپنی جان بچانے کے لیے فکر میں لگا ہوا ہوں۔''

''کیا بات ہے کوئی سراغ ملا ہے کیا؟''

''ہاں ملا تو ہے۔''

''بتاؤ' بتاؤ۔ پرواہ مت کرو۔ ابھی وہاب احمد سے اس کا واسطہ نہیں پڑا ہے۔ جس دن بھی وہاب احمد شیخ کے سامنے آ گیا۔ سمجھ لو کہ کام سے گیا۔ میں ایس پی کسی سفارش کے نتیجے میں نہیں بنا ہوں۔''

''وہاب احمد چکر تو لمبا ہے تمہیں یہ بات تو پتا ہے کہ میں تماش بین آدمی ہوں مجرے شجرے کراتا رہتا ہوں۔ ایک طوائف سے یاداللہ ہوگئی ملکہ بائی نام ہے اس کا۔''

''جانتا ہوں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہاب احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں ظاہر ہے تم نہیں جانتے ہوگے تو اور کون جانتا ہوگا۔''

''نہیں بھئی نہیں۔ غلط بات مت کرو۔ ارے ہم لوگوں کو واقفیت تو ہوتی ہی سارے لوگوں سے۔ تم نے اگر آنکھ دبا کر بات کی تو میری بیوی مجھے طلاق دے بھاگ جائے گی۔ کیا سمجھے۔ بڑی ڈینجر ہے وہ۔'' دونوں ہنسنے لگے۔ پھر وہاب احمد کہا۔

''آگے بولو۔''

''یار! وہ لڑکا اس لڑکی لجیا کے لیے پاگل ہو رہا ہے۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ لڑکی جسے میں نے لاہور بھجوا دیا تھا۔ اسی لڑکے کے خوف سے جل دے کر نکل گئی ہے اور ابھی تک اس کا پتہ نہیں ہے۔ مطلب سمجھ رہے ہو نا۔ وہ میرے قبضے میں بھی نہیں ہے مگر پچھلے کچھ دنوں سے سنا گیا ہے بلکہ یقینی طور پر شاہ زیب کو ملکہ بائی کے کوٹھے پر آتے جاتے دیکھا گیا ہے۔ وہ ملکہ بائی کے کوٹھے پر ایک لڑکی ریحانہ کا دوست بن گیا ہے۔ عاشق تو میں اسے نہیں کہہ سکتا۔ مگر یہ طوائفیں بھی بڑی فنکارائیں ہوتی ہیں۔ بڑے بڑوں کے دل دھوڑ الیتی ہیں۔ ہوسکتا ہے ریحانہ نے اس پر جادو چلا رکھا ہو۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ آج کل وہاں آتا جاتا ہے؟''

''ہاں۔''

''ملکہ بائی کے بارے میں تم نے ابھی مجھے بتایا تھا کہ اس سے تمہاری یاداللہ ہے۔''

''ہاں بالکل۔''

''اس سے پوچھا اس کے بارے میں۔''

''نہیں' ابھی تک نہیں۔ مگر اس نے مجھے اطلاع بھجوائی تھی کہ وہ آتا جاتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ملکہ بائی اس کی گرفتاری میں تعاون کرے گی۔''

''بالکل کرے گی۔''

''مگر ہم اس سے تعاون مانگیں ہی کیوں۔''

''تو پھر۔''

''اوئے یار! رشوت دے کر ایس پی نہیں بنا ہوں۔ نہ ہی کسی سفارش کے نتیجے میں ایسا ہوا ہے۔ ابھی بندے لگا دیتا ہوں اور یہ معلوم کرتا ہوں کہ آتا کس وقت ہے۔ وہ اگر مجرے کے وقت آتا ہے تو مجرے میں سادہ لباس والے بندے بٹھا دوں گا۔ جو اس پر قابو پالیں گے اور اگر ایسے ویسے وقت میں آتا ہے تو یہ بھی دیکھ لوں گا۔''

''ایک کام کرو وہاں رحیمی نام کا ایک بندہ ہے جو اپنا ساتھی ہے۔ ملکہ بائی نے اسے ہی میرے پاس بھیجا تھا اور اسی نے اس بارے میں مجھے اطلاع دی تھی۔ میں نے اس کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ اگر وہ آتا ہے تو اس کا پیچھا کر کے یہ پتہ لگائے کہ اس کا اصل ٹھکانہ کون سا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا اگر یہ نہیں پتہ ہوگا تو کم از کم یہ تو پتہ چل سکے گا کہ وہ کس وقت وہاں آتا ہے۔''

''رحیمی نام بتایا تم نے اس کا؟''

"ہاں۔"

"تو پرواہ مت کرو۔ معلوم کر لیتے ہیں۔ دیکھ لیتے ہیں اس رحیمی کو بھی۔"

"یار! بڑی امیدیں لے کر آیا ہوں اب کے مت چوک جانا۔"

"اوئے باپ نے سفارش نہیں کی تھی میری۔ اپنی محنت سے ایس پی بنا ہوں۔ سمجھے میرے ہاتھ سے نکل کر دکھا تو دے وہ بچو۔ کیا یاد کرے گا کہ ایس پی وہاب احمد سے ٹاکرا ہوا تھا۔"

"تمہاری وجہ سے دل کو بڑا اطمینان ہو گیا ہے۔ شکریہ ادا کرتا ہوں اس کا۔"

"ارے بھائی! کوئی بڑا کام ہمارے سپرد کرو۔ کیا یہ چھوٹے موٹے کام دیتے ہو۔ کوئی ایسا کام ہمارے سپرد کرو جس سے کچھ فیوچر بھی بنے۔ ارے ہاں۔" وہاب احمد نے اپنا مقصد بیان کر دیا جسے شہاب الدین نے سمجھ لیا لیکن عارضی طور پر گول مول کر گیا۔ البتہ لالچ دینا ضروری تھا۔ اس نے کہا۔

"اس سے پہلے کبھی تم نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ اپنے علاقے کی تمام زمینوں پر قبضہ نہ کرا دوں تو میرا نام بھی شہاب الدین نہیں ہے۔"

"اوئے لاکھوں سال جیو۔ لاکھوں سال۔ بنا دے یار مجھے چوہدری! پولیس کے محکمے سے ریٹائر ہونے کے بعد آخر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔"

"کھانا منگاتا ہوں۔" شہاب الدین نے کہا اور ویٹر کو بلانے کے لیے بیل بجا دی۔

اسلم خان اس دوران کمرے میں موجود نہیں تھا اور باہر نکل گیا تھا۔ ایک پرتکلف ڈنر کے بعد ایس پی وہاب احمد رخصت ہو گیا اور شہاب الدین نے اسلم خان کو آواز دے لی۔

☆☆☆

شاہ زیب ہوٹل میں مقیم تھا۔ تنہائی اسے کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں ان دنوں ختم ہو گئی تھیں۔ عجیب عجیب احساسات نے گھیر لیا تھا۔ بیشتر بار دل کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ لجیا اب کبھی نہیں ملے گی۔ مر کھپ گئی ہو گی۔ ہو سکتا ہے ان حالات نے اسے خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا ہو۔ شہاب الدین جیسے بھیڑیے کے چنگل سے بچنے کے لیے اس نے زندگی قربان کر دی ہو۔ اس کے پیچھے زندگی برباد کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔"

لیکن جب ایسی باتیں سوچتا تو دل کی حالت عجیب ہونے لگتی تھی۔ پھر اسے ایک التجا بھری آواز سنائی دیتی۔

"شادی کر لے مجھ سے، میرے ماں باپ کا دکھ دور ہو جائے گا۔ وہ جسے اپنے دل کی کیفیت سے بھی آگاہی نہیں تھی۔ ماں باپ کا دکھ دور کرنے کے لیے وہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ معصوم اور الہڑ سی لڑکی جسے دنیا کی کوئی خبر نہیں تھی۔ بس اپنے آپ کو ماں باپ کے لیے وقف کر چکی تھی۔ وہ اور اب نجانے اس پر کیا بیت رہی ہو گی۔

بہرحال یہ سوچیں اس پر سوار رہتی تھیں اور وہ ان دنوں بری طرح نڈھال تھا۔ ایسے حالات میں اپنے آپ کو روکنے کے باوجود وہ اپنے قدم ملکہ بائی کے کوٹھے کی طرف بڑھنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ اس دن کے بعد سے تقریباً روزانہ ہی ملکہ بائی کے کوٹھے پر جا رہا تھا اور رفتہ رفتہ اسے اس کوٹھے کے آداب معلوم ہوتے جا رہے تھے۔ مجرے کے وقت وہاں پہنچ جاتا۔ دوسروں کی طرح ہاتھ کھولے رکھتا تھا بلکہ دوسروں سے زیادہ ہی ہاتھ کھلا رکھتا تھا اور وہ رقم جو اسے مختلف طریقوں سے حاصل ہوتی تھی ملکہ بائی کے پاس منتقل ہوتی جا رہی تھی۔

البتہ اسے اتنی آسانی حاصل تھی کہ مجرہ ختم ہونے کے بعد بھی ایک دو گھنٹے ر
کے پاس بیٹھنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ ابھی زیادہ وقت ہی نہیں ہوا تھا حالانکہ ر
اسے منع کرتی تھی کہ وہ اپنی رقم یہاں نہ لٹایا کرے۔ بلکہ اس نے کہہ بھی دیا تھا کہ آ
یہ ساری رقم اسے واپس کر دے گی لیکن شاہ زیب کا کہنا تھا کہ جو سکون اسے ریحانہ
پاس آ کر ملتا ہے۔ اس کی قیمت وہ دے ہی نہیں سکتا۔

ابھی زیادہ وقت بھی نہیں ہوا تھا۔ چند ہی روز ہوئے تھے۔ ادھر شہاب الدین
کارروائی میں مصروف تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایس پی وہاب احمد انتہائی ذ
اور اعلیٰ کارکردگی کا آفیسر تھا۔ رحیمی کو اس نے چالاکی سے حاصل کر کے ساری تفصیلا
معلوم کر لی تھیں اور آج وہ سارے پروگرام ترتیب دے چکا تھا۔ ملکہ بائی کو بھی ا
مہمانوں کی زیادہ آمد پر حیرانی ہوئی تھی۔ کئی اجنبی مہمان اس کے کوٹھے پر آئے تھے۔ ل
بہر حال ظاہر ہے مہمان خانے میں تو مہمانوں کی آمد ہوتی ہی ہے۔ پھر شاہ زیب بھی
گیا اور مہذب انسانوں کی طرح ایک گوشے میں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ کوئی بھی یہ نہیں د
سکا تھا کہ ان اجنبی لوگوں نے خاص طور سے ایک دوسرے کو اشارے کئے تھے اور ب
چوکس ہو گئے تھے بلکہ انہوں نے اپنے اپنے لباسوں میں کچھ ٹٹول کر بھی دیکھا تھا۔

ریحانہ پر ان دنوں ایک عجیب سرور کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ رقص بھی کرتی ت
اور گاتی بھی تھی۔ ایسی ایسی حسین غزلوں کا انتخاب کیا تھا ان دنوں اس نے کہ کوئی جوا
نہیں تھا ان کا۔ اس وقت بھی وہ بے خودی کے عالم میں رقص کر رہی تھی اور تماش بینا
واہ کے ڈونگرے برسا رہے تھے اور پھر گانا ختم کر کے اس نے تماش بینوں کو جھک جھک
سلام کیا اور ایک جگہ جا بیٹھی۔

لیکن اچانک ہی ایک خوفناک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ چھ افراد بری طرح شاہ زیب

ٹ پڑے تھے۔ انہوں نے اس کی کلائیاں موڑ کر پیچھے کر لی تھیں۔ دونوں پاؤں پکڑ
لئے تھے اور انہیں زمین پر لٹا دیا تھا۔ تماش بین حیران ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ملکہ بائی بھی
یک لمحے کے لیے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ ریحانہ کے حلق سے ہیجانی چیخیں نکل رہی تھیں۔ وہ
وڑ کر آگے بڑھی تو ملکہ بائی نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا۔

"پاگل ہو گئی ہے۔ پاگل ہو گئی ہے کیا؟ موت آ گئی ہے تیری' مرنا چاہ رہی ہے۔
بیٹھ جا اپنی جگہ۔"

"اماں! وہ دیکھو---وہ شاہ زیب کو۔"

"ٹھیک کر رہے ہیں بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ آخر اسے پولیس کے
نگل میں آنا ہی تھا۔ پولیس والے ہیں وہ سب پولیس والے ہیں۔" ملکہ بائی نے اس
طرح کہا کہ ریحانہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"پپ---پولیس والے؟"

"ارے ہاں۔ وہ پولیس والے ہیں۔ تجھے پتہ ہے نا وہ قاتل ہے۔ کئی پولیس
والے مارے ہیں اس نے اور کئی بندے بھی مار دیئے ہیں۔ کوئی شریف زادہ ہے وہ؟
شریفوں کی سی شکل بنا کر یہاں آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ تو تیرا کیا خیال ہے کسی کو اس کے
بارے میں معلوم نہیں ہے۔"

"مگر اماں! تمہیں کیسے معلوم کہ یہ پولیس والے ہیں؟" ریحانہ نے کہا۔

"میں نے بلایا ہے انہیں۔ سمجھی میں نے بلایا ہے۔" ریحانہ کا اوپر کا سانس اوپر اور
نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔

ادھر شاہ زیب کو ان لوگوں نے بری طرح جکڑ لیا تھا۔ دھوکے سے پکڑا تھا۔ ہتھیار
وغیرہ بھی نہیں تھا اس کے پاس۔ وہ تو بالکل سادہ لباس اور سادہ دل کے ساتھ یہاں

موجود تھا۔ اس طرح رسیوں سے جکڑا تھا انہوں نے اسے کہ ریحانہ کا کلیجہ کٹ کر منہ کو
رہا تھا۔ مار بھی رہے تھے۔ ریحانہ پھر دلدوز انداز میں چیخ رہی تھی۔

''کیا کر رہے ہو یہ۔ تم لوگ کیا کر رہے ہو؟'' اچانک ہی پولیس کی وردی میں
ملبوس ایس پی وہاب احمد اندر داخل ہوا اور اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا شور مچا رکھا ہے تم لوگوں نے۔ ملکہ بائی یہ لڑکی کیوں چیخ رہی ہے؟ چپ کرا
اسے۔'' ریحانہ خود خاموش ہو گئی تھی۔ وہاب احمد نے مذاق اڑانے والی نظروں سے شاہ
زیب کو دیکھا۔ جسے اب رسیوں میں بری طرح کس لیا گیا تھا۔

''ہوں شاہ زیب' شاہ زیب پانچ پولیس والوں کا قاتل اور چھ سات دوسرے
بندوں کا' بارہ افراد کا' تیرہ افراد کا قاتل لیکن بچو میں نے راجہ شہاب الدین سے کہہ دیا تھا
کہ جب تک بچھڑے کی طرح اچھل رہا ہے اچھلنے دو۔ جس دن وہاب احمد اس کی جانب
متوجہ ہو گیا۔ چوہے کی طرح پکڑ لیا جائے گا۔ ایس پی وہاب احمد ہوں میں۔ وہاب احمد
شیخ سمجھا۔ راجہ شہاب الدین نے تیری گرفتاری کرائی ہے کیا سمجھا۔ چلو۔۔۔ لے کر چلو اور
سنو۔ کوئی شور شرابہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنا کام جاری رکھو۔ ہم ایک مجرم کو پکڑ
کر لے جا رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر ایس پی نے پولیس والوں کو اشارہ کیا اور وہ کسی کتے کی
طرح گھسیٹتے ہوئے شاہ زیب کو باہر لے گئے۔

ریحانہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں اور وہ سخت ہیجان کا شکار
تھی۔ اس کے پورے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا تھا اور وہ بری طرح کپکپا رہی تھی۔ ادھر ملکہ
بائی خوشی سے کہہ رہی تھی۔

''ریحانہ! تو پاگل ہو گئی ہے۔ ارے بارہ تیرہ افراد کا قاتل ہمارے کوٹھے پر آنا
شروع کر دے تو کیا ہم سکون سے رہ سکتے ہیں۔۔۔ بول سکون سے رہ سکتے ہیں ہم۔ میں

نے رحیمی کو ساری صورتحال معلوم ہونے کے بعد راجہ شہاب الدین کے ہاں بھیجا اور اس
نے کہا کہ بھیا اپنا کیا خود سمیٹو۔ یہ تم نے ہماری جان کو کیا مصیبت لگا دی۔ بس راجہ
صاحب آ گئے اور انہوں نے یہاں سارے انتظامات کئے۔ پکڑا گیا حرام کا جنا۔ کیسا
لے گیا تھا ہمیں اس ڈاک بنگلے میں اور کیسا چھین لیا تھا ہمارا مال۔''

ریحانہ کچھ نہیں بول رہی تھی۔ اب اس ہنگامہ آرائی کے بعد محفل تو جمنے کا سوال ہی
نہیں پیدا ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ سارے لوگ چلے گئے اور ملکہ بائی نے کہا۔

''حس کم جہاں پاک۔'' ریحانہ لرزتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ شاہ زیب
کے ساتھ اس کے کوٹھے پر جو سلوک ہوا تھا۔ وہ اس کے تصور سے بھی باہر تھا۔ ملکہ بائی
نے اس سے شاہ زیب کے بارے میں تفصیلات معلوم کیں۔ اس کے بعد رحیمی کو راجہ
شہاب الدین کے پاس بھیجا اور یہ ساری کارروائی اس طرح ہوئی۔ شاہ زیب جوان
لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے جنگ کرتا رہا تھا۔ صرف اس لیے قبضے
میں آ گیا کہ ملکہ بائی نے یہاں پر غداری کی اور اب اسے موت کی سزا ہو جائے گی۔
قاتل ہے وہ قاتل۔ اتنے سارے افراد کا قاتل۔۔۔ ہائے میرا شاہ زیب۔ ریحانہ کے
حلق سے رونے کی آوازیں نکلنے لگیں۔ وہ بلک بلک کر روتی رہی۔ اس کے منہ سے الفاظ
نکلتے رہے۔

''میں بے قصور ہوں شاہ زیب! تم یقین کرو میں بے قصور ہوں۔ ہائے کیا سوچ
گئے تم۔ کہیں میں نے تو تمہارے ساتھ ایسا نہیں کیا۔ شاہ زیب! کیا کہوں تم سے میں تو
ہوں ہی سڑک کا پتھر۔ میں تو تم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ شاہ زیب میں تم سے محبت کرنے
لگی ہوں۔ شاہ زیب میں انسان ہوں۔ میں بھی انسان ہوں۔ میرے سینے میں بھی سرخ
گوشت کا ایک ٹکڑا چھپا ہوا ہے جسے دل کہتے ہیں اور جو کم بخت سب کا ایک جیسا ہوتا

ہے۔شاہ زیب وقت انسان کو نجانے کیا سے کیا بنا دیتا ہے پر جب بھی وہ انسان بنتا۔ اس کے دل میں سب سے بڑا جذبہ محبت کا ہی ہوتا ہے۔ہائے شاہ زیب میں نے یہ سر کچھ تمہارے ساتھ نہیں کیا۔میں تو تم سے پیار کرتی ہوں۔شاہ زیب! میں کیا کروں م تمہارے لیے۔ہائے میرے شاہ زیب میں کیا کروں تمہارے لیے اور پھر اسے ملکہ با یاد آ گئی۔فخر کر رہی تھی اپنے آپ پر۔اچانک ہی اس کی آنکھوں میں ایک جنون سا ا آیا۔

ملکہ بائی شاہ زیب کی گرفتاری کی ذمے دار تو ہے۔تو نے ایسا کیا ہے۔ملکہ بائی تو نے ایسا کیا ہے میرے شاہ زیب کے ساتھ۔ایسی بات ہے۔وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔اچانک ہی اس کی آنکھیں آگ اگلنے لگی تھیں۔پورے بدن میں ایک تشنج سا پید ہو گیا تھا۔آگ لگ رہی تھی سارے وجود میں اور یہ آگ اسے خاکستر کیے دے رہ تھی۔اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ملکہ بائی!'' اور پھر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ایک گوشے میں لوہے کا سریا پڑا ہو تھا۔غالباً کسی پردے کے لیے تھا۔فینسی اسٹیل کا بنا ہوا خوبصورت لیکن انتہائی مضبوط۔ ریحانہ کے دانت ایک دوسرے پر بھینچ گئے۔اس نے وہ سریا اٹھایا جو کوئی گز بھر لمبا تھا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔باہر آ کر وہ ملکہ بائی کے کمرے کی جانب چل پڑی۔ملکہ بائی بھی غسل وغیرہ کر کے لیٹ گئی تھی لیکن سوئی نہیں تھی۔ دروازے پر آہٹ ہوئی تو اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ریحانہ تھی۔ملکہ بائی مسکرا دی۔

''آؤ---آؤ---آ جاؤ---دیکھو ریحانہ! تمہیں ہزار بار سمجھا چکی ہوں۔ایک بار پھر سمجھا رہی ہوں۔مجھے تمہارے بارے میں یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ تم اس لڑکے سے متاثر ہو گئی ہو۔بی بی! یہ طوائف کا کوٹھا ہے۔تم ہزار بار مر جاؤ لیکن رہو گی طوائف! کوئی

بھی تمہیں عزت سے اپنے گھر میں قبول نہیں کر سکے گا۔طوائف کو کبھی کسی سے متاثر نہیں ہونا چاہیے اور تم نے جو کچھ کیا ہے اس کے نتیجے میں راجہ شہاب الدین ہمیں ضرور کوئی رقم دے گا۔آؤ--- کھڑی کیوں ہو ابھی تک تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔''

''تو نے---تو نے میرے شاہ زیب کو گرفتار کرایا ہے۔اب اسے موت کی سزا ہوگی۔''

''ایں--- کیسے بول رہی ہے تو مجھ سے---''تو نے---تو نے' کہہ رہی ہے۔''

''تو نے---تو نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے اور وہ یہ سوچے گا کہ یہ سب کچھ میں نے کیا ہے۔''

''اری سوچتا ہے تو سوچنے دے۔اور یہ تو نے---تو نے کیا لگا رکھا ہے۔زیادہ دماغ میں خرابی ہو گئی ہے۔''

''ہاں زیادہ خرابی ہو گئی ہے۔'' اچانک ہی ریحانہ نے کہا اور لوہے کی وہ راڈ اس نے کس کے مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھام لی اور اسے اوپر اٹھایا۔

ملکہ بائی نے حیرت سے اس کی یہ جنونی کیفیت دیکھی اور دوسرے لمحے اس کا منہ کھل گیا لیکن پھر اس کی چیخ پورے کمرے میں گونج کر رہ گئی تھی۔لوہے کی سلاخ اس کی بائیں ٹانگ پر پڑی تھی اور بائیں ٹانگ کی ہڈی چکنا چور ہو گئی تھی۔

''یہی سوچے گا نا وہ کہ میں نے اس کے ساتھ غداری کی---یہی سوچے گا نا وہ کہ میں طوائف ہوں۔صرف طوائف---پیسے کے حصول کے لیے میں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔میری ساری باتوں کو مکاری سمجھے گا نا وہ۔تیری وجہ سے---تیری وجہ سے ایسا ہو گا نا---ایسا ہی ہو گا نا۔''

اس نے سلاخ دوبارہ ملکہ بائی کی دوسری ٹانگ پر ماری اور پنڈلی کی دوسری ہڈی

بھی ٹوٹ گئی۔ ملکہ بائی بن پانی کی مچھلی طرح تڑپ رہی تھی اور اس کی چیخیں آسمان ۔
باتیں کر رہی تھیں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دفعتاً ہی کئی سازندے اندر گھس گئے۔ اس ۔
ساتھ ساتھ ہی شمع بھی اس کے نزدیک تھی۔

چنانچہ دوسرے لمحے ریحانہ کو بری طرح جکڑ لیا گیا۔ وہ سب بری طرح چیخ ر
تھے اور ملکہ بائی ماہی بے آب کی طرح زمین پر تڑپ رہی تھی۔ ریحانہ کا چہرہ شدت ج
سے تمتما رہا تھا۔ آنے والے سہمی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے اور ملکہ بائی
چیخیں اب مدھم پڑتی جا رہی تھیں۔ دونوں ٹانگیں چکنا چور ہو گئیں تھیں اور لوہے کی
ریحانہ کے ہاتھ میں تھی۔ وہ خونی نگاہوں سے ملکہ بائی کو دیکھ رہی تھی۔ رحیمی نے خوفز
لہجے میں کہا۔

''ارے ریحانہ بی بی--- ریحانہ بی بی--- یہ کیا کیا تم نے؟ ریحانہ بی بی یہ تم
کیا کیا؟'' ریحانہ نے پلٹ کر رحیمی کی طرف دیکھا تو رحیمی اس کی آنکھیں دیکھ کر ڈر گ

''مم مرگئی--- مرگئی ملکہ بائی--- اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ریحانہ نے سلا
ایک طرف پھینک دی اور نفرت زدہ نگاہوں سے ملکہ بائی کو دیکھتی ہوئی وہاں سے باہر ن
گئی۔ جیسے ہی وہ باہر نکلی شور ہو گیا۔

''ہسپتال--- ہسپتال لے چلو--- ہسپتال لے چلو۔'' ملکہ بائی بے ہوش ہو
تھی۔ فوراً ہی تیاریاں کیں گئیں اور تھوڑی دیر بعد ملکہ بائی کو گاڑی میں ڈال کر گا
ہسپتال کی جانب دوڑا دی گئی۔

ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں ملکہ بائی کی دیکھ بھال کی گئی۔ ڈاکٹروں نے فوراً
اسے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ رحیمی اور دوسرے سازندے باہر بیٹھے ہوئے تھ
تھوڑی دیر کے بعد شمع بھی روتی پیٹتی وہاں پہنچ گئی اور ماں کے بارے میں تفصیلات معل

ر نے لگی۔ ریحانہ گھر پر ہی تھی۔ ڈاکٹروں نے تمام تر دیکھ بھال شروع کر دیں۔ فوری
طور پر طے کیا گیا کہ ملکہ بائی کا آپریشن کیا جائے۔ عمر رسیدہ عورت تھی اور ہڈیوں کی جو
حالت ہوئی تھی وہ دیکھنے کے قابل تھی۔ ایمرجنسی میں کافی اچھی دیکھ بھال کی گئی تھی اور
اس کے لیے ایکسرے وغیرہ نکالے گئے۔ ڈاکٹر انگلیوں کی کیفیت دیکھ کر سر پکڑ کر بیٹھ
گئے۔

''کیا خیال ہے ان ہڈیوں کو جوڑنے کی کوشش کی جائے؟''

''آپریشن کے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔'' پھر باقی تمام انتظامات کئے گئے اور کوئی
پانچ گھنٹے تک یہ زبردست آپریشن جاری رہا۔ سرپرست کی حیثیت سے اس وقت رحیمی
ہی پیش پیش تھا۔ اپنے طور پر وہ یہ سوچ رہا تھا کہ جس طرح بھی بن پڑے سب سے پہلے
راجہ شہاب الدین کو اس بارے میں اطلاع دی جائے۔ وہ بہت چالاک آدمی تھا اور
اسے یقین تھا کہ ریحانہ نے جو خوفناک قدم اٹھایا ہے۔ وہ شاہ زیب کی گرفتاری کے بعد
ہی اٹھایا ہے۔ جہاندیدہ بھی تھا اور جانتا تھا کہ نوجوان دل جب کسی کی جانب راغب
ہوتے ہیں تو بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔

بہرحال ایک اور خیال بھی دل میں تھا کہ کسی طرح ملکہ بائی کو ہوش آ جائے تو آگے
کے اقدامات کرے۔ اس کی اجازت کے بغیر کچھ کرنا ذرا خطرناک سی بات تھی۔ ہوسکتا
ہے ملکہ بائی ایسا نہ کرے۔

بہرحال ملکہ بائی کی ٹانگوں کا آپریشن کیا گیا۔ بڑا زبردست آپریشن تھا اور اس
کے اخراجات کے سلسلے میں رحیمی سے بات کر لی گئی تھی۔ ڈاکٹروں کو جب یہ معلوم ہوا کہ
ملکہ بائی کس حیثیت کی مالک ہے تو انہیں کوئی تردد نہیں ہوا تھا۔ جانتے تھے کہ اس پروفیشن
میں رہنے والی کوئی خاتون اور خاص طور سے وہ جو سربراہ ہو مالی طور پر کس قدر مضبوط

ہو سکتی ہے۔

لیکن بہر حال یہ تمام کام کر لیے گئے اور ملکہ بائی کو بے ہوشی ہی کی حالت میں کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ دو سازندے رحیمی کے ساتھ موجود تھے۔ رحیمی ان سے ملکہ بائی کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

’’پتہ نہیں چلا استاد جی! یہ اپنی ریحانہ کو کیا ہوا۔ کوئی غلط چیز کھا لی تھی اس نے جو اس کے دماغ کو گرمی چڑھ گئی؟‘‘ فیض خان نے رحیمی سے کہا۔

’’ابے بکواس مت کر غلط چیز کھالی تھی یہ کم بخت جوانی جو ہوتی ہے۔ یہی سب سے غلط چیز ہوتی ہے۔ انسان اس میں ایسی احمقانہ حرکتیں کر جاتا ہے۔‘‘

’’مطلب؟‘‘

’’وہ جو ایک لڑکا پکڑا گیا ہے اپنے کوٹھے سے۔‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’بس یہ ریحانہ بی بی اسی کے چکر میں تھیں۔ حالانکہ وہ ڈاکو ہے۔‘‘

’’ڈاکو۔‘‘

’’ہاں۔ ڈاکو۔‘‘

’’اماں--- کیا کہہ رہے ہو استاد جی؟‘‘

’’بک بک مت کر اگر پوچھ رہا ہے تو جو کہہ رہا ہوں اسے ہی سن۔‘‘

’’جی، جی جی۔ تو یہ تو بڑی گڑبڑ ہوگئی۔ اب کیا ہوگا؟‘‘

’’جب تک بائی جی ہوش میں نہیں آ جائیں گی۔ ہم کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ ڈاکٹروں کو بڑی مشکل سے یہ کہہ کر خاموش کیا ہے کہ بائی جی سیڑھیوں پر سے گر گئیں تھیں اور اس طرح گریں کہ دونوں پنڈلیوں میں یہ چوٹ آ گئی۔ حالانکہ ڈاکٹر مشکوک ہیں۔

بڑی باتیں کیں انہوں نے مجھ سے۔ کیسے گریں؟ کیا ہوا؟ نشے میں تھیں اور وہ بڑھیاں کیسی تھیں جہاں وہ گریں۔ بھائی فیض خان پولیس کو سمجھانا بڑا مشکل کام ہے لیکن بہر حال بائی جی کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔‘‘

’’کہیں بائی جی مر تو نہیں جائیں گی؟‘‘

’’یار! یہ تو اللہ کی مرضی پر ہے۔ مر جائیں گی کوئی اور گھر دیکھ لیں گے۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو وقت کی بات ہوتی ہے۔‘‘

بہر حال ملکہ بائی کا کوئی اتنا ہمدرد نہیں تھا۔ شمع کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کون تھی لیکن بہر حال ریحانہ کے مسئلے میں یہ لوگ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ ریحانہ پر کیا گزر رہی تھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس نے نہ تو فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی کوئی اور ردعمل ظاہر کیا تھا۔ اس قسم کے معاملات میں وہ بالکل ہی بے بس تھی اور اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ بس اس کے ذہن پر ایک ہی کیفیت سوار تھی۔

شاہ زیب نے کیا سوچا ہوگا۔ اس نے یہی سوچا ہوگا نہ کہ ریحانہ نے اسے گرفتار کرایا ہے۔ اس نے دھوکا دہی کی۔ حالانکہ شاہ زیب کے ساتھ دھوکا دہی کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ ریحانہ کے دل کی گہرائیوں میں جا بیٹھا تھا۔ طوائف کبھی کسی سے محبت نہیں کرتی اور جب کسی سے محبت کرتی ہے تو پھر شاید اس کے لیے اپنی ہزار جانیں قربان کر سکتی ہے کیونکہ کسی طوائف کے دل کی گہرائیوں تک پہنچنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہوتا ہے۔ سمندر کی تہہ میں اترا جا سکتا تھا لیکن کسی طوائف کے دل کی گہرائیوں میں اتنی رکاوٹیں ہوتی ہیں کہ وہاں تک پہنچنا ناممکن ہو جاتا ہے کیونکہ اسے بچپن ہی سے انسانوں سے نفرت کرنے کا سبق سکھایا جاتا ہے۔ اس کی محبت اس کی ادائیں، اس کا پیار،

اس کی مسکراہٹیں سب دولت کے لیے ہوتی ہیں۔ انسان اس کی نگاہوں میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور اگر کبھی کوئی انسان اس کی نگاہوں کے راستے دل کی وادیوں تک پہنچ جائے تو غالباً پھر وہ کبھی نہیں نکل سکتا۔ یہی کیفیت ریحانہ کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ خود کیا ہے بذات خود کیا ہے۔ شاہ زیب کے بارے میں اسے تمام تفصیلات معلوم ہو چکی تھیں لیکن کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سوائے اس کے کہ خاموشی سے اسے چاہے۔ شاہ زیب اس کے پاس آنے لگا تھا۔ یہی اس کی خوش بختی تھی۔ ورنہ کون اس طرح سے کسی طوائف زادی کو توجہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

بہرحال یہ تمام چکر چل رہا تھا۔ ادھر ملکہ بائی برے حالات سے گزر رہی تھی ڈاکٹروں نے اسے فوراً ہی سنبھال لیا تھا۔ دوسرے دن بھی اسے ہوش نہیں آیا تھا لیکن تیسرے دن کو کوئی ساڑھے دس بجے اسے ہوش آیا۔ شمع اور رحیمی اس کے پاس موجود تھے۔ اس نے حیران نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھا اور پھر غور و خوض میں ڈوب گئی۔ چند لمحوں کے بعد اسے سب کچھ یاد آ گیا اور اس کے حلق سے کراہیں نکلنے لگیں۔

"ارے مرگئی --- ارے خدا غارت کرے --- ارے خدا غارت کرے۔ ارے خدا اسے غارت کرے۔ رحیمی ادھر آ کم بخت موئے کہاں مر رہا ہے۔ میں زندہ ہوں یا مرگئی اور اگر میں مرگئی تو تو یہاں اس جنت میں میرے ساتھ کہاں سے آ گیا۔"

"خیر بائی جی مرنے کے بعد اگر تم جنت کے بارے میں سوچ رہی ہو تو یہ تو غلط بات ہے اور جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے تو اگر جہنم کے دروازے پر بھی جگہ مل جائے تو بہت بڑی بات ہے۔ اندر تم باہر میں۔"

"تیرا ستیاناس مردود کیا بک رہا ہے۔ میری ٹانگوں کا کیا حال ہے؟" ملکہ بائی نے پوچھا۔ رحیمی اسی لیے یہ کر رہا تھا کہ ملکہ بائی کے ذہن پر کوئی گہرا اثر نہ پڑے۔ اس نے

کہا۔

"ٹھیک ہیں بائی جی!"

"مگر اس ریحانہ اس کتیا کا کیا ہوا؟ مار ڈالا اسے کسی نے یا زندہ ہے وہ ابھی تک؟"

"نہیں بائی جی! آپ کی اجازت کے بغیر بھلا اسے کوئی کیسے مار سکتا تھا۔ اگر آپ حکم دیں تو ہم اس کے پورے بدن کو چکنا چور کر دیں۔ کہاں آپ کہاں وہ۔" ملکہ بائی نے رحیمی کی طرف دیکھا اور بولی۔

"کم بخت تیری تو زندگی ہی اسی مکھن پالش میں گزر گئی ہے۔ ارے میں کہتی ہوں۔ اس کم بخت کو ہوا کیا تھا؟"

"لو بائی جی! ساری عمر گزاری ہزاروں کو نگاہوں کے تیر سے مار دیا اور یہی نہیں سمجھیں کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے۔"

"مطلب کیا ہے تیرا کمینے۔" بائی جی نے پوچھا۔

"ریحانہ بی بی اس لڑکے شاہ زیب سے محبت کرنے لگیں تھیں اور کیا۔"

"محبت --- اس کا مطلب ہے کہ میری پوری زندگی کی تربیت بے کار گئی۔"

"ہاں یہی تو کہتے ہیں۔ تربیت تو آپ کی اپنی بھی نہیں ہوئی بائی جی۔ اب ہمیں دیکھو آپ سے کتنے عرصے سے محبت کر رہے ہیں لیکن کبھی آپ نے ہمیں محبت کی نگاہ سے دیکھا۔"

"دیکھ میری ٹانگوں میں تکلیف ہے ورنہ ابھی اٹھتی اور اتنے جوتے لگاتی تیرے منہ پر کہ تیرا منہ سیدھا ہو جاتا۔" رحیمی ہنسنے لگا۔ ملکہ بائی نے کہا۔

"میری ٹانگوں کا کیا حال ہے؟"

''آپریشن کیا گیا ہے۔ ہڈیاں جوڑ دی گئیں ہیں' ویسے ریحانہ بڑی جاندار لڑ
ہے۔ لوہے کی سلاخ سے آپ کی دونوں پنڈلیاں چکنا چور کر دیں۔''

''دیکھ تو سہی میں اس کا کیا حشر کرتی ہوں۔''

''ایک سوال آپ سے کرنا ہے ملکہ بائی؟''

''ہاں بولو۔''

''ابھی تک ہم آپ کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ پولیس میں رپور
تو کرنی ہوگی۔''

''پولیس میں رپورٹ؟''

''تو اور کیا۔ گرفتار نہیں کرائیں گی ریحانہ بی بی کو۔'' ملکہ بائی سوچ میں ڈو
گئیں۔ بہت دیر تک خاموشی سے سوچتی رہیں پھر بولیں۔

''نہیں۔ اسے گرفتار نہیں کراؤں گی۔''

''میں تو کہتا ہوں کہ کم از کم دس سال کی سزا دلوانی چاہیے آپ کو اسے۔''

''تو کہتا ہے نا۔ تیری شکل پر جھاڑو پھرے دس سال کے لیے اسے جیل کرا دوں او
کوٹھے کو اجڑوا دوں --- ہیں --- پاگل سمجھا ہے تو نے ملکہ بائی کو۔'' ملکہ بائی نے رحیمی
غصے کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ سزا تو ملنی چاہیے اسے۔ اپنی محبت میں اس نے آپ
اپاہج کر دیا۔'' ملکہ بائی کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر تک وہ سوچ
رہی پھر اس نے کہا۔

''تو کیا سمجھتا ہے مجھے رحیمی! کیا سمجھتا ہے تو مجھے؟ تجوری ہے وہ میری سمجھا
تجوری ہے۔ خالی تجوری تھی منہ سے بھر دوں گی اسے لبالب بھر دوں گی منہ تک۔ اتنا

استعمال کروں گی اسے کہ عورت ہی نہیں رہے گی وہ اور جب دیکھوں گی کہ وہ بے مصرف
ہوگئی ہے اور کوئی اسے دو کوڑی میں پوچھنے والا نہیں ہے تو تیزاب میں ڈبو دوں گی حرام
زادی کو۔ خاکستر کر دوں گی۔ ملکہ بائی ہے میرا نام۔ وہ انتقام لوں گی اس سے کہ سارا
عشق ہوا ہو جائے گا۔ ٹھیک ہونے دے مجھے۔ رحیمی ٹھیک ہونے دو۔ پھر دیکھوں گی کہ کیا
کیا جا سکتا ہے۔''

بہر حال ملکہ بائی کے دل میں ظاہر ہے ریحانہ کے لیے شدید نفرت پیدا ہوگئی تھی
لیکن مصلحت پسند عورت تھی۔ جانتی تھی کہ زندگی گزارنے کے صحیح ڈھنگ کیا ہوتے ہیں
لیکن فی الحال تو مشکل میں گرفتار تھی۔

☆☆☆

ایس پی وہاب احمد شیخ نے شاہ زیب کو لاک اپ کر دیا۔ چونکہ شاہ زیب کا ماضی
کافی خطرناک رہا تھا۔ کئی پولیس والوں کا قاتل تھا وہ اور اس نے چودھریوں کے کئی
آدمی مارے تھے۔ یہ بات صیغہ راز میں نہیں تھی۔ چنانچہ ایک خطرناک قاتل کے ساتھ جو
سلوک کیا جاتا ہے وہ شاہ زیب کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں
ڈال کر اسے ایک ایسی کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا۔ جو پولیس ہیڈ کوارٹر میں تھی۔ اور جہاں
مقدمے کے دوران خطرناک قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔ جب تک کہ انہیں جیل ریمانڈ
حاصل نہ ہو جائے۔ اس کے بعد ایس پی وہاب شیخ نے اپنے خاص آدمی کو بلایا جو سب
انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھا۔ اس کا نام زلفی تھا۔ زلفی کو بلانے کے بعد وہاب شیخ نے کہا۔

''زلفی! ویسے تو میں ٹیلی فون پر یہ ساری باتیں کر سکتا تھا مگر تم ایسا کرو خود چلے جاؤ۔
راجہ شہاب الدین کے پاس اور انہیں جا کر بتاؤ کہ شاہ زیب کو گرفتار کر لیا گیا ہے وہ فوراً
یہاں آ جائیں۔''

’’ٹھیک ہے سر جی! میں چلا جاتا ہوں۔‘‘

’’بات اصل میں یہ ہے زلفی کہ راجہ صاحب سے میرا ذاتی سلسلہ ہے۔ تم
لے کر میری کوٹھی پر آ جانا۔ ان سے کہنا کہ ساتھ چلنا بڑا ضروری ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے صاحب جی! ایسا ہی ہوگا۔‘‘ سب انسپکٹر زلفی، راجہ شہاب الد
شاندار کوٹھی میں داخل ہوگیا۔ بڑی مشکل سے اس کی کوٹھی تک رسائی ہوئی تھی۔ کیونکہ
لگتا تھا جیسے راجہ شہاب الدین نے کوٹھی کے گرد فوج لگا رکھی ہو۔ سادہ لباس میں مسلح ا
کوٹھی کے آس پاس بکھرے ہوئے تھے اور ان کی تعداد بھی ساٹھ ستر سے کسی طر
نہیں ہوگی زلفی چونکہ سادہ لباس میں گیا تھا اور یہی ہدایت اسے وہاب شیخ نے کر دی
چنانچہ اسے بڑی مشکلوں کے ساتھ اپنے کاغذات دکھا کر اندر تک رسائی حاصل ک
پڑی تھی جس وقت شہاب الدین کے پاس پہنچا تو وہ اپنے خاص مصاحب اسلم خان
باتیں کر رہا تھا اور اتفاق کی بات کہ موضوع لجیا ہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

’’اسلم خان! ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ ایک لڑکی ہمیں اس طرح جل دے کر
گئی ہے۔ نہ صرف وہ نکل گئی ہے بلکہ اس کے ماں باپ بھی اب اپنے گھر میں نہیں ہیں
یہ آس بھی ختم ہوگئی کہ اب وہ اپنے گھر میں واپس آئے گی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ
زیب نے اسے حاصل کر لیا ہے اور اسے اس کے ماں باپ کے ساتھ کہیں اور رکھ چھو
ہے۔ ممکن ہے وہ لاہور میں ہو۔ الیاس خاں اور جبار خاں بھی اس سلسلے میں کوئی صحیح با
نہیں بتا سکے۔ پہلے یہ بات میرے ذہن میں آئی تھی کہ ممکن ہے کہ شاہ زیب
بھائیوں جہانزیب اور اورنگزیب نے اس خاندان کو اپنے گھر میں پناہ دے دی ہو لیکن
ایسا نہیں ہے کیونکہ بہت سی نگاہیں ان کی طرف ہیں۔ سب سے بڑی بات ان کے رشتے
داروں ہی کی ہیں۔ یعنی الیاس خاں اور جبار خاں جن کے بارے میں یہ سنا گیا ہے کہ

شاہ زیب نے الیاس خاں کے بیٹے کو مار ڈالا ہے، ویسے بھی بڑا خطرناک بندہ ہے یہ۔ سنا
ہے کالج کا اسٹوڈنٹ تھا۔ زرعی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ پھر پتہ نہیں اتنا بڑا
مجرم کیسے بن گیا۔ بندے کو مارنے میں تو اسے کوئی دقت ہوتی ہی نہیں ہے۔‘‘

’’جی شاہ جی---بس بندے کو خراب ہونے میں کونسی دقت ہوتی ہے---اوہو یہ
کون ہے؟‘‘ اسلم خان نے اپنی طرف آنے والے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

’’اوہ یار---یہ چوکیدار---شوکیدار---منہ اٹھا کر بندہ اندر بھیج دیتے ہیں۔ میں
کہتا ہوں آخر اجازت لینا بھی تو ضروری ہے۔‘‘

’’شاہ جی! دیکھو تو سہی یہ ہے کون؟‘‘ کچھ لمحوں کے بعد زلفی ان کے قریب پہنچ گیا
تھا۔ اس نے سلام کیا اور گردن خم کر کے بولا۔

’’میں سب انسپکٹر زلفی ہوں۔ لاہور سے آیا ہوں۔‘‘

’’اچھا اچھا۔ آؤ بھئی بیٹھو بیٹھو۔ خیریت تو ہے۔ یقیناً تمہیں وہاب احمد شیخ نے بھیجا
ہوگا۔‘‘

’’ہاں جی۔ آپ کے لیے خوشخبری لے کر آیا ہوں۔ شیخ صاحب اگر چاہتے تو یہ
خوشخبری آپ کو ٹیلی فون پر بھی سنا سکتے تھے لیکن انہوں نے یہ مناسب نہیں سمجھا۔‘‘

’’کیا بھئی کیا؟ جلدی بول۔‘‘

’’شاہ زیب گرفتار ہوگیا ہے۔‘‘

’’ہیں۔‘‘ راجہ شہاب الدین خوشی سے اچھل پڑا۔ اس کے چہرے پر رونق نظر آنے
لگی تھی۔ بزدل آدمی تھا۔ چاہے اپنے آپ کو جتنا بھی بہادر سمجھتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ
شاہ زیب اس کے لیے حلق کی ہڈی بن گیا تھا اور شاہ زیب کے تصور کے ساتھ ہی اس کا
خون خشک ہونے لگتا تھا۔ بہر حال اس نے جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور سب انسپکٹر کی

طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ لے تیرا یہ خوشخبری سنانے کا انعام بھئی۔ اب ذرا جلدی سے بتا دے۔''

''شاہ جی! اسے ملکہ بائی کے کوٹھے سے پوری پلاننگ کے بعد گرفتار کیا گیا ہے۔''

''اوئے جیوئے اوئے جیو--- بڑی بات ہے بھئی بڑی بات ہے۔ بڑا خطرناک بڑا پکڑا شیخ صاحب نے۔ مجھے تو پتہ تھا کہ وہ ہیں ہی دوسری طرح کے آدمی۔ تو پھر کیا پیغام بھیجا ہے؟''

''شاہ جی! آ جائیں۔ آپ کو کہا ہے۔ ایس پی صاحب نے کہ راجہ صاحب سے کہو کہ فوراً مجھ سے آ کر ملیں۔''

''ہوں کوئی ایسی ہی ضرورت ہوگی جو انہوں نے یہ پیغام بھیجا ہے۔''

''جی شاہ جی--- آپ چاہو تو میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔''

''نہیں--- تم چلو ہم آتے ہیں۔''

''شاہ جی! کہا ہے کہ فوراً آ جائیں۔''

''ہاں فوراً ہی آتے ہیں۔ بھئی کچھ چائے شائے پیو۔''

''نہیں شاہ جی! آپ کی بہت محبت' بہت مہربانی۔''

''دو گن مین لے لے ساتھ کوئی حرج نہیں ہے تنخواہ دیتے ہیں ہم اسے۔ چل جلدی کر۔ دیر پر دیر کئے جا رہا ہے۔'' زلفی کے جانے کے بعد راجہ شہاب الدین نے اسلم خان سے کہا اور اسلم خان نے ایک جیپ لی اور دو گن مین اس میں بٹھا دیئے اور اس کے بعد یہ لوگ شہر چل پڑے۔

راستے بھر راجہ شہاب الدین اسلم خان کے کان کھاتا آیا تھا اور اس کی نگاہیں بھی چاروں طرف بھٹکتی رہی تھیں۔ وہ خوفزدہ تھا کہ کہیں شاہ زیب پولیس کے چنگل سے نکل

اس طرف نہ آ جائے لیکن آخر کار وہ شہر میں داخل ہو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد پولیس ہیڈکوارٹر پہنچ گئے۔ ایس پی وہاب شیخ کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں تو وہ موجود تھے اور تھوڑی دیر کے بعد راجہ شہاب الدین ایس پی وہاب کے سامنے تھا۔

''لو جی مبارک ہو آپ کو۔ آپ کا دشمن آپ کی مٹھی میں آ گیا۔''

''اپنی مٹھی میں کہیں شیخ صاحب' اپنی مٹھی میں۔ ہماری مٹھی تو بہت کمزوری ہوتی ہے۔ اصل میں صحیح طاقت تو آپ کی مٹھی میں ہے۔''

''ہاں۔ میں نے اسے بڑی پلاننگ کے بعد پکڑا ہے۔ بندہ بہت خطرناک ہے اور اب آپ یوں سمجھ لیں کہ سزائے موت کے علاوہ اور کوئی چیز ہی نہیں ہے اس کے لیے۔ اسے جیل بھیجنا ہے کیا سمجھے آپ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری عطا کر دی جائے تو راجہ صاحب آپ کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ مجھے زمیندار بنا دیں گے۔''

''او بھائی اپنے بھائی ہو تم چوہدری بنو گے تو ہمیں ہی خوشی ہوگی۔ ہم ہی ڈھول لے کر وہاں پہنچیں گے۔''

''کہاں---؟'' ایس پی صاحب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''او میاں جی! زمینیں بھی مل جائیں گی۔ اب فوراً ہی ہتھیلی پر بال نہیں اگائے جا سکتے۔ اب تھوڑا انتظار کرو ہم مارکنگ کریں گے اور پھر کہیں نہ کہیں آپ کو تھوڑی بہت زمین دے دیں گے۔ بس ایک بات بتاؤں آپ کو بس اتنی زمین لے لیں کہ اس پر باغ لگائیں۔ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ زمیندار بننے کے بعد جن مشکلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو نہیں ہے۔ آپ تو اچھے خاصے پولیس کے آدمی' آپ کا مزاج الگ ہے۔''

"بھئی بچپن ہی سے زمیندار بننے کا شوق ہے۔ اب جیسے بھی ہو گا یہ شوق تو پورا کرنا ہے۔ پولیس کی زندگی میں آ کر بھی یہ شوق جس حد تک ممکن ہو سکا ہے پورا ہو چکا ہے۔ چلو خیر چھوڑو ملو گے اپنے دشمن سے؟"

"ایں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو جائے گی؟" راجہ شہاب الدین نے کسی قدر سہمے ہوئے لہجے میں کہا اور ایس پی وہاب ہنسنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

"جب بندہ ہماری تحویل میں ہوتا ہے نا تو پھر سمجھ لو کہ اس کی مجال نہیں ہوتی۔"

"ملادو بھائی --- بات کرنے دو اس سے۔"

"ہاں کیوں نہیں آیئے میرے ساتھ۔" ایس پی وہاب شیخ نے کہا۔ حالت تو خراب ہو رہی تھی۔ راجہ شہاب الدین کی لیکن انہوں نے سوچا کہ ذرا اس سے بات ہی کر لی جائے۔ اگر بات اس کی سمجھ میں آ جائے تو ممکن ہے کہ آئندہ کی دشمنی ختم ہو جائے۔ اب کون جانتا ہے کہ پولیس اس پر کب تک قابو رکھ سکے گی یا نہیں رکھ سکے گی۔ بہر حال ایس پی صاحب نے اسے لاکر تک پہنچایا اور بولے۔

"ذرا دور ہی سے بات کرنا۔ میں مصروف ہوں۔ بات کرنے کے بعد میرے آفس میں ہی آ جانا۔"

"ٹھیک ہے۔" شہاب الدین نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ ایس پی صاحب انہیں اس طرح لاک اپ کے سامنے چھوڑ کر چلے جائیں گے ورنہ اسلم خان کو ہی ساتھ لے لیا جاتا۔

بہر حال وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے لاک اپ کے سامنے پہنچ گئے۔ شاہ زیب گھٹنوں میں سر دیئے زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ شہاب الدین تھوڑے فاصلے پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ شاہ زیب کو ادھر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے گردن اٹھا کر راجہ

ب الدین کو دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کے چہرے پر تغیر رونما ہوا لیکن دوسرے لمحے اس اپنے آپ کو نارمل کر لیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا سلاخوں کے آ کھڑا ہوا۔

"سارا --- سارا --- سارا --- سارا کھیل غلط فہمی پر چل رہا ہے شاہ زیب۔ کبھی تم میرے پاس بیٹھ کر مجھ سے بات نہیں کی۔" شاہ زیب کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی راہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

"میں جانتا تھا راجہ صاحب! کہ آخر کار ایک دن آپ مجھ پر قابو پا لیں گے۔ اس خان، جبار خان، فخر خان اور کئی دوسرے میرے بہت سے دشمن مجھے پکڑنے میں کام رہے لیکن راجہ صاحب آپ ان میں ذرا الگ آدمی ہیں۔ جس طرح آپ نے ب تک اپنا بچاؤ کیا ہے میں اس کی داد دیتا ہوں آپ کو۔"

"او یار! پھر بھی تو نے میری ہڈیاں تو کھڑکا ہی دی تھیں۔" راجہ صاحب نے کہا۔

"راجہ صاحب! ساری باتیں اپنی جگہ آپ کے بارے میں مجھے جو معلومات اصل ہوئی ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ آپ رنگین مزاج آدمی ہیں۔ عورت آپ کے لیے کوئی شکل چیز نہیں ہے۔ آپ اپنے وسائل سے کام لے کر نجانے کیا کیا کچھ حاصل کر چکے ہیں لیکن ایک بات کہوں میں آپ سے۔ میں بہت دکھی انسان ہوں۔ سب سے پہلے مجھے میرے بھائیوں اور بھابیوں نے ٹھکرا دیا۔ زمانے کی ٹھوکروں میں آیا تو ماں کی یادوں کو سینے سے لگائے ماں کی ایک خواہش کی تکمیل کرنا چاہی یعنی ان زمینوں کو آباد کرنے کی خواہش جس کا اظہار ایک بار ماں نے اپنی زندگی میں کیا تھا۔ ماں کی محبت نے مجھے اس بات کے لیے مجبور کر دیا کہ وہ لوگ جو اس علاقے میں بھٹہ بنانا چاہتے تھے اور جس زمین کو میں نے گل گلزار بنانے کا وعدہ کیا تھا اپنی ماں سے۔ وہاں آگ بکھیرنا

چاہتے تھے۔ میں نے بس اسی لیے روکا تھا انہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں راجہ صاحب کہ مجھے
جرم کی دنیا میں دھکیلا گیا تھا۔ میں فطری طور پر مجرم نہیں تھا۔ میں تو ایک کسان بننا چاہتا
تھا۔ زمینوں کو آباد کرنے کا خواہش مند تھا میں۔ مگر مجھے خونی اور قاتل بنا دیا گیا۔
خیر انسان کی زندگی لینا کوئی اچھی بات نہیں ہے مگر میں نے مجبور ہو کر یہ سب کچھ کیا
اور اس کے بعد میرے سینے میں محبت کی کونپل پھوٹی اور راجہ صاحب میں جانتا تھا کہ میں
محبت کے قابل نہیں ہوں۔ جو جرم نہ کرنے کی خواہش کے باوجود مجھ سے ہو گئے تھے۔
ان کے بارے میں مجھے بھی اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ قابل معافی نہیں ہیں۔ میری
زندگی کی انتہا ہو چکی ہے۔ بس جب تک بچھڑے کی طرح اچھلتا پھر رہا ہوں اس وقت
تک اچھل رہا ہوں۔ جب گرفت ہو گی تو میرا بچ نکلنا ناممکن ہو جائے گا۔ یہ بات میں
اچھی طرح جانتا تھا۔

لیکن کیا کرتا راجہ صاحب! ایک آواز نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھ سے شادی کر لے۔
میرے ماں باپ کی مشکل دور ہو جائے گی۔ بڑا الھڑ پن تھا اس آواز میں۔ بڑی آرزو تھی
راجہ صاحب وہ آواز میرے سینے میں اتر گئی۔ میں لجیا سے محبت کرنے لگا۔ آپ کے
بارے میں مجھے علم ہو چکا تھا کہ آپ لجیا کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ بس راجہ صاحب آپ
یوں سمجھ لیجئے کہ اس محبت نے مجھے آپ کے ساتھ جو کچھ بھی کرنے پر مجبور کر دیا اور
بہرحال لجیا آپ کے قبضے میں پہنچ گئی۔ شادی تو اس سے میں ویسے بھی نہیں کرنا چاہتا
تھا۔ بھلا ایک معصوم سی لڑکی سے شادی کر کے میں اسے سہاگن بننے سے پہلے بیوہ کرنا تو
نہیں چاہتا تھا مگر محبت ضرور ہو گئی تھی مجھے اس سے اور بس آپ یہ سمجھ لیجئے کہ اب تک
جتنے وار میرے ہاتھوں ہوئے۔ وہ اسی محبت کا نتیجہ تھے۔ راجہ صاحب میں نہیں جانتا کہ
آپ نے اس کے ساتھ کیا کیا لیکن--- لیکن راجہ صاحب! ہر شخص کسی سے کچھ کہنے کی

حیثیت تو رکھتا ہے۔ ماننا نہ ماننا دوسرے کا کام ہے۔ راجہ صاحب! اگر آپ نے اسے
بے آبرو نہیں کیا ہے تو اسے چھوڑ دیجئے۔ اسے اس کے ماں باپ تک پہنچا دیجئے۔ بس
میں بھلا آپ کو کیا صلہ دے سکوں گا۔ معمولی سی بات ہے ہو سکے تو اس لڑکی کو آبرو دے
دیجئے اور اگر آپ اسے تباہ کر چکے ہیں تو آپ کی مرضی۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔''
کچھ ایسے ہولے ہولے لہجے میں یہ الفاظ کہے گئے تھے کہ راجہ شہاب الدین کے
بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ فطری طور پر بہت برا انسان تھا وہ لیکن یہ بھی تاریخ
میں درج ہے کہ انسان انتہائی برا ہونے کے باوجود ہے انسان ہی ہوتا ہے اور کوئی معمولی
سی بات اس پر اس طرح اثر انداز ہو جاتی ہے کہ پھر اس کی شیطنت قائم نہیں رہتی۔ وہ سچ
سچ انسان بن جاتا ہے اور راجہ شہاب الدین بھی اپنے اندر ایک شدید گڑگڑاہٹ محسوس
کرنے لگا تھا۔ اسے سردی لگنے لگی تھی۔ ایسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ برف میں دبا ہوا ہو۔
اس کا دماغ سن ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ لمحے وہ خاموش رہا اور اس کے بعد وہ وہاں سے واپس
پلٹ پڑا۔ اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ اسلم خان نے اس کی کیفیت کو محسوس کیا
اور بولا۔

''خیریت چوہدری جی! کیا بات ہے؟ طبیعت خراب ہو گئی ہے کیا؟ اس حرامی نے
کوئی حرکت تو نہیں کی ایسی۔ برا بھلا کہا ہو گا۔ گالیاں دی ہوں گی آپ کو۔ تبھی آپ کی یہ
حالت ہو گئی ہے۔''
''آؤ---'' راجہ شہاب الدین نے کہا اور واپس ایس پی کے آفس کی جانب چل
پڑا۔ اس کے قدموں میں لرزش تھی۔ اس نے اسلم خان سے کہا۔
''میرا بازو پکڑ لو۔ بڑی طبیعت خراب ہو رہی ہے میری۔''
''یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔''

"بلکہ ایسا کرو مجھے لے جا کر گاڑی میں بٹھا دو اور ایس پی وہاب شیخ سے کہو کہ اچانک ہی میری طبیعت بگڑ گئی ہے۔ میں دوبارہ ان کے پاس آؤں گا۔ اس وقت شہر میں ہی ہوں۔ ہم کسی ہوٹل میں چلیں گے۔ ایس پی صاحب کو اس بارے میں اطلاع دے دیں گے۔"

"ٹھیک ہے آیئے۔" اسلم خان نے راجہ شہاب الدین کو گاڑی تک پہنچایا۔ جس میں بیٹھ کر وہ یہاں تک آیا تھا۔ راجہ شہاب الدین کے دونوں گن مین اس کے قریب کھڑے ہو گئے اور اسلم خان ایس پی صاحب کے سلسلے میں چل پڑا۔

جب وہ ایس پی کے آفس میں پہنچا تو وہاں ایس پی کے اردلی نے ان سے ملاقات کی اور اسلم خان سے کہنے لگا۔

"شیخ صاحب کہہ گئے ہیں کہ جب آپ لوگ واپس آئیں تو آپ کو بتا دیا جائے کہ اچانک ہی ڈی آئی جی صاحب کے پاس طلبی ہو گئی ہے اور ایمرجنسی میں جانا پڑا ہے۔ صاحب کہہ گئے ہیں کہ وہ آپ سے جلد ہی ملاقات کریں گے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" اسلم خان نے کہا اور وہاں سے پلٹ پڑا۔ لینڈ کروزر میں جا کر اس نے راجہ شہاب الدین کو ساری تفصیل بتائی۔ راجہ صاحب کی کیفیت کچھ بہتر تو ہو گئی تھی لیکن اپنے سارے وجود میں وہ شدید سنسناہٹ محسوس کر رہے تھے اور ان کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا۔

"کسی اچھے سے ہوٹل چلو۔" انہوں نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک ہوٹل میں پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا کہ کرائے پر کمرہ حاصل کیا جائے۔ فور اسٹار ہوٹل میں راجہ صاحب کے لیے ایک کمرہ اور دوسرا کمرہ گن مینوں کے لیے حاصل کر لیا گیا۔ راجہ صاحب نے کہا تھا کہ وہ کچھ وقت کے لیے یہاں رکیں گے۔

بہر حال یہ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن راجہ شہاب الدین پر اس خوبصورت نوجوان کا ٹوٹا ہوا لہجہ اور اس کے غم میں ڈوبے ہوئے الفاظ بری طرح سے اثر انداز ہوئے تھے۔ کمرے میں تنہا لیٹ کر وہ اس آواز کو سنتے رہے جو ان سے بڑے درد بھرے انداز میں کہہ رہی تھی۔

"راجہ صاحب! بس مجھے محبت ہو گئی ہے اس سے۔ میں اسے سہاگن بنانے سے پہلے بیوہ نہیں بنانا چاہتا تھا لیکن محبت کا کیا کیا جائے۔ ہو سکے تو اسے بے آبرو نہ کیجئے۔ راجہ صاحب--- راجہ صاحب--- راجہ صاحب---"

اچانک ہی انہیں اپنی آنکھوں کے دونوں سروں سے ایک گرم گرم سیال بہنے کا احساس ہوا۔ یہ آنسو جب آنکھوں تک پہنچ جائیں اور باہر نکل جائیں تو سمجھو کہ انسان کے دل کی دنیا نرم ہو گئی۔ وہ سختی، وہ پتھریلا پن ختم ہو گیا اور جب دل سے پتھر کی تہہ ختم ہو جائے تو انسان کسی حد تک انسان ضرور ہوتا ہے۔ راجہ صاحب بے اختیار رو پڑے۔

"کیا کچھ نہیں کیا ہے میں نے زندگی میں۔ کیا کچھ نہیں کیا ہے واقعی۔ سنگدلی کی انتہا ہو گئی۔ حد ہو گئی تھی۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا مجھے۔ میرا اپنا بھی تو گھر ہے۔ اپنے بھی تو بیوی بچے ہیں۔ آہ--- سب کے ساتھ ناانصافی کی میں نے۔ کل بچے بڑے ہو جائیں گے کیا سوچیں گے وہ اپنے باپ کے بارے میں۔ بہت برا کیا ہے میں نے واقعی۔ بہت ہی برا کیا ہے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ انہیں خود اپنے رونے پر حیرانی تھی۔

کیا ہو گیا تھا نجانے کیا ہو گیا تھا۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا لیکن بڑی تبدیلیاں محسوس کر رہے تھے وہ کہ یہ آنسو جب آنکھوں سے باہر نکل جاتے ہیں تو دل کو کتنا فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ احساس انہیں پہلی بار ہوا تھا اور وہ دل کی کیفیات پر غور کر رہے تھے۔ بہت دیر تک یہ احساسات دل و دماغ پر حاوی رہے اور دیوار قائم ہوتی رہی۔ پھر وہ ایک گہری سانس

لے کر اپنی جگہ سے اٹھے اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے۔ پہلی بار ان کے دل سے آواز نکلی۔

معبود کریم! پتہ نہیں کیوں انسان کو اپنے گناہوں کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ احساس وقت سے پہلے ہو جانا چاہیے۔ اگر یہ احساس ہو جائے تو کم از کم دوسروں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ بہر حال نجانے کب تک وہ گناہوں کے احساس تلے دبے رہے تھے۔ دوسری صبح انہوں نے اسلم خان سے کہا۔

''اسلم خان! شاہ زیب کو آزاد ہونا چاہیے۔'' اسلم خان نے اپنے کان میں زور سے انگلی گھمائی اور بولا۔

''کیا کہہ رہے ہیں شاہ جی؟''

''برا ہوا یار! بہت برا ہوا۔ جلد بازی میں بڑا غلط قدم اٹھا بیٹھے۔''

''کیسا غلط قدم شاہ جی؟''

''شاہ زیب! اب پولیس کے چنگل سے نہیں نکل سکتا۔ بڑا مشکل ہو جائے گا اس کے لیے۔''

''لیکن اسے رہائی کیوں دلانا چاہتے ہیں آپ؟''

''یار! زیادتی ہوئی ہے اس کے ساتھ۔ تم ذرا غور کرو۔ اس کا ماضی دیکھو وہ برا انسان نہیں تھا۔ وہ تو ایک اچھا نوجوان تھا۔ جو زرعی تعلیم حاصل کر کے اپنے دیس' اپنے وطن کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن اسے جرم کی طرف دھکیل دیا گیا۔ اس کے ساتھ زیادتی کی گئی اور آخر کار وہ مجرم بن گیا۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔ کوئی اچھے انداز میں جینا چاہے اور اس سے اس کی اچھائیاں چھین لی جائیں اور اسے مجرم بنا دیا جائے۔''

''آپ کے اندر یہ تبدیلی کسی خاص وجہ سے رونما ہوئی ہے شاہ جی! کوئی خاص

بات سوچی ہے آپ نے؟''

''یار! بس سمجھ لے ضمیر جاگ اٹھا ہے۔''

''مگر اب کیا ہو سکتا ہے شاہ جی! اس نے پولیس والے بھی قتل کیے ہیں۔ الیاس خاں کا بیٹا بھی مارا ہے اور کئی بندے مارے ہیں۔ اتنے لوگوں کے قاتل کو کیا آزادی مل سکتی ہے؟''

''آزادی تو نہیں مل سکتی لیکن --- لیکن یار میں تو دلدل میں پھنس گیا۔''

''شاہ جی! اپنے آپ کو سنبھالئے ویسے بھی اب کچھ نہیں ہو سکتا اور پھر شاہ زیب شاید گرفتار نہ ہوتا یہ تو ہماری ہی کوشش کے صلے میں گرفتار ہوا ہے۔''

''ہوں یار! ایک مسئلہ ہے مدد تو کرنی پڑے گی اس کی۔''

''مگر شاہ جی! کیا مدد کریں گے آپ اس کی؟''

''دیکھو--- میں اگر چاہوں تو وہاب شیخ سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ وہ کچھ کرے لیکن یہ مناسب نہیں ہوگا۔ اگر میں نے ایسا کہا تو وہاب شیخ کر تو کچھ نہیں سکے گا کیونکہ بات پولیس والوں کے بھی قتل کی ہے۔ لیکن وہ میری طرف سے ہوشیار ہو جائے گا۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ اسے جنوبی علاقے کی زمین دے دیتا ہوں۔ وہ زمین دیکھنے میں تو اچھی ہے لیکن نتیجتاً اس میں پتھر کی چٹانیں ہیں۔ کئی بار کوشش کر چکے ہیں ہم لیکن وہاں کام نہیں ہو سکا۔ بس چھوٹی موٹی سبزی وغیرہ اگ آتی ہے۔ میں نے جو کام کرا لیا ہے اس سے اسے اس کا معاوضہ تو دینا پڑے گا لیکن در پردہ ہم شاہ زیب کی مدد کریں گے۔ جو کچھ بھی بن پڑا کریں گے۔ دیکھو اللہ کی کیا مرضی ہے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔''

''شاہ جی! سوچ سمجھ لیں بات بالکل الٹ ہو جائے گی۔''

''نہیں ہو گی۔ اگر میں نے تجھے اپنا راز دار بنا لیا ہے تو اس بات کو سمجھ لینا کہ اگر یہ

بات کہیں نکل گئی تو پھر یہ زبان تیرے منہ کے اندر نہیں رہے گی۔ سمجھ رہے ہونا۔''

''ارے نہیں، نہیں شاہ جی! اسلم خان کی طرف سے بالکل بے فکر رہو۔ جدھر تمہارا رخ ہوتا ہے۔ اسلم خان کا رخ بھی اسی طرف ہوتا ہے۔ آپ کا آزمایا ہوا بندہ ہوں میں۔''

''ہاں یہی میں چاہتا ہوں۔''

''تو پھر اب حکم کرو شاہ جی!''

''کچھ نہیں وہاب شیخ سے ملاقات کرتے ہیں۔ کل تو وہ چلا ہی گیا تھا۔''

''ٹھیک ہے شاہ جی! آپ جیسا مناسب سمجھو۔'' وہاب شیخ نے خود ہی ٹیلی فون پر ان سے رابطہ قائم کیا اور بولا۔

''ہاں جی۔ کیا پروگرام ہے آپ آ رہے ہو یا میں آ جاؤں؟''

''میں آ رہا ہوں۔'' شہاب الدین نے کہا اور پھر یہ لوگ پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے۔ وہاب شیخ نے معمول کے مطابق ان کا استقبال کیا۔

''ہاں شاہ جی! کام ہو گیا مبارک ہو۔ ویسے میں آپ کو بتاؤں بڑا صحیح بندہ پکڑا ہے ہم نے۔ میری تو بڑی تعریف ہو گی کیونکہ اس سے پہلے وہ کئی پولیس والوں کو مار چکا ہے۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔''

''شاہ جی! اب آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے آپ میرے کام کی بات کرو۔''

''تمہارا کام تو طے ہے شیخ! جب بھی فرصت ہو آ جانا۔ کاغذات دے دوں گا۔ رجسٹری کرا لینا۔ زمین میں نے منتخب کر لی ہے۔ تم ان میں باغ لگواؤ۔ ترکاریاں لگواؤ۔ کھیت لگواؤ۔ مزارعے تمہیں وہیں سے مل جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے شاہ جی! تم نے جو کچھ کیا ہوگا۔ اچھا ہی کیا ہوگا۔ بس بات ہو گئی۔ مت مل جائے تو پہنچ جاؤں گا تمہارے پاس۔ اس کے لیے کوئی اور حکم ہو تو بتاؤ۔''

''ملنا چاہتا ہوں میں اس سے۔''

''کل ملے تھے کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں کی؟''

''نہیں بالکل نہیں۔'' شہاب الدین نے کہا۔

''تو میں اردلی بلوا کر آپ کو بھجوائے دیتا ہوں وہاں۔''

تھوڑی دیر بعد راجہ شہاب الدین سلاخوں والے دروازے کے سامنے موجود تھا۔ پیچھے شاہ زیب کھڑا ہوا تھا۔

''کہیے راجہ صاحب! میری بے بسی کا تماشا دیکھ کر اپنے آپ کو تسکین دینے کے لیے آتے ہیں آپ۔''

''نہیں۔ کل تو میں واقعی تم پر طنز کرنے کے لیے آیا تھا شاہ زیب! لیکن آج راجہ شہاب الدین بالکل ہی ایک بدلہ ہوا انسان ہے۔ شاہ زیب! میں تم سے جو باتیں کرنا چاہتا ہوں تم سمجھ رہے ہو کہ اس وقت ان میں فریب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم خاصی بڑی مشکل میں گرفتار ہو گئے ہو۔ کچھ باتیں تمہارے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ مناسب سمجھو تو ان پر یقین کر لینا۔'' شاہ زیب خاموشی سے راجہ شہاب الدین کی صورت دیکھنے لگا۔ شہاب الدین نے کچھ لمحے توقف کے بعد کہا۔

''مجھے بہت شدت کے ساتھ یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں ایک انتہائی گنہگار اور بدکردار انسان ہوں شاہ زیب! تمہیں تمہاری ان کاوشوں سے کچھ ملے یا نہ ملے لیکن یہ اعزاز تمہیں ہی حاصل ہے کہ ایک بہت بڑے انسان کو تمہاری وجہ سے سیدھا راستہ نظر آ گیا شاہ زیب! میں ایک اوباش طبع اور آوارہ مزاج آدمی تھا۔ تھا کا لفظ میں خاص طور

سے استعمال کر رہا ہوں۔ کل تم سے گفتگو کرنے کے بعد میں نے تمام حالات پر غور کیا
مجھے ایک دم احساس ہوا کہ سب کچھ کیا دھرا میرا ہی ہے۔ برا انسان میں ہی ہوں کوئی او
نہیں ہے۔ شاہ زیب! ساری برائیوں کو ایک طرف ڈالو مجھے اس بچی کے ساتھ یہ سلوک
نہیں کرنا چاہئے تھا۔ سب سے پہلی بات میں تمہیں یہ بتاؤں۔ واحدہٗ لاشریک کی قسم
میں نے اسے بے آبرو نہیں کیا۔ وہ ایک عزت دار کنواری لڑکی ہے کیونکہ تمہارے خوف
سے میں نے اسے لاہور بھجوا دیا تھا۔ وہاں اسے ہم نے ایک مکان میں رکھا لیکن موقع
کر وہ وہاں سے فرار ہوگئی۔ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ جب تمہارا خطرہ ختم ہو جائے
گا تو میں اسے واپس بلالوں گا اور اس کے ساتھ رنگ رلیاں مناؤں گا لیکن وہ اس سے
پہلے ہی میرے چنگل سے نکل گئی۔ جب تم نے میرے سلسلے میں سخت ہنگامہ آرائی کی تو
میں نے اسے آزاد کرنے کے بارے میں سوچا لیکن اس وقت وہ یہاں موجود نہیں تھی۔
میرا کوئی بھی آدمی نہیں بتا سکا کہ وہ کہاں گئی۔ میں نے قسم کھائی ہے بس اس کے علاوہ
میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے تمہیں دکھانے کے لیے۔ تمہاری گرفتاری میرے ذریعے
عمل میں آئی۔ خاص طور سے میں تمہیں یہ بتا دوں کہ ملکہ بائی میرے ساتھ ملوث رہی اور
کوئی ملوث نہیں ہے۔ یہ دو باتیں ہوئیں شاہ زیب! تیسری بات یہ ہے کہ میں ایک
بدلے ہوئے انسان کو لے کر واپس اپنے گھر جا رہا ہوں۔ تمہارے لیے صرف یہ دعا
کر سکتا ہوں کہ کاش! معبود عالم! کوئی ایسا معجزہ دکھا دے کہ تمہاری زندگی بچ جائے
لیکن ایک بات اپنے ذہن میں رکھو اگر لجیا مجھے مل گئی تو خدا کی قسم! میں اسے اپنی بیٹی کی
نگاہ سے دیکھوں گا۔ اتنی ہی مدد کروں گا اس کی اور ساری زندگی اس کی خدمت میں گزار
دوں گا۔ کاش اس کے ماں باپ بھی مجھے مل جائیں جواب اپنی جگہ نہیں ہیں۔ بس یہ چند
باتیں تم سے کہنا چاہتا تھا۔"

"نیز یہ کہ منظر عام پر آ کر نہیں کیونکہ ایس پی وہاب کو میں نے ہی تمہاری گرفتاری
کے لیے آمادہ کیا تھا۔ اب میں اگر اپنے اس بدلے ہوئے رویے کا اظہار کروں تو وہ
میری جانب سے مشکوک ہو جائے گا اور میں وہ نہیں کر سکوں گا جو کرنا چاہتا ہوں۔ تو
مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں کسی بھی طرح پولیس کے چنگل سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔
یہ چند باتیں کر کے تم سے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ اللہ پر یقین کرتے ہو تو میری بات
پر بھی یقین کر لینا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ غلط نہیں ہے۔ میرا دل و دماغ' ذہن سب
کچھ بدل گیا ہے۔ کوئی اور حکم ہو میرے لیے تو بتاؤ۔"

شاہ زیب گہری نگاہوں سے راجہ شہاب الدین کا جائزہ لے رہا تھا۔ تعلیم یافتہ
نوجوان تھا۔ بیوقوف نہیں تھا۔ یہ اندازہ تھا کہ اللہ تعالیٰ جب انسان کے دل میں نیکی ڈالتا
ہے تو پھر وہ ایک اچھا انسان ہی بن جاتا ہے اور اس وقت راجہ شہاب الدین جس لہجے
میں بات کر رہا تھا اور جو الفاظ اس کی زبان سے ادا ہو رہے تھے۔ ان سے سو فیصدی یہی
اندازہ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں نیکیاں ڈال دی ہیں۔ چلو اور کچھ نہ سہی تو
کم از کم یہ تو ہے کہ اس کے بعد بہت سے گھرانے' بہت سی لڑکیاں راجہ شہاب الدین کی
برائیوں سے محفوظ رہیں گی۔ راجہ شہاب الدین' شاہ زیب کو دیکھ رہا تھا۔ شاہ زیب نے
مدھم لہجے میں کہا۔

"راجہ صاحب! جس طرح آپ نے اس وقت خلوص دل سے اور اس وقت اس
بات کا اظہار کیا جب میں ایک بے بس انسان کی حیثیت سے آپ کے سامنے کھڑا ہوں تو
بہرحال جہاں تک میرا تجربہ ہے۔ یہی اندازہ ہوتا ہے مجھے کہ آپ واقعی بدل گئے ہیں
اور اللہ کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے ارادوں میں
مضبوط رکھے۔ آپ نے جتنا کچھ کہہ دیا ہے بس اتنا کافی ہے۔ لجیا مل جائے تو اس سے

اتنا ضرور کہہ دیجئے گا کہ میرے دل میں اس کی محبت تھی ہے اور رہے گی۔ بس باقی اس کی تقدیر۔ بس جہاں تک اس کے والدین کا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں بھی محفوظ رکھے۔''

شاہ زیب نے مکمل طور پر یہ مناسب نہیں سمجھا تھا کہ راجہ شہاب الدین کو حیدر شاہ کا حوالہ دے۔ وہ ایک الگ ہی مسئلہ تھا لیکن بہرحال راجہ شہاب الدین کے الفاظ سے اسے نجانے کیوں ایک ذہنی سکون حاصل ہوا تھا۔ شہاب الدین نے کہا۔

''میں واپس جا رہا ہوں لیکن یہ سمجھ لینا کہ میں تم سے منسلک رہوں گا اور جہاں بھی تمہارے مفاد کے لیے کوئی بہتر ذریعہ میرے پاس آیا۔ اس سے گریز نہیں کروں گا۔ خدا حافظ۔''

پھر راجہ شہاب الدین وہاں سے واپس چل پڑا۔

☆☆☆

جہانزیب اور اورنگزیب کی زندگی معمول کے مطابق تھی۔ دنیا کب کسی کو یاد رکھتی ہے بھائی کے لیے انہوں نے جو کچھ کیا تھا اس پر کبھی کبھی دل کو احساس ہوتا تھا اور وہ دکھی ہو جاتے تھے۔ اب شاہ زیب کے لیے کچھ کرنا خود ان کے اپنے بس کی بات نہیں تھی۔ ہاں ضمیر بے شک مجرم تھا اور یہ مجرم ضمیر احساس دلاتا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے برا ہوا ہے۔ لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ بس وہ ایک یاد رہ گیا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

بچپن کی بہت سی یادیں ایسی ہوتی ہیں جسے انسان زندگی بھر کوشش کے باوجود نہیں بھلا سکتا۔ اس وقت بھی جہانزیب شاہینہ کے ساتھ بیٹھا ہوا مختلف موضوعات پر باتیں کر رہا تھا کہ اورنگزیب اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور اس وقت وہ سخت بدحواس نظر آ رہا تھا۔ شدید جذباتی ہو رہا تھا وہ۔ اس لیے اس نے شاہینہ کا خیال بھی نہیں کیا اور بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بھائی صاحب--- بھائی صاحب--- شاہ زیب گرفتار ہو گیا ہے۔ شاہ زیب گرفتار کر لیا گیا۔''

جہانزیب کے دل کو ایک دھکا سا لگا تھا۔ وہ دیر تک اورنگزیب کی صورت دیکھتا رہا پھر اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

''گرفتار ہو گیا؟''

''ہاں بھائی صاحب! وہ گرفتار ہو گیا۔''

''کیسے؟''

''ایس پی وہاب نے اسے گرفتار کیا ہے۔''

''تمہیں یہ اطلاع کہاں سے ملی؟''

''پولیس ہیڈ کوارٹر سے ہی مجھے یہ خبر دی گئی ہے کہ شاہ زیب گرفتار ہو چکا ہے۔ ہم اس کے سلسلے میں اگر کوئی کارروائی کرنا چاہتے ہیں تو کر سکتے ہیں۔''

جہانزیب نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ شاہینہ گہری نگاہوں سے دونوں بھائیوں کو دیکھ رہی تھی جہانزیب کچھ دیر بیٹھا رہا پھر بولا۔

''کچھ تفصیلات معلوم ہوئیں؟''

''نہیں ابھی نہیں۔''

''کہاں ہے؟''

''لاہور میں ہے۔''

''ہوں۔ پھر کیا کہتے ہو؟''

''بھائی--- بھائی صاحب لاہور چلتے ہیں۔ معلومات کرتے ہیں۔ وکیلوں سے رابطہ کرتے ہیں۔ دیکھیں کیا کیا جا سکتا ہے اس کے لیے۔'' جہانزیب خاموش ہو گیا تھا۔

اتنی دیر میں شکیلہ بھی اندر آ گئی۔

''کیا ہوا ہے---ہیں کچھ الفاظ میرے کانوں میں پڑیں ہیں کیا ہوا ہے؟'' کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو شکیلہ نے کہا۔

''آپ لوگ مجھے آخر سمجھتے کیا ہیں۔ گھر کے معاملات سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں پوچھ رہی ہوں کیا ہوا ہے؟ کچھ شاہ زیب کی باتیں ہو رہی تھیں۔''

''شکیلہ! وہ گرفتار ہو گیا ہے۔'' اورنگزیب نے بدستور بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور شکیلہ کا چہرہ بھی پتھرا گیا۔

''چلئے اچھی بات ہے۔ یہ تو خوشخبری ہے آپ سب کے لیے۔ چودھریوں کے معاملات بڑے ہی ہوا کرتے ہیں۔ اب اس کے حصے کی تمام زمینیں آپ کو مل جائیں گی۔ مبارک ہو۔''

جہانزیب نے نگاہیں اٹھا کر شکیلہ کو دیکھا۔ شاہینہ کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ شکیلہ کی آنکھوں سے آنسو لڑھک پڑے اور وہ آنسو پونچھتی ہوئی باہر نکل گئی۔ شاہینہ نے کہا۔

''شکیلہ کو واقعی شاہ زیب سے بہت زیادہ محبت تھی۔''

''شاہینہ! تم جاؤ۔ براہ کرم تم جاؤ۔ ہمیں کچھ سوچنے کا موقع دو۔''

''جاتی ہوں۔ میں کون سا آپ لوگوں کے سر پر سوار ہو رہی ہوں۔'' شاہینہ نے کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی لیکن اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ سیدھی ٹیلی فون کے پاس پہنچی تھی، اور اس نے الیاس خاں کے نمبر ڈائل کیے تھے۔ جبار خاں نے فون ریسیو کیا۔ آواز آئی۔

''کون؟''

''جبار بھائی! میں شاہینہ بول رہی ہوں۔''

''ہاں شاہی! کہو خیریت سے تو ہو؟''

''بالکل خیریت سے ہوں۔ ایک خوشخبری ہے آپ کے لیے۔''

''کیا؟'' جبار خاں نے پوچھا۔

''شاہ زیب گرفتار ہو چکا ہے۔''

''کیا؟''

''ہاں۔''

''کیسے معلوم ہوا؟''

''ابھی ابھی اورنگزیب کو اس بارے میں اطلاع ملی ہے۔''

''کہاں سے؟''

''لاہور سے۔''

''کس نے اطلاع دی؟''

''شاید پولیس ہیڈ کوارٹر نے۔''

''اچھا اچھا۔ تب تو صحیح اطلاع ہو گی۔ دونوں بھائیوں کو پتہ چل گیا؟''

''ہاں ابھی ابھی۔ کچھ لمحے پہلے۔''

''بہرحال پولیس کے چنگل سے نکل نہیں سکے گا وہ۔ ایسا کرتا ہوں میں الیاس لالا سے بات کر کے کوئی فیصلہ کرتا ہوں۔ تم نے اطلاع دے دی تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ دیکھ لیجئے یہ لوگ اس کے لیے وکیل کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔''

''سب کو دیکھ لیں گے۔ اول تو پولیس ہی اس کو سزا دینے کے لیے کافی ہے۔''

''ٹھیک ہے بھائی پھر خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔''

شاہینہ نے فون بند کر دیا اور اس کے بعد سوچنے لگی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔

☆☆☆

الیاس خاں نے جبار خاں کے منہ سے شاہ زیب کی گرفتاری کی خبر سنی تو اس کا چ ایک دم سے سرخ ہو گیا۔

''میرے بیٹے کا قاتل یقیناً وہ پولیس کی تحویل میں ہوگا لیکن جبار خاں! یہ تو کو بات نہ ہوئی۔ ہم لوگوں کو پہلی بار ایک لڑکے سے شکست ہوئی ہے۔''

''شکست؟''

''تو اور کیا۔ کیا کہو گے تم اسے؟ ہم اسے گرفتار نہیں کر سکے۔ حالانکہ اس سے پہ ہم نے ہمیشہ اپنا کام خود کیا ہے۔ اپنی جنگ خود لڑی ہے۔ اپنی آگ خود بجھائی ہے لیک اس بار ہم شکست کھا گئے۔ میں اپنے بیٹے کے قاتل کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ آج بھی میری روح تڑپتی ہے۔ اپنے بچاؤ کو یاد کرتی ہے اور میرا دل جیسے کوئی مٹھی میں جکڑ لیتا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا بیٹا! مجھ سے سوال کر رہا ہو۔ ابا! مجھے اتنی آسانی سے مار دیا گ اور تو نے کچھ نہ کیا؟ کچھ بھی نہ کیا تم نے ابا۔ ایسا تو پہلے نہیں ہوتا تھا۔ تم تو ہمیشہ میرے سامنے ہوتے تھے۔ میرے ہر مسئلے کے شریک لیکن اب--- لیکن اب تم قاتل تک کو نقصان نہیں پہنچا سکے۔ کیوں ابا کیوں؟'' الیاس خاں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور جبار خاں کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''نہیں' ایسی بات ہے تو کچھ سوچنا پڑے گا' کچھ کرنا پڑے گا۔''

''کیا کر سکتے ہو تم؟''

''جو بھی کر سکتے ہیں کریں گے بھائی! وہ ہمارا مجرم ہے اسے پولیس نہیں ہم سزا دیں گے۔''

''مگر کیسے؟'' الیاس خاں نے سوال کیا اور جبار خاں سوچ میں ڈوب گیا پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔

''مکاری سے کام لینا ہوگا' مکاری سے۔''

''کیا مطلب--- کیسی مکاری؟''

''ایسا کرتے ہیں خاں جی! ہم دونوں فوراً چلتے ہیں جہانزیب اور اورنگزیب کے پاس بات کرتے ہیں اس سے۔ ان سے کہیں گے کہ اعلیٰ پائے کے وکیل کیے جائیں اور جس طرح بھی ممکن ہو سکے شاہ زیب کی زندگی بچائی جائے۔ ہم بالکل مکاری کے کھیل کھیلیں گے اور ان کے شانہ بشانہ مل کر کوشش کریں گے۔ پھر اس کے بعد شاہ زیب کو ان کے چنگل سے نکال لیں گے۔''

''مشکل ہے جبار خاں! بات اگر پولیس والوں کے قتل کی نہ ہوتی تو اس بات کے امکانات تھے کہ ہم کچھ کر ڈالتے۔''

''بھائی جان! یہ وکیل جو ہوتے ہیں ناں۔ بڑے پائے کے لوگ ہوتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی نقطہ نکال لیں گے۔ اسے پولیس کے چنگل سے نکالنے کا۔ ہم اعلیٰ درجے کے وکیل کریں گے۔ جب بات انتقام کی ہے تو آپ یہ سمجھ لو کہ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔''

''اگر ایسی بات ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ تیاریاں کرو چلتے ہیں۔'' اور دونوں بھائی تیاریاں کرنے لگے۔ ان کی گاڑیاں گن مینوں کے ساتھ کبیر والا چل پڑیں۔ کبیر والا کی حویلی میں ایک سوگ سا طاری تھا۔

ابھی جہانزیب اور اورنگزیب روانہ نہیں ہو سکے تھے۔ بلکہ اس سلسلے میں آپس م
مشورے ہی کر رہے تھے کہ جبار خاں اور الیاس خاں بھی وہاں پہنچ گئے۔ فوراً
جہانزیب اور اورنگزیب کو ان کی آمد کی اطلاع مل گئی۔ دونوں حیران و پریشان باہر نک
آئے۔ شاہینہ بیگم بھی پیچھے ہی پیچھے آ گئی تھیں۔ جہانزیب اور اورنگزیب سکتے کے عا
میں الیاس خاں اور جبار خاں کو دیکھ رہے تھے۔ تعلقات چونکہ اتنے کشیدہ ہو گئے تھے ک
ان لوگوں کی آمد کسی اچھے ارادے کے تحت تصور ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ الیاس خاں او
جبار خاں آگے بڑھے انہوں نے اپنے چہروں پر عجیب سے تاثرات قائم کر رکھے تھے۔
الیاس خاں نے کہا۔

''تم نے سنا جہانزیب! شاہ زیب گرفتار ہو چکا ہے۔''

''یقیناً آپ لوگ مجھے مبارکباد دینے آئے ہوں گے۔'' جہانزیب نے کسی قدر
طنزیہ انداز میں کہا اور الیاس خاں جبار خاں کی طرف دیکھنے لگا۔ جبار خاں جلدی سے
بولا۔

''جہانزیب بھائی! آپ بار بار یہ بھول جاتے ہیں کہ ہماری بہن اس گھر میں ہے
اور بہرحال ہم یہ جانتے ہیں کہ بہنوں کے گھر کی جانب گندی اور میلی نگاہوں سے نہیں
دیکھا جاتا۔ اس بہن کے رشتے سے آپ ہمارے لیے قابل احترام ہے۔ جس وقت
میرے بھتیجے کو قتل کیا گیا تھا تو آپ یقین کریں ہم اس قدر دیوانے ہو رہے تھے کہ ہمارا
دل چاہ رہا تھا کہ اس حویلی کو خاکستر کر دیں۔ یہاں ایک اینٹ بھی ثابت نہ رہنے دیں
لیکن اس وقت بھی یہی بہن تھی جس نے کہا کہ جبار خاں ایک مثال قائم کرو کہ بھائیوں
نے بہن کا گھر تباہ کر دیا اور اس کے بعد ہمیشہ یہ بہن ہمارے جذبات کو سرد کرتی رہی اور
یہی کہتی رہی کہ اس کی وجہ سے اس کی حویلی کا احترام کیا جائے۔ جہانزیب بھائی ہم پر ظلم

نہ کریں۔ ظلم شاہ زیب نے کیا تھا اس بات کو آپ نے تسلیم نہیں کیا۔ ارے سب کچھ
ہو سکتا تھا بعد میں سمجھوتہ بھی ہو سکتا تھا کوئی۔ مار دیا میرے بھتیجے کو لیکن وقت بہت گزر چکا
ہے۔ ہم دکھی دل کے لوگ ہیں۔ جب آپ کے دکھ کی اطلاع ملی ہمیں تو باز نہ رہ سکے۔
میں نے بڑے خاں سے کہا کہ خاں جی! ہمارا چراغ بجھ چکا ہے۔ چلو ظرف کا ثبوت دیں
کبیر والا کی حویلی کا چراغ آندھیوں کی زد میں آنے سے بچائیں۔

''جبار خاں! بھائی جہانزیب نے تو ہم سے اندر آنے تک کا نہیں کہا؟''

''میں کہتی ہوں خاں جی! میں کہتی ہوں۔ جب آپ اس حویلی کو میرا گھر کہتے ہیں
اور سمجھتے ہیں تو مجال ہے کسی کی جو آپ کو اس گھر میں آنے سے روکے۔ آئیے اندر
آئیے۔''

''معافی چاہتا ہوں الیاس بھائی اور جبار بھائی! شدت جذبات میں واقعی یہ غلطی
مجھ سے ہوئی۔ سب سے پہلے آپ کو اندر آنے کی دعوت دینی چاہیے تھی۔ شاہینہ نے
بہت اچھا کیا۔ میں اس کی باتوں پر ذرا بھی ناراض نہیں ہوں۔ آئیے اور مجھے میری اس
گستاخی پر معاف کر دیجیے۔''

جہانزیب نے کہا اور دونوں نے انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ پھر احترام کے
ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئے اور صوفوں پر بیٹھنے کی پیشکش کی۔

''شاہ زیب! گرفتار ہو گیا ہے۔ آپ یہ سمجھ لیجیے کہ اب صرف اس کے لیے تعزیت
کی جا سکتی ہے بھلا اب اسے سزائے موت سے کون بچا سکے گا؟''

''تم نے میرے الفاظ نہیں سنے جہانزیب بھائی! میں نے کہا تھا کہ خاں جی کو میں
نے اس کے لیے تیار کیا کہ ہمارا چراغ تو بجھ گیا ہے ہم اس حویلی کے چراغ کو بچائیں۔
جو ہماری بہن کا گھر ہے۔''

جہانزیب اوراورنگزیب نے تعجب بھری نگاہوں سے جبار خاں اور الیاس خاں کو دیکھا اور کہا۔

''میں سمجھا نہیں بھائی جبار خاں۔''

''شاہ زیب پر پولیس والوں کے قتل کا الزام ہے اور ہمارے آدمیوں کا قتل بھی اسی نے کیا لیکن ہم اپنا بیان بدل دیں گے۔ ہم عدالت میں کہیں گے کہ یہ قتل مشکوک ہیں۔ ایک بہت بڑی سازش کی گئی ہے شاہ زیب کو پھنسانے کے لیے۔ ایک ایسے ہمشکل کو تلاش کیا گیا ہے جو بالکل شاہ زیب محسوس ہو کیونکہ شاہ زیب کی گرفتاری کے بعد ہم نے اس بندے کو دیکھا ہے اور یقینی طور پر یہ فخر خان کی کارروائی ہے۔ یہ ہمارا اپنا ذاتی معاملہ ہے کہ ہم کس طرح اس بیان کو بدلیں گے۔ ہم ایسے وکیلوں کا پورا پینل شاہ زیب کے تحفظ کے لیے کھڑا کر دیں گے جو ان کاموں کا ماہر ہے اور بات ثابت ہو جائے گی۔ آپ کیا سمجھتے ہو جہانزیب! اس دنیا میں ہر کام ہو جاتا ہے بس خرچہ کرنا پڑتا ہے۔

جہانزیب اوراورنگزیب کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ جہانزیب نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''بھائی جبار خاں' بڑے خاں جی! آپ ایسا کریں گے میرے بھائی کے لیے۔ آپ ایسا کریں گے؟''

''ہاں۔ یہ بھی ایک مثال ہوگی بیٹے کے قاتل کو۔۔۔ اپنے بیٹے کے قاتل کو موت سے بچا لوں گا میں۔'' الیاس خاں نے کہا اور جہانزیب دوڑ کر الیاس خاں سے لپٹ گیا۔

''آپ۔۔۔ آپ بہت بڑے آدمی ہیں خاں جی! ایسا کون کرتا ہے اس دنیا میں۔ آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ بہت ہی بڑے آدمی ہیں آپ۔''

''بہت چھوٹا ہوں میں۔ میرا بیٹا' میرا بیٹا۔'' الیاس خاں کا لہجہ واقعی بھرا گیا۔ جبار امردنگاہوں سے ماحول کو دیکھ رہا تھا اور شاہینہ حیرانی سے اپنے بھائیوں کو۔

''بہر حال ان کے درمیان بہت سے معاملات طے ہوئے اور یہ طے کیا گیا کہ چل کر سارا بندوبست کیا جائے۔ جبار خاں نے کہا۔

''میں آپ کے ساتھ شہر چلوں گا شاہ جی! آپ تیار ہو کر ہماری طرف آ جائیں۔ آپ مناسب سمجھیں چلتے ہیں۔''

''میرا دل تڑپ رہا ہے اپنے بھائی کے لیے۔ میں آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں۔''

''تو پھر یہی کریں۔ آپ تیار ہو جائیں بھائی جہانزیب! اور ہمارے ساتھ ا۔''

''ٹھیک ہے۔''

''میں بھی چلوں بھائی؟''

''نہیں۔ بڑا صحیح فیصلہ کیا ہے خاں جی نے تم یہیں حویلی میں رہو اور یہاں کے لات پر نگاہ رکھو۔ میں اسی وقت خاں جی کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔ خاں جی اور میں جائیں گے اور صورتحال کو سنبھال لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تیار ہو جاؤں۔''

''ہاں۔'' الیاس خاں نے کہا اور جہانزیب شاہینہ کو اشارہ کر کے اندر چل پڑا۔ شاہینہ نے معنی خیز نگاہوں سے جبار خاں کو دیکھا تو جبار خاں نے غیر محسوس انداز ائے اشارہ کر دیا اور شاہینہ شوہر کے پیچھے پیچھے اندر چلی گئی۔ اتنا اندازہ تو اسے بھی ہو تھا کہ بھائی چال چل رہے ہیں۔

☆☆☆

حوالات کی کوٹھری میں شاہ زیب پر عجیب وغریب خیالات گزر رہے تھے۔ نہ تو وہ خوفزدہ تھا اور نہ ہی اسے اپنے گرفتار ہونے پر کوئی حسرت ہو رہی تھی۔ بس تھوڑا سا حیران ضرور تھا وہ۔ خاص طور سے شہاب الدین کے رویے سے۔ شہاب الدین کی شخصیت میں اسے ایک نمایاں تبدیلی نظر آئی تھی اور بہر حال اب اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ شہاب الدین کے لہجے کے سچ اور جھوٹ کی پرکھ نہ کرسکتا۔

بہر حال یہ ساری پریشانیاں تو تقدیر کا ایک حصہ تھیں۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ جب بھی کبھی پولیس کے چنگل میں آیا۔ پولیس اسے کسی طور نہیں چھوڑے گی اور اس کے بعد سارے کئے دھرے کا صلہ مل جائے گا۔ ایسا ہونا تھا سو ہو گیا۔ ویسے شہاب الدین کی باتوں نے ایک عجیب سی کیفیت طاری کر دی تھی اس پر۔ لجیا اگر ان لوگوں کے چنگل سے نکل بھاگی ہے تو کہاں گم ہو گئی وہ۔ معصوم سی بیوقوف لڑکی۔ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی جال میں ضرور پھنس جائے گی۔ وہ دنیا کی چالاکیوں کو نہیں سمجھتی۔ دیکھا ہی کیا ہے اس نے زندگی میں۔ شہاب الدین کہتا ہے کہ اس نے اسے بے آبرو نہیں کیا تھا۔ سچی بات لگتی تھی لیکن باہر کی دنیا میں نجانے اس کا کیا حال ہوگا۔

بہر حال سارے جھگڑے زندگی کے ساتھ ہیں جب یہ سب کچھ ہو گیا تھا تو پھر افسوس کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہر شخص کی اپنی تقدیر ہوتی ہے۔ لجیا کی بھی تقدیر تھی۔ ویسے اس نے لجیا کے ماں باپ کے بارے میں شہاب الدین کو نہیں بتایا تھا اور یہ اچھی بات تھی اور وہ اس سے مطمئن بھی تھا۔

بہر حال جیل کی کوٹھری میں ابھی تک اس کے ساتھ کوئی سختی نہیں ہوئی تھی۔ کھانے پینے کو بھی مل رہا تھا۔ البتہ وقفے وقفے سے پولیس والے آکر اسے دیکھ جاتے تھے۔ ان میں مختلف لوگ تھے اور ان میں سے بعض کی آنکھوں میں شاہ زیب کو انتہائی سفاکی نظر

تھی۔ اس کی پوری طرح دیکھ بھال ہو رہی تھی کیونکہ بہر حال اسے ایک خطرناک مجرم قرار دیا گیا تھا۔ بہت سے افراد کا قاتل۔

جس کوٹھری میں اسے رکھا گیا تھا وہ بھی ذرا اسپیشل قسم کی تھی۔ پھر اسے اطلاع ملی کہ کوئی اسے ملنے کے لیے آیا ہے۔ ہوگا کوئی۔ اب تو وہ کسی کے بارے میں بھی نہیں سوچتا لیکن جب ملاقاتی سامنے آیا تو اسے چونکنا پڑا۔ شخصیت اجنبی نہیں تھی۔ وہ فخر خان تھا۔

شاہ زیب کی گہری نگاہیں فخر خان کے چہرے پر پڑیں۔ وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ فخر خان کس کیفیت میں اس کے پاس آیا ہے۔ فخر خان آہستہ آہستہ چلتا ہوا شاہ زیب کے قریب پہنچ گیا۔ وہ سپاٹ نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"بات اصل میں یہ ہے شاہ زیب کہ انسان کبھی چومکھی نہیں چل سکتا۔ آخر کار اسے ایک دن سیدھا راستہ اختیار کرنا ہوتا ہے اور جو چومکھی چلتا ہے وہ کہیں نہ کہیں مارا جاتا ہے جیسے تم۔"

شاہ زیب خاموشی سے فخر خان کی صورت دیکھتا رہا۔ فخر خان اس کے بولنے کا انتظار کر رہا تھا۔ قرب وجوار کا ماحول کسی عجیب سے سناٹے کا شکار تھا۔ سلاخوں والے دروازے سے کافی فاصلے پر مسلح سنتری ٹہل رہے تھے۔ فخر خان جیسے آدمی کو شاہ زیب تک پہنچنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

لیکن بہر حال شاہ زیب اس وقت حالات کا مارا ہوا تھا۔ ہر شخص کے ساتھ اسے نرم رویہ ہی اختیار کرنا تھا۔ کیونکہ سخت رویہ کسی بھی طرح اس وقت اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ فخر خان نے جس وقت یہ دیکھا کہ شاہ زیب کچھ نہیں بول رہا تو اس نے خود ہی کہا۔

"میں نے تمہیں بھرپور حمایت کی پیشکش کی تھی اور بہر حال میں تھوڑے بہت

تعلقات والا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کون تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میں تو تمہیں گرفتار ہی نہ ہونے دیتا۔ مگر دیکھو ہر شخص اپنا شکار خود بنتا ہے۔ تم نے برائیوں کے راستے اپنا لیے میں کہتا ہوں زندگی کا ایک ہی رخ تو نہیں ہوتا۔ انسان حالات کا شکار ہوتا ہے۔ حالات سے لڑتا ہے اور پھر تمہاری عمر کا بندہ ابھی تو تم نے زندگی کا آغاز کیا ہے۔ کیا ضرورت تھی ان چکروں میں پڑنے کی۔ ساری معلومات حاصل کر کے آیا ہوں تمہارے بارے میں۔ طوائفوں کے کوٹھے پر جانا شروع کر دیا تھا۔ شراب پینی شروع کر دی تھی۔ کیوں۔ آخر کیوں؟ میں تمہیں ملک سے باہر نکال سکتا تھا۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری زمین پر آگ نہیں جلے گی۔ یہ سارے کام میں نے اپنے ذمے لے لیے تھے اور ایک چھوٹا سا کام تمہارے سپرد کر دیا تھا۔ مجھے بتاؤ تم نے مجھ پر اعتبار کیوں نہیں کیا؟ ارے بابا! زندگی میں ایسا ہوتا ہے۔ میں کسی اور سے بھی یہ کام لے سکتا تھا لیکن میں نے تمہارا انتخاب کیا صرف اس لیے کہ تمہاری بھی مدد کرنا چاہتا تھا۔ مگر تم نے میرے ہی خلاف سازش کر ڈالی۔ کچھ بولو گے نہیں؟''

جواب میں شاہ زیب مسکرا دیا۔ پھر اس نے کہا۔

''خان جی! آپ نے خود ہی پہلی اینٹ رکھی اور خود ہی اس پر عمارت تعمیر کر ڈالی۔ میرے بولنے کے لیے چھوڑا ہی کیا ہے آپ نے۔''

''مطلب کیا ہے تمہارا؟''

''الزامات کا ایک ڈھیر لا دیا آپ نے میرے سر پر جو آپ کہہ رہے ہیں وہ غلط ہے خان جی۔ آپ نے جو کچھ کہا میں نے کیا۔ حیدر شاہ کی حویلی میں گھسا۔ وہاں تعلقات بڑھائے۔ حیدر شاہ کی قربت حاصل کی اور اس کے بعد فاضل باجوہ تک پہنچ گیا۔ وہ آپ کا بندہ تھا۔ آزادی دلائی میں نے اسے اور اس کے بعد حیدر شاہ پر بھرپور قاتلانہ حملہ کیا اور جب اس کے آدمی چاروں طرف سے دوڑ پڑے تو اسے زخمی چھوڑ کر بھاگ آیا لیکن اسے زخم لگائے تھے میں نے ایسے کہ اس کا بچنا مشکل تھا۔ پھر جب میں وہاں سے بھاگا تو پولیس میرے پیچھے لگ گئی۔ چھپتا پھرا اور آخر کار کسی نہ کسی طرح لاہور نکل آیا۔ میں یہاں ایک چکر میں مارا گیا۔ نہ تو میں نے طوائفوں کے کوٹھے کی زندگی اپنائی' نہ کبھی شراب چکھی۔ یہ میری تقدیر میں تھا سو ہو گیا۔''

''کیا تمہیں یہ بات معلوم ہے کہ حیدر شاہ زندہ ہے؟''

''زندہ ہے۔'' شاہ زیب نے حیرانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ فخر خان تعجب سے اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

''کیا تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں معلوم؟''

''نہیں خان جی! اگر حیدر شاہ بچ گیا ہے تو پھر یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہت سخت جان انسان ہے۔ میں نے تو اسے اپنی دانست میں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔''

''لیکن مجھے تو اطلاع ملی ہے کہ اسے ایک بھی زخم تک نہیں لگا۔''

''تو پھر آپ کی اطلاع ٹھیک ہوگی۔ میں غلط کہہ رہا ہوں گا۔'' شاہ زیب نے کہا اور فخر خان الجھن کا شکار ہو گیا۔ دیر تک وہ شاہ زیب کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

''شاہ زیب! سچ بتا دو مجھے کیا تم نے حیدر شاہ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا؟''

''نہیں تو میں کیا وہاں بین بجانے گیا تھا۔ عجیب باتیں کرتے ہیں آپ خان جی! حیدر شاہ آپ کو مل جائے تو آپ جا کر دیکھ لیجیے۔ اس کی گردن پر سینے پر اور بائیں بازو پر بدترین نشانات ملیں گے آپ کو۔ ایسے گہرے گھاؤ اور زخموں کے نشانات اصل میں میرے پاس ریوالور نہیں رہ سکا تھا کیونکہ وہاں مجھے تلاشی لے کر اندر جانے دیا گیا تھا۔''

''اوہو۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ قدرتی طور پر بچ گیا۔ بہر حال فاضل باجوہ کہاں

گیا؟''

''جی۔'' شاہ زیب نے حیرانی کا مظاہرہ کیا۔

''بھئی۔ تم نہیں جانتے میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ایک ایسی دستاویز جو میرے اور حیدر شاہ کے درمیان دشمنی کا باعث بنی تھی۔ میرے پاس سے غائب ہو گئی۔ یقیناً فاضل باجوہ نے حیدر شاہ سے کوئی ڈیل کی تھی اور وہ ڈیل مکمل کرنے کے بعد باجوہ اپنی بیوی بچوں کو لے کر چالاکی سے میرے پاس سے نکل گیا۔''

فخر خان نے فاضل باجوہ کے بارے میں ساری تفصیلات شاہ زیب کو بتائیں۔ شاہ زیب دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا لیکن بہر حال اس نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''خان جی! آپ کا شبہ بھی ٹھیک ہی ہے۔ ظاہر ہے انسان ایسے حالات میں ہی سوچ سکتا ہے کہ کوئی لمبی گڑبڑ ہوئی ہے لیکن بہر حال آپ دیکھ لیجئے' سوچ لیجئے۔ میں تو اب مشکل میں پڑ گیا ہوں۔''

''فاضل باجوہ کے بارے میں اگر تم مجھے بتا دو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ تمہیں سزا سے بچا لوں گا لیکن اپنے جیسی ہر ممکن کوشش کروں گا کہ تم بچ جاؤ۔'' جواب میں شاہ زیب ہنسنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے خان جی! آپ جیسے چودھری اسی انداز میں سوچ سکتے ہیں۔ آپ کا یہی خیال ہے کہ نا کہ میں آپ سے بھی جھوٹ بول رہا ہوں۔''

''اوہ یار! میری تو بڑی زمینیں نکل گئیں۔ چلو ٹھیک ہے لیکن ایک بات اب بھی دماغ میں رکھنا اگر کوئی گڑبڑ ہے اور تم فاضل باجوہ کے سلسلے میں یا حیدر شاہ کے مسئلے میں میری کوئی مدد کر سکتے ہو تو پھر اپنے آپ کو پہلے یہاں لاک اپ میں اور اس کے بعد جیل کی کوٹھری میں اکیلا مت سمجھنا۔ کیا سمجھے؟''

''جی خان جی! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

فخر خان تھوڑی دیر تک اس کے ساتھ رہا۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا لہ اب اسے شاہ زیب سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ظاہر ہے اس کا اپنا مسئلہ تو ختم ہو گیا

چنانچہ وہ واپس چل پڑا اور شاہ زیب دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔ بھلا فخر خان کو اس کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

☆☆☆

الیاس خاں اور جبار خاں لاہور کے اعلیٰ درجے کے وکیلوں سے ملے اور انہوں اپنا کیس ان کے سامنے رکھا۔ اعلیٰ ترین وکیلوں نے بھی اس بات سے انکار کر دیا اور

''خاں صاحب! آپ خود غور کیجئے۔ بات صرف آپ کے بیٹے کے قتل اور آپ بیٹے پر کام کرنے والے ملازموں کے قتل کی نہیں ہے۔ بلکہ پولیس والوں کے قتل ے ہیں۔ آپ اپنے کتنے ہی رشتے نبھائیں لیکن جو ہوا ہے اس سے تو انکار نہیں کیا کتا۔ ہم یہ کیس نہیں لے سکتے۔ معذرت چاہتے ہیں' آپ سے بہت افسوس کے تھ۔ ہم اس کیس کو لینے سے معذوری کا اظہار کرتے ہیں۔''

بڑے بڑے اعلیٰ درجے کے وکیلوں سے رابطے قائم کئے گئے لیکن ہر طرف سے ہی جواب ملا کہ قتل کا مجرم بلکہ ایک خونخوار قاتل بھلا قانون سے کیا رعایت پا سکتا ہے۔ آپ لوگ بلا وجہ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ٹھیک ہے آپ کا کیس لے لیا جائے گا ن ایک بے مقصدی بات ہو گی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ صرف سرکاری طور پر ہی بس خانہ ری کر لی جائے ورنہ کسی وکیل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' ایک بہت بڑے وکیل صاحب

نے کہا اور الیاس خاں اور جبار خاں مایوس ہو گئے۔ جہانزیب بھی ان کے ساتھ ہی تھا
لاہور کے ایک ہوٹل میں آخر کار الیاس خاں نے اصلیت اگل دی۔

''جہانزیب تم کیا سمجھتے ہو۔ ہم تمہارے بھائی کو زندگی دلانا چاہتے ہیں۔ بات
صرف اتنی سی تھی کہ ہم اسے صرف قانون کے شکنجے سے بچانا چاہتے تھے۔ ہم یہ نہیں
چاہتے تھے کہ قانون اسے موت کی سزا دے۔ جس دن ہماری کوششوں سے اسے رہائی
ملتی۔ اسی دن اسے اغوا کر کے ہم لوگ اسے اپنے گھر لے جاتے اور پھر اس کے جسم کی
بوٹی بوٹی کاٹی جاتی۔ میں اس سے اپنے بیٹے کی موت کا انتقام لیتا۔ جاؤ تم اس قابل نہیں
ہو کہ ہم تمہیں ہوٹل میں اپنے ساتھ رکھیں۔ بچ گیا وہ کم بخت ہمارے ہاتھوں سے لیکن
لگے رہیں گے ہم بھی چھوڑیں گے نہیں اس کو کہ اگر کوئی ایک بھی موقع مل گیا تو اسے
حاصل کر لیں، پھانسی ہونے سے پہلے اور اگر وہ جیل سے گم ہو جائے اور کہیں بھی اس کا
پتہ نہ ملے تو ہم سے آ کر اس کی قبر کے بارے میں پوچھ لینا۔ جاؤ دفع ہو جاؤ۔''

جہانزیب ششدر رہ گیا تھا۔ بہرحال وہ ان دونوں کا بہنوئی تھا لیکن ان سے بدلا
لینے کا کوئی ذریعہ اس کے پاس نہیں تھا۔ شاہینہ بے شک اس کی بیوی تھی لیکن وہ یہ جانتا تھا
کہ اگر شاہینہ کو کوئی نقصان پہنچا تو وہ لوگ درحقیقت ان کی نسلیں تباہ کر دیں گے۔

بہرحال وہ یہاں سے واپس پلٹ پڑا۔ راستے میں اس نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ
اورنگزیب کو حقیقت نہیں بتائے گا بلکہ یہی کہے گا کہ وکیلوں نے کیس لینے سے انکار کر دیا
ہے۔ ادھر الیاس خاں اور جبار خاں بھی بری طرح تلملا رہے تھے۔

''دل تو چاہتا ہے کہ اس سے ملاقات کرنے کے لیے لاک اپ میں جائیں اور
وہیں اس کو ٹھنڈا کر دیں۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ میں اس کی آنکھیں نکال لاؤں اور
انہیں کیمیکل میں ڈال کر محفوظ رکھوں تا کہ وہ حسرت بھری نگاہوں سے دنیا کو دیکھتا رہے

اور میں اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کروں۔''

بہرحال دونوں بھائی اپنی ان کوششوں میں ناکام ہو کر واپس اپنی حویلی آ گئے
تھے۔ اور ان کے ذہنوں میں گہری سوچیں گردش کرتی رہیں تھیں۔ چار چھ دن کے بعد
جبار خاں نے کہا۔

''اور اب ہمیں وہاں بھٹہ بنانے میں کوئی دقت نہیں ہو گی۔ کیا خیال ہے بھائی
جان! کام شروع کر دیا جائے؟'' الیاس خاں نے جبار خاں کی صورت دیکھی اور بولا۔

''وہ خونی زمین مجھے انتہائی قابل نفرت لگتی ہے لیکن اس سے متعلق جو داستان ہے
وہ بھی مجھے یاد ہے وہ کتے کا بچہ اپنی ماں کی خواہش پوری کرنے کے لیے اس زمین کو گلزار
بنانا چاہتا ہے۔ میں اسے آتشکدہ بنا دوں گا۔ آتشکدہ، جہنم زار اور پہلے تم وہاں میرے
بیٹے کی یادگار قائم کرو۔ ایک چھوٹا سا یادگاری نشان وہاں بنا دو اور اس پر نام لکھوا دو اس کا
پھر وہاں ایک عظیم الشان بھٹہ بناؤ۔ ایسا بھٹہ جو اس علاقے میں بڑا ہو۔ فخر خان کے منہ
پر تھوک دو۔ اسے بتا دو کہ خاں کیا ہوتے ہیں اور خاں زادوں سے جھگڑنا آسان بات
نہیں ہوتی۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں خاں جی!''

''بس تو پھر مزدوروں کو وہاں پہنچا دو۔ یادگار بنا دو بہت بڑی اور اس پر تختی لگوا دو،
پھر بھٹے کا کام شروع کروا دو۔''

''ٹھیک ہے خاں جی! میں آغاز کرتا ہوں۔''

اور اس کے بعد جبار خاں اس کام میں مصروف ہو گیا۔ دونوں بھائی ایک ہی
فطرت کے مالک تھے اور اپنے طور پر ہر قسم کی غلط حرکات کے محرک ضرور اکٹھے کیے
گئے۔ جن لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ بھٹے کی زمین متنازعہ ہے اور وہاں کوئی خطرہ پیش

آ سکتا ہے ان ٹھیکیداروں نے تو بھٹے پر کام کرنے کی حامی نہیں بھری تھی لیکن لاہور کے ایک ٹھیکیدار نے ایک اچھی پیشکش پر اس جگہ کام کرنے کا ٹھیکہ لے لیا اور اسے سائیڈ پر لے جا کر ساری تفصیلات بتا دی گئیں۔ یادگار کے لیے نشان قائم کر دیا گیا اور وہاں کھدائی شروع ہوگئی۔ کام تیزی سے ہونے لگا۔ ابتدائی چار پانچ دنوں میں جبار خاں نے خود وہاں کی نگرانی کی۔ غالباً پانچواں دن تھا اور یادگار کے چاروں طرف کارروائی ہو رہی تھی۔ وہ لوگ آرام سے کام میں مصروف تھے کہ ایک دن دوپہر کے وقت جب سورج آسمان سے کہر برسا رہا تھا' زمین تانبے کی طرح تپ رہی تھی۔ ہوا بند تھی اور مزدور پسینے میں شرابور تھے خود جبار خاں یہ سوچ رہا تھا کہ اس شدید گرمی میں یہاں کام کرانا بیمار پڑنے کو دعوت دینا ہے۔ اب ٹھیکیدار کام تو اچھی طرح سمجھ ہی چکا ہے چنانچہ آج شام کو یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ دن میں تو سفر کرنا بھی بے کار تھا۔ جو کیمپ اس نے اپنے آرام کے لیے بنایا تھا وہاں وہ زمین پر لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ اب آگے کیا کرنا ہے کہ اچانک ہی باہر سے کچھ شور شرابے کی آواز آئی اور جبار خاں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دفعتاً ہی ٹھیکیدار اندر آیا وہ ہانپ رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' جبار خاں نے اس سے پوچھا۔

''خاں جی! وہ دس بارہ آدمی ہیں۔ چہروں پر نقابیں لگائی ہوئی ہیں۔ انہوں نے کالے ڈھاٹے باندھے ہوئے ہیں۔ شلوار قمیصیں پہنے ہوئے ہیں اور پوری طرح مسلح ہیں۔ ڈاکو معلوم ہوتے ہیں۔''

''ڈاکو؟''

''ہاں جی۔ انہوں نے چاروں طرف چکر لگانا شروع کر دیئے ہیں اور اس کے بعد ان میں سے ایک آدمی نے کہا ہے کہ جو اس بھٹے کو بنانے کا ذمے دار ہے اسے سامنے لاؤ

ورنہ سارے مزدوروں کو بھون کر رکھ دیا جائے گا۔''

''کون ہے وہ؟''

''خاں جی! ہم کیا جانیں۔'' جبار خاں سخت حیران رہ گیا تھا۔ اگر وہ ڈاکو ہیں تو انہیں بھٹہ بنانے یا نہ بنانے سے کیا دلچسپی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر---'' دفعتاً ہی باہر گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی اور جبار خاں ایک دم اچھل پڑا۔ وہ سہما سہما باہر نکل آیا تھا۔ گھر کی دیواروں کے اندر شیخیاں بگھارنا الگ بات ہے۔ کھلے میدان کا کھیل دوسرا ہوتا ہے۔

چنانچہ اس کے دل میں خوف تھا۔ ٹھیکیدار اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ تب اس نے ایک شخص کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر ڈھاٹا بندھا ہوا تھا اور وہ گھوڑے پر سوار تھا جو خاص بات جبار خاں نے دیکھی وہ اس کے ساتھ موجود بیساکھی تھی۔ اس کا ایک پاؤں نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس بیساکھی تھی' رائفل تھی۔ وہ کافی تنومند شخصیت کا مالک تھا۔ آہستہ آہستہ وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا آگے آیا اور جبار خاں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''تو تو ہے جو یہ بھٹہ بنا رہا ہے۔''

''ہاں چوہدری جی! میں ہی ہوں لیکن بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ کون ہیں؟ اور آپ کو اس بھٹے کے بنانے سے کیا نقصان ہے؟''

''دیکھو' سنو۔ میں کون ہوں' کیا ہوں۔ اس بات کو جانے دو۔ میں تمہیں صرف ایک بات بتاتا ہوں۔ یہ جو کچھ تم نے کھڑا کر لیا ہے اسے گرا دو۔ ایک ایک اینٹ یہاں سے ہٹوا دو۔ اگر اس کے بعد تم نے یہاں کوئی ایسی کارروائی کی تو جتنے لوگ یہاں نظر آئیں گے انہیں بھون کر رکھ دیا جائے گا۔ میں تمہیں چوبیس گھنٹے کا وقت دیتا ہوں اس

کے بعد یہاں کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ گھوڑے سوار نے ایک نگاہ چاروں طرف ڈالی اور اس کے بعد گھوڑے کے واپس موڑ دیا۔ اس کے ساتھ آنے والے لوگ بھی واپس چلے گئے تھے۔ جبار خاں سرد نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر ٹھیکیدار کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''چودھری جی! اگر کوئی جھگڑے والی بات ہے تو ہم تو بھئی گھر بار چھوڑ کر آئے ہیں۔ ہم غریب لوگوں کو مزدوری کے سوا اور کیا ملے گا۔ ہم جان کی بازی نہیں لگا سکتے۔''

''صرف آٹھ گھنٹے۔ تم بے شک کام مت کرو لیکن یہاں سے جانے کی کوشش مت کرنا۔ آٹھ گھنٹے کے اندر اندر صحیح کام کا فیصلہ ہو جائے گا۔'' جبار خاں نے ٹھیکیدار کو سمجھایا بجھایا اور اس کے فوراً بعد جیپ پر سوار ہو کر برق رفتاری سے حویلی کی جانب چل پڑا۔

بڑی سنسنی خیز بات تھی۔ وہ تو یہی سمجھتا تھا کہ شاہ زیب اکیلا آدمی ہے اور جنون کے عالم میں الٹی سیدھی حرکتیں کرتا پھر رہا ہے لیکن یہ لوگ کون تھے جو شاہ زیب کے مشن کو اس طرح پورا کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ بہر حال وہ سیدھا بڑے بھائی کے پاس پہنچا۔ الیاس خاں نے اسے دیکھا تو کہنے لگا۔

''اوہ یار! جبار خاں تو تو وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ تجھے پتہ نہیں ہے کہ میں کتنا اکیلا محسوس کرتا ہوں خود کو۔''

''خاں جی! پھر پریشانی کھڑی ہو گئی ہے ایک۔''

''کیسی پریشانی بھئی؟''

''خاں جی! بھٹے کی تعمیر رکوانے کے لیے گھوڑے سوار وہاں پہنچے تھے۔ چہروں پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔'' جبار خاں نے پوری تفصیل الیاس خاں کو بتائی تو الیاس خاں کا چہرہ بھی تصویر حیرت بن گیا۔

''ان کا سردار لنگڑا تھا۔''

''جی ہاں ٹانگ تھی ہی نہیں اس کی۔ کوئی دھوکے والی بات نہیں تھی۔''

''کون ہو سکتا ہے یہ--- لعنت ہے ہماری عقل پر اتنے سامنے کی بات نہیں سوچ ...''

''کیا خاں جی؟''

''اوئے فخر خان کے پاس اب اس کے سوا چارہ کار کیا رہ گیا تھا۔ فخر خان اور سیدھا ھا فخر خان۔ مگر ایک بات بتا۔ شاہ زیب کے لیے جو ہم نے پہلے مورچے لگوائے تھے ا کیا ہوا؟''

''خاں جی! اب تو ان مورچوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ بندے تو پہلے ہی ہٹا گئے تھے۔''

''ہوں۔ تم ایسا کرو بندے لے جاؤ۔ چاروں طرف لگا دو اور کام جاری رکھو۔ فخر ن کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ شاہ زیب تو گرفتار ہو گیا۔ فخر خان نے سوچا کہ اب شاہ زیب کے نام پر کام شروع کرتے ہیں۔ او اس کی چالاکی کو میں اچھی طرح سمجھتا ں۔ بھون کر ڈال دینا اگر اس کے بندے دوبارہ آئیں۔''

''سوچ لیجئے خاں جی!''

''او سوچ لیا تو بزدل کب سے ہوتا جا رہا ہے۔''

''بالکل بزدل نہیں ہوں خاں جی! بس یہ سوچ رہا ہوں کہ--- کہ---''

''نہیں کچھ نہیں۔ جاؤ کام شروع کر دو۔ چوبیس گھنٹے کے لیے کہہ کر گیا ہے تیار ہا۔ چوبیس گھنٹے کے بعد اسے سبق سکھا دو۔ میں نہیں چاہتا کہ میں فخر خان کے پاس جا کر بات کروں۔ پہلے اسے مزہ چکھاؤ اس کے بعد اگر وہ رابطہ قائم کرے گا تو ہم اسے

بھی ٹھیک ٹھاک جواب دے لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"جاؤ احتیاط رکھنا۔" الیاس خاں نے کہا اور جبار خاں نے گردن ہلا دی۔

بہرحال آدمیوں کی ان لوگوں کے پاس کمی نہیں تھی۔ جبار خاں نے تین یا چار گھنٹے کے اندر اندر مسلح افراد اکٹھے کئے اور انہیں جیپوں میں بھر کر آسل چل پڑا۔ بھٹے کے اردگرد مسلح افراد کو بٹھایا گیا اور اس کے بعد جبار خاں نے ٹھیکیدار سے کہا۔

"ٹھیکیدار جی! جیسے کام چالو تھا ایسے ہی چالو رکھو۔ اب اگر کوئی ادھر آیا تو خود دیکھ لینا بچ کر واپس نہیں جا سکے گا۔ کام جاری رکھا جائے۔" ٹھیکیدار نے گہری سانس لے کر کام دوبارہ شروع کر دیا تھا۔

جبار خاں نے اس کا دل بڑھانے کے لیے ان لوگوں کو کچھ انعامات دیئے اور کام پھر سے شروع ہو گیا۔ نجانے کیوں جبار خاں کے دل میں ایک خوف سا بیٹھا ہوا تھا۔ الیاس خاں نے اسے یہاں بھیج تو دیا تھا اور اس نے ان لوگوں کا چیلنج قبول کر کے کام شروع کر دیا تھا لیکن گزرنے والا ہر لمحہ اسے یہ احساس دلا رہا تھا کہ کوئی بڑی گڑبڑ ضرور ہو گی۔ اور ایسا ہی ہوا۔ جس وقت چوبیس گھنٹے پورے ہوئے دوپہر ہی کا وقت تھا اور ویسا ہی دن نکلا ہوا تھا لیکن سورج میں آج وہ تپش نہیں تھی۔ مزدور اور ٹھیکیدار کام کر رہے تھے کہ اچانک ہی فائر کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد گولیوں کی تڑاتڑ۔ کچھ مزدور وہیں ڈھیر ہو گئے تھے اور باقی اینٹوں کے ڈھیر میں چھپ گئے تھے۔

ادھر جبار خاں کے ان آدمیوں نے جوابی مقابلہ شروع کر دیا اور علاقہ میدان کارزار بن گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دو فوجیں آپس میں ٹکرا گئیں ہوں۔ دونوں طرف سے گولیاں برس رہی تھیں لیکن حملہ آوروں نے بہتر پوزیشن لی ہوئی تھی اور وہ لوگ جو

خاں کے آدمی تھے وہ کھلی جگہوں پر تھے اور اچھے مورچے نہیں تھے ان کے پاس۔ چنانچہ ایک کے بعد ایک چھ مزدوروں کے علاوہ نو افراد موقع پر ہی ہلاک ہو گئے اقیوں نے راہ فرار اختیار کی۔ جبار خاں نے خود اینٹوں کے نیچے چھپ کر اپنی جان تھی۔ یہ خوفناک اور خونریز جنگ وہ اچھی طرح دیکھ رہا تھا اور اس میں سب سے ہ دکھ بھری بات یہ تھی کہ حملہ آوروں میں سے ایک بھی نہ تو ہلاک ہوا تھا اور نہ ہی زخمی ا کیونکہ بعد میں انہیں آرام سے جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا کہ جبار خاں کے لڑاکے تو ں چکے تھے۔ اس لیے اب ان پر گولی چلانے والا کوئی نہیں تھا۔ ادھر ٹھیکیدار پر نیم غشی ی کیفیت طاری تھی۔ وہ جبار خاں کے پاس پہنچا اور اس نے جبار خاں کا گریبان پکڑ

"اب بولو خاں جی! کون جواب دے گا ان چھ مزدوروں کی موت کا۔ کون ب دے گا۔ کون ذمے دار ہے؟"

"ہوش میں آؤ۔ الو کے پٹھے۔ یہ کیا کر رہے ہو میرا گریبان چھوڑو۔"

"خاں جی! مار دو گولی مار دو۔ ریوالور ہے تمہارے پاس اور ہمیں صرف اس بات جواب دے دو کہ جب ہم نے آپ سے پہلے کہا تھا کہ ہم جھگڑے کے کسی کام میں ں پڑنا چاہتے تو پھر آپ نے ہمیں دوبارہ مجبور کیوں کیا؟"

"ہوتا ہے۔ ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ اب مجھے تو نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ ا طرح سے حملہ کر دیں گے۔"

"مگر ہم کیسے جواب دیں گے؟"

"او جواب کے بچے ان لوگوں کو معاوضے ادا کر دیئے جائیں گے۔ چلو ان کی شوں کو شہر پہنچانے کا بندوبست کرو۔ گریبان پکڑا ہے تو نے میرا۔ ایسا کام کرنے والے

کو میں زندہ نہیں چھوڑتا لیکن بہر حال---''

پھر اس کے بعد جبار خاں نے موبائیل پر الیاس خاں کو اس سب کے بارے میں اطلاع دی اور الیاس خاں پوری داستان سن کر دنگ رہ گیا۔

''میں آ رہا ہوں جبار خاں! ڈرنا مت میں آ رہا ہوں۔'' الیاس خاں نے کہا لیکن جبار خاں نے موبائیل بند کر کے برا سا منہ بنایا۔

''اب تمہارے آنے سے کیا ہوگا خاں جی! جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا ہے۔''

☆☆☆

لاک اپ ہی میں دوسری ملاقات ریحانہ نے شاہ زیب سے کی تھی۔ شاہ زیب کو ابھی تک عدالت میں نہیں پیش کیا گیا تھا بلکہ ایس پی وہاب شیخ نے عدالت سے اس کے لیے مہلت مانگ لی تھی اور عدالت میں جا کر یہ بیان دیا تھا کہ چونکہ شاہ زیب ایک خطرناک قاتل ہے اور ابھی تک اس کے بھائیوں نے اس کی پیروی کے لیے کوئی انتظام نہیں کیا ہے۔ چنانچہ اسے کچھ وقت پولیس کی حراست میں رہنے کی اجازت دی جائے اور یہ اجازت اس نے حاصل کر لی تھی۔

ملکہ بائی ابھی تک ہسپتال ہی میں تھی اور ابھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کب اسے ہسپتال سے اجازت ملے کیونکہ اس کے دونوں پاؤں چکنا چور ہو گئے تھے اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ پاؤں کی ہڈیاں اتنی آسانی سے جڑ جائیں گی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ریحانہ نے پوری پوری کوشش کی تھی۔ سازندوں میں سے تو کسی نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ ایک صاحب اس کے پاس آیا کرتے تھے جو وکیل تھے۔ ان کا نام ریاست علی خان تھا۔ ایک بار انہوں نے ریحانہ کو اپنا ٹیلی فون نمبر دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر کبھی کوئی ضرورت پیش آئے تو وہ ان سے رابطہ قائم کر سکتی ہے۔ اس نے فون کر کے ریاست علی خان صاحب کو بلایا تھا

پھر ساری تفصیل ان کے گوش گزار کر دی تھی۔ جس پر ریاست علی خان صاحب نے مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں شاہ زیب کے سلسلے میں کچھ افراد بڑے بڑے وکیلوں کے پاس کوششیں کرتے پھر رہے ہیں۔ یقیناً وہ شاہ زیب کے بھائی بندے ہوں گے۔ میں تو خیر اس پائے کا وکیل نہیں ہوں۔ مگر مجھے اطلاع ملی تھی۔''

''ریاست علی خان صاحب! میں شاہ زیب سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ اس کا بندوبست کر سکتے ہیں؟''

''جانِ من! تم کہہ کر دیکھو سب کچھ کر سکتے ہیں ہم۔''

''جانے دیجئے خان صاحب! یہ بتائیے شاہ زیب کو رہا کرا سکتے ہیں آپ؟''

''ارے رے---رے---رے یہ تو وہی سوال ہوا کہ موت پر قابو پا سکتے ہیں آپ۔ بس اس کے علاوہ جو کچھ بھی تم کہو۔''

''میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''معلومات کر لیتے ہیں کوئی مشکل مرحلہ نہیں ہے۔''

بہر حال ریاست علی خان صاحب نے ریحانہ کا شاہ زیب سے ملاقات کا بندوبست کر دیا اور ریحانہ شاہ زیب کے سامنے پہنچ گئی۔ شاہ زیب کو اس عالم میں دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے تھے۔ شاہ زیب نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہا۔

''ہیلو ریحانہ۔''

ریحانہ کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''شاہ زیب! تم---''

"ہاں' ہاں بولو۔"

"کیوں آئے تھے ہمارے ہاں' کیوں آئے تھے؟ کیا ہوگا اب؟"

"نہیں ریحانہ! اگر میں تمہارے گھر سے نہ پکڑا جاتا تو کہیں اور سے پکڑا جاتا۔ مجرم تو میں تھا۔ قتل میں نے کئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں میرا نظریہ کیا تھا۔ قانون اس نظریے کو نہیں مانے گا۔ موت کی سزا ہو جائے گی مجھے۔ اصل میں ریحانہ پتہ ہے کیا بات ہے ایک وقت ایسا آتا ہے جب انسان کے لیے موت کا تصور بے معنی ہو جاتا ہے۔ میں نے بہتوں کی زندگیاں چھینی ہیں۔ اگر وقت مجھ سے میری زندگی لے رہا ہے تو یہ کون سی بڑی بات ہے۔ وہ بھی تو اس دنیا سے چلے گئے۔ جو میری گولیوں کا شکار ہوئے تھے۔"

"میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتی ہوں شاہ زیب!"

"یہی نا کہ مجھے گرفتار کرانے میں تمہارا ہاتھ نہیں ہے۔"

"ہاں۔ قسمتوں پر اعتبار کرتے ہو؟"

"نہیں۔"

"تو پھر۔"

"تم پر اعتبار کرتا ہوں ریحانہ! یہ بات مجھے معلوم ہو چکی ہے کہ یہ کام شہاب الدین کے کہنے پر ملکہ بائی نے کیا ہے۔"

"معلوم ہو چکی ہے تمہیں۔ تو کیا تمہیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ ملکہ بائی اس وقت ہسپتال میں ہے۔ میں نے اس کی دونوں ٹانگیں توڑ دی ہیں اور اب اس کے پیروں کی ہڈیاں کبھی نہیں جڑیں گی۔ وہ اپاہج بن کر زندہ رہے گی اگر زندہ رہی تو۔ اور زندگی بھر یاد کرتی رہے گی کہ اس نے شاہ زیب کو گرفتار کرایا تھا۔"

"کیا---؟ ارے کیا واقعی---اوہو تم نے اپنی ماں کے ساتھ ایسا کیا؟" شاہ زیب نے کہا۔

"ماں نہیں ہے وہ میری۔ وہ شمع کی بھی ماں نہیں ہے۔ ہم لوگوں کا کوئی نہیں ہوتا۔ نہ ماں اور نہ باپ۔ ہمارے تو صرف گاہک ہوتے ہیں۔ جو ہمارے جسموں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ ہمارے رقص اور آواز سے بھی دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان کی نگاہوں میں ہمارے بے لباس بدن تھرکتے ہیں۔ وہ ہمیں کپڑوں کے اندر سے دیکھتے ہیں بس۔ یہ ہے ہماری اوقات اور یہ ہے ہمارا منصب۔ منع کیا تھا تمہیں شاہ زیب کہ ہم سے دل نہ لگاؤ---ہماری طرف نہ آؤ---وہاں سے گرفتار نہ ہوتے تو دل کو یہ دکھ تو نہ ہوتا۔"

"نہیں ریحانہ! میں تم سے ایک بات کہوں۔ ابھی تم نے جو الفاظ کہے جسموں کے تھرکنے اور نگاہوں کی ہوس کے بارے میں تو یقین کرو سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ میں نے تمہیں ایک دوست کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ دیکھتا ہوں اور دیکھتا رہوں گا۔ جب تک زندہ ہوں اور شاید مرنے کے بعد اگر کبھی میرے دل میں اچھے دوستوں کا تصور آیا تو تم ان میں سرفہرست ہوگی۔ ریحانہ ایسا مت سوچو۔ ایسا بالکل مت سوچو۔"

ریحانہ بلک بلک کر رو پڑی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"شاہ زیب! ایک وعدہ کرتی ہوں تم سے اگر تمہیں موت کی سزا ہوئی تو یقین کرنا جو وقت تمہاری موت کا متعین کیا جائے گا۔ اسی وقت ریحانہ بھی اس دنیا سے چلی جائے گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ شاہ زیب! یقین کر لینا میری بات پر۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گی اور نہ ہی جھوٹ بول رہی ہوں۔"

"نہیں ریحانہ! یہ تو ایک بے معنی سی بات ہوگی...... بھلا--- بھلا تم میرے لیے

کیوں جان دوگی؟''

''بس دے دوں گی۔'' ریحانہ نے کہا اور بہت دیر تک روتی رہی یہاں تک کہ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ چلتے ہوئے شاہ زیب نے اس سے کہا۔

''ریحانہ --- پتہ نہیں دوبارہ ملاقات ہو یا نہ ہو لیکن جو فیصلہ تم نے کیا ہے اسے بدل دو۔''

''فیصلے بدلنے کے لیے نہیں ہوتے شاہ زیب! خدا حافظ۔'' ریحانہ نے کہا اور وہاں سے واپس چل پڑی۔

☆☆☆

الیاس خاں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے جب وہ زمینوں پر پہنچا تو وہاں اسے چاروں طرف لاشیں اور خون بکھرا ہوا ملا۔ جبار خاں کی حالت خراب تھی۔ ٹھیکیدار ایک طرف گردن لٹکائے بیٹھا تھا۔ الیاس خاں وہاں پہنچا تو جبار خاں نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

''یہ دیکھ لو خاں جی! یہ دیکھ لو آج اس مردود نے میرا گریبان پکڑ لیا ہے۔ میرا گریبان خاں جی! میرا گریبان ---'' الیاس خاں نے چونک کر جبار خاں کو دیکھا اور کہا۔

''کس مردود نے؟''

''ٹھیکیدار نے خاں جی --- اس ٹھیکیدار نے۔''

''کیوں؟ کیوں؟'' الیاس خاں دھاڑا۔

''اس لیے کہ اس کے چھ آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے ہیں۔''

''اوئے، تو کیا ہم نے انہیں مار دیا۔'' ٹھیکیدار اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

''ہاں۔ خاں جی! آپ نے ان بے گناہوں کو مار دیا۔''

''اوئے۔ کیا بکواس کر رہا ہے۔''

''بالکل ٹھیک ہے خاں جی! یہ دیکھ لیجئے خاں جی! ان کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔''

''اوئے۔ تو ان کو ہم نے تو نہیں مارا۔''

''منع کیا تھا میں نے خاں جی --- کہا تھا میں نے کہ اگر جھگڑے والی بات ہے تو ہمیں جانے دو --- ہم تو غریب محنت کرنے والے مزدور --- ہمارا بھلا چودھریوں کے جھگڑوں سے کیا تعلق۔ پر خاں جی! ہمارے آدمی بھی مارے گئے۔ ذمہ داری تھی ہم پر ان کی۔ اب بتاؤ کیا کریں ان کا؟''

''اوئے لے جا کر دفن کر دو اور کیا کرو گے۔ کفن دفن کے پیسے لے لو۔''

''نہیں خاں جی! ایسا تو نہیں ہوتا۔''

''تو پھر کیا ہوتا ہے؟''

''یہ تو آپ ہی جانتے ہو خاں جی!''

''اوئے سمجھتا ہوں میں تم لوگوں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ جیبیں بھرنا چاہتے ہو ان کے حوالے سے۔''

''لعنت بھیجتے ہیں خاں جی ہم' ایسی جیبوں پر جو اپنے بھائیوں کے خون سے بھری جائیں۔''

''اوئے لیڈر بننے کی کوشش مت کرو۔ الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہو کیا آئندہ؟''

''جو دل چاہے آپ کہہ لو خاں جی! لیکن ہم --- ہم ---؟''

''اوئے۔ یہ کیا بکواس کر رہا ہے جبار خاں!''

''بھائی جی! آپ خود دیکھ لو --- آپ دیکھ لو جی --- اور ابھی ہمارے بندے

مارے گئے ہیں---دیکھ لو۔''

''تو پھر کرنا کیا ہے؟''

''ایک بات کہوں خاں جی!---اب ایف' آئی' آر لکھوانا ضروری ہے۔اتنے بڑے مسئلے کو ہم نہیں سنبھال سکیں گے۔''

''اوئے یہ خونی زمین نجانے کتنے بندوں کا خون کروائے گی۔ بیٹا کھو چکا ہوں میں اس کے لیے اور ایک قسم میں بھی کھاتا ہوں۔اگر یہاں میں نے بھٹہ نہ تعمیر کیا' اگر اس جگہ کو جہنم نہ بنا دیا تو لعنت ہے میری جنتی پر۔لعنت ہے کچھ اور کرنے والے پر۔'' الیاس خاں نے کہا۔

''خاں جی فوراً اطلاع دی جائے پولیس کو۔''

''ہاں۔اب یہ ضروری ہو گیا ہے۔''

''ایف' آئی' آر میں کس کا نام لکھواؤ گے؟''

''سیدھی سیدھی بات ہے شاہ زیب تو جیل میں ہے اب یہ کارروائی اس کے حوالے سے تو نہیں کی جا سکتی۔اس سلسلے میں سیدھی سیدھی بات فخر خان کی طرف جاتی ہے۔''

''تو ایف' آئی' آر میں آپ فخر خان کا نام لکھواؤ گے۔''

''ہاں۔''

''ٹھیک ہے۔''

بہر حال پولیس کو اطلاع دی گئی۔ بہت بڑی واردات تھی۔ بہت سے لوگ قتل ہوئے تھے۔ چھوٹا موٹا معاملہ نہیں تھا۔ چاروں طرف ہنگامہ آرائی ہو گئی۔ پولیس والے وہاں پہنچ گئے۔ لاشوں کو دیکھا گیا۔ الیاس خاں اور جبار خاں متعلقہ پولیس اسٹیشن پہنچے

اور فخر خان کے نام ایف آئی آر کٹوا دی گئی۔ یہ ساری کارروائی بڑی زبردست اہمیت کی حامل تھی۔ دونوں بھائی سخت پریشان تھے۔ بھٹے کا کام پھر آخری حد میں پہنچ گیا۔ بھلا ان حالات میں بھٹے کا کام کیسے کیا جا سکتا تھا۔ مزدوروں کی لاشیں ہسپتال پہنچا دی گئیں اور اس سلسلے میں جبار خاں اور الیاس خاں کو ہدایت کی گئی کہ وہ اس وقت تک جب تک اس کے بارے میں کوئی مناسب فیصلہ نہ ہو جائے۔ یہیں قیام کریں۔

بہر حال ٹھیک تھا کہ وہ چودھری تھے لیکن قانون تو قانون ہوتا ہے انہیں کوئی مناسب جواب دینا تھا اور اس جواب کے لیے انہوں نے فوری طور پر اپنے وکیلوں کو طلب کر لیا تھا۔ ان کا قیام لاہور ہی میں تھا۔ گھر والوں کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ وکیلوں نے کہا۔

''آپ کو اس بارے میں پورا یقین ہے کہ یہ کام فخر خان ہی نے کیا ہے؟''

''ابتدا وہیں سے ہوئی تھی وکیل صاحب جی! شاہ زیب تو بیچ میں آ کر ٹپکا۔ اصل میں فخر خان ان علاقوں میں ہمارا بھٹہ نہیں تعمیر ہونے دینا چاہتا تھا اور اس نے اس سلسلے میں ان ساری زمینوں کو خرید لیا تھا۔ جو اس کی سرحدوں سے ملتی ہیں اور اس طرح ہمیں بھٹہ تعمیر کرنے سے روک دیا تھا۔ وہاں صرف شاہ زیب کی وہ زمینیں رہ گئیں تھیں جسے ہم نے ان سے مانگا تو شاہ زیب نے منع کر دیا۔ بس وہیں سے چکر چلا۔''

''ایک بات اور بتائیے خاں جی! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ساری کارروائی جو شاہ زیب کے خلاف کی گئی ہے اور جس کے نتیجے میں شاہ زیب کو مجرم بننا پڑا۔ فخر خان ہی نے کی ہو؟''

''اوئے تو اور کیا ہے؟ فخر خان نے ہی یہ سب کچھ کیا ہے۔''

''تو آپ نے شاہ زیب کو بلا وجہ مجرم بنا دیا۔''

''اوئے یار! تو میرا وکیل ہے یا شاہ زیب کا۔ میرے لیے کچھ کرنا ہے تو کرو ورنہ دوسرے بہت سے وکیل پڑے ہوئے ہیں لاہور میں۔''

''خیر یہ تو آپ کی مرضی ہے خاں جی! آپ جس کو چاہیں اپنا وکیل کر لیجئے۔ اس سلسلے میں آپ کیا دھمکی دے رہے ہیں مجھے۔''

''ارے کمال ہے بھئی کمال ہے۔ اس وقت تو ہر شخص شیر بنا ہوا ہے اور ہم بلی۔''

''نہیں ہم بلی تو نہیں ہیں۔'' جبار خاں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اوئے تو پھر اور کیا ہیں؟''

''خاں جی! اس وکیل سے کہو کہ اگر اس سلسلے میں کارروائی کرنی ہے تو کرے ورنہ اسی وقت سے ہمارا اس کا رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔''

''دیکھئے آپ میرے ساتھ تو زیادتی کر رہے ہیں۔ میں تو صرف وہ باتیں کر رہا ہوں جو حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ بات تو آپ سوچ سکتے ہیں۔ اصل میں جب ہم فخر خان کے خلاف کوئی قدم اٹھائیں گے تو ہمیں ان تمام چیزوں کا خیال تو کرنا ہی پڑے گا۔''

''اوئے تو خیال کر۔ ہم سے بک بک کیوں کر رہا ہے یار!''

''تو پھر آپ یہ بات طے کر چکے ہیں کہ ہم سیدھا سیدھا فخر خان کا نام لے لیں۔''

''سو فیصدی۔''

''ٹھیک ہے۔ بہر حال ان مزدوروں کو آپ کو معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔''

''کیوں؟ ہماری کوئی انشورنس کمپنی ہے۔''

''نہیں ٹھیکیدار نے جو بیان دیا ہے۔ اس کے مطابق اس نے منع کیا تھا جبار خاں صاحب کو کہ اگر جھگڑے والی بات ہے تو وہ ادھر کام نہیں کرنا چاہتا لیکن انہوں نے ذمے داری قبول کی تھی۔''

''اوہ یار وکیل صاحب! دماغ مت خراب کرو۔ جو لین دین کی بات ہو وہ کر لی ے گی۔ پہلے اس فخر خان کو اس سلسلے میں ملوث کرو۔'' فخر خان کو باقاعدہ پولیس ٹوارٹر طلب کیا گیا تھا اور بڑے بڑے افسران کی موجودگی میں فخر خان غصے سے کھولتا اوہاں پہنچا تھا۔ الیاس خاں اور جبار خاں پولیس ہیڈ کوارٹر میں موجود تھے۔

''جی۔ کیسے طلب کیا گیا ہے مجھے؟''

''فخر خان! آپ نے اپنے آدمیوں کے ذریعے وہاں فائرنگ کرائی اور بے شمار راد ہلاک ہو گئے۔ اس سلسلے میں الیاس خاں اور جبار خاں نے آپ کے خلاف ایف ئی آر کٹوائی ہے۔'' فخر خان نے خونی نگاہوں سے الیاس خاں اور جبار خاں کو دیکھا۔

''ہوں۔ تو تم لوگوں نے اس طرح یہ بنیاد ڈال دی ہے۔ ایک بات ذہن میں رکھنا یاس خاں اور جبار خاں تم بھی خاں ہو۔ میں بھی خان ہوں۔ یہ دشمنی اتنی شدید نہیں ٹی۔ بات صرف ناک کی تھی۔ پچاس بھٹے قائم کر لو میرے اوپر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم نے خود لوگوں سے کہا تھا کہ فخر خان کی آس پاس کی زمینوں پر تم بھٹے بنا رہے ہو اور اس کے سارے آدمی تھوڑے دنوں بعد ہمارے بھٹوں پر کام کر رہے ہوں گے۔ میں نے ں پر کہا تھا کہ بھٹہ بنے گا ہی نہیں تو کام کیا ہوگا اور اس کے بعد تم نے بے چارے شاہ زیب کو مصیبت میں ڈال دیا۔ تمہارا خاندانی رشتہ تھا لیکن تم نے اس کا بھی خیال نہیں کیا۔ ٹما بے وقوف نہیں ہوں کہ ایک معمولی سے کام کے لیے اتنے لوگوں کی زندگی چھین لوں۔ سمجھ رہے ہو نا تم لیکن تم نے میرے نام کی ایف آئی آر کٹوا کر اب جو دشمنی کی بنیاد ڈالی ہے اسے یاد رکھنا۔ مجھے تو خیر ان سارے آدمیوں کے قتل کے الزام میں پھانسی نہیں دلوا سکو گے کیونکہ یہ قتل کبھی ثابت ہی نہیں ہوگا اور ثابت اس لیے نہیں ہوگا کہ یہ قتل میں نے نہیں کیا ہے میں یہاں تک جانے کا عادی نہیں ہوں۔ آخر کار اس بات کا پتہ چل

جائے گا کہ اصل مجرم کون تھا لیکن اس کے بعد جو ہوگا الیاس خاں اسے یاد رکھنا۔“ فخر
خان کا لہجہ اتنا سنگین تھا کہ سچ مچ الیاس خاں اور جبار خاں کو ایک ہلکے سے خوف کا
احساس ہوا۔

”لو بھئی--- ہم نے آخری بات تو نہیں کہی ہے۔ پولیس تفتیش کرے گی اگر تم مجرم
ثابت ہوئے تو تمہیں سزا ملے گی ورنہ کوئی بات نہیں ہے۔ اصل مجرم پکڑا جائے گا۔“
الیاس خاں نے کہا۔

”اور تم نے جو مجھے یہاں بلایا ہے اس کے لیے کیا کرو گے؟“

”اوہ بھائی! کوئی تم گرفتار تو نہیں ہوئے۔“

”گرفتاری تو ہوگئی۔ مقدمہ چلے گا‘ تفتیش ہوگی۔ اس کے بعد آخری عمل ہوگا۔“ یہ
بات پولیس کے ایک افسر اعلیٰ نے کہی تھی۔

”کیا مطلب ہے--- آپ کا افسر جی!“ فخر خان نے پوچھا۔

”دیکھئے جب کسی کے خلاف ایف آئی آر درج کرائی جاتی ہے اور مدعی ایف آئی
آر پر دستخط کرتے ہیں تو جس کے خلاف ایف آئی آر درج کی جاتی ہے اس کی گرفتاری
بھی لازمی ہوتی ہے۔ ہاں--- آپ بھی ایک بڑے آدمی ہیں۔ آپ چاہیں تو اپنے وکیل
کو ٹیلی فون کر کے بلا سکتے ہیں۔ وہ آپ کا قانونی تحفظ کرے گا۔ آپ اپنے آپ کو گرفتار
سمجھئے۔“

”ہوں۔ تو یہ بات ہے ٹھیک ہے الیاس خاں! یاد رکھوں گا اسے۔ یہ دشمنی اب
پشتوں چلے گی اور دونوں خاندانوں میں سے ایک خاندان باقی بچے گا۔ تمہارا یا میرا۔“

فخر خان کو گرفتار کر لیا گیا۔ اسے لاک اپ میں ڈال دیا گیا۔ اس نے اپنے وکیل کو
ٹیلی فون کر دیا تھا لیکن جبار خاں اور الیاس خاں کی حالت خراب تھی۔ وہ گھر واپس آئے

ن ان کے چہرے خوف سے زرد پڑے ہوئے تھے۔

”یہ تو مصیبتوں پر مصیبتیں نازل ہوتی جا رہی ہیں۔ اب کیا کریں؟“

”سوچنا پڑے گا بھائی جی! فخر خان بھی کوئی گڑ کا ٹکڑا نہیں ہے کہ آسانی سے منہ
رکھ کر گھل جائے گا۔ حلق میں ہڈی کی طرح اٹک جائے گا۔“

”یار! گڑ بڑ زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ اسے کم کرنے کا کوئی طریقہ دریافت کرو۔“
یاس خاں نے پرخیال انداز میں گال کھجاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

تقدیر مہربانیوں پر مہربانیاں کر رہی تھی۔ وقت لمحہ لمحہ تبدیل ہو رہا تھا۔ بس سارے
ھیل مقدر کے ہوتے ہیں۔ شاہ زیب پر بھی زندگی کچھ اس طرح تلخ ہوگئی تھی کہ اس کی
ہی سوچنے سمجھنے کی قوتیں صلب ہوگئیں تھیں۔ عدالت نے اسے جیل بھجوا دیا تھا۔ اتنے
طرناک مجرم کو لاک اپ میں رکھ کر فرار کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ وہ شک و شبہ
ے بالاتر مجرم تھا۔

چنانچہ جیل میں شاہ زیب کو سخت نگرانی میں رکھا جا رہا تھا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھری میں
اے بالکل علیحدہ رکھا گیا تھا۔ پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں تھیں اور شاہ زیب ایک
ئی دنیا کا نظارہ کر رہا تھا۔ وہ اس وقت جس کوٹھری میں تھا وہ انتہائی گندی‘ غلیظ اور
دار تھی۔ سلاخوں دار دروازہ چھت کے قریب ایک چھوٹا سا روشندان جس کے عین
منے اس وقت چاند جگمگا رہا تھا اور پوری رات کی چاندنی پوری کوٹھی کو منور کئے ہوئے
ما۔

شاہ زیب نے مسکراتی نگاہوں سے چاند کو دیکھا۔ ماضی کے بہت سے نقش آنکھوں
ما اتر آئے۔ یہی چاندنی کبھی آم اور کینوں کے باغ پر اتری تھی اور ایسی کئی راتیں شاہ

زیب نے اس باغ میں گزاریں تھیں۔ خاص طور سے جب وہ واپس جایا کرتا تھا ماں زندہ تھی۔ یہ دونوں بھائی بھی اس وقت بہت محبت کرنے والے بھائی تھے۔ دوستوں کے ساتھ باغ میں چودھویں رات کے چاند کا نظارہ کچھ عجیب ہی ہوا کرتا تھا۔ ہوائیں آموں کی کھٹی میٹھی خوشبو سمیٹے ہوئے ادھر سے ادھر گردش کرتی تھیں۔ کینوں پکتے تھے تو ان کے چھلکوں کی مدھری خوشبو پورے باغ میں پھیلی ہوتی تھی اور اس وقت دل چاہتا تھا کہ بس وہیں زندگی کی شام ہو جائے۔ بہت سی بار اس کے دوست اسے کسی حسین منزل کی طرف رخ کر کے کھڑے ہونے کو کہتے تھے۔ دیہاتی دوست طرح طرح کی باتیں کرتے تھے اور اس سے کہتے تھے کہ زندگی تو صرف اس کے لیے باقی ہے اور کیا رکھا ہے۔ شاہ زیب کو نجانے کیا کیا کچھ یاد آیا اور اسی وقت کہیں دور سے ایک مدھری آواز اس کے کانوں میں ابھری۔

چپ چپ رہندے
کجھ نہ کیندے
چن اسمانوں تکدا رہندا
پھلاں وانگوں ہسدا رہندا
کدی کدائیں
لک لکا کے
پچھلی رات ڈبکی لا کے
ستیاں لہراں نوں گل لا کے
روندا رہندا
ہسدا رہندا

کون دلا سے کس نوں دیندا

یہ ساری باتیں شاہ زیب کے لیے زندگی کا ایک انوکھا سرمایہ تھیں۔ اب تو اس کا ل بھی زخمی ہو گیا تھا اور یہ زخم بھی بڑا انوکھا تھا۔

''بہر حال جو کچھ بھی ہوا وہ بار بار غور کرنے کے قابل تھا۔ ریحانہ کے لیے پہلے ں کے دل میں میل آیا تھا لیکن ریحانہ نے آ کر بتایا تھا کہ صورتحال کیا ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ میں سچائی تھی۔ لیکن اب کیا ہوگا۔ اب اگر زندگی موت کے قریب بھی پہنچ جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اپنے آپ سے لاپرواہی آنے والے وقت میں سکون دے گی۔

بہر حال اس کے بعد اس نے جیل کی دنیا کا تجزیہ شروع کر دیا۔ یہاں کی زندگی بھی عجیب تھی۔ قیدیوں کو مار لگتی تھی، حالت بری ہو جاتی تھی۔ جیلر ایک انتہائی سخت گیر آدمی تھا اور قیدیوں کے ساتھ سخت سلوک کیا جاتا تھا۔ جیل میں ایسی ایسی انہونی باتیں ہوتی تھیں۔ قیدی کے عزت نفس کی چادر پر ذلت کے اتنے داغ لگتے تھے کہ پھر ذات نام کی کوئی چیز ذہن پر نہیں رہ جاتی تھی۔ ہر طرح کی سختیاں کی جاتی تھیں۔ جیل کے احاطے میں ایک جگہ سیوریج لائن کے لیے زمین کھودنی تھی۔

چنانچہ شاہ زیب کو بھی اسی کام کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ کئی افراد وہاں کدالیں اور بیلچے لئے ہوئے کام کر رہے تھے اور دن بھر کی مشقت کے بعد جب تھکے ماندے قیدی فارغ ہوتے تو انہیں ایک قطار بنا کر بیٹھ جانا پڑتا تھا۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک پیالہ دے دیا جاتا تھا اور پتلی دال اور روٹیاں مل جایا کرتی تھیں۔ بساند بھرے چاول یہ سارا کھانا کھا کر سچی بات یہ ہے کہ کھانے کو دل نہیں چاہتا تھا اور کھانے کا وقت بھی عذاب ہی محسوس ہوتا تھا لیکن پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے تو یہ سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔

بہرحال یوں یہ سارا معاملہ چلتا جارہا تھا اور شاہ زیب کو اب اس میں بھی لطف آنے لگا تھا۔ زندگی عیش و عشرت سے گزارنا تو ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے لیکن جو زندگی تقدیر سونپ دے اسے گزارنا ایک بڑا کام ہے۔ قیدیوں میں ایسے ایسے لوگ موجود تھے جو بہت ہی اچھے لوگ ہوا کرتے تھے لیکن تقدیر نے انہیں بھی قیدی بنا دیا تھا۔

بہرحال یہ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں۔ کبھی کبھی شاہ زیب کے دماغ میں آندھیاں چلنے لگتی تھیں اور اس پر عجیب عجیب سی کیفیتیں طاری ہو جاتی تھیں۔ لیکن بہرحال ساری باتیں اپنی جگہ۔ یادیں کبھی پیچھا نہیں چھوڑتیں اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنے بھائیوں کی طرف سے بڑا دکھی تھا۔ ان میں سے کسی نے ابھی تک اس کی خبر نہیں لی تھی۔ ٹھیک ہے کوئی کچھ کر سکتا یا نہ کر سکتا لیکن بھائی تو تھا یہ۔ بہرحال وقت گزرتا رہا۔ غالباً اسے ابھی کافی عرصے کے بعد عدالت میں پیش ہونا تھا۔ اس کے بارے میں تحقیقات ہو رہی تھیں۔ تھوڑی بہت قانون سے واقفیت اسے بھی حاصل تھی۔ جیل میں اس وقت تک جب تک کسی قیدی کو سزا نہ ہو جائے قیدیوں کے ساتھ برا سلوک کرنا لیکن یہاں کا باوا آدم نرالا تھا۔ کوئی بھی کچھ نہیں پوچھتا تھا۔ پھر ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا۔ جس نے شاہ زیب کو ایک عجیب و غریب حادثے سے دوچار کر دیا۔ اس دن بھی وہ لوگ سیوریج لائن کی کھدائی کے لیے کام کر رہے تھے اور بہت سے قیدی آس پاس موجود تھے کہ اچانک ایک آفیسر چند آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''تم لوگوں میں سے چرس کس کے پاس ہے؟ مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم میں سے کسی کے پاس چرس موجود ہے۔'' تمام قیدی ساکت کھڑے رہے۔ آفیسر ایک ایک کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ابھی تھوڑی دیر کے بعد تمہاری تلاشی لی جائے گی اور اگر تم میں سے کسی کے پاس

ں برآمد ہو گیا تو تم اپنا کیا ہوا خود ہی بھگتو گے۔ جب میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ چرس ے حوالے کر دی جائے تو تمہیں میری بات ماننی چاہیے۔''

آفیسر نے جو جیلر نہیں تھا بلکہ جیل کا کوئی اور آفیسر تھا۔ ایک نگاہ پاس کھڑے ہوئے یوں پر ڈالی۔ شاہ زیب اور دوسرے قیدی ساکت ہو گئے تھے۔ آفیسر نے دوسری بار ں جملے دوہرائے اور اس کے بعد وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ تلاشی لینے لگا۔ ایک عمر یدہ قیدی نے دبی زبان میں کہا۔

''صاحب جی! بھلا جیل میں چرس کیسے آ سکتی ہے؟ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔'' ''بس غضب ہو گیا۔ آفیسر نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''کتے دے پتر! ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اس عمر یدہ شخص کا گریبان پکڑ کر اسے پوری قوت سے دھکا دیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا کھدی ہوئی ین کے گڑھے میں جا گرا۔ اس کا منہ فرش سے لگا اور ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ وہ فیسر ایک اچھے بدن کا مالک تھا۔ اس لیے عمر رسیدہ قیدی کو خاصی چوٹ لگی تھی۔ اس نے پنے آدمی کو اشارہ کیا اور اس کے آدمی نے قیدی کو گڑھے سے باہر نکالا اور زمین پر ڈال یا۔ باقی تمام لوگ خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے۔ آفیسر نے عمر رسیدہ آدمی کو بوٹ کی ٹھوکروں سے مارنا شروع کر دیا اور اس وقت تک مارتا رہا جب تک کہ قیدی کے پورے سم پر زخموں کے نشان نہ بن گئے۔ اس وقت اچانک شاہ زیب کے بدن میں بجلیاں سی ر گئیں۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا کر رہے ہو تم؟ اس کے پاس سے چرس برآمد نہیں ہوئی تھی۔ پھر تم اسے کیوں ار رہے ہو؟'' آفیسر رک گیا اس نے شاہ زیب کو دیکھا اور اس بعد آگے بڑھا اور شاہ زیب کے قریب پہنچ کر بولا۔

(حصہ دوم)

"بہت زیادہ جوشیلہ ہے رے تو۔ کتے کے پلے!" آفیسر کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ شاہ زیب کا الٹا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا۔ چوڑے چکلے جسم والا آفیسر اپنی جگہ سے دو فٹ اونچا اچھلا اور زمین پر جا گرا لیکن اس کے ساتھ ہی اچانک چاروں طرف سے لوگ شاہ زیب پر ٹوٹ پڑے اور پھر اس کے بعد شاہ زیب کے لیے ان سے مقابلہ کرنا مشکل ہو گیا۔ پیروں میں بیڑیاں تھیں' ہاتھ آزاد تھے۔ تین چار کے جبڑے توڑ کر وہ آخر کار بے ہوش ہو گیا۔ پھر نجانے کب تک یہ بے ہوشی طاری رہی اور اس کے بعد جب ہوش آیا تو وہ اس کوٹھری میں نہیں تھا' جہاں اسے پہلے رکھا گیا تھا۔ بلکہ اب وہ ایک بیرک میں تھا جو دوسرے قیدیوں کے ساتھ ساتھ ہی تھا۔ اس کے جسم میں جگہ جگہ تکلیف ہو رہی تھی۔ ہونٹ خشک تھے اس کے منہ سے بھرائی ہوئی آواز نکلی۔

"پانی!" قریب ہی ایک سایہ حرکت میں آیا اور مٹی کے گھڑے سے تھوڑا سا پانی نکال کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا گیا۔ اس وقت شاہ زیب کو ہر چیز بڑی عجیب و غریب محسوس ہو رہی تھی۔

بہر حال پانی پلانے والے نے اسے پانی پلایا۔ شاہ زیب کے ذہن میں واقعات متحرک ہو گئے اور اس کے وجود میں تاریکیاں اترنے لگیں۔ تو یہ ہوگا اب اس کے ساتھ۔ سزائے موت تو اب اس کا مقدر ہے لیکن یہ سزا اب نجانے کب ملے گی۔ اس وقت تک اس بے بسی کو کیسے گزارہ جائے۔ کیسے گزارہ جائے اس بے بسی کو۔ بڑی عجیب سی کیفیت تھی۔

بہر حال ان تمام چیزوں کو محسوس کر کے اس کے دل میں صرف ایک ہی احساس پیدا ہوتا تھا۔ وقت اگر ساتھ دے تو ان سب سے انتقام لینے کی کوشش کی جائے۔ واقعی انتقام بہت ضروری ہے۔ یہ انتقام زندگی کا ایک اہم مقصد بن جانا چاہیے۔ یہ تو کوئی بات

نہ ہوئی۔ کچھ کیا نہ دھرا خواہ مخواہ جرائم سر پر مسلط ہوتے چلے گئے۔ میں نے اپنے آپ تو اپنے آپ کو مجرم بنانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

بہر حال یہ ساری باتیں اس طرح سے ہو رہی تھیں اور شاہ زیب اپنے آپ کو شدید بے بسی کا شکار محسوس کرتا تھا۔ دیکھیں آگے کیا ہوتا تھا۔ جیل کے اندر کسی آفیسر پر ہاتھ اٹھا دینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ بات یہیں ختم ہو گئی تھی۔ وہ آفیسر تو شاہ زیب کی جان کا دشمن بن گیا تھا اور شاہ زیب کو باقاعدہ منصوبے کے تحت خاص قید سے نکال کر عام قیدیوں کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ اب کبھی کبھی عقل پر مٹی پڑ جاتی ہے۔ وہ ایک الگ بات تھی۔ آفیسر اعلیٰ نے دوسرے دن ہی صبح کو شاہ زیب کو بیرک سے نکلوا کر اپنے اس آفس میں طلب کر لیا جہاں اذیت رسانی کے آلات موجود تھے۔ یہ ایک ایسی بھیانک جگہ تھی جیسے پھانسی گھر' موت گھر کچھ بھی کہا جا سکتا تھا کیونکہ یہاں آنے کے بعد زندگی بچا کر نکل جانا ایک مشکل کام ہی تھا اور اکثر قیدی یہ بات جانتے تھے کہ تحقیقات کے لیے لے جائے جانے والے واپس کیوں نہیں آتے اور وہاں جا کر گم کیوں ہو جاتے ہیں۔ شاہ زیب کو یہ تمام تفصیلات معلوم نہیں تھیں۔

بہر حال جب اس نے اس آفس میں اس پولیس آفیسر کو دیکھا تو نجانے کیوں اسے یہ احساس ہوا کہ آج دن کچھ الگ اور سنگین نوعیت رکھتا ہے۔ آفیسر نے گہری نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا۔ دو آدمی اور بھی موجود تھے۔ اس نے کہا۔

"کس دو اس حرام کے کتے کو۔"

"آفیسر! دیکھو گالی مت بکو جو کرنا ہے کر لو۔ گالی مت بکنا۔"

"ابھی بتاتا ہوں تجھے تیری ساری اکڑفوں نہ نکال دو تو غلام شاہ نام نہیں ہے۔" آفیسر نے دانت پیس کر کہا۔ شاہ زیب کو ایک ٹکٹکی سے باندھ دیا گیا اور آفیسر نے کہا۔

''ننگا کر دو حرامی کو۔'' شاہ زیب نے ایک بار پھر خونی نگاہوں سے اس آفیسر کو دیکھا اور مدھم لہجے میں کہا۔

''یہ دوسری گالی ہے یاد رکھنا۔'' جواب میں آفیسر ایک موٹا سا ڈنڈا لے کر کھڑا ہو گیا۔ ادھر پہلے سے موجود دونوں آدمی شاہ زیب کے لباس کی جانب بڑھے لیکن بہرحال خوش بختی نے یہاں شاہ زیب کے سامنے چادر تان دی۔ جیلر اندر داخل ہوا۔ اس نے شاہ زیب کو دیکھا اور چونک کر بولا۔

''اوہ۔ کیا بات ہے بھئی اسے ادھر کیوں بلوا لیا؟''

''سر جی! مجھے اس سے حساب چکتا کرنا ہے۔ یہ ذرا اونچے پائے کا بندہ ہے۔''

''اوئے یار! عقل سے کام لیا کر تو غلام شاہ! ہر وقت یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ اسے سزا نہیں ہوئی ہے۔ ابھی اسے عدالت میں جانا پڑے گا۔ کیا جواب دے گا تو جج صاحب کے سامنے، اگر یہ ٹوٹ پھوٹ گیا؟''

''مگر سر جی! اس نے میرے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔''

''اوئے تو وقت ملے گا، اس بدتمیزی کو پورا کرنے کا۔ ابھی پتہ ہے کیا بات ہے۔ ایک بندہ آیا ہے شہاب الدین، کام کا بندہ ہے بلکہ میری اس سے دور کی رشتہ داری بھی نکلتی ہے۔ اس کے لیے آیا ہے وہ وکیل کو لے کر۔ وہ تو شکر ہے خدا کا میں اس طرف آ گیا۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ اسے تیرے آفس میں لے جایا گیا ہے۔ کھول یار! اسے لے جانا ہے اپنے ساتھ۔'' آفیسر تلملا کر رہ گیا۔

بہرحال شاہ زیب کو کھول لیا گیا۔ پتہ نہیں موت اس کے قریب سے گزری تھی یا خوش بختی نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ بہرحال ملاقات کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جیلر ساتھ ہی ساتھ تھا۔ راجہ شہاب الدین، اسلم خان اور ایک وکیل صاحب کے ساتھ موجود

تھا۔ وکیل صاحب نے شاہ زیب کو سر سے پاؤں تک دیکھا پھر گردن ہلا کر بولے۔

''ہوں۔ یہاں کوئی سختی تو نہیں ہو رہی ہے تمہارے ساتھ؟'' شاہ زیب نے جیلر کی طرف دیکھا۔ جیلر بھی اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ تب شاہ زیب نے کہا۔

''نہیں۔''

''یہاں دستخط کر دو۔ جیلر صاحب! اسے ریمانڈ کے لیے کب بھیجا جائے گا؟''

''شاید پرسوں۔''

''ٹھیک۔ ہے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس کی حفاظت کیجیے۔''

''ہم اپنے قیدیوں کو بڑے آرام سے رکھتے ہیں آپ بے فکر رہیں۔''

''میں اس سلسلے میں پہلے ہی بات کر چکا ہوں۔ جیلر صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔'' راجہ شہاب الدین نے کہا۔ پھر بولا۔

''کچھ باتیں کر سکتا ہوں تنہائی میں؟''

''ہاں، ہاں۔ ضرور۔ کیا حرج ہے۔'' جیلر صاحب نے کہا اور سب لوگ وہاں سے ہٹ گئے۔ میں راجہ شہاب الدین کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

''کیا واقعی کوئی سختی نہیں کی گئی؟''

''بس یہ سمجھ لیجیے ابھی پھانسی نہیں دی ہے انہوں نے مجھے لیکن ایک بات میں جانتا ہوں تھوڑے عرصے ہی جیل میں رہا تو یہاں سے میری لاش حاصل ہو سکے گی۔''

''وکیل صاحب سے بات کروں گا میں۔ وہ کوئی موثر بندوبست کریں گے تمہارے لیے۔ تم فکر مند نہ ہونا بھائیوں میں سے کوئی آیا ہے؟'' راجہ شہاب الدین نے سوال کیا۔

''نہیں کوئی نہیں۔'' شاہ زیب پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"میں بھی تمہارا بھائی ہوں شاہ زیب تم نے مجھے برائی کے راستے سے ہٹا دیا ہے۔ دیکھو تقدیر اگر کوئی موقع دے گی تو میں تمہیں اپنی بات کی تصدیق کرا دوں گا۔ میں بالکل بدل گیا ہوں اور میری اس کیفیت میں سو فیصدی تمہارا ہاتھ ہے۔" شاہ زیب ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

بہر حال یہ سارے معاملات ہو گئے اور اس کے بعد راجہ شہاب الدین وغیرہ وہاں سے چلے آئے۔

جیلر نے شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوسن بھئی بڑا تیس مار خان ہے تو۔ پتہ چل گیا ہے مجھے تیرے بارے میں۔ چوہدریوں کے خاندان کا ہے اور تو نے بڑے بندے مارے ہیں لیکن ایک بات میں تجھ سے کہوں یہ جیل ہے یہاں ایک سے ایک خطرناک قیدی آتا ہے۔ شیر بن کر آتا ہے اور چوہا بن کر جان دے دیتا ہے۔ یہاں کے لوگ تجھ سے زیادہ تربیت یافتہ ہیں۔ میری بات تیری سمجھ میں آ جائے تو ٹھیک ہے جتنی بھی زندگی بچی ہے تیری، قانون ہی تجھے سزا دے تو زیادہ اچھا ہے۔ غیر قانونی سزا سے بچنے کی کوشش کرنا۔ غلام شاہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ تو نے غلط آدمی سے جھگڑا مول لے لیا ہے۔ تجھے اس کا نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ کوشش تو کروں گا تجھے غلام شاہ کے ہاتھوں موت نصیب نہ ہو لیکن خود تجھے بھی خیال رکھنا ہے۔ میں کب تک تیرے پیچھے لگا رہوں گا۔" شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا تھا تو جیلر نے پھر کہا۔

"تجھے اس بیرک میں پہنچا دوں گا جہاں سے تجھے لایا گیا تھا۔ اکیلی کوٹھری میں غلام شاہ کو زیادہ موقع مل جائے گا۔ وہ بھی بڑا سخت آدمی ہے میرے لیے تجھے بچانا مشکل ہو جائے گا۔"

بہر حال شاہ زیب کو بیرک میں پہنچا دیا گیا اور بیرک کے دوسرے قیدیوں نے ے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ان میں سے کچھ کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ اس قیدی نے غلام شاہ کو مارا ہے اور جب اسے وہاں لے جایا گیا تھا تو قیدیوں نے اسے صبر کر لیا ا لیکن اس کی زندہ سلامت واپسی خود قیدیوں کے لیے بڑی حیران کن تھی۔ وہ اس کو سر ے پاؤں تک دیکھ رہے تھے اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس کا کیا کیا وٹا پھوٹا ہے۔

بہر حال کسی نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ اس کے بعد اس ر کوئی سختی نہیں کی گئی تھی لیکن وقت اس پر بہت ہی سخت گزر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ دیکھو اب کیا ہوتا ہے۔ یہ انتظار اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وقت کی کہانی اگر ختم ہونے والی ہے تو اس میں بھی جلدی ہو جائے تو اچھا ہے۔ اس طرح کیا فائدہ۔

بہر حال دوسرا دن بھی گزر گیا پھر تیسرے دن اسے عدالت جانا تھا۔ اسے اس کی اطلاع دے دی گئی اور کہا گیا کہ صبح آٹھ بجے اسے عدالت کے لیے تیار ہونا ہے۔ بھلا یل کی کوٹھری میں تیاریوں کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ البتہ منہ ہاتھ وغیرہ دھو لیا تھا۔ شیو غیرہ بنانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا اور نہ ہی اس نے اپنی کسی ایسی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ حالانکہ بعض قیدی جنہیں ضرورت ہوا کرتی تھی کہہ دیا کرتے تھے لیکن اس سلسلے یں بھی احتیاط برتی جاتی تھی کیونکہ بہت سے ایسے واقعات ہو چکے تھے۔ جو جیل کے عملے کے لیے پریشانی کا باعث ہوئے تھے۔ مثلاً ایسے کسی قیدی کو شیو بنانے کے لیے کوئی چیز ل گئی۔ اس نے اس سے یا تو اپنے کسی مد مقابل کو زخمی کر دیا یا پھر خودکشی کرنے کی کوشش کی۔

چنانچہ یہ سلسلہ بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اب قیدیوں کو یہ آسانی اور سہولت

میسر نہیں تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے اسے جیل کی گاڑی میں سوار کرایا گیا۔ دو قیدی اور بھی ساتھ تھے۔ ان میں ایک قیدی کوئی چالیس پینتالیس سال کی عمر کا تھا۔ گٹھے ہوئے بدن کا مالک، چہرے سے بھی خباثت ٹپکتی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور گہری سرخ۔ ہونٹ موٹے موٹے دیکھنے ہی سے خطرناک لگتا تھا۔ اس کے صرف ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ پیروں میں بیڑیاں نہیں تھیں۔ چار پولیس والے پیچھے بیٹھ گئے۔ ایک ڈرائیور اور ایک اس کے ساتھ صرف۔ تین قیدی تھے جنہیں جیل لے جایا جا رہا تھا۔ شاہ زیب کے پیروں میں بیڑیاں بھی ڈالی گئیں تھیں کیونکہ بہر حال وہ ایک خطرناک قاتل تھا۔

پولیس کی وین چل پڑی۔ شاہ زیب کے علاوہ بھی دوسرے قیدی تھے۔ ان میں ایک دبلے پتلے بدن کا مالک مجہول سا نوجوان تھا۔ دوسرا وہ شیطان قیدی، تیسرا شاہ زیب۔ پولیس والے ہوشیار بیٹھے ہوئے تھے۔ چوڑے چکلے بدن والا قیدی بار بار جالیوں سے باہر جھانکتا تھا۔ پولیس والوں کے چہروں پر خوف کے آثار تھے۔ وہ رائفلیں لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر قیدی نے آخری بار باہر جھانکا۔ اس کے بعد ہاتھ عجیب سے انداز میں موڑے اور سینے کے پاس کھجانے لگا۔ سپاہیوں کو کوئی خاص احساس نہیں ہوا تھا لیکن دوسرے لمحے قیدی نے ایک بہت ہی اعلیٰ پائے کا ریوالور نکال لیا اور اس پارٹیشن کی جانب دیکھنے لگا جو ڈرائیونگ سیٹ کے اور پچھلے حصے کے درمیان تھا۔ درمیان میں اچھی خاصی چوڑے خانوں والی جالی لگی ہوئی تھی۔ قیدی نے اطمینان سے ریوالور کی نال جالی کے اس سوراخ پر رکھ کر ڈرائیور کے سر کا نشانہ لیا اور ایک زوردار فائر کی آواز ہوئی۔ پولیس والے بری طرح اچھل پڑے۔

ادھر ڈرائیور کے سر کے چیتھڑے اڑ گئے تھے۔ اس نے فوراً ہی ریوالور کا رخ تبدیل کر کے ڈرائیور کے برابر بیٹھے ہوئے شخص کے سر کا بھی نشانہ لیا اور دوسرا فائر اس پر

کر دیا۔ ادھر پولیس والوں نے جو پیچھے بیٹھے ہوئے تھے صورتحال سے واقف ہوتے ہی اپنی رائفلیں سنبھال لیں لیکن قیدی نے ڈز ڈز کر کے چاروں کے کامیاب نشانے لیے اور وہ اپنے اپنے سینے پکڑ کر گاڑی کے فرش پر اوندھے ہو گئے تھے۔

شاہ زیب سکتے کے عالم میں قیدی کی یہ کاوش دیکھ رہا تھا۔ ادھر پولیس کی ویگن بری طرح سڑک پر لہرانے لگی تھی اور شاہ زیب کو اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا جبکہ اس کے برابر والے مجہول آدمی نے تین چار قلابازیاں کھائیں تھیں۔ چوڑے چکلے بدن والا آدمی ہوشیار تھا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد ایک زوردار دھماکے کے ساتھ گاڑی ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ قیدی اس کے لیے تیار تھا لیکن شاہ زیب خود بھی قلابازیاں کھا گیا تھا۔ پھر اس کے بعد قیدی نے کہا۔

''یہ جو تیرے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے پاس ہتھکڑی کی چابی موجود ہے۔ جلدی کر، جلدی کر، جلدی کر۔'' شاہ زیب کا پورا بدن اس طرح سنسناہٹ کا شکار تھا کہ وہ ہاتھ پاؤں بھی نہ ہلا سکا تو قیدی نے دانت پیستے ہوئے اسے دیکھا اور بولا۔

''بزدل مت بن تیری کہانی تو بڑی بہادری کی ہے۔ یہ کیا کر رہا ہے یہ لے۔'' یہ کہہ کر قیدی نے ہتھکڑیوں والے ہاتھ آگے بڑھائے اور پھر ایک سپاہی کی کمر سے چابی کا گچھا کھینچ کر شاہ زیب کی طرف اچھال دیا۔

''لے میرے ہاتھ کی ہتھکڑی کھول۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے۔ ہتھکڑی پر چابیاں آزمانے لگا۔

''سولہ نمبر--- سولہ نمبر۔'' قیدی نے بھری ہوئی آواز میں کہا اور شاہ زیب نے سولہ نمبر کی چابی سے اس کی ہتھکڑی کھول دی۔

''اب اپنے ہاتھ ادھر لا۔'' قیدی بولا اور ایک لمحے کے اندر اندر اس نے شاہ زیب

کے ہاتھ آزاد کر دیئے۔ پھر بولا۔

’’یہ لے ہتھکڑی کی چابی۔ مگر رک میں ذرا اندر سے تالہ کھول لوں۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے ایک اور چابی سے پولیس ویگن کا اندر سے بند دروازہ کھولا اور چابی دوبارہ شاہ زیب کی طرف اچھال کر بولا۔

’’یہ بیڑیوں سے نجات پالے۔ یہ بھوتنی کا پلہ تو شاید بے ہوش ہو گیا۔‘‘ اس نے دوسرے قیدی کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ جس کی ٹانگیں سیٹ پر تھیں اور منہ نیچے ویگن میں دو طرف خون اچھل رہا تھا۔ شاہ زیب کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ تھی لیکن قیدی ایک پولیس والے کی رائفل لے کر نیچے اتر گیا۔

’’بھری پری سڑک ہے۔ گاڑیاں رکیں گی میں ذرا ان کو بھگاتا ہوں۔‘‘ وہ نیچے اتر گیا اور شاہ زیب اپنے پیروں کی بیڑیاں کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہاتھوں میں لرزش تھی۔ اس لیے بیڑیاں کھلنے میں کافی دقت ہو رہی تھی۔ ادھر قیدی سڑک پر تماشے کر رہا تھا۔ اس نے رائفل سنبھال لی تھی۔ سڑک مصروف تھی اور اس پر سے اچھی خاصی گاڑیاں گزرتی رہتی تھیں۔ غالباً قیدی نے اپنے اندازے کے مطابق ویگن سے بھاگنے کے لیے صحیح جگہ منتخب کی تھی لیکن پھر بھی اکا دکا گاڑی ادھر سے گزر جاتی تھی۔ سب سے پہلے گاڑی والوں کو حیرت ہوئی کہ پولیس کی ویگن درخت سے ٹکرا گئی ہے۔ انہوں نے بریک لگانے کی کوشش کی لیکن دوسرے لمحے قیدی نے رائفل سے دو تین فائر کیے رکنے والی گاڑی بدحواسی میں ہوا ہو گئی۔ اس کے بعد ایک دو گاڑیاں اور گزری تھیں اور قیدی نے دور ہی سے فائرنگ کر کے انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا پھر شاہ زیب بھی اپنی بیڑیاں کھول کر نیچے کود آیا۔ قیدی نے کہا۔

’’رائفل اٹھا لے۔ رائفل اٹھا لے۔ جلدی کر۔‘‘ شاہ زیب نے خود بھی ایک

نفل اٹھالی اور قیدی نے اسے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’آجا۔‘‘ دونوں برق رفتاری سے سڑک کے نشیب میں دوڑنے لگے۔ جہاں کچھ ین تھا بس اونچے نیچے پہاڑی پتھر، جھاڑیاں وغیرہ تھیں۔ وہ لوگ دوڑنے لگے اور تیز ناری سے دوڑتے ہوئے کافی فاصلہ طے کر گئے پھر وہ ایک نہر کے پاس پہنچے تو قیدی ن شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

’’پانی وانی پیئے گا؟‘‘

’’یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی گاڑی پولیس کو اطلاع دے دے گی۔‘‘

’’مگر پولیس یہاں پہنچے گی کیسے۔ جانی سڑک پر بھاگ کر ہی آنا پڑے گا اسے۔ را مطلب ہے اسے کچے راستے پر اور اگر آ بھی گئی تو چار چھ بندے ہوں گے۔ رائفلیں ڈ ہیں۔ سنبھال لیں گے انہیں۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘

’’پر میری رائفل پکڑ میں ذرا منہ ہاتھ دھو لوں۔‘‘ قیدی نے منہ ہاتھ وغیرہ دھویا ر یہی عمل شاہ زیب نے کیا اور اچھی خاصی تازگی کا احساس ہوا۔ قیدی نے کہا۔

’’اب یہاں سے سیدھے چلیں گے۔ اصل میں ہمارا سب سے بڑا مسئلہ کپڑے ں۔ یہ قیدیوں کے کپڑے تو صاف پہچانے جائیں گے۔ یہیں سے مصیبت بن جائے گی۔‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’شاہ زیب ہے نا تیرا نام؟‘‘ قیدی نے کہا۔

’’ہاں۔ تم مجھے جانتے ہو؟‘‘

’’مجھ سے تو یہ کہا گیا تھا کہ تو بھی مجھے جانتا ہے۔ جیل میں تو نے مجھے تلاش کرنے

کی کوشش بھی نہیں کی۔"

"مم۔۔۔میں تمہیں جانتا ہوں؟" شاہ زیب نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں میرا نام جہانگیرہ ہے۔ مکرم شاہ جی نے تجھے میرے بارے میں ضرور بتایا ہوگا۔" شاہ زیب کے ذہن میں ایک شدید گڑگڑاہٹ ہوئی تھی۔ واقعی یہ نام تو اس کے علم میں تھا۔ مکرم شاہ نے یہ نام اسے بتایا تھا۔ چند لمحات وہ بالکل خاموش رہا۔ جہانگیرہ نے کہا۔

"بتایا تھا نا شاہ جی نے تجھے میرا نام؟"

"ہاں۔ لیکن جیل میں میری تم سے ملاقات نہیں ہوئی۔" شاہ زیب نے کہا۔

"الگ الگ جگہیں تھیں اور مجھے تو اس وقت بھی پتہ نہ چلتا لیکن شاہ جی نے باقاعدہ مجھے تیرے بارے میں اطلاع بھجوائی تھی۔"

"بہرحال چھ بندے اور ہلاک ہوگئے اور یہ حساب کتاب ہمارے ہی سر رہے گا۔" جواب میں جہانگیرہ ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔

"صرف تیرے سر۔ اگر میں دوبارہ گرفتار ہوا بلکہ گرفتار تو نہیں ہوں گا لیکن خو اطلاع دوں گا اور اگر شاہ جی کی ہدایت ہوئی تو دوبارہ جیل چلا جاؤں گا۔ میں ان سے یہی کہوں گا کہ یہ سارا کام تو نے کیا ہے۔" شاہ زیب نے پریشان نگاہوں سے جہانگیرہ دیکھا تو وہ ہنس پڑا اور پھر کچھ دیر بعد وہ بولا۔

"لالے کی جان! قتل ایک کرو یا دس کرو یا پچاس کرو۔ سزائے موت ایک ہی ملتی ہے۔ اس کے بعد رہ کیا جاتا ہے۔ تیرے نام میں تو بہت سے قتل لکھے ہیں۔ بندے اور مار دیئے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" میں نے نگاہیں اٹھا کر جہانگیرہ کو دیکھا بڑی خطرناک شکل کا مالک تھا لیکن مزاج کا اچھا ہی معلوم ہوتا تھا۔ شاہ زیب نے پھیکی

ں کے ساتھ گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔

"حالانکہ میں زندگی میں کبھی کسی چڑیا کے بچے کو بھی نہیں مارنا چاہتا تھا۔"

"دیکھ بیٹا! وقت انسان کے لیے راستے طے کرتا ہے اور پھر تو تو پہلے بھی قاتل ہی ۔ مرد بن مرد؛ بزدلی سے کام نہیں چلتا۔ اصل میں مجھے شاہ جی کے کہنے پر ہی چلنا ہے۔ شاہ جی کہیں گے کہ میں دوبارہ پولیس کے ہاتھ میں نہ جاؤں تو وہ بھی مان لوں گا اور ے ساتھ رہوں گا۔ خیر ابھی تو میرا تیرا ساتھ ہے لیکن جب بھی کبھی میں شاہ جی کے حکم مطابق واپس پلٹا تو یہی کہوں گا کہ راستے میں اچانک تم نے پستول نکال لیا اور رنگ شروع کردی۔ اگر ہوسکا تو میں اپنے بھی کوئی چھوٹا موٹا زخم لگا لوں گا۔ یہی کہوں ا کہ تو مجھے گرفتار کرکے لیا گیا تھا۔"

"لیکن کیوں؟" شاہ زیب نے سوال کیا۔

"اس لیے بیٹا کہ مجھے زیادہ تر وقت جیل میں ہی گزارنا ہوتا ہے۔ شاہ جی کے ندے اگر جیل پہنچتے ہیں تو مجھے وہاں ان کی مدد کرنا ہوتی ہے۔ انہیں نکالنا ہوتا ہے۔ ہاں ر پھر بھی پولیس یا جیل والوں کو شک ہوگیا تو پھر الگ بات ہے وہاں سے نکل لوں گا۔"

شاہ زیب کو جہانگیرہ کی بات پر بہت ہنسی آئی تھی لیکن تھی یہ بڑے گر کی بات۔ یرہ جیل میں مکرم شاہ کا نمائندہ ہوا کرتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ مکرم شاہ کے آدمی ا پہنچتے رہتے تھے۔ بہت سی باتیں شاہ زیب کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ لیکن ہی ان کی چھان بین مناسب نہیں تھی۔ ذرا اندازہ ہو جائے کہ جہانگیرہ ہے کس قسم کا لا۔ ویسے کافی سنگدل، سفاک اور خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ بات پھر وہیں آجاتی تھی کرم شاہ بذات خود کیا چیز ہے۔ بہرحال وہ تین یا چار گھنٹے تک سفر کرتے رہے اور اس بعد جہانگیرہ نے کہا۔

''کافی لمبے چل لیے ہیں ہم۔ وہ لوگ اگر کوشش بھی کریں گے تو دیر لگے گی انہیں۔ ویسے میں تمہیں یہاں سے لے کر رحیم کوٹ جاؤں گا۔ رحیم کوٹ ایک چھوٹا گاؤں ہے مگر وہاں ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔ وہاں میرے چاچے کے بیٹے کا گھر ہے۔ یوں سمجھ لے میرا اپنا گھر ہے۔ ہم کوشش کر کے وہاں تک پہنچ جائیں گے۔ بہت زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔'' شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جہانگیرہ اب کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ابھی تو بہت سی مشکلیں اٹھانی پڑیں گی۔ ہم یہ تو نہیں سوچ سکتے کہ پولیس ہمارے سلسلے میں کچھ نہیں کرے گی۔ چھ بندے مارے گئے ہیں۔ کھلبلی تو مچ جائے گی۔ پر ہم بھی انسان ہیں۔ تیرے دل میں خوف تو نہیں ہے؟'' شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جہانگیرہ پھر بولا۔

''اب کچھ دیر آرام کرنا ضروری ہے۔ ورنہ تھکن سے چور چور ہو جائیں گے۔ یہاں اس جگہ آرام کیا جاسکتا ہے۔'' اس نے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔ شاہ زیب نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کہی تھی۔ درختوں کے جھنڈ میں پہنچ کر وہ دونوں لیٹ گئے۔ جہانگیرہ نے کہا۔

''ابھی کھانے پینے کے لیے تو کچھ ہے نہیں دیکھنا ہوگا' وقت گزارنا ہوگا اور اس کے بعد دیکھیں گے کہ کیا ہوسکتا ہے۔ دھوپ ٹیلوں کی چوٹیوں اور درختوں کی اونچی اونچی شاخوں پر جھک رہی تھی۔ نجانے کتنی تھکن ذہن پر سوار تھی کہ نیند آ گئی۔ شام ہونے سے کچھ دیر قبل جہانگیرہ نے اسے جگا دیا اور شاہ زیب آنکھیں ملتا ہوا اٹھ گیا۔ روشنیاں دھندلی پڑ چکی تھیں۔ دن ختم ہو رہا تھا اور شام کی آمد آمد تھی۔

تھوڑی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر وہ دونوں وہاں سے نکل کر آگے بڑھنے

کے لیے تیار ہونے لگے۔ سورج اونچے اونچے ٹیلوں کے نیچے غروب ہو چکا تھا اور شام کا دھندلکا ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ چنانچہ دونوں آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ رحیم کوٹ کے بارے میں جہانگیرہ نے اسے کہا تھا لیکن بعد میں جب وہ چلنے کے لیے تیار ہوئے تو جہانگیرہ خود ہی بولا۔

''تو ایسا کر۔ میرے خیال میں تو یہاں سے آگے بڑھ جا۔ ہم دونوں کو ایک ساتھ نہیں چلنا چاہیے۔ ذرا سا غور کرنا ہوگا کہ پولیس ہمارے سلسلے میں کیا کرتی ہے۔''

''جیسی تمہاری مرضی میں خود کچھ نہ کچھ اپنے لیے کرلوں گا۔''

''ٹھیک ہے تو بےفکر رہنا میں تجھے تلاش کرلوں گا۔'' شاہ زیب کو خود بھی اب اس بات کا اندازہ تھا کہ صورتحال مزید سنگین ہوگئی ہے۔ اس کے لیے تو خیر پہلے ہی کوئی جگہ نہیں تھی لیکن اب بات مزید آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور ٹیلوں کے درمیان سے گزرتا ہوا میدان میں اتر گیا۔ تھوڑے فاصلے پر جنگلی جھاڑیوں کے جھنگر نظر آ رہے تھے۔ کہیں سے پانی کے سیلن کی خوشبو بھی تھی اس کا مطلب تھا کہ پانی کا کوئی جوہڑ' تالاب یا نہر تھوڑے فاصلے پر موجود ہے۔ وہ آگے بڑھنے لگا اور جنگلی جھاڑیوں سے اپنے جسم کو خراشوں سے بچاتا ہوا پانی کی تلاش میں آگے چلتا رہا۔ یہ علاقہ ختم ہوا تو نہر نظر آنے لگی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور تھوڑی دیر کے بعد نہر کے کنارے پر پہنچ گیا۔

تھوڑے فاصلے پر نہر کا پل نظر آ رہا تھا۔ اچانک ہی اس نے کچھ آہٹیں سنی اور ایک دم چونک پڑا۔ نہر کے اس پار نظر پڑی تو درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے دھندلی دھندلی روشنی میں پولیس کی وردی نظر آئی۔ وہ زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ درمیان میں بس نہر تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ پولیس والوں نے اسے دیکھا ہے یا نہیں لیکن وہ برق رفتاری سے واپس پلٹا اور تیزی سے جھاڑیوں کی جانب لپک پڑا۔ اسے اب اور زیادہ آوازیں سنائی

دینے لگیں تھیں لیکن اس نے ان آوازوں پر توجہ نہیں دی اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ جنگلی جھاڑیوں سے بھرا ہوا میدان طے کرنے کے بعد وہ ٹیلوں کے قریب پہنچ گیا اور پھر ایک ٹیلے کو اس نے اپنا مسکن بنایا اور بلندی پر پہنچ کر مڑ کر دیکھا۔ اسے ایک لمحے کے اندر اندر اندازہ ہو گیا تھا کہ پولیس والوں کی تعداد کافی ہے اور انہوں نے اسے دیکھ لیا ہے اور وہ برق رفتاری سے رائفلیں سنبھالے نہر کے دوسری جانب دوڑ رہے تھے۔

شاہ زیب کے لیے اب اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں تھا کہ برق رفتاری سے آگے بڑھتا رہے۔ اسے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ جہانگیرہ یہاں سے کتنے فاصلے پر نکل گیا تھا۔

البتہ جب جہانگیرہ نے اچانک ہی اس بات کا اظہار کیا تھا کہ ان دونوں کو الگ الگ ہو جانا چاہیے۔ تو شاہ زیب نے سوچا تھا کہ جہانگیرہ کے اس اچانک فیصلے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے اور اب اسے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ ممکن ہے جہانگیرہ نے پولیس والوں کو دیکھ لیا ہو اور اسے اس بات کا خطرہ پیدا ہوا کہ پولیس والے بہر حال تھوڑی دیر کے بعد اسے تلاش کر لیں گے۔ اس لیے اس نے شاہ زیب کا پیچھا چھوڑ دیا ہو۔ تاکہ اپنی وہی بات جو اس نے شاہ زیب کو صاف صاف بتا دی تھی وہ یہ کہ شاہ زیب نے خود فرار کی کوشش کی تھی اور پولیس والوں کو قتل کر کے نکل بھاگا تھا اور اس طرح جہانگیرہ خود بچ سکتا تھا۔ یقیناً اس کے ذہن میں یہی منصوبہ ہو گا لیکن اگر وہ شاہ زیب کو بتا دیتا تو اچھا تھا۔

بہر حال شاہ زیب برق رفتاری سے دوڑتا رہا اور بھاری بوٹوں کی آہٹیں اسے اپنے عقب میں سنائی دیتی رہیں۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب تھوڑی ہی دیر کے بعد اس پر حملہ ہو جائے گا۔ اس نے چیمبر میں کارتوس چڑھا لیا اور اس ٹیلے سے اتر کر قریب کے ٹیلے پر چڑھتا ہوا بلندی پر پہنچ گیا۔ آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ پولیس والے برق رفتاری سے اس کے قریب پہنچ گئے تھے۔ وہ ایک ابھرے ہوئے پتھر کی آڑ میں

رائفل سنبھال کر رک گیا۔ پولیس والوں کی تعداد کافی تھی۔ وہ ٹیلے کے عقب سے نکل نکل کر آ رہے تھے اور پھر انہوں نے اپنے آپ کو ٹولیوں میں تقسیم کر لیا۔

شاہ زیب اگر چاہتا تو ان پر فائرنگ شروع کر سکتا تھا لیکن وہ خاموش رہا اور اس نے انتظار کیا کہ پولیس والے اپنے طور پر جو کچھ کریں تب اس کا جواب دیا جائے۔ پولیس کی ایک ٹولی دھیرے دھیرے اس کے قریب آ رہی تھی جہاں شاہ زیب موجود تھا لیکن آگے آنے کی بجائے دائیں ہاتھ کو رخ کر کے وہ ایک ٹیلے کی آڑ میں روپوش ہو گئی۔ شاہ زیب کو ایک لمحے کے اندر اندر اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ٹولی پیچھے سے اس پر حملہ آور ہونا چاہتی ہے۔

چنانچہ شاہ زیب نے اب رکنا مناسب نہیں سمجھا اور گولی چلا دی۔ شام کے سناٹے میں رائفل کی آواز اتنی خوفناک تھی کہ خود شاہ زیب کو ایک لمحے کے لیے اپنا دل رکتا ہوا محسوس ہوا۔ پولیس والے گھبرا کر زمین پر لیٹ گئے اور دھیرے دھیرے رینگتے ہوئے پتھروں کے پیچھے چھپنے لگے۔ غالباً انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ شاہ زیب مسلح ہے۔ ادھر پولیس کی جو ٹولی دوسری جانب سے آ رہی تھی وہ گولی کی آواز سنتے ہی نشیب میں اتر گئی۔ اور وہ ادھر ادھر بکھر کر اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرنے لگے۔ شاہ زیب نے دوبارہ ایک اور گولی چلائی اور پولیس کی ٹولی میں بھگدڑ مچ گئی لیکن اب دوسری طرف سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ گولیاں چیختی ہوئی شاہ زیب کے سر پر سے گزرنے لگیں۔ اسے یقین تھا کہ جہانگیرہ اس کی مدد کرے گا چونکہ اس نے جگہ چھوڑ دی تھی اور بقول اس کے مکرم شاہ کی ہدایت پر وہ شاہ زیب کے سلسلے میں کارروائی کر رہا تھا۔ گولیاں چیختی ہوئی اب اس کے سر پر سے گزر رہی تھیں۔ ایک گولی اس پتھر پر لگی جس کے پیچھے وہ چھپا ہوا تھا۔ پتھر کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر بڑی طاقت سے شاہ زیب کے بازو پر لگا لیکن چوٹ ایسی

نہیں تھی کہ اس سے خون نکل آتا۔

بہر حال وہ آہستہ آہستہ نیچے کھسکتا جا رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ صورتحال سنگین ہے اور اگر دوبارہ ان لوگوں نے کوشش کی تو یقیناً صورتحال خطرناک ہو سکتی ہے۔ چنانچہ نکل جانا زیادہ بہتر ہے۔

پھر وہی ہوا جس کی اسے امید تھی۔ اچانک ہی دوسری طرف سے بھی گولیاں چلنے لگیں اور اس بار شاید کچھ پولیس والوں کو نقصان پہنچا تھا۔ چنانچہ وہ افراتفری کے عالم میں ادھر ادھر بھاگنے لگے اور تھوڑی دیر میں شاہ زیب نے دیکھا کہ وہ سرپٹ دوڑے چلے جا رہے تھے۔ ان میں شدید وحشت اور خوف پھیلا ہوا تھا۔ غالباً انہیں احساس ہو گیا تھا کہ بات کسی ایک بندے کی نہیں ہے۔

اسی طرح شاہ زیب کچھ دیر کے لیے محفوظ ہو گیا۔ وہ ادھر ادھر نگاہیں دوڑا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے خود جہانگیرہ کو اس کی مدد کی ضرورت ہو۔ جہانگیرہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس نے دو گولیاں بھی چلائیں لیکن کچھ نہیں ہوا اور شاہ زیب نے گردن جھٹکی۔ جہانگیرہ جس حالت میں بھی ہے اس کے پاس آنے کی کوشش نہیں کر رہا اور نہ ہی یہ بات مناسب تھی۔

چنانچہ شاہ زیب وہاں سے آگے بڑھا اور ایک ایسے ٹیلے کے پاس پہنچ گیا جہاں سے وہ ان کی نگاہوں سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ کافی وقت گزر گیا۔ رات ہو گئی اور اب اسے کہیں کوئی نقل و حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔ پولیس والے یا تو خوفزدہ ہو کر واپس چلے گئے تھے۔ انہیں بھی بہر حال اپنی جان عزیز تھی یا پھر وہ کوئی اور لمبی پلاننگ کر رہے تھے۔

دوسری طرف جہانگیرہ کا بھی کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ جہانگیرہ نے دوسری طرف سے گولیاں چلا کر پولیس والوں کو خوفزدہ کر دیا تھا ورنہ وہ

سانی سے شاہ زیب کا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہ ہوتے۔ پھر رات آہستہ آہستہ گزرتی
ماحول بالکل کالا ہو گیا تھا۔ قرب و جوار کے علاقے سائیں سائیں کر رہے تھے۔
اونچے ٹیلے جیسے دم سادھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہوا کا کوئی تیز جھونکا آتا تو قرب و
یں بڑے ہوئے تیز پتے کھڑکھڑاتے اور خاموشی ذرا سی سرسراہٹوں کا شکار ہو
اسی طرح رات ڈھلتی رہی۔ شاہ زیب تھکن سے بری طرح مضمحل ہو گیا تھا۔ ادھر
ہوتے ہوتے ہوا میں سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا
ڑھ گیا۔ نینداس کی آنکھوں کو بند کیے دے رہی تھی۔

بہر حال نجانے کب نیند آ گئی اور اس کے بعد جب آنکھ کھلی تو دن چڑھ چکا تھا۔ وہ
اکر اٹھ بیٹھا۔ قرب و جوار میں زرد زرد دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ بہت دیر ہو گئی۔
پ درختوں سے چھن چھن کر روشنی کرنے لگی۔ چنانچہ اب وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا
ہستہ آہستہ ایک طرف چلنے لگا۔ گنجان درختوں کا سلسلہ تھوڑی دور جا کر ختم ہو گیا تھا
اگے پھر گھنی جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ خودرو جنگلی پودے جگہ جگہ اگے ہوئے تھے۔
نخت اور ناہموار تھی۔ یہ راستہ نشیب میں دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ شاہ زیب جنگلی
ڑیوں کے درمیان آگے بڑھتا چلا گیا اور کچھ دیر کے بعد وہ اس میدان میں پہنچ گیا۔
امنے نظر آ رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے شدید پیاس محسوس
ا۔ وہ نہر نجانے کہاں گم ہو گئی تھی۔

بہر حال اس نے پانی کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا تو کچھ دور ایک گھنے درخت کے
ڑے کنوئیں کی منڈیر نظر آئی اور تھوڑے فاصلے کو طے کر کے وہ اس جگہ جا پہنچا۔
ال پرانا اور بہت بڑا تھا اور یقینی طور پر قرب و جوار کے علاقے کے لیے آبپاشی کے
بنایا گیا تھا۔ کھیتوں میں پانی پہنچانے کے لیے نالیاں نکلی ہوئی تھیں لیکن اب کنوئیں

کی منڈیریں منہدم ہو چکی تھیں اور نالیوں کے نشانات دھندلے پڑ گئے تھے۔ قرب و جوار میں کھیت بھی نہیں تھے۔

بہر حال اس نے جھک کر کنوئیں میں نظر ڈالی تو کنواں بالکل خشک نظر آیا اس کی تہہ میں جھاڑیاں اور خودرو پودے نظر آ رہے تھے۔ کوئی سوسوا سو گز کے فاصلے پر کسی ویران بستی کے ٹوٹے پھوٹے مکانات نظر آ رہے تھے۔ کھنڈر کے عقب میں بھی دور تک پھیلا ہوا لق و دق میدان تھا لیکن میدان کے ایک حصے میں مزدور اسے کھدائی کرتے ہوئے نظر آئے۔ یہ بڑی سنگین صورتحال تھی۔ اس کے پاس بے شک رائفل موجود تھی لیکن بدن پر قیدیوں کا لباس تھا۔ ایسی حالت میں اگر وہ مزدوروں تک پہنچنے کی کوشش بھی کرتا تو وہ اسے دیکھ کر نجانے کس ردعمل کا اظہار کرتے۔

وہ دیر تک سوچتا رہا اور آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ اب جو کچھ بھی ہو اسے مزدوروں تک پہنچنا ہی ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ کسی ایک مزدور سے رابطہ قائم کرے۔ کاش---اسے کوئی فاصلے پر نظر آ جائے وہ آہستہ آہستہ بڑی بڑی چٹانوں اور درختوں کا سہارا لے کر آگے بڑھنے لگا۔ مزدور اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ وہ کدالوں سے سخت اور پتھریلی زمین کھود کر کنکر نکال رہے تھے۔ اپنے اپنے کاموں میں سب مصروف تھے لیکن اس کی نگاہیں اس شخص کی جانب اٹھ گئیں جو ایک خیمے کے سامنے بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ شاہ زیب نے ادھر ادھر دیکھا۔ اگر وہ کسی طرح چھپتا چھپاتا اس خیمے تک پہنچ جائے تو ہوسکتا ہے اسے کچھ مدد مل جائے۔ یہ حقہ پینے والا شخص غالباً ٹھیکیدار تھا یا پھر ہوسکتا ہے ٹھیکیدار کا کوئی آدمی ہو کیونکہ وہ اونچی آواز سے مزدوروں کو ہدایت بھی دیتا جا رہا تھا۔ شاہ زیب ایک جگہ سے مزدوروں کو کام کرتے دیکھتا رہا اور پھر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اگر یہ مزدور اس کے خلاف ہو گئے تو وہ کیا کر سکتا ہے۔

بہر حال وقت گزرتا رہا۔ شاہ زیب کو بھوک اور پیاس بری طرح ستا رہی تھی لیکن ی شدت زیادہ تھی۔ اس نے درختوں کی آڑ سے ادھر ادھر دیکھا تو سامنے ہی یں اسے نالا ٹیلوں کے درمیان سے بل کھاتا ہوا دکھائی دیا لیکن نالا بھی خشک تھا۔ ہاں اس کا خاتمہ ہوتا تھا وہاں ایک چھوٹی سی جھیل نما جگہ نظر آ رہی تھی اور اس میں جود تھا۔ شاہ زیب نے مزدوروں کے درمیان جانے کی ہمت نہیں کی تھی لیکن تک جاتے ہوئے اسے کوئی دقت نہ محسوس ہوئی۔ البتہ جب وہ نالے کے قریب اسے ایک شخص نظر آیا جو پگڑ باندھے ہوئے تھا۔ اونچا سا تہمند اس کے جسم پر تھا اور با کرتا۔ وہ غالباً اس جگہ بیٹھا ہوا کوئی چلہ یا وظیفہ کر رہا تھا۔ اس کے بیٹھنے کا انداز تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

شاہ زیب کو اس وقت اس شخص کی یہاں موجودگی بہت بری لگی۔ کم از کم پینے کے پانی تو سامنے آیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا نالے کے پاس پہنچا۔ اس شخص کی آنکھیں بند تھیں اس لیے اس نے شاہ زیب کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن جب شاہ زیب الے کے پانی کو دیکھا تو اس کی طبیعت میں شدید کراہت پیدا ہوگئی۔ پانی میں لمبے ڑے تیر رہے تھے اور اس کا رنگ بالکل کالا ہو چکا تھا۔ یقیناً یہ پانی نہیں بلکہ زہر یہاں بھی بدنصیبی نے ساتھ نہیں چھوڑا تھا لیکن پھر اس کی نگاہیں اس شخص کی جانب یں۔ اس نے اپنے برابر ایک برتن رکھا ہوا تھا جس میں سو فیصدی پانی ہی ہوسکتا تھا۔ اس شخص کے پاس جائے بغیر چارہ کار نہیں تھا۔

چنانچہ شاہ زیب آہستہ آہستہ راستہ طے کرتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ البتہ اس نے شاہ زیب کے قدموں کی آہٹ محسوس کر لی تھی۔ جوان عمر کا آدمی تھا۔ اچھے کا مالک اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ شاہ زیب نے بڑی عاجزی سے کہا۔

''بھائی! میں پانی پینا چاہتا ہوں۔ اس برتن میں جو پانی ہے وہ مجھے دے دو۔ تمہارا بڑا احسان ہوگا۔'' لیکن دوسرے لمحے اس شخص نے شاہ زیب پر چھلانگ لگا دی۔ وہ انتہائی جنگلی اور وحشی معلوم ہوتا تھا۔ شاہ زیب اس کی لپیٹ میں آ کر بری طرح زمین پر گرا اور پتھریلی زمین پر کئی پتھر اس کی کمر میں چبھ گئے۔ قرب و جوار میں پتھر کافی پڑے تھے۔ بہرحال بڑی مشکل سے شاہ زیب نے اسے اپنے آپ پر سے دھکیلا اور کہا۔

''دیکھو--- میں پیاسا ہوں۔ صرف پانی پینا چاہتا ہوں۔ تم نے تو مجھے زخمی کر دیا۔'' لیکن اس وحشی شخص کے انداز میں ذرا بھی شرافت نہیں پیدا ہوئی۔ اس نے ایک بار پھر تہمند اونچا کر کے بھینسے کی طرح سر جھکا کر شاہ زیب کے سینے پر ٹکر ماری اور خاصی چوٹ لگی شاہ زیب کو۔ وہ دوبارہ گرتے گرتے بچا تھا۔ شاہ زیب کے اندر بھی جنون ابھر آ اور اس بار جب وہ شخص حملہ آور ہوا تو شاہ زیب نے اس کی گردن اپنی بغل میں دبا لی او پھر ایک دم سے نیچے لیٹ گیا۔ شاہ زیب کے ذہن میں یہ بات بالکل نہیں تھی کہ اس شخص کو کوئی شدید نقصان پہنچایا جائے۔ گردن دبانے سے پکڑ اس کے سر سے اتر گیا اور جب وہ زمین سے ٹکرایا تو ایک نوکیلا پتھر اس کے دماغ میں اتر گیا۔ اس کے حلق سے ایک بھنچی بھنچی چیخ نکلی اور ایک لمحے کے اندر اندر اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ شاہ زیب صحیح صورتحال کا اندازہ نہیں تھا لیکن اب اسے ایک دم سے یہ احساس ہو گیا کہ اس شخص کوئی شدید نقصان پہنچ گیا ہے۔ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا تو وہ زندگی سے محروم ہو چکا تھا۔ ایک اور قتل ایک اور انسانی زندگی کا نقصان' شاہ زیب چکرا گیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔

☆☆☆

دل ڈوب رہا تھا' طبیعت گری گری ہو گئی تھی۔ انسان تھا پتہ نہیں اس دنیا میں رہنے

والوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ساری کائنات ہی میری دشمن بن گئی۔ اپنا گھر' بھائی' بھاوجیں اور بے شمار افراد اور اس کے بعد وہ ہوتا جا رہا ہے جو میں نہیں چاہتا۔ کچھ محبت کرنے والے محبت کا ثبوت بھی دے رہے ہیں لیکن تقدیر ان راستوں میں آڑے آتی جا رہی ہے۔ کرتا کچھ چاہتا ہوں اور ہو کچھ اور جاتا ہے۔

بہرحال اس وقت مکرم شاہ نے جو کچھ بھی کیا تھا وہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ بات کسی ایک فرد کی نہیں تھی۔ اب تو خود حکومت اس سے زندگی چھیننا چاہتی تھی۔ وہ ایک بڑے مجرم کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ کسے دل چیر کر دکھاتا اور کہتا کہ وہ سرے سے مجرم ہے ہی نہیں۔ حالات نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور اس کا ہر قدم جرم بن جاتا ہے اور درحقیقت وہ ہے جرم۔ اب ایک بے گناہ انسان کی زندگی ختم ہو گئی تھی۔ بے مقصد' کسی بھی طرح یہ شخص قابل سزا نہیں تھا۔ پر دیکھو--- میں نے تو صرف پانی مانگا تھا پتہ نہیں اس پر کیا جنون سوار ہوا کہ مجھے مارنے پر ہی تل گیا۔

شاہ زیب بہت دیر تک یہی باتیں سوچتا رہا پھر اس نے ایک گہری سانس لی۔ آخری نگاہ اس لاش پر ڈالی اور وہاں سے آگے چل پڑا۔ کوئی راستہ' کوئی منزل نہیں تھی۔ اپنے کرم فرماؤں میں سے کسی کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا۔ جہانگیرہ نے جو کچھ بھی کیا تھا اس نے اسے بھاگنے میں تو مدد دی تھی لیکن اس کے آگے جہانگیرہ نے بھی ساتھ نہیں دیا تھا۔

بہرحال یہی مناسب ہوگا وہ چلتا رہا اور وہاں سے کافی دور نکل آیا۔ سامنے اونچا اور ابھرا ہوا ناہموار میدان تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس میدان پر چڑھنے لگا۔ اوپر پہنچا' میدان عبور کیا' نیچے آیا تو پختہ سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی اور بالکل سنسان پڑی تھی۔ اس کے دونوں طرف کہیں کہیں گھنے درخت نظر آ رہے تھے۔

درختوں کے پیچھے نشیب تھے۔ جو جنگلی پودوں اور جھاڑیوں سے بھرے پڑے ہوئے تھے۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر آہستہ آہستہ اس سڑک پر بڑھنے لگا۔ ابھی اس نے بہت زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ اچانک ہی سڑک پر ایک کار نظر آئی۔ جو رکی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ حیرانی سے اس کار کو دیکھنے لگا۔ ایسی سنسان اور ویران جگہ کسی کار کی موجودگی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ اپنی جگہ رک کر کار کے آس پاس کا جائزہ لیتا رہا لیکن کار سنسان ہی کھڑی ہوئی تھی اور کوئی اس کے آس پاس موجود نہیں تھا۔

تھوڑی دیر تک وہ کچھ سوچتا رہا اور پھر اس نے اپنے ذہن میں فیصلے کرنے شروع کیے۔ محتاط رہنا ضروری ہے۔ سڑک کے نشیب میں بکھری ہوئی جھاڑیوں اور مدھم روشنی میں وہ کار ایک عجیب وغریب شکل اختیار کر گئی تھی لیکن انسانی فطرت اور تجسس نے شاہ زیب کے قدم اس جانب اٹھا دیئے اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ کار کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ابھی تک اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا اگر آس پاس کوئی ہے تو اسے دیکھ نہ پائے تو زیادہ بہتر ہے۔

بہر حال وہ دیر تک ایک جگہ رک کر کار کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ جب کار کا فاصلہ چند قدم ہی رہ گیا تو اچانک ہی کار کا دروازہ کھلا اور شاہ زیب اچھل پڑا۔ اسے ایک لمحے کے اندر اندر یہ احساس ہو گیا کہ یقیناً یہ اس کے لیے کوئی جال بچھایا گیا ہے۔ وہ سنبھل گیا اور صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ تبھی ایک آواز سنائی دی۔

''رکو بھائی رک جاؤ۔'' دروازہ کھولنے والا ایک ہی آدمی تھا۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن وہ شخص تیزی سے اس کے قریب آ گیا۔

''بھائی! میری بات سنو۔'' شاہ زیب سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا اور اس

ایک ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ اگر یہ شخص اکیلا ہے اور اس کے ساتھ کوئی سختی کرنا
نا ہے تو اسے پچھاڑنا مشکل نہیں ہوگا۔ وہ اچھی خاصی عمر کا آدمی تھا۔ سفید خوبصورت
ں میں ملبوس اچھی حیثیت کا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''بھائی! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ کیا تم میری مدد کرو گے؟'' شاہ زیب نے
بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تب اس نے کہا۔

''یہ کم بخت کار بے کار ہو گئی ہے اور اس کے لیے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''کیا کرنا ہے؟ میں کوئی مکینک نہیں ہوں۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''وہ جو اس جیسے لوہے کے گھوڑے کی اوقات ہوتی ہے۔ ہمیں اسی اوقات میں
م کرنا ہے۔''

''مطلب؟''

''بس اسے دھکا لگانا ہے اور۔۔۔''

''نہیں جی۔ میں مجبور ہوں۔''

''سنو۔ بہت ضروری ہے۔ اگر میں یہاں سے آگے نہ گیا تو ایک بہت بڑی
ثانی پیش آ جائے گی مجھے۔ ویسے تم کہاں جا رہے ہو؟''

''لاہور۔۔۔'' شاہ زیب نے ایسے ہی جواب دیا۔

''ویری گڈ۔۔۔ ویسے اسٹیشن یہاں سے کافی دور ہے۔ تم پیدل تو وہاں تک صبح تک
ل پہنچ سکتے۔''

''کوئی بات نہیں ہے۔ جب بھی جاؤں گا پہنچ جاؤں گا۔''

''صبح کو چھ بجے ایک گاڑی یہاں سے لاہور جاتی ہے' دوسری دوپہر کو جاتی ہے۔
اما میرا ساتھ دے دو۔ میں تمہیں اپنی کار سے اسٹیشن پہنچا دوں گا۔ ویسے بھی اس

وقت رات ہوگئی ہے۔ ایک اکیلے سے دو بہت بہتر ہوتے ہیں۔'' شاہ زیب ایک لمحے تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

''جانا کتنی دور ہے تمہیں؟''

''بس زیادہ نہیں۔ دو ڈھائی کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔''

''تو کیا اتنی دور تک کار کو دھکا لگا کر لے جاؤ گے؟''

''یار! میں نے کہا نا ایک سے دو بہتر ہوتے ہیں۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو اتنے سے اسٹیشن جانے کی کیا بات ہے۔ ہم لاہور تک دھکا لگاتے ہوئے جا سکتے ہیں۔'' اس نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

''یہ اسٹارٹ نہیں ہوگی کیا؟ میرا مطلب ہے دھکا لگانے سے۔''

''نہیں یار! خرابی کچھ نہیں ہے بس گھوڑے کا پیٹ خالی ہوگیا ہے۔ یعنی پیٹرول ختم ہوگیا ہے۔'' شاہ زیب تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ وہ شخص بڑبڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''بس ڈرائیور ہمیشہ ایسے ہی چکر دیتے ہیں۔ میں نے از راہ کرم اسے چھٹی دے دی تھی۔ تھوڑا سا کام تھا اسے مگر لاپرواہی---لاپرواہی---لاپرواہی نکال دوں گا اسے سالے کو۔ بھلا جتنی پریشانی میں نے اٹھائی ہے اس کے بعد اسے رکھنے کی کیا گنجائش ہے۔ ویسے دوست تم میرا ساتھ دو۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ تم فوراً ہی تیار ہو جاؤ گے۔ دیکھو---ایک اور پیشکش کروں برا مت ماننا۔ تم جو مانگو گے میں تمہیں رقم بھی دے دوں گا۔''

''ٹھیک ہے چلو۔'' شاہ زیب نے کہا اور اس شخص نے گاڑی کا ہینڈ گیئر نکالا۔ گیئر نارمل کیا اور اس کے بعد اسٹیئرنگ سیٹ کے پاس کھڑے ہو کر خود بھی اسے دھکا لگانے لگا اور دونوں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ وہ شخص کہنے لگا۔

''ہوسکتا ہے آگے چل کر تمہارے جیسا ہی کوئی کرم فرما مل جائے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ مجھے ذرا جلدی پہنچنا ہے۔ کچھ ایسے کاغذات ہیں میرے پاس جو مجھے اعلیٰ افسران تک پہنچانے ہیں۔''

''کیا کرتے ہیں آپ؟'' شاہ زیب نے اس کے ساتھ دھکا لگاتے ہوئے کہا۔

''بس گزارہ کرتا ہوں اور کیا۔ ویسے اس کم بخت سڑک پر نہ لاری چلتی ہے نہ ٹرک یہاں سے گزرتے ہیں۔ یہ سڑک سیدھی میری کوٹھی تک جاتی ہے۔''

''تو آپ ایک کام کیوں نہیں کرتے؟''

''کیا؟''

''کار کو یہیں چھوڑ دیں۔ لاک کر دیں اسے اور پیدل ہی چلے جائیں۔ آپ کی کوٹھی میں یقیناً کچھ نہ کچھ افراد تو ہوں گے۔ وہ بعد میں آ کر کار کو لے جائیں گے۔''

''یار! یہ میں نے بھی سوچا تھا پہلے۔ اب تم جو کچھ کر رہے ہو وہ میرے لیے بڑے احسان کی بات ہے لیکن بے تکی بات مت کرو۔ اس نے اسٹیئرنگ کاٹا اور کار کو زیادہ تیزی سے دھکیلنے لگا۔ شاہ زیب اس کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سڑک صاف ستھری تھی۔ آگے ڈھلان بھی تھی۔ ان دونوں کو زیادہ زور نہیں لگانا پڑ رہا تھا۔ کافی دیر تک خاموشی طاری رہی پھر شاہ زیب نے کہا۔

''میرا خیال ہے میری کسی بات پر آپ ناراض ہوگئے؟''

''نہیں بھائی! کوئی ناراض واراض نہیں ہوا۔''

''آپ نے باتیں کرنا بھی چھوڑ دیا۔''

''تم نے باتیں ہی کچھ ایسی ٹیڑھی کر دیں۔ اب دیکھو نا ہر انسان کے اپنے کچھ مسائل ہوتے ہیں۔ میں کون ہوں' کیا ہوں۔ اگر تمہیں بتا دوں تو ہوسکتا ہے تم مجھے ناپسند

کرو۔''

''کیوں---؟''

''بس تو تم یہ سمجھ لو کہ میں ایک مجسٹریٹ ہوں۔ ہنسو گے نا میری بات پر۔ ہنس لینا۔ عدالتوں میں میرے احکامات پر پتہ نہیں کیا کیا ہو جاتا ہے لیکن اس وقت دیکھ لو کار کو دھکا لگا رہا ہوں۔ ویسے میں بتاؤں مزہ آ رہا ہے۔'' اس نے کہا اور شاہ زیب کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ وہ شخص مسکراتی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

''زندگی مختلف طرح کے تجربات میں گزری ہے۔ تم مجھے ایک اچھے خاصے نوجوان معلوم ہوتے ہو لیکن تمہارے چہرے کی کچھ لکیریں بتاتی ہیں کہ تمہاری زندگی کے ساتھ بھی کوئی ایسا المیہ ہے۔ خیر فکر مت کرو انسان ہی انسان کا دوست بھی ہوتا ہے۔ کوئی مشکل ہو تو مجھے بتانا۔''

نجانے کیوں شاہ زیب کے دل میں خیال آیا کہ اس شخص کو حقیقت بتانی چاہیے۔ کبھی کبھی کوئی بے لوث مشورے دینے والا بھی زندگی کی گاڑی کو اس طرح دھکے لگاتا ہے کہ وہ پھر دوڑتی ہی چلی جاتی ہے۔ شاہ زیب اس وقت سخت مشکل میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

''تم نے مجھ سے میرے بارے میں نہیں پوچھا دوست! تم ایک عدالت کے مجسٹریٹ ہو اور ظاہر ہے اس وقت عدالت میں نہیں ہیں ہم۔ بلکہ زمین کی عدالت میں مشکل کا سفر کر رہے ہیں۔''

''واہ۔ کیا عمدہ بات کہی۔ پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ مجھے تمہاری آنکھوں سے ہی پتہ چل گیا تھا۔ ویسے یہ تم نے حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟''

''اس حلیے سے تم نے کوئی اندازہ نہیں لگایا جبکہ تم ایک مجسٹریٹ ہو؟''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ اس سے کوئی خاص اندازہ نہیں ہوتا۔''

''میں ایک مجرم ہوں، جیل سے بھاگا ہوا مجرم۔'' اور ایک لمحے کے لیے اسے گاڑی کا دباؤ زیادہ محسوس ہوا۔ غالباً وہ شخص دھکا لگاتے لگاتے رک گیا تھا لیکن دوسرے لمحے اس نے پھر سے دھکا لگانا شروع کر دیا۔

''یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کیا کیا تھا تم نے؟ چوری کی تھی، ڈاکہ ڈالا تھا یا کوئی لڑکی وغیرہ غائب کر دی تھی؟ تمہاری شکل وصورت اور عمر ایسی ہی کسی واردات کا اظہار کرتی ہے۔ اگر واقعی سچ کہہ رہے ہو تو ہوسکتا ہے تعلیم کے حصول کے بعد ملازمت کی تلاش کر رہے ہو اور جھنجھلا گئے ہو کہ نوکری نہیں ملی۔ بس اس کے بعد کام دکھا دیا یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لڑکی کے بھائی نے شادی سے انکار کر دیا ہو اور تم نے---'' وہ ایک دم ہنسا اور اس کے بعد کہنے لگا۔

''بتاؤ تو سہی قیدی تو بھاگتے ہی رہتے ہیں۔ تم نے ایسا کون سا انوکھا کام کر دیا؟ کیا سمجھے خیریت بتاؤ۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تم اس وقت عدالت مین ہو۔ میرا مطلب ہے عدالت کے ساتھ ہو۔ بالکل پریشان نہ ہو۔ کیا سمجھے--- تم نے میری مدد کی ہے۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔ ویسے میرا نام شہریار ہے۔ کیا سمجھے؟'' وہ بے تکلفی سے باتیں کرتا رہا۔ سمجھ رہا تھا کہ یہ شخص اس سے اپنا کام نکالنا چاہتا ہے۔ کچھ لمحوں کے بعد اس نے کہا۔

''تو پھر تھوڑا بہت تو بتاؤ یار! تاکہ راستہ ہی کٹے۔''

''بس نہ میں نے کسی لڑکی کو بھگایا ہے نہ چوری یا ڈاکہ ڈالا ہے۔ بڑی مختصر سی کہانی ہے میری۔ بس یہ سمجھ لو کہ وقت نے مجھے اس مشکل میں ڈالا ہے۔'' شاہ زیب نے مختصر

الفاظ میں اسے اپنے بارے میں بتانا شروع کیا اور وہ پرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔

''ایک بات کہوں؟ ہوں تو میں مجسٹریٹ مگر میرا دل ذرا مختلف قسم کا ہے۔ میں تمہیں کیا بتاؤں اس بارے میں۔ خیر چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔ یہ مرد کا وعدہ ہے۔ آؤ ہاتھ ملاؤ۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔ اچھا خیر --- چلو چھوڑو۔ اب میں تمہیں خود ہی چھوڑنے جاؤں گا لیکن آج دوپہر کو نہیں۔ کل صبح پانچ بجے والی ٹرین سے۔''

''ٹھیک ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو خود ہی شناساؤں کے سہارے جی رہا ہوں۔ تم یقین کرو میرے دوست! اس وقت میں تمہاری حیثیت کو نظر انداز کر کے تمہیں اپنے دوستوں کی طرح مخاطب کر رہا ہوں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں اپنے آپ کو انسان سمجھوں۔ کبھی تھا میں بھی انسان۔ ہنستا بولتا' ہنستا کھیلتا۔ نجانے کیا کیا احساسات تھے میرے دل میں۔ دو بڑے بھائی تھے میرے' ماں بے شک مر چکی تھی لیکن' میں بھائیوں کو ماں کی جگہ سمجھتا تھا۔ پر میرے دوست وقت کسی کا دوست نہیں ہوتا۔''

شہر یار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کافی دور تک وہ گاڑی کو دھکیلتے ہوئے چلے گئے۔ اب دونوں بری طرح ہانپنے لگے تھے۔ شہر یار نے رکتے ہوئے کہا۔

''تھوڑی دیر رکو' تھوڑی دیر ستا لیں' زندگی میں کبھی کبھی ایسے لمحات بھی آتے ہیں جو تصور میں بھی نہیں ہوتے' لیکن وہ ہو جاتا ہے جو سوچا بھی نہیں جاتا۔'' دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہے۔ پھر شہر یار نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا اور تھوڑے فاصلے پر پڑے ہوئے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ شاہ زیب کے لیے بھی اس نے جگہ

ا تھی۔

شاہ زیب دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ بعض شخصیتیں ہی مقناطیسی ہوتی ہیں۔ ضروری تو نہیں تھا کہ شاہ زیب اپنے بارے میں ساری باتیں سچ سچ ہی بتا دیتا۔ پر نے کیوں اس کا دل جھوٹ بولنے کو نہیں چاہا تھا۔ آدمی ہی سامنے ایسا موجود تھا۔ شہر ری پیشانی پر شکنیں تھیں۔ اس نے کہا۔

''تم نے مجھے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا نہایت مختصر بتایا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں اگر کرسی عدالت پر بیٹھا ہوتا اور مجھے تمہارے بارے میں یہ تمام تفصیلات معلوم ہو جاتیں تو میں تمہیں کم از کم سزائے موت نہ دیتا۔ قانون ہاتھ باندھ دیتا ہے لیکن میں اس کی لچک سے پورا فائدہ اٹھاتا کیونکہ میری نگاہ میں تم مجرم نہیں ہوتے۔''

''بس میں کیا بتاؤں؟ صرف ایک بات بتا سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ میں نے تمہارے سامنے جو کہا ہے جھوٹ نہیں کہا ہے۔''

''ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ تمہیں میرے سامنے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی نہیں تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ تم اچھی طرح ایک بات جانتے ہو گے کہ ایک مجسٹریٹ بھی تمہارے سامنے ذاتی طور پر کوئی معلومات حاصل کر لے تو کمرۂ عدالت میں بیٹھ کر وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ثبوت ہی ہمارے لیے راہیں متعین کرتے ہیں۔ کیا خیال ہے گاڑی نہیں چھوڑ دیتے ہیں اور اب پیدل چلتے ہیں لیکن میرے پاس کچھ وزنی چیزیں ہیں ہم دونوں کو یہ چیزیں کندھے پر لاد کر چلنا ہوں گی' مگر چھوڑو یہی طریقہ زیادہ مناسب ہے اور اب فاصلہ بھی زیادہ نہیں رہ گیا ہے۔ اب اتنی سی دیر کے لیے ہم گاڑی کیا چھوڑیں۔ پہلے بھی میں نے تم سے یہی بات کہی تھی کہ گاڑی کو میں نہیں چھوڑ سکتا۔''

''نہیں کوئی بات نہیں شہر یار صاحب! اگر رفاقت اچھی ہو تو ہر مشکل آسان ہو

جاتی ہے۔''

''واہ۔ کیا اچھی بات کہی ہے۔'' شہر یار نے کہا۔

دونوں تھوڑی دیر تک خاموش رہے اور اس کے بعد کھڑے ہو گئے۔ شہر یار ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

''میرے اہل خاندان' ملازم وغیرہ جب مجسٹریٹ صاحب کو دھکا لگاتے ہوئے دیکھیں گے تو سامنے بے شک نہیں ہنسیں گے لیکن دل ہی دل میں خوب ہنسیں گے لیکن بہرحال تجربات تو زندگی میں ہوتے رہنے چاہیں۔''

تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے پھر دھکا لگانا شروع کر دیا۔ مشرق میں ہلکا ہلکا اجالا پھوٹنے لگا تھا۔ ستارے اب بالکل مدھم پڑتے جا رہے تھے اور وہ دونوں پوری محنت کے ساتھ کار گھسیٹتے ہوئے جا رہے تھے۔ پھر کچھ فاصلے سے ایک عمارت نظر آنے لگی اور شہر یار نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''وہ---وہ' میری---میری کوٹھی ہے۔'' کار آہستہ آہستہ کوٹھی کے قریب پہنچتی جا رہی تھی اور سامنے ہی پہرہ نظر آ رہا تھا۔ دو مسلح گن مین گیٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے غالباً کار کو پہچان لیا اور پوری طرح پہچاننے کے بعد وہ دوڑ پڑے۔ گن مینوں نے اٹینشن ہو کر اسے سلوٹ کیا اور شاہ زیب نے دیکھا کہ شہر یار کا وہ انداز بالکل تبدیل ہو گیا۔ اب اس وقت وہ مجسٹریٹ نظر آ رہا تھا۔ اس نے جیب سے چابی نکال کر گن من کو دیتے ہوئے کہا۔

''ڈگی کھولو۔'' گن مین نے ڈگی کھولی اور شہر یار نے اس میں رکھا ہوا سامان دونوں گن مینوں کے کندھے پر لدوا دیا اور پھر اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ دونوں گن مین اندر چل پڑے۔ شہر یار بھی گیٹ سے اندر داخل ہو گیا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے شاہ زیب بھی

ر آ گیا اور بھی کچھ ملازم موجود تھے۔ شہر یار نے ایک ملازم کو اپنے قریب بلایا اور کہا۔

''جاؤ--- گاڑی دھکیل کر اندر لاؤ اور اسے ایک طرف کھڑا کر دو اور وہ کتا کیا کر ہا ہے؟''

''سر جی! بند کیا ہوا ہے ہم نے اسے۔''

''ہوں ٹھیک ہے۔ آؤ' تم آؤ---'' اور پھر وہ شاہ زیب کو لیے ہوئے آگے بڑھ لیا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے کہا۔

''شاہ زیب بتایا ہے نا تم نے اپنا نام؟''

''جی سر!'' شاہ زیب نے مستعدی سے کہا تو شہر یار مسکرا دیا۔

''سنو---میرے اس رویے کو اپنے خلاف مت سمجھنا۔ اصل میں زندگی گزارنے ے کچھ ڈھنگ ہوتے ہیں۔ انسان تو ہر حال میں انسان ہی ہوتا ہے لیکن بعض معاملات ادا کاری ضروری ہوتی ہے۔ اچھا سنو--- آرام کرو' ناشتہ وغیرہ کرنے کے بعد آرام ہو جانا' کیا سمجھے۔'' ابھی وہ یہی باتیں کر رہا تھا کہ سامنے سے ایک آدمی آتا ہوا نظر ۔وہ اچھا خاصا عمر رسیدہ تھا۔ وہ جلدی سے اس کے پاس پہنچا اور اس نے کہا۔

''ہاں کیا رہا؟'' شاہ زیب نے ایک دم سے شہر یار کا رویہ تبدیل ہوتے ہوئے ھا۔ شہر یار نے شاہ زیب کی طرف دیکھا اور پھر ایک ملازم کو اشارہ کر کے بولا۔

''انہیں انیکسی میں لے جاؤ اور اچھے قیام کا بندوبست کرو۔ یہ میرا دوست ہے۔''

''جی صاحب!'' اس ملازم نے شاہ زیب کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور پھر شاہ ب کو ساتھ لئے ہوئے انیکسی میں پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔

''صاحب جی! آپ اگر پسند کرو تو یہ غسل خانہ ہے۔ ٹھنڈا گرم پانی موجود ہے نہا لو۔ آپ کا کوئی اور سامان تو نہیں ہے؟''

"نہیں۔ میرا کوئی سامان نہیں ہے۔"

"تو نہا کر یہی کپڑے بدل لو گے آپ؟"

"ہاں۔" شاہ زیب نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے صاحب جی! آپ نہاؤ میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

شاہ زیب بھی شدید ذہنی اور جسمانی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ نیم گرم پانی کے غسل نے اسے تازہ دم کر دیا اور نہانے کے بعد وہ باہر نکل آیا۔ غسل کرنے کے بعد نیند شدت سے حملہ آور ہو رہی تھی لیکن ابھی وہ بستر پر جا کر بیٹھا ہی تھا کہ ملازم ناشتہ لے کر آ گیا۔ شاہ زیب کو بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے ناشتہ کیا اور اس کے بعد بستر پر لیٹ گیا۔ نیند تو جیسے ایک بدترین دشمن کا کردار ادا کر رہی تھی۔ لیٹتے ہی اس نے شاہ زیب کو اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔

☆☆☆

اورنگزیب اور جہانزیب سر جوڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں کے چہروں پر غم کے آثار تھے۔ جہانزیب نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔

"خود بھی کچھ محسوس کر رہے ہو اورنگزیب کیا ہم خوش ہیں؟ سب کچھ ہے۔ کوئی مشکل نہیں ہے زندگی میں لیکن دل کو جس بے چینی کا احساس ہے کیا تم بھی میری ہی طرح محسوس کر رہے ہو؟" اورنگزیب نے افسردگی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا بتاؤں۔ تین دن سے ماں خواب میں آ رہی ہیں۔ خاموش کھڑی ہوتی ہیں۔ آنکھوں میں ملامت کے آثار ہوتے ہیں۔ تم یقین کرو آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ جو کچھ کہہ دیتی ہیں۔ دل کٹ کر رہ جاتا ہے اس پر۔ اب یہ بتاؤ، ہم کیا کریں؟"

"وہ ایک بار پھر پولیس کے چنگل سے نکل گیا ہے اور اگر تم میری بات کا برا مت

مانو بھائی جہانزیب! تو میں تمہیں بتاؤں۔ ہمیں کھل کر الیاس خاں جبار خاں کے مقابلے پر آنا چاہیے۔ بہت ہو گئی ہے جب زندگی اس انداز میں گزر رہی ہے تو پھر کچھ سامنے آ کر کرنا ہوگا۔ آخر ہمیں بھی خون کے رشتے نبھانے ہیں۔" جہانزیب گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے نفرت بھرے انداز میں کہا۔

"ہمارا دشمن ہماری شہ رگ سے قریب ہے اور وہ یہاں مخبری کر رہا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ہم بھی کھل کر اپنے بھائی کی مدد کریں تو کیا زیادہ بہتر نہیں ہوگا۔"

"ایک سب سے بڑا مسئلہ جو ہے وہ یہ ہے کہ شاہ زیب کے ہاتھوں پولیس والوں کا قتل ہو چکا ہے اور اب یہ نیا جرم اس پر لاگو ہے۔ یعنی اس نے کچھ پولیس والوں کو قتل کر کے فرار حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ تم نے اخبارات دیکھے کتنا خوفناک مجرم قرار دے دیا گیا ہے اسے۔ کیا ہمارا شاہ زیب اتنا ہی خوفناک مجرم ہے۔"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے مگر اب ہم کریں کیا اس کے لیے؟"

"وہ ہم تک پہنچے بھی تو سہی۔"

"اس کا یہاں نہ آنا بہتر ہی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا پولیس اسے ہمارے قرب و جوار میں تلاش نہیں کر رہی ہوگی؟" جہانزیب نے کہا اور اورنگزیب سوچ میں ڈوب گیا اور پھر اس نے کہا۔

"ہاں یقینی طور پر مخبر پیچھے لگے ہوں گے اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہوں گے کہ وہ ادھر آتا ہے یا نہیں۔ وہ یہاں تو نہیں ملے گا لیکن ایک مسئلہ ہے؟"

"کیا؟"

"کیوں نہ اسے ملک سے باہر نکال دیا جائے۔ اب اس کے لیے یہی ایک ذریعہ رہ گیا ہے کہ خاموشی سے اسے کہیں روانہ کر دیا جائے۔"

"ہوں۔ بات تو بالکل ٹھیک ہے لیکن اس کے لیے کیا طریقہ کار ہے؟"

"ایسا کرتا ہوں میں کراچی چلا جاتا ہوں۔ کراچی بہت کچھ ہوتا ہے۔ ہمیں یقینی طور پر کسی ایسے آدمی کا پتہ مل جائے گا۔ جو کسی ایک شخص کو سمندری راستے سے ملک سے باہر نکال دے۔ شاہ زیب کے لیے اس سے زیادہ بہتر اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ وہ خاموشی سے ملک سے باہر چلا جائے۔ کسی جگہ قیام کرے۔ ہم اسے ہر طرح کی مالی مدد دیں تاکہ اسے آگے زندگی گزارنے میں کوئی دقت نہ ہو۔" جہانزیب پر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔ پھر بولا۔

"ہاں۔ یہی کیا جا سکتا ہے۔ صرف یہی کیا جا سکتا ہے۔"

"تو پھر اس کے لیے تیاریاں کیوں نہ کی جائیں؟"

"کرتے ہیں۔ ایسا بھی کر لیتے ہیں۔" جہانزیب اپنے طور پر منصوبہ بندی کرنے لگا۔ حالانکہ بہت سے مرحلے مشکل تھے۔ شاہ زیب کے فرار ہونے کی خبر پھر مل چکی تھی۔ الیاس خاں اور جبار خاں اب بالکل ننگے ہو کر سامنے آ چکے تھے۔ انہوں نے جس محبت اور دوستی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی حقیقت بھی پتہ چل گئی تھی۔ وہ انتقام کی آگ میں سلگ رہے تھے اور اپنے طور پر انتقام کی تکمیل کر لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ان دونوں کو بھی دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔

بہر حال اب دونوں بھائیوں کے دلوں میں یہ بات جڑ پکڑ چکی تھی کہ اپنے چھوٹے بھائی کی تباہی کا باعث وہی بنے ہیں چنانچہ وہ اپنے کیے پر نادم تھے۔ جہانزیب کافی دیر تک اپنے ذہن میں مختلف منصوبے بناتا رہا تھا اور اس کے بعد وہ اٹھ کر اپنے بیڈ روم کی طرف چل پڑا لیکن دروازے پر ہی اسے ٹھٹھک جانا پڑا۔ شاہینہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ نجانے کیوں شاہ زیب نے اپنی عادت کے خلاف اس کی باتیں سننے کی کوشش

کی۔ شاہینہ کہہ رہی تھی۔

"ہاں۔ دونوں بھائیوں میں منصوبے بن رہے ہیں۔ اب ان کے دماغ میں یہ بات ہے کہ وہ شاہ زیب کو تلاش کریں اور اسے ملک سے باہر نکال دیں۔ جہانزیب شاید کراچی جانا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ اسے سمندری راستے سے باہر نکالنے کی کوشش کریں گے۔ نہیں بھائی جی! وہ نہیں ملا ہے ابھی تک۔ ہاں--- آپ بے فکر رہو۔ میں دن رات کوشش میں ہوں کہ اس کا پتہ چل جائے۔ ہر بات پر نظر رکھتی ہوں--- نہیں--- میں بھی اس سے اتنی ہی نفرت کرتی ہوں، جتنی آپ لوگ--- کیونکہ وہ بھی تو میرے بھتیجے کا قاتل ہے۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ ٹھیک ہے بھائی جی! آپ اطمینان رکھو۔ مجھے جو بھی معلومات ہوں گی وہ میں آپ کو دوں گی۔"

جہانزیب کے سارے وجود میں آگ لگ رہی تھی۔ سب سے بڑی مخبر، سب سے بڑی دشمن اس کی بیوی گھر میں موجود ہے۔ وہ بہت دیر تک سوچ میں ڈوبا رہا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اندر داخل ہو کر شاہینہ کا سر پھاڑ دے لیکن یہ خلاف مصلحت تھا۔ وہ اب یہ بات سمجھ چکا تھا کہ شاہینہ ان کی سب سے بڑی دشمن ہے۔

جہانزیب الٹے قدموں واپس پلٹ پڑا اور غصے کی آگ میں سلگتا ہوا اورنگزیب کے پاس پہنچ گیا۔ اورنگزیب بھائی کی شکل دیکھ کر سمجھ گیا کہ کوئی خاص بات ہے۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے جہانزیب کو دیکھا۔ جہانزیب کہنے لگا۔

"اورنگزیب! پوری سنجیدگی کے ساتھ تم سے ایک مشورہ چاہتا ہوں۔ یہ بات تو طے ہے کہ ہمارا سکون چھیننے والی میری بیوی ہے۔ ہم عورتوں کے جال میں اس طرح قید ہوئے کہ بری طرح پھنس گئے اور سب کچھ بول گئے۔ یہ ساری باتیں اس طرح سے آگے بڑھی ہیں کہ ہم کچھ نہیں کر سکے۔"

"ہوا کیا؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے شاہینہ! اپنے بھائی کو وہ ساری تفصیل بتا رہی تھی جو ہمارے درمیان گفتگو کے طور پر ہو رہی تھی یعنی میرے کراچی جانے کا منصوبہ اور شاہ زیب کے فرار کی باتیں۔ سب کچھ اس نے الیاس خاں یا جبار خاں کو بتا دیا ہے۔ مجھے بتاؤ اورنگزیب! مجھے کیا کرنا چاہیے؟ یہ بیوی میرے لیے اب بیوی نہیں بلکہ آستین کا سانپ ہے۔ جو ہماری آستین میں گھس کر ہمیں ڈس رہا ہے۔ کیا ہم اسے اس کا موقع دیں؟ کیا ہم اتنے ہی بے وقوف ہیں؟"

"کرو گے کیا؟ الیاس خاں اور جبار خاں سے جس قدر دشمنی ہو گئی ہے وہی کافی ہے۔ اب میں اور آگے کیا بتاؤں؟"

"میں خود ہی کچھ کروں گا سمجھے۔ میں خود ہی کچھ کروں گا۔" جہانزیب کا لہجہ بے حد بھیانک تھا۔ اورنگزیب کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ جہانزیب اتنا آگے بڑھ کر سوچ رہا ہے لیکن جہانزیب پر کچھ زیادہ ہی جنون سوار ہو گیا تھا۔

اسی رات تقریباً دو بجے جب سارا ماحول خاموشی اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ جہانزیب اٹھ گیا۔ شاہینہ بھی اس کے برابر ہی گہری نیند سو رہی تھی۔ جہانزیب نے اٹھ کر تیز لائٹ جلائی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ تیز لائٹ نے شاہینہ کو چونکا دیا تھا۔ وہ جاگ گئی اور اس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے جہانزیب کو دیکھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم؟ دوسروں کا کوئی احساس نہیں ہے تمہارے دل میں۔ اپنے کسی کام کے لیے تم نے آسانی سے لائٹ جلا لی۔ میں کہتی ہوں بند کرو اس لائٹ کو۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔ میری نیند خراب کر دی تم نے۔ میں ویسے بھی بے خوابی کی مریضہ ہوں۔" جہانزیب خاموشی سے ہونٹ بھینچے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کی زہریلی آواز

ابھری۔

"ہاں۔ مجھے واقعی شرم آنی چاہیے کہ میں نے تم جیسی عورت کو اپنی بیوی بنا کر رکھا ہوا ہے۔"

"جی خیریت۔ یہ رات کو دو بجے لڑنے کا موڈ کیوں سوار ہو گیا ہے آپ پر؟"

"اس لیے شاہینہ! کہ میں نے ٹیلی فون پر تمہاری اور تمہارے بھائیوں کی گفتگو سن لی ہے۔"

"گفتگو؟"

"ہاں۔"

"دماغ خراب ہو گیا ہے کیا۔ کون سی گفتگو؟"

"وہ جو تم آج کر رہی تھیں اور بتا رہی تھیں کہ ہم دونوں بھائیوں نے اپنے چھوٹے بھائی شاہ زیب کے بارے میں کیا سوچا ہے۔" شاہینہ کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ جہانزیب نے پھر کہا۔

"یہ بات تو خیر بہت پہلے سے مجھے معلوم تھی شاہینہ! کہ تم کسی طور اس خاندان کی دوست نہیں رہی ہو۔ تم نے ہمیشہ ہم سے دشمنی کی ہے۔ تعجب کی بات ہے بڑے تعجب کی بات ہے۔ تم نے یہ دشمنی بے مقصد ہی کی ہے۔ اس وقت بھی تم ہماری دشمن تھیں جب شاہ زیب کا کوئی جھگڑا نہیں کھڑا ہوا تھا۔ شاہ زیب ہمارا بھائی' ہمارا خون بلاوجہ شاہینہ تم نے اس سے بیر باندھا اور اسے یہاں تک پہنچا دیا اور اب تم اس کی زندگی کے پیچھے پڑی ہوئی ہو۔ پتہ نہیں کس طرح کی عورت ہو تم ارے--- عورت کے بارے میں تو یہ سنا ہے کہ بڑی نرم دل ہوتی ہے اور رشتے بناتی ہے وہ--- تم کیسی عورت ہو شاہینہ؟"

"صبح بات کروں گی میں تم سے اس موضوع پر۔" شاہینہ نے کروٹ بدلنے کی

کوشش کی لیکن اس کے فرشتوں کو بھی گمان نہیں تھا کہ جہانزیب پر اس وقت کیا جنون سوار ہے۔ اس نے قریب پہنچ کر شاہینہ کے بال پکڑے اور ایک جھٹکے سے اسے اپنی طرف موڑ لیا۔ شاہینہ کے حلق سے آواز نکل گئی تھی۔

''ارے ارے --- یہ کیا بدتمیزی ہے؟ ہوش خراب ہو گئے ہیں تمہارے۔ کہ دیوانگی کا شکار ہو۔ خواب دیکھا تھا کیا؟ میں ہر طرح کا پاگل پن دور کر دیتی ہوں سمجھے --- شاہینہ نام ہے میرا۔''

''شاہینہ نام ہے تمہارا۔ اور اس نام کے لیے صرف چند لمحات باقی رہ گئے ہیں۔ شاہینہ! مجھے شدت سے یہ احساس ہو گیا ہے کہ میں نے ایک دوست نہیں دشمن پالا ہو ہے۔ ہم چودھری بہت اچھے لوگ ہیں لیکن بہر حال دشمن تو دشمن ہی ہوتا ہے۔ تمہیں گھ سے بھی نہیں بھگایا جا سکتا کیونکہ تم جیسی سازشی عورت کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اس لیے شاہینہ میں وہ تمام رشتے بھول چکا ہوں جو میرے اور تمہارے درمیان قائم ہوئے ہیں۔'' اچانک ہی جہانزیب نے مسہری پر چھلانگ لگائی۔ اس کے بعد اس نے چادر کا ایک پلا ہاتھ میں لیا اور شاہینہ کی گردن پر ڈال کر گردن دبوچ لی۔

''تت --- تت --- تت ---'' شاہینہ کے منہ سے آواز نکلی لیکن اس کے بع جہانزیب کے ہاتھ کی گرفت نے اس کی آواز بند کر دی۔ وہ بری طرح ہاتھ پاؤں ما رہی تھی۔ ہاتھ جھٹک رہی تھی۔ گردن جھٹک رہی تھی لیکن جہانزیب پر اس وقت خون سوا تھا۔

''میری ماں تین دن سے میرے خواب میں آ رہی ہے۔ مجھے ملامت کر رہی ہے؟ بلاشبہ میں نے اس کے لخت جگر کو تیری وجہ سے زندگی سے اتنی دور کر دیا ہے شاہینہ! ا اب میرا یہ فرض بنتا ہے کہ میں تجھے اس دنیا سے دور کر دوں۔''

شاہینہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ بولنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن جہانزیب پر خون سوار تھا۔ وہ اس وقت تک شاہینہ کی گردن کو اپنی گرفت میں لیے دباتا رہا جب تک شاہینہ کی زبان اور آنکھیں باہر نہ نکل آئیں اور اس کا تنفس ختم نہ ہو گیا۔ جہانزیب نے اس کا اچھی طرح جائزہ لیا اور پھر نفرت سے اس کے ہونٹوں پر تھوک دیا۔

''تو نے --- تو نے ایک خاندان تباہ کر دیا' تو نے چودھریوں کی حرمت خاک میں ملا ڈالی اپنے بھائیوں کے لیے۔ ارے --- لوگ تو شوہر کو مزاجی خدا کہتے ہیں۔ شوہر کا گھر عورت کی آخری پناہ گاہ ہوتا ہے لیکن تجھ جیسی عورت کا نہیں تو سرے سے عورت تھی ہی نہیں۔ جس کے سینے میں عورت کا دل نہ دھڑکتا ہو۔ وہ عورت کہاں سے ہو سکتی ہے۔''

جہانزیب اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ شاہینہ کا مردہ جسم اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اس نے نفرت بھرے انداز میں کہا۔

''عقل تیرے پاس ہی نہیں ہے شاہینہ! عقل صرف تیرے پاس اور تیرے بھائیوں کے پاس ہی نہیں تھی۔ دنیا میں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ سمجھیں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔'' جہانزیب نے کہا اور اس کے بعد اس نے اپنے منصوبے کے دوسرے مرحلے پر عمل شروع کر دیا۔ اچانک ہی اس نے ریوالور نکال کر گولیاں برسانا شروع کر دیں اور تیزی سے راہداری میں دوڑنے لگا۔ ساتھ ہی وہ چیختا بھی جا رہا تھا۔

''پکڑو --- پکڑو --- پکڑو'' اور ساتھ ہی بھگدڑ مچ گئی۔ سارے ملازم جاگ گئے۔ اورنگزیب بھی جاگ گیا۔ شکیلہ بھی جاگ گئی۔ جہانزیب دوڑتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

''وہ گیا --- وہ دیوار کود گیا --- اس طرف --- اس طرف۔'' اورنگزیب' شکیلہ قریب پہنچ گئے تھے۔ ملازم بھی سامنے کھڑے ہوئے تھے۔

''کون تھا؟ بھائی جان کون تھا؟'' اورنگزیب نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''شاہ زیب! آہ--- شاہ زیب' شاہینہ کے کمرے میں--- شاہینہ کے کمرے میں شاہ زیب۔''

''شاہینہ کے کمرے میں؟''

''آؤ---'' اورنگزیب نے کہا۔

گھر کے کچھ ملازم بھی ساتھ ساتھ ہی دوڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک آدھ ملازم وہ تھا جو شاہینہ کا راز دار تھا اور وہ الیاس خاں اور جبار خاں سے رابطے کا ذریعہ بھی تھا۔ سارے کے سارے شاہینہ کے کمرے میں پہنچ گئے اور پھر شاہینہ کو ایک نگاہ دیکھنے سے ہی پتہ چل گیا کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ ایک ہنگامہ ہو گیا تھا۔ ایک خوفناک ہنگامہ' جہانزیب زبردست اداکاری کر رہا تھا اور رو رو کر کہہ رہا تھا کہ شاہ زیب نے شاہینہ کو قتل کر دیا۔ شاہ زیب شاہینہ کا قتل کر کے بھاگ گیا۔ بھائی نے بھائی کے سینے میں خنجر گھونپ دیا ہے۔ اورنگزیب بھی سکتے میں تھا اور شکیلہ بھی لیکن یہ بات اورنگزیب اور شکیلہ ہی نہیں ملازم بھی جانتے تھے کہ شاہ زیب کو مجرم بنانے میں شاہینہ کا بہت بڑا بلکہ سب سے بڑا ہاتھ ہے۔

بہرحال اس کے بعد یہ خبر الیاس خاں اور جبار خاں تک پہنچنے میں بھلا کیا دقت پیش آ سکتی تھی۔ ملازم نے سب سے پہلے ٹیلی فون پر ان دونوں کو ہی خبر دی تھی اور ادھر بھی کہرام مچ گیا تھا۔ ادھر اس کوٹھی میں ایک ایک فرد جاگ گیا تھا۔ چاروں طرف روشنیاں جلا دی گئیں تھیں۔ اورنگزیب اور جہانزیب سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ جہانزیب نے تو اپنی حالت بری بنالی تھی اور بہت دیر تک وہ سکتے کے سے عالم میں بیٹھا رہا تھا۔ الیاس خاں اور جبار خاں نے پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ جہانزیب دوڑ کر الیاس خاں سے لپٹ گیا۔

''کیا ہوا ہے؟ یہ سب کیا ہوا ہے؟'' جہانزیب دوڑ کر الیاس خاں سے لپٹ گیا۔

''شاہینہ--- شاہینہ--- بھائی الیاس--- شاہینہ--- شاہینہ قتل کر دی گئی۔'' الیاس ں نے دور جہانزیب کو دھکا دیا تھا۔

''تیرے سپرد کی گئی تھی وہ--- تیرے نکاح میں دی گئی تھی وہ جہانزیب! کیسے قتل ئی؟ تو اس کا محافظ تھا تیری ذمہ داری تھی وہ۔''

''گولی مار دو مجھے' پھانسی پر چڑھوا دو۔ اسی وقت ختم کر دو۔ میں اس کے بغیر جینا یں چاہتا' مر جانا چاہتا ہوں۔ گولی مار دو مجھے' انتظار مت کرو۔ آہ--- مجھے گولی مار دو۔ اہینہ میری زندگی تھی وہ---وہ---'' جہانزیب نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا اور سکیاں لینے لگا۔ الیاس خاں خونی لہجے میں بولا۔

''تمہیں ہی نہیں جہانزیب! تمہارے پورے خاندان کو زندہ جلا دینا چاہیے۔ تم گ اسی قابل ہو۔ ارے--- تم لوگ کیا کر رہے ہو؟ تم سب میرے خاندان کو تباہ کر ہے ہو۔ ہم لوگ--- ہم لوگ جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے لیکن تمہارے بھائی کے اتھوں میری بہن اور بیٹے کا خون ہوا ہے۔ کیا کروں میں تمہارا' کیا کروں؟''

''سوچ کیا رہے ہو الیاس خاں' جبار خاں۔ خون سرد ہو گئے ہیں تمہارے۔ مارو۔ ہم سب کو مار دو گولی' مار دو ہمیں۔'' جبار خاں نے آگے بڑھ کر بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''جذباتی نہ بنو خاں جی! وہ ہم پر دوسرا وار کر کے نکل گیا اور ہم بلاوجہ خاں کہلاتے ہیں اسے تلاش کرو۔ ان سے کیا لینا۔ پہلے بہن کی تدفین کا بندوبست کرو۔ بلکہ ایسا کرو ہم شاہینہ کی لاش کو لے چلتے ہیں۔ یہاں ان جانوروں میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔ ہم--- ہم خود اس کی تدفین کریں گے۔''

''نہیں رے نہیں --- مجھے اس کی آخری رسومات میں تو حصہ لینے دو۔ ہاتھ جوڑتا ہوں میں تمہارے۔''

''جہانزیب! ہم نے اپنی بہن زندہ سلامت رخصت کی تھی۔ تم نے اور تمہارے خاندان نے اسے موت سے ہمکنار کر دیا۔ ہماری تمہاری دشمنی اب نجانے کب تک چلے گی۔ تم یہ مت سمجھو کہ ہم نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ آخر وہ تمہارا ہی خون ہے۔ ہمارا خون اس طرح بہا دیا گیا ہے تو تم کیا سمجھتے ہو تم بچ جاؤ گے۔ تم نہیں بچ سکو گے جہانزیب! سوچ لیں ہمارا غم کہاں تک پہنچے گا اور اس کے بعد ہم فیصلہ کریں گے کہ اس کے آگے کیا کرنا ہے۔'' جہانزیب آنکھیں بند کر کے اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ الیاس خاں اور جبار خاں نے اپنے ساتھ آئے ہوئے لوگوں سے انتظامات کرنے کے لیے کہا پھر اس کے بعد جہانزیب خاموشی سے شاہینہ کی لاش کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ اس نے آخری وقت میں بھی کہا۔

''مجھے اس کی لاش کو قبر میں اتارنے کی اجازت تو دے دو بھائی الیاس!''

''تمہارا اب اس سے رشتہ ختم ہو گیا ہے۔ تم اس کی صورت نہیں دیکھ سکتے۔ چلو۔''

الیاس خاں کے اشارے پر گاڑیاں واپس چلی گئیں۔

رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔ حویلی پر ایک عجیب سی فضا طاری تھی۔ شکیلہ اس وقت کمرے میں موجود نہیں تھی۔ جہانزیب نے بھائی کا چہرہ دیکھا اور پھر سرد لہجے میں بولا۔

''یہ کام شاہ زیب نے نہیں کیا ہے۔'' اورنگزیب چونک کر جہانزیب کو دیکھنے لگا۔ اسے ایک دم سے محسوس ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جہانزیب کے چہرے پر جو غم کے آثار نظر آ رہے تھے وہ اب نہیں رہے ہیں۔ بلکہ اس کی آنکھوں میں ایک تیز چمک

رانے لگی تھی۔ پھر ایک مدھم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی اور اس نے سرد لہجے ں کہا۔

''ہاں' شاہینہ کو شاہ زیب نے نہیں قتل کیا اورنگزیب!''

''تت --- تو پھر۔''

''اسے میں نے قتل کیا ہے۔'' جہانزیب نے کہا اور اورنگزیب کے پورے وجود ں گڑگڑاہٹ ہونے لگی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے جہانزیب کو دیکھا تو جہانزیب نے کہا۔

''وہ ہمارے خاندان کی تباہی کا باعث بنی ہے۔ اس نے ہم لوگوں کو ہمارے بھائی ے محروم کر دیا ہے۔ وہ ہماری آستین کا سانپ تھی۔ اس کی وجہ سے نجانے ہم کیسے کیسے ذاب میں گرفتار ہو گئے۔ شاہ زیب ہم سے چھن گیا۔ آخر کار میری غیرت کو جاگنا ہی ھا۔ ماں کی ملامت بھری آنکھوں کا سامنا نہیں کر سکتا تھا میں۔ وہ ہمارے لیے قابل فرت چیز تھی۔ میں نے اسے ہمیشہ کے لیے راستے سے ہٹا دیا۔''

''کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟ پھر آپ نے گولیاں کس پر چلائیں تھیں؟ آپ نے شاہ زیب کا نام لیا تھا۔''

''ضروری تھا یہ۔ چالوں کی دماغ میں' چالیں چلنا پڑیں گی۔ اب شاہ زیب کی زندگی بچائیں گے ہم --- ہم سے زیادہ اس کا قریبی اور کون ہو سکتا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں اور سنو --- اب ہمیں باقاعدہ ایک نیٹ ورک بنانا پڑے گا۔ بھائی ہے وہ ہمارا۔ ایسے تو نہیں چھوڑ سکتے اسے۔'' اورنگزیب خوفزدہ نگاہوں سے بھائی کو دیکھنے لگا۔ تو اس نے کہا۔

''لیکن قتل کا یہ الزام تو شاہ زیب پر ہی جائے گا۔'' جہانزیب کے ہونٹوں پر پھیلی

سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

"بے شمار پولیس والے، بہت سے لوگوں کے قتل کا الزام اس پر ہے۔ ایک اور قتل کا الزام سہی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

☆☆☆

دن ختم ہوتا جا رہا تھا اور آہستہ آہستہ شام اترتی جا رہی تھی۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنیں ماحول کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھیں۔ شاہ زیب نے دور سے شہریار اور اس کی خوبصورت بیوی کو دیکھا۔ وہ لوگ غالباً ہلکی ورزش کرنے کے بعد واپس آ رہے تھے۔ دونوں کے جسموں پر سفید لباس تھا۔ ان کے چہرے سنہری دھوپ سے چمک رہے تھے۔ سفید لباس میں دونوں بہت خوبصورت نظر آ رہے تھے۔ شاہ زیب انیکسی سے باہر نکل آیا اور سامنے کی طرف چلا تو شاہ زیب کی ضروریات پوری کرنے والے ملازم نے اسے روک لیا۔

"نہیں اندر جانا منع ہے۔ اگر تم ان سے ملنا چاہتے ہو تو ان کا انتظار کرو۔ وہ ابھی باہر آئیں گے۔" شاہ زیب نے گردن ہلائی۔

بہرحال مجسٹریٹ کچھ بھی تھا۔ مالی طور پر وہ شاہ زیب کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن اب یہ وقت بگڑا ہوا تھا۔ شاہ زیب ایک طرف بیٹھ گیا۔ جہاں چھوٹے چھوٹے سے حوض کے کنارے سفید سنگ مرمر کی بنچ پڑی ہوئی تھی۔ بنچ پر بیٹھ کر وہ حوض میں تیرتی ہوئی مچھلیوں کا جائزہ لینے لگا۔ رنگین مچھلیاں ادھر سے ادھر بھاگتی پھر رہی تھیں اور شام تیزی سے ماحول کو نگل رہی تھی۔ پھر سورج ڈوب گیا اور عمارت میں جگہ جگہ بلب روشن ہو گئے۔ لیکن قرب و جوار میں گہرا سناٹا تھا۔ عظیم الشان کوٹھی میں ملازم تو تھے لیکن گھر والے کم ہی تھے۔

پھر تھوڑی دیر کے بعد شہریار اور اس کی بیوی باہر نکل آئے۔ انہوں نے لباس بھی تبدیل کر لئے تھے۔ شہریار نے شاہ زیب پر کوئی توجہ نہیں دی تھی اور ہنستا ہوا باتیں کرتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا جبکہ اس نے شاہ زیب کو دیکھ بھی لیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہی ملازم آیا اور اس نے کہا۔

"آیئے صاحب جی! بڑے صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔" شاہ زیب اس جانب چل پڑا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ راستے میں جس قدر اخلاق سے مجسٹریٹ اس کے ساتھ پیش آیا تھا یہاں اپنی کوٹھی میں آنے کے بعد اس کا یہ انداز نہیں رہا تھا۔

بہرحال وہ لان میں بچھی ہوئی بید کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا اور اس کی بیوی اس کے قریب موجود تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک تیز بلب موجود تھا۔ شہریار کے سامنے میز پر ٹیلیفون بھی رکھا ہوا تھا اور اورنج جوس کے گلاس بھی۔ ملازم اسے وہاں چھوڑ کر چلا گیا اور شہریار نے اس انداز میں گردن ہلائی جیسے شاہ زیب کو انتظار کرنے کے لیے کہہ رہا ہو۔ اچانک ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور شہریار نے ہاتھ اٹھا کر ٹیلی فون کا رسیور اٹھا لیا اور پھر بولا۔

"ہاں۔ میں تمہارے ہی فون کا انتظار کر رہا تھا۔ کہو کیا حال ہے؟ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم فکر ہی مت کرو کیا سمجھے۔" اس کے بعد وہ دیر تک ہاں، ہوں کرتا رہا تھا پھر اس نے بات ختم کی اور رسیور رکھ دیا۔ اس کے بعد اشارے سے شاہ زیب کو قریب بلایا اور اس سے بولا۔

"ہاں۔ کوئی خاص بات کہنی ہے مجھ سے۔ اصل میں مجھے اس فون کا انتظار تھا۔ بہت ضروری ٹیلی فون تھا۔ میں نے سوچا فون پر باتیں کرنے کے بعد تم سے باتیں کروں گا۔ کہو ٹھیک تو ہو تم؟"

''جی جناب!''

''اچھا اب یہ بتاؤ کیا چاہتے ہو؟ دیکھو--- حالانکہ میں خود بھی سرکاری عہدے دار ہوں۔تمہارے بارے میں تھوڑی بہت معلومات مل چکی ہیں مجھے تم سے لیکن میری ذمے داریاں اپنی جگہ ہیں۔ میں اگر اپنی سیٹ پر ہوتا تو شاید تمہارے ساتھ یہ سلوک نہ کرسکتا لیکن کوئی ایسی بات نہیں ہے۔''

''بس جناب! آپ مجھے اجازت دیجئے۔ظاہر ہے آپ کا اور میرا ساتھ اتفاقیہ ہی تھا۔میں چلا جاؤں گا۔''

''نہیں میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں خود اسٹیشن تک پہنچاؤں گا۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ تمہیں تھوڑے دن تک اپنا مہمان کیوں نہ رکھوں۔ کیوں ڈارلنگ! بڑا اچھا آدمی ہے یہ۔راستے میں مجھے مل گیا تھا اور میری بڑی مدد کی تھی۔'' شہریار نے شاہ زیب کو آنکھ ماری۔ غالباً وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو بھی شاہ زیب کی اصلیت نہیں بتائی ہے۔''

''ہاں--- کیا حرج ہے۔تم جو کوئی بھی ہو۔ اگر کچھ وقت ہمارے ساتھ گزارنا چاہتے ہو تو رک سکتے ہو۔''

''نہیں جناب! آپ کی بے حد مہربانی۔ آپ تو بہت ہی مہربان انسان ہیں مگر میں آپ کو زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتا۔''

''پھر بھی میرا خیال ہے۔تمہیں تھوڑا تو وقت ہمارے ساتھ گزارنا چاہیے۔رات کو میں تم سے بات بھی کروں گا۔'' شاہ زیب نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر ایک گہری سانس لے کر گردن ہلاتا ہوا بولا۔

''ٹھیک ہے جناب! آپ اگر چاہتے ہیں تو میں رک جاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔رکو--- رکو اور بالکل فکر مت کرو۔ یہاں آرام سے گھومو' یہاں کوئی ہیں پریشان نہیں کرے گا۔''

''جی سر!''

''جاؤ--- اب آرام کرو۔کھانے پینے کی کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟''

''نہیں جناب! بالکل نہیں۔''

''او کے۔او کے۔جاؤ'' اس نے کہا اور شاہ زیب اپنی جگہ سے واپس پلٹ پڑا۔

سوچتا تھا بہت کچھ سوچتا تھا۔اب کرنا کیا چاہیے۔کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ربار سوچوں کے دائرے پھیل جاتے تھے۔ یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ اب زندگی میں سکون ا کوئی لمحہ نہیں ہے لیکن بدنصیبی کوئی ایسا ٹھوس راستہ دریافت ہونے نہیں دے رہی تھی۔ ںسکون دے دے۔سکون تو اب زندگی سے دور ہی ہو گیا تھا۔

بہرحال یہ مجسٹریٹ بڑا حیرت انگیز آدمی تھا۔عقل تو اس کی بات کو تسلیم نہیں کرتی ی کہ وہ درحقیقت تمام معاملات بھول کر اسے پناہ دے رہا ہے۔ بلکہ ہر لمحہ یہی سوچ امن گیر رہتی تھی۔ یہ مجسٹریٹ اتنے خطرناک آدمی کو گرفتار کرا کے اپنے نمبروں میں ضافہ کرنا چاہتا ہے اور شاہ زیب اس کے لیے تیار تھا۔انیکسی کی ایک ایسی کھڑکی سے ملحق یک درخت اس نے تاڑ لیا تھا جس میں سلاخیں وغیرہ نہیں تھیں اور وہ کھڑکی کے ذریعے ل درخت تک پہنچ سکتا تھا اور یہ درخت اسے اپنی پھیلی ہوئی شاخوں کے ذریعے اس مارت سے باہر نکال سکتا تھا۔شاہ زیب نے یہ دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر شہریار کی رف سے کوئی گڑبڑ پائے گا تو اس درخت کے ذریعے نکلنے کی کوشش کرے گا۔

بہرحال اس کے بعد یہ تھوڑا سا مرحلہ تو اسے طے کرنا ہی تھا۔پھر دو دن یہاں گزر ئے۔تیسرے دن غالباً یہاں کوئی تقریب تھی۔ پتہ یہ چلا کہ بیگم صاحبہ کی سالگرہ ہے۔

بے شمار مہمان آئے ہوئے تھے۔ پولیس کی بہت سی گاڑیاں بھی یہاں آئی ہوئی تھیں اور پولیس کو دیکھ کر شاہ زیب کا دم نکل گیا تھا۔ اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر کھڑکی کے راستے درخت کی ایک شاخ کو اپنا مسکن بنایا۔ گھنے اور پھیلے ہوئے درخت کے ایک حصے میں اسے پناہ مل گئی اور وہ یہاں سے اس جشن کا جائزہ لے رہا تھا۔

آخر کار اس نے سوچا کہ اب یہاں وقت گزاری بے مقصد ہی ہے۔ مجسٹریٹ شاید چھٹی پر ہے۔ ڈیوٹی پر واپس جاتے ہوئے وہ اس کو خدا حافظ کہے گا یا پھر اس سے پہلے ہی کچھ ہو جائے گا لیکن ان دونوں باتوں سے پہلے ہی کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہے۔

چنانچہ آخر وہ کوٹھی سے باہر درخت سے اتر گیا اور تیز رفتاری سے ایک سمت چل پڑا۔ آگے گھنی جھاڑیاں تھیں۔ اس کے درمیان سے گزرنے کے لیے اسے بار بار رکنا پڑتا۔ جھاڑیوں کا یہ سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ تھوڑی دور تک وہ جھاڑیوں سے الجھتا چلتا رہا اور اس کے بعد اسے ایک نہر نظر آئی۔ اچھی خاصی نہر تھی۔ اس نے جلدی سے جوتے اتارے اور نہر میں اتر گیا۔ کنارے پر پانی کم تھا۔ وہ رفتہ رفتہ آگے بڑھتا گیا اور پانی اونچا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ پانی کمر تک آ گیا۔ اب وہ نہر کے بیچوں بیچ پہنچ گیا تھا۔ پانی کا دھارا کافی تیز تھا۔ اس کے قدم بار بار اکھڑ جاتے تھے۔ مگر وہ سنبھل سنبھل کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک پانی کا زوردار ریلا آیا اور شاہ زیب کے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ پانی کے تیز ریلے میں بہتا ہوا آگے نکل گیا۔ نہر نیم دائرہ بناتی ہوئی مغرب کی سمت مڑ گئی تھی۔ موڑ پر بائیں طرف کھال تھا جو کنارہ کاٹ کر آبپاشی کے لیے بنایا گیا تھا۔ خاصی تنگ جگہ تھی۔ کافی کم جگہ تھی۔ شاہ زیب پانی کے تیز ریلے میں بہتا ہوا کھال میں آ گیا اور اس نے گردن پانی سے باہر نکال لی۔

کھال کے ایک طرف گندم اور جو کے کھیت نظر آ رہے تھے۔ گہرائی اتنی کم تھی کہ

کچھ ہی لمحوں کے بعد شاہ زیب اوپر چڑھ کر آگے بڑھ گیا۔ گندم اور جو کے کھیت داہنی سمت تھے۔ اس طرف سرکنڈوں کے گھنے پودوں کی جھاڑیاں تھیں اور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ پانی سے شرابور تھکن سے نڈھال ایک جھاڑی کے نیچے بیٹھ کر ستانے لگا۔ رات کے آنگن میں ستاروں کے کنول جھلملا رہے تھے۔ ہلکے ہلکے جھونکوں سے پودوں میں سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ گہری سانسیں لیتا رہا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ کھیتوں کے اس پار کسی گاؤں کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں مٹی کے مکانات دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ رات کے پچھلے پہر کی خاموشی میں گاؤں بالکل ویران نظر آ رہا تھا۔

چنانچہ شاہ زیب کھیتوں کے پاس سے گزرتا ہوا گاؤں سے تھوڑے پرے آگے بڑھنے لگا۔ آخر کار کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوا۔ اس کے آگے چٹیل میدان تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا اور اس نے دو تین میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ اب وہ بہت تھک چکا تھا۔ کہیں ٹھہر کر آرام کرنا چاہتا تھا۔ آخر کار ایک ایسی جگہ بھی مل گئی۔ یہ کسی نامعلوم درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ نیچے کی زمین ہموار تھی اور خاردار جھاڑیوں سے صاف تھی۔

چنانچہ وہ درختوں کے نیچے چلا گیا اور نڈھال ہو کر زمین پر ہی لیٹ گیا۔ اس کے کپڑے ابھی تک گیلے تھے اور اسے سخت سردی لگ رہی تھی۔ چنانچہ اس نے کروٹ لے کر بدن سکوڑ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر کے بعد نیند آ گئی تھی۔ وہ گہری نیند سوتا رہا تھا۔

رات گزری، صبح ہوئی۔ سورج چڑھ کر آسمان پر آ گیا۔ آنکھ کھلی تو اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے قریب موجود ہے۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا کہ ایک آدمی اس پر جھکا ہوا اس کی جیبوں کی تلاشی لے رہا تھا۔ وہ ایک دم چونک پڑا اور دوسرے لمحے اٹھ کر بیٹھ

گیا۔ تلاشی لینے والا شخص بھاگنے کے لیے تیزی سے مڑا لیکن شاہ زیب نے اس کی ٹانگوں میں ٹانگیں اڑا دیں اور وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گر پڑا۔ شاہ زیب نے جھپٹ کر اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا تھا۔ اس شخص کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جسم لمبا اور مضبوط تھا۔ اس نے طاقت صرف کر کے اپنے آپ کو شاہ زیب کی گرفت سے آزاد کرلیا۔

لیکن دوسرے لمحے شاہ زیب نے پھر اس کے کان پکڑے۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے زور آزمائی کرنے لگے۔ دونوں خاک میں لتھڑے ہوئے ہانپ رہے تھے اور اب اس شخص کو احساس ہو رہا تھا کہ اس نے کوئی جنجال پال لیا ہے۔ شاہ زیب نے آخر کار اسے زچ کرلیا اور اچھل کر ایک زوردار لات اس کی کمر پر ماری۔ وہ زمین پر گرا اور لڑھکتا چلا گیا۔ شاہ زیب نے اسے موقع نہیں دیا تھا۔ وہ جلدی سے اس کے سینے پر سوار ہو گیا تھا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلہ پکڑ لیا۔ وہ بے بس ہو کر غیں غیں کر رہا تھا۔ شاہ زیب نے اس کے منہ پر تین چار تھپڑ لگائے اور کہا۔

''ہوں' تو چوری کر رہا تھا تو۔''

''صاحب جی! آپ تو مجھ سے بھی زیادہ غریب ہو۔ میرے پاس تو پھر بھی بارہ سو روپے موجود ہیں۔ آپ کی جیب سے تو بارہ آنے بھی نہیں نکلے۔'' شاہ زیب کو ایک دم ہنسی آ گئی۔ اس نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''تو نے دیکھ لیا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔''

''ہاں جی --- اگر کسی اور جگہ چھپا رکھا ہے تو ہم نہیں کہہ سکتے۔''

''تو پھر تلاشی لے سکتا ہے لیکن بارہ سو روپے میں سے چھ سو میرے ہوں گے۔''

''کیا کہتے ہو جی!''

''چوری ہی کیئے ہوں گے تو نے یہ بارہ سو روپے کہیں سے۔''

''سر جی! تھوڑے تھوڑے پیسے کر کے جمع کیئے ہیں۔''

''بکواس مت کر' چھ سو روپے نکال دے ورنہ ---''

''صاحب جی! معاف کر دو۔ اسے تو کہتے ہیں کہ چوروں کو مور پڑ جاتے ہیں۔''

''بالکل ٹھیک۔ ایسا ہی ہوا ہے اور اگر دوسری بار تو نے منع کیا تو بارہ سو کے بارہ سو میرے ہوں گے۔ ورنہ آ جا فیصلہ کر لے۔''

''لے لو جی۔ کبھی کبھی تقدیر ایسے فیصلے بھی کرتی ہے۔''

''کب سے چوری چکاری کر رہا ہے؟''

''اوہ جی --- دو تین جگہ بس یہ سب کچھ کیا ہے۔ ورنہ جی کسان ہوں کھیتوں پر کام کرتا تھا۔ بہت عرصے سے کھیت پر کام نہیں ملا اور پیٹ بھرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے جی!''

''ہوں۔ یہاں سے کہاں جانے والا تھا؟''

''بس جی --- اب ساری باتیں مت پوچھو' نہر کا پانی بہت تیز چل رہا ہے۔ رات کے اندھیرے میں میں بھی نہر میں گرتے گرتے بچا تھا۔''

''علاقہ کس کا ہے؟''

''اوہ بھائی جان --- فخر خان ہے اس علاقے کے مالک کا نام۔ بس جی کیا کریں یہ چودھری لوگ کسی کی پرواہ نہیں کرتے ہیں۔ اتنے عرصے اس کے پاس کام کیا۔ ذرا سا ناراض ہوا نکال دیا۔ اب جی ادھر تو فاقے کرنے پڑ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ مجبوری ہے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔''

''اور تو نے چوریاں شروع کر دیں۔''

''صاحب جی! بس یہی کام ایسا ہے جس کے لیے سفارش کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' اس نے کہا اور ہنسنے لگا۔ شاہ زیب کو اس کی یہ بات بہت پسند آئی تھی۔ وہ بھی ہنس پڑا اور بولا۔

''کافی تیز آدمی معلوم ہوتا ہے تو۔''

''چھوڑیں صاحب جی! اب آپ نے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا۔ نقصان بھی ہو گیا چھ سو روپے کا۔ اب آپ اپنا راستہ ناپو ہم اپنا' ہم تیز ہیں یا پاگل ہیں یہ جانے دو۔ کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔''

''نام نہیں بتایا تو نے اپنا؟''

''ایسا نام ہے جی! کہ بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔''

''کیوں؟ ایسا کیا نام ہے؟''

''اللہ رکھا ہے جی ہمارا نام۔ سمجھ رہے ہو نا لیکن اب جیسے بھی ہیں تمہارے سامنے ہیں۔''

''ہوں--- عمل تو انسان کا اپنا ہی ہوتا ہے۔ تو نے دوبارہ فخر خان سے نوکری نہیں مانگی؟''

''آپ کیا بات کرتے ہو جی! جب ہم نے اس کے بھٹے پر کام کیا تھا تو اس نے ہمیں تین ہزار رکھنے کے لیے دیئے تھے۔ تم پتہ نہیں سمجھتے ہو یا نہیں سمجھتے۔ سمجھ لو کہ یہ تین ہزار ہماری قیمت تھی۔ ہم مر کر دس دفعہ بھی پیدا ہو جاتے تو فخر خان کے وہ تین ہزار نہیں ادا کر سکتے تھے۔ بھٹے پر جتنے بھی لوگ کام کرتے ہیں۔ سر جی! انہیں کچھ نہ کچھ ملا ہوا ہوتا ہے اور وہی ان کی زندگی کی قیمت ہوتی ہے۔ فخر خان ناراض ہو گیا اور اس نے ہمیں

ال دیا تین ہزار روپے واپس مانگے۔ ہم کہاں سے دیتے۔ گھر کا سارا سامان فخر خان کے پاس پہنچ گیا اور اسی سامان میں ہماری گھر والی بھی تھی۔''

''کیا---؟'' شاہ زیب بری طرح چونک پڑا۔

اللہ رکھا کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس کے حلق سے سسکاریاں سی نکلنے لگیں تھیں۔ شاہ زیب کو بہت ہی افسوس ہونے لگا۔ اس نے کہا۔

''اللہ رکھا! اپنے آپ کو سنبھال۔ مجھے بتا کیا کہہ رہا ہے تو؟''

''بس جی! تین ہزار روپے کے بدلے ہماری گھر والی پکڑ لی اور یہ شرط لگائی کہ پیسے واپس کر دیں گے۔ تو گھر والی مل جائے گی۔ بڑی محبت تھی جی ہمیں اس سے مگر سری! ہماری تقدیر میں ہی نہیں تھی۔'' اللہ رکھا بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

ایک بار پھر شاہ زیب کے دل و دماغ میں نفرت کا طوفان بلند ہوا۔ وہ اپنے ہی مسائل میں گرفتار تھا۔ اس کے اپنے ہی دل میں غم کے سائے لرزتے رہتے تھے۔ کسی دوسرے غم کی گنجائش اپنے سر لینے کی بالکل فرصت نہیں تھی لیکن بعض اوقات ایسے دلدوز واقعات سامنے آ جاتے ہیں کہ اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون شدید روانی اختیار کر لیتا تھا۔ اس نے سامنے کھڑے ہوئے شخص کے چہرے کو دیکھا جو اس کی جیبوں کی تلاشی لے رہا تھا لیکن کتنا دکھی ہے یہ اندر سے کتنا غمزدہ ہے۔ کتنے دکھ سے وہ کہہ رہا تھا کہ ہم اپنی گھر والی سے بہت محبت کرتے تھے۔ انسانوں سے انسانوں کا پیار چھین لینے والے اس قابل نہیں ہو سکتے کہ ان پر رحم کیا جائے۔ ایک بار پھر اس کے دل میں نفرت کا وہی پودا جڑ پکڑ گیا تھا۔

شہاب الدین نے بھی تو ایسا ہی کیا تھا۔ بعد میں چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں کرے یا اپنے پچھتاوے کا شکار ہو لیکن جو کرنا تھا وہ تو [illegible]ن بیٹھا تھا۔ اب اس کے بعد باقی سب

کچھ کرنا اس کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ لجیا دل میں آتی تو دل اس طرح ڈوبنے لگتا جیسے کوئی سہارا نہ رہا ہو۔ ''مجھ سے شادی کر لے۔'' یہ الفاظ اکثر اس کے کانوں میں گونجتے رہتے تھے۔ پتہ نہیں بے چاری کہاں گئی۔ پتہ نہیں کیا کر رہی ہوگی۔ بہرحال یہ ساری باتیں بعد کی تھیں۔ اس نے پوچھا۔

''اچھا۔ ایک بات بتاؤ اللہ رکھا! بچے تو نہیں ہیں تمہارے؟''

''ہیں نا جی! ایک بیٹا ہے۔ ایک بیٹی ہے۔''

''اوہو کتنے بڑے بڑے ہیں؟''

''بڑے چھوٹے ہیں جی! بیٹا ابھی ڈیڑھ سال کا ہے اور بیٹی ڈھائی سال کی۔''

''ماں کو یاد کرتے ہوں گے؟''

''ایسا ویسا جی۔ بیٹی تو سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہے۔ بیٹا ٹھیک ہے پر وہ بھی ہمکتا ہے ماں کے لیے۔ اصل میں ابھی اسے اس کا اندازہ نہیں ہوسکا کہ اس کی ماں اس کے پاس نہیں ہے۔''

''کہاں ہیں دونوں؟''

''نانی کے پاس چھوڑ دیا ہے جی! اور کون تھا ان کا رکھوالا۔'' اللہ رکھا نے جواب دیا۔

''ہوں۔ اللہ رکھا! فخر خان اس بات سے انکار تو نہیں کر دے گا کہ تیری بیوی اس کے پاس ہے؟''

''نہیں صاحب جی! پیسے واپس کر دیں گے اس کے تو واپس کر دے گا ہماری گھر والی کو۔ یہی کہہ رہا ہے۔''

''اچھا۔ ایک بات بتاؤ تم نے کبھی اس کی حویلی میں داخل ہونے کی کوشش نہیں

کی؟ میرا مطلب ہے اپنی گھر والی کی تلاش میں؟'' اللہ رکھا کے ہونٹوں پر ایک غم آلود مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''کی تھی جی! ایک بار کی تھی۔''

''تو پھر؟''

''پھر---'' اللہ رکھا نے آہستہ سے کہا اور اس کے بعد پیٹھ کھول کر سامنے کر دی۔ شاہ زیب نے اس کی پیٹھ پر بنے ہوئے وہ کالے نشان دیکھے جو پہلے لال ہوں گے۔ پھر کالے ہوگئے ہوں گے۔

''آ جا--- آ جا--- میرے ساتھ آ جا--- آ جا' بس تو نے میرے لیے ایک مشغلہ دریافت کر لیا ہے۔'' شاہ زیب نے کہا اور اللہ رکھا کو ساتھ لے کر ایک اور گوشے میں جا بیٹھا۔ پرسکون سی جگہ تھی کوئی خاص کام تو تھا نہیں۔ اللہ رکھا بھی بے روزگار ہی تھا اور اپنے طور پر شاید تین ہزار روپے جمع کرنے کے لیے شاید اس طرح کے کام کر رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر شاہ زیب نے کہا۔

''اللہ رکھا! مجھے فخر خان کے بارے میں تفصیلات بتاؤ۔''

''بس جی! آپ یوں سمجھ لو کہ ہمارا تو سب کچھ ختم ہوگیا۔ ہمارے ساتھ ہمارا ایک بچپن کا یار دین محمد بھی تھا۔ ہم اپنے کھیتوں پر کام کرتے تھے اور زندگی گزار رہے تھے۔ بس جی تقدیر نے ساتھ چھوڑ دیا۔ فخر خان کے کھیتوں میں بہت سے لوگ کام کرتے تھے۔ دین محمد بھی اسی کے ساتھ کام کرتا تھا۔ فخر خان کی زمین ذرا آگے ہے ادھر پانی نہیں ہوتا۔ ٹیوب ویل لگاؤ جی تو کافی گہرائی میں جا کر پانی ملتا ہے اور جب فخر خان کی زمین اناج نہیں دیتی تو وہ غصہ ہو جاتا ہے اور ادھر ادھر کی زمینوں سے پانی لیتا ہے۔ اکثر جی! جھگڑے بھی ہوتے رہتے ہیں اس پر اور اس کے لیے بڑے بڑے خراب کام ہوتے

ہیں۔ایک دفعہ دین محمد نے اس سے جھگڑا کیا تھا۔بس آپ یہ سمجھ لو جی کہ دین محمد اب اس دنیا میں نہیں ہے۔''

''ارے ارے مار دیا اسے؟''

''ہاں جی۔مار دیا۔''

''ہوں۔یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔''

''آپ کو پتہ نہیں ہے صاحب جی! فخر خان نے اپنی جیل الگ بنا رکھی ہے اور اس جیل میں جو کچھ ہوتا ہے وہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''مجھے اور کچھ بتاؤ؟''

''بس جی! سارے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ایک بار مجھے اس جیل کا مزہ مل چکا ہے میں شروع رات کو ایک ہی زنجیر سے پیروں میں کڑے ڈال کر بند کر دیا گیا تھا اور بھی قیدی ہمارے ساتھ تھے۔پھر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔وہ آپ کو بتاؤں تو آپ یقین نہیں کرو گے۔ایک قیدی کے جھگڑا کرنے پر فخر خان جی نے گولی سے اڑا دیا تھا میرے سامنے تین گولیاں چلائیں تھیں اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔بڑا تگڑا جوان تھا جی! کچھ دیر اپنے ہی خون میں تڑپتا رہا پھر اس نے دم توڑ دیا لیکن کیا مجال کوئی اس کی طرف گردن اٹھا کر بھی دیکھے۔

''قیدی اس جیل سے بھاگنے کی کوشش نہیں کرتے؟''

''کرتے ہیں جی! پر خیر خان جو ہے نا وہ خیر خان نہیں شیر خان ہے۔وہ اچھے اچھوں کو گولیوں سے ختم کر دیتا ہے۔جو پکڑے جاتے ہیں انہیں بھی سامنے لا کر گولی مار دیتا ہے۔پھر وہیں اسے گڑھا کھود کر دفن کر دیتے ہیں۔نہ اس پر کفن ڈالا جاتا ہے نہ اسے نہلایا جاتا ہے۔رات کے اندھیرے میں چپ چاپ زمین میں گاڑھ دیتے ہیں۔میں

جتنے دن جیل میں رہا ہوں انہوں نے آٹھ بندے مارے، میری آنکھوں کے سامنے کی بات ہے جی! پھر کس کی مجال ہے کہ فخر خان کے خلاف کوئی قدم اٹھائے۔''

''ہاں۔ایک بات بتاؤ۔ان میں سے کوئی پولیس سے رابطہ نہیں کرتا؟'' شاہ زیب نے پوچھا۔

''لو جی! کیا نہیں ہوا لوگ پولیس میں پرچے کرا آتے ہیں مگر مجال ہے کسی کی کہ فخر خان کے خلاف کوئی کارروائی ہو جائے۔کچھ بھی نہیں ہوتا صاحب جی! بلکہ الٹی مصیبت گلے پڑ جاتی ہے اور پھر جو کچھ ہوتا ہے وہ دیکھنے والی چیز ہوتی ہے۔میں آپ کو ایک بات بتاؤں میں نے ایک دفعہ ایک بندے کو دیکھا تھا جس نے پولیس میں کافی آگے تک بات پہنچا دی تھی۔بس جی فخر خان کے بندے مسلح ہو کر اس کے گھر پہنچے۔سردیوں کے دن تھے۔دھند چھائی ہوئی تھی انہوں نے پنڈ میں گھستے ہی اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی اور لوگوں نے کھیتوں میں چھپ چھپ کر جان بچائی۔وہ دروازہ توڑ کر گھر میں گھس گئے اور توڑ پھوڑ کر کے چلے گئے۔جاتے جاتے اس کی فصلوں کو بھی آگ لگا دی گئی۔اس کے تینوں بچے جل کر راکھ ہو گئے اور بات ختم ہو گئی جس نے جو کیا اس کو اس کا صلہ مل گیا۔''

''ٹھیک ہے۔اب کیا چاہتا ہے تو؟''

''بس جی! تین ہزار روپے اکٹھے کرنا چاہتے ہیں اور اس کے بعد فخر خان کے پاس جائیں گے۔ہمیں ہماری گھر والی مل جائے گی۔بس آپ یہ سمجھ لو کہ دنیا کی ہر چیز مل جائے گی۔''

''اچھا یہ بتا میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''آپ نے تو جو کچھ کرنا تھا کر لیا صاحب جی! ہمیں چھوڑ دیا یہی آپ کی بڑی مہربانی ہے۔''

''چل یہاں سے آگے چلتے ہیں۔ کچھ کریں گے۔ وہ سامنے جو آبادی نظر آ رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے صاحب جی!''

''ایک بات سن میں تجھے بتاؤں۔ میں بھی پولیس سے بھاگا ہوا ہوں اور پولیس میری تلاش میں ہے۔ تیرا جب تک دل چاہے میرے ساتھ رہ۔ مجھے تو خیر کوئی نہ کوئی بڑی سزا ہو ہی جائے گی لیکن اگر ممکن ہوسکا تو فخر خان سے تیری گھر والی کو رہائی دلوا دوں گا۔'' اللہ رکھا کی آنکھوں میں غم کے آثار پھیل گئے تھے۔ دونوں دیر تک خاموشی سے بیٹھے رہے۔ پھر اللہ رکھا نے کہا۔

''بھوک تو لگ رہی ہوگی آپ کو صاحب جی؟''

''ہاں یار! لگ تو رہی ہے۔''

''میں بستی جاتا ہوں اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے کر آتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے جا۔'' شاہ زیب نے کہا اور ایک گھنے اور چوڑے درخت کے نیچے ڈیرہ جمالیا۔ بستی زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ دور سے اس کے آثار نظر آ رہے تھے لیکن پھر بھی ایک انسان کا پیدل جانا اور پیدل ہی واپس آنا خاصا وقت طلب مرحلہ تھا۔ شاہ زیب جانتا تھا کہ اسے کافی دیر لگ جائے گی۔ پھر وہ کچھ سوچ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اللہ رکھا پیدل چلتا ہوا نگاہوں سے دور ہو گیا تھا اور شاہ زیب اس کے قدموں کے نشان دیکھتا رہا تھا۔

دفعتاً ہی اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ درخت کے نیچے اسے دیکھا بھی جاسکتا ہے۔ لمبے، چوڑے، گھنے اور پھیلے ہوئے درخت کی شاخوں پر وہ چڑھ کر اپنے لیے جگہ بھی بنا سکتا تھا اور یہی اس نے مناسب سمجھا۔ ایک چوڑی شاخ پر اس نے اپنا ٹھکانا

بنالیا۔ دوسری چھوٹی شاخیں اس میں کچھ اس طرح پیوست تھیں کہ آرام کرنے کے لیے ایک اچھی جگہ مل گئی تھی اور گرنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ یہاں سے وہ اللہ رکھا کی واپسی کا انتظار بھی کرسکتا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ واپس آ ہی جائے۔ دنیا پر سے اتنا بھروسہ ختم ہو گیا تھا اس کا کہ وہ کسی پر بھی اعتبار نہیں کرتا تھا۔ ہاں اگر کوئی کام کر دے تو وہ قابل توجہ ہوسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے اللہ رکھا واپس ہی نہ آئے۔ کیا پڑی ہے کسی کو کسی کی آگ میں سلگنے کی اور کون سا اطمینان کر لیا ہوگا اس نے کہ شاہ زیب اس کی بیوی کو فخر خان کے ہاتھوں سے رہائی دلوا ہی دے گا۔

ویسے جہاں تک اللہ رکھا کی اس کہانی کا تعلق تھا۔ تو شاہ زیب کو اس پر پورا پورا یقین تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ جھوٹ نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے پھر اس کا ذہن نجانے کیسے کیسے خیالات میں ڈوبا رہا تھا۔ ان بڑے آدمیوں کی کہانی یکساں ہی ہوا کرتی تھی۔ کہیں وہ شہاب الدین ہوں، کہیں فخر خان، الیاس خاں یا حیدر شاہ سب اپنے اپنے طور پر کوئی نہ کوئی کہانی رکھتے ہیں۔ ایسی کہانی جس میں کسی کی زندگی کی پردرد داستان چھپی ہو۔ باقی رہا مکرم شاہ تو وہ تو ایک پراسرار کردار تھا۔ یوں نہ سمجھ میں آیا تھا نہ آسکتا تھا۔ پتہ نہیں کون تھا وہ کیا چیز تھا۔ کوئی سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ جہانگیرہ نے اسے رہائی دلادی تھی لیکن یہ رہائی بھی بہت خوفناک تھی۔

خیر یہ سب کچھ تو اس کی زندگی سے نجانے کب سے چمٹ گیا تھا۔ بھاگتا ہی پھر رہا تھا طویل عرصے سے۔ پولیس نے پکڑ لیا تھا۔ کبھی نہ چھوڑتی وہ تو شکر تھا کہ ابھی تک اس پر تشدد کا آغاز نہیں کیا گیا تھا۔ وہ لوگ اسے ریمانڈ پر ہی رکھ رہے تھے اور اس کے بارے میں تمام شواہد جمع کر رہے تھے۔ سینکڑوں الزامات تھے اس پر، قتل کئے تھے اس نے، لیکن یہ ساری کہانیاں کہانیاں ہی تھیں۔ جنون بار بار اس کے ذہن پر سوار ہوتا لیکن ہر شخص

ایک دم سے اعلیٰ پائے کا مجرم نہیں بن جاتا۔ پتہ نہیں اسے کیسی کیسی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے اور خاص طور سے جب وہ جرائم پیشہ نہ ہو۔

شاہ زیب نے جو کچھ کیا تھا بس ایک جنون تھا۔ ایک ایسا عمل تھا جو خود بخود ہو گیا تھا۔ اسے کرنے کے لیے کوئی پلاننگ نہیں کی گئی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک جو کچھ ہوتا رہا تھا وہ بھی وقت کی داستان تھی۔ شاہ زیب کی کہانی سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

نجانے کب تک اپنی سوچوں میں ڈوبا رہا پھر دور سے اللہ رکھا آتا ہوا نظر آیا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مزے کی بات ہے۔ یہ شخص معلوم ہے اس لیے اس کے جال میں پھنس گیا۔ ورنہ کون کس پر اعتبار کرتا ہے۔ اللہ رکھا خاصے انتظامات کے ساتھ آیا تھا۔ شاہ زیب نے دور ہی سے اسے تفصیل سے دیکھ لیا۔ اس کے ہاتھوں میں پوٹلی اور ایک ٹین کا ڈبہ لٹک رہا تھا۔ شاہ زیب درخت سے نیچے اتر آیا۔ اللہ رکھا کو اندازہ نہیں ہوا کہ اس سے پہلے وہ درخت پر تھا۔ شاہ زیب کے سامنے پہنچ کر اس نے مسکرا کر گردن ہلائی اور پوٹلی کھول لی۔ اندر سے چار پانچ موٹی موٹی روٹیاں نکلیں جن کے ساتھ چنے کی نرم کونپلوں کا پکایا ہوا ساگ اور پیاز کی دو گنٹھیاں تھیں۔ اس نے مسکرا کر یہ ساری چیزیں اس کے سامنے رکھ دیں اور کہنے لگا۔

''چلو سر جی! شروع ہو جاؤ۔'' شاہ زیب نے گہری سانس لی اور اس کے بعد دونوں ساگ اور روٹی کھانے لگے۔ روٹی باسی تھی لیکن بھوک ان تمام چیزوں کو ذہن سے نکال دیتی ہے۔ دونوں نے اطمینان سے کھانا کھایا اور پھر ڈبے سے منہ لگا کر پانی پیا۔ اس کے بعد اللہ رکھا نے وہ ساری چیزیں سمیٹ لیں اور کہنے لگا۔

''اس کے بعد اللہ پھر کھانے کو دے گا۔ اب یہ بتائیے جی! کہ میں کیا کروں؟''

شاہ زیب ہنسنے لگا۔ ایک معصوم اور سادہ دیہاتی آدمی جو تھوڑی دیر پہلے ایک چور کی

حیثیت سے اس کے سامنے آیا تھا اب اپنی معصومیت کا پیکر بنا سامنے موجود تھا۔

''حوصلے سے کام لے۔ ہم لوگ فخر خان کے گھر جائیں گے اور تیری بیوی کو تلاش کر کے وہاں سے لے آئیں گے۔''

''اتنا آسان کام نہیں ہوگا جی۔ وہاں جو پہرے دار ہوتے ہیں ان کے پاس بھری ہوئی بندوقیں ہوتی ہیں۔''

''اللہ مالک ہے۔ دیکھیں گے اب تھوڑی دیر آرام کر لے۔''

''ہاں جی ٹھیک ہے۔ تھک گئے ہیں بری طرح سے۔'' اللہ رکھا نے کہا اور اس کے بعد دونوں وہیں زمین پر لیٹ گئے۔ اتنی بری زندگی نہیں گزری تھی شاہ زیب کی لیکن اب جن حالات میں وہ گزارہ کر رہا تھا۔ ان کے تحت یہ کھردری زمین اس کے لیے نرم بستر کی حیثیت رکھتی تھی اور کوئی فرق نہیں تھا۔

دن ڈھلنے لگا۔ سورج رفتہ رفتہ مغرب میں اترنے لگا۔ دھوپ کی رنگت بدلنے لگی۔ سائے طویل ہونے لگے۔ درختوں کے نیچے اندھیرا پھیلنے لگا۔ جھاڑیوں میں چڑیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ یہ شام کی آمد کا نشان تھا۔ شاہ زیب سو گیا تھا۔ اس شور و پکار سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے چند لمحات تک ماحول کو دیکھا اور اس کے بعد اللہ رکھا کی طرف لیکن اللہ رکھا۔۔۔ اللہ رکھا یہاں موجود نہیں تھا۔ شاہ زیب جلدی سے اٹھ گیا۔ ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں اور اسے تلاش کرنے لگا لیکن اللہ رکھا کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔

ایک لمحے کے لیے شاہ زیب کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ بات بڑی عجیب سی ہے۔ اللہ رکھا کو اگر بھاگنا ہوتا تو اس وقت بھاگنا زیادہ مناسب تھا جب وہ بستی میں روٹی لینے گیا تھا لیکن وہ روٹی لایا اسے کھلائی اور اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا اور پھر اس طرح غائب ہو گیا۔

کافی دیر تک وہ اس کا انتظار کرتا رہا اور اس کے بعد اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اللہ رکھا کچھ سوچنے کے بعد اس سے علیحدہ ہی ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے سادہ ذہن میں کوئی ایسی بات آئی ہو۔ جس نے اسے خوفزدہ کر دیا ہو۔ دل میں اس نے سوچا کہ ٹھیک ہے اللہ رکھا! میں تو واقعی فخر خان سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہوں۔ طریقہ کار چاہے کچھ بھی ہوتا لیکن ہو سکتا ہے میں تیری مشکل حل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔

بہر حال وقت گزرتا رہا پھر شاہ زیب نے فیصلہ کیا کہ یہاں سے آگے بڑھا جائے۔ ابھی اپنے اگلے اقدام کے بارے میں وہ بہت ہی مناسب فیصلہ نہیں کر پایا تھا لیکن بہر حال اللہ رکھا کے اس طرح چلے جانے کا اسے دکھ تھا۔ اب اگر اللہ رکھا نہ ہوا تو اس کی گھر والی کے بارے میں سوچنے سے کیا فائدہ لیکن ابھی اس نے اتنا ہی سوچا تھا کہ اسے قدموں کی چاپ سنائی دی اور تھوڑی دیر کے بعد اللہ رکھا سامنے آتا ہوا نظر آیا۔ شاہ زیب نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کہاں چلا گیا تھا تو؟''

''وہ جی۔ آپ تو سو رہے تھے۔ بہت دور کافی دور گولیاں چلنے کی آواز آئی تھی۔ آپ نے مجھے بتایا تھا نا صاحب جی! کہ آپ جیل سے بھاگے ہوئے ہو۔ میں نے سوچا کہ ذرا جا کر دیکھوں تو سہی کیا قصہ ہے۔ پر بعد میں پتہ چلا کہ کچھ بندے شکار کھیل رہے ہیں۔ ادھر سے ہی آ رہا ہوں۔''

شاہ زیب کو ایک خوشی کا سا احساس ہوا۔

بہر حال انسان' انسان کی قربت کا باعث ہوتا ہے۔ ایک بار پھر شام کے دھندلکے پھیلنے لگے اور اندھیرا آہستہ آہستہ زمین پر اترتا رہا۔ سناٹا گہرا ہو گیا تھا۔ قرب و جوار میں جھینگروں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ پھر جب خاصی رات گزر گئی اور ہر طرف ہو کا عالم

اری ہو گیا تو شاہ زیب نے اللہ رکھا سے اٹھنے کے لیے کہا اور اس کے بعد میں وہ دونوں رختوں کے پیچھے سے نکل کر کھلے میدان میں آ گئے۔ آہستہ آہستہ آسمان پر تارے نکلتے ا رہے تھے۔ نرم نرم ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ وہ احتیاط سے آگے بڑھنے لگے۔ نوں کچھ دور آگے آئے تو میدان میں جگہ جگہ پودوں کے جھنڈ نظر آنے لگے۔ یہ پودے کمر کمر تک اونچے تھے۔ وہ کھلے میدان سے ہٹ کر پودوں کے درمیان سے راستہ باتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ احتیاط پھر بھی اچھی چیز تھی۔ خاصا فاصلہ طے ہو گیا۔ پھر آگے پتھریلا میدان نظر آنے لگا۔ میدان کے سرے پر ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں پانی کی وسیع جھیل جھلملا رہی تھی۔ جھیل کو دیکھ کر شاہ زیب نے پر خیال انداز میں کہا۔

''یار! یہ جھیل تو اس وقت بڑی کار آمد ہے۔ میں نہا لوں اگر تجھے اعتراض نہ ہو؟''

اللہ رکھا ہنس پڑا پھر بولا۔ ''یہ جھیل نہیں ہے جی!''

''کیا؟'' شاہ زیب حیرت سے بولا۔

''ہاں جی! اصل میں جب بارش ہوتی ہے تو باڑے کی مٹی بھیگ کر اتنی نرم پڑ جاتی ہے کہ دلدل بن جاتی ہے اور یہ دلدل جی بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ پیر رکھتے ہی بندہ ر دھنس جاتا ہے لیکن دلدل کا اوپری حصہ تاروں کی روشنی میں اس طرح چمکتا ہے جیسے جھیل ہو پر یہ جھیل نہیں ہے۔ بہت سے بندے غلط فہمی کا شکار ہو کر اس میں اتر جاتے ا بس پھر بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔'' شاہ زیب کے پورے بدن میں گرم گرم لہریں ڑ گئیں تھیں۔

بہر حال وہ اس کے آس پاس سے گزرے۔ شاہ زیب نے قریب سے دلدل کی ل جھیل کو دیکھا۔ اس کی مٹی سخت چکنی اور چمکدار تھی۔ دور دور تک سبزے کا نام و نشان یں تھا۔ یہاں تک کہ جنگلی جڑی بوٹیاں بھی نہیں تھیں۔ صرف اجلا اجلا سفید چٹیل میدان

تھا۔ آگے پھر انہی پودوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو قدرتی تھا۔ کافی فاصلہ طے کیا جا چکا تھا۔ تب انہیں دور سے روشنی ٹمٹماتی نظر آئی اور اس کے بعد بڑے بڑے درختوں کے سائے نظر آنے لگے۔ یہ صحرائی درخت تھے۔ جون کا تپتا ہوا مہینہ ختم ہوتے ہی جب بادل گھر کر آتے ہیں اور رم جھم مینہ برستا ہے تو ان درختوں میں پھل لگتے ہیں اور بہت ہی خوبصورت نظر آتے ہیں۔ بہرحال وہ ان کے درمیان سے گزرتے چلے گئے۔ روشنی قریب آتی جا رہی تھی۔ شاہ زیب نے کہا۔

''اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو یہ فخر خان کی زمینوں کا مشرقی حصہ ہے۔''

''ہاں جی۔ بالکل وہ جگہ ہے۔''

''کیا کہتا ہے پھر اللہ رکھا! اپنی گھر والی کو حاصل کرلے گا تو؟''

''بات اصل میں یہ ہے جی کہ وہ جو کہتے ہیں نا کہ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔ قسم کھا کر کہتے ہیں سوچا تو بہت سی بار لیکن ہمت نہیں ہوئی۔ کوئی ایسا ہی نہیں ملا جو ہمارے لیے اپنی زندگی خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہو جیسے آپ۔ سرجی! ایک بات کہیں آپ سے اللہ جانتا ہے ہم برے آدمی نہیں ہیں لیکن آپ نے جس طرح ہمیں اتنی اپنائیت سے یہ پیشکش کی ہے تو ہمیں بھی حوصلہ ہو گیا ہے۔''

''ہوں۔ چلو کوئی بات نہیں ہے۔ دیکھتے ہیں۔'' وہ لوگ آگے بڑھ گئے اور پھر شاہ زیب نے کہا۔

''اس علاقے کے بارے میں تو جانتا ہے؟''

''ہاں جی۔ فخر خان ہی کا بھٹہ ہے اور بھی کئی بھٹے ہیں یہاں۔''

''بوئے آسل کس طرف ہے؟''

''وہ جی بوئے آسل ادھر نہیں ہے۔ حویلی کے اس پار بوئے آسل کا علاقہ ہے۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ ویسے اس جگہ کو دیکھا ہے تم نے؟''

''ہاں جی۔ کیوں نہیں۔ آپ ذرا آگے دیکھو آگے ایک عمارت نظر آئے گی۔ اس عمارت میں بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کے چھوٹے چھوٹے گھر بنے ہوئے ہیں۔ عمارت کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں بنا دی گئیں ہیں سر جی تاکہ مزدور رات کی تاریکی میں نکل کر بھاگ نہ جائیں۔ سامنے کے حصے میں پہرے دار اور نوکر چاکر رہتے ہیں۔''

شاہ زیب اس اونچی مینار نما چمنی کو دیکھ رہا تھا۔ جو بھٹے کی چمنی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ بالکل ہی الگ حصہ ہے۔ اس کے مخالف حصے میں وہ زمین تھی جس نے شاہ زیب کو خون سے نہلا دیا تھا اور اس کی قسم آج بھی برقرار تھی کہ اس زمین پر آگ نہیں جلنے دے گا جس زمین پر اس نے ماں سے گل بوٹے اگانے کا وعدہ کیا تھا۔

بہرحال وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی اور کہیں کہیں کھانسنے کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ ابھی کوئی ایسی خاص بات نہیں سوچی گئی تھی۔ بس شاہ زیب اللہ رکھا کے ساتھ فخر خان کے اس علاقے تک چلا آیا تھا۔ اس کے فرار کی خبر فخر خان کو بھی مل گئی ہوگی لیکن ابھی شاہ زیب ان میں سے کسی کی کوئی مدد نہیں لینا چاہتا تھا۔ حالانکہ ان میں سب سے زیادہ قابل اعتماد حیدر شاہ تھا۔ جس کے پاس اگر شاہ زیب چلا جاتا اور پوری تفصیل اسے بتا دیتا تو حیدر شاہ اسے ضرور پناہ دیتا۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے وہ مکرم شاہ کو دیکھنا چاہتا تھا جس نے جہانگیرہ کو اس کی مدد کے لیے بھیج تو دیا تھا لیکن جہانگیرہ بھی) اس طرح غائب ہو گیا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

بہرحال ابھی فخر خان سے دور رہنا ہی زیادہ مناسب تھا۔ اللہ رکھا نے اس بات کا شبہ ظاہر کیا تھا کہ ہوسکتا ہے اس کی بیوی سے ابھی بھٹے پر ہی کام لیا جا رہا ہو۔ اس نے

کہا۔

''بس صاحب جی! اب آپ کو کیا بتایا جائے۔ آپ یہ سمجھ لو جی وہاں نہ مرد کی کوئی عزت ہے نہ عورت کی۔ یہ لوگ جانوروں کی طرح بھٹے پر کام کرتے ہیں اور کوئی کسی کا پرسان حال نہیں ہے۔ عورتیں بھی کام کرتی ہیں۔ مرد بھی کام کرتے ہیں۔ ان میں بہت کم عورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے مردان کے ساتھ ہوتے ہیں بس کوئی بھی پھنس جائے چودھری کے چکر میں سمجھ لو زندگی قربان ہوگئی اس کی۔''

''تیرا کیا خیال ہے اللہ رکھا! کیا تیری بیوی یہاں ہوسکتی ہے؟''

''پچھلی بار میں نے اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں تھیں تو یہی پتہ چلا تھا کہ وہ بھٹے پر کام کر رہی ہے۔ ویسے یہاں سے فرار کی کوشش نہیں کی جاتی جی۔ جیسا کہ میں پہلے آپ کو بتا چکا ہوں کہ ایسی کوشش میں زندگی اور موت کا کوئی فاصلہ نہیں رہتا۔''

وہ لوگ آگے بڑھ گئے۔ رات کے اس ویرانے میں خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ بس صرف وہ پہرے دار پہرہ دیتے ہوئے نظر آرہے تھے جن کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔

قید خانے میں بھٹے کے اس علاقے میں جہاں مزدور رہا کرتے تھے۔ جانے کا ایک ہی راستہ تھا اور اس پر تالہ پڑا رہتا تھا۔ دروازے کے عین سامنے چارپائی بچھی تھی اور پہرے دار پہرہ دینے کے بعد چارپائی پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ لالٹین چارپائی کے پاس رکھی ہوئی تھی اور بندوق بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ کچھ دیر کے بعد اللہ رکھا نے کہا۔

''کیا کہتے ہیں سر جی! بات کروں اس سے؟ پتہ چلاؤں کہ میری گھر والی کہاں ہے؟''

''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی؟''

''نہیں صاحب جی! وہ مجھے جانتا ہے اور ویسے بھی میں بھاگا ہوا بندہ نہیں ہوں۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ فخر خان نے میری گھر والی کے بدلے پیسہ مانگا ہے اور مجھے اجازت دی ہے کہ اگر میں پیسہ لے کر آجاؤں تو بات بن جائے۔''

''ٹھیک ہے تو دیکھ لے۔'' شاہ زیب نے کہا۔

بہرحال تھوڑی دیر تک اللہ رکھا کچھ سوچتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا پہرے دار کے پاس جا پہنچا۔ شاہ زیب نے اپنے طور پر ایک منصوبہ ذہن میں بنا لیا تھا۔ اللہ رکھا کو محسوس کر کے پہرے دار نے جلدی سے لالٹین اٹھالی اور اللہ رکھا کو پہچاننے کی کوشش کی تو اللہ رکھا نے کہا۔

''میں ہوں سر جی! اللہ رکھا۔''

''اوہو۔ آگیا ہے تو بڑی ہمت ہے بھئی تیری۔''

'کیا کرتا سر جی! گھر والی جو ادھر پھنسی ہوئی ہے میری۔''

''تو کیا تو نے پیسے نکال لیے۔''

''نہیں سر جی! بس ایسے ہی اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے یہاں آگیا تھا۔''

''ہوں، بڑا مشکل۔''

''وہ ٹھیک تو ہے نا؟''

''ہاں ٹھیک تو ہے اور ادھر ہی ہے۔''

''مگر۔۔۔؟''

''مگر شگر کچھ نہیں۔ کوئی رعایت مت مانگنا مجھ سے تو جانتا ہے میں خود بھی مجبور آدمی ہوں۔'' شاہ زیب نے درخت کی آڑ میں چھپے چھپے پہرے دار کا جائزہ لیا۔ چوڑے چکلے جسم کا مضبوط آدمی تھا۔ وہ اللہ رکھا سے بڑے دوستانہ انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ اللہ رکھا نے چونکہ اسے اپنی باتوں میں لگا لیا تھا اس لیے شاہ زیب کو اس کے قریب

آنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ویسے قرب وجوار کا جائزہ لے رہا تھا۔ قرب وجوار میں جوٹوٹی پھوٹی سی آبادی نظر آ رہی تھی وہ خاصی بوسیدہ تھی۔ عام طور سے مکانات میں سفیدی لگی ہوئی تھی۔

بہرحال شاہ زیب ایک شکستہ دیوار کی آڑ میں پہنچ گیا اور سانس روکے ان کی باتیں سنتا رہا۔ پھر فوراً ہی اس نے آگے بڑھ کر پہرے دار کے چہرے پر نظر ڈالی۔ پہرے دار نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا شاہ زیب پہرے دار کے پاس پہنچا اور ہاتھ بڑھا کر جھٹ اس کی گردن دبوچ لی۔ پہرے دار کے ہاتھ سے بندوق نیچے گر گئی تھی۔ اللہ رکھا خوفزدہ ہو کر دیوار سے چمٹ گیا تھا۔ شاہ زیب نے چوکیدار کو کمر پر لاد کر زور سے زمین پر پٹخ دیا۔ چوکیدار سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ کافی مضبوط آدمی تھا۔ اس نے اٹھ کر بندوق پر ہاتھ مارنے کی کوشش کی اور اسے اٹھانے کے لیے لپکا لیکن شاہ زیب نے اسے اتنی مہلت نہیں دی۔ وہ پیچھے ہو کر اچھلا اور سر جھکا کر پہرے دار کے منہ پر اتنی زور سے ٹکر ماری تھی۔ پہرے دار سنبھل نہ سکا اور چارپائی پر چاروں شانے چت گرا۔ پھر اس کے بعد شاہ زیب نے اسے کروٹ بھی نہ لینے دی اور چارپائی اٹھا کر پلٹ دی۔ پہرے دار لڑھک کر نیچے آ گیا۔ چارپائی اس کے اوپر گری۔ اس نے چارپائی سے نکلنے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے کہ وہ چارپائی کے نیچے سے باہر آتا۔ شاہ زیب نے جھپٹ کر بندوق اٹھالی اور اس کی نال پہرے دار کی طرف کر دی۔

''اٹھنے کی کوشش کی تو گولی چلا دوں گا۔'' پہرے دار کا جسم ایک دم ساکت ہو گیا وہ جس طرح چارپائی کے نیچے فرش پر پڑا تھا ویسے ہی پڑا رہا۔ اس کا چہرہ اور دھڑ کا اوپری حصہ چارپائی سے باہر نکلا ہوا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں ایک عجیب وغریب منظر نظر آ رہا تھا۔ پھر شاہ زیب نے اللہ رکھا کو اشارہ کیا اور کہا۔

''چل اس کی پگڑی اتار کر اس کے دونوں ہاتھ باندھ دے۔'' اللہ رکھا نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا تھا۔ اس وقت پہرے دار نے پہلی بار زبان کھولی۔

''اللہ رکھا! تو کیا سمجھتا ہے اس طرح تو بچ جائے گا۔ تیرے بارے میں پتہ تو چل جائے گا۔ چاہے تو مجھے مار کیوں نہ دے۔''

''یہ بتا میری گھر والی کہاں ہے؟'' اللہ رکھا نے کہا۔

''وہ اندر ہے باڑے میں۔''

''ٹھیک ہے۔ اب کیا کروں سرجی!''

''جا' باڑے میں جا کر اپنی گھر والی کو تلاش کر کے لے آ۔'' شاہ زیب نے کہا اور خود چارپائی کی ادوائین کھولنے لگا۔ اس نے اس ادوائین سے پوری طرح چوکیدار کو کس کے باندھ دیا اور اسی وقت اللہ رکھا اندر سے واپس آیا۔

''چابی تو اس کے پاس ہے سرجی!''

''چل چابی کدھر ہے نکال۔'' شاہ زیب نے رائفل کی نال چوکیدار کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا تو اس نے جلدی سے چابی ان کے حوالے کر دی۔

''کیا کروں سرجی! دوسروں کو بھی رہا کر دوں؟''

''مرضی ہے۔ دروازہ کھول دو جس کو بھاگنا ہوگا بھاگ جائے گا۔''

''اوئے --- تو کیوں اپنی زندگی خراب کر رہا ہے۔ اگر تو سمجھتا ہے کہ یہ سب بھاگ جائیں گے اور تیرا پتہ نہیں چلے گا تو یہ تیری غلط فہمی ہے۔ فخر خان تیرے پورے خاندان کو قتل کرا دے گا۔''

''اس کی فکر مت کرو۔ بلکہ میں تو تجھ سے بھی کہتا ہوں کہ فخر خان کے ہاتھ ہی مارا جائے گا تو' تو بھی یہاں سے بھاگ جا اور کوئی دوسرا دھندا کر لے۔ تجھے ان بے چارے

قیدیوں پر ظلم کرتے رحم نہیں آتا۔ کیا سمجھا۔“

”کہہ تو ٹھیک رہا ہے یار! چل ٹھیک ہے جو تیرا دل چاہے کر میں بھی ادھر سے نکل جاؤں گا۔“

بہرحال اللہ رکھا نے آگے بڑھ کر وہ دروازہ کھولا۔ ایک طرف عورتیں تھیں۔ دوسری طرف مرد تھے اور تھوڑی دیر بعد وہاں پر موجود قیدی جاگ گئے اور انہوں نے ساری صورتحال کا جائزہ لیا۔ اللہ رکھا کے ساتھ شاہ زیب بھی تھا اور مزے کی بات یہ کہ پہرے دار کو بھی کھول کر وہ لوگ ساتھ لے آئے تھے۔ یہ خطرہ تو مول لینا ہی تھا۔ قیدیوں کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے۔ اللہ رکھا نے کہا۔

”بھائیو! آج نجانے کتنے عرصے کے بعد اللہ نے ہماری سنی ہے۔ قید خانے کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ فخر خان کا پہرے دار ہمارے ساتھ ہے۔ تم سب لوگ اس وقت آزاد ہو۔ جس میں ہمت ہے وہ بھاگ جائے اور جس میں ہمت نہیں ہے وہ یہیں پڑا رہے۔ جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔“

قیدیوں کو شاید اس بات کی امید نہیں تھی کہ زندگی میں کوئی ایسا دن بھی آ سکتا ہے جب انہیں باہر نکلنے کا موقع مل جائے۔

بہرحال وہ اٹھ کھڑے ہوئے جس جگہ یہ مزدور یا قیدی انہیں قیدی بھی کہا جا سکتا ہے اور مزدور بھی۔ موجود تھے وہ ایک بہت وسیع و عریض عمارت تھی۔ بڑا سا صحن ان میں دو طرف تنگ و تاریک کوٹھریاں۔ کسی کوٹھری میں کھڑکی یا روشندان نہیں تھا۔ البتہ اس کے آگے طویل برآمدہ نظر آ رہا تھا۔ ہر طرف بدبو سڑاند پھیلی ہوئی تھی اور صفائی کا یہاں کوئی بندوبست نہیں تھا۔ اس وقت قید خانے میں تین پینتیس افراد قیدی تھے۔ جن میں تیرہ عورتیں تھیں باقی مرد۔ ان کے جسموں کے نیچے کھردری چٹائیاں تھیں۔ نہ تکیے تھے نہ

اوڑھنے کے لیے چادریں۔ چٹائیوں میں بھی کھٹمل بھرے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے چہروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زندگی سے بے زار ہیں۔ بہرحال وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان میں سے ایک قیدی نے جو کسی قدر عمر رسیدہ تھا کہا۔

”ایک بات بتا اللہ رکھا! کہیں یہ کوئی مذاق تو نہیں ہے۔ باہر کی دنیا میں ہمارے لیے جگہ ہے؟“

”کوئی جگہ نہیں ہے تمہارے لیے باہر کی دنیا میں۔ یہ جگہ تو تمہیں خود بنانی پڑے گی۔ جب تک بزدلی کا مظاہرہ کرتے رہو گے فخر خان جیسے لوگ تم پر قبضہ جماتے رہیں گے۔ جس دن تم نے اپنے آپ کو پہچان لیا اور فخر خان جیسے لوگوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ دن تمہارا اپنا ہوگا۔ اٹھو باہر نکلو۔ یہ قید ختم کرنے میں اللہ رکھا نے اور میں نے تمہاری مدد کی ہے۔ اس سے آگے تم اپنی مدد خود کرو۔ اب تم سب آزاد ہو۔ جس کا جہاں دل چاہے نکل جائے۔ ابھی تو آدھی رات بھی نہیں ہوئی بھاگنے کے لیے ابھی تمہارے پاس بہت وقت ہے۔ یہاں سے بھاگنے سے پہلے تم سب کو ایک کام کرنا ہوگا۔“ شاہ زیب کے اندر اس وقت ایک عجیب سی کیفیت ابھر آئی تھی۔

”کیا کام جی؟“

”تمہارے پاس اوزار وغیرہ ضرور ہوں گے۔ یہ سارے بھٹے توڑ پھوڑ کر برابر کر دو اور اس کے بعد یہاں سے بھاگ جاؤ۔ یہ تمہاری آزادی کا معاوضہ ہے۔“

قیدی ایک دم جوش میں آ گئے۔ سامنے ایک ٹین کا لمبا سا سائبان تھا۔ اس کے نیچے بیلچے، پھاوڑے، کدالیں وغیرہ رکھی ہوئی تھیں۔ سارے قیدیوں نے ادھر کا رخ کیا اور پر جوش انداز میں یہ سارے اوزار سنبھالے ہوئے باہر نکل آئے اور اس کے بعد توڑ پھوڑ کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ ملبے سے گرد و غبار اڑ کر پھیل رہا تھا اور رات کا اندھیرا مزید

گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ کدالیں چلنے اور ملبہ گرنے کی آوازیں سناٹے میں ابھر رہی تھیں۔

قیدیوں میں اللہ رکھا کی بیوی بھی تھی جو اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ابھی تک اللہ رکھا نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

بہر حال وہ لوگ اینٹوں کے اس بھٹے کو گراتے رہے۔ روشنی میں سب کے چہرے، بال گرد و غبار میں اٹے ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے پورے بھٹے کو تہس نہس کر دیا۔ ان کے چہروں پر مسرت تھی۔ پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے مختلف سمتوں میں چل پڑے۔ کچھ دیر تک دھندلی دھندلی پرچھائیوں کی مانند نظر آتے رہے اور آخر کار رات کے اندھیرے میں گم ہو گئے۔ پہرے دار اللہ رکھا اور اس کی بیوی کے علاوہ شاہ زیب وہاں موجود تھا۔ اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

''کیا خیال ہے اللہ رکھا! یہاں آگ لگا دی جائے؟''

''ہاں جی! برباد کر دیا جائے اسے تاکہ یہ دوبارہ آباد نہ ہو سکے۔'' سائبان کے نیچے مٹی کے تیل کے دو کنستر بھی رکھے ہوئے تھے۔ پھٹے پرانے کپڑے اور بہت سا کاٹھ کباڑ بھی تھا۔ ایک طرف دیوار کے قریب کالی بوریوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ مٹی کے تیل کے پیپے سائبان کے نیچے سے نکال کر رکھے گئے اور اس کے بعد خود پہرے دار نے بھی اس جگہ کو آگ لگانے میں مدد کی تھی۔ تیل کے بھیگے ہوئے کپڑے اور بوریوں میں لالٹین کے ذریعے آگ لگائی گئی اور انہیں جلدی جلدی کوٹھریوں کی چھتوں پر پھینک دیا گیا اور پھر وہ لوگ وہاں سے چل پڑے۔ پہرے دار بھی کافی آگے جا کر ایک طرف نکل گیا تھا۔ شاہ زیب نے اللہ رکھا سے کہا۔

''ٹھیک ہے اللہ رکھا! تیری بیوی تجھے مل گئی۔ اب اپنی حفاظت تیرا فرض ہے۔ ایک بات تو اچھی طرح جانتا ہے۔ فخر خان کو اگر صحیح صورتحال کا پتہ چل گیا تو وہ تجھے

ے گھر میں تلاش کرے گا حالانکہ اس کے امکانات نہیں ہیں لیکن ہو سکتا ہے بھاگنے
ں میں سے کوئی اس کے ہاتھ آ جائے یا ان میں سے اس کا کوئی اپنا آدمی بھی ہو۔ وہ
ری صورتحال تو بتا دے گا نا۔ سمجھ رہا ہے میری بات۔'' اللہ رکھا پرخیال انداز میں گردن
نے لگا۔ پھر بولا۔

''مگر سر جی! آپ کدھر جاؤ گے؟''

''میری بات چھوڑو۔ میری منزل کچھ اور ہے۔'' شاہ زیب کی نگاہیں اللہ رکھا کی
ی کی جانب اٹھ گئیں۔ چوبیس پچیس سال کی عورت رنگ پیلا پڑا ہوا تھا۔ آنکھیں بڑی
ی اور روشن تھیں۔ بے چاری نجانے کس مشکل میں گرفتار رہی ہو گی۔ کون جانے۔ اللہ
ھا نے کہا۔

''سر جی! ایسا کرو تھوڑا ٹائم تو میرے ساتھ گزارو۔''

''دیکھو۔۔۔ میں تمہیں ہدایت کرتا ہوں جہاں رہتے ہو وہاں نہ رہنا۔''

''سر جی! میں نے تو ایک بات سوچی ہے۔ سیدھا کراچی چلا جاتا ہوں۔ کراچی
ں اپنی گھر والی کے ساتھ چھپ چھپا جاؤں گا۔ سنا ہے بڑا غریب پرور شہر ہے۔ بندے کو
پنے درمیان میں جگہ دے دیتا ہے۔''

''ہاں شاید۔۔۔'' شاہ زیب نے مدھم لہجے میں کہا اور پھر اس نے اللہ رکھا سے
جازت مانگ لی۔ اللہ رکھا نے کہا۔

''صاحب جی! آپ نے بڑا احسان کیا ہے ہم پر۔ اس احسان کو ہم کبھی بھولیں
گے نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ بس اب تو جا۔'' شاہ زیب نے کہا اور پھر وہ خود ہی مڑ کر
واپس چل پڑا۔

جو کرنا تھا وہ کر دیا تھا۔ کم از کم اور کچھ نہیں تو فخر خان کا ایک بھٹہ برباد ہو گیا تھا!
اللہ رکھا کی بیوی آزاد ہو گئی تھی۔ یہ ایک برے آدمی کا بڑا نقصان تھا۔ اب اس کے ب
زندگی جس انداز میں بھی گزرے۔ شاہ زیب نے دل میں سوچا اور گہری گہری سانسیں
لیتا ہوا ایک جانب چل پڑا۔ کوئی منزل نگاہوں کے سامنے نہیں تھی۔ کچھ ایسے کردار ضر
تھے جو یاد آتے تھے لیکن کچھ ایسے تھے جن تک جانا خطرناک تھا اور کچھ ایسے جن تک
جانے کے راستے ہی نامعلوم تھے۔

بہر حال رات کی تاریکی میں وہ حالات پر غور کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر نجا
سر میں ایک عجیب سا سودا سمایا۔ فخر خان کا ایک بھٹہ تباہ ہوا ہے۔ ذرا اس کی کیفیت
جائزہ تو لوں۔ فخر خان کے ہاں سے ایک رات کو وہ اس طرح فرار ہوا تھا کہ اس نے
مخصوص راستے دیکھ لئے تھے۔ نائلہ نے ان راستوں کی تلاش میں اس کی مدد کی تھی۔

بہر حال یہ تمام باتیں اس کے ذہن میں آ رہی تھیں اور وہ ان راستوں کی تاک
میں آگے بڑھ گیا تھا۔ اسے وہاں تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوئی تھی اور وہ انہی راستو
سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں نائلہ کی قیام گاہ تھی۔
پھر اس نے اس قیام گاہ میں جھانک کر دیکھا۔ نائلہ اپنی مسہری پر گہری نیند سو رہی تھی
ایک نگاہ میں ہی شاہ زیب نے اسے پہچان لیا تھا۔

کچھ لمحے تک سوچا اس وقت کسی کی پرسکون نیند میں خلل اندازی مناسب نہیں تھ
لیکن ظاہر ہے یہاں تک آیا تھا تو حالات معلوم کئے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔ ممکن ہے فخر خا
کو بھٹے کی تباہی کی اطلاع مل گئی ہو۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے قدموں کی چا
سنائی دی۔ کہیں دور سے ڈھول اور ہارمونیم کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ اس کا مطلب
ہے کہ فخر خان کے اس مخصوص حصے میں ناچ گانے کی محفل جمی ہوئی ہے۔ قدموں

غالباً کسی پہرے دار کی تھی۔ اس کی نگاہوں سے بچنے کے لیے اندر داخل ہونا
ی تھا لیکن اس کا یہ خیال بالکل غلط نکلا کہ نائلہ گہری نیند سو رہی ہے۔ جیسے ہی وہ اندر
ہوا نائلہ کی سہمی ہوئی آواز نکلی۔

''کون--- کون ہے---؟'' شاہ زیب کے لیے ضروری تھا کہ وہ نائلہ سے اپنا
ب کرا دے کیونکہ چوکیدار بھی زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اندر مدھم روشنی پھیلی ہوئی
۔ اس نے جلدی سے اپنا رخ نائلہ کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''میں شاہ زیب ہوں-- نائلہ! شاہ زیب--- براہ کرم مجھے پہچانئے اور شور نہ
یے۔'' نائلہ نے ایک لمحے کے اندر اندر شاہ زیب کو پہچان لیا تھا۔ وہ جلدی سے مسہری
ر کر بیٹھ گئی۔

''تم---؟''

''میں نے کہا نا میں معافی چاہتا ہوں کہ اس طرح یہاں آپ کے کمرے میں
ا ہوا لیکن--- لیکن---''

''نہیں، نہیں...... میں تو تمہارے یہاں آنے پر حیران ہوں۔ آ جاؤ...... آ جاؤ......
تو روشنی بند کر دوں؟''

''چوکیدار ابھی ادھر سے گزر رہا ہے۔''

''تم اس طرف آ جاؤ--- فکر نہ کرو میں ہوں نا۔'' نائلہ کے لہجے میں بڑی اپنائیت
ا شاہ زیب کو اس سے حوصلہ ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر نائلہ کے قریب پہنچ
ا نائلہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ دروازے پر آئی۔ دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور اس کے
واپس پلٹتی ہوئی بولی۔

''چوکیدار آگے جا چکا ہے تم بے فکر ہو جاؤ۔ تم ٹھیک تو ہو نا یہ بتاؤ۔ خدانخواستہ زخمی

وغیرہ تو نہیں ہو؟''

''نہیں۔ بہت بہت شکریہ۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''آ ؤ اس طرف آ جاؤ۔ یہاں کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ یہ بالکل اندرونی جگہ ہے۔ نائلہ نے کہا اور اپنے کمرے سے ملحق ایک ایسے حصے میں پہنچ گئی جو دیوار کی آڑ میں پوشیدہ تھا یہاں ڈائننگ ٹیبل پڑی ہوئی تھی۔ اس نے کرسی گھسیٹی اور بولی۔

''بیٹھو اور یہ بتاؤ کسی چیز کی ضرورت محسوس کر رہے ہو؟''

''بالکل نہیں۔ ہر طرح سے مطمئن ہو کر یہاں تک پہنچا ہوں۔''

''نہا لو۔ یہ غسل خانہ ہے۔ ایک بار پھر یہ کہوں گی کہ بے فکر ہو جاؤ۔ پرواہ کی کوئی بات نہیں ہے۔''

''بہت بہت شکریہ نائلہ! آپ کے اس رویے نے میری بڑی مشکل حل کر دی ہے۔''

''کسی خاص مقصد سے یہاں آئے ہو؟''

''نہیں بالکل نہیں۔ فخر خان سے ایک ملاقات کروں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔ ویسے نائلہ آپ کو میرے درمیان کے واقعات کے بارے میں معلوم ہے؟''

''اس حد تک جب تم جیل سے فرار ہوئے ہو۔ میرا مطلب ہے جیل سے عدالت کے راستے میں تم نے کچھ لوگوں کو ہلاک کر کے راہ فرار اختیار کی ہے۔''

''اوہ۔ میرے خدا یہاں تک معلومات حاصل ہیں تمہیں۔''

''ہاں خان جی! تم سے ملنے جیل بھی گئے تھے۔''

''ہاں مگر تعجب ہے نائلہ! یہ اطلاعات آپ تک کیسے پہنچیں؟''

''خود نہیں پہنچیں۔ جہاں تک مجھ سے ممکن ہو سکا ہے۔ تمہارے بارے میں

معلومات حاصل کرتی رہی ہوں۔''

''تاجو سے تو دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی؟''

''کمینہ نکلا۔ نجانے میں نے کہاں کہاں اسے تلاش کیا۔ غائب ہو چکا ہے۔ ہو سکتا ہے ملک ہی چھوڑ گیا ہو۔''

''ہوں اور خان جی کے کیا حالات ہیں؟''

''معمول کے مطابق آوازیں سن رہے ہوگے۔'' اس نے کہا۔

''مجرہ ہو رہا ہے۔''

''ہمیشہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ نت نئی گانے والیاں آتی ہیں۔ ان کا قیام وغیرہ کا بندوبست یہیں ہوتا ہے۔ وہ جو سامنے والا حصہ ہے وہ جو ادھر روشن دیکھ رہے ہو۔ وہاں ناچنے گانے والیوں کا بسیرا ہوتا ہے۔ محفل جمی ہوئی ہے عیش کرتے ہیں خان جی۔''

''اور آپ کا کیا حال ہے؟'' شاہ زیب نے سوال کیا تو نائلہ نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کے بعد ایک پھیکی سی ہنسی کے ساتھ گردن جھکا کر خاموش ہو گئی۔ شاہ زیب نے پھر کہا۔

''میں ذرا جائزہ لے لوں خان جی کا۔''

''لے لو لیکن ایک بات بتائے دیتی ہوں۔ یہ لوگ کسی کے نہیں ہوتے اگر کوئی جھگڑا نہیں ہے تم سے تو مل لو ورنہ یہ ضرور پوچھیں گے کہ اندر کیسے آئے؟''

''وہ سب کچھ میں جواب دے لوں گا۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''میرے لائق کوئی خدمات بتاؤ؟''

''نہیں نائلہ! یہاں داخل ہوا تو سوچا کہ تم سے ملاقات کر لوں۔ اگر تم مل جاؤ تو --- بڑی خوشی ہوئی ہے۔''

''تمہارے بارے میں تو یہ پوچھنا ہی بے کار ہے کہ تمہاری کیا کیفیت ہے جو کیفیت ہے وہ اخبارات سے ہی پتہ چلتی رہتی ہے۔ جس طرح اللہ نے تمہاری مدد کی ہے۔ وہ بہت بڑی بات ہے۔ اخبارات تمہارے بارے میں خاصی تفصیلات لکھتے رہتے ہیں۔ میں نے ان اخباروں کو سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ جن میں تمہارا تذکرہ ہوتا ہے۔''

نائلہ کے لہجے میں ایک عجیب سی بات تھی جسے شاہ زیب نے محسوس کیا لیکن وہ کوئی حماقت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے محسوسات اپنی جگہ بلاوجہ جس کا خیال دل میں تھا اس کا تو تصور تک دور ہو چکا تھا۔

بہر حال وہ نائلہ سے اجازت لے کر اس طرف چل پڑا۔ جہاں مجرہ ہو رہا تھا۔ آواز راہنمائی کر رہی تھی۔ وہ حصہ بھی دیکھا تھا جہاں گانے والیوں کا قیام ہوتا تھا۔ ایک ایسی جگہ تلاش کرنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوئی۔ جہاں سے چھپ کر اس مجرے کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ شاہ زیب نے پہلی نگاہ اندر ڈالی اور اس نگاہ نے اس کے دل کو شدید دھچکا پہنچایا۔ وہ غور سے اس رقص کرنے والی کو دیکھنے لگا۔ جس کا چہرہ جب سامنے آتا تو ایک شناسائی اس چہرے پر تحریر ہوتی۔ شاہ زیب نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خاموشی سے رقص کرتے ہوئے ریحانہ کو دیکھتا رہا۔ ریحانہ پر اسے مکمل اعتماد تھا۔ ملکہ بائی کا کھیل سامنے آچکا تھا۔ خود راجہ شہاب الدین نے اس کھیل کی تصدیق کر دی تھی اور ویسے بھی شاہ زیب کے دل میں ریحانہ کے لئے کوئی برائی نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔

بہر حال ریحانہ کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے دل میں جو ہیجان پیدا ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ سرد ہو گیا۔ ریحانہ سے اسے عشق نہیں تھا۔ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس دل میں تو لجیا پوری طرح قبضہ جما چکی تھی۔ کسی اور کی گنجائش کسی بھی مشکل میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ پھر وہ اپنی جگہ سے ہٹ آیا۔ اس کا ذہن نجانے کیسی کیسی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس حویلی

سے اسے کافی واقفیت تھی۔ وہ جانتا تھا کہ طوائفیں مہمان خانے میں ہی ٹھہری ہوں گی۔ یہ مہمان خانہ بھی بے حد شاندار تھا۔ یہاں بڑے بڑے چودھری آ کر ٹھہرا کرتے تھے۔ جہاں مجرا ہو رہا تھا وہاں ملکہ بائی نظر نہیں آئی تھی۔ اس نے مہمان خانے تیں جا کر ملکہ بائی کو تلاش کیا۔ دو سازندے وہاں موجود تھے۔ ملکہ بائی کا پتہ نہیں تھا۔

شاہ زیب کافی دیر تک سوچتا رہا۔ فخر خان تو عیش وعشرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ ریحانہ سے تفصیلی ملاقات کرے۔ اس کے لیے انتظار کرنا تھا۔ مجرا ہو سکتا ہے صبح تک جاری رہے۔

بہر حال وہ مہمان خانے کے آس پاس ہی چکراتا رہا اور ایک جگہ منتخب کر کے بیٹھ گیا۔ پھر صبح کے پونے چار بجے تھے جب ساز و آواز ختم ہو گئے اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے ریحانہ اور دوسری لڑکیوں کو آتے ہوئے دیکھا۔ وہ سوچنے لگا کہ ریحانہ سے کس طرح ملاقات کی جا سکتی ہے۔

بہر حال سازندے بھی تھے اور دوسری لڑکیاں بھی۔ اسے ایک ترکیب سوجھ گئی یہاں گھومتے ہوئے اس نے ایک جگہ دو کمبل پڑے ہوئے دیکھے تھے۔ یہ کمبل نما کھیس تھے۔ اس کے لیے تو بے کار ہی تھے لیکن اچانک ہی اسے خیال آیا تھا اور اس نے دوڑ کر ایک کھیس اٹھا لیا تھا۔ پھر یہ کھیس اپنے بدن کے گرد لپیٹ کر وہ برق رفتاری سے آگے بڑھا۔ ریحانہ اس وقت مہمان خانے میں پہنچ چکی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور ریحانہ کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے کھیس میں اپنا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ ریحانہ کو ایک دم یہ محسوس ہوا کہ کوئی اس کا راستہ روکنا چاہتا ہے۔ تو وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔

''کیا ہے؟'' اس نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''ریحانہ! میں شاہ زیب ہوں۔''

"کون؟" ریحانہ کی آواز میں سرسراہٹ پیدا ہوگئی۔

"شاہ زیب۔"

"تت--- تم۔" ریحانہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"مہمان خانے کے پچھلے حصے میں درخت بکھرے ہوئے ہیں۔ میں ادھر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ بہتر حالات ہوتے ہی ادھر آجانا۔"

"ابھی آرہی ہوں تھوڑی دیر میں۔" ریحانہ کی آواز کپکپا رہی تھی۔ شاہ زیب پلٹ کر واپس چل پڑا۔ دوسرے لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ ہوسکتا ہے حویلی کا کوئی ملازم ہو اور کوئی خاص بات کر رہا ہو۔

بہرحال پھر ایک درخت کے نیچے شاہ زیب بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ کوئی بیس منٹ کے بعد ریحانہ واپس آئی تھی۔ اس نے لباس تبدیل کرلیا تھا۔ غسل خانے میں منہ دھوکر آئی تھی۔ مہمان خانے کا پچھلا حصہ بالکل سنسان پڑا ہوا تھا۔ صبح کی روشنی پھوٹنے میں ابھی دیر تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی۔ شاہ زیب خود ہی نکل کر سامنے آگیا تھا تو وہ اس کے قریب پہنچ گئی۔

"معاف کرنا کچھ دیر ہوگئی لیکن میں جواز پیدا کر رہی تھی۔ لباس وغیرہ تبدیل کرلیا تھا میں نے، مگر تم یہاں---"

"ہاں ریحانہ! پتہ نہیں تمہیں آگے کی تفصیل معلوم ہوئی کہ نہیں۔ میں---"

"ایک بات سنو میری بات مان لو گے؟"

"بولو کیا بات ہے۔"

"یہاں سے باہر چلو۔"

"میرے لیے تو ہر طرف خطرات ہیں ریحانہ!"

"یہاں سے باہر چلو۔ یہ بھی تو غیر محفوظ ہے۔ یہاں بہت سے لوگ ہیں۔ ابھی وڑی دیر میں کوئی مجھے تلاش کرتا ہوا آجائے گا۔ میں انتظام کر کے چلی ہوں۔ وَ--- یہاں سے باہر چلیں۔"

"جیسے تم مناسب سمجھو۔"

"کسی خاص کام سے تو یہاں نہیں رکے ہو؟"

"بالکل نہیں۔"

"تو آؤ پلیز چلتے ہیں۔ میں بندوبست کروں۔"

"مگر کہاں؟"

"میری بات مان لوگے جو کچھ میں کہوں گی؟"

"مان لوں گا۔" شاہ زیب نے کہا۔

"تو پھر میں دو تین منٹ میں واپس آتی ہوں۔ ہوشیار رہنا بلکہ ادھر میرے ساتھ چلے آؤ۔" ریحانہ نے کہا اور گھوم کر حویلی کے سامنے والے حصے میں چل پڑی۔ اس کے عد اس نے شاہ زیب کو درخت کی آڑ میں کھڑا کیا اور خود ملازمہ کے کوارٹر کی جانب چل ڑی۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ ایک آدمی کے ساتھ واپس آئی۔ تھوڑے فاصلے پر نڈ کروزر کھڑی ہوئی تھی۔ اس آدمی نے لینڈ کروزر کا دروازہ کھولا۔ شاہ زیب کو بے حد عجب ہو رہا تھا۔ ریحانہ نے مدھم لہجے میں آواز دی۔

"آجاؤ--- تم کہاں چھپے ہوئے ہو آجاؤ۔" یہ آواز شاہ زیب کو ہی مخاطب کر کے ی گئی تھی لیکن جب شاہ زیب اپنی جگہ سے نہ ہلا تو ریحانہ بولی۔

"زیب! آتے کیوں نہیں ہو۔" شاہ زیب بدستور کھیس اوڑھے ہوئے آگے بڑھا ور لینڈ کروزر کے پاس پہنچ گیا تو ریحانہ نے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس کے لہجے میں حکم کا سا انداز تھا۔ وہ خود بھی اندر بیٹھ گئی اور پھر اس نے کہا۔

''چلو۔محبت شاہ! معاف کرنا تمہیں اس وقت تکلیف دے رہی ہوں۔''

''نہیں صاحب! ہم تو آپ کے غلام ہیں بیگم صاب۔'' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا جسے ریحانہ اس کے کوارٹر سے اٹھا کر لائی تھی۔ یہ غالباً ڈرائیور تھا۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے باہر نکل آیا۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار نے باادب انداز میں دروازہ کھول دیا تھا۔ شاہ زیب بدستور کمبل اوڑھے بیٹھا ہوا تھا۔ البتہ اسے شدید حیرت تھی کہ ریحانہ نے یہ خوب چکر چلایا ہے۔ لینڈکروزر آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ آبادی سے باہر نکل آئی تو ڈرائیور محبت شاہ نے پوچھا۔

''بیگم صاب! ابھی کدھر چلنا ہے؟''

''رکو۔ گاڑی سائیڈ پر لگاؤ۔'' ریحانہ نے حکم دیا اور محبت شاہ نے گاڑی سائیڈ پر لگا دی۔ ریحانہ سرگوشی کے انداز میں شاہ زیب سے بولی۔

''شاہ زیب! اسے بے ہوش کر کے ایک طرف پھینک دو۔ گاڑی لے کر چلنا ہے۔ محبت شاہ گاڑی کا انجن بند کر دو ہمیں یہیں تک آنا تھا۔''

''ادھر بیگم صاب! یہ علاقہ تو اچھا نہیں ہے۔''

''آؤ۔ نیچے اترو۔ میرے ساتھ تھوڑا سا دور چلنا ہے۔ چلو تم بھی آجاؤ۔'' ریحانہ نے شاہ زیب سے کہا اور شاہ زیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک عجیب قدم اٹھایا تھا ریحانہ نے جو بڑا حیرت ناک تھا لیکن بہرحال اب جو کچھ بھی تھا اسے ریحانہ کی بات ماننی تھی۔ تینوں نیچے اتر آئے۔ ڈرائیور محبت خان ویسے بھی سوتے سے اٹھا کر لایا گیا تھا۔ اس کا ذہن ابھی تک چکرایا ہوا تھا لیکن جب شاہ زیب نے اس پر کمبل ڈالا اور اس کی کنپٹیوں پر شدید دباؤ ڈالا تو اس نے بھی خوب چیخ و پکار مچائی۔ لیکن شاہ زیب جانتا تھا کہ اسے بے ہوش کرنے کے لیے اسے کیا کرنا ہے۔ آخرکار ڈرائیور نے ہاتھ پاؤں ڈال دیئے۔ ریحانہ پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ جب ڈرائیور بے ہوش ہو گیا تو ریحانہ نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔

''بے چارہ۔''

''کمبل ہٹا لوں؟''

''ہاں ہاں بالکل۔ کوئی نقصان تو نہیں پہنچے گا اسے؟''

''نہیں۔ آدھے پونے گھنٹے بے ہوش رہے گا پھر ہوش میں آجائے گا۔''

''اور ہوش میں آ کر نکل جائے گا۔ کیا خیال ہے؟''

''مگر یہ اس وقت؟''

''ہاں۔ میں یہاں چھ دن سے آئی ہوئی ہوں۔ دس بارہ دن کا پروگرام تھا۔ فخر ان نے اسے ہدایت کر دی تھی کہ میں اگر آدھی رات کو بھی اس سے کہیں جانے کی رمائش کروں تو حکم سے سرتابی نہ کی جائے۔ یہ محاورے والی بات تھی یعنی آدھی رات کا ناورہ۔ لیکن اس وقت میں نے اس محاورے کو پوری طرح استعمال کیا اور بے چارے کو وتے سے جگا لائی۔ بس اتنی سی بات ہے۔ آؤ چلیں۔''

''یہاں سے بھی چلیں۔''

''ارے بابا! تو کیا یہیں رہو گے۔ مگر یہ پچھلی سیٹ پر بیٹھو اور کمبل مسلسل استعمال کرو۔ لینڈکروزر کافی بڑی ہے کہیں اگر رش کی بات آجائے تو سیٹ کے نیچے رینگ جانا۔''

''ڈرائیونگ تم کرو گی؟''

''ہاں۔ میں بہترین ڈرائیور ہوں۔'' ریحانہ نے جواب دیا۔

''واہ کمال ہے۔'' شاہ زیب بولا۔ ریحانہ ہنس کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور پھر کہنے لگی۔

''آرام سے بیٹھے رہو اور میری ڈرائیونگ دیکھو۔'' شاہ زیب کو یہ سب بہت عجیب لگ رہا تھا لیکن بہرحال اس کا کوئی خاص مقصد تو تھا نہیں۔ ریحانہ نے واقعی رفتار تیز کر دی۔ نئی لینڈکروزر تھی۔ اس نے غالباً یہ دیکھ لیا تھا کہ لینڈکروزر کا پیٹرول ٹینک فل ہے۔

اس کے علاوہ اس میں سی این جی بھی لگی ہوئی تھی جس کا سیلنڈر بھی بھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میٹر یہی بتاتا تھا۔

چنانچہ اس نے تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک پختہ سڑک کی جانب رُخ کیا اور برق رفتاری سے سفر طے کرنے لگی۔ شاہ زیب گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ریحانہ کی یہ بے باکانہ کاوش اسے بڑی حیران کئے ہوئے تھی لیکن بہرحال یہی وجہ تھی کہ کافی دیر تک خاموشی طاری رہی اور شاہ زیب کو ہی پھر خاموشی کا یہ طلسم توڑنا پڑا۔

''ریحانہ! کہاں جا رہی ہو؟'' ریحانہ نے گردن گھما کر شاہ زیب کو دیکھا پھر بولی۔

''بس اس وقت مجھے آزاد چھوڑ دو شاہ زیب! میں تم سے پہلے بھی درخواست کر چکی ہوں کہ مجھے تھوڑا سا وقت دے دو۔ میری دلی آرزو ہے۔''

''ریحانہ! کہیں دور جا رہی ہو؟''

''ہاں۔''

''کہاں؟''

''پہلے اسلام آباد پھر مری اور اگر دل چاہا تو اس سے بھی آگے---'' ریحانہ کے جواب نے شاہ زیب کو گنگ کر دیا تھا۔ وہ حیرانی سے ریحانہ کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ جس کا رخ سامنے تھا۔ چہرے پر تاثرات تو نظر نہیں آ رہے تھے لیکن جس لہجے میں ریحانہ نے یہ الفاظ کہے تھے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ جو کچھ کہہ رہی ہے وہی کر ڈالے گی۔ شاہ زیب نے کہا۔

''ریحانہ! کیا یہ اندھا قدم نہیں ہے؟''

''محبت اندھی ہی ہوتی ہے شاہ زیب! میں تم سے کہوں۔ میں تمہیں چاہنے لگی ہوں۔ بے پناہ پیار کرنے لگی ہوں تم سے اور جیسا کہ میں نے کبھی تم سے اپنے آپ کو نہیں چھپایا۔ بہت پہلے بھی تم سے میری یہی بات ہو چکی ہے۔ میں کوئی اچھی لڑکی نہیں ہوں۔

برائیوں کے راستے پر چل کر اتنی دور نکل چکی ہوں کہ اب مجھے خود اپنے آپ کو حقیر ترین سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی لیکن کیا کروں شاہ زیب سینے میں دل بھی ہے۔ دل میں ارمان بھی ہیں۔ سانس لیتی ہوں، آئینہ دیکھتی ہوں تو اپنے آپ کو عام انسانوں جیسا پاتی ہوں۔ غور کرتی ہوں تو مجھ میں اور کسی اور ارمان بھری میں کوئی بہت نمایاں فرق نہیں ہے۔ اگر کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ رات کو میں کوٹھوں پر سجتی ہوں تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ میں کوٹھے والی ہوں۔ یہ تمام چیزیں کبھی احساس دلاتی ہیں کہ کم از کم ون وے ٹریفک تو چل سکتا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ میں کسی کو چاہوں کوئی مجھے نہ چاہے اور جب دل اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ میری یہ بے لوث چاہت میرا حق ہے تو شاہ زیب میرے دل میں تمہارا پیار امنڈ آتا ہے۔ اب دیکھو نا ہر انسان کے اندر کبھی کبھی تھوڑی سی بے غیرتی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ خود پرست بن جاتا ہے۔ تم مجھے اس طرح ہاتھ لگ گئے ہو تو کیوں نہ میں کچھ وقت تمہارے ساتھ گزار لوں چاہے تمہیں بلیک میل کر کے ہی سہی۔''

اس کی آواز لرز گئی۔ شاہ زیب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے جو الفاظ وہ کہہ رہی تھی اس کی گہرائی سمندر کی گہرائی سے بھی زیادہ تھی۔ کتنی تلخی تھی اس کے انداز میں۔ کتنی بے کسی تھی۔ شاہ زیب کی زبان بند ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک مکمل خاموشی طاری رہی۔ پھر اس نے کہا۔

''اور مجھے خوشی کے یہ لمحات لوٹ لینے دو شاہ زیب! میں تمہاری عزت تمہارے وقار کو داغدار نہیں کروں گی۔ میں تم سے تمہارا جسمانی قرب نہیں مانگوں گی۔ میرا وعدہ ہے کیونکہ یہ قرب میرے لیے بے مقصد اور بے حقیقت ہے۔ میں تو صرف تمہارا ساتھ چاہتی ہوں۔ تھوڑے سے وقت کے لیے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تم سے مکمل تنہائی میں اتنی باتیں کروں کہ میرا دل بھر جائے۔ باتوں کا ذخیرہ ختم ہو جائے۔ کچھ نہ رہے ہمارے پاس۔ تم بھی سوچو۔ میں بھی سوچوں کہ اب کیا باتیں کریں اور جب دل اتنا بھر جائے تو میں تم سے معافی مانگوں اور کہوں شاہ زیب! تم نے مجھے جو کچھ دے دیا ہے اب کچھ نہیں

چاہیے مجھے۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''بہت جذباتی ہو رہی ہو تم اسٹیرنگ سنبھالو۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دل کی باتیں کر رہی ہوں۔ یہ باتیں جو میرے دل میں پک رہی تھیں۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میری زبان تمہارے سامنے اس طرح سے کھل سکے گی۔ کوئی وقت' کوئی لمحہ مجھے ایسا مل جائے گا کہ میں دل کی یہ تمام باتیں تم سے کہہ دوں گی۔ اب موقع ملا ہے تو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہی ہوں شاہ زیب!''

''میں تم سے ایک بات کہوں ریحانہ!''

''ہاں کہونا۔'' وہ بڑے پیار سے بولی۔

''تم نے اپنے بارے میں جو کچھ کہا ہے ہوسکتا ہے تمہاری سوچیں ایسی ہی سمت رکھتی ہوں لیکن میں تمہیں یقین دلا رہا ہوں کہ میں تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی کہیں سے حقیر نہیں سمجھتا۔ بلکہ جس محبت سے تم نے مجھے اپنے پاس سہارا دیا تھا اور جس طرح میں تمہارے پاس آ کر سکون حاصل کرتا تھا۔ وہ میرے لیے بڑا قیمتی سرمایہ تھا۔ میں تم سے ملتا رہتا۔ تمہارے پاس آتا رہتا اگر راجہ شہاب الدین وہ عمل نہ کر ڈالتا۔ یقین کرو گرفتار ہونے کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی میرے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ میری گرفتاری کی وجہ کسی بھی شکل میں تم ہوسکتی ہو۔ اعتماد کی یہ منزل ریحانہ بڑی مشکل سے آتی ہے اور تمہارے سلسلے میں' میں اس منزل تک پہنچ چکا ہوں۔''

''آہ' کاش--- دل چاہتا ہے مر جاؤں ان الفاظ کے بعد۔ اس سے بڑا اعزاز مجھے اور کبھی نہیں ملے گا۔ انہی الفاظ کو سینے میں سجا کر مر جاؤں۔''

''لاؤ۔ اب ڈرائیونگ میں کرتا ہوں۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''نہیں میں ٹھیک ہوں۔ تم سے ڈرائیونگ اس لیے نہیں کراؤں گی کہ کہیں کوئی کم بخت مل نہ جائے۔ البتہ یہ اجازت مجھے دے دو کہ یہ تھوڑا سا وقت اپنی پسند کے مطابق

گزار لوں۔''

''ایک بات بتاؤ!''

''ہاں۔''

''تمہاری تلاش نہیں ہوگی؟''

''کیوں نہیں ہوگی۔''

''کیا سمجھیں گے لوگ؟''

''سمجھتے رہیں۔''

''واپس تو وہیں جاؤ گی نا؟''

''ہاں جاؤں گی۔''

''سوال نہیں کئے جائیں گے تم سے؟''

''کوئی بہانہ بنا دوں گی۔ بلکہ کہہ دوں گی کہ شاہ زیب مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے۔'' ریحانہ نے کہا اور ہنس پڑی لیکن شاہ زیب نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تو بہترین بہانہ ہے۔''

''ہاں تو اور کیا؟ میں کہہ دوں گی کہ مجھ سے اپنی گرفتاری کا انتقام لینا چاہتے تھے اور انتقام لے لیا انہوں نے۔'' اس نے کہا اور ہنس پڑی۔

''بہانہ واقعی اچھا ہے اور مجھے پسند ہے۔''

''بس پھر کس بات کی پرواہ اور ویسے بھی ہم جیسے لوگ کوئی عزت دار تو ہوتے نہیں ہیں کہ کوئی ہماری طرف انگلی اٹھائے۔ اتنی انگلیاں اٹھ چکی ہوتی ہیں ہم پر کہ خود انگلیاں ہی تھک جاتی ہیں۔ ہمارا اب کچھ نہیں بگڑتا۔''

شاہ زیب ایک گہری سانس لے کر خاموش ہوگیا۔ زندگی اس قدر بے مقصد ہوگئی تھی کہ اب کوئی مصرف ہی نہیں رہا تھا زندگی کا۔ اس نے سوچا کہ چلو تھوڑی سی تبدیلی ہی سہی۔ ویسے ریحانہ کے لیے اس کے دل میں صرف ایک محبت کا جذبہ تھا۔ عزت اور

احترام والی محبت کا۔ محبت کی روشنی نمودار ہوگئی۔ ریحانہ نے کہا۔

''ہم اسلام آباد تک تو پہنچ ہی جائیں گے۔ اس کے بعد جیپ چھوڑ دیں گے اور فوراً ہی وہاں سے مری کا رخ کریں گے۔ خدا کرے اتنی جلدی گاڑی کی چوری کے بارے میں پولیس تک اطلاع نہ پہنچے۔'' موٹروے پر وہ ایک ریستوران پر رکے' کھانے پینے کی چیزیں طلب کیں۔ فیول چیک کرایا اور ایک بار پھر آگے کی جانب چل پڑے۔ راولپنڈی میں ایک مناسب جگہ لینڈ کروزر روکی گئی۔ کافی فاصلہ پیدل طے کیا۔ بازار کھل چکے تھے۔ دوکانیں وغیرہ سجی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ گو ابھی بازاروں میں زیادہ رش نہیں تھا لیکن اتنا تھا کہ دوکانداری ہو رہی تھی۔ ریحانہ ایک بڑے اسٹور میں داخل ہوگئی۔ یہاں سے اس نے اپنے لیے ایک برقعہ' کچھ لباس زنانہ اور کچھ مردانہ خریدے۔ ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے اس نے ایک اٹیچی بھی حاصل کیا' اس کے ساتھ ہی شاہ زیب کے لیے کچھ چیزیں خریدی گئیں۔ مثلاً ایک چشمہ اور ایک خاص قسم کی ٹوپی جسے پہن کر شاہ زیب خوب ہنسا تھا۔ ریحانہ بھی ہنسی تھی۔ اس نے کہا۔

''میرا بس چلے تو میں تمہارا چہرہ ہی بدل دوں لیکن یقین کرو اس بدلے ہوئے حلیے میں بھی بڑے تبدیل نظر آرہے ہو۔ ایک نگاہ دیکھ کر کوئی پہچان نہیں پائے گا۔'' شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بہرحال وہ لوگ ویگن کے ذریعے مری پہنچے تھے۔ سیزن آف تھا اور مری میں اتنا رش نہیں تھا۔ جتنا عام حالات میں نظر آتا ہے۔ ایک اچھے سے ہوٹل میں انہوں نے ایک کمرا حاصل کیا۔ شاہ زیب کو یہ سب بہت عجیب لگ رہا تھا۔ لیکن زندگی کی اس تبدیلی نے اس کے اندر ایک عجیب خوش گوار کیفیت پیدا کی تھی اور وہ ایک عجیب سا سرور محسوس کر رہا تھا۔ یہی کیفیت ریحانہ کی تھی۔ اس نے کہا۔

''میں نہیں جانتی شاہ زیب! تمہیں زندگی میں کسی ساتھی کے ساتھ اس طرح کسی ہوٹل میں قیام کرنے کا موقع ملا یا نہیں لیکن میں ان دنوں کو اپنی زندگی کی یادگار بنالینا

چاہتی ہوں۔''

''ملکہ بائی کا کیا حال ہے؟''

''ہسپتال میں ہیں ابھی۔''

''دیکھنے گئیں تھیں؟''

''میرے جانے کا کیا سوال ہے۔''

''کیوں؟''

''میری وجہ سے تو انہیں ہسپتال جانا پڑا ہے۔''

''تم نے ایسا کیوں کیا ریحانہ؟''

''بس انہوں نے میرے دوست کو زندگی موت کی کشمکش میں ڈال دیا تھا۔'' ریحانہ نے کہا اور شاہ زیب اسے دیکھتا رہا۔ ریحانہ مسکرا کر بولی۔

''اب آئندہ کیا ارادہ ہے شاہ زیب؟''

''آئندہ۔'' شاہ زیب ہنس پڑا۔

''ہاں۔''

''میرا کوئی آئندہ ہے؟''

''ہاں ہے۔ تم زندہ رہو گے سینکڑوں سال عمر پاؤ گے اور --- لجیا تمہاری زندگی میں شامل ہوگی --- جاؤ ولی اور درویش تو دعائیں دیتے ہیں۔ یہ ایک راند درگاہ کی دعا ہے۔''

شاہ زیب مسکرا دیا۔

''نہیں مانتے؟''

''کیوں نہیں --- لیکن راند درگاہ کے لفظ سے اختلاف ہے۔''

''نہیں ہونا چاہیے۔''

''کسی قیمت پر نہیں۔ جو کسی کے لیے قربانی دینے کا جذبہ رکھتے ہیں وہ نیک ہوتے

ہیں۔ انہیں راندۂ درگاہ نہیں کہا جاسکتا۔'' ریحانہ اسے دیکھ کر خاموش ہوگئی تھی۔ یوں وقت گزرتا رہا۔

کچھ وقت کے لیے ایسا لگنے لگا تھا جیسے دونوں کے درمیان گہرا رشتہ ہو۔ ریحانہ بڑی اپنائیت سے شاہ زیب کے سارے کام کرتی تھی اور کبھی کبھی شاہ زیب کچھ کھوسا جاتا تھا۔ وہ نگاہ بھر کر ریحانہ کو دیکھنے لگتا تھا۔ اس وقت بھی ان لوگوں کا باہر جانے کا ارادہ تھا اور ریحانہ شاہ زیب کے کپڑے استری کر رہی تھی۔ یہ استری اس نے یہیں سے خریدی تھی۔ شاہ زیب بے خیالی کے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ ریحانہ نے کئی بار اس کی طرف دیکھا تھا اور مسکرا دی تھی لیکن اس بار اس نے شاہ زیب کو مخاطب کر ہی لیا۔

''شاہ زیب!''

شاہ زیب کے کانوں تک جیسے اس کی آواز ہی نہیں پہنچی تھی۔ ریحانہ نے کوئی جواب نہ پا کر اسے دوبارہ آواز دی۔

''شاہ زیب!''

اس بار شاہ زیب چونک پڑا۔ اس نے کہا۔

''مجھ سے کچھ کہا؟''

''ہاں۔'' ریحانہ مسکرا کر بولی۔

''کیا؟''

''تمہیں آواز دی تھی۔''

''کیوں؟''

''کچھ پوچھنا تھا۔''

''اوہ۔ پوچھو---'' شاہ زیب نے کہا۔

''اتنی دیر سے مجھے کیوں دیکھ رہے ہو؟''

''وہ---بس--- یونہی۔''

''یہ جھوٹ کا ایک انداز ہے۔'' ریحانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''

''وہ---بس---یونہی۔''

''یہ جواب نہیں ہے۔''

''میں سوچ رہا تھا کہ بلاوجہ تم نے یہ استری خریدی اور اب سے میرے کپڑوں پر گھس رہی ہو جبکہ ہوٹل میں اس کا معقول بندوبست ہے۔ تھوڑے سے پیسے دو استری ہو جاتی ہے۔''

''یہ دوسرا جھوٹ ہے۔'' ریحانہ نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''تم اس وقت استری کے بارے میں نہیں سوچ رہے تھے۔''

''ہاں۔ یہ سچ ہے۔ مجھے تمہاری شکل میں لجیا نظر آ رہی تھی۔ اس معصوم لڑکی کو اپنے دل کا حال معلوم نہیں تھا۔ کہتی تھی مجھ سے شادی کرنے میرے ماں باپ کی مشکل دور ہو جائے گی۔ اگر میں اس سے شادی کر لیتا تو---وہ اس طرح میرے لباس پر استری کر رہی ہوتی۔''

ریحانہ کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر وہ بولی۔

''مگر وہ میری طرح نہ ہوگی۔''

''کیوں؟'' شاہ زیب نے کہا۔

''اس کے چہرے پر پاکیزگی کا نور ہوگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک کنواری حیا ہوگی۔ جبکہ مجھے غور سے دیکھو تو تمہیں میرے چہرے پر پھٹکار نظر آئے گی۔ غلاظت لتھڑی نظر آئے گی۔''

''ایسی باتیں کیوں کرتی ہو ریحانہ!'' شاہ زیب نے دکھ سے کہا۔

''سچ نہیں کہہ رہی کیا--- بڑا فرق ہے مجھ میں اور لجیا میں' جانتے ہو میں اس طرح

یہاں وقت کیوں گزار رہی ہوں؟'' اس نے کہا اور شاہ زیب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''بتاؤ۔'' ریحانہ بولی۔

''میں کیا بتاؤں۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''میں بتاؤں؟''

''ہوں۔''

''اس لیے کہ زندگی کے یہ دن رات جدا ہو جائیں گے۔ میں جانتی ہوں مجھے پھر یہ دن کبھی نہیں ملیں گے۔ بہت سے تماشبین بھاری معاوضے دے کر مجھے اپنی عیش گاہوں کی زینت بنائیں گے لیکن وہاں شاہ زیب نہیں ہوگا۔ میرا دوست' میرا محبوب۔''

شاہ زیب چونک کر اسے دیکھنے لگا تو ریحانہ ہنس پڑی پھر بولی۔

''بس یہی تو فرق ہے مجھ میں اور کسی گھریلو شریف زادی میں۔ وہ میری طرح بے باک نہیں ہو سکتی۔''

''ہم باہر چلیں؟''

''کہاں؟''

''مری کے کسی بھی خوبصورت علاقے میں۔''

''مرضی ہے۔'' ریحانہ بولی۔

''کیوں۔ تم نہیں چاہتیں؟''

''نہیں۔ یہ لمحے تمہارے ساتھ میں' کہیں بھی گزریں۔''

''ٹھیک پھر تیار ہو جاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔'' ریحانہ نے کہا۔ دونوں باہر جانے والے لباس پہن کر تیار ہو گئے۔ باہر نکلے تو موسم گہرا سیاہ ہو رہا تھا۔ شاہ زیب بے اختیار بول اٹھا۔

''ارے۔ اندر تو اس کالے موسم کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ کیا برفباری ہو گی۔''

''نہیں۔ یہ موسم برفباری کا نہیں ہے۔ ہاں بارش ہو سکتی ہے۔''

''پھر کیا خیال ہے؟''

''کوئی خیال نہیں۔ یہ تو اور لطف کی بات ہے۔ خدا کرے خوب بارش ہو۔ جل تھل ہو جائیں۔'' ریحانہ نے مسرور لہجے میں کہا وہ بہت زیادہ خوش تھی اور اپنی خوشی کا اظہار اسی انداز میں کر رہی تھی۔ بہر حال شاہ زیب اس وقت اس کی ہر خوشی کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا۔

چنانچہ دونوں باہر نکل آئے اور اس کے بعد ایک ٹیکسی کر کے چل پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے وائپر چلا دیے تھے۔ ماحول میں دھند لائٹ اور نمی بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے موسم مزید خوشگوار ہو گیا تھا۔ وہ لوگ مختلف مقامات کی سیر کرتے رہے۔ بارش مدھم مدھم پھوار کی شکل اختیار کر گئی۔ یہ پھوار بھی بڑی معمولی سی تھی۔ پھر ایک اوپن ایئر ریستوران کے سامنے ٹیکسی رکوائی گئی۔ ریحانہ نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ وہ ٹیکسی روک دے۔ یہاں رک کر کافی کے دو کپ پیے گئے۔ واقعی بعض چیزوں کا مزہ مکمل طور پر موسم سے تعلق رکھتا ہے۔ اس وقت کافی نے جو مزہ دیا تھا وہ اس سے پہلے یقیناً کبھی نہیں محسوس ہوا ہوگا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک لینڈ کروزر وہاں آ کر رکی تھی اور اس میں سے ایک شخص نیچے اُترا تھا۔ اس نے کافی کے دو کپ خریدے اور انہیں لے کر لینڈ کروزر کی جانب بڑھ گیا۔ اس دوران شاہ زیب اور ریحانہ نے اپنی ٹیکسی آگے بڑھوا دی تھی۔ وہ اس دوڑتے ہوئے آدمی کو نہیں دیکھ سکے تھے۔ جو کافی کے کپ دینے کے فوراً ہی بعد ان کی جانب لپکا تھا۔ لمبے چوڑے بدن کا باڈی گارڈ نما آدمی تھا۔ لینڈ کروزر کے اندر ایک اوباش سی شکل کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ جس کا چہرہ تو بہت زیادہ چوڑا نہیں تھا لیکن بے حد بڑی مونچھیں رکھ کر اس نے اپنے چہرے کو رعب دار بنانے کی کوشش کی تھی۔ وہ شخص بہت ہی عمدہ لباس پہنے ہوئے تھا۔ ٹیکسی خاصی آگے نکل گئی تو اس کے پیچھے دوڑنے والا واپس لینڈ کروزر کی طرف آیا۔

''نکل گیا صاحب جی!''

''صاحب جی کے بچے پیچھا کرو اس کا۔'' پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔

''او چل بھئی چل جلدی چل'' لمبے چوڑے آدمی نے جو یقینی طور پر پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی کا گن مین تھا۔ ڈرائیور سے کہا اور ڈرائیور نے فوراً ہی لینڈ کروزر کا سلف لگا کر اسے گیئر میں ڈال کر آگے بڑھا دیا۔ لینڈ کروزر اب اس ٹیکسی کے پیچھے چل پڑی تھی۔ موسم کی خوشگوار کیفیت بدستور قائم تھی۔ ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے ریحانہ اور شاہ زیب کو کچھ اندازہ نہ تھا کہ کوئی ان کے پیچھے لگا ہوا آ رہا ہے۔ ایک سنسان سی جگہ لینڈ کروزر نے آخر کار ٹیکسی کو جا لیا۔ تیزی سے اس کے آگے نکلی اور ٹیکسی کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے فوراً ہی بریک لگا دیے تھے۔ اچانک جھٹکے سے شاہ زیب اور ریحانہ چونک پڑے۔

''کیا ہوا؟'' شاہ زیب نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا لیکن جو ہوا تھا وہ نگاہوں کے سامنے ہی تھا۔ لمبا چوڑا گن مین نیچے اتر آیا۔ شاہ زیب خاموش نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گن مین ٹیکسی کے قریب پہنچ گیا۔ اس کا چہرہ کافی بڑا تھا اور جسم کی مناسبت سے وہ ایک پہلوان نما آدمی لگتا تھا۔ شاہ زیب نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا تو گن مین نے کہا۔

''بی بی تیرا نام ریحانہ ہے؟ ریحانہ بائی'' ریحانہ نے کوئی جواب نہ دیا تو گن مین نے لینڈ کروزر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''گاڑی میں چودھری نادر علی بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر تم ریحانہ ہو تو چودھری صاحب کے پاس آؤ۔ وہ تمہیں بلا رہے ہیں۔'' اتنی دیر میں لینڈ کروزر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی نیچے اتر آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ڈرائیور بھی جو خود بھی ایک لمبے چوڑے بدن کا مالک تھا وہ ٹیکسی کی جانب بڑھا۔ شاہ زیب کو ایک لمحے کے اندر اندر احساس ہو گیا تھا کہ گاڑی میں بیٹھا ہوا شخص جس کا نام اسے چودھری نادر علی معلوم ہوا تھا یقینی طور پر ریحانہ کا شناسا ہے لیکن اس سے آگے کے حالات کا اسے کوئی صحیح اندازہ نہیں تھا۔ چودھری نادر ٹیکسی کے قریب پہنچ گیا۔

''او ریحانہ بی بی! چودھری نو دیکھ کر بھی تم گڈی کے اندر ہی بیٹھی ہو۔'' اس نے کہا ''او میں نے پہچان لیا ہے تمہیں۔ کدھر گھوم رہی ہو بھئی۔ نیچے تو اترو۔'' ریحانہ نے ایک لمحے تک کچھ سوچا پھر دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔

''جی چودھری صاحب فرمایئے۔''

''اوئے ہوئے ہوئے ہوئے۔ اس بادل بھرے موسم میں تو ریحانہ بی بی اور بھی قیامت بن گئی ہو تم۔'' شاہ زیب خاموشی سے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا یہ گفتگو سن رہا تھا۔

ریحانہ نے کہا ''فرمایئے چودھری صاحب کیسے ہیں آپ؟''

''اوئے بالکل ٹھیک ہیں بھئی۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہماری شکر ہمیں یہیں مل جائے گی۔ او بھئی ڈگے ہماری دوست ہمیں مل گئی ہے۔ اب ہمیں کسی اور کی ضرورت نہیں ہے۔ او چل بھئی کہاں ٹیکسی میں گھوم پھر رہی ہے اور یہ کون ساتھ ہے؟'' چودھری نے گردن جھکا کر شاہ زیب کو دیکھا اور ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک سا گیا۔

''اوئے یہ! او تو جانا پہچانا سا کیوں لگ رہا ہے رے۔ نیچے اُتر۔ چودھری نادر کو نہیں جانتا تو۔'' شاہ زیب خاموشی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

''اوئے کدھر دیکھا ہے بھئی تجھے۔'' ڈگے تو پہچانتا ہے اسے۔

''ہاں چودھری صاحب جی۔ آپ کے ساتھ ہی میں نے بھی ایک بار اسے بوئے آسل میں دیکھا ہے۔ اوئے جی آپ کسی کام سے ادھر گئے تھے میں ساتھ تھا۔ یہ تو لاہور میں پڑھتا تھا ملنے آیا تھا۔ اوئے یاد آ گیا۔ چودھری صاحب جی جہاں زیب اور اورنگ زیب کی اماں کا انتقال ہوا تھا۔ روئے گئے تھے افسوس کرنے۔ وہیں اسے بھی دیکھا تھا۔'' شاہ زیب خاموشی سے کھڑا چودھری نادر کی گفتگو سن رہا تھا۔ چودھری صاحب نے ہاتھ آگے بڑھا کر ریحانہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''واہ رے بھئی! اوئے میاں تو جا۔ ہماری اس سے بہت پرانی دوستی ہے۔ جب ہم یہاں موجود ہیں تو یہ کسی اور کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ جو بھی کام ہو بتا دینا ہمیں۔ ہمارا پتہ لکھ

لینا ادھر مری میں ہماری کوٹھی ہے۔ اس میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

ریحانہ نے جھٹکے سے چودھری کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

"چودھری جی آپ جیسے لوگوں کے بارے میں سنا تھا کہ پاگل ہوتے ہیں۔ اپنے آپ میں گم اپنے آپ میں ڈوبے ہوئے لیکن آج دیکھ بھی لیا۔ مجھے آپ کا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔ میں کسی کے ساتھ جا رہی ہوں آپ نے ٹیکسی کا راستہ روک کر اس طرح مجھے احکامات دینے شروع کر دیے جیسے آپ نے مجھے خرید کر رکھا ہوا ہے۔"

"اوہ بھئی بدتمیزی کر رہی ہے۔ خریدنے کی بات کر رہی ہے تو خرید بھی لیں گے۔ قیمت لگا دینا اپنی۔"

"آپ جیسے گدھے یہی کہہ سکتے ہیں۔ بہرحال دفع ہو جائیے یہاں سے۔ آؤ شاہ زیب ان جیسے پاگل آتے رہتے ہیں ہمارے گھر۔ اداکاریاں کرتے ہیں۔ جوتے کھاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔" چودھری نادر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

"او کتے دی پتر! کیا بکواس کر رہی ہے تو۔ او جا بھئی اس نے ہماری کھوپڑی گھما دی ہے۔ اب یہ کہیں اور نہیں جا سکتی۔ چل ڈگے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈال لے۔" چودھری واپسی کے لیے مڑ گیا اور لمبا چوڑا آدمی جسے مسلسل ڈگا کہہ کر مخاطب کیا جا رہا تھا ریحانہ کی طرف بڑھا۔ اس نے ریحانہ کے بازو پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی اور کہا۔

"چل بی بی چودھری صاحب کے غصے کو ہوا نہ دے ورنہ تیرا یار مارا جائے گا۔" شاہ زیب صورت حال کا اندازہ لگا چکا تھا۔ ریحانہ دو قدم پیچھے ہٹی تو شاہ زیب نے ڈگے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"اس حرام زادے چودھری کو لے کر یہاں سے دفع ہو جا۔ کیوں اپنی موت کو آواز دے رہا ہے۔"

یہ الفاظ چودھری نادر نے بھی سن لیے تھے۔ وہ رکا اور اس نے خونی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا۔ ڈگا جھک کر ریحانہ کو اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن شاہ زیب کا زوردار گھونسا

اس کی پیشانی پر پڑا۔ دونوں کے ڈیل ڈول میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ڈگے کو امید نہیں تھی کہ شاہ زیب جیسے درمیانی جسامت کے آدمی کا گھونسا اتنا آہنی ہوگا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی کھوپڑی میں ستارے ناچ گئے تھے لیکن اس کے ساتھی ڈرائیور نے وفاداری کی مثال قائم کرنے کی کوشش کی اور ایک لمبی چھلانگ شاہ زیب پر لگا دی۔ شاہ زیب اس کی طرف سے بھی غافل نہیں تھا۔ اب ذرا مختلف قسم کا انسان بن چکا تھا وہ۔

چنانچہ جیسے ہی وہ شاہ زیب پر آیا شاہ زیب نے اس کی کمر پر ہاتھ ڈالے اور کولہے پکڑ کر اس کو اوپر اچھال دیا۔ یہ بے پناہ طاقت کا کمال نہیں تھا بلکہ پھرتی کا ایک مظاہرہ تھا۔ صحیح وقت پر اور اس کے زور پر شاہ زیب نے یہ کام دکھایا تھا۔ یہ شاہ زیب کے قد سے دوگنا اونچا اچھلا اور پتھریلی زمین پر آ پڑا۔ پتھریلی زمین نے شاہ زیب کی خوب مدد کی تھی۔

چنانچہ ڈرائیور کی ہولناک چیخ سنائی دی اس دوران ڈگے نے پلٹ کر شاہ زیب کی کمر پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ پیچھے سے کمر پکڑی تھی اس نے لیکن شاہ زیب نے اس وقت کے موقع کی صحیح مناسبت سے کام لیا۔ اس کا رخ سامنے چودھری کی طرف تھا۔ جبکہ ڈگا دونوں ٹانگیں پھیلائے ہوئے اس کے پیچھے تھا۔ شاہ زیب کی سیدھی ٹانگ پوری قوت سے اٹھی اور ڈگے کی دونوں ٹانگوں کے درمیان زوردار ضرب پڑی۔ اس کے حلق سے ایسی ہی چیخ نکلی جیسے بکرا کاٹ دیا ہو۔ وہ پیچھے ہٹا تو شاہ زیب نے پھرتی سے اس کی گردن پکڑ لی اور اپنا ریوالور نکال کر بے رحمی سے اس کی گردن میں پھنسا دیا۔ یہ ایک خوفناک عمل تھا۔ چودھری نے شاہ زیب کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اب صورت حال کی سنگینی کو سمجھا تھا چنانچہ اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے۔

"او سن بھئی سن۔ میری بات تو سن۔" لیکن اس دوران شاہ زیب نے پلٹ کر تابڑتوڑ تین چار گھونسے ڈگے کے لگا دیے تھے۔ ڈگے کی حالت تو پہلے ہی خراب تھی ان گھونسوں نے اسے زمین پر لٹا دیا۔ چودھری نے کہا۔

"او میاں میری بات سن۔" او بھائی ترے بھائیوں سے میرے بڑے تعلقات ہیں

اوراس لڑکی کو تو کیا سمجھتا ہے۔ وہ طوائف زادی ہے۔ ہیرامنڈی کی ہے۔ کہیں اس نے کوئی شریف زادی کہہ کر تو تجھے اپنے آپ سے متعارف نہیں کرایا۔ او میاں یہ تو ٹکے ٹکے بکنے والیاں ہیں۔ تم ان کے لیے چودھری نادر علی سے جھگڑا مول لے رہے ہو۔ ہماری پرانی یاری تھی اس سے۔ اِس لیے کہا کہ یہ ہمارے ساتھ چلے۔ ٹھیک ہے تم نہیں چاہتے تو نہ سہی۔ پر ایک بات یاد رکھنا۔ چودھری نادر سے ٹکر لی ہے تم نے۔'' شاہ زیب ہنس پڑا پھر بولا۔

''ہاں آج کل یہی کام کر رہا ہوں میں۔ اب جائیے چودھری صاحب! اپنے ان دونوں بندوں کو اب آپ کو اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔ یہ تو اس قابل نہیں رہے ہیں کہ اپنے پیروں پر چل کر جاسکیں۔ ایک بات ذہن میں رکھیے۔ آپ ریحانہ کو زیادہ جانتے ہیں اگر آپ نے اسے تنگ کرنے کی کوشش کی تو جو تماشا آپ دیکھیں گے وہ آپ کے خیال میں نہیں ہوگا۔ چل بھئی۔''

شاہ زیب نے اپنے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا اور ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی واپس موڑ لی۔ شاہ زیب اور ریحانہ ٹیکسی میں بیٹھ گئے تھے۔ ریحانہ کا رنگ بری طرح اُڑا ہوا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

''سر جی کدھر چلوں۔''

''یار واپس چلو۔ ان لوگوں نے ساری بارش کا مزہ خراب کر دیا۔'' شاہ زیب نے جواب دیا اور اس کے بعد وہ ہوٹل کی جانب واپس چل پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ہوٹل پہنچ گئے تھے۔ ریحانہ کے چہرے پر کسی قدر الجھن کے آثار تھے۔ شاہ زیب نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں ریحانہ کیا بات ہے؟''

''یہ اچھا نہیں ہوا۔'' چودھری نادر عام چودھریوں جیسا ہی ہے۔ کینہ پرور، طاقتور اس وقت جو کچھ ہوا ہے شاید اس کے ساتھ زندگی میں کبھی نہ ہوا ہوگا۔ وہ یقینی طور پر بدلہ لینے کی کوشش کرے گا اور شاہ زیب تم۔'' جواب میں شاہ زیب ہنس پڑا اور پھر اس نے کہا۔

''اصل میں تم یقین کرو ریحانہ! ہم وقت کی تحریر کو نہیں بدل سکتے۔ وقت کچھ ایسا کھیل کھیلتا ہے کہ کبھی کبھی وقت کا کھیل ہمیں بھی حیران کر دیتا ہے۔ ایک ایک کر کے ان علاقوں کے سارے چودھریوں سے میری دشمنی بڑھتی جا رہی ہے۔ بارہا اپنے آپ کو اس بات کے لیے آمادہ کیا کہ چودھریوں کے خلاف ایک باقاعدہ محاذ بنالوں۔ وہ جنھوں نے انسانوں پر زندگی تنگ کر رکھی ہے۔ ان سے دو دو ہاتھ کروں طبیعت کی شرافت ہاتھ روک دیتی ہے لیکن کوئی نہ کوئی چودھری پھر وہ راستہ دکھا دیتا ہے۔ تم فکر مت کرو ریحانہ! میرا تو کام ہی یہ ہے۔ ہاں تمھیں کچھ مشکل پیش آ سکتی ہے۔'' ریحانہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''اب واپس چلو شاہ زیب! کافی وقت ہو گیا۔ میں نے آنے والے لمحات کو بالکل بھلا دیا تھا اور یہ سوچ لیا تھا کہ تمہارے ساتھ جتنا وقت گزرے گا اسے زندگی بھر کی یادگار بنائے رکھوں گی۔ بس اب کافی ہے ہمیں واپس چلنا چاہیے۔'' شاہ زیب نے سنجیدہ نگاہوں سے ریحانہ کو دیکھا پھر آہستہ سے بولا۔

''تم ڈر گئی ہو ریحانہ! لیکن خیر واپس تو جانا ہی ہے۔ آج نہیں کل...... کہاں جاؤ گی۔''

''بس لاہور جاؤں گی سیدھی۔ اب واپس فخر خاں کے ہاں جانا تو بے مقصد ہوگا۔ اس سے میرا تعلق ہی کیا۔''

''اس درمیان کے بارے میں کیا کہو گی''

''کہہ لوں گی کچھ۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ تمہارا نام بالکل نہیں لوں گی۔ یہ وعدہ ہے میرا۔'' شاہ زیب پھر ہنسنے لگا پھر بولا۔

''مگر میں چاہتا ہوں کہ تم میرا ہی نام لو۔''

''نہیں میں تمہارے دشمنوں کو مشتعل نہیں کرنا چاہتی۔ یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا۔''

''تمہاری مرضی ہے۔ میری طرف سے تمہیں کھلی اجازت ہے۔ کھل کر بتاؤ کہ تمہیں

اُڑا کر لے جانے والا میں تھا۔"

"مجھے لاہور پہنچا دو یہاں سے کسی بھی بس سے چلی جاؤں گی۔"

"میں تمہیں لاہور چھوڑ کر آؤں گا۔"

"شاہ زیب نہیں"

"ہاں تمہیں لاہور پہنچانا میری ذمہ داری ہے اور بس۔"

"تو پھر ہم حلیہ بدل کر چلیں گے۔"

"اس میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" لاہور جانے والی بس میں شاہ زیب ایک دیہاتی بنا ہوا بیٹھا تھا۔ لاچہ' کرتا' پگھڑ' آنکھوں میں کاجل لیکن جو تروتازہ اور شگفتہ چہرہ تھا وہ دیکھنے والوں کو بہت متاثر کرتا تھا۔ ایسا خوبصورت دیہاتی بہت کم دیکھا گیا ہوگا۔ لاہور میں وہ لوگ بس اڈے پر اتر گئے اور ریحانہ نے کہا۔

"بس شاہ زیب پلیز مجھے وہاں تک نہ لے جاؤ یہیں چھوڑ دو۔ میں رکشہ سے چلی جاؤں گی۔ تم اگر ہو سکے تو مجھ سے رابطہ قائم کرنا۔ اپنی حفاظت کرو شاہ زیب" شاہ زیب نے کچھ لمحے کچھ سوچا پھر گردن ہلا کر بولا۔

"ٹھیک ہے تم سے رابطہ کروں گا۔ آؤ تمہیں رکشہ میں بٹھا دوں۔" ریحانہ رکشے میں بیٹھ کر چلی گئی اور شاہ زیب نے اداس نگاہوں سے لاہور کو دیکھا۔

لجیا کے بارے میں اب راجہ شہاب الدین نے جو کچھ بتایا تھا اگر وہ سچ ہے تو کاش کوئی جگہ کوئی راستہ لجیا کی صورت دکھا دے۔ کاش ایک دیہاتی کے روپ میں اسے آسانی سے تو نہیں پہچانا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ لاہور میں گھوم پھر کر لجیا کو تلاش کرے اور یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

چودھری نادر ٹیکسی کو واپس جاتے دیکھ رہا تھا۔ اسے ایک لمحے کے اندر اندر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر اس نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو شاہ زیب اس کا حشر ڈرائیور اور ڈگا

جیسا کرے گا۔ حیرانی کی بات تھی بالکل حیرانی کی بات تھی۔ ملکہ بائی اس کا بڑا احترام کرتی تھی۔ خیر یہ تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ملکہ بائی تو ہر اس شخص کا احترام کرتی تھی جس کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوئی ہوں۔ ریحانہ اس کی ہونہار لڑکی تھی۔ چودھری نادر نے ایک دو بار ملکہ بائی سے کہا تھا کہ اگر وہ چاہے تو ریحانہ کو اسے دے دے۔ داشتہ بنا کر رکھے گا اور ملکہ بائی جو مانگے گی وہ دے دے گا۔ ملکہ بائی نے غالباً ریحانہ سے بات بھی کی تھی لیکن ریحانہ نے اس سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کی تھی کہ اسے کم از کم کسی ایسے بندے کے حوالے نہ کرے جو دیکھنے میں انسان ہی نہ لگتا ہو۔ یہ حقیقت تھی نادر علی کا رنگ کالا توے جیسا تھا۔ بدن بھی انتہا بے ڈھنگا اور بے تکا تھا۔ فطرتاً بھی وہ انتہائی کمینہ صفت انسان تھا۔ ریحانہ نے اس سے شدید نفرت کا اظہار کرتے ہوئے ملکہ بائی سے کہا تھا کہ اگر ملکہ بائی نے صرف پیسوں کے عوض اسے اس طرح نیلام کیا تو وہ یا تو یہاں سے بھاگ جائے گی یا خودکشی کر لے گی۔ ریحانہ کا عزم دیکھ کر ملکہ بائی ڈر گئی تھی اس نے حیلے بہانوں سے چودھری نادر کو ٹال دیا تھا اور چوہدری نادر خاموش ہو گیا لیکن یہاں اس موسم میں ریحانہ کو دیکھ کر چودھری نادر کو بس ایک دم جوش آ گیا تھا اور اس نے اسی جوش کے عالم میں ریحانہ کو اپنی تحویل میں لینا چاہا تھا لیکن اس وقت صورت حال کافی گڑبڑ ہو گئی تھی اور چوہدری نادر کو زبردست توہین کا احساس ہوا تھا۔ اس کے دونوں آدمی بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ چوہدری نادر کو ان پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ دبلی پتلی جسامت کا ایک لڑکا ان دونوں کی حجامت کر کے چلا گیا تھا۔ ڈگا جس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ دس آدمیوں پر بھاری ہے۔ بے بسی سے لمبا پڑا ہوا تھا۔ چوہدری نادر اس پر بڑا خرچہ کرتا تھا۔ ایک بھینس پال رکھی تھی اس نے ڈگے کے لیے اس کا خیال تھا کہ وہ ایک ایسا باڈی گارڈ ہے جو اسے ہر مشکل سے نکال سکتا ہے لیکن ڈگے کی جو کیفیت ہوئی تھی وہ دیکھنے کے قابل تھی۔ چودھری نادر نے نفرت سے زمین پر تھوکا اور لینڈ کروزر کی جانب بڑھ گیا۔ اول تو ان دونوں کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالنا ہی ایک مشکل کام تھا۔ جو چوہدری نادر کے لیے ممکن نہیں تھا۔ دوئم وہ انہیں اتنی حیثیت دینا نہیں چاہتا تھا کیونکہ

انہوں نے ایک آدمی کے ہاتھوں مار کھائی تھی۔

بہر حال لینڈ کروزر کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد اس نے لینڈ کروزر ریورس کی اور پھر اسے گھما کر اپنی رہائش گاہ کی طرف چل پڑا۔ سیر و سیاحت کے لیے مری آیا تھا۔ اس جیسے عیاش آدمیوں کی عیاشی کے لیے ہر چیز دستیاب ہو جاتی تھی۔ شاندار رہائش گاہ ہر قسم کی ضرورتوں کے لیے کافی تھی۔

چوکیدار نے لینڈ کروزر دیکھ کر گیٹ کھول دیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر صرف چودھری نادر کو دیکھ کر کسی قدر حیران ہوا لیکن مالکوں سے کوئی بات پوچھنے کے لیے نہیں ہوتی۔ چودھری نادر اندر چلا گیا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اس نے ملازموں کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔ جب ملازمہ اندر آئی تو چوہدری نے کہا۔

''کافی لاؤ میرے لیے بنا کر'' وہ بری طرح تلملا رہا تھا اور اس کا ذہن شدید سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ کیا کرنا چاہیے۔ ان دونوں کو تلاش کرنا بے مقصد ہی تھا۔ یہاں اس کی اجارہ داری نہیں چلتی تھی۔ اگر کوئی ہنگامہ کھڑا کیا تو بلاوجہ فوری طور پر تو مشکل پیش آ جائے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں حالات کو سنبھالا جا سکتا ہے۔ چنانچہ صبر سے کام ہی لینا اس وقت زیادہ مناسب ہوگا لیکن شاہ زیب کو سزا دینا اور ریحانہ کو دو کوڑی کا کر دینا اب اس کی زندگی کا بہت بڑا مقصد بن گیا تھا۔ کافی پیتے ہوئے بہت دیر تک سوچتا رہا دل و دماغ میں دھواں اٹھ رہا تھا۔ سارے وجود میں ایک بے کلی سی چھائی ہوئی تھی۔ کرنا ہے کچھ کرنا ہے۔ کوئی ایسا کام جو اس بے کلی کو سکون بخش دے۔
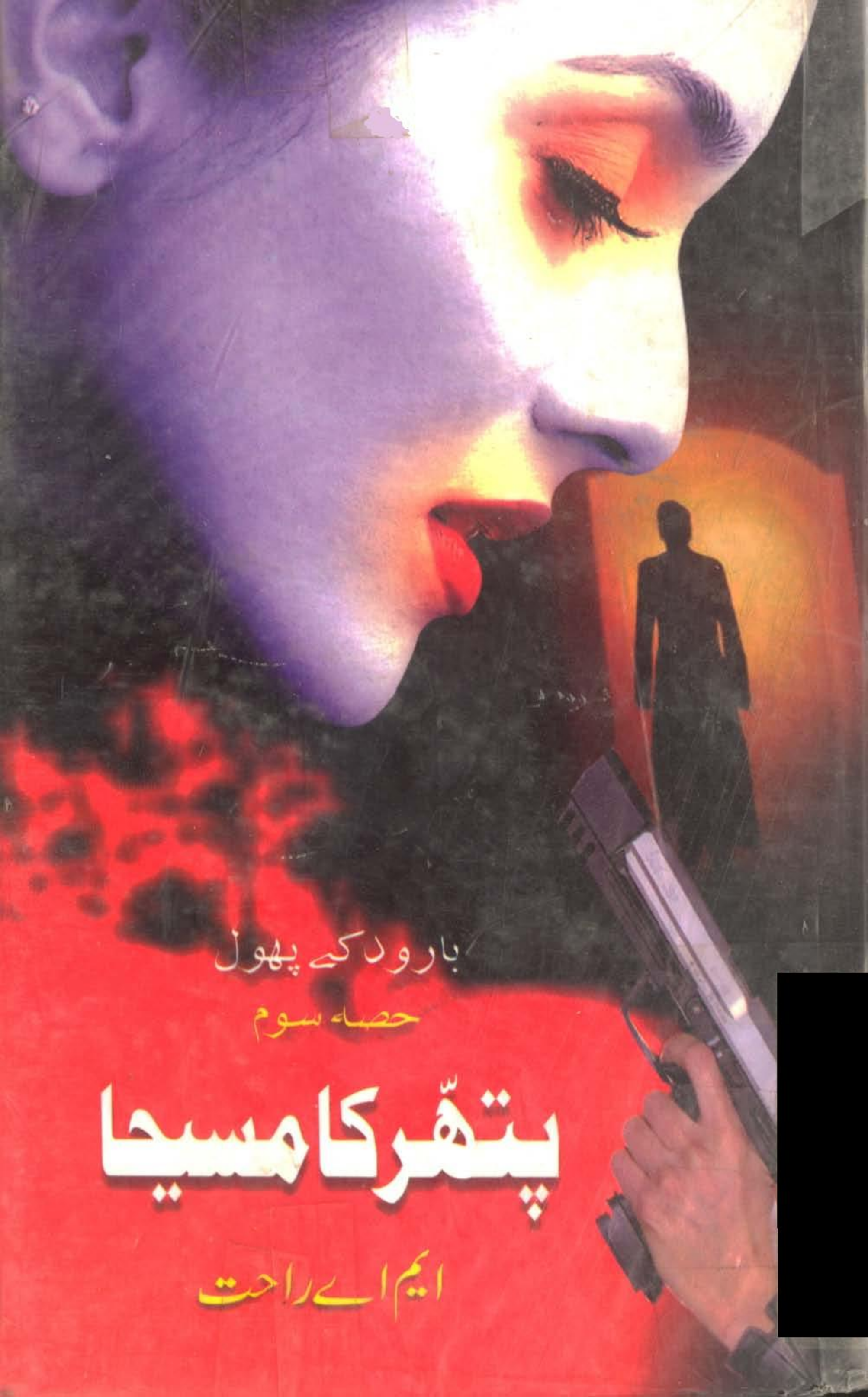
بارود کے پھول
حصہ سوم
پتّھر کا مسیحا
ایم اے راحت

پتھر کا مسیحا

ایم اے راحت

خزینہ علم و ادب
الکریم مارکیٹ اُردو بازار - لاہور ۷۳۱۴۱۶۹ . ۷۲۱۱۴۶۸

اشاعت : 2004ء

سرورق: عبیداللہ

کمپوزنگ: محمد عمران ساغر

مطبع: حافظ جمیل پریس لاہور۔

قیمت : -/200

نہ جانے کب تک وہ سوچ میں ڈوبا رہا۔ پانچ بجے کے قریب ڈگا اور ڈرائیور واپس آئے ان کی حالت بری تھی۔ انہوں نے رورو کر چوہدری نادر سے معافی مانگی تو نادر نے خونی نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے۔

وہ تو صرف ایک لڑکی کا معاملہ تھا اس کا عاشق تم دونوں کی مرمت کر کے چلا گیا۔ اگر وہ ڈاکو ہوتے خطرناک لوگ ہوتے یا میرے ایسے دشمن ہوتے جو مجھے قتل کرنا چاہتے تو کیا تم ان سے میری بچت کر سکتے تھے اور خاص طور سے توڈ گے تُو تو اپنے آپ کو دس آدمیوں پر بھاری بتاتا تھا۔

''معافی چاہتا ہوں سر جی! بس چوک ہوگئی اس لیے مار کھا گیا''۔

''لعنت ہے تجھ پر۔ پر معافی کا لفظ مجھے زہر لگتا ہے۔ جو حرکت کر چکے ہوتے ہو اس کے لیے معافی مانگنے سے پورا کام نہیں ہو جاتا''۔

''صاحب جی۔ پھر آپ مجھے حکم دو۔ کہ اسے تلاش کر کے قتل کر دوں۔ اس کے بعد مجھے آپ کے پاس واپسی کی اجازت مل جانی چاہیے۔ غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے جی۔ بس اس خیال میں مار کھا گیا کہ بندہ ہے ہی کیا۔ توڑ مروڑ کر رکھ دوں گا۔ چلتا ہوں آپ مجھے نہ نکالو تو اچھا ہے۔ میں خود ہی نکل جاتا ہوں۔ ہاں اگر اس کی لاش لے کر آپ کے پاس آجاؤں تو پھر معافی کا حقدار ضرور ہوں گا''۔

''بکواس بند کر ادھر آ...... پتہ ہے وہ کون ہے''۔

''صاحب جی! میرا کام بس اسے تلاش کرنا ہے۔ وہ کوئی بھی ہو یا تو وہ مجھے

مارے گا یا میں اسے ماردوں گا''۔

''بیوقوف کے بچے، بہت زیادہ جذباتی بننے کی کوشش مت کر، کہاں تلاش کرے گا اسے''۔

''مری میں ہی ہوگا جی''۔

''کیوں تیرے باپ کا غلام ہے وہ کہ مری میں رک کر تیرا انتظار کرے گا۔ چوہدری نادر اتنا معمولی آدمی نہیں ہے کہ کوئی اس سے پنجہ لڑائے اور آنکھیں ڈال کر کھڑا رہے۔ وقتی طور پر کوئی کامیابی حاصل کرنے والے جب یہ معلومات حاصل کرتے ہیں کہ چوہدری نادر کیا ہے تو سب سے بڑی فکر انہیں اپنی جان کی ہونی۔ ہوسکتا ہے وہ مری سے نکل گیا ہو...... کسی ایک بندے کو مری میں تلاش کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ جا آرام کر اپنا حلیہ درست کر میں سوچوں گا کہ مجھے آگے کیا کرنا ہے''۔ ڈگا اور ڈرائیور وہاں سے چلے گئے تو چوہدری نے منہ بنا کر کہا۔

''قتل کریں گے اسے اور اس کے بعد پھانسی سے بچانا میری ذمے داری ہوگی۔ سالا ڈگا ہی ہے پورا لیکن بہر حال کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔ اس سے پہلے ملکہ بائی سے ملاقات کرکے، اسے اس کی بیٹی کے کرتوت بتانے ہوں گے۔ یہ ضروری ہے''۔

چوہدری نادر الگ تھلگ کا آدمی تھا اس لیے یہاں کی مقامی ہنگامہ آرائیوں کا اسے کوئی علم نہیں تھا۔ جہانزیب اور اورنگزیب سے تھوڑی سی شناسائی تھی۔ اتنی جتنی چوہدریوں سے ہوتی ہے۔ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی میٹنگ میں مل لیتے تھے۔ پھر جب جہاں زیب کی والدہ کا انتقال ہوا تو افسوس کرنے کے لیے چوہدری نادر بھی اس کے گھر گیا۔ کہیں آس پاس آیا ہوا تھا یہ سنا تو افسوس کرنے چلا گیا۔ وہیں اس نے شاہ زیب کو بھی دیکھا تھا۔ یادداشت کا پکا تھا۔ شاہ زیب کو پہچان لیا۔ وہ دونوں بھائی تو اچھے لوگ تھے۔ ذرا ان سے بھی بات کرے گا۔ لیکن پہلے ملکہ بائی کو دیکھ لیا جائے۔ اسے بتادیا

جائے۔ وہ کیا کہتی ہے۔

چنانچہ اس نے تیاریاں شروع کردیں اور ایک دن وہاں گزارنے کے بعد دوسرے دن وہاں سے چل پڑا۔ پہلے اپنے علاقے میں پہنچا تھا انتقام کی آگ سینے میں سلگ رہی تھی۔ علاقے کے معاملات بھلا کہاں چھوڑنے والے ہیں۔ چنانچہ کوئی دس دن وہاں لگ گئے۔ لیکن جو آگ سینے میں لگی ہوئی تھی وہ اتنی آسانی سے بجھ نہیں سکتی تھی۔ تمام تر کاموں سے فرصت پانے کے بعد آخر کار وہ لاہور چل پڑا۔ ہیرا منڈی کی پرشباب رونقوں میں گم ہونے کے بجائے اپنی آگ میں جھلستا ہوا ملکہ بائی کے کوٹھے پر پہنچ گیا۔ سازندوں سے شناسائی تھی۔ ایک سازندے سے بات چیت ہوئی اس نے فرشی سلام کرتے ہوئے چوہدری نادر سے کہا۔

''صاحب جی! اس وقت تو کوئی بھی نہیں ہے گھر پر، شمع بی بی اور ریحانہ بی بی کسی کام سے مارکیٹ گئی ہوئی ہیں''۔

''ریحانہ آگئیں واپس''۔

''ہاں جی! کئی دن ہوگئے''۔

''کہاں گئی تھی وہ؟''

''وہ جی بلاوے پر گئیں تھیں خاصے لمبے عرصے کے لیے''۔

''ملکہ بائی کیا کررہی ہے؟''

''نہیں جی نہیں وہ تو ہسپتال میں ہے''۔

''کیوں خیریت''

''ارے آپ کو تو کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ وہ ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا جی، ٹانگیں ٹوٹ گئیں دونوں''۔

''ارے ارے ارے...... کب کی بات ہے؟''

''اب تو جی ڈیڑھ مہینہ ہوگیا''

''کون سے ہسپتال میں ہیں''۔ سازندے نے اسپتال کا نام اور پورا پتہ بتایا تو چوہدری نادر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہوں......ملکہ بائی کا ہاتھ اٹھا ہوا ہے آجکل......اسی لیے بڑی عیاشیاں ہو رہی ہیں۔ من مانیاں کی جارہی ہیں۔ ملتا ہوں ملکہ بائی سے اور سنو، ریحانہ آئے تو اسے بتا دینا چوہدری نادر آیا تھا۔ جلد ہی اس سے ملاقات کروں گا''۔

''جی چوہدری جی آپ فکر ہی نہ کریں۔ جہاں ٹھہرے ہوئے ہیں وہ جگہ بتا دیں۔ ریحانہ بی بی آتے ہی آپ کے پاس پہنچ جائے گی''۔

''بتا دوں گا، بتا دوں گا، پہلے ذرا ملکہ بائی سے ملاقات کرلوں۔ تم آؤ میرے ساتھ''۔ چوہدری نے سازندے سے کہا اور سازندہ خوشی سے تیار ہوگیا۔ ایسے ہی بڑے لوگوں سے کبھی کبھی تقدیر بن جاتی ہے۔ چوہدری نادر نے بھی اسے دو ہزار روپے دیئے تھے اور وہ خوشی سے نہال ہوگیا تھا۔

بہر حال لینڈ کروزر نیچے کھڑی ہوئی تھی سازندے کو ڈرائیور کے ساتھ بٹھا کر چوہدری نادر خود پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور گاڑی اسٹارٹ ہوکر آگے بڑھ گئی۔ کچھ دیر کے بعد گاڑی ہسپتال سے اندر داخل ہوگئی۔ ڈرائیور کو وہیں چھوڑ کر چوہدری نادر علی سازندے کو ساتھ لے کر ملکہ بائی کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اندر ایک نرس ملکہ بائی کے لیے کچھ کر رہی تھی۔ سازندہ چوہدری نادر کو لے کر ملکہ بائی کے پاس پہنچا۔ تو نرس اپنا کام کر کے باہر نکل گئی۔ ملکہ بائی نے چوہدری نادر کو دیکھا تو پر مسرت لہجے میں بولی۔

''آیئے چوہدری جی آیئے۔ اصل میں یہی موقع ہوتا ہے۔ جب دوست اور دشمن کی تمیز ہوتی ہے۔ کچھ ایسے ہی تھے جنہوں نے زندگی بھر محبتوں اور رفاقتوں کے دعوے کیے۔ جب مشکل پڑی تو پوچھنے تک نہ آئے اور کچھ ایسے جن کے لیے امید نہیں

تھی کہ اتنا پیار دیں گے چوہدری جی، آپ کا بے حد شکریہ۔ کاش میں اٹھ کر بیٹھ سکتی آپ کا استقبال کرسکتی''۔

''بی بی بات سنو......اے تم باہر جاؤ''۔ چوہدری نادر نے سازندے کو اشارہ کیا اور وہ باہر نکل گیا۔ تو اس نے وہیں سے اپنی گفتگو کا سلسلہ شروع کیا اور کہا۔

''بی بی بات سنو۔ نہ میں تمہاری عیادت کو آیا ہوں اور نہ ہی یہ پوچھنے کہ تمہاری دونوں ٹانگوں پر پلاسٹر کیسے چڑھا ہوا ہے اور کب اترے گا۔ میں تم سے ایک سوال کرنے آیا ہوں یہاں۔

''چوہدری جی۔ بہت غصے میں معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی غلطی ہوگئی مجھ سے؟۔ کسی کو بیمار دیکھ کر دشمنوں کے دل بھی نرم ہو جاتے ہیں آپ تو ہمارے دوست ہیں۔

''تھا اب نہیں ہوں''۔

''مگر یہ دشمنی کیوں پیدا ہوگئی؟''

''تمہاری بیٹی ریحانہ کی وجہ سے'' چوہدری نے جواب دیا اور ملکہ بائی کے چہرے پر نفرت کے نقوش بکھر گئے۔ کچھ لمحے وہ خاموش رہی پھر بولی۔

چوہدری جی، یہاں ماحول بڑا عجیب ہوتا ہے۔ اولاد اپنے پیٹ سے بھی پیدا ہو تو اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ریحانہ تو میری اولاد بھی نہیں ہے۔ چلیں چھوڑیں آپ نے بہت سے مان توڑ دیئے ہیں۔ انسان جب بے کسی کا شکار ہوتا تو ہر تنکے کا سہارا پکڑتا ہے۔ آپ نے تو یہ کہہ کر ہمیں ہماری اوقات یاد دلا دی کہ آپ ہم سے ملنے نہیں آئے ہیں۔ ٹھیک ہے چوہدری جی، ٹھیک ہے۔ ریحانہ کی کوئی شکایت ہے۔

''شکایت کی بات کر رہی ہو۔ اس نے میری بے عزتی کی ہے اور میں تم جانتی ہو ہم عزت پر مرنے مارنے والوں میں سے ہیں۔ میں اپنی بے عزتی کا بدلا اس سے ضرور لوں گا۔ مگر اس سے پہلے پرانے تعلقات کی بناء پر تم سے اس بارے میں بات کرنا

چاہتا ہوں''۔

''حکم کرو چوہدری جی''۔

''مری میں ملی تھی مجھے اپنے کسی یار کے ساتھ''۔ چوہدری نادر نے پوری تفصیل ملکہ بائی کو بتائی۔ تو ملکہ بائی کے چہرے پر حیرت کے نقوش پھیل گئے۔

''مجھے تو کسی حرام کے پلے نے بتایا ہی نہیں۔ یہ گئی تو تھی چوہدری فخر کے ہاں۔ فخر خاں نام سنا ہوگا تم نے۔ وہاں مجرے کے لیے گئی تھی۔ فخر خاں شوقین آدمی ہیں۔ اس کا گانا پسند کرتے ہیں۔ اکثر بلاتے رہتے ہیں۔ دس بارہ دن کے لیے گئی تھی وہاں۔ کیا فخر خاں اس کے ساتھ مری میں تھے''۔

''نہیں فخر خاں کو میں جانتا ہوں''۔

''تو پھر کون تھا''۔ چوہدری نادر نے جب اس کا حلیہ بتایا تو ملکہ بائی کی آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئیں۔

''ہاں۔ میں بھی سن چکی ہوں کسی نے مجھے بتایا تھا کہ شاہ زیب جیل توڑ کر بھاگ گیا ہے''۔

''اسی کی بات کرر ہا ہوں میں تم نے ٹھیک نام لیا اس کا''۔

''چوہدری جی کل کا لونڈا آپ کے مقابلے پر آگیا''۔

''خیر میں تو لڑائی بھڑائی کا آدمی ہی نہیں ہوں۔ مگر اس نے میرے ایک خاص آدمی کو شدید زخمی کردیا ڈاگا۔ بڑا جاندار تھا مگر وہ سسرا لونڈا''۔

''ہوتا ہے چوہدری جی ہوتا ہے۔ جب کسی کی موت آتی ہے تو وہ ضرورت سے زیادہ ہی اچھلنے لگتا ہے۔ وہ لونڈا شاہ زیب بڑا سرکش ہے۔ کچھ عرصہ پہلے چوہدری شہاب الدین کی جان کو اٹکا ہوا تھا''۔

''کون چوہدری شہاب الدین۔ کیا راجہ شہاب الدین''۔

''ہاں جی وہی''۔

''قصہ کیا ہے''۔

''بس جی لمبی کہانی ہے''۔

''میں جانتا ہوں ملکہ بائی اگر ایسے چھوکرے ہمارے منہ پر تھپڑ لگا دیں۔ تو پھر ہم تو جی ایسے ہی اس دنیا میں...... مرنا ہی پڑے گا ہمیں اپنی اس بے عزتی کے بدلے میں۔ چھوڑنا نہیں چاہتا میں اس حرام زادے کو''۔

''فخر خاں سے بھی اس کی چل رہی ہے۔ سب سے زیادہ اس کی دشمنی الیاس خاں اور جبار خاں سے ہے۔ ساری کہانی سن چکی ہوں میں اس کے بارے میں۔ اس کی وجہ سے مجھے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ میری ٹانگیں اس لڑکی نے توڑیں ہیں جس کی شکایت لے کر آپ میرے پاس آئے ہیں''۔

''کون ریحانہ''

''ہاں۔ چوہدری جی اس نے مجھے اپاہج کر دیا ہے۔ اور اب رنگ رلیاں مناتی پھر رہی ہے۔ میں نے تو اسے اس لیے چھوڑ رکھا ہے کہ بدلہ لوں گی اس سے ذرا اچھی طرح''۔

''سنو ملکہ بائی۔ چھوڑوں گا تو میں بھی نہیں اسے اور اس کے بعد اس کے یار کو بھی تم ایسا کرو میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ ریحانہ کو منہ مانگے پیسے لے کر میرے حوالے کر دو۔ دو چار مہینے رکھوں گا اسے اور اسکے بعد واپس تمہارے گھر پہنچا دوں گا''۔

ملکہ بائی کی آنکھوں میں ایک دم چراغ جل اٹھے۔ پہلے بھی ایک بار چوہدری نادر نے یہ پیشکش کی تھی اور اس وقت ریحانہ نے رو رو کر ملکہ بائی سے درخواست کی تھی کہ اسے چوہدری جیسے مکروہ آدمی کے سپرد نہ کرے۔ جتنی رقم چوہدری دے رہا ہے وہ کما کر دے دے گی۔ اس نے ایسا بے شک کیا تھا لیکن اب بات دوسری تھی۔ چنانچہ ملکہ

بائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''چوہدری جی سودا کریں بات پکی کرلیں ابھی اور اسی وقت''۔

''کہانا جو مانگے گی سودے دوں گا''۔

''ٹھیک ہے چوہدری اور ایک کام آپ کو کرنا ہوگا آپ اسے خود لے جائیے گا''۔

''ٹھیک ہے اس کی تم فکر مت کرو۔لیکن اس سے پہلے میں ذرا شاہ زیب کا بندوبست کرلوں''۔

''جو آپ کا دل چاہے کریں''۔

''ٹھیک ہے ملکہ بائی اب میں کام کرنے کے بعد دوبارہ تم سے ملوں گا''۔

چوہدری نادر نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

ملکہ بائی دیر تک خالی دروازے کو دیکھتی رہی پھر اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆

زندگی میں خدشات کے سوا کچھ اور باقی نہیں رہ گیا تھا۔ایک انسان کی زندگی سے کتنے لوگ منسلک ہوتے ہیں۔ حالانکہ ہر انسان کی ایک جیسی ہی کہانی نہیں ہوتی۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو رفاقتوں کو ترستے ہیں۔انسانوں سے قریب ہونا چاہتے ہیں لیکن انہیں فاصلے ہی فاصلے ملتے ہیں۔شاہ زیب بھی اپنی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ رشتے ٹوٹ جاتے ہیں ختم ہو جاتے ہیں۔ پائیدار اور مضبوط رشتے صرف انہی سے ہوتے ہیں جو کسی کو اس دنیا میں لانے کا باعث بنتے ہیں اور اس کے بعد سب کچھ فاصلے پر چلا جاتا ہے۔ بدن کے وہ ٹکڑے جو خود اپنے بدن کا حصہ ہوتے ہیں بے شک پائیدار محبتوں کے امین ہوتے ہیں لیکن اس کے بعد سارے قصے اور

کہانیاں ہیں۔ باپ تو خیر مر ہی چکا تھا۔ ماں وہ ہستی تھی۔جس نے سارے رشتے اپنے پروں میں سنبھال رکھے تھے اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئی تو رشتوں کے ایسے بھیانک روپ سامنے آئے کہ شاہ زیب دنگ رہ گیا۔ ماں تو بے شک مر چکی تھی۔لیکن دونوں بھائیوں پر بڑا اعتماد تھا اسے۔ بھابیوں کو تو سہی طریقے سے پرکھنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ پتہ یہ چلا کہ انسان بڑا ہی بیوقوف ہوتا ہے اپنی عقل کو بیچ دیتا ہے۔ دوسروں کی عقل کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے۔نتیجہ ایک بھیانک المیے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کا وہ ہونہار طالب علم جس کے دل میں اپنے وطن کو گلزار بنانے کے منصوبے اور خواہشیں تھیں۔اب ایک مجرم بن چکا تھا۔جس کے لیے موت کی سزا سے کم اور کوئی سزا نہیں تھی۔سرکار نے شاہ زیب کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر انعام مقرر کر دیا تھا۔ایک پورا ملک اپنے ایک شہری کے پیچھے پڑ گیا تھا۔جبکہ وہ شہری بے گناہ تھا۔بس اسے گھسیٹ گھسیٹ کر ان راستوں پر لاکر ڈالا جاتا تھا جو جرم کے راستے ہوتے تھے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان جرائم میں ملوث ہوتا چلا گیا۔سب کچھ چھین لیا گیا اس سے اور اس کے بعد اس سے جینے کا حق بھی چھین لیا گیا کیا کرے انسان جینا تو تبھی چاہتے ہیں۔کسی کو زبردستی موت دی جائے تو کیا وہ اپنی زندگی کا دفاع بھی نہ کرے۔ گھر بار، زمین، آزادی اور اس کے بعد محبت سب کچھ چھین لیا گیا تھا اس سے لجیا کی یاد دل کے گوشے میں کسکتی رہتی تھی۔اور وہ اپنے آپ سے نفعی کرتا تھا۔

آہ کاش! دنیا کے ہر خوف سے بے نیاز ہو کر لجیا سے شادی کر لی ہوتی۔ جو گزرتی دیکھا جاتا۔کیا تھا زیادہ سے زیادہ وہ اس کی بیوہ کی حیثیت سے ہی زندگی گزار لیتی لیکن اسے ایک اعتماد تو مل جاتا ایک سکون تو مل جاتا اسے۔نجانے کہاں سے کہاں در بدر ہوگئی ہے۔کیسی گم ہوئی ہے نام ونشان نہیں مل رہا۔

حلیہ کافی بدل گیا تھا داڑھی خوب بڑھ آئی تھی۔ لباس بھی میلا کچیلا ہی پہنے رہتا تھا کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ قیام کے لیے فی الحال ایک ہوٹل ہی منتخب کیا تھا۔ لیکن یہ سوچ رہا تھا ہوٹلوں میں بہت زیادہ لوگوں سے واسطہ رہتا ہے۔ لاہور کے کسی کچے علاقے میں کوئی ایسی چھوٹی سی جگہ حاصل کر لی جائے ایک غریب آدمی کی حیثیت سے جہاں سر چھپایا جا سکے۔

چوہدریوں سے لڑائی بہت زیادہ بڑھ چکی تھی اور اب یوں لگتا تھا جیسے قرب و جوار میں دشمنوں کے علاوہ اور کوئی ہو ہی نا۔ ادھر نادر شاہ بھی بلاوجہ کا دشمن بن گیا تھا حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ ریحانہ سے اسے کوئی دلی لگاؤ نہیں تھا۔ بس ایک بات ضرور تھی کہ ریحانہ اس کے جلتے ہوئے دل پر سکون کا مرہم ضرور رکھ دیا کرتی تھی۔ جو لمحے اس کی رفاقت میں گزارے تھے۔ وہ محبتوں کے حامل تو نہیں تھے مگر ایک طرفہ محبت کی ٹھنڈک ضرور محسوس ہوتی رہی تھی۔ ریحانہ کی اپنائیت کا احساس دنیا کی دوری اور بے وفائی کا بدل بنا جاتا تھا۔ اور بہر حال اسے اس حد تک ریحانہ سے دلچسپی ضرور تھی کہ وہ زندہ سلامت رہے۔ اس کے علاوہ ریحانہ نے اس کی محبت میں جو کچھ کر ڈالا تھا۔ ملکہ بائی کے ساتھ اس کے بعد شاہ زیب محسوس کرتا تھا کہ ملکہ بائی جیسی عورت ریحانہ کو سکون سے نہیں رہنے دے گی۔ لیکن وہ خود بے سکون تھا۔ کیا کرتا کیا نہ کرتا۔ اپنے ہی سکون کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ نجانے کیا کیا خیالات دل میں آتے رہتے تھے۔

حیدر شاہ پر اسے مکمل اعتماد تھا کہ لجیا کے ماں باپ کو وہ آرام سے رکھے گا۔ بیچارے اس کی وجہ سے دربدر ہو گئے۔ کیا کیا کہانیاں چمٹ گئیں تھیں اس کی زندگی سے اور وہ کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی تو جنون اس قدر بڑھ جاتا کہ وہ سوچتا کہ بس ہر شخص سے نفرت کی جائے۔ صرف اپنے مفاد کو سامنے رکھ کر ہر ایک کی زندگی اور موت کا فیصلہ کیا جائے۔ نہ کسی کو قتل کرنے سے دریغ کیا جائے۔ وہ الجھ جاتا۔

آخر لوگ سوچتے کیوں نہیں ہیں۔ میں تو وہ سب کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا جو کچھ ہوا دنیا کی زیادتی کی وجہ سے ہوا۔ کیا ضرورت تھی ان لوگوں کو اس زمین پر بھٹہ بنانے کی جوان کی نہیں تھی۔ زبردستی اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ صرف اتفاق تھا۔ میں نے جان بوجھ کر کچھ بھی نہیں کیا۔ اگر میری بات کو سچ کی نگاہ سے دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ میں نے تو دنیا میں کسی کو بھی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی ادھر میرے بھائی تھے کمال ہے کمال ہے۔

اپنے بگڑے ہوئے حلیے کی وجہ سے اس بات کا اطمینان تھا کہ اسے آسانی سے پہچانا نہیں جائے گا۔ لجیا کو تلاش کرنے کے لئے لاہور میں رکا تھا۔ دل میں یہ خیال بھی تھا کہ ممکن ہے وہ لاہور میں نہ ہو۔ لجیا جیسی معصوم لڑکی زیادہ سے زیادہ کہاں جا سکتی ہے دو ہی باتیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کسی صاحب دل نے اس پر رحم کھا کر اپنے گھر میں رکھ لیا ہو کہ جوان لڑکی ہے دو وقت روٹی کھائے گی اور گھر کے تھوڑے بہت کام کر دیا کرے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہوس پرستوں کی نگاہوں میں چڑھ گئی ہو۔ اور اس وقت کہیں قیدی کی زندگی گزار رہی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بدنصیبی اسے کسی کوٹھے تک لے گئی ہو اور وہاں کسی بدکار طوائف کے مظالم کا شکار ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ٹرین میں بیٹھ گئی ہو اور کسی گمنام گوشے میں پہنچ کر بدنصیبی کی زندگی گزار رہی ہو۔

اس بھری کائنات میں کسی ایک شخص کو تلاش کر لینا کتنا مشکل کام ہے۔ یہ شاہ زیب اچھی طرح جانتا تھا۔ اخبارات کی خبروں پر اس کی گہری نگاہ رہتی تھی کہ ممکن ہے کہیں سے کوئی ایسی خبر مل جائے جس کا تعلق لجیا سے ہو۔

بہر حال ان کیفیات میں زندگی گزر رہی تھی اور اس پر بڑی اداسیاں طاری رہتی تھیں۔ دل کہیں لگتا ہی نہیں تھا۔ لاہور کی بڑی سڑکوں پر نکل جاتا میلوں پیدل چلتا رہتا۔ نگاہیں چاروں طرف بھٹکتیں کہ کہیں کسی گوشے سے لجیا کی ایک جھلک نظر آ

جائے۔ لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ قصے کہانیوں کی باتیں ہوتی ہیں۔

جمعرات کا دن تھا دل پر بڑی اداسی طاری تھی۔ رات کا وقت تھا پرانے لاہور کے ایک ایسے علاقے سے گزر رہا تھا جو لاہور کی روایتوں کا امین تھا۔ ہنستے بولتے لوگ جس کی زندہ دلی مثال بنی ہوئی تھی۔ حالات و واقعات کچھ بھی ہوں۔ نہروں میں چھلانگیں لگا کر خودکشی کی جائے یا مینار پاکستان سے کود کر جان دے دی جائے۔ بچوں کو قتل کر کے خود موت قبول کر لی جائے۔ بھوک افلاس، فاقہ کشی، بے روزگاری لیکن زندہ دلانِ لاہور ہنستے ہوئے نظر آئیں گے۔

مالشیوں کے تیل کی شیشیوں کی کھنکھناہٹ گونج رہی تھی۔ کہیں دور سے ڈھول اور ہارمونیم کی آواز آرہی تھی۔ چلتا رہا...... کسی کا مزارِ پاک تھا جہاں قوال اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے کچھ ایسی دل موہنی آواز تھی اور کچھ ایسے دل موہنے بول کہ قدم اس طرف بڑھ گئے۔ اور وہ بھی سامعین کے درمیان جا بیٹھا۔

عقیدت مند اپنی عقیدتیں نچھاور کر رہے تھے۔ صاحب مزار کو دوائیاں دے رہے تھے کہ ان کی مشکل حل ہو جائے۔ چند افراد کو اس نے اپنے قریب دیکھا وہ کسی کو لے کر آئے تھے اور بڑے مضطرب نظر آتے تھے۔ اچھے خاصے صاحب حیثیت لوگ معلوم ہوتے تھے۔ جس شخص کو وہ لے کر آئے تھے وہ ایک نوجوان تھا۔ عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ بائیس تیئس سال کا ہوگا۔ لانے والوں میں سے ایک عورت بھی تھی۔ لمبے قد و قامت کی مالک۔ حلیے سے ہی پتہ چلتا تھا کہ کوئی بڑی بیگم ہے۔

شاہ زیب کی نگاہیں اس نوجوان کی جانب اٹھ گئیں۔ اس کی حالت بہت بری ہو رہی تھی۔ سارا جسم مروڑا جا رہا تھا اور اس کے گلے سے خوفناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کوئی دم میں چل بسے گا۔ اس کی نوجوان خوش شکلی دیکھ کر شاہ زیب کو اس کی حالت پر ترس آنے لگا۔ وہ لوگ اس کے بالکل قریب تھے۔ عورت کے

منہ سے مدھم مدھم آوازیں نکل رہی تھیں۔ جو رونے کی آوازیں تھیں۔ وہ دعائیں مانگ رہی تھی اور روتی بھی جا رہی تھی۔ ادھر نوجوان ہاتھ ہاتھ بھر اونچا اچھل رہا تھا اور اسکے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اس کا چہرہ بگڑتا جا رہا تھا۔ عورت کی دکھ بھری آواز نکلی۔

''بچا لے ولی...... میرے بیٹے کو بچا لے...... ولی! میرے بیٹے کو بچا لے بچا لے ولی......!''۔ لوگ بہت کچھ کر رہے تھے لیکن اس کی حالت لحظہ بہ لحظہ بگڑتی جا رہی تھی۔ کسی نے ایک گلاس پانی بھر کر اس کے منہ سے لگایا۔ لیکن وہ پانی اس کے حلق میں اترنے کے بجائے دائیں بائیں بہہ گیا۔ اس کے بدن کا تشنج بڑھتا جا رہا تھا۔ ساتھ میں جو مرد تھا اس کی یہ حالت دیکھ کر بلک بلک کر رونے لگا۔

شاہ زیب کے دل میں بھی انسانی ہمدردی جاگی۔ وہ چند قدم آگے بڑھا اور اس نے نوجوان کے اچھلتے ہوئے بدن پر ہاتھ رکھ کر اسے دبایا۔ مسئلہ کچھ بھی نہیں تھا وہ اچھل اچھل کر گر رہا تھا تو شاہ زیب نے سوچا تھا کہ اسے کہیں چوٹ نہ لگ جائے۔ نوجوان شاہ زیب کے چھوتے ہی ہاتھ بھر اچھلا اور زمین پر ذبح ہوتے بکرے کی طرح لوٹنے لگا۔ شاہ زیب نے اسے قبضے میں کیا اور زمین پر لٹا لیا۔

رفتہ رفتہ اس کے اچھلنے کی رفتار کم ہونے لگی۔ شاہ زیب آہستہ آہستہ اس کے مڑے ہوئے ہاتھوں پر اپنا داہناں ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اور نوجوان کے پورے وجود میں سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا نچلا جبڑا امڑا ہوا تھا اور زبان اس کے دانتوں تلے دبی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے منہ سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ شاہ زیب نے بڑی احتیاط سے اس کے مڑے ہوئے جبڑے پر ہاتھ پھیر کر اسے سیدھا کیا۔ اور ذرا سا منہ کھولا تو اس کی زبان اندر ہوگئی۔ اس کا جبڑا بغیر کسی دباؤ کے آپ ہی آپ اپنی اصلی حالت پر آنے لگا اور اس کا اکڑا ہوا بدن ڈھیلا پڑنے لگا۔

ایک دم سے تمام لوگ حیران رہ گئے۔

نجانے کب سے نوجوان کی یہ حالت تھی۔ شاہ زیب کو وہ لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ اس وقت اتفاق کی بات یہ تھی کہ شاہ زیب کا حلیہ بھی کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔ بڑھی ہوئی داڑھی بکھرے ہوئے بال بدن پر کالے رنگ کا کھیس اس سے شاہ زیب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ نوجوان اب بالکل ہی پرسکون ہو گیا تھا۔ عورت ایک دم سے چونکی آگے بڑھی اور اس نے شاہ زیب کے پاؤں پکڑ لیے۔

''میرے پیر، میرے مرشد، میرے سائیں، آپ...... آپ اللہ والے ہو جی...... آپ اللہ والے ہو...... دعا کرو میرے بیٹے کے لئے، ٹھیک کر دو میرے بیٹے کو، بڑا کام کیا آپ نے شاہ جی! بڑا کام کیا آپ نے''۔

''نہیں بی بی...... نہیں نہیں میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ تو بس اللہ کا کرم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے سکون دیا ہے''۔

''نہیں پیر و مرشد! آپ بڑے کرنی والے ہو جی...... میرے بچے کو آپ کے ہاتھ سے شفا ہو گئی''۔ مرد جو بلک بلک کر رو رہا تھا مودب لہجے میں بولا اور اس نے شاہ زیب کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

''اللہ تعالیٰ آپ کے بچے کو شفا دے...... انشاء اللہ تعالیٰ اسے جو کوئی بھی بیماری ہے یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر خدا کیلئے مجھے گناہ گار نہ کریں۔ میں تو خود ایک''۔

''بڑی کرنی والے ہو جی آپ...... بڑی کرنی والے ہو۔ آپ کا احسان ہم زندگی بھر نہیں بھول سکتے''۔

''مگر اسے ہوا کیا ہے''۔

''شاہ جی! تین سال ہو گئے اسے۔ تین سال پہلے اسے ایسا ہی دورہ پڑا تھا۔ اس وقت اس کی حالت اتنی خراب نہیں تھی۔ ہم نے ہر طرح سے علاج کر لیا اس کا شاہ جی! ہم نے ہر طرح سے علاج کرا لیا۔ میرا نام حاجی کریم ہے۔ شاہ جی...... شاہ جی!

جان دینے کو دل چاہتا ہے آپ پر...... آپ نے میرا بچہ ٹھیک کر دیا...... شاہ جی دعا کر دو میرے لیے...... کچھ دم درود کر دو کہ پھر کبھی اسے کوئی ایسی تکلیف نہ ہو''۔

''بھائی! پہلے بھی کہہ چکا ہوں آپ سے کہ جو کچھ ہوا ہے اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ میں نے تو بس از راہ ہمدردی اس کے بدن پر ہاتھ رکھ دیا تھا کہ یہ اونچا ہو ہو کر گر رہا تھا اور بس اتنی سی بات تھی اور کچھ نہیں۔ آپ حاجی ہیں روزۂ رسول کی زیارت کر آئے ہیں۔ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ تو مجھ سے کہیں برتر ہیں''۔

''یہی تو شان ہوتی ہے اللہ والوں کی۔ یہی شان ہوتی ہے''۔ پیچھے سے ایک آواز آئی۔ ایک چالاک صورت آدمی تھا۔ پتہ نہیں ان لوگوں کے ساتھ تھا یا الگ۔

بہر حال یہ ڈرامہ یہاں ہونے لگا۔ شاہ زیب عجیب سے انداز میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکا ہوش میں آ گیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں تو کسی نے کہا۔

''پانی پلاؤ...... اسے پانی پلاؤ''۔ جلدی سے پانی کا گلاس لڑکے کے ہونٹوں سے لگا دیا گیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے تین گلاس پانی پی لیا۔ اس نے چاروں طرف حیرت سے دیکھا اور پھر بولا۔

''مجھے کیا ہو گیا تھا''۔

''جو کچھ بھی ہو گیا تھا بیٹے! اللہ نے بڑا کرم کیا ہے، دیکھ...... یہ تیرے مرشد ہیں ان کے ہاتھوں میں اللہ نے تیری شفا رکھی تھی۔ پاؤں پکڑ لے ان کے اللہ کرم کرے گا۔ سر نیچے کر اپنا چوم لے ان کے پاؤں''۔ لڑکا حیرانی سے کبھی شاہ زیب کو اور کبھی اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''ابا جی! میں گھر جانا چاہتا ہوں''۔

''چلتے ہیں بیٹا!''

''یہ آوازیں کیسی آ رہی ہیں۔ میں کہاں ہوں''۔

''مزار شریف ہے بیٹا! قوالی ہو رہی ہے''۔

''آپ مجھے گھر لے چلیں، میں...... میں......'' اس نے کہا اور وہ لوگ تیار ہو گئے۔ حاجی کریم نے شاہ زیب سے پوچھا۔

''مرشد! کیا حکم ہے گھر لے جائیں اسے''۔

''آپ کی مرضی ہے البتہ میں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ میں نہ پیر ہوں اور نہ مرشد......اللہ کا جو حکم ہوا اس نے کیا اب آپ جانیے''۔

وہ لوگ شاہ زیب کے سامنے سراپا اجز و نیاز بنے کھڑے تھے اور شاہ زیب محسوس کر رہا تھا کہ اس وقت وہ ان سے جو کچھ بھی کہے۔ وہ مان لیں گے۔ بہر حال وہ لوگ بہت زیادہ محبت کا اظہار کرتے رہے۔ پھر حاجی کریم نے شاہ زیب کو اپنے گھر کا پتہ بتاتے ہوئے کہا۔

''مرشد! بچے کو گھر لے جا رہا ہوں۔ لیکن دل آپ میں اٹکا رہے گا آپ اگر ہمیں تھوڑی سی خدمت کا موقع دیتے۔ تو ہم سمجھتے کہ ہمیں زندگی میں سب کچھ مل گیا ہے۔ پھر بھی یہ پتہ رکھ لیجیے مرشد......! ہماری طرف آئیں، ہمیں عزت دیجیے۔ ہم اس کا انتظار کریں گے اور اس کے بعد وہ لوگ واپسی کی تیاریاں کرنے لگے۔

ایک بہت ہی قیمتی کار تھوڑے فاصلے پر کھڑی تھی۔ جس میں لڑکے کو بٹھایا گیا اور اس کے بعد وہ لوگ اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ان کی نگاہیں اب بھی شاہ زیب کی جانب ہی اٹھی ہوئی تھیں۔

دفعتاً ہی عقب سے وہ شخص جو شاید ان میں سے نہیں تھا لیکن بڑی شاطری شکل کا آدمی تھا آگے آیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر شاہ زیب کے سامنے جھک گیا اس نے شاہ زیب کا ہاتھ پکڑا ہونٹوں سے چوما آنکھوں سے لگایا اور بولا۔

''شاہ جی! میرا نام گلزار ہے۔ شاہ جی ان لوگوں کو تو آپ نے ٹال دیا لیکن گلزار آپ کو نہیں چھوڑے گا۔ جو زندہ کرامت دیکھی ہے شاہ جی! اس کے بعد تو دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو آپ کوئی پتھر اٹھا لو اور میرے سر پر مار دو یا پھر مجھے عزت بخشو''۔

''ارے بھائی کس مصیبت میں گرفتار ہو گیا میں، تم کیا چاہتے ہو''۔

''شاہ جی! آپ کو میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ ان لوگوں کو تو آپ نے ٹال دیا۔ میں آپ جیسے بزرگوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ نہیں جانتے آپ میرے لیے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ شاہ جی! مان لیں میری بات آپ کو اللہ کا واسطہ''۔

''مگر تم چاہتے کیا ہو بھائی...... مجھے بتا دو''۔ شاہ زیب عجیب سے جھگڑے میں گرفتار ہو گیا تھا۔

''بس شاہ جی! آپ میرے ساتھ چلو...... آ جاؤ''۔ وہ اتنی خوشامد کرتا رہا کہ شاہ زیب پریشان ہو گیا وہ سوچ رہا تھا کیا کرے کیا نہ کرے۔

دفعتاً ہی اس کے دل میں خیال آیا کہ اس کی تنہائی اسے دیوانہ کیے ہوئے ہے۔ ہوٹل کی زندگی سے ویسے ہی عاجز آیا ہوا تھا۔ لاہور میں اگر کچھ دن کے لیے سر چھپانے کا ٹھکانا مل جائے تو زیادہ سکون کے ساتھ لجیا کو تلاش کر سکتا ہے۔ دیکھیں تو سہی یہ شخص کیا چیز ہے؟ ہو سکتا ہے کام کا بندہ ہی ثابت ہو۔

بلا وجہ کا عقیدت مند بن گیا تھا۔ حالانکہ جو کچھ ہوا تھا اس میں شاہ زیب کا ذرا برابر ہاتھ نہیں تھا۔ لیکن کبھی کبھی ایسے اتفاقات ہو جاتے ہیں۔ حاجی کریم بخش کوئی بہت ہی زیادہ صاحب حیثیت شخص معلوم ہوتا تھا۔ اپنا پتہ دے گیا تھا۔ شاہ زیب نے سوچا کہ چلو کوئی بات نہیں ہے۔ یہ تو خیر بڑا گناہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو بزرگ تسلیم کرے اور ایک گھرانے کو دھوکہ دے۔ لیکن بہر حال ویسے اگر کوئی مشکل در پیش ہو تو حاجی کریم

بخش سے ملا جاسکتا ہے۔ پہلے ذرا ان گلزار صاحب کا جائزہ لے لیا جائے جو بلاوجہ جان
کو اٹک گئے تھے۔

بہرحال گلزار نے شاہ زیب کو اپنے ساتھ چلنے پر تیار کرلیا اور شاہ زیب اس
کے ساتھ چل پڑا۔ اس نے سوچا کہ اس کا گھر عارضی پناہ گاہ ثابت ہوسکتا ہے۔ اپنی
بدنصیب زندگی کے لئے کچھ لمحات حاصل کر لیے جائیں۔ بہرحال اس شخص کے پاس
بھی کار موجود تھی کار کے قریب پہنچ کر اس نے دروازہ کھولا اور بڑے احترام کے انداز
میں شاہ زیب کو اندر بٹھایا پھر بولا۔

''شاہ جی! اپنی خوش نصیبی پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے۔ میرے گھر میں آپ
کے قدم پہنچیں گے تو برکتیں ہی برکتیں ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی رحمت میں لے
لیا ہے''۔ شاہ زیب آنکھیں بند کرکر کے سر جھٹک رہا تھا۔ ان لوگوں کی احمقانہ عقیدت
اسے دل ہی دل میں ہنسنے پر مجبور کررہی تھی اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے بنالو تم مجھے اپنا پیر اور ولی...... بعد میں خود مجھے دھکے دے کر نکالو
گے اپنے گھر سے اور اگر کہیں میری یہ بدنصیبی تم پر مسلط ہوگئی تو بیٹا عیش کرو گے زندگی
بھر۔ تمہیں کیا معلوم کہ اس وقت میری گرفتاری پر دس لاکھ روپے کا انعام ہے۔ ہاں تم
اس انداز میں اپنے آپ کو خوش نصیب ضرور کہہ سکتے ہو کہ مجھے پولیس کے حوالے کرو
اور دس لاکھ روپے کا انعام حاصل کرو۔ اصل میں بات وہی تھی کسی قیمت پر کسی اجنبی گھر
میں نہیں جاتا۔ لیکن ان دنوں جس ذہنی بحران سے گزر رہا تھا وہ اتنا ہی اذیب ناک تھا
کہ شاہ زیب اپنے آپ کو کہیں ضم کردینا چاہتا تھا۔

بہرحال کار کا سفر ختم ہوا۔ مغل پورے کے ایک بھرے پرے علاقے میں
ایک مکان کے سامنے گاڑی رک گئی اور گلزار نے بڑے احترام کے ساتھ شاہ زیب کو
نیچے اتارا اور اندر لے گیا۔ باہر سے جگہ چھوٹی تھی لیکن اندر سے بے حد وسیع ایک بڑے

سے مہمان خانے میں پہنچ کر گلزار نے نیازمندی سے کہا۔

''شاہ جی! یہ گھر آپ کے قابل تو نہیں ہے پر غریب کی کٹیا میں یہ سمجھ کر قیام
کرلیجئے کہ آپ احسان کررہے ہیں مجھ پر''۔

''نہیں بھائی...... یہ تو بڑی اچھی جگہ ہے۔ تم اسے غریب کی کٹیا کہہ رہے ہو''
شاہ زیب نے کہا اور بستر کی جانب بڑھ گیا جو بڑا پرتکلف اور آرام دہ تھا۔ شاہ زیب
نے کمرے کا جائزہ لیا اور کہنے لگا۔

''اب یہ بتایئے شاہ جی کھانے میں کیا پسند کریں گے''۔

''اس وقت تو کچھ نہیں کھائیں گے بعد میں دیکھا جائے گا ویسے ہمیں بڑی
شرمندگی ہے کہ ہم تمہیں تکلیف دے رہے ہیں''۔

''نہیں شاہ جی! آپ تکلیف کی بات کرتے ہو جی! میں کہتا ہوں میری تقدیر
کے ستارے روشن ہوگئے۔ شاہ جی! یہ پورا گھر آپ کا خدمت گزار ہے''۔

''آپ یہ تمہاری سوچ ہے میں کیا کہہ سکتا ہوں''۔ لیکن اتنا میں جانتا ہوں
گلزار کہ تھوڑا وقت گزرنے کے بعد تمہیں عقل آجائے گی اور ایک بات اور کہے دیتا
ہوں۔ میں وہاں بھی یہی الفاظ کہہ رہا تھا اور اب بھی یہی الفاظ ادا کررہا ہوں کہ میں
کوئی پیر، فقیر یا درویش نہیں ہوں۔ اللہ کا ایک گناہ گار بندہ ہوں اور جو کچھ ہوا ہے اور
جس نے تمہیں متاثر کیا ہے۔ وہ صرف اللہ کی مرضی سے ہوا ہے''۔ جواب میں وہ ہنسنے
لگا پھر بولا۔

''چائے بنوا کر لاتا ہوں شاہ جی! پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے''۔ وہ باہر چلا گیا
تو شاہ زیب اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر دیکھنے لگا پھر بولا۔

''واہ میرے مالک! کیا ہے تیری قدرت۔ ایک طرف اپنے ہاتھوں سے کئی
گھروں کے چراغ گل ہوگئے۔ اور دوسری طرف ان ہاتھوں کو باکرامت بنا دیا گیا۔

میں کیا اور میری اوقات کیا۔ اب یہ آدمی اندھی عقیدت میں مجھے یہاں لے آیا ہے۔ یہ تو بڑا مشکل کام ہے کہ میں اسے مسلسل دھوکہ دیتا رہوں۔ بڑی شرم آئے گی مجھے اس انداز میں اسے دھوکہ دیتے ہوئے۔ اور پھر کہیں میری وجہ سے وہ کسی مصیبت میں نہ پڑ جائے۔

حالانکہ شاہ زیب کو یہاں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ایک تھوڑی سی تبدیلی آئی تھی۔ زندگی میں بہرحال شاہ زیب انتظار کرتا رہا۔ سوچتا رہا۔ گلزار واپس آیا تو اس کے ساتھ تین عورتیں تھیں ایک چٹک پٹک سی عمر رسیدہ عورت جس نے لباس بھی بڑا بھڑک دار پہنا ہوا تھا۔ عمر اچھی خاصی تھی اس کی اور دو لڑکیاں جو اچھی شکل وصورت کی مالک تھیں اور تقریباً ہم شکل ہی نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک چائے کے برتن سنبھالے ہوئے تھی۔ دوسری کے ہاتھ میں دو پلیٹیں تھیں جن میں پیسٹری اور بسکٹ رکھے ہوئے تھے۔ سامنے رکھی چھوٹی سی ٹیبل پر یہ چیزیں سجا دی گئیں۔ شاہ زیب نے ایک نگاہ میں محسوس کر لیا تھا کہ دونوں لڑکیاں اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔ گلزار نے کہا۔

''شاہ جی! یہ دونوں میری بیٹیاں ہیں مہرو اور خیرو۔ ایک نام مہروالنساء اور دوسری کا خیروالنساء...... ہم پیار سے انہیں مہرو اور خیرو کہتے ہیں۔ بس شاہ جی! یہ میری گھر والی ہے زندگی کی یہی کائنات ہے۔ دونوں آپ کو سلام کرنے آئی ہیں۔ ارے کھڑی دیکھ کیا رہی ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ کچھ کھاتا ہے۔ کچھ کمانا ہے تو شاہ جی کے پیر دباؤ''۔
شاہ زیب جلدی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔
''نہیں میں پیر نہیں دبواتا''۔
''تھوڑی خدمت کرنے دیں جی! تقدیر بن جائے گی سسریوں کی۔ پتہ نہیں کیا لکھا ہے تقدیر میں بس یہی بوجھ ہے ہمارے اوپر شاہ جی! ورنہ اللہ کا دیا سب کچھ

ہے۔ یہ گھر بھی اپنا ہی ہے باپ دادا کا چھوڑا ہوا ہے۔ یہ نہ ہوتا شاہ جی! تو پتہ نہیں کہاں ہم گندی نالیوں میں مارے مارے پھر رہے ہوتے۔ ٹھیک ہے اب تم لوگ جاؤ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا اگر زندگی میں کچھ لینا ہے تو شاہ جی کی خدمت کر لینا کیا سمجھیں''۔ جب وہ چلیں گئیں تو شاہ زیب نے چائے کی پیالی اٹھالی اور بولا۔
''دیکھو...... اتنا تکلف مت کر، اتنا آگے مت بڑھو کہ پھر پیچھے ہٹتے ہوئے تمہیں دکھ ہو''۔
''شاہ جی! یہ باتیں کر کے آپ اپنی محبت اور بڑھا رہے ہیں ہمارے دل میں ایک بات آپ سن لیں جی۔ ہماری بری عادت ہے یا اچھی یہ نہیں کہہ سکتے۔ جسے ایک بار پیار کر لیتے ہیں پھر شاہ جی زندگی بھر اس کا ساتھ نہیں چھوڑتے''۔
''تم کرتے کیا ہو''۔
''بہت دیر کے بعد آپ نے یہ سوال کیا سرکار''۔ گلزار نے ہاتھ جوڑ دیئے پھر بولا۔
''گھر کے سامنے آپ نے دیکھا نہیں ہوگا رات کا وقت ہے۔ ہمارا آستانہ ہے بس وہیں بیٹھے ہیں گیارہ بجے سے لے کر شام چار بجے تک۔ دکھ درد کے مارے ہوئے اپنے درد کی دوا لینے آتے ہیں۔ گنڈے تعویز دیتے ہیں دم کر دیتے ہیں ان پر اللہ کی مہربانی ہو جاتی تو لوگ صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ آپ یقین کرو شاہ جی! کسی سے کچھ مانگتے نہیں ہیں۔ جو خوشی سے دے جاتا ہے وہ لے لیتے ہیں۔ یہی جھاڑ پھونک کا کاروبار ہے اپنا۔ چلئے، وظیفے کر کے گزارہ کر رہے ہیں۔ شاہ جی کیا کریں؟''
شاہ زیب حیران رہ گیا تھا اب اسے یاد آ رہا تھا۔ کہ گلزار نے اس کی اتنی خاطر مدارت کیوں کی ہے۔ شاہ زیب دل ہی دل میں ہنسنے لگا پھر بولا۔
''تو بھائی مجھے یہاں کیوں لے آئے ہو''۔

''شاہ جی دل کی بات کہہ دیں برا تو نہیں مانیں گے''۔

''کہو۔ کیا بات ہے''۔

''آپ نے خود کرامت دکھائی ہے۔ وہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ اس لڑکے کو ہم نے دیکھا تھا۔ بری حالت تھی بے چارے کی۔ مگر لگ رہا ہے اب کبھی وہ بیمار نہیں پڑے گا۔ بس اللہ کی دین اسی کو کہتے ہیں جی! مگر شاہ جی! ہم اس سے کہیں زیادہ بیمار ہیں ہماری مدد کر دو''۔

''بیمار ہو تم''۔ شاہ زیب نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں شاہ جی''۔

''کیا بیماری ہے تمہیں''۔

''حرف پریشانی کی بیماری ہے۔ آپ کو بالکل سچ سچ بتائیں گے۔ ہم کوئی علم نہیں جانتے کوئی جادو نہیں ہے ہمارے پاس۔ بس اللہ کا نام لے کر کسی کو کچھ دے دیتے ہیں اور اللہ سے گڑگڑا گڑگڑا کر معافی مانگتے ہیں۔ کہ مالک عزت رکھ لے۔ اپنی بھی روٹی چلتی رہے۔ شاہ جی! ریلوے ورکشاپ میں کام کرتے تھے۔ بیوی بھی تھی بچے بھی تھے۔ یہی دونوں بیٹیاں تھیں۔ تھوڑی سی تنخواہ ملتی تھی۔ ورکشاپ کے بوائلر پر کام کرتے تھے۔ گرمی بدن کو کھا رہی تھی اور کسی قابل نہیں تھے۔ مرے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دن کھانسی کے ساتھ خون آیا۔ ڈاکٹر کو دکھایا جی تو اس نے بتایا جی کہ ٹی بی شروع ہو گئی ہے۔ گھر والی نے تو زمین آسمان ایک کر دیئے۔ رو رو کر زندگی دینے پر تل گئی۔ بچیاں نگاہوں کے سامنے تھیں کوئی بھی نہیں تھا جی ہمارا۔ بڑے پریشان ہو گئے۔ سوچتے رہے کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔ نوکری چھوڑ دی کیونکہ ایک بار ایک آفیسر کے سامنے کھانسی کے ساتھ خون آ گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی ریٹائرمنٹ دے دیا۔ تھوڑے سے پیسے ملے تو جی یہ سامنے والی جگہ خرید لی۔ اور یہاں آستانہ کھول کر بیٹھ

گئے۔ بس آپ خود باہر نکل کر دیکھ لو شاہ جی! دنیا کے کام ایسے ہی چل رہے ہیں ہر شخص ایک دوسرے کو دھوکہ دے رہا ہے۔ شاہ جی! ہم تو پھر بھی اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلا لیتے ہیں کہ مالک! دو دو جوان بیٹیوں کا بوجھ سر پر ہے یہ اپنے گھر کی ہو جائیں تو وعدہ کرتے ہیں تجھ سے کہ دھندہ چھوڑ دیں گے۔ گھر بار بیچ باچ کر کوئی چھوٹی موٹی دوکان کر لیں گے۔ کسی دوسرے محلے میں جا کر جہاں لوگ ہمیں پہچانتے نہ ہوں۔ اور اس وقت تک کی پریشانی ہے شاہ جی! آپ کو اللہ کا واسطہ جی۔ ہماری مدد کرو ہمیں کچھ بخش دو۔ کوئی ایسا تعویز گنڈا کہ ہمارا بھی کاروبار چلتا رہے۔ لوگوں کو ہمارے ہاتھوں سے شفا ہو گی تو شاہ جی ہمارے بھی وارے نیارے ہو جائیں گے''۔

شاہ زیب نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا داستان تو اس بندے کی عجیب سی تھی۔ لیکن جس سے وہ مانگ رہا تھا وہ تو خود ایک بھکاری تھا۔

بہر حال شاہ زیب خاموش ہو گیا۔ پھر کافی دیر تک گلزار بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شاہ زیب اسکے ساتھ آستانے میں بیٹھے لوگ آئیں جائیں اور وہ ان کا روحانی علاج کرے اسکے جانے کے بعد شاہ زیب بہت دیر تک بستر پر لیٹا رہا۔

آخر کار اس نے یہی فیصلہ کیا کہ گلزار کے ساتھ تعاون کرے۔ زیادہ لوگوں کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا وہ لیکن تھوڑے دن تک اگر گلزار کے ساتھ وقت گزر جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ہوٹلوں کی زندگی بے مقصد ہی ہے۔

بہر حال چونکہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ کوئی منزل نہیں تھی۔ کوئی ایسا ٹھکانہ نہیں تھا جسے زندگی کا محور بنا کر اس کی طرف سفر کا آغاز کیا جائے۔ ہر طرف دشمن ہی دشمن بکھرے ہوئے تھے۔ اب تو کسی کو بھی دوست نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک آرزو، ایک کسک، ایک تکلیف سینے پر تھی۔ بس لجیا کا خیال۔ اگر لجیا مل جائے تو درحقیقت زندگی سے دلچسپی محسوس ہو۔ سب سے چھپ چھپا کر کوئی ایسا گوشہ مل جائے جہاں کوئی کسی کو تلاش

نہ کرسکے۔ بار بار کراچی کا خیال دل میں آتا تھا جہاں پر مشکل کا حل موجود تھا اور جہاں پناہ کے لئے بہت سے گوشے موجود تھے۔ رات کے نجانے کون سے حصے میں یہ تمام باتیں سوچتے سوچتے نیند آ گئی۔ آخری فیصلہ یہی کیا تھا کہ گلزار کے ساتھ کچھ وقت گزار لیا جائے اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ چوہدری کی ہنگامہ آرائی بھی سرد پڑ جائے گی۔ جب وہ اسے تلاش نہیں کر پائیں گے تو خاموش ہو کر بیٹھ جائیں گے۔ بس اس خیال نے دل میں بے ایمانی پیدا کر دی تھی۔ اور اس نے سوچا تھا کہ کچھ دن کے لئے گلزار کے گھر کو اپنی پناہ گاہ بنا لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ اگر دل نے سرکشی کی اور دماغ نے بغاوت کی تو پھر جیسا بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔

دوسرے دن گلزار پوری پوری نیازمندی کے ساتھ موجود تھا۔ شاہ زیب اس کے دل کی بات تو سمجھ چکا تھا۔ مگر وہی ضمیر کا معاملہ تھا۔ کچھ چوٹیں ضمیر کے ذریعے پڑ رہی تھیں کہ انسانوں کو دھوکہ دینا ایک مشکل کام ہے۔ لیکن بہر حال لوگ تو نجانے کیا کیا کر بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ یہاں خاموشی اختیار کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ گلزار نے بہت عمدہ ناشتے کا بندوبست کیا تھا تو شاہ زیب نے کہا۔

''گلزار تمہاری محبت کا میں صلہ نہیں دے سکتا۔ بس ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں تم سے۔ وہ یہ یہاں جتنے دن بھی آب و دانہ ہے۔ تم میرے لیے کھانے پینے کا کوئی اہتمام نہ کیا کرو۔ روکھی سوکھی کھا کر ہی زندگی گزارنا مجھے پسند ہے''۔

''میں جانتا ہوں مرشد، آپ جیسے اللہ والے دنیا کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے لیکن ہمارے بھی دل میں کچھ باتیں ہیں۔ خدمت کر کے خوشی ہوتی ہے مرشد! اور سچی بات یہ ہے کہ آپ کو بتا چکے ہیں۔ بچیوں سے ملا دیا ہے آپ کو اس دور میں لوگوں کے منہ لالچ سے کھلے ہوئے ہیں۔ ہر ایک بیٹی کے ساتھ ساتھ اس کا عمر بھر کا خرچہ بھی مانگتا ہے۔ مرشد...... ان بیٹیوں کے سوا ہماری زندگی میں اور کچھ نہیں ہے کچھ بخش دیں ہمیں

بھی مرشد کچھ بخش دیں''۔

''او یار کمال کرتا ہے۔ میں کیا بخش دوں تجھے بھائی۔ بلاوجہ بخش دیں، بخش دیں، بعد میں کہے گا کہ سالا بہروپیا تھا دھوکہ دے کر چلا گیا''۔

''گردن کٹ جائے گی مرشد! ایسی کوئی بات نہیں کہیں گے''۔ بہر حال آپ آرام کرو جی۔ ہم تھوڑی دیر کے بعد آستانے چلے جائیں گے۔ آپ کا دل چاہے تو ادھر آ جائیے دیکھ لیجئے۔ ادھر ہمارا کاروبار بھی کیسا ہے''۔

ناشتے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد شاہ زیب تو آرام گاہ میں آرام کرتا رہا۔ گلزار چلا گیا تھا۔ اس وقت باہر نکلنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ طبیعت پر ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ صبح کا ناشتہ بھی ذرا بھاری ہی تھا۔ اس لیے بدن پر کھولت سی طاری ہو گئی تھی۔ پھر دوپہر کا کھانا بھی اچھا خاصا بھاری تھا۔ مہرو کھانا لے کر آئی تھی۔ شوخ، شریر، الہڑ سی لڑکی۔ جوانی کی دین سے لدی ہوئی۔ آنکھوں کے خمار میں ڈوبی ہوئی۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ سے سجی ہوئی۔ کھانا رکھا۔ گہری نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا اور واپس مڑی تو شاہ زیب نے کہا۔

''میں اکیلا ہی کھانا کھاؤں گا کیا......؟'' وہ رک گئی۔ ٹھٹکی اور دو قدم آگے بڑھ گئی۔ پھر بولی۔

''ہم بیٹھ جائیں''۔

''نہیں......'' شاہ زیب گھبرا کر بولا۔ مہرو کے بدن کی خوشبو دماغ کو چڑھ رہی تھی۔ سوندھی سوندھی سی جیسے کچی مٹی کا برتن ہو۔ وہ اپنے ذہن کو خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''تو پھر......'' مہرو کا سوال عجیب سا تھا۔

''نہیں میرا مطلب ہے گلزار کھانے پر نہیں آتے''۔

''نہیں جی۔ دوپہر کا کھانا وہ ادھر ہی کھاتے ہیں مریدوں کے ساتھ''۔

''مریدوں کے ساتھ''۔

''ہاں جی۔ بڑے مرید ہیں ان کے، وہ خود ہی دوپہر کا کھانا لے کر آتے ہیں اور ابا ادھر ہی کھانا کھاتے ہیں''۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ''۔ شاہ زیب نے کہا اور مہر پر جیسے اوس سی پڑ گئی۔ وہ کولہے مٹکاتی ہوئی واپس مڑی۔ دروازے پر رک کر شاہ زیب کو دیکھا پھر باہر نکل گئی۔ شاہ زیب کھانے میں مصروف ہوگیا۔

بہرحال آج کا دن آرام کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ کل باہر نکلے گا۔ یہاں آرام کرنے کے لیے آیا تھا۔ اصل کام لجیا کی تلاش تھا۔ دیکھیں لجیا کہاں ملتی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے اور لجیا کے راستے اب ہمیشہ کے لئے لگ ہو گئے ہوں۔ اگر ایسا ہو گیا تو درحقیقت یہ زندگی کا دوسرا بڑا المیہ ہوگیا۔ کھانا کھانے کے بعد آرام کر رہا تھا کہ اچانک مہرو اور خیر والنساء اندر آگئیں۔ دونوں اس کے بستر کے قریب پہنچ گئیں تھیں۔ وہ آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا۔ لیکن دونوں لڑکیوں کی اس طرح آمد سے چونک سا پڑا اور جلدی سے سنبھل کر بولا۔

''ہاں بولو۔ کیا بات ہے''۔

''نہیں جی۔ کوئی بات نہیں ہے''۔

''پھر یہاں کیا کر رہی ہو''۔

''وہ جی ابا نے کہا تھا کہ آپ کی خدمت سے ہماری تقدیریں کھل جائیں گی۔ لائیے ہم آپ کے پاؤں دبا دیں''۔

''ارے بابا کیوں میرے پیروں نے کیا قصور کیا ہے تمہارا''۔

''نہیں جی۔ آپ تکلیف نہ کرو۔ آپ کی خدمت سے ہماری تقدیریں کھل

گئیں تو ہمارے بھی وارے نیارے ہو جائیں گے''۔ خیرو کچھ زیادہ چٹ پٹ تھی۔ اس نے شاہ زیب کا پاؤں پکڑ کر سیدھا کرلیا۔ شاہ زیب اس سے پاؤں چھڑانے لگا۔ مگر اس نے مضبوطی سے شاہ زیب کا پاؤں پکڑ لیا تھا۔ دوسرا پاؤں مہرو نے پکڑ لیا تو شاہ زیب گھبرا کر بولا۔

''دیکھو لڑکیو! بدتمیزی مت کرو۔ جب میں تم سے پاؤں نہیں دبوانا چاہتا تو تم ایسا کیوں کر رہی ہو''۔ خیرو شاہ زیب کا پاؤں دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

''مہرو! ذرا دیکھو شاہ جی کے پاؤں کتنے گورے ہیں۔ کیسے گول گول گدگدے گدگدے سے ہیں''۔

''جاؤ بابا جاؤ۔ میں منع کر رہا ہوں تم سے''۔

''دبوالو نا''۔ مہر نے ناز بھرے انداز میں کہا۔

''نہیں میں پاؤں واؤں نہیں دبواتا تم لوگ جاؤ''۔ شاہ زیب نے اس بار نرم لہجے میں کہا اور دونوں اداس اداس سی باہر نکل گئیں۔ شاہ زیب پریشان ہوگیا۔

پھر شام کو چار بجے کے قریب وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ کالے رنگ کا موٹا کھیس اس کے پاس موجود تھا۔ اس نے کھیس اوڑھا اور گھر سے باہر نکل آیا۔ سامنے ہی آستانے کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ بابا گلزار خاندانی درویش اور اس کے بعد بابا گلزار صفات کے قصیدے لکھے ہوئے تھے۔ بند دروازہ تھا غالباً اندر ایئر کنڈیشنر لگا ہوا تھا۔ شاہ زیب دلچسپی سے آگے بڑھ گیا۔ ایک بڑا سا ہال تھا جس میں چند افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہ زیب نے سامنے دیکھا ایک آدمی اس کے قریب آیا اور بولا۔

''ہاں۔ نام بتاؤ اپنا''۔

''زیب''۔

''ٹھیک ہے تمہارا نمبر پانچواں ہے۔ ابھی چار بندے اندر جائیں گے۔ لو یہ نمبر رکھ لو''۔

اس نے پانچ نمبر کی ایک ٹکی شاہ زیب کے ہاتھوں میں تھما دی۔ اس کے برابر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا۔

''کوئی بیمار ہے بھائی''۔

''ہاں دل بیمار ہو گیا ہے''۔

''ارے بھیا! ماحول ہی ایسا ہے۔ ہر چوتھا آدمی دل کا مریض ہے۔ اللہ شفا دے۔ کھیس کیوں اوڑھ رکھا ہے سردی لگ رہی ہے کیا''۔

''ہاں۔ ویسے یہ بابا جی کیسے ہیں؟''

''بس نہ پوچھو۔ ایسی شفا دی ہے اللہ نے ان کے ہاتھوں میں جس کے لیے دعا کر دیں سمجھ لو اس کا بیڑا پار ہو گیا''۔

''لو بھیا۔ مفت میں آجکل کیا ہوتا ہے پر بابا جی ہیں بڑے کام کے''۔

ایک دو بندوں سے اور بات ہوئی انہوں نے بھی بابا گلزار کی بڑی تعریفیں کی تھیں۔ شاہ زیب ہنسنے لگا گلزار نے اسے مرشد اور پیر بنا دیا تھا۔ لوگوں نے گلزار کو، دنیا کس طرح توہمات کے سہارے چلتی ہے۔ پر جس وقت پانچواں نمبر اندر گیا۔ چار پانچ نمبر اور آ گئے تھے۔ شاہ زیب کھیس اوڑھے اندر داخل ہو گیا۔

اندر کا ماحول مزید پراسرار تھا۔ ویسے تو باہر کا ہال بھی ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ اندر زیادہ سردی تھی فضا میں ایک دھواں سا پھیلا ہوا تھا۔ حالانکہ ہوا باہر پھینکنے والا پنکھا بھی لگا ہوا تھا۔ لیکن ماحول کو ایک پراسرار رنگ دیا گیا تھا۔ سامنے ہی بابا گلزار بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک سفید رنگ کے چغے میں ملبوس ہاتھ میں ہزارا تسبیح، چہرے پر جلال، آنکھیں بند جو شخص ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، وہ گڑگڑاتی آواز میں بابا گلزار سے کہہ رہا تھا۔

''بابا جی...... زندگی سے عاجز آ گیا ہوں۔ اب نقصان پر نقصان برداشت نہیں ہوتا۔ سارا کام میرے سالوں نے کیا ہے۔ ان سالوں کی ایسی تیسی کر دیں۔ جو مانگیں گے آپ میں دوں گا۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے''۔

''دولت کا لالچ دیتا ہے ہمیں، بہت دولت ہے تیرے پاس، جب تجھ سے کہہ دیا کہ تیرا کام ہو جائے گا تو لالچ کیوں دیتا ہے۔ جو کچھ دینا ہے نقد ادا کر دے۔ کام میں جلدی ہوگی۔ ہمیں بھی بہت سوں کو پالنا پڑتا ہے''۔

''ٹھیک ہے بابا صاحب! کل پیسے لے کر آؤں گا''۔

''جا آگے جا......'' وہ شخص عقیدت سے اٹھا اور الٹے پاؤں چلتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ شاہ زیب کمرے میں چکراتی ہوئی خوشبو کو سونگھ رہا تھا۔ بہت ہی اعلیٰ درجے کا مشک فضا میں اپنی خوشبو پھیلا رہا تھا۔ معمولی بات نہیں تھی۔ ایک طرف سے زعفران کی خوشبو بھی ابھر رہی تھی۔ جو غالباً ایک پیالے میں گھول کر رکھا گیا تھا۔ شاہ زیب اس جگہ جا بیٹھا۔ جہاں گلزار بیٹھا ہوا تھا۔

''جی بابا صاحب! میری مشکل کا کوئی حل ہے آپ کے پاس''۔ چالاک آدمی تھا گلزار فوراً ہی آنکھیں کھول کر شاہ زیب کو دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

''ارے ارے شاہ جی آپ! بڑی عزت بخشی آپ نے، میرے آستانے کو رونق دے کر۔ شاہ جی بڑا شکر گزار ہوں آپ کا۔ آیئے آپ کی جگہ وہ نہیں یہ ہے''۔

''نہیں بھائی''۔

''نہیں شاہ جی! آپ کو اللہ کا واسطہ، آپ کو میری قسم''۔ گلزار اس طرح گڑگڑایا کہ شاہ زیب اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

''یار! میں اس لیے تو نہیں آیا تھا''۔

''اس لیے تو آپ کو آنا ہے شاہ جی! آپ کو اس لیے یہیں آنا ہے۔ آپ جیسے

باکمال بزرگ میں نے کم دیکھے ہیں۔ ارے آپ تو مسیحا ثانی ہیں۔ ایک منٹ میں اس بندے کی بیماری دور کردی۔ میں تو اس پر حیران ہوں شاہ جی! دیکھیے دل کی بات تو آج رات آپ سے کہوں گا۔ پر اس آستانے پر بیٹھ کر جو رونق آپ کے دم سے نظر آئی ہے۔ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میری یہی آرزو ہے کہ آپ اس جگہ ہوں اور میں آپ کے مرید کی حیثیت سے، یہاں آپ کے قدموں میں، آپ کے ہاتھوں سے لوگوں کو شفا پہنچے۔ اور میری تقدیر کھل جائے۔ شاہ جی، پہلے بھی گڑگڑا اتار رہا ہوں آپ کے سامنے، اب بھی یہی عرض کر رہا ہوں''۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن''

''نہیں شاہ جی! کچھ نہیں''

پھر اس رات اس نے اپنا مدعائے دل مجھ سے بیان کیا، کہنے لگا۔

''شاہ جی، دیکھئے آپ تو اللہ والے ہو جی، آپ کے لیے دنیا میں کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔ پر میری نیا پار لگ جائے گی۔ تھوڑا سا وقت مجھے دے دیجئے جی...... آپ لوگوں کو شفا پہنچائیں گے اور میری شہرت ہوگی۔ پھر آپ اگر کہیں جانا چاہیں تو میں آپ کو نہیں روکوں گا۔ شاہ جی! لیکن میری جو شہرت آپ کی وجہ سے ہو جائے گی۔ اس سے میری زندگی بن جائے گی۔ پہلے بھی آپ سے کہہ چکا ہوں بچیوں کے ہاتھ پیلے ہو جائیں۔ پھر مجھے دولت کی پرواہ نہیں ہے۔ اس کے بعد تو مجھے ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ دال روٹی مل جائے گی۔ گھر والی کے ساتھ گزارہ کرلوں گا۔ پر اتنے دن آپ میرا ساتھ دے دیں''۔

تمہیں خود شرمندگی ہوگی، ٹھیک ہے میں ابھی کہاں جارہا ہوں''۔ شاہ زیب نے کہا اور گلزار خوشی سے گلزار ہو گیا۔

......☆......

شاہینہ ہی نے کوشش کی تھی کہ جبار اور الیاس کچھ ٹھنڈے ہو جائیں۔ اصل میں بچھو اپنی عادت سے مجبور ہوتا ہے۔ ڈنگ مارنا اس کی زندگی کا سب سے محبوب مشغلہ ہے اور اگر وہ اپنے اس مشغلے سے باز آجائے تو اسے زندگی خاصی مشکل محسوس ہوتی ہے، لیکن اب جبکہ ایک طرح سے شاہ زیب بالکل ہی غائب ہو گیا تھا۔ وہ معتدل ہوتی جارہی تھی۔ بھائیوں ہی سے اس نے کہا۔

''وہ لڑکا تو لگتا ہے کہیں مرکھپ گیا۔ کوئی خیر خبر نہیں ہے اس کی۔ اس لیے اب ان لوگوں سے فاصلہ کیوں رکھا جائے بھائی جی۔ اگر آپ چاہتے ہو کہ ان سے کچھ کام لیا جائے تو رویے میں تبدیلی پیدا کرو۔ کام بن جائے گا اور شاہ زیب کبھی ہاتھ آئے تو آپ کو حق حاصل ہوگا کہ اس سے اپنا حساب چکالیں اصل میں اسے تو ویسے بھی چھوڑنا نہیں ہے ورنہ بہت فساد پیدا کرے گا''۔

''افسوس حاصل کچھ بھی نہیں ہوا اور میرا ایک بیٹا مجھ سے بچھڑ گیا۔ میں اس غم کو سینے سے کبھی نہیں نکال سکوں گا۔ بڑے غلط فیصلے ہو گئے تھے ہم سے''۔

''اب جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہو کیا میں اپنے بھتیجے کو بھول گئی؟ شاہ زیب آپ لوگوں کو نہ ملا اور کہیں میرے ہاتھ لگ گیا۔ تو قسم کھاتی ہوں اپنے مرے ہوئے ماں باپ کی کہ اس کا کلیجہ اپنے دانتوں سے چبا جاؤں گی''۔ جبار خاں اور الیاس خاں بھی کچھ نرم سے ہو گئے تھے۔

بہر حال شاہینہ ادھر یہ کہہ رہی تھی اور ادھر وہ ان دونوں کو بھی نرم کرنے کی

کوشش کر رہی تھی۔ جہاں زیب اور اورنگزیب تو ویسے ہی موم کی ناک تھے۔ شکیلہ البتہ
خاصی سمجھدار عورت تھی اور جب سے شاہینہ دوبارہ گھر واپس آئی تھی۔ شکیلہ نے بڑا ہوشیار
رہنا شروع کر دیا تھا اور ہر مسئلے میں خبردار رہا کرتی تھی۔ ویسے کبھی کبھی اس کے دل میں
شاہ زیب کا خیال آتا تھا تو اسے واقعی دکھ ہوتا تھا۔ اچھی پیاری سی شکل وصورت کا تھا۔
بھابیوں کی عزت بھی کرتا تھا لیکن تقدیر نے اسے سب سے دور لے جا کر پھینک دیا تھا۔
جبار خاں اور الیاس خاں بوئے آسل سے آئے تھے اور پہلی بار شرافت کے ساتھ آئے
تھے۔ چوہدری اکیلے تو خیر کبھی نہیں نکلتے۔ دوست تو کم ہی ہوتے ہیں دشمن زیادہ ہوتے
ہیں۔ گن مین ساتھ چلتے تھے۔ گاڑیاں بھر کر جاتی تھیں۔ یہاں پر بھی وہ اکیلے نہیں
آئے تھے۔ لیکن حویلی میں دونوں بھائی تنہا ہی داخل ہوئے تھے۔

آیئے خان صاحب! خیر ہے بہت دن کے بعد یہاں سے گزر ہوا''۔ جہاں
زیب نے کہا۔

''ہاں جی! رشتے ٹوٹتے نہیں ہیں بھائی! برا ہوا ہے ہمارے ساتھ ظلم ہوا ہے
ہم پر مگر کیا کریں۔ بہن کہتی ہے کہ بہنوئی اتنا کچا نہیں ہوتا کہ اس طرح سے چھوڑ دیا
جائے۔ ہم بھی یہی سوچ کر آئے ہیں کہ آپ سے گلے شکوے دور کر لیں''۔

''ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں اور ایک بار پھر اپنی بے گناہی آپ کے
سامنے پیش کرتے ہیں۔ شاہ زیب کا ہم سے کوئی بھی تعلق نہیں رہ گیا ہے۔ بات ایسی
نہیں ہے کہ ہم نے دل کے رشتے اس سے ختم کر دیئے ہیں۔ لیکن اب کچھ ایسی
مجبوریاں سامنے آ چکی ہیں کہ اسے زندہ تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے جیسے عذاب اس
نے اپنے سر پر مول لے لیے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت اس کے لیے موت بن جائیں
گے۔ ہم اپنے بھائی کے لیے اتنے بے درد الفاظ استعمال کر رہے ہیں مگر کیا کریں۔
ویسے اس میں شک نہیں ہے کہ جب وہ ہم سے بچھڑ گیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تو ہم یہ

بات کبھی نہیں بھولیں گے کہ اس میں آپ کا ہاتھ ہے''۔ جہاں زیب نے کہا اور جبار کا
چہرہ کرخت ہو گیا۔

''اور آپ حساب کا رجسٹرڈ نہیں دیکھیں گے۔ اس نے بھی تو ہمارے گھر کی
جوانی لوٹی ہے''۔

''ہاں۔ ہم دونوں کا دکھ یکساں ہے''۔ اورنگزیب نے کہا۔ پھر یہ سارے
مسئلے باتوں سے حل ہونے لگے۔ ایک نیا کردار ان کے درمیان آ ٹپکا۔ باہر سے اطلاع
ملی تھی کہ چوہدری نادر شاہ آیا ہے۔ اورنگزیب نے حیرت سے کہا۔

''یہ کون چوہدری نادر شاہ ہے۔ بلاؤں اس کو خان جی!''

''ہاں بلا لیتے ہیں اسے، دیکھیں تو کون ہے''۔ اور جب نادر شاہ اندر آیا تو
اس کو سبھی نے پہچان لیا۔

''ارے چوہدری جی...... آپ، آیئے...... آیئے...... بھئی بڑی محبت ہے
آپکی''۔ نادر شاہ، الیاس خاں اور جبار خاں کو بھی پہچانتا تھا۔ اس نے ان لوگوں سے
مصافحہ کیا لیکن جب اورنگ زیب نے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے تو اس نے اپنا ہاتھ،
پیچھے کر لیا۔

''نہیں چوہدری! میں دوست بن کر نہیں آیا۔ پہلے ہمارے درمیان کچھ
باتیں ہو جائیں۔ اس کے بعد دوستی اور دشمنی کا فیصلہ ہوگا۔ اورنگزیب نے اپنا ہاتھ پیچھے
کر لیا تھا۔ اور اس کی آنکھوں کے تاثرات بھی بدل گئے تھے''۔

''بڑی ہمت کی چوہدری صاحب آپ نے کہ دشمنی کا اعلان کرنے کیلئے ایسا
آزادانہ کوٹھی میں گھس آئے۔ لیکن چونکہ ابھی یہ دشمنی یکطرفہ ہے اور ہمیں نہیں معلوم کہ
آپ نے دشمنی کا آغاز کیوں کیا ہے۔ اس لیے ہم آپ کو دوست ہی سمجھتے ہیں۔ ٹھیک
ہے آپ ہاتھ نہ ملایئے آیئے بیٹھئے''۔

''شکریہ..... جبار خاں صاحب اور الیاس خاں صاحب آپ کی موجودگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ جس کے پاس چار مربع زمین ہوئی وہ چوہدری بن کر بیٹھ گیا اور اس نے جو حرکتیں شروع کر دیں اس سے چوہدریوں کے نام کو بڑا بٹہ لگ گیا۔ غلط تو نہیں کہہ رہا میں''۔

''کہہ کس کے بارے میں رہے ہیں آپ، یہ بتایئے، کتنی زمین ہے کس کے پاس اس کا فیصلہ کرنے کے لیے آپ یہاں آئے ہیں''۔

''نہیں۔ مجھے معاف کیجئے گا اورنگ زیب جی! میں آپ کے بھائی شاہ زیب کی بات کر رہا ہوں''۔ نادرشاہ کے منہ سے شاہ زیب کا نام سن کر جہاں زیب اور اورنگزیب تو چونکے ہی تھے۔ الیاس خاں اور جبار خاں بھی ایک دم چوکنے ہو گئے۔ اورنگزیب نے کڑی نگاہوں سے نادرشاہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

''کیا کہنا چاہتے ہیں آپ شاہ زیب کے بارے میں''

''ویسے تو بہت سی تفصیل معلوم ہو چکی ہے مجھے، یہ پتہ چل گیا ہے کہ شاہ زیب بہت زیادہ آگے بڑھ گیا ہے۔ اس نے الیاس خاں اور جبار خاں صاحب سے بھی جھگڑا مول لے رکھا ہے۔ مگر یہ آپ کا آپس کا رشتہ داری کا معاملہ ہے۔ میرا نام نادرشاہ ہے۔ میں آپ کو بتاؤں میں بالکل الگ قسم کا آدمی ہوں۔ ہم لوگ عیاشی کرتے ہیں۔ عیش کرتے ہیں اپنی دولت کے بل پر، زمینیں ہیں ہماری آمدنی ہے ان زمینوں سے۔ ایک طوائف تھی ملکہ بائی اس کی بیٹی ریحانہ سے ہماری دوستی تھی۔ مری میں ملے ہمیں یہ دونوں ہم نے لڑکے کو سمجھایا کہ طوائف زادی ہمارے حوالے کر دے۔ لیکن جناب مرنے مارنے پر تل گیا۔ بس عزت بچالی ہم نے یہ سوچ کر کہ ہم اورنگ زیب اور جہاں زیب کو جانتے ہیں۔ جناب عالی! اس کے بعد اس نے جو حرکتیں کیں ہیں وہ ناقابل برداشت ہیں۔ بڑی معلومات کر کے آئے ہیں۔ اس کے بارے میں، الیاس

خاں صاحب کے بیٹے کو بھی قتل کر دیا اور کچھ پولیس والوں کو بھی مارا ہے۔ مفرور قاتل ہے اور جیل سے بھاگا ہوا ہے۔ آپ لوگوں سے صرف ایک بات کہنی ہے وہ یہ کہ قانون تو اس کے ساتھ جو سلوک کرے گا سو کرے گا ہی۔ ہم بھی اسے نہیں چھوڑیں گے۔ یہ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے۔ بعد میں آپ یہ نہ کہیں کہ ہم نے اس کے ساتھ کوئی برائی کی''۔

''بس.....'' اورنگزیب نے سرد لہجے میں کہا۔

''مطلب..... بس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا''

''وہ ایک مفرور قاتل ہے اس نے پولیس والوں کو بھی قتل کیا اور جیل سے بھی بھاگا ہوا ہے۔ ظاہر ہے یہاں اس حویلی میں نہیں رہ رہا ہو گا''۔

''لاہور میں ہے جی، ہمیں معلوم ہے اچھی طرح''۔

''تو آپ یہاں کیا کرنے آئے ہیں نادرشاہ صاحب!۔ ہمیں دھمکیاں دینے''۔

''نہیں بلکہ یہ کہنے آیا ہوں کہ میری اب اس سے دشمنی ہو گئی ہے''۔ جواب میں جبار خاں ہنس پڑا تھا پھر اس نے کہا۔

''بڑی کم معلومات ہیں جی آپ کی، اس کے دشمنوں کی ایک فہرست بتا دیں آپ کو۔ فخر خاں اس کا بدترین دشمن ہے۔ خیر ہماری تو آپ بات کہہ ہی چکے ہیں کہ ہماری رشتے داری ہے۔ ہماری آپ بات چھوڑ دیجئے۔ راجہ شہاب الدین اس کا دشمن ہے۔ اور کتنے لوگوں کے نام بتائیں۔ اب آپ کا نام بھی ان میں شامل ہو گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے اس نے چوہدریوں کے خلاف ایک محاذ جنگ بنایا ہے۔ اور ٹھیک ہے اس کا کہنا بھی اس کی زمین جائیداد ختم ہو گئی ہے۔ اپنا سب کچھ مٹانے کے بعد بندہ دوسروں کا دشمن ہی بن جاتا ہے۔ بات اورنگزیب اور جہاں زیب کی نہیں ہے۔ ہم اپنی رشتے داری کی بات کر رہے ہیں۔ نادرشاہ صاحب! غلط جگہ شکایت لے کر آگئے ہیں آپ،

یہاں سے تو کبھی کا اس کا رابطہ ٹوٹا ہوا ہے۔ ہاں ایک بات آپ کو بتا دی جائے۔ ہاتھ لگ جائے تو اسے کوئی سزا آپ نہ دیں۔ ہمیں ضرور اطلاع دیں۔ ورنہ پھر سچ مچ دشمنی پڑ جائے گی''۔

''ٹھیک ہے بعد میں کوئی شکایت نہیں ہوگی''

''اس کے علاوہ کوئی شکایت نہیں ہوگی''

نادر شاہ چلا گیا۔ اورنگزیب اور جہاں زیب خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر جبار خاں نے کہا۔

''بھئی جہاں زیب بھائی! اور اورنگ زیب بھائی! بڑی قریب کی رشتے داری ہے ہماری اور اچھی خاصی زندگی گزار رہے تھے ہم۔ ایک چھوٹی سی بات تھی اس نے بڑھا کر کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ خود بھی اب برے حالات کا شکار ہے۔ آپ کے پاس پہنچے تو آپ اس پر بالکل ہاتھ نہیں رکھیں گے۔ جو کچھ کرنا ہے مل جل کر ہی کریں گے''۔

''وہ ہم تک پہنچے گا ہی نہیں ......'' اورنگزیب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہاں عقلمند ہے تو یہاں نہیں آئے گا۔ بہر حال دشمنیوں پر دشمنیاں مول لیتا جا رہا ہے وہ۔ میرا خیال ہے اب وہ آخری حد تک بگڑ چکا ہے۔ توبہ ...... توبہ ...... توبہ ...... آپ کا خاندان اور طوائفوں کے ساتھ دوستی۔ بہر حال عزتیں جب بگڑتی ہیں تو ایسے ہی بگڑتی ہیں۔ اللہ آپ پر رحم کرے''۔

جبار خاں اور الیاس چلے گئے۔ اورنگزیب اور جہاں زیب سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔

......☆......
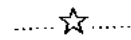
مزے کا آدمی تھا یہ گلزار بھی۔ دلچسپ وقت گزر رہا تھا اس کے ساتھ، اسے شاہ زیب کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ البتہ اس بات پر اسے یقین تھا کہ یہ ایک پوشیدہ درویش ہے۔ بہت سی کرامات دیکھ چکا تھا۔ حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ حاجی کریم بخش کے بیٹے کے ٹھیک ہو جانے میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا وہ تو خود حیران تھا کہ وہ لڑکا کیسے ٹھیک ہو گیا۔ ادھر مہرو اور خیرو اپنی سی کوششوں میں مصروف تھیں۔ انہیں یہ نوجوان درویش بڑا پسند آیا تھا۔ ہر طرح سے اس کی خاطر مدارت کرتی تھیں اور اس سے لگاوٹ کا اظہار کرتی تھیں۔ لیکن شاہ زیب کے دل کی دنیا پہلے سے آباد تھی۔ اب اس میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

شاہ زیب کی داڑھی اور لمبی ہو گئی تھی۔ اس طرح سے بال بھی کندھوں سے نیچے آ گئے تھے۔ اس سے اسے یہ آسانی ہو گئی تھی۔ کہ کوئی پہچان نہیں رہی تھی اس کی اور اس بات کا خوف نہیں رہا تھا کہ اسے پہچان لیا جائے گا۔ اس کے علاوہ جب وہ آستانے میں بیٹھتا تھا تو کالے رنگ کے کھیس سے اپنا چہرہ ڈھانپے رکھتا تھا۔ قرب و جوار میں اس کی اچھی کاصی شہرت ہو گئی تھی۔ چھوٹے موٹے کام لوگوں کے ہو ہی جایا کرتے تھے۔ لیکن اس سے جو شہرت ملتی ہے۔ وہ کافی الگ ہوتی ہے۔

بہر حال یہ دن رات گزر رہے تھے اور برے نہیں لگ رہے تھے۔ تھوڑے دن کیلئے گوشہ نشینی ہو گئی تھی۔ پھر ایک دن چند افراد ایک لڑکی کو لے کر آئے اس کے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہو رہے تھے۔ منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ شاہ زیب کو ایسے کسی

مریض سے ہمیشہ خوف محسوس ہوتا تھا۔ کیونکہ یہ بات اس کے علاوہ اور کون جان سکتا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں ہے بس ایک کھیل ہے جو ہو رہا ہے اور نجانے کب تک جاری رہے گا۔ کسی بھی دن خاموشی سے اپنی جگہ سے باہر نکل جائے گا۔ یہ سوچیں اس کے ذہن میں تھیں۔ اس لڑکی کو دیکھ کر اسے ایسا ہی خوف محسوس ہوا تھا۔ وہ لڑکی ٹھنڈے فرش پر پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ایسے باہر کو آ پڑ رہی تھیں جیسے اس کے ڈھیلے خانوں سے باہر آ پڑیں گے۔ منہ سے جھاگ چھوٹ رہے تھے اور ہاتھ مڑ رہے تھے۔ وہ فرش پر لوٹ پوٹ ہوتی کبھی ادھر جاتی کبھی ادھر، کئی عورتیں اور مرد اسے سنبھال رہے تھے۔ لیکن وہ سنبھل نہیں پا رہی تھی اور اس کی حالت دم بدم خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوفناک وحشت نظر آ رہی تھی۔

دفعتاً ہی وہ اٹھ کر باہر کی طرف دوڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن ساتھ آنے والے کئی تھے اور اسے انہوں نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ کبھی وہ دیواروں سے سر پھوڑنے کی کوشش کرتی تو لوگ اسے بچانے اور کبھی بلند آواز سے سب کو نام لے لے کر پکارنے لگتی۔ ایک لمحے کے لیے تو شاہ زیب سناٹے میں رہ گیا۔

بہرحال اگر یہ لڑکی کسی جن کے قبضے میں ہے تو بھلا میں کیا کر سکوں گا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا اور یہی ہوا جونہی شاہ زیب اس کے سامنے ہوا وہ ہاتھ پکڑی ہوئی عورت سے ہاتھ چھڑا کر شاہ زیب کی طرف بڑھی۔ اور اس طرح جیسے کوئی گائے سینگ سیدھے کر کے مخالف پر حملہ آور ہوتی ہے۔ شاہ زیب اپنی جھونک میں دروازے سے ہٹا تو وہ اپنی جھونک میں بھاگتی ہوئی دروازے سے باہر نکل گئی۔ لیکن دہلیز سے باہر نکلتے ہی اس کا پاؤں کپڑوں سے پھنسا اور وہ دھڑام سے نیچے گر پڑی۔ منہ پر سخت چوٹ لگی تھی۔

اس کے ساتھیوں نے بھاگ کر اسے اٹھایا تو شاہ زیب نے دیکھا کہ اس کے رخسار چھل گئے تھے۔ اور ہونٹوں سے خون رسنے لگا تھا۔ ویسے بھی اچھی خاصی صحت مند

اور ڈیل ڈول کی لڑکی تھی۔ لیکن بکھرے ہوئے بال اور اجڑے ہوئے چہرے سے وہ عجیب و غریب ہو کر رہ گئی۔ جونہی ایک عورت اور ایک مرد نے اسے اٹھایا وہ انہیں دو ہتڑ مارتی ہوئی، چیختی ہوئی واپس کمرے میں گھسی اور دروازے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور اب وہ شاہ زیب کو دیکھ رہی تھی۔

''کتے دے پتر کیا بگاڑے گا تو میرا، بول کیا بگاڑے گا'' یہ کہہ کر اچانک ہی اس نے شاہ زیب پر حملہ کر دیا۔ شاہ زیب نے اس کے ہاتھ پکڑے اور زور سے دھکا دے دیا۔ وہ اس طرح زمین سے گری جیسے کسی نے جڑ سے کاٹ کر درخت کو زمین پر گرا دیا ہو۔ نیچے اس نے دو تین پلٹیاں کھائیں اور پھر بے ہوش ہو گئی۔ ہاتھ ابھی تک مڑے ہوئے تھے اور جبڑا ابھی ٹیڑھا ہو گیا تھا۔

''اٹھاؤ اسے اس طرف ڈال دو''۔ شاہ زیب نے درد بھری آواز میں کہا اسے اس نوجوان لڑکی کی اس کیفیت پر غم کا احساس ہوا تھا۔ وہ لوگ شاہ زیب کی باتوں پر عمل کرنے لگے۔ شاہ زیب نے دیکھا کہ اس بدنصیب لڑکی کے پاؤں بھی اندر کی طرف مڑنے لگے تھے۔ گویا اس کی کیفیت خراب ہوتی چلی جا رہی تھی۔ شاہ زیب نے آگے بڑھ کر ہمدردی سے اس کے دونوں ہاتھ، دائیں ہاتھ میں لے کر اس کے جبڑے پر محبت اور شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ نجانے کیوں شاہ زیب کے دل میں اس کے لیے محبت اور ہمدردی کا تصور ابھرا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے وہ اس کی اپنی بہن ہو، لیکن اچانک ہی اسے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اسے یوں لگا کہ ذرا سا اس نے جبڑے پر دباؤ ڈالا تو جبڑا اپنی جگہ پر آ گیا ہو۔ شاہ زیب غور سے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے اس کے دونوں ہاتھ سیدھے کیے۔ تو اس کی انگلیاں یوں کھلنے لگیں۔ جیسے ان میں ہڈی ہی نہ ہو۔ شاہ زیب حیران نگاہوں سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اس کے مڑے

ہوئے پاؤں پر ہاتھ پھیرا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ لکڑی کی طرح سخت پاؤں سیدھے ہونے لگے وہ اپنی اصلی حالت پر آتے جا رہے تھے اور کمرے میں موجود لوگ ششدر رتھے۔اچانک ہی ان میں سے ایک آدمی کی خوشی سے بھری ہوئی آواز نکلی۔

''اللہ......اللہ......اللہ......اللہ...... یہ ٹھیک ہو رہی ہے۔ارے یہ تو ٹھیک ہو رہی ہے۔شاہ جی......شاہ جی اللہ آپ کو اور بڑا مرتبہ دے۔میری بہن ٹھیک ہو رہی ہے۔آپ نے تو کمال کر دیا''۔

شاہ زیب کے دل کو ایک عجیب سا دھکا لگا۔قدرت اسے کیا دے رہی ہے؟ کیا بنا رہی ہے اسے؟ وہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔بمشکل تمام اس کے منہ سے ایک بھرائی ہوئی آواز نکلی۔

''ایک گلاس پانی منگوائیے......''۔پانی آ گیا تو شاہ زیب نے وہ گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر لڑکی کے منہ سے لگایا۔

''لو بہن...... یہ پانی لے لو۔اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے''۔لڑکی کی آنکھیں کھل گئیں اس نے کچھ لمحوں تک شاہ زیب کو دیکھا۔پھر وہ آہستہ سے اٹھی اور اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر پانی پینے لگی۔ایک سانس میں وہ سارا پانی حلق سے اتار گئی۔لیکن پانی پینے کے فوراً ہی وہ پھر تکیے پر گر گئی۔اب اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں تھیں۔

''نہیں تم سوؤ گی نہیں۔دیکھو...... یہ سب کتنے پریشان ہیں اٹھ جاؤ...... تمہارا بھائی تم سے کہہ رہا ہے''۔شاہ زیب کو نجانے کیوں اس کی کیفیت ٹھیک ہو جانے پر ایک ڈھارس کا سا احساس ہو رہا تھا۔اس نے اس کے کھلے بالوں پر ہاتھ پھیرا تو لڑکی نے ایک بار پھر آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔شاہ زیب نے دوپٹہ لے کر اس کے منہ پر لگی جھاگ صاف کی اور پھر دوپٹہ اس کے سر پر ڈال دیا۔

''یہ ٹھیک ہو گئی ہے۔لیکن اب کبھی بیمار نہیں ہونا...... اٹھو......'' یہ کہہ کر شاہ

زیب نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ اٹھتی چلی گئی۔اس نے حیران پریشان ہو کر ایک بار پھر سب کو دیکھا سب کے چہرے حیرت سے سکڑے ہوئے تھے۔ان کے منہ کھلے ہوئے تھے اور ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شاہ زیب کو اپنے سینوں میں بھر لیں۔ پھر ان میں سے ایک عورت تیزی سے آگے بڑھی اور اس نے جھک کر شاہ زیب کے پاؤں پکڑ لیے۔شاہ زیب پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔

''یہ کیا کر رہی ہو...... بری بات ہے...... بری بات ہے ایسا مت کرو۔ نجانے مجھے اس کی کیا سزا ملے۔میں نے خود یہ سب کچھ نہیں کیا۔بس جو ہوا ہے وہ اللہ کی مرضی سے ہوا ہے۔اٹھ جاؤ بہن! یہ بوجھ میں ہرگز نہیں اٹھا سکتا''۔

شاہ زیب کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلے۔دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے لیکن ایسا نہیں کر سکتا تھا۔البتہ آنکھوں سے آنسوؤں کے تار ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے ہاتھوں کے لمس نے کسی کو زندگی تو بخش دی ہے۔لیکن خود اس کی زندگی کن حالات کا شکار ہے۔اس کا کوئی حل کسی کے پاس ہے۔ لیکن کون ایسا تھا جو اس کے لیے اپنے آپ کو مشکلات میں ڈالتا...... کوئی بھی نہیں...... کوئی بھی نہیں......۔

وہ لوگ لڑکی کو لے کر چلے گئے۔گلزار نے ان سے کیا لین دین کی اس کا شاہ زیب کو کوئی علم نہ تھا۔گلزار کے کاروبار کو اس نے خراب کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ویسے ان دنوں اس کی وجہ سے گلزار کا کاروبار کافی بڑھ گیا تھا۔

رات کو بھی شاہ زیب کافی دیر تک روتا رہا۔اسے ساری دنیا سے شکایت تھی بے شک لوگ ملے تھے لیکن اس کے لیے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔دل تڑپنے لگا۔ہر شخص کی زندگی کا ایک محور ہوتا ہے ایک مقصد ہوتا ہے......لیکن میری زندگی کا نہ کوئی محور ہے اور نہ مقصد...... میں تو بس ایک آوارہ روح کی مانند اس کائنات میں بھٹکتا پھر رہا تھا اور

لوگ میری طرف غور بھی نہیں کرتے۔ دشمنی باندھ رکھی ہے سب نے مجھ سے صرف دشمنی...... یہ جگہ بھی چھوڑ دینی چاہیے۔ بھلا جھوٹی تسلیوں سے کسی کو کیا ملتا ہے۔ میں کسی کو کیا دے سکوں گا۔ یہ تو ایک طرح سے قدرت کا بھی مذاق ہے میرے ساتھ، میں بھلا کسی کو کیا شفاء دے سکتا ہوں۔ یہ تمام سوچیں دامن گیر تھیں۔ اور وہ بہت سے فیصلے کر رہا تھا۔ آخری فیصلہ یہی تھا کہ خاموشی سے یہاں سے نکل جائے گا اور حیدر شاہ کے پاس پہنچے گا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ لجیا کے ماں باپ تو ٹھیک ہیں۔ ایک بار پھر لجیا کے گھر کا چکر لگائے گا ویسے راجہ شہاب الدین سے اس کی جو بات چیت ہوئی تھی وہ بھی کچھ ایسی ہی تھی کہ اسے راجہ شہاب الدین کا انداز کچھ بدلا بدلا سا لگا تھا۔ یہ دونوں کام کرنے پڑیں گے۔

پھر رات کے آخری پہر اسے نیند آ گئی تھی اور دوسرے دن کے معمولات یکساں تھے اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ مہرو اور خیر والنساء کو ذرا بھی توجہ مل جائے تو دونوں میں سے کوئی ایک لڑکی اس کے گلے پڑ سکتی ہے۔ ویسے عموماً دونوں ساتھ ہی رہتی تھیں۔

اس دن شاید ان کی ماں کسی کام سے گئی ہوئی تھی۔ گلزار بدستور آستانے پر تھا۔ مہرو اس کے کمرے میں آ گئی اور وہ مہرو کو دیکھنے لگا۔

''ایک چیز ہوتی ہے جسے نائی کہتے ہیں۔ لوگ اس کے پاس جاتے ہیں اور اپنے جھاڑ جھنکار صاف کرا لیتے ہیں۔ آپ تو بلاوجہ بابا سائیں بن کر بیٹھ گئے ہیں۔ چلو بن ہی گئے ہو تو کم از کم یہ بال تو تھوڑے سے ٹھیک کرا لیا کرو۔ ساری داڑھی اجڑی پڑی ہے۔ جیسے بھوسے سے کھیت''۔ مہرو نے کہا اور ہنس پڑی۔ خیر والنساء کے قدموں کی آواز سنائی دی تو مہرو النساء نے چونک کر اسے دیکھا اور بولی۔

''بند کر دیا دروازہ''

''ہاں کنڈی لگا کر آئی ہوں''۔

''دو منٹ باہر نہیں نکلا جا سکتا تھا۔ دل میں پنکھے لگے ہوئے ہوں گے''۔

''تو اور کیا تو اکیلے ہی اکیلے جو ہاتھ مار جانے کے چکر میں ہے''۔ شاہ زیب ان دونوں کو دیکھنے لگا پھر اس نے کہا۔

''کیا جھگڑا ہے بھئی تم دونوں میں اور یہ مہرو نے تو مجھے آتے ہی ڈانٹنا شروع کر دیا''۔

''تو ڈانٹیں گے نہیں تو اور کیا کریں گے؟ کم از کم حلیہ تو درست کر لیں آپ اپنا۔ اچھی خاصی پیاری سی شکل ہے اور یہ جھاڑیاں پھیلا لی ہیں۔ کم از کم انہیں ٹھیک تو کرا لیں۔ لوگ تو اپنے جھاڑ بھی کاٹ لیا کرتے ہیں''۔ شاہ زیب ہنسنے لگا پھر بولا۔

''تم دونوں کو میری اتنی فکر کیوں ہے''۔

''اسی کا فیصلہ کرنے آئے ہیں''۔ خیر والنساء بولی

''اچھا کیا فیصلہ''

''یہ بتائیں کہ ہم دونوں میں سے کون زیادہ اچھا ہے۔ دیکھیں سچ سچ بتائیں۔ آپ جھوٹ نہیں بولیں گے''۔

''اور اگر سچ بولوں گا تو یقین کر لوگی تم دونوں''۔ شاہ زیب نے کہا

''ہاں اللہ قسم''۔ مہرو نے کہا

''وعدہ''۔ خیر والنساء نے کہا

''تم یقین کرو کہ جب میں تم دونوں کے چہرے دیکھتا ہوں۔ تو دونوں ہی مجھے اچھی لگتی ہو۔ آج تک میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ تم میں سے کون زیادہ اچھا ہے''۔

''یہ کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہمارے درمیان جب سے آپ آئے ہو نا اکثر جھگڑا ہی رہتا ہے''۔

''کیوں؟''

''یہی کہ مہرو کہتی ہے وہ زیادہ اچھی ہے اور آپ اسے پسند کریں گے۔ میں کہتی ہوں کہ میں مہرو سے زیادہ اچھی ہوں''۔

''اچھا تو یہ جھگڑا ہے''۔

''آج فیصلہ ہو جانا چاہیے اس جھگڑے گا''۔

''دیکھو...... میں نے بالکل سچائی کے ساتھ کہا ہے کہ مجھے تم دونوں پسند ہو۔ اور ایک بات کہوں تم سے''۔

''ہاں۔ وہی تو ہم سننا چاہتے ہیں''۔

''ہم تین بھائی ہیں۔ میرے بڑے بھائیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ میری بھابیوں میں سے ایک بھابی مجھ سے بہت نفرت کرتی ہے اور اسی نے میری زندگی تلخ کر دی ہے۔ دوسری نے بظاہر مجھ سے نفرت کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن کبھی زیادہ محبت سے بھی نہیں۔ پیش آئی میرے ساتھ۔ حالانکہ میرے دل میں یہ آرزو تھی کہ میری بھابیاں میری بہنیں بن جائیں۔ میں بڑی بہنوں کی طرح ان کی قدر کروں ان کی عزت کروں۔ ان کے قدموں میں رہوں۔ وہ مجھے جو حکم دیں اسے پورا کروں۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ میرے دل میں بڑی آرزو تھی کہ میری کوئی بہن ہوتی۔ بڑی چاہت تھی میرے دل میں بہنوں کے لئے اور اب خدا نے میری یہ آرزو پوری کر دی ہے۔ اور اب مجھے ایک کے بجائے دو دو بہنیں مل گئیں ہیں۔ ایک کا نام مہرو ہے دوسری کا خیر والنساء یعنی خیرو...... بولو کیا تم مجھے پیار سے اپنا بھائی کہہ سکتی ہو''۔

دونوں کے چہرے دھواں دھواں ہو گئے شدید شرمندگی نظر آ رہی تھی ان کے چہروں پر دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھتی رہیں پھر ان کے ہونٹ کپکپائے اور وہ روتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

شاہ زیب ان کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ لیکن اس نے اپنے خون کا خیراج ادا کر دیا تھا۔ اس نے ایک سچا انسان ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ کسی کو برائیوں کے راستے پر لانا تو بہت ہی آسان کام ہے۔ لیکن برائیوں کو دور کرنے کی کوشش بڑی سخت اور مشکل ہوتی ہے۔ آج اس نے یہی کوشش کر ڈالی تھی۔

دونوں لڑکیاں شروع ہی سے اس کی جانب متوجہ تھیں۔ لیکن وہ دیکھ چکا تھا کہ بیچارہ گلزار ان دونوں کے لیے کتنا پریشان رہتا ہے۔ اس کی پریشانی میں اضافہ کرنے کی بجائے شاہ زیب نے ان دونوں کو ایک موقع دے دیا تھا اور اس کی آرزو تھی کہ وہ دونوں اسے خوشی سے قبول کر لیں۔ ویسے بھی بس آج کے دن کا مسئلہ تھا۔ رات کو یہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

بہر حال لڑکیاں پھر اس کے سامنے نہیں آئیں تھیں اور شاہ زیب کافی مطمئن تھا۔ معمولات جاری رہے۔ رات کے لیے اس نے مکمل تیاریاں کر لی تھیں۔ چنانچہ وہ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے گھر سے نکل آیا۔ تھوڑی سی رقم جیب میں محفوظ کر لی تھی۔ اس کے علاوہ اور کچھ ساتھ نہیں لیا تھا۔ لیکن وہ کھیس بدستور اس کے جسم سے لپٹا ہوا تھا۔ لباس بھی صاف ستھرا پہن لیا تھا۔ کبھی کبھی وہ ٹہلنے کے لیے نکل پڑتا تھا۔ چنانچہ گلزار نے بھی اس پر توجہ نہیں دی تھی۔

کافی دیر وہ پیدل چلتا رہا اور اس کے بعد ایک ٹیکسی سٹینڈ پر پہنچ گیا اپنی منزل تک جانے کے لیے اس نے ٹیکسیوں میں سفر ہی مناسب سمجھا تھا۔ یہ سفر اس کے خیال میں محفوظ بھی تھا اور کسی حد تک آرام دہ بھی وہ زیادہ جدوجہد سے بچنا چاہتا تھا۔ ڈرائیور سے اس نے بات کی اور ڈرائیور نے اسے اس کی منزل تک پہنچانے کا معاوضہ بتا دیا۔

''ٹھیک ہے چلو۔ لیکن واپسی میں شاید تمہیں سواری نہ مل سکے''۔

''نہیں صاحب جی! وہ جو کہتے ہیں نا کہ یہ سارے کام اللہ کے ہیں''۔

ڈرائیور ایک متعاون آدمی تھا راستے میں وہ بھی زیادہ دیر تک خاموش رہا۔ شاہ زیب نے بھی اسے چھیڑنا زیادہ مناسب نہیں سمجھا تھا۔ رات آہستہ آہستہ اترتی آرہی تھی۔ راستے میں ڈرائیور نے کہا۔

''صاحب جی! آپ کے پاس کوئی ایسی ویسی چیز تو نہیں ہے۔ کیونکہ راستے میں پولیس کا گشت ہوتا ہے انہوں نے کہیں روک کر تلاشی لے لی تو بڑی گڑ بڑ ہوگی''

''ایسی ویسی چیز سے تمہاری کیا مراد ہے''

''معافی چاہتا ہوں صاحب جی! کوئی ہتھیار، کوئی نشے والی چیز''

''نہیں کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن کیا ان راستوں پر پولیس باقاعدہ رہتی ہے''

''ہاں جی...... گشت تو چلتا ہے خاص طور سے رات کو لیکن آج کل ناکے لگے ہوتے ہیں۔ شہر سے باہر جانے والے راستوں پر خاص طور سے۔ موٹر وے پر بھی اور حجائی روڈ پر بھی ادھر ملتان روڈ بھی بند ہے''۔

''بند ہے''

''نہیں میرا مطلب ہے صاحب جی! وہ آپ کو پتا تو ہوگا اخبار میں پڑھا ہوگا ایک منسٹر صاحب کے گھر زبردست ڈاکہ پڑا تھا۔ پرسوں کی ہی تو بات ہے۔ پورے لاہور کی ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔ اور جگہ جگہ ناکے لگے ہوتے ہیں''

شاہ زیب کو افسوس ہونے لگا۔ بلاوجہ نکل آیا تھا اگر ایسی بات تھی تو ابھی کچھ روز اور گزارے جاسکتے تھے کہیں کوئی گڑ بڑ نہ ہو جائے۔ لیکن گڑ بڑ ہوگئی۔ ابھی بہت زیادہ فاصلہ نہیں طے ہوا تھا کہ اچانک ہی ایک جگہ ناکہ لگا نظر آیا۔ مسلح سپاہی سڑک پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان کو یوں سامنے دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے تو شاہ زیب کو بھی پسینہ آ گیا۔ حالانکہ اس کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ کمبل بھی اوڑھا ہوا تھا اس کے، سپاہی منتظر تھے کہ ٹیکسی رکے۔ اور پھر ٹیکسی کے ڈرائیور نے شاہ زیب سے کہا۔

''لیجئے ناکہ آ گیا''۔ یہ کہہ کر اس نے ٹیکسی کی رفتار سست کی اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان سپاہیوں تک جا پہنچا۔ وہ اسے رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ ڈرائیور نے گاڑی اطمینان سے ان کے پاس روک دی ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر ڈرائیور پر نظر ڈالی اور بولا۔

''کدھر جا رہا ہے''

''وہ جی ایک سواری ہے صاحب جی! بوئے آسل جا رہے ہیں''۔ یہ کہہ کر اس نے گاڑی کے اندر کی بتی جلا دی اور خود نیچے اتر گیا۔

دو سپاہی سر اندر ڈال کر شاہ زیب کر دیکھنے لگے۔ تیسرے نے دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا اور ایک ایس پی کے عہدے والے آدمی نے اندر نگاہ ڈالی۔ شاہ زیب نے اس کی صورت دیکھی اور دوسرے لمحے شاہ زیب کو احساس ہوا کہ تقدیر اس پر بہت بڑا حملہ کرنے والی ہے۔ یہ وہی ایس پی تھا جس نے شاہ زیب کو ملکہ بائی کے کوٹھے سے گرفتار کیا تھا اور جس کے بارے میں شہاب الدین نے بتایا تھا کہ وہ اس کا جاننے والا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اس نے ٹارچ کی روشنی جلائی اور پھر اس کے چہرے پر تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔

شاہ زیب کو اب کم از کم اتنا اندازہ ضرور ہوگیا تھا کہ ساری عمر مجرموں کی سرکوبی کرنے والے یہ لوگ ضرورت سے کہیں زیادہ تیز اور چالاک ہوتے ہیں اور ان کی نگاہیں دماغ کی ہڈیوں سے اتر کر یا سینے کے خول کو توڑ کر اندر داخل ہونے میں کمال رکھتی ہیں۔ اس کے چونکنے کا انداز بھی بتا رہا تھا کہ اسے کوئی شبہ ہوگیا ہے۔ اس نے پیچھے ہٹ کر ایک دم پستول نکالا اور اپنے ساتھیوں سے بولا۔

''اسے نیچے اتارو'' ایک سپاہی آگے بڑھا اور بولا۔

''باہر آ جائیے۔ میاں جی! ایس پی صاحب کا ناکہ ہے''۔

''میں بیمار ہوں بھائی! میرے جوڑوں میں درد ہے اگر مہربانی کرو تو مجھے نیچے نہ اتارو''۔

''او بیمار باہر نکل آ ورنہ یہیں تیرا علاج ہو جائے گا۔ چل نیچے اتر......'' یہ کہہ کر اس نے اپنی رائفل کا دستہ گاڑی پر جمایا اور دائیں ہاتھ سے شاہ زیب کو دوسری طرف دھکیلنے لگا۔

شاہ زیب اس مصیبت کے لیے قطعی تیار نہ تھا لیکن جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا اب بدترین صورتحال تھی۔ ایس پی کے بارے میں اس کو اس کا بھرپور اندازہ تھا کہ اس نے اسے پہچان لیا ہے۔ اس کی داڑھی، بکھرے بال اور کالے رنگ کا کھیس۔ اس تیز نگاہوں والے ایس پی کو دھوکہ نہیں دے سکتے تھے۔ ادھر سپاہی نے نہایت بدتمیزی سے شاہ زیب کو دوسری طرف دھکیلا تو شاہ زیب کو فیصلہ کرنا پڑا۔ سپاہی زور لگانے کی کوشش میں خاصا اندر آ گیا تھا۔ شاہ زیب نے دوسری سمت کا دروازہ کھولا اور جیسے ہی دروازہ کھلا اس نے سپاہی کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور پھر اسے اتنی طاقت سے دوسری سمت کھینچا کہ وہ شاہ زیب کے اوپر آ گرا۔ شاہ زیب نے ایک لمحے کے اندر اندر اس کی رائفل چھین لی اور پھر پوری پھرتی سے اسے اپنی ڈھال بنا کر ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

اب کیفیت یہ تھی کہ دوسری طرف کھڑا ہوا ایس پی اگر گولی چلاتا تو وہ سپاہی کے سر میں لگتی۔ شاہ زیب نے ایک منٹ کے دسویں حصے میں یہ کاروائی مکمل کر کے رائفل ایس پی پر تان لی۔ شاہ زیب جانتا تھا کہ اس رائفل کے چیمبر میں گیارہ راؤنڈ موجود ہیں۔ اسے اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ رائفل بھری ہوئی ہے۔ رائفل کی نال اپنی طرف دیکھ کر ایس پی بوکھلا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ تب شاہ زیب کی آواز ابھری۔

''اگر تم نے ہمیں راستہ نہ دیا تو تمہارا یہ سپاہی تو مارا ہی جائے گا۔ لیکن تم بھی

میری زد میں ہو مسٹر ایس پی''۔

''اس کا مطلب ہے کہ میرا شبہ ٹھیک تھا۔ میں نے تجھے پہچان لیا ہے حرامی! اوئے تیری''۔ اس نے ایک زوردار گالی دی تو شاہ زیب گرج کر بولا۔

''دیکھ میں نے تم لوگوں سے صلح کر لی ہے۔ ایک انسپکٹر کے بارے میں میں نے سوچا تھا کہ اگر مجھے موقع ملا تو اسے موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ وہ بھاگ گیا۔ ایس پی صاحب! زبان کو قابو میں رکھو یہ گالیاں تم دو ٹکے کے مجرموں کو دے سکتے ہو۔ اگر اس کے بعد تمہارے منہ سے گالی نکلی تو میں تم سب کی لاشیں یہیں گرا دوں گا۔ سمجھ رہے ہو نا''۔

''میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ رائفل پھینک دے ورنہ''۔ شاہ زیب نے گولی چلا دی۔ اسے اس کی گالیوں پر شدید طیش آ گیا تھا۔ گولی اس کی ران میں لگی۔ اور وہ اچھل کر نیچے گرا۔ لیکن گرتے گرتے بھی اس نے گولی چلا دی۔ نشانہ شاہ زیب ہی پر لیا گیا تھا مگر گولی ٹیکسی کی باڈی میں لگی۔

البتہ شاہ زیب کی چلائی ہوئی دوسری گولی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں جا لگی تھی اچانک ہی دوسری طرف کھڑے سپاہی نے بند دروازے کے چڑھے ہوئے شیشے سے تاک کر گولی چلائی۔ لیکن شاہ زیب شیشہ ٹوٹنے سے پہلے ہی نیچے جھک گیا اور گولی دوسری طرف کھلے دروازے سے نکل گئی۔ یہ بڑا خوفناک حملہ تھا تقدیر اگر ساتھ نہ دیتی تو کھوپڑی اڑ گئی تھی۔ تیسرا آدمی گاڑی کی ونڈ اسکرین کے سامنے کھڑا تھا۔ شاہ زیب نیچے جھکا وہ وہاں سے ہٹ کر کئی قدم پیچھے جا کر کھلے دروازے کے راستے شاہ زیب پر گولی چلانے لگا تو شاہ زیب نے گھٹنا ٹیک کر اسے مہلت دینے کی بجائے اس پر گولی چلا دی۔

البتہ سپاہی کافی تیز نکلا تھا اس نے بھی فائر کیا اور گولی پہلے سپاہی کے کندھے

میں لگی شاہ زیب نے ایک اور فائر کیا۔ تو وہ سپاہی گیند کی طرح اچھل کر کئی ہاتھ پیچھے جا
گرا۔ شاہ زیب کی گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ شاہ زیب کی خوش قسمتی تھی کہ دو سیٹوں
کے درمیاں جھکنے کی وجہ سے وہ کافی فائدے میں تھا۔ اور ایک کے بعد دیگرے کئی
گولیاں چلانے کے باوجود ابھی تک خود نشانہ نہیں بن سکا تھا۔ لیکن اب گاڑی کے اندر
سے نکل جانا بڑا ضروری تھا۔ چنانچہ وہ پھرتی سے گاڑی کے پچھلے حصے میں آ گیا۔ گاڑی
کی دوسری طرف ایک اور سپاہی موجود تھا اور بڑی احتیاط سے پوزیشن لے رہا تھا لیکن
شاہ زیب نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''پھینک دو...... رائفل پھینک دو ورنہ اڑا کر رکھ دوں گا''۔ شاہ زیب کے
لہجے کی غراہٹ نے اس پر ہیبت طاری کر دی۔ اور وہ تیزی سے پیچھے ہٹ کر سڑک کے
کنارے کے نشیب میں لڑھک گیا۔

شاہ زیب کو اندازہ نہیں تھا کہ جن لوگوں نے اس پر گولیاں چلائی ہیں ان کا
کیا حشر ہوا۔ لیکن اسی وقت ایس پی کی آواز سنائی دی۔

''کتے کے بچے! تو میرے ہاتھوں سے نہیں بچ سکتا''۔ یہ کہہ کر اس نے پھر
اپنے ریوالور سے فائر کیا۔ لیکن گولی ٹائر کے رنگ میں لگی تھی۔ ادھر ٹیکسی ڈرائیور کے
بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں تھا۔ پتہ یہ چلا کہ وہ خوفزدہ ہو کر ٹیکسی کے نیچے گھس
گیا ہے۔ وہیں سے اس کی آواز سنائی دی۔

اوئے تمہارا بیڑا غرق...... اوئے مر جاؤ تم رب کرے۔ اوہ میری گاڑی کا
کیوں ستیاناس کیے دے رہے ہو۔ اوہ اپنی لڑائی لڑو۔ مجھ غریب کو کیوں مار رہے ہو''۔

شاہ زیب کو اندازہ تھا کہ اگر لیٹے ہوئے ایس پی نے گولی چلائی تو بے چارہ
ٹیکسی ڈرائیور کام آ جائے گا۔ پھر اس نے دیکھا کہ وہ سپاہی جو سڑک کی نشیب میں
لڑھک گیا تھا۔ کہنیوں کے بل چلتا ہوا۔ پوزیشن لے کر آگے سرک رہا ہے۔ اور اس

کوشش میں ہے کہ شاہ زیب کو زد میں لے کر اس پر فیصلہ کن وار کرے۔ یہ بھی اتفاقیہ
طور پر شاہ زیب کی اس پر نظر پڑ گئی۔ اور وہ بھی اس لیے کہ ٹیکسی کی بتیاں روشن تھیں۔
شاہ زیب نے جونہی اُسے دیکھا وہ اپنی جگہ سے ہٹا اس نے ٹیکسی کے ہیڈ کے اوپر
رائفل کی نال رکھ کر نشانہ باندھ کر گولی چلا دی۔ شاہ زیب کی گولی اس کی کمر میں لگی۔
پھر وہ ایک دلدوز چیخ مار کر ایک بار پھر سڑک کی نشیب میں منہ کے بل لڑھک گیا۔ اب
میدان ایک طرح سے بالکل صاف تھا۔ شاہ زیب نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''ڈرائیور باہر آ جاؤ، ورنہ میں تمہیں بھی قتل کر کے ٹیکسی لے جاؤں گا''۔ شاہ
زیب کے الفاظ نے ڈرائیور کو بالکل ہی خوفزدہ کر دیا۔ وہ لرزتا ہوا باہر نکلا اور کپڑے
جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''میری تو ٹیکسی ہی گئی جی!''

''تو چل جلدی سے یہاں سے دفع ہو جا، ورنہ میں یہیں تیری قبر بنا دوں
گا''۔ شاہ زیب نے کہا جانتا تھا کہ ڈرائیور شرافت کی زبان نہیں سمجھے گا۔

بہر حال اس وقت بڑی عجیب و غریب پوزیشن تھی۔ ایس پی غالباً اب تک
اپنی قوت ارادی سے کام لیتا رہا تھا۔ پتہ نہیں اب وہ ہوش میں تھا یا نہیں۔ ویسے جن
سپاہیوں کو گولیاں لگیں تھیں وہ ابھی تک کھلبلا رہے تھے۔ اس کا مقصد ہے کہ وہ سب
زندہ ہیں۔ خدا کرے انہیں کوئی بھی مہلک زخم نہ لگا ہو۔ یہ مجبوری تھی جو ہوا وہ اپنی
زندگی بچانے کے لیے ضروری تھا اگر ایسا نہ کرتا تو خود اس کے زندہ بچنے کے امکان نہ
ہوتے۔ ڈرائیور کو ٹیکسی کے اندر دھکیل کر شاہ زیب خود ہی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس
نے ایک اور سپاہی کی رائفل اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ ڈرائیور بے پناہ خوفزدہ تھا۔ اس
نے کہا۔

''صاحب جی...... ! مجھ سے یہ گاڑی نہیں چلے گی۔ معافی چاہتا ہوں آپ

یقین کرلو جی! میرے ہاتھ پاؤں میرے قابو میں نہیں ہیں''۔

''کوئی زخم لگا ہے تجھے''

''اب لگے گا جی! جب یہ لوگ پیچھے سے گولیاں چلائیں گے''۔

''دفع ہو ادھر آ جا''۔ شاہ زیب نے کہا اور اس کے بعد اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ لیکن یہ دوسرا فیصلہ بھی شاہ زیب نے ایک لمحہ کے اندر ہی کیا تھا۔ جونہی وہ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی سیٹ کی طرف گیا۔ شاہ زیب نے گاڑی گیئر میں ڈال کر اسے ایک رفتار سے آگے بڑھا دیا۔

بہرحال یہ ایک مناسب قدم ہی تھا۔ کیا کہا جا سکتا تھا، آگے چل کر صورتحال کیا ہو غرض یہ کہ شاہ زیب پوری قوت سے گاڑی دوڑاتا ہوا۔ اس ناکے سے آگے نکل آیا۔ حقیقت تو یہی تھی کہ اس نے جان بوجھ کر ایک بھی قتل نہیں کیا تھا۔ اگر الیاس خاں کا بیٹا اس کے راستے میں اس طرح مزاحم نہ ہوتا۔ اور اس کی آرزوؤں کا جنازہ اتنی بے دردی سے نہ نکالا جاتا تو یقینی طور پر وہ اسے بھی قتل نہ کرتا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا وہ حالات کی ستم ظریفی تھی۔

شاہ زیب اس وقت بھی اس بات سے خوش تھا کہ اس کی گولی سے کوئی سپاہی نہیں مرا۔ ایک اور بات بھی اس کے ذہن میں تھی۔ ڈرائیور کم از کم ان کی تھوڑی بہت مدد کر سکتا ہے۔ اس طرح اس کی جان بھی بچ جائے گی اور وہ ان لوگوں کے شبے کا شکار نہیں ہوگا۔ ٹیکسی کی باڈی میں کئی سوراخ ہو گئے تھے۔ لیکن شکر ہے اس کا انجن وغیرہ بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا۔ پٹرول بتانے والی سوئی بتا رہی تھی کہ پٹرول کافی مقدار میں موجود ہے۔ ظاہر ہے وہ ایک لمبے سفر پر نکلا تھا ٹیکسی میں پٹرول بھرا ہوگا۔ ورنہ وہ کسی پٹرول پمپ سے پٹرول ضرور بھرواتا۔

تھوڑا فاصلہ طے کر کے اچانک شاہ زیب کے ذہن میں ایک سوال ابھرا۔ وہ

لوگ بچ گئے ہیں یہ خوشی کی بات ہے لیکن ان میں سے ہر ایک خود شاہ زیب کی زندگی کا خواہاں ہوگا۔ ہو سکتا ہے جی ٹی روڈ پر آگے ناکے لگے ہوں۔ وائرلیس پر ٹیکسی کے بارے میں دوسرے ناکے پر اطلاع دی جا سکتی ہے۔ یہ خیال ایک لمحے کے اندر ذہن میں آیا تھا اور شاہ زیب نے فوراً ہی ٹیکسی کی رفتار سست کر دی تھی۔ کیا پتہ کتنے فاصلے پر دوسرا ناکہ لگا ہو۔

پھر تھوڑے فاصلے پر جا کر اسے ایک ذیلی سڑک اچانک ہی نیچے اترتی نظر آئی۔ تو اس نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھایا اور ٹیکسی کی رفتار سست کر کے اس کا رخ ذیلی سڑک پر کر دیا۔ یہ اس کا اپنا علاقہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح کی سڑکیں خاص قسم کے فارم ہاؤس پر یا اینٹوں کے بھٹے کی جانب جانے والی سڑکیں ہوا کرتی ہیں۔ وہ آگے بڑھتا چلا گیا اور اس کا اندازہ بالکل درست نکلا آگے ایک بھٹے کا چمنی نظر آ رہا تھا۔ وہ سست رفتاری سے آگے بڑھتا رہا۔ اینٹوں کے بھٹے پر اس وقت مکمل خاموشی طاری تھی۔ وہاں پر بہت سے جھونپڑے بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی بھی جھونپڑے میں روشنی نہیں تھی۔ بھٹے کے ایک ٹیلے پر ایک چوکیدار کی جھونپڑی بنی ہوئی تھی۔ شاہ زیب نے یہاں ٹیکسی روک دی۔ وہ آگے جانے والے راستوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ اینٹوں کے بڑے بڑے ڈھیر کی اوٹ سے نکل کر اس کوٹھڑی کے پاس پہنچا تو اسے اس کوٹھڑی میں روشنی نظر آئی۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھتا رہا اور کوٹھڑی کے دروازے کے سامنے جا کر رک گیا۔ اندر کی سن گن لینا چاہتا ایسے ہی منہ اٹھا کر تو کہیں نہیں گھسا جا سکتا تھا۔ پتہ چلے کہ اندر کون ہے کتنے افراد ہیں یہاں، اور اس وقت ان لوگوں کو چھیڑنا مناسب ہوگا یا نہیں۔ قرب و جوار کے ماحول کا بھی اندازہ لگا لینا چاہتا تھا۔

چنانچہ دروازے سے ہٹ کر وہ اس کوٹھڑی کی بغلی سمت چل پڑا۔ پھر جب وہ

اس کے عقب میں پہنچا تو اچانک ہی اسے آہٹیں سنائی دیں۔ وہ ایک دم اپنی جگہ ساکت ہوگیا۔ ادھر یقینی طور پر کوئی تھا۔

رات کے تاریک سناٹوں میں سانسوں کی بازگشت اور بدن کی جنبشوں کا احساس ہوتا تھا وہ کچھ لمحے وہاں رکا اور اسے اس بات کا یقین ہوگیا کہ اس طرف کوئی ذی روح موجود ہے۔ آہستہ سے اس نے جھانک کر دیکھا ادھر بھی ماحول تاریک تھا لیکن اب اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہوگئیں تھیں۔ اسے کوٹھڑی کے عقبی دیوار کے سہارے کوئی پڑا ہوا نظر آیا۔ ایک انسانی جسم تھا جس میں جنبش ہو رہی تھی۔ شاہ زیب بغور دیکھنے لگا اور کچھ ہی لمحوں کے بعد اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ کوئی زندہ انسان ہے اور رسیوں سے بندھا پڑا ہے۔ شاہ زیب پھرتی سے آگے بڑھا اور اس کے قریب پہنچ گیا اس شخص کے منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا تھا اور ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ وہ بڑے کرب کے عالم میں تھا۔ شاہ زیب نے سب سے پہلے اس کے منہ سے کپڑا نکالا تاکہ سانسوں کی آمدورفت معطل نہ ہونے پائے۔ پھر وہ اس کے ہاتھ پاؤں کھولنے لگا۔ بندھا ہوا آدمی ایک جوان آدمی تھا۔ تیس پینتیس کے درمیان عمر ہوگی۔ ہاتھ پاؤں بھی مضبوط تھے۔

بہرحال شاہ زیب نے اسے کھول دیا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شاہ زیب کی صورت دیکھ رہا تھا پھر اس نے شاہ زیب کے کان کے پاس سرگوشی کی۔

''اندر بڑی گڑبڑ ہے اگر ہوسکے تو ایک لڑکی کی عزت بچالو''۔

''کون ہو تم؟''

''چوکیدار ہوں یہاں کا۔ دین بخش نام ہے۔ بھٹے کا چوکیدار ہوں۔ بھٹے کے مالک کا بیٹا اور اس کے آوارہ مزاج دوست ایک لڑکی کو اغوا کر کے لائے ہیں۔ چار

بندے ہیں چاروں مل کر اس کی عزت لوٹیں گے۔ ابھی ایک اندر ہے وہ لوگ دارو وغیرہ لینے کے لیے گئے ہیں''۔ شاہ زیب ایک دم چونک پڑا پھر اس نے کہا۔

''تم کون ہو؟''

''بولا نا صاحب چوکیدار ہوں ادھر کا۔ بھٹے کے مالک کا بیٹا بھی ساتھ ہے۔ دھوکے سے ادھر لایا اور مجھے زخمی کر دیا''۔

''لڑکی کہاں سے لائی گئی ہے؟''

''گن موری سے۔ گن موری یہاں سے کوئی ڈھائی میل کے فاصلے پر ہے۔ چراغ دین کی بیٹی ہے وہ۔ میں چراغ دین کو اچھی طرح جانتا ہوں جی! بڑا نیک آدمی ہے۔ عزت بچالو بھائی جی! میں نہیں جانتا آپ کون ہو۔ پر اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے مدد بھیجی ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں جی۔ جان جاتی ہے تو دونوں کی جان چلی جائے گی۔ اگر وہ لوگ مجھے اس طرح بے ہوش کر کے یہاں نہ ڈال دیتے تو صاحب جی! میں جان پر کھیل جاتا پر بچاتا اس بچی کو۔ ارے ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ سترہ سال کی ہے اور چراغ دین بڑا مجبور آدمی ہے جی۔ بھروسہ کرو''۔

''تمہارے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ ہے''۔

''نہیں جی! بس ایک ڈنڈا ہے وہ بھی اندر ہی پڑا ہوا ہے۔ اصل میں وہ چوہدری شیدے چونکہ مالک کا بیٹا ہے۔ دھوکے سے ادھر لے آیا۔ تین بندے یہاں اور موجود تھے۔ میرے سر پر میرا ہی ڈنڈا مار کر مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہوش آیا ہے۔ یہ دیکھو سر میں زخم پڑ گیا ہے۔ بچالو جی۔ لڑکی کی عزت بچالو۔ اگر وہ لوگ آئے تو پھر چھوڑیں گے نہیں''۔

''ٹھیک ہے آؤ...... ہمت کرتے ہیں''۔ شاہ زیب نے کہا اور افسوس کرنے لگا کہ اس کے پاس اس وقت کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ ٹیکسی میں

پانا اور جیک چڑھانے والی راڈ موجود ہے۔ یہ راڈ کام آ سکتی ہے۔ چوکیدار کا ڈنڈا تو شاید ان لوگوں کے پاس ہی تھا۔ اور پھر یہ نہیں پتہ تھا کہ وہ تین افراد واپس آ گئے ہیں یا نہیں۔ سیدھا سادھا چوکیدار تو اپنی کہانی سنا رہا تھا۔ ٹیکسی سے پانا نکال کر وہ آگے بڑھا تھا کہ اندر سے تیز نسوانی چیخ سنائی دی اور چوکیدار کانپ کر رہ گیا۔ شاہ زیب نے پوچھا۔

''ہاں جی۔ وہی تو ہے بھٹے کے مالک کا بیٹا۔ بڑے چوہدری بڑے شریف آدمی ہیں جی۔ یہ شیدا ہی ہے جو یہاں عیاشی کرنے کے لیے آتا جاتا رہتا ہے۔ حرامی کہیں کا''۔ چوکیدار نے کہا۔

اندر سے ایک بار پھر چیخ سنائی دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ تینوں بھی اندر آ گئے ہیں۔ شاہ زیب دروازے پر پہنچ گیا اس نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ اس دوران اس نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ لیا تھا۔ جبکہ چوکیدار سہی حالت میں تھا اسے اس کا ڈنڈا بھی مل گیا تھا جو وہیں احاطے میں پڑا ہوا تھا۔ شاہ زیب نے یہ اندازہ لگا لیا کہ دروازہ بند نہیں کیا گیا ہے۔ پھر اس نے چوکیدار کو اشارہ کیا کہ وہ ڈنڈا لے کر دروازے پر ہی رکا رہے اور جیسے ہی کوئی اس کی رینج میں آئے اس پر ڈنڈا جما دے۔ چوکیدار شاہ زیب کی بات سمجھ گیا تھا۔

بہرحال ان تمام انتظامات سے فارغ ہونے کے بعد شاہ زیب ایک دم سے دروازے پر ٹکر مار کر اندر داخل ہو گیا اس کی ٹکر سے دروازے کے دونوں پٹ بڑی قوت سے کھلے تھے ان سے خوب زوردار آواز ہوئی تھی۔ کوٹھڑی کے بارے میں شاہ زیب کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ بہت کشادہ ہے۔ اندر تیز روشنی ہو رہی تھی اور اس روشنی میں ایک انتہائی شرمناک منظر نظر آ رہا تھا۔ چکنے اور سڈول بے لباس بدن کو زمین پر ڈال کر اس کے ہاتھ پیچھے پلنگ کے دونوں پایوں سے باندھ دیئے گئے تھے اس کا

لباس اتار کر پھینک دیا گیا تھا۔ نوخیز بدن روشنی میں چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ چہرے پر خوف کے شدید آثار پھیلے ہوئے تھے۔ دہشت سے منہ ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں ایک ایسا خوف تھا جیسا اس وقت ہرنی کی آنکھوں میں ہوتا ہے جب چیتا اس سے چند گز دور رہ گیا ہو۔ ایک اور بے غیرت انسان بے لباس ہو کر اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ یہی چوہدری شیدا معلوم ہوتا تھا۔ ظاہر ہے بھٹے کے مالک کا بیٹا تھا اور اپنے سارے حقوق استعمال کرنا جانتا تھا۔ اس بے جا مداخلت سے وہ بری طرح بھڑک اٹھے اور انہوں نے خوفزدہ نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا لیکن شاہ زیب نے سب سے پہلے چوہدری شیدے کو نشانہ بنایا۔ ہاتھوں میں پکڑا ہوا جیک چڑھانے والی راڈ اس نے پوری قوت سے چوہدری شیدے کی کمر پر ماری اور اس کے حلق سے مکروہ آواز نکل گئی۔

''ہائے مر گیا''۔ وہ اچھل کر چت زمین پر گرا۔ نیچے بیٹھے دونوں آدمی کھڑے ہو گئے تھے۔ شراب کی بوتل ان کے پاس رکھی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک نے بوتل اٹھا کر شاہ زیب پر دے ماری۔ لیکن اس سے فائدہ یہ ہوا کہ شاہ زیب تو جھک گیا البتہ بوتل سامنے کھڑے ہوئے آدمی کے منہ پر لگی اور چونکہ پوری قوت سے پھینکی گئی تھی۔ اس لیے اپنا کام دکھا گئی۔ اس کے منہ سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ بوتل نے اس کے دانت وغیرہ توڑ دیئے تھے۔ دونوں آدمی اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی لیکن شاہ زیب نے راڈ اس کے ہاتھ پر ماری۔ اس وقت رائفل کا استعمال بالکل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے رائفل ٹیکسی میں ہی چھوڑ دی تھی۔ حالانکہ وہ اس کے بہت کام آ سکتی تھی۔ لیکن یہاں کی صورتحال بالکل مختلف تھی اور بھی دوسری بات یہ کہ شاہ زیب رائفل استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔ انسان اس کے ہاتھوں سے بے دریغ قتل ہو رہے تھے اور اسے خود اس قتل و غارت گری کا دلی دکھ تھا لیکن کیا کرتا برائی اس طرح پھیل گئی تھی کہ اسے سنبھالنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا

اور اس وقت شاہ زیب بھی انتہائی خونخوار بنا ہوا تھا۔ جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا وہ اس قدر وحشت ناک تھا کہ بیان سے باہر اس پر جنون سوار تھا اس نے لوہے کی راڈ اس شخص کی کلائی پر ماری جس نے پستول نکالنے کی کوشش کی تھی۔ اور نکلا ہوا پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ لی۔ شاہ زیب نے تیسرے آدمی کو سنبھالا اور لوہے کی راڈ اس پر ماری۔ راڈ میں جیک چڑھانے کے لیے ایک سلاخ کوئی دوانچ لمبی پھنسی ہوئی تھی۔ اس وقت شاہ زیب کا وار کچھ اس طرح بے تکا ہو گیا یا پھر اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ شخص راڈ سے بچنے کے لیے لپک گیا تھا۔ چنانچہ راڈ کا وہ حصہ جو جیک میں پھنس کر چھک کر اوپر اٹھا تا۔ اس شخص کی کنپٹی میں گھس گیا اور اس کی کھوپڑی تڑخ گئی۔ وہ بائیں سمت گرا اس دوران چوہدری شیدا اٹھ گیا تھا اس نے پیچھے سے شاہ زیب کی کمر پر چڑھنے کی کوشش کی۔ اس وقت اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں تھا۔ ورنہ یہ اس کے لیے بہترین موقع تھا کہ اپنے دشمن کو ٹھکانے لگا دے لیکن پھر بھی اس نے پیچھے سے شاہ زیب کو پکڑنے کی کوشش کی اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اس کی گردن پر ہاتھ دیئے لیکن شاہ زیب تیزی سے پیچھے دوڑا۔ اور پوری قوت سے اس شخص کو دیوار پر دے مارا۔ دیوار سے لگا آدمی جس کے دانت وغیرہ ٹوٹ چکے تھے اپنے ہی عذاب میں گرفتار تھا۔ چوہدری شیدے کو شاہ زیب نے دیوار سے مارا تو دیوار ہل گئی۔ اور ایک بار پھر چوہدری شیدے کے منہ سے کربناک آواز نکلی۔ غالباً ریڑھ کی ہڈی بالکل ہی کام چھوڑ گئی تھی۔ اور اس کے بعد شاہ زیب پر جنون سوار ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر لوہے کی راڈ پوری شدت سے چوہدری شیدے کی کمر پر ماری اور اس کی پسلیاں ٹوٹ کر دل میں گھس گئیں۔ منہ سے خون کا فوارہ بلند ہوا۔ شاہ زیب نے دوسری سلاخ اس شخص کے سینے پر ماری جو بدستور دیوار سے لگا رہا تھا۔ دونوں لمبے ہو گئے تھے۔

ادھر ٹوٹی کلائی والا باہر نکل کر بھاگنے کی کوشش کرنے لگا اور جیسے ہی اس نے

دروازے سے باہر قدم رکھا ایک زوردار چیخ سنائی دی اور چوکیدار نے اپنا فرض پورا کر دیا پھر وہ بھی اندر گھس آیا۔ لڑکی جو بندھی ہوئی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس خونی منظر سے انتہائی خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔ ان لوگوں کا خون اچھل اچھل کر اس کے شفاف بدن کو داغدار کر رہا تھا۔ وہ کچھ اس انداز میں کس دی گئی تھی کہ ہل جل بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ ساتھ شرم کے تاثرات بھی تھے۔

بہر حال چاروں کو ناکارہ کر دیا گیا تھا پتہ نہیں ان میں سے کون زندہ تھا اور کون مر گیا تھا لیکن شاہ زیب کو ان پر جنون آ رہا تھا۔ جو کچھ یہ لوگ کر رہے تھے وہ قابل معافی نہیں تھا۔ اس نے ابھی کچھ سوچا بھی نہیں تھا کہ چوکیدار نے لپک کر رائفل اٹھا لی اور پھر دھائیں دھائیں کی آوازوں کے ساتھ ان چاروں کی آخری چیخیں گونجیں۔ چوکیدار نے انہیں بھون کر رکھ دیا تھا۔ وہ خود بھی بڑا مشتعل نظر آتا تھا۔ چند لمحوں تک تڑپنے کے بعد ان کے جسم سرد ہو گئے۔ شاہ زیب کو خوف ہوا کہ بھٹے کے دوسرے مزدور جن کے جھونپڑے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ گولیوں کی آواز سن کر باہر نہ نکل آئیں۔ لیکن بہر حال اب جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ چوکیدار ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ پھر اسے لڑکی کا لباس نظر آیا تو اس نے جلدی سے لباس اٹھا کر لڑکی کے بدن پر ڈال دیا اور آہستہ سے بولا۔

''بیٹا! میں تیرے ہاتھ کھولے دیتا ہوں۔ اٹھ جا اور اپنے کپڑے پہن لے''۔ یہ کہہ کر وہ اس کے ہاتھوں پر جھک گیا۔ شاہ زیب ان چاروں کی لاشوں کو دیکھ رہا تھا۔ جب چوکیدار نے ہاتھ کھول دیئے تو شاہ زیب نے کہا۔

''گولیوں کی آوازیں سن لی گئیں ہوں گی مزدور باہر آ گئے ہوں گے''۔

''نہیں آئیں گے صاحب جی! کوئی بھی نہیں آئے گا۔ ان غریبوں کو ان آوازوں کی عادت ہو گئی ہے۔ یہاں اکثر یہ چوہدری شیدا فائرنگ کر دیتا ہے۔ بس

شوق ہے اس کا۔ ان میں سے کوئی بھی باہر نہیں آئے گا۔ آپ اطمینان رکھو''۔

''اوہ''۔ شاہ زیب کے منہ سے نکلا۔ چوکیدار ویسے تو کافی شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت اس کی غیرت جاگ گئی تھی اور یہ خون اس نے ہی کیے تھے۔ اس کے انداز میں خوف کا کوئی اظہار نہیں تھا۔ اس نے نفرت سے بھرے لہجے میں کہا۔

''کنجر بنا کر رکھ دیا تھا اس حرامی شیدے نے ہمیں۔ اس کے یہ آوارہ اوباش دوست یہاں لڑکیاں لاتے رہتے تھے اور ہمیں ان کی چوکیداری کرنی پڑتی تھی۔ ان کے گندے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ تو اپنے کپڑے پہن لے بیٹا! اللہ نے تجھے بچا دیا ہے۔ ہم باہر کھڑے ہوئے ہیں تم فکر مت کرنا''۔ چوکیدار نے کہا اور شاہ زیب کے ساتھ باہر نکل آیا۔

چاروں طرف تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ چوکیدار کے بیان کی تصدیق ہوگئی۔ کوئی اس طرف نہیں آیا تھا لیکن شاہ زیب بڑے گہرے انداز میں سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''جب وہ لوگ یہاں لڑکیوں کو لاتے ہیں اور بقول تمہارے عیاشی کرتے ہیں اور تمہیں اپنے کاموں کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ تو اس بار انہوں نے تمہیں کیوں باندھ دیا''۔

''یہ چراغ دین کی بیٹی ہے جی! جسے وہ اٹھا کر لے آئے ہیں۔ ہم سینہ تان کر کھڑے ہوگئے تھے ہم نے کہا تھا کہ چراغ دین ہمارے بچپن کا دوست ہے۔ اس لڑکی کو واپس کر دو۔ بس بگڑ گئے۔ دھوکے سے چوہدری شیدا مجھے سمجھاتا ہوا پیچھے لے آیا اور ان لوگوں نے میرا ڈنڈا اٹھا کر میرے سر پر دے مارا۔ پھر میرے ہاتھ پاؤں بھی باندھ دیئے۔ بے ہوش ہوگیا تھا میں مگر تھوڑی دیر میں مجھے ہوش آ گیا۔ اللہ نے تمہیں اس کی

عزت آبرو کا محافظ بنا کر بھیج دیا''۔

''کیا نام بتایا تھا تم نے اس لڑکی کی بستی کا''۔

''گن موری ہے جی۔ یہیں سے دیکھو گے تو سامنے تمہیں اس کی روشنیاں نظر آئیں گی وہ کیا دو میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں سے نظر آتا ہے۔ ہم بھی وہیں کے رہنے والے ہیں۔ اب پتہ نہیں آپ کدھر سے آئے ہو صاحب! کون ہو؟ اور یہاں تک کیسے آ گئے؟ ورنہ آپ کو پتہ ہوتا کہ یہ بھٹے والے کیا کرتے ہیں اور یہ چوہدری شیدا یہ تو پکا جرائم پیشہ ہے۔ اپنے باپ کو اس نے خود نشے کا عادی بنایا ہے۔ وہ افیم کھاتا ہے جی۔ اور بس پلنگ پر پڑا رہتا ہے۔ بھٹے کا کام یہی سنبھالتا ہے۔ یہاں جو مزدور رہتے ہیں ان کی ساری جوان بیٹیاں اس کی بھینٹ چڑھ چکی ہیں۔ سب کے دل زخموں سے چور ہیں۔ پر یہ لوگ ایسے ہی جال میں گرفتار کر لیتے ہیں۔ رقم دے کر بندے کو خرید لیتے ہیں اور اس کے بعد اس کا سارا مال اسباب آل اولاد ان کی ملکیت ہوتی ہے۔ چوہدری شیدے نے ظلم کے پہاڑ توڑ رکھے تھے۔ بار بار ہمارے دل میں خیال آیا کہ ہم چڑھ جائیں سولی پر اور اب بھی ہم خوشی سے تیار ہیں۔ یہ چار بندے ہم نے مارے ہیں۔ مالک کی قسم دنیا کے ہر بندے کے سامنے یہ کہنے کو تیار ہیں۔ کہ دیکھو ہم نے یہ کارنامہ سر انجام دیا ہے۔ ہماری عزت کرو۔ ہم نے دوسروں کی عزت لوٹنے والے کو زندہ درگور کر دیا ہے۔ ختم کر دیا ہے ہم نے''۔ چوکیدار جذباتی ہوگیا تھا۔

''بہرحال تم نے ایک نیک کام کیا ہے۔ لیکن زندگی بچانا بھی فرض ہوتا ہے۔ لڑکی کا کیا نام ہے''۔

''جانتے ہیں جی یہ جمیلہ ہے بے چاری۔ جمیلہ ہے اس کا نام''۔

''اب ایسا کر کیا باہر ان کی گاڑی موجود ہوتی ہے''۔

''ہاں جی۔ یہ لوگ گاڑی پر ہی گئے تھے۔ دارو لینے پتہ نہیں کہاں سے لائے

ہیں کچی شراب پیتے ہیں جی۔ یہاں اکثر آ کر غل غباڑہ مچاتے ہیں''۔

''ایک ٹیکسی بھی کھڑی ہوئی ہے۔ ان کی کون سی گاڑی ہے''۔

''جیپ ہے''۔

''اب تمہیں ایک کام کرنا پڑے گا اب چاہو تو کپڑے اتار لو۔ ان چاروں کو جیپ میں پہنچا دینا باقی کام میں کرلوں گا''۔

''ابھی لو جی۔ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے''۔

''میری پوری بات سن لو لڑکی کو میں راستے میں سمجھا دوں گا کہ وہ کسی سے بھول کر بھی اس بات کا تذکرہ نہ کرے۔ کہ اسے اغوا کرلیا گیا تھا۔ اس میں اس کی بچت ہے ان چاروں کی موت وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہے۔ میرا خیال ہے اس کی حالت بھی کافی خراب ہوگی۔ لیکن میں ان کی لاشوں کو ٹھکانے لگا دوں گا۔ تم بھول کر بھی کسی سے یہ بات مت کہنا کہ چوہدری شیدا اپنے دوستوں کے ساتھ ادھر آیا تھا۔ یہاں سے ان کی آمد کا تمہیں ایک ایک نشان مٹانا ہے۔ ٹوٹی ہوئی بوتلوں کے ٹکڑے، خون کے دھبے، سمجھ لو اسی میں تمہاری زندگی ہے۔ میرا تو کچھ نہیں ہے نہ تم مجھے جانتے ہو کہ کوئی تم سے میرے بارے میں پوچھے اور تم اسے بتا دو۔ نہ کسی کو پتا ہے کہ یہاں آ کر میں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ ایک ایک نشان مٹا دو اور اگر کوئی شیدے یا ان کمینوں کے بارے میں آ کر پوچھے تو صاف مکر جانا۔ کہہ دینا کہ یہاں تو چوہدری شیدا کئی دن سے آیا ہی نہیں ہے۔ چوکیدار غور سے شاہ زیب کی صورت دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''اللہ تمہیں خوش رکھے۔ ہم تو سر جی! شہید کہلانے کے لیے تیار ہیں یہ نیک کام کیا ہے اگر اس کے بدلے میں ہمیں موت کی سزا بھی ہو جائے۔ تو ہمیں پرواہ نہیں ہے اگر پیچھے بھی کوئی نہیں ہے ہمارا پر دل خوش ہوگا کہ ہم نے ایک نیک کام کیا ہے''۔

''دیکھو...... جب تک زندگی بچ سکتی ہے بچانی چاہیے۔ نیک کام کیا ہے تو

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جا کر پھانسی کا پھندہ اپنے گلے میں فٹ کرلو۔ سمجھ رہے ہو نا اس وقت تک خاموشی اختیار کیے رکھنا۔ جب تک کہ انتہا ہی نہ ہو جائے۔ ویسے کچھ ہوگا نہیں اس بات کا اطمینان رکھو۔ پھر اس کے بعد چوکیدار ایک ایک کر کے چاروں لاشیں باہر لے آیا۔ لڑکی نے کپڑے پہن لیے تھے اور وہیں جھونپڑی میں سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی دماغی کیفیت بہتر نہیں معلوم ہوتی تھی۔

شاہ زیب نے ان کی جیپ تلاش کر کے قریب لا کر کھڑی کر دی تھی۔ کھلی جیپ تھی۔ جو عام طور سے ایسے علاقوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ شاہ زیب اب تک یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ ٹیکسی بھی یہیں موجود تھی۔ ٹیکسی کو یہاں چھوڑ کر وہ پولیس کو شبہ کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ ویسے تو اسے کوئی پرواہ نہیں تھی لیکن اب اس نیکوکار چوکیدار کی حفاظت بھی اس کا فرض بن گئی تھی۔ چنانچہ ٹیکسی کو بھی یہاں سے ہٹانا بڑا ضروری تھا۔ وہ اس سلسلے میں سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

بہر حال جیب میں چاروں لاشیں لاد دی گئیں اور شاہ زیب جیپ لے کر چل پڑا لڑکی کو اس نے یہیں چھوڑ دیا تھا اور چوکیدار سے کہہ دیا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آ جائے گا۔

بہر حال اب اسے کسی ایسے گڑھے کی تلاش تھی۔ جس میں اس جیپ کو پھینکا جا سکے۔ یہ بڑا ضروری تھا اور خوش قسمتی تھی کہ اسے ایک کھائی نظر آ گئی۔ اچھی خاصی گہری کھائی تھی اور نیچے بڑے بڑے چٹانی پتھر پڑے ہوئے تھے۔ یہ جگہ بھی شاید انہی لوگوں کے لیے بنائی گئی تھی۔

چنانچہ شاہ زیب وہاں جیپ سے اتر گیا۔ اس نے جیپ کو کھائی کے بالکل کنارے اس جگہ لا کر کھڑا کر دیا کہ تھوڑی سی کوشش کر کے اس کے پہیے کھائی میں اتر جائیں۔ پھر اس نے پیچھے سے جیپ پر زور لگایا اور جان جوکھوں سے کام لیتے ہوئے

جیپ کو کھائی میں لڑھکا دیا۔ جیپ نیچے گری پھر اس سے پٹرول بہا اور آخر میں اس میں آگ لگ گئی۔ شاہ زیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ پھر اس کے بعد اس نے واپسی کا راستہ پیدل طے کیا۔

چوکیدار اور چراغ کی بیٹی جمیلہ جاگ رہے تھے۔ لڑکی زار و قطار رو رہی تھی اور چوکیدار اسے سمجھا رہا تھا کہ شاہ زیب اندر داخل ہوا۔ لڑکی نے روتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ شاہ زیب آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''خدا کا شکر ہے کہ تم بچ گئیں۔ اب آؤ میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں۔ راستے میں تم سے باتیں کروں گا''۔ شاہ زیب نے کہا اور اس کے بعد وہ چوکیدار سے بولا۔

ٹھیک ہے بھائی! ہماری اور تمہاری یہ ملاقات بہت عجیب رہی۔ میں چلتا ہوں اگر کبھی دوبارہ موقع ملا تو تمہارے پاس آؤں گا اور تم سے باتیں کروں گا۔ ویسے جو کچھ میں نے تمہیں سمجھایا ہے تمہیں وہی کرنا ہے اور سنو...... میں نے ان کی جیپ آگے تھوڑے فاصلے پر موجود ایک کھائی میں پھینک دی ہے۔ جیپ جل رہی ہے اور ان کی لاشیں بھی جل جائیں گی۔ لوگ یہی سمجھیں گے کہ دارو کے نشے میں وہ اس طرف نکل گئے اور کھائی میں گر کر موت کو شکار ہو گئے۔ لیکن تم ایک ایک نشان مٹا دینا۔ پولیس بال کی کھال نکالتی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بیوقوفی کر جاؤ''۔

''نہیں۔ ہم اپنی بھی زندگی بچائیں گے سرجی، آپ کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ جب بھی کبھی موقع ہو اور آپ ادھر آؤ۔ تو اس غریب کو ضرور یاد کر لینا''۔

شاہ زیب باہر نکل آیا۔ لڑکی اس کے ساتھ لڑکھڑاتی ہوئی چل رہی تھی۔ شاہ زیب نے اسے ٹیکسی میں بٹھایا اور اس کے بعد وہاں سے چل پڑا۔ ایک بار پھر وہ اس

کھائی کے قریب سے گزرا جیپ سے اب دھواں اٹھ رہا تھا۔ شاہ زیب کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس کے بعد وہ یہاں سے آگے بڑھ گیا۔ لڑکی بالکل خاموش تھی۔ شاہ زیب نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بستی سے کافی فاصلے پر ٹیکسی چھوڑ دے گا اور اس کے بعد پیدل چلتے ہوئے لڑکی کو تفصیل بتائے گا اور اس سے اس کے بارے میں پوچھے گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک جگہ اسے جوہڑ نظر آیا۔ بدبو اٹھ رہی تھی گندے پانی کا جوہڑ تھا۔ مچھروں کے غول اس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہ زیب کچھ دیر سوچتا رہا اور اس کے بعد اس نے ٹیکسی کے ایکسیلیٹر پر پتھر رکھا اور لڑکی کو نیچے اتارنے کے بعد کلچ چھوڑ کر خود بھی نیچے اتر گیا۔ بڑی پھرتی کا کام تھا۔ لیکن تھا بڑا پائیدار ٹیکسی نے جوہڑ میں چھلانگ لگائی تھی۔ اور شاہ زیب یہ دیکھ کر حیران ہو گیا تھا کہ کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ جوہڑ میں غروب ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بڑی گہری جگہ ہے۔ لڑکی خاموش کھڑی ہوئی اس کی یہ تمام کاروائی دیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد شاہ زیب نے اس کا ہاتھ پکڑا اور آہستہ سے بولا۔

''تمہیں مجھ سے بالکل نہیں ڈرنا چاہیے۔ میرے لیے تم چھوٹی بہنوں کی مانند ہو۔ خاموشی سے آگے آ جاؤ''۔ لڑکی پھر بے اختیار رو پڑی تھی۔

''نہیں بیٹا! روتے نہیں ہیں جمیلہ ہے نا تمہارا نام''۔ شاہ زیب نے کہا اور لڑکی نے معصومیت سے زور زور سے گردن ہلا دی۔ پھر شاہ زیب نے اسے کہا۔

''اچھا یہ بتاؤ بیٹا جمیلہ! کہ ان لوگوں نے تمہیں کس وقت اغوا کیا تھا''

''شام کو ہم شمیلا کے پاس جا رہے تھے۔ شمیلا ہماری سہیلی ہے۔ بابا سے پوچھ کر گھر سے نکلے تھے ہم''

''تمہارے گھر میں اور کون ہے؟''

''بابا ہے اور میں ہوں بس، اماں مر چکی ہے''

''شمیلا تمہاری بہت گہری دوست ہے''

''ہاں جی''

''اچھا اب یہ بتاؤ۔ آگے جا کر کیا کہو گی؟''

''پتہ نہیں جی۔ ہمیں کچھ نہیں پتہ''

''میں تمہیں بتاتا ہوں تم کہنا کہ شمیلا کے گھر جا رہی تھیں کہ راستے میں تمہیں چکر آ گئے۔ اور اس کے بعد تم بے ہوش ہو گئیں۔ ہوش آیا تو میں کسی جگہ پڑی ہوئی تھیں۔ جگہ کا نام تم خود بتا دینا۔ یہاں وہاں کوئی کھنڈر وغیرہ تو نہیں ہے''

''ہے جی۔ وہ سامنے ہی تو نظر آ رہے تھے۔ یہ جن گڑھی کہلاتی ہے''

''اوئے واہ۔ پھر تو کام بن گیا۔ تم جیسی پیاری سی خوبصورت لڑکی کو جن اٹھا کر لے گئے تھے۔ بس وہاں پڑی ہوئی تھیں تم۔ اب اٹھ کر آئی ہو۔ دیکھو میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو کہ بات تو تمہیں پتہ چل ہی چکی ہے جمیلہ! چوہدری شیدا اور اس کے تینوں ساتھی مار دیئے گئے ہیں۔ اب جان بچانا تمہارا فرض ہے۔ تم اپنے آپ کو ایسا کرو تھوڑے دن کے لیے بالکل پاگل ظاہر کرو۔ اتنا کام تو تمہیں کرنا چاہیے۔ تم سمجھدار لڑکی ہو...... ہونا''۔

جمیلہ نے پھر معصومیت سے گردن ہلا دی تھی اور یہ کہا تھا کہ وہ بہت سمجھدار ہے۔ شاہ زیب ہنسنے لگا تھا۔ لڑکی اسے بہت پیاری لگ رہی تھی۔ لیکن جس عالم میں اس نے اسے دیکھا تھا۔ اس کا احساس جب بھی لڑکی کو دیکھتا شاہ زیب کو وہ شرمناک منظر یاد آ جاتا تو اس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ بہر حال وہ لڑکی کی دلجوئی کرتا رہا۔ پھر اس کے بعد اس نے کہا۔

''میں تمہیں تمہارے گھر کے دروازے پر چھوڑ دوں گا۔ یقیناً تمہارا باپ تمہارے لیے پریشان ہو گا''۔

''میرے بابا کی تو جان نکلی ہو گی''

''ہاں یہ تو ہے''

''ویسے ایک بات بتاؤں تمہیں''

''ہاں بولو''

''کریمو بھی تھا ان لوگوں کے ساتھ''

''کن کے ساتھ''

''جو شیدے کے دوست تھے''

''تم اسے پہلے سے جانتی ہو''

''ہاں جی...... وہ...... وہ......'' لڑکی جھجک کر خاموش ہو گئی۔

''ہاں بولو''

''وہ جی! وہ میرے ماما کا بیٹا ہے''

''کیا......'' شاہ زیب اچھل پڑا۔ لڑکی کی آواز میں سسکیاں گوندھی ہوئی تھیں۔ وہ کہنے لگی۔

''اس سے میری منگنی ہوئی ہے۔ وہ...... وہ...... وہ بس اس نے میرے بھروسے سے فائدہ اٹھایا۔

''مطلب''

''چوہدری شیدے کا...... چوہدری شیدے کا دوست تھا وہ...... چوہدری شیدے کا یار تھا۔ اب مجھے کیا معلوم کہ وہ اس طرح کا آدمی ہے۔ میرے بابا نے بڑی چاہت سے میری منگنی اس کے ساتھ کی تھی۔ سال بھر کے بعد ہماری شادی ہونے والی تھی۔ وہ میرے ماما کا بیٹا تھا۔ اس لیے میں کبھی کبھی اس سے ملتی رہتی تھی۔ اسنے کبھی کسی بات کا موقع نہیں دیا کہ میں سوچتی کہ وہ برا آدمی ہے۔ وہ چالاکی سے کام لے رہا تھا۔

اس نے..... اس نے..... ''لڑکی کی آواز ایک بار پھر رندھ گئی۔

''ہاں..... بولو گے''

''بعد میں مجھے پتہ چلا کہ چوہدری شیدے نے اسے رقم دی ہے اور کہا ہے کہ وہ ادھر مجھے بھٹے پر اٹھا لائے۔ دھوکہ دے کر لایا تھا جی چوپ گڑھی لے گیا۔ وہاں سے اپنے کھیت دکھانے لے گیا جہاں وہ گاڑی کھڑی ہوئی تھی اور چوہدری شیدا اپنے بندوں کے ساتھ موجود تھا وہ..... وہ جی وہاں سے ان لوگوں نے مجھے بے ہوش کر دیا اور پھر میری آنکھ اس جھونپڑی میں کھلی۔ جہاں آپ نے مجھے دیکھا جی۔ مارا گیا حرامی اس کا ستیاناس ہو۔ آپ نے مجھے بچا لیا جی۔ میں..... میں آپ کو دعاؤں کے سوا اور کیا دے سکتی ہوں۔ بچا لیا جی آپ نے مجھے''۔

''اچھا دیکھو..... میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ جیسا کہ میں نے تم سے کہا کہ گھر جا کر یہ مت بتانا کہ تمہیں اغوا کر لیا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے پولیس بھی وہاں پہنچ جائے۔ تم لوگوں سے معلومات حاصل کی جائیں۔ نہ تم کریمو کا نام لینا اور نہ چوہدری شیدے کا ان کے قاتلوں کو روپوش ہی رہنے دو۔ کیا سمجھیں جمیلہ ہے نا تمہارا نام''

''ہاں جی''

''بس میں تمہیں یہ مشورہ دے رہا ہوں۔ باقی آگے تمہاری مرضی ہے۔ میں تو کہیں نہ کہیں گم ہو ہی جاؤں گا۔ مصیبت میں پھنسو گی تو تم کبھی بھول کر یہ بات چراغ دین کو بھی مت بتانا کہ کیا ہوا تھا۔ بس وہی کہانی گھڑ دینا جو میں نے تمہیں سنائی ہے۔ کہنا تمہیں جن اٹھا کر لے گئے تھے۔ ہوش آیا تو کھنڈر کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ بس وہاں سے اٹھ کر آ رہی ہو۔ کیا سمجھیں''۔

''ٹھیک ہے جی..... میں ایسا ہی کہہ دوں گی۔ اور کیا آپ ہمارے ساتھ ہمارے گھر نہیں چلو گے''۔

''نہیں جمیلہ! میں تمہارے گھر نہیں جا سکتا''

''ہمیں ڈر لگے گا جی''

''نہیں میں تمہارے گھر کے دروازے پر ہی چھوڑ دوں گا''۔ شاہ زیب نے کہا اور جمیلہ خاموش ہو گئی۔

بہرحال شاہ زیب اسے لیے ہوئے باقی فاصلہ طے کر کے گن موری پہنچ گیا۔ اچھا خاصا بڑا گاؤں تھا۔ کافی مکانات تھے یہاں وہ لڑکی کی رہنمائی میں آگے بڑھتا رہا۔ پھر ایک چوڑی سی گلی میں داخل ہو گیا۔ جہاں آگے چل کر ایک میدان جیسا نظر آتا تھا۔ اس نے لڑکی کو اس کے گھر کے دروازے پر چھوڑا دفعتاً ہی ایک عجیب سا احساس ہوا۔ لڑکی کیواڑوں میں ہاتھ ڈال کر کنڈی کھول کر اندر داخل ہو گئی تھی۔ پھر اس نے دروازہ بھی بند کر لیا تھا۔ شاہ زیب خود بھی اندر نہیں جانا چاہتا تھا۔ بس اتنا ہو گیا تھا کہ وہ مزید چار افراد کا قاتل بن گیا تھا۔ یہ اندازہ لگانا تو مشکل ہی تھا کہ شاہ زیب کی کسی ضرب سے ان میں سے کوئی ہلاک ہوا یا پھر چوکیدار کی غیرت جاگنے سے۔

بہرحال جو کچھ ہوا تھا وہ خاصا خطرناک تھا۔ جو احساس شاہ زیب کو ہوا تھا وہ بھاری بوٹوں کی آواز کا ہوا تھا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو ایک دم سے اس کا پتا پانی ہو گیا۔ اسے دو ٹرک نظر آئے تھے اور یہ ٹرک یقینی طور پر پولیس کے تھے۔ سفید نشانات چمک رہے تھے۔ جن میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ درختوں کے نیچے کچھ سائے بھی چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ وہ یقیناً پولیس کے سپاہی تھے۔ شاہ زیب ششدر رہ گیا۔ پتہ نہیں یہ پولیس یہاں کیوں آئی تھی۔ کیا شاہ زیب کے پیچھے ویسے جو سنگین واردات وہ کر آیا تھا جس میں اس نے ایس پی کو زخمی کر دیا تھا اور یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ایس پی زندہ ہے یا مر گیا۔ اس کے بعد اس کی حیثیت بالکل ہی مختلف ہو گئی تھی۔

ہو سکتا ہے ایس پی نے بیان دے دیا ہو کہ اسے مارنے والا یا زخمی کرنے والا

شاہ زیب ہے ظاہر ہے اتنے پولیس والوں کا قاتل اور اتنا خطرناک آدمی معمولی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ لوگ فوراً ہی اس کی گرفتاری پر چڑھ دوڑے ہوں۔ نشانات تو بہرحال مل ہی رہے ہوں گے۔ اچانک ہی شاہ زیب نے اندھیری گلی میں دوڑ لگا دی۔ اسے اپنے پیچھے بھاری بھرکم بوٹوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اور اسے یقین ہو گیا کہ سپاہی اس کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ پھر ایک گرجتی ہوئی آواز فضا میں ابھری۔

''رک جاؤ۔ ورنہ گولی ماردی جائے گی''۔ لیکن رکنے کا کیا سوال تھا۔ شاہ زیب نے اپنی رفتار اور تیز کر دی اور اسی وقت کئی گولیاں سنسناتی ہوئی اس کے دائیں بائیں سے گزر گئیں۔ گلی کافی لمبی تھی۔ گولیوں کی ایک اور باڑ ماری گئی۔ ان سے بچنے کے لئے شاہ زیب تیزی سے ایک دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ پولیس والے تیزی سے دوڑتے ہوئے آ رہے ہیں۔ گلی میں آگے بڑھنا ناممکن سا ہو گیا تھا کیونکہ وہ کافی قریب آ گئے تھے۔ شاہ زیب نے زور سے دروازے کو پیچھے دھکیلا تو اس کی اندر کی کنڈی کھل گئی اور وہ پاگلوں کی طرح اس مکان کے کچے صحن میں جا گھسا۔ آگے ایک سیڑھی نظر آ رہی تھی جو اوپر جاتی تھی۔ اب اس وقت ضروری تھا شاہ زیب گھر میں گھسے رہنے کے بجائے چھت پر پہنچ جائے۔ اس نے برق رفتاری سے سیڑھی عبور کی اور چھت پر جا چڑھا۔ پولیس والے گلی میں سخت بھاگ دوڑ کر رہے تھے ان کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''وہ کسی گھر میں چھپ گئے ہیں سارے گھروں کی ناکہ بندی کر دو''۔ شاہ زیب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ صورتحال کافی خطرناک ہو گئی ہے اور وہ بری طرح گھر چکا ہے۔ فی الحال اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کدھر جائے۔ کس طرف نکلے۔ دوسری گلی میں کودنا بھی کسی طرح سودمند نہیں تھا کیونکہ اُسے یقین تھا کہ یہ لوگ کھلی جگہ پر دیکھتے ہی گولیاں برسانا شروع کر دیں گے۔ وہ شاہ زیب کو ہر قیمت پر پکڑنے کی کوشش کر رہے

تھے۔

بہرحال اسے ان کی نظروں سے بچنا تھا ورنہ اس جگہ زندگی کی بازی ہار جاتا۔ وہ اس گھر کی چھت پر منڈیر کے ساتھ لگ کر سیدھا سیدھا لیٹ گیا۔ تاکہ وہ کسی طرف سے اسے نہ دیکھ سکیں۔ دفعتاً اوپر بنے ہوئے کمرے کا دروازہ کھلا روشنی کی رمق باہر نکلی اور ایک عورت کی آواز سنائی دی۔

''یہ تو بڑی گڑبڑ ہو رہی ہے۔ گولیاں بھی چلی ہیں''۔

''تو چپ چاپ پڑی رہ میں دیکھتا ہوں''۔

''پتہ نہیں کیا ہو گا ذرا دیکھوں تو سہی''۔ کوئی عورت باہر نکل آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک مرد بھی باہر نکلا تھا۔ اور پھر ان دونوں نے شاہ زیب کو دیکھ لیا تھا۔ شاہ زیب تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے یہ لوگ چیخیں۔ کچھ کر لینا ضروری تھا۔ چنانچہ شاہ زیب نے فوراً ہی ریوالور مرد کی کنپٹی پر رکھ دیا اور غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''خبردار! ذرا بھی آواز آئی تو تم دونوں کو یہیں ڈھیر کر دوں گا''۔ عورت اور مرد دونوں سکتے میں رہ گئے تھے۔ مدھم روشنی میں ان کے خوف سے بگڑے ہوئے چہرے صاف نظر آ رہے تھے۔ لیکن شاہ زیب نے پہلی بار مرد کو غور سے دیکھا اور دفعتاً ہی اس کا ہاتھ لرز گیا۔ یہ شکل اجنبی نہیں تھی۔ دشمن بھی نہیں تھی...... وہ...... بلکہ...... بلکہ......۔

☆

ملکہ بائی کی ٹانگوں کا پلاسٹر کٹ چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے ایکسرے وغیرہ کر کے اسے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اب اس کو یہاں رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن یہ بتا دیا گیا تھا اسے کہ عمر کی وجہ سے اس کی ہڈیاں بہت کمزور ہیں۔ وہ زیادہ چلنے پھرنے سے گریز کرے اور اپنی ٹانگوں کی حفاظت کرے۔ ملکہ بائی گھر واپس آ گئی۔

دوسری لڑکیاں تو خوش تھیں لیکن ریحانہ جانتی تھی کہ اس کے اور ملکہ بائی کے درمیان ایک زبردست جنگ کا آغاز ہو گیا ہے۔ وہ ملکہ بائی کے سامنے نہیں آئی جبکہ سازندوں وغیرہ نے اور پڑوس کی طوائفوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مٹھائی وغیرہ تقسیم کی تھی۔ ملکہ بائی اندر سے تو آتش فشاں بنی ہوئی تھی۔ لیکن شیطان صفت تھی۔ انتقام لینے کے لیے اس نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ چنانچہ اس نے خود ہی ریحانہ کو طلب کیا۔

''ارے میری ریحانہ بیٹی کہاں گئی...... اسے تو بلاؤ...... جاؤ ریحانہ کو بلا کر لاؤ''۔ ریحانہ اپنے کمرے میں تھی۔ جب اس کا بلاوا آیا تو اس نے اپنے آپ کو ملکہ بائی کے سامنے کرنے کیلئے تیار اور آخر کار وہ ملکہ بائی کے کمرے میں پہنچ گئی۔ ملکہ بائی محبت بھری نگاہوں سے ریحانہ کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور بولی۔

''آؤ میری دشمن...... دشمن کو گلے لگانے میں جو لطف آتا ہے۔ اسے وہ ہی جانے جو دشمن کی قدر کرتا ہے۔ آجا میں جانتی ہوں کہ تو اپنے دل میں میرے لیے کیا جذبات رکھتی ہے۔ دشمن ہے نا تو میری، مگر پتھروں سے بھی پیار ہو جاتا ہے۔ تو تو انسان ہے بہت عرصے سے تیرا میرا ساتھ ہے اور یہ کم بخت جوانی چیز ہی ایسی ہوتی ہے۔ بگڑ جائے تو ایسا جھٹکا دیتی ہے انسان کو کہ اسے سہی راستے پر لانے والا کوئی رہتا۔ اب آ...... یا، دور ہی کھڑی رہے گی۔ ملکہ بائی نے کہا اور ریحانہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔

بہرحال وہ بھی دنیا ساز تھی۔ ملکہ بائی کے ہتھکنڈے دیکھے تھے۔ سمجھ تھی گئی اچھی طرح کہ سانپ اگر کینچلی میں لپٹا ہوا ہو تب بھی سانپ ہی ہوتا ہے اور اگر کوئی مکاری سے مارنا چاہتا ہو۔ تو زیادہ خوفناک ہو سکتا ہے۔ ملکہ بائی نے اسے خوب زور سے سینے سے بھینچ لیا تھا۔

''عشق ہو گیا ہے نا تجھے شاہ زیب سے۔ ہیں...... میں نے تو خیر ٹھیک ہی کیا مگر تو نے وہ نہیں سوچا جو میں سوچ رہی تھی۔ باولی! اس وقت تو ہمیں معلوم ہی نہیں تھا۔ ہم نے تو صرف راجہ شہاب الدین کے کہنے پر اسے پکڑوایا تھا۔ لیکن اب پتہ ہے کیا بات ہے۔ دس لاکھ روپے انعام ہے اس پر۔ دس لاکھ کیا سمجھیں''۔ ریحانہ خاموش رہی تھی ملکہ بائی اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔

''مگر میں تھوکتی ہوں ان دس لاکھ پر۔ جن سے تیری دل زاری ہو بول کیا کر سکتی ہوں میں نے تیرے لیے۔ تو نے تو مجھے ختم کرنے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔ بس وہی بات ہے کہ بھلا تو ہو بھلا میں تیری جوانی کو سکون دینا چاہتی ہوں۔ لیکن میری ایک بات سن لے ریحانہ! طوائف کے کوٹھے سے اتر کر کسی بھی متبرک جگہ چلی جائے۔ تجھے جاننے والے تجھے طوائف ہی کہیں گے۔ محبت کرتی ہے تو اس سے تو ٹھیک ہے جا اور اس کی زندگی کو سکون دے دے۔ جہاں دل چاہے چلی جا میں تجھے نہیں روکتی۔ سمجھ رہی ہے نا تو۔ جا تلاش کر لے اسے اور روپوش ہو جا دنیا کے کسی گوشے میں۔ میری جو مدد تمہیں درکار ہو مجھے بتا دینا۔ تیری برائی کے جواب میں احسان کر رہی ہوں تجھ پر صرف اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔ بہت کچھ سوچا ہے میں نے ہسپتال کے بستر پر لیٹ کر، سب مجھے دیکھنے آئے لیکن تو نہیں آئی لیکن کوئی بات نہیں۔ تیرے دل میں ظاہر ہے میرے لیے برائی تھی مگر پگلی ہم لوگ کہیں کے نہیں ہوتے۔ دھوبی کے کتے ہیں ہم لوگ نہ گھر کے نا گھاٹ کے کوئی ہمیں اپنے گھر میں عزت کا مقام دینے کو تیار نہیں ہو سکتا۔ ہاں! یہ الگ بات ہے کہ ہمارے جسم گدلائے ہوئے ہوں۔ ہمارے چہروں پر جوانی چمکتی ہو۔ تو ہمارے لیے بہت سے سہارے ہوتے ہیں اور جب بھی جوانی کی چمک ماند پڑتی ہے تو سمجھ لے کہ اس کائنات میں ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ اور اس وقت جوانی

کے دور کی محنت کام آئی ہے۔ اگر کچھ ہے زندگی گزارنے کے لیے تو زندگی گزر جاتی ہے ورنہ سڑک پر۔ میں تجھے کیا بتاؤں۔ جونکڑ والے چوک پر گاڑی میں ایک اپاہج عورت پڑی رہتی ہے۔ اس کا نام سنگیت ہے۔ یہ نام اسے اس کے چاہنے والوں نے دیا تھا۔ دیکھ سنگیت اپاہج پڑا ہے۔ لوگ اس پر سکے پھینک دیتے ہیں تو سنگیت روٹی کھا لیتا ہے۔ ورنہ سنگیت کو پوچھنے والا اب کوئی نہیں ہے۔ جو بندہ اسے صبح کو گاڑی میں لا کر چھوڑتا ہے اور شام کو کسی سائے میں کھڑا کر دیتا ہے۔ وہ پانچ روپے روز لیتا ہے اس سے۔ چاہے اس کے اپنے پاس کھانے کے لیے ہو یا نہ ہو۔ یہ ہماری انتہا ہے''۔ ملکہ بائی خاموش ہو گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملکہ بائی کے الفاظ نے ریحانہ کو لرزا دیا تھا۔ ملکہ بائی نے لوہا گرم دیکھا تو اس پر چوٹ لگائی۔

''اس کے باوجود اگر تیرا دل چاہے تو اسے تلاش کرے وہ مجرم ہے۔ جرائم پیشہ ہے اور اس کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ گرفتار ہو گیا تو سزائے موت ہو جائے گی اسے۔ سمجھ رہی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے سر کی قیمت دس لاکھ ہے۔ پورے دس لاکھ روپے جو بہرحال ایک حیثیت رکھتے ہیں۔ اسے تلاش کر کے میں وعدہ کرتی ہوں کہ تجھے اس کے حوالے کر دوں گی''۔ ملکہ بائی خاموش ہو گئی۔

مگر یہ رات ریحانہ پر قیامت کی رات گزری تھی۔ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ ملکہ بائی مکاری کر رہی ہے۔ پوری پوری مکاری اور دھوکہ دے رہی ہے اسے۔ لیکن ایک بات بالکل سچ تھی۔ وہ یہ کہ اگر سارے مسائل حل ہو جائیں۔ تو کیا شاہ زیب اسے اپنی زندگی میں کرے گا۔ ایسی بات تو اس وقت بھی نہیں ہوئی تھی جب وہ مری کی سیر کر رہے تھے۔ لیکن بہرحال ریحانہ نے آخری فیصلہ یہی کیا تھا کہ کچھ بھی ہو وہ شاہ زیب کو دھوکہ کسی قیمت پر نہیں دے گی۔ کچھ ملے یا نہ ملے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ تین دن گزر گئے۔ ملکہ بائی کا رویہ حیرت انگیز طور پر نرم تھا ایسا لگتا تھا جیسے اسے ریحانہ کے عمل کا اب

کوئی احساس نہ رہ گیا ہو۔ حالانکہ وہ ایک ناممکن بات تھی۔ قطعی ناممکن بہرحال چوتھے دن ملکہ بائی نے اسے دن میں طلب کیا اور بولی۔

''ہاں! کیا فیصلہ کیا تو نے شاہ زیب کے بارے میں دیکھ پہلے تو میں نے جو کچھ کیا۔ راجہ شہاب الدین کے کہنے پر کیا۔ اب میرا اس سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ تو اسے تلاش کرے اگر چاہے تو میں تجھے یہاں سے جانے کی اجازت بھی دے سکتی ہوں۔ جہاں دل چاہے چلی جا''۔

''اماں! مجھے کیا معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ پولیس اسے تلاش نہیں کر سکتی تو میں کیا تلاش کر سکوں گی''۔

''ہاں یہی میں بھی کہنا چاہتی تھی۔ وہ خود بھی دوبارہ شاید تیری طرف کبھی نہ آئے۔ ہم کلیجہ نکال کر بھی رکھ دیں گے اس کے سامنے تو وہ یہی سمجھے گا کہ ہم دھوکہ کر رہے ہیں خیر بہرحال اس کا سمجھنا بھی حق بجانب ہے۔ کیونکہ وہ ایک بار یہاں سے دھوکہ کھا چکا ہے۔ خیر میں تیری رائے جاننا چاہتی ہوں''۔

''نہیں اماں! میری کیا رائے ہو گی۔ مل گیا کبھی تو پوچھوں گی اس سے کہ کیا وہ کبھی مجھے اپنی زندگی میں کہیں جگہ دے سکتا ہے۔ باقی جہاں تک رہا اس کی زندگی موت کا معاملہ تو اس کا تو ذمے دار اللہ ہے۔ اس کی زندگی ہے تو جئے گا اور دشمنوں کی نگاہوں سے بچتا رہے گا۔ زندگی نہیں ہے تو ہم اس کی خبر سن لیں گے''۔ ملکہ بائی نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا اور پھر خاموش ہو گئی تھی۔

بہرحال رات کو کھانے پینے سے فراغت حاصل کر کے وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آج کچھ شدت کی نیند ذہن پر سوار ہو رہی تھی۔ وہ جلد ہی سو گئی اور دن چڑھے دوسری صبح اٹھی۔ سورج کی کرنیں کسی گوشے سے اندر آ رہی تھیں اور اس کے چہرے پر براہ راست پڑ رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں موند کر گردن جھٹکی۔ یہ

کرنیں آج کہاں سے داخل ہو گئیں۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے چہرے کو کرنوں کی زد سے بچایا اور اس طرف دیکھا جہاں سے کرنیں آرہی تھیں۔ پہلی نگاہ میں ہی ایک عجیب سا احساس دل میں پیدا ہو گیا۔ یہ اس کا کمرا تو نہیں ہے۔ پھر یہ کون سی جگہ ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا اور پھر اس کے حلق سے ایک آواز نکل گئی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ کمرہ حسین ترین فرنیچر سے آراستہ تھا۔ وہ جس مسہری پر لیٹی تھی وہ بھی بے حد خوبصورت تھی۔ اس کا جسم کا لباس بھی بدلا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

''میرے خدا یہ کیا ہوا...... یہ...... یہ...... یہ میرے، میرے بدن کو کس نے چھوا۔ اور یہ...... یہ سب کچھ، یہ سب کچھ...... اوہ میرے خدا...... میرے خدا......'' اس کی نگاہیں بھٹکتی ہوئی دروازے پر جا ٹکیں۔ وہ جلدی سے اٹھی اور تیر کی طرح دروازے کی جانب لپکی کسی شاندار لکڑی سے بنا ہوا قیمتی دروازہ باہر سے بند تھا اور اس قدر مضبوط تھا کہ اگر اسے بجانے کی کوشش بھی کی جاتی تو اپنے ہاتھوں ہی کو تکلیف ہوتی اس لیے اس نے یہ سب کچھ نہیں کیا لیکن اس بدلے ہوئے ماحول اور ان تمام کیفیات کو اس نے حیرانی کی نگاہوں سے دیکھا تھا اور اس کے بعد اس کے منہ سے ایک مدھم سی آواز نکلی۔

''اماں! مکاری کر گئی۔ تو کر گئی مکاری''۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ واپس پلٹ پڑی تھی۔ لیکن جگہ کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کون سی جگہ ہے۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس نے ایک بار پھر چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ ایک طرف ٹوائلٹ لکھا ہوا تھا۔ وہ کچھ لمحے سوچتی رہی اور پھر ٹوائلٹ کی جانب بڑھ گئی۔ اپنے سارے وجود کا اچھی طرح جائزہ لے رہی تھی کہ عالم بے ہوشی میں اس کے ساتھ کیا ہوا۔ لیکن کوئی خاص احساس نہیں ہو رہا تھا۔ واش روم میں منہ ہاتھ وغیرہ دھو کر اس

نے بالوں کو درست کیا اور پھر یاد کرنے لگی کہ رات کے کھانے کے بعد اس نے کیا کیا تھا۔ پتہ یہ چلا کہ کھانا کھانے کے فوراً بعد پلکیں جھکنے لگیں تھیں۔ اور اس کے بعد وہ گہری نیند سو گئی تھی۔ اس کے منہ سے پھر ایک آواز نکلی۔

''ٹھیک ہے ملکہ بائی! تُو میری ماں تو نہیں ہے لیکن کچھ دن ایسے بھی گزرے ہیں جب میں نے تجھے ماں کا ہی مقام دیا ہے۔ البتہ جو کچھ میں کہا وہ میری غلطی تھی اور اب میں سوچتی تھی اور اب میں سوچتی ہوں کہ مجھے...... مجھے تیرے سلسلے میں اتنا نرم نہیں ہونا چاہیے تھے۔ خیر کوئی بات نہیں اگر تو نے کچھ کر ہی ڈالا ہے تو اس کے جواب کے لیے بھی تیار رہ۔ میں بھی ضد کی پکی ہوں''۔

دفعتاً اسے دروازے پر دستک سی سنائی دی اور وہ چونک کر ادھر دیکھنے لگی۔ پھر جو شخص دروازے سے داخل ہوا تھا اسے دیکھ کر ریحانہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ یہ نادر شاہ تھا۔ ایک قیمتی لباس میں ملبوس، چہرے پر خوشی ہے اس نے پلٹ کر دروازہ بند کیا۔ دروازہ تو کسی مخصوص طرز کا تھا۔ اندر داخل ہو کر وہ اس مسہری کے قریب پہنچ گیا۔ جس پر واش روم سے نکلنے کے بعد وہ آکر بیٹھ گئی تھی۔

''کہو ریحانہ بیگم! کیسے مزاج ہیں تمہارے''۔ ریحانہ نے ایک لمحے کے اندر اندر آگے کے منصوبے کو ذہن میں ترتیب دے لیا۔ مدھم لہجے میں بولی۔

''مزاج اور وہ بھی ہمارے، مذاق اڑا رہے ہو شاہ جی''۔

''نہیں، مزاج تو ہیں تمہارے، سب کچھ ٹھکرا دیتی ہو تم اپنے عشق کے سامنے''

''عشق......'' ریحانہ منہ ٹیڑھا کر کے بولی اور پھر ہنسنے لگی۔ نادر شاہ چونک کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

''کیوں بھئی، مری میں جس شہزادے کے ساتھ گھوم رہی تھیں۔ وہ تمہارا

عاشق نہیں تھا کیا؟"

"جناب نادر شاہ صاحب! آپ تو نادر شاہ درانی ہی ہیں۔ بس جذبات میں قتل عام کرادیا دلی میں اور دلی لوٹ آئے۔ میں کہتی ہوں کوٹھوں پر جانے کا سلیقہ بھی رہا ہے آپ کو"۔

"اچھا تو ہمیں سلیقہ سکھانا چاہتی ہو"۔

"نہیں سلیقہ تو نہیں سکھانا چاہتی۔ ہمارا تو کام ہی مردوں کو بیوقوف بنانا ہے۔ اصولی طور پر تو اس وقت مجھے آپ کے صدقے واری جانا چاہیے تھا۔ چونکہ اماں نے بغیر کچھ لیے دیئے مجھے بے ہوش کر کے آپ کے حوالے نہ کر دیا ہوگا"

"ہاں لین دین تو ہوتا ہی رہتا ہے"۔

"اور آپ جیسے لوگ بیوقوف بنتے رہتے ہیں"۔

"گھر ہے یہ میرا اور تم ایک معزز مہمان نہیں ہو۔ زبان درازی سے گریز کرو تو زیادہ بہتر ہے۔ چونکہ اب جو کچھ میں نے تمہارے بارے میں سوچا ہے۔ اس کے ساتھ میرے دل میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے"۔ نادر شاہ نے ترش لہجے میں کہا اور ریحانہ نے قہقہہ مار کر ہنس پڑی دیر تک ہنستی رہی۔ نادر شاہ غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا

"جی! اب اس ہنسنے کی وجہ بھی بتا دیجیے"۔

"نادر شاہ صاحب! اماں سچ مچ گن کی پکی ہے۔ شرط لگائی تھی مجھ سے کہنے لگی کہ نادر شاہ کو ایسے بیوقوف بنائے گی کہ وہ سوچ بھی نہ سکے"۔

"مزید تفصیلات"۔ نادر شاہ بدستور طنزیہ انداز میں بولا۔

"جناب نادر شاہ صاحب! مجھے واقعی اماں نے بے ہوش کر دیا تھا۔ مگر میرے اور اس کے درمیان ایک ڈیل ہوگئی تھی"۔

"ڈیل"

"ہاں"

"کیسی ڈیل"

"اصل میں اماں مجھے جس بندے کے حوالے کرنا چاہتی تھی میں اسے ناپسند کرتی تھی۔ وہ ایک اسمگلر تھا۔ باہر سے آیا تھا افریقیوں کی شکل وصورت جیسی ہوتی ہے۔ آپ کو خود معلوم ہے اماں کو پیٹ بھر کر رقم دے رہا تھا اور مجھے مانگ رہا تھا۔ آپ کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ میں کتنی ضدی ہوں۔ میں نے اماں کی بات نہیں مانی اور اماں سے میرا شدید جھگڑا ہوگیا۔ اتنا جھگڑا کہ میں نے لوہے کی ایک راڈ اٹھا کر ان کے پیروں پر دے ماری اور ان کے پیر کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ مجھ پر جنون کا دورہ سا پڑ گیا تھا۔ اماں تو اسپتال چلی گئیں۔ اس دوران شاہ زیب ہمارے گھر آتا جاتا رہا تھا۔ میں کچھ اس طرح ذہنی طور پر پریشان ہوگئی تھی۔ کہ میں شاہ زیب کے ساتھ سیر کرنے کے لیے مری نکل گئی اور پھر کافی دن وہاں رہی۔ اماں اس دوران ہسپتال میں رہی تھی۔

بہر حال واپس تو مجھے گھر ہی آنا تھا چنانچہ میں گھر واپس آ گئی۔ بہر حال پھر اماں نے مجھے معاف کر دیا۔ کہنے لگی علاج پر بہت زیادہ خرچہ ہوگیا ہے۔ یہ خرچہ کہیں سے نکالنا ہے۔ نظر انتخاب آپ پر پڑی آپ شاید پہلے بھی اماں سے کہہ چکے تھے کہ میرا بہترین معاوضہ دیں گے میں نے یہاں بھی اماں سے انکار کیا اور کہا کہ اماں ابھی کچھ دن آرام کرنا چاہتی ہوں میں۔ انہوں نے اسی شرط پر مجھے معاف کیا کہ میں آپ کے ساتھ چلی جاؤں۔ باقی پورا ڈرامہ آپ کے سامنے ہے۔ اماں نے یہ کہہ کر مجھے آپ کے حوالے کیا ہوگا کہ میں نہیں مان رہی تھی اور انہوں نے کھانے میں مجھے بے ہوشی کی دوا ڈال کر مجھے بے ہوش کیا ہے"۔

"ہاں یہی کہا تھا اس نے" جواب میں ریحانہ پھر ہنس پڑی تھی۔ اس نے کہا

"اور خوب رقم لوٹی ہوگی آپ سے۔ نادر شاہ ہم طوائفیں ہیں۔ ایسی بات نہیں ہے کہ ہمارے سینے میں دل نہ ہو۔ ہماری پسندیدگی کی نگاہ بھی ہوتی ہے۔ لوگوں کو پسند بھی کرتے ہیں ہم۔ مگر اتنا جانتے ہیں کہ ہماری پسند بے حقیقت ہوتی ہے۔ لوگ ہم سے کھیل تو سکتے ہیں ہمیں عزت نہیں دے سکتے سمجھ رہے ہیں نا آپ۔ چنانچہ نہ کوئی شاہ زیب ہے نا۔ نادر شاہ ہے جہاں سے زیادہ مال ملا وہیں کے ہو رہے۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ۔ باقی سب خیریت ہے"۔

"بکواس کر رہی ہو تم"۔

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کو کسی کے خلاف بھڑکا تو نہیں رہی۔ میں نے تو آپ کو آپ کی حقیقت بتائی ہے۔ دو کوڑی کے ہیں آپ میری نگاہ میں، کوئی عزت نہیں ہے آپ کی میرے دل میں بس یہ میرا حق ہے۔ باقی سارے حقوق آپ کے ہیں کیونکہ آپ نے رقم خرچ کی ہے"۔

"ریحانہ! ایک بات سمجھ لو تم جو بے عزتی مری میں تم نے میری کی تھی۔ میں اس کا بدلا لیے بغیر نہیں رہوں گا تم سے۔ تم میری منظور نظر نہیں ہو اب بلکہ تم میرے گھوڑوں کا راتب ہو۔ سمجھیں۔ میرے معمولی معمولی لوگ تمہارے مالک بنیں گے۔ اس بات کو ذہن نشین کر لو"۔

"آپ کی ملکیت ہوں شاہ جی! نہ مجھے گدھوں سے دلچسپی ہے نہ گھوڑوں سے۔ ارے آپ کسی طوائف سے کیا انتقام لیں گے۔ جائیں اپنی اوقات میں رہیں۔ ہم لوگ ایسی باتوں کی پرواہ نہیں کرتے"۔ نادر شاہ منہ کھول کر رہ گیا تھا۔

......☆......

پولیس کے سپاہیوں کی سیٹیاں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ شاہ زیب نے جس شخص کو دیکھا تھا۔ وہ تاجو تھا۔ فخر خاں کے ہاں سے نائلہ کی مدد سے فرار ہو کر تاجو اور وہ نجانے کہاں سے کہاں پہنچے تھے۔ پھر تاجو اس سے بچھڑ گیا تھا۔ اور اس کے بعد سے تاجو کا کہیں پتہ نہیں چل سکا تھا اور اب وہ یہاں نظر آیا تھا۔ شاہ زیب نے پہلے اسے غور سے دیکھا اور اس کے بعد اس کی ساتھی لڑکی کو۔ لڑکی درمیانی سی شکل وصورت کی تھی۔ مگر نوجوان اور کسے ہوئے بدن کی مالک اس کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں۔ وہ اس وقت شاہ زیب کو دیکھ کر بہت زیادہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ تاجو بھی داڑھی وغیرہ ہونے کی وجہ سے شاہ زیب کو نہیں پہچان سکا تھا۔ پھر جب اس نے یہ دیکھا کہ یہ دونوں دہشت زدہ ہیں اور تاجو اسے نہیں پہچان سکا تو اس نے کہا۔

"سنو...... میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ تم پولیس کی بھاگ دوڑ کی آوازیں سن رہے ہو۔ وہ بکھر کر مجھے ہی تلاش کر رہی ہے۔ تم نے گولیوں کی آوازیں بھی سنی ہوں گی۔ وہ انہوں نے مجھ پر ہی چلائیں تھیں۔ میں تھوڑا سا وقت یہاں گزاروں گا اور اس کے بعد یہاں سے چلا جاؤں گا کیا سمجھے۔ اس دوران تم میری مدد کرو۔ سمجھ رہے ہو نا"۔ تاجو کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ لڑکی نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"تاجو...... میں تو چل رہی ہوں"۔

"دماغ خراب ہوا ہے تیرا۔ گھر سے باہر نکلے گی، باہر پولیس والے موجود

ہیں''۔ تاجو نے فوراً ہی کہا

''مم...... مگر مجھے دیر ہو جائے گی اور...... اور......''

''میں کہتا ہوں بکواس مت کر''

''لڑکی! تم کہیں نہیں جاؤ گی کیونکہ باہر پولیس موجود ہے۔ میں تم پر یہ بھی شبہ کر سکتا ہوں کہ باہر نکلتے ہی تم پولیس کو میرے بارے میں بتا دو۔ اس لیے تم ابھی یہیں رہو گی۔ چلو بیٹھ جاؤ''۔ شاہ زیب نے ریوالور سے ان دونوں کو اشارہ کیا۔ لڑکی کے منہ سے ہلکی سی آواز نکلی اور وہ جلدی سے ایک طرف پڑی گھڑونجی پر بیٹھ گئی۔ جبکہ وہ خاموش کھڑا ہوا تھا۔ پھر شاہ زیب نے تاجو سے کہا۔

''تاجو...... تم بھی بیٹھ جاؤ اگر تم میرے ساتھ یہ مہربانی کرو گے تو بعد میں تمہیں اس کا دکھ نہیں ہوگا۔ کیا سمجھے''۔

''ٹھیک ہے صاحب جی! میں بیٹھ جاتا ہوں لیکن آپ ہو کون؟'' شاہ زیب ایک لمحے تک سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

''یہ پولیس کم بخت اسی راستے پر منڈلا رہی ہے۔ گھر میں تو نہیں گھس آئے گی یہ''۔

''آپ مجھ پر بھروسہ نہیں کرو گے۔ ورنہ میں باہر کا ایک چکر لگا کر آؤں''۔

''نہیں میں تجھ پر بھروسہ کر سکتا ہوں لیکن اسی شرط پر کہ یہ لڑکی میری تحویل میں رہے گی اور اگر پولیس نے دروازے سے اندر قدم رکھا تو پہلے میں اسے گولی مار دوں گا''۔

''لو۔ میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا۔ مجھے کیوں گولی مارو گے ارے واہ''۔

لڑکی نے کہا اور جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور اتنے لمبے تھے کہ کولہوں سے نیچے تک آ جاتے تھے۔ بہت پیاری لگ رہی تھی وہ اپنے اس انداز میں۔

تاجو کہنے لگا۔

''اگر تم پسند کرو تو نیچے آ جاؤ۔ نیچے کوئی نہیں ہے۔ میں خود بھی خطرے میں ہوں کیونکہ امینہ کو یہاں دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ بستے والے میری کھوپڑی گنجی کر دیں''

''نیچے کوئی محفوظ جگہ ہے''

''ہاں ہے''

شاہ زیب ان دونوں کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ اندرونی کمرے میں اناج رکھنے کے لئے ایک کھتہ بنا ہوا تھا۔ یہ کھتہ بڑی محفوظ جگہ تھی۔ اس کے اوپر چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اور جب تک کسی کو اس کی نشاندہی نہ کی جائے۔ کھتے کا پتہ نہیں چل سکتا تھا تاجو نے بڑے مخلصانہ انداز میں شاہ زیب کو اس کھتے کے بارے میں بتایا۔ تو شاہ زیب ہنسنے لگا پھر بولا

''اب میں تجھے اپنی ضمانت دیئے دیتا ہوں۔ تیرا نام تاجو ہے نا''

''ہاں جی۔ آپ کو ہمارا نام امینہ کی زبان سے ہی پتا چلا ہوگا''

''نہیں تاجو! مجھے تیرا نام اس وقت سے پتہ ہے۔ جب تو فخر خاں کے ہاں قید تھا اور نائلہ نے تیری مدد کر کے وہاں سے تجھے فرار کرایا تھا۔ تاجو جھنجھنا اٹھا تھا اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں شاہ زیب کا جائزہ لے رہی تھیں اور پھر اس کے منہ سے خود ہی نکلا۔

''باؤ شاہ جی! شاہ زیب......'' شاہ زیب نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور تاجو اس کے سینے سے آلپٹا۔

''باؤ تیری آواز تو مجھے جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ پر اللہ کی قسم یاد نہیں آ رہا تھا کہ یہ کہاں سنی تھی''

''تو تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو کیا......؟'' امینہ نے کہا

''اری جانتا ہوں...... یہ تو جان ہے میری'' یار دل تو یہ تھا کہ تمہارے ساتھ

ساری زندگی گزاردوں کہاں چلے گئے تھے تم''۔

''بس تاجو! تو مل گیا پر کیسے ملا یہ بھی دیکھ لے''

''اوہ باؤ جی! جان دے دوں گا تیرے لیے پولیس تجھ تک نہیں پہنچ پائے گی۔ اینہ آج تو تجھے خطرہ مول لینا پڑے گا۔

''میری تو جان نکل رہی ہے۔ ساری بستی جاگ گئی ہوگی۔ ان پولیس والوں کی بھاگ دوڑ کی وجہ سے۔ ابا بھی جاگ گیا ہوگا۔ اماں کو تو خیر پتہ ہے میں ادھر آئی ہوں''۔

''اری جا جا ابا کو بھی پتہ ہے۔ ساری بستی کو تو پتہ ہے اور اماں، ابا کی بڑی فکر پڑی ہے تجھے''۔

''دیکھ تو نے مجھے پھر طعنہ دیا۔ کتنی بار منع کیا ہے میں نے کہ طعنہ نہ دیا کر ورنہ بددعا دے دوں گی''۔

''میں یہ کہہ رہا تھا کہ کچھ چائے پانی کا بندوبست کر''

''اور دودھ کیا تیرا ابا والا کر دے گا۔ پہلے بھی دودھ نہ ہونے کی وجہ سے چائے نہیں بنی تھی''۔

''نہیں، ایسی کیا بات ہے تاجو!''

''شاہ جی! تم فکر مت کرنا''

''ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ میں بھی چائے کی شدید ضرورت محسوس کر رہا ہوں اور ذرا باہر کی صورتحال کا جائزہ بھی لے آنا۔ کوئی روک ٹوک تو نہیں ہوگی راستے میں''۔

''نہیں جی۔ میں تو ادھر ہی کا رہنے والا ہوں مجھے کون روکے گا۔ اچھا میں چلتا ہوں بس ابھی آتا ہوں تھوڑی دیر میں''۔ یہ کہہ کر اس نے ایک کھیس اٹھایا اس کے پلے کو سر پر بل دے کر وہ باہر نکل گیا اینہ نے صحن میں نکل کر دروازے کی کنڈی چڑھائی

اور پھر دبے پاؤں چلتی ہوئی اندر آگئی۔ مگر چارپائی پر نہیں بیٹھی۔

''بیٹھ جاؤ اینہ! میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ تمہیں پتہ چل گیا ہوگا کہ پولیس کی وجہ سے میں یہاں آگھسا ہوں''۔

''مگر پولیس تمہارے پیچھے کیوں لگی ہوئی ہے؟''

''بس پولیس کو مجھ سے بڑی محبت ہے''

''کوئی قتل وتل کیا ہوگا تم نے''

''ہاں قتل بھی کیا ہے اور بھی بہت سی خرابیاں ہیں مجھ میں''

''خرابیاں''

''ہاں بس ایک خرابی یہ نہیں ہے کہ تجھے کوئی نقصان پہنچاؤں۔ ویسے تو کون ہے اور تاجو سے تیرا کیا رشتہ ہے''۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ کچھ لمحے گردن جھکائے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

''بس یہ سمجھ لو کہ بے بس اور بے کس ہوں۔ ماں باپ اولادیں تو پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ آگے ان کی زندگی کیسے گزرے گی۔ یہ نہیں سوچتے کہ ان کے لیے کچھ کر کے رکھنا چاہیے۔ میرے ماں باپ نے بھی نجانے کس عمر میں مجھے پیدا کیا۔ لیکن جیسے جیسے ہوش سنبھالتی رہی گھر میں فاقوں کا منہ دیکھا اور جب یہ فاقے حد سے آگے بڑھ گئے۔ اور ماں باپ دنیا میں ہی سے جانے لگے تو میں نے گھر سے باہر قدم نکال دیئے۔ ماں کو تو پتہ ہے پر وہ یہ کہتی ہے کہ بابا کو نہیں پتا کہ میں کہاں کہاں سے پیسے اکٹھے کر کے لائی ہوں۔ جہاں تک بات رہی تاجو کی تو اس سے مجھ کو پیار ہے۔ اس کے پاس میں پیسے کے لیے نہیں آتی۔ میں نے کھل کر اس سے کہہ دیا تھا کہ میں تو اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی ہوں۔ مگر وہ سسرا مجھے ایسی ویسی ہی عورت سمجھتا ہے۔ تین سو روپے مہینہ دیتا ہے مجھے۔ کہتا ہے تجھ سے شادی کرلوں گا۔ مگر مجھے پتہ ہے کہ وہ مجھ سے شادی

نہیں کرے گا۔بس دوسروں کی طرح میرے ساتھ زندگی گزارے گا اور ایک دن دھکے مار کر مجھے نکال دے گا۔مگر یہ جاننے کے باوجود میں اس کے پاس آتی ہوں اس سے اب بھی محبت کرتی ہوں۔ یہ ہوتی ہی ایسی کتی چیز ہے باؤ''۔اس کی آواز بھرا گئی اور شاہ زیب اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔وہ سچ کہہ رہی تھی۔یہ محبت ہوتی ہی بڑی کتی چیز ہے۔پھر اس نے کہا

''تیرا اور کوئی سرپرست نہیں ہے''

''ہوتا تو ایسے رلتی''

''ٹھیک ہے ایک بات بتا یہ تاجو یہاں کرتا کیا ہے''۔لڑکی نے تعجب بھری نگاہوں سے اسے دیکھا پھر بولی۔

''مجھے نہیں معلوم''

''نہیں میں بہت دن کے بعد اس سے ملا ہوں''

''اچھا خاصا کام چلتا ہے اس کا،سبزیوں کا آڑھتی ہے ہفتے کے ہفتے منڈی لگتی ہے۔بس ہفتے میں ایک دن منڈی جاتا ہے اور ہفتے بھر کی کمائی کر لیتا ہے''۔

''اس کا مطلب ہے کہ ٹھیک زندگی گزار رہا ہے''۔

''ہاں مجھ سے میرے بارے میں ہی پوچھے جا رہے ہو تم اپنے بارے میں نہیں بتاتے۔آخر یہ پولیس تمہارے پیچھے کیوں لگی ہوئی ہے''۔

''بابا پولیس کی مرضی ہے جس کے پیچھے اس کا دل چاہے لگ جائے۔اب کسی سے پوچھ کر تو وہ کسی کے پیچھے نہیں لگتی''۔

''پر کچھ نہ کچھ تو کیا ہوگا۔ویسے تاجو کے بارے میں بھی مجھے شبہ ہے۔وہ اس کے علاوہ بھی کچھ کرتا ہے۔جبھی تو تمہاری اس سے دوستی ہے۔میرا مطلب ہے ایسے کسی بندے سے جس کے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہو۔معافی دینا مجھے اصل میں مجھے سہی بات

بولنی نہیں آتی۔تمہیں میری بات بری تو نہیں لگی ہوگی۔شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔کچھ دیر کے بعد تاجو واپس آ گیا۔

''ہاں استاد پولیس تو نکل گئی بس ایک دو گھر کی تلاشی لی تھی۔وہ پہلے گھر میں ایک بابو رہتے ہیں۔نیاز بخش نام ہے ان کا لیڈر ٹائپ کے آدمی ہیں۔پولیس سے اڑ گئے کہنے لگے۔گھروں کی تلاشی بغیر وارنٹ کے نہیں لی جا سکتی۔بہرحال بندہ تگڑا ہے پولیس کو اس کی بات ماننی پڑی۔ورنہ پولیس تو گھروں کی تلاشی کے چکر میں تھی''۔

''بڑا ہی چکر ہے تاجو!پولیس نے گاؤں میں تو ناکہ لگایا ہوگا''۔

''لو الٹی بات کر رہے ہو شاہ زیب جی!خدمت تو تم مجھے بتاؤ۔آرام سے رہو یہاں اور اگر کہیں جانے کا ارادہ ہے۔تو ساتھ ہی چلتے ہیں۔میرے کون سے بچے رو رہے ہیں''۔

''ہوں۔خیر میں تمہیں ساتھ تو نہیں لے جاؤں گا۔تمہیں ایک بات بتاؤں تاجو!میں بھی محبت کا مارا ہوا ہوں۔پیار کا ترسا ہوا اپنی محبوبہ کی تلاش ہے مجھے۔وہ نجانے زندگی کے کیسے عذاب میں گرفتار ہو گئی ہے اور وہ بھی صرف میری وجہ سے تاجو! میں اسے تلاش کر رہا ہوں اگر وہ مجھے مل گئی نا۔تو میں نے قسم کھائی ہے کہ دنیا سے اپنا جھگڑا چھوڑ دوں گا۔ہاں اگر وہ نہیں ملی تو میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنے بندے میرے ہاتھوں مارے جائیں گے۔شرط اس کے مل جانے کی ہے''۔

''مگر گئی کہاں وہ؟''

''لمبی کہانی ہے تاجو!چھوڑ تو میرا دوست ہے''

''دوست نہیں۔تمہارا غلام ہوں شاہ زیب جی......تمہارا غلام کیا سمجھے''

''نہیں میرے بھائی!میرا غلام کیسے ہوسکتا ہے تو۔تجھے غلام کہنے سے زیادہ مجھے بھائی کہنے میں خوشی ہوگی''۔

''تم نے میرے اوپر احسان کیا ہے۔ اس احسان کو ہم زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔ نائلہ اور تم دونوں ہمارے لیے بڑے محترم ہو ورنہ فخر خان مجھے زندہ کہاں چھوڑتا''۔

''تب پھر تاجو...... میرا حق بنتا ہے کہ تم سے اپنے دل کی بات کہہ دوں''

''ارے ارے اگر تمہارے دل میں کوئی بات ہے شاہ جی! اور تاجو اس سلسلے میں کچھ کر سکتا ہے۔ تو سمجھ لو تمہارا حکم ٹالنے کی ہمت نہیں ہے میرے اندر''۔

''امینہ کیسی لڑکی ہے تاجو......'' شاہ زیب نے سوال کیا اور تاجو چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''ہے تو اچھی...... بے چاری مشکلوں کی ماری ہوئی ہے بس یوں سمجھ لو کہ اپنے ماں باپ کو پال رہی ہے''۔

''کیا وہ ایک فاحشہ ہے''

''نہیں...... ایسی بات کہہ کر میں اس پر الزام نہیں لگا سکتا۔ وہ بس میرے پاس آتی جاتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ مجھ سے محبت کرتی ہے وہ''

تاجو! اگر انسان کو زندگی میں کسی ایک کی محبت مل جائے۔ تو سمجھ لے وہ دنیا کا امیر ترین آدمی ہے۔ میں تجھ سے جو مانگ رہا ہوں اسے منع مت کرنا۔ سچ کہہ رہا ہوں منع مت کرنا مجھے ورنہ میں تیرا دوست نہیں رہ سکوں گا''۔

''مانگو...... مانگو بھائی...... یہ تو بہت بڑی بات ہے کہ تم مجھ سے کچھ مانگ رہے ہو''۔

''تو امینہ سے شادی کر لے سمجھا''

''کیا......'' تاجو اچھل پڑا۔

''ہاں۔ شادی کر لے امینہ سے۔ بسا دے گھر، بنا دے ایک مسجد، تین افراد کو

زندگی مل جائے گی۔ تیرا بھی گھر بن جائے گا۔ یہ جو ادھار کی زندگی جی رہا ہے ایسا نہیں ہوگا بچے ہوں گے تیرے، اپنے آپ کو معتبر سمجھے گا تو، یہ میری تجھ سے ڈیمانڈ ہے۔ یہ میری تجھ سے طلب ہے''۔

تاجو بھونچکا رہ گیا تھا۔ کچھ دیر وہ سوچتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی گردن جھک گئی اور اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے تو پھر یہ نیک کام تم اپنے ہاتھوں سے کر ڈالو، میرا نکاح کرا دو اس سے۔ ڈال لوں گا اسے گھر میں، ماں باپ کو بھی اس کے یہیں بلا لوں گا۔ کوئی لمبا کھڑاک تو ہے نہیں۔ ٹھیک ہے سمجھ لو میں نے تمہارے حکم کی تعمیل کر دی''۔ شاہ زیب نے تاجو کو سینے سے لگا لیا تھا امینہ اس دوران چلی گئی تھی۔ یہ تمام باتیں اس کے پیچھے ہی ہوئی تھیں۔ شاہ زیب نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''اور بس اگلے جمعہ کو تو اس سے نکاح کر لے اور سن میں تو آج ہی یہاں سے نکل جاؤں گا۔ پولیس لوگوں سے پوچھ گچھ کرتی پھر رہی ہے کسی کو نہیں معلوم کہ میں تیرے گھر میں ہوں۔ میں اگر یہاں رہوں گا تو لوگ یہی سوچیں گے کہ میں وہی ہوں جسے تو نے پناہ دی ہے۔ یہ بات ٹھیک نہیں رہے گی۔ اب تو ایک نیک زندگی کا آغاز کر رہا ہے تو تجھے بے داغ ہونا پڑے گا۔ لوگ یقیناً یہاں تیری عزت کرتے ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ عزت قائم رہے''۔ تاجو نے غور سے شاہ زیب کو دیکھا پھر گردن ہلا کر بولا۔

''ٹھیک ہے جیسا آپ کا حکم، لیکن یہاں رہنے میں تو کوئی ہرج نہیں ہے''۔

''ہے تاجو ہے۔ اور ویسے بھی مجھے نکلنا ہے''

''جاؤ گے کہاں''

''بس...... ابھی زندگی بھٹک رہی ہے کوئی نہ کوئی محور پا لوں گا۔ تو تیاریاں کر

دے میری، میں چلتا ہوں''۔

''ٹھیک ہے''۔تاجو نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''تو اگلے جمعہ کو تو امینہ سے شادی کرے گا نا''۔

''ہاں۔وعدہ کرتا ہوں تم سے''۔شاہ زیب کو دلی خوشی ہوئی تھی۔ایک برائی کی طرف دوڑنے والی لڑکی کی زندگی کو سہارا مل جائے گا۔جو بری نہیں رہنا چاہتی تھی۔

تاجو کے گھر سے نکلنے کے لیے اس نے رات کا وقت منتخب کیا تھا۔رات کی تاریکی میں وہ ایک آوارہ سائے کی مانند اس آبادی سے باہر نکل گیا۔اور گن موری کے آخری سرے پر پہنچ کر اس نے میدانوں کا رخ کر لیا۔تاجو سے اپنی منزل کے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھی۔ویسے بھی ان علاقوں سے اجنبی نہیں تھا کئی بار راجہ شہاب الدین سے ملاقات کے لیے آنکلا تھا کوئی چار میل تک پیدل سفر کیا اور اس کے بعد اسے روشنیاں نظر آنے لگیں لیکن روشنیوں کا یہ فاصلہ اتنا تھا کہ ابھی دو ڈھائی گھنٹے کا سفر باقی تھا۔دو تین گھنٹے کے سفر کے بعد آخر کار وہ اس آبادی میں پہنچ گیا۔جہاں کریم بخش اور اس کی بیوی رہا کرتے تھے۔

اسے حیرت ہوتی تھی اس بات پر کہ لجیا اس کے حواس پر اس طرح سوار کیوں ہوگئی تھی لجیا اتنی دلکش تو نہیں تھی۔اس سے کہیں زیادہ حسین لڑکیاں شاہ زیب کی زندگی میں آچکی تھیں وہ اگر اس طرف مائل ہوتا تو کسی سے بھی رجوع کر سکتا تھا۔لیکن ایسا نہیں کیا تھا اس نے اور اب صرف اور صرف لجیا اس کے دل کا روگ بنی ہوئی تھی۔کبھی کبھی وہ اپنے آپ پر جھنجھلا جاتا تھا۔

چوہدری شہاب الدین تو پہلے ہی سے لجیا کے چکر میں تھا۔اس کی وجہ سے تو لجیا اس چکر میں نہیں پھنسی تھی۔دنیا میں نجانے کتنی لڑکیاں اس عذاب میں گرفتار ہوں گی۔یہ لجیا نے کیوں اس طرح اس کے دل و دماغ پر قبضہ جما لیا ہے لیکن پھر اندر سے

دکھ کی ایک لہر اٹھتی تھی اور ایک آواز اس کے کانوں سے ابھرتی تھی۔

''مجھ سے شادی کر لے۔میرے ماں باپ کی مشکل حل ہو جائے گی''۔اس کی آواز میں کوئی نہ کوئی ایسی بات تھی جو اسے پریشان کر دیتی تھی اور وہ لجیا کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔کیا بات تھی اس آواز میں......

بہر حال اس نے آبادی سے کچھ فاصلے پر مکمل طور پر صبح ہونے کا انتظار کیا اور پھر جب، اجالے کی کرنیں پھوٹنے لگیں اور بستی کی مسجدوں کی آواز اس کے کانوں مین گونجنے لگی تو وہ بستی کی جانب چل پڑا اور تھوڑی دیر کے بعد اس جگہ پہنچ گیا۔جہاں لجیا کا گھر تھا۔دروازے پر موٹا سا تالا پڑا ہوا تھا۔وہ وہاں کھڑے ہو کر قرب و جوار کا جائزہ لینے لگا۔

کریم بخش کے گھر میں داخل ہونا اس کا محبوب مشغلہ تھا صرف یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ یہاں کوئی آیا ہے یا نہیں۔وہ عقبی حصے میں پہنچ کر اندر اتر گیا۔گھر خالی پڑا ہوا تھا ہر چیز پر مٹی کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔کوئی نشان موجود نہیں تھا اس کا مطلب ہے کہ کسی نے گھر کا تالا نہیں کھولا......تھوڑی دیر تک وہ وہاں رکا رہا اور اس کے بعد وہی دیوار کود کر باہر نکل آیا۔اور گھوم کر سامنے والے حصے میں پہنچ گیا۔ایک بزرگ غازی ادھر سے جا رہا تھا اس نے اسے سلام کیا تو بزرگ رک گیا۔بزرگ اسے تعجب سے دیکھ رہا تھا پھر بولا۔

''ہاں کیا بات ہے بیٹا!''

''بابا جی! یہ کریم بخش یہاں رہتے ہیں''

''ہاں ہاں رہتے تھے''

''کیا انہوں نے یہ گھر چھوڑ دیا''

''ہاں بیٹا۔بے چارہ بد نصیبی کا شکار ہو گیا''

''کیا مطلب...... میں کچھ سمجھا نہیں''

''اب تو بہت دن سے اس طرف نہیں آیا نجانے کہاں ہے کچھ پتہ نہیں ہے کسی کو''

''لجیا بھی نہیں آئی اس کی بیٹی! سنا ہے وہ کہیں چلی گئی تھی''

''اللہ ہی جانے بیٹا! میں سامنے والے گھر میں رہتا ہوں۔ بڑے عرصے سے یہاں کوئی نہیں آیا۔ سنا ہے کوئی جھگڑا چل رہا تھا راجہ شہاب الدین سے۔ اب دیکھو نا، راجہ صاحب کو اللہ نے بہت بڑا مرتبہ دیا ہے۔ پتہ نہیں کیا قصہ ہے۔ بس سمجھ لو کہ ہوا انہی کی وجہ سے ہے یہ سب کچھ۔

''کوئی پتہ نہیں ہے کہ یہ لوگ کہاں ہیں''

''نہیں بیٹا! بھلا اتنا پتہ کیسے چل سکتا ہے۔ ویسے تم کون ہو''

''میں بھتیجا ہوں ان کا ملک سے باہر تھا کافی عرصے کے بعد آیا ہوں''

''ارے ارے ارے بیٹا! ہمیں، معلوم ہوتا تو ضرور بتاتے تمہیں۔ ویسے آؤ ناشتہ کرو ہمارے ساتھ بعد میں چلے جانا''۔

''بابا جی! آپ کا بہت بہت شکریہ چلتا ہوں خدا حافظ''۔ شاہ زیب نے انتظار نہیں کیا اور الٹے قدموں سے وہاں سے واپس چلا گیا۔ ویسے تو خیر اب وطن عزیز کا چپہ چپہ اس کے لیے مخدوش تھا۔ پولیس اس کی تلاش میں تھی اب یہ پتہ نہیں کہ جبار خاں اور الیاس خاں نے جو اس کی تلاش کا سلسلہ جاری رکھا تھا وہ کہاں تک پہنچا ہے۔ دشمنوں کی اچھی خاصی تعداد بنالی تھی اس نے۔ کون جانے کون دشمن کب کہاں سے آ ٹوٹے۔

راجہ شہاب الدین نے البتہ ایک نئے کردار کا مظاہرہ کیا تھا اور جیل کے لاک اپ میں اس کے پاس پہنچ کر اس سے بڑی دلسوزی کی باتیں کیں تھی۔ اس نے سوچا کہ

جب ادھر آیا ہے تو راجہ شہاب الدین سے مل کر جائے۔ چنانچہ ابھی تک بستی میں زیادہ چہل پہل نہیں پیدا ہوئی تھی ایسے وقت راجہ شہاب الدین کے پاس جانا آسان تھا۔

تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد آ کر کار وہ راجہ شہاب الدین کی حویلی میں پہنچ گیا۔

زیادہ پرانی بات نہیں تھی کہ اس حویلی کے اطراف میں زبردست پہرے لگے ہوئے تھے صرف شاہ زیب کی وجہ سے راجہ شہاب الدین حویلی مین سکون کی نیند نہیں سوتا تھا۔ شاہ زیب کو کوئی پہچان نہیں سکا تھا یا پھر یہ بات تھی کہ کوئی ایسا شناسا اس وقت موجود نہیں تھا جسے شاہ زیب کے بارے میں تفصیلات معلوم ہوں۔ ورنہ ہنگامہ مچ جاتا۔ البتہ راجہ شہاب الدین سے ملاقات کے مسئلے پر اس سے باز پرس کی گئی۔ تو اس نے کہا۔

''راجہ صاحب! سے بس اتنا کہہ دیجئے کہ وہ بندہ آیا ہے جس سے آپ نے پولیس ہیڈ کوارٹر میں جا کر ملاقات کی ہے''۔

''کہے دیتے ہیں راجہ صاحب! کئی دن کے بعد واپس آئے ہیں اگر انہوں نے آپ سے ملاقات سے انکار کر دیا۔ تو معاف کیجئے گا آپ کو جانا ہوگا''۔

''جاؤں گا بھائی! یہاں زندگی گزارنے کے لیے تو نہیں آیا تم اتنا کہہ دو جا کر جو میں نے تم سے کہا ہے۔ راجہ شہاب الدین اس بات کو سمجھ سکا یا نہیں سمجھ سکا۔ بلکہ شاید نہیں سمجھ سکا تھا۔ البتہ حیرانی اسے یہاں لے آئی تھی اور جب اس نے شاہ زیب کی صورت دیکھی تو بری طرح اچھل پڑا۔

''اوہو شاہ تم''۔ اس نے چونک کر کہا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شاہ زیب سے مخلص ہی ہوگا۔ پھر اس نے شاہ زیب کو سینے سے لپٹا لیا اور دیر تک لپٹائے رہا۔

''کہو کیسے ہو۔ کچھ عرصہ پہلے یار شاہ زیب! میں تم سے واقعی خوفزدہ ہو گیا

تھا۔ مرمت تو تم نے میری اچھی خاصی کر دی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ بھی لیکن آج یقین
کرو۔ اگر تم مجھے مارنا چاہو تو بڑے آرام سے مار سکتے ہو۔ چونکہ میرے دل میں
تمہارے لیے خلوص کے سوا کچھ نہیں ہے''۔

''سارے مخلصوں کو ماردوں گا راجہ صاحب! تو زندہ کس کے سہارے رہوں
گا۔ آپ کی محبت ہے کہ آپ نے مجھے اپنے گھر میں یہ عزت دی''۔

''یار! سچ جاننا کایا پلٹ ہوگئی ہے میری، اور اس مبارکباد کے حقدار تم ہو۔
پہلے موت کے خوف سے ڈرا اور اس کے بعد تم سے محبت ہوگئی۔ اچھا اب سب سے پہلی
بات یہ بتاؤ۔ کہ لجیا کا کہیں پتہ چلا ہے''۔

''نہیں راجہ صاحب......'' راجہ شہاب الدین نے اسے بڑے احترام سے
بٹھایا پھر اس کے سامنے بیٹھتا ہوا بولا۔

''خدا کی قسم۔ یہ نہ سمجھنا کہ تمہیں کسی بھی طرح کا کوئی دھوکہ دے رہا ہوں
پورے خلوص اور محبت سے یہ کہہ رہا ہوں کہ میں تمہارے دکھ میں برابر کا شریک ہوں۔
لجیا کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم۔ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں نے اسے
لاہور بھیجا تھا۔ لاہور سے وہ نکل جانے میں کامیاب ہوگئی۔ جن لوگوں کو میں نے ان کی
حفاظت کی ذمہ داری سونپی تھی ان سے مکمل تحقیقات کرنے کے باوجود مجھے اس کا کوئی
پتہ نہیں چل سکا ہے۔ لیکن میں نے کچھ لوگوں کی ذمہ داری لگائی ہے۔ بلکہ دھمکیوں کے
ساتھ لگائی ہے کہ وہ جہاں بھی کہیں ہو اسے نکال لیں اور میرے پاس لے کر آئیں
افسوس ابھی اس سلسلے میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی''۔

''جی راجہ صاحب! میں بھی بس اسی کی تلاش میں آیا ہوں۔ اس کے علاقے
میں گیا لوگوں سے معلومات حاصل کیں وہ نہیں آئی''

''مجھے صرف ایک شبہ ہے کہ وہ کراچی وغیرہ نکل گئی۔ حالانکہ بڑی معصوم سی

بچی تھی''۔

''یہ بھی ہو سکتا ہے راجہ صاحب کو کچھ لوگوں نے اسے ورغلایا ہو''۔ راجہ
صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا اس کی گردن جھک گئی تھی۔ دیر تک وہ سوچ میں ڈوبا رہا
پھر اس نے کہا۔

''کیا کہہ سکتا ہوں اس سلسلے میں بہرحال میرا قصور تو ہے''۔

''اب ان باتوں کو جانے دیجئے راجہ صاحب! آپ جس سہی راستے پر آ گئے
ہیں وہ میرے لیے بڑی قیمتی حیثیت رکھتا ہے۔ میری لجیا تو پتہ نہیں کہاں غائب ہوگئی۔ یا
کہاں گم ہوگئی۔ لیکن آپ کے بدلے ہوئے اطوار لجیا جیسی بہت سی لڑکیوں کے لیے
فائدہ مندر ہے۔ میں اسی کو اپنی جیت سمجھتا ہوں''۔

''تمہارا مجرم ہوں اگر کبھی سزا دینے کو جی چاہے تو آپ سزا دے دینا زندگی
بچانے کے لیے چوکہ نہیں بدلا۔ معلومات کر سکتے ہو میرے بارے میں۔ مزاج ہی بدل
گیا ہے میرا۔ اب کسی کی طرف دیکھتا ہوں تو دل میں اس طرح کے خیالات آتے ہیں
کہ سارے شیطانی جذبات دم توڑ دیتے ہیں۔

''خدا کا شکر ہے میں تو یہ کہتا ہوں کہ میں اگر کوئی بھی نیکی ہے اور اللہ کے
نزدیک اسے قبولیت حاصل ہے تو اس کے صلے میں لجیا مل جائے اور کچھ نہیں چاہتا
میں''۔

''وہ ملکہ بائی کے بارے میں تفصیلات معلوم ہیں تمہیں۔ تمہاری وجہ سے اس
کی ٹانگیں ٹوٹی تھیں''۔

''ہاں وہ بے چاری ریحانہ جذباتی ہوگئی تھی میرے لیے''

''تازہ ترین خبر یہ ہے کہ ملکہ بائی نے ریحانہ کو نادر شاہ کے حوالے کر دیا
ہے۔ پورا کیس تمہارے علم میں ہے اور میرے علم میں بھی۔ ملکہ بائی ویسے بھی کینہ پرور

عورت ہے۔ سنا ہے کہ تم نے نادر شاہ کی بے عزتی کی تھی کہیں۔ ریحانہ بھی تمہارے ساتھ شامل تھی۔ ملکہ بائی نے انتقامی طور پر ریحانہ کو نادر شاہ کے ہاتھ بیچ دیا ہے''۔ شاہ زیب پر بجلی سی گری تھی۔ ریحانہ سے اسے کوئی عشق وغیرہ نہیں تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ریحانہ نے اس کے لیے بڑا ایثار کیا ہے اور اس کی وجہ سے وہ ملکہ بائی کو زخمی کرنے کے جرم میں گرفتار ہوئی اور اب اس کی وجہ سے ریحانہ پر ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔ اس نے جلدی سے شہاب الدین سے کہا۔

''راجہ صاحب! آپ کو یہ سب کیسے معلوم''

''گیا تھا ملکہ بائی کے پاس۔ ہسپتال سے گھر واپس آ گئی ہے۔ لیکن ابھی ڈاکٹروں نے صحیح انداز میں چلنے پھرنے سے منع کیا ہے ہڈیاں کرچی کرچی ہو گئیں تھیں اس کی، ڈاکٹروں نے انہیں کیلیں لگائی ہیں اور نجانے کیا کیا جتن کیے ہیں وہ ابھی تک پوری طرح صحت مند نہیں لیکن بہرحال انہیں چھٹی دے دی گئی ہے مری میں شاید تم دونوں کو دیکھا تھا اس نے اور تم نے اس کی بے عزتی کر ڈالی تھی''۔

''میں نے نہیں۔ ریحانہ نے''

''بات ایک ہی ہے نادر شاہ! پہلے ہی سے ریحانہ کا طلبگار تھا۔ اور وہ قامہ ریحانہ کی قیمت بڑھا رہی تھی۔ لیکن پھر انتقامی جذبے کے تحت ملکہ بائی نے ریحانہ کو نادر شاہ کے حوالے کر دیا اور ریحانہ نادر شاہ کی حویلی میں ہے''۔

''ریحانہ وہاں نہیں جانا چاہتی تھی''۔ شاہ زیب نے سوال کیا۔

''ویسے وہ مختلف مزاج کی لڑکی ہے۔ اتنا اس کے بارے میں میں بھی جانتا ہوں''۔ راجہ شہاب الدین نے کہا۔

''تب تو ریحانہ کو نادر شاہ کے قبضے سے نکلنا چاہیے''۔

''یار! تمہیں ایک بات بتاؤں۔ برا مت ماننا میری بات کا تم چوہدریوں کا

مزاج نہیں جانتے اور نہ ہی فطری طور پر تم ان زمینداروں جیسے ہو جو بہر طور حکومت کرنا جانتے ہیں مطلب یہ کہ اپنے مسائل کے پکے ہیں اور ان سے نمٹ لیا کرتے ہیں''۔

''میں سمجھا نہیں راجہ صاحب''

''یار! ایک بات بتاؤ مجھے کس کس کی مدد کرو گے۔ ریحانہ طوائف ہے میرے خیال میں تم سے محبت کرنے لگی ہے۔ محبت کے اس جذبے کے تحت اس نے تمہاری گرفتاری کے بعد ملکہ بائی کے پاؤں توڑ دیئے تھے میں اس میں برابر کا مجرم ہوں لیکن بہرحال اب میں اپنے گناہوں سے تائب ہو گیا ہوں۔ میری مانو تو فوری طور پر نادر شاہ کے خلاف کوئی عمل نہ کرو۔ چاروں طرف سے تم مشکلات میں گھرے ہوئے ہو ایک طرف پولیس تمہاری دشمن ہے تو دوسری طرف جبار خاں اور الیاس خاں، پھر فخر خان بھی۔ یہ سارے مسئلے تمہارے اردگرد کھڑے ہوئے ہیں اور تم صرف اپنے جذبوں کے ہاتھوں نادر شاہ سے نئی دشمنی کا آغاز کر رہے ہو۔ شاہ زیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''راجہ صاحب! آپ یقین کریں اب تو ان ہنگامہ آرائیوں میں مزہ آنے لگا ہے۔ عادت پڑ گئی ہے''۔

''کیا کیا جا سکتا ہے۔ دیکھو میرا ایک مشورہ ہے چاروں طرف کی دشمنی تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔ کسی ٹھوس طریقہ کار کو اختیار کرو۔ تاکہ اپنی بچت ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ لجیا کی محبت کو دل سے نکال شہاب الدین ہے۔ بہت گھٹیا آدمی ہوں میں لیکن ایک طرح سے تم میرے رہنما ہو۔ عزیز ہو میرے۔ تم نے مجھے سیدھے راستے پر لا ڈالا ہے۔ میں خلوص دل سے تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ ملک سے باہر نکلو تو میں تمہارے لیے بندوبست کر دوں''۔

''راجہ صاحب! اگر مجھے لجیا کی موت کا یقین ہو جائے۔ تو واقعی میں ملک

چھوڑ دوں گا یا پھر مجھے مل جائے۔ میری دونوں باتوں کا مفہوم ایک ہی ہے''۔

''ایسا کرو۔ میرے پاس کچھ وقت قیام کرو۔ تمہارے لیے بندوبست کیے دیتا ہوں۔ بیٹھ کر باتیں کریں گے کہ تمہیں آئندہ کیا کرنا ہے''۔

''راجہ صاحب! انتہائی شکر گزار ہوں۔ مجھے ایک بہت عمدہ قسم کی رائفل چاہیے اگر ایک گھوڑا ممکن ہو تو گھوڑا بھی دے دیجئے مجھے، بدلے میں کچھ نہیں دے سکوں گا۔ نادر شاہ کے پاس جا کر ریحانہ کو اس کے چنگل سے آزاد کراؤں گا اور بس اس کے بعد دیکھوں گا کہ آگے کیا کرنا ہے۔ راجہ شہاب الدین سوچ میں ڈوب گیا تھا پھر اس نے کہا۔

''یہ بتاؤ اکیلے اس طرح جاؤ گے یا میں تمہاری کچھ مدد کروں''

''بالکل اکیلا آپ صرف میری یہ مدد کریں کہ آپ مجھے ایک رائفل اور گھوڑا دے دیجئے۔ جو اس دوران میرے پاس نہیں ہے۔ وہ بندوبست ہو جائے گا لیکن اب ایسے تو نہیں جا سکو گے تھوڑا سا وقت تو گزارو''۔ شہاب الدین نے کہا

راجہ صاحب! آپ سے میری بڑی دشمنی رہی ہے اور میں نجانے کتنے عرصے آپ کی زندگی لینے کا خواہش مند رہا ہوں۔ لیکن اب آپ یقین کریں کہ اب میرے دل میں آپ کے لئے محبت اور بڑا احترام ہے میری فطرت بالکل بدل گئی ہے اور آپ کے بارے میں میری سوچ بالکل ہی مختلف ہوگئی ہے۔ راجہ صاحب بات اصل میں یہ ہے کہ میری زندگی میں اگر کوئی چیز ہے تو آپ مجھے بتا دیجئے۔ سب کچھ تو آپ کے علم میں ہے لجیا کے بارے میں بھی میں آپ کو سچ بتا دوں کہ مجھے پہلے اس سے کوئی محبت نہیں تھی۔ بس وہ جس طرح مجھ سے زندگی مانگ رہی تھی۔ وہ چیز میرے دل پر نقش ہوگئی۔ اور اس وقت سے اب تک کی کہانی میں اس کے وہی الفاظ میرے لیے ایک عجیب درد بنے ہوئے ہیں کہنے لگی تو مجھ سے شادی کر لے۔ مجھے عزت مل جائے گی۔

پھر میری آبرو کو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ میرے ماں باپ دن رات میری وجہ سے ڈرے ڈرے رہتے ہیں کہ کہیں کوئی مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ راجہ صاحب اس کے دل میں میرے لیے محبت تھی۔ مگر وہ محبت کا مفہوم نہیں جانتی تھی۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے اس کا دل اندر سے کیا کہہ رہا ہے وہ تو بس اپنے ماں باپ کے بارے میں سوچ رہی تھی لیکن راجہ صاحب اس وقت میں نے اسے ٹھکرا دیا تھا غور نہیں کیا تھا اس کی تڑپ پر آج اس پر غور کرتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ...... کہ......'' شاہ زیب کی آواز بھرا گئی۔ راجہ شہاب الدین کا سر جھک گیا تھا۔ شاہ زیب نے گردن اٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے کہا۔

''راجہ صاحب''۔ راجہ شہاب الدین نے چونک کر شاہ زیب کو دیکھا۔ تب اسے اپنی آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں کا احساس ہوا۔ کیونکہ سر اٹھا کر دیکھنے سے یہ آنسو رخساروں تک پہنچ گئے تھے اور رخساروں پر ایک گرم گرم نمی کا احساس ہو رہا تھا اس نے جلدی سے اپنی آستینوں سے آنسو صاف کیے پھر افسردہ لہجے میں بولا۔

''اور اس کی وجہ میں تھا''

''تھے۔ ہیں نہیں، میں آپ کو صرف یہ بتا رہا تھا کہ میری زندگی میں نہ صرف بھائی ہیں نہ کچھ اور ہے اگر کوئی مجھ پر اعتماد کرتا ہے اور میری وجہ سے کسی مشکل میں جا پھنسا ہے تو میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ زندگی تو جانے والی چیز ہے ہی۔ راجہ صاحب کب چلی جائے گی اس کا غم بے کار ہے''۔

''مطلب کیا ہے''۔

''مطلب یہ ہے کہ ریحانہ کو میری وجہ سے نادر شاہ کے پاس بھیجا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ نادر شاہ کے چنگل سے نکل آئے''۔

''ٹھیک ہے تمہاری اپنی سوچ ہے۔ بے شک ایسا ہی کرو۔ لیکن وہ ایک

طوائف ہے۔تم اسے اپنی بیوی نہیں بنا سکتے کیا کرو گے اس کے ساتھ کس طرح سے اس
کی مدد کرو گے تم۔ بولو کیا کرو گے تم''

''جس طرح بھی ہو سکے گا''۔شاہ زیب نے جواب دیا۔

''اور پھر تم یہ بات کیوں کہتے ہو کہ تمہاری زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔یار!
تم یہ بات کیوں بھول رہے ہو کہ ایک مقصد کے تحت ہی تو تم اپنے آپ کو یہاں تک
لے آئے ہو۔اور تمہارا مقصد وہ زمینیں ہیں۔جن پر تم آگ نہیں جلنے دینا چاہیے۔جن
کے بارے میں تمہارا خیال ہے کہ اپنی ماں سے کیے وعدے کے تحت تم انہیں گلزار بناؤ
گے۔کیا یہ مقصد ختم کر رہے ہو تم۔اگر تم کہتے ہو کہ یہ مقصد تم ختم کر رہے ہو تو پھر ٹھیک
ہے۔پھر بلاوجہ ان چکروں میں کیوں پڑے ہوئے ہو''۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں راجہ صاحب! بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔مگر میں خودکشی
نہیں کر رہا۔نہ میرا خودکشی کرنے کا ارادہ ہے۔دیکھیے نا جدوجہد ہی تو زندگی ہے۔مجھے
جدوجہد تو کرتے رہنا چاہیے۔آپ نے مجھے ابھی ملک سے باہر جانے کی پیشکش کی
تھی۔فخر خان، الیاس خاں اور جبار خاں اگر زندہ ہیں تو میں ان زمینوں کو چھوڑ کر نہیں
جا سکتا۔اگر ایسا ارادہ کر بھی لیا تو پہلے ان لوگوں کو موت کی نیند سلاؤں گا۔اس کے بعد
ان زمینوں پر کام کراؤں گا اور پھر سوچوں گا کہ اپنا وعدہ پورا کرنے کے بعد مجھے آگے
کی زندگی کے لیے کیا کرنا ہے۔ورنہ بلاوجہ اتنے لوگوں سے جھگڑا مول لیا۔میری
زمینوں کو مجھ سے کون چھین سکتا ہے''۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔لیکن بہر حال جو کچھ
کرو سوچ سمجھ کر کرنا۔البتہ ایک مشورہ دوں تمہیں۔فرض کرو تم نے ریحانہ کو نادر شاہ
کے چنگل سے نکال بھی لیا۔تو کیا کرو گے اس کا کہاں رکھو گے اسے''

''کوئی ٹھکانا تلاش کر لوں گا''

یہی مشورہ میں تمہیں دینا چاہتا ہوں۔میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ کسی بھی چھوٹی
سی آبادی میں ایک گھر کا بندوبست کرو اور ریحانہ کو وہاں لے جا کر رکھو اس سے پوچھو
کہ مستقبل میں وہ کیا چاہتی ہے۔سمجھ رہے ہو نا میری بات۔مطلب میرا یہ ہے کہ کوئی
ایسا ٹھکانا بناؤ۔جہاں تم اپنے طور پر پناہ لے سکو۔اب جب تمہاری لڑائی اس منزل کو
پہنچ گئی ہے۔تو پھر تمہیں اپنا کوئی قلعہ بھی تو بنانا پڑے گا نا۔چھوٹی بستیوں کو میں اس لیے
منع کرتا ہوں کہ لوگ ایک دوسرے کے معاملات سے بہت زیادہ متعلق رہتے ہیں۔
کہیں دور نکل جانے کا مشورہ میں تمہیں دے نہیں سکتا۔کیونکہ تمہاری ہم پھر ختم ہو جاتی
ہے یعنی کراچی وغیرہ۔میری رائے ہے کہ لاہور ہی میں کوئی ایسا ٹھکانہ تلاش کرو۔
جہاں تم ایک سنجیدہ آدمی کی حیثیت سے رہ سکو۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں''

''ٹھیک کہتا نہیں ہوں۔کچھ کرنا بھی چاہتا ہوں''۔

''جی حکم''۔

''ایک پتا بتاتا ہوں وہاں چلے جاؤ۔میرا آدمی وہاں موجود ہوتا ہے چوکیدار
باسط، میرا گھر ہے وہاں اور سچ سچ بتاؤں تمہیں، میں اسے لاہور میں اپنی خفیہ رنگ
رلیوں کے لیے استعمال کرتا تھا۔اچھا گھر ہے۔جاؤ اسے اپنا ٹھکانہ بنا لو کسی کے علم میں
نہیں ہے۔کوئی بھی نہیں جانتا کہ یہ گھر کس کی ملکیت ہے۔اور خفیہ طور پر وہ کون آتا جاتا
ہے۔تمہارے لیے وہ ایک بہترین ٹھکانا رہے گا۔میں باسط علی کو فون کر دوں گا اور
تمہارے بارے میں مکمل تفصیل بتا دوں گا۔اگر ریحانہ تمہارے ہاتھ لگ جائے تو پھر تم
اسے وہیں پر پہنچا دینا بعد میں جو بھی فیصلہ تم لوگ کرو۔میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت
ریحانہ تمہارا پہلا متن ہے تمہارے انداز سے یہی ظاہر ہوتا ہے''۔

''راجہ صاحب! شکریہ بڑا معمولی سا لفظ ہے اور اس کا بدل میرے پاس نہیں

ہے''۔

''نہیں ہے نا......بس جب بدل تلاش کرلو تو مجھے آگاہ کر دینا''۔ راجہ شہاب الدین نے مسکراتے ہوئے کہا پھر بولا۔

''میری بہترین دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ راجہ شہاب الدین جیسے آدمی کے لیے شاہ زیب کو گھوڑا اور رائفل مہیا کر دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ رائفل کے ساتھ ساتھ اس نے انتہائی جدید ساخت کا ریوالور اور اس کے فالتو راؤنڈ کے پیکٹ شاہ زیب کو دیئے۔ اس وقت شاہ زیب کی اولین ضرورت یہی تمام چیزیں تھیں۔ چنانچہ اس نے شکریہ ادا کیا اور اس کے بعد وہاں سے چل پڑا۔

☆

نادر شاہ بڑی انتقامی فطرت کا آدمی تھا ریحانہ بہت عرصے سے اس کی منظور نظر تھی اور اس نے دو تین بار اس کے بارے میں ملکہ بائی سے بات کی تھی۔ اس وقت ملکہ بائی نے نہایت کاروباری لہجے میں کہا تھا۔

''کیوں نہیں شاہ جی! طوائف تو ہر تماش بین کی ملکیت ہوتی ہے۔ کوئی بھی آکر وہاں اپنا حق جتا سکتا ہے۔ لیکن دیکھیں نا۔ شوکیس میں رکھی ہوئی کوئی بھی چیز اپنی قیمت رکھتی ہے اور دوکاندار کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی چیز کی پسندیدہ قیمت مانگے۔ گاہک کا حق ہوتا ہے کہ وہ اس کی قیمت اپنی پسند کے مطابق لگائے۔ میں ابھی اس کا بازار سجاؤں گی۔ یہی ہماری روایت ہے۔ آپ جیسے بہت سے قدر دان اس بازار میں جا کر اس کی قیمت لگائیں گے۔ جہاں سے مجھے زیادہ قیمت ملی اپنا مال فروخت کر دوں گی''۔

اس وقت نادر شاہ کو غصہ آ گیا تھا اس نے کہا تھا۔

''ملکہ بائی اگر یہ کام تم نے میری غیر موجودگی میں کر دیا تو سوچ لو کہ اس کے بعد کیا ہوگا''۔

''نہیں شاہ جی! ہم قدر دانوں کی عزت کرتے ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ آپ کو دعوت دی جائے گی۔ پھر اس کے بعد نادر شاہ بہت سی بار ریحانہ سے ملا تھا۔ مری میں ریحانہ مل گئی تھی۔ تو نادر شاہ نے سوچا تھا کہ چلو مطلوب نظر اور اس قدر خوبصورت ماحول میں مل گیا۔ مگر وہاں ریحانہ نے اس کی بے عزتی کر دی تھی۔ دیوانی فطرت کا آدمی تھا بگڑ گیا تھا اور اب اس نے ملکہ بائی کے جنون کے ہاتھوں شکار کر لیا تھا۔ لیکن اب اس کا جنون خود کام کر رہا تھا۔ ایک ایسی لڑکی جس نے اس کی بے عزتی کر دی تھی۔ کتوں سے نچوائے جانے کے قابل ہو گئی تھی اس کے لیے۔ یہ اس کی اپنی سوچ تھی حالانکہ جب بھی ریحانہ کو دیکھتا۔ دل میں طرح طرح کے خیالات پھوٹنے لگتے۔ سوچتا کہ ضد کو چھوڑ دے لیکن ریحانہ کو ذلیل کرنے میں اسے بہت لطف آ رہا تھا۔ ابھی تک اس نے وہ نہیں کیا تھا جس کا ارادہ اس کے دل میں تھا لیکن اس نے ریحانہ کو ایک طرح سے قیدی بنا رکھا تھا سخت نگرانی ہوتی تھی اس کی۔ فرصت کے لمحات میں وہ اسے ذلیل وخوار کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ شہر جا رہا تھا ریحانہ کے پاس پہنچا اور کہا۔

''ہاں۔ لاہور جا رہا ہوں۔ کچھ چاہیے تو نہیں تمہیں کسی سے ملنا تو نہیں چاہتیں''۔

''آپ کا کیا خیال ہے نادر شاہ صاحب! کیا کہوں گی میں آپ سے''

''ریحانہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں تمہیں یہاں لانے کے بعد ایک طوائف کی فطرت سے سہی طور پر آگاہ ہو رہا ہوں۔ عام لڑکی میں اور ایک طوائف میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اس کا مجھے اچھی طرح اندازہ ہو رہا ہے؟۔

''اچھی بات ہے شاہ جی! انسان کو زندگی میں تجربات تو کرنے چاہئیں۔ لیکن آپ میرے ساتھ جو کچھ کر رہے ہیں نا۔ اس کے بارے میں اگر کسی کو بتائیں تو دنیا آپ پر ہنسے گی۔ عورت اور طوائف کا فرق سمجھنے کے باوجود۔ آپ طوائف سے اس

بات کی توقع رکھتے ہیں کہ وہ صرف آپ کو چاہیے''۔

''رکھتا تھا اور حماقت تھی وہ میری اب نہیں رکھتا۔ اب تو بس میری یہ خواہش ہے کہ ایک ایسا جشن رچاؤں جس میں صرف اور صرف تمہاری توہین اور بے عزتی ہو سکے''۔

''اپنی خواہش پوری کرنا آپ کا کام ہے نادر شاہ صاحب! کسی اور کا تو نہیں''۔

''بہت زیادہ دلیری کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ جب میرے کتے تمہارے بدن کو نوچیں گے تو تمہاری چیخیں سننے کے قابل ہوں گی''۔

''اس کے بعد میں مر جاؤں گی یہی نا۔ پھر کیا کریں گے آپ'' ریحانہ نے ہنستے ہوئے کہا اور نادر شاہ کو ضروری کام تھا۔ ورنہ وہ شاید ریحانہ کو مارنے سے بھی نہ چوکتا۔

لاہور پہنچا اپنے کاموں سے فارغ ہوا تو ملکہ بائی یاد آ گئی۔ ملکہ بائی کے پاس پہنچ گیا۔ ملکہ بائی جو انتقامی آگ میں سلگ رہی تھی۔ نادر شاہ کو دیکھ کر خوش ہو گئی اور بولی۔

''مر گئی کم بخت''

''کہاں ملکہ بائی! اس جیسی ڈھیٹ لڑکیاں کہیں مرتی ہیں''

''کیا حال ہے''

''ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے''

''کیا؟''

''ہاں آرام سے رہ رہی ہے''

''شاہ جی! مجھے آپ سے شکوہ ہے''۔ ملکہ بائی نے کہا

''کیا مطلب ہے''

''وہاں میں نے آرام سے رہنے کے لیے تو اسے نہیں بھیجا تھا۔ میں تو یہ چاہتی تھی کہ اذیت سے اس کی بوٹی بوٹی پھڑکے۔ وہ چیخنا چاہے مگر اس کے حلق سے آواز نہ نکلے۔ شاہ جی آپ نے اس کا وعدہ کیا تھا مجھ سے''۔

''بالکل کیا تھا''

''تو پھر وہ آرام سے کیوں ہے''

''اچھا ایک بات بتاؤ ملکہ بائی پوری ایمانداری کے ساتھ''

''ہاں۔ ہاں پوچھو''

''کیا واقعی۔ تم نے کبھی اس کی قیمت وصول نہیں کی''

''بڑے مزے کی بات ہے شاہ جی! کہ بعض جگہ بڑی اچھی سچائیاں بہت بری جگہوں پر ملتی ہیں۔ میری سچائی صرف یہ ہے کہ جو کچھ میں نے آپ سے کہا غلط نہیں کہا''۔

''آہ...... مگر اس حرامی شاہ زیب کے بارے میں آپ کیا کہیں گی...... اس نے ریحانہ...... میرا مطلب ہے......''

''اب یہ تو اللہ جانتا ہے۔ ظاہر ہے مرد عورت اور وہ بھی ایک دوسرے کو چاہنے والے اور پھر ایک طوائف زادی۔ باقی باتیں مجھے کہنے کی کیا ضرورت ہے شاہ جی''۔

''بہر حال تم بھی اس سے بہت زیادہ ناراض ہو ملکہ بائی''

''صرف ناراضگی کا لفظ کافی نہیں ہے نادر شاہ...... اس وقت کائنات میں مجھ سے بڑی دشمن اس کی اور کوئی نہیں ہے''۔ شاہ جی اگر برا نہ مانو تو ایک کام کرو''

''ہاں بولو''

''دل گھبرا رہا ہے یہاں پڑے پڑے۔ ٹانگیں ٹھیک کام نہیں کر رہیں۔ ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔ اس نے کہا کہ ابھی کچھ عرصہ بیساکھیوں کا سہارا لینا پڑے گا۔ شاہ جی مجھے اپنے ساتھ لے چلو اپنی آنکھوں سے اس کی تکلیفیں دیکھنا چاہتی ہوں''۔

ٹھیک ہے چلو۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ کل واپس جا رہا ہوں تمہیں ساتھ لیتا جاؤں گا اور ویسے بھی یہ بہت اچھی بات ہوگی کہ تم اس کا جشن اپنی آنکھوں سے دیکھو''۔

''یہی تو چاہتی ہوں میں''۔ ملکہ بائی نے کہا۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔ تم تیاریاں کر لو ملکہ بائی کل دوپہر بارہ بجے کے قریب یہاں سے چلیں گے اور پھر دو تین دن ہی میں اس کا حساب کتاب کر دیا جائے گا۔ اور وہ بھی تمہاری آنکھوں کے سامنے''۔ نادر شاہ نے کہا۔

''ہاں...... بالکل ٹھیک ہے''۔ دوسرے دن ملکہ بائی تیار ہوگئی۔ اور نادر شاہ اسے اپنے ساتھ لے کر چل پڑا۔ ملکہ بائی کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔

حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک ایسا انتقام لینا چاہتی تھی ریحانہ سے کہ دنیا میں اس کی مثال قائم ہو جائے۔ بہر حال عورت جب ناگن بن جاتی ہے تو اس کے زہر کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ وہ اس قدر خوفناک ہو جاتی ہے کہ اس کے بعد خوف کا تصور ہی ختم ہو جائے...... ملکہ بائی اس وقت ایسی ہی زہریلی ناگن بنی ہوئی تھی۔

......☆......

نادر شاہ ملکہ بائی کو لے کر اپنی حویلی پہنچ گیا۔ ملکہ بائی کے دل میں انتقام کا جہنم سلگ رہا تھا۔ بات معمولی نہیں تھی۔ جوتوں کی خاک سر پر پہنچ گئی تھی۔ اپاہج کر دیا تھا ریحانہ نے اسے۔ اور یہ بھی حق تھا کہ ریحانہ اس کی اپنی بیٹی نہیں تھی۔ کوٹھوں کی کہانیاں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔ کون کہاں سے آتا ہے اور وہاں کا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو خود اسے بھی پتہ نہیں چلتا جو وہاں آنکھ کھولتا ہے اور اس کے بعد وہیں اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ اس وقفے میں اسے ذرا بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس کی اپنی زندگی کی کہانی کیا تھی۔ بس وہی ماحول وہی زندگی اسے اپنی لگتی ہے۔ یا پھر لگتی بھی نہیں ہے تو وہ اسے اپنا سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ملکہ بائی کو اپنا ماضی بھی نہیں معلوم تھا بس اسے اس کے بارے میں جو کچھ بتا دیا گیا تھا۔ اسی کو اس نے اپنی ابتدا اور انتہا سمجھ لیا تھا۔ اور پھر دل اس طرح سے پختہ ہو جاتے ہیں کہ کبھی کبھی تو شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ اس دنیا کے لوگ ہی نہیں ہیں۔

بہر حال نادر شاہ جیسے شیطان صفت لوگوں کی اس دنیا میں جگہ نہیں ہے اور ان سے شیطنت ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ نادر شاہ اپنی توہین سے ناخوش تھا اور ملکہ بائی کے لیے بھی کچھ کرنا چاہتا تھا بلکہ اصل مسئلہ تو اپنی توہین ہی کا تھا۔ جس کا انتقام وہ ریحانہ سے لینا چاہتا تھا۔ جہاں تک شاہ زیب کا تعلق تھا تو شاہ زیب سے انتقام لینا خواب و خیال تھا۔

ہر شخص اپنی انا کی تسکین کے لیے کمزور ہی کو شکار کرتا ہے جب نادر شاہ حویلی

میں پہنچا تو ریحانہ جس کمرے میں اسے منتقل کیا گیا تھا موجود نہیں تھی۔ اس پر پہرہ بے شک لگا ہوا تھا لیکن بس اس حد تک کہ وہ وہاں سے فرار نہ ہونے پائے۔ باقی اسے ہر طرح کی آزادی حاصل تھی ملکہ بائی کو دیکھ کر ریحانہ نہ تو خوفزدہ ہوئی اور نہ اس نے کسی قسم کی نفرت کا اظہار کیا۔ بلکہ بڑے پرخلوص انداز میں مسکرا کر اسے خوش آمدید کہا۔

''واہ نادر شاہ واہ۔ آپ کا ذوق قابل داد ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ملکہ بائی کوئی معمولی شخصیت نہیں ہے۔ میری ماں کے حسن کے چرچے میں نے اپنے کانوں سے سنے ہیں۔ آپ کو کیا معلوم اس کے بارے میں کہ اپنے زمانے میں وہ کیا رہ چکی ہے اور اصولی طور پر آپ کا اور ان کا ساتھ بھی اچھا لگتا ہے''۔

''کیا بک رہی ہے مردار''۔ میرا اور نادر شاہ کا کیا ساتھ بتا کیا چاہتی ہے تو''۔

''ارے ارے اماں۔ کچھ غلط فہمی ہوگئی شاید مجھے۔ اصل میں ان دنوں نادر شاہ صاحب مجھ سے رجوع کرنے کی کوششیں کرتے رہے ہیں۔ اماں بات یہ نہیں ہے کہ میں کوئی پارسا ہوں یا ان راستوں سے گزرنے کی روادار نہیں ہوں۔ لیکن بات وہی چڑ کی آجاتی ہے۔ نادر شاہ صاحب نے مجھے جھنجھلاہٹ کا شکار کر دیا ہے۔ وہ ایک طوائف یا اپنی داشتہ کی حیثیت سے یہاں نہیں لائے بلکہ ان کے اپنے ذہن میں کچھ انتقامی جذبے پل رہے ہیں۔ اب اماں یہ بھی تو ہے نا، ہم بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور انسان زندہ ہوتا ہے تو مقابلہ کرتا ہے چنانچہ میرا اور نادر شاہ صاحب کا مقابلہ چل رہا ہے۔ اماں اگر کوئی بیچ میں نہ آئے تو زیادہ بہتر ہے۔ میں بھی دیکھتی ہوں کہ یہ اپنی دولت کے بل پر کیسے مجھے زیر کرتے ہیں''۔

''مردار اپنی اوقات بھول گئی دو ٹکے کی عورت۔ اتنے بڑے لوگوں سے ٹکر لیتی ہے۔ ارے تو..... تو ہے ہی ٹکیائی۔ اپنی اوقات سے آگے بڑھے گی تو جوتے کھا کر

منہ کے بل گرے گی اتنے بڑے بڑے لوگ ہی تو تمہاری زندگی کا سہارا ہوتے ہیں اور تم جوانی کی عمر میں بجائے اس کے کہ اپنی ذات کو مستحکم کرو۔ عشق و محبت کے چکر میں پڑ جاتی ہو۔ جوتے کھاتے ہوئے دیکھا ہے میں نے تم جیسی عاشق مزاج لڑکیوں کو۔ شاہ زیب سے عشق کرے گی بے غیرت حرام زادی...... دو کوڑی کی عورت...... اور وہ...... ارے اس کی اوقات ہے کیا......؟ کل پولیس کے ہاتھ لگ گیا تو کتے کی موت مارا جائے گا۔ اب تو اس جیسے لوگوں کو پھانسی بھی نہیں دی جاسکتی۔ بلکہ جہاں پولیس اسے دیکھے گی باولے کتے کی طرح ہلاک کر دے گی''۔

''واہ اماں واہ...... خوب نبھا رہی ہیں آپ لوگوں کی دوستیاں۔ اماں ایک بات بتاؤ ان تمام باتوں سے تمہیں کیا ملتا ہے۔ پیسے...... صرف پیسے...... صرف پیسوں کے لیے تم اتنا نیچا کیوں گر جاتی ہو۔ ارے پیسہ تو آنی جانی چیز ہے۔ اور پھر تمہاری ضرورتیں ہی کتنی کس کے لیے چھوڑ جاؤ گی اماں اتنا پیسہ۔ زندگی میں حق کی کچھ باتیں کر لو تا کہ کم از کم اس سوکھے ہوئے دل میں پانی کے چند قطرے تو ٹپک جائیں''۔

''بہت بول رہی ہے...... بہت بول رہی ہے۔ تیری آواز تو اس طرح سے بند ہوگی کہ تو یاد کرے گی''۔

''ہاں اماں...... ایک میری آواز بند کرنے سے دنیا کی آواز تو بند ہو جائے گی۔ اچھا بیٹھو...... آیئے نادر شاہ صاحب! فیصلہ آپ بھی کر سکتے ہیں۔ بیٹھیے...... بیٹھیے نا...... میرے کمرے میں آئے ہیں۔ تو تھوڑی دیر کے لیے میں آپ کی میزبان بن گئی ہوں۔ نادر شاہ اور ملکہ بائی اپنی جگہ کھڑے رہے تو وہ مسکرا کر بولی۔

ہاں۔ اچھا یہ تو بتایئے کہ آپ آئے کس پروگرام کے تحت ہیں۔ اماں ویسے میں نے نادر شاہ صاحب کو جوتے کے تلوے چٹوا دیئے ہیں۔ کچھ بھی نہیں بگاڑ پائے ہیں میرا کہتے ہیں کہ میرے کتے انہیں چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔ ارے چھوڑیں نا نادر

شاہ صاحب کتوں کو آسانی سے گولی ماری جاسکتی ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں اپنے آپ کو اتنا بے اوقات کر کے رکھ دوں گی آپ کو کہ یاد کریں گے اور رہی بات لڑکے کی جس کا نام شاہ زیب ہے تو ایک بات بتاؤں نادر شاہ صاحب! آپ جیسے لوگ تو صرف اپنی دولت کے بل پر کسی کو اپنی مٹھی میں دے سکتے ہیں۔ اس کے اندر مردانگی ہے، وقار ہے، جوانی ہے، حسن ہے اور اس کے سامنے آپ جیسے دس افراد پر تھوکتی ہوں میں دولت اماں کی طلب ہوگی میری نہیں''۔

''سن رہی ہیں آپ ملکہ بائی''

''ہاں ہاں سن رہی ہوں۔ کیا کہوں کبھی کبھی تقدیر اس طرح دھوکا دے جاتی ہے۔ مگر نادر شاہ صاحب...... مسئلہ کچھ اور ہے۔ چھوڑوں گی نہیں میں اس کتیا کو...... چھوڑوں گی نہیں اسے''۔

''اماں آپ میرا کیا بگاڑ لیں گی۔ بتایئے آپ کیا بگاڑ لیں گی میرا۔ کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتیں یہ میں آپ سے کہے دیتی ہوں اور یہ صاحب!'' ریحانہ نے طنزیہ انداز میں نادر شاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اماں ایسے ناکارہ...... نکھٹو، بوڑھوں کو کیوں لیے پھرتی ہو۔ جو خود اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتے''۔

''ریحانہ...... ریحانہ...... موت تو خیر تیری آنی ہی ہے مگر اپنی موت کو اتنا مشکل کیوں بنا رہی ہے۔ نادر شاہ صاحب اب تو یہ انسانوں کے قابل بھی نہیں رہی۔ واقعی کتے چھوڑ دیجئے اس پر''۔ ملکہ بائی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''ایسے نہیں، ملکہ بائی ایسے نہیں۔ تم دیکھو گی اپنی آنکھوں سے، وہ منظر دکھاؤں گا تمہیں جو اصولی طور پر نہیں دکھانا چاہیے۔ کسی کو میں اور تم تماشائی ہوں گے اور میرے آدمی اسے درحقیقت کتوں ہی کی طرح جھنجھوڑ رہے ہوں گے۔ اس کے جسم کو

بے لباس کر کے اسے نوچیں گے کھسوٹیں گے میں آج ہی رات تمہیں یہ تماشہ دکھاؤں گا تمہیں۔ ملکہ بائی کیا سمجھیں''۔ جواب میں ریحانہ کا زبردست قہقہہ گونجا تھا''۔

''اور یہ کھیل ہوگا کیا''۔

''جہاں ہوگا تو بھی دیکھ لے گی بے غیرت''۔ نادر شاہ نے کہا اور ریحانہ پھر ہنس پڑی تھی۔ پھر وہ بولی۔

''خدا کی قسم۔ کیسے لوگ ہو تم لفظوں کا مفہوم بھی نہیں جانتے۔ مجھے بے غیرت کہہ رہے ہو۔ ارے میں تو بے غیرت تھی۔ بلکہ بے غیرت پیدا ہوئی تھی۔ مگر اب میں بے غیرت نہیں ہوں۔ بے غیرت تم ہو نادر شاہ۔ کتنا اچھا نام ہے کتنے بڑے آدمی کا نام ہے تمہارا، لیکن بہر حال ہوتا ہے۔ والدین کو چاہیے کہ نام بھی سوچ سمجھ کر رکھیں۔ مگر بے چارے والدین بھی بے قصور ہیں۔ انہیں کیا پتہ کہ ان کی اولاد کس طرح کی نکلے گی''۔

''آیئے نادر شاہ صاحب! چلیں یہاں سے یہ تو پاگل ہوگئی ہے۔ آپ کو غصہ دلا رہی ہے۔ بھگتے گی کم بخت، بھگتے گی۔ ملکہ بائی نے کہا اور نادر شاہ کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ ریحانہ کے قہقہے ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ نادر شاہ بھی کچھ عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ دوسرے کمرے میں آ کر میں نے ملکہ بائی سے کہا۔

''دیکھا آپ نے اسے''۔

''ارے نادر شاہ جی! بس کیا کہوں کیا نہ کہوں''۔

''ملکہ بائی! غلطی فہمی کا شکار ہے وہ، میرے پاس ایسے آدمی موجود ہیں جو میری خواہش کی تکمیل کریں گے''۔

''ٹھیک ہے۔ میں خود بھی چاہتی ہوں۔ نوچ کر پھینک دینا اسے، گردن کاٹ دینا اس کی، نرخرہ دبا کر ہلاک کر دیں اسے۔ مجھ سے زیادہ خوش اور کوئی نہیں

ہوگا‘‘۔

’’ایسا ہی ہوگا۔ جو کچھ بھی ہوگا تمہارے سامنے ہی ہوگا۔ ملکہ بائی! آج رات کو اسے اپنی زبان درازی کی سزا مل جائے گی‘‘۔ نادر شاہ غرائی ہوئی آواز میں بولا

☆

شاہ زیب ریحانہ کی تلاش میں بڑی احتیاط کے ساتھ اپنا کام کر رہا تھا۔ تقدیر نے یہی سب کچھ متعین کر دیا تھا۔ اس کے لیے تو اس نے بھی تقدیر سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ گھوڑا وغیرہ راجہ شہاب الدین نے اسے مہیا کر دیا تھا۔ ریوالور بھی پاس موجود تھا اور رائفل بھی ایک روایتی شکل اختیار کر چکا تھا۔ وہ راستے پر خطر تھے لیکن شناسا۔ نادر شاہ کی حویلی پر پہنچنا تھا۔ ریحانہ کے بارے میں یہی اطلاع ملی تھی کہ وہ نادر شاہ کی حویلی میں ہے۔ کچھ بھی ہے ریحانہ کو نادر شاہ کے ظلم کا شکار نہیں بننے دوں گا۔ شاہ زیب نے فیصلہ کیا تھا۔

بہر حال اب اس کے اندر بے پناہ خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی۔ احتیاط بے شک ایک اچھی چیز ہوتی ہے۔ لیکن خوف کا دل میں گزر نہیں تھا اور اس وقت اگر کوئی بھی اس کے راستے کی رکاوٹ بنتا تو وہ اسے با آسانی زندگی سے محروم کر دیتا۔ یہاں بھی اس نے اپنی تقدیر سے شکوہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ سب کچھ اگر میری تقدیر کا حصہ نہ ہوتا۔ تو میں یقینی طور پر ان علاقوں کا ایک اچھا انسان ہوتا۔ اور کسی کی بات کی پرواہ نہ کرتا۔ لیکن بہر حال تقدیر کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ جہنم میرا مقدر بن چکا ہے۔ تو پھر کم از کم اپنی برائیوں سے تو مخلص رہوں۔ لوگ یہ نہ کہہ پائیں کہ اس برے آدمی کے اندر ایک اچھا انسان چھپا ہوا تھا۔ جہاں تک معاملہ لجیا کا ہے تو پتہ نہیں میں لجیا سے عشق کرتا ہوں یا نہیں۔ شاید نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس کی مظلوم آواز میرا دل بن چکی ہے۔ ایک مکمل دل اور اب یہ آواز ہی خون بن کر میرے دل سے گزرتی ہے۔ اس آواز کی تلاش میری

زندگی کا مقصد ہے۔ اور کیا کروں گا اور اس زندگی کا۔

لیکن بہر حال لجیا کے طفیل اگر کچھ اور لوگ فیض پا جاتے ہیں تو کوئی ہرج نہیں ہے اور ان میں پہلا نمبر ریحانہ کا ہے جس نے مجھ سے محبت کی ہے۔ ریحانہ میں تجھے اپنی محبت تو نہیں دے سکتا کیونکہ اب وہ میری اپنی ہی نہیں۔ وہ تو کچھ معصوم الفاظ میں منتقل ہو گئی ہے۔

’’شادی کر لے مجھ سے تیرا بھی بھلا ہو جائے گا۔ میرے ماں باپ کو بھی زندگی مل جائے گی‘‘۔ بس ریحانہ یہ الفاظ میری محبت بن چکے ہیں۔ لیکن بہر حال تمہیں نادر شاہ جیسے شخص کا شکار نہیں بننے دوں گا۔ گھوڑا ایک ایسی محفوظ جگہ چھوڑ دیا تھا اس نے جہاں تک اگر وہ واپس پہنچ سکے تو اسے حاصل کر سکے۔ نادر شاہ کی حویلی سامنے ہی تھی۔ اور وہ یہ محسوس کر چکا تھا کہ بالکل عام سا انداز ہے۔ اس حویلی کا، اگر وہ پچھواڑے سے درختوں کا سہارا لیتا ہوا۔ حویلی کے عقبی جھرونکے تک پہنچ سکے۔ تو پھر حویلی میں داخلہ مشکل نہیں ہوگا۔ دن کی روشنی میں یہ جائزہ لے لیا تھا۔ اس نے اور رات کو جیسے ہی روشنیاں جلیں اس نے ایک درخت پر بسیرا کر لیا۔ جس کی کچھ شاخیں حویلی کے عقبی جھرنکوں سے اتنے فاصلے سے گزرتی تھیں کہ اگر کوئی پھرتیلا انسان ان شاخوں سے حویلی کے جھروکے تک پہنچنا چاہے۔ تو بس ذرا سی محنت کے سوا اسے کچھ نہ کرنا پڑے گا‘‘۔

چنانچہ مزید کچھ وقت کا انتظار کیا اور اس کے بعد وہ بندر کی طرح شاخوں پر چلتا ہوا۔ جھروکے کے سامنے پہنچ گیا۔ کوئی سوا گز کا فاصلہ تھا۔ اس شاخ کا اور جھروکے کا۔ اس شاخ کو پوری طرح ناپ طول کر اس نے طے کیا اور جھروکے میں لٹک گیا۔ پھر اس کا سیدھا ہوا جسم اسے سنبھال کر جھروکے میں داخل ہو گیا۔ البتہ رائفل اسے درخت کی شاخ میں ہی لٹکانی پڑی تھی۔ کیونکہ رائفل سمیت وہ جھروکے سے اندر نہیں جا سکتا

تھا۔ البتہ اس کا ریوالور اس کے پاس موجود تھا۔ جھروکے میں پہنچ کر اس نے جسم کا توازن کیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ دوسری طرف کوئی دو گز نیچے اترنا پڑا اور اس کے بعد وہ چھت پر پہنچ گیا تھا۔ چھت کس جگہ کی تھی۔ اس کا اسے علم نہیں تھا لیکن پھر وہ دبے پاؤں اس پر چلا تھا اور چھتوں چھتوں حویلی کے دوسرے حصوں میں نکل گیا تھا۔ ایک جگہ سے آخر کار نیچے اترنے کا موقع مل ہی گیا اور وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا۔ جو صوخہ کہلاتی ہے صوخے میں چھپنے کی جگہ تھی۔ ابھی حویلی میں تھوڑی سی چہل پہل تھی۔ چنانچہ یہ صوخہ اس کے لئے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوسکتا تھا۔ اور اگر تقدیر کسی مسئلے میں بھی رہنمائی کرتی ہے۔ تو اسی طرح کرتی ہے۔ اسی صوخے سے اس نے ملکہ بائی اور نادر شاہ کو دیکھا۔ جو باتیں کرتے ایک طرف جا رہے تھے۔ یہ تو بڑی ہی اچھی بات ہے۔ ملکہ بائی کو یہاں دیکھ کر وہ بڑا ہی حیران ہوا تھا اور اس نے دل ہی دل میں کہا تھا کہ چلو اچھا ہوا۔ دو کمینے ایک ساتھ ہیں۔ ریحانہ کی تلاش میں مدد بھی ملے گی۔ جس کمرے سے وہ اندر داخل ہوئے۔ وہ گول کمرہ تھا اس میں بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے تھے۔ خاص انداز سے یہ کمرہ بنایا گیا تھا۔ قد آدم کے شیشے اس طرح کے تھے کہ انہیں گھما کر کھولا جا سکتا تھا اور اس میں کوئی سلاخ نہیں لگی ہوئی تھی۔ واہ ری تقدیر شاہ زیب نے سوچا تھا یہاں سے تو بڑا کام ہوسکتا ہے۔

چنانچہ ایک سہی جگہ منتخب کر کے وہ ایک شیشے کے پاس کھڑا ہوگیا۔ اب تو اندر داخلہ بھی مشکل نہیں تھا۔ اندر بہت ہی حسین فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ تیز روشنیوں سے کمرہ جگمگا رہا تھا۔ جبکہ باہر تاریکی تھی اور یہ بات بھی شاہ زیب کے حق میں ہی جاتی تھی۔ کیونکہ اس طرح وہ تو اندر کے تمام مناظر دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اس پر کسی کی نگاہ نہیں پڑ سکتی تھی۔ ملکہ بائی اور نادر شاہ ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اسی وقت کمرے کے اندرونی دروازے سے تین افراد باہر نکل آئے۔ ایک شخص انہیں لے

کر آیا تھا۔ یہ اچھے قوی ہیکل جوان تھے اور ان کے چہروں پر جھینپے جھینپے تاثرات تھے۔ نادر شاہ انہیں چونک کر دیکھنے لگا اور پھر بولا۔

''غلام، سردار، تم لوگوں کو میں نے ساری زندگی عیش کرائے ہیں۔ کیا سمجھے؟ آج بھی میں نے تم تینوں کو اسی لیے بلایا ہے۔ کارنامہ دیکھانا ہے تمہیں سمجھے''۔

''جی مالک! آپ کا حکم''

''ہوں۔ لڑکی لائی جا رہی ہے اور اسے تمہارے حوالے کیا جا رہا ہے۔ لیکن جو کچھ ہوگا ہمارے سامنے ہی ہوگا۔ کیا سمجھے۔ ملکہ بائی! ان تینوں جوانوں کو دیکھ رہی ہو۔ تمہیں شرم تو آئے گی۔ لیکن اس جیسی حرامزادی کے لیے یہی سزا مناسب ہے یہ تینوں اسے ہم دونوں کے سامنے پامال کریں گے اور ہم اس کی دلدوز چیخیں سنیں گے۔ جاؤ...... لے آؤ اس کو''۔

''وہ آدمی جوان تینوں کو لے کر آیا تھا واپس چلا گیا۔ شاہ زیب نے صورتحال کو کسی طور سمجھ رہا تھا۔ تقدیر نے بڑا صحیح انتخاب کیا تھا اس کے یہاں آنے کے وقت کا۔ اس کے پورے بدن میں خون کی گردش تیز ہوگئی تھی۔ کنپٹیاں گرم ہونے لگیں تھیں۔ نادر شاہ کی کمینگی کا اسے تھوڑا احساس ہوگیا تھا۔ ملکہ بائی جیسی ذلیل عورت نادر شاہ کے ساتھ تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد شاہ زیب نے ریحانہ کو دیکھا۔ ایک خوبصورت لباس میں ملبوس لڑکھڑاتی چلی آ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے نشے میں ہو۔ شاہ زیب کی آنکھوں میں ہمدردی ابھر آئی۔ ریحانہ سو فیصدی اس کی وجہ سے اس عذاب میں گرفتار ہوئی تھی۔ اس نے دل میں سوچا کہ ریحانہ اپنے آپ کو تنہا مت سمجھنا۔ ان سب کو تو میں اس طرح فنا کے گھاٹ اتاروں گا کہ یاد کریں گے یہ لوگ۔ ریحانہ سامنے آگئی۔ اس نے یہاں کے ماحول کو دیکھا۔ شاہ زیب کے کان اس کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ پھر اسے ہلکا سا کھنکتا

قہقہہ سنائی دیا۔

''واہ۔تو یہاں یہ رنگ رلیاں ہو رہی ہیں۔اماں مجھے کیوں بلایا ہے''۔

''بیٹا! پیار کرنے کے لیے بلایا ہے تمہیں۔بڑی محبت آ رہی ہے میرے دل میں تمہاری۔بہت ہوا میں اڑ رہی تھیں نا تم...... کہا تھا میں نے تم سے کہ ہوا میں اڑنے کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ریحانہ ہمارے ہاتھوں سے کھاؤ گی اور ہضم بھی ہو جائے گا۔جہاں کہیں اور ہپ ہپ کرنے کی کوشش کی تو مار کھا جاؤ گی۔چوٹ کھا جاؤ گی''۔

''پاگل ہو اماں۔بوڑھے دماغ سے سوچتی ہو۔یہ غور نہیں کرتی تم کہ تم بوڑھی ہو گئی ہو ارے ہم جوان ہیں ہمارے دماغ بھی جوان ہیں۔جسم و جان بھی جوان ہیں۔کہاں مقابلہ کرو گے تم لوگ ہمارا تھک جاؤ گے۔ذہنی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی کہو۔کیا انتقام لے رہی ہو مجھ سے تم''۔

''انتقام...... ہو سکتا ہے وہ تیرے لیے انتقام نہ ہو فاحشہ! دیکھ رہے ہے ان تینوں کو یہ تینوں تیرے گاہک ہیں۔جو ہمارے سامنے تیرے وجود کو ریزہ ریزہ کر دیں گے۔اپنی آنکھوں سے دیکھوں گی میں تجھے پامال ہوتے ہوئے۔دلی خواہش پوری ہو گی میری۔میری مراد پوری ہو گی''۔شاہ زیب کے پورے بدن میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔لیکن اس نے پھر ریحانہ کا قہقہہ سنا تو حیران رہ گیا۔

''بس اماں۔اچھا بتاؤ۔سچی سچی بتاؤ یہ بات تو مجھے معلوم ہے کہ میری ماں نہیں ہو جو تمہارے پاس اور لڑکیاں ہیں ان میں کوئی تمہاری بیٹی ہے''۔

''کیوں؟''

''نہیں میں پوچھ رہی تھی کہ کیا ان کے ساتھ ہونے والے مناظر بھی تم اسی طرح دیکھ سکتی ہو''۔

''ان کے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہو گا بی بی! ایسا تو تجھ جیسی ذلیل لڑکیوں کے

مقدر میں ہیں''۔

''بکواس کرتی ہے بڑھیا! ماں نہیں ہے نا تو میری اسی لیے میں نے بھی تیری ٹانگیں توڑنے میں کوئی دقت نہیں محسوس کی تھی۔ماں ہوتی نا میری تو میں تجھ پر بھی ہاتھ نہ اٹھا سکتی تھی۔اور آج...... آج تو اپنی بدبختی کا تماشہ دیکھ۔تیرا خیال ہے میں ان لوگوں کے ہاتھوں میں پڑ کر چیخوں گی چلاؤں گی۔ارے پاگل! یہ سب کچھ تو زندگی کے ساتھ ہے۔کوئی روح کی تذلیل کر کے دکھائے۔تب تو میں جانوں میں کیا سمجھی تو یہ پامال کریں گے مجھے۔میری زندگی میں، ممکن ہے ایسا تو نے مجھے کبھی سمجھا۔کبھی مجھ پر غور نہیں کیا۔ملکہ بائی تو نے کبھی غور نہیں کیا۔کہ میں کیا ہوں۔تو نہیں جانتی کہ کس کا خون ہے میری رگوں میں۔لیکن جس کا بھی ہے ایک بات تو ہے میں کہہ سکتی ہوں اماں! کہ ہوگا غیرت مند ورنہ میں تیرے غصے کے سامنے سر جھکا دیتی۔ورنہ میں شاہ زیب کی محبت میں ڈوب کر تیرے پاؤں نہ توڑ دیتی۔کیا سکون مل رہا ہے مجھے اس احساس سے اماں! ایک بار چل کر دکھا۔جب تو بیساکھیوں کے سہارے چلے گی نا۔تو یقین کر میری آنکھوں میں ٹھنڈک اتر جائے گی اور میری روح تک سرشار رہے گی''۔

''دیکھ کیا رہے ہو۔نوچ ڈالو اسے۔بھنبھوڑ ڈالو اسے''۔

''ارے پاگلو! تھوڑی دیر رک جاؤ۔ابھی چند لمحوں کی بات ہے۔پھر تمہیں مجھ سے زیادہ لطف اندوز ہونے کا موقع مل جائے گا۔ایک مردہ جسم کا استعمال تمہارے لیے ایک انوکھا تجربہ ہو گا۔اماں...... ایک بات بتاؤں، نادر شاہ صاحب! زہر کھا لیا ہے میں نے۔میرے اندر شدید ٹوٹ پھوٹ ہو رہی ہے۔ایک ایسا زہر مجھے حاصل ہو گیا ہے جو کچھ لمحوں کے بعد اثر کرتا ہے اب یہ زہر کہاں سے حاصل ہوا یہ میں تمہیں قیامت تک نہیں بتاؤں گی۔

دفعتاً ہی ریحانہ رک گئی اس کے چہرے پر جانکنی کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور

پھر اس کے منہ سے خون کی پھوار بلند ہوئی۔ یہ خون کی پھوار دور تک پھیل گئی تھی۔ نادر شاہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ملکہ بائی نے اٹھنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں اوندھے منہ زمین پر گر پڑی۔ لیکن پھر اس نے رخ بدلا اور ریحانہ کی جانب دیکھنے لگی۔ ریحانہ آہستہ آہستہ گھٹنوں کے بل بیٹھتی چلی گئی تھی۔ اس نے گردن اٹھا کر نادر شاہ کو دیکھا اور اس کے خون میں ڈوبے ہوئے ہونٹ پھر سے مسکرا اٹھے خوبصورت دانت جو خون میں رنگ گئے تھے۔ نمایاں ہوئے اور پھر اس کی لڑکھڑاتی ہوئی آواز ابھری۔

''کیا سمجھے تم لوگ سمجھ گئے نا۔ ارے اتنا آسان نہیں ہوتا۔ مجھ جیسی کسی لڑکی کو پامال کرنا اور تم کتو...... چلو میرے قریب آ جاؤ۔ میری لاش کو اٹھا کر درمیان میں رکھو لباس اتارو میرا اور اس کے بعد، اس کے بعد......''۔ اس سے زیادہ شاہ زیب برداشت نہ کر سکا اور اس کے پورے بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ دوسرے لمحے اس نے شیشے کا دروازہ کھولا اور ایک خوفناک غراہٹ کے ساتھ اندر چھلانگ لگا دی۔ وہ سب کو نظر انداز کر کے دوڑتا ہوا ریحانہ کے پاس پہنچا۔ ریحانہ لڑکھڑا رہی تھی۔ شاہ زیب نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ اور پھر ریحانہ کو جھنجھوڑتا ہوا بولا۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا ریحانہ۔ تمہیں زندہ رہنا چاہیے تھا۔ تھوڑی دیر تو انتظار کر لیتیں۔ تم نے میرے لیے اپنے آپ کو ختم کر لیا۔ تو کیا میں تمہیں اس طرح بھول جاتا۔ جلدی کر دی، جلدی کر دی ریحانہ۔ شاہ زیب نے اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ریحانہ کی حیرت بھری مسکراہٹ ابھری اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز ساتھ نہ دے سکی۔ اس کے ہاتھ کو تھوڑی سی جنبش ہوئی اور یہ ہاتھ شاہ زیب کی گردن میں پہنچ گیا۔ پھر اس کے بعد اس کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔ آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ نادر شاہ اور ملکہ بائی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ دونوں کے اعصاب بے جان ہو گئے تھے۔ لیکن وہ تینوں افراد جو یہاں ایک مغموم ارادے سے

آئے تھے۔ سنبھلے اور انہوں نے شاہ زیب کو پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ اسی وقت نادر شاہ بھی چونکا اور اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''مار دو اس کتے کو۔ ختم کر دو اسے''۔ شاہ زیب ایک دم سنبھل گیا۔ اس نے ایک جھکالی دی اور دوسرے لمحے اس کے دونوں ہاتھ سیدھے ہوئے۔ اور اپنے پکڑنے والوں کے پیٹ پر پڑے۔ کیا فولادی ضرب تھی۔ ان کے حلق سے آواز نکلی اور اسی وقت شاہ زیب نے اپنا ریوالور نکال لیا۔ دھائیں دھائیں دھائیں کی تین آواز نکلی اور ان تینوں کے سینوں میں سوراخ ہو گئے۔ نادر شاہ ایک دم چونکا اس نے پہلے صوفے پر چھلانگ لگائی۔ اس کے بعد دروازے کی طرف لیکن شاہ زیب بھی برق بنا ہوا تھا۔ وہ پھرتی سے سامنے آیا اور اس کا زوردار گھونسہ نادر شاہ کے سینے پر پڑا۔ نادر شاہ اچھل کر صوفے پر آ پڑا تھا۔ شاہ زیب نے سب سے پہلے کام یہ کیا کہ دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ نادر شاہ صوفے پر سے گزرتا ہوا۔ ملکہ بائی پر آ کر گرا تھا۔ ملکہ بائی کی چیخ سنائی دی۔

اوہ میری میا! مر گئی میں وہ اپنی اپاہج ٹانگوں کے ساتھ فرش پر جا گری تھی۔

ادھر وہ تینوں دم توڑ رہے تھے۔ شاہ زیب کے نشانے اتنے کمزور نہیں تھے کہ اس کے بعد اس میں زندگی باقی رہ جاتی۔ گولیوں نے عین دل کے مقام کو چاٹا تھا اور وہ آخری سانسیں لے رہے تھے۔ ادھر ریحانہ ساکت ہو گئی تھی۔ ملکہ بائی اور نادر شاہ اب ساتھ ساتھ پڑے ہوئے سہمی ہوئی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھ رہے تھے۔ فائرنگ کی آوازیں بے شک گونجیں تھیں۔ لیکن پتہ نہیں کیوں باہر کوئی تحریک نہیں ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے نادر شاہ کے ہاں اس طرح کے کھیل ہوتے رہتے ہوں۔ اور جب تک کسی کو طلب نہ کیا جائے کوئی اندر نہ آتا ہو''۔

بہر حال شاہ زیب نے ایک بار پھر ریحانہ پر نگاہ ڈالی اس میں زندگی کی کوئی

امن باقی نہیں تھی۔ پھر اس نے نادر شاہ اور ملکہ بائی کو دیکھا۔

''کھیل جلدی ختم کر دیا تم نے ملکہ بائی۔ نادر شاہ ریحانہ کو مار دیا تم نے۔ اچھا نہیں کیا تم نے۔ اچھا نہیں کیا۔ تم سمجھتے ہو کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے''۔

''وہ...... شاہ زیب! وہ...... دراصل اس نے...... اس نے...... ہوا یوں تھا کہ......''۔

''ہاں، ہاں بولو۔ ہوا کیا تھا''۔

''دیکھو...... بس افسوس...... افسوس جو کچھ ہوا اس کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ جو کچھ ہوا ہمیں اس کا افسوس ہے۔ ریحانہ جلدی کر گئی۔ ہم تو صرف اسے ڈرانے دھمکانے کے لیے یہ سارا ناٹک رچایا تھا''۔

''نادر شاہ! کتنے شرم کی بات ہے۔ موت تمہارے اس قدر قریب پہنچ گئی ہے اور اس کے بعد بھی تم جھوٹ بولے جا رہے ہو۔ کیوں ملکہ بائی! تم بتاؤ کیا ارادے ہیں تمہارے''۔

''مم...... مجھے...... مجھے...... مجھے کچھ نہیں معلوم۔ یقین کرو شاہ زیب میرے بچے مجھے کچھ نہیں معلوم''۔

''ٹھیک...... تمہیں کچھ نہیں معلوم اور یہ...... یہ مر گئی۔ ملکہ بائی میں کافی دیر سے شیشے کے اس دروازے پر کھڑا تمہاری باتیں سن رہا تھا۔ تم کہہ رہی ہو۔ تمہیں کچھ نہیں معلوم۔ لیکن جو کچھ تم لوگوں کے درمیان بات چیت ہو رہی تھی۔ میں اسے سن چکا ہوں''۔

''مم...... مگر، مگر، مگر میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ دیکھو میں مرنا نہیں چاہتی مجھے مت مارو۔ مجھے مت مارو''۔

''میری بات سنو شاہ زیب! ریحانہ مر چکی ہے۔ جو کچھ ہوا مجھے اس کا شدید

افسوس ہے ہم سے سمجھوتہ کر لو تم جن حالات کا شکار ہو۔ میں ان میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ شاہ زیب سنو، کوئی ایسا عمل مت کرنا پلیز...... پلیز''۔

''موت سے ڈر رہے ہو نا۔ بیوقوف نادر شاہ! موت سے ڈر رہے ہو۔ چلو ٹھیک ہے وعدہ کرتا ہوں۔ تمہیں نہیں ماروں گا۔ اگر تمہیں مار دیا تو بات بے مزہ ہو جائے گی۔ مر جاؤ گے قبر میں چلے جاؤ گے۔ کیا فائدہ کم از کم سوچنا تو چاہیے انسان کو کہ اس نے کیا اچھا اور کیا برا کیا۔ موت کے بعد کا حساب تو بعد کی بات تھوڑا بہت حساب تو دنیا میں بھی ہونا چاہیے''۔

''میری بات سنو...... تت...... تت...... تم کیا کرنا چاہتے ہو''۔

''ہاں۔ میں یہی سوچ رہا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے''۔ شاہ زیب نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ریوالور ہولسٹر میں واپس رکھ لیا۔ پھر بولا۔

''کوئی ایسا عمل نادر شاہ! او ہو ذہن میں آ گیا۔ میرا خیال ہے میں تم دونوں کو روشنی سے محروم کر دوں۔ تمہاری آنکھیں پھوڑ دوں۔ علاج تو ہو جائے گا تمہارا۔ زندہ رہو گے لیکن اندھے بن کر یہ دنیا تمہیں کتنی بری لگے گی۔ لیکن یہ سوچ لینا کہ برے اعمالوں کا کتنا برا انجام ہوتا ہے''۔

''نہیں پلیز ایسا مت کرنا۔ تم...... تم''۔ نادر شاہ نے ادھر ادھر دیکھا لوہے کی ایک ایسی نوکدار چیز اسے نظر آ گئی۔ جو بظاہر ڈیکوریشن پیس کی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن اسے اس شکل میں بھی استعمال کیا جا سکتا تھا شاہ زیب نے اسے ہاتھ میں اٹھا لیا اور نادر شاہ کپکپا کر بولا۔

''نہیں شاہ زیب...... پلیز نہیں، دیکھو میری بات سنو۔ تم...... تم جو کچھ بھی چاہتے ہو دیکھو سنو...... تو سہی...... میں شاہ زیب...... میں تمہاری ایسی مدد کر سکتا ہوں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ سب کچھ ٹھیک کر سکتا ہوں میں''۔

''میں بھی سب کچھ ٹھیک کر دوں گا نادر شاہ! تم بالکل فکر مت کرو''۔ دوسرے لمحے شاہ زیب نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ زیادہ ڈرامہ کر کے اپنے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے نادر کے بال پکڑ لیے۔ نادر شاہ کا بدن بری طرح کپکپا رہا تھا۔ دوسرے لمحے اس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ گونجی۔ شاہ زیب نے لوہے کی وہ کیل اس کی آنکھ میں گھونپ دی تھی۔ نادر شاہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ گیا۔ اور پھر اس کی دوسری چیخ بلند ہوئی۔ شاہ زیب نے اس کی دوسری آنکھ بھی اسی طرح پھوڑ دی تھی۔ کہ اب اس میں ایک گڑھے کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ نادر شاہ دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر تڑپنے لگا۔ تو شاہ زیب نے ملکہ بائی کی طرف دیکھا۔ ملکہ بائی اپنی ریاپج ٹانگوں کے ساتھ دونوں ہاتھوں کے بل دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ شاہ زیب اس کے قریب پہنچا۔ اس نے اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ گھسیٹ کر زور سے کھینچا۔

''برائی ہر انسان میں تھوڑی بہت ہوتی ہے ملکہ بائی۔ لیکن تم بہت بری ہو اتنی بری کہ...... کہ'' دوسرے لمحے ملکہ بائی نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''معاف کر دے۔ معاف کر دے مجھے۔ شاہ زیب مجھے معاف کر دے''۔

''نہیں ملکہ بائی اگر تم نے ریحانہ کو معاف کر دیا ہوتا تو میں تمہارے بارے میں کوئی بری بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ افسوس زیادہ وقت نہیں دے سکوں گا تمہیں۔ دیکھو دنیا کیسی ہے اب اس کے بعد تم اس دنیا کو کبھی نہیں دیکھ سکو گی۔ ایک اور پچاک کی آواز آئی اور کیل جو خون سے ڈوبی ہوئی تھی ملکہ بائی کی آنکھ میں گھس گئی۔ پھر دوسری آنکھ میں ملکہ بائی تو پہلی آنکھ میں کیل گھسنے سے ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔ شاہ زیب نے اس کی دوسری آنکھ بھی پھوڑ دی۔ اور کیل ایک طرف پھینک دیا پھر وہ بولا۔

''اور اس کے بعد نادر شاہ ظاہر ہے تم پولیس کو میرے بارے میں بتاؤ گے۔ میرے دوست تم نے مجھے ایک راستہ ضرور دکھا دیا ہے۔ وہ یہ کہ میں اپنے دشمنوں کو

بینائی سے محروم کر دوں مجھے کسی کو موت کے گھاٹ اتار کر کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ لیکن جو لوگ انسانوں کی زندگی سے کھیلتے ہیں۔ اگر انہیں دنیا کی روشنی سے محروم کر دیا جائے تو کم از کم یاد ضرور رکھیں گے کہ روشن دنیا میں رہ کر انہوں نے کیا کیا۔ واہ...... کیا اچھا آئیڈیا دیا ہے تم نے مجھے نادر شاہ اور اس کے بعد تمہاری کہانی ختم اور ریحانہ میں تم سے محبت کرتا کیونکہ میرا دل کسی اور کے لیے دھڑکتا ہے۔ وہ جو شاید مجھے کبھی نہ ملے۔ وہ جو...... جس کے بارے میں، میں جانتا ہوں کہ شاید اب وہ اس دنیا میں نہ ہو۔ لیکن ریحانہ تم نے جو ایثار میرے لیے کیا ہے اسے میں نہیں بھولوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں''۔

شاہ زیب جانتا تھا کہ اب زیادہ دیر یہاں رکنا اس کے لیے بہتر ثابت نہیں ہوگا۔ چیخوں کی آوازیں فائرنگ کی آواز بہر حال لوگوں کو متوجہ تو کر ہی چکی ہوں گی۔ اب ایسا بھی نہیں ہے کہ کوئی صورتحال معلوم ہی نہ کرے اور یہی چیز خطرناک ہو جائے گی۔ چنانچہ اب یہاں سے چل پڑنا بہت بہتر ہے۔ وہ واپس شیشے کے کھلے دروازے کی طرف لپکا اور پھرتی کے ساتھ یہاں سے باہر نکل گیا۔

یہ بہت ہی اچھا قدم تھا اس کا چونکہ کچھ ہی لمحوں کے بعد پیچھے سے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ پتہ نہیں وہ سامنے کے دروازے سے آنے کے بجائے عقبی سمت سے کیوں آئے تھے۔ جتنی دیر میں کوئی وہاں پہنچتا شاہ زیب دیوار پر چڑھ گیا تھا۔ جہاں سے وہ چھت پر اور پھر درخت کی شاخ پر پہنچ گیا تھا۔ تاکہ یہاں سے وہ باہر نکل سکے۔ اور یہ بروقت اقدام تھا۔ کیونکہ اس کے بعد شاہ زیب نے بہت سے لوگوں کو دوڑ کر اس طرف سے آتے ہوئے دیکھا تھا وہ باہر نکل آیا۔ ابھی تک اس نے اپنے ذہن کی گہرائیوں تک اس واقعے کو نہیں پہنچنے دیا تھا۔ کیونکہ اسے اپنی جان بھی بچانی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں اس کا گھوڑا موجود تھا۔ دراصل رائفل اٹھا کر اس نے اپنے کندھے سے لٹکائی تھی۔ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر وہ وہاں سے چل

پڑا۔ گھوڑا برق رفتاری سے اپنا سفر طے کر رہا تھا۔ رات خاصی گزر چکی تھی اور شاہ زیب کا رخ کسی منزل کی طرف نہیں تھا وہ کسی ایسی ویران جگہ کا انتخاب کرنا چاہتا تھا۔ جہاں وہ قیام کر سکتا۔ کافی دور نکلنے کے بعد اسے کھیتوں کا سلسلہ نظر آیا۔ اس کے قریب ہی ایک باغ بھی تھا۔ اس نے گھوڑے کی رفتار سست کی اور اس کے بعد گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔

رات کے تقریباً ساڑھے تین بج رہے تھے شاہ زیب نے گھوڑے کو درخت سے باندھا۔ جگہ کے بارے میں صحیح طور پر اندازہ نہیں تھا کہ کون سی ہے۔ لیکن کھیت بتاتے تھے کہ آس پاس آبادی ہے وہ درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ قرب و جوار کے ماحول کی بھی اسے پرواہ نہیں تھی۔ بس رائفل اس نے گھٹنوں پر رکھی ہوئی تھی۔ گھوڑا بھی پر سکون نظر آ رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ ماحول آس پاس ٹھیک ہی ہے۔

بہر حال وہ بہت دیر تک خاموش گردن جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے ذہن میں خیالات ابھرنے لگے۔ اور ریحانہ اس کے ذہن میں زندہ ہو گئی۔ جو الفاظ اس نے سنے تھے ان سے اسے اندازہ ہو گیا تھا۔ کہ نادر شاہ ریحانہ سے اپنی توہین کا بدلا لینے کے لیے اسے اپنے آدمیوں سے پامال کرانا چاہتا تھا۔ لیکن شخصیتیں کہاں کہاں جنم لیتی ہیں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ریحانہ نے ایک انتہائی اعلیٰ کردار لڑکی کا مظاہرہ کیا تھا اور شاہ زیب ان دکھ بھرے لمحات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جب ریحانہ اس کی آغوش میں زندگی دے چکی تھی۔ کوئی حیرت بھری بات وہ کہنا چاہتی تھی اس سے۔ شاہ زیب کی آنکھوں میں نمی آ گئی اور پھر ایک اور ڈبڈباتا ہوا چہرہ اس کی آنکھوں میں ابھرنے لگا۔

''شادی کر لے مجھ سے میرے ماں باپ کی مشکل بھی حل ہو جائے گی۔ تو مجھے اچھا بھی تو لگتا ہے کر لے نا مجھ سے شادی''۔ یہ الفاظ اس کے کانوں میں سرگوشیاں

کرنے لگے اور اس کے منہ سے ٹھنڈی سانس نکل گئی۔

''دلجیا! تو اگر زندہ ہے اگر تو مجھے مل گئی تو یقین کر لے کہ میں تجھے ساری زندگی کی مشکلات کا صلہ دے دوں گا۔ حالانکہ اب میری زندگی بھی مشکلات کے سوا کچھ نہیں ہے''۔

وہ سوچتا رہا رفتہ رفتہ صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ وہ کون سے علاقے میں ہے۔ یہ حیدر شاہ کی تحویل میں تھا دن کی روشنی اس کے لیے بستیوں میں جانے کے لیے نہیں ہوتی تھی۔ شام کے جھٹپٹوں کا انتظار کروں اور اس کے بعد بستی میں داخل ہو جاؤں۔ صحیح اندازہ اسے ہو چکا تھا کوئی بیس منٹ کا سفر تھا اور اس کے بعد وہ حیدر شاہ کی بستی میں داخل ہو سکتا تھا۔

چنانچہ اس نے دن گزارنے کے لیے سہی جگہ کا انتخاب کیا باغ سے ہٹ گیا تھا کیونکہ باغ اور کھیتوں کے رکھوالے اسے دیکھ کر پولیس کو اطلاع دے سکتے تھے اور پولیس کے لیے اس وقت وہ سب سے اہم کردار بنا ہوا تھا۔

بہر حال کہیں نہ کہیں وقت گزار ہی دیا اور اس کے بعد جیسے ہی رات کی تاریکیاں زمین پر اتریں اس نے بستی کی جانب رخ کیا اور یہ فاصلہ طے کر کے حیدر شاہ کی حویلی کے پاس پہنچ گیا۔ لیکن اندر داخلے کے لیے صدر دروازے سے کسی طور مناسب نہیں ہوتے تھے۔ اور حیدر شاہ کی حویلی میں داخل ہونے کے خفیہ راستے وہ جانتا تھا۔ حویلی میں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ لوگ گہری نیند سو رہے تھے لیکن راہداری میں قدم رکھتے ہی اسے چونک کر رک جانا پڑا۔ راہداری کے جس حصے میں حیدر شاہ کے مسلح افراد ہوتے تھے۔ وہاں دو آدمی اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ شاہ زیب بری طرح چونک پڑا اور ان کے قریب پہنچ گیا یہ حیدر شاہ کے چوکیدار تھے ان کے سروں سے خون بہہ رہے تھے ان کے سروں پر شدید ضربیں لگائی گئی تھیں اور پھر ان کے ہاتھ پاؤں

باندھ دیئے گئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ یقینی طور پر کوئی سنگین عمل ہو رہا تھا۔ ’دھت تیرے کی‘ تقدیر میں یہی سب کچھ لکھا ہوا ہے اس کے علاوہ بھی تو زندگی ہوتی ہے۔ وہ حیدر شاہ کی رہائشگاہ کے بارے میں جانتا تھا۔ لیکن ان دو افراد کو اس نے اس طرح پڑے ہوئے دیکھا تو اس نے سوچا کہ ممکن ہے جنہوں نے انہیں زخمی کر کے باندھا ہے وہ ابھی یہیں اسی حویلی میں موجود ہوں۔ چنانچہ اپنے آپ کو چھپاتے ہوئے وہ حیدر شاہ کی خواب گاہ کے ایک ایسے حصے میں پہنچ گیا۔ جہاں سے وہ نہ صرف اندر جھانک سکتا تھا بلکہ بالکل نادر شاہ کے گھر کی طرح وہاں سے اندر بھی داخل ہو سکتا تھا اور اندر روشنی میں ایک پراسرار کھیل ہو رہا تھا۔ ان کی تعداد بھی چار تھی اور ان میں ایک انتہائی لمبے چوڑے بدن کا مالک نظر آ رہا تھا۔ حیدر شاہ کو ایک کرسی سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھیں لمبے چوڑے بدن والے پر جمی ہوئی تھیں۔

’’تو کیا چاہتا ہے آخر جے کال‘‘۔ حیدر شاہ کی آواز ابھری

’’بڑے دن سے تیری تاک میں تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ حیدر شاہ اور مکرم شاہ میں کیا فرق ہے‘‘۔ لمبے چوڑے بدن والے کی آواز ابھری۔ جسے جے کال کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔

’’مکرم شاہ میرا بھائی تھا اور تو جانتا ہے کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے‘‘۔

’’یہی مجھے تجھ سے اختلاف ہے۔ میرے دوست کی دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے جے کال کی آنکھوں میں نہیں۔ تو حیدر شاہ نہیں مکرم شاہ ہے۔ مجھے اس کے بارے ثبوت مل چکے ہیں۔ تو نے حیدر شاہ پر مکمل قبضہ جمایا ہوا ہے۔ لیکن تجھے یہ سن کر افسوس ہو گا کہ یہ تیرے آخری لمحات ہیں۔ میں تجھے اس دنیا میں نہیں رہنے دوں گا۔ یہ دنیا اب تیرے لیے نہیں ہے‘‘۔

’’حالانکہ تو اپنی زندگی کی بدترین حماقت کرے گا۔ تو یہ بتا کہ تجھے مجھ سے کیا

دشمنی ہے‘‘۔

’’نہیں۔ مجھے تجھ سے دشمنی نہیں ہے مکرم شاہ! اس نے میرے آخری آدمی کو بھی قتل کر دیا تو حیدر شاہ نہیں مکرم شاہ ہے۔ دنیا کو دھوکہ دے سکتا ہے تو لیکن جے کال کو نہیں‘‘۔

’’میری بات سن جے کال! خوامخواہ کی غلط فہمیوں‘‘

’’اگر مجھے غلط فہمی ہے تو اسے دور کرنے میں میری مدد کر‘‘

’’بول میں کیا کر سکتا ہوں‘‘۔ حیدر نے کہا

’’تو نہیں کر میں خود کر لیتا ہوں اور مجھے یہ کرنا تھا‘‘۔ جے کال نے کہا اور پھر ہنس کر اپنے آدمیوں سے کہا۔

’’چلو...... اس کی ٹانگیں کھول کر دیکھو اگر اس کی دونوں ٹانگیں مصنوعی ہیں تو پھر یہ حیدر شاہ نہیں مکرم شاہ‘‘۔ شاہ زیب کے بدن میں پسینے چھوٹ رہے تھے۔ یہ بات تو اس کے ذہن میں بھی بڑی شدت سے گردش کرتی رہتی تھی۔ آج یہ عجیب اتفاق تھا۔ بہر حال تم حیدر شاہ ہو یا مکرم شاہ کی زندگی کو کوئی خطرہ ہو تو جہنم کا دہانہ کھول دے۔ اس وقت اس کے پاس رائفل بھی موجود تھی اور کوئی مشکل مسئلہ نہیں تھا۔ اندر ایک سنسنی خیز کھیل شروع ہو چکا تھا اور پھر جب بہت ہی اعلیٰ درجے کی پلاسٹک کی بنی ہوئی دو مصنوعی ٹانگیں نکال کر ایک طرف پھینک دی گئیں تو شاہ زیب کی آنکھیں بھی بند ہو گئیں تھی۔ وہ حیدر شاہ نہیں مکرم شاہ تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا۔ شاہ زیب جانتا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ چنانچہ اس نے ریوالور سنبھال لیا۔ اندر کی آواز اس کے کانوں میں ابھری۔

’’ہاں۔ مکرم شاہ! اب تو مجھے بتا کہ حیدر شاہ کہاں ہے‘‘۔

’’میں حیدر شاہ ہوں‘‘

''اب بھی''

''اگر میں مکرم شاہ بھی ہوں تو تو مجھے ہلاک نہیں کر سکے گا''۔ مکرم کی آواز بے حد پھنسی پھنسی تھی''۔

''کیوں میرے پیارے بھائی! اب مجھے کیا دقت ہوسکتی ہے''۔ جے کال نے کہا اور اپنا ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ پھر وہ بولا

''بات اصل میں یہ ہے مکرم شاہ! کہ میں ذرا مختلف انداز میں کھیلنے کا عادی ہوں۔ بہت سے ایسے کردار ہیں جو میری اور تمہاری زندگی میں مشترک ہیں۔ میں جانتا ہوں تمہیں حیدر شاہ کی حقیقت سے اختیارات حاصل ہیں۔ لیکن جب حیدر شاہ ہی نہیں ہوگا تو اپنے اختیارات کو کیسے استعمال کرے گا''۔

اس نے ریوالور سیدھا کیا تھا کہ شاہ زیب کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی نے اس کے ریوالور کو اس کے ہاتھ سے نکال کر دور پھینک دیا وہ ایک دم سے پیچھے ہٹا تھا کہ شاہ زیب نے دوسری گولی چلائی اور اس گولی نے جے کال کی ران میں سوراخ کر دیا۔ اس کے حلق سے ایک کریہہ آواز نکلی۔ ادھر اس کے ساتھ جو لوگ موجود تھے۔ انہوں نے اندھا دھند سمت کا اندازہ کر کے فائرنگ شروع کر دی۔ لیکن شاہ زیب اس کے لئے پہلے سے تیار تھا۔ اس نے فوراً ہی اپنی جگہ تبدیل کی۔ بھاگ کر دوسری سمت آیا اور وہاں سے اس نے اس پر گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ جے کال اپنی ٹانگ لے کر دروازے کی طرف دوڑا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

ادھر اس کے ساتھی بھی گولیاں چلاتے ہوئے ادھر سے دوڑے تھے۔ حیدر شاہ یا مکرم شاہ نے اس وقت عقل سے کام لیا اس نے فوراً ہی اپنی کرسی نیچے گرا دی اور بندھا بندھا نیچے گر پڑا۔ شاہ زیب بہت ذہانت سے کام لے رہا تھا۔ اس نے وہ جگہ چھوڑ دی جہاں سے وہ فائرنگ کر رہا تھا اور اس سے کافی فاصلے پر ایک پوزیشن لے

لی۔ مقصد یہ تھا کہ وہ لوگ کہیں اس کی تلاش میں اس طرف نہ آئیں اور وہ اس کا نشانہ بن جائے۔ لیکن وہ بدحواسی میں بھاگے تھے اور دوڑتے ہوئے دور تک نکل گئے تھے۔

شاہ زیب کو یہ اندازہ تھا کہ حیدر شاہ زخمی نہیں ہوا ہے۔ بس بندھا ہوا ہے اس لیے اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ چنانچہ پہلے وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جے کال اور اس کے ساتھیوں کو کیا ہوا لیکن جب وہ حویلی سے باہر پہنچا تو اس نے ایک گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی اور پھر وہ آواز دور چلی گئی۔ غالباً گاڑی کسی ایسی جگہ رکھی گئی تھی جہاں سے وہ نظر نہ آسکے۔ جے کال اور اس کے ساتھی یقینی طور پر فرار ہو گئے تھے۔ ادھر حویلی میں جگہ جگہ روشنی ہونا شروع ہو گئی تھی۔ صرف ان دو افراد کو زخمی کیا گیا تھا جو چوکیداری پر متعین تھے۔ باقی لوگوں کو شاید اندر ہونے والے حالات کا علم ہی نہیں تھا۔

بہر حال جے کال اور اس کے ساتھی بھاگ گئے تھے اور اب شاہ زیب کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آگے کیا کرنا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے پوشیدہ رہنے کے لیے ایک جگہ منتخب کی اور پھر پھرتی سے وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔ حویلی میں اچھی خاصی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی تھی۔ شاہ زیب کو موقع مل گیا اور وہ حویلی میں ہو رہی تھی۔ حیدر شاہ کے رشتے دار، ملازم سب ہی اس کی خیریت معلوم کرنے کے لئے دوڑ پڑے تھے۔ کچھ اس کے کمرے میں بھی داخل ہو گئے اور اس کے بعد حیدر شاہ کو کسی نے کھول دیا تھا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے سوالات کر رہے تھے۔ حیدر شاہ نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''کتے کے بچو! اب جب سب کچھ ہو چکا ہے تو آئے ہو میرے پاس سوالات کرنے کے لئے چوکیدار کہاں ہیں''۔

''شاہ جی وہ تو بے ہوش پڑے ہوئے ہیں ہوسکتا ہے مر بھی گئے ہوں ان کے پاس خون بکھرا ہوا ہے''۔ کسی نے جواب دیا اور حیدر شاہ انہیں دیکھنے کے لئے باہر نکل

آیا۔بس یہی موقع تھا شاہ زیب کے لئے۔ وہ پھرتی سے سے حیدر شاہ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ جو اس کی خوابگاہ کے طور پر تھا۔ یہیں ساری ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی۔ شاہ زیب کے لئے حیدر شاہ کی مسہری کے نیچے چھپنا مشکل نہ ہوا۔ یہاں وہ آرام سے لیٹ گیا۔ حویلی کی بھاگ دوڑ جاری رہی۔ باہر سے آواز ابھر رہی تھیں اور شاہ زیب مسہری کے نیچے لیٹا سوچ رہا تھا کہ اس کا خیال بھی بالکل ٹھیک نکلا۔ یعنی یہ حیدر شاہ اور مکرم شاہ اس وقت ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ حیدر شاہ ہی مکرم شاہ کی حیثیت سے ان سے ملتا رہا ہے۔ ماضی کی بہت سی باتیں شاہ زیب کے ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ مکرم شاہ کا اپنا انداز ہی بالکل مختلف تھا جبکہ حیدر شاہ اس سے الگ شخصیت کا مالک۔

پھر کوئی گھنٹہ گزر گیا بھاگ دوڑ ختم ہو گئی۔ حیدر شاہ نے غالباً ساری حویلی کی تلاشی لینے کے بعد اپنے کچھ اور آدمیوں کو مسلح کرنے کے بعد وہاں متعین کر دیا۔ اور اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں واپس آیا تھا۔ لیکن بستر پر لیٹنے کے بجائے اس نے اپنی الماری سے دو رائفل نکالنے کے بعد سامنے رکھیں اور کرسی پر بیٹھ کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ اس کی آنکھیں خلا میں گھور رہی تھیں اور شاہ زیب سوچ رہا تھا کہ اب اسے حیدر شاہ سے ملاقات کر لینی چاہیے۔ لیکن اس وقت وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا وہ ایسا تھا کہ اسے سخت خطرہ درپیش ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی مسہری کے نیچے سے نکلے گا کہیں حیدر شاہ اس پر فائرنگ شروع کر دے۔ وہ سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے کوئی بیس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ تو اس نے ایک فیصلہ کرنے کے بعد مسہری کے نیچے سے آواز لگائی۔

''حیدر شاہ صاحب! میں شاہ زیب ہوں اور آپ کی مسہری کے نیچے چھپا ہوا ہوں۔ باہر نکل رہا ہوں میں آپ مجھے دیکھتے ہی فائرنگ شروع نہ کر دیں''۔ حیدر شاہ کو جیسے بجلی کا کرنٹ لگا تھا، کھڑے ہوتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں میں ریوالور اٹھا لیے تھے۔ غالباً مصنوعی ٹانگیں اس نے اپنی ٹانگوں میں باندھ لی تھی یہ بھی اس کے

بدترین حالات ہیں کہ اس کی ٹانگوں کا راز کھل گیا تھا پتہ نہیں کس طرح اس نے اپنی ٹانگوں کو مصنوعی ٹانگوں سے منسلک کیا تھا۔ اس بات کا شاہ زیب کو علم نہیں تھا۔

بہر حال حیدر شاہ دونوں ریوالور سیدھے کیے ہوئے مسہری کی جانب دیکھ رہا تھا۔ شاہ زیب نے پہلے ایک پاؤں باہر نکالا پھر دوسرا اور پھر آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا وہ باہر نکل آیا۔ حیدر شاہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ جب اس نے شاہ زیب کو پہچان لیا تو اس کے دونوں ریوالور نیچے جھک گئے۔ وہ حیرانی سے شاہ زیب کو گھور رہا تھا۔ اور پھر اس نے کہا۔

''تم یہاں کیسے''

''بس جناب! جب آپ کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔ تو میں آپ کے کمرے میں چلا آیا تھا۔ آپ سے ملاقات کرنی تھی۔ اور اپنے آپ کو دوسروں کی نگاہوں سے بھی بچانا تھا''۔

مگر تم ...... اوہو...... اس کا مطلب ہے کہ ان لوگوں پر گولیاں تم نے ہی چلائیں تھیں''۔ حیدر شاہ نے کہا۔

''جی''

''پر تم یہاں کیسے''

''میں اس وقت وہاں اس طرف تھا اور مجھے ایک اچھا نشانہ مل گیا تھا''

''میرے خدا...... میں ایک ایک سے پوچھتا پھر رہا تھا کہ میرے دشمن پر گولیاں کس نے برسائیں کسی کو بھی اس کے بارے میں علم نہیں تھا۔ میرا دماغ بری طرح چکرایا ہوا تھا اور میں سوچ رہا تھا۔ کہ یہ کون سا میرا نادیدہ دشمن پیدا ہو گیا ہے''۔

''وہ میں تھا جناب''

''مگر تم''

"ہاں"

"پر تم حویلی میں داخل کیسے ہوئے"

رات ہی کو میں اسی چور دروازے سے حویلی میں داخل ہوا تھا جہاں سے پہلے بھی آ چکا ہوں اور میری خوش بختی تھی کہ میں بروقت پہنچ گیا ورنہ وہ کم بخت جے کال آپ کو نجانے کیا نقصان پہنچاتا"۔ حیدر شاہ نے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا تھا۔ پھر حیدر شاہ نے شاہ زیب سے کہا۔

"تو تم جے کال سے واقف ہو چکے ہو"

"جی حیدر شاہ صاحب"

"تم نے ساری حقیقت جان لی ہے"

"جی ہاں اور بلاوجہ اداکاری نہیں کروں گا۔ میں نے آپ کی تمام حقیقتیں جان لی ہیں"۔ حیدر شاہ نے گردن جھکالی تھی۔ پھر وہ دیر تک خاموش رہا اور اس کے بعد گردن اٹھا کر شاہ زیب کو دیکھتا ہوا بولا۔

"وہ کرسی گھسیٹو اور میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔ اب کوئی خطرہ نہیں رہا ہے۔ میں نے حویلی کے در و دیوار پر اتنا پہرہ بٹھا دیا ہے۔ کہ جے کال تو کیا اب کوئی پرندہ بھی اجازت کے بغیر اندر نہیں گھس سکے گا"۔

"جی"

"تو تم نے۔ مگر ٹھہرو تم آ کہاں سے رہے ہو"

"بس شاہ جی میری زندگی کے بارے میں تو آپ کو علم ہو ہی چکا ہے۔ میں ادھر ادھر بھٹکتا رہتا ہوں۔ کچھ دوست ہیں اور کچھ دشمن۔ دشمنوں سے پنجہ کشی کے بعد جب تھکن ہوتی ہے تو کسی دوست کی خواہش کرتا ہوں۔ آپ بھی میرے سرپرست ہیں۔ ادھر نکل آیا۔ لیکن میری تقدیر نے مجھے ایک اچھا موقع دیا کہ میں بروقت پہنچ گیا۔

"واقعی اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت تم نے جے کال سے میری جان بچائی۔ ورنہ وہ پاگل کتا مجھے ختم کر دیتا۔ اصل میں میرے اور اس کے درمیاں ایک طویل دشمنی چل رہی ہے اور اب تم یہ بات جان چکے ہو کہ میں حیدر شاہ نہیں مکرم شاہ ہوں تو میرے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ میں تمہیں اس کے بارے میں بتا دوں"۔

"آپ کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں شاہ صاحب! کہ اگر یہ جاننے کے بعد کہ آپ مکرم شاہ ہیں۔ آپ مجھے حکم دیں تو میں آپ کو حیدر شاہ ہی سمجھوں گا"۔

"نہیں یہ بات تم پر کھل گئی ہے اور چند دوسرے افراد بھی اس بات سے واقف ہو گئے ہیں۔ بس دوسرے افراد کا اس سے واقف ہو جانا۔ میرے لیے ذرا تکلیف دہ ہے۔ میرے ملازم بھی نہیں جانتے کہ میری دونوں ٹانگیں مصنوعی ہیں جو لوگ جان گئے ہیں ان کی زبانیں تو بہر حال میں نے بند کر دی ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ کافی نہیں ہے۔ یہ بات میرے لیے مشکل کا باعث بن گئی ہے۔ دیکھو آگے کیا ہوتا ہے"۔

"جی"

"میں مکرم شاہ اور میرا بھائی حیدر شاہ بالکل ہی الگ طبقوں اور شخصیتوں کے مالک تھے میں بہت سے لوگوں کی دشمنی مول لے بیٹھا تھا۔ کیونکہ میری فطرت بالکل مختلف تھی۔ جبکہ حیدر شاہ نرم خو اور تحمل مزاج کا آدمی تھا۔ بہر حال دشمنوں ہی سے ایک جھگڑے کے نتیجے میں میری دونوں ٹانگیں ضائع ہو گئیں اور مجھے روپوش ہونا پڑا۔ بڑی مشکل سے میرا علاج ہوا ٹانگیں کاٹ دی گئیں۔ لیکن میں نے اپنے دشمنوں سے ہار نہیں مانی تھی۔ پانچ ایسے آدمی تھے جنہیں مجھے قتل کرنا تھا اور تقدیر کی مہربانی سے میں نے اپنے دشمنوں کو قتل کر چکا تھا لیکن اس دوران ایک بار حیدر شاہ میرے دھوکے میں مارا گیا وہ بے چارہ میری ہی وجہ سے مارا گیا تھا۔ خود چونکہ لڑائی بھڑائی کا آدمی نہیں تھا اس

لیے مار کھا گیا۔ اب میرے لیے اپنے بھائی کا غم بڑی حیثیت کا حامل تھا میں مصنوعی ٹانگوں پر بھاگنا دوڑنا اور چلنا پھرنا سیکھ گیا تھا۔ چنانچہ میں نے حیدر شاہ کی شخصیت اختیار کر لی۔ اور اس کی حیثیت سے اس کی حویلی میں آ گیا۔ جب مجھے اپنے دشمنوں کے مقابلے پر جانا ہوتا تھا تو میں مکرم شاہ بن کر ہی جاتا تھا اسی دوران تم سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں اور میں نے تمہیں حیدر شاہ بن کر بھی اپنے ساتھ رکھا اور مکرم شاہ بن کر بھی...... بہرحال میری یہ دوسری شخصیت تمہارے لیے نقصان دہ نہیں۔ میں صرف اپنے دشمنوں سے جنگ کر رہا تھا اور یہ کتا جے کال میرا ایک کاروباری حریف رہا میرے اس کے درمیان خوب چلتی رہی۔ میں حیدر شاہ بن گیا تھا اور حیدر شاہ سے اسے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ یہ تو بس مکرم شاہ ہی کا دشمن تھا۔ پھر نجانے اسے کیسے معلوم ہو گیا کہ میں حیدر شاہ نہیں مکرم شاہ ہوں اور حیدر شاہ مر چکا ہے۔ چنانچہ اس نے پھر میری تلاش شروع کر دی اور اس کے بعد تھوڑی بہت صورت حال تمہارے علم میں ہے۔ یہ میرا کاروباری حریف ہے اب کاروبار کیا ہے براہ کرم اس کے بارے میں مت پوچھنا۔ ظاہر ہے جس کا کاروبار میں اس جیسا حریف ہو وہ کوئی اچھا کاروبار نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے پوری کہانی''

شاہ زیب خاموشی سے پوری داستان سن رہا تھا۔ مکرم شاہ خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی طاری رہی پھر اس نے چونک کر کہا۔

''تمہیں یہ پتہ چل گیا کہ میں اصل میں کیا ہوں۔ یہ بات تمہارے ذہن میں بھی ضرور ہو گی۔ کہ حیدر شاہ اور مکرم شاہ ہم شکل ہیں۔ اچھا ایک بات بتاؤ تمہیں کبھی شبہ ہوا اس بات کا''۔

''ہاں''

''تو پھر تم نے چھان بین بھی کی ہو گی''

''نہیں''

''نہیں''

''جی''

''مگر یہ تو انسانی فطرت ہے۔ تجسس تو ہر شخص کے اندر ہوتا ہے''

''میرے اندر بھی تھا''

''تم نے اسے دور کرنے کی کوشش نہیں کی''

''نہیں''

''کیوں''

''اس کی کوئی وجہ نہیں''

''تعجب کی بات ہے''

''نہیں تعجب کی بات نہیں ہے''

''کیوں؟''

''اس لیے جناب کہ مکرم شاہ کی حیثیت سے بھی آپ نے میری بڑی مدد کی ہے اور حیدر شاہ کی حیثیت سے بھی۔ میرے لیے یہ دونوں کردار محترم تھے۔ میں جانتا تھا کہ اگر آپ مجھے اس بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے تو بتا دیں گے ورنہ ایک ایسے شخص کے بارے میں جو میرا محسن ہے۔ جو کچھ وہ نہیں چاہتا۔ مجھے وہ نہیں کرنا چاہیے تھے''۔

''خیر اس بات کو میں دل سے تسلیم کرتا ہوں کہ تم بہت اچھے نوجوان ہو۔ یہ ساری داستان تھی۔ تم خود سوچ لو۔ دشمنوں کے درمیان گھرا ہوا تھا کسی کو اپنی اصلیت نہیں بتا سکتا تھا۔ لیکن جے کال وہ کم بخت اب یہ معلوم کر چکا ہے۔ اپنی طرف سے وہ مجھے ختم کرنے کی پوری تیاریاں کر کے آیا تھا اور اس نے حقیقت بھی معلوم کر لی۔ اب یہ الگ بات ہے کہ وہ اس حقیقت سے کوئی بہت بڑا فائدہ نہیں حاصل کر سکتا۔ کیونکہ وہ

خود بھی دنیا سے روپوش ہے۔لیکن بہر حال وہ اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد میرے پیچھے ضرور لگ جائے گا اور بہر حال خطرناک آدمی ہے''۔

''آہ...... کاش مجھے پہلے ہی معلوم ہوتا۔تو میں اسے کسی قیمت پر زندہ نہیں جانے دیتا''۔شاہ زیب نے کہا اور مکرم شاہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔دیر تک سوچتا رہا اور پھر بولا۔

سوچیں گے۔سوچیں گے اس بارے میں بھی کچھ سوچیں گے۔تم یہ بتاؤ تمہارا معاملہ کیسا چل رہا ہے''۔

''معمول کے مطابق مکرم شاہ صاحب''

''وہ لڑکی ملی تمہیں''

''نہیں یوں لگتا ہے کہ یا تو وہ زیر زمین چلی گئی ہے اور اب اس دنیا مین نہیں ہے یا اگر ہے تو اس نے کوئی ایسا گمنام گوشہ اختیار کر لیا ہے۔ جہاں نگاہ پہنچ ہی نہیں سکتی۔لیکن اب وہ میرے لیے حسین چیز نہیں رہی ہے''۔

''مطلب''

''مطلب کچھ نہیں''

''کیا تمہارے خیالات اس کی جانب سے بدل گئے ہیں''

''نہیں''

''تو پھر''

''مکرم شاہ صاحب خیالات نہیں بلکہ راستہ بدل لیا ہے میں نے۔اس کے چکر میں پڑ کر نجانے کیسے کیسے ضروری کام نظر انداز کر چکا ہوں جو میں نہیں کرنا چاہتا''

''ہاں۔یہ اچھی بات ہے محبت ایک آفاقی جذبہ ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن محبت کے ہاتھوں مفلوج ہو جانا ایک مناسب عمل نہیں ہے''۔

''ہوں۔کیا کرتے رہے ہو اب تک''

''بس وہی تمام فضول باتیں۔میں نے نادر شاہ کو اندھا کر دیا ہے''۔

''اوہو...... ہو۔نادر شاہ، چوہدری نادر شاہ''

''جی...... اسی کی بات کر رہا ہوں''

''کیسے بھی کیسے''

''اور جواب میں شاہ زیب نے ملکہ بائی، نادر شاہ اور ریحانہ کی کہانی سنا دی۔مکرم شاہ پر خیال انداز میں گردن ہلاتے ہوئے ساری تفصیل غور سے سن رہا تھا اور شاہ زیب کا چہرہ دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

''یہی تو تمہاری خوبیاں ہیں میری آنکھیں ایک جوہری کی آنکھیں جو ہمیشہ ہیرے ہی پسند کرتی ہیں۔اب تمہارا کیا پروگرام ہے''۔

''میں لجیا کے والدین کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں''

''دونوں ٹھیک ہیں۔بے چارے جی رہے ہیں۔ایک حسرت میں، ایک آس میں ان کی طرف سے بے فکر رہو۔میں نے انہیں بڑے آرام سے رکھا ہوا ہے''۔

''وہ میں جانتا ہوں جناب''

''ایک کام کرو شاہ زیب''

''جی''

''فی الحال یوں کرو کہ اپنے نظریات میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کرو''

''کیسی تبدیلی جناب''

''دیکھو ایک بات تو میں بھی جانتا ہوں اور تم بھی جانتے ہو کہ اگر تم سیدھے سیدھے خدانخواستہ پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو وہ تمہیں مقدمہ چلائے بغیر قتل کر دیں گے اس وقت میرا خیال ہے کہ تم ملک کی سب سے بڑی اشتہاری شخصیت ہو۔جس کے

دشمن براہ راست پولیس والے ہیں اور بہر حال پولیس کی دشمنی اچھی نہیں ہوتی''۔

''مجھے اندازہ ہے جناب''

''میں تمہیں ایک ایسے شخص سے ملوا سکتا ہوں جو تمہیں مکمل تحفظ دے سکتا ہے۔تمہاری شخصیت تو نہیں بدلی جا سکتی۔لیکن تم یہ سمجھ لو کہ چھوٹے موٹے لوگ تمہیں ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ان سب کو خفیہ طور پر ہدایت کر دی جائے گی کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔لیکن وہ شخصیت تم سے کچھ کام لینا چاہے گی۔میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔جے کال میرے لیے ہی نہیں بلکہ بہت سے لوگوں کے لئے بہت بڑا مسئلہ ہے۔جس شخصیت سے میں تمہیں ملواؤں گا نا تو تم یہ سمجھ لو کہ وہ ملک کی بہت بڑی شخصیت ہے۔وہ خود کوئی قانونی حیثیت نہیں رکھتا لیکن یوں سمجھ لو قانون اس کی مٹھی میں ہے۔کسی کے لئے اس کا کچھ کہہ دینا ہی کافی ہے۔جے کال اس کا بھی دشمن ہے اور وہ جے کال کا۔اگر ہم تمہیں جے کال کے قتل پر معمور کر دیں تو وہ شخص بھی تمہاری بھرپور مدد کر سکتا ہے۔تم ایسا کرو میں تمہارے آرام کا بندوبست کیے دیتا ہوں۔رکو......سوچو اور پھر فیصلہ کرو''۔شاہ زیب تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے مکرم شاہ صاحب!میں آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہوں''۔

زندگی جس طرح لمحہ لمحہ رنگ بدلتی ہے شاہ زیب کو اس کا بھرپور اندازہ تھا اور زندگی کے ہر بدلے ہوئے رنگ ہر قیمت پر قبول تو کرنا ہی پڑتے ہیں۔انسان ان سے فرار نہیں حاصل کر سکتا۔چاہے نفع ہو یا نقصان اس کا فیصلہ تقدیر ہی کرتی ہے۔حیدر شاہ یا باالفاظ دیگر مکرم شاہ اب پوری طرح اپنی شخصیت پر نمایاں ہو چکے تھے۔مکرم شاہ نے اس کے لئے آرام کا بندوبست کر دیا۔پہرہ کافی سخت کر دیا گیا تھا۔دوسری صبح ناشتے کی میز پر مکرم شاہ،حیدر شاہ کی حیثیت سے ہی مجھ سے ملا۔ناشتہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

اور اب مجھے اپنے لیے نیا ٹھکانا تلاش کرنا پڑے گا۔جس کا علم میرے اور

تمہارے سوا کسی کو نہیں ہوگا۔مکرم شاہ کی حیثیت سے میں نے اپنی جو جگہ بنائی ہے۔وہ ان علاقوں میں زیادہ دور نہیں ہے۔چونکہ اب حیدر شاہ کی حیثیت سے میں یہاں نہیں رہ سکتا۔جے کال جب بھی رخ کرے گا ادھر کا ہی کرے گا۔ویسے وہ زخمی ہو گیا ہے۔میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔لیکن میں تمہیں اس کے بارے میں یہ ضرور بتاؤں گا کہ جس طرح زخمی شیر خطرناک ہو جاتا ہے وہ بھی اتنا ہی خطرناک اور خونخوار ہو چکا ہے۔ہم آج رات کی تاریکی میں گھر سے نکلیں گے اور وہ راستے اختیار کریں گے۔جو محفوظ راستے ہوں گے۔

''آپ جیسا مناسب سمجھیں شاہ جی''۔شاہ زیب نے کہا وہ خود بھی بہت کچھ سوچتا رہا تھا اور اس طرح کے سہارے اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہے تھے۔چوہدریوں کے اختیارات اور اس کی حیثیت سے وہ اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔یہ لوگ جب جہاں اور جیسے دل چاہے اپنے مقصد پورے کر لیا کرتے ہیں اس کا تجربہ اسے اچھی طرح سے ہو گیا تھا۔رات کی تاریکی میں حیدر شاہ احتیاط سے باہر نکلا اپنے کچھ خاص آدمیوں کو اس نے ہدایت کر دی تھی اور خاص طور پر پہریداروں کو اس نے کہا تھا۔

''وہ شیطان جس کا نام جے کال ہے۔تم سے معلوم کرنے کے لیے یہاں ضرور آئے گا کہ حیدر شاہ کہاں ہے اور ظاہر ہے تمہیں میرے بارے میں معلوم نہیں ہوگا اپنے آپ کو اس کے لیے تیار رکھنا''۔

''آپ فکر نہ کریں حیدر شاہ جی!اللہ مالک ہے''۔راستے میں حیدر شاہ نے کہا۔

''اور اب میں بھی ادھر چوری چھپے ہی آسکوں گا کیونکہ جے کال یہاں میری نگرانی کرے گا''۔صبح کو تقریباً ساڑھے چار بجے ہم ایک آبادی میں داخل ہو گئے۔

مکرم شاہ کو اس آبادی کے بارے میں پوری تفصیل معلوم تھی۔ وہ ایک سرائے میں جا پہنچا اور اس نے سرائے میں رہائشگاہ حاصل کر لی۔ بالکل معمولی سی سرائے تھی۔ چارپائیاں اور بستر غلیظ تھے۔ لیکن شاہ زیب مکرم شاہ کو دیکھ رہا تھا کہ وہ ہر طرح سے وقت گزارنے کا عادی ہے۔ حیدر شاہ کی حویلی بھی دیکھی تھی اس نے۔ ویسے مکرم شاہ اسے جب بھی ملا تھا خانہ بدوشی کی حالت میں ہی ملا تھا اور اس وقت بھی وہ حیدر شاہ سے مکرم شاہ بننے کے بعد اتنا ہی مست نظر آ رہا تھا۔ شاہ زیب نے ہنستے ہوئے کہا۔

''شاہ جی! مکرم شاہ کی شخصیت میں ایک بڑی حسین بات تھی۔ اب جب آپ مکرم شاہ بنے ہیں بلکہ میں تو میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کی زبان سے کچھ سنوں''۔

''کیا''۔ مکرم شاہ نے چونک کر پوچھا۔

''شاہ جی! بُھلّے شاہ کی کافی۔ یا جو بھی آپ پسند کریں''۔ مکرم شاہ ہنسنے لگا تھا اور پھر وہ بولا۔

''چلو پھر کبھی سہی یہاں اس سرائے میں مناسب نہیں ہوگا''۔

''شاہ جی! تھوڑی سی مدھم آواز میں ہی سہی۔ اب کون سا ہمیں سونا ہے۔ جاگیں گے ابھی تو''۔

''تمہاری مرضی ہے اگر ایسا ہی چاہتے ہو تو یہی سہی اور پھر مکرم شام نے انتہائی حسین آواز میں شروع کیا۔

بھاں بھاں کردی جوہ میرے دی
جیون بڑا اکولا
چار چوفیرے ڈونگھا رستہ
میں وچ کلم کلا
سارے پہلے میرے پتر

موٹے پتلے ڈاہڈے
لم سلمیاں لغراں اتے
بولن کاں مونہہ کالے
آون جھکھڑ جاون جھکھڑ
تھاں توں ذرا نہ ہلاں
بوہندیاں دھپاں مارو پے لے
اپنی جان تے جھلاں
چھاں نوں کوئی چھاں نہ جانے
پھل نوں پھل نہ سمجھے
اوہ جیون کی جیون جس دا
کوئی مُل نہ سمجھے

شاہ زیب جھوم رہا تھا۔ مکرم شاہ مست انداز میں جو کچھ بھی گاتا تھا۔ اس کی حیثیت الگ ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس وقت وہ صرف گانے کے موڈ میں تھا اور اس نے اتنی خوبصورتی سے یہ سب کچھ گایا تھا کہ شاہ زیب پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی وہ دیر تک جھومتا رہا پھر اس نے کہا۔

''جی نہیں بھرا شاہ جی! جی نہیں بھرا''

''سن میرے یارا اور سن لے''

کیہ دساں میں کیہڑی گلوں جتی بازی ہار گیا
جنہوں جنہوں منصف پایا اوہو مینوں چار گیا

لہو رنگا اوہ اتھرو جیہڑا پلکیں زوریں ڈگیا سی
ڈگدا ڈگدا کئی سجناں دے پیار دا بھار اتار گیا

نہر کنارے میلہ لگیا لوکیں پچھدے پھردے تیں
ڈبن والا کاغذ دی اک بیڑی کاہنوں تار گیا

تیری اکھ سہارا دتا میریاں ٹٹیاں آساں نوں
تیرا اک دلاسا چناں میرا بتا سار گیا

کندھاں ات ہنیرے دیاں ڈھا کے وی میں قید رہیا
جن چڑھیا تے میرے گردے چانن کندھ اسار گیا

اک رتی توں پیار دا سودا ایتھوں کتھے لبھنا ایں
جدھر ٹر گئے حسن بپاری اودھر اوہ بازار گیا

ایہو اک وڈیائی میری میں بوہا کھڑکایا نئیں
وچ خیالیں بھانویں اوہدے بوہے لکھاں وار گیا

کوئی موت بہانہ یارو میری موت نو ملیا نہ
میںوں اپنے اندروں اٹھدا ہویا ہوکا مار گیا

پرے پار اڈیکن والے بزدل کہہ کے ٹر گئے نیں
ارلے کنڈے آکھن لوکیں اندر پرلے پار گیا

مکرم شاہ بھی موڈ میں آ گیا تھا۔ پھر ایک کے بعد دیگرے اس نے اور بھی چیزیں سنائیں۔ شاہ زیب کو ماحول کے بدلے ہوئے ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ جب سے لاہور یونیورسٹی چھوڑی تھی دوستوں کو چھوڑا تھا۔ زندگی ایک رزم گاہ ہی بن گئی تھی۔ اپنے دل کو بہلانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا لیکن اس وقت مکرم شاہ نے ایک ایسا سماں

باندھ دیا تھا کہ شاہ زیب کو ماضی یاد آ رہا تھا۔ ماضی میں راوی کی لہریں، نور جہاں کا مقبرہ، اور بھی بہت سے ایسے مقامات جہاں زندگی اپنا ایک لطف رکھتی تھی۔ مکرم شاہ کی آواز میں بھراہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ جسے شاہ زیب نے محسوس کیا اور مدھم لہجے میں بولا۔

''شاہ جی! آپ کی زندگی سے بھی کوئی کہانی وابستہ لگتی ہے''۔ مکرم شاہ ہنس پڑا پھر بولا۔

''کہانیاں...... میں سمجھتا ہوں۔ انسان تو انسان کہانیاں تو جانوروں کی زندگی میں بھی ہوتی ہیں۔ یہ پھل، پھول، پودے اس کائنات کا ہر ذرہ اپنی ایک داستان رکھتا ہے۔ کوئی بھی اس داستان سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ بس یوں سمجھو کہ ساری کائنات ایک داستان ہے۔ میرا گھٹیا سا فلسفہ حرف آخر نہیں ہے میں اپنی سوچ بتا رہا ہوں۔ دوسرے جو کچھ بھی سوچیں۔ مفکر اور دانش ور جو کچھ بھی کہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ تم کسی بھی چیز کو لے لو، اس کی تخلیق اس کی نمود جاندار ہو یا بے جان ایک کہانی رکھتی ہے۔ کہیں یکساں کہیں مختلف''۔

''آپ ٹھیک کہتے ہو شاہ جی''۔ صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد مکرم شاہ نے سوچا کہ اب سویا جائے۔ اور دونوں اپنے بستروں پر جا لیٹے۔ یہ غلیظ اور بدبودار بستر اس وقت کائنات سب سے بڑی نعمت ہے۔ جنہوں نے انہیں سکون کی نیند سلایا۔ دنیا بھر کی مشکلات سے دور ہو کر وہ سوتے رہے۔ ڈھائی بجے کے قریب آنکھ کھلی تھی۔ مکرم شاہ نے باہر نکل کر سرائے کے مالک سے نہانے دھونے کے بارے میں پوچھا۔ تو انہیں جگہ بتا دی گئی۔ نہانے کے بعد وہی لباس زیب تن کیے گئے۔ جو ان کے جسموں پر تھے۔ مکرم شاہ نے کہا۔

''بینکوں میں بڑے پیسے پڑے ہوئے ہیں میرے۔ خریداری کر لیں گے تھوڑی۔ لیکن میں تمہیں پہلے کبیر شاہ صاحب سے ملا دوں''۔

''کبیر شاہ صاحب کون ہیں''۔

''وہی شخصیت جن کے پاس تمہیں لایا ہوں۔ دیکھنا ذرا کیا شاندار چیز ہیں''

''ٹھیک ہے لیکن بغیر کسی اطلاع کے ہم ان سے مل لیں گے''

''نہیں۔ میں انہیں اطلاع دے دوں گا۔ کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ میرا اور ان کا ایسا ہی تعلق ہے''۔ شام کو چھ بجے شاہ زیب اور مکرم شاہ وہاں سے چل پڑے۔ مکرم شاہ نے اب مکمل طور پر اپنی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ مصنوعی پاؤں پر وہ اس طرح سفر کرتا تھا کہ کوئی بڑی سے بڑی آنکھ والا یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ شخص مصنوعی ٹانگوں پر چل رہا ہے۔ لیکن کبیر شاہ کے گھر جاتے ہوئے اس نے بازار سے دو بیساکھیاں خریدیں تھیں اور ان بیساکھیوں کے ذریعے ہی آگے کا سفر کیا تھا۔

بہر حال کبیر شاہ کی حویلی کے عظیم الشان گیٹ پر کھڑے ہوئے پہریداروں نے بڑے احترام کے ساتھ مکرم شاہ کو سلام کیے تھے اور اس کے بعد مکرم شاہ شاہ زیب کے ساتھ اندر داخل ہو گیا تھا۔ ایک انتہائی وسیع ڈرائنگ روم میں ان دونوں کا استقبال جس شخصیت نے کیا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کوئی چھ فٹ دو انچ کا قد، گورا رنگ، گھنے بال، انتہائی سڈول جسم چہرے پر خاص اسٹائل کی گھنی مونچھیں ہاتھوں کی انگلیوں میں آٹھ انگوٹھیاں پڑی ہوئیں۔ جس میں سے ہر ایک کا رنگ الگ الگ جگمگا رہا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ہیرے کی بنی ہوئی تھیں اور ہیرے بھی نایاب اور بیمثال، یاقوت، زمرد، الماس وغیرہ۔ اسی طرح ڈرائنگ روم بھی دیکھنے کے قابل تھا۔ کسی بادشاہ کا محل ہی معلوم ہوتا تھا۔ فرش کا قالین لاکھوں روپے کی مالیت کا۔ شاہ زیب مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ کبیر شاہ نے آگے بڑھ کر مکرم شاہ سے ہاتھ ملایا اور بولا۔

''کہاں ہو شاہ جی! غائب ہوتے ہو تو ایسے جیسے گدھے کے سر سے سینگ''۔

کبیر شاہ نے کہا اور پھر ہنستا ہوا شاہ زیب کی طرف دیکھ کر بولا۔

''مائنڈ نہ کرنا پتر ہماری یاری کوئی پچیس سال پرانی ہے اور جب پچیس سال پرانی یاری ہو جاتی ہے نا۔ تو بے تکلفی خود بخود ہو جاتی ہے''۔ شاہ زیب پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گردن ہلا کر خاموش ہو گیا۔

''بیٹھو بھئی بیٹھو۔ اوہ یار! بڑا یاد کیا۔ پچھلے دنوں تمہیں اچھا یہ سناؤ راضی خوشی ہو طبیعت ٹھیک ہے''۔

''ہاں شاہ بس ٹھیک ہوں۔ دعائیں چاہئیں تمہاری''

''اوہ یار! ہماری دعائیں۔ اوہ میاں! گنا گاروں کی دعائیں بھی کبھی کسی کو لگتی ہیں اور پھر سچی بات تو یہ ہے کہ ہم اپنے بارے میں بھی دعا مانگتے ہوئے شرمندہ ہوتے ہیں۔ اللہ کے سامنے کہ اس کے تو کسی حکم کی پابندی نہیں کرتے اور جب دیکھو اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں''۔

''شاہ جی اس کی مخلوق بڑی کمزور ہے۔ مطلب اتنے ہیں کہ باتیں نکال لی جاتی ہیں''۔ دیر تک اس طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر اچانک ہی کبیر شاہ نے چونک کر شاہ زیب کو دیکھا اور بولا۔

''اوہ بھئی یار! کیا سوچ رہے ہو تم۔ اوئے مکرم شاہ، بھائی کا تعارف نہیں کرایا بھئی تم نے''۔

''وہی کرانے جا رہا ہوں شاہ جی۔ ایک نام لیتا ہوں آپ ذرا بتایئے کہ آپ کی معلومات کہاں تک ہیں''۔

''اوہ بھئی کوئی بہت بڑی مشہور شخصیت ہے۔ بھئی یہ...... ہوگی...... ہوگی، میاں! میری بات سنو۔ میری اور تمہاری عمر میں کافی فرق ہے۔ پر میں تم سے ایک بات کہوں۔ چہرہ شناسی میرا محبوب ترین مشغلہ رہا ہے۔ کبھی کبھی الٹے سیدھے دعوے بھی

کر دیا کرتا ہوں۔ساری جگہ بات سچ ہی نہیں نکلتی۔کئی جگہ بڑا ذلیل ہونا پڑا ہے۔کیونکہ
میری چہرہ شناسی نے کسی کو کچھ کہہ دیا۔پتہ یہ چلا کہ وہ اس کا الٹ ہی نکلا۔بھائی اللہ بڑا
کارساز ہے اور بندہ بڑا جال ساز ہے کیا سمجھے۔تمہارے بارے میں اتنا کہہ سکتا ہوں
میں کہ جو کچھ بھی ہے شخصیت بڑی جاندار ہے تمہاری۔فیصلہ کر لیتے ہو تو پھر غلط ہو یا سہی
ہٹتے نہیں ہو اس سے پیچھے۔ایسے بندے بڑے زبردست ہوتے ہیں۔اگر کوئی انہیں
پہچان لے اور مجھے معاف کرنا میں تو ذرا الگ ہی ٹائپ کا آدمی ہوں کام کے بندوں کو
دل سے چاہتا ہوں۔یوں سمجھ لو عشق ہے مجھے ان سے۔یار میں الٹی سیدھی تو نہیں بک
رہا۔کبیر شاہ نے پھر مکرم شاہ کو دیکھ کر کہا۔

''نہیں شاہ جی! بولتے رہیں..... بولتے رہیں..... بولنے میں برکت ہے''

دونوں ہنسنے لگے اس ہنسی میں شاہ زیب بھی شریک ہو گیا تھا۔پھر اچانک ہی کبیر شاہ
سنجیدہ ہو گیا اور پھر بولا۔

''ہاں بھئی بتاؤ تو سہی''

''شاہ زیب..... شاہ زیب..... شاہ زیب''۔کبیر شاہ نے آنکھیں بند کر لیں
اور پھر ایک دم سے چونک کر بولا۔

''شاہ زیب..... بوئے آسل والے''۔مکرم شاہ نے مسکراتی نگاہوں سے
شاہ زیب کو دیکھا اور پھر بولا۔

''وہاں..... کیا کہتے ہو''

''اور بھئی ذرا سی وضاحت اور کر دو۔وہی یار! جس نے پولیس والے
مارے ہیں اور وہ زمینوں وغیرہ کا چکر..... اور وہ اشتہاری''۔

''ہاں شاہ جی۔وہی شاہ زیب''

''اوئے ہوئے..... ہوئے..... ہوئے..... ہوئے..... ہوئے۔یہ تمہارے

ہاتھ کہاں سے لگ گیا بھائی''۔

کبیر شاہ نے مکرم شاہ سے کہا۔

''میری اس کی شناسائی تو بہت پرانی ہے۔پرانی سے مراد کہ جب سے یہ
اس زندگی میں آئے۔اس وقت سے میں انہیں جانتا ہوں۔بہر حال مضبوط قوت
ارادی کا مالک ہے''۔

''اوہ میاں جی۔ذرا تھوڑی سی تفصیل میں چلے جاؤ۔تمہارا اصل پرابلم کیا
تھا۔مجھے معاف کرنا کسی کی ذاتی زندگی کے بارے میں کریدنا کوئی اچھی بات نہیں
ہے۔لیکن پھر بھی دل چاہتا ہے کہ مکمل تعارف حاصل کیا جائے''۔

''بہت چھوٹی سی بات تھی والد کا انتقال ہو چکا تھا۔والدہ میرے لیے سر کا
تاج تھیں۔زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا میرے نام تھا۔برابر کے ایک پڑوسی چوہدری نے
وہاں اینٹوں کا بھٹہ بنانا چاہا۔میں نے پنجاب زرعی یونیورسٹی میں تعلیم صرف اس لیے
حاصل کی تھی کہ ایک بار ماں نے اس بنجر زمین کے بارے میں مجھ سے کہا تھا کہ کیا یہ سر
سبز و شاداب ہو سکتی ہے۔میں نے ماں سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس زمین کو گلزار بنا کر
دکھاؤں گا۔ان پڑوسیوں نے وہ زمین حاصل کرنا چاہی۔تاکہ وہاں اینٹوں کا بھٹہ بنا
دیا جائے۔ماں مر چکی تھی اس لیے کیے ہوئے وعدے کو اس طرح پامال نہیں دیکھ سکتا
تھا۔بس وہیں سے جھگڑا اچل گیا اور قتل و غارت گری شروع ہو گئی۔

''جیو..... جیو میری جان! شیر اسی طرح جیتے ہیں۔اگر کوئی گیدڑ ہوتا تو ہار
مان کر خاموش ہو جاتا۔ببر شیروں کی یہی شان ہوتی ہے بڑا اچھا کیا یار تم نے، بڑا اچھا
کیا کوئی زبردستی ہے کسی کی زمین پر اس طرح قبضہ جما لینے کی۔ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔
بات ختم ہو گئی۔ان چوہدریوں نے تمہارے خلاف کام شروع کیا ہو گا اور تم ڈٹ گئے
ان کے سامنے''۔

''ایسا ہی ہوا ہے شاہ جی''

''ٹھیک ہے ...... بہر حال تمہارے بارے میں بہت کچھ سن چکا ہوں میں۔ ابھی تم نے تھوڑے دن پہلے چند ہی روز پہلے کی بات ہے اس ڈی ایس پی کو بھی مارا ہے جو ایک بار تمہیں گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا''۔

''جی شاہ جی......'' شاہ زیب کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ کبیر شاہ کوئی معمولی شخصیت نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اتنی کرنٹ معلومات، اتنی زبردست معلومات بڑی بات تھی۔ کوئی عام آدمی اتنی زیادہ معلومات نہیں رکھ سکتا تھا۔ بہر حال کبیر شاہ نے کہا۔

''بھئی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔ کئی بار تمہارے بارے میں سنا تو سوچا تھا۔ کہ اگر موقع ملا تو تم سے ملیں گے ضرور۔ مگر ہمارے یار نے ہماری یہ خواہش پوری کر دی۔ بڑی بات ہے۔ یہ یار مکرم شاہ بندہ بڑے کام کا ہے۔ خیر ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو ہمیں بتاؤ''۔

''ایک خوش خبری بھی ہے اس کے ساتھ ساتھ ہی''۔ مکرم شاہ نے کہا

''بولو۔ بولو کیا''

''جے کال مجھ پر حملہ کیا تھا اور ایک طرح سے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ مگر میرے دوست نے میری مدد کر کے نہ صرف مجھے جے کال سے نجات دلائی۔ بلکہ جے کال کو زخمی بھی کر دیا۔ اس وقت وہ زخمی ہے۔ کبیر شاہ کے اس انکشاف کے زبردست اثرات ہوئے تھے وہ ایک دم سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کڑی نگاہوں سے مکرم شاہ کو دیکھنے لگا پھر بولا۔

''اور مکرم شاہ! اگر یہ بات تم مجھے بتا رہے ہو تو اس کا مطلب ہے کہ مکمل طور پر تصدیق کر چکے ہو۔ میں جانتا ہوں کوئی ایسی بات تم مجھے کبھی نہیں بتا سکتے۔ جس پر تمہیں شبہ ہو''۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں اس وقت وہ اچھا خاصا زخمی ہے ریوالور کی گولی لگی ہے۔ اس کے جسم کے کسی حصے میں بھاگ تو گیا ہے۔ لیکن ساتھیوں کا سہارا لے کر میں نے بہت اچھی طرح دیکھا ہے''۔

''ہوں۔ بڑی بات ہے بھئی بڑی بات ہے وہ تو حرام کا جنا جادوگر ہے۔ لوگ یہی کہتے ہیں اس کے بارے میں کہ جادوئی قوتیں اس کی مدد کرتی ہیں حرامی کالا جادو جانتا ہے''۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے شاہ جی! بعض لوگ بس ہوا کھڑا کر دیتے ہیں اپنا''

''مجھے تو بس تم یہ بتاؤ کہ اس میرے یار نے واقعی اسے زخمی کر دیا۔ بڑا کام کیا ہے اس نے تو بھئی۔ ویسے میرے پاس بھی اس بارے میں تھوڑی بہت انفارمیشن ہے اور میرے گروپ کے کچھ افراد اس پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اگر وہ زخمی ہے تو اور اچھا ہے''۔

''شاہ جی ایک کھرا کھرا سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کھرے سوال کا کھرا ہی جواب ملتا ہے مجھے۔ کوئی لگی لپٹی بات نہیں ہوتی''۔

''بڑی مہربانی تمہاری کہ تم مجھ پر اتنا اعتبار کرتے ہو''۔

''شاہ جی سارے حالات آپ کے علم میں ہیں۔ میرے اس یار کی ایک بات آپ اپنے ذہن میں رکھ لو شاہ جی! آپ کی دعاؤں اور اللہ کے فضل سے میں اسے اپنے سر کا تاج بنا کر رکھ سکتا ہوں۔ اپنی اولاد کی طرح اسے سینے سے لپٹا کر دیا کو دکھا سکتا ہوں۔ مجھ پر یہ بالکل بار نہیں ہے۔ لیکن پہلی بات یہ کہ جے کال کا مسئلہ سامنے آیا۔ ظاہر ہے اب اس کی اور جے کال کی سیدھی سیدھی دشمنی چل پڑی ہے۔ دوسری بات یہ کہ بہر حال میرے وہ اختیارات نہیں ہیں جو آپ کے ہیں''۔

''سمجھ گیا۔ سمجھ گیا۔ تم اسے میرے ساتھ نتھی کرنا چاہتے ہو''

''ہاں شاہ جی! اگر آپ قبول کریں''۔

''دیکھو بہت بڑے آدمی کو لائے ہو میرے پاس خاص طور سے موقف سننے کے بعد تم یقین کرو میرے دل میں اس کے لیے بہت بڑا مقام پیدا ہو گیا ہے۔ یار شاہ زیب میری ماں بھی اس دنیا میں نہیں۔ بڑی یاد آتی ہے مجھے۔ بڑی یاد آتی ہے۔ بڑی عزت کرتا ہوں میں اس کی۔ تم یقین کرو جب بھی کسی مصیبت کا شکار ہوتا ہوں۔ آنکھیں بند کر کے اس کا تصور کرتا ہوں اور کہتا ہوں میرے لیے دعا کرو۔ میری ماں دعا کر میرے لیے اور اتنا اعتماد ہوتا ہے مجھے اس کی دعا پر اور اتنا جانتا ہوں میں کہ وہ دعا کرتی ہے اور اللہ میری مشکل حل کر دیتا ہے تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ شاہ زیب کا یہ موقف کہ ماں سے اس نے وعدہ کیا تھا اور اس وعدے کی تکمیل کے لئے اس نے بندوق اٹھالی ہے۔ میرے لیے بڑا قابل احترام ہے اگر شاہ زیب خوشی سے میرے ساتھ شامل ہونا چاہے تو میں اپنے گروپ میں اسے خوش آمدید کہتا ہوں''۔

''بس یہی میرا مقصد تھا اور شاہ زیب کبیر شاہ کے ساتھ جو شامل ہو جاتا ہے۔ کبیر شاہ اس کی پوری پوری مدد کرتا ہے اور یہ انتہائی قابل بھروسہ شخصیت ہے۔ ان کے ساتھ رہ کر تم ان کے اختیارات دیکھو گے''۔

''میاں! ایک بات بتاؤں تمہیں شاہ زیب! بس دنیا میں بہت بری ہو گئی ہے۔ جینے کے لئے ناٹک کرنا پڑتا ہے۔ سبھی ناٹک کرتے ہیں یار! کوئی کیسا کوئی کیسا میں بھی تھوڑا سا ناٹک کر لیتا ہوں پیسے دے دیئے ہیں مالک نے بس، دوسرے کے پیٹ بھرتا رہتا ہوں اور جن کے پیٹ میرے ذریعے بھرتے ہیں وہ تو میرے سامنے دل ہلائیں گے ہی۔ کھری کھری بات ہے۔ خیر مکرم شاہ تم بے فکر ہو جاؤ، اچھا یہ بتاؤ کہ جے کال کے بارے میں اور کوئی انفارمیشن ہے تمہارے پاس''۔

''کوئی خاص نہیں''

''تم کہاں ہو آجکل''

''میں تو آوارہ گرد ہوں شاہ جی! کبھی کسی نکڑ، کبھی کسی موڑ پر بس اپنا تو مشن ہی یہ ہے''۔

''یار! میرے ساتھ آ جاؤ۔ کیوں نہیں رہتے میرے پاس۔ کتنی بار کہا ہے تم سے''۔ جواب میں مکرم شاہ ہنسنے لگا پھر بولا۔

''بس شاہ جی! دنیا دیکھنے دو۔ تھک جاؤں گا تو آ کر پڑ جاؤں گا تمہارے در پر۔ ابھی تھکا نہیں ہوں''۔

''تو پھر شاہ زیب کو ہمارے پاس ہی رہنے دو فی الحال اب ہم جانیں اور یہ''۔

ہاں مجھے خوشی ہے کہ شاہ زیب کو میں بہت اچھی جگہ پہنچا رہا ہوں۔ بہر حال یہ بتایئے جہانگیرہ کہاں ہے''۔

''جہانگیرہ فیصل آباد گیا ہوا ہے۔ کوئی میسج کوئی پیغام''۔ کبیر شاہ نے پوچھا اور شاہ زیب کو پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ جہانگیرہ کبیر شے سے متعلق ہے''۔

''بس کچھ نہیں ایسے ہی پوچھ لیا تھا تو پھر مجھے اجازت''

''یار! ایسے کیسے۔ رہو نا ایک آدھ دن میرے پاس''

''سیماب اگر قرار آ جائے۔ تو سمجھ لو اس کی جان نکل گئی ہے مجھے زندگی سے روشناس رہنے دو۔ کیا سمجھے''۔

''ٹھیک ہے بھائی...... ٹھیک ہے تو بڑا آدمی ہے مان لیا''۔ مکرم شاہ نے شاہ زیب سے کہا۔

''ٹھیک ہے شاہ زیب! تم ایک آزاد پنچھی ہو، آسمان پر پرواز کرنے والے کبیر شاہ صاحب سے تمہاری بن جائے تو یہاں ٹکنا ورنہ کبیر شاہ صاحب تمہارا راستہ نہیں

روکیں گے''۔

''ہاں بھئی، وعدہ ہے، وعدہ ہے۔ کوئی پابندی نہیں ہے شاہ زیب تم پر۔ میرے مہمان نہیں ہو میرے ساتھی ہو۔ جس دن کہو گے کہ تھک گیا ہوں جانا چاہتا ہوں۔ پیار سے تمہاری پیشانی چوم کر تمہیں رخصت کروں گا۔ کوئی غلامی نہیں ہے تمہاری میرے ساتھ''۔

''جی شاہ جی! آپ اطمینان رکھو''۔

''گڈ...... اچھا سنو تمہیں اپنے ساتھ نہیں رکھوں گا۔ بلکہ ایک جگہ بھجوائے دے رہا ہوں۔ وہاں تم پورے اعتماد اور آرام سے رہ سکتے ہو۔ کوئی پریشانی نہیں ہوگی کیا سمجھے''۔

''آپ جیسا پسند کریں''۔ شاہ زیب نے جواب دیا

''پھر تھوڑی دیر کے بعد کبیر شاہ نے شاہ زیب کے لیے انتظام کر دیا ایک عمدہ گاڑی اسے لے کر چل پڑی۔ سفر طے کرتے ہوئے شاہ زیب نے کبیر شاہ سے پوچھا۔

''میرا آپ کا رابطے کا کیا ذریعہ رہے گا جناب''

''بہت جلد میں تم سے رابطہ کروں گا اور بھی کچھ لوگوں کو تمہارے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ اچھا ایک بات بتاؤ، جہانگیرہ سے واقفیت ہے''

''ہاں ہے''

''بس بس بس۔ جہانگیرہ بھی وہاں پہنچ جائے گا تم لوگ مل کر ساری پلاننگ کرو گے اب ذرا میں یہ معلوم کر لیتا ہوں کہ جے کال کہاں مل سکے گا۔ اس کے بعد تمہیں اس بارے میں اطلاع مل جائے گی''۔

''ٹھیک ہے جناب''۔ شاہ زیب نے جواب دیا۔

کار اسے لے کر چل پڑی اور جس کوٹھی میں وہ داخل ہوئی تھی وہ بھی

خوبصورت تھی۔ ملازم تھے۔ آسائشیں تھیں۔ ہر چیز موجود تھی۔ شاہ زیب کو اس کا بیڈ روم دکھا دیا گیا۔ کوٹھی میں قیام کو کوئی چودہ گھنٹے گزر چکے تھے کہ ایک نئی شخصیت سے اس کا واسطہ پڑا۔ اس دوران ساری باتیں اپنی جگہ لیکن شاہ زیب کو یہاں بڑے سکون کا احساس ہوا تھا۔ سوچنے کے لیے بہت اچھا وقت مل گیا تھا۔ شاہ زیب نے اپنے ماضی پر ایک نگاہ ڈالی تھی۔ یہ مقام تو اسے حاصل ہونا ہی چاہیے تھا۔ سب کچھ تو کر ڈالا تھا اس نے اور زبردست مجرم بن گیا تھا۔ لیکن کیا کرتا مجبور کیا گیا تھا اسے آخری جرم ملکہ بائی اور نادر شاہ کو اندھا کرنے کا تھا ظاہر ہے کوئی نہ کوئی صورتحال تو سامنے آئی ہوگی۔ وہ قتل اس کے حساب میں لکھ دیئے گئے ہوں گے جو اس نے نادر شاہ کی حویلی میں کیے تھے۔

بہرحال یہ فہرست بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ لیکن اس کے لیے کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ صورتحال یہ تھی کہ اگر وہ کسی کو خود کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ تو کوئی بھی اسے نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اب یا تو خود جی لیا جائے۔ یا پھر ان لوگوں سے پنجہ کشی جاری رکھی جائے۔ شاہ زیب کے اندر اعتماد تو بہت پہلے پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن وقت اسے ایک ہی راستے پہ لے آیا تھا۔ اس وقت بھی رات ہو چکی تھی اور وہ حویلی کے ایک خوبصورت سے کمرے میں بیٹھا۔ انہی سوچوں میں گم تھا کہ کار کے ہارن کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ نیلے رنگ کی ایک موک تھی جو سامنے گیٹ پر موجود تھی اور پھر پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ گاڑی ایک فراٹے سے اندر آ گئی تھی۔ پھر گاڑی کا انجن بند ہوا اور ایک خوبصورت سی لڑکی نیچے اتری۔ وہ جینز پہنے ہوئے تھی۔ گھنے بال بڑی خوبصورتی سے بندھے ہوئے تھے وہ تر و تازہ نظر آ رہی تھی۔ شاہ زیب نے اسے دور سے دیکھا پتہ نہیں۔ یہ شگفتہ کلی کون تھی۔

بہرحال نقوش جاذب نگاہ تھے وہ اندر داخل ہوگئی لیکن شاہ زیب کو یہ امید نہیں تھی کہ وہ سیدھی اس پر نازل ہو جائے گی اس نے دو کھٹ کھٹ کی آوازیں سنی اور

پھر لڑکی کو اپنے سامنے دیکھا ایک ملازم انہیں وہاں تک چھوڑنے آیا تھا۔ وہ شاہ زیب کے قریب پہنچی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔

"ہیلو...... تو آپ ہیں شاہ زیب! نام بڑا پیارا ہے آپ کا، جب میں نے پہلی بار آپ کا نام سنا تھا نا تو میں نے کہا تھا کہ بعض لوگ اپنے بچوں کے نام بڑے اچھے رکھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ جیسے لوگ بھی نظر آتے ہیں آپ یقین کریں ایک خاتون سے ملاقات ہوئی۔ کالا رنگ، سفید دانت، بدھے نقوش، تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ محترمہ کا نام حسن آرا ہے۔ دل چاہا کہ جوتے سے سر پیٹوں، یہ فیصلہ نہیں کر پائی کہ اپنا پیٹوں یا پھر اس کا۔ اور یا ان کا جنہوں نے اس کا یہ نام رکھا تھا۔ خیر تو میرے کہنے کا مقصد یہ ہے جناب شاہ زیب صاحب کہ آپ اپنے نام کی طرح خوبصورت ہیں۔ کیا سمجھے"

"شکریہ۔ آپ کا کیا نام ہے"۔ شاہ زیب نے پوچھا

"روبن۔ اصل میں میں آدھا لڑکا ہوں اب کیا کیا جائے۔ اللہ کی مرضی کہ اس نے مجھے لڑکی پیدا کر دیا۔ لیکن فطری طور پر میں لڑکا ہوں۔ نام روبینہ ہے گھر والے مجھے روبی کہنا چاہتے تھے لیکن میں نے سخت اختلاف کیا اور خود کو روبن کہلوایا آپ بھی پلیز مجھے روبن ہی کہا کریں"۔

"ٹھیک"

"ارے ہاں ایک بات اور بتا دوں۔ انکل کی بھتیجی ہوں یعنی وہ جو ہیں نا اپنے کبیر شاہ وہ میرے چچا ہیں۔ میرے والدین بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ چچا نے باپ کی طرح پالا ہے۔ بس جیسا کہ میں نے آپ سے کہا نا۔ کہ آدھا لڑکا ہوں۔ چچا کے معاملات میں پوری طرح ملوث خاص طور سے معاملات میں جو غیر قانونی ہوتے ہیں۔ کیا ہوا مائی ڈیئر شاہ زیب! یہ برائیاں جو ہوتی ہیں نا۔ اتنی دلکش ہوتی ہیں کہ

انسان کا دل چاہتا ہے کہ وہ برائی پر برائی کرتا جائے۔ جبکہ نیکیاں اور اچھائیاں کرتے ہوئے طبیعت بہت بوجھل ہو جاتی ہے آپ کا کیا موقف ہے اس بارے میں"۔ شاہ زیب ہنس پڑا پھر بولا۔

"آپ مجھے سوچنے کا موقع دیں تو میں کچھ سوچوں"

"ارے ہاں۔ آپ بھی وہی کہیں گے نا۔ کہ میں ضرورت سے زیادہ بولتی ہوں۔ چلیے ٹھیک ہے اب آپ کی باری"

"نہیں آپ بولیے۔ بری نہیں لگ رہیں"

"وہ تو خیر سبھی کہتے ہیں آپ نے نئی بات نہیں کہی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ میں بولتی بہت اچھی لگتی ہوں۔ لیکن لوگ تو میری تعریفیں کرتے ہیں لیکن تعریفیں کبھی کبھی اچھی تو لگتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات طبیعت اکتا بھی جاتی ہے۔ دل چاہتا ہے کوئی سچ بھی بولے"۔ شاہ زیب ہنسنے لگا پھر بولا۔

"کیا آپ کی تعریف سچ نہیں ہوتی"

"نہیں نہیں۔ اب ایسا بھی نہیں ہے۔ شکل وصورت کی بھی اچھی ہوں۔ اپنے آپ کو سنبھال کر بھی رکھا ہوا ہے۔ کھانے پینے کی بہت شوقین ہوں۔ لیکن ایسے کھاتی ہوں جیسے کوئی جرم کر رہی ہوں۔ چلیے آپ کو کافی پلواتی ہوں۔ منگواؤ"

"مجھے یہاں آئے ہوئے خاصا وقت گزر گیا اور نجانے کیوں میں اپنے آپ کو میزباں سمجھ رہا ہوں۔ چنانچہ کافی کی ضرورت میں ہی پوری کرتا ہوں"

"بھول جایئے۔ بھول جایئے۔ ان باتوں کو۔ میں عام طور سے یہیں اسی کوٹھی میں رہتی ہوں وہ تو تین چار دن کے لیے کراچی گئی ہوئی تھی۔ اس لیے آپ کو نہیں ملی۔ ویسے ایک بات بتاؤں۔ آپ کا نام میں نے پہلے سن رکھا تھا۔ پھر کہیں گے کہ میں ہی بولے جا رہی ہوں کچھ آپ بھی تو بولیں۔

''آپ نے ابھی یہ کہا تھا کہ آپ اپنے انکل کے معاملات سے واقف ہیں روبن''

''بالکل واقف ہوں اور یہ بھی کہا تھا میں نے کہ خاص طور سے ان معاملات میں جو غیر قانونی ہوتے ہیں''۔

''بالکل کیا میں ان غیر قانونی معاملات کے بارے میں کچھ جان سکتا ہوں''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ایک بات آپ کو بتا دینے کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ میں اپنوں کے راز کھولنے بیٹھ جاؤں۔ بابا اتنا تو میں جانتی ہوں کہ آپ کو اس بات کا علم ہوگا کہ انکل کیا کیا کرتے ہیں۔ اب میں نے اتنی سی بات کہہ دی تو آپ اتنے آگے بھی نہ بڑھیے کہ مجھ سے ان کے غیر قانونی معاملات کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیں۔ ہاں۔ اتنا میں بتا سکتی ہوں آپ کو کہ مجھے یہ بتا دیا گیا ہے کہ آپ کو جے کال کے مقابلے پر اتارا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ جے کال کو زخمی کر چکے ہیں۔ ویسے میں آپ کو بتاؤں ہو سکتا ہے جس گروپ میں آپ شامل ہیں نا۔ اس میں میں بھی آپ کے ساتھ رہوں''

''خیر یہ تو بہت اچھی بات رہے گی''

''حالانکہ مجھے امید نہیں ہے اصل میں انکل جو ہیں نا وہ مجھے دوسروں سے برتر سمجھتے ہیں جب کہ میں یہ نہیں سمجھتی۔ میں سوچتی ہوں کہ مل جل کر کام کرنے کا جو مزہ ہے وہ دوسری کسی چیز میں ہو ہی نہیں سکتا آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں''۔

''جی میں تو آپ کی تائید ہی کروں گا''۔

''اچھا چھوڑیئے۔ اب آپ یہ بتائیے کہ آپ مجھے اپنے ساتھ رکھنا پسند کریں گے نا''۔

''دیکھئے میں بذات خود تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اگر شاہ جی چاہیں گے تو مجھے

بھی خوشی ہوگی''۔

''مجھے یقین ہے کہ انکل مجھے آپ کے ساتھ حصہ لینے میں انکار نہیں کریں گے۔ ویسے میں آپ کو بتاؤں ایک مرتبہ میں کراچی کے اینگل ہاربر پر جے کال کے مقابلے پر آ چکی ہوں''۔

''اینگل ہاربر''

''ارے آپ اینگل ہاربر کے بارے میں نہیں جانتے۔ اسمگلروں کی جنت کہلاتا ہے وہ علاقہ اصل میں اس علاقے کا ٹھیکا اٹھتا ہے۔ بس ٹھیکے دار میں اور مزے کی بات آپ کو بتاؤں ان ٹھیکیداروں میں انکل بھی شامل ہیں۔ تو ہوا یوں تھا کہ ایک بار ہماری لانچ مال لے کر آ رہی تھی کہیں باہر سے جے کال کی لانچ بھی سمندر میں آ گئی۔ اصل میں مجھے وہ مال ریسیو کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا اور میں ایک لانچ میں بیٹھی ہوئی۔ اپنی مال والی لانچ کی حفاظت کے لئے نکل کھڑی ہوئی تھی کہ جے کال نے ہمارے مال پر قبضہ جمانے کے لیے اس پر فائرنگ شروع کر دی بس جناب! ہم نے بھی جہنم کا دہانہ کھول دیا ان پر۔ اور میں آپ کو سچ بتاؤں کہ اس دن اگر موسم ذرا خراب نہ ہوتا تو جے کال ہمارے ہاتھوں سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔ ویسے وہ کافی خطرناک آدمی ہے۔ میں اس طرح کے لوگوں سے بڑی دلچسپی لیتی ہوں۔ نکل گیا وہ اور ہم اپنی لانچ لے کر خیریت سے ویسے آج میں بہت خوش ہوں کیونکہ شاہ زیب کے بارے میں بھی خاصی معلومات حاصل کرتی رہی ہوں۔ آپ کے بارے میں خاصی تفصیلات اخبارات میں آتی رہی ہیں اور مجھے پتا چلا ہے۔ اور مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ خطرے کی پرواہ نہیں کرتے اور مشکل حالات میں جہنم کا دہانہ کھول دیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ آپ کی زد میں آنے والا کون ہے۔ ویسے نجانے کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ جے کال کے مقابلے میں اب پہلی بار کوئی خطرناک آدمی آیا ہے۔ اچھا ایک بات بتائیے آپ''۔

''جی پوچھیے''

''آپ نے جے کال کو زخمی کیسے کیا؟''

''بس میں نہیں جانتا وہ کیا چیز ہے۔ میرے ایک دوست کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری اس سے مڈبھیڑ ہوگئی اور آپ سمجھ لیں کہ بس میں نے اسے زخمی کر دیا''۔

''کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ اچھا آپ یہ بتائیے کہ آپ کو جے کال کے بارے میں ساری تفصیل معلوم ہے یا نہیں''۔

''نہیں ساری تو نہیں، بس اتنا پتہ چل سکا ہے کہ وہ بہت خطرناک آدمی ہے''

''ایسا ویسا خطرناک، خوفناک قاتل، اتنا خوفناک کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ آپ یوں سمجھ لیجیے کہ زندگی موت اس کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ یوں سمجھ لیجئے آپ کہ اس نے سینکڑوں افراد کو قتل کر دیا ہے۔ ہر طرح کے اسلحے کا استعمال کر لیتا ہے طاقت ور بھی بہت ہے۔ وحشی بھی بہت ہے بالکل دیوانہ ہے''۔

''ہوں۔ تب تو ایسے آدمی کا شکار کر کے لطف آئے گا''۔

''یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔ بالکل آپ یہ سمجھ لیجیے کہ میں اس کی لاش دیکھنا چاہتی ہوں۔ ارے میرے انکل کے مقابلے پر آتا ہے۔ اب بتائیے کیا کیا جائے۔ اچھا ایک کام کرتے ہیں باتیں تو ساری رات ہی ہوتی رہیں گی۔ کافی کا کیا رہا''۔

''آپ کی مرضی ہے۔ میں نے تو پہلے ہی پیشکش کی تھی کہ اگر آپ کا دل چاہ رہا ہے تو میں بنوا کر لاؤں''۔

نہیں بات چیت کرنے کا موڈ ہو رہا تھا چلیں چھوڑیں آپ کا بھی چائے کے لئے کوئی خاص موڈ نہیں لگتا۔ ویسے میں آپ ہی کے کمرے میں سو جاؤں گی۔ رات کو باتیں کرتے رہیں گے۔ آپ کو اعتراض تو نہیں ہے''۔

''جی......'' شاہ زیب نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

ہاں ہاں۔ میں اپنا سونے کا لباس لے کر ابھی آتی ہوں۔ پھر یہیں آرام سے لیٹیں گے گپیں لگائیں گے۔ نیند آئے گی تو سو جائیں گے کیا خیال ہے آپ کا''۔ شاہ زیب نے ایک بار پھر عجیب نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ کبیر شاہ جیسے خطرناک آدمی کی بھتیجی تھی۔ انتہائی بے باک اور خود سر نظر آتی تھی۔ کبیر شاہ نے یہاں شاہ زیب کو بڑے اعتماد کے ساتھ بھیجا تھا۔ ذرا سی لغزش مصیبتوں کے دروازے کھول سکتی تھی۔ دشمن بے شک بن رہے تھے لیکن ان کے دشمن بننے کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوا کرتا تھا۔ ایک بے مقصد دشمنی تو کسی بھی طور برداشت نہیں کی جا سکتی۔ لڑکی بے باک ہے بظاہر اپنے انداز سے معصوم بھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی دنیا اتنی معصوم نہیں ہے۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی شاہ زیب نے کہا۔

''ایسا ممکن نہیں ہوسکتا کہ ہم باقی باتیں کل دن کی روشنی میں کریں''۔

''کیا مطلب۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں''

''نہیں میرا مطلب یہ نہیں ہے''

''تو پھر کیا مطلب ہے آپ کا''

''اصل میں بس مجھے نیند آ رہی تھی''

''بالکل نہیں۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں یہیں رہوں گی اور آپ سے گپیں لڑاؤں گی۔ سونے نہیں دوں گی آپ کو۔ کیا سمجھے'' اس نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

شاہ زیب پریشانی سے سر کھجاتا رہ گیا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ واپس آئے گی اور یہیں پر وقت گزارنے کی کوشش کرے گی۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا کہ دروازہ اندر سے بند کر کے لائٹ آف کر کے سو جائے۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا البتہ وہ

پھرتی سے اٹھ کر اپنے بیڈروم کی طرف چل پڑا۔ پوری کوٹھی ہی اس کے حوالے کر دی گئی تھی۔ لیکن اس نے اپنا ایک بیڈروم مقرر کر رکھا تھا۔ وہ جگہ جہاں وہ اس وقت موجود تھا اوپری منزل پر تھی۔ جبکہ اس کا بیڈروم نچلی منزل پر تھا۔ البتہ بیڈروم میں داخل ہو کر اس نے دروازہ نہیں بند کیا تھا۔ بلکہ نائٹ بلب جلا لیا تھا۔ لڑکی کو شاید اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ کون سے کمرے میں سو رہا ہے۔ البتہ کھلے دروازے کی طرف شاہ زیب کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں اور وہی ہوا وہ کم بخت اندر آ گئی تھی اور سب سے پہلے اس نے کمرے میں تیز روشنی کی تھی۔

''آپ کا کیا خیال تھا جناب شاہ زیب صاحب! آپ کی چوری پکڑی نہیں جائے گی کیوں بھاگے تھے وہاں سے''۔

''نہیں میرا بیڈروم یہی ہے''

''تو مجھے معلوم ہے اس بارے میں، اور میں بھی آپ یقین کریں سیدھی ادھر ہی آئی ہوں مجھے معلوم تھا کہ آپ ادھر آ گئے ہوں گے اور یہ نائٹ بلب کیوں جلا لیا جیسے میں آپ کو سونے دوں گی''۔

شاہ زیب کی نگاہیں اس پر پڑیں۔ سفید باریک لباس اور اس کے نیچے سلک کا ایک ڈھیلا ڈھالا لبادہ جو اس کے بدن کی لطافتوں کو نمایاں کر رہا تھا۔ شاہ زیب کے دماغ میں چنگاریاں سی گردش کرنے لگیں۔

بہرحال یہ انتہائی صبر آزما لمحات تھے۔ وہ شاہ زیب کے بستر میں آ گھسی۔ اور شاہ زیب اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کیوں؟ کیا مصیبت آئی آپ پر، بابا میں صوفے پر سو جاؤں گی کمال کے انسان ہیں آپ ایسا لگ رہا میں چھپکلی ہوں اور آپ مجھ سے ڈر رہے ہیں''۔

''نہیں، بس میں نے آپ سے کہا نا کہ نیند آ رہی تھی مجھے''۔ شاہ زیب نے کہا

''نہیں ابھی تھوڑی دیر تک باتیں کریں گے۔ اچھا ایک کام کرتے ہیں۔ ایک بجے تک سو جائیں گے۔ کیا خیال ہے آپ کا۔ پھر اس کے بعد وہ شاہ زیب سے باتیں کرتی رہی تھی۔ اوٹ پٹانگ باتیں کبھی اپنے بچپن کے حالات سناتی۔ کبھی یہ بتاتی کہ جب اس کے ماں باپ زندہ تھے۔ تو وہ کس طرح جیتی تھی۔ ایک دو بار انکل کبیر شاہ کا تذکرہ بھی کر چکی تھی جسے وہ اسمگلروں کی لانچ والی بات۔

بہرحال پھر باتیں کرتے کرتے اس کی آواز بوجھل ہو گئی شاہ زیب نے اسے دیکھا وہ معصوم بچے کی طرح آنکھیں بند کر کے سو گئی تھی اور اس کے گہرے سانس فضا میں بلند ہو رہے تھے۔ شاہ زیب اپنی جگہ سے اٹھا ایک کمبل لیا اور صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

پھر صبح کو نجانے کس وقت اس کی آنکھ کھلی۔ دیکھا تو روبن موجود نہیں تھی۔ غسل خانے کی طرف دیکھا وہاں بھی کوئی آہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اٹھ کر کہیں چلی گئی ہے البتہ تھوڑی دیر کے بعد ایک ملازم نے کہا۔

''جناب! نو بج رہے ہیں بے بی ناشتہ پر آپ کا انتظار کر رہی ہیں''۔

''اوہو۔ اچھا......'' شاہ زیب نے جلدی سے کہا اور پھرتی سے غسل خانے میں جا کر اپنا منہ ہاتھ وغیرہ دھویا اور پھر ناشتے کے کمرے میں پہنچ گیا۔ جہاں وہ ایک بہت ہی خوبصورت لباس میں ڈھلی ڈھلی سی بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔ ناشتہ سامنے لگا ہوا تھا اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بھئی جلدی کریں۔ میں زیادہ تر ساڑھے آٹھ بجے ناشتہ کر لیتی ہوں۔ آپ کی وجہ سے سوا نو بج رہے ہیں اس وقت۔ یہ پون گھنٹہ میری طرف سے آج آپ کو۔ لیکن اس کے بعد آپ سمجھ لیجئے ساڑھے آٹھ بجے ناشتہ ہو جانا چاہیے''۔

اس کے لہجے میں کوئی خوشگواری تھی نہ کوئی ایسا انداز جس سے ندازہ ہو کہ اسے شاہ زیب سے کوئی شکایت ہے۔ بہر حال ایک الجھا ہوا کردار تھا۔ ناشتہ بڑی خاموشی سے ہوااور اس کے بعد اس نے کہا۔

''جانتے ہیں اب کیا پروگرام ہے''

''نہیں مجھے نہیں معلوم''

''وہ بس ...... کچھ انتظام ہو چکا ہے ابھی تھوڑی دیر بعد آپ کو اس بارے میں اطلاع مل جائے گی''۔

''کیسا انتظام''۔ شاہ زیب نے سوال کیا۔

''روانگی کا، روانگی کا......روانگی کا''

''آپ کو کیسے معلوم''

''بس ایسے ہی بہت سی باتیں مجھے خود بخود ہی معلوم ہو جاتی ہیں جادوگر ہوں میں۔ سمجھے نہیں تو دیکھ لیجئے آپ جو کہہ رہی ہوں وہی ہوگا''۔

''ہوں اچھا دیکھیں گے۔ جانا ہوگا کہیں ہمیں یہاں سے''

''کچھ نہیں بتاؤں گی بس اسکے بعد۔ ناراض ہوں آپ سے مسٹر شاہ زیب''

''مجھے بہت افسوس ہے لیکن ناراضگی کی کوئی وجہ بھی پتہ چلے''

''میں اکثر بلاوجہ بھی ناراض ہو جاتی ہوں''۔ اس نے کہا اور ہنس پڑی۔ پھر تھوڑی دیر بعد یہ لوگ یہاں سے اٹھ گئے اور وہ کہنے لگی۔

''اب آپ اپنے کمرے۔ میں جائیں میں بھی جارہی ہوں''

''کہاں''

''یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔ ہر شخص کے اپنے اپنے سیکریٹ ہوتے ہیں''۔ اس نے کہا۔ خاموشی سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ شاہ زیب اپنے کمرے میں واپس آ گیا

تھا۔

بہر حال یہ لڑکی بہت عجیب تھی انتہائی عجیب اور شاہ زیب یہ سوچ رہا تھا کہ اس کے سلسلے میں اسے محتاط رہنا ہوگا۔ اس قسم کی لڑکیاں بعض اوقات بہت ہی محتاط ہو جایا کرتی ہیں اور اپنی حیثیت بچانا بے حد ضروری ہے کیونکہ معاملہ بہت بڑے آدمی کا تھا جس کی وہ بھتیجی تھی۔

بہر حال پھر کام کا وقت آ گیا۔ کبیر شاہ خود اس کی کوٹھی پر پہنچا تھا اس کے ساتھ چار افراد اور تھے ان میں سے دو کا تعارف کرواتے ہوئے اس نے کہا۔

''یہ گوگا ہے بڑے کام کا آدمی ہے اور تمہارا دست راست ثابت ہوگا۔ یہ ساون ہے ذات کا ہندو ہے لیکن ذات پات کی زیادہ پرواہ نہیں کرتا اس کے علاوہ یہ دو بندے اور ہیں یہ سب تمہاری آرمی ثابت ہوں گی۔ تم پانچوں ایک گاڑی میں جاؤ گے۔ سفر کوئی چار گھنٹے کا ہے اپنے علاقے میں پہنچو گے تو وہاں تمہیں جہانگیرہ مل جائے گا۔ جس کے ساتھ کچھ بندے ہوں گے۔ اب میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہے جے کال کے بارے میں تمہیں بالکل سہی خبر ملے گی۔ مائیکل اسحاق کی کوٹھی سے۔ یہ مائیکل اسحاق جو ہے وہ اس علاقے کا چھوٹا موٹا زمیندار بھی ہے لیکن اصل میں یہ جے کال کا آدمی ہے۔ اور جے کال کے مفادات کی نگرانی کرتا ہے ہمیں اطلاع ملی ہے کہ جے کال اس وقت مائیکل اسحاق کے گھر چھپا ہوا ہے۔ تمہیں اچانک ہی ادھر پہنچ کر چھاپہ مارنا ہے۔ وہاں تمہاری مڈبھیڑ پولیس والوں سے بھی ہو سکتی ہے۔ یہ کارڈ انہیں دے دینا۔ یہ ایک خفیہ نشان ہے۔ جو پولیس والوں کو تمہارے سلسلے میں بالکل نرم کر دے گا۔ اصل میں وہ گن مین وہاں پر نگرانی کے لیے رہا کرتے ہیں۔ کیونکہ مائیکل اسحاق اس علاقے میں پادری بھی ہے۔ اور وہ جے کال کا آدمی ہے۔ پولیس کے پاس اس بارے میں رپورٹ بھی ہے۔ لیکن اقلیتوں کو تو تحفظ ہے۔ اس لیے وہ مائیکل پر ہاتھ

نہیں ڈالتی۔لیکن جے کال کے بارے میں یہ بات مصدقہ ہے کہ وہ مائیکل اسحاق کے پاس آتا جاتا رہتا ہے اور اس وقت بھی سنا یہی گیا ہے کہ وہ مائیکل اسحاق کی حویلی میں ہے۔

بہرحال اب یہ تم لوگ جانو کہ تمہیں کیا کرنا ہے گویا یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ شاہ زیب ہر طرح سے ایک مکمل نوجوان ہے اور میں نے اسے مکمل طور پر اختیارات دے دیئے ہیں یہاں تک کہ جہانگیرہ کو بھی میں نے بتا دیا ہے کہ اب وہ اس کے امکانات کی پابندی کرے۔شاہ زیب تم سمجھ گئے نا میری بات، جے کال کو زندہ گرفتار کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم اس کی چھٹی کر دو۔کیا سمجھے۔اگر وہ وہاں مل جائے تو کیا ہی اچھی بات ہے تو یار زندہ محبت باقی۔

''ٹھیک ہے شاہ جی''۔شاہ زیب نے جواب دیا کسی کا آلہ کار بننے اور اس کے لیے کام کرنے کا یہ پہلا ایسا موقع تھا جو شاہ زیب کی زندگی میں آیا تھا۔

بہرحال اس کی خواہش تھی کہ یہ کام خوش اسلوبی سے ہو جائے۔ویسے بھی جے کال تھی زبردست شخصیت اور اس کے ذریعے کچھ الگ قسم کے ہنگامے ہوئے تھے جو بہرحال شاہ زیب کے حق میں برے نہیں رہے تھے۔کیونکہ وہ ایک ایسے آدمی کے ساتھ منسلک ہو گیا تھا جو بہرحال کسی مشکل مرحلے پر اس کی مدد بھی کر سکتا تھا اور اس کی مدد کی اسے فی الحال ضرورت تھی۔جس گاڑی میں سوار ہو کر وہ لوگ چلے وہ ایک شاندار جیپ تھی اور تقریباً نئی ہی تھی۔لیکن رنگ و روغن کر کے اسے پرانا کر دیا گیا تھا اس کا انجن بالکل بے آواز تھا اور پوری طرح کسی ہوئی تھی وہ۔

ساون اسے ڈرائیو کر رہا تھا۔شاہ زیب اس کے برابر بیٹھا ہوا تھا۔گوگا پیچھے اور سب سے پیچھے وہ دو آدمی ان لوگوں کو بہترین قسم کی دو آٹومیٹک رائفلیں مہیا کر دی

گئیں تھیں۔بڑے ٹھسے کے ساتھ اس سفر کا آغاز ہوا تھا جبکہ پچھلے طویل عرصے سے شاہ زیب کو ہر کام چھپتے چھپاتے کرنا پڑا تھا۔لیکن بہرحال اب بھی وہ محتاط تھا پولیس کسی کی غلام نہیں ہوتی اپنی سی پر آ جائے۔تو یقینی طور پر شاید کبیر شاہ جیسے لوگوں کی بھی نہ چل سکے۔لیکن شکر تھا کہ سارے راستے پولیس سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔

پنجاب کے خوبصورت سرسبز و شاداب علاقے نگاہوں کے سامنے تھے اور شاہ زیب اپنے آپ کو ان احساسات سے کبھی نہیں بچایا تھا کہ وہ بھی اس شادابی میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔بہرحال سفر ایک مخصوص جگہ درمیان میں رکا کیونکہ ایک پرانی فوڈ نظر آ رہی تھی۔جو تھی تو پرانی لیکن پوری طرح مضبوط اور کسی ہوئی۔اس میں جہانگیرہ موجود تھا۔جہانگیرہ گاڑی سے نیچے اترا تو شاہ زیب بھی اتر آیا۔جہانگیرہ نے آگے بڑھ کر شاہ زیب کو سینے سے لگایا اور بولا۔

''واہ جی واہ۔ہماری پیشن گوئی کبھی غلط نہیں ہوتی۔ہم نے جیل میں ہی اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا تھا کہ یہ معمولی آدمی نہیں ہے۔ایک دن ایسے سینہ تان کر سامنے آئے گا کہ دیکھنے والے دیکھیں گے پر ہم تمہیں سیدھا شاہ جی کے پاس لے آتے۔میری مراد بڑے شاہ جی سے ہے ویسے میں تمہیں بتا دوں۔مکرم شاہ بھی دل کے بڑے اچھے آدمی ہیں۔بس جی تقدیر کی بات ہوتی ہے۔وقت کسی کو برا بنانا چاہتا ہے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔مکرم شاہ جی بھی اتنے برے آدمی نہیں تھے اور آپ دیکھو شاہ زیب جی ٹانگیں کاٹ دی گئیں ان کی، زبردستی کیا گیا تھا یہ ان کے ساتھ زخمی ہوئے تھے علاج کرانے پہنچے تھے اور ان کے دشمن ہسپتال پہنچ گئے ڈاکٹروں کو رشوت دے کر انہوں نے دوسرا کام کرا دیا۔میں جی بکنے والا تو ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ان کی ٹانگوں میں زہر پھیلا دیا گیا اور بڑے بڑے ڈاکٹروں نے جو اس کام میں ملوث نہیں تھے۔ٹانگوں کی کیفیت دیکھ کر مشورہ دیا کہ ان کی ٹانگیں کاٹ دی جائیں۔بس جناب! آپ

یہ سمجھ لو کہ شاہ جی کو اپاہج کر دیا گیا۔ وہیں ان کا جنون سہی معنوں میں شروع ہوا تھا۔ اپنے بہت سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں وہ اور پھر حیدر شاہ جی قتل ہو گئے۔ حیدر شاہ بھی بہت اچھے آدمی تھے۔ بس شاہ جی مکرم شاہ جی نے حیدر شاہ جی کا روپ دھار لیا۔ ارے کوئی معمولی بات ہے نقلی ٹانگوں سے دنیا کے سارے کام اس طرح کر لینا کہ کسی کے فرشتوں کو بھی نہ پتہ چلے کہ یہ ٹانگیں اصلی ہیں یا نقلی...... اچھا خیر چھوڑو یہ باتیں بعد میں بھی تو ہوتی رہیں گی۔ کیونکہ آپ کی ہماری ملاقاتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ پر جناب اب جو ہم چل رہے ہیں نا تو آپ یہ سمجھ لیجیے کہ ہمارے دو دھڑے بن گئے ہیں۔ جے کال بڑا خطرناک آدمی ہے اور بڑا چالاک بھی۔ اگر وہ واقعی آپ کی گولی سے زخمی ہو گیا ہے تو اس کے علاج کے لئے مائیکل اسحاق کا گھر ہی بہتر جگہ ہوگی۔ پھر انفارمیشن بھی یہی ملی کہ آج کل یہ غیر معمولی سرگرمیاں بھی دیکھی جا رہی ہیں۔ اس کا مطلب ہے جے کال وہاں موجود ہے مائیکل اسحاق ڈاکٹر بھی ہے اور ہو سکتا ہے وہی جے کال کا علاج کر رہا ہو۔ بندے سب ایک جیسے ہی ہیں جی۔ شاہ زیب جی! جے کال کے معاملے میں مائیکل اسحاق بھی برابر کا شریک ہے۔ کئی بار اس کے بارے میں پولیس کو رپورٹیں کی گئیں ہیں۔ لیکن جناب اسے اقلیت ہونے کی آسانی حاصل ہے۔ کیونکہ ہمارے ملک میں اقلیتوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ تو پھر ہمارے کام یوں ہیں کہ آپ تو جاؤ گے ہی مائیکل اسحاق کی کوٹھی پر اور وہاں جا کر جے کال کو تلاش کرو گے اور میں آبادی کی ناقہ بندی کر لوں گا اور جیسے ہی کوئی خراب صورتحال نظر آئی۔ میں سنبھال لوں گا۔ کیا کہتے ہو اور کچھ کرنا ہو تو مجھے بتا دو''۔

''نہیں جی اور کیا کرنا ہے جہانگیرہ شاہ جی''۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔ اب آپ چلو ہم آپ کے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ اور ہم آپ کے ساتھ وہاں تک نہیں جائیں گے بلکہ ہمیں اس بات کا اندازہ ہے کہ ہمیں

کہاں سے ناقہ بندی کرنی ہے۔ پھر اور کچے مکانات دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ آبادی کی سڑکیں بھی پتلی پتلی اور تقریباً کچی ہی تھیں بس بعض سڑکیں لال اینٹوں سے بنی ہوئی تھیں۔ جیپ دھول اڑاتی ہوئی اور ہچکولے کھاتی آبادی میں داخل ہوئی۔ گوگا جانتا تھا کہ مائیکل اسحاق کی کوٹھی کون سی ہے۔ پھر دور سے بھی نظر آ جاتی تھی۔ کیونکہ اس کے ایک حصے کو چرچ بنایا ہوا تھا اس کے لیے وہاں صلیب نصب تھی۔ ویسے کچے پکے قصبے کے درمیان یہ حویلی خاصی خوبصورت نظر آتی تھی دور ہی سے دیکھنے سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ عمارت اندر سے کس قدر شاندار ہے۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ ملازم نظر آ رہے تھے سامنے ہی دو گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ گیٹ پر جیسا کہ ہمیں بتایا گیا تھا۔ پولیس کی وردی میں ملبوس سپاہی موجود تھے۔ جن کے ہاتھوں میں گنیں موجود تھیں گوگا نے جیپ تھوڑے فاصلے پر روک دی اور ان میں ایک سپاہی کو اشارہ کر کے قریب بلایا۔ سپاہی جو کڑی نظروں سے اس جیپ کو دیکھ رہا تھا اپنے ساتھی کے کان میں کچھ کہہ کر گوگا کی جیپ کی طرف چل پڑا۔ جب وہ گوگا کی جیپ کے پاس پہنچا تو اس نے جیب سے وہ کارڈ نکال کر سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''تمہاری ڈیوٹی ہے۔ یہ بتاؤ مائیکل اسحاق اندر موجود ہے یا نہیں''۔ سپاہی نے غور سے کارڈ دیکھا پھر ایک دم سنبھل کر بولا۔

''نہیں صاحب! پادری صاحب تو کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ باقی لوگ موجود ہیں''۔

''ہوں۔ کچھ اور معلومات دے سکتے ہو ہمیں''۔ سپاہی نے مشکوک نگاہوں سے شاہ زیب اور گوگا وغیرہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیسی معلومات صاحب''۔ ایک لمحے تک سوچنے کے بعد شاہ زیب خاموش ہو گیا اور پھر بولا۔

"ٹھیک ہے ہم اندر جا رہے ہیں تم ہماری جیپ کی حفاظت کرو"۔

"ٹھیک ہے صاحب! اچھا ہوگا آپ جیپ ادھر ہی چھوڑ دو"۔

"ٹھیک ہے"۔ شاہ زیب نے گوگا اور ساون کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ باقی دو آدمیوں کو اس نے وہیں باہر گاڑی میں چھوڑ دیا تھا۔

رائفلوں سے مسلح وہ لوگ اس حویلی میں داخل ہوئے تو ملازم خوف اور حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔ دونوں سپاہی پھر اپنی جگہ آ کھڑے ہوئے تھے۔ ویسے وہ خاصے الجھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کارڈ پر جو کچھ تھا وہ تو انہوں نے دیکھ لیا لیکن بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ تین مسلح افراد اندر جا رہے تھے اور وہ سرکاری آدمی بھی نہیں تھے۔ اقلیتی دہشت گردی ہو سکتی تھی لیکن کارڈ کے بارے میں جو کچھ اس کی معلومات تھیں۔ اس کے تحت وہ انہیں روک بھی نہیں سکتے تھے۔ پھر وہ صدر دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ دو ملازم سہمے ہوئے سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"ادھر آؤ......" شاہ زیب نے کرخت لہجے میں کہا اور وہ دونوں شاہ زیب کے پاس پہنچ گئے۔

"کون کون ہے یہاں"

"بس جناب میڈم جوزیفائین ہیں اور باقی ہم لوگ ہیں"

"ہوں۔ میڈم جوزیفائن کو اندر بلاؤ اور خبردار کوئی عمارت سے باہر نہ جانے پائے بلکہ ساون تم ایسا کرو ذرا چرچ کا جائزہ لے لو۔ اچھی طرح دیکھ لینا اور گوگا تم میرے ساتھ آؤ"۔

شاہ زیب گوگا کے ساتھ ڈرائینگ روم میں پہنچا۔ جوزیفائن ایک تقریباً چالیس سالہ خاتون تھی جو نن کے لباس میں ملبوس تھی اندر داخل ہو کر اس نے اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھا۔ پھر پاٹ دار لہجے میں بولی۔

"جی کون ہیں آپ لوگ اور کیسے آنا ہوا یہاں؟"

"میڈم آپ یہیں رہتی ہیں"

"جی"

"ہم جے کال سے ملنے آئے ہیں"

"کون جے کال"

آپ براہ کرم اس کے پاس لے چلیے۔ ہمیں پتہ چلا ہے کہ وہ زخمی ہے ہم اس کے خاص آدمیوں میں سے ہیں۔ عورت کے چہرے کے نقوش ایک لمحے کے لیے بدلے پھر وہ حیرانی سے بولی۔

"کیا آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔ یہاں میں رہتی ہوں فادر اسحاق رہتے ہیں جے کال نامی کوئی شخص یہاں نہیں رہتا۔ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔ کہاں سے آئے ہیں آپ لوگ"۔

"ہماری اطلاع بالکل ٹھیک ہے اور آپ جو اداکاری کر رہی ہیں اسے ترک کر دیں۔ اچھا یہ بتایئے مائیکل اسحاق کہاں ہے"۔

"فادر کہیں گئے ہوئے ہیں کچھ ضروری کام تھے انہیں"

"کب گئے ہیں"

"کل رات"

"کب واپس آئیں گے"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا"

"جے کال کی کیا کیفیت ہے اس وقت"

"میرا خیال ہے آپ لوگ ہمیں کوئی نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ یا پھر کسی بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ جے کال نامی کوئی

شخصیت یہاں پر موجود نہیں ہے''۔

''مگر ہمیں اطلاع ملی ہے وہ یہاں موجود ہے''

''ٹھیک ہے۔آپ چاہیں تو تلاشی لے سکتے ہیں۔ مجھے اعتراض نہیں ہوگا''۔

تھوڑی دیر میں ساون واپس آ گیا۔اس نے بتایا کہ چرچ خالی ہے۔اچھی طرح دیکھ لیا ہے اس نے یہاں کوئی نہیں ہے''۔

''ٹھیک ہے تم دونوں کوٹھی کے ہر کمرے کا جائزہ لو۔اگر جے کال یہاں موجود ہے تو اسے نکلنا نہیں چاہیے''۔عورت کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آنے لگے۔وہ بولی۔

''دیکھئے آپ کی باتوں میں تضاد پایا جاتا ہے۔آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ جے کال کے آدمی ہیں اور آپ کوٹھی کی تلاشی بھی لے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ نکل کر نہ جانے پائیں دونوں باتوں میں کیا مماثلت ہے''۔

''اگر آپ یہ بتادیں کہ وہ کہاں ہے تو ہم ساری باتیں آپ کو بتادیں گے''

''میں نے کہا نا کہ جے کال نامی کوئی شخصیت یہاں نہیں ہے۔اگر وہ آپ کو یہاں مل جائے تو آپ جو سزا چاہیں مجھے دے سکتے ہیں''۔شاہ زیب عورت کے الفاظ کو پرکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ساون اور گوگا نکل گئے تھے۔کوئی پندرہ منٹ تک وہ واپس نہیں آئے اس دوران شاہ زیب عورت سے باتیں کرتا رہا تھا۔عورت نے اپنا نام اسے جوزیفائن بتایا تھا پھر وہ دونوں پہنچ گئے اور ساون نے کہا۔

''نہیں جے کال یہاں نہیں ہے''

''میڈم! جوزیفائن ہمیں اس بات کا پورا پورا علم ہے کہ جے کال کا آپ لوگوں سے براہ راست واسطہ ہے۔اگر آپ نے اسے یہاں چھپا رکھا ہے تو آپ یہ سمجھ لیجیے کہ اس عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی۔ہم کون ہیں اس کی آپ کو

پرواہ نہیں ہونی چاہیے۔ جب کہ فادر اسحاق کا تعلق ہے۔اس سے ملاقات ہونا ضروری ہے۔ہم دونوں دوبارہ آئیں گے''۔

''لیکن اگر آپ لوگ اپنا تعارف کرادیں تو کیا یہ زیادہ بہتر نہیں ہوگا۔میں کم از کم فادر کو آپ کے بارے میں بتاسکوں گی''۔

شاہ زیب نے ان دونوں کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور وہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔شاہ زیب حویلی سے باہر نکل آیا تھا۔لیکن جیسے ہی انہوں نے باہر قدم رکھا اچانک انہیں زبردست فائرنگ کی آواز سنائی دی۔اور وہ چونک پڑے۔شاہ زیب بری طرح چونک پڑا فائرنگ پہلے رک رک کر ہو رہی تھی اور بعد میں اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔اس کا مطلب ہے کہ جہانگیرہ کسی سے بھڑ گیا ہے۔ممکن ہے کہ وہ جے کال ہو یا پھر مائیکل اسحاق کھل کر سامنے آ گیا ہو۔

چنانچہ سارے کے سارے ایک جگہ جمع ہو کر جیپ کی جانب دوڑے جیپ برق رفتاری سے قصبے کی جانب روانہ ہوگئی۔فائرنگ کی آواز اب پوری طرح گونج رہی تھی اور لوگ گھروں کے دروازے پر کھڑے تھے ان کے چہروں پر خوف اور تجسس کے آثار تھے۔جیپ تنگ راستوں پر موڑ کاٹتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد ان کھیتوں تک پہنچ گئے جن کے دوسری جانب فائرنگ کی آواز آ رہی تھی۔غالباً دو گاڑیاں تھیں جو ایک دوسری کا تعاقب کر رہی تھیں۔آگے والی گاڑی بڑی فوکس ویگن تھی۔جس سے فائرنگ ہو رہی تھی۔وہ اپنے عقب میں دھول کے مرغولے چھوڑتی ہوئی برق رفتاری سے سامنے کی سمت جا سکتی تھی کافی فاصلے پر ایک بڑی نہر تھی۔دوسری گاڑی جو اس کا تعاقب کر رہی تھی۔وہ جہانگیرہ ہی کی تھی۔

چنانچہ ان لوگوں نے رائفلیں سنبھال لیں راستہ بے شک بہت زیادہ خراب تھا لیکن جیپ آسانی سے ان راستوں پر سفر کر رہی تھی۔البتہ گرد و غبار کی وجہ سے کافی

دشواری پیش آ رہی تھی۔ اور آگے والی گاڑی دھول میں روپوش ہو جاتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہ لوگ فائرنگ شروع نہیں کر سکتے تھے کیونکہ درمیان میں جہانگیرہ کی گاڑی تھی اس طرح راستہ طے کرتے ہوئے اور تقریباً تین چار میل کا فاصلہ طے ہو گیا۔

اچانک ہی جیپ کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور ڈرائیور نے اسے بڑی احتیاط کے ساتھ سنبھالا۔ یہ ایک بہت ہی خراب راستہ تھا جو نہر کے پل کے قریب تھا۔ بڑی مشکل سے یہ لوگ نہر کے اس پل تک پہنچے۔ جہانگیرہ دھوکہ کھا گیا تھا کیونکہ اس نے جس راستے پر اپنی جیپ موڑی تھی آگے والی اسٹیشن ویگن دوسرے راستے پر مڑ گئی تھی اور اس طرح درمیاں میں چونکہ نہر آتی تھی اس لیے کہیں سے راستہ کراس بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ جہانگیرہ جیپ کو واپس لے آتا اور نہر کے پل تک پہنچتا تب کہیں جا کر وہ اسٹیشن ویگن کے تعاقب میں کامیاب ہو سکتا تھا جبکہ یہ علاقے ان لوگوں کے بخوبی دیکھے ہوئے تھے جو آگے جا رہے تھے ان میں چاہے مائیکل ہو یا خود جے کال......

بہر حال شاہ زیب، ساون، گوگا وغیرہ اس نیم پختہ راستے پر پہنچے اور انہوں نے اسٹیشن ویگن یا فوکس ویگن کو روک لیا۔ ان کی تیز نگاہیں فوکس ویگن کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ اب یوں ہوا تھا کہ جہانگیرہ پیچھے رہ گیا تھا اور یہ لوگ آگے بڑھ رہے تھے۔ فوکس ویگن اس رفتار سے نہیں چلا سکتے تھے۔ جس رفتار سے جیپ یہ ناہموار راستے طے کر رہی تھی۔

بہر حال فاصلے کم ہوتے جا رہے تھے اور اب یہاں زیادہ آسانی سے تعاقب کیا جا سکتا تھا۔ لیکن جیپ کو نزدیک دیکھ کر فوکس ویگن سے رائفل کے فائر ہونے لگیں۔ جواب میں ان لوگوں نے پہلی بار اپنی رائفلوں کو استعمال کیا۔ کوشش کی گئی کہ فوکس ویگن کے ٹائر پھاڑ دیئے جائیں۔ لیکن چلتی گاڑیوں میں ذرا اس قسم کے نشانہ مشکل ہی کامیاب ہوتے ہیں پھر راستے بھی ناہموار تھے۔ چنانچہ ابھی تک وہ نہیں کر سکا

تھا جو یہ لوگ چاہتے تھے۔

البتہ قدرتی طور پر ہی کام ہوا۔ فوکس ویگن بڑی مہارت سے ڈرائیو کی جا رہی تھی لیکن وہ لوگ بھی بدحواس ہو گئے تھے۔ چنانچہ گڑھے میں اچھلنے کے بعد وہ ایک درخت سے جا ٹکرائی اور گھومتی ہوئی جھاڑیوں میں گھوم گئی۔ اس سے پہلے کہ فوکس ویگن والے ہوشیار ہوتے اور فرار ہونے کی کوشش کرتے۔ شاہ زیب وغیرہ ان کے سر پر پہنچ گئے۔ فوکس ویگن کا دروازہ کھلا اور ڈرائیور نے نکل بھاگنے کے لیے ٹانگ باہر نکالی لیکن اس وقت ایک گولی سنسناتی ہوئی اس کے سر سے گزر گئی۔ اس نے گھبرا کر دروازہ بند کر لیا۔ اس دوران ساون کی گولی نے فوکس ویگن کا پچھلا شیشہ چکنا چور کر دیا تھا۔ یہ لوگ بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچے اور اندر موجود افراد کو للکارتے ہوئے گرجے۔

''خبردار! اگر تم نے زیادہ گڑبڑ کی تو اندر بم پھینک دیا جائے گا''۔ وہ لوگ خاصے بدحواس ہو گئے تھے''۔ چنانچہ ان لوگوں پر قابو پا لیا گیا۔ ڈرائیور کی پیشانی سے خون ابل کر اس کی قمیض کو بھگو رہا تھا باقی تین افراد بھی شکل وصورت سے ہی کافی خطرناک ہی نظر آ رہے تھے ان میں دو کے پاس ریوالور اور ایک کے پاس ایم جی رائفل تھی۔ ویسے وہ بدحواس ہی ہو گئے تھے اگر وہ حاضر دماغی سے کام لیتے تو نکل سکتے تھے لیکن فوکس ویگن کے ٹکرا جانے سے وہ یوں گھبرائے تھے کہ نکل بھاگنے کے سوا اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ان میں نہ تو مائیکل اسحاق تھا اور نہ ہی جے کال، چند ہی لمحوں کے اندر ان سے ہتھیار چھین لیے گئے اور شاہ زیب نے ریوالور کی نال ایک شخص کی پیشانی پر رکھتے ہوئے کہا۔

''کہاں گیا وہ بدمعاش جواب دو''۔

''کک...... کس کی بات کرتے ہیں صاحب''۔ اس شخص نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"مائیکل اسحاق اور جے کال"

"نہیں صاحب جی! یہ دونوں تو ہمارے ساتھ نہیں تھے اور ہم انہیں نہیں جانتے"۔ شاہ زیب کی ٹھوکر اس شخص کی ریڑھ کی ہڈی پر پڑی تو وہ درد سے کراہ اٹھا اور ہاتھ جوڑتا ہوا بولا۔

"نہیں مارو صاحب! نہیں مارو"

"تم نے فائرنگ کیوں کی تھی"

"صاحب جی! ہم اپنے دشمنوں سے بچنا چاہتے تھے۔ کچھ لوگ ہمیں مار دینا چاہتے ہیں ہم تو کہیں اور سے آرہے ہیں صاحب جی! ادھر سے گزر رہے تھے کہ ہمارا پیچھا شروع ہوگیا۔ ہم سمجھے کہ ہمارے دشمن ہمارے پیچھے لگ گئے ہیں"۔

"کہاں سے آرہے تھے تم"

"صاحب جی! چک نمبر اٹھارہ سے"

شاہ زیب خونی نگاہوں سے انہیں گھورنے لگا اتنی دیر میں جہانگیرہ کی گاڑی بھی پہنچ گئی تھی۔ ان لوگوں سے سارا سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ جہانگیرہ سے بات ہونے لگی۔ تو جہانگیرہ بولا۔

"یہ تو ممکن نہیں ہوسکتا کہ وہ دونوں اس میں نہ ہوں۔ کم از کم مائیکل اسحاق یا پھر جے کال"۔

"پھر کیا ہوسکتا ہے"

"میرا خیال ہے ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ موقع سے فائدہ اٹھا کر کسی موڑ پر اتر گئے ہوں"۔

"ارے ہاں...... ایک بات سنو"۔ شاہ زیب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور جہانگیرہ شاہ زیب کی طرف دیکھنے لگا۔ شاہ زیب کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

"جب تمہاری جیپ دوسرے راستے پر چلی گئی تھی اور ویگن نے نہر کا پل عبور کیا تھا اور میں ویگن کے پیچھے لگ گیا تھا تو ویگن مجھے ایک دم نظر آ گئی تھی اس کا مطلب تھا کہ وہ یا تو سست ہوئی ہے یا رکی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے یقینی طور پر نہر کے آس پاس مائیکل اسحاق یا جے کال اتر گئے ہوں گے ورنہ اصولی طور پر انہیں پوری برق رفتاری سے آگے نکل جانا چاہیے تھا۔ جہانگیرہ نے تعریفی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا تھا اور پھر وہ بولا۔

"ٹھیک کہتے ہو شاہ جی! تو پھر"

"پھیل کر تلاش کرتے ہیں"

چاروں آدمیوں کو تو خیر باندھ کر ڈال دیا گیا تھا۔ باقی لوگوں نے اپنی اپنی رائفلیں سنبھال لیں اور مختلف سمتوں میں ہوشیار ہو کر چل پڑے۔ شاہ زیب نے چند لوگوں کو پکڑے جانے والے لوگوں کے پاس چھوڑا تھا ان کی نگرانی کے لیے۔ اور خود بھی اپنی رائفل لے کر سرکنڈوں اور جھاڑیوں میں گھس گیا تھا۔ زمین دور دور تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاہ زیب کا رخ اس جانب تھا جدھر ویگن کی رفتار سست ہوئی تھی۔ سرکنڈوں اور جھاڑیوں سے اٹے ہوئے راستے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ جس موڑ پر جیپ کی رفتار دھیمی ہوئی تھی وہاں اونچے سرکنڈے تھے۔

چنانچہ شاہ زیب رائفل اپنے ہاتھوں میں سنبھالے۔ محتاط نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر کسی سرخ سی چیز پر پڑی اور اس کے قدم رک گئے بوڑھی جھاڑیوں کے درمیان یہ چیزیں نمایاں تھیں وہ قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ یہ گولڈ لیف کا پیکٹ تھا آدھا سرخ اور آدھا سفید اور زمین پر کھلا پڑا ہوا تھا۔ اس میں سے سگریٹ جھانک رہے تھے اس کا مطلب تھا کہ یہ کسی کی جیب سے گرے ہیں۔ شاہ زیب کا پورا بدن اکڑ گیا۔ اعصاب کشیدہ ہو گئے اور اس کو یقین ہو گیا

کہ اطراف کے سرکنڈوں میں کوئی موجود ہے۔ اس نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور دبے قدموں سرکنڈوں میں داخل ہونے لگا۔ وہ وقت کا تعین بھی کرتا جا رہا تھا اگر فوکس ویگن سے کوئی اترا ہے ابھی شاہ زیب تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ دفعتاً ہی فائر کی آواز سنائی دی اور گولی اس کے کندھے سے کوئی آدھ انچ کے فاصلے سے گزر گئی تقدیر نے ساتھ دیا تھا اس سے پہلے کہ دوسرا فائر ہوتا اس نے چھلانگ لگائی اور سرکنڈوں کو توڑتا ہوا آٹھ دس فٹ بائیں جانب گرا۔

چھلانگ لگاتے ہوئے اسے بائیں سمت کوئی نظر آیا تھا۔ جو شاید سفاری سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے دوسرا فائر کیا اور پھر پوری طاقت سے ایک طرف دوڑ پڑا لیکن وہ شخص جو اسے مدھم سے سائے کی شکل میں نظر آیا تھا۔ اس سے آگے دوڑ رہا تھا۔ شاہ زیب نے اپنا ریوالور نکالا۔ رائفل کو سنبھال کر گولی چلانا مشکل تھا اور رائفل اس نے بائیں ہاتھ میں لے لی اور ریوالور سے ایک فائر کیا۔ سرکنڈوں میں پرندے بھاگنے دوڑنے لگے۔ ناہموار زمین پر بھاگنے میں خاصی مشکل پیش آرہی تھی۔ ویسے جانتا تھا کہ آگے بھاگنے والا بھی سہی طور پر نہیں بھاگ پا رہا ہوگا۔ کیونکہ راستے تو اس کے لیے بھی ویسے تھے۔ جیسے شاہ زیب کے لیے۔ بھاگتے بھاگتے شاہ زیب ریوالور سے ایک آدھ فائر کر دیتا تھا لیکن وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس طرح سہی نشانہ لے کر کسی کو نقصان پہنچانا ایک مشکل کام تھا۔ کوئی بھی لمحہ خطرناک بن سکتا تھا۔ کیونکہ شاہ زیب ان راستوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ بس ایک اندھی بھاگ دوڑ ہو رہی تھی۔ آگے دوڑنے والے کے پاس غالباً ریوالور نہیں تھا۔ ورنہ وہ بھی یقینی طور پر پلٹ کر فائر کرتا۔

شاہ زیب نے اپنے آپ کو پوری طرح سنبھالا اور اس کے بعد رفتار تیز کر دی۔ اب اس کا فاصلہ آگے بڑھنے والے سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ پھر اچانک ہی شاہ زیب نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور اسے لپیٹ میں لیے ہوئے نیچے جا گرا۔ تھوڑے

فاصلے پر ایک چھوٹا سا جوہڑ نظر آرہا تھا۔ شاہ زیب نے گرنے والے کے دو تین گھونسے رسید کر دیئے۔ لیکن وہ بھی ایک طاقتور آدمی تھا۔ اس نے پلٹ کر ایک زوردار ٹھوکر شاہ زیب کے پیٹ میں ماری اور شاہ زیب کے حلق سے ایک چیخ سی نکل گئی۔ اس نے سنبھالا لے کر ریوالور کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ وہ دھاڑتا ہوا آگے بڑھا اور جوہڑ میں جا کر لیکن آدمی بڑا سخت اور لڑائی بھڑائی والا معلوم ہوتا تھا۔ وہ ذرا سا لڑکھڑا کر اٹھا اور اس نے سر کی زوردار ٹھوکر شاہ زیب کے سینے پر مارنا چاہی۔ لیکن وہ اس کے شانے پر پڑی تھی۔ شاہ زیب کو ایسا ہی لگا جیسے شاہ زیب کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔

لیکن بہرحال اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر ایک ضرب اس کے چہرے پر رسید کی اور وہ دوبارہ پانی میں جا پڑا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ اس کا وار خالی گیا ہے۔ پانی میں گرتے ہی اس نے سنبھالا لے کر دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس مرتبہ اس کے قدموں کے نیچے ٹھوس زمین کے بجائے جوہڑ کی کیچڑ تھی۔ شاہ زیب نے آگے بڑھ کر اسے پھر دبوچ لیا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون چھوٹ رہا تھا۔ اور رفتہ رفتہ اس کی مزاحمت سرد ہوتی جا رہی تھی۔

شاہ زیب نے اس کے بال پکڑے اور اسے گھسیٹتا ہوا جوہڑ سے باہر لے آیا۔ اب ریوالور پانی میں بھیگ کر ناکارہ ہو چکا تھا اور شاہ زیب کا پورا جسم جوہڑ کے گدلے پانی میں شرابور تھا۔ لیکن اپنے مدمقابل کو چھوڑنے کا مطلب یہ تھا کہ شدید نقصان اٹھایا جائے۔ بے شک شاہ زیب کی ضربوں نے اسے زخمی کر دیا تھا لیکن دو تین باتیں تھیں۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ جوہڑ میں گر کر اپنی قوت کھو بیٹھا تھا اس کی آنکھیں وغیرہ سب گندی ہو گئی تھیں اور پھر شاید اس کے چوٹ بھی لگی تھی کیونکہ اس کا پاؤں زخمی ہو گیا تھا کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ اچانک ہی ایک اور آواز سنائی دی اور شاہ زیب بے اختیار سنبھل گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ دوسرا آدمی کون ہے اور ایک لمحے کے

اندر اندر اس کے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔ اور اس نے کسی قدر پریشان نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ چند پرندے تھے جو جھاڑیوں میں دبکے ہوئے بیٹھے تھے اور یہ صورتحال دیکھ کر اپنی جگہ چھوڑ کر اڑ گئے تھے۔

شاہ زیب نے سکون کی گہری سانس لی اور اپنے شکار کو گھسیٹتا ہوا ایک ایسی جگہ لے آیا۔ جہاں جھاڑیاں نہیں تھیں۔ یہاں اس نے ایک زوردار ٹھوکر اس کی ران کے پٹھوں پر رسید کی اور اس کے حلق سے ایک دہاڑ نکل گئی۔ شاہ زیب اب کافی وحشی ہو چکا تھا۔ اس طرح کے معاملات اب اسے زیادہ متاثر نہیں کرتے تھے چنانچہ اپنے شکار کو لیے ہوئے وہ باہر آیا اور اس نے اسے زمین پر ڈال دیا۔ اس کا شکار اب خاصا بدحواس ہو چکا تھا شاہ زیب نے اسے خونی نگاہوں سے دیکھا اور غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''دیکھو...... میں اس وقت تک تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ جب تک کہ مجھے اس بات کا پتہ نہ چل جائے کہ تم مجھے کوئی نقصان پہنچا دو گے''۔

''میں...... میں زخمی ہوں۔ گاڑی سے کودتے ہوئے میرے پاؤں کا ٹخنہ ٹوٹ گیا ہے اگر میں یہاں سے بھاگنے کی کوشش بھی کروں تو نہیں بھاگ سکتا۔ تم نے مجھے کافی توڑ پھوڑ دیا ہے''۔

''ہوں۔ ٹھیک...... یہ تو اچھی بات ہے۔ اب تم مجھے میرے تمام سوالات کے جوابات سچ سچ دو گے تو ہو سکتا ہے میں تمہیں چھوڑ دوں۔ ورنہ تم اس وقت میری گرفت میں ہو۔ میرے ساتھی چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ میں سیٹی بجا کر انہیں بلا سکتا ہوں اور اس کے بعد تمہارا جو حشر ہو گا تم سوچ نہیں سکتے''۔

''مگر تم ہو کون۔ کیا پولیس سے تعلق ہے تمہارا''

''نہیں۔ پولیس پر میں لعنت بھیجتا ہوں''۔ شاہ زیب نے کہا

''تو پھر''

''تم الٹے مجھ سے سوالات کر رہے ہو تم خود کون ہو''

''میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا میرا نام مائیکل اسحاق ہے اور میں قریب ہی کی ایک بستی میں رہتا ہوں''۔

''گڈ...... مجھے تمہاری ہی ضرورت تھی اچھا اب یہ بتاؤ کہ......''

''ایک منٹ میری بات سنو۔ اگر تم مجھے یہ بتا دو کہ تمہارا تعلق کس سے ہے۔ تو میں تمہارے بڑے کام آ سکتا ہوں۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میں تمہارے لیے کس قدر کارآمد ثابت ہو سکتا ہوں''

''مثلاً''

''دس لاکھ روپے لینا پسند کرو گے''

''کس سلسلے میں''

''مجھے چھوڑ دو...... بات میرے اور اپنے درمیان ہی رہنے دو۔ اگر تمہارے ساتھی بھی آس پاس موجود ہیں تو کم از کم تمہارے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ میں تمہیں راستہ بھی بتا سکتا ہوں۔ میرے ساتھ چلو اور خاموشی سے مجھ سے رقم لے کر وہاں سے چلے آؤ۔ دیکھو دس لاکھ کم نہیں ہوتے۔ ہو سکتا ہے تمہیں ہماری دشمنی پر آمادہ کرنے کے لیے کچھ رقم دی گئی ہو لیکن وہ دس لاکھ نہیں ہو سکتی۔ یہ دس لاکھ تمہیں صرف اکیلے کو مل سکتے ہیں۔

''پیشکش تو اچھی ہے۔ لیکن تمہارا کیا خیال ہے۔ تمہارے خلاف کون کام کر سکتا ہے''۔

''دیکھو یار! ان تمام باتوں کے چکر میں نہ پڑو۔ میں زخمی ہوں مجھے سہارا دے کر لے چلو۔ جو راستہ میں تمہیں بتاؤں گا وہ بہت مختصر ہے۔ ہم ایک ایسی جگہ پہنچ جائیں گے۔ جہاں سے ہمیں سہولتیں مل سکتی ہیں۔ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جس کا کوئی

نام نہیں بس...... کچھ آبادیوں والے مکانات ہیں۔ وہ لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ تم مجھے وہاں لے چلو۔ وہاں میرے شناسا موجود ہیں۔ وہ مجھے ہر طرح کا سہارا دیں گے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ بدنیتی نہیں کروں گا''۔

''اچھا خیر چھوڑو اس مسئلے پر بات چیت کر لیتے ہیں پہلے تم مجھے یہ بتاؤ مائیکل اسحاق! کہ تم اپنے گھر سے کب بھاگے تھے؟''

''یہ سوال ضروری ہے......؟ اگر تم سودا مکمل کر لو تو پھر ان سوالات کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی''

''تمہارا کون سا پاؤں زخمی ہے''۔ شاہ زیب نے سوال کیا۔

''سیدھا...... اسی کم بخت نے تو مجھے مفلوج کر دیا ہے ورنہ...... ورنہ...... اور پھر میرا ایمونیشن بھی ختم ہو گیا ہے۔ بس ذرا سی جلد بازی ہو گئی تھی اصولی طور پر مجھے اپنے گھر پر ہی رک کر تم لوگوں سے نمٹنا چاہیے تھا لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ میں جلد بازی کر بیٹھا تھا اور کوٹھی سے باہر نکل آیا تھا۔ اور پھر بھاگنے کی فکر میں سرگرداں ہو گیا تھا۔ سب کچھ غلط تھا۔ سب کچھ غلط تھا''۔

''ہاں۔ یہ بات تو ہے لیکن میں تم سے جو کچھ پوچھنا چاہتا ہوں تم مجھے اس کے جواب دے دو تو زیادہ بہتر ہے''

''یعنی...... یعنی تم دس لاکھ روپے کمانا پسند نہیں کرو گے''

''مائیکل اسحاق! یا تو تم گدھے یا گدھے کے بچے۔ تم مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ گے پہلے اس گاؤں پہنچو گے۔ وہاں تمہارے شناسا موجود ہوں گے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہیں میرا کام تمام ہو جانا چاہیے۔ فرض کرو اگر وہاں ایسے لوگ موجود نہیں ہیں۔ جو مجھے مارنے میں تمہاری مدد کریں۔ تو تم مجھے اپنی کوٹھی میں لے جاؤ گے۔ وہاں یقینی طور پر تم نے ایسی جگہیں بنا رکھی ہوں گی۔ جہاں ایک آدھ آدمی کو دفن کرنے کے معقول

انتظامات ہوں۔ یار دونوں میں سے ایک بات مجھے بتاؤ گدھے ہو یا گدھے کے بچے ہو۔ مائیکل اسحاق خونی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھنے لگا اور پھر بولا۔

''کسی نے آج تک مجھ سے اس قسم کی بدتمیزی نہیں کی۔ تم ذرا سی......'' ابھی اس نے اتنا ہی جملہ کہا تھا کہ شاہ زیب نے اپنا پاؤں اس کے داہنے پاؤں پر رکھ دیا اور اس پر دباؤ ڈالنے لگا اس شخص کے حلق سے دلخراش چیخیں نکلنے لگیں تھیں اور وہ شاہ زیب کو گالیاں بکنے لگا۔

''الو کے پٹھے! یہ کیا کر رہا ہے''

''یہی پاؤں زخمی ہے نا تمہارا میرا خیال ہے میں اس پر تین چار ضربیں لگاؤں تو تم زبان کھولنے پر آمادہ ہو جاؤ گے''

''پاؤں ہٹا...... پاؤں ہٹا کتے! مر جاؤں گا...... مر جاؤں گا میں...... آہ...... بڑی تکلیف ہے میرے ٹخنے کی ہڈی چور چور ہو گئی ہے۔

''گڈ...... ہاں مائی ڈیئر مائیکل اسحاق! میرا خیال ہے کچھ اور دباؤ ڈالوں تمہارے پاؤں پر تا کہ تمہاری زبان کھل جائے''

''پاؤں ہٹا لے...... پاؤں ہٹا لے...... پلیز...... پلیز پاؤں ہٹا لے کیا پوچھنا چاہتا ہے تو مجھ سے کمال کا آدمی ہے...... اس دور میں دس لاکھ روپے چھوڑ دیا ہے ارے بیوقوف! اس وقت میری جو کیفیت ہے اس کیفیت میں، میں تجھ سے کوئی قریب کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں''۔

''پھر بکواس......'' شاہ زیب نے پاؤں اس کے زخم سے ہٹا دیئے تو وہ دونوں ہاتھوں کو سیدھا کر کے بولا۔

''نہیں نہیں پوچھ کیا پوچھنا چاہتا ہے''

''جے کال کہاں ہے؟'' شاہ زیب نے سوال کیا۔ مائیکل اسحاق کے چہرے

پر ایک لمحے کے لیے حیرت کے آثار نظر آئے۔ وہ شاہ زیب کو گھورتا رہا پھر بولا۔

''بتا دوں گا تجھے اس کے بارے میں، پہلے یہ بتا کہ جے کال کے چکر میں تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ میری حویلی میں داخل ہوا تھا''

''اگر میں کہوں ہاں۔تو پھر''

''تو پھر میں اس کی وجہ پوچھوں گا''

''گویا وہی الٹے سوالات کا سلسلہ،نہیں مائیکل اسحاق میری جان! بتانا تو تمہیں ہی پڑے گا''۔

''دیکھ...... یہ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ آخر تجھے یہ بات کس نے بتائی کہ جے کال میری حویلی میں مل سکتا ہے''۔

''کسی نے بھی بتائی ہو تجھے اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے''۔

''بتا دے میرے یار! پہلے اگر مجھے پتہ چل جاتا تو شاید ہم لوگ اس حد تک نہ جاتے۔ پتہ نہیں آگے کیا ہوگا۔ کتنے بندے تیرے ہاتھوں مارے جائیں گے اور کتنا نقصان تجھے میرے بندوں کے ہاتھوں پہنچے گا''۔

''میں جے کال کو تلاش کرنا چاہتا ہوں''۔ وہ میرے ہاتھوں زخمی ہوا ہے۔ میری گولی اس کی ران کو لگی اور وہ وہاں سے بھاگا ہے۔ جہاں میں نے اسے زخمی کیا تھا''۔

''کیا حیدر شاہ کی حویلی سے؟'' مائیکل اسحاق نے فوراً سوال کیا۔شاہ زیب اسے غور سے گھورتا رہا پھر بولا۔

''حیدر شاہ کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟''

''ارے بابا پتہ نہیں تم کس چکر میں پڑے ہوئے ہو۔سب بڑے لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔حیدر شاہ برا آدمی نہیں ہے لیکن پھر بھی''۔

''اچھا ایک بات سنو۔اگر میں تمہیں مکرم شاہ کا نام بتاؤں تو''

''اوہ ہو...... وہ...... ہاں۔تو کیا تم مکرم شاہ کے آدمی ہو''۔

''پھر وہی سوال''

''بتا دے یار! بتا دے تیرا فائدہ ہی ہوگا۔ دیکھ لینا جو کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔میری بات کا یقین کر''۔

''چلو ٹھیک ہے تم فائدے کی بات کرتے ہو مائیکل اسحاق...... تو میں تمہیں بتا دوں کہ میں مکرم شاہ ہی کا آدمی ہوں اور مکرم شاہ ہی کی ہدایت پر میں جے کال کو تلاش کر رہا ہوں''۔

''بالکل ٹھیک جگہ پہنچے تھے تم۔لیکن اب جو کچھ میں تمہیں بتا رہا ہوں اس کی تصدیق کیے بغیر مجھ سے دشمنی نہ باندھنا۔کیونکہ بعد میں تمہیں خود افسوس ہوگا۔کبھی کسی زمانے میں جے کال میرا دوست میرا ساتھی تھا۔اب میں کھل کر تمہیں یہ بات بتاؤں کہ اسمگلنگ کا کاروبار میں بھی کرتا تھا اور کرتا ہوں۔تم یہ کہو گے کہ ایک پادری کا روپ دھار کر اور حویلی میں چرچ بنا کر میں یہ کاروبار کیوں کرتا ہوں۔تو میرے دوست...... میری جان...... اس وقت آدھی دنیا یہی سب کچھ کر رہی ہے۔صرف میرا قصور نہیں ہے گر دوہری شکلیں نہ بناؤں اور اپنی اصلی شکل کے ساتھ دنیا کے ساتھ رہوں تو دنیا پیس کر رکھ دیتی ہے سمجھ رہے ہو نہ تم۔تمہیں کبھی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔تم نقصان ہی نقصان اٹھاتے رہو گے اس لیے شکلیں تو بدلنا ہی پڑتی ہیں''۔

''خیر۔تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اب تمہارا جے کال سے کوئی رابطہ نہیں ہے''

''ہاں۔ میں یہ صرف کہنا نہیں چاہتا بلکہ یہی حقیقت ہے۔ جے کال کسی زمانے میں میرا کاروباری دوست تھا۔لیکن وہ ایک کم ظرف ساتھی ہے ہم لوگ برے دھندے کرتے ہیں۔لیکن ہمارے اندر بھی ایک دوست جیتا ہے۔ہم جب دوستیاں

کرتے ہیں نا تو کم از کم دوستوں کے لیے برے نہیں ہوتے ورنہ برائیاں تو مختلف شکلوں میں ہمارے ساتھ ہوتی ہیں۔ وہ بہت خود غرض اور کمینہ نکلا مجھے بدترین نقصان پہنچایا اس نے۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں اس بارے بہت ہی ذاتی بات ہے۔ بس یوں سمجھ لو میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ میں اس کا ساتھ چھوڑ دوں اور جب ایسے لوگ ساتھ چھوڑتے ہیں تو پھر دشمنیوں کا آغاز ہو جاتا ہے تم یہ سمجھ لو کہ جے کال میرا دوست نہیں دشمن ہے۔ بس یہ اتفاق ہے کہ ہم لوگ براہ راست ایک دوسرے کے سامنے نہیں آئے۔ نہ میں نے اسے کبھی نقصان پہنچایا نہ اس نے مجھے۔ لیکن یہ ہم جانتے ہیں کہ اگر ہمارا آمنا سامنا ہوا تو ہم ایک دوسرے کے ساتھ رعایت نہیں کریں گے''۔ شاہ زیب گہری نگاہوں سے مائیکل اسحاق کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا وہ کہ مائیکل اسحاق نے اسے کوئی الگ کہانی سنا کر بیوقوف بنانے کی کوشش تو نہیں کی ہے۔ مائیکل اسحاق نے کہا۔

''اس وقت اتفاق کی بات ہے کہ میں بالکل اکیلا گیا ہوں اور زخمی بھی ہوں تم اگر چاہو تو آسانی سے مجھے گولی مار کر یہاں سے جا سکتے ہو۔ لیکن کہہ سچ رہا ہوں میں۔ میں تمہیں ایسے کچھ ٹھکانے بتا سکتا ہوں۔ جہاں جے کال تمہیں مل سکتا ہے۔ ویسے تو وہ بہت شاطر اور خطرناک آدمی ہے لیکن اگر تم کہتے ہو کہ وہ تمہاری گولی سے زخمی ہو گیا ہے تو پھر بنیادی طور پر اسے تمہیں شکرے کے پاس ملنا چاہیے۔

''شکرا!'' شاہ زیب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں پتہ بتا دیتا ہوں۔ بھلی وال نامی ایک جگہ ہے اس کے نواحی علاقے میں خانہ بدوشوں کے ڈیرے لگے ہیں۔ یہ اصل میں خانہ بدوش نہیں ہیں بلکہ اسمگلر ہیں خانہ بدوشوں کے روپ میں وہ جگہیں بدلتے رہتے ہیں اور مختلف جگہوں سے اسمگلنگ کیا کرتے ہیں۔ اگر کبھی سرکاری محافظ ان تک پہنچ جائیں تو وہ اپنے آپ کو خانہ بدوش

ظاہر کر کے کام چلا لیا کرتے ہیں۔ ورنہ وہی کے وہی۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات''۔

''ہوں''۔ شاہ زیب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا پھر بولا۔

''اور اب جب ہم تم سے دور ہو جائیں گے تم سب سے پہلا کام کیا کرو گے''

''میں سمجھا نہیں''۔ مائیکل اسحاق نے بھنویں سکیڑتے ہوئے کہا۔

''سیدھی سیدھی سی بات ہے اور اصولی طور پر تمہیں یہی کرنا بھی چاہیے''

''کیا......؟''

''یہی کہ فوری طور پر تم جے کال کو ہمارے بارے میں اطلاع دے دو''۔

مائیکل اسحاق کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ کچھ لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

''اپنے قابو میں آئے ہوئے کسی بے بس انسان کو ذلیل کرنے کا حق سب کو پہنچتا ہے۔ تم کوئی نیا کام نہیں کر رہے ہو''۔ اس کے لہجے کی تلخی اور اس کا اندازہ بتاتا تھا کہ اسے شاہ زیب کی یہ بات بہت بری لگی ہے۔ شاہ زیب کو ایک لمحے کے اندر اس بات کا یقین ہو گیا کہ مائیکل اسحاق کم از کم اس بارے میں جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔

بہر حال مائیکل اسحاق نے اپنی جان بچالی تھی۔ جہانگیرہ بھی اس بات پر متفق تھا کہ مائیکل اسحاق مطلب کی چیز نہیں ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے وہ بستی چھوڑ دی۔

جہانگیرہ نے خانہ بدوشوں کے اس علاقے کا پتہ معلوم کیا تھا اور انہوں نے ساری باتیں ذہن نشین کرنے کے بعد اسی جانب رخ کیا تھا۔ راستے میں جہانگیرہ کی شاہ زیب سے بات چیت ہوئی۔

''شاہ جی! تمہارا کردار ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا ویسے بہت گہرے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ مکرم شاہ کی ہی کیا شخصیت کم تھی کہ تم کبیر شاہ تک آ پہنچے۔ بہت

بڑے لوگ ہیں یہ جی! یوں سمجھ لو ہر کام نکال لیا کرتے ہیں۔ بڑے بڑے واقعات آ جاتے ہیں زندگی میں تم یہ سمجھ لو کہ یہ لوگ ہر مشکل کا حل نکال لیتے ہیں“۔

”ہوں۔ یہی کہتے ہو مجھے کبیر شاہ تک مکرم شاہ نے ہی پہنچایا تھا“۔

”مکرم شاہ جی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ کبھی کسی سے متاثر نہیں ہوتے لیکن اگر متاثر ہو جاتے ہیں تو بڑے اچھے دوست ثابت ہوتے ہیں۔ میں صرف وفاداری میں یہ بات نہیں کہہ رہا بلکہ اپنا تجربہ بتا رہا ہوں۔ ایسے اچھے لوگ کم ہی ہوا کرتے ہیں“۔ شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

بہر حال یہ لوگ راستہ طے کرتے رہے چھوٹے موٹے واقعات تو زندگی کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ مختلف قسم کے حالات سے واسطہ پڑتا رہا۔ غالباً اس سفر کا تیسرا دن تھا کہ اچانک ہی انہیں ایک مختلف واقعہ سے دو چار ہونا پڑا۔

سورج آسمان پر چمک رہا تھا اور یہ سفر کر رہے تھے کہ اچانک ہی گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں اور پتھروں کی کرچیاں اڑنے لگیں۔ انہوں نے حیرانی سے سامنے دیکھا تو پولیس کی وردی میں ملبوس بہت سے لوگ انہیں گھیرے ہوئے نظر آئے۔ پولیس والوں کی تعداد کوئی تیس بتیس کے قریب تھی۔ دو جیپیں اور باقی گھوڑے کوئی بڑا کام ہو رہا تھا۔ جہانگیرہ کے ہونٹوں سے مدھم سی آواز نکلی۔

”یہ کیا قصہ ہے“

ادھر شاہ زیب اپنے طور پر چونک گیا تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگل گردی اور پر صعوبت ماحول نے شاہ زیب کا چہرہ خشک کر دیا تھا۔ پہلے جو ملائمت اور شگفتگی اس کے چہرے پر نظر آیا کرتی تھی اب اس طرح نہیں رہی تھی بلکہ چہرے کی رنگت تھوڑی سی سرخ ہو گئی تھی۔ دھوپ کی تپش نے چہرے کو تانبے جیسی سرخی دے دی تھی۔ بہت سے لوگوں کا خون کر چکا تھا۔ اس لیے آنکھوں کی ملاحت بھی درشتگی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

داڑھی تو اب بالکل بے تکے انداز میں بڑھی ہی رہتی تھی۔ اپنے آپ کو سنوارنے کا موقع کہاں ملتا ہے۔ بہر حال پولیس پارٹی چاروں طرف مستعد تھی۔ پھر میگا فون پر ایک آواز سنائی دی۔

”تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے اپنے ہتھیار رکھ کر لائن میں کھڑے ہو جاؤ۔ ورنہ ہمارے پاس ہر قسم کے ہتھیار موجود ہیں میزائل کے گولوں سے تمہارے چیتھڑے اڑا دیئے جائیں گے۔ خبردار.... خبردار اگر تمہاری طرف سے ایک گولی چلی تو تم سب کے جسموں کو داغدار کر دیا جائے گا“

”یہ لوگ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے شاہ جی! کیونکہ کبیر شاہ کا نام ان میں سے ہر کوئی جانتا ہے۔ پر سنگین صورتحال بہر حال سنسنی خیز تھی۔ لیکن بہتر یہی تھا کہ ان پولیس والوں کے مقابلے پر ہتھیار نہ اٹھائے جائیں۔ شاہ زیب کے اندر پھر وحشت ابھر رہی تھی۔ ان پولیس والوں نے بلاوجہ اسے قاتل بنا دیا تھا اور نہ بات جبار خاں تک ہی ختم ہو جاتی اور اس حد تک آگے نہ بڑھنا پڑتا۔ الیاس خاں اور جبار خاں تک میں دشمنی محدود رہتی تو کوئی مشکل پیش نہ آتی لیکن اب وہ باقاعدہ ایک مجرم بنا گیا تھا۔

جہانگیرہ کے مشورے سے سب نے اپنی اپنی رائفل اور پستول نکال کر نیچے رکھ دیئے اور پولیس پارٹی کے افراد ان کا گھیرا تنگ کرنے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ پورے چوکنے ہو کر آگے بڑھ رہے تھے اور واقعی اس طرح چوکس نظر آ رہے تھے کہ اگر ادھر سے کوئی کاروائی ہو تو آگے پیچھے چاروں طرف سے وہ ان پر گولیوں کی بارش کر دیں۔ کسی کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا یہاں تک کہ سامنے بھاری بھرکم جسم کا ایک آدمی نمودار ہوا اس کے کندھے پر اس پی کے پھول لگے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں کسی عقاب کی طرح تیز تھیں وہ ان کے سامنے پہنچ گیا اور اس نے کہا۔

”لیڈر کون ہے تم میں سے“۔ جہانگیرہ نے نرم لہجے میں کہا۔

''جناب عالی کوئی لیڈر رشیڈ رنہیں ہے ہم میں سے۔ شکاری پارٹی کے لوگ ہیں شکار کھیل رہے ہیں۔ بس آوارہ گردی کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ ہم میں سے کچھ کا تعلق کراچی سے ہے کچھ پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہیں''۔

ایس پی نے ساتھ کھڑے ہوئے ایک شخص کو دیکھا اور بولا۔

''رحیم شاہ کیا کہتے ہو''۔ رحیم شاہ نے، جہانگیرہ، شاہ زیب، گوگا، ساون اور باقی جو افراد بھی تھے انہیں غور سے دیکھا۔ پھر ایس پی کے کان کے پاس جا کر کچھ گدگدایا۔ ایس پی کے چہرے کے نقوش تبدیل ہو گئے۔

''شکاری ہو تم لوگ''

''جی ایس پی صاحب! بالکل شکاری ہیں۔ یہ کچھ کاغذات ہیں ہمارے پاس آپ انہیں دیکھ سکتے ہیں حالانکہ کوئی ایسی ضرورت نہیں محسوس کی تھی ہم نے لیکن پھر پھر......'' یہ کہہ کر جہانگیرہ نے اپنی جیب سے کچھ کاغذات اور شناختی کارڈ نکالا اور بڑے ادب سے ایس پی صاحب کے سامنے آیا جہانگیرہ کے لہجے کی نرمی اور اس کے تعاون نے ایس پی صاحب کو بہت نرم کر دیا تھا۔ لیکن اس نے جو یقیناً پولیس کا مخبر تھا کوئی ایسی بات کہی تھی کہ جس نے ایس پی صاحب کو گرم کر دیا تھا۔ بہر حال ایس پی صاحب نے جہانگیرہ کے کاغذات واپس کرتے ہوئے کہا۔

''وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن......لیکن......'' یہ کہہ کر اس نے شاہ زیب کے چہرے پر نظریں گاڑھ دیں اور دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

''یہ آنکھیں، یہ نقوش دماغ میں چبھ رہے ہیں کیا نام ہے تمہارا جوان''

''فیض علی شاہ''۔ شاہ زیب نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کہا۔

''ہوں۔ کہاں کے رہنے والے ہو''

''کراچی کا''

''کس جگہ رہتے ہو''

''گلشن اقبال میں''

''ہوں۔ گھر کا پتہ''۔ شاہ زیب نے ایک لمحہ اب بھی نہیں سوچا تھا۔ مکان نمبر فون نمبر ساری چیزیں ایس پی صاحب کو بتا دیں گئیں جو فرضی تھیں۔ ایس پی صاحب نے گردن ہلائی اور بولے۔

''بھئی ہم لوگ ڈاکوؤں کا پیچھا کر رہے ہیں۔ ڈاکو علی نواز انہی علاقوں میں ہے۔ بڑی وارداتیں کرتا پھر رہا ہے آج کل ہمیں اس کی تلاش تھی۔ آپ لوگ بھی ذرا احتیاط رکھو کیا سمجھے''۔

''جی ایس پی صاحب! آپ بے فکر رہیں ہم اللہ پر بھروسہ کر کے نکلے ہیں''

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ آپ لوگ جاؤ۔ اپنے ہتھیار سمیٹ لو''۔ ایس پی ایک اچھا انسان تھا۔ جو وجوہات تھیں انہیں روکنے کی وہ اس نے بتا دیں تھیں۔ جب انہوں نے اپنے ہتھیار اٹھا کر اپنے قبضے میں کر لیے اور اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ تو ایس پی نے بھی اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ اور اس کے بعد وہ لوگ چلے گئے انہیں سفر کرتے ہوئے کوئی دو تین منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک ہی میگا فون پر آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی گاڑی کا ہارن زور زور سے بجنے لگا۔ ایس پی کی جیپ سامنے آ رہی تھی۔ تھوڑا فاصلہ طے ہوا تھا۔ جہانگیرہ نے آہستہ سے کہا۔

''اب کچھ گڑبڑ ہو گئی''

''لگتا نہیں ہے''۔ شاہ زیب بولا

''کیوں''

''اگر گڑبڑ ہوتی تو ایس پی اتنے دوستانہ انداز میں نہ آتا۔ صرف ایک ہی جیپ آ رہی تھی''

''ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ پھر اسے کیا تکلیف ہے''۔ ایس پی کی جیپ تھوڑی دیر بعد پہنچ گئی۔

''سنو..... کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا''۔ اس نے شاہ زیب کو اشارہ کرتے ہوئے کہا اور شاہ زیب نیچے اتر آیا پھر ایس پی بولا۔

''یار..... تیری شکل مجھے اتنی جانی پہچانی کیوں لگ رہی ہے۔ کیا کرتا ہے وہاں کراچی میں''۔

''بس جناب گارمنٹس کا کاروبار ہے''

''کس جگہ''

''گلشن اقبال ہی میں ایک اسٹور ہے میرا''

''اوہ..... پتہ نہیں یار! تیری شکل آنکھوں میں کیوں چبھ رہی ہے۔ میں اسی لیے پلٹ کر بھاگا ہوں۔ ٹھیک ہے جاؤ بڑی مہربانی تمہاری۔ معافی چاہتا ہوں دوبارہ راستہ روکنے کی''۔ ایس پی کو نجانے کیوں اپنے ذہن میں کلبلاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے گروہ میں واپس آتے ہوئے کہا۔

''اوہ بھئی..... علی نواز کے چکر میں بائیس دن گذر گئے ہیں۔ اب میری ہمت جواب دے گئی ہے۔ واپس چلو۔ علی خیر کے اسٹیشن میں تھوڑا ٹائم گذاریں گے اور اس کے بعد اوپر سے ہدایات لیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے''۔

''جی سر.....'' دوسرے لوگوں نے کہا اور اس کے بعد پولیس پارٹی کے تمام افراد سمیٹ کر تیز رفتاری سے فاصلے طے کرنے لگے اور ایک مخصوص فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک چھوٹی سی آبادی میں داخل ہو گئے۔ یہاں باقاعدہ پولیس چوکی بنی ہوئی تھی۔ پیلے رنگ کی عمارت میں پہنچ کر گاڑیاں اور گھوڑے وغیرہ رک گئے اور مقامی پولیس آفیسر جوان کے ساتھ تھا وہ ان کے آرام کا بندوبست کرنے لگا۔ لیکن ایس پی

کے چہرے کے نقوش ایک شدید سی الجھن نظر آ رہی تھی وہ نجانے کیوں شبے کا شکار تھا۔ تھانہ انچارج نے اس سے کہا۔

''سر کھانے کا بندوبست کروں۔ یا کچھ چائے وغیرہ''

''اوہ یار جاہ، پلوا دے۔ اچھا سن رحیم شاہ! تیرے پاس پرانے مجرموں کا ریکارڈ موجود ہے''

''ہے سر''

''اوہ..... تو یار نکال کر لانا جلدی سے۔ بس یہی کوئی دو سال کا ریکارڈ''

''ابھی لاتا ہوں۔ شاہ جی!'' رحیم شاہ نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے ایک بکس فائل ایس پی کے سامنے پیش کر دیا۔ ساتھ ہی ایک ملازم چائے کے برتن لے کر آ گیا تھا۔ انسپکٹر رحیم شاہ نے خود چائے بنا کر ایس پی صاحب کو پیش کی اور ایس پی صاحب چائے پینے میں مصروف ہو گئے پھر انہوں نے بکس فائل کھول کر اسے دیکھا اور ایک ایک ورق الٹتے رہے۔ یہاں تک کہ بکس فائل کے ایک صفحے پر رک گئے انہوں نے اس صفحہ کو غور سے دیکھا اور دوسرے لمحے وہ بری طرح اچھل پڑے۔

''اوہ یار! رحیم شاہ! اوہ ادھر آ میرے دوست! ادھر آ.....'' رحیم شاہ ایس پی صاحب کے پاس پہنچا تو ایس پی صاحب نے فائل کا وہ صفحہ رحیم شاہ کے سامنے کر دیا۔ اور بولے

''دیکھ ذرا اسے غور سے دیکھ یار''۔ فائل میں ایک تصویر لگی ہوئی تھی اور اس تصویر کے نیچے صاحب تصویر کے مکمل کوائف تھے۔ یہ شاہ زیب نامی ایک شخص کی تفصیلات تھیں۔ جس کا تعلق بوئے آمسل سے تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے بارے میں تفصیلات ایس پی صاحب انسپکٹر رحیم شاہ کی شکل دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا

''اوئے کتنی دیر دیکھے گا یار۔ لا ادھر دے''۔ یہ کہہ کر ایس پی صاحب نے

اس تصویر پر قلم پھیرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے اس پر ایک بکھری ہوئی داڑھی بنائی۔ مونچھیں بڑھا دیں اور انسپکٹر اچھل پڑا۔

''سر جی! یہ تو وہ......''

''ہاں...... دوڑو...... میں کہتا تھا نا کہ میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھاتیں۔ وہ شاہ زیب ہے بے شمار پولیس والوں کا قاتل بڑا ہی خطرناک آدمی ذرا یہ فائل دیکھو انسپکٹر نے فائل اپنے چہرے کے سامنے کی تو ایس پی صاحب جھنجھلا کر بولے۔

''اوئے یار نفری تیار کر۔ نکل گیا تو گڑ بڑ ہو جائے گی۔ تھوڑی دیر کے بعد پولیس کی دونوں جیپیں برق رفتاری سے اس سمت دوڑ رہی تھیں۔ جدھر سے یہ لوگ آئے تھے ادھر شاہ زیب، جہانگیرہ وغیرہ اپنے مخصوص راستے پر چلے جا رہے تھے۔ شام کے سائے جھکنے لگے۔ سفر نے نڈھال کر دیا تھا۔ جہانگیرہ نے کہا۔

''شاہ جی میرا خیال ہے اس علاقے میں آرام کر لیا جائے۔ آگے ہے تو جنگل مگر دیکھا ہوا نہیں ہے۔ یہ جگہ آفاقی کی ہے۔ رات گذار لیں صبح کو دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے''۔

''ٹھیک ہے۔ جیسا آپ پسند کریں''۔ شاہ زیب نے گردن ہلا دی۔ یہیں قیام کر لیا گیا تھا کھانے پینے کی تیاریاں ہونے لگیں پھر سورج ڈوبا بھی نہیں تھا کہ سامنے گرد و غبار کا طوفان اڑتا ہوا نظر آیا۔ اور ان لوگوں نے اپنی اپنی رائفلیں سنبھال لیں گرد و غبار کے طوفان میں سے پولیس کی دونوں جیپیں برآمد ہوئیں تھیں۔ جہانگیرہ نے دور ہی سے پہچان لیا کہ یہ وہی جیپیں تھیں۔ جن پر ایس پی صاحب ڈاکو علی نواز کو تلاش کر رہے تھے۔

''یار یہ ایس پی بھی مجھے کچھ کھسکا ہوا معلوم ہوتا ہے اب پتہ نہیں کس چکر میں آ رہا ہے''۔

''اس بار اس کے تیور زیادہ اچھے نہیں ہیں''

''خیر اس کی تو کوئی پرواہ ہی نہیں ہے۔ آنے دو''۔ جہانگیرہ نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد گاڑیاں قریب آ گئیں۔ پولیس والے اس طرح رائفلیں لئے نیچے کودے۔ جیسے ایک لمحے کے اندر ان لوگوں کو بھون ڈالیں گے۔ ایس پی اب بھی پیش پیش تھا۔ اس نے ادھر ادھر گھورتے ہوئے کہا۔

''کدھر ہے بھئی وہ کدھر ہے۔ وہ جو کراچی کا بندہ تھا۔ نام بھول گیا میں اس کا''۔ شاہ زیب سامنے آ گیا تو ایس پی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''داڑھی کب سے رکھی ہے تو نے؟'' شاہ زیب کی آنکھوں میں غصے کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔

''کافی عرصہ ہو گیا''

''اوئے کتنا عرصہ میں نے وقت پوچھا ہے''

''سر! کوئی اور بات ہو گئی''۔ جہانگیرہ نے دخل در اندازی کی

''اوہ تو چپ کر بھائی! مجھے اس سے پوچھنے دے۔ اصلی نام کیا ہے تیرا''۔

شاہ زیب نے گہری سانس لے کر جہانگیرہ کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔

''میرا کوئی نام نہیں ہے اب آپ بتایئے کیا نام ہے میرا؟''

''میں بتاؤں''

''جی''

''شاہ زیب ہے تیرا نام اور اگر داڑھی صاف کر دی جائے تو اندر سے بے شمار پولیس والوں کا قاتل نمودار ہو گا''۔

''آپ کیا کہہ رہے ہیں سر! ہم لوگ مستند حیثیت رکھتے ہیں''

''سند تو اب میں دوں گا تم لوگوں کو۔ آنکھوں میں دھول جھونکتے ہو اور وہ

بھی میرے''۔

''جناب! غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو۔ ہاں آپ تو بڑے اچھے ماحول میں رخصت ہوئے تھے۔ آپ پتہ نہیں کیوں بار بار الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے بارے میں اگر تصدیق کرنا چاہتے ہیں۔ تھوڑی سی تکلیف کیجئے آپ کبیر شاہ صاحب کو تو آپ جانتے ہوں''

''کون کبیر شاہ! اور جہانگیرہ نے کبیر شاہ کے شہر کا نام لیا''

''وہ بڑے شاہ جی''۔ اچانک ہی ایس پی کے انداز میں پھر ڈھیلا پن نمودار ہوا تو جہانگیرہ نے جیب سے کبیر شاہ صاحب کا کارڈ نکال کر ایس پی کے سامنے کر دیا۔

''جی۔ یہ ٹیلی فون نمبر ہے ان کا موبائل بھی ہے آپ کے پاس یقیناً موبائل تو ہوگا''۔

''اوہ نہیں بھئی کدھر۔ بھلا ان علاقوں میں موبائل کیا کام کرے گا''

''یہ بھی ٹھیک ہے لیکن تھانے سے تو آپ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ چلیے ہم آپ کے ساتھ تھانے چلتے ہیں۔ لیکن جواب آپ کو دینا پڑے گا کہ آپ نے ہمارا کتنا وقت ضائع کیا۔ جبکہ ہم نے کبیر شاہ کا کارڈ بھی آپ کے حوالے کر دیا تھا''۔

''اوہ نہیں بھئی۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے اصل میں پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ایک فائل موجود ہے۔ شاہ زیب نامی ایک بندے کی جو قاتل ہے۔ بوئے آسل کا رہنے والا ہے بڑے خطرناک کیسز ہیں اس پر اور بہت بڑا انعام بھی ہے ابھی یار! اگر تم لوگ خود دیکھو تو میری پریشانی کو سمجھ جاؤ گے''۔

''آپ بالکل اطمینان رکھیں ہم تو صرف آپ سے یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ اپنی ضمانت پر ہمیں تھانے لے چلیں۔ وہاں سے کبیر شاہ جی سے ہمارے بارے میں تصدیق کرلیں۔ اصل میں ہم سب انہی کے بندے ہیں اور انہی کے لیے کام کرتے

ہیں۔ سال میں کچھ دن کے لیے چھٹیاں مل جاتی ہیں تو سیر و شکار کو نکل آتے ہیں۔ یہ بھی انہی کی مہربانی ہے۔ ایک اور بات وہ یہ کہ جو گاڑیاں ہیں ہمارے پاس یہ شاہ جی کے نام پر رجسٹرڈ ہیں۔ آپ گاڑیوں کے کاغذات دیکھ لو'

''اوہو...... اوہو دکھا دے یار! تیری بہت مہربانی ہوگی۔ ذرا دل صاف ہو جائے گا''۔

شاہ زیب نے اس بات کو دل سے تسلیم کیا تھا کہ جہانگیرہ نے اس وقت اچھا کارڈ استعمال کیا ہے۔ ایس پی صاحب نے جیپوں کے کاغذات وغیرہ دیکھے اور بالکل ڈھیلے پڑ گئے۔

''بس بھئی تم لوگ خود دیکھ لو اگر میں تمہیں شاہ زیب کی تصویر دکھا دوں تو تم کہو گے کہ داڑھی رکھ کر یہ شخص بھی شاہ زیب بن سکتا ہے۔ بہر حال معافی چاہتا ہوں ٹھیک کہتے ہو کہ کبیر شاہ صاحب کے آدمی تو غلط ہو ہی نہیں سکتے''۔

''آپ تصدیق کر لیجیے۔ چلتے ہیں ہم لوگ تھانے سے زیادہ تمہیں ہمارے کھانے پینے کا بندوبست کرنا پڑے گا''۔

''اوئے نہیں یار۔ ویسے تو کوئی بات نہیں ہے تم سو دفع ہمارے مہمان بنو۔ لیکن جب شاہ جی کو یہ بات پتہ چلے گی کہ ان کا نام سننے کے باوجود ہم نے ان کے آدمیوں کو تنگ کیا تو جان عذاب میں آجائے گی۔ ہماری۔ بھئی معاف کر دینا آؤ بھئی آؤ چلیں۔'' جہانگیرہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ شاہ زیب سکتے کی سی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔

لیکن جب پولیس کی گاڑیاں نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں تو شاہ زیب نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''کیا خیال ہے ایس پی صاحب پھر واپس آئیں گے''۔

''جوڑو زانہیں مل گیا ہے۔ میرا خیال ہے۔ اس کے بعد امکان تو نہیں ہے ان کی واپسی کا''

''سارا موڈ چوپٹ کر دیا''

''ویسے تھوڑے فاصلے پر ایک جگہ میاں جی کی گڑھی کے نام سے موجود ہے کبھی گئے ہو ادھر''

''نہیں''

''اگر ہم اس طرف چلیں۔ تو ہمارا کچھ کام بن جائے گا۔ میاں جی کی گڑھی میں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ ہندو ہے۔ جیون کھالی نام ہے اس کا۔ اس سے ہمیں خانہ بدوشوں کے بارے میں مزید تفصیل معلوم ہو گی۔ اب یہاں رکنے کو دل نہیں چاہتا کیا کہتے ہو۔ چلیں اُدھر''۔

''اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں۔ جہانگیرہ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے''۔ شاہ زیب نے جواب دیا۔

''ہاں پتہ نہیں کیوں ایس پی صاحب نے کچھ دماغ خراب کر دیا ہے''

''ٹھیک ہے کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ ظاہر ہے کچھ سامان وغیرہ تو اٹھانا نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ لوگ وہاں سے چل پڑے اور پھر واقعی فاصلہ زیادہ طے نہیں کرنا پڑا۔ میاں جی کی گڑھی پہاڑوں میں گھری ہوئی چھوٹی سی آبادی تھی کوئی دو ڈھائی سو گھر ہوں گے اس آبادی میں مکانات کچے پکے بھی طرح کے تھے۔ لکڑی سے بنے ہوئے بھی۔ اور عارضی جھونپڑے بھی بستی کے بیچ و بیچ ایک چوک تھا جس کے چاروں طرف دکانیں تھیں بس یہی اس بستی کا بڑا بازار تھا۔ جب یہ لوگ بستی میں داخل ہوئے تو اندھیرا اچھا خاصا ہو چکا تھا بستی کی روشنیاں روشن ہو گئیں تھیں۔ بازار میں دکانیں بے شک کھلی ہوئی تھیں۔ لیکن دکانوں پر اکا دکا گاہک ہی نظر آ رہے تھے۔ جیون کھالی کا

مکان کافی بڑا تھا اور جب وہ باہر آیا تو شاہ زیب نے اس شخصیت کا جائزہ لیا۔ لمبے چوڑے بدن کا تند خو آدمی تھا۔ جہانگیرہ کو دیکھ کر اس سے لپٹ گیا اور پنجابی میں بولا۔

''اوہ کہاں۔ ٹائیگر...... جیل سے کب نکلے''

''تجھے کچھ پتہ بھی ہوتا ہے یار! دوستوں کے بارے میں۔ کون جیل میں ہے اور کون جیل سے باہر۔ تجھے اس سے کیا غرض ہے؟

''نہیں یارا تو کون سا جیل میں تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ مکرم شاہ جی نے مجھے حفاظت کے لیے جیل بھجوایا تھا۔ تیرے دشمن کی تو چھٹی ہو گئی۔ اب تو آزاد ہے''۔

''وہ بھی شاہ جی کا شوق ہے ورنہ تجھے معلوم ہے جیون کے اپنے دشمنوں سے میں نے کبھی منہ نہیں چھپایا''

''اوہ اندر آ بھائی! کیا باہر کھڑے ہو کر بات کر رہا ہے۔ ذرا ان لوگوں کے بارے میں تو بتا؟

''سب میرے دوست ہیں۔ کچھ کام تھا ہمیں تم سے''

''پرواہ ہی مت کرو بعد میں دیکھیں گے۔ آ جاؤ...... وہ ان لوگوں کو لیے اندر داخل ہو گیا۔ نجانے گھر کے اندر ایک عجیب سی ویرانی کیوں پھیلی ہوئی تھی۔ انہیں ایک وسیع و عریض کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ اور جیون کھالی نہیں ہر طرح کی آسائش مہیا کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس نے انہیں ہر طرح کی سہولت دی تھی۔ بہر حال جیون کھالی نے ان کی خاطر مدارت کا بندوبست کیا۔ اس کے مکان کے دو حصے تھے۔ ایک جس میں سے بچوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جیون کھالی ان کے ساتھ بیٹھ کر ان سے باتیں کرنے لگا اور باتوں باتوں میں اس نے کہا۔

''نکلے کسی کام سے ہوں گے''

''کیا'' جیون کھالی نے پوچھا

''اپنے قبیلے کی ایک لڑکی کے بارے میں جو تم نے کہا تھا کہ شکرا اسے اٹھالے گیا تھا''

''ہاں وہ حرامی بردہ فروشی بھی کرتے ہیں، لڑکیاں اور بچے اٹھا لاتے ہیں کچھ بچے مشرق وسطیٰ بھیج دیتے ہیں۔ لڑکیاں بھی مختلف جگہوں پر جاتی ہیں۔ اب اس کی فروخت کا ذریعہ اس کے پاس کیا ہے یہ مجھے نہیں معلوم۔ معلوم ہوتا تو وہیں ختم کر دیتا کتے کے بچوں کو۔ برے کاموں میں سب سے برا کام یہی ہے۔ کہ ماں بیٹیوں پر نگاہیں رکھی جائیں۔ عزت ہر ایک کی اپنی عزت ہوتی ہے''۔ جیون کھالی کی یہ بات سب کو پسند آئی تھی۔ بہر حال جیون کھالی سے اس سلسلے میں بہت سی باتیں ہوئیں اور اس نے کہا۔

''دیکھو جہانگیرہ! ہر بات صاف ہو جانی چاہیے۔ میرے پاس آئے ہو، میرے مہمان رہے ہو۔ مجھے قبول ہے لیکن تمہاری اتنی ہی مدد کر دی ہے میں نے کہ تمہیں شکرے تک پہنچا دیا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تم بس مجھ سے اس کا پتہ معلوم کرنا چاہتے تھے نا۔ تمہیں پتہ چل گیا اب اس کے بعد لال تالاب پر جو کچھ بھی کرنا چاہو وہ تم اپنے طور پر ہی کرنا ہم لوگوں کو آگے بھی گاڑی چلانی ہے۔ کوئی باقاعدہ دشمنی ہم مول نہیں لے سکتے۔ جہاں تک اپنے جھگڑوں کا معاملہ ہے وہ ہم خفیہ طور پر نمٹا لیا کرتے ہیں۔ یا کچھ لین دین کر کے حساب برابر کر لیتے ہیں۔ شکرے سے میری یہ دشمنی چل رہی ہے۔ میں دیکھ لوں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے''۔

''ہم فوراً تمہارا ڈیرہ چھوڑ دیتے ہیں۔ جیون کھالی پریشان کیوں ہو''

''نہیں اب ایسی بھی بات نہیں ہے، ابھی تو ادھر بھی وقت لگے گا اور پھر مجھے تیاریاں بھی کرنی ہیں۔ تم اگر چاہو تو یہاں رہ سکتے ہو۔ جب دل چاہے نکل جانا۔ جیون کھالی کے عمل پر اسرار تھے۔ بہر حال جہانگیرہ نے کہا۔

''اصل میں شاہ زیب ہمیں تو اپنا کام کرنا ہے۔ ہم یہاں کسی کی مہمان داری

میں نہیں آئے۔ جیسا کہ جیون کھالی کے آدمی نے تمہارے سامنے یہ اطلاع دی کہ لال تالاب پر خیمہ زنی ہو رہی ہے اور اسمگلروں کا جھمگھٹا وہاں ہونے والا ہے۔ تو بس ہمارے لیے یہی کافی ہے کہ شکرا وہاں آئے گا''۔

یہ تو ایک اچھی بات ہے ہمیں ابھی بہت سا سوچنا ہے اور بہت سے فیصلے کرنے ہیں وہاں کے ماحول سے آگاہ ہونے کے لیے اگر ہم کچھ وقت پہلے ہی نکل چلیں تو کیا ہرج ہے''۔

''کوئی ہرج نہیں ہے'' شاہ زیب نے جواب دیا۔ پھر اس رات کا کھانا تو جیون کھالی کے ساتھ ہی کھایا گیا۔ جہانگیرہ نے خود ہی اس سے بات کی تھی اور کہا تھا کہ کل صبح وہ یہاں سے نکل لے گا۔ لال تالاب کا پتہ وغیرہ بھی پوچھ لیا تھا اس نے، پھر منشیات کے خریدار کے طور پر یہ لوگ لال تالاب کی طرف چل پڑے۔

گوگا، ساون، جہانگیرہ صرف چار افراد تھے۔ باقی مجمع نہیں لگایا تھا انہوں نے ہر جگہ کا ایک عمل ہوتا ہے۔ اور وہ اس کے مطابق کام کرنا چاہتے تھے۔ یہ تمام کاروائیاں کر لی گئیں تھیں اور کوئی ایسا نشان اپنے ساتھ نہیں رکھا گیا تھا جو ان لوگوں کی نشاندہی کر دے۔ خطرناک لوگوں کے درمیان جا رہے تھے اور ہر خطرے سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لی تھی۔ جیپ کے پوشیدہ خانوں میں پہلے ہی اسلحہ چھپا ہوا تھا اور یہ خانے بھی اس قدر محفوظ تھے کہ کوئی خاص طور سے ہی دماغ لڑائے تو پتہ چل سکے کہ ایسے خانے بنے ہوئے ہیں ورنہ عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ جیپ بھی کبیر شاہ نے انہیں مہیا کی تھی اور اس کے بارے میں ساری تفصیلات بتا دی تھیں۔

بہر حال اس طرح سے تیار ہونے کے بعد وہ لال تالاب کے علاقے کی جانب چل پڑے۔ بڑی پر اسرار بات تھی اور بڑا ہی دلچسپ عمل بھی راستے بڑے عجیب

وغریب تھے۔ پہلی بار انہیں اس بات کا پتہ چلا تھا کہ اس سادہ لوح بستیوں میں ایسے عمل بھی ہوا کرتے ہیں۔ وہ اپنا یہ سفر طے کرتے ہوئے ایک چھوٹی سی بستی کے کچھ فاصلے پر رکے۔ رات ہو چکی تھی۔ یہاں کھانے پینے کا انتظام کرنا اور قیام کرنا زیادہ مناسب تھا۔ بستی میں داخلہ ضروری نہیں تھا۔ ویسے جن نشانات پر وہ سفر کر رہے تھے ان سے مطمئن تھے کہ ان کا رخ صحیح سمت ہی ہے۔ انہوں نے اپنا ڈیرا وہیں جمالیا تھا اور رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ پھر انہوں نے دور سے کھلی گاڑی کی روشنیاں دیکھیں۔ غالباً دو گاڑیاں تھیں جو اسی سمت آ رہی تھیں۔ یہ ایک چوڑی پگڈنڈی تھی جو بستی کی طرف جاتی تھی انہوں نے پگڈنڈی سے تھوڑا سا ہٹ کر گاڑی روک دی تھی۔ یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ کون لوگ ہیں لیکن دونوں گاڑیاں جب قریب آ کر رکیں تو دفعتاً ہی ان سے مسلح آدمی نیچے کودنے لگے۔ انہوں نے رائفلیں تانی ہوئی تھیں۔ پتہ چلا علاقے کا تھانیدار ہے۔ انیس خان نام تھا اس کا۔ ڈاکوؤں کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا تھا۔ بڑی بڑی ٹارچوں کی روشنی میں اس نے ان چاروں کو دیکھا اور پھر انیس آئی بولا۔

''ان میں سے کوئی ہے''

''نہیں سر جی! یہ تو بندے ہی دوسرے لگتے ہیں''

''ہاں اور تمہارا انتظار کر رہے تھے کہ تم آؤ اور تمہیں گرفتار کر لو''۔ جہانگیرہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''اوئے مطلب کیا ہوا تیرا''

''تھانیدار جی! ڈاکو ہوتے تو تمہیں دیکھ کر بھاگ نہ جاتے''

''اوئے تو پھر کون ہو''

''مسافر ہیں۔ رات ہو گئی ہے ڈیرا جمانے پڑے ہیں''

''اوئے مال شال ہے تمہارے پاس''

''چاہیے آپ کو''

''اوئے یار! تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ تجھے پتہ ہے میں تھانیدار ہوں اس علاقے کا۔ میرے ساتھ الٹی بات کرنے کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے''۔

''تو تھانیدار جی! کھلے حرف سے ہمیں ڈاکو کہہ دینا کیا اچھی بات ہے۔ ہم بھی معزز اور عزت دار لوگ ہیں''۔ جہانگیرہ نے کہا ویسے بھی اس کی شخصیت بڑی رعب دار تھی۔ تھانیدار نے ٹارچ کی روشنی اس پر ڈالی اور بولا۔

''او باؤ جی! سمجھنے کی کوشش کرو ڈاکوؤں کا پیچھا کر رہے ہیں ہم لوگ اور ہمیں خاص خبر ملی ہے کہ وہ اس بستی تک آئے ہیں۔ یہاں کچھ مشکوک لوگ ہیں۔ جن سے ہمیں نمٹنا ہے۔ اوئے یار! پوچھ لیا تو کوئی ایسی بات نہیں۔ پر بات سنو، ہم پولیس والے ہیں تلاشی لیں گے تمہاری جیپ کی۔ ٹھیک ہے''۔

''جی جی آپ پولیس والے ہیں لے لیجئے تلاشی۔ لیکن ایک بات سن لیجئے ہمیں پریشان کرنے کی جوابدہی آپ کو کبیر شاہ صاحب کو کرنا ہوگی''

''کک کیسے'' تھانیدار صاحب کی آواز تبدیلی ہو گئی۔

''کبیر شاہ صاحب کے آدمی ہیں ہم اور آپ دیکھ لیجیے یہ نشانیاں ہیں''

''اوئے یار تو برا ماننے کی کیا ضرورت ہے۔ شاہ جی کے بندوں پر بھلا کوئی ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ اوئے بھائی ہم بھی شاہ جی کے غلام ہیں پہلے نام لے لیتے۔ تو اتنی بات ہی نہ ہوتی۔ چلو خیر...... کوئی بات نہیں۔ او چھوڑو...... ارے چھوڑو...... پیچھے ہٹ جاؤ۔ یہ تو اپنے ہی بندے ہیں تو شاہ جی ڈاکو اس طرف آئے ہیں اور ہم یہ زمیندار جی کے ساتھ ان پر ریڈ کرنے جا رہے ہیں۔ زمیندار کا نام اللہ وسایا تھا اور اسی نے ڈاکوؤں کی مخبری کی تھی۔ اور ان کے ساتھ آیا تھا تھانیدار نے کہا۔

"بھائی جی! اگر تم لوگ برا نہ مانو تو تھوڑا سا وقت تمہارے ساتھ بھی گزار لیا جائے۔ کچھ کھانے پینے کا انتظام تو ہوگا تمہارے پاس"

"چائے پلائی جا سکتی ہے"

"اوئے جیو۔ ایسے میں اگر چائے بھی مل جائے تو کیا بری ہے"۔ تھانیدار نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر بولا۔

"کیوں جی۔ آپ فکر مند ہو"

"نہیں یار! میں جانتا ہوں کہ تو کتنا بڑا تھانیدار ہے"

"او بس۔ فکر ہی مت کرو۔ صبح سارے بدمعاشوں کو تمہارے سامنے باندھ کر بند کر دوں گا"۔ اس نے ایک ہاتھ اوپر کر کے مونچھوں کر بل دیا۔ تو زمیندار اللہ دسایا ہنس کر بولا۔

"مجھے پتہ ہے تیرے بارے میں، مجھے پتہ ہے، پہلے بھی تیرا وار خالی گیا۔ تھانیدار نے ایک بلند قہقہہ لگایا اور گھڑی میں وقت دیکھنے لگا اور بولا۔

"او تم لوگ اگر تھوڑی دیر آرام کرنا چاہو تو کر لو، لیکن صرف آرام کرنا گہری نیند نہ سو جانا جو سویا اس کے بارہ بجا دوں گا میں"۔ پولیس والے اپنے طور پر آرام کرنے لگے تھانیدار نے جہانگیرہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"سر جی۔ آپ بھی ہمارے ساتھ رہو بڑا مزہ رہے گا"

"دیکھ لیں گے"۔ یہ کہہ کر جہانگیرہ نے شاہ زیب کی طرف دیکھا تو شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔ مقصد یہ تھا کہ ذرا یہ تفریح بھی دیکھ لی جائے۔

بہرحال اس کے بعد آدھی رات کو سب لوگ اس طرح ہوشیار ہو گئے جیسے دن نکل آیا ہو کچھ لوگ ایک جیپ میں بیٹھے اور کچھ دوسری جیپ میں۔ دونوں جیپیں چل پڑیں۔ بستی جو دور سے قریب نظر آ رہی تھی۔ جتنا فاصلہ یہ لوگ طے کرتے جا رہے تھے

اتنی ہی دور نظر آنے لگی تھی۔ پھر کوئی ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے ہوا تھا۔ کہ کچھ افراد نظر آئے جو گھوڑے اور اونٹوں پر سوار تھے۔ وہ آ کر ان لوگوں سے مل گئے اور تھانیدار سے باتیں کرنے لگے۔ کہ پاس بھاری اسلحہ تھا دو نالی بندوقیں کچھ پرانی وضع کی رائفلیں، کلہاڑیاں اور اونچی اونچی ڈانگیں پر ڈانگ میں تیز دھار کی چمکیلی چھری چڑھی ہوئی تھی یہ لوگ ان کے ساتھ ہی چل پڑے اور نیچے ناہموار راستے پر دھول اڑاتے بستی کی جانب جا رہے تھے۔

اصل میں تھانیدار کا منصوبہ یہی تھا کہ اندھیرے میں نہایت خاموشی سے بستی کا محاصرہ کر لیا جائے اور رات کے پچھلے پہر اس طرح اچانک گھروں پر چھاپہ مارا جائے کہ بستی والے بے خبر رہے ہوں۔ تاکہ کسی ملزم کو فرار کا موقع نہ ملے اور سب کو آسانی سے حراست میں لے لیا جائے۔

بہرحال یہ لوگ اپنے فاصلے طے کر کے آگے بڑھتے رہے۔ جہانگیرہ، شاہ زیب وغیرہ سب سے پیچھے تھے۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ بستی کے قریب پہنچ گئے۔ گاؤں کے اردگرد جنگل اور گھنی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ جن کے درمیان کہیں کہیں ٹیلے اور ٹبے نظر آ رہے تھے۔ ان لوگوں کو تو اندازہ بھی نہیں تھا۔ کہ یہ ٹیلے اور ٹبے ان لوگوں کے لیے کس مصیبت کا آغاز بننے والے ہیں اندازہ یہ ہوا کہ بستی والوں کو پولیس کے چھاپے کی سن گن مل گئی تھی۔ وہ نہ صرف چوکس اور چوکنے تھے بلکہ پولیس اور اس کے مددگاروں کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ وہ پتھروں کی ڈھیریاں لگائے بیٹھے تھے اور انہوں نے اپنے طور پر دیہی ہتھیار تیار کر رکھے تھے۔ جیسے گوپھنس اور سانگھیاں وہ فصلوں اور باغوں سے پرندوں کو بگانے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ اس وقت ان کے لیے ایک موثر ہتھیار بنی ہوئی تھیں۔ بہت سوں کے پاس تو غلیلیں تھیں جن کے ذریعے دور نشانے پر تاک کر مارنے کے لیے انہوں نے مٹی کی

گولیاں تیار کیں تھیں۔ جن کو بھٹی میں پکا کر پختہ اور مضبوط کر لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ عورتیں اور بچے مکانوں کی دیواروں پر بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے بھی چھوٹے بڑے پتھروں کی ڈھیریاں بنا رکھی تھیں۔ معذور اور بیمار کو چھوڑ کر بستی کے سب بوڑھے بھی سرگرم نظر آ رہے تھے وہ گھروں کے دروازوں پر بیٹھ کر حقے کے کش لگا رہے تھے۔ کھانس رہے تھے کھنکار رہے تھے اور انہی آوازوں سے یہ احساس ہوا تھا کہ یہ لوگ بے خبر نہیں ہیں۔

دفعتاً شاہ زیب کو یاد آیا کہ جیون کھالی نے ایک ایسی بستی کا تذکرہ تھا جہاں اسمگلروں کی رہائش گاہ ہوتی ہے وہ عام قسم کے دیہاتی بن کر وہاں رہتے ہیں۔ لیکن ویسے سبھی طرح کے اسمگلر ہیں اور اس وقت یہ اسمگلر جاگ رہے تھے اور رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ آسمان پر ستاروں کے کنول جگمگا رہے تھے۔ ہوا سرسراتی سروں سے گزر رہی تھی اور سب چوکنی نگاہوں سے بار بار گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ جو مختلف سمتوں سے گاؤں کی طرف آتے تھے۔ پھر شمال میں تیز روشنی ابھری جو رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں اور آوازیں ابھرنے لگیں۔ بستی پر گہرا سکوت طاری تھا۔ عورتیں چھتوں کی منڈیروں کی اوٹ میں دبک گئی تھیں۔ بستی کے نوجوانوں نے مورچے سنبھال لیے تھے۔ بوڑھوں نے گھروں میں گھس کر دروازے بند کر لیے تھے اور ایسی خاموشی طاری کر دی تھی جیسے کوئی جاگ نہ رہا ہو۔

بہر حال یہ لوگ آگے بڑھتے رہے۔ سب سے آگے والی جیپ میں تھانیدار اور پولیس کے سپاہی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ جیپیں درختوں کے جھنڈ کے نیچے رک گئیں۔ جیپوں کے رکتے ہی گھوڑے سوار اور اونٹ بھی رک گئے۔ جیپوں کی روشنی تو پہلے ہی بجھالی گئیں تھیں۔ سب سے پہلے تھانیدار باہر آیا اور اس کے باہر آتے ہی دوسرے بھی جیپوں اور گھوڑوں سے اتر کر نیچے آ گئے۔ سب اس کے اردگرد اکٹھا ہو گئے

تھے۔ اس نے ایک ڈرائیور کو جیپوں اور گھوڑوں کی اور اونٹوں کی نگرانی پر معمور کیا دوسروں کو ساتھ لیا ضروری ہدایات دیں اور آگے بڑھا۔ سب کچے راستوں پر چلتے ہوئے آہستہ آہستہ بستی کی جانب چل پڑے تھے۔

لیکن جہانگیرہ اور شاہ زیب وغیرہ نے ان کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ البتہ انہوں نے ایک ایسی جگہ سنبھالی لی تھی۔ جہاں سے وہ اس دلچسپ مقابلے کو دیکھ سکتے تھے۔ تھانیدار اپنے ساتھیوں کو مورچہ بند کرا رہا تھا۔ اس کی خاموش نگاہیں بار بار گاؤں کی جانب اٹھ جاتیں۔ گاؤں بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی طاری تھی یہاں تک کہ تھانیدار گاؤں کے بالکل قریب پہنچ گیا اور پھر جیسے ہی گاؤں کی حدود میں داخل ہوا۔ اچانک ہاتھوں سے زور زور سے سیٹیاں بجنے لگیں عورتوں اور بچوں کے حلق کے اندر سے طرح طرح کی آوازیں نکلنے لگیں رات کے سناٹے میں ان کا شور اس قدر پر ہول اور خوفناک تھا کہ تھانیدار اور سپاہیوں پر سراسیمگی اور گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ وہ ٹھٹھک کر رک گئے۔ حالانکہ تھانیدار خاصا دلیر آدمی تھا۔ ڈاکوؤں اور خطرناک مجرموں کے خلاف کتنے ہی سنگین معرکے سر کر چکا تھا۔

بہر حال اس نے خود کو سنبھالا پلٹ کر رائفل سردار کانسٹیبلوں کی طرف دیکھا اور ہوائی فائر کرنے کا حکم دیا۔ چار پانچ فائر کیے گئے تھے کہ تمام آوازیں ایک دم بند ہو گئیں اور ہر طرف سناٹا طاری ہو گیا۔ تھانیدار کو اس بات کا اندازہ تو ہو چکا تھا کہ صورتحال گڑبڑ ہے اور وہ لوگ ہوشیار ہیں۔

بہر حال پھر بھی وہ اپنی جمعیت کے ساتھ آگے بڑھا لیکن جب اس کے ساتھی آبادی کے درمیان پہنچے لیکن ایک بار پھر زور زور سے سیٹیاں بجنے لگیں اور ان آوازوں کے ساتھ پتھروں کی بارش ہونا شروع ہو گئی۔ وہ سب بالکل کھلی جگہ پر کھڑے ہوئے تھے۔ پتھر کھٹا کھٹ ان کے جسموں سے ٹکرانے لگے کوئی بھی ان کی زد سے محفوظ نہ رہا۔

پتھر نوکیلے تھے اور ان میں ایک ایسی تیز دھار تھی کہ جسم کے جس حصے پر لگتے اسے زخمی کر دیتے۔ ایک بھاری پتھر تھانیدار کی پیٹھ پر لگا۔ اور وہ بے قرار ہو کر پلٹا۔ اسی وقت مٹی کی پختہ گولیاں چلنے لگیں اور ان گولیوں نے تو حشر ہی کر دیا وہ سب کے سب تکلیف سے بلبلانے لگے ایک گولی شاید اس زمیندار کے کندھے پر لگی تھی جو ان کا مخبر بھی تھا زمیندار کندھا پکڑ کر نیچے بیٹھ گیا۔

دوسرے بھی پتھروں کی چوٹوں سے نہ بچ سکے۔ جو نوکیلا پتھر تھانیدار کے سر پر اس طرح لگا کہ اس کی ٹوپی گر گئی اور سر جھنجھنا اٹھا آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ لیکن پھر بھی اس نے ہمت سے کام لیا، ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھی اور سب کو لیٹ جانے کا حکم دیا سب جلدی جلدی پیٹ کے بل لیٹ گئے اور پتھر اور مٹی کی پختہ گولیوں کی زد سے بچنے کے لیے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے چھپانے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن فرش پر لیٹ جانے سے کام نہیں بنا تھا۔ ان پر مسلسل پتھراؤ ہو رہا تھا اور پتھر ان کے سروں پر، گردن پر، ٹانگوں پر غرض یہ کہ جسم کے ہر حصے پر کھٹا کھٹ گر رہے تھے۔ زخم پہ زخم لگا رہے تھے۔ پتھروں کے انبار لگتے جا رہے تھے۔

بہرحال جوابی کاروائی کے طور پر انہوں نے کئی بار پتھر اٹھا کر مارنے کی بھی کوشش کی مگر کوئی نظر آتا تب نا۔ گاؤں والوں نے پوری طرح ان کے استقبال کا بندوبست کیا تھا۔ جہانگیرہ، شاہ زیب اور ان کے دونوں ساتھیوں نے اپنے بچاؤ کا معقول بندوبست کر لیا تھا اصل میں ذمے داری تو ان کی تھی نہیں وہ تو بس پولیس والوں کے ساتھ یہاں تک چلے آئے تھے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا تھا انہیں کہ اسمگلروں کی اس بستی کا انہوں نے جائزہ لے لیا تھا جس کے بارے میں جیون کھالی نے انہیں معلومات فراہم کیں تھیں ہیں۔ جہانگیرہ اور شاہ اپنے ذہن میں مختلف منصوبہ بنایا کر رکھتے تھے جہانگیر بہت زیادہ تو نہیں کھلا تھا لیکن اتنی بات اس نے صاف بتا دی تھی کہ جے کال،

کبیر شاہ کا بہت بڑا حریف ہے۔ اور کبیر شاہ اپنے معاملے میں جے کال سے سخت دشمنی رکھتا ہے۔

بہرحال شاہ زیب، کبیر شاہ کے ہاتھوں کی لمبائی تو دیکھ ہی چکا تھا۔ پولیس والے اسے پہچاننے کے باوجود اس طرح موم ہو گئے تھے جیسے ساری دشمنی بھول گئے ہوں۔ اس وقت صورتحال ایسی تھی کہ کبیر شاہ جیسے آدمی کی حیثیت پناہی حاصل کی جائے۔ اس سے فائدے ہی فائدے تھے۔

بہرحال اس وقت تھانیدار پر بہت برا وقت آ پڑا تھا۔ وہ سخت الجھن میں مبتلا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ واپس پلٹتا تو شدید بدنامی کا سامنا کرنا پڑتا اور اس کے بعد اس کی جو دھاک بیٹھی ہوئی تھی وہ ختم ہو جاتی فائرنگ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ جس طرح ان لوگوں نے اپنے آپ کو مورچہ بند کر رکھا تھا، اس سے اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا تھا۔ ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ دیہاتیوں نے ایک اور مصیبت نازل کر دی۔ انہوں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق سیٹیوں اور خوفناک آوازوں اور پتھراؤ کے ساتھ ساتھ گھنی جھاڑیوں بھیڑیں اور بکریاں دوڑانا شروع کر دیں ان کے پیروں کی آہٹوں سے یہ تاثر ابھرا جیسے بہت سے لوگ نقل و حرکت کر رہے ہیں اور بلاشبہ ان کا خوفناک ردعمل ہوا۔

تھانیدار کے پاس زیادہ افراد نہیں تھے جبکہ پورا گاؤں اس کے مقابلے پر تھا ایک طرف پتھروں کی زبردست بارش اور دوسری طرف اتنے سارے قدموں کی آوازیں تھوڑی دیر کے بعد تو یہ لوگ بھی خوفزدہ ہو گئے تھے۔ جہانگیرہ نے فوراً ہی کہا۔

''شاہ زیب کیا ہم یہاں بیوقوفی نہیں کر رہے ہم آخر ان کے پیچھے لگے یہاں کیوں چلے آئے ہیں''۔ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک بھاری پتھر ان کے قریب آ کر گرا تھانیدار نے پلٹ کر ادھر دیکھا اور اسی وقت دو دیہاتی سامنے سے نظر آئے ان

میں سے ایک غلیل چلائی جس میں مٹی کی ایک گولی تھانیدار کے اس طرح لگی کہ وہ چکرا کر رہ گیا۔ گولی اس کے سر میں کنپٹی کے قریب لگی تھی خون کی ایک دھار رستی ہوئی اس کے رخسار کو تر کرتی ہوئی گردن تک پہنچ گئی۔ ابھی وہ سنبھلا بھی نہیں تھا۔ کہ اس کے آدمیوں کے بھی بہت سی گرلیاں پڑیں اور وہ پلٹ کر بھاگنے لگے۔ تھانیدار نے گھبرا کر فائرنگ کا حکم دیا۔ اپنا پستول نکال کر خود بھی گولی چلائی۔ لیکن کسی کو پتہ نہیں تھا کہ وہ کس پر گولی چلا رہا ہے۔ لیکن اس اندھا دھند فائرنگ کا نتیجہ ضرور نکلا کہ پتھروں کی بوچھاڑ سست پڑ گئی۔ سپاہیوں کے قدم پہلے ہی اکھڑ چکے تھے۔ تھانیدار نے پسپا ہونے میں ہی عافیت سمجھی۔ وہ رک رک کر فائرنگ کرتا ہوا اٹھا اور بھاگنا شروع کر دیا۔

پھر تو ایسی بھگدڑ مچی کہ جس کا منہ جدھر اٹھا ادھر ہی منہ کر کے بھاگ اٹھا۔ دوسری طرف پتھراؤ ایک بار پھر تیز ہو گیا تھا پتھروں اور مٹی کی گولیاں سہتے تکلیف سے بلبلاتے وہ لوگ درختوں کے اس جھنڈ کی جانب دوڑنے لگے۔ جہاں چھوڑ جیپیں چھوڑ آئے تھے۔ گھوڑے اور تھے۔ چنانچہ وہ بغیر رکے ہوئے مسلسل دوڑتے رہے اور درختوں کے جھنڈ تک پہنچنے پر ہر شخص پریشان اور بدحواس تھا۔ سب بری طرح ہانپ رہے تھے زخمی تھے......

کسی کو ہلکے زخم لگے تھے کسی کو گہرے...... بدن پسینے میں شرابور تھے لباس خاک میں لتھڑے ہوئے۔ سروں کے بال بکھرے ہوئے۔ گھبراہٹ اور بھگدڑ میں کسی کی ٹوپی اور کسی کا جوتا غائب ہو گیا تھا۔ وہ لوگ اس طرح اپنی اپنی گاڑیوں، گھوڑوں اور اونٹوں پر بیٹھ کر بھاگے کہ کسی نے جہانگیرہ وغیرہ کی طرف توجہ بھی نہیں دی۔

جہانگیرہ نے خود بھی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی جیپ اسٹارٹ کی اور اسے ریسورس کر کے دور تک لیتا چلا گیا اس کے بعد اس نے سیدھا کر کے اس نے ایک دم رخ تبدیل کیا۔

تھانیدار وغیرہ تو اپنی بستی کی طرف ہی بھاگے تھے۔ یعنی جہاں سے انہوں نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ لیکن جہانگیرہ نے لال تالاب کی طرف رخ کیا تھا۔ ویسے بھی ان لوگوں کے حلیے وغیرہ بالکل درست تھے۔ چونکہ انہوں نے اس معرکے میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا تھا اور جب کہ تھانیدار اور سپاہی پتھروں اور مٹی کی گولیوں سے خاصے زخمی ہو گئے تھے۔

بہر حال جہانگیرہ کی جیپ تیز رفتاری سے کام کرتی رہی اور جب صبح کی روشنی پھوٹی تو وہ تالاب کے قریب تھے۔ ویسے تو جیون کھالی نے انہیں ساری لوکیشن سمجھا دی تھی۔ لیکن لال تالاب کے بجائے پہلے انہوں نے ان خیموں کو دیکھا تھا جو بڑی ترتیب سے جگہ جگہ آباد ہو رہے تھے۔ یہ ترتیب ان لوگوں کو بے حد پسند آئی۔ غالباً ہر گروپ کے اپنے خیمے تھے اور ان کے رنگ و روپ بھی الگ الگ تھے۔ جہانگیرہ نے کہا۔

''شاہ زیب ایک بات ہم جیون کھالی سے پوچھنا بھول گئے۔ خیموں کا یہ شہر آباد کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ ہم یہ خیمے کہاں سے حاصل کر سکتے ہیں''۔

''وہ اس طرف''۔ شاہ زیب نے اس طرف اشارہ کیا۔ ایک بینر صبح کے دھندلکے میں نظر آ رہا تھا جس پر لکھا تھا۔

''کیمپنگ ورلڈ۔ یہاں ہر طرح کے خیمے کرائے پر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

جہانگیرہ نے بھی یہ جملہ پڑھا اور مسکرا کر بولا۔

''چلو۔ یہ مشکل بھی حل ہو گئی۔ اب ہم منشیات کے اسمگلر ہیں۔ کیا سمجھے''۔

شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے ادھر دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ جیپ آگے بڑھ کر کیمپنگ ورلڈ کے پاس پہنچ گئی۔ اس وقت بھی وہاں کا کاؤنٹر کھلا ہوا تھا اور خیمے اشو کیے جا رہے تھے اس کا مطلب تھا کہ اچھی خاصی ہنگامہ آرائی ہوتی ہے یہاں۔

بہر حال یہ ساری باتیں اپنی جگہ ایک الگ نوعیت کی حامل تھیں کاؤنٹر سے

خیموں کے بارے میں بات کی گئی۔ کوئی مشکل ہی پیش نہ آئی سوائے ادائیگی کرنے کے، ادارے کے آدمی نے خود ان کی پسند کی جگہ خیمے نصب کرائے صرف دو خیمے کرائے پر حاصل کیے گئے تھے۔ زیادہ کی ضرورت ہی نہیں تھی ایک میں جہانگیرہ اور شاہ زیب نے اپنے لیے بندوبست کیا اور دوسرے میں ساون وغیرہ کے لیے۔ کھانے پینے کی اشیاء کا بھی یہاں معقول بندوبست تھا اور صبح کا ناشتہ حلوہ پوری کی شکل میں تیار کیا جا رہا تھا جس کی خوشبو فضا میں بلند ہو رہی تھی۔ جہانگیرہ نے کہا

''یار! میرے خیال میں تو شاید شاہ جی کو بھی منشیات کے اس میلے کے بارے میں کچھ معلومات نہیں ہیں''۔ شاہ زیب نے کہا۔

''ایک بات بتائیے جہانگیرہ جی''

''پوچھو''

''کیا حکومت کو اس بارے میں بالکل نہیں معلوم۔ گاؤں، دیہاتوں وغیرہ میں جو میلے لگتے ہیں۔ ان کے لیے بہر حال ایک اجازت نامہ حاصل کیا جاتا تھا۔ کیا اس میلے کا اجازت نامہ بھی حاصل کیا۔ جہانگیرہ ہنسنے لگا پھر بولا۔

''شاہ زیب جی! آپ کے بارے میں بڑی کہانیاں مشہور ہیں۔ بڑے کام سرانجام دیئے ہیں آپ نے لیکن آج دل کی بات بتاؤں آپ کو، آپ کو پہلی بار دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی کہ آپ جرم کی دنیا میں اتنے آگے کیسے نکل گئے۔ آپ کا چہرہ تو ایک کالج اسٹوڈنٹ کا چہرہ ہے۔ پتہ نہیں اس معصوم چہرے کے پیچھے وہ کون سا تجربہ چھپا ہوا تھا۔ جس نے آپ کا خوف بے شمار دلوں پر بٹھا دیا اور اتنے آگے بڑھ گئے۔ اس وقت آپ کی یہ بات بڑی معصومیت سے تعلق رکھتی ہے۔ ارے بابا یہ تو جنگل ہے یہاں سرکاری آدمیوں کا گزر تک نہیں ہوتا۔ ایسے میلے آپ کے شہروں کے بیچ و بیچ لگائیں وہی سب کچھ کریں جو یہاں ہونے والا ہے۔ بس آپ کو کچھ ہاتھوں کی گرمی قائم رکھنا ہوگی

بات سمجھ میں آجائے تو ٹھیک ہے اس سے زیادہ میں وضاحت نہیں کر سکتا۔ اس موقع پر آپ کو حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ اس کا ٹیکس ذمے داروں کی جیبوں میں جا چکا ہوگا اور ہمیشہ ہی جاتا رہا ہوگا آپ کو پتہ ہے۔ ایسے کام سرپرستی کے بغیر نہیں چلتے۔ اصل میں بات وہی ہے نا کہ کبیر شاہ تو انٹرنیشنل آدمی ہیں۔ دنیا کے گوشے گوشے میں کام کرتے ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کی کوئی توجہ نہیں ہے۔ بہر حال ساری باتیں اپنی جگہ مجھے یہ طریقہ کار بہت اچھا لگا ہے اور اب ہم منشیات کے اسمگلر ہیں۔ لیکن بیچنے والے نہیں خریدنے والے۔ البتہ شاہ زیب جی ایک بات میں آپ سے ضرور کہنا چاہتا ہوں۔

''ہاں کہو''۔ شاہ زیب نے کہا

''دیکھیے پہلے بھی یہ بات آپ کو ہلکے پھلکے انداز میں بتا چکا ہوں کہ اس وقت دنیا بڑے عجیب رنگ میں رنگی ہوئی ہے جو شخص دوسروں کے بارے میں کچھ سوچنے اور بہتری کا خواہش مند نظر آتا تھا یا تو وہ بالکل بیوقوف ہے یا پھر بہت زیادہ خطرناک اس کی بیوقوفی یہ ہے کہ اس دور میں بھی وہ کسی دوسرے کی بہتری کے لیے سوچتا ہے اور یہ چالاکی یہ ہے کہ اس کے پس پردہ اس کا اپنا بھی کوئی مفاد ہوتا ہے۔ میری بات آپ سمجھ رہے ہیں نا۔ اور جیون کھالی نے ہمیں اپنے بارے میں بتایا ہے اور یہ بات تو طے ہے کہ جیون کھالی یہاں آئے گا اور شکرے کی تاک میں آئے گا اور یہاں شکرا ہماری ضرورت بھی ہے یعنی یہ کہ ہمیں اس سے راہ و رسم بڑھا کر جے کال کی تلاش کرنا ہے سمجھ رہے ہیں نا آپ شکرے تک پہنچنے کا ایک راستہ جیون کھالی کے سینے پر سے گزرتا ہے۔

شاہ زیب نہ سمجھنے والے انداز میں جہانگیرہ کو دیکھنے لگا تھا جہانگیرہ نے مسکرا کر کہا۔

''مکرم شاہ نے میری تربیت کی ہے شاگرد ہوں میں ان کا۔ ہر جگہ انہوں نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر مجھے مشکلوں سے بچایا ہے اور دنیا سے روشناس کرایا ہے اسی

تجربے کی بنا پر یہ بات کہہ رہا ہوں اس وقت دنیا کا ہر آدمی سب سے پہلے اپنا مفاد سوچتا ہے جیون کھالی ہمارا نہ رشتے دار ہے نہ دوست یہاں تک کہ ہمارا ہم مذہب بھی نہیں ہے ہم جیون کھالی کو اپنا چارہ بنا کر شکرے تک پہنچ سکتے ہیں''۔

شاہ زیب نے چونک کر جہانگیرہ کو دیکھا لیکن ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن پر عجیب سے تاثرات ہوئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس دنیا میں وہ داخل ہو چکا تھا وہ دنیا اسی طرح کی تھی۔ اس سے گریز ناممکن تھا اور گریز کر کے کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ جس مقصد کے لیے اس نے اپنے آپ کو ایک مجرم بنایا تھا وہ ایک مسلم حقیقت تھی۔ دنیا جب انسان سے اس کی پسند کی زندگی کا حق چھین لے تو پھر یہی ہونا چاہیے جو شاہ زیب نے کر ڈالا تھا۔ ایک مکمل برا آدمی بننے میں اب کیا دقت رہ گئی۔ اس کے ہاتھ بے شمار انسانوں کے خون سے رنگ چکے تھے لاکھ وہ اپنی بے گناہی کا رونا روتا رہے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جہانگیرہ نے کہا

''میری بات پر غور کر رہے ہو''

''ہاں''۔ وہ بھاری لہجے میں بولا۔

''فیصلہ کب کرو گے''

''نہیں جہانگیرہ فیصلہ کرنے کے بعد بندوق اٹھائی ہے''

''جیو...... بندوق سے بہتر ساتھی اور کوئی نہیں ہے یہ تمہارے ہاتھ میں ہوگی تو گردنیں تمہارے سامنے جھکی رہیں گی۔ ورنہ کچھ بھی نہیں ہوگا''۔

''ٹھیک کہتے ہو۔ بالکل ٹھیک کہتے ہو''۔ شاہ زیب نے اپنا ذہن بالکل تبدیل کر لیا۔

خیموں کا شہر آباد ہو چکا تھا بھانت بھانت کے چہرے نظر آ رہے تھے۔ ایک عجیب و غریب دنیا تھی۔ اس میں خریدار بھی تھے اور دوکاندار بھی۔ دلال بھی پھر رہے

تھے اور ایک دلال نے ان سے کہا۔

''مال لائے ہو''۔ جہانگیرہ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''پولیس کے مخبر ہو''

''یہاں پولیس کے مخبروں کو گولی مار دی جاتی ہے۔ ایک جگہ بنالی گئی ہے اس طرف جسے تم احتجاجی قبر بھی کہہ سکتے ہو یہ پولیس کے مخبروں کے لئے ہی ہے وہ یہاں ہوتے نہیں ہیں اور اگر آ جاتے ہیں تو واپس نہیں جاتے معاہدہ ہے''۔

''خریداری کرنی ہے''

''ہوئی نا بات میرا نام اشتیاق بیگ ہے۔ لیکن کس طرح کا مال خریدنا چاہتے ہو''۔

''خیمہ کدھر ہے تمہارا''۔ جہانگیرہ نے دبے بغیر پوچھا۔

''وہ اس طرف''

''فوراً اپنے خیمے میں واپس چلے جاؤ۔ ضرورت ہوئی تو تمہیں بلا لیا جائے گا''۔ جہانگیرہ کی گرجدار آواز اور اس کا انداز دیکھ کر دلال مسکرایا اور بولا۔

''یاد رکھنا اشتیاق بیگ کو''

''تیسری بات نہیں جاؤ......'' جہانگیرہ غرایا اور وہ کان دبا کر چلا گیا۔

شاہ زیب بغور جہانگیرہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر دو یا تین دن اور گزر گئے۔ کسی طرح کی کوئی کمی نہیں تھی یہاں بس رقم درکار ہوتی تھی۔ جیون کھالی کو دکھایا گیا جو اپنے آٹھ افراد کے ساتھ اور پھر خانہ بدوش شکرا بھی نظر آیا جو جیون کھالی کے بالکل مخالف سمت کافی فاصلے پر خیمہ زن ہوا تھا۔ اس کے بارے میں معلومات حاصل کر لی گئیں۔

دلال اشتیاق بیگ اکثر ان کے اردگرد منڈلاتا رہتا تھا۔ کام شروع ہو گیا

تھا۔ گاڑیاں آتیں واپس چلی جاتیں ایک عجیب پراسرار زندگی تھی جو بڑی سنسنی خیز نوعیت کی حامل تھی۔ شکرا بھی مال لایا تھا۔ جہانگیرہ نے اشتیاق بیگ سے کہا۔

''مال کے نمونے مل سکتے ہیں''

''اشارہ کر لے جا کر مال دکھا دیا جائے''

''وہ سامنے کون ہے؟''

''شکرا''

''سنا ہے اس کا مال اچھا ہوتا ہے''

''اور بھی بہت سوں کے پاس اچھا مال ہوتا ہے۔ میں تمہیں شکرا کے پاس لے چلوں''۔

''چلو''

''صرف مال دکھانے کی فیس اور بعد میں دو پرسنٹ کمیشن''

''مال دکھانے کی فیس کیا ہوگی''

''ہزار روپے۔ معمولی سی بات ہے''۔ جہانگیرہ نے ہزار کا نوٹ نکال کر اشتیاق بیگ کے حوالے کیا اور وہ ایک دم پرادب ہو گیا۔

''تو آپ تشریف لایئے نا جناب! دیر کیوں کر رہے ہیں''۔ انہوں نے شکرے کو دیکھا ایک خطرناک صورت آدمی تھا۔ کالا رنگ بڑی بڑی مونچھیں اور بڑی بڑی آنکھیں جسم بھی لمبا چوڑا تھا خود آ کر ان لوگوں سے ملا تھا۔

''کیا کیا چاہیے؟''

''نمونہ۔ اشتیاق بیگ تم جاؤ ہم لوگ معاملہ خود طے کر لیں گے اور جو بھی طے ہوگا اس کا کمیشن تمہیں مل جائے گا''

''ایمان داری کے ساتھ۔ لیکن میں شریک رہتا تب بھی کوئی ہرج نہیں تھا ہم

لوگ پیٹ کے پکے ہوتے ہیں''

''جب وہ کہتے ہیں کہ جاؤ۔ تو تم بھاگ جاؤ''۔ شکرا غرایا اور اشتیاق بیگ ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ لیکن کوئی سوگز کے فاصلے پر جا کر وہ پتھر کے ایک ٹکڑے پر بیٹھ گیا۔

''حرامی دلال''۔ شکرے نے کہا پھر بولا۔

''ہاں بولو''

''کالا سونا''

''افیم''

''ہاں''

''خالص ملے گی۔ کتنی چاہیے''

''چھوٹے بیوپاری ہیں۔ ابھی آغاز کیا ہے کم سے کم''

''کہاں بیچتے ہو''

''شہر میں''

''اڈا ہے کوئی''

''نہیں''

''پولیس سے یاری ہے''

''ابھی نہیں''

''تو پھر کیوں مشکل میں پڑ رہے ہو دماغ خراب ہے تمہارا کتنے بندے ہیں صاحب''

''چار افراد ہیں بس ہم''

''الو کے پلو مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ چار پیسے کماؤ گے نہیں پولیس کے ہاتھ

لگ گئے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ کوئی سر پرستی لے لو اس کے بعد کام کرو''

''بات اصل میں یہ ہے شکرے! کہ دوستوں کے دوست ہیں زندگی میں بہت کچھ کر کے دیکھ لیا کچھ نہیں ملتا تو سوچا کہ یہ دھندہ کر لیا جائے۔ اب تم خود دیکھو لال تالاب تک پہنچنا کتنا مشکل کام ہے لیکن پہنچ گئے ہم''۔

''ہاں ہاں یہ بات تو مانتا ہوں لال تالاب پر جی دار ہی آتے ہیں''

''ویسے تمہارے لیے ایک پیغام بھی ہے۔ اسی لیے دلال کو بھگا دیا ہے''

''پیغام''

''ہاں''

''وہ کیا؟''

''پہلے تمہیں ایک وعدہ کرنا ہوگا شکرے!'' جہانگیرہ بولا اور شکرا غور سے اسے دیکھنے لگا پھر بولا

''بندہ تو پکا لگتا ہے بول کیا وعدہ ہے''

''ہماری نیت پر شک نہیں کرو گے۔ پہلے ساری حقیقت معلوم کر لو گے اس کے بعد جو کچھ بھی کرنا ہے کرو گے''

''ٹھیک ہے وعدہ کرتا ہوں''

''شکرے! تم نے ایک بات بالکل ٹھیک کہی۔ ہمیں کسی کی سر پرستی چاہیے۔ یہ کاروبار ہمیں کرنا نہیں آتا بس یوں سمجھ لو جھنجھلا کر اس طرف متوجہ ہوئے ہیں اور اپنی بساط سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ کسی نے ایک پتہ بتایا تھا۔ لیکن وہ بندہ اپنی پسند کا نہیں ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ نہیں ملنا چاہتے۔ تمہارے بارے میں معلومات حاصل کر چکے ہیں۔ یہ بتاؤ سر پرستی کرو گے ہماری۔ شکرا حیرت سے جہانگیرہ کو دیکھنے لگا۔ پھر اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

''مخبر ہو''

''مخبروں کا قبرستان ہم دیکھ چکے ہیں''

''یہی بتانے والا تھا میں''

''کہا نا مخبر نہیں ہیں''

''ہوں...... پھر شکرے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی''۔

''ایک بندے سے ملے تھے اسی نے سر پرستی کے سلسلے میں نام تھا جیون کھالی'' الفاظ جہانگیرہ نے ادا کیے تھے۔ شاہ زیب نے شکرے کے چہرے پر نگاہیں گاڑھ دی تھیں۔ شکرا بری طرح چونکا تھا۔

''ہاں پھر''۔ اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا

''جیون کھالی نے سر پرستی تو نہیں کی۔ البتہ ایک کام سونپ دیا''

''کیا''

''اس نے کہا کہ لال تالاب جائیں اور شکرے کو قتل کر دیں اگر اس میں کامیاب ہو گئے تو وہ ہماری سر پرستی کرے گا۔ وجہ اس نے بتائی کہ شکرے نے اس کے خاندان کی ایک لڑکی اٹھالی تھی۔ کہنے سننے پر واپس تو کر دی لیکن لڑکی خراب کر دی گئی تھی۔ جیون کھالی نے اسے قتل کر دیا اور اس وقت سے وہ شکرے کے لیے دل میں انتقام کی آگ پال رہا ہے وہ اسے قتل کرا دینا چاہتا ہے''۔ شاہ زیب شکرے کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ چہرے کے نقوش نرم پڑ گئے۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

''میں فلمی ہیرو نہیں ہوں کہ گنڈاسہ لے کر کھڑا ہو جاؤں۔ کہ اوئے میں تیری ہڈیاں توڑ دوں گا۔ دشمن پر غور کرنا چاہیے۔ اس کے بارے میں کبھی کچے انداز میں نہیں

سوچنا چاہیے۔ اسی میں جیت ہے وہ حرامی اتنی ہی بری بات سوچ سکتا ہے۔ ہم لوگ لڑکیاں فروخت کرتے ہیں مال خود ہی خراب کر دیا جائے تو اسے کون خریدے گا۔ جب اس الو کے پٹھے نے بتایا کہ لڑکی اس کے قبیلے کی ہے۔ تو ہم نے عزت کے ساتھ اسے واپس کر دیا۔ خود چونکہ برا آدمی ہے۔ اس لیے اچھی بات سوچ ہی نہیں سکتا۔ لڑکی مار ڈالی اس نے ہم نے اپنا کام کر دیا تھا اب آگے اس کی مرضی تھی کہ وہ جو کچھ بھی کر لے لیکن اس نے دل میں سوچا ہے۔ وہ تو ناممکن ہے شکرے کو مارنا اس کے بس کی بات نہیں ہے تو اس نے تم لوگوں کو یہ آفر دی تھی کہ اگر تم مجھے قتل کر دو تو وہ تمہیں اپنی سرپرستی میں لے لے گا''۔

''ہاں''

''مگر تم نے مجھے کیوں یہ بات بتا دی''

''جب اس نے ہمیں یہ پیشکش کی تھی اسی وقت ہم نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کے لیے ہم یہ کام نہیں کریں گے۔ ہمیں وہ ایک اچھا آدمی نظر نہیں آیا۔ تم سچ پوچھو تو شکرے یہاں تک ہم آئے ہی تمہارے لیے تھے۔ بات وہی آ جاتی ہے ہم بھی سرپرستی چاہتے ہیں۔ یہ میرا جو بندہ ہے نا یہ ایک پڑھا لکھا آدمی ہے۔ لاہور کی زرعی یونیورسٹی میں پڑھتا رہا ہے اس کے ساتھ بھی ایسے حالات پیش آئے کہ یہ بھی دنیا سے بےزار ہو گیا اور اس لائن میں نکل آیا۔ چھوٹے موٹے کام کر رہا تھا کہ مجھے نظر آ گیا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ شامل کر لیا اور اب ہم کسی کی نگرانی میں آ کر کام کرنا چاہتے ہیں''۔

''ہوں''۔ شکرا پرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔ پھر بولا

''بندے تم کام کے ثابت ہو سکتے ہو۔ میرے لیے، لیکن میرے ساتھ نہیں رہو گے شہر میں رہو گے میرے لیے کام کرو گے۔ مقصد پیسہ ہے نا جتنا مانگو گے مل جائے گا۔ بادشاہ بنا دوں گا بادشاہ''۔

جہانگیرہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

''اب یہ بتاؤ جیون کھالی کا کیا کرو گے''

''سوچنا پڑے گا اس کے بارے میں تم لوگ بےفکر رہو تم نے اپنا کام کر دیا اب باقی میرا کام ہے۔ ویسے میں تمہیں ایک مشورہ دوں۔ جتنے بھی پیسے اپنے ساتھ لے کر آئے ہو انہیں محفوظ رکھو مال مت خریدنا۔ میں تمہیں یہاں سے اپنے ڈیرے پر لے جاؤں گا اور تمہیں مشورہ دوں گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے سرپرستی کی بات کی ہے نا تم لوگوں نے بغیر پیسوں کے تمہیں مال دوں گا۔ جتنا مانگو گے اتنا دوں گا۔ میرے لیے کام کرو اور بےفکر ہو جاؤ''

''ٹھیک ہے ہم کہیں سے مال نہیں خریدیں گے ہمارے ساتھ دو آدمی اور بھی ہیں ان سے بھی تمہیں ملا دیتے ہیں اگر کوئی اطلاع تمہیں پہنچانی ہوئی تو پہنچا دیں گے''۔

''فکر مت کرو مجھے اب کسی کی اطلاع کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تم اپنی حفاظت کرتے رہو۔ یہاں سے میرا سودا پورا ہو جائے اس کے بعد ہم لوگ ڈیرے پر چل پڑیں گے''۔ ڈیرا وہی قبیلہ تھا جہاں جے کال کی موجودگی کے امکانات ہو سکتے تھے۔

بہرحال شاہ زیب اور جہانگیرہ اپنے اس کام کو بہت سمجھتے تھے جیون کھالی تو خیر یہاں اپنے طور پر آیا ہی تھا۔ بس ان لوگوں کے لیے تفریحات کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا۔ وہ شکرے کی قربت چاہتے تھے جو انہیں حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن اس دوران وہ اس سے دوبارہ نہیں ملے تھے۔ کوئی تین دن کی بات ہے کہ ایک دن وہ اپنے طور پر شکرے اور جیون کھالی نگرانی کر رہے تھے کہ انہوں نے شکرے کو تنہا ان ٹیلوں کی جانب جاتے ہوئے دیکھا جو تاحد نظر بکھرے ہوئے تھے۔ بڑے پراسرار اور ویران علاقے میں تھے یہ ٹیلے۔ انہی کے درمیان وہ قبر بھی نظر آ رہی تھی جو مخبروں کے لیے یہاں مستقل

طور پر تیار کر دی گئی تھی پھر شاہ زیب نے جیون کھالی کو دیکھا جو اپنے دو آدمیوں کے ساتھ شکرے کا تعاقب کر رہا تھا۔ جہانگیرہ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار! یہ تو بڑے کام کی بات ہے کہ ہمیں اس کاروائی کا علم ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ آج کچھ ہونے والا ہے مگر اس شکرے کو کیا سوجھی ہے کہ اکیلا ہی چل پڑا ہے۔

''اسے ہوشیار تو کر دیا گیا تھا اب اگر وہ خود ہی موت کے منہ میں جا رہا ہے تو دوسری بات ہے''۔

''نہیں یار! شکرے کو زندہ رہنا چاہیے۔ کیونکہ وہی تو ہماری مشکل آسان کرے گا''۔

اور پھر تیرے آدمی کا گندا خون۔ نا نا نا میں اپنے ہاتھ گندے نہیں کر سکتا۔

''خون ......'' شکرے نے حیرانی کا مظاہرہ کیا۔

شاہ زیب اور جہانگیرہ حیران تھے کہ شکرا اتنا مطمئن کیوں نظر آ رہا ہے جبکہ اسے صورتحال کا اندازہ ہے اور وہ یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ تین مسلح دشمن اس کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں۔ بہرحال یہ بات ان لوگوں کے لیے خاصی دلچسپی کا باعث تھی اور انہوں نے بھی اپنے ریوالور سیدھے کیے ہوئے تھے کیونکہ بہرحال انہوں نے شکرے کے لیے کام کرنا تھا۔ شکرے نے کہا۔

''یار۔ تیری باتوں سے ایک عجیب سی بو آ رہی ہے مجھے۔ جیسے تو دوستوں کی طرح نہیں دشمنوں کی طرح مل رہا ہے مجھ سے''

''کیا تیری میری دوستی اب بھی رہ سکتی ہے شکرے تو نے میرے قبیلے کی لڑکی اٹھائی تھی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں''

''ہاں اٹھائی تھی اور اس ٹائم مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ تیرے قبیلے کی ہے جب تو نے مجھے یہ بتایا تو میں نے پوری شرافت کے ساتھ لڑکی تیرے حوالے کر دی تھی''

''اور جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا اس کے بارے میں تو کیا کہے گا''۔ شکرا ایک منٹ تک خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

''دیکھ میں کوئی شریف آدمی نہیں ہوں برا آدمی ہوں۔ میں برے کام کرتا ہوں لڑکیاں بھی بیچتا ہوں اور ایک بات میں تمہیں بتا دوں کہ لڑکیوں کو جب ہم اٹھاتے ہیں تو ان کی پوری پوری حفاظت بھی کرتے ہیں۔ چونکہ باسی مال کوئی نہیں خریدتا۔ انہیں نہ میں اور نہ میرا کوئی ساتھی نقصان پہنچاتا ہے۔ کیونکہ ہمیں اس کی اچھی قیمت وصول کرنا ہوتی ہے۔ اور برے کاموں میں تھوڑی سی ایمانداری ضرور برتنا پڑتی ہے۔ ورنہ گاہک خراب ہو جاتے ہیں لڑکی جیسی آئی تھی ویسے ہی تیرے حوالے کر دی گئی تھی اور اب یہ الگ بات ہے کہ وہ خود ہی بدکردار ہو''۔

''کتے ...... وہ میرے قبیلے کی لڑکی تھی بدکردار نہیں ہو سکتی۔ لیکن صرف تیری وجہ سے ہم نے اسے ہلاک کر دیا''۔ شکرا سنجیدہ ہو گیا اور اس نے کہا

''کتا کہا تو نے مجھے۔ کیا اس کے بعد دوستی کی گنجائش ہے''

''کون بے غیرت تیرا دوست ہے کتے ...... میں تیرا دشمن ہوں بدترین دشمن اور اس وقت تیرا پیچھا کرتا ہوا اس لیے یہاں آیا ہوں کہ تجھے خاک و خون میں نہلا دوں''۔

''دو مرتبہ تو نے مجھے کتا کہہ دیا مجھے کھل کر اپنی زبان سے یہ کہا ہے کہ تو میرا دوست نہیں دشمن ہے۔ پر تجھے بیوقوف یہ بات نہیں معلوم ہوگی کہ میرے دشمن زیادہ دیر دنیا میں نہیں رہتے نہیں معلوم تھی نا تجھے یہ بات اب مین یہاں کیا کروں افسوس ہے''۔

''یہ بات میں جانتا ہوں''

''تو پھر ایسا کریں گے کہ اگر شکرے سے کوئی بے وقوفی ہو رہی ہے تو اس کی مدد کریں گے چاہے جیون کھالی کو ٹھکانے ہی کیوں نہ لگانا پڑے''۔ شاہ زیب نے پر

خیال انداز میں گردن ہلائی۔

دونوں کے پاس ہتھیار موجود تھے۔ ساون وغیرہ کو ابھی تک استعمال ہی نہیں کیا گیا تھا گوگا اور ساون اپنے طور پر یہاں تفریحات میں مشغول تھے۔

بہرحال یہ سارے مسئلے سنسنی خیز تھے اور وقت اپنا سفر طے کر رہا تھا۔ شکرا ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی چیز کی تلاش میں ہو۔ وہ بار بار زمین پر بیٹھ کر کچھ تلاش کرنے لگتا...... اور پھر نشانات گنتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ جیون کھالی اپنے دونوں آدمیوں کے ساتھ بدستور اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ شکرا لال تالاب سے کافی دور نکل آیا کوئی ڈیڑھ کلومیٹر کا فاصلہ طے ہو چکا تھا اور شکرا پھر ایک جگہ رک گیا اس نے یہاں بھی جھک کر زمین کو دیکھا لیکن اب جیون کھالی نے اپنا فاصلہ کم کر دیا تھا۔ ادھر شاہ زیب اور جہانگیرہ بھی بڑی ہوشیاری کے ساتھ ان کا تعاقب کر رہے تھے اور لحہ لحہ محتاط تھے۔ ان کی نگاہیں بھی چاروں طرف بھٹک رہی تھیں اور وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ جیون کھالی کہاں شکرے کو گھیر کر اس پر حملہ کرتا ہے یہ موقع آ گیا تھا۔

چنانچہ جیون کھالی نے اپنے آپ کو ظاہر کر دیا شکرا جو زمین پر بیٹھا زمین کھود رہا تھا چونک کر اسے دیکھنے لگا شاہ زیب اور جہانگیرہ دونوں اتنے فاصلے پر تھے کہ ایک لمحے کے اندر شکرے کی مدد کر سکیں وہ ایک ٹیلے کی آڑ میں چھپے ہوئے تھے شکرے کی آواز گونجی۔

''آیا۔ میرا یار جیون...... او بھئی تو رک ادھر یار مجھ سے ملا بھی نہیں''۔ جیون کھالی نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر بولا۔

''تیرے لیے تو ادھر آیا تھا شکرے۔ ملنا تھا تجھ سے مگر ذرا موقع کے انتظار میں تھا''۔

''کیسا موقع بھئی''

''ایسا ہی جیسا موقع تو نے اس وقت مجھے دیا ہے۔ تیرا شکریہ یہ ادا کیے بغیر نہیں رہ سکتا میں تو بڑی مشکل میں تھا۔ کہ دیکھو کس طرح میرا تیرا اکیلے میں سامنا ہوتا ہے کہ تو نے مجھے اس مشکل سے نکال لیا تیری بڑی مہربانی شکرے''

''اکیلے میں ملنا چاہتا تھا تو کوئی خاص بات''

''بڑی خاص بات ہے۔ بڑی خاص بات ہے''

''بول بھئی۔ پر تو اکیلا تو نہیں ہے تیرے ساتھ تو یہ دو بندے اور بھی ہیں''

''ہاں۔ اصل میں خود کسی کا خون نہیں کرتا۔ یہ کام میں ان دونوں سے ہی کراتا ہوں۔

شکرے نے دونوں بازو پھیلائے اور اسی وقت دھائیں دھائیں کی تین آوازیں ابھریں۔ جیون کھالی اور اس کے دونوں ساتھیوں کی کھوپڑیوں میں عین پیشانی میں سوراخ ہو گئے ہڈیاں تڑخ گئیں اور پھر اس سے خون کی دھاریں چھوٹنے لگیں ان کے ہاتھ فضا میں پھیلے چونکہ سیدھا دماغ کا نشانہ لیا گیا تھا اس لیے زندگی بچ جانے یا سوچ سمجھ کر کچھ کرنے کا تصور بھی ختم ہو گیا تھا۔ جن لوگوں نے یہ نشانے لگائے تھے وہ بہت بڑے سچے نشانے باز تھے۔ وہ کہاں تھے اس کا علم نہ شاہ زیب کو تھا اور نہ جہانگیرہ کو لیکن یہ بات اب ان کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ شکرا اتنا بے خوف کیوں تھا۔

حقیقتاً وہ جیون کھالی کو خود اپنے پیچھے لگا کر یہاں تک لایا تھا اور یہاں اس نے ان تینوں کے استقبال کا معقول بندوبست کر لیا تھا۔ وہ تینوں ایک لمحے میں ٹھنڈے ہو گئے۔ ان کے جسموں نے ذرا بھی جنبش نہیں کی تھی۔ ان کا اسلحہ ان کے جسموں کے نیچے دب گیا تھا۔ اسی وقت چھ سات آدمی پہاڑی ٹیلوں کی اوٹ سے باہر نکل آئے اور پھر ان میں سے ایک نے شکرے کے کان میں کچھ کہا۔ باقی جیون کھالی اور ان لاشوں کو

پیروں سے پلٹنے لگے شکرے نے چونک کو اس ٹیلے کی طرف دیکھا جس کے پیچھے شاہ زیب اور جہانگیرہ چھپے ہوئے تھے پھر اس نے کہا۔

''اوہ...... آجاؤ بھئی میرے ساتھی بتاتے ہیں کہ تم اس ٹیلے کے پیچھے موجود ہو۔ آجاؤ۔ آجاؤ یار...... آجاؤ تماشہ دیکھ لو اپنے جیون کھالی کا''۔ جہانگیرہ نے ایک گہری سانس لی اور سرگوشی کے انداز میں شاہ زیب سے کہا۔

''بہت تیز آدمی ہے ہمیں بہت احتیاط رکھنی ہوگی''۔ شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا دونوں باہر نکل آئے جہانگیرہ مسکرا رہا تھا۔

اوہ بھئی...... میرے بندوں نے تمہیں دیکھ لیا اور تمہاری طرف سے بھی ہوشیار تھے۔ انہوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ تم لوگوں نے بھی اپنے ہتھیار تیار رکھے ہیں۔ غالباً تم سوچ رہے تھے کہ میں بے خبر ہوں اور یہ بھی سوچ رہے تھے کہ اگر جیون کھالی مجھ پر حملہ کرے تو تم اس کا کام تمام کر دو۔ بولو یہی بات تھی نا۔ اور یار! میں سمجھتا ہوں اچھی طرح سمجھتا ہوں میں ہر بات کو۔ بندے کی پہچان مجھے بھی ہے۔ دیکھ لو یہ ہے جیون کھالی! اب اس بیوقوف کو کوئی سمجھاتا کہ ایسے کام فلمی انداز میں نہیں کیے جاتے۔ للکار کر مار دھاڑ کر مارنے سے بہتر ہوتا ہے کہ خاموشی سے اپنا کام کر لیا جائے۔ ورنہ جھگڑے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ کیا سمجھے۔ مگر تم لوگوں نے وفاداری کا ثبوت دیا ہے۔ تمہیں اس کا بھرپور صلہ دیا جائے گا۔ جاؤ اپنے ڈیرے پر جاؤ۔ ہم ان لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد واپس آجائیں گے۔ رات کو مجھ سے ملاقات کرنا...... جاؤ......''

جہانگیرہ نے شاہ زیب کو اشارہ کیا۔ اس طرح سے نکل آنا ہی بہتر تھا۔ البتہ وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ جہانگیرہ نے خاص طور سے اس بات کا خیال رکھا تھا۔ کہ پیچھے سے ان پر گولی نہ چلا دی جائے۔ جرائم پیشہ افراد کے بارے میں کچھ نہیں کہا سکتا تھا کہ ان کے دلوں میں کیا ہے اور زبان پر کیا ہے لیکن ایسی کوئی بات

نہیں ہوئی جب وہ ان کی رینج سے باہر نکل آئے۔ تو جہانگیرہ نے کہا۔

''بہت تیز اور شاطر آدمی ہے ہمیں بہت سوچ سمجھ کر کام کرنا ہوگا''

''ہاں۔ ایسی ہی بات ہے میں سمجھتا ہوں''۔ شاہ زیب نے جواب دیا

بہر حال وہ لوگ اپنے خیموں پر آ گئے اور اس کے بعد جہانگیرہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ شاہ زیب بھی گہرے سمندروں کا سفر کر رہا تھا۔ رات کو تقریباً ساڑھے آٹھ بجے جب جنگلوں میں منائے جانے والے اس جنگل میں رقص و موسیقی کی محفلیں جاری تھیں۔ گو یہاں مرد ہی مرد تھے اور کسی عورت کا کوئی وجود نہیں تھا۔ لیکن گانے بجانے کا سارا انتظام ان لوگوں نے کیا ہوا تھا۔ ساون اور گوگا سیر کرنے نکل گئے تھے ابھی تک انہیں یہاں کچھ نہیں کرنا پڑا تھا۔ اور وہ بڑے لطف لے رہے تھے لیکن جہانگیرہ اور شاہ زیب محتاط تھے۔ اچانک ہی خیمے کے دروازے پر شکرا نظر آیا اس کے پیچھے کچھ افراد تھے جو اپنے ہاتھ کچھ چیزیں اٹھائے ہوئے کھڑے تھے شکرے نے کہا۔

''دوستو...... اندر آنے کی اجازت دو گے مجھے جہانگیرہ اور شاہ زیب نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا تھا۔ شکرا مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔ اس کے آدمیوں نے ساتھ لائے ہوئے سامان کو پورے خیمے میں سجا دیا۔ شاہ زیب اور جہانگیرہ حیرت اور دلچسپی سے یہ سارا عمل دیکھ رہے تھے۔ جہانگیرہ نے کہا۔

''یہ کیا ہے جناب! یہ تکلف کیا آپ نے ہمارے لیے کیا ہے''

''تکلف نہیں محبت کہو اسے میری۔ تم لوگوں نے میرا دل جیت لیا ہے۔ وہ کام کیا ہے تم نے جو گہرے اور سچے دوست کیا کرتے ہیں''

''ایسا تو کوئی کام ہم نے نہیں کیا شکرے''۔ جہانگیرہ نے کہا

''یہ بات مجھے سمجھنے اور مجھے غور کر لینے دو۔ بہر حال جیون کھالی ایک برا آدمی تھا اس نے میرے ساتھ برا سلوک کیا کیونکہ میں نے اس کے قبیلے کی لڑکی کو عزت د

احترام سے واپس کر دیا تھا۔ پر وہ خود اتنا برا آدمی تھا۔ کہ اسے اس بات کا یقین نہیں آیا اور لڑکی مار ڈالی اس نے۔ بہت افسوس ہوا مجھے سن کر کہ بہت برا آدمی ہوں میں۔ بردہ فروشی کرتا ہوں اور بھی سارے برے کام کرتا ہوں لیکن نجانے کیوں مجھے اس لڑکی کی موت کا مجھے بہت افسوس ہوا۔ بہر حال چھوڑو ان باتوں کو میری تمہاری نئی دوستی ہوئی ہے میرے اندر یہ بات ہے کہ اگر کوئی مجھ پر احسان کرتا ہے تو میں اس احسان کا بدلہ اتارنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اسے اپنا دوست بنا لیتا ہوں۔ یہ میرا اپنا طریقہ کار ہے کیا سمجھے''۔

''تم بہت اچھے آدمی ہو شکرے۔ ہم تمہاری بہت عزت کرتے ہیں''

''شکریہ۔ اب تم لوگ دھندہ شروع کرنا چاہتے ہو۔ میں تمہیں بہت اچھی ٹپ دے سکتا ہوں۔ بڑا کام کرو گے تم یہ لڑکا ابھی جوان ہے۔ پوری زندگی پڑی ہے اس کے سامنے یہ اگر اس کاروبار کو اپنانا چاہے تو مجھ سے زیادہ آمدنی اسے اور کوئی نہیں دے سکتا۔ اب تم ایسا کرو میں ذرا اپنا مال بیچ لوں۔ خاموشی سے تم اپنا وقت گزارو۔ اس کے بعد قبیلے واپس چلیں گے۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ آگے کیا کرنا ہے۔ شہر چلے جانا لاہور، کراچی کہیں سے بھی کام کا آغاز کر سکتے ہو۔ بلکہ کراچی تمہارے لیے بہت زیادہ بہتر رہے گا۔ سمندر ہے اور سمندر ہر ایک کے لیے اپنا سینہ کشادہ رکھتا ہے۔ بولو میری یہ بات اور پیشکش منظور کرتے ہو''۔

''اب تم اتنی محبت سے ہمیں دوستی کی پیشکش کر رہے ہو۔ ایک اتنے بڑے آدمی کی دوستی تو ویسے بھی قابل احترام ہوتی ہے ہم خلوص دل سے تمہاری دوستی کی پیشکش قبول کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ابھی ہم اس دنیا میں نئے ہیں اور جیسا کہ تمہیں بتایا جا چکا ہے۔ خاص طور سے شاہ زیب تو مکمل طور سے پہلی بار اس زندگی میں آ رہا ہے اگر تم جیسا رہنما مل جائے تو ہم لوگ اپنی ساری خواہشیں پوری کر سکتے ہیں''۔

''میں نے کہا نا مل جا کیا مل گیا ہوں میں تمہیں۔ بس اب آرام کرو۔ چار دن گزارے پانچویں دن شکرے نے اپنا خیمہ سمیٹ لیا۔ اس دوران وہ شاہ زیب وغیرہ سے روزانہ ہی ملتا رہا تھا۔ شاہ زیب اسمگلروں کے اس شہر میں جو عارضی طور پر جنگل میں آباد ہو گیا تھا۔ دھڑلے سے گھومتا پھرتا تھا۔

درحقیقت کبیر شاہ کی سرکردگی میں کام بڑا اچھا ہو گیا تھا۔ کم از کم اسے باہر کی حفاظت مل گئی تھی۔ اندر کے معاملات اب اسے دیکھنے تھے کہ کیا ہوتے ہیں۔

بہر حال وہ پانچویں دن یہاں سے چل پڑے اور شکرا انہیں لے کر اپنے قبیلے میں پہنچ گیا یہاں تک آنا ہی ان کا مقصد تھا ساون اور گوگا کو انہوں نے وہیں سے واپس کر دیا تھا۔ جہانگیرہ نے ان سے کہا تھا کہ وہ ٹھکانے پر جا کر ان کا انتظار کریں۔ کبیر شاہ صاحب کی طرف سے رابطہ قائم ہو تو ان سے کہہ دیں کہ وقت بے شک لگ جائے گا۔ کیونکہ جے کال کسی پلیٹ میں رکھا ہوا نہیں ہے تلاش کرنا پڑ رہا ہے اسے اور وہ ہوا میں تیر چلا رہے ہیں۔

جس قبیلے میں وہ پہنچے وہ قابل دید تھا۔ خیموں کا ایک شہر آباد، کنارے کنارے بھدے اور بدنما خیمے لگے ہوئے، کٹے پھٹے اور ان میں نظر آنے والا غریب لوگ نظر آتے تھے لیکن ان کی عزت تب بھی ایک دکھاوا تھی۔ شاندار کھانے، شاندار زندگی اندر کی دنیا ذرا بالکل مختلف تھی۔ یہ باہر والے جو لوگ تھے اور جو کٹے پھٹے کپڑوں میں نظر آتے تھے۔ صرف ایک دکھاوا واقعی ان کے خیموں میں، زمین میں، اندر اسلحہ دفن تھا کہ اگر اتفاقیہ طور پر کوئی فوجی بریگیڈ بھی ادھر نکل آتی۔ تو یہ اس سے بھرپور مقابلہ کر سکتے تھے اور پھر ان کی ڈیوٹیاں بھی بدلتی رہتی تھیں۔ ایک عجیب سسٹم بنا رکھا تھا شکرے نے اندر بڑے بڑے شاندار خیمے لگا رکھے تھے اور ان میں دنیا کی ہر چیز کا انتظام تھا بوسیدہ خیموں میں جو لوگ ڈیوٹی دیا کرتے تھے۔ ان کی ڈیوٹی بدلتی رہتی تھی ایک ہفتہ وہ

لوگ جیسے سرحدوں کی نگرانی کرتے ہوں اور اس کے بعد ان کی جگہ دوسرے لے لیا
کرتے تھے انہیں ڈریس البتہ تبدیل کرنا پڑتا تھا۔ اور وہ بھی اس لیے تھا کہ غیر متعلق
دیکھنے والے انہیں دیکھ کر یہی سمجھیں کہ خانہ بدوش اپنی بدحال زندگی گزار رہے ہیں۔

ان دونوں کو ایک خیمے میں ٹھہرایا گیا۔ جو کافی کشادہ تھا۔ اس میں آرام دہ
گدے پڑے ہوئے تھے اور ہر آسائش مہیا تھی۔ گھومنے پھرنے کی کوئی پابندی نہیں
تھی۔ بستی یہاں سے کافی دور تھی۔ شاہ زیب ان تمام چیزوں کو دیکھ دیکھ کر ششدر رہ
جاتا تھا اس کے اپنے وطن میں جس کے بارے میں وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ بہت زیادہ
جانکاری رکھتا ہے ایسی ایسی جگہیں بھی موجود تھیں۔ جہاں کی زندگی ہی الف لیلوی تھی۔
ایک پراسرار دنیا...... جیسے اسمگلروں کا وہ میلہ جو لال تالاب کے کنارے لگتا تھا یا پھر
دوسری حیران کن جگہ یہ تھی۔ ایک خیمے میں دس گیارہ لڑکیاں بند تھیں ان پر ذرا سختی ہوا
کرتی تھی۔ رقص و موسیقی کی محفلیں بھی جمتی تھیں۔ یہ لوگ گھوم پھر کر جے کال کو تلاش کر
رہے تھے۔

شکرے نے اپنی بستی کے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ یہ اس کے معزز دوست
ہیں۔ یہاں قیام کریں گے انہیں ہر طرح کی آسائش دی جائے۔ بہت زیادہ موم ہوگیا
تھا وہ لیکن جے کال کی تلاش کے سلسلے میں خاصی احتیاط برتی جارہی تھی شکرے نے ایک
شام کہا۔

''اور سناؤ۔ تمہارے اہل خاندان کون سے شہر میں آباد ہیں''۔ جہانگیر ہنس
پڑا اور پھر بولا۔

''یہ بات آپ نے بڑی دیر سے پوچھی شکرے۔ اصل میں ہم لوگ اس
جھگڑے سے آزاد ہیں''۔

''جیتے رہو...... جیتے رہو۔ یہ جھگڑے واقعی زندگی کو روگ لگا دیتے ہیں۔ تم

نے کسی فلم میں نانا پاٹیکر کا وہ جملہ سنا ہوگا۔ کہ ایک مچھر سالا انسان کو ہیجڑا بنا دیتا ہے۔
بات اگر وسیع تر معنوں میں لی جائے تو حقیقت ہے۔ رشتے ناتے انسان کو بزدل بنا
دیتے ہیں۔ بہادر وہی ہوتا ہے جس کے سر پر بہت سارے جھگڑے نہ پڑے ہوں۔
زندگی بھی اپنی موت بھی اپنی۔ آرام سے رہو جلد بازی نہ کرنا۔ میں پوری پلاننگ کے
بعد ہی کہیں بھیجوں گا۔ کبھی جلد بازی مت کرنا روپے پیسے کی بھی پرواہ نہیں ہے جو چاہو
گے مل جائے گا''۔

شکرا بہت زیادہ مہربان تھا۔ شاہ زیب یہاں بڑے دلچسپ دن رات گزار
رہا تھا کبھی کبھی اپنے آپ پر غور کرتا تو احساس ہوتا کہ زندگی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں
رہ گئی ہے۔ یہی سب کچھ کرنا ہے اسے۔ اب بہت سے پرانے دوست تھے رضوان تھا
اور بھی چند افراد تھے۔ بھائی تھے دونوں بھابیاں تھیں۔ جن میں اشکیلہ اکثر اسے یاد کرتی
تھی۔ بڑی بھابی کا جہاں تک تصور تھا تو وہ ہمیشہ اس کے حق میں خوفناک رہی تھی۔
دونوں بھائی بھی آنکھیں بدل چکے تھے۔ لے دے کر اگر زندگی کا کوئی محور تھا تو لجیا تھی
اور لجیا بس اب ایک ٹھنڈی سانس بن کر رہ گئی تھی اس کے لیے۔

بہر حال اسے یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ انسان ہر مرحلے پر انتہائی بے بس
ہے۔ دنیا کو بے بس کر سکتا ہے اپنی مرضی کی چیزیں نہیں پا سکتا۔ لجیا کو حاصل نہیں کر
سکتا۔ پھر وہ اسے نظر آ گئی۔ اس دن رقص کی محفل جمی ہوئی تھی اور بہت سی لڑکیاں رقص
کر رہی تھیں۔ یہ رقص بھی مجبوری کا رقص نہیں تھا بلکہ اچھی خاصی ہنسی خوشی کا ماحول تھا۔
لڑکیوں کے بارے میں شاہ زیب کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کون ہے۔ ہاں اسمگلروں کی
عورتیں خیموں میں آباد تھیں اور دوہری زندگی گزار رہی تھیں۔ یعنی ان کے پاس سب
کچھ موجود تھا لیکن وہ کبھی کبھی فقیرنیاں بھی نظر آتی تھیں۔ بلکہ آہستہ آہستہ بہت سے
انکشافات بھی ہو رہے تھے۔ مثلاً یہ فقیرنیاں جھولیاں ڈال کر بستیوں میں نکل جاتی

تھیں۔ بھیک مانگتی تھیں تاکہ آس پاس کے رہنے والے یہی سمجھیں کہ غریب خانہ بدوش مانگ ٹانگ کر گزارہ کر لیتے ہیں لیکن اس طرح بہت سے کام ہوا کرتے تھے۔منشیات کی ترسیل بھی ہوا کرتی تھی۔اس کے ساتھ ساتھ ہی جاسوسی بھی کی جاتی تھی۔اور یہ کام نہایت خوش اسلوبی سے ہوا کرتے تھے۔شکرا ان سب کا سربراہ تھا۔شکرے کے بارے میں جو بات مائیکل اسحاق نے فراہم کی تھی۔وہ اس قدر نہیں تھی جتنی یہاں آنے کے بعد انہیں حاصل ہوئی تھی۔

بہرحال اگر وہ قانون کے محافظ ہوتے اور اگر وقت انہیں انسانوں جیسی زندگی مہیا کرتا تو یہ سارے انکشافات حکومت کے لیے بڑے اہم ہوتے جن سے جرائم کے سدباب میں خاصا فائدہ ہوتا۔لیکن یہ دونوں بھی مجرم تھے،ذرا مختلف قسم کے۔

تو بات اس لڑکی کی ہو رہی تھی۔ جوان لڑکیوں کے درمیان رقص کر رہی تھی اور ایک بار اس نے مسکراتی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا تھا۔دلکش نقوش تھے حسین چہرہ نجانے کیوں وہ کچھ عجیب سی لگی تھی۔ شاہ زیب اسے دیکھتا رہ گیا اور اس وقت شکرے نے شاہ زیب کے چہرے کو دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیکن شام کو جب جہانگیرہ گھومنے پھرنے نکل گیا تھا کہ اچانک وہی لڑکی شاہ زیب کے خیمے میں آ گئی۔اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی شاہ زیب اسے دیکھ کر چونک پڑا پھر بولا۔

''ہاں ہاں خیریت کیا بات ہے''

''شکرے نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے''

''شکرے نے''

''خیریت۔کوئی کام ہے مجھ سے''

''نہیں''

''تو پھر''۔اس وقت شکرا خیمے کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اس نے کہا۔

''میرے نوجوان دوست!شکرے میں دوسری بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ جب دوست اس کے سامنے آتے ہیں تو وہ ہر طرح کے مفادات کو بھول جاتا ہے۔اس لڑکی کی قیمت مجھے بہت زیادہ مل سکتی ہے۔ بالکل الہڑ کنواری ہے۔ پورے اعتماد کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں تم اسے دیکھ رہے تھے اور تمہاری آنکھوں میں اس کے لیے پسندیدگی کے آثار تھے۔چنانچہ اب یہ تمہاری ملکیت ہے کیا سمجھے''۔

شاہ زیب کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔شکرا ہنستا ہوا بولا۔

''ہاں واقعی باتیں یہ تم سے خود کرے گی''۔ یہ کہہ کر شکرا باہر نکل گیا لڑکی اسے دیکھنے لگی پھر گردن جھکا کر ایک طرف جا بیٹھی اور بولی۔

''تمہارا پہلا احسان میرے اوپر یہ ہے کہ مجھے تمہاری ملکیت قرار دے دیا گیا اس سے کم از کم اب میں اس منڈی میں نہیں جاؤں گی۔ جہاں لڑکیاں فروخت ہوتی ہیں۔ پتہ نہیں کس کے ہاتھ جا کر لگتی''

''کیا نام ہے تمہارا''

''دانی۔دانیہ تھا میرا نام لیکن اب صرف دانی ہوں''

''ماں باپ''

''ہیں۔لیکن نہ ہونے کے برابر باپ سگا ہے ماں سوتیلی مصائب کی زندگی گزار رہی تھی تنگ آ کر گھر سے باہر نکل آئی تھی۔نوکری کے لیے ماری ماری پھر رہی تھی کہ کچھ لوگوں کے ہاتھ لگ گئی۔اغوا کر کے لائے اور شکرے کے ہاتھ بیچ دیا۔اب شکرا مجھے کہیں کسی منڈی میں لے جا کر بیچ دے گا۔لیکن اس نے اب تمہیں مجھے سونپ دیا ہے مجھے کم از کم یہی اطمینان ہے کہ کسی وحشی انسان کے ہاتھ نہیں لگی ہوں''۔شاہ زیب

حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

''میرے بارے میں کیا جانتی ہو''

''کچھ نہیں جانتی اور نہ جاننا چاہتی ہوں لیکن کم از کم تمہارے چہرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم ایک اچھے مالک ثابت ہو گے''۔

''دانی...... مجھے اپنے بارے میں کچھ اور تفصیل سے بتاؤ۔ کیا خیال ہے یہاں سے کہیں چلیں''

''ہاں۔ کسی بھی وقت کوئی بھی ہماری باتیں سن سکتا ہے آؤ۔ کہیں چل کر بیٹھتے ہیں''۔ شاہ زیب اس کے ساتھ خیموں کے اس شہر سے باہر نکل کر کھلے علاقے میں پہنچ گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ قرب و جوار کا ماحول بھی بے حد خوبصورت تھا۔ ایک جگہ دانی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ شاہ زیب بھی اس سے تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد بیٹھ گیا تھا۔ لڑکی اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگی پھر بولی۔

''کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ تجربہ تو تجربہ میں تو دنیا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی لعنت ہے مجھ پر''

''کیوں ایسی کیا بات ہے؟''

''تمہیں دیکھ کر یہ بات کہہ رہی ہوں۔ تمہیں دیکھ کر کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ جرائم کی دنیا سے تمہارا کوئی تعلق ہے''

''اور تمہارا خیال ہے جرائم کی دنیا سے مرا تعلق ہے''۔ شاہ زیب نے کہا اور لڑکی کے چہرے پر الجھن نظر آنے لگی۔ پھر وہ بولی۔

''میری صاف گوئی کو معاف کرنا۔ ظاہر ہے جرائم کی دنیا سے اگر تمہارا تعلق نہ ہوتا تو شکرے سے تمہاری دوستی کیوں ہوتی''

''ہاں۔ یہ بات بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو اچھا چلو چھوڑو۔ تمہیں یہاں آئے

ہوئے کتنے دن ہو گئے''

''کوئی ڈھائی مہینہ''

''تمہیں معلوم ہے کہ شکرے کے سلسلے میں تمہارا، یعنی میرا مطلب ہے تمہارے سلسلے میں شکرے کا کیا پروگرام تھا''

''کہا نا کبھی سنتی تھی دوبئی لے جائے گا۔ کبھی سنتی تھی کہیں اور، اور بھی کئی لڑکیاں ہیں جو اسی طرح اغوا کر کے لائی گئی ہیں۔ کہیں نہ کہیں بیچ دیا جائے گا انہیں''۔

''مگر تمہیں آزادی تو بہت زیادہ ملی ہوئی ہے۔ بظاہر تم خوش بھی نظر آتی ہو''۔ وہ زہریلے انداز میں ہنسی پھر بولی۔

''ہاں۔ یہ خوشی زندہ رہنے کی خوشی ہے۔ بلکہ یوں سمجھ لو کہ یہ خوشی ہی زندہ رکھے ہوئے ہے اگر ہم افسردگی یا سرکشی کا اظہار کریں۔ تو وہ بھی تم دیکھ لو کہ کیا نتیجہ ہوتا ہے اس کا''۔

''مطلب''

''کھلے اور آزاد پھرتے ہیں ہم لوگ۔ ہمیں تربیت دی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ بھاگنے کی کوشش کا کیا نتیجہ ہوتا ہے''۔

''کیا نتیجہ ہوتا ہے''

لڑکی کتنی ہی حسین ہو کیسی بھی ہو۔ اس کا چہرہ تیزاب سے جلا دیا جاتا ہے پھر اس کا یہیں علاج کیا جاتا ہے اور اس کے بعد اسے فقیروں کے ہاتھ بیچ دیا جاتا ہے۔ جو ان جھلسے ہوئے چہروں اور لنگڑے لولے ہاتھوں والی لڑکیوں سے بھیک منگواتے ہیں۔ ایسی بھی خرید و فروخت ہوتی ہے یہاں''۔ شاہ زیب کانپ کر رہ گیا تھا۔ پھر اس نے کہا

''دانی میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں''

''پہلے یہ بتاؤ۔ کہ عورت کی حیثیت سے تم مجھے قبول کرتے ہو یا نہیں''

"نہیں"۔ شاہ زیب نے جواب دیا اور دانی چونک پڑی۔ اس نے حیرت بھری نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا اور بولی۔

"بدصورت ہوں میں"

"نہیں بدصورت نہیں ہو"

"اور کوئی ایسی کمی پائی میرے اندر جو تمہارے معیار کے خلاف ہو"

"کوئی نہیں......کوئی نہیں......کوئی نہیں کیوں پوچھ رہی ہو یہ بات"

"تم ایک ایسی انوکھی بات کہی جس نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم واقعی برے واقعی نہیں ہو"

"نہیں میں بہت برا آدمی ہوں دانی! لیکن بے فکر رہو میرے ہاتھوں تمہیں کوئی ایسا نقصان نہیں پہنچے گا جو تم نہ چاہتی ہو"۔

"وجہ بتاؤ"

"لجیا"۔ شاہ زیب کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"نہیں سمجھی"

"میری محبت، میرا پیار جو فضاؤں میں گم ہو گیا ہے اور میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔ مل جائے گی تو اس سے ہی محبت کروں گا اور اسی سے شادی کروں گا۔ اس کی جگہ میں کسی کو بھی نہیں دے سکتا اور میری فطرت میں عیاشی نہیں ہے۔ یہ دونوں چیزیں تمہارے حق میں جاتی ہیں"۔

دانی زار و قطار رونے لگی۔ شاہ زیب نے اسے خاموش کرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس لڑکی کے دل کی بھڑاس کو وہ اچھی طرح جانتا تھا وہ جس ماحول میں گزارہ کر رہی تھی اس ماحول نے اسے ذہنی طور پر ختم کر دیا ہوگا۔ روتی نہیں تو کیا کرتی جب اس کی ہچکیاں رک گئیں تو اس نے کہا۔

"شاہ زیب ہے نا تمہارا نام"

"ہاں"

"شاہ زیب مجھے یہاں سے نکال لے چلو۔ مجھے لاہور پہنچا دو وہاں رحیم ہے میرا بچپن کا منگیتر میری خالہ کا بیٹا، خالہ خالو مر چکے ہیں۔ اگر میرے ساتھ یہ حادثہ نہ پیش آتا تو رحیم مجھ سے شادی کر لیتا۔ میں......میں بچپن سے اس سے محبت کرتی ہوں۔ بچپن سے شاہ زیب! میرے اوپر رحم کرو۔ مجھے رحیم تک پہنچا دو تم، تم تو خود محبت کے مارے ہوئے ہو۔ ایک گھائل ہی گھائل کے بارے میں جان سکتا ہے۔ ایک گھائل ہی گھائل کی حالت سمجھ سکتا ہے۔ وہ آگے بڑھی اور اس نے شاہ زیب کے پاؤں پکڑ لیے"

"نہیں ایسا کوئی جذباتی قدم نہ اٹھاؤ۔ ہو سکتا ہے کچھ فاصلے سے ہمیں دیکھا جا رہا ہو۔ براہ کرم سیدھی ہو کر بیٹھ جاؤ۔ خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ شکرا تمہیں میرے حوالے کر چکا ہے۔ تم بے فکر رہو میں تمہیں لاہور لے جاؤں گا۔ رحیم جہاں بھی رہتا ہے میں تمہیں اس تک پہنچا دوں گا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے الفت کا اظہار کرنا چاہیے۔ ابھی شکرے کے دل میں میرے لیے بڑی گنجائش ہے۔ میں یہ عمل کر سکتا ہوں اور تم بھی بہت زیادہ جذباتیت کا مظاہرہ نہ کرو اپنی کسی بھی ساتھی لڑکی کو ایک لفظ اس کے بارے میں نہ بتانا اگر بہتری چاہتی ہو تو"۔

"نہیں بتاؤں گی لیکن تم مجھے"

"ہاں۔ میں تمہیں وہاں تک پہنچا دوں گا"۔ دانی نے گردن جھکا لی پھر بھی اس کی آنکھوں سے دیر تک آنسو ٹپکتے رہے تھے وہ غور سے دانی کی صورت دیکھتا رہا اسے اس پر بہت رحم آ رہا تھا"۔ دانی نے کہا۔

"ایک بات بتاؤ گے شاہ زیب"

"پوچھو"

''شکرے سے تمہاری دوستی کس لیے ہوگئی وہ تو اچھا آدمی نہیں ہے''

''دانی! میں نے یہ دوستی کی ہے بڑی محنت کر کے۔ میرے ساتھ میرا ایک اور ساتھی ہے۔ ہم لوگ ایک خاص مقصد کے تحت یہاں اس قبیلے میں آئے ہیں۔ ارے ہاں۔ میں تمہیں کیوں نہ اپنی معلومات کا ذریعہ بناؤں۔ بولو کچھ معلومات مجھے فراہم کردو گی''۔

''کرسکی تو ضرور کروں گی''

''ہمیں ایک شخص جے کال کی تلاش ہے اور ہمیں یہ پتہ چلا ہے کہ زخمی جے کال اس قبیلے میں لایا گیا ہے''۔

''بالکل لایا گیا ہے اور وہ جس خیمے میں رہ رہا ہے میں اس خیمے کے بارے میں بھی جانتی ہوں''۔

شاہ زیب کے پورے بدن میں ٹھنڈی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہوگیا تھا وہ۔ کچھ لمحے تو وہ بول ہی نہ سکا پھر اس نے کہا۔

''دانی! سوچ سمجھ کر یہ بات کررہی ہو''

''ہاں ہاں ہاں۔ میں تمہیں اس خیمے کے بارے میں بتاسکتی ہوں۔ وہ نیلے رنگ کا خیمہ ہے اور جے کال، شکرے کا گہرا دوست ہے۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی جیسا کہ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ یہاں خیموں کے اس آباد شہر میں بظاہر خانہ بدوش رہتے ہیں۔ لیکن ان خانہ بدوشوں میں بڑے بڑے وکیل، بڑے بڑے ڈاکٹر اور دنیا کا ہر سامان موجود ہے۔ یہ سب شکرے کے مفادات کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس کی ہر ضرورت پوری کرتے ہیں۔ تھوڑے دن پہلے یہاں ایک زخمی کو لایا گیا تھا جس کی ران میں گولی لگی تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کا علاج شروع کردیا اور وہ اب بیساکھیوں کے سہارے چل لیتا ہے۔ اس کا نام جے کال ہے۔ مجھے پوری طرح یقین ہے اور یہ بات

میں جانتی ہوں۔ شاہ زیب نے آنکھیں بند کرلیں تھیں۔ یہ سنسنی خیز انکشاف اس سے برداشت نہیں ہورہا تھا۔ اتنا بڑا کام اتنی آسانی سے ہوگیا جے کال کا پتہ چل گیا۔ ساری معلومات بالکل ٹھیک تھیں۔ شکرا جے کال کا دوست تھا جے کال یہاں موجود ہے۔ اچانک ہی دانی نے شاہ زیب کا خاموشی کا طلسم توڑ دیا اور بولی۔

''مگر تمہیں جے کال کی تلاش کیوں ہے''

''بہت اہم آدمی ہے وہ ہمارے لیے، ہم سخت مشکلات کا سامنا کرکے یہاں تک پہنچے ہیں''۔

''ٹھیک اچھا اب بتاؤ۔ میں تمہارے لیے کیا کروں''

''دیکھو دانی! یہ وعدہ تو میں تم سے کرچکا ہوں کہ تمہیں لاہور لے جاؤں گا اور رحیم کے حوالے کردوں گا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد اب ہمیں آپس کے تعلقات کا جو اظہار کرنا ہے وہ یہی ہونا چاہیے جو شکرے نے سوچا یا چاہا ہے۔ دانیہ نے کسی قدر چونک کر شاہ زیب کو دیکھا تو شاہ زیب بولا۔

''بار بار کوئی بات کہتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگتا۔ یہ بات میں نے تم سے کہہ دی ہے کہ تم مکمل طور پر محفوظ ہو۔ تمہاری عزت، تمہارا وقار، تمہاری نسوانیت، تمہارا کنوارپن سب کچھ محفوظ ہے۔ بس ہمیں تھوڑی سی اداکاری کرنا پڑے گی۔ ایک دوسرے کو پسند کرنے کی اور یہ بات میں اپنے ساتھی کو بھی نہیں بتاؤں گا۔ اگر مناسب سمجھوں گا۔ بہرحال میرا مطلب تم سمجھ گئی ہونا''۔

''ہاں''۔ دانیہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمک گئے تھے۔ دیر تک خاموشی طاری رہی پھر اس نے ایک سسکی سی لے کر کہا۔

''یقین کرو مجھے یقین نہیں تھا۔ دعائیں تو بے پناہ مانگتی تھی لیکن دعائیں تو دوسری لڑکیاں بھی مانگتی ہیں۔ میری دعا قبول ہوجائے گی اس کا مجھے یقین نہیں تھا۔

کاش! تم اپنے وعدے پر قائم رہو۔ کاش! تم وہ کرسکو جو تم کہہ رہے ہو"۔

"دانیہ جلدی نہیں کرنی تم مجھے جے کال کا خیمہ دکھاؤ گی"۔ شاہ زیب نے در حقیقت جہانگیرہ کو بھی اصل بات نہیں بتائی تھی۔ البتہ جہانگیرہ دانیہ کو ہر وقت اس کے ساتھ دیکھا کرتا تھا۔ اس شام بھی اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اوہ بھئی۔ کیا کر رہے ہو۔ کیا اب اسی قبیلے میں باقی زندگی گزارنے کا ارادہ ہے"۔

"نہیں۔ جہانگیرہ بس کام ہوگیا ہے بس موقع کی تاک میں ہوں"۔

"کیا مطلب"

"جے کال یہاں موجود ہے۔ ہم بہت جلد اسے دیکھیں گے۔ میں خود جے کال کے سامنے آنے سے گریز کرتا ہوں"۔

"موجود ہے"۔ جہانگیرہ اچھل پڑا۔

"ہاں۔ مائیکل اسحاق کی اطلاع بالکل درست تھی۔ جے کال زخمی ہونے کے بعد شکرے کے پاس ہی آیا ہے۔ خیر یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ دونوں کا ایک دوسرے سے اتنا گہرا تعلق کیوں ہے۔ تعلق کی وجہ تو صاف ظاہر ہے کہ شکرا بھی ایک مجرم ہے اور جے کال بھی"۔

"جے کال، شکرے سے کہیں زیادہ بڑا اور خطرناک آدمی ہے۔ تم یہ سمجھ لو کہ ایک طرح سے وہ انٹرنیشنل شخصیت ہے"۔

"ہوگا"۔ لیکن بہرحال مجھے اس کی یہاں موجودگی کا پتہ چل گیا ہے"۔ شاہ زیب نے جواب دیا۔

"کہاں ہے"۔

"نیلے رنگ کا ایک بڑا سا خیمہ ہے۔ اصل میں چونکہ وہ ہمیں ایک نگاہ میں

پہچان سکتا ہے۔ اس لیے بڑی احتیاط سے کام کرنا پڑ رہا ہے۔ اور پھر ویسے بھی وہ شکرے کا دوست ہے۔ اس لیے احتیاط تو کرنی پڑے گی۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ایک بات میں تمہیں بتاؤں۔ ہوسکتا ہے جے کال ٹھیک ہونے کے بعد یہاں سے نکل جائے اور پھر شکرے کے پاس بھی ہم کب تک رہیں گے۔ ویسے ایک بات بتاؤ۔ ایک لڑکی تمہارے آس پاس دیکھی جا رہی ہے مستقل یہ تو مجھے معلوم ہے کہ شکرے نے تمہیں وہ لڑکی بخش دی ہے۔ لیکن تمہارے بارے میں مجھے علم نہیں کہ کیا تم"۔

"بھئی انسان تو ہوں نہ میں"

"مجھے اس سے بالکل انکار نہیں ہے۔ عمر ہے تمہاری لیکن صرف ایک بات ذہن میں رکھنا کسی جال میں نہ پھنس جانا۔ میرا مطلب ہے لڑکی کو اپنی اصلیت بالکل مت بتانا کیونکہ عورت کے پیٹ میں بات نہیں رکتی راز کھل نہ جائے کہیں"۔

شاہ زیب مسکرا کر خاموش ہوگیا تھا۔ جے کال کے خیمے کا پتہ اسے چل گیا تھا نیلے رنگ کے بڑے سے خیمے کے سامنے ایک بار اس نے جے کال کو دیکھ بھی لیا تھا۔ بے ساکھی کے سہارے باہر آیا تھا ایک آدمی اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

بہرحال شاہ زیب نے اسے پہچان لیا اور اب کوئی شک وشبہ نہیں رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ واقعی اسے اپنا کام کر لینا چاہیے۔ لیکن شکرا جس طرح کا انسان تھا۔ اسے بڑا محتاط رہ کر کام کرنا تھا۔ بات صرف جے کال کے قتل کی تھی۔ مکرم شاہ اور کبیر شاہ دونوں ہی یہ چاہتے تھے کہ جے کال اس کے راستے سے ہٹ جائے۔ جے کال یہاں وقت گزار رہا تھا اس کے بعد یقینی طور پر اس کی کاروائیاں دہشت ناک شکل اختیار کر جائیں گی اس لیے کام خاموشی کے ساتھ ہو جانا چاہیے اور اس دن آخر کار شاہ زیب کو موقع مل ہی گیا۔

موسم بہت اچھا تھا آسمان سے ہلکی ہلکی پھوار گر رہی تھی اور خانہ بدوشوں کی بستی میں ایک مستی سی پائی جاتی تھی۔ عورتیں، مرد، بچے سب خوش نظر آ رہے تھے۔ خیموں کے بیچ و بیچ رقص کا آغاز ہو گیا۔ ڈھول، تاشے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے باجے اور اس کے بعد لڑکیوں کا رقص چہلیں، ہنسی مذاق، نشہ آور ادویات بھی استعمال کی جاری تھیں۔ غالباً دیسی شراب بھی شغل کے لئے موجود تھی۔ شکرا کہیں گیا ہوا تھا یہاں کے معاملات کیا کیا تھے۔ اس کے بارے میں اسے نہیں معلوم تھا۔ لیکن شاہ زیب کے دل میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ جے کال کو ٹھکانے لگانے کا اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں ہوگا۔ جے کال نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے خیمے میں موجود ہے۔ ڈھول، تاشوں اور سازوں کی آواز خوب بلند ہو رہی تھی۔ جہانگیرا بھی اس رقص و موسیقی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ شاہ زیب خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور خیموں کے درمیان آڑ لیتا ہوا۔ جے کال کے خیمے کی طرف چل پڑا۔ جے کال کے خیمے کی طرف پہنچ کر اس نے پہلے سن گن لی اور یہ اندازہ لگانے لگا کہ جے کال خیمے میں موجود ہے یا نہیں۔ اور اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ اندر موجود ہے۔

چنانچہ اس نے آگے کا کام شروع کر دیا۔ خیمے کے عقبی حصے کو ایک بڑا شگاف دے کر اس نے بڑی احتیاط سے اندر جھانکا، جے کال ایک سینٹر ٹیبل کے پیچھے بیٹھا ہوا شراب سے شغل کر رہا تھا ساتھ ہی وہ کچھ بڑبڑاتا بھی جا رہا تھا۔ خنجر سے خیمے میں شگاف پیدا کرنے کے بعد شاہ زیب بڑی آہستگی سے اندر داخل ہوا اور جے کال سانپ کی طرح پلٹ پڑا۔ اس نے گھوم کر شاہ زیب کو دیکھا۔ شاہ زیب کے لیے اس وقت بڑی آزمائش کا دن تھا۔ وہ آگے بڑھ کر جے کال کے سامنے پہنچ گیا۔ جے کال نے اسے چونک کر دیکھا اور پھر ایک دم حیرت زدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اس کے اٹھنے سے سامنے رکھی ہوئی سینٹر ٹیبل اٹھ گئی اور شاہ زیب نے فوراً ہی ایک بوتل اپنی مٹھی میں دبائی اور پوری

قوت سے جے کال کے سر پر دے ماری۔ جے کال کے حلق سے ایک مکروہ چیخ نکلی تو شاہ زیب نے دوسرا وار سر پر کیا اور یہ وار پہلے سے کہیں زیادہ خوفناک تھا۔ حالانکہ شاہ زیب کے ہاتھ میں خنجر تھا لیکن اسے استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اس نے کئی وار جے کال پر کیے اور جے کال کا بھیجہ پاش پاش ہو گیا۔ شاہ زیب اس وقت ایک وحشی درندہ بنا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جے کال کے دونوں ہاتھ پھیلے اور وہ اوندھے منہ کرسی سے نیچے آ رہا۔ ٹیبل اس کے سامنے الٹی پڑی ہوئی تھی۔ شاہ زیب ادھر ادھر دیکھنے لگا اس کے سارے وجود میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ باہر کی آہٹوں پر بھی اس نے کان لگائے ہوئے تھے۔ اس نے تھوڑی دیر تک انتظار کیا اور اس کے بعد جے کال کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

کام ہو گیا تھا ظاہر ہے سوڈے کی بھاری بوتل نے وہ فنکاری دکھائی تھی اس کے بعد جے کال کا زندہ بچنا ناممکن ہی تھا پوری طرح یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ جے کال ہلاک ہو چکا ہے۔ شاہ زیب نے اپنے آپ کو سنبھالا اس نے اپنے بدن کو جے کال کے لہو سے داغدار نہیں ہونے دیا تھا اور کا پورا پورا خیال رکھا تھا البتہ بوتل کے ہتھے پر اس کے نشان ضرور بن گئے ہوں گے۔ انہیں صاف کرنا بھی بڑا ضروری تھا۔

چنانچہ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ایک تولیہ اٹھا کر بوتل کو خوب اچھی طرح صاف کر دیا اور اسے وہیں میز پر جے کال کے سامنے رکھ دیا اس کے بعد ایک لمحہ یہاں اس خیمے میں رکنے کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ وہ برق رفتاری سے واپس پلٹا۔ پھر ایک اور کام اس نے کیا وہ خنجر جس سے اس نے خیمے کو کاٹا تھا اسے بھی ٹھکانے لگانا بڑا ضروری تھا۔ چنانچہ اسے اس نے ایک اندھے کنوئیں میں پھینک دیا اور کچھ لمحوں بعد وہ رقص کرنے والوں کے مجمع میں شامل ہو گیا۔ ابھی وہ وہاں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ اچانک اس نے شکرے کو دیکھا جو کہیں باہر سے آیا تھا اور سفر کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ یعنی جینس

اور فل بوٹ ویسے بھی لمبا چوڑا خطرناک آدمی تھا وہ شاہ زیب کو دیکھتا ہوا اس کے پاس
ہی آ کر بیٹھ گیا۔

''موسم کا حسین تحفہ خوب لطف اٹھا رہے ہو دوست''

''ہاں۔ جب اتنی بڑی دوستیاں ہو جاتی ہیں تو خود بخود طبیعت میں ایک
جولانی پیدا ہو جاتی ہے اور لطف اٹھانے کو دل چاہتا ہے''

''میں ابھی تھوڑی دیر کے بعد آتا ہوں میرا ایک دوست یہاں رہتا ہے اسے
بھی ان تفریحات میں شامل کر لوں''۔ شاہ زیب نے بظاہر خوشگوار انداز میں گردن ہلا
دی اور دل میں شدید سنسنی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ پھر کہیں سے جہانگیرہ نکل کر اس
کے پاس آ گیا اور ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''جگہ واقعی بڑے مزے کی ہے۔ لیکن ہم لوگ بہت زیادہ وقت نہیں ضائع
کر رہے ہیں۔ ہمارا انتظار کیا جا رہا ہوگا''۔ شاہ زیب نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔
اس کی آنکھوں میں سنسنی کے آثار تھے لیکن پھر بھی اس نے خاموشی اختیار کی البتہ اس
کے عمل کا نتیجہ چند ہی لمحوں کے بعد ظاہر ہو گیا۔ دو افراد کہیں سے آئے اور انہوں نے
دونوں ہاتھ اٹھا کر چیختے ہوئے کہا۔

''شکرے! نے حکم دیا ہے گانا بجانا فوراً بند کر دیا جائے۔ سب لوگ اپنے
اپنے خیموں میں چلے جائیں''۔ یہ دونوں شکرے کے خاص آدمیوں میں سے تھے۔ نتیجہ
فوراً ظاہر ہو گیا لوگ حیران تھے ایک دوسرے سے سوالات بے شک کر رہے تھے۔ لیکن
گانا بجانا فوراً بند ہو گیا۔ ساز اٹھا لیے گئے جہانگیرہ بھی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر
شاہ زیب اور وہ اپنے خیمے کی جانب چل پڑے۔

ہوا کیا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ شکرا تو ابھی ابھی یہاں سے کہیں گیا ہے اور
بڑے اچھے موڈ میں تھا''۔ شاہ زیب نے جہانگیرہ کا چہرہ دیکھا اور پھر مدھم لہجے میں بولا

''کام ہو گیا ہے جہانگیرہ''۔ پہلے تو ایک لمحے تک جہانگیرہ کی سمجھ میں کچھ
نہیں آیا پھر وہ ایک دم اچھل پڑا اور سنسنی خیز لہجے میں بولا

''کک...... کیا، کیا، کیا کہہ رہے ہو تم''

''جے کال ختم ہو گیا''۔ جہانگیرہ کے قدم رک گئے اور وہ عجیب سی نگاہوں
سے شاہ زیب کو دیکھنے لگا۔

''چلتے رہو۔ چلتے رہو اپنے خیمے میں چلے جاؤ''۔

''مم...... مگر یار! کچھ بتاؤ تو سہی''

تقدیر نے مجھے موقع فراہم کر دیا اور اب جے کال اس دنیا میں نہیں ہے۔ بات
اصل میں یہ ہے جہانگیرہ کہ میں روایتی قسم کا ہیرو نہیں بننا چاہتا بہت سے انسانوں کی
زندگی لے چکا ہوں وہ حالات کچھ اور تھے لیکن اب تقدیر نے میرے لیے یہ سب کچھ لکھ
دیا ہے۔ تو میں کیا کروں؟ وہ کرنا پڑتا ہے جو مجھے بھی جینے میں مدد دے''

''مم...... مگر کیسے؟''

''تم لوگ یہاں رقص و موسیقی میں مصروف تھے۔ میں جے کال کے خیمے تک
پہنچ گیا تھا''۔

''اوہ......'' جہانگیرہ کے ہونٹ سیٹی بجانے والے انداز میں سکڑ گئے۔

بہر حال پھر شاہ زیب اور جہانگیرہ اپنے خیمے میں واپس آ گئے۔ جہانگیرہ پر
ایک سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ بہت دیر تک وہ خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

''کس طرح۔ ہتھیار کیا استعمال کیا''

''شراب کی بوتل سے بھیجہ نکال دیا اس کا''

''زندگی کے امکانات تو نہیں رہے''

''ایک فیصد بھی نہیں''

"گڈ...... اچھی بات ہے۔ کہ تمہیں اپنے الفاظ پر ذرا بھی شبہ نہیں ہے"۔

شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بہر حال جہانگیرہ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"مگر یار! واقعی اب تو تم ایک تجربہ کار قاتل بن چکے ہو۔ کیا بہترین موقع تلاش کیا تم نے اور جے کال اس کی حالت اتنی خراب نہیں تھی کہ وہ اپنی جان بچانے کی کوشش نہ کر سکتا کوئی جدوجہد کی تھی اس نے"۔

"موقع نہیں دیا میں نے اسے"۔ شاہ زیب نے جواب دیا

"بڑی بات ہے بھائی! بڑی بات ہے، باہر نکلیں......"

"تم چاہو تو جاؤ"

جہانگیرہ باہر نکل گیا شاہ زیب گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر تک ایک مکمل خاموشی طاری رہی اور اس کے بعد شاہ زیب نے بھی خیمے سے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا لیکن اس وقت دانی اندر آ گئی۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھ رہی تھی

"کچھ سنا تم نے؟"

"کیا؟"

"جے کال کو کسی نے ہلاک کر دیا"۔ شاہ زیب نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولا۔

"مگر کس نے؟"

"کچھ پتہ نہیں چل رہا"

"وہ ایک برا آدمی تھا اور برے آدمیوں کے ہزاروں دشمن ہوتے ہیں۔ لیکن جس نے بھی یہ کام کیا بہت اچھا کیا۔ تم نے اس کی لاش دیکھی۔

"نہیں۔ شکرا اس کے لیے بہت افسردہ ہے اور تحقیقات کر رہا ہے کہ اسے

ہلاک کرنے والا کون ہو سکتا ہے"۔ دانیہ بہت دیر تک باتیں کر رہی تھی اس نے کہا۔

"کیسی بھیانک جگہ ہے کاش! میری تقدیر میرا ساتھ دے جائے تم یہاں کب تک رہو گے"۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اپنے آپ کو سنبھالے رکھو"۔ اس دوران شاہ زیب دانیہ سے جس طرح اظہار الفت کرتا رہا تھا۔ اس سے بہت سے لوگ واقف ہو چکے تھے۔ ایک طرح سے دانی اس کی سب کچھ بن گئی تھی کم از کم دیکھنے والوں کو یہی اندازہ ہوتا تھا۔ پھر شکرے سے دو دن تک ملاقات نہیں ہوئی۔ تیسرے دن جب جہانگیرہ اور شاہ زیب باہر نکلے تو شکرا ایک اونچے چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا۔ چبوترے کے اوپر درخت سے گرنے والے پتے کو آہستہ آہستہ توڑ رہا تھا۔ اس کا چہرہ خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور انہیں اپنے پاس ہی بلا لیا۔

"بیٹھو...... بیٹھ جاؤ"۔ دونوں بیٹھ گئے تھے۔

"تمہیں پتہ چلا"

"ہاں صرف اتنا کہ جے کال کو کسی نے قتل کر دیا لیکن یہ نہیں معلوم کہ جے کال کون تھا"۔

"بڑا آدمی تھا یار! بڑا آدمی تھا۔ اوہو...... اوہو...... اوہو...... اچانک ہی وہ چونک کر ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ پھر مدہم لہجے میں بولا۔

"مگر جے کال۔ جے کال"۔ اس کے الفاظ اور انداز کچھ عجیب سا تھا شاہ زیب اور جہانگیرہ دیر تک سوچتے رہے۔ چانک ہی وہ بولا۔

"تمہارا دل تو نہیں بھر گیا یہاں سے"

"خیر شکرے کی مہمان نوازی سے بھلا کس کا دل بھر سکتا ہے۔ لیکن اس دوران جو اندازہ ہوا وہ یہ کہ جے کال تمہارا بہت ہی قریبی ساتھی یا دوست تھا۔ اور تمہیں

اس کی موت کا بہت افسوس ہے''۔

''ہاں۔اس میں کوئی شک نہیں وہ میرا دوست بھی تھا ساتھی بھی تھا۔لیکن مجھ سے کہیں بڑی حیثیت کا حامل۔ وہ ایک بین الاقوامی شخصیت ہے۔ منشیات کے بڑے بڑے تاجروں سے اس کا رابطہ تھا کوئی معمولی چیز نہیں تھا وہ لیکن جو جوتا میرے منہ پر پڑا ہے میں اس کی چوٹ کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ میرا ڈیرہ، میرا شہر، میری بستی، میری آبادی اور اس آبادی میں جے کال کو قتل کر دیا گیا۔ میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ میرے اس گروہ میں کون سی کالی بھیڑ آگھسی بس اس چیز نے مجھے زیادہ پریشان کر رکھا ہے لیکن پتہ چل جائے گا۔ چھپ کر کہاں جائے گی مجھ سے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ جے کال کے بھی لاکھوں دشمن تھے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میرا کوئی آدمی کیسے بکا۔ یا پھر ایسا کون ہے جس نے میرے آدمی کی حیثیت سے میرے گروہ میں شمولیت حاصل کی اور کام کسی اور کے لیے کر ڈالا یا اپنے لیے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اچھا چھوڑ وان باتوں کو یہ بتاؤ۔ شاہ زیب تم نے کیا فیصلہ کیا۔

''شکرے! تم نے مجھ سے کیا کہا تھا تم مجھے یہاں کیوں لائے تھے''۔

''ہاں موضوع وہی ہے، اسی موضوع پر بات کر رہا ہوں، کیا فیصلہ کیا تم نے''

''کس سلسلے میں''

''آگے کام کرنے کا یار! ایک بڑا عجیب خیال آیا ہے میرے ذہن میں تم یہ بتاؤ کہ اگر تمہیں ایک بین الاقوامی منشیات کے اسمگلر کی حیثیت دے دی جائے تو کیا تم وہ حیثیت قبول کرو گے''۔

''حیثیتوں کو قبول کرنا تو بڑا آسان کام ہوتا ہے شکرے! لیکن ان حیثیتوں کو نبھانا بے حد مشکل''

''تمہاری تربیت کی جائے گی۔ تمہیں وہ مقام دیا جائے گا''

''بات وہی آجاتی ہے اگر تم کسی کام کے لیے مجھے موزوں سمجھتے ہو تو بس یہ سمجھ لو کہ مجھے انکار نہیں''۔

''گڈ..... ملاؤ ہاتھ یہی میں تم سے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ تو پھر تم ایسا کرو کہ لاہور نکل جاؤ۔ تھوڑے دن لاہور میں گزارو وہاں تمہیں دوسری ہدایات مل جائیں گی تو کراچی چلے جانا۔ کراچی سے یہ سمجھ لو کہ تمہارے کام کا آغاز ہو جائے گا''۔

''ایسا ہے تو ٹھیک ہے جیسا تم کہو گے''

''تو کل صبح نکل جاؤ تم یہاں سے''

''ٹھیک ہے''

''یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں بھگا رہا ہوں۔ اصل میں جے کال کی موت کے بعد سے ایک خلاء سا ہو گیا ہے۔ اس خلاء کو دور کرنے کے لیے میں کسی سے تمہاری سفارش کر رہا ہوں۔ جس سے تمہاری سفارش کر رہا ہوں وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ تم کبھی ان کے بارے میں نہیں جان سکو گے اس کا نام اور شخصیت تو صیغۂ راز میں رہی ہے اور رہے گی یہ سمجھ لو۔ میں بھی اس کی اصل شخصیت کو نہیں جانتا۔ لیکن میں اس کے لیے کام کرتا ہوں۔ جے کال اسی حوالے سے میرا شناسا بنا تھا اسے فوری طور پر جے کال کی موت کی اطلاع دے دی گئی ہے اور جے کال کی لاش پیک کر کے اس کے پاس کراچی روانہ کر دی گئی ہے وہ خود بھی تحقیقات کرے گا اور ہو سکتا ہے۔ کچھ بندے بھی یہاں بھیجے۔ لیکن میں تمہیں اس کے پاس بھیج رہا ہوں۔ تم دیکھ لینا۔ غور کر لینا وہ جو سوالات تم سے کرے انہیں سمجھ لینا۔ ابھی تو فی الحال کچھ دن کے لیے خاموشی اختیار کرنی ہے۔ تحقیقات مکمل ہو جائیں اس کے بعد دیکھیں گے''۔

''ٹھیک ہے''۔ شاہ زیب نے جواب دیا۔ پھر دوسری صبح اس کے لیے تیاریاں مکمل کر دی گئیں۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ دانیہ بھی روانگی کے لیے تیار تھی۔

شکرے نے انہیں رخصت کرتے ہوئے کہا۔

''یہ لڑکی تو میں تمہیں دے ہی چکا ہوں۔ خیال رکھنا اس کا اور سنو جب اس سے دل بھر جائے تو اسے یہیں واپس کر دینا اور اگر نہ بھرے تو رکھو اپنے پاس میری طرف سے تحفہ سمجھ لو۔ میں تو دل بھر جانے کی بات کر رہا ہوں''۔ شکرے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی بے جان چیز کے بارے میں بات کر رہا ہو۔

بہر حال اس کے بعد اس نے ان کی واپسی کا بندوبست کیا۔ جہانگیرہ خوش تھا۔ دانی بھی خوش تھی۔ خیموں سے باہر کی دنیا دیکھ کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور بولی۔

''جس بات کا یقین نہیں تھا وہ ہوئی ہے میرے مالک تیری شکر گزار ہوں تو نے میری دعا قبول کر لی''۔

شاہ زیب اور جہانگیرہ لاہور پہنچ گئے۔ بڑی زبردست ذمے داری پوری کر کے آئے تھے۔ لاہور کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں انہوں نے قیام کیا اور دو دن تک ہوٹل کے کمرے میں بند رہے۔ شاہ زیب دانی کے ساتھ اپنے کمرے میں تھا۔ وہ ڈبل روم تھا اور جہانگیرہ دوسرے کمرے میں وہ یہ اندازہ لگانا چاہتے تھے کہ یہاں تک کسی نے اس کا تعاقب تو نہیں کیا ہے۔ خیال شکرے کے آدمیوں کی جانب ہی تھا۔ لیکن پھر انہیں بھرپور طریقے سے اس بات کا یقین ہو گیا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے تب جہانگیرہ نے کہا۔

''ہاں بھئی۔ اب بتاؤ آگے کا کیا پروگرام ہے''

''دو پروگرام ہیں میرے، پہلا تو یہ کہ ہم کبیر شاہ صاحب کو ان کے کام کی اطلاع دیں گے۔ دوسرا ایک اور کام ہے جو میرا بالکل ہی ذاتی کام ہے''

''وہ کیا؟''

''بس یہ سمجھ لو کہ تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے''

''میرے لیے تو سب سے بڑا سرپرائز تم ہو میری جان''۔ جہانگیرہ نے بڑے اچھے موڈ میں کہا اور شاہ زیب ہنسنے لگا پھر بولا

''یہ جو لڑکی میرے ساتھ ہے میرے کمرے میں رہ رہی ہے اور جس کا قبیلے میں مجھ سے گہرا تعلق تھا''۔

''ہاں۔ اور جو تمہاری وجہ سے فروخت ہونے سے رہ گئی''

''بالکل بالکل اسی کی بات کر رہا ہوں''

''اس کی کیا بات کر رہے ہو''

''تمہارا کیا خیال ہے میرا اور اس کا کیا تعلق ہے''

''یار! اب اتنی پرائیویٹ باتیں مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو''

''خیر۔ میں تمہیں خود بتائے دیتا ہوں۔ میرے لیے یہ ایک بہن کی حیثیت رکھتی ہے میں نے اس کے ہر مفاد کا خیال رکھا ہے اور اسے چھوا تک نہیں ہے''۔ جہانگیرہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ پہلے عجیب سے انداز میں اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

''تم اتنے ہی نفیس انسان ہو کہ میں تمہاری بات پر مکمل طور پر یقین رکھتا ہوں''۔

''لڑکی کا کوئی سرپرست نہیں ہے سوائے ایک نوجوان کے اس کا نام رحیم خان ہے۔ لڑکی رحیم سے محبت کرتی ہے اور وہ بھی اس سے۔ میں اس کا سارا پتہ وغیرہ معلوم کر چکا ہوں۔ اب یہ بتاؤ کہ رحیم خان سے رابطہ تم کرو گے یا میں کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے رحیم خان کے حوالے کر دیا جائے اور اس کے بعد ہم کبیر شاہ سے ملاقات کریں۔ ویسے باقی تفصیلات بھی تمہیں معلوم ہیں بھئی یہ کہ شکرے نے ہمیں ایک

پتہ بتایا ہے وہ اس چکر میں تھا کہ ہم جے کال کی جگہ لے لیں اور اس کے لیے اس نے
ہمیں بڑے مخلصانہ انداز میں ایک کارڈ بھی دیا ہے۔ باقی کام وہ کہتا ہے کہ وہ براہ
راست کرے گا کیا کہتے ہو اس بارے میں''۔
''کارڈ کہاں ہے میں نے نہیں دیکھا''۔ میں نے کارڈ نکال کر جہانگیرہ کو دیا
اور جہانگیرہ اسے غور سے دیکھنے لگا۔ پھر گردن ہلا کر بولا۔
''بہت بڑی بات ہوگئی ہے یہ۔ شاہ جی ہی اس بارے میں سہی فیصلہ کریں
گے۔ یہ کارڈ سنبھال کر رکھو۔ ہم انہیں ساری رپورٹ دیں گے''۔
''تو پھر تم یہ کام کرلو۔ رحیم خاں کا پتہ لگاؤ''۔ جہانگیرہ کو رحیم خاں کا پتہ
لگانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے رحیم خاں سے صرف اتنا کہا تھا کہ کوئی اس
سے ملنا چاہتا ہے۔ رحیم خاں کو ہوٹل میں بلا لیا گیا تھا جہاں شاہ زیب نے اس سے
ملاقات کی۔ اس وقت دانیہ کو اس کے سامنے سے ہٹا دیا گیا تھا اور دانی جہانگیرہ کے
کمرے میں چلی گئی تھی رحیم خاں حیران حیران سا آیا تھا۔ بڑا خوبصورت اور صاف
ستھرا سا نوجوان تھا۔ حیرانی سے بولا۔
''جی سر! آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ جہانگیرہ صاحب نے کہا ہے کہ آپ
ایڈووکیٹ ہیں اور کسی اہم سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں''۔
''رحیم خاں تم کون سی فرم میں ملازمت کر رہے ہو''۔ رحیم خاں نے حیران
لہجے میں اپنی فرم کا نام بتایا۔ شاہ زیب نے سوال کیا۔
''کتنی آمدنی ہے تمہاری''
''معقول آمدنی ہے جناب! لیکن آپ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں''۔
''کچھ عرصہ پہلے تم نے ایک لڑکی سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا جس کا
نام دانیہ تھا۔ رحیم خاں ایک دم چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل

گئے۔ پھر اس نے ایک سسکی لے کر کہا۔
''کیا آپ کو دانیہ کے بارے میں کچھ معلوم ہے جناب! ۔ خدا کے لیے آپ
اس کے بارے میں بتا دیجئے آپ دانیہ کو کیسے جانتے ہیں اس کا نام آپ نے کیسے لیا''۔
''رحیم خاں! دانیہ سنا ہے بہت عرصے سے تمہاری منگیتر تھی''۔
''وہ میری زندگی ہے اس کے بارے میں مجھے صرف یہ پتہ چلا کہ اسے اغوا
کر لیا گیا ہے آپ کو پتہ ہے کہ ایسے واقعات کے سلسلے میں جن لوگوں کی ذمہ داری
ہوتی۔ وہ اپنی ذمہ داری کبھی پوری نہیں کر سکتے۔ دانیہ میرے سینے میں ایک زخم بن گئی
ہے''۔
''تمہارا کیا خیال ہے دانیہ کہاں چلی گئی ہے''
''میں نہیں جانتا جناب! اس بے چاری کیساتھ بڑا سنگین واقعہ پیش آیا تھا''۔
ہاں عورتوں کے سوداگروں نے اسے اغوا کر لیا تھا اور اسے فروخت کرنے
کے لیے یہاں سے بہت دور لے جایا گیا تھا۔ خوش نصیبی تھی کہ میں کسی طرح وہاں پہنچ
گیا اور آخر کار میں نے اسے واپس حاصل کرلیا تھا۔ تب دانیہ نے مجھے تمہارے بارے
میں ساری تفصیلات بتائیں اور میں اسے وہاں سے یہاں لے آیا''
رحیم خاں تڑپ اٹھا تھا وہ بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بولا۔
''یہاں...... یہاں...... آپ کا مطلب ہے لاہور میں''
''ہاں''
''اور وہ اب بھی آپ کے پاس ہے''
''خدا کے لیے...... خدا کے لیے'' رحیم خاں بے اختیار رو پڑا۔ اس نے شاہ
زیب کے پاؤں پکڑ لیے تھے رندھی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔
''خدا کے لیے مجھے اس سے ملا دیجیے۔ اس کے بغیر میں زندہ درگور ہو گیا

ہوں''۔شاہ زیب کو یہ اندازہ تو ہوگیا کہ رحیم خاں ہر حال میں دانی کو قبول کرلے گا۔ جہانگیرہ کو اشارہ کیا اور جہانگیرہ دانی کو دوسرے کمرے سے لے آیا۔تھوڑی دیر کے لیے انہیں بالکل تنہا چھوڑ دیا گیا۔شاہ زیب، جہانگیرہ کے کمرے میں جہانگیرہ کے ساتھ آ گیا تھا اس وقت اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھ رہی تھی اور اس کا رواں رواں فریاد کررہا تھا کہ معبودِ دو جہاں اگر یہ کوئی نیک کام ہے جو میں نے کیا ہے تو اس کے بدلے۔ان دو محبت کرنے والے انسانوں کی دعاؤں کے بدلے مجھے بھی میری منزل دے دے تیرا احسان ہوگا۔بہت احسان ہوگا تیرا۔مجھے وہ زندگی دے دے جو میری آرزو ہے۔جہانگیرہ بھی شاہ زیب کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔پھر اس نے کہا۔

''بڑی چوٹ کھائے ہوئے معلوم ہوتے ہو شاہ زیب! چلو کسی کے ذاتی معاملات نہیں کریدنے چاہئیں۔میں بھی اس کا خیال رکھتا ہوں۔یہ مسئلہ تو میرا خیال ہے حل ہو ہی گیا۔اب ہم کبیر شاہ سے ملاقات کرلیتے ہیں''۔اس سے زیادہ کی گنجائش بھی نہیں تھی۔

شاہ زیب نے دانیہ کو رحیم خاں کے حوالے کیا اور دونوں اسے دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے پھر اس کے بعد کبیر شاہ صاحب سے ایک خاص طریقہ کار سے رابطہ کیا اور کبیر شاہ نے فوراً ان دونوں کی خواہش ظاہر کی۔اور جہانگیرہ نے فوراً کبیر شاہ سے بات کی اور اس کے بعد شاہ زیب کو بتایا تھا کہ کبیر شاہ کو جے کال کی موت کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ظاہر ہے کہ خبر اس انداز میں عام نہیں ہوگئی ہوگی۔کبیر شاہ نے اپنی شاندار رہائشگاہ میں معمول کے مطابق ان دونوں سے ملاقات کی تھی اور خندہ پیشانی سے پیش آئے تھے۔دلچسپ بات یہ تھی کہ مکرم شاہ بھی اس وقت ان کے ساتھ موجود تھا دونوں بیٹھے ہوئے خوش گپیاں کررہے تھے۔چنانچہ دونوں نے کھڑے ہوکر ان دونوں کا استقبال کیا اور کبیر شاہ کہنے لگا۔

''ہاں۔بھئی کیا خبریں ہیں جے کال کا کچھ پتہ چلا''

''شاہ جی آپ کے لیے خوش خبری ہی ہے''

''کیا''

''شاہ زیب نے جے کال کو قتل کردیا''۔جہانگیرہ نے انکشاف کیا اور کبیر شاہ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔وہ یقین نہ کرنے والی نگاہوں سے جہانگیرہ کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے شاہ زیب کو دیکھا۔شاہ زیب سپاٹ چہرہ بنائے ہوئے بیٹھا تھا۔

''کیا کہہ رہے ہو تم...... کک...... کیا...... کیا واقعی...... واقعی...... مکرم شاہ''

''کچھ نہیں کہہ سکتا شاہ جی! بات اتنی معمولی نہیں ہے جتنے معمولی انداز سے کہہ دی گئی ہے۔پیچھے کچھ ہے شاہ جی۔ویسے جہاں تک شاہ زیب کا تعلق ہے اگر اتنے اعتماد سے یہ بات کہہ رہے ہیں تو غلط نہیں ہوسکتی...... ہاں...... غلط بے شک نہیں لیکن غلط فہمی ہوسکتی ہے''۔

''ایک منٹ...... میں ابھی تصدیق کیے لیتا ہوں''۔کبیر شاہ نے کہا اور وہاں سے باہر نکل گیا۔اپنی تمام شخصیت کو نظر انداز کرکے وہ دوڑتا ہوا باہر گیا تھا اور مکرم شاہ بھی اتنا ہی پر تجسس نظر آرہا تھا دیر تک وہ کچھ نہ بول سکا پھر اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

''میری بات سنی تم نے شاہ زیب! میں نے کہا تھا کہ شاہ زیب غلط نہیں کہہ سکتا لیکن اسے کوئی غلط فہمی ضرور ہوئی ہے''۔

''جواب میں مجھے کیا کہنا چاہیے مکرم شاہ صاحب!'' شاہ زیب نے پروقار لہجے میں کہا۔

''نہیں میں کہہ چکا ہوں کہ تم جھوٹ نہیں بول رہے ہوگے میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم نے کوئی بات غلط کہی ہوگی۔لیکن جے کال اتنی آسانی سے مارا جائے۔ یار...... وہ ایک تاریخ ہے۔پوری تاریخ...... اسے ہلاک کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے

پرانے دور کے جادوگروں کی ہلاکت ہوتی تھی یعنی پتہ یہ چلتا تھا کہ جادوگروں کی جان کسی چڑیا میں ہے اور چڑیا کسی پہاڑ کی چوٹی پر لگے ہوئے ایک درخت کے پنجرے میں بند ہے۔ اب پہلے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچو۔ درخت تلاش کرو۔ پنجرہ تلاش کرو۔ چڑیا کو مارو۔ تب کہیں جا کر جادوگر کا کچھ خانہ خراب ہو''۔ مکرم شاہ نے کہا اور ہنس پڑا۔ جہانگیرہ بھی ہنس کر بولا۔

''بہر حال شاہ جی! اگر باوثوق ذرائع سے معلوم کریں گے تو انہیں پتہ چل جائے گا۔ بات ہوگئی ہے اور وہی ہوا ہے جو ہم لوگ کہہ رہے ہیں''۔

''اگر ایسا ہوا ہے تو تم سمجھ لو کہ شاہ زیب کی تقدیر کے ستارے تو چمک گئے''۔

''اگر ایسا ہے تو سمجھ لیجیے کہ آپ کے ستارے چمکے ہوئے ہیں''۔ تقریباً کوئی بیس منٹ کے بعد کبیر شاہ اندر داخل ہوا تھا اور اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے شاہ زیب کو اٹھایا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر دیر تک لپٹائے رہا تھا۔ مکرم شاہ نے کہا۔

''تصدیق ہوگئی بھئی۔ ارے واہ بھائی کمال ہے کمال کر دیا شاہ زیب تم نے ویسے تم یقین کرو شاہ جی موجود ہیں۔ میں نے ان سے یہ بات کہہ دی تھی کہ شاہ زیب کمال ہی کر کے دکھائے گا دیکھ لینا تم۔ پھر ایک طرح سے جیسے خوشیاں منائیں گئیں۔ مکرم شاہ اور کبیر شاہ بہت زیادہ خوش نظر آ رہے تھے۔ کبیر شاہ نے مکرم شاہ سے کہا۔

''اور شاہ جی! شاہ زیب نے جو زبردست کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس کا صلہ بھی اسے بھرپور ملنا چاہیے''۔

اصل میں جے کال نے شکرے نامی ایک شخص کے ہاں پناہ لی تھی۔ جس نے اپنا ایک قبیلہ بنا رکھا ہے اور خود کو خانہ بدوش کہتا ہے۔ لیکن خانہ بدوشوں کے قبیلے میں''

''ارے واہ۔ تو وہ حرامی وہاں جا پہنچا تھا لیکن اس کا پتہ تم نے کیسے لگایا۔

''کافی قتل و غارت گری کر کے شاہ جی! ویسے شاہ زیب کمال کا بندہ ہے میں نے تو اس سلسلے میں صرف اس کا ساتھ ہی رکھا ہے۔ باقی اور کچھ نہیں کیا میں نے البتہ ایک انکشاف ہے۔ ایک خاص علاقہ ہے وہاں میلہ لگتا ہے۔ جس میں منشیات کی تجارت ہوتی ہے اور چھوٹے موٹے تاجر''

''معلوم ہے۔ معلوم ہے مجھے لال تالاب کی بات تو نہیں کر رہے''۔ کبیر شاہ نے کہا۔

''تو نے دیکھا''۔ جہانگیرہ نے شاہ زیب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''اصل میں وہاں پر اتنے چھوٹے پیمانے پر کام ہوتا ہے کہ میں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی۔ اچھا تو شکرے کے ہاں یہ سارا سلسلہ ہوا''۔

''ہاں اور شکرے نے مجھے ایک کارڈ دیا ہے اور کہا ہے کہ ان صاحب سے مل لوں یہ میری تقدیر بنانے میں بڑے معاون ثابت ہوں گے''۔

''دکھاؤ تو یار! ذرا وہ کارڈ''۔ پھر شاہ زیب نے وہ کارڈ نکال کر کبیر شاہ کے سامنے رکھا تو کبیر شاہ کی کیفیت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہوگئی۔

''یہ...... یہ...... کیا واقعی...... کیا واقعی...... اور مائی گاڈ...... مکرم شاہ! دیکھا میرے ایک بہت پرانے خیال کی تصدیق ہوئی ہے۔ ذرا دیکھو یہ کارڈ پڑھو شکرا اور جے کال ان کی سرپرستی میں کام رہے تھے اور اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو جے کال کی موت کے بعد شاہ زیب کو یہ مقام دیا جا رہا ہے۔ یہ ایک سفارش ہے۔ اوہو...... یہ تو ایک بہت سنسنی خیز بات ہوگئی جہانگیرہ...... ایسا کرو تم لوگ آرام کرو۔ کہیں جانے کی کوئی جلدی تو نہیں ہے مجھے آج کا دن دے دو۔ کچھ کام کرنے ہیں مجھ اس کے بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ ٹھیک ہے نا''۔

''جیسا آپ مناسب سمجھیں شاہ جی''

''مکرم شاہ تم ایک کام کرو۔ کسی ملازم کو بلا کر ان کے لیے ایک شاندار سا کمرہ تیار کرا دو انہیں کوئی تکلیف ہوئی تو مجھے تکلیف ہوگی۔ یہ بات تم کیئر ٹیکر کو بتا دینا''۔

''جی شاہ جی! مکرم شاہ نے کہا اور ان دونوں کو ساتھ لیے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا جس کمرے میں اسے پہنچایا گیا تھا وہ تمام آسائشوں سے پر تھا۔ قیام کے دوران جہانگیرہ نے کہا۔

''لگتا ہے شاہ زیب! کوئی بہت بڑا کام ہونے والا ہے کوئی بہت بڑی بات اب تم مجھے ایک بات بتاؤ''۔

''ہاں پوچھو''

''یار تقدیر نے تمہیں بہت بڑے منصب تک پہنچا دیا ہے۔ اصل میں ہر شخص کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے۔ تم ذرا سیاست دانوں کو دیکھو...... کیا کیا ہتھکنڈے استعمال ہوتے ہیں۔ اخبارات میں ان کے بارے میں کھلم کھلا برائیاں اور اچھائیاں لکھی جاتی ہیں۔ اقتدار ملا تو دنیا کے سب سے مقدس لوگ ہو گئے وہ۔ اقتدار سے اترے تو سمجھ لو برائیوں کے ہار پڑے ہوتے ہیں ان کے گلوں میں لیکن وہ دوبارہ اقتدار کے لیے کوشاں ہو جاتے ہیں نہ انہیں اپنی بدنامی کی کوئی پرواہ نہ نیک نامی کا خیال بس زندگی جس انداز میں بھی گزر جائے۔ صنعت کار ہیں صنعتیں لگاتے ہیں۔ تاجر ہیں تجارتیں کرتے ہیں۔ ہر طرح کا الٹ پھیر جائز سمجھتے ہیں۔ ایک کلرک صرف کلرک رہتا ہے۔ بے چارا پورا دن قلم گھسیٹنے کے بعد ایک معمولی سی تنخواہ کماتا ہے اور گھر میں بے بسی کی زندگی گزارتا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ تمہاری اپنی زندگی کا ایک مشن تھا۔ جو جاری تھا جو کچھ تم چاہتے تھے وہ تو نہیں ہو سکا۔ لیکن دنیا تمہارے لیے ایک لائن آف ایکشن متعین کر چکی ہے۔ تم یہ بتاؤ اس دنیا سے لڑ کر تم کوئی نیا مقام حاصل کر سکو گے''۔

''نہیں''۔ شاہ زیب نے جواب دیا۔

''پولیس تمہاری تاک میں ہے۔ تمہارے دشمن تمہارے تاک میں ہیں۔ دشمنوں کے ہاتھ چڑھ گئے اور انہوں نے تمہیں گولیوں سے بھون دیا تو تمہارے مقدمہ تک درج نہیں کیا جائے گا۔ پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو تمہیں دیکھتے ہی گولی ماردی جائے گی۔ اپنی زندگی بچانا ہر شخص کا فطری حق ہے۔ یہ حق تمہیں بھی حاصل ہے۔ تم نے اپنے لیے ایک مقام تلاش کر لیا ہے اور اپنے کام کر رہے ہو۔ میری اتنی بڑی تقریر کا مطلب یہ ہے کہ اب تم کبیر شاہ کی آنکھوں میں بہت بڑا مقام حاصل کر چکے ہو۔ یہ معمولی لوگ نہیں ہیں۔ تمہیں خود بھی اندازہ ہو گیا ہے۔ وہ ایس پی تمہیں پہچان چکا تھا۔ لیکن کبیر شاہ کا نام سننے کے بعد اس نے اپنی آنکھوں پر غلاف چڑھا لیا۔ سارا محکمہ پولیس ایسا ہی کرے گا۔ ہر شخص تردید کرے گا کہ تم شاہ زیب ہو یا اگر شاہ زیب ہو بھی تو وہ سب کچھ تم نے نہیں کیا۔ جو تمہارے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ شاہ زیب ایک مقام حاصل کرنے کے لیے نجانے کیا کیا چیز کھونی پڑتی ہے۔ میں تم سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کبیر شاہ نے تمہیں ایسا کام دیا جو باہر کی دنیا سے متعلق ہو۔ تو کیا تم اسے قبول کرو گے''۔

''اعتماد سے نہیں کہہ سکتا کہ ایسا کر لوں گا''۔ شاہ زیب نے جواب دیا۔

''اگر اتنے عرصے کی افاقت میں تمہیں یہ احساس ہوا ہے۔ کہ ہم لوگ آپس میں اچھے دوست ہیں تو میرے بھائی میں تمہیں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ اس سنہری موقع کو ہاتھ سے نہ گنواؤ۔ ہاتھ میں اقتدار آ جائے گا تو سارے دشمن زمین پر لیٹ جائیں گے۔ تمہارا پاؤں ان سب کی گردن پر ہوگا۔ اور وہ خوشی سے تمہارے اس پاؤں کو برداشت کریں گے''۔ شاہ زیب پرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا پھر بولا۔

''ٹھیک کہتے ہو جہانگیرہ مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے۔ میری زندگی کا ایک مقصد

تھا۔ ایک بہت ہی معمولی سی لڑکی کی تلاش جس کا نام لجیا ہے وہ مجھے مل جاتی تو میں نیکیوں اور سچائیوں کے راستے اختیار کر لیتا۔ ملک سے باہر نکل جاتا یا کہیں گوشہ نشین ہو جاتا اور اس کے ساتھ زندگی گزار دیتا ایسا لگتا ہے کہ وہ اس دنیا میں ہے ہی نہیں۔ کہیں سے بھی تو اس کا نشان نہیں ملا۔ اب اس کے بعد زندگی کسی بھی راہ پر چل پڑے۔ مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے''۔

''بالکل ٹھیک۔ تو پھر یوں سمجھ لو کہ کبیر شاہ کی پیشکش قبول کر لینا''۔

''اس سے پہلے میں ذرا اپنے گھر کو دیکھنا چاہتا ہوں''

''بوئے آسل''

''ہاں''

''ٹھیک ہے کبیر شاہ صاحب! تمہیں اس کا پورا پورا موقع دیں گے۔ بلکہ تمہیں اس سلسلے میں ہر طرح کی سہولت بھی دی جائے گی''۔

''مجھے کوئی سہولت درکار نہیں ہے اپنی آگ اپنے دامن کا قاتل ہوں میں''۔ شاہ زیب نے جواب دیا۔

☆
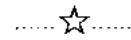
الیاس خاں اور جبار خاں بد باطن لوگ تھے۔ فطری طور پر غلط سوچوں کے حامل بہت سے معاملات چلتے رہتے تھے اور وہ اپنی برائیوں میں ڈوبے ہوئے تھے اس دن اتفاقیہ طور پر فخر خاں سے ایک شادی میں ملاقات ہوگئی۔ شادی ایک بڑے چوہدری کی بیٹی کی تھی اور اس نے بہت سے لوگوں کو بلایا تھا۔ فخر خاں بھی مدعو تھا اور الیاس خاں اور جبار خاں بھی فخر خاں کے ان لوگوں سے تعلقات بہت کشیدہ تھے۔ لیکن بڑے آدمیوں میں یہی ایک خوبی ہوتی ہے۔ دل میں لاکھوں کدورتیں ہوں لیکن جب ایک دوسرے کے سامنے آتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ان کے دلوں میں کوئی خاص بات ہی نہ ہو۔ فخر خاں خود ہی اٹھ کر اس جگہ آ بیٹھا تھا۔ جہاں چوہدری دلاور، چوہدری غیاث الیاس خاں اور جبار خاں بیٹھے ہوئے تھے۔ چوہدری غیاث نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آؤ فخر خاں آؤ...... کیسے ہو ایسی تقریبیں بڑی مبارک ہوتی ہیں کہ سارے لوگ مل بیٹھتے ہیں اور بڑی خوشی ہوتی ہے ایک دوسرے سے مل کر''۔

''ہاں خان جی! ایک دوسرے کے حالات بھی معلوم ہو جایا کرتے ہیں؟''

''بے شک...... بے شک اور سناؤ...... کیا ہو رہا ہے''

''بس خان جی اللہ کی مہربانی ہے۔ زمینداری ہو رہی ہے اللہ نے بڑی ترقی دی ہے۔ کام چل رہا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے۔ کہ مقابلہ ختم ہو گیا ہے''۔

''مقابلہ''

''ہاں خان جی! اصل میں ہم زمینداروں کا اصل کام تو مقابلے بازی ہی

ہے۔اس کے بغیر زندگی ادھوری معلوم ہوتی ہے۔ جب تک کوئی مقدمہ نہ چل رہا ہو۔ کوئی جھگڑا نہ چل رہا ہو۔کوئی زندگی زندگی ہوتی ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے خان جی! کہ بندہ اپنے دشمنوں کو نیچا دکھا کر خوش ہوتا ہے۔کوئی زندگی زندگی ہوتی ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے خان جی! کہ بندہ اپنے دشمنوں کو نیچا دکھا کر خوش ہوتا ہے لیکن ایک اور بہت بڑی حقیقت یہ ہے کہ جب دشمن نہ رہے تو جینے کا مزہ بھی آدھا رہ جاتا ہے''۔

''اوئے فخر خاں بوڑھے ہو گئے ہو لڑائی جھگڑے کی باتیں چھوڑو۔ کچھ اللہ رسول کو بھی یاد کرلیا کرو''۔

ہاں جی اللہ رسول کو بھلا کیسے بھول سکتے ہیں ہماری تو صبح کا آغاز ہی اللہ کے نام سے ہوتا ہے جی۔بس اللہ ترقی بھی دیتا ہے اور فخر کو موقع بھی دیتا ہے۔ اب ہماری اینٹوں کے بھٹے تو دیکھ لو۔ پورے پنجاب میں سب سے بڑے بھٹے بن گئے ہیں۔ ہر جگہ مال سپلائی ہوتا ہے۔ لاہور میں کنسٹرکشن کمپنیاں ہم سے اینٹیں منگواتی ہیں۔ اپنے ٹرالے چلا رکھے ہیں۔ کام جذبہ سے جدید ہوتا جا رہا ہے۔ بہت سے لوگوں نے مقابلے پر آنے کی کوشش پر آپ کی دعائیں ہیں خان جی! بھلا فخر خاں کا کسی سے کیا مقابلہ الیاس خاں اور جبار خاں اچھی طرح محسوس کر رہے تھے کہ فخر خاں ان پر ہی چوٹیں کر رہا ہے۔ جب وہ شادی سے واپس لوٹے تو بری طرح تن تنائے ہوئے تھے۔ شاہینہ بھی اتفاقیہ طور پر خود ملنے آ گئی تھی اور الیاس خاں اور جبار خاں کی حویلی میں دونوں بھائیوں کا انتظار کر رہی تھی۔ دونوں اسے دیکھ کر خوش ہوئے شاہینہ نے کہا۔

''کہاں گئے تھے بھائی جی''

''او بھئی .....شادی تھی ایک چوہدری کی بیٹی کی اس میں شرکت کے لیے گئے تھے تم بتاؤ ٹھیک ہو''۔

''ہاں بھائی جی! دعائیں ہیں آپ کی''

''اور وہ دونوں ٹھیک ہیں جہاں زیب اور اورنگزیب کے بارے میں پوچھ رہا ہوں''۔

''دونوں ٹھیک ہیں''

''اور وہ تخم حرام''

''شاہ زیب''

''اوہ......اور کس کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں''

''اس کی کیا معلوم خان جی''

''آیا تو نہیں اس دوران ملنے کے لیے''

''میرا خیال ہے اب وہ نہیں آئے گا''

''کیوں''

''خان جی! وہ بہت دور نکل گیا ہے''

''کیا مطلب ہے بھئی۔ ملک سے باہر چلا گیا ہے''

''نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے اور نہ ہی مجھے یہ معلوم ہے کہ ملک میں ہے اور ملک سے باہر چلا گیا ہے۔لیکن جرم کی دنیا میں وہ اتنی دور چلا گیا ہے کہ اسے اس کا کہیں بھی نظر آنا ناممکن ہے''۔

''اوہ۔ وہ پچھلے دنوں ایک خبر سنی تھی اس نے نادر شاہ کی آنکھیں پھوڑ دیں تھیں۔ چوہدری نادر شاہ ت بڑے کلے ڈھلے کا آدمی تھا۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ پر سنا ہے عیاشی میں پڑ گیا تھا اور کوئی چکر چل گیا تھا اس کا شاہ زیب نے اس کی آنکھیں پھوڑ دیں تھیں مقدمہ درج کرایا تھا اس نے پولیس میں''

''میں نے نہیں سنا۔ ایسی کوئی خبر مجھے پہنچانے والا کون ہے''۔

''ہاں۔ یہ تو ٹھیک ہے بہر حال تجھے یقین ہے کہ بھائیوں سے ملنے نہیں آتا

وہ''۔

''کیسے آئے گا اسکے بھائی اس کے ہوں تب نا۔ وہ تو ہماری مٹھی میں ہیں''۔

شاہینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ الیاس خان اور جبار خاں شادی کی تقریب سے واپسی کے تاثر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شاہینہ نے کہا۔

''کیا بات ہے۔ آئے تو آپ لوگ شادی سے ہیں اور آپ کے چہرے لٹکے ہوئے کیوں ہیں''۔

''اوہ بھئی وہ حرام کا جنا مل گیا تھا۔ فخر خاں کی بات کر رہے ہیں۔ ہمیشہ طنز کرتا ہے۔ ناک کاٹ دیتا ہے سب کے سامنے اور ہمارے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا تو جی تیرے اس دیور نے کالک مل دی ہمارے منہ پر بیٹا چھین لیا ہمارا بہت کچھ کر ڈالا ہے۔ اس نے اور ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے''۔

''ایک بات کہوں خاں جی! آپ لوگوں نے سہی معنوں میں اس سے مقابلہ ہی نہیں کیا۔ آپ مجھے بتایئے۔ پولیس فورس آپ کے ساتھ ہے۔ تعلقات آپ کے ہیں۔ جہاں زیب اور اورنگ زیب ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔ کیا آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ آپ ایک آدمی کو روک لیں''۔

''مطلب کیا ہے''

''مطلب یہ ہے کہ آپ قانونی طور پر بھی اس زمین کو استعمال کر سکتے ہیں۔ بات جب ناک کی آجاتی ہے خان جی! تو انسان روپے پیسے کی پرواہ کب کرتا ہے آپ چاہیں تو ڈٹ کر مقابلہ کریں بلکہ میں تو آپ کو مشورہ دوں۔ بوئے آسل کی وہ زمین جہاں آپ بھٹہ بنانا چاہتے ہیں۔ وہاں فخر خاں کی سرحد ملتی ہے۔ شاہ زیب کی ملکیت تھی نا۔ وہ کاغذات تو آپ نے غائب کرادیئے تھے اب آپ ایسا کریں کہ اس زمین کو قانونی طور پر خرید لیں''۔

''خرید لیں''۔ جبار خاں حیرت سے بولا۔

''ہاں''

''کس سے خرید لیں۔ شاہ زیب''

''نہیں''

''تو پھر''

''جہاں زیب اور اورنگزیب سے''

''مطلب کیا ہے بھئی۔ تمہاری بات سمجھ میں نہیں آئی''

''دیکھیں سائیں! پیسہ کسے برا لگتا ہے۔ کاغذات چونکہ اب شاہ زیب کی تحویل میں نہیں رہے۔ یہ کاغذات پہلے ردّ و بدل کرائے جائیں اور ان میں زمین کا مالک اورنگزیب یا جہاں زیب کو دکھایا جائے اور جسے بھی آپ ان زمینوں کا مالک دکھائیں۔ اس سے سودے بازی کرلیں''۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ بات ان کی سمجھ میں آرہی تھی۔ جبار خاں اور الیاس خاں سے کہا۔

''بات تو بھائی جان سمجھ میں آتی ہے''

''ہاں بھئی ہم سے تو یہ ہماری بہن ہی زیادہ تیز ہے''

''ہے کس کی بہن''۔ جبار خاں نے کہا اور قہقہہ لگانے لگا۔ الیاس خاں بھی ہنستا رہا جبار خاں نے کہا۔

''بات اصل میں ایک بھٹے کی آمدنی کی نہیں ہے۔ بات اس کمین کے جنے فخر خاں کی ہے جو موقع بے موقع ہم پر طنز کرتا رہتا ہے تو پھر اب بتائیں بھائی جان کیا کرنا چاہیئے''۔

''یار! تم ایسا کرو کل ہی لاہور چلے جاؤ۔ وہاں اپنے بندوں سے ملو۔ وہ کاغذات تو ہمارے پاس ہیں ہی ان کے تحت ملکیت تبدیل کراؤ۔ پیسہ کتنا ہی خرچ ہو

جائے پرواہ نہیں کیونکہ یہاں بات پیسے کی نہیں آن کی اور ناک کی ہے''۔

''ٹھیک ہے بھائی جان! میں چلا جاتا ہوں''

''اور شاہینہ! تم ہمارے لیے نرم فضا تیار کرو''۔

''وہ تیار ہے۔ اس بار بھی ان دونوں گدھوں کی یہ مجال نہیں ہے کہ میری مرضی کے خلاف جائیں اور پھر ایک بات میں جانتی ہوں کہ آپ رقم دکھائیں جی تھوڑی سی بھائیوں کو بھائی کے مقابلے پر نہ کھڑا کرے رقم تو میرا نام بھی شاہینہ نہیں ہے''۔

''رقم کی تم پرواہ نہ کرو جو وہ مانگے گا وہ ہم دیں گے ناک جو بچانی ہے''۔

جبار خاں لاہور چلا گیا۔ دونمبر کے کام ایک نمبر کے کاموں کی نسبت زیادہ آسانی سے ہو جاتے ہیں۔ وہاں ان لوگوں کے آدمی موجود تھے۔ جو ایسے لوگوں کا بندوبست کر سکتے تھے۔ جو ملکیت کا قومیت تبدیل کرا دیں۔ چنانچہ جعلی کاغذات تیار ہو گئے اور جبار خاں کامیابی کے ساتھ واپس پہنچ گئے تھے۔ شکیلہ بھی بہت کچھ بھول گئی تھی۔ زندگی کے عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے تھے یہ لوگ جبار خاں اور الیاس خاں کا استقبال کیا گیا تھا۔

''آیئے بھائی جان! بہت دن کے بعد آپ سے ملاقات ہوئی'' اورنگزیب نے پرجوش انداز میں کہا۔

''اوہ بھئی کیا بتائیں بس یوں سمجھ لو۔ شاہ زیب نے ہماری محبت کے سینے میں کیل گاڑھ دی تھی۔ غلط فہمیوں پر غلط فہمیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔

''آیئے...... آیئے...... بیٹھے آرام سے''۔ بڑی نشست گاہ میں خاطر مدارت کا سلسلہ شروع ہوا اور باتوں کا آغاز ہو گیا۔ جہاں زیب نے کہا۔

اصل میں غلطی ہماری بھی تھی۔ بہت بڑی غلطی تھی اور میں منہ کے سامنے بات کر رہے ہوں۔ شاہینہ کی غلطی بھی تھی ارے تھوڑی سی جائیداد تھی اس کے حوالے کر دیتے تو کیا ہوتا کہاں لے جاتا سسرا، ہم میں ہی شامل رہتا۔ چھوٹا بھائی تھا عزت بھی

کرتا تھا اور ویسے بھی پڑھ رہا تھا۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کرتا ہم اس کے دل میں سے بڑی آسانی سے یہ بات نکال سکتے تھے کہ بنجر زمینوں کو وہ سیراب کرے اور پھر سچی بات یہ ہے کہ دوسرے طریقہ کار بھی استعمال کیے جا سکتے تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ کوششیں کرتا ان زمینوں کو کارآمد بنانے کی اور ہم خفیہ طور پر ان زمینوں کو ناکارہ بنا دیتے۔ آج کل تو ایسا کیمیکل بھی آ چکا ہے۔ جو ایسے کاموں میں استعمال کیا جا سکتا کہ کارآمد زمینوں کو خراب کر دیا جائے۔ بھائی جی سارے کام ہو سکتے تھے بس جب عقل خراب ہوتی ہے تو سب کچھ خراب ہو جاتا ہے۔ وہ ماں سے کیے وعدے کے لیے جذباتی تھا بات یہاں تک پہنچ گئی۔

''میں اپنے بیٹے کی موت کو کبھی نہیں بھول سکتا''۔ الیاس خاں نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

''ہمیں بھی اتنا ہی افسوس ہے آپ یقین کریں یا نہ کریں''۔ جہاں زیب نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''ہاں بھئی۔ یقین نہ کرنے کی کیا بات ہے۔ رشتے تو ہیں نا ہمارے مگر اس بیوقوف کو نہیں معلوم کہ الیاس خاں اور جبار خاں کی گردنیں کتنی جھکا دی اس نے۔ کاش وہ ایسا نہ کرتا۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے فخر خاں شادی میں مل گیا اور وہ بےعزتی کی اس نے ہماری کہ اگر بھائیو! تم لوگ بھی ہوتے تو مرنے مارنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ آخر ہمارا رشتہ ہے تم سے جہاں زیب میں اس وقت تم سے ایک خاص کام سے آیا ہوں۔ یہ کہہ کر الیاس خاں نے جبار خاں کی طرف دیکھا جبار خاں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے موبائیل سے باہر اپنی لینڈ کروزر میں بیٹھے آدمی سے کہا۔

''ہاں بھئی آ جاؤ اندر آ جاؤ''۔ جہاں زیب اور اورنگ زیب کچھ نہیں سمجھ پائے تھے۔ شکیلہ نے بھی چونک کر ادھر دیکھا تھا۔ اچانک ہی اس کے دل میں خیال

ابھرا تھا کہ جبار خاں اور الیاس خاں کسی خطرناک ارادے سے یہاں نہ آئے ہوں۔ یہ دونوں خالص جرائم پیشہ لوگ تھے اور ان سے ہر بات کی توقع رکھی جا سکتی تھی۔ لیکن اندر آنے والا ہاتھوں میں ایک بریف کیس لے کر اندر آیا تھا۔ خاصا بڑا بریف کیس تھا۔ اس بریف کیس کو سامنے رکھ کر نمبروں والا تالا کھولا گیا اور پھر بریف کیس کھول دیا گیا۔ اس میں اوپر تک ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں چنی ہوئی تھیں۔

''پینتیس لاکھ ہیں یہ۔ پورے پینتیس لاکھ یہ میں تم لوگوں کے لیے لایا ہوں''۔ الیاس خاں نے کہا دونوں بھائی گنگ رہ گئے تھے۔

''کھرے نوٹ ہیں چاہو تو اٹھا کر گن سکتے ہو کیا سمجھے''۔

''سمجھ میں ہی تو کچھ نہیں آیا بھائی جی! یہ تحفہ آپ کس لیے لائے ہیں''۔ جہاں زیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جہاں زیب بڑی سنجیدہ بات ہے بھئی یہ پیپرز دیکھ تمہارے لیے تو میں نے کوئی مشکل چھوڑی ہی نہیں ہے۔ یہ دیکھو''۔ جبار خاں نے وہ کاغذات نکالے جو بنوا کر لائے گئے تھے اور انہیں سامنے کر دیا۔

''دیکھو اٹھا کر دیکھو''۔ الیاس خاں نے کاغذات کی طرف اشارہ کر کے کہا اور جہاں زیب نے وہ کاغذات اٹھا لیے اورنگزیب بھی ان پر جھک گیا تھا۔ دونوں یہ دستاویزات پڑھتے رہے اور ان کی آنکھوں میں حیرت کے نقوش نمایاں ہوتے رہے کاغذات دیکھنے کے بعد دونوں نے سراسیمہ نگاہوں سے الیاس خاں اور جبار خاں کو دیکھا تو الیاس خاں نے نرم اور متحمل لہجے میں کہا۔

ہاں بات بہت بڑی نہیں تھی۔ یہ ساری کاروائی پہلے بھی ہو سکتی تھی۔ اگر وہ بیوقوف تھوڑی سی عقل مندی سے کام لیتا۔ بلاوجہ ضد میں پڑ کر اپنی زندگی کو روگ لگا بیٹھا۔ خیر برا مت ماننا جہاں زیب اور اورنگزیب بھائی ہم لوگ اس کے دوست تو ہو ہی

نہیں سکتے۔ کیونکہ اس نے ہمارے گھر کا چراغ گل کیا ہے۔ لیکن ہم تمہارے دوست ضرور ہیں۔ یہ رقم کھرے کھرے سودے کی ہے یہ پرونوٹ جو ہم نے بنوائے ہیں یہ اس زمین کا سیل ایگریمنٹ ہے۔ دونوں بھائی اس پر دستخط کر دو ان کاغذات کی موجودگی میں اس زمین کا شاہ زیب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سرکاری طور پر اگر تم اسے سیل کر دیتے ہو تو پھر وہ ہماری ملکیت ہوگی۔ ہم تمہیں باقاعدہ اس کا معاوضہ دے رہے ہیں۔ بولو کیا کہتے ہو''۔

''بھائی جی! آپ معاوضے کی بات نہ بھی کرتے اور ایسے کچھ کاغذات تیار کرا لیتے تو ہم بھلا ان پر دستخط کرنے سے کیسے انکار کر سکتے تھے اور اب بھی اگر آپ یہ رقم ہمیں نہ بھی دیں تب بھی ہم آپ کے حکم پر یہ رقم آپ کو دیئے دیتے ہیں''۔

''نہیں بھائی نہیں دیکھو میں باقاعدہ کیمرہ لایا ہوں۔ تصویریں بنیں گی تمہاری اس دستاویز کو بھی ایکسپوز کیا جائے گا۔ بات ایسی ہی ہونی چاہیے ہم بھی مفت کا سودا نہیں کر رہے''۔

جہاں زیب نے اورنگزیب کی طرف دیکھا اور اورنگزیب نے خاموشی سے گردن جھکا لی تھی اور یہ طے کر لیا تھا کہ بھائی کے معاملے میں کچھ نہ بولے گا۔ پینتیس لاکھ کی رقم معمولی نہیں ہوتی ہزاروں کام بنتے ہیں چنانچہ کاغذات پر دستخط کر دیئے گئے لیکن اس کے ساتھ ہی جہاں زیب نے اس خدشے کا اظہار کیا تھا۔

''ایک بات بتایئے بھائی جی! رکاوٹ تو پہلے بھی نہیں تھی لیکن اب اگر اس نے کوئی مزاحمت کی تو تم کیا کرو گے''۔

''اب ہم پوری طرح سرکاری مدد لیں گے۔ پہلے ہم نے اتنے زوردار طریقے سے کاروائی نہیں کی تھی۔ اب یہ کاروائی کرتے ہیں کہ باقاعدہ ایک رپورٹ حکومت کو اس سلسلے میں دیں گے۔ لوگوں کی مدد بھی حاصل کریں گے۔ اور پھر کام

شروع کریں گے۔ جہاں زیب اور اورنگزیب درمیانے درجے کے لوگ تھے۔ بھائی
کے سلسلے میں بہت زیادہ جذباتی نہیں تھے۔ تیار ہوگئے اور تمام کاغذات مکمل کر کے
الیاس خاں اور جبار خاں کے حوالے کر دیئے۔ بہرحال الیاس خاں اور جبار خاں
وہاں سے واپس چل پڑے۔ پھر اس کے بعد انہوں نے باقاعدہ کارروائی کا آغاز کیا۔
سرکاری طور پر انہوں نے شاہ زیب کے خلاف تحفظ حاصل کیا اور آخر کار ہمیشہ سے کہیں
زیادہ تیاریوں کے ساتھ وہ ان زمینوں پر آ گئے۔ جو شاہ زیب کی ملکیت تھیں۔ چار
دیواری تعمیر کرائی گئی اور اس کے بعد دن اور رات کام ہونے لگا۔ جبار خاں اور الیاس
خاں پولیس کی نفری کے ساتھ خود بھی وہاں موجود ہوتے اور بھٹے کی تیاری کا کام پوری
ذمے داری کے ساتھ سرانجام دیا جانے لگا۔ دن اور رات بے شمار مزدور کام کرتے
رہے اور یہ لوگ خود حالات کی نگرانی کرتے رہے۔ کوئی مہینہ گزر گیا تھا اور کسی طرح کی
کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ ادھر بڑی برق رفتاری سے بھٹہ تکمیل کے مراحل طے کر رہا تھا
یہاں تک کہ اس کی چمنی بھی کھڑی ہوگئی اور غالباً فخر خاں نے اپنی سرزمین سے گزرتے
ہوئے اس چمنی کو دیکھا اور ششدر رہ گیا اس کے ساتھ اس کا ایک مشیر خاص موجود تھا۔
فخر خاں سکتے کے عالم میں اس چمنی کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے اپنے مشیر سے کہا۔

''خادم حسین ذرا دیکھو میری آنکھیں دھوکہ کھا رہی ہیں یا جو کچھ میں دیکھ رہا
ہوں وہی ٹھیک ہے۔ ادھر دیکھو وہ آسل کی زمینوں پر وہ بھٹے کا مینار کھڑا ہوا ہے''۔

''ہاں خان جی! یہ تو وہی زمینیں ہیں جن کی وجہ سے بڑی خونریزی ہو چکی
ہے''۔

''آؤ...... ذرا دیکھیں''۔ فخر خاں گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کا مشیر دوسرے
گھوڑے پر تھا دونوں گھوڑے دوڑاتے ہوئے وہاں پہنچے تو انہوں نے الیاس خاں اور
جبار خاں کو دیکھا جو دو گھڑسواروں کو دیکھ کر ایک دم سنبھل گئے تھے اور خاموشی سے ان کا

انتظار کر رہے تھے جب انہوں نے دیکھا کہ آنے والے فخر خاں وغیرہ ہیں۔ الیاس
خاں اور جبار کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔

''یار! آج دل ٹھنڈا ہوگیا۔ ایک بیٹے کی قربانی دے کر یہ مقام حاصل کیا
ہے۔ کیا وقت ہے میرا بیٹا زندہ ہوتا تو کتنی خوشی ہوتی اسے''۔ فخر خاں قریب پہنچ گیا اور
اس نے بھٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''واہ خان جی واہ۔ بھٹہ بنا ہی ڈالا آپ نے''۔

ہاں فخر خاں بھٹہ بنانا لازمی تھا۔ اصل میں چوہدریوں کی ناک تبھی اونچی
ہوتی ہے۔ جب دشمنوں کے منہ پر بھرپور جوتے پڑیں۔ کچھ لوگ شدید مخالف تھے۔
اس بھٹے کی تعمیر کے چلو شاہ زیب کا مسئلہ تو یہ تھا کہ زمینیں اس کی تھیں اور اس لیے وہ اپنی
زمینوں پر ایسا کوئی کام ہونے نہیں دینا چاہتا تھا۔ لیکن اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ جو
خیرخواہ نہیں تھے۔ اب دنیا ان کے منہ پر کالک ملے گی۔ تو ہمیں بھی مزہ آئے گا۔ اونچی
اونچی باتیں کرنے والوں کے سر زمین سے لگ گئے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کون
سی ہو سکتی ہے۔ الیاس خاں کا ایک ایک لفظ زہر میں ڈوبا ہوا طنز تھا۔ جسے فخر خاں محسوس
کر رہا تھا لیکن اس وقت بات ایسی ہی تھی کہ کچھ بول بھی نہیں سکتا تھا کہنے لگا۔

''ٹھیک ہے خان جی! بڑی خوشی کی بات ہے۔ تیار ہو جائے اور آپ اس کی
مہورت کریں تو ہمیں بلانا نہ بھولیے سب سے زیادہ مٹھائی ہم ہی لے کر آئیں گے آپ
کے لیے''۔ الیاس خاں طنزیہ انداز میں ہنسنے لگا۔ فخر خاں نے اپنے گھوڑے کا رخ موڑ
دیا تھا لیکن وہ بری طرح جھلس گیا تھا راستے میں اس نے خادم حسین سے کہا۔

''یار خادم حسین! تم لوگ بالکل بے کار لوگ ہو۔ بالکل بے کار''

''خان جی! ایک بات بتائیں آپ کو۔ یہ کام ہوا مہینے سوا مہینے میں ہی ہے
کیونکہ اس سے پہلے ہم جب بھی ادھر سے گزرے۔ نام ونشان نہیں تھا اس بھٹے کا''۔

''کوئی ایسا ہی کام ہوا ہے ویسے یار! وہ لڑکا بڑا خطرناک تھا۔ بڑا نقصان پہنچا ہے اس سے ہمیں لیکن پھر بھی ہمارے لیے اس طرح کارآمد تھا کہ کم از کم الیاس خاں اور جبار خاں اپنی یہ خوشی پوری نہیں کر سکتے تھے اب جب وہ لڑکا روپوش ہو گیا ہے۔ تو ان لوگوں نے اپنی کاروائی کر ڈالی ہے۔ تم لوگوں کو میں ناکارہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تم کوئی بھی ایسا کام نہیں کر سکے ہو اب تک۔ جو میرے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکے''۔

''آپ حکم دیں خان جی! بم لگا دیں بھٹے پر۔ ڈائنا مائیٹ لگا کر اڑا دیں اسے۔ آپ بتائیں کیا کریں؟''

''بس تم شاہ زیب کا پتہ لگا لو ہم کیوں وہ کام کریں جس سے ہم حکومت کی نگاہوں میں مجرم قرار پائیں''۔

''ہاں یہ تو ہے واقعی بات تو ایسی ہی ہے''۔

''شاہ زیب کو کسی طرح یہ اطلاع ملنی چاہیے کہ بھٹہ تعمیر ہو چکا ہے اور اس کی زمینیں اب الیاس خاں اور جبار خاں کے قبضے میں ہیں''۔

''خاں جی! مگر شاہ زیب کو تلاش کہاں سے کیا جائے''۔

''میری جیبوں میں دیکھو ہو سکتا ہے ان میں تمہیں مل جائے۔ الو کے پٹھے مطلب تو یہی تھا نا کہ تم لوگ کسی کام کے نہیں ہو۔ میں خود ہی کوشش کروں گا۔ دیکھوں گا۔ نادر خاں کی آنکھیں پھوڑ دی ہیں اس نے۔ اور بھی بہت سے کام کیے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہے وہ ابھی انہی علاقوں میں۔ ملک چھوڑ کر کہیں باہر نہیں بھاگا ہے۔ جبکہ پولیس بھی اس کی تلاش میں ہے۔ یار! لونڈا جی دار ہے یہ بات ماننی پڑے گی۔ چلو دیکھتے ہیں کہاں ملتا ہے وہ''۔

......☆......

شاہ زیب کبیر شاہ کی ناک کا بال بن چکا تھا۔ کبیر شاہ واقعی کچھ بین الاقوامی حیثیت ہی رکھتا تھا۔ ان دنوں شاہ زیب سے اس کی براہِ راست میٹنگیں ہوا کرتی تھیں۔ اس نے پہلی میٹنگ میں شاہ زیب سے پوچھا تھا۔

''ہاں بھئی شاہ جی یار! تمہارے اندر اتنی صلاحیتیں ہیں کہ تم آنکھوں کے راستے دل میں اتر سکتے ہو اور تم نے ایسا ہی کیا ہے۔ یقین کرو جے کال میرا بدترین دشمن تھا۔ بہر حال اگر وہ نہ بھی مرتا تو میری اس سے چلتی رہتی۔ کبھی میں اسے نقصان پہنچاتا اور کبھی وہ مجھے نقصان پہنچا دیتا۔ لیکن اس کے چکر میں تم جیسا بندہ مجھے مل گیا۔ یار! تمہارے سلسلے میں، میں کچھ منصوبے بنا رہا ہوں میں تمہیں ان سے روشناس کراؤں گا۔ باقی ساری باتوں کا مجھ پر چھوڑ دو۔ دھڑلے سے شہر لاہور میں گھومو۔ پورے پاکستان میں گھومو مجال ہے کسی کی کہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔ جو بات میں کہہ رہا ہوں اسے پتھر کی لکیر سمجھ لو۔ جاؤ پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ جاؤ۔ بتاؤ کہ تم شاہ زیب ہو لوگ تمہیں عزت دیں گے چائے پلائیں گے اور واپس کر دیں گے اس سے زیادہ اور کیا چاہتے ہو مجھ سے''۔

''نہیں کبیر شاہ صاحب! مجھے اندازہ ہے''۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ میں تمہیں ایک پروگرام بنا کر باہر بھیجوں میرے لیے کام کرو۔ پندرہ فیصد کمیشن دوں گا۔ تم یہ سمجھ لو اگر پچاس کروڑ کے منصوبے میں پندرہ فیصد تمہیں مل جائیں تو وہ رقم کتنی ہوگی اور پھر ایک دفعہ نہیں یہ رقم تو تمہیں ملتی ہی رہے

گی۔ بس ایک خاص چکر چلانا چاہتا ہوں میں اس کے لیے کام کرو"

"ٹھیک ہے شاہ جی! مجھے منظور ہے۔ پہلے بھی ایک بار میری مکرم شاہ صاحب سے بات چیت ہو چکی ہے بات یہ ہے کہ دنیا میرے لیے تنگ ہو گئی ہے خاص طور پر میرا کوئی اپنا نہیں رہا ہے تو پھر باہر کی دنیا ہی دیکھی جائے کیا ہرج ہے"

"یہ مت کہو ہم سب تمہارے اپنے ہیں۔ باقی رہے رشتے ناطے تو بیٹا۔ اس دنیا میں کوئی ایسا رشتہ نہیں ہے۔ جسے ٹھوس رشتہ کہا جا سکے۔ چلو ٹھیک ہے دیکھیں گے۔ دیکھیں گے۔ پھر اس کے بعد کبیر شاہ اسے بہت ساری باتیں بتاتا رہا تھا۔ اس دوران روبینہ بھی ایک بار شاہ زیب سے آ کر ملی تھی۔ عجیب لا ابالی سی لڑکی تھی اپنے آپ کو آدھا مرد کہتی تھی اور درحقیقت نظر بھی وہی آتی تھی۔ اس کے انداز میں کہیں بھی عورت پن نہیں جھلکتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ شاہ زیب کو ناپسند نہیں تھی۔ شاہ زیب ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کرنے لگا کہ کبیر شاہ کے مقاصد کے لیے کام شروع کرے اس سلسلے میں مکرم شاہ سے بھی بات چیت ہوئی تھی اور مکرم شاہ نے کہا تھا۔

"دیکھو شاہ زیب تم نے اندازہ لگایا ہوگا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور میں نے ہمیشہ تمہارے لیے بہتر سوچا ہے۔ بس کسی نہ کسی سے بغیر کسی وجہ سے کچھ قلبی لگاؤ ہو جاتا ہے اور وہ اس کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ اسے زندگی کے اچھے اور سہی راستے ملیں۔ لجیا کے ماں باپ محفوظ ہیں۔ میری طرف سے اطمینان رکھنا ان کی بھرپور خدمت کروں گا۔ لجیا کی تلاش کے لیے میں نے ایک پینل بنا دیا ہے۔ جو مختلف طریقوں سے اسے تلاش کرتا رہتا ہے۔ یقین کرو اس کے بارے میں جب بھی کوئی خبر ملی یا وہ خود ملی تو بڑے عزت و احترام کے ساتھ تمہاری امانت سمجھ کر اسے اپنے پاس محفوظ کر لوں گا۔ باقی جہاں تک کبیر شاہ کی بات کا تعلق ہے تو شاہ زیب ایک اچھے دوست اور اچھے ساتھیوں کی حیثیت سے تمہارے لیے میرا یہی فیصلہ ہے کہ تم کبیر شاہ کے مقصد کے لیے

کام شروع کر دو۔ اگر تم نے اپنا موقف بتایا ہے تو تم یہ سمجھ لو کہ وہ موقف تمہارے لیے بڑا بہتر رہے گا۔ تمہاری زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی بھی پیدا ہو جائے گی اور یہاں سے بھی تمہیں نجات مل جائے گی ابھی تو جو کچھ تم کر چکے ہو اس میں بہت سے تمہارے دشمن تمہارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ کبیر شاہ صاحب بے شک تمہارے پشت پناہ ہیں لیکن جن لوگوں کو تمہاری ذات سے نقصان پہنچا ہے وہ تو بہر حال گھاتیں لگائیں گے ہی۔ ان سے بھی کچھ عرصہ کے لیے چھٹکارہ مل جائے گا کیا سمجھے"۔

"ہاں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں"

"تو پھر کیا سوچا تم نے"

"نہیں ٹھیک ہے میں تیار ہوں"

"کبیر شاہ جی کسی بھی وقت تمہیں ملک سے باہر بھیج سکتے ہیں۔ تم اپنے آپ کو اس کے لیے تیار رکھو۔ میرا خیال ہے ایک دو بار اپنے بھائیوں سے مل لو۔ کوئی ہرج نہیں ہے"۔

"میرے دل میں بھی یہی خیال آ رہا ہے کہ میں ان سے جا کر ملوں"

"پہلے اور اب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اب تم آرام سے وہاں جاؤ اور جا کر ملو چاہو تو کبیر شاہ کے ایک دو بندے بھی اپنے ساتھ لے جانا"۔ شاہ زیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اس نے کہا۔

"کوئی ایسی بات نہیں ہے مکرم شاہ صاحب! آپ کو اندازہ ہے کہ آج تک اپنے ہی بل پر جیا ہوں آگے بھی اپنے ہی بل پر جیتا رہوں گا۔ ویسے کبیر شاہ صاحب کا ساتھی بن چکا ہوں ان کا نام بے شک استعمال کرتا رہوں گا"۔ شاہ زیب بوئے آسل جانے کی تیاریاں کرتا رہا۔ ایک اعلیٰ درجے کی لینڈ کروزر اسے مہیا کر دی گئی۔ اس میں زبردست اسلحہ موجود تھا۔ جہانگیرہ نے اسے ساتھ چلنے کی پیشکش کی لیکن شاہ زیب نے

اس سے کہا۔

''نہیں جہانگیرہ یہاں مجھے تنہا ہی جانے دو''

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی شاہ زیب''۔ جہانگیرہ نے کہا لیکن در پردہ جب کبیر شاہ کو یہ بات معلوم ہوئی کہ شاہ زیب اپنے گاؤں جا رہا ہے تو اس نے جہانگیرہ کو ہدایت کر دی کہ وہ چھوٹی سی نفری کے ساتھ احتیاط سے اس کا پیچھا کرے۔ تا کہ اگر وہ کسی مشکل میں پڑے تو جہانگیرہ اس کی مدد کر سکے۔ بوئے آسل جاتے ہوئے شاہ زیب جس راستے سے گیا۔ وہ اس کی زمینوں کی طرف سے جاتا تھا۔ دور ہی سے اس نے وہاں بڑی تبدیلی محسوس کی۔ چار دیواری اس کے بعد گیٹ اور بھٹے کی چمنی اس کے ساتھ ساتھ ہی اس نے پولیس کو بھی دیکھا تھا۔ پولیس کے دو ٹرک سامنے کھڑے ہوئے تھے شاہ زیب کی آنکھوں میں خون ابھر آیا۔ یہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی کہ بھٹہ کس نے تعمیر کرایا ہوگا۔ ایک لمحے کے اندر اس نے فیصلہ کیا اور اس کے بعد آگے بڑھ گیا۔ جہانگیرہ نے بھی اس علاقے کو دیکھا تھا چونکہ تمام صورتحال اس کے علم میں بھی آ گئی تھی اس لیے اسے بھی اندازہ ہو گیا کہ کوئی خطرناک صورتحال پیش آنے والی ہے۔ فاصلے طے کرنے کے بعد آخر کار شاہ زیب اپنی حویلی کے گیٹ پر پہنچ گیا اور پھر اس کی لینڈ کروزر آگے بڑھ گئی۔ جہاں زیب اور اورنگزیب اس وقت سامنے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ اور بالکل اتفاقیہ طور پر شاہ زیب کا تذکرہ ہی نکل آیا تھا۔ جہاں زیب نے اورنگزیب سے کہا۔

''پینتیس لاکھ روپے بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ بڑا کام ہو سکتا ہے ان سے لیکن ایک بات میں جانتا ہوں کہ بات خطرناک ہے اگر شاہ زیب کہیں سے آ گیا اور اس نے ہم سے سوال کیا تو اس سلسلے میں کیا کہو گے''۔

''کیا کہہ سکتے ہیں یہ بتاؤ''

''صرف ایک بات وہ یہ کہ ہمیں مجبور کر دیا گیا تھا''

''میں اس کی مخالفت کرتا ہوں''

''تو پھر''

''سیدھی سیدھی بات کہو کہ یہ الیاس خاں اور جبار خاں کا معاملہ ہے ہم اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے''

''اور یہ رقم فرض کرو اگر تم نے اسے اس رقم کے بارے میں بتا دیا تو کیا وہ یہ رقم ہمارے پاس رہنے دے گا''۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا''

''یہی میں کہہ رہا ہوں کہ اس مسئلے کو اس کے اور جبار کے درمیان رہنے دو۔ نہ ہم نے اس سلسلے میں کسی کام کا آغاز کیا اور نہ ہی خود اس میں ملوث ہوں گے''۔

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی''۔ دونوں میں یہ بات طے ہو گئی تھی۔ اور قسمت کا لکھا دیکھیے کہ شاہ زیب بھی اس وقت وہاں پہنچا تھا۔ لینڈ کروزر حویلی میں داخل ہو گئی تھی۔ یہی ایک حیران کن بات تھی انتہائی قیمتی لینڈ کروزر تھی۔ لیکن جب شاہ زیب ڈرائیونگ سیٹ سے نیچے اترا تو دونوں کے رنگ فق ہو گئے۔ عجیب مشکل کا شکار ہو گئے تھے وہ لوگ۔ ایک تو بھائی کے نظر آ جانے سے اندر کچھ تحریک ہوئی تھی۔ محبت تو خود ایک جذبہ ہوتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو لاکھ فرعون بنائے کہیں نہ کہیں سے محبت پھوٹ پڑتی ہے۔ چنانچہ شاہ زیب کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے دونوں کے بدن میں محبت کی لہریں پھوٹی تھیں۔ لیکن پھر ماحول کی سنگینی اور شاہ زیب کی یہاں موجودگی خوف کا باعث بن گئی اور ان کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ شاہ زیب خود ہی آگے بڑھ کر ان کے پاس پہنچا تھا اور اس نے انہیں سلام کیا تھا۔

''شش...... شش...... شاہ زیب...... تت...... تم''

''ہاں بھائی صاحب! زندہ ہوں اور آپ کے سامنے ہوں۔ میرا خیال ہے آپ لوگ کبھی کا مجھے مردہ سمجھ چکے ہوں گے اور اس وقت آپ کے دل میں یہ خیال آرہا ہوگا کہ یہ شاہ زیب نہیں اس کی روح ہے لیکن ثبوت کے طور پر میں آپ کو بتا دوں کہ روحیں گاڑیوں میں سفر نہیں کرتیں۔ ان کے لیے فاصلہ طے کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ لیکن آپ ڈریں نہیں زندہ ہو کر بھی میں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا''۔

''شاہ زیب...... تم...... تم''

''دوسرا سوال یہ کریں گے آپ کہ میں یہاں کھلے عام کیسے آیا ہوں۔ میری تاک میں تو پولیس بھی ہے باقی تمام لوگ بھی۔ خیر آپ سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا۔ بہت سے ایسے واقعات ہیں جو مجھے پریشان کرتے رہتے ہیں۔ آپ لوگ تو اپنی اپنی منزلیں تلاش کر بیٹھے۔ مجھے آپ نے بڑی کامیابی سے اپنے آپ سے دور کر دیا۔ کچھ الفاظ میں آپ کے کان میں ڈالنا چاہتا ہوں بھائی جان! شاید پہلے بھی کبھی یہ بات کہی ہو۔ زمینیں یہ دولت جائیداد کیا مجھے اگر آپ کے قدموں کی خاک سر پر رکھنے کو مل جاتی تو شاید آپ سے اس بات پر یقین کر لیں یا نہ کریں وہ آپ کی مرضی ہے۔ میں اس خاک کو اپنا سائبان بنا کر اس کی چھاؤں میں اپنی زندگی گزار دیتا۔ مجھے کیا لینا دینا تھا۔ دو بڑوں کے زیر سایہ پلتا۔ پر آپ نے اپنے سائے سمیٹ لیے نا۔ نہ صرف سائے سمیٹ لیے بلکہ سورج میرے سر پر لا کھڑا کیا۔ اتنی دھوپ دے دی مجھے کہ حیات کے آخری لمحے تک جلتا رہوں۔ شکریہ بھائی جان! میں تو خیر کچھ نہیں کہوں گا۔ آپ کو لیکن روز محشر ماں اور باپ کو جواب دینا پڑے گا آپ کو کیونکہ میں نے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا آپ ہی میرے دشمن بن گئے۔ مٹی کے ان میدانوں کے لیے جو کچھ بھی نہیں ہوتے۔ جن میں صرف دو گز جگہ آپ کی اپنی ہوتی ہے قبر کے لیے۔ باقی آپ کا کچھ نہیں ہوتا۔ مگر ٹھیک آپ نے جو کچھ کیا اپنی سوچ اور سمجھ کے مطابق کیا۔ بھائیوں نے بھی جو کچھ کیا

وہ بھی بہت اچھا کیا۔ اب ان جائیدادوں کو آپ سمیٹے رکھیے۔ میں آپ سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں۔ آپ سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ آسل کی زمینوں پر سے گزرا۔ وہاں الیاس خاں اور جبار خاں بھٹہ تعمیر کر چکے ہیں آپ کے علم میں ہے''۔ دونوں بھائیوں نے اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''تعمیر کر چکے ہیں''

''یقین نہیں آرہا یہ بات آپ کے علم میں نہیں ہے''

''نہیں ہم اس طرف نہیں جاتے۔ خاص طور سے اس خیال کے تحت کہ کہیں کوئی غلط نہ سمجھے''۔

''خیر آپ کے علم میں ہے یا نہیں۔ میں نے آپ کو بتا دیا۔ بہرحال ٹھیک ہے بات صرف اتنی سی تھی۔ مجھے اس زمین کا کوئی لالچ نہیں ہے۔ لیکن ماں سے وعدہ کیا تھا کہ اس زمین کے سینے پر آگ نہیں جلنے دوں گا۔ ماں کا وعدہ ہے بس اور کچھ نہیں ہے بھائی جان۔ اس زمین کا مجھے کچھ نہیں کرنا۔ آپ لوگ ٹھیک تو ہیں نا۔ میری بھابیاں ٹھیک ہیں''۔

''ہاں۔ تم...... اصل میں تم''

''جی جی اصل میں، میرا تو بوئے آسل سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے''

''نہیں میرا مطلب ہے کہ اس طرح کھلے طور پر آزادانہ پھر رہے ہو۔ یہ خطرناک نہیں ہے تمہارے لیے''

''اب دکھ یا مایوسی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ بہرحال آپ میرے بھائی ہیں۔ کچھ بھی ہو خون کو تکلیف دینا تو کسی کے لیے ممکن نہیں ہوتا''

''آؤ بیٹھو''

نہیں بھائی جان! آپ کو دیکھنے کو دل چاہا تھا۔ دیکھ لیا اب پتہ نہیں کہاں اور

کب ملاقات ہو چلتا ہوں''

''سنو تو سہی''

''کیا سنائیں گے مجھے ظاہر ہے آپ کے ایک لفظ میں بھی صداقت نہیں ہوگی۔ میں کوئی برا تاثر لے کر نہیں جانا چاہتا۔ اپنے بھائیوں کے بارے میں کہ وہ مجھ سے ایک بے مقصد جھوٹ بولیں۔ چلتا ہوں''۔ یہ کہہ کر شاہ زیب واپس لینڈ کروزر میں بیٹھا اور اسے ریورس میں ہی گیٹ تک لیتا چلا گیا۔ پھر اس نے اس کا رخ واپس موڑ دیا۔ وہ تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ اسے جہانگیرہ کی جیپ دکھائی دی اور وہ چونک پڑا۔ لینڈ کروزر کی رفتار تیز کر کے اس نے جہانگیرہ کو جالیا۔

جہانگیرہ نے جیپ رکوا دی تھی۔ شاہ زیب اس کے قریب پہنچ کر بولا۔

''میری حفاظت کے لیے میرے ساتھ لگے ہوئے ہو''

''معافی چاہتے ہیں اپنی مرضی سے یہاں نہیں آئے بھیجے گئے ہیں''

''چلو اچھا ہوا۔ تم میری گاڑی میں آجاؤ جہانگیرہ! ان لوگوں کو ساتھ ساتھ آنے دو۔ ہم لوگ ذرا بائیں سمت چلتے ہیں۔ ادھر ویرانہ ہے''۔ جہانگیرہ اپنی گاڑی سے نکل کر شاہ زیب کے ساتھ آبیٹھا۔ شاہ زیب نے کہا۔

''کب سے میرے پیچھے لگے ہوئے ہو!''

''شروع سے شاہ جی''

''وہ بھٹہ دیکھا جو تعمیر ہو چکا ہے''

''ہاں اور اس کے بارے میں ساری تفصیل بھی معلوم ہے''

''بھٹہ بن تو چکا ہے لیکن قائم نہیں رہنا چاہیے اسے۔ ابھی اس میں آگ نہیں جلی ہے یہ آگ ہی میرے سینے کی آگ ہے اسے جلنا نہیں چاہیے۔ جہانگیرہ مجھے بتاؤ میں کیا کروں''۔ جہانگیرہ سوچ میں ڈوب گیا پھر اس نے کہا۔

''یہ یقین ہے تمہیں کہ الیاس خاں اور جبار خاں نے ہی یہ سب کچھ کیا ہے''

''دوسرے کسی بندے کی مجال نہیں ہے کہ جو ان علاقوں میں اس زمین کی جانب رخ کر جائیں''۔

''تو پھر میں ایک تجویز پیش کرتا ہوں اگر آپ پسند کرو تو''۔ جہانگیرہ آہستہ آہستہ شاہ زیب کو کچھ بتانے لگا اور شاہ زیب نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی۔

''بالکل مناسب ہے جگہ کون سی رکھو گے''۔

''وہ ڈاک بنگلہ جہاں آپ پہلے بھی کچھ دن قیام کر چکے ہیں''

''فاصلہ بہت ہے''

''لیکن ضروری بھی ہے''

''ٹھیک ہے پھر ایسا کرو یہ کام تم کر ڈالو''

''میں کرلوں گا آپ بالکل بےفکر رہو۔ بلکہ آپ ایسا کرو جی کہ چلو ڈاک بنگلے چلو۔ خاموشی اختیار کرنا ہوگی۔ کام تو کرنا ہے''۔

''ہاں کام تو کرنا ہے''۔ خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ اس ڈاک بنگلے میں پہنچ گئے تھے۔ جہانگیرہ کے بارے میں بہرطور شاہ زیب کو یہ اندازہ تھا کہ معمولی آدمی نہیں ہے مکرم شاہ نے اس کے بارے میں کافی تفصیلات بتائیں تھیں اور جہانگیرہ خاصے عرصے اس کے ساتھ رہا تھا۔ اور اسے صورتحال کا کافی علم تھا۔ چنانچہ جہانگیرہ اپنے ساتھیوں کو لے کر چل پڑا۔ اور شاہ زیب وہیں ڈاک بنگلے میں رک کر انتظار کرنے لگا اس کے دل میں غم و غصے کا طوفان امنڈ رہا تھا۔ جبار خاں اور الیاس خاں بڑے ہی کمینہ صفت انسان تھے۔ انہوں نے ایک طرح سے اس کے بھائیوں کو یرغمال بنا لیا تھا۔ اپنے مفاد اور اپنے مقصد کی خاطر انہوں نے اتنا کچھ کیا تھا کہ اب اسے معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال شاہ زیب کو یہاں تنہائی ملی اور سوچ کے سوتے کھل

گئے۔ یادوں کا ایک ذخیرہ ہر شخص کے پاس ہوتا ہے اور یہ اس کا سرمایا حیات ہوتا ہے۔ چنانچہ یادوں کے ذخیرے میں چہرے ڈوبتے اور ابھرتے رہے۔ بہت دن کے بعد سکون کا کچھ وقت گزارا تھا اور اس وقت کا انتظار تھا جب جہانگیرہ واپس آ جائے۔ جہانگیرہ واپس آ گیا اور اپنا کام مکمل کر کے آیا۔ الیاس خاں کا دوسرا بیٹا انور اس کے ساتھ تھا بے ہوشی کے عالم میں اسے یہاں لایا گیا تھا۔ جہانگیرہ نے بتایا۔

''یہ سسرا ایک ایسے گھر میں عیاشی کر رہا تھا کہ جو بظاہر عیاش گاہ نہیں ہے۔ لیکن وہاں کے کمینوں نے اسے عیاشی کا اڈا بنا رکھا ہے اور اس طرح کے بگڑے ہوئے لڑکے وہاں آوارگی کرنے جاتے ہیں''۔

''مکان کے مکینوں کو یہ پتہ چل گیا کہ انور کو یہاں لانے والا کون ہے''

''نہیں شاہ جی! یہ کوئی بتانے کی بات تھی''

''ہاں۔ چلو ٹھیک ہے۔ اچھا اب یہ بتاؤ یہاں اپنے بندوں کو اس کی نگرانی پر رکھو گے''۔

''ہاں شاہ جی''

''ویسے ہمیں اس سے کوئی دشمنی نہیں ہے ان لوگوں سے کہہ دینا کہ اسے بس کہیں آنے جانے سے روکا جائے۔ باندھ کر رکھا جائے کسی دھوکے کی گنجائش نہ رہے تلاشی لے ڈالی ہے اس کی''

''مکمل تلاشی لے لی ہے جی راستے میں ہی چیک کر لیا گیا تھا''

''ٹھیک ہے اب چلیں ہم لوگ''

''ہاں شاہ جی! میرا خیال ہے کوئی ایسی مشکل نہیں ہے''۔

''ٹھیک ہے''۔ جہانگیرہ نے انور کا انتظام کیا۔ ڈاک بنگلے کے ہی ایک حصے میں اسے اپنے آدمیوں کی نگرانی میں چھوڑ دیا اور اسے ہدایت کر دی۔ انور کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے گئے تھے منہ میں کپڑا ٹھونسنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان لوگوں کو بتا دیا

گیا تھا کہ اس کے کسی سوال کا جواب نہ دیا جائے اور خاص طور سے اس بات کا خیال رکھا جائے کہ وہ نکلنے نہ پائے۔ بہر حال اس کے بعد شاہ زیب اور جہانگیرہ چل پڑے اس بار بھی لینڈ کروزر میں ہی سفر کیا گیا تھا۔ شاہ زیب کو اس بات کا بھی خوف تھا۔ کہیں اس کے بھائیوں نے الیاس خاں اور جبار خاں کو ہوشیار نہ کر دیا ہو۔ لیکن بہر حال جو کچھ بھی ہے اس سے نمٹنا تو پڑے گا رات بھی تاریکی میں وہ الیاس خاں اور جبار خاں کی حویلی پر پہنچے تھے۔ شاہ زیب اس حویلی میں داخل ہونے والے خفیہ راستے کو جانتا تھا۔ جہانگیرہ نے اپنے آدمیوں کو ہوشیار کر دیا تھا۔ اور انہیں ہدایت کر دیں تھیں کہ اندر اگر فائر کی آواز سنائی دے تو یہ ان کے لیے اشارہ ہوگا کہ وہ اندر گھس آئیں اور اس کے بعد انہیں ہدایت دے دی جائے گی انہیں کیا کرنا ہے۔ چنانچہ یہ ساری صورتحال بنائی گئی جہانگیرہ اور شاہ زیب حویلی میں داخل ہو گئے تھے اور اس کے بعد آوارہ روحوں کی مانند کوریڈور اور دوسرے علاقوں میں الیاس خاں اور جبار خاں کو تلاش کرتے رہے تھے۔ اپنی خواب گاہوں میں وہ لوگ مل گئے اور ایک جگہ رک کر جہانگیرہ نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولنے والا الیاس خاں ہی تھا۔ جہانگیرہ نے ریوالور کی نال اس کی پیشانی پر رکھ دی اور بولا۔

''خاموشی سے باہر آ جاؤ اگر زندگی چاہتے ہو تو''

''کک..... کون..... کون.....''

''سمجھ میں نہیں آئی بات''۔ جہانگیرہ غرایا تو الیاس خاں کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ جہانگیرہ نے گریبان سے پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لیا تھا۔ یہی کیفیت جبار خاں کے ساتھ ہوئی اور شاہ زیب اسے کھینچ کر باہر لے آیا اس کی غراہٹ ابھری۔

''خاموشی سے چلتے رہو۔ ذرا بھی جنبش کی تو کمر میں سوراخ ہی سوراخ ہو جائیں گے اور گولیاں بدن کے پار نکل جائیں گی''۔ دونوں کے جسموں میں کپکپاہٹ کا

شدید احساس ہو رہا تھا۔ جہانگیرہ اور شاہ زیب انہیں حویلی کے ایک سنسان علاقے میں لے آئے جہاں کسی کا وجود نہیں تھا۔ ابھی تک تو سارا کام نہایت بہتر طریقے سے ہو رہا تھا۔ انہیں کمرے میں لانے کے بعد پہلے سے تیار کی ہوئی چیزوں سے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے اور انہیں ایک ریوالور سے لگا کر بٹھا دیا گیا۔ شاہ زیب اور جہانگیرہ اپنے چہروں پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔ شاہ زیب نے جہانگیرہ کو اشارہ کیا تو جہانگیرہ باہر نکل گیا۔ الیاس خاں اور جبار خاں کو ایسی چپ لگ گئی تھی۔ جیسے ان کی قوت گویائی نے ہی ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔ تب شاہ زیب نے کمرے میں موجود ساری بتیاں روشن کر دیں اور اس کے بعد اس نے اپنے چہرے سے ڈھاٹا ہٹا دیا۔ الیاس خاں اور جبار خاں جو شدید سنسنی اور تجسس کا شکار تھے شاہ زیب کی صورت دیکھ کر دھک سے رہ گئے تھے۔ شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی خان جی بھٹہ تیار ہو گیا ہے آپ کا''۔ دونوں بھائیوں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ان کے حلق سے بے ہنگم آوازیں نکلنے لگیں۔

''نہیں نہیں۔ خود کو سنبھالیے بزرگ ہیں آپ میرے، عزت بھی کرتا ہوں میں آپ کی، ظاہر ہے میری بھابی کے بھائی تھے آپ میرا بھی کچھ رشتہ ہوتا ہے آپ سے مگر خان جی! ایسی بھی کیا بے مروتی آپ نے سب کچھ ہی کر لیا کچھ بھی نہیں سوچا آپ نے میرے بارے میں''۔

''بھئی...... وہ...... وہ...... وہ اصل میں فخر خاں سے ہماری خاصی دشمنی تھی''

''دیکھیں اپنی دشمنیاں اپنے بل پر کی جاتی ہیں۔ میری زمینوں کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ جبکہ میں نے آپ کو بتا دیا تھا کہ ان زمینوں سے میرا ایک جذباتی رشتہ ہے۔ پتہ نہیں آپ کا اپنی والدہ کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ کسی کی ماں کو میں کبھی بے احترامی کے الفاظ میں یاد نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ مائیں کسی کی بھی ہوں عظیم ہوتی ہیں۔ پر خان جی آپ نے میرے مسئلے پر میرے کیس پر غور نہیں کیا۔ میں نے کھل کر کہا تھا کہ یہ زمینیں تو میں آپ کے ایک حکم پر آپ کے قدموں میں ڈال دوں۔ مگر ماں سے وعدہ کیا تھا کہ انہیں گلزار بناؤں گا۔ آپ نے تو میرے وعدے کی نوعیت ہی بدل دی۔ میں انہیں گلزار تو نہیں بنا سکا لیکن خون سے نہلا دیا میں نے ان زمینوں کو اور خان جی! آپ لوگوں کا پیٹ اس سے نہیں بھرا۔ آپ مزید خون چاہتے ہیں''۔

''نن۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے''

''ایسی ہی بات ہے خان جی! آپ یہ بتایئے آپ نے کیا سمجھا تھا۔ میری موت کی تصدیق تو نہیں ہو سکی تھی۔ پھر آپ نے یہ بھٹہ کیوں تعمیر کرا ڈالا''۔

''وہ دراصل ہم نے۔ ہم نے تو یہ زمینیں خریدی تھیں''۔

''جی''

''ہاں قسم کھاتے ہیں پینتیس لاکھ میں یہ زمینیں جہاں زیب اور اورنگزیب نے ہمارے ہاتھ بیچ دیں تھیں''۔

''بک رہے ہیں آپ جھوٹ بول رہے ہیں''

''تم اگر اجازت دو تو میں تمہیں وہ دستاویزات دکھا سکتا ہوں''

''ہاں دستاویزات تو آپ مجھے دکھایئے۔ بتایئے کہاں ہیں وہ۔ تفصیل بتا دیجئے''۔

''میرے بیڈ روم میں ہیں''۔ الیاس خاں نے کہا

''اور وہاں آپ کی بیگم بھی سو رہی ہوں گی''

''ہاں تم...... تم مجھے لے چلو میں ایک معاہدہ کرتا ہوں تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ دیکھ صورتحال کو ٹھنڈے دل سے سمجھ لو''

''یہ معاہدہ تو میں اس سے پہلے آپ سے کر چکا ہوں۔ الیاس خاں صاحب''

شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیسا معاہدہ''

''انور کہاں ہیں''۔ شاہ زیب نے کہا

''انور''۔ الیاس خاں کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں بولا۔

''زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ انور میرے قبضے میں ہے''۔

''کیا''۔ دونوں بھائیوں کی پھٹی پھٹی آوازیں ابھریں۔

ہاں۔ چاہیں تو تصدیق کر لیجیے۔ جس طرح سے بھی آپ کا دل چاہے۔ پہلے میں نے اسے اپنے قبضے میں کر کے ایک ایسی جگہ پہنچا دیا ہے۔ جہاں تک آپ لوگوں کی پہنچ نہ ہو سکے۔ اس کے بعد یہاں آیا ہوں۔ اکیلا بیٹھا رہ گیا ہے آپ کا الیاس خاں صاحب! اپنے گھر کو بالکل بے چراغ کرنا پسند نہیں کریں گے۔ آپ نے اگر کوئی گڑ بڑ کی تو انور کو مار دیا جائے گا۔ اس کے لیے میں نے مناسب بندوبست کر دیا ہے''۔

''نہیں''۔ الیاس خاں کے حواس گم ہو گئے تھے جبار خاں بھی بری طرح پریشان نظر آ رہا تھا۔

''بالکل سچ کہہ رہا ہوں آپ سے آپ پہلے میری باتوں کی تصدیق کر لیجیے اس کے بعد میرا کام کیجیے''۔

میں سچ بتا رہا ہوں تمہیں ہم لوگ باقاعدہ منصوبے کے تحت جہاں زیب اور اورنگزیب سے ملے تھے۔ پینتیس لاکھ روپے میں وہ ان کاغذات تیار کرا لیے تھے۔ جن کے تحت وہ زمینیں تمہاری نہیں بلکہ جہاں زیب کی ملکیت تھیں اور اس کے بعد اس ملکیت کو انہوں نے فروخت کر دیا میرے کمرے کی سفید الماری میں وہ کاغذات رکھے ہوئے ہیں۔ نیلے رنگ کی ایک فائل ہے تم جا کر خود نکال لو''۔

''یقین کر لوں آپ کی بات پر''

''میں نے کہا نا سچ بول رہا ہوں میں''

خیر چلیے ٹھیک ہے بھائی تو ہمیشہ کے غدار ہیں اس عالم میں مجھے لانے والے وہی دونوں ہیں مگر پھر بھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا ان کے لیے۔ مگر آپ نے ذرا سی غلطی کی بہت زیادہ اچھی سوچ نہیں ہے آپ کی۔ آپ ایک کام کرتے زمین کی خریداری کرنے کے بجائے میرے بھائیوں کو آپ کسی طرح مجبور کرتے کہ بھٹہ وہ خود تعمیر کرائیں اگر وہ خود بھٹہ تعمیر کرا دیتے تو مسئلہ بالکل الگ ہو جاتا۔ مالک چاہے آپ ہی قرار دیے جاتے ان کے لیکن بھٹہ وہ تعمیر کراتے اس طرح مسئلہ ذرا کچھ اور ہو جاتا''۔ دونوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی شکل دیکھی۔ واقعی یہ تدبیر تو زمینوں کی خریداری سے بھی بہتر تھی۔ مسئلہ صرف فخر خاں کو نیچا دکھانا تھا۔ بھٹہ تعمیر ہو جاتا تو فخر خاں کی مونچھیں نیچی ہو جاتیں۔ وہ تو کہتا تھا کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ کام تو ابتداء ہی میں کیا جا سکتا تھا۔ الیاس خاں نے جبار خاں سے کہا۔

''جبار! کیا عمدہ بات کہی ہے شاہ زیب نے کاش! ہم ایسا کر لیتے''

''یہ لفظ کاش جو ہے نا۔ بڑا ہی عجیب لفظ ہے کسی بھی چیز کو مستحکم نہیں رہنے دیتا۔ اب بتائیے کیا کرنا ہے آپ کو انور کی زندگی سے کوئی دلچسپی ہے''۔

''نہیں دیکھو۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں ہمارے انور کو کچھ نہ کرنا کچھ نہ کہنا اس کے بعد تو سب کچھ میرے لیے بے مقصد ہو جاتا ہے''۔

''ٹھیک ہے تو پھر آپ ایسا کریں۔ ہمارے ساتھ چلیں وہاں پر میرے آدمی موجود ہیں آپ انہیں حکم دیں کہ بھٹہ گرا دیں ایک ایک اینٹ توڑ کر پھینک دیں اگر آپ ایسا کر لیتے ہیں تو انور کی زندگی بچ جائے گی کیا سمجھے''۔ دونوں خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگے پھر الیاس خاں ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے میں تیار ہوں''۔

فخر خاں غم واندوہ کے عالم میں اپنی حویلی کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا تھا اس کے سامنے اس کے دو وفادار غلام انہیں غلام ہی کہنا چاہیے۔ جس کی اپنی کوئی اوقات نہ ہو۔ جس کی اپنی کوئی آواز نہیں ہے۔ اور وہ صرف دوسروں کی ہاں میں ہاں ملانے کے لیے زندہ ہوں انہیں غلام کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ جو اپنی زندگی نہ جی سکے وہی غلام ہوتا ہے۔ فخر خاں اپنے دونوں آدمیوں کے سامنے منہ لٹکائے بیٹھا ہوا تھا۔ تب ان میں سے ایک نے کہا۔

''چوہدری جی! غم وافسوس کرنے سے کچھ نہیں ہوتا وہ لوگ کتنا بڑا کام کرتے ہیں ہم دیکھیں گے۔ مقابلہ تو جی زندگی بھر کا ہوتا ہے جب دو بندے میدان میں اترتے ہیں تو داؤ پیچ لگائے جاتے ہیں۔ اور یہی داؤ پیچ لگائے جاتے ہیں اور یہی داؤ پیچ مستقبل کا فیصلہ کرتے ہیں۔ چوہدری جی! ہم آگے بڑھ کر ان سے مقابلہ کریں گے اپنے مال کی کوالٹی بہتر بنائیں گے اور جی''۔

''کتے دے پتر۔ بک بک کیے جا رہا ہے مال کوالٹی بہتر بنائیں گے تیرا خیال ہے کیا میں اس لیے افسردہ ہوں کہ میرے مال کی کھپت کم ہو جائے گی۔ گدھے کی اولاد میں اگر اپنے بھٹوں کو بم سے اڑا دوں تب بھی مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے ایک اینٹ نہ بکے میری بات اس کی نہیں ہے بات صرف اس کی ہے کہ میرے بھٹوں کے مقابلے الیاس خاں اور جبار خاں کے بھٹے بن گئے۔ میری ناک نیچی ہو گئی۔ ناک کی قیمت باقی ساری قیمتوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ بکواس کر رہا ہے مقابلہ کرے گا بزنس میں۔

دوسرا آدمی دبے دبے لہجے میں ایک گردان کیے جا رہا تھا۔

''بم سے اڑا دیا جائے۔ بم سے اڑا دیا جائے۔ بم سے اڑا دیا جائے''۔

اپنی بات ختم کر کے فخر خاں نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

''تجھے کیا ہو گیا بھئی''

''بات تو آپ نے خود ختم کر دی چوہدری جی! بات تو آپ نے خود ہی ختم کر دی''۔

''دیکھو...... تم دونوں میرا دماغ مت خراب کرو۔ اگر زیادہ دماغ خراب ہو گیا۔ میرا تو گولی مادوں گا تمہیں۔ میں اس وقت جس قدر پریشان ہوں''۔

''چوہدری جی! اپنی پریشانیوں کا حل تو آپ نے خود ہی تلاش کر لیا''

''اچھا''۔ فخر خاں ادھر ادھر دیکھنے لگا تو دوسرا آدمی جلدی سے بولا۔

''بم سے اڑا دیا جائے۔ بم سے اڑا دیا جائے چوہدری جی! یہ کام تو آسانی سے ہو سکتا ہے۔ الیاس خاں کے بھٹے کو بم سے اڑا دیا جائے جی! کیا کہتے ہیں آپ''۔

فخر خاں نے ایک گہری سانس لی۔ چند منٹ ان دونوں کو دیکھتا رہا پھر دانت پیس کر نیچے سے جوتا اٹھایا۔ اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا دونوں آدمی اچھل کر کھڑے ہو گئے تھے۔

''کوئی غلطی ہو گئی چوہدری صاحب! کوئی غلطی ہو گئی''

''بھٹے کو بم سے اڑا دیا جائے اور اس کے بعد حرام کے جنو...... تم لوگ تو اپنے اپنے کاموں میں لگ جاؤ گے اور مجھے جیل بھیج دیا جائے گا''۔

''آپ کو کیوں جی؟''

''چلو پھر ایسا کرو ایک اقرار نامہ لکھ دو اس میں یہ لکھ دو کہ تم نے اپنی مرضی سے بھٹے کو بم سے اڑایا ہے۔ یہ میری ہدایت نہیں تھی۔

''ہم ہم ہم ہم...... ہم ہم لکھ دیں''

''ابے تو اور کیا۔ مشورہ دے رہے ہیں سسرے! چلو اٹھو تیار ہو جاؤ''۔ بوہدری نے کہا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ وہ ان دونوں کو ساتھ لیے ہوئے باہر آیا۔ ینڈ کروزر کے نزدیک ہی ڈرائیور کھڑا ہوا تھا۔ وہ لینڈ کروزر کی جانب بڑھا تو ڈرائیور نے جلدی سے نیچے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا۔ لیکن فخر خاں ڈرائیونگ سیٹ کے برابر الا کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ کھلے ہوئے دروازے سے وہ دونوں اندر داخل ہو گئے تھے۔ ینڈ کروزر حویلی کے گیٹ سے باہر نکل آئی۔ فخر خاں نے کہا۔

''بھٹے پر چلو۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ خاردار تاروں کے راستے سے نکل آئے اس وقت سامنے بھٹے پر کچھ لوگ جمع تھے اور الیاس خاں اور جبار خاں بھی ہاں موجود تھے۔ پیچھے سے بہت سے ٹرالے تیز رفتاری سے چلے آ رہے تھے۔ اور ان پر مزدور سوار تھے۔ فخر خاں کو دلچسپی محسوس ہوئی وہ آگے بڑھا اور اس بھٹے کے قریب پہنچ گیا جو ابھی ابھی تعمیر ہوا تھا۔ کچی اینٹوں کی بے شمار دیواریں بنی ہوئی تھیں۔ ابھی اس بھٹے پر آگ نہیں جلی تھی۔ فخر خاں کو محسوس ہوا کہ کوئی گڑ بڑ ہے۔ وہ اپنے ڈرائیور سے بولا۔

''چلو ذرا پاس چلو۔ الیاس خاں اور جبار خاں سے بات چیت ہی کر لی جائے۔ کوئی گڑ بڑ معلوم ہوتی ہے۔ یہ ٹرالے جو آ رہے ہیں تا یہ مجھے شبے کا شکار کر رہے ہیں۔ ڈرائیور نے لینڈ کروزر تیزی سے آگے بڑھا دی اور وہ الیاس خاں اور جبار خاں کو ایک لمحے کے اندر یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان دونوں کے چہرے لٹکے ہوئے ہیں۔ کوئی خاص ہی بات معلوم ہوتی تھی۔ دونوں نے ناخوشگوار انداز میں فخر خاں کو دیکھا تو فخر خاں نے انہیں سلام کیا لیکن اس سلام کا بھی کوئی جواب نہیں ملا تھا فخر خاں آگے بڑھ گیا اور بولا۔

''اگر بھٹے کا افتتاح کرنا تھا خان جی! تو کم از کم پڑوسیوں کو تو دعوت دے دی ہوتی ارے مخالفت ضرور ہے ہماری اور دعا کے لیے ہاتھ تو ہم بھی اٹھا دیتے۔ جھوٹے ہی کیوں نہ سہی آگ لگا رہے ہو بھٹے کو''۔ الیاس خاں یا جبار خاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ٹرالے نزدیک آ کر رک گئے تھے۔ تب الیاس خاں نے سامنے کھڑے ہوئے مزدوروں سے کہا۔

''چمنی گرادو''

''گرادو''۔ کسی اور کے بجائے فخر خاں کے منہ سے نکلا۔

''فخر خاں اپنے کام سے کام رکھو کسی کے دکھ کا مذاق نہیں اڑاتے''

''دکھ...... قسم اللہ کی بات سمجھ میں نہیں آئی ہے خان جی''

''اگر سمجھ میں نہیں بھی آئی ہے تب بھی تم یہاں سے چلے جاؤ''

''رہنے دو۔ رہنے دو۔ بڑے آدمیوں کو ساتھ ہونا چاہیے۔ پھر آپ لوگوں کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک گاڑی سے آواز آئی اور فخر خاں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ دروازہ کھول کر شاہ زیب نیچے اتر آیا اسے دیکھ کر فخر خاں کے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شاہ زیب کو دیکھنے لگا تو شاہ زیب مسکراتا ہوا آگے بڑھ آیا پھر بولا۔

''خان جی نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا ہے اور اب وہ یہاں بھٹہ نہیں بنا رہے ہیں''۔

''برداشت کی ایک حد ہوتی ہے شاہ زیب! فخر خاں! شاہ زیب نے انور کو اغوا کر لیا ہے اور اب اس کی زندگی اور موت کے بل پر ہم سے یہ بھٹہ گرانے پر کہہ رہا ہے لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا شاہ زیب! لڑائی ختم نہیں ہوئی ہے۔ لڑائی بھرپور طریقے سے جاری ہے۔ بھول جاؤ اس بات کو کہ تم ہمیشہ ہم پر قابو پاتے رہو گے۔ آخر

ار ایک نہ ایک دن تمہارا کھیل ختم ہو جائے گا۔ اور میں قسم کھاتا ہوں کہ پیچھے لگا رہوں گا ور جب بھی مجھے موقع ملا میں اس زمین کو حاصل کر کے اس پر اس پر بھٹہ بناؤں گا''۔

واب میں شاہ زیب نے قہقہہ لگایا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''میں بھی آپ کے سامنے قسم کھاتا ہوں خان جی! کہ آپ کو کبھی یہاں بھٹہ ہیں بنانے دوں گا۔ اور جب یہ دیکھوں گا کہ میری زندگی کے دن ختم ہو گئے ہیں۔ اور ب اتنا وقت نہیں ہے کہ میں آپ کو اس کام سے روکوں تو آپ دونوں کو ختم کر کے خود کشی کر لوں گا۔ آپ کے بیٹے کو بھی ختم کر دوں گا۔ آپ کی نسلوں میں کوئی یہاں کوئی بھٹہ نہیں بنا سکے گا۔ میری بھی بات آپ سن لیں۔ چلیں اب جلدی کریں فخر خاں مٹھائی کا ڈبہ گاڑی میں رکھا ہوا ہے۔ ابھی ذرا چمنی گر جانے دو اس کے بعد ہم سب مل کر مٹھائی کھائیں گے چلو خان جی جلدی کرو۔ میرے آدمی زیادہ انتظار نہیں کر سکیں گے۔

مزدور بھٹے کی چمنی پر پل پڑے تھوڑی ہی دیر کے بعد چمنی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا گیا۔ ٹرالوں والے مزدور کچی پکی اینٹیں ٹرالوں پر بار کرنے لگے۔ ایک ایک ٹرالا آگے بڑھ رہا تھا۔ شاہ زیب غالباً راستے ہی سے مٹھائی خرید کر لایا تھا۔ سب سے پہلے اس نے ڈبہ جبار خاں کے سامنے پیش کیا تو جبار خاں کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''شاہ زیب ہمیں خودکشی پر مجبور مت کرو''۔

''مرضی ہے آپ کی خان جی۔ فخر خان تم تو مٹھائی کھاؤ گے نا''۔ فخر خاں نے ہنستے ہوئے مٹھائی کی ڈلی اٹھالی تھی۔

☆

بہر حال الیاس خاں اور جبار خاں کے منہ پر ایک بار پھر کالک لگ گئی تھی بھٹے کی ایک ایک اینٹ اٹھالی گئی تھی۔ اور بات یہیں تک ختم نہیں ہوئی تھی جب تک کہ زمین بھٹے کے تمام تر نشانات سے پاک نہ کر دی گئی۔ انور کو نہیں چھوڑا گیا تھا پوری زمینوں کی صفائی کے بعد ہی انور اپنے گھر پہنچا تھا۔

ادھر شاہینہ۔ شکیلہ۔ جہاں زیب اور اورنگزیب وغیرہ کو بھی ساری صورتحال معلوم ہو گئی تھی۔ اورنگزیب نے جہاں زیب سے کہا تھا۔

''بھا جی! لگتا ہے یہ سسرے ہم دونوں کو بھی مروا کر چھوڑیں گے شاہ زیب جو کچھ بن چکا ہے۔ وہ آپ کی نگاہ میں بھی ہے۔ اگر بگڑ گیا تو بھول جائے گا ہم دونوں اس کے کون ہیں''۔ جہاں زیب ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا تھا۔

ادھر شاہ زیب ان دنوں شدید ترین ذہنی بحران سے گزر رہا تھا۔ اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیا ملا ہے اسے زندگی میں سب کی بے اعتنائی۔ خون ہی اگر دشمن ہو جائے تو پھر انسان کی زندگی میں کیا رہ جاتا ہے۔ سوائے غم واندوہ کے ماں کی قبر پر جا پہنچا۔ بہت دیر تک قبر پر رخسار رکھے روتا رہا۔ اسے اپنے سر میں ایک نرم سی لرزش کا احساس ہوا۔ سوچ ہی ہوتی ہے انسان کی جذبات نجانے کیسی کیسی تصویریں پیش کر دیتے ہیں یہ جذبات کی تصویریں ہی تھیں لیکن اس وقت گھر گیا تھا پتہ نہیں کسی نے مخبری کی تھی۔ یا پھر بالکل اتفاق تھا۔ کہ پولیس نے چاروں طرف سے گھیرا تھا۔ شاہ زیب کو اس کا احساس ہو گیا ماں کے سامنے کھڑا ہو کر کہا۔

''تو میرے ساتھ نہیں ہے ماں۔ لیکن تیری ہی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے موت کا کوئی افسوس نہیں ہے اگر تھوڑا سا احساس ہے تو صرف اتنا کہ میں اس وعدے کو پورا کر دوں جو میں نے تجھ سے کیا تھا ابھی تک مجھے اس کا موقع نہیں ملا ہے اور اس کے بعد وہ وہاں سے بھاگ نکلا تھا اب وہ خاصا ماہر ہو گیا تھا۔

پھر پولیس اس کے پیچھے لگ گئی۔ شاہ زیب کے منہ سے بڑبڑاہٹ نکلی۔

''نہیں دوستو! ابھی نہیں۔ ہوسکتا ہے ایک وقت ایسا آ جائے کہ میں خود اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دوں لیکن یہ اس وقت ہوگا جب اس زمین پر باغ لہلہا رہا ہوگا۔ اس سے پہلے ممکن نہیں ہے اپنی جان مت کھوو۔ میں ایک خونی دیوانہ ہوں۔ اس وقت کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ پھر پولیس چکمہ کھا گئی۔ شاہ زیب ایک بار پھر ان کے چنگل سے نکل گیا تھا اور اس وقت اس نے نجانے کون سے علاقے میں آموں کے ایک باغ میں پناہ لی تھی۔ آموں کا موسم نہیں تھا۔ درخت خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ پولیس پیچھے رہ گئی تھی۔ لیکن رات کو ایک مدھ بھری آواز نے اسے متوجہ کرلیا۔ یہ آواز مکرم شاہ کی تھی وہ اس آواز کے تاروں سے کھنچتا ہوا مکرم شاہ تک پہنچ گیا۔ مکرم شاہ سوز کے عالم میں گا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں لیکن اس کے انداز میں چونکنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں دیکھ چکا تھا تمہیں۔ بلکہ بہت دور سے دیکھ رہا تھا اور انتظار کر رہا تھا۔ بلکہ گانا میں نے تمہارے لیے ہی شروع کیا تھا تاکہ تم یہاں آ جاؤ''۔ شاہ زیب نے گردن ہلائی تھی۔

''کیا بات ہے چہرہ اترا اترا کیوں ہے''

''بس شاہ جی! کبھی کبھی زندگی سے بڑی اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ مکرم شاہ خود بھی سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے کہا۔

''ہاں زندگی سے کبھی کبھی واقعی اکتاہٹ ہوتی ہے۔ زندگی ہے ہی اتنی بے زار کرنے والی چیز''۔

''شاہ جی! آپ نے آج تک میرے لیے جو کچھ کیا ہے یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہزار مرتبہ مر کر زندگی ملے تو آپ کے احسانات نہیں چکا سکتا تھا۔ لیکن شاہ جی آپ کے بارے میں جاننے کی آرزو اس طرح میرے دل میں ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ مکرم شاہ نے آنکھیں اٹھائیں اور پھر بولا۔

''بہت مختصر سی کہانی ہے میری۔ ہم زمیندار لوگ یا تو سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں اور سونے کے انبار تلے ہی مر جاتے ہیں۔ یا اگر مصائب کا شکار ہوتے ہیں تو اس طرح کہ بس کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ مختصر میں تمہیں اپنے بارے میں بتائے دیتا ہوں۔ حیدر شاہ میرا جڑواں بھائی ہے ہم نے ماں کے سائے تلے ہوش سنبھالا تھا کیونکہ باپ ہمارے بچپن میں ہی مر چکا تھا۔ ذمے داریاں بے پناہ تھیں۔ حیدر شاہ مجھ سے مختلف مزاج کا آدمی تھا۔ میں ایک ذمے دار شخص تھا اور حیدر شاہ عیش وعشرت والا۔ اپنے بھائی کے اندر کی کہانیاں نہیں کھولوں گا۔ کام کی باتیں بتاؤں گا بس حیدر شاہ جو برائی کرتا تھا۔ اس کی ذمے داری میرے کندھے پر رکھ دیا کرتا تھا۔ کیونکہ ہم دونوں ایک ہی شکل وصورت کے مالک تھے۔ وہ بہت چالاک تھا۔ سارے الزامات مجھ پر عائد ہو جاتے تھے اور میں کہتا ہی رہ جاتا تھا کہ ماں میں وہ نہیں ہوں۔ لیکن کوئی نہیں مانتا تھا سب حیدر شاہ کو اچھا انسان سمجھتے تھے۔ بس میرے ساتھ ایک حادثہ ہوا اور میں اپنی ایک ٹانگ ضائع کر بیٹھا۔ اس کے بعد ماں مر گئی۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ بہت عرصے کے بعد حیدر شاہ نے اپنے آپ کو سنبھالا لیکن میری جانب توجہ نہیں دی اور پھر وقت نے ہمیں ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا۔ مکرم شاہ گردن جھکا کر خاموش ہو گیا۔ شاہ زیب سکتے کے عالم میں۔ یہ دوسری کہانی سن رہا تھا۔ اسے تو ان

دونوں کے بارے میں کچھ اور ہی معلوم ہوا تھا۔لیکن بہر حال یہ تو وقت ہی جانتا ہے کہ کون سی کہانی سچی ہے اور کون سی جھوٹی۔مکرم شاہ نے کہا۔

''کوئی تازہ واقعہ ہوا ہے تمہارے ساتھ''۔اور شاہ زیب نے اسے الیاس خاں اور جبار خاں کے بارے میں بتا دیا۔مکرم شاہ گردن ہلا کر بولا۔

''میری رائے ہے کہ کچھ وقت کے لیے تم اپنے آپ کو بھول جاؤ۔یہ بھول جاؤ کہ کون ہو کیا کرتے رہے ہو''۔میں تمہیں ایک پتہ بتائے دیتا ہوں۔شمشاد گھانی جو کچھ بھی ہے لیکن بہر حال تم اس کے پاس چلے جاؤ۔میرے حوالے سے وہ تمہارے ساتھ بہتر سلوک کرے گا''۔بہر حال شاہ زیب ہمیشہ ہی مکرم شاہ کی بات مانتا تھا۔اور اس وقت بھی اس نے مکرم شاہ کی بات پر پوری پوری توجہ دی اور آخر کار شمشاد گھانی کے گاؤں چل پڑا۔

گاؤں پہنچتے پہنچتے اسے شام ہوگئی تھی۔گاؤں پہنچ کر اسے پتہ چلا کہ شمشاد گھانی کھاتا پیتا زمیندار ہے۔گاؤں میں اس کا بڑا عالی شان مکان ہے۔بڑے عیش و عشرت سے رہتا تھا۔مکان پختہ ہونے کے ساتھ ساتھ خوب کشادہ بھی تھا۔مکان کے گرد وسیع احاطہ تھا جس میں جگہ جگہ درخت تھے باغیچہ تھا کنواں تھا۔جس سے پانی نکالنے کیلئے ہینڈ پمپ لگا تھا۔مہمانوں کے قیام کے لیے الگ ڈیرہ تھا۔نوکروں کے رہنے کے لیے مکان کے پچھواڑے مٹی کی بنی ہوئی کوٹھریاں تھیں جن کے قریب ہی مویشیوں کا باڑا اور اصطبل تھا۔اصطبل میں عمدہ نسل کے کئی گھوڑے بھی تھے۔گائے اور بھینسوں کے علاوہ اونٹ بھی تھے۔احاطے کے چاروں طرف اونچی دیوار تھی۔اور اندر داخل ہونے کے لیے دو پھاٹک تھے۔بڑے پھاٹک پر مسلح پہرے داروں کا پہرہ مسلح رہتا تھا۔چھوٹا پھاٹک پیچھے کی طرف تھا جو گھر میں کام کاج کرنے والے نوکروں کی آمد ورفت کے لیے مخصوص تھا۔شمشاد گھانی کا مکان طرزِ تعمیر کے اعتبار سے دیہات کی

پرانی حویلیوں کی طرح کا نہ تھا۔بلکہ شاید نیا نیا بنا تھا۔اسے دیکھ کر اگر اندازہ لگانے کی کوشش کی جائے۔تو یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ شمشاد گھانی خاندانی زمیندار نہیں ہے اس نے بعد میں ترقی کی ہے اور یہ مکان بھی بعد ہی کی تعمیر ہے۔شمشاد گھانی نے شاہ زیب کو بڑے احترام کے ساتھ خوش آمدید کہا۔

''اور بڑے اچھے انداز میں اسے اپنے درمیان رکھا۔رات کا کھانا ساتھ ساتھ ہی کھایا تھا۔اور پھر وہ شاہ زیب کو سونے کی ہدایت کر کے چلا گیا۔جاتے ہوئے اس نے کہا کہ کل صبح کو بات چیت ہوگی۔لیکن صبح کو شاہ زیب کو ناشتہ اپنے کمرے میں ہی کرنا پڑا تھا۔البتہ دوپہر کے کھانے پر اس نے شاہ زیب سے کہا۔

''معاف کرنا شاہ جی! بندہ چاہے کتنا ہی فارغ البال ہو جائے۔جب تک اپنے کام خود نہ کرے کام ہوتے نہیں ہیں۔کیا بڑے شاہ جی نے میرا مطلب ہے مکرم شاہ جی نے تمہیں بتا دیا تھا۔کہ میں کون ہوں۔کیا ہوں''۔

''زیادہ نہیں''

''تو کوئی بات نہیں میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔زمینداری کے ساتھ ساتھ میرا دھندہ اسمگلنگ وغیرہ کا بھی ہے اور دوسرے چھوٹے موٹے جرم بھی کر لیتا ہوں لیکن انہیں جرم نہیں سمجھتا''۔

''زیادہ بات نہیں ہوئی آپ کے بارے میں''

''اصل میں یہ سب تو زمینداروں کے کھیل ہیں زمینداری تو سچ پوچھو۔میرے آدمی چلاتے ہیں۔میرے لیے کرنے کو کوئی کام نہیں تھا اور زمیندار خالی بیٹھے بیٹھے کرے بھی کیا۔ہم لوگ دوسروں کے ڈنگر اور مویشی اٹھواتے ہیں۔مزاروں کی عورتیں اٹھواتے ہیں ادھر سے ادھر کرتے ہیں۔بیچ دیتے ہیں یا رقم لے کر واپس کر دیتے ہیں۔کبھی بھی دو پارٹیوں کے بیچ میں پڑ کر سودا بھی کرا دیتے ہیں اور اپنا کمیشن

وصول کر لیتے ہیں۔ تمہیں یہ بات بتاؤں یہ دھندہ برا نہیں پر عورتوں کی خرید و فروخت کا
دھندہ مجھے پسند نہیں ہے۔ شاہ زیب کا دل ایک لمحے کے لیے دھڑکا پھر اس نے کہا۔
''جب یہ سارے کام کرتے ہو۔ تو یہ کام کیوں پسند نہیں ہے''۔
''اوہ بھائی! میری گھر والی بڑی سخت ہے۔ اس نے میرے دوسرے
دھندے برداشت کر لیے لیکن عورتوں کے دھندے سے مجھے روک دیا کہنے لگی کہ خبردار
گھانی میں یہ کام مت کیا کر''۔
''اور دوسرے کام''
''بس اب مجبوری تو ہوتی ہے نا کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ ادھر کا مال
ادھر ادھر کا ادھر اپنا کام آرام سے چل رہا ہے۔ اور سچ بتاؤں کہ یہ اسی کمائی سے میں
نے زمینیں خریدی ہیں سارے کام اسی سے ہوئے ہیں اب یار تو اپنے بارے میں بھی تو
بتادے کہ تو کیا کرتا ہے''۔
''میرے بارے میں مکرم شاہ صاحب نے تمہیں خط میں نہیں لکھا''
''کچھ نہیں لکھا بس اتنا لکھا ہے کہ پولیس تمہارے پیچھے ہے۔ تمہیں پولیس
سے بھی بچانا ہے۔ اور عیش و عشرت کی زندگی بھی رہی ہے ویسے ایک بات کہوں یار جی
لگ جاؤ آکر میرے دھندے سے۔ یہ دھندہ برا نہیں بلکہ دور سے برا ہو جاتا ہے اوپر
سے نیچے تک سبھی کھاتے ہیں۔ اسمگلنگ کی روک تھام کرنے والے اور دبا کر کھاتے
ہیں وہ نہ کھائیں تو یہ اسمگلنگ کا دھندہ بالکل ہی نہ چلے۔ نزدیک جاؤ گے تو تمہیں اس
میں ایسے ایسے چہرے نظر آئیں گے۔ جنہیں دیکھ کر تم حیران رہ جاؤ گے۔ ویسے تم سے
اور بھی بات کرنی ہے مجھے''۔
''ہاں کہو''۔ شاہ زیب کو یہ آدمی خاصا دلچسپ لگا تھا۔
''کل رات چینی اور تیل سے لدے میرے ساتھ آٹھ ٹرک سرحد پار جا رہے

ہیں۔ میں اس سلسلے میں شام کو ہی نکل جاؤں گا۔ سارا بندوبست مجھے پہلے ہی کرنا ہوتا
ہے۔ بس میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ آج رات مجھے تیرے ساتھ روٹی نہیں کھانی اکیلا ہی
وقت گزارنا ہے جس کی ضرورت ہو۔ ہاں میں جا رہا ہوں۔ وہ جگہ خاصی خطرناک ہے
کیا سمجھے''۔
''ہاں'' شاہ زیب نے کہا
''یار! تم بہت کم بولتے ہو اور مجھے کم بولنے والے ہمیشہ خطرناک لگتے ہیں۔
خیر چھوڑو بعد میں بات کریں گے ذرا کام کرلوں ویسے شاہ جی نے تیرے بارے میں
بڑی کم باتیں لکھی ہیں''۔
''ہاں میں بتاؤں گا تمہیں اپنے بارے میں''۔ شاہ زیب نے اپنے اسی تصور
کے ساتھ کہا جو اس کے دل میں ابھرا تھا۔ اسے اپنی جگہ بتائی گئی تھی۔ وہ وہاں داخل ہوا
اور بستر پر دراز ہو گیا۔ دن ڈھلے وہ کمرے سے باہر نکلا اور دوڑتا ہوا درختوں کی طرف
چل پڑا۔ اس نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر چاردیواری کے قریب دو نوعمر لڑکے کھیل رہے
ہیں۔ ان کے لباس بوسیدہ اور میلے کچیلے تھے ایک کا قد ذرا نکلتا ہوا تھا۔ آنکھیں چھوٹی
چھوٹی تھیں عمر نو دس سال سے زیادہ نہیں تھیں دوسرا بھی اسی عمر کا ہوگا۔ سر گٹھا ہوا اور قد
ذرا زیادہ۔ وہ بڑا خاص ہی کھیل کھیل رہے تھے انہوں نے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے
پتھر ایک دوسرے سے ٹکرائے پھر سامنے پڑے ہوئے کھلاڑی کے پتھر پر نشانہ باندھ کر
ہاتھ میں بندھا ہوا پتھر زور سے پھینکا مگر نشانہ چوک گیا اب دوسرے کی باری تھی اس
نے زمین پر پڑا ہوا اپنا پتھر اٹھایا۔ اس نے بھی اپنے دونوں پتھروں کو ایک دوسرے
سے ٹکرا کر بجایا ایک ہاتھ اٹھایا اور پہلے کھلاڑی کے پتھر کو تاک کر اس طرح پتھر پر مارا
کہ وہ ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ دونوں پتھروں کے ٹکرانے سے زور کی آواز پیدا ہوئی۔ جس
کھلاڑی کا پتھر پٹ گیا تھا۔ اس کا منہ لٹک گیا۔ وہ ہار گیا تھا۔ کھیل کے اصول کی رو سے

وہ زمین پر دونوں ہاتھ لٹکا کر گھوڑا بن گیا۔ دوسرا اپنی جیت پر مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ شاہ زیب کو اپنا بچپن یاد آ گیا اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ بے اختیار ماضی میں پہنچ گیا۔ اسے اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ اس کے قدم کب آگے بڑھے اور ان دونوں کے قریب پہنچ گئے۔ اس کے قدموں کی آہٹ سن کر دونوں نے ہی گردن موڑ کر دیکھا۔ جو کھلاڑی گھوڑا بنا ہوا تھا وہ آگے بڑھا اور شاہ زیب کو غور سے دیکھنے لگا اس کی آنکھوں سے حیرت جھلک رہی تھی۔ شاہ زیب نے اسے غور سے دیکھا پیٹھ پر بیٹھا ہوا لڑکا اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا تھا اور پھسل کر دھڑام سے نیچے گرا اور پھر دونوں تیز رفتاری سے وہاں سے بھاگ گئے۔ شاہ زیب ہوش کی دنیا میں واپس آ گیا تھا۔ نجانے کیوں ماضی سے بہت سے دروازے اس کے سامنے کھل گئے تھے اور ہر جھروکے سے ایک یاد اس کے دماغ سے ٹکرا رہی تھی وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا شیشم کے گھنے درخت کے نیچے پہنچ گیا۔ جہاں کرسی اور مونڈھے پڑے ہوئے تھے۔ وہ تھکا تھکا سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

دن ڈھل رہا تھا سائے طویل ہو کر پھیلتے جا رہے تھے۔ ہوا میں تیزی تھی شیشم کے خزاں رسیدہ پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہے تھے۔ شاہ زیب کے دل و دماغ پر ایک عجیب سی اداسی طاری ہو گئی تھی۔ بیتے دنوں کی یادوں کے چراغ بار بار جل اور بجھ رہے تھے۔ بہت دیر تک وہ وہاں بیٹھا رہا پھر اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ شام کا دھندلکا آہستہ آہستہ فضاؤں میں تحلیل ہو رہا تھا۔ اور وہ ماضی میں کھویا ہوا تھا۔ وقت آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ شمشاد گھانی اپنے کام سے چلا گیا تھا۔ اور شام خوب گہری ہو گئی تھی۔ ڈیرے کے کمروں میں روشنی جھلملا رہی تھی۔ شاہ زیب کے علاوہ یہاں دو مہمان اور بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ جن کا شمشاد گھانی نے کوئی خاص تذکرہ نہیں کیا تھا۔ بس اتنا کہا تھا کہ کچھ اور مہمان بھی ڈیرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس وقت

بھی وہ کمرے میں چارپائی پر بیٹھے ہوئے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ شاہ زیب کا کمرہ ذرا فاصلے پر تھا۔ برآمدے میں دو مونڈھے پڑے ہوئے تھے وہ آگے بڑھا اور درمیان میں رکھی ہوئی میز کو تھوڑا سا ہٹا کر ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ برآمدے کے آگے دو اونچے اونچے درخت تھے۔ رات آہستہ آہستہ آسمان سے نیچے اتر رہی تھی اور درختوں تلے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے برآمدے میں بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ملازم کھانا لے کر آ گیا۔

''سر جی! کھانا ادھر ہی لگا دوں''۔ اس نے پرادب لہجے میں کہا۔

''لگا دو۔ کیا حرج ہے''۔ شاہ زیب بولا۔ اور ملازم واپس چلا گیا تھوڑی دیر کے بعد اس نے میز پر کھانا لگا دیا۔ کھانے کے ساتھ لسی بھی تھی۔ شاہ زیب سب کچھ بھول کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ یہ ضروری ہے کہ پیٹ کا دوزخ پوری طرح بھر لیا جائے۔

بہرحال پیٹ بھر چکا تھا ملازم کھانے کے برتن اٹھا کر لے گیا۔ رات کاجل کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔ بہت دیر تک ادھر بیٹھنے کے بعد شاہ زیب اپنے کمرے کے اندر چلا گیا لیکن اسے کمرے میں نیند نہ آئی۔ نجانے کیوں اس وقت ذہن کے پردوں پر لجیا کی یاد چھا گئی تھی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ سناٹا بڑھ گیا تھا۔ پھر پلکیں جڑی ہی تھیں کہ کھڑکی پر آہٹ سی محسوس ہوئی اس نے جھٹ آنکھیں کھول دیں۔ گردن موڑی اور کھلی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ لوہے کی سلاخوں کے پیچھے اندھیرے میں کھڑا کوئی کمرے میں جھانک رہا تھا۔ اسے گھور رہا تھا۔ اسے سایہ نظر آیا اور ہلکی سی جھلک شاہ زیب نے گردن اونچی کر کے حیران پریشان ہو کر کھڑکی کی طرف دیکھا وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ اس کی نیند اچاٹ ہو گئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ لمحے اس طرح بیٹھا رہا پھر بستر سے نیچے اتر کر کھڑکی پر پہنچا اور سلاخوں کی آڑ سے باہر دیکھنے لگا۔ آسمان پر

بادل چھائے ہوئے تھے ہرطرف تاریکی کا راج تھا۔ ہوا کے جھونکے سرد تھے۔ ابھی وہ آنکھیں پھاڑ ہی رہا تھا کہ درختوں کے خشک پتوں پر دبی دبی چاپ سی ابھری لیکن اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ اس نے گردن گھما کر ادھر ادھر نگاہیں گھمائیں ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پھر وہ بہت دیر تک چوکھٹ سے لگا کھڑا رہا۔ لیکن کوئی آواز سنائی نہ دی۔ چنانچہ وہ واپس بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ البتہ نیند اڑ چکی تھی۔ وہ بستر پر چپ چاپ لیٹا رہا اور اس کی نظریں بار بار کھڑکی کی جانب اٹھ جاتیں۔ کھڑکی کے باہر گھنے درخت تھے پت جھڑ کا موسم چونکہ شروع ہو چکا تھا۔ اس لیے خزاں رسیدہ پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرتے رہتے تھے اس وقت بھی ہوا کے بپھرے ہوئے جھونکے ان پتوں کو منتشر کر رہے تھے۔ آخر کار نجانے کس وقت شاہ زیب کی آنکھ لگ گئی۔ مگر دوسری صبح شمشاد گھانی ناشتے کی میز پر موجود تھا۔ اس وقت بھی آسمان پر بادلوں کا غبار چھایا ہوا تھا۔ ہوا سنسناتی ہوئی چل رہی تھی۔ رات کو بوندا باندی بھی ہوئی تھی شاید باہر اس کے آثار نظر آ رہے تھے موسم بدل گیا تھا سردی بڑھ گئی تھی اور صبح خنک اور دھندلی تھی۔ شمشاد گھانی ناشتے پر اس کے سامنے آ گیا۔

''اور شاہ زیب جی رات کیسی گزری''

''اچھی۔ آرام سے سویا''۔ شاہ زیب نے کہا۔

''بس میں بھی جس جگہ گیا تھا وہ ایک چکر چل رہا ہے۔ ایک بات بتاؤں تمہیں۔''

''ہاں جی بولو''۔ شاہ زیب نے کہا

''سرحد پار کی تھی میں نے''

''کیا''

''ہاں یار! میرا ایک دوست ہے ہرچندی اس کے کام سے گیا تھا۔ ہری چند

کی گھر والی سے اس کا جھگڑا ہو گیا ہے۔ جھگڑا تو پہلے بھی کئی بار ہوا لیکن اس بار کچھ زیادہ ہی ہو گیا''۔

''اچھا''

''ہری چند کی گھر والی غصے کی بہت تیز اور جھگڑالو ہے۔ ویسے چھوت چھات بھی بہت کرتی ہے۔ ہری چند نے ایک لڑکی رکھی ہوئی ہے۔ جو مسلمان ہے اور بس ہرچندی کی گھر والی اس بات پر اس سے لڑتی ہے بس کیا کیا جائے۔ حالانکہ ہرچندی اس پر ڈانٹ پھٹکار بھی کرتا ہے۔ پر اس کی گھر والی بہت چنڈال ہے۔ لڑتی جھگڑتی ہے اور پھر رونے پیٹنے بیٹھ جاتی ہے''۔

''ہاں۔ گھروں کے بہت سے تذکرے ہیں''۔ شاہ زیب نے مدھم لہجے میں کہا۔

''کچھ اور کام ہے مجھے ایک بات بتاؤ شاہ جی! اکیلا پن تو نہیں محسوس کر رہے۔ کچھ بندوبست کروں تمہارے لیے۔ برا مت ماننا یاروں کا یار ہوں ہر کام ہی کر لیا کرتا ہوں۔ ویسے مجھے تو پھر بھی جانا ہے اندھیرا ہوتے ہی نکل جاؤں گا۔ کچھ ضروری کام ہیں ویسے اگر کام ہو گئے تو کل سویرے ہی آ جاؤں گا''۔

''ٹھیک ہے میں ابھی یہاں مطمئن ہوں''۔ شمشاد گھانی شام کو شاہ زیب کے کمرے میں آیا آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ کہنے لگا۔

''سردی بھی بہت ہے اور ہوا بھی تیز ہے بارش بھی ہو سکتی ہے۔ ویسے ایسا ہی موسم اپنے کام کے لیے ٹھیک ہوتا ہے۔

''بیٹھو''

''نہیں مجھے جانا ہے باہر جیپ تیار کھڑی ہوئی ہے تم چاہو تو آس پاس کے علاقوں میں گھوم سکتے ہو۔ ابھی تک تو میں نے آس پاس پولیس کو نہیں دیکھا اس کا

مطلب ہے کہ پولیس کو تمہاری یہاں موجودگی کا شبہ نہیں ہے''۔

''ٹھیک ہے اگر دل گھبرائے تو گھوم لوں گا''۔ شاہ زیب نے جواب دیا۔
شمشاد گھانی تو چلا گیا۔لیکن شاہ زیب سر جھکائے سوچ میں بیٹھا ڈوبا رہا اور اس کے بعد بقیہ وقت اس نے اندر ہی گزارہ اسے حیرت تھی کہ رات کو کھڑکی کے پاس کس کا سایہ نظر آیا تھا۔نجانے کیوں دن بھر اسے اس سائے کا احساس رہا تھا کون تھا وہ اور اس طرح چوری چھپے یہاں کیوں جھانک رہا تھا۔شاہ زیب کو اس بات کا تو یقین تھا کہ اسے کوئی وہم نہیں ہوا ہے۔

بہرحال رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ بستر پر لیٹ گیا رات سنسنان ہوتی گئی۔ تاریک اور سرد رات جو بہت سے سوئے ہوئے خوابوں کو جگا دیتی ہے۔ ہوا درختوں کی شاخوں سے الجھتی ہوئی پھڑ پھڑا رہی تھی۔ پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ شاہ زیب آنکھیں بند کیے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔مگر نجانے کیوں نیند نہیں آ رہی تھی۔ پھر آہستہ سے آہٹ ہوئی اور شاہ زیب نے آنکھیں کھول دیں کھڑکی کی جانب مڑ کر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا البتہ دروازے پر ہلکی ہلکی آہٹ ابھر رہی تھی۔کوئی ہولے ہولے دستک دے رہا تھا۔دروازہ بند تھا لیکن زنجیر نہیں چڑھی ہوئی تھی۔شاہ زیب نے سوچا کہ ہوسکتا ہے وہ ملازم آیا ہو۔البتہ اس نے کروٹ بدل کر دروازے کی سمت دیکھا اور پھر وہ آواز ذرا اونچی کر کے بولا۔

''دروازہ کھلا ہے اندر آجا''۔ دروازے کا ایک پٹ دھیرے سے کھلا اور جھپاک سے کمرے میں داخل ہوگیا۔اندر آنے والے نے مڑ کر جھٹ دروازہ بند کر دیا۔اس کی پشت شاہ زیب کی طرف تھی لیکن وہ ملازم نہیں تھا بلکہ کوئی عورت تھی۔وہ پلٹی تو شاہ زیب ششدر رہ گیا۔ایک نوجوان سی عمر کی عورت تھی سہمی ہوئی تھی اور سردی سے کپکپا رہی تھی۔شاہ زیب حیران سا اٹھ کر تکیے کے سہارے بیٹھ گیا اور پھر بولا۔

''کون ہے تو؟''

''آہستہ بول میرا نام سونی ہے۔سوہنی......''

''مگر تو ہے کون؟''

''مجھے نہیں جانتا تو''

''نہیں بالکل نہیں۔ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا''

''مگر میں نے پہلے تجھے دیکھا ہے''۔ وہ بولی شاہ زیب حیران نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتا رہا کہیں یہ لڑکی پاگل تو نہیں ہے۔اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔

''مجھ سے کیا چاہتی ہو سوہنی''

''ملنے آئی ہوں تجھ سے''

''مگر کیوں بتاؤ گی نہیں''۔ سوہنی کچھ نہ بولی۔کھوئی کھوئی سی کھڑی رہی اس کے پیروں میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔اس نے نیلے رنگ کی دھوتی باندھی ہوئی تھی سوتی سفید ململ کا کرتا پہنا ہوا تھا اور دوپٹہ ہلکا بسنتی تھا اس نے پھولدار کھیس اوڑھا ہوا تھا۔ صاف ستھری تھی آنکھوں میں کاجل اور سر میں تیل بھی پڑا ہوا تھا۔البتہ شاہ زیب نے محسوس کیا کہ اس کے رخساروں کے شگفتہ پھول مرجھا گئے ہیں۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں جن میں کبھی ستارے جھلملاتے ہوں گے بجھ کر ویران ہوگئیں ہیں۔اس کا چمکتا دمکتا حسن اجڑ سا گیا تھا۔چہکتی بولتی جوانی ڈھلک گئی تھی اور وہ ایک ٹوٹا پھوٹا کھنڈر بن گئی تھی۔

''بتائے گی نہیں یہاں آئی کیوں ہے''

''کہا نا تیرے پاس''

''کیا شمشاد گھانی نے''

''وہ مجھے تیرے پاس کیوں بھیجے گا میں تو خود تیرے پاس آئی ہوں کل رات بھی آئی تھی پر اندر آنے کا حوصلہ نہ ہوا''

''کل رات''

''ہاں''

''تو کھڑکی پر تو ہی تھی''

''ہاں میں ہی تھی''

''پر تو آئی کیوں تھی''۔ سوہنی نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور شاہ زیب کو اس کے چہرے پر ایک عجیب سے کیفیت نظر آئی۔ یوں لگا جیسے وہ اس کے چہرے پر کچھ تلاش کر رہی ہے۔ اس نے گردن موڑ کر رخ بدل لیا سوہنی اپنی جگہ کھڑی رہی تھی اور اس کی نگاہیں بدستور شاہ زیب کا جائزہ لے رہی تھیں''۔

''مجھے بتا میں تیری کیا مدد کرسکتا ہوں''

''تو.....تو.....'' اس نے کہا اور جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگئی۔

''ہاں آگے بول''

''بالکل ویسی ہی آنکھیں ہیں۔ وہی چہرہ ہے داڑھی البتہ بڑھی ہوئی ہے۔ گال پر یہ نشان بھی نہیں تھا اب پتہ نہیں کیا ہوگیا''۔

''تو کہنا کیا چاہتی ہے''۔ شاہ زیب نے سوال کیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور شاہ زیب کے سامنے فرش پر بیٹھ گئی۔ وہ اب بھی گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے نرمی سے کہا۔

''مجھے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ تو آگیا ہے وہ تو بس چھوٹے نے تجھے یہاں دیکھا بھاگتا ہوا میرے پاس آیا۔ کھیل رہا تھا وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر لایا تو سامنے تو بیٹھا ہوا تھا۔ میں اور چھوٹا درختوں کی آڑ سے چوری چوری تجھے دیکھتے رہے۔ چھوٹا تو تیرے

پاس جانے کے لیے مچل رہا تھا پر میں نے اسے روک دیا۔

''کون چھوٹا۔ یہ وہی تو نہیں جو کل دن ڈھلے درختوں تلے کھیل رہا تھا پر وہ تو دو تھے''۔

''جس کی آنکھیں اور ناک تیری طرح ہے نا۔ وہی تو چھوٹا ہے آج بھی دن بھر تجھے چھپ چھپ کر دیکھتا رہا۔ وہ تو تیرے کمرے میں بھی آنا چاہتا تھا پر میں نے اسے منع کر دیا''۔

''مگر پاگل عورت قصہ کیا ہے میں تم دونوں کو بالکل نہیں جانتا۔ نہ اسے اور نہ تجھے''۔

''ایسا مت کہہ.....ایسا مت کہہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تو ہمارا جگی ہے نا۔ بول کیا تو کہہ دے گا کہ تو جگی نہیں ہے''

''جگی.....''

تو تو اور کیا.....اور کیا''

''میں کسی جگی کو نہیں جانتا نجانے تو کسی کی بات کر رہی ہے''

''نہیں جانتا''

''بالکل نہیں''

''ایسا مت کہہ تجھے رب دا واسطہ ایسا مت کہہ''

''دیکھو تمہیں کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام تو کچھ اور ہے تم اگر غلط فہمی کا شکار ہو تو اپنی یہ غلط فہمی دور کرلو۔ میں جگی نہیں ہوں''

''تو پھر کون ہے تو.....کون ہے تو..... بتا دے مجھے تو کون ہے''

''جگی تیرا شوہر تھا''

''ہاں''

''وہ لڑکا تیرا بچہ''

''ہاں''

''تجھے کیسے پتہ کہ میں وہ ہوں''

''میں نے تجھے پہچان لیا ہے''

''اوہ میرے خدا اس کا مطلب ہے کہ تیرے جگی کا چہرہ میرے چہرے سے ملتا جلتا تھا''

''ہاں''۔ وہ آنسو بھری آواز میں بولی

''اگر تو جگی ہوتا تو مجھے بھر کر سینے سے لگا لیتا جگی تو مجھے بہت پیار کرتا تھا؟ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی پھر وہ بولی۔

''اب تو اسے مرے ہوئے بھی بہت دن گزر گئے''

''مرے ہوئے''

''ہاں۔ مار دیا گیا تھا اسے زمینداروں نے مار دیا تھا''

''وہ خود کیا کرتا تھا''

''خود بھی زمیندار تھا ہماری اپنی زمینیں تھیں''

''تو تیری زمینداری کا کیا بنا''۔ شاہ زیب کو اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی

''بس جگی کے مرنے کے بعد ختم ہو گئی''۔ سوہنی کی آواز میں درد کی کسک تھی۔

''گھر بار اجڑ گیا مگر تو......تو اس کا کون ہو سکتا ہے۔ اس کا تو کوئی ایسا تھا بھی نہیں''۔

''میں کسی جگی کو نہیں جانتا میں بس تو یہ سمجھ لے کہ گھانی جی کا مہمان ہوں میری بھی تھوڑی بہت زمینداری ہے''۔

''بس ٹھیک ہی ہے کیا کہا جا سکتا ہے''

''اپنی زمین پر تو جان خاں کے بھائیوں نے زبردستی قبضہ کر لیا انہوں نے کھیتوں کی وٹ بندھی میں ہماری زمین دبائی جگی سے جھگڑا ہوا جھگڑے میں جان خاں زخمی ہو کر ہسپتال چلا گیا۔ اور میرے جگی کو سزا ہو گئی۔ پھر بعد میں جان خاں ہسپتال میں مر گیا اس کے بھائیوں نے رات کے اندھیرے میں بدلا لینے کے لیے میرے گھر کو آگ لگا دی۔ میں اپنے بچے کے ساتھ نکل گئی وہ تو مجھے بھی قتل کر دینا چاہتے تھے۔ پر ایک ہمدرد نے بچا لیا وہ جگی کا بچپن کا ساتھی تھا دونوں میں بڑی گہری یاری تھی۔ میں اسی کے ساتھ رہتی تھی اور وہاں بھی تیری طرح کا ایک بندہ مجھے اپنے گھر کے اندر نظر آیا تھا وہ دیوار کود کر چوری کرنے آیا تھا''۔

''پھر چوری کی اس نے''

''لے گھر میں دھرا ہی کیا تھا کہ کوئی چوری کرتا''

''بس کیا کہا جا سکتا ہے۔ پر کیا کہوں پتہ نہیں تو اس کی شکل کا کیوں ہے بلا وجہ پریشان ہو گئی تھی میں''۔ اسے مسلسل روتے دیکھ کر شاہ زیب کو ایک عجیب سے اداسی کا احساس ہو رہا تھا۔

''اب تو کیا کرے گی سوہنی''

''کروں گی کیا بس تجھے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے میں اپنے جگی کے پاس بیٹھی ہوئی ہوں۔ سچ کہہ رہی ہوں جی مجھے بالکل ایسا ہی لگ رہا ہے تیرے پاس سے جانے کو دل نہیں کرتا۔ تجھے نیند آ رہی ہے تو تو سو جا۔ میں یہیں بیٹھی رہوں گی اور جب مجھے نیند آئے گی تو اٹھ کر چپ چاپ چلی جاؤں گی۔ شاہ زیب کو ایک عجیب سا احساس ہوا نجانے کیوں اس لڑکی کے لیے دل میں ہمدردی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ وہ یہ بات جانتا تھا کہ اگر کسی نے اسے یہاں دیکھ بھی لیا تو شاید کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس لیے

کوئی بات نہیں ہے وہ آہستہ سے بولا۔

''کتنا عرصہ ہو گیا تیرے جگی کو تجھ سے جدا ہوئے''

''پتہ نہیں''

''کیا تجھے یقین ہے کہ اسے قتل کر دیا گیا تھا''

''میں کیا کروں پتہ نہیں کیوں میرا من نہیں مانتا۔ میرا دل یہ بات نہیں مانتا کہ وہ دنیا میں نہیں ہے''

''اگر ہوتا تو تیرے پاس نہ آتا''۔ شاہ زیب بولا

''یہی تو سوچا میں نے کہ شاید وہ میری تلاش میں میرے پاس آ گیا ہے''

''ہوں، میری مان تو نکاح کر لے کسی سے ابھی نوجوان ہے خوبصورت ہے''

''کہاں''۔ وہ شرما گئی نیچی نظریں کرتی ہوئی بولی۔

اب تو کچھ بھی نہیں رہا تو پہلے مجھے دیکھتا تو دل پکڑ کر رہ جاتا نہیں میں بھلا کسی سے نکاح کیا کروں گی دکھ اور تنگی کے جتنے دن ہیں کسی نہ کسی طرح کاٹ لوں گی بیٹا ہے میرا جوان ہو جائے گا۔ اب تو اسی کے سہارے زندہ رہوں گی۔ شاہ زیب نے ایک نگاہ بھر کے اسے دیکھا دل میں لجیا کی یاد تڑپ رہی تھی۔ سوہنی سر جھکائے بیٹھی تھی کمرے میں سکوت تھا البتہ باہر درختوں کے تلے پتے آہٹیں پیدا کر رہے۔ پت جھڑ کی رات اور کالی ہو گئی تھی ڈیرہ سنسان تھا۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ ایک عجیب سا احساس شاہ زیب کو پریشان کیے ہوئے تھے۔ نجانے کب اور کون سے لمحے سوہنی اس کے قریب پہنچ گئی اور شاہ زیب کو غیر محسوس انداز میں اسے سینے سے لگا لیا۔ اس نے شاہ زیب کو دیکھا اور پھر ایک دم تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ چہرے پر جھنجلاہٹ ابھر گئی اور پھر اس کی آواز ابھری۔

''میں کنجری نہیں ہوں سمجھا میں تو تجھے اپنا جگی سمجھی تھی اس لیے تیرے پاس

آ گئی تھی لیکن تم سب مرد ایک جیسے ہی ہوتے ہو تو نے بھی میری مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کی آواز بھرا گئی آنکھوں میں آنسو ستارے بن کر منڈلانے لگے اور پھر اس کی سسکیاں کمرے میں ابھرنے لگیں وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر جھک کر لمحوں کے بعد وہ شاہ زیب کی جانب دیکھے بغیر مڑی۔ دروازے پر پہنچ کر اسے کھولا اور باہر چلی گئی۔ شاہ زیب کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا مشکل ترین حالات گزر جاتے تھے لیکن وہ ایک باہمت نوجوان تھا۔ اور کبھی بھی اس نے کسی طرح کے حالات سے خوفزدہ ہو کر ہمت نہیں ہاری تھی۔ لیکن اس وقت نجانے کیوں اس کے بدن پر کپکپی سی طاری ہو گئی تھی کیا اس عورت سے مظلوم کوئی اور بھی ہو گا۔ پت جھڑ کی رات ویران اور نڈھال آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ ہوا کی سسکیاں بدستور سنائی دے رہی تھیں اور خشک پتے اڑ کر ادھر ادھر بکھر رہے تھے۔ نجانے کتنی دیر وہ بستر پر لیٹا چھت کو تکتا رہا۔ اور پھر اس کی آنکھیں نیند میں ڈوب گئیں نجانے کتنا وقت تھا۔ ملی جلی آوازوں کے ہلکے ہلکے شور سے اس کی آنکھ کھلی۔ یہ آوازیں باہر سے آ رہی تھیں۔ صبح ہو چکی تھی۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر نکل آیا باہر قدم رکھا ہی تھا کہ سامنے سے وہی ملازم جو اس کی چاکری کرتا تھا۔ سامنے نظر آیا کچھ بدحواس سا تھا۔ شاہ زیب اسے دیکھنے لگا پھر اس نے کہا۔

''کیا ہوا''

''بس سرجی! بہت برا ہو گیا''۔ ملازم کے چہرے پر افسردگی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔ شاہ زیب خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا تو ملازم نے کہا۔

''وہ بس جناب ایک جھلی تھی ایک پگلی سوہنی نام تھا اس کا رات جانے اسے کیا ہوا۔ اس نے اپنے بچے کا گلہ کاٹ ڈالا۔ اپنے کپڑوں پر تیل چھڑک کر آگ لگا لی''۔

ملازم نے تفصیل بتائی اور شاہ زیب کے دل کی دھڑکن شدید ہو گئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ملازم کو دیکھتا رہ گیا اور اس کے منہ سے آواز ہی نہ نکلی۔

''بس جناب! پتہ نہیں کیا ہوا تھا اس کا شوہر قتل ہو گیا تھا جی۔ لیکن وہ کہتی تھی کہ وہ آئے گا ایک دن ضرور آ جائے گا''۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا دروازہ اندر سے بند کیا کسی کو پتہ بھی نہیں چلا۔ چیخی چلائی بھی نہیں چپ چاپ جلتی رہی اس کے پاس ایک اور نوکر رہتا ہے گوشت جلنے کی بدبو سے اس کی آنکھ کھل گئی جی۔ اس وقت اندھیرا تھا سردی بھی زیادہ تھی۔ وہ باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ سوہنی کے گھر سے دھواں نکل رہا ہے۔ تب اس نے شور کیا اور پاس پڑوس کے سارے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ دروازہ کھول کر اندر گھسے تھے اتنا دھواں تھا کہ کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

''تت..... تو آگ لگانے سے وہ''

''مر گئی جی۔ میں جب پہنچا تو سسک رہی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ اس پر آسیب ہے۔ جن کا اثر ہے تب ہی اس نے ایسا کیا وہ بڑی دکھیاری تھی جی اس کا کوئی نہیں تھا''

''میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں''۔ شاہ زیب نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''نہ جی نہ۔ جل کر اس کا منہ اسقدر بگڑ گیا ہے کہ دیکھنے سے دل گھبراتا ہے ڈر لگتا ہے۔ میں تو ادھر نہ جانے کا۔ شاہ زیب نے یہ سلسلہ ترک کر دیا۔ لیکن نجانے کیوں اسے ایک جرم کا سا احساس ہو رہا تھا۔ کیسی ہوتی ہیں یہ بیوقوف لڑکیاں۔ کیسی ہوتی ہیں جان ایسی بے اثر چیز تو نہیں ہے کہ چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر زندگی ختم کر لی جائے۔

بہر حال یہ ٹھیک نہیں تھا۔ پتہ نہیں مجھ سے کیا چاہتی تھی جو کچھ وہ کہہ رہی تھی اسے تسلیم کرنا بھی تو خطرناک تھا اس کے بعد دوسرے بہت سے مرحلے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ مرحلے تو طے نہیں کیے جا سکتے تھے۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھ رہی تھی۔ ''شادی کر لے مجھ سے میرے باپ کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا وہ بھی چین کی زندگی جی لیں گے

شادی کر لے مجھ سے''۔ ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو حالات سے دلبرداشتہ ہو کر لجیا نے بھی اس طرح اپنے وجود کو ختم کر لیا ہو۔ امکانات تھے اس بات کے امکانات تھے۔

ملازم نے ناشتہ لگا دیا۔ مگر ناشتہ کرنے کو کس کا دل چاہے۔ وہ بہت اداس تھا بہت زیادہ اداس تھا۔ بہرحال بڑا دکھ بھرا عمل تھا۔ پھر دوسرا دن اور اس کے بعد تیسرا دن بھی گزر گیا اور پھر گھانی اس کے پاس پہنچ گیا۔

''بڑا وقت لگ گیا گھانی کہاں تھے اب تک''

''یار بس سمجھ لے میرا مسئلہ بالکل مختلف ہو گیا ہے۔ کچھ لوگوں سے دشمنی پڑ گئی ہے۔ حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ دشمنی کی وجہ بالکل غلط ہے۔ یہ زمینداریوں کے معاملے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ لوگ جب ایک دوسرے کے دشمن بنتے ہیں نا تو بڑے بہکاوے دے دیتے ہیں اور یہ بہکاوے جان لیوا ہو جاتے ہیں''۔

''قصہ کیا ہے''۔ شاہ زیب نے پوچھا تو گھانی اسے غور سے دیکھنے لگا پھر بولا

''چھوڑ ان سارے قصوں کو اب یہ بتاؤ یہاں رہ کر اکتا تو نہیں گئے ہو''

''بے کار پڑا پڑا وقت ہی گزر رہا ہے''

''وہ تو بس ٹھیک ہے مگر تمہارا یہاں رہنا بڑا ضروری ہے''۔

''کیوں؟''

''ایک پیغام ملا ہے مجھے مکرم شاہ صاحب کی طرف۔ اور وہ یہ ہے کہ میں تم سے کہوں کہ ہر قیمت پر یہاں رہو۔ جب تک مکرم شاہ صاحب خود یہاں تک نہ پہنچیں وہ شاید کراچی جا رہے تھے۔ بہت سے ضروری کام کر رہے ہیں۔ اب جیسی بھی گذر رہی ہے گزارو یہاں''۔

''ٹھیک ہے گھانی میں یہاں زیادہ گھوم پھر بھی نہیں رہا ہوں''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے دور دور کے علاقے میں نگاہوں میں آ چکے ہیں
کہیں سے یہ شبہ نہیں ہوتا کہ کوئی تمہاری تاک میں ہے۔ آس پاس اگر دل چاہے تو نکل
جایا کرو۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے''۔

''تمہاری مصروفیت کیا ہے''

''میں نے کہا نا جو گڑ بڑ ہوگئی ہے اسے تو سنبھالنا ہی ہے۔ اصل میں بس ایک
چکر چلا ہوا ہے۔ ایک لڑکی ہے میرے ہاں ملا دیتا ہوں میں تمہیں اس سے کچھ شکلوں
میں پڑی ہوئی تھی۔ مدد کی غرض سے میں اسے یہاں لے آیا ہوں۔ فریدہ نام ہے۔ اسی
کا چکر چل رہا ہے۔ اب دیکھو نا زبان بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ گھانی نے اسی دن فریدہ کو
شاہ زیب سے ملایا۔ درمیان شکل وصورت کی لیکن انتہائی خوش مزاج کوئی ستائیس سالہ
لڑکی تھی۔ حویلی کے اندرونی حصے میں رہتے تھی۔ ابھی تک شاہ زیب کو یہ بھی پتہ نہیں تھا
کہ یہاں اس حویلی میں زنانہ خانے میں کون کون رہتا ہے۔ اندر کا ماحول سنسان اور
خاموش ہی پڑا رہتا تھا۔ پتہ نہیں گھانی فریدہ کو اس سے کیوں ملا رہا تھا۔

بہرحال جسمانی طور پر انتہائی موزوں یہ لڑکی یا عورت کچھ پراسراری نوعیت
کی حامل تھی۔ شاہ زیب نے اس پر بہت زیادہ غور نہیں کیا۔ بہرحال وقت گزرتا چلا
گیا۔ فریدہ اس دوران کئی بار اس سے ملی تھی۔ شاہ زیب نے محسوس کیا تھا کہ اس کی
آنکھوں میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ لیکن بس ایک پراسرار سا وجود ہزاروں
کردار آ جائیں۔ لجیا کی جگہ تو شاید زندگی کے آخر سانس تک خالی ہی رہے گی۔ بہرحال
وقت گزرنے لگا مکرم شاہ کی طرف سے جو ہدایت ملی تھی۔ وہ عارضی طور پر تو قابل
برداشت تھی۔ لیکن اگر یہ سلسلہ طویل ہوگیا۔ تو ظاہر ہے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنا کسی
طور ممکن نہیں تھا۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ لیکن ابھی ایسی جلد بازی نہیں تھی۔ گھانی چلا
گیا تھا۔ موسم کچھ تبدیل ہوگیا تھا۔ اس رات خاص حبس تھا۔ شاہ زیب اپنے بستر پر لیٹا

ہوا کروٹیں بدل رہا تھا جس کی وجہ سے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ جاتے ہوئے گھانی اسے
ایک رائفل دے گیا تھا۔ اور کہہ گیا تھا وہ ذرا ہوشیار رہے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا وہ
یار! مہمانوں کو ایسی ذمے داریاں نہیں سونپی جاتی۔ لیکن قسم لے لو میں تمہیں مہمان سمجھ
ہی نہیں رہا۔ پتہ نہیں کیوں بالکل اپنے اپنے سے لگتے ہو۔ اور دل چاہتا ہے کہ تمہارے
ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارہ جائے۔ ذرا ان جھگڑوں سے نمٹ لوں۔ شاہ زیب
مسکرا کر خاموش ہوگیا تھا۔ رائفل اس وقت بھی اس کے سرہانے رکھی تھی۔ رات آدھی
سے زیادہ گزر چکی تھی پھر اسے سونا نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جس کیفیت میں اس وقت وہ تھا۔
بس نیم غنودگی کا سا عالم تھا کہ اسے کچھ آوازیں محسوس ہوئیں۔ جہاں وہ لیٹا تھا۔ وہاں
آس پاس تو کچھ بھی نہیں تھا لیکن اس کی نیند اچٹ گئی۔ آسمان پر گاڑھا گاڑھا سا غبار
چھایا ہوا تھا۔ ہوا دھیمی تھی اور رک رک کر چل رہی تھی۔ حویلی کے بالائی منزل کے
کمرے میں مدھم روشنی جھلملا رہی تھی۔ مہمان خانے کا اگلا حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ شاہ
زیب نے ہچکچاتے ہوئے گردن ذرا سی اٹھائی جھک کر نیچے دیکھا لیکن پھر اچانک ہی
اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ ایک آدمی چار دیواری سے چمٹا ہوا نظر آیا تھا۔ وہ ہولے ہولے
نیچے پھسل رہا تھا۔ نیچے اتر کر وہ دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ بیرونی دروازے پر پہنچا
اور آہستہ آہستہ دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی چار آدمی اندر داخل ہو گئے۔ یہ
انتہائی خوفناک صورتحال تھی گھانی اسے جو کچھ بتا کر گیا تھا اور جو ہدایت کر گیا تھا۔ اس
کے تحت صورتحال بڑی سنگین تھی۔ شاہ زیب چند لمحے دم بخود پڑا رہا۔ اس نے خوف اور
پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کی ایک بار پھر گردن اٹھائی اور منڈیر کی آڑ لے کر چوکنا
نگاہوں سے پانچوں کو دیکھنے لگا۔ ان کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے اور
پانچوں ہی کے ہاتھوں میں بندوقیں نظر آ رہی تھیں وہ قمیض اور شلواریں پہنے ہوئے
تھے۔ دھندلی روشنی میں وہ اس کے بارے میں زیادہ کوئی اندازہ نہ لگا سکا۔ پانچوں کچھ

دیر آنگن میں خاموش کھڑے رہے جب آس پاس کوئی کھٹکا نہیں ہوا تو ایک مسلح شخص آگے بڑھا اور بندر کی طرح اچھل کر قدِ آدم دیوار پر چڑھ گیا۔ یہ دیوار مہمان خانے کو حویلی سے جدا کرتی تھی اور اس کا دروازہ حویلی کی جانب سے بند تھا۔ وہاں اب صرف چار افراد رہ گئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد درمیانی دیوار کا بند دروازہ کھلا اور وہ شخص باہر آ گیا جو دیوار سے اندر کی سمت کودا تھا۔ اس کے نکلتے ہی ان دونوں نے جو سامنے نظر آ رہے تھے۔ قمیضوں کے اندر ہاتھ ڈال کر کمر سے لٹکے ہوئے پستول نکالے۔ اور کچھ اشارے کرنے لگے۔ تین آدمی ایک طرف چل پڑے اور بقیہ حویلی کے اندر داخل ہو گئے۔

شاہ زیب کو ایک دم اپنے فرض کا احساس ہوا شمشاد گھانی ایک مخلص آدمی تھا اور اب تک اس نے جس طرح شاہ زیب کی خدمت گاری کی تھی۔ شاہ زیب اس کا ممنونِ کرم تھا۔

بہر حال کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا وہ پانچ افراد ہیں جن میں سے دو اندر جا چکے ہیں اور باقی دروازے پر پہرہ دے رہے ہیں۔ حویلی پر ایک گہرا سکوت طاری تھا۔ رات تاریک اور بوجھل تھی۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ سناٹے میں حویلی کی بالائی منزل سے بھنچی ہوئی نسوانی چیخ سنائی دی اور اب شاہ زیب کے لیے رکنا بے غیرتی اور بے حیائی تھی۔ وہ بے قرار ہو گیا۔ بالائی منزل پر صرف دو کمرے تھے۔

بہر حال اس نے رائفل اٹھائی اور زمین پر دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا منڈیر کے پاس پہنچ کر اس نے گردن قدرے بلند کی بیرونی دروازے کھلا ہوا تھا۔ مہمان خانہ خالی تھا۔ دھندلی روشنی میں ایک آدمی اس طرح کھڑا ہوا تھا کہ اس کی پیٹھ نظر آ رہی تھی۔ شاہ زیب اسے تکتا رہا لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ شاہ زیب آہستہ آہستہ کھسکنے لگا۔ اس کی نگاہیں مسلح شخص کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ شاہ زیب نے ہولے ہولے قدم

رکھتے ہوئے سیڑھیاں طے کیں نیچے اترا اور دم سادھے دیوار سے چپکا ہوا دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ پھر وہ حویلی کے اندر کھلنے والے دروازے پر پہنچا۔ اور وہاں پہنچ کر اس نے حویلی کے اندر نظر ڈالی۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا اس نے مڑ کر چوکس نگاہوں سے بیرونی دروازے پر مسلح آدمی کو کھڑے دیکھا اور پلک جھپکتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ حویلی کا اندرونی حصہ وہ پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔ چار پائیوں پر نوکرانیاں سو رہی تھیں۔ وہ بالکل بے خبر معلوم ہوتیں تھیں شاہ زیب سنبھل کر اوپر پہنچا۔ سامنے کھلی چھت تھی وہ رائفل پر اپنی گرفت سیدھی کیے جھکا جھکا آگے بڑھنے لگا۔ اس وقت کمرے کا دروازہ چرچراتا ہوا کھلا اور شاہ زیب پھرتی سے ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ اس کی نظریں کمرے کے دروازے پر لگی ہوئی تھی۔ دروازے کے پیچھے سے بہت مدھم لہجے میں باتوں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ شاہ زیب نے صرف کان لگائے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر کار اس نے رائفل سنبھال کر کمرے کے دروازے کا نشانہ لیا۔ اور جھکا جھکا کمرے کی جانب بڑھا اب انتظار بے مقصد تھا۔ جو ہونا تھا وہ ہو جاتا۔ اس کے بعد کچھ کرنے سے کیا فائدہ چنانچہ اس نے دروازے پر زوردار ٹھوکر ماری اور دروازہ کھل گیا اور کمرے کا منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

کمرے میں دو آدمی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے عین سامنے پلنگ پر فریدہ بیٹھی تھی۔ شاہ زیب نے نشانہ باندھ کر ان دونوں کو بندوق کی زد پر لے لیا اور بھونچا رہ گئے ان کے چہرے پر شدید خوف اور پریشانی طاری ہو گئی۔ شاہ زیب کی تند نگاہیں ان کا جائزہ لے رہی تھیں۔ فریدہ نے گردن کو خم دے کر شاہ زیب کی طرف دیکھا اور پھر بولی۔

''ارے نہیں نہیں۔ نہیں شاہ جی نہیں''۔ ایک بار پھر شاہ زیب کے ذہن کو جھٹکا لگا تھا۔ رائفل نیچی ہو گئی۔ کمرے میں لیمپ روشن تھا، مگر اسکی روشنی مدھم تھی۔ شاہ

زیب نے دونوں اجنبیوں کا جائزہ لیا۔ انہوں نے ڈھاٹے ہٹا دیئے تھے اور اب ان کے چہرے صاف نظر آ رہے تھے ان میں سے ایک بالکل نوجوان لڑکا تھا۔ قد اونچا جسم مضبوط اور بھرا بھرا اس کا لباس بھی بہت اچھے کپڑے کا تھا۔ گلے میں سونے کی زنجیر پڑی تھی۔ ہاتھ کی ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی پڑی تھی۔ جس میں جڑے ہوئے مہرے کی کرنیں بکھر رہی تھیں۔ دوسرا شخص ادھیڑ عمر کا تھا۔ اس کے سر بال بکھرے تھے۔ مونچھیں گھنی تھیں ان میں کہیں کہیں سفید بال جھلک رہے تھے۔ وضع قطع سے وہ بھی کھاتا پیتا آدمی لگتا تھا۔ فریدہ نے حیرت اور پریشانی سے نکلتے ہوئے کہا۔

''شاہ جی! یہ میرا چاچا ہے اور یہ میرا بھائی۔ دونوں مجھ سے ملنے آئے ہیں

شاہ زیب کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ پھر ادھیڑ عمر آدمی نے کہا۔

''مگر یہ کون ہے''

''گھانی کا رشتے دار یہاں رہ رہا ہے بڑا اچھا بندہ ہے''

''یہ لوگ اس طرح کیوں آئے ہیں''۔ شاہ زیب نے سنبھل کر سوال کیا۔

''بس میں تمہیں کیا بتاؤں شاہ جی! کچھ ایسی ہی مشکل میں پڑے ہوئے ہیں ہم لوگ گھانی نے اگر تمہیں نہیں بتایا تو مجھے معاف کرنا۔ میں بھی کچھ نہیں بتا سکتی بس یوں سمجھ لو کہ ہماری اس مشکل کا آغاز تھوڑے دن پہلے ہوا ہے۔ یہ لوگ مجھ سے اس طرح چھپ کر ملنے پر مجبور ہیں''۔

''ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں''۔

''تم آرام کرو شاہ جی! مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں اپنے چاچا اور بھائی سے باتیں کر رہی ہوں۔ شاہ زیب کو بڑی شرمندگی ہوئی تھی۔ لیکن بہر حال وہ غیر مخلص نہیں تھا۔ وہ یہی سمجھ کر آیا تھا کہ شاید اسے ان کی ضرورت ہو۔ چنانچہ وہ باہر نکل آیا۔ بیرونی دروازہ ابھی تک پاٹ و پاٹ کھلا ہوا تھا اس نے باہر نکل کر محسوس کیا کہ ہلکی ہلکی

بوندا باندی ہو رہی ہے۔ اپنے کمرے میں آ گیا اب یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا یہ کردار اس کی خاموشی یا اس طرح وہاں سے واپس آ جانا شمشاد گھانی کے لیے کس حیثیت کا حامل ہوگا۔ رات کے ساڑھے چار پانچ بجے کے قریب وہ دونوں باہر نکلے۔ فریدہ انہیں چھوڑنے باہر تک آئی تھی اور اس کے بعد وہ باہر نکل گئے۔

دوسرے دن فریدہ خود ہی اس کے پاس آ گئی تھی۔ اس نے کہا

''رات کو آپ کو پریشانی ہوتی شاہ جی۔ میں شرمندہ ہوں بجائے اس کے کہ میں آپ کو کوئی آرام پہنچاتی آپ کے لیے مشکل ہی بن گئی''۔

''نہیں تم ٹھیک ہو کوئی ایسی بات نہیں ہے''

میں کیا بتاؤں تمہیں بس یوں سمجھ لو کچھ دشمن بن گئے تھے ہمارے تھوڑے دن تک ان سے بحث رہی لیکن پھر وہ میری تلاش میں مارے مارے پھرنے لگے۔ ہم یعنی میں اور میرے ماں باپ ایسی مشکل میں گرفتار تھے کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ ایک رات میں اور میرے گھر والے بستی چھوڑ کر گاؤں سے نکل بھاگے اب وہ رات یاد کرتی ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بھیانک سپنا دیکھ رہی ہوں راستے میں دو بار ٹرک پر بلا پڑا۔ پر ڈرائیور بڑا ہوشیار تھا۔ صاف بچا کر نکال لے گیا۔ آدھی رات کے بعد ہم ریلوے اسٹیشن پر پہنچے۔ ہم ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ ٹرین تو نہیں آئی ہمارے دشمن وہاں پہنچ گئے۔ اندھیری رات تھی۔ تڑ تڑ گولیاں چلیں۔ ہمارے دوستوں نے بھی ہماری بڑی مدد کی اور اس طرح بہت دیر تک ہنگامہ ہوتا رہا میں ڈر کر ایک طرف بھاگی اور کسی سے ٹکرا کر زور سے زمین پر گر پڑی۔ پر زمین تک نہیں پہنچی یوں لگا جسے کوئی مجھے اپنی پیٹھ پر لادے بھاگا جا رہا ہے۔ پتہ نہیں کون تھا پوچھا بھی تو نہیں بولا۔ تب میں نے اس کے ہاتھوں کی پکڑ سے نکلنے کی کوشش کی۔ منت سماجت کی، گڑگڑائی اور روئی بھی پر اس نے نہیں چھوڑا۔ ڈیڑھ میل آگے نہر تھی اس نہر کے نزدیک گھنی جھاڑیوں میں بنی ایک

سنسان جگہ مجھے اپنی پیٹھ سے ایسا پھینکا کہ میری ہڈیاں کڑکڑا گئیں۔ وہ بڑا ظالم تھا۔ وہ اکیلا بھی نہیں تھا اس کے ساتھ چھ کتے اور تھے۔ فریدہ کے چہرے پر ہلکی سی سرخی بکھر گئی۔ اور پھر اس نے دیر تک خاموشی اختیار کیے رکھی۔ اور اس کے بعد شاہ زیب کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''اس سے آگے بھی کچھ پوچھو گے''

''کک...... کیا مطلب''

''بس جی۔ جھوٹ نہیں بولوں گی کیا فائدہ انہوں نے انہوں''۔ وہ پھر رک گئی۔ خاموش بیٹھی رہی اور پھر بولی۔

''بس پھر انہوں نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔ پھر وہ چلے گئے میری بری حالت تھی۔ دن ڈھلے میں اٹھی۔ جس جگہ انہوں نے مجھے ڈالا تھا وہاں گوبر ہی گوبر بکھرا ہوا تھا۔ میرے کپڑے پیٹھ ہاتھ پاؤں سب کے سب گوبر سے لتھڑے ہوئے تھے۔ میں نہر پر پہنچنے کی کوشش کرتی رہی اور میں نے نہر پر پہنچ کر اپنے آپ کو صاف کیا۔ پھر رات ہوگئی۔ رات کو دو آدمی وہاں پہنچے اور انہوں نے مجھے اٹھایا اور وہاں سے لے جا کر ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ پتہ نہیں میری تقدیر میں کیا کیا تھا جی۔ میرے ماں باپ کہاں چلے گئے تھے۔ مجھے اس کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ بڑے مشکل وقتوں سے گزری اور اس کے بعد کئی جگہ میں نے وقت گزارہ مجھے کتے ہی کتے ملے اور میں ان کے درمیان جیتی رہی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں مر جاؤں۔ مگر بچپن ہی سے مجھے موت سے ڈر لگتا تھا۔ پھر مجھے ہیرا نامی ایک آدمی ملا بیل گاڑی میں جا رہا تھا۔ مجھ پر رحم کھا کر اس نے مجھے اپنے ساتھ لے لیا اور اپنے گھر لے گیا اس کی گھر والی تھی بچے تھے۔ مجھے کچھ اطمینان ہوا مگر کیا بتاؤں پتہ نہیں اس دنیا میں انسان کہاں ہوتے ہیں اور کتے کہاں۔ مجھے معاف کرنا شاہ جی! مجھے تو زیادہ تر کتے ہی ملے۔ مگر وہی بات ہوتی ہے۔ کہ انسان

پر سے انسان کا اعتماد بالکل اٹھ جائے تو دنیا کہاں باقی رہے گی۔ میں بتا رہی تھی کہ مجھے ہیرا ملا جو خود بھی ایک کتا تھا۔ وہ مجھے گھسیٹ کر زبردستی کوٹھڑی میں لے گیا۔ میں نے اس کی منت ساجت کی ہاتھ جوڑے گڑگڑا کر اسے اپنے اوپر بیتنے والی داستان سنائی پر اس نے ایک نہ سنی دوسرے دن صبح وہ تو چلا گیا مگر اسکی گھر والی نے مجھے بہت مارا پیٹا۔ میں نے اسے اپنی مجبوری بتائی تو اس نے میری ایک نہ مانی بس مارتی چلی گئی۔ مارتے مارتے تھک گئی تو رونے بیٹھ گئی۔ میں بھی روتی رہی اور روتے روتے بیہوش ہوگئی۔ تب اسے مجھ پر کچھ ترس آیا اس نے مجھے پانی پلایا دوپہر ہوگئی تو کھانے کو روٹی بھی دی۔ مگر شام کو ہیرا پھر واپس آ گیا۔ وہ بہت ہی گندا اور کمینہ تھا۔ ہیرا کی گھر والی مسلسل احتجاج کرتی رہی پر ہیرا نہ مانا۔ ایک دن اس کی گھر والی نے بہت شور شرابا کیا تو پاس پڑوس والے اکٹھے ہوگئے۔ انہوں نے ہیرا پر زور ڈالا کہ وہ مجھے اپنے گھر سے نکال دے۔ پر اس کمینے نے مجھے اس طرح اپنے گھر سے نکالا کہ ایک اور آدمی کے ہاتھوں بیچ دیا۔ وہ بہت ہی عمر رسیدہ آدمی تھا بس کیا بتاؤں شاہ جی! بہت بری گزری مجھ پر اور میرے ساتھ نجانے کیا کیا ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن میں نے اپنی جان ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا کہ میں خودکشی کر لوں میں نے دیوار میں لگی اونچی کھونٹی میں اپنی اوڑھنی کا ایک مضبوط پلو باندھا دوسرے پلو کا پھندہ بنایا۔ اونچی کھونٹی کے نیچے لکڑی کا ایک اسٹول رکھا۔ اور اس پر چڑھ کر پھندہ اپنی گردن میں ڈال لیا۔ لیکن نجانے کیا ہوا کہ جہاں میں موجود تھی۔ وہاں باہر اچانک گولیاں چلنے لگیں اور پھر مجھے ایسا لگا جیسے بہت سے لوگ اندر گھس آئے ہوں۔ میں نے جھٹ اپنا پیر اٹھایا دوسرے پیر سے اسٹول ڈگمگا کر نیچے گر گیا۔ اور میں اوڑھنی کے ساتھ لٹکنے لگی۔ پھر اس کے بعد مجھے پتہ نہیں کیا ہوا۔ رات گئے مجھے ایسا لگا جیسے میں زندہ ہوں میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ میں بچ گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی وہاں موجود ہے۔ بس ایک بار پھر زندگی مل گئی

تھی شاہ جی! برسوں بعد میں نے اپنے بارے میں کسی کو اتنی باتیں بتائی ہیں۔ لگ رہا ہے میں بہت ہلکی پھلکی ہو گئی ہوں اس راز سے میں بہت بے کل تھی۔ آخری بار ان دونوں نے مجھے سہارا دیا تھا۔ ہمارے دشمن میرے ماں باپ کے دشمن تھے۔ زمینداری کی دشمنی تھی جی، زمینداریوں کی دشمنیاں ایسے ہی چلتی ہیں۔ اس کے ان الفاظ پر شاہ زیب کا دل دھک سے ہو گیا۔ واقعی زمینداری کی دشمنیاں بھی عجیب ہی ہوتی ہیں۔ یہ زمینیں آخر ہیں کیا چیز۔ بھائی بھائی کا دشمن بن جاتا ہے۔ کمال کی چیز ہے یہ زمین بھی فریدہ نے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ سب کچھ جو عام انسانوں کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔

بہرحال شاہ زیب کو اس طرح کی بہت سی کہانیاں سننے کو مل چکی تھیں اب ان دنوں وہ ذہنی طور پر بہت پریشان تھا اور سوچ رہا تھا۔ کہ اسے اس سلسلے میں کچھ کر ڈالنا چاہیے۔

بے شک مکرم شاہ اس کا ہمدرد تھا۔ ہر طرح سے مکرم شاہ نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نئے واقعے کے تحت الیاس خاں اور جبار خاں اپنی بھرپور کوشش کریں گے کہ کسی بھی طرح شاہ زیب کو نقصان پہنچائیں۔ لیکن مکرم شاہ نے اسے یہاں بھیج کر ایک طرح سے تحفظ دیا تھا۔ پھر اس کے بعد ایک رات جب وہ باہر برآمدے میں چارپائی ڈالے بیٹھا ہوا۔ سوچوں میں گم تھا کہ اس نے گھانی جیپ اندر داخل ہوتے دیکھی۔ شمشاد گھانی کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ وہ دونوں اجنبی تھے۔ ان کے پاس رائفلیں تھیں شمشاد گھانی سیدھا اس کی طرف آیا تھا۔

''خدا کا شکر ہے کہ تم مجھے مل گئے۔ اصل میں بات ذرا زیادہ ہی آگے بڑھ گئی ہے۔ فریدہ ٹھیک ہے نا''۔

''ہاں بالکل''

''یار! شاہ زیب اس وقت تمہیں ایک تکلیف دینا چاہتا ہوں''

''ہاں بولو''

''میں تمہیں اپنے ایک کام سے بھیجنا چاہتا ہوں فریدہ تمہارے ساتھ جائے گی چک نمبر **204** سوکھی والی کے علاقے میں ہے وہاں تمہیں پہنچنا ہے۔ فریدہ کو وہاں منتقل کرنا ہے پتہ میں بتائے دیتا ہوں۔ اصل میں اس وقت ہم جن لوگوں میرا مطلب ہے میں جن لوگوں کے چکر میں پڑا ہوا ہوں۔ وہ تمہیں نہیں جانتے اور پھر تم ویسے بھی میرے بھروسے کے آدمی ہو بھروسے کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ کسی بھی صورتحال پر تم حالات سے نمٹ سکتے ہو بولو میرا یہ کام کرو گے''۔

''کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ اس کا کیا سوال ہے''

''دوست اگر مجبوری نہ ہوتی تو میں''

''یہ بات مت کرو میں بہت جلدی یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا''

''پرواہ مت کرو چک پہنچ کر ایک دو دن تمہیں وہاں قیام کرنا پڑے گا اور اس کے بعد میں خود تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا یہ کچھ نام پوچھ لو اور پتہ بھی لکھ لو یہ کہہ کر گھانی نے اسے ساری تفصیل بتا دی۔ شاہ زیب اب خود بھی یہاں اکتا گیا تھا۔ فریدہ سے اسے بہت ہمدردی تھی۔ اس نے تو اسی وقت پیشکش کر دی۔ کہ اگر وہ چاہے تو ابھی جا سکتا ہے۔

''نہیں اتنی جلدی میں نہیں جانے دوں گا۔ بات یہ ہے کہ راستہ بھی طویل ہے اور ویران اور اجاڑ علاقوں سے گزرتا ہے۔ رات کا سفر وہاں محفوظ نہیں ہے۔ اکثر ان راستوں پر لوٹ مار ہو جاتی ہے۔ کچا راستہ ہے اور خاصے پھیر کا ہے۔ بہرحال فریدہ کو بھی اس سلسلے میں بتا دیا گیا تھا۔ صبح ہوئی تو طے شدہ پروگرام کے مطابق وہ لوگ تیار ہو گئے۔ فریدہ کو تفصیل بتا دی گئی تھی۔ وہ ایک بس میں جا بیٹھے۔ فریدہ کو ڈرائیور کے

ساتھ والی اگلی نشست پر جگہ مل گئی تھی۔ اس کے برابر دو عورتیں اور بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ دونوں برقع اوڑھے ہوئے تھیں۔ شاہ زیب پچھلی نشست پر بیٹھ گیا تھا۔ بے شک شمشاد گھانی یا فریدہ کے دشمن اپنی جگہ خود اس کا اپنا مسئلہ بھی تو بہت ہی خطرناک ہے۔ کہیں اسے کوئی پہچان نہ لے نجانے کیوں اس وقت دل پر ایک اضطراب سا ہے بس پرانے طرز کی تھی۔ ان راستوں پر یہی بس سفر کرتی تھیں شاہ زیب کو عجیب عجیب سے وسوسے گھیرے ہوئے تھے۔ صبح چونکہ بہت جلدی چل پڑے تھے۔ سویرا بھی پوری طرح بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب روشنی پھیلتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی زندگی کی چھل پہل بے دار ہو رہی تھی۔ موسم بھی حیرت انگیز طور پر گرم ہوتا جا رہا تھا۔

بہرحال وہ اپنی منزل کی جانب جا رہے تھے۔ پھر ایک اور چک سے دو افراد بس میں سوار ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شاہ زیب نے ان کا بھرپور طریقے سے جائزہ لیا۔ کچھ انوکھی سی بات تھی ان کے اندر دونوں مسلح تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس مضبوط اور اونچی ڈانگ تھی۔ جس کے دونوں کناروں پر لوہے کی شام چڑھی ہوئی تھی۔ ایک طرف کی شام میں سیسہ بھرا ہوا تھا۔ دوسرے کے پاس مضبوط اور لمبے ہتھے کی تیز کلہاڑی تھی۔ جس کا چوڑا پھل چمکدار تھا۔ پرانے طرز کی بس مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ اور ہچکولے کھاتی پختہ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ آسمان پر چھائے ہوئے گرد کے مٹیالے غبار کے پیچھے سورج چمک رہا تھا۔ تیز دھوپ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے البتہ کالے بادلوں کے غول نظر آ رہے تھے۔ لیکن ان کا فاصلہ کافی تھی۔ ویران سڑک کے دونوں طرف کیکر کے درخت اور گھنے جھاڑیوں کا جنگل تھا۔ کہیں کہیں اونچے نیچے ٹیلے اور ٹبے بھی تھے۔ لاری دو ٹبوں کے درمیان سے ڈھلان پر اترتے ہوئے۔ دائیں ہاتھ کو مڑی تو اس کی رفتار سست پڑ گئی اور کچھ دور جانے کے بعد ٹھہر گئی۔ نجانے کیوں ڈرائیور بس سے نیچے اترا باہر کچھ ملی جلی آوازیں ابھریں اور شاہ زیب بے اختیار کھڑکی

کی طرف دیکھنے لگا۔ اگلے دروازے کے عین سامنے دو آدمی مشتبہ حالت میں کھڑے تھے۔ ایک وضع قطع سے کسان نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی لاٹھی تھی جس پر گنڈاسہ لگا ہوا تھا۔ لاٹھی کندھے پر رکھی تو پشت کی جانب ایک گھڑی اس طرح جھول رہی تھی کہ گنڈاسے کا تیز پھل دور سے نظر نہیں آتا تھا۔ دوسرے کے چہرے پر ڈھاٹا بندھا ہوا تھا۔ اس کے پاس ایک پرانے طرز کی دیسی بندوق تھی۔ ڈرائیور ان کے درمیان خاموش کھڑا تھا۔ دیکھتے دیکھتے قریب کی جھاڑیوں میں سے تین آدمی اور نکلے اور ڈرائیور کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے چہروں پر بھی ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ جو تیزی سے ادھر سے ادھر گردش کر رہی تھیں۔ تینوں نیزوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ شاہ زیب کو ایک لمحے کے اندر اندر احساس ہو گیا کہ کوئی غیر متوقع بات ہے۔ بس کے دوسرے مسافر بھی دم بخود اور سہمے ہوئے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے عورتیں اور بچے بھی تھے۔ مسلح افراد نے مسافروں کو مزید دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی۔ بندوق والے آدمی نے آسمان کی طرف نال بلند کر کے دو ہوائی فائر کیے اور پھر ان سے ایک زور سے چیخا۔

''سارے بندے باہر آ جاؤ۔ سامان اندر ہی رہنے دو۔ شاہ زیب کے پیچھے بیٹھے ہوئے بوڑھے آدمی نے ساتھ والے مسافر سے کہا۔

''ڈکیت...... ڈکیت ہیں بھیا''۔ لباس کی سرسرائیں ابھریں مسافر نشستوں سے اٹھنے لگے۔ ایک عورت کی بغل میں دبا ہوا بچہ منہ پھاڑ کر رو دیا تو عورت نے منہ دبا کر اس کا منہ بند کر دیا۔ بچہ سہمی ہوئی نگاہوں سے ماں کا چہرہ تکنے لگا۔ کنڈیکٹر جو کلینر بھی تھا۔ سب سے پہلے دروازے کی جانب بڑھا۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرے مسافر بس سے اترنے لگے۔ شاہ زیب بھی اتر آیا۔ وہ اس وقت گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ لیکن صورتحال کا جائزہ لیے بغیر کچھ سوچنا یا کرنا حماقت تھی۔ وہ سڑک پر ایک طرف

خاموش ہوگیا اور وہ دونوں افراد بھی جو بعد میں چڑھے تھے اور جن کے پاس لاٹھی اور کلہاڑی تھی۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ باہر نکل آئے۔ ان دونوں کو دیکھ کر مسلح افراد میں سے ایک غصے سے دہاڑا۔

''یہ رہے دونوں حرام کے جنے''۔ یہ سنتے ہی ان دونوں نے اپنی ڈانگ اور کلہاڑی اٹھائی اور اچھل کر مسلح افراد پر جھپٹے انہوں نے پینترا بدل کر تیزی سے حملہ کیا پانچوں حملہ آور بدحواس ہوگئے۔ ایک تو پہلے ہی حملے میں زخم لگا کر گرا اس کی کنپٹی سے لال لال خون نکل کر کپڑوں پر پھیلنے لگا۔ بقیہ چاروں افراد سراسیمہ ہوکر ادھر ادھر تتر بتر ہوگئے ان کے بکھرتے ہیں مسافروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا جدھر منہ اٹھا ادھر بھاگا اور درختوں کے نیچے گھس گیا۔ شاہ زیب نے بھی تکلف نہیں کیا تھا وہ ایک گھنی جھاڑی کے پاس حیران پریشان کھڑا تھا۔ البتہ اسے ایک دم فریدہ کا خیال آیا۔ وہ کچھ فاصلے پر چھتری جیسے گھنے درخت کے نیچے کھڑی تھی اور نگاہیں اٹھائے بے چینی سے اسی جانب دیکھ رہی تھی۔

ادھر وہ دونوں افراد اپنی ڈانگ اور کلہاڑی گھما رہے تھے۔ جھپٹ جھپٹ کر وار کر رہے تھے۔ صورتحال شاہ زیب پر واضح ہوگئی تھی۔ مسلح افراد جنہیں ڈاکو سمجھا گیا تھا۔ ڈاکو نہیں تھے بلکہ شاید وہ کسی کا انتقام لینے کے لیے آئے تھے۔ ادھر وہ دونوں آدمی ایک کی عمر پینتالیس کے قریب ہوگی۔ مگر اس کا مضبوط جسم گھٹا ہوا تھا۔ بہترین مقابلہ کر رہے تھے۔ پینتالیس سالہ شخص کے جسم میں بہترین پھرتی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں دبی ہوئی ڈانگ بجلی کی مانند لہرا رہی تھی۔ دوسرا نوجوان تھا وہ بھی قد آور تھا اور اس میں بھی اسی طرح پھرتی اور حوصلہ تھا۔ لیکن حملہ آور اب سنبھل چکے تھے اور وہ بھی گھوم پھر کر وار کر رہے تھے۔ اور ان دونوں کو نرغے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر دونوں ہر بار ان کا گھیرا توڑ کر نکل جاتے۔ وہ جھک کر سمٹ کر، پلٹ کر ہر طرح سے اپنا سر بچانے

کے لیے کوشاں تھے۔ جھکائی دے کر وہ پینترے بدل بدل کر حملے بھی کر رہے تھے۔ اس وقت یہ جنگ یہ شکل اختیار کر گئی تھی کہ بندوق بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ فاصلہ اس قدر کم تھا اور فریقین اسقدر جلد اپنی اپنی جگہ بدل رہے تھے کہ گولی چلانے کی گنجائش نہیں تھی۔ بندوق والا آدمی بری طرح بپھرا ہوا ادھر سے ادھر گھوم پھر رہا تھا۔ آخر کار اسے جیسے ہی موقع ملا اس نے ٹریگر دبا دیا۔ گولی کسی کے جسم میں نہیں لگی لیکن گولی کی آواز سن کو مسافر اور بھی بدحواس ہوگئے بھاگے اور درختوں اور جھاڑیوں میں دور تک نکل کر دبکنے اور روپوش ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ اب اصولی طور پر اب ان دو افراد کے مقابلے پر صرف تین افراد تھے۔ وہ دونوں اتنی بے جگری سے حملہ کر رہے تھے کہ تینوں حملہ آوروں میں سے ہر ایک چوٹ کھا چکا تھا کسی کے منہ سے۔ کسی کے کندھے سے اور کسی کی ٹانگ سے خون رس رس کر پھیل رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ کاری زخم کسی کو نہیں لگا تھا۔ ادھر وہ دونوں افراد بھی گھائل ہو چکے تھے۔ انہوں نے زخموں سے بے پرواہ بہت تیزی سے وار کرنے شروع کر دیئے۔ اور تینوں حملہ آوروں کو جان بچانا مشکل ہوگئی۔ اب ان میں پہلی سی پھرتی اور حوصلہ نہیں رہا وہ کس قدر پریشان اور تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور رفتہ رفتہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ وہ پہلا حملہ آور جو پہلے ہی حملے میں شدید زخمی ہوگیا تھا۔ سڑک پر چت لیٹا ہوا تھا قریب ہی اس کا نیزہ پڑا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر بے حال پڑا رہا رک رک کر سانسیں لیتا رہا پھر اس نے کروٹ بدلی دونوں مقابلہ کرنے والے چند گز کے فاصلے پر تھے اور بپھر بپھر کر حملے کر رہے تھے وہ ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ وہ ان کے پیچھے تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر نیزہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اٹھا لیا اور دونوں ہاتھوں میں نیزہ دبائے ہوئے۔ عمر رسیدہ شخص پر جھپٹا اور وار کیا۔ نیزے کا پھل آدھے سے زیادہ پینتالیس سالہ شخص کے پیٹ میں اتر گیا وہ تلملا کر پلٹا اور اسی وقت سامنے سے کلہاڑی کا وار ہوا ہاتھ بھرپور پڑا اس کا ایک بازو لٹک گیا ڈانگ اس کے ہاتھ سے

چھوٹ گئی۔ وہ لڑکھڑایا اور سنبھلنے کی کوشش کی۔ لیکن نیزے کے تازہ وار نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس دفعہ نیزے کا پھل اس کے پہلو میں گوشت چیرتا ہوا پسلیوں میں اتر گیا تھا۔ وہ ڈگمگایا، گہری سانس بھری دونوں ہاتھوں سے نیزہ پکڑا اور سڑک پر گر پڑا۔ نیزہ بدستور اس کی پسلیوں میں پھنسا ہوا تھا اس نے زور لگا کر نیزہ کھینچا تو نیزہ باہر نکل آیا لیکن ساتھ ہی پہلو سے خون کا فوارہ بھی ابل پڑا۔ اس نے ایک ہاتھ زخم پر رکھا اور اٹھنے کی کوشش کی مگر جس کے پاس بندوق تھی وہ قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے اچھل کر پوری قوت سے اس کے منہ پر لات جمائی تو وہ اس حملے کی تاب نہ لا سکا۔ بے سدھ ہو کر گر گیا۔ حملہ آور نے بندوق ایک طرف رکھی۔ دھوتی سے چھری نکالی اور اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس کا گلہ ایک ہاتھ سے دبا کر بولا۔

''پہچان لیا نہ مجھے۔ پہچان لیا نہ۔ اس نے یہ کہہ کر اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا نیچے گرے ہوئے آدمی کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں تو اوپر بیٹھے آدمی نے چھری ایک آنکھ میں گھونپ دی اور اسے نکالنے کے لیے بے دردی سے اسے گھمانے لگا پینتالیس سالہ شخص تڑپ کر گردن ادھر ادھر ہلانے لگا تھا۔

ادھر نوجوان لڑکا اس طرف دیکھ بھی نہیں سکا۔ حملہ آوروں نے اسے نرغے میں لے لیا تھا۔ اور ہر طرف سے تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ اس کے جسم پر بے شمار زخم آ چکے تھے لیکن وہ ڈٹا رہا اور ہر وار کلہاڑی کے ڈنڈے پر روکتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ حملے بھی کر رہا تھا۔ چار افراد کے مقابلے پر وہ زیادہ نہ رک سکا۔ اس کے زخموں سے برابر خون بہہ رہا تھا۔ قدم بھی بار بار ڈگمگاتے۔ کلہاڑے پر انگلیوں کی گرفت کمزور پڑنے لگی اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ کلہاڑے کا لمبا ڈنڈا بھی چھوٹ چکا تھا۔ اب وہ موت سے دفع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ صورتحال دیکھ کر حملہ آوروں کے حوصلے بڑھ گئے وہ اسے گھیر کر ہر طرف سے وار کر رہے تھے اور آخر کار اس کا وار کامیاب ہوا اور نوجوان

لڑکا بھی گر پڑا۔

ماحول پر ایک خوفناک کیفیت طاری تھی۔ مغربی افق پر ابھی تک لہو رنگ روشنی بکھری ہوئی تھی۔ سورج ڈوبنے کو تھا۔ شام بلندی سے نیچے اترنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ فریدہ درخت کے نیچے سے نکل کر سڑک کی طرف بڑھی جدھر وہ دونوں زخمی نڈھال پڑے ہوئے تھے اسی وقت دوسرے آدمی نے بندوق سنبھالی اور بولا۔

''کام ہو گیا نکل چلو''۔ یہ کہہ کر اس نے خوف و دہشت پھیلانے کے لیے ہوائی فائر کیے اور اس کے بعد وہ سب سڑک پر دوڑنے لگے۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ اس دوران کوئی اور گاڑی بھی نہیں آئی تھی۔ لیکن جیسے ہی وہ غائب ہوئے۔ پیچھے سے ایک بس آئی اور وہ رک گئی مسافر گردن نکال کر خون میں لت پت ان دونوں کو دیکھنے لگے جو سڑک کے بیچ و بیچ پڑے تھے۔ بہت ہی خوفناک صورتحال ہو گئی تھی۔ پینتالیس سالہ شخص کی دونوں آنکھیں نکال دی گئیں تھیں۔ اس کی گردن پر بھی چھری چلائی جا چکی تھی۔ لوگ ان کا جائزہ لینے لگے پھر آوازیں ابھریں۔

''زندہ ہیں۔ زندہ ہیں انہیں ہسپتال لے جاؤ''۔ بڑی مشکل سے وہ لوگ زخمیوں کو ہسپتال لے جانے پر تیار ہوئے۔ بہت سے مسافر بھی بس میں گھس گئے تھے لیکن یہ دونوں ابھی یہیں موجود تھے اور سوچ رہے تھے کہ اب جو بس آئے گی اس سے آگے کا سفر کیا جائے گا۔

آخر کار شاہ زیب فریدہ کو لے کر مطلوبہ جگہ پہنچ گیا۔ بڑی غیر مناسب جگہ تھی ہر طرح کی مشکلات سے بھری ہوئی۔ لیکن کوئی ایسا ہی مسئلہ ہوگا جس کی وجہ سے گھانی نے فریدہ کو یہاں بھیجا تھا۔ فریدہ خود بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکی۔ اب یہاں ذرا سی بیزاری پیدا ہوگئی تھی۔ کوئی خاص مقصد تو نہیں تھا۔ مکرم شاہ نے ہدایت کر دی تھی کہ جس طرح بھی بن پڑے وہ محفوظ رہے اور ادھر ادھر نہ جائے۔ مکرم شاہ انتہائی ہمدرد آدمی تھا اور اس کے لیے اس طرح فکر مند رہتا تھا جس طرح کوئی باپ اپنی اولاد کے لیے اس کے علاوہ اس نے شاہ زیب کا بھرپور ساتھ بھی دیا تھا۔ اب تو زندگی ایک طرح سے محدود سی ہو کر رہ گئی تھی۔

بہر حال یہاں کے سادہ ماحول میں وقت گزارنا پڑا۔ فریدہ کے اندر اس کے لیے لگاوٹ پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ مدِ مقابل شدید چوٹ کھایا ہوا انسان ہے۔ زخموں سے چور چور کوئی چار دن یہاں گزارنے پڑے پانچویں دن اس وقت جب رات کا آغاز ہو چکا تھا ایک جیپ دور سے آتی ہوئی نظر آئی اور آخر کار آ کر رک گئی۔

شاہ زیب نے فوراً پہچان لیا تھا جیپ شمشاد گھانی کی تھی اور شمشاد گھانی اس سے اتر کر اس کے پاس آیا تھا۔

''کہو شاہ جی کیسے حال ہیں''۔

''ٹھیک ہوں''

''شاہ جی! بڑی سرگرمی سے کام ہو رہا ہے۔ تمہارے خلاف۔ مکرم شاہ صاحب نے اطلاع بھیجی ہے کہ کچھ دن کے لیے تمہیں یہاں سے دور جانا ہوگا''۔

''کہاں دور''۔ شاہ زیب نے الجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''شاید سرحد پار'' گھانی کا جواب شاہ زیب کے لیے انتہائی سنسنی خیز تھا۔ وہ حیران نگاہوں سے گھانی کو دیکھتا رہ گیا۔

''مگر کیوں؟''

''بات تو بس اتنی سی ہی پتہ چلی ہے شاہ جی! کہ الیاس خاں اور جبار خاں نے آفت توڑ رکھی ہے۔ تھوڑی سی تفصیل مجھے بڑے شاہ جی سے پتہ چلی تھی میرا مطلب ہے مکرم شاہ جی سے آپ نے شاید کوئی بھٹہ تڑوا دیا تھا جو جبار خاں اور الیاس خاں کا تھا بس وہ آپ کے پیچھے لگ گئے۔ مکرم شاہ جی نے کہا ہے کہ بڑی صحیح صحیح نشاندہی کر رہے ہیں وہ مخبر آگے پیچھے دوڑ رہے ہیں اور پولیس کا ٹرک مسلسل آگے بڑھ رہا ہے۔ ان کا رخ اسی جانب ہے۔ لگتا ہے بڑی مضبوط مخبری ہو رہی ہے انہوں نے کھوجی بھی ساتھ رکھے ہوئے ہیں۔ شاہ جی! ہم آپ سے ایک بات کہیں زیادہ تفصیلات تو ہمیں نہیں معلوم پر زندگی میں ہم نے یہی سیکھا ہے کہ وقت کے ساتھ سمجھوتا ہر طرح سے اچھا رہتا ہے۔ وقت کی آواز سنو اس کی ضرورت پوری کرو۔ محفوظ رہو گے اور اگر وقت سے جھگڑا کیا تو پھر نقصانات ہی نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ شاہ جی! کوئی بہت زیادہ الٹی سیدھی بات نہیں ہے۔ تھوڑے دن کے لیے سرحد پار چلو۔ جب دل چاہے واپس آجانا''

''تو کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئے ہو''

''بالکل جی۔ ابھی اور اسی وقت ہم نہیں چاہتے کہ ہماری کوئی ذرا سی کوتاہی آپ کے لیے نقصان دہ بن جائیں اور معاف کرنا شاہ جی! بات وہی ہو جاتی ہے۔

آپ کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو زندگی بھر کی محبت تو گئی نا''۔ شاہ زیب سوچ میں ڈوب گیا بار بار ذہن بغاوت کر رہا تھا۔ دل یہ سوچ رہا تھا کہ کسی کے ساتھ اتنے منسلک بھی نہ ہو جاؤ کہ آگے کوئی بات ہی نہ رہے۔ لیکن بہرحال ان لوگوں کو نظر انداز کرنا بھی مناسب نہیں تھا جنہوں نے واقعی بھرپور ساتھ دیا تھا۔ مکرم شاہ اس میں سرفہرست تھا۔ اب تک جن علاقوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ ان میں ہی کون سی کشش تھی۔ آخر کار اس نے گردن ہلا کر کہا۔

''فریدہ کا کیا ہوگا''

''یہاں بالکل سیٹ ہے بعد میں دیکھ لیں گے اسے کہ اس کے لیے کیا کرنا ہے''۔

''ہوں۔ ٹھیک ہے گھانی! بڑے شاہ جی نے جیسا کہا ہے میں اس سے الگ نہیں جا سکتا''۔ بات ختم ہوگئی تھی۔ فریدہ کو بتائے بغیر وہاں سے نکلنا پڑا تھا۔ راستے میں اس نے گھانی سے پوچھا۔

''سرحد پار جانا اتنا آسان ہوتا ہے کیا؟''

''آسان کہاں ہوتا ہے۔ آسان ہوتا تو ہر شخص ادھر سے ادھر آ جا سکتا۔ اصل میں جی اپنا کاروبار ہی ایسا ہے۔ میٹنگ کرنی پڑتی ہے جگہ بھی ذرا الگ تھلگ ہی ہے۔ ابھی کوئی یہاں سے سارے تین گھنٹے کا سفر ہے۔ سرحد پر پہنچ جائیں گے۔ البتہ یہ ایک اچھی بات ہے کہ ہر چندی ایک سرحدی گاؤں میں ہی رہتا ہے''۔

''ہر چندی''

''ہاں شاہ جی! بتایا تھا نا اس کے بارے میں یار ہے اپنا۔ بزنس پارٹنر بھی ہے۔ مزے کا آدمی ہے۔ کوئی سو بندے اس کے لیے کام کرتے ہیں ہر ایک کا دم نکلتا ہے ہری چند سے اور ہری چند کا دم نکلتا ہے اپنی دھرم پتنی سے''

''ہاں تم نے بتایا تھا کہ ابھی۔ پچھلے دنوں کچھ گڑبڑ بھی ہوگئی تھی''

''ہاں جی۔ بڑی مشکل سے بھائی جی کو سمجھایا۔ بات بن گئی ہے لیکن بارود کا ڈھیر ہے ذرا سی چنگاری پڑی پھر بھڑک اٹھے گا۔ کوئی پائیدار حل نہیں نکلا ہے''۔

''مجھے حیرت ہے کہ سرحدیں اس طرح عبور کرلی جاتی ہیں''

''وہ جناب! حیرت ہوتی ہے نا بس جی! پتہ نہیں کیا ہوتی ہے۔ اس دور میں تو ہر کام ہی ہو جاتا ہے''۔

بہرحال ساڑھے تین گھنٹے کے سفر میں شاہ زیب نے بہت سی معلومات حاصل کرلی تھیں۔ دل و دماغ بھی اڑے اڑے سے تھے۔ ایک دل کہتا تھا کہ یہ تمام چکر چھوڑو نکل جاؤ یہاں سے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ تقدیر میں جو لکھا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا اور پھر زندگی کون سی اتنی دلکش رہ گئی ہے۔ بہرحال وقت گزرتا رہا اور اس کے بعد وہ ایک ویران سی جگہ پہنچ گئے۔ ریت کے اونچے اونچے ٹیلے بکھرے ہوئے تھے۔ پتھریلی زمین تھی۔ گھانی نے جیپ کی روشنیاں بجھا دیں۔ پھر بولا۔

''وہ آخری ٹیلا ہے نا۔ جیپ وہاں چھوڑ دیں گے اس کے بعد کوئی ایک میل کا سفر طے کرنا پڑے گا پیدل۔ اصل میں تھوڑی سی گڑبڑ ہوگئی ہے ورنہ ادھر بھی اور کچھ نہیں ملتا تو اونٹ تو مل ہی جاتے وہ بات یہ ہے نا کہ اچانک ہی آنا پڑا ہے۔ ورنہ بندوں کو پہلے سے تیار کردیا جاتا ہے۔ مگر بڑے شاہ جی کا حکم''

''کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ریت کے ٹیلوں کے درمیان ایک میل کا پیدل سفر بہرحال تکلیف دہ تو تھا۔ سارا وجود مٹی میں اٹ گیا تھا۔ پھر اس کے بعد روشنیاں نظر آنے لگیں۔ کوئی گاؤں ہی معلوم ہوتا تھا۔ بلندی سے دیکھنے پر اس کی آبادی زیادہ نہیں لگتی تھی۔ لیکن بجلی وغیرہ وہاں موجود تھی۔ سفر ختم ہوا۔ رات خاصی گہری ہو چکی تھی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد صبح ہونے والی تھی۔ گلیوں کے کتے بھی گہری نیند سو گئے تھے ہر طرف

ہو کا عالم تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایک ایسے گھر پر پہنچ گئے۔ جو کچا بنا ہوا تھا۔ لیکن وسیع کافی
تھا اور اس کے اندر بہت سے درخت جھول رہے تھے۔ قرب و جوار میں بھی اچھا خاصا
سبزہ تھا۔ دو پٹ والا ایک پرانے طرز کا دروازہ نگاہوں کے سامنے تھا۔ گھانی نے
دروازے کی زنجیر بجائی اور پھر تقریباً پانچ چھ مرتبہ زنجیر بجانے کے بعد اندر قدموں کی
چاپ سنائی دی اور ایک بڑبڑائی آواز سنائی دی۔

''کتے کے پلو..... یہ آنے کا وقت ہے ناس ہو تمہارا..... نیند حرام کر دی''

''او دروازہ کھول حرام کے پلے.....''۔ گھانی نے چہکتے ہوئے لہجے میں کہا
اور دروازہ کھل گیا آنے والا لمبے قد و قامت کا مالک ایک موٹے پیٹ والا تھا جس نے
دھوتی باندھی ہوئی تھی۔ گلے میں پیلے رنگ کی ڈوری پڑی ہوئی تھی۔ پنڈت ٹائپ کی
کوئی چیز لگتا تھا۔ اس نے شمشاد گھانی کو دیکھا اور بولا۔

''اوہ..... تم اس وقت اندر آؤ۔ اندر آؤ۔ پیچھے خطرہ تو نہیں ہے''

''ان کا نام خطرہ نہیں بلکہ شاہ زیب ہے''۔ گھانی نے کسی قدر پر مزہ لہجے میں
کہا۔

''آؤ جی آؤ..... اندر آ جاؤ۔ نمسکار.....'' ننگے بدن والے شخص نے دونوں
ہاتھ جوڑ کر کہا شاہ زیب اندر داخل ہو گیا۔ بڑا سا ایک کمرہ تھا۔ غالباً یہ مردانہ بیٹھک
تھی۔ اس کے بعد صحن اور صحن کے بعد نجانے کیا۔ چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوتی بند
نے لائٹ جلا دی۔ تو گھانی نے کہا۔

''یہ ہری چند ہے میرا دوست''۔ ہری چند نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ دیئے
پھر بولا۔

''اور اس وقت آنے کا مقصد یقیناً کوئی ایسی ہی بات ہوگی ورنہ کون اس
طرح سے کسی کے ہاں جاتا ہے۔ چلو جی! کوئی بات نہیں۔ پہلے یہ حکم کرو بندے بلانے

ہیں کوئی چکر ہے''۔

''بالکل نہیں۔ بالکل نہیں۔ یہ شاہ زیب ہیں۔ تم انہیں شاہ جی کہہ سکتے ہو۔
کچھ دن تمہارے پاس رہیں گے پولیس پیچھے لگی ہوئی ہے''۔

''او جی..... آپ کے دیس کی پولیس ہوگی ہمارے ہاں کی پولیس کے لیے تو
یہ ایک معزز مہمان ہیں''۔ ہری چند نے کہا۔

''کون ہے۔ مجھے بتانا ضروری نہیں ہے وہاں جا کر مرے ہو تو ایسے مرے
ہو کہ واپس نہیں پلٹے میں پوچھتی ہوں کون آیا ہے اس وقت''۔

''ارے وہ اپنا گھانی ہے اپنا گھانی''

''ہوں''۔ دو چار لمحوں کے لیے خاموشی طاری ہو گئی پھر کہا گیا۔

''کچھ چاہیے؟''

''نہیں بھابی جی! بڑی مہربانی اس وقت کچھ نہیں چاہیے''۔ گھانی جلدی سے
بولا۔ ہری چند دانتوں میں زبان دبائے بیٹھا ہوا تھا۔ پھر وہ دبے قدموں سے آگے
بڑھا۔ اندر کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''دگئی مصیبت۔ ہے بھگوان ہر ایک کے گھر میں موتیں جو ہیں کوئی نہ کوئی
ضرور مر جاتا ہے۔ اپنے گھر کے دروازے پتہ نہیں تجھے کیوں نظر نہیں آتے''۔ گھانی
ہنس پڑا تھا۔ وہ سب چار پائی پر بیٹھ گئے۔ تو ہری چند نے کہا۔

''پولیس کیوں ہے ان کے پیچھے''

''لمبی ہی کہانی ہوگی۔ مکرم شاہ جی کو جانتے ہو''

''ارے وہ شاہ بابا''

''ہاں انہی کی بات کر رہا ہوں۔ یہ ان کے رشتے دار ہیں انہوں نے ہی
میرے پاس بھیجا تھا لیکن پولیس کچھ زیادہ ہی سرگرمی دکھا رہی ہے۔ دس پندرہ دن

یہاں رہیں گے۔ اس کے بعد میں انہیں واپس لے جاؤں گا''۔

''سر آنکھوں پر، سر آنکھوں پر، یہ کوئی کہنے کی بات ہے گھر ہے شاہ جی اپنا۔ مزے سے رہو یہاں تمہارے ملک کی پولیس کوئی گڑ بڑ نہیں کر سکتی۔ اب یہ بتاؤ کچھ کھاؤ۔ پیو گے اس وقت''۔

''کیوں شاہ جی!''

''نہیں''

''او جی۔ پرواہ مت کر بالکل جو چاہیے لے لو۔ کچھ گرم کر کے لاؤں یا چائے پیو گے''۔

''نہیں صبح کو''۔ گھانی تمہارا کیا پروگرام ہے''۔ شاہ زیب نے پوچھا۔

''واپسی شاہ جی واپسی۔ لمبا چکر ہی نہیں۔ روشنی ہوگئی تو پورا دن ادھر ہی گزارنا پڑے گا جب کہ آپ سمجھتے ہو کہ وقت سے قیمتی کوئی چیز نہیں ہے''۔

''ہاں یہ تو ہے''

''اچھا ہری چند جی اور کوئی بات''

''نہیں۔ منگل کو کاغذات منگوا لینا یہاں کام پورا ہوگیا ہے''۔

''منگل میں تو ابھی کافی دن پڑے ہوئے ہیں آ جائے گا سب کچھ اچھا پھر مجھے اجازت''۔

ہری چند گھانی کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا تھا اور شاہ زیب اب اس نئی جگہ کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس کے وطن کا حصہ نہیں تھی ایک غیر ملک میں پہنچ گیا تھا وہ بالکل ہی غیر ملک میں۔

تقدیر پر ہنسی آ رہی تھی۔ چلو ٹھیک ہے تقدیر میں یہی چکر لکھے ہوئے ہیں تو کھاتے رہو چکر ہری چند کوئی دس منٹ کے بعد ہی واپس آ گیا تھا۔ آتے ہی بولا۔

''ارے مہاراج! آپ بیٹھے ہوئے ہیں ایسے۔ یہ برابر جو دروازہ ہے نا یہ جنگل پانی کے کام آتا ہے۔ پیچھے درخت اور جھاڑیاں ہیں۔ ہم لوگوں کا رہن سہن آپ لوگوں کے رہن سہن سے الگ ہوتا ہے۔ پر بے فکری سے وہاں جائیں پانی وانی کا سب بندوبست ہے ادھر نہانے کے لیے جگہ بائیں طرف ہے۔ کپڑے وپڑے نہیں ہیں آپ کے پاس''۔

''ہاں''

''چنتا کی بات ہی نہیں ہے۔ گھانی بلاوجہ آپ کو ہمارے پاس نہیں لایا ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو بس آپ اشارہ کریں سب آ جائے گا۔ کپڑے بھی پہنچ جائیں گے۔ صبح ہی کو بدلیں گے اب آپ آرام سے سو جائیں۔ باقی باتیں فرصت کے وقت ہوں گی اور ہماری فرصت کی آپ بات نہ پوچھیں۔ آپ یہاں رہیں باہر نکلیں گھومیں پھریں۔ کسی مائی کے لال کی ہمت نہیں ہے کہ آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ ٹھیک ہے نا''۔

''ہاں بالکل''

''ہم چلتے ہیں''۔ یہ کہہ کر ہری چند اس اندرونی دروازے سے اندر چلا گیا۔ دروازہ اس نے اندر سے بند بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن بہر حال باہر کا دروازہ شاہ زیب نے بند کر لیا تھا اس کے بعد وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ جس پر ہلکا پھلکا بستر تھا۔ بڑا عجیب سا محسوس ہو رہا تھا اسے۔ بھلا ایسے عالم میں نیند آنے کا کیا سوال تھا۔ اور پھر رات بھی تقریباً ختم ہونے کو تھی۔ تنہائی ہو۔ نیند نہ آ رہی ہو تو ایسے لمحات میں سوچ کی دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ اور سوچ کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہتا۔ نجانے کس کس لمحے کی یاد شاہ زیب کے دماغ سے باہر آتی رہی اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ صبح کی روشنی کب نمودار ہوئی۔ سورج کی پہلی کرن ایک کھڑکی سے اندر داخل ہوئی تو ایک آواز ابھری۔

'موٹی مسٹنڈی، تیرا ستیاناس، صبح کی ڈیوٹی بھی گلے پڑ گئی۔ کہ تجھ ہتھنی کو ہلا ہلا کر جگایا جائے۔ کم بخت کھا کھا کر کیا ہو رہی ہے۔ ایسا حرام پھلتا ہے کسی کسی کو ارے میں کہتی ہوں اٹھے گی یا ایک لات کمر پر''۔

''ارے ارے ہوش ٹھکانے ہیں کہ نہیں ڈیوڑھی میں مہمان سویا ہوا ہے۔ اور تو ہے کہ چیخ رہی ہے''۔ یہ آواز ہری چند کی تھی۔

''کلیجے میں بٹھالو۔ لے کر کہیں چلے جاؤ۔ الگ جگہ رکھ لو اسے۔ تمہارے لچھن تو میری نگاہوں کے سامنے ہمیشہ سے ہیں''۔

''بھگوان سے ڈر۔ بھگوان سے ڈر۔ آنے والا کل تجھے بھی اتنا ہی بے بس اور بے سہارا کر سکتا ہے۔ تیرے من سے تو بھگوان کا گزر ہی نہیں ہے''۔

''اور تم تو خود بھگوان بنے بیٹھے ہو۔ ہے نا ارے میں کہتی ہوں بھگوان کے نام پر یہ پاپ تو مت کرو''۔

''تو چپ ہوگی یا جوتا اٹھاؤں''۔

''ہاں ہاں اب تو جوتا اٹھانا مجھ پر اور کیا ہوگا''

''دیکھ میں کہتا ہوں کہ چپ ہو جا۔ ورنہ'' آواز ابھری اور شاید صورتحال ایسی ہوگئی تھی کہ ہری چند کی دھرم پتنی جی کو چپ ہی ہونا پڑا۔ شاہ زیب کو صورتحال کا کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔ یہ ایک نیا شعبہ ہوتا ہے زندگی میں جسے بھگتنا پڑتا ہے۔ لیکن بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر اس کے بعد ساری آوازیں بند ہوگئیں۔ اور تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور کوئی اندر داخل ہوگیا۔ شاہ زیب جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''آپ نے منہ ہاتھ دھو لیا ہو تو یہ چائے موجود ہے ناشتہ تھوڑی دیر کے بعد ملے گا۔ ایک سستی سستی سی آواز ابھری۔ لیکن شاہ زیب کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا

اسے یوں لگا جیسے دل کی حرکت بند ہوگئی ہو۔ پورا وجود بے جان ہوگیا ہو۔ جھکی ہوئی نگاہیں زرد رنگ کا چہرہ اجڑا اجڑا بکھرے بال میلی کچیلی ساڑھی میں لپٹی ہوئی لجیا تھی۔ سو فیصدی لجیا تھی۔ ہم شکل ہوتے ہیں اس دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ لیکن دل کی دھڑکنیں سہی معنوں میں وجود کی عکاسی کر دیتی ہیں۔ لجیا کوئی دھوکہ نہیں تھی ایک سچائی ایک حقیقت تھی جو ہاتھوں میں پلاسٹک کی ٹرے لیے کھڑی تھی اور اس ٹرے میں چائے کی پیالی رکھی ہوئی تھی۔ جھکی نگاہوں سے اس نے مہمان کا چہرہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ شاہ زیب بے اختیار پلنگ سے اٹھ گیا اور اس کے حلق سے آواز نکلی۔

''لجیا''۔ اور چائے کی پیالی ٹرے سمیت نیچے گر پڑی۔ لجیا نے نگاہیں اٹھا کر شاہ زیب کو دیکھا۔ دیکھتی رہی اس کے بعد اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور وہ زمین پر گر پڑی۔ پہلے چائے کی پیالی اور ٹرے بعد میں لجیا کے گرنے کی آواز۔ ہری چند اور اس کی بیوی دوڑے ہوئے آئے اور سناٹے میں رہ گئے۔ شاہ زیب نے گری ہوئی لجیا کو بازوؤں میں بھینچ لیا تھا۔ لجیا بے ہوش ہو چکی تھی اور شاہ زیب نے بمشکل تمام ہونٹ بھینچ کر منہ سے نکلنے والی آواز کو بند کیا ہوا تھا۔ ہری چند کی بیوی کے منہ سے نکلا۔

''لو بھگوان تمہارا بھلا کرے اچھا مہمان لائے ہو میرے لیے تو نیک فال ہے پر کھیل فوراً ہی شروع ہو گیا''۔ ہری چند نے بیوی کی گردن پکڑ لی دروازے کا پٹ کھولا اور اسے زور سے گھر کے اندر دھکا دے دیا۔ ہری چند کی بیوی شاید دوسری طرف گر پڑی تھی اس نے بین کرنا شروع کر دیا اور ہری چند دانت پیسنے لگا۔ پھر بولا۔

''کیا ہوا شاہ جی! کیا بات ہے''

''یہ...... یہ تمہارے پاس کہاں سے آ گئی ہری چند...... یہ...... یہ''

''کیوں بات کیا ہے''۔

''یہ میری منگیتر ہے جو گم ہوگئی تھی۔ یہ میری زندگی ہے۔ یہ...... یہ'' شاہ

زیب شدت جذبات کی وجہ سے جملے پورے نہیں کر پا رہا تھا۔ ہری چند نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''چلو...... یہ تو اور اچھی بات ہوئی تمہیں کچھ نہ کچھ تو تحفے میں دینا ہی تھا۔ ہماری طرف سے اپنی منگیتر کا تحفہ قبول کرو۔ یہ اسمگلنگ کا ایک ٹرک میں یہاں تک پہنچی تھی۔ اس بات کے امکانات تھے کہ برے ہاتھوں میں جا پڑے خوش قسمتی سے ہماری نظر پڑ گئی اور ہم نے اسے رکھ لیا۔

''ہری چند۔ ہری چند۔ یہ میری زندگی کا سب سے اہم مقصد تھی''

''منگنی ہوئی ہے تمہاری''

''ہاں''

''تو پھر نکاح کر لو۔ ہم مسلمان قاضی کو بلا لائیں۔ پرواہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ سب ٹھیک کر لیں گے ہم۔ چلو چائے پیو گے یا ناشتہ بھجوایا جائے۔ یہ بے ہوش ہو گئی ہے''۔

''ہاں''

''اٹھا کر پلنگ پر لٹا دو۔ ہم کہہ رہے ہیں تم سے اور ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ تم سچے آدمی ہو۔ آخر ہم نے بھی کہیں نہ کہیں زندگی گزاری ہی ہے''۔

ہری چند تو واقعی شاہ زیب کے لیے فرشتہ صفت ثابت ہو رہا تھا۔ اس وقت بھلا اس کائنات میں ہری چند سے زیادہ محبت کرنے والا۔ اور اس سے زیادہ کارآمد آدمی اور کون ہو سکتا تھا۔ شاہ زیب نے لجیا کو پلنگ پر ڈال دیا۔ اس کے بال سنوارنے لگا ہری چند پانی لے آیا۔ لجیا تھوڑی دیر کے بعد ہوش میں آ گئی۔ اس نے اس طرح شاہ زیب کو دیکھا جیسے خواب دیکھ رہی ہو اور پھر جب اسے یہ یقین ہو گیا کہ یہ خواب نہیں ہے تو وہ شاہ زیب سے لپٹ گئی۔ شاہ زیب نے اس طرح اسے اپنے وجود میں سمیٹ لیا

تھا جیسے اس کے بعد اس کے لیے اس کائنات میں کچھ نہ رہا ہو۔ لجیا نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مجھ سے شادی کر لو گے نا۔ بتاؤ اب مجھے کہیں جانے نہیں دو گے نا''

''کہیں نہیں میری زندگی۔ کہیں نہیں جانے دوں گا میری روح۔ شادی کر لوں گا تم سے آج شام کو ہی شادی کر لوں گا۔ تم میری زندگی کی ساتھی بن جاؤ گی''۔ شاہ زیب نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا اور لجیا کے ہونٹوں پر ایک معصوم مسکراہٹ پھیل گئی۔ واقعی بعض اوقات ایک معمولی سی اور غیر متعلق سی شخصیت زندگی کا سب سے اہم حصہ بن جاتی ہے۔ کمال کا تھا یہ ہری چند بھی اس نے واقعی شام کو محفل سجا دی ایک مولوی صاحب کو لے آیا جو گاؤں کے قاضی تھے نکاح خواں تھے۔ معلومات حاصل کر کے مٹھائی وغیرہ بھی لے آیا۔ مولوی صاحب نے خود ہی چار مسلمان گواہ اکٹھے کر لیے تھے ساتھ ہی ہری چند کپڑے وغیرہ بھی لے آیا تھا۔ یہ تمام اہتمام دیکھ کر شاہ زیب بھونچکا رہ گیا۔ لیکن لجیا کو تسلی دینے کے لیے وہ مقام دینا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ مغرب سے پہلے مولوی صاحب نے نکاح پڑھا دیا۔ مٹھائی کھائی گئی۔ ہری چند کی بیوی کو اب جیسے قرار آ گیا تھا۔ اسے اس بات کا اطمینان ہو گیا تھا۔ کہ اس کا سہاگ خطرے میں نہیں ہے۔ لجیا دوسرے کی ہو چکی ہے۔ چنانچہ اس نے بھی توجہ دی تھی ایک کمرہ بھی خالی کر دیا تھا اندر جسے حجلہ عروسی بنا دیا گیا تھا۔ لجیا نے تفصیل بتائی۔ راجہ شہاب الدین کے چنگل سے نکل کر وہ نجانے کہاں کہاں بھٹکتی رہی۔ بسوں میں اور ٹرینوں میں بیٹھ کر سفر کرتی رہی یہ جانے بغیر کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ اسے بس اپنی عزت بچانی تھی۔ پھر جنگل میں ایک جگہ اسے کچھ ٹرک نظر آئے اور وہ ایک ٹرک میں چھپ گئی۔ بس لوگوں سے چھپتی پھر رہی تھی۔ بھیڑیوں سے چھپتی پھر رہی تھی۔ جو انسانی شکل میں اس کی عزت آبرو کے درپے تھے۔ جس ٹرک میں چھپی تھی وہ اسمگلروں کا ٹرک تھا۔ جو سرحد پار

کر کے اس طرف آنے والا تھا اور اس طرح وہ پڑوسی ملک کی سرحد میں پہنچ گئی۔ پھر تقدیر نے اس پر مہربانی کی کہ ہری چند جیسے آدمی نے اسے دیکھ لیا۔ اس کی داستان معلوم کر کے وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہاں آنے کے بعد ہری چند کی بیوی نے لجیا کی زندگی تلخ کر دی۔ یہ لجیا کی کہانی تھی۔

شاہ زیب کو زندگی میں پہلی بار سکون کا ایک لمحہ حاصل ہوا تھا۔ ہری چند نے دوسرے دن صبح کہا۔

شاہ جی! دیکھو جب انسان کی تقدیر کانٹا بدلتی ہے نا۔ تو آپ یوں سمجھ لو کہ آسانیوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔ آپ کو زندگی کا پہلا مقصد حاصل ہوا ہے۔ اب یوں سمجھ لو کہ ساری زندگی ہی آرام سے گزرے گی''۔

''ایسا ہی لگتا ہے ہری چند۔ ایسا ہی لگتا ہے''۔ شاہ زیب نے پرمسرت لہجے میں کہا تھا۔

☆☆☆

شاہ زیب کو جیسے زندگی کی ہر خوشی حاصل ہو گئی تھی۔ مایوسیوں کے اندھیرے چھٹ گئے تھے۔ جنہیں وہ اپنی زندگی کا ایک حصہ سمجھتا تھا۔ فطرت انسانی پر بھی غور کرتا تھا۔ کیا عجیب ہوتی ہے انسان کی فطرت بھی مرکز نگاہ مل جائے۔ مرکز دل مل جائے۔ تو جینے کا لطف ہی دوبالا ہو جاتا ہے۔ ورنہ مایوسیوں کے اندھیروں کے سوا اور کچھ پاس نہیں ہوتا۔ ہری چند سے کہنے لگا۔

''ہری چند اب تو دل چاہتا ہے کہ خاموشی سے اپنی بیوی کو لے کر یہیں کہیں انسانی وسعتوں سے گم ہو جاؤں۔ میرے لیے تو میری منزل یہی تھی''۔

''نہ بھائی نہ بھائی ایسا نہ کرنا۔ مجھے تمہیں خیریت کے ساتھ واپس کرنا ہے اگر گھائی آ جائے تو اس سے بات کر کے جہاں دل چاہے چلے جانا۔ میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔ لیکن میری ذمے داری ہے وہ مجھے پوری کرنے دینا ایسا کوئی کام نہ کرنا''

''نہیں میرے دوست! تم نے تو میری روح کو سہارا دیا ہے۔ جس چیز سے تمہیں کوئی نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو گا وہ میں زندگی بھر نہیں کروں گا''۔

''پتہ نہیں برے لوگوں سے تمہارا واسطہ کیسے پڑ گیا تم تو بہت اچھے انسان ہو''۔ ہری چند نے کہا پھر گھائی آ گیا۔ یہ بھی خوش بختی کا الگ حصہ ہی تھا۔

''کیسی گزر رہی ہے۔ صحت تو یار اچھی ہو گئی ہے۔ چہرہ سرخ ہو گیا ہے بالکل''۔ اس نے شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے کہا اور شاہ زیب اس سے لپٹ گیا۔

''ارے ارے ارے۔ بہت خوش ہو بھیا۔ کیوں بھئی ہری چند ہمارے

دوست کو کیا کھلا پلا دیا۔ یہ تو بہت خوش ہے یہاں''۔

''بس مہاراج! بھگوان جب کسی کو عزت دینے پر آتا ہے تو ایسے ہی دے دیتا ہے۔ ہمیں بھی عزت مل گئی ہے اس کے علاوہ اور کیا کہیں''

''کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا''

''بڑی خاص بات''۔ گھانی کو تفصیل بتائی گئی تو وہ بھی خوش ہو گیا۔

''یہ تو واقعی بہت خوشی کی بات ہے۔ ویسے شاہ زیب بڑے شاہ جی نے تمہیں فوراً بلایا ہے۔ شام تک میرے گاؤں پہنچ جائیں گے۔ کام بھی طے کر کے آیا ہوں۔ یعنی تمہیں آسانی سے نکال لے جانے کے لیے بات چیت کر لی ہے۔ چلو تمہاری بیگم صاحبہ کو بھی کسی نہ کسی طرح سرحد پار کرا ہی لیں گے''۔

''میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا گھانی''

''کیا''

''بس اس نگری میں جسے میں چاہتا تو بے پناہ تھا۔ میرے دوست کم اور دشمن زیادہ ہیں میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ یہیں کہیں ان آبادیوں میں گم ہو جاؤں اور اپنی اس دنیا کو بالکل بھول جاؤں''۔

''بڑے شاہ جی نے مجھے تمہارے بارے میں کافی تفصیلات بتا دی ہیں۔ یہ لجیا ہے نا۔ جو اب تمہاری بیوی بن گئی ہے''۔

''ہاں''

''فرض کرو تم یہاں کے ماحول میں کھو بھی جاتے ہو تو اپنی ان زمینوں کا کیا کرو گے جن کے لیے تم نے اپنی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ انہیں گلزار بنا دو گے۔ دشمن زندہ ہیں اور اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے۔ آزادی دے رہے ہو اسے''۔

''نہیں''۔ شاہ زیب نے افسردگی سے کہا

''مردوں کی طرح مقابلہ کرو۔ وقت کو اپنی مٹھی میں لو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ فکر مت کرو''۔ شاہ زیب نے پر خیال انداز میں گردن ہلا دی تھی۔ پھر اس کے بعد یہاں سے واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ لیکن اب صورتحال بالکل مختلف تھی۔ شاہ زیب کارواں رواں خوشی سے ناچتا رہتا تھا۔ لجیا اس کے ساتھ تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ خوشیاں نصیب ہوئیں تھیں۔ جو ماں کی موت کے بعد اس سے روٹھ گئیں تھیں۔ سرحد پار کرنے کا عمل انتہائی سنسنی خیز تھا لیکن یہ لوگ اس میں ماہر تھے اور ایسے کام با آسانی کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ سرحد پار کر کے وہ شمشاد گھانی کے گاؤں پہنچ گئے۔ شمشاد گھانی نے خصوصی طور پر یہاں آنے کے بعد انتظامات کیے اسے نہیں معلوم تھا کہ شاہ زیب کی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا ہے۔

بہر حال لجیا اور شاہ زیب یہاں بھی خوش تھے۔ شاہ زیب نے لجیا کو اس کی غیر موجودگی کے بعد کی کہانی سنائی تھی اور لجیا افسردہ ہو گئی تھی۔ شاہ زیب نے اسے خوش کرنے کے لیے اس کے الفاظ دہرائے اور لجیا ہنس پڑی۔

''اس وقت تو تم نے ایسے مجھے ٹھکرا دیا تھا جیسے میں کیڑوں بھری جھاڑو ہوں''۔ شاہ زیب اس مثال پر ہنس پڑا پھر اس نے کہا۔

نہیں لجیا۔ اس وقت بھی میں نے تمہیں ٹھکرایا کہاں تھا وہ تو راجہ شہاب الدین نے تمہیں اغوا کر لیا تھا۔ لیکن اس کے بعد میں نے راجہ شہاب الدین کی زندگی عذاب کر دی کچھ ایسے لوگوں نے میری مدد کی جنہیں آج بھی یاد کروں تو دل غم کے آنسو رونے لگتا ہے۔ شاہ زیب نے لجیا کو ریحانہ کے بارے میں تفصیلات بتائیں جس نے شاہ زیب کے لئے جان دے دی تھی۔ لجیا کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ یہاں آئے ہوئے تیسرا دن تھا کہ ایک رات مکرم شاہ آ گیا۔ شاہ زیب اور لجیا آرام کرنے لیٹ گئے تھے کہ گھانی نے مکرم شاہ کے آنے کی اطلاع دی اور شاہ زیب تڑپ کر اٹھ گیا۔ لجیا کو اس

نے کچھ ہدایات کیں اور اس کے بعد باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر وہ مکرم شاہ سے لپٹ گیا تھا۔ مکرم شاہ مسکرا رہا تھا پھر اس نے کہا۔

''شاہ زیب! تمہاری خوش قسمتی کا دور واقعی شروع ہو گیا ہے۔ جس لڑکی نے تم سے کہا تھا کہ تم اس سے شادی کر لو تم نے اسے ٹھکرا کر غلطی کی تھی بس اب یوں سمجھ لو کہ تقدیر نے اپنے فیصلے بدل دیئے ہیں۔ بہر حال میری طرف سے مبارک باد وصول کرو۔ گھانی مجھے لجیا کے مل جانے کی خوشخبری سنا چکا ہے۔ اور تم یقین کرو۔ میں بھی اتنا ہی خوش ہوں۔ جتنا بڑا بھائی ہو سکتا تھا۔ نہیں کچھ نہیں کہو گے۔ ساری باتیں اپنی جگہ ہم رشتوں کی تردید نہیں کر سکتے۔ یہ الگ بات ہے کہ رشتے ہمارا ساتھ نہ دیں۔ اچھا۔ اب تم چلنے کی تیاریاں کرو ہمیں راتوں رات سفر کرنا ہے۔ لجیا کو بھی تیار کر لو میں انتظامات کر کے آیا ہوں۔ مکرم شاہ نے کہا۔

اور اس کے بعد وہ گھانی کو کچھ ہدایت دینے لگا رات کی تاریکیوں میں بڑی لینڈ کروزر کے سفر کا آغاز ہو گیا۔ اور یہ سفر صبح تک جاری رہا یہاں تک کہ جب روشنی کا آغاز ہوا تو لینڈ کروزر لاہور میں داخل ہو چکی تھی۔ مکرم شاہ کی پر اسرار شخصیت بہت کافی تھی۔ لاہور کے ایک خوبصورت علاقے میں قیام کیا گیا۔ یہاں صبح کے ناشتے کے بعد مکرم شاہ نے کہا۔

''میں بھی کچھ سونا چاہتا ہوں۔ تم لوگ بھی آرام کرو یہ کمرا تمہارے لیے مخصوص ہے۔ رات کو ہم یہاں سے آگے کا سفر کریں گے۔ ہمیں ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی جانا ہے''۔ شاہ زیب بہت سے معاملات میں خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا۔ مکرم شاہ کیا کرتا ہے۔ کیا نہیں کرتا۔ یہ ایک الگ بات تھی لیکن بہر حال اس نے لجیا کو مطمئن رہنے کے لیے کہا۔

''شاہ جی! بہت بڑے انسان ہیں عظمت کا مینار تم یوں سمجھ لو۔ لجیا کہ ہمارے

لیے تو وہ فرشتہ ہی ہیں۔ زمین پر فرشتے کیسے لگتے ہیں۔ یہ انہیں دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے۔ کراچی کی فلیٹ ساڑھے چار بجے کی تھی۔ مکرم شاہ ساتھ ہی تھا۔ لاہور ائیر پورٹ سے ان کا طیارہ انہیں لے کر کراچی کی طرف چل پڑا۔

نجانے کیا کیا خیالات شاہ زیب کے ذہن میں تھے۔ کیا عجیب وغریب زندگی گزاری تھی اس نے یہاں۔ بہر حال اب تھوڑا سا سکون تھا اور وہ غیر مطمئن نہیں تھا۔ پونے دو گھنٹے کا یہ سفر ختم ہوا اور جہاز کراچی ایئر پورٹ پر اتر گیا۔ انٹرنیشنل ٹرمینل سے گزر کر وہ لوگ باہر آئے۔ غالباً مکرم شاہ نے کسی کو اطلاع دے دی تھی کیونکہ شاندار سیاہ رنگ کی مرسیڈیز استقبال کے لیے تیار تھی۔ سامان تو کوئی ساتھ نہیں تھا۔ بس تین افراد تھے جو لاہور سے یہاں پہنچے تھے۔ مرسیڈیز انہیں لے کر چل پڑی اور ایئر پورٹ سے ڈیفنس کلفٹن تک کا لمبا سفر طے کیا گیا۔ لجیا پھٹی پھٹی آنکھوں سے کراچی کی روشنیاں دیکھ رہی تھی۔

وہ اب بھی اتنی ہی معصوم تھی گاؤں سے نکلنے کے بعد لاہور پہنچی تھی۔ لاہور سے بھاگی تھی تو بس انہی علاقوں میں گردش کرتی رہی تھی۔ اب یہاں اس کے سامنے بین الاقوامی شہر کراچی تھا۔ جہاں دن اور رات کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ رات میں بھی دن ہی نکلا ہوا تھا۔ کار لمبا سفر طے کرنے کے بعد ڈیفنس کی ایک خوبصورت کوٹھی میں داخل ہو گئی اور پورچ میں جا رکی مکرم شاہ نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

''آؤ......''۔ شاہ زیب جھجکتا ہوا نیچے اتر آیا دوسری طرف سے اس نے لجیا کا بھی دروازہ کھول کر نیچے اتار لیا تھا۔ عظیم الشان کوٹھی کا ماحول بالکل خاموش اور سنسان تھا۔ سمندر کے طرف سے چلنے والی ہوائیں ایک انوکھی نمی کا احساس دلا رہی تھیں۔ مکرم شاہ انہیں ساتھ لیے ہوئے، ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ انتہائی قیمتی فرنیچر سے آراستہ یہ ڈرائنگ روم بے مثال تھا۔ لجیا تو قدم قدم پر لڑکھڑا رہی تھی۔ سیدھی سادھی دیہاتی لڑکی

جس بے چاری نے زندگی میں کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ گاؤں کی رہنے والی اسے تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی سیارے پر آ گئی ہو۔ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ یقین بھی نہیں آ رہا تھا کہ یہ بھی اسی دنیا کا ایک منظر ہے۔ مکرم شاہ کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ شاہ زیب خود بھی متاثر نظر آ رہا تھا۔ مکرم شاہ نے کہا۔

''بیٹھو...... یہ تمہاری رہائشگاہ ہے تمہیں یہیں رہنا ہوگا''۔ شاہ زیب کے منہ سے آواز تک نہیں نکل پا رہی تھی۔ مکرم شاہ نے کہا۔

''تم اگر چاہو تو لجیا کو بیڈ روم میں پہنچا دو۔ یہاں ابھی کوئی ملازم وغیرہ نہیں ہے لیکن کل تک ایک دو ملازم عورتیں اور مرد آ جائیں گے۔ بلکہ ایسا کرو تم دونوں بھی آرام کرو میں بھی یہیں ہوں۔ آؤ میں تمہارے بیڈ روم میں پہنچا دوں''۔ شاہ زیب نے معصومیت سے گردن ہلا دی تھی۔ مکرم شاہ نے انہیں جس بیڈ روم میں پہنچایا وہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ دروازے سے انہیں چھوڑ کر وہ واپس چلا گیا۔ یہ کہہ کر کہ کل صبح ملاقات ہوگی۔ لجیا نے اس بیڈ روم کو دیکھا موٹا قالین انتہائی قیمتی بستر فوم کا بہت موٹا گدا اتنا نرم کہ انسانی جسم اس میں دھنس کر رہ جائے۔ اس کے علاوہ اور بھی لاتعداد قیمتی اشیاء شاہ زیب حیرت کے عمل سے نکل آیا۔ اور لجیا کی بوکھلاہٹیں دیکھنے لگا۔

''وہ...... وہ کہہ رہے تھے کہ ہم یہاں رہیں گے''

''کیوں تمہارا کیا خیال ہے''

''ہائے میں تو مر جاؤں گی''۔ لجیا دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر بولی۔

''بالکل نہیں۔ تمہیں زندہ رہنا ہوگا لجیا اب تو زندگی کا آغاز ہوا ہے''

''مگر یہ جگہ ہے کون سی''

''گھر ہے۔ پہلے تو یہ بتاؤ کہ تمہیں پسند ہے یا نہیں''

''ہائے میں مر جاؤں تم پسند کی بات کر رہے ہو۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ یہاں

اگر موت بھی آ جائے تو بندہ خوشی سے مرنے کے لیے تیار ہو جائے''۔

''پاگل! موت کی نہیں زندگی کی بات کرو۔ کیا موت موت لگا رکھی ہے''۔

لجیا اسی طرح کی باتیں کرتی رہی۔ شاہ زیب خود بھی حیران تھا۔ دوسرے دن خوب دن چڑھے دونوں کی آنکھ کھلی تھی۔ فوم کے گدے پر ایسی گہری نیند آئی کہ بس بیان سے باہر ہے۔ لجیا ہنس کر بولی۔

''میں تو سوچ رہی تھی کہ یہ خواب ہے اور صبح کو آنکھ کھل جائے گی''

''سوچتی رہو بیوقوفی کی باتیں''۔ پھر دروازے پر دستک ہوئی تو شاہ زیب نے بستر سے چھلانگ لگا دی۔ دروازے پر پہنچا۔ مکرم شاہ سامنے کھڑا ہوا تھا۔

''بھئی۔ تیار ہو کر باہر آ جاؤ لجیا کیا کر رہی ہے''

''تت۔ تیار ہے''

''الماریوں میں تم دونوں کے لیے لباس وغیرہ موجود ہیں۔ سارا بندوبست ہے نہا کر لباس تبدیل کر لو اور باہر آ جاؤ۔ کس شاندار کمرے سے بڑے ٹائلٹ باتھ روم میں لجیا کو ہر چیز بتانی پڑی۔ بمشکل تمام وہ تیار ہو کر باہر آئی اور وہ دونوں مکرم شاہ کی رہنمائی میں ڈائننگ ہال میں پہنچ گئے۔ کچھ باوردی ویٹر ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا رہے تھے مکرم شاہ نے کہا۔

''یہ ہوٹل کے ویٹر ہیں جب تک ہمارے ہاں مکمل طور پر باقی بندوبست نہیں ہو جاتے یہ لوگ صبح دوپہر شام ہوٹل سے کھانے کی اشیاء سپلائی کریں گے تم انہیں آرڈر بک کرا دیا کرو''۔ ناشتے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد شاہ زیب نے لجیا کو تو اسی بیڈ روم تک پہنچایا اور خود مکرم شاہ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

''شاہ جی! عقل حیران ہو گئی ہے۔ آپ ہر کام کر سکتے ہیں یہ تو مجھے معلوم ہے لیکن یہ جگہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی''۔ مکرم شاہ نے محبت بھری نگاہوں سے شاہ

زیب کو دیکھا اور بولا۔

''شاہ زیب میں نہیں جانتا کہ قدرت کا یہ عمل کیا ہے۔ لیکن یہ سمجھ لو کہ بعض لوگ زندگی میں اتنا بڑا مقام حاصل کر لیتے ہیں کہ اس کے بعد اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ وہ بہت بڑی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں اور میرے لیے اس حیثیت کے مالک تم ہو۔ میرے دل میں مستقل ایک خیال گردش کر رہا تھا کہ وقت تم پر بہت سنگین ہو گیا ہے۔ اور ہر طرف تمہارے دشمن بکھرے ہوئے ہیں۔ دو صورتیں تھیں شاہ زیب پہلی تو یہ کہ جس طرح بھی بن پڑے میں تمہیں ملک سے باہر نکال دوں یہ میں نہیں چاہتا تھا۔ تمہیں ملک سے باہر نکال کر مجھے کیا فائدہ ہوتا تمہاری زندگی بے شک بچ جاتی لیکن میں تو اپنی مرضی کے مطابق تم سے نہیں مل سکتا تھا۔ میں...... شاہ زیب میں نجانے کیوں تم سے اتنا متاثر ہو گیا ہوں۔ میرا دل نہیں چاہتا کہ تم میری نگاہوں سے دور ہو جاؤ۔ پچھلے دنوں جو میں نے تمہیں شمشاد گھانی کے ہاں بھجوایا تھا۔ وہ ایک اہم مسئلے کے لیے تھا میں کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اب میں تمہیں اس کی مکمل تفصیل بتائے دیتا ہوں۔ تم تیار ہو''۔

''جی شاہ جی''۔ شاہ زیب متاثر لہجے میں بولا۔

''اٹھو آؤ......'' اور ایک بار پھر مکرم شاہ اسے لے کر ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ پھر بولا۔

''تھوڑی دیر کے بعد تم اس پوری کوٹھی کو دیکھ لینا۔ یہاں جو میں ملازم بلاؤں گا نا وہ میرے اپنے آدمی ہوں گے۔ شاہ زیب! میں تم سے ایک ایسی بات کہہ رہا ہوں جو تمہیں بڑی عجیب لگے گی۔ لیکن اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے''۔

''جی شاہ جی''

''کیا تم شاہ زیب ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت کرنا پسند کرو گے''۔

''آپ جیسا چاہیں شاہ جی! میں کیا کہوں۔ اگر شاہ زیب کا اس دنیا سے جانا

ضروری ہے تو پھر آپ بھی مجھے دنیا رخصت کر دیجئے''۔

''ہاں شاہ زیب کا اس دنیا سے جانا ضروری ہے اور اس کی جگہ ایک نئے کردار کا وجود میں آنا مجبوری ہے''۔

''نیا کردار''

''ہاں۔ اب تمہیں ایک نئے نام سے اس دنیا میں آنا ہے اور تمہارا اپنا نام کریم شاہ ہے۔ سمجھے اب تم کریم شاہ ہو۔ نیروبی میں تمہارا کاروبار ہے۔ تمہارے والد کا نام فرید شاہ ہے ہم اس نام کو بہت زیادہ استعمال نہیں کریں گے تاکہ تمہیں کسی جذباتی الجھن کا سامنا نہ کرنا پڑے کریم شاہ کی شکل وصورت سے یہاں کا کوئی شخص واقف نہیں ہے۔ نیروبی میں اگر کریم شاہ کے بارے میں معلومات حاصل کی جائے گی تو وہاں کی حکومت مکمل طور سے یہ بتائے گی کہ کریم شاہ کا کاروبار وہاں موجود ہے۔ اور کریم شاہ یہاں پاکستان شفٹ ہو چکا ہے۔ یہ سب کچھ ہو گا۔ یہاں سارے کام ہو چکے ہیں۔ ساری تیاریاں مکمل ہیں۔ پولیس حکومت اور ہر ادارہ اس سلسلے میں تمہاری مدد کرے گا اگر ضرورت پیش آئی۔ میں نے تمہارا کردار ہی بدل دیا ہے۔ اور اس کے لیے میں نے زبردست تیاریاں کیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ نیروبی میں میں نے کریم شاہ کا کاروبار خرید لیا ہے۔ اور یہ بات کبھی منظر عام پر نہیں آئے گی کہ کریم شاہ کا کاروبار بک چکا ہے۔ سمجھے میری بات کریم شاہ وہاں کے کاغذات کے مطابق پاکستان شفٹ ہو چکا ہے۔ اور وہ یہاں رہتا ہے۔ ہر جگہ سے اس بات کی تصدیق ہو جائے گی۔ میں نے کوئی کام کچا نہیں کیا تھا۔ سمجھ رہے ہو نا تم''۔

شاہ زیب ششدر رہ گیا تھا۔ مکرم شاہ نے کہا۔

''بس بیٹے! میرا بھی اس کائنات میں کوئی نہیں ہے یہ بات تم جانتے ہو۔ تمہاری خوشیوں کے ساتھ میں بھی زندگی گزار دوں گا۔ میں نے اپنا تمام سرمایہ جو کچھ

میرے پاس موجود تھا اس کام پر خرچ کر دیا ہے۔ اور ہر طرح کی مراعات حاصل کر لی ہیں۔ سمجھ رہے ہو نا تم''۔

''جی''۔ شاہ زیب آہستہ سے بولا۔

بہر حال اس کے بعد یہاں کی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ کراچی کی اس حسین کوٹھی میں بہت سے ملازم آ گئے۔ شاہ زیب کریم شاہ کی حیثیت سے شاہانہ زندگی بسر کرنے لگا لجیا اس کی زندگی میں آ گئی تھی۔ ساحل سمندر پر جب ان کے قدموں کے نشانات بکھرتے تو شاہ زیب فرط مسرت سے ان نشانات کو چوم لیتا۔ بات یہیں تک نہیں رہی تھی۔ کوئی دو مہینے اسی طرح گزر گئے ہیں۔ مکرم شاہ بھی گوشہ نشیں ہو گیا تھا۔ اس کا عظیم الشان جال پھیلا ہوا تھا۔ ہر کام اس کی خواہش اور ضرورت کے مطابق ہو جاتا تھا۔ جو ملازمین یہاں آئے تھے وہ بھی مکرم شاہ کے انتہائی وفادار لوگوں میں سے تھے۔ پھر مکرم شاہ نے ایک اور عمل کیا وکیلوں کے ذریعے اس نے بوئے آسل کی زمین کا وہ ٹکڑا جو تنازعہ کا باعث تھا اور جس کے گرد زندگی کی ایک خونی داستان گردش کر چکی تھی۔ کریم شاہ کے نام منتقل ہو گیا۔ اسے باقاعدہ شاہ زیب نے فروخت کیا تھا۔ تمام تر ثبوتوں کے ساتھ یہ زمین کریم شاہ کے نام منتقل ہو گئی تھی۔ مکرم شاہ نے آگے کا منصوبہ بتاتے ہوئے کہا۔

''اور اب تم اپنے خوابوں کی تکمیل کر سکتے ہو''۔ شاہ زیب نے فرط مسرت سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پھر اس کے بعد شاہ زیب کریم شاہ کی حیثیت سے بوئے آسل پہنچا اور لاتعداد کارندوں کو بلا کر زمین ہموار کی جانے لگی۔ ایک چھوٹا سا کاٹیج ایک گوشے میں بنایا گیا اور زمین کی آبیاری شروع کر دی گئی۔ مالیوں نے وہاں پودے لگا دیئے اور در حقیقت اس خواب کی تکمیل ہونے لگی کہ اس زمین کو گل و گلزار بنایا جائے گا۔ ادھر الیاس خاں اور جبار خاں اپنی ہر ممکن کوشش کر کے ہار چکے تھے۔ انہوں نے فخر

خاں کے سامنے جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کے علاوہ لوگوں سے یہ کہنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ کہ وہ زمین پر فخر خاں کے مقابلے پر بھٹہ بنائیں گے۔ شاہینہ، شکیلہ اورنگزیب اور جہاں زیب اپنے معمول کے مطابق زندگی گزار رہے تھے۔ بھائی ان کی زندگی سے تقریباً نکل ہی گیا تھا۔ شکیلہ اور اورنگزیب البتہ اکثر شاہ زیب کو یاد کر لیا کرتے تھے۔ کئی بار شکیلہ نے اورنگزیب سے کہا تھا۔

''حقیقت یہ ہے کہ میں نے زمینداروں کے ایسے بہت سے واقعات دیکھے اور سنے ہیں لیکن آپ لوگوں کے ہاں جو کچھ میں نے دیکھا اس نے مجھے سخت حیران کیا ہے۔ خون اس طرح خون سے جدا ہو جاتا ہے یہ آپ ہی کے ہاں کی روایت ہے''۔

''ٹھیک کہتی ہو شکیلہ! مگر میں کیا کروں حالات کے جال میں اس طرح پھنسا کہ نکلنے کا راستہ ہی نہ ملا۔ تم کیا سمجھتی ہو وہ میرا چھوٹا بھائی تھا میں اس سے محبت نہیں کرتا۔ ماں باپ کی آغوش میں ہم کس طرح پلے بڑھے دنیا جانتی ہے لیکن بس برا مت ماننا قصور جہاں زیب کا بھی نہیں ہے شاہینہ بھابی نے ہمارے درمیان زہریلی ناگن کا کردار ادا کیا۔ ان کے بھائیوں نے ہم بھائیوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ سوچو بات کا آغاز وہیں سے تو ہوا تھا''۔

''اور اب ہم سب نے مل کر شاہ زیب کو زندہ دفن کر دیا کیا زندگی گزاری ہے اس معصوم سے خوبصورت سے بچے نے۔ کیا الفاظ تھے اس کے کہ وہ تو آپ لوگوں کو اپنا محور سمجھتا تھا۔ سوچتا تھا کہ آپ اس کے ماں باپ کا درجہ رکھتے ہیں۔ بس اسی غلط سوچ نے اسے مروا دیا۔ ماں باپ کا درجہ تو کوئی بھی نہیں لے سکتا کوئی بھی نہیں''۔ شکیلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اورنگزیب کا چہرہ بھی لٹک گیا تھا۔ بھائی کبھی کبھی یاد تو بڑی شدت کے ساتھ آتا۔ یہ خاصے دن بعد کی بات ہے الیاس خاں اور جبار خاں ایسے ہی خفت مٹانے کے لیے باہر نکلے تھے۔ باہر نکلے تو ان کا گزر اس طرف سے ہوا یہ ان کا

راستہ تھا۔ یہ دیکھ کر وہ دھک سے رہ گئے کہ زمینوں پر ان زمینوں پر یہاں انہوں نے اپنی زندگی کی بدترین لمحات سے نقصانات اٹھائے تھے۔ چھوٹے چھوٹے پودے اور کونپلیں جنم لے رہی ہیں وہ وہاں پر کام کرنے والوں کو دیکھ کر ان کی جانب بڑھ گئے۔ دونوں بھائیوں کا دل غم کا شکار ہو گیا۔ اس کاٹج کی طرف بڑھتے ہوئے الیاس خاں اور جبار خاں سے کہا۔

’’یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ جبار خاں‘‘

’’وہ جس کا دعویٰ شاہ زیب نے کیا تھا۔ وہ جس نے ہمارے منہ پر ایسی غلاظت لگا دی تھی۔ کہ بس بیان سے باہر ہے۔ یہ کیا ہوا۔ کیا ہے یہ سب کچھ دونوں وہاں پہنچ گئے اور پھر انہوں نے ایک مالی کو بلایا جو کام کر رہا تھا۔ مالی نے قریب آ کر سلام کیا۔ الیاس خاں نے اس سے کہا۔

’’مالی بابا۔ یہ باغ کب لگایا گیا‘‘

’’سر جی! بہت دن ہو گئے‘‘

’’کس کا ہے یہ باغ‘‘

’’کریم شاہ صاحب کا‘‘

’’کریم شاہ‘‘

’’ہاں‘‘

’’کیا کریم شاہ صاحب اندر موجود ہیں‘‘

’’نہیں جی۔ کبھی کبھی آتے ہیں‘‘

’’کہاں رہتے ہیں وہ‘‘

’’کراچی۔ کراچی سے آتے ہیں جی‘‘

’’کراچی سے کریم شاہ‘‘

’’ہاں‘‘

’’ابھی کتنے دن کے بعد آئے تھے۔ میرا مطلب ہے کب گئے ہیں یہاں سے‘‘۔

’’وہ جی کوئی آٹھ دن ہو گئے۔ آتے رہتے ہیں‘‘۔

’’ہوں‘‘۔ ان لوگوں سے زیادہ معلومات نہیں حاصل ہو سکیں۔ لیکن دونوں کے دل عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئے تھے۔ انہوں نے اور بھی بہت سی معلومات حاصل کیں۔ یہ پتہ چلا لیا کہ کریم شاہ صاحب کہاں رہتے ہیں۔ اور یہ پتہ چلانے کے بعد وہ وہاں سے واپس چل پڑے لیکن اب بھلا سکون کہاں۔ سکون تو لٹ چکا تھا۔ ان زمینوں پر جن کے لیے الیاس خاں کو اپنے بیٹے کی قربانی دینا پڑی تھی۔ اینٹوں کا بھٹہ بننے کے بجائے ایک باغ کا خوبصورت نقشہ ابھر رہا تھا اور یہی شاہ زیب کا قول تھا۔

’’مگر یہ سب کچھ اور کریم شاہ......‘‘ الیاس خاں نے جبار خاں سے کہا۔

’’ہمیں فوراً کراچی چلنا ہوگا‘‘

’’ہاں کراچی جانا ہے‘‘۔ اور اس کے بعد وہ تیاریاں کر کے اس پتے کے مطابق چل پڑے ڈیفنس کی اس عالی شان کوٹھی جواب پوری طرح آباد ہو گئی تھی کے گیٹ پر ٹیکسی آ کر رکی تو چوکیدار نے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

’’کس سے ملنا ہے صاحب‘‘

’’کریم شاہ صاحب سے‘‘

’’آپ لوگ کون ہیں؟‘‘

’’وہ ہمیں نہیں جانتے لیکن ان سے ملنا بہت ضروری ہے‘‘

’’ٹھیک ہے صاحب ہم پوچھتے ہیں‘‘۔ یہ کہہ کر چوکیدار نے انٹر کام پر اندر سے رابطہ قائم کیا۔

''آپ کا نام کیا بتا دیا جائے صاحب جی''

''الیاس خاں اور جبار خاں''۔ دونوں نے کہا اور چوکیدار انٹر کام پر یہ نام دوہرانے لگا۔ مکرم شاہ اس وقت ان دونوں کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ لجیا کی معصوم شرارتیں اور اس کی خوشیاں مکرم شاہ کو بھی بھاتی تھیں۔ اس نے زندگی کی جنگ ختم کر دی تھی۔ اور اب ان دونوں کے ساتھ ہی رہا کرتا تھا۔ جب گیٹ سے چوکیدار نے ان دونوں کی آمد کی اطلاع دی تو مکرم شاہ اچھل پڑا۔

''آ گئے۔ آنا تھا دیر سے آئے پر صحیح وقت پر آئے۔ باغ تیار ہو چکا ہے آگ لگ گئی ہوگی ان کے سینوں میں۔ ملوان سے ملو میں ساتھ نہیں ہوں گا لیکن تم سمجھتے ہو کہ تمہیں کس طرح ملنا ہے''۔ شاہ زیب نے مسکرا کر گردن ہلا دی تھی۔ اس وقت وہ ایک انتہائی قیمتی لباس میں ملبوس اپنے ڈرائینگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ حلیے میں معمولی سی تبدیلی پیدا کر لی تھی اس نے۔ آنکھوں میں سنہرے فریم کی عینک گالوں پر ہلکی ہلکی سیاہ داڑھی چہرہ تو تھا ہی دودھ کی طرح سفید بدن بھی کچھ بھر سا گیا تھا اس تھوڑے سے وقفے میں دیکھنے والی شخصیت بن گئی تھی اس کی وہ ان دونوں کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ چوکیدار کو اس نے ہدایت کر دی تھی کہ ان دونوں کو احترام کے ساتھ پہنچا دیا جائے۔ اپنے عظیم الشان ڈرائینگ روم میں اس نے ان دونوں کا استقبال کیا تھا۔ چہرے میں اب اتنی تبدیلی بھی نہیں پیدا ہوئی تھی کہ اسے پہچانا نہ جا سکتا۔ الیاس خاں اور جبار خاں ڈرائینگ روم میں داخل ہوئے اور شاہ زیب کو دیکھ کر اس طرح لڑکھڑائے کہ دونوں کو گرنے سے بچنے کے لیے ایک دوسرے کا سہارا لینا پڑا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شاہ زیب کو دیکھ رہے تھے۔ شاہ زیب خاموشی سے کھڑا دونوں کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جب دونوں کے حواس کچھ بحال ہوئے تو شاہ زیب نے کہا۔

''آئیے جناب! تشریف رکھیے کہیے کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی''

''شش...شاہ...شاہ زیب، شاہ زیب تم...تت...تم''

''جی۔ میں سمجھا نہیں کیا کہہ رہے ہیں آپ''

''تم شاہ زیب ہو نا''

''آپ یہاں کس سے ملنے آئے ہیں۔ مجھ سے یا شاہ زیب سے''

''تت...تم...مم...مطلب یہ کہ...تت...تم شاہ زیب نہیں ہو''

''معاف کیجیے گا غلط جگہ آ گئے آپ لیکن میرے چوکیدار کو تو آپ نے یہ کہا تھا کہ آپ کریم شاہ سے ملنا چاہتے ہیں''۔

''اوہ...وہ تو ٹھیک ہے۔ لل...لیکن تم۔ تم شاہ زیب نہیں ہو گیا۔ کریم شاہ صاحب کہاں ہیں''۔

''میرا نام کریم شاہ ہے''

''کیا...'' دونوں کے منہ سے حیرت بھری آواز نکلی۔

''دیکھیے چوکیدار کے علاوہ یہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو غلط قسم کے افراد ہیں اور غلط حرکتیں کرنے والوں کو پہلے وہ اچھی طرح مارتے ہیں اور اس کے بعد اٹھا کر باہر پھینک دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہم نے یہاں کچھ خونخوار کتے بھی پال رکھے ہیں۔ جو ہلکے سے اشارے پر اس کوٹھی کے ہر گوشے میں آ جا سکتے ہیں۔ اور دوسرے ہلکے سے اشارے سے پہلے غلط طریقے سے گھس آنے والوں کو بے لباس کر دیتے ہیں۔ اس طرح تربیت دی گئی ہے انہیں کہ بے لباس کرتے ہوئے وہ کسی کے جسم پر خراش نہیں آنے دیتے۔ اور جب دوسرا ہلکا سا اشارہ کیا جاتا ہے تو پھر وہ بھنبھوڑ کر رکھ دیتے ہیں''

''شاہ زیب تم...تم''

''پھر شاہ زیب۔ میرا خیال ہے آپ کی ملاقات ان افراد سے کرا دی جائے''۔

"نن......نہیں"۔ جبار خاں کے منہ سے نکلا اور وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ الیاس خاں بھی بیٹھ گیا تھا۔

"خدا کے واسطے یہ بتا دو یہ سب کیا ہے شاہ زیب"

"دو...... تیسری بار اگر آپ مجھے شاہ زیب کہہ کر پکاریں گے تو اس کے بعد تمام راستے بند ہو جائیں گے"۔

"تم شاہ زیب نہیں ہو۔ ہم نے تمہیں شاہ زیب کہہ کر پکارا نہیں ہے۔ مگر تم کیا واقعی شاہ زیب نہیں ہو"۔

"حیرت کی بات ہے شکل وصورت سے آپ لوگ اتنے بیوقوف نہیں لگتے کہ ایک شخص کا نام بدلنے کی کوشش کریں"۔

"خدا کی قسم۔ اگر تم شاہ زیب نہیں ہو تو یہ دنیا کی حیرت انگیز مماثلت ہے۔ لیکن نہیں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ کچھ گڑبڑ ضرور ہے"۔

"کھڑے ہو جایئے"۔ شاہ زیب ترش لہجے میں بولا۔

"ہماری بات سنو۔ ہم تم سے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا تم واقعی شاہ زیب نہیں ہو"۔

"کھڑے ہو جایئے"۔ اس بار شاہ زیب کی آواز غراہٹ میں بدل گئی وہ دونوں بے اختیار کھڑے ہو گئے۔

"باہر نکل جایئے۔ کوئی سوال کیے بغیر باہر نکل جایئے"۔ شاہ زیب نے کہا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے باہر نکل آئے۔ حیرت نے ان کی ساری شخصیت مسخ کر دی تھی۔ پھر وہ گیٹ سے ہی باہر نکل آئے کیونکہ سامنے کتوں کی شکلیں دیکھ چکے تھے۔ یہ کتے بھی مکرم شاہ نے ہی مہیا کیے تھے۔ ٹیکسی البتہ باہر کھڑی ہوئی تھی۔ دونوں گرتے پڑتے ٹیکسی کی طرف چل پڑے اور کچھ لمحوں کے بعد اس میں بیٹھ گئے۔

"ہوٹل۔ ہوٹل"

"کون سے ہوٹل صاحب جی"

"یار! کسی بھی ہوٹل چلو اور ٹیکسی چل پڑی۔ ایک ریستوران کی ایک میز پر بیٹھ کر دونوں نے سر پکڑ لیے۔ ویٹر کو کافی کا آڈر دے دیا گیا تھا۔ بہت دیر تک دونوں خاموش رہے اور پھر جبار خاں نے کہا۔

"بہت لمبا کھیل ہوا ہے۔ خان جی بہت لمبا کھیل ہوا ہے"

"لگ رہا ہے ایسا ہی ذرا واقعات کی کڑیوں پر غور کرو ارے باپ رے اس سے بڑی اسکیم کوئی اور ہو سکتی تھی۔ کریم شاہ...... شاہ زیب کریم شاہ بن گیا ہے کہیں سے اس نے دولت بھی حاصل کر لی ہے۔ کیا شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ نوکر چاکر عالی شان کوٹھی وہ بھی کراچی کے ڈیفنس میں اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ کریم شاہ نہیں ہو سکتا۔ وہ شاہ ہی ہے اور اس کی شخصیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نے نوبے آسل کی اس زمین کو وہی حیثیت دی ہے۔ جس کا وعدہ اس نے اپنی ماں سے کیا تھا"۔

"ایسے نہیں چھوڑیں گے اسے۔ ایسے نہیں چھوڑیں گے۔ وہ میرے بیٹے کا قاتل بھی ہے اور اس کائنات میں ہمارا سب سے بڑا دشمن بھی۔ او ہو میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے کافی پینے کے بعد اٹھو یہاں سے ہم اپنے دوست ایس پی وہاب احمد شیخ سے ملیں گے۔ ایسے نہیں چھوڑوں گا"۔ ایس پی وہاب احمد شیخ نے ان کا پرتپاک استقبال کیا تھا۔

"کہیے خان جی کیسے مزاج ہیں آپ کے"

"یار شیخ صاحب! کچھ نہیں کیا آپ نے پولیس کی لاپرواہیوں کے بارے میں ہزاروں رپورٹیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ہم سب کے لیے سب کچھ سن سکتے ہیں۔ آپ کے لیے کچھ سننا ہمارے بس کی بات نہیں ہے"۔

''پولیس پر تنقید کرنے آئے ہیں آپ چلیے کر لیں ذاتی کوئی بات ہے تو بتایئے''۔

''ہے نا ذاتی بات یہ بتایئے آپ نے اس لڑکے کا کیا کیا۔ ٹانگ برابر چھوکرا ایس پی وہاب احمد شیخ صاحب آپ کو بھی چونا لگا گیا''۔

''ظاہر ہے آپ شاہ زیب کے علاوہ کس کی بات کر رہے ہوں گے''

''اتنی معمولی چیز تو نہیں ہے وہ''

''بھائی ہمارا مسئلہ جو ہے نا وہ یہ ہے کہ ہزاروں الٹے سیدھے لوگوں سے نمٹنا پڑتا ہے ہمیں۔ ہزاروں وارداتیں ہوتی ہیں ہزاروں واقعات ہوتے ہیں۔ اب کسی ایک کام کے لیے تو اپنے آپ کو وقف نہیں کیا جا سکتا اور ویسے بھی یہ صرف میرا ہی کام نہیں تھا۔ لگے ہوئے ہیں بہت سے لوگ کر رہے ہیں اس کے خلاف کام اصل میں بات آپ لوگوں کی نہیں ہے۔ وہ بے شمار پولیس والوں کا قاتل ہے اور پولیس والوں کے قاتل کو ایسے نہیں چھوڑا جا سکتا۔ آج نہیں تو کل۔ کل نہیں تو پرسوں جب بھی ہاتھ لگے گا ہم اس پر ہاتھ ڈال دیں گے''۔

''یہی تو میں کہہ رہا تھا آپ سے شیخ صاحب! چونا لگا گیا وہ پورے محکمۂ پولیس کو''۔

''کیا مطلب''

''مطلب یہ کہ اس نے سب کی ناک کاٹ کر ہاتھ پر رکھ دی ہے''

''آپ کی بھی''۔ وہاں احمد شیخ نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

''ہماری تو ناک ہی نہیں اس نے کان بھی کاٹ لیے ہیں''۔

''بڑا افسوس ہوا یہ سن کر آپ تو بہت بڑے لوگ ہیں۔ دھاگ بیٹھی ہوئی ہے آپ کی اور بقول آپ کے ایک لڑکے نے آپ کے ناک کان کاٹ لیے''

''پولیس ڈیپارٹمنٹ ناکام رہا جی! اس کے خلاف کچھ کرنے میں تو ہم کیا ہماری اوقات کیا۔ ویسے ہم اس کا پتا لگا آئے ہیں''۔

''پتہ لگا آئے ہیں''

''ہاں''

''کیا پتہ لگایا ہے آپ نے''

''وہ زندہ سلامت ہیں ڈیفنس کی ایک کوٹھی میں کریم شاہ کے نام سے رہ رہا ہے۔ بوئے آسل کی زمینوں کا تو انہوں نے ایسا کھیل کھیلا ہے۔ کہ حقیقت ہے میں اس لڑکے کی عقل کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکوں گا''۔

''وہ کیا''۔ ایس پی نے پوچھا

''زمینیں شاہ زیب نے کریم شاہ کے نام بیچ دی ہیں۔ جبکہ دونوں ایک ہی کردار کے مالک ہیں۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ۔ یہ دونوں کردار ایک ہی ہیں آپ خود جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ اور پھر ان بکھری ہوئی زمینوں پر باقاعدہ انتہائی شاندار باغ لگایا جا رہا ہے۔ بے شمار افراد وہاں کام کر رہے ہیں۔

''آپ کا مطلب ہے کہ وہ''

''ہاں۔ ڈیفنس کی ایک کوٹھی میں بڑے آرام سے کریم شاہ کے نام سے رہ رہا ہے''۔

''ہوں۔ کھیل واقعی اونچا ہے۔ کام کرنا پڑے گا''۔ ایس پی وہاب احمد شیخ نے پرخیال انداز میں رخسار کھجاتے ہوئے کہا۔ لیکن ایک ہی ہفتے کے اندر اندر اس نے رپورٹ دی۔

''کام بالکل مکمل کیا ہے میں بھی آپ لوگوں کے اس بیان کی تصدیق کرتا ہوں۔ وہ شاہ زیب ہی ہے لیکن اس نے کریم شاہ کی حیثیت سے اپنی شخصیت بدل ڈالی

ہے۔ نیروبی میں اس کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ اور نیروبی کی حکومت اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ کریم شاہ ہی نہیں بلکہ اس کا باپ فرید شاہ بھی نیروبی میں ہی رہتے ہیں۔ اور اب وہ پاکستان منتقل ہو گئے ہیں۔ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا''

''یعنی آپ کا مطلب ہے کہ''

''ہاں بالکل یہی مطلب ہے میرا''۔ وہاب احمد شیخ نے جواب دیا اور دونوں کے چہرے لٹک گئے۔ پھر وہ شاہینہ سے ملے۔ شاہینہ کے ساتھ ساتھ اورنگزیب اور شکیلہ کو بھی ساری تفصیلات معلوم ہوئیں۔ شاہینہ ششدر رہ گئی تھی پھر اس نے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں بھائی جی! ہم خود اس سے ملنے جائیں گے اور معلومات حاصل کریں گے''۔

یہ چاروں ڈیفنس کی اس کوٹھی پر پہنچ گئے۔ اور پھر جب شاہ زیب کو ان لوگوں کی آمد کی اطلاع دی گئی تو اس نے گارڈ سے کہا۔

''اسلحہ تو ان کے پاس بے شک نہیں ہوگا۔ لیکن ان کے جسموں کی مکمل تلاشی لے کر انہیں اندر بھیجا جائے۔ کوئی ٹیپ ریکارڈر یا ٹرانسمیٹر وغیرہ ان کے پاس نہیں ہونا چاہیے''۔ ڈرائینگ روم میں شاہ زیب نے لجیا کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور اجنبی انداز میں ان سے ملا۔ اورنگزیب تو آگے بڑھ کر شاہ زیب سے لپٹ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ شکیلہ بھی رونے لگی تھی۔ شاہ زیب نے ان سے انتہائی پتھریلے لہجے میں کہا۔

''آپ لوگوں کی اس محبت سے میں حیران ہو رہا ہوں۔ کون ہیں آپ لوگ؟''

''کیا ہمیں پہچاننے سے بھی انکار کرو گے یہ تو ہمیں پتہ ہے کہ تم کریم شاہ نہیں شاہ زیب ہو۔ ہم تو تمہارے اپنے ہی ہیں''۔

''اس ملک میں آ کر مجھے اگر کوئی پریشانی ہوئی ہے تو یہ کہ لوگ منہ اٹھا کر مجھے شاہ زیب شاہ زیب کہتے چلے آتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ بیوقوف انسان کون تھا''۔

''تم شاہ زیب نہیں ہو''

''اور اب میں اتنا جھنجھلا گیا ہوں کہ ایسا کہنے والوں کو میں فوراً باہر نکال دیا کرتا ہوں۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں''۔ شاہ زیب کا لہجہ انتہائی خشک تھا۔ اس نے اتنا ترش رویہ اختیار کیا کہ ان لوگوں کو واپس آتے ہی بن پڑی۔ البتہ شکیلہ مڑ مڑ کر شاہ زیب کو دیکھ رہی تھی۔ جب وہ تینوں دروازے سے باہر نکل گئے تو شاہ زیب نے ایک دم اشارہ کیا۔

''محترمہ! آپ سنیئے ذرا''۔ شکیلہ رک گئی

''راہ کرم دو قدم ادھر آیئے''۔ شکیلہ آگے بڑھ گئی۔ شاہ زیب آہستہ سے بولا

''میں شاہ زیب ہی ہوں صرف آپ کو بتا رہا ہوں بھابی! مجھے امید ہے کہ آپ اس انکشاف کی لاج رکھیں گی۔ ذرا سا وقت گزر جانے دیجئے آپ سے تو میں ملتا ہی رہوں گا۔ لیکن یہ برادران یوسف''۔ شاہ زیب نے کہا اسی وقت باہر سے آواز آئی

''شکیلہ کہاں رک گئیں آؤ''۔ اور شکیلہ آنسو بہاتی ہوئی باہر نکل آئی شاہ زیب خاموشی سے کھڑا ہوا انہیں جاتے ہوئے دیکھتا [illegible]